تاریخِ تہذیب

حِصّۂ دوم

مُرتّبہ

کرین برنٹن

جان بی۔ کرسٹوفر

رابرٹ ایل۔ وُلف

ترجمہ وتحشیہ

مولانا غلام رسُول مہر

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور — پشاور — حیدر آباد — کراچی

تاریخِ تہذیب

جلد دوم

(۱۷۱۵ء سے زمانۂ حال تک)

مرتّبہ

کرین برنٹن

[redacted] جان بی، کرسٹوفر

رابرٹ لی ولف

ترجمہ

غلام رسول مہر

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور پشاور حیدرآباد کراچی

FIRST EDITION

Printed in Pakistan.

طبع اوّل ۱۹۶۷ء

تعداد .... دو ہزار ایک سو

طابع .... شیخ نیاز احمد

مطبع .... علمی پرنٹنگ پریس

قیمت فی جلد .... [redacted] روپے

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، کشمیری بازار لاہور

بہ اشتراک

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن

لاہور ــــ نیویارک

فہرست ابواب

ذہنی انقلاب

سامراجی بندھنوں کی کشود

دوسری عالمی جنگ اور بعد کا دَور

اٹھارھویں صدی

بین الاقوامی توازن

پہلا باب

تمہید

۱۷۱۵ء میں عام منظر

۱۷۱۵ء میں صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یورپ کے اندر طویل مدّت کے لیے صلح و امن کی فضا قائم رہے گی۔ اگرچہ ترکی اور بحیرۂ بالٹک میں لڑائی جاری تھی، لیکن نئی جنگِ عام کا امکان دُور نظر آتا تھا۔ یوٹریکٹ[ل] کے صلح نامے پر ۱۷۱۳ء میں دستخط ہُوئے تھے۔ اس کے مطابق مغرب میں توازنِ قوی بحال ہو گیا تھا اور لُوئی چہاردہم فرانسیسی اقتدار کی توسیع کے لیے جو کوششیں کر رہا تھا، وہ ختم ہو چکی تھیں۔ ۱۷۱۵ء میں اس کی وفات نے بین الاقوامی استواری کا مزید یقین دلا دیا، کیونکہ فرانس کا تاج اس کے پوتے لُوئی پانزدہم کو ملا تھا، جس کی عمر صرف پانچ سال کی تھی، لہٰذا طویل مُدّت کے لیے نیابت کا انتظام ناگزیر تھا۔ اس کا اغلب نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ فرانس داخلی مسائل میں منہمک رہے گا اور جارحانہ اقدام کا اُسے موقع ہی نہ مل سکے گا۔ مزید بر آں لوئی چہاردہم کی بڑی بڑی لڑائیوں کے باعث خود اس کی قوم کی قوت سلب ہو چکی تھی اور اس کے فاتح مخالفین بھی دیوالے کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ قومی قرضے تشویش ناک حد تک بڑھ گئے تھے۔

اوضاعِ حکومت

۱۷۱۵ء میں یورپ کے اندر مطلق العنان بادشاہیاں بھی موجود تھیں، جیسے فرانس اور رُوس۔ دستوری بادشاہیاں بھی تھیں، جیسے برطانیہ اور جمہوریتیں تھیں، جیسے سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ۔ ان اوضاعِ حکومت میں فرق حد درجہ اہم ہیں، لیکن یہ حقیقت چُھپی نہیں رہ سکتی کہ اس وقت کی تمام حکومتیں صرف چند محدود افراد کے مفاد کی نمائندگی کرتی تھیں۔ برطانیہ میں خطاب یافتہ اُمراء، دیہاتی جاگیرداروں اور دولتمند تاجروں نے ووٹ کا حق اور اعلیٰ عہدوں کا حصول عملاً اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسی طرح دولتمند کاروباری آدمیوں کو ولندیزی جمہوریت پر ضبط و نظم حاصل تھا اور نام نہاد مطلق العنان بادشاہوں کے متعلق خداداد حق فرمانروائی کی بناء پر اختیار و اقتدار کا جو تصور پیدا ہوتا ہے، اس سے انھیں بہت کم اختیارات حاصل تھے۔ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ رُوس کا شہنشاہ پیٹرِ اعظم اپنے عہد کا بے پناہ مطلق العنان فرمانروا تھا، لیکن امراء کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی، اگرچہ وہ بالکل بے اثر رہی۔ اس کے کمزور جانشینوں نے اُمراء کو وسیع رعایتیں دے دیں۔ لُوئی چہاردہم نے فرانس کے اُمراء

ل Utrecht

اور مذہبی پیشواؤں کو سلطنت کے معاملات میں لب کشائی کا بہت کم حق دیا تھا، تاہم وہ انھیں مالی اور مجلسی حقوق سے محروم کر دینے کی جرأت نہ کر سکا۔ لوئی کے وفات پاتے ہی اُمراء نے اپنا کھویا ہُوا سیاسی اثر دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ غرض ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یورپ کی تقریباً ہر حکومت میں حکومتِ عدیدہ (جس کے اختیارات کی باگ چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہو) کے خط و خال نمایاں تھے۔

نظامِ قدیم

مؤرخین مغربی یورپ، خصوصاً فرانس کے ان اداروں کو، جن کی عنانِ اقتدار چند افراد کے ہاتھ میں تھی، "نظامِ قدیم" کہتے ہیں۔ یہ اٹھارھویں صدی کا نظامِ قدیم تھا اور ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کے بعد نظامِ جدید وجود پذیر ہُوا۔ نظامِ قدیم بعض اعتبارات سے تمدنِ ازمنۂ وسطیٰ کی قدیم روایات سے ہٹ گیا۔ پہلے ازمنۂ وسطیٰ کے مسیحی مقاصد پیشِ نظر تھے، اُن کی جگہ بڑی حد تک کلاسیکی توازن کے فرانسیسی تصور نے لے لی اور مدبّروں کی وفاداری کا مقدم ترین مرکز مذہب نہ رہا۔ مغربی یورپ میں کسان زرعی غلامی کی زنجیریں بہت پہلے توڑ چکے تھے اور سرمایہ داروں نے نجی دولت جمع کرنے کے اس تعصب پر غلبہ پا لیا تھا، جو ازمنۂ وسطیٰ میں رائج تھا اور حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اگر تیرھویں صدی کے اکابر ——— مثلاً سینٹ لوئس اور سینٹ ٹامس ایکوئناس میں سے کوئی آ کر دیکھتا تو صورتِ حال پر متحیّر رہ جاتا۔

متوقع صورتِ حال

لیکن مشرق، خصوصاً رُوس میں زرعی غلامی تدریجاً زیادہ سخت ہو گئی تھی اور اس کا دائرہ زیادہ پھیل گیا تھا۔ مغربی یورپ کا نظامِ قدیم اکثر بیسویں صدی کے بجائے ازمنۂ وسطیٰ سے قریب تر تھا۔ اٹھارھویں صدی کے اکثر اہلِ یورپ ان دیہات میں رہتے تھے جہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی اور ان کا نقطۂ نگاہ روایتی صوبائی تھا۔ بہت کم لوگ تھے، جن کے دل میں قومیّت کا احساس تھا، یعنی انھیں احساس نہ تھا کہ اُن کا تعلق ایک وسیع جمعیّت سے ہے، جو مقامی حدود سے بالاتر ہے۔ ذات پات کا جاگیردارانہ تصور بدستور نظامِ قدیم میں کارفرما تھا۔ کسانوں، تاجروں اور کاریگروں نے ازمنۂ وسطیٰ کے بعد سے اپنی حالت بہتر بنالی تھی، لیکن ان میں سے اکثریت ایسی تھی، جنھیں کوئی خاص حقوق نہیں ملے تھے۔ صرف دولتمند سرمایہ دار خاندان سیاسیات میں رائے دینے یا پہلے دو طبقوں کے حقوقِ خاص میں شریک ہونے کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ یورپ ہمیشہ سے بڑی حد تک زرعی، صوبائی اعتبار سے نیز بہ لحاظ اقتدار چند افراد تک محدود تھا۔ ۱۷۱۵ء میں معلوم ہو رہا تھا کہ اِس برِاعظم کی یہ حالت غالباً ہمیشہ قائم رہے گی۔

توازنِ قوی کا انجام

مگر نظامِ قدیم ہمیشہ کے لیے قائم نہ رہ سکا۔ اس کی نمائشی استواری سے لوگ دھوکا کھا گئے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں اِس نظام کی بنیادیں انقلابی اقتصادی تغیّرات کے دباؤ سے متزلزل ہونے لگی تھیں۔ ساتھ ہی بڑی ثقافتی اور ذہنی تحریکات کے لیڈروں نے اصلاح کا مطالبہ شروع

کر دیا تھا، جس نے انجام کار ۱۷۸۹ء کے بڑے انقلابِ فرانس کی شکل اختیار کی۔ ان ثقافتی اور ذہنی تحریکات کو "تنویر" کہا جاتا ہے۔ یوٹریکٹ کے صلح نامے سے بین الاقوامی استواری کی جو امید پیدا ہوئی تھی، وہ بھی بے بنیاد ثابت ہُوئی۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ ہسپانوی تخت نشینی کی جنگ میں لُوئی چہار دہم نے جو شکست کھائی، اس سے فرانس و برطانیہ کی عالمگیر رقابت ختم نہ ہوئی اور ۱۷۴۰ء میں دوبارہ جنگ پھوٹ پڑی۔ اس اثنا میں رُوس نیم بے تعلقی کے حلقے سے نکل کر یورپی نظامِ دول میں سرگرم اور اکثر جارحانہ حِصّہ لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ۱۷۱۳ء سے بعد کے عشرے میں پروشیا اوّل درجے کی طاقت بن گیا اور اسے اپنی توسیع کی خاطر یورپ کے اندر جنگِ عام کی آگ بھڑکانے میں بھی قطعاً تامّل نہ تھا۔ غرض جو توازنِ قوی ۱۷۱۳ء میں قائم کیا گیا تھا وہ بُری بھلی طرح صرف ایک پُشت تک قائم رہا، پھر درہم برہم ہو گیا ٭

دُوسرا باب

مغرب میں اقتصادی انقلابات

تین اقتصادی تغیرات

تین بڑے اقتصادی تغیرات —— تجارت میں، زراعت میں اور صنعت وحرفت میں نے نظامِ قدیم کی بنیاد کھوکھلی کرنے اور یورپی توازن کو بدلنے میں مدد دی۔ یہ دراصل اقتصادی انقلابات تھے، جو آہستہ آہستہ رونما ہوئے اور سیاسی انقلابات کے برابر ان میں ڈرامائی شان نہ تھی، لیکن انجامِ کار تاریخِ انسانیت پر ان کا اثر ہر اعتبار سے انقلابی تھا۔ یہ تینوں اٹھارھویں صدی کے اختتام کے بعد بھی جاری رہے اور ہمیں انیسویں صدی کے حالات پر غور کرتے وقت پھر ایک مرتبہ ان کا جائزہ لینا پڑے گا۔

۱۷۱۵ء اور ۱۷۸۹ء کے درمیان تجارتی انقلاب سب سے بڑھ کر پختگی سے کامیاب رہا۔ یہ تقریباً ہر یورپی مُلک میں پہنچا اور اس نے جنگ، سیاسیات اور معاشرے پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے برعکس زرعی اور صنعتی انقلابات بالکل ابتدائی حالت میں تھے، لیکن وہ بڑے صحت مند تھے اور ان کی وجہ سے مزرعوں اور دکانوں میں نئے طور طریقے جاری ہوئے۔ برطانیہ، فرانس اور پروشیا کو ان سے نئی قوت ملی۔

تجارتی انقلاب

تجارتی انقلاب کے بنیادی ادارے ۱۷۱۵ء سے پیشتر نشو و ارتقاء پا چکے تھے۔ بنک اور بیمے کے مرکز دورِ احیاءِ علوم بلکہ اس سے بھی پہلے شروع ہو چکے تھے۔ سندیافتہ تجارتی کمپنیاں سولھویں صدی میں بننے لگی تھیں۔ تجارتی نظریۂ زر اور تجارت کے متعلق حکومت کے مسلک و مشرب کا بنیادی فلسفہ فلپ دوم کے ہسپانیہ اور لوئی چہاردہم نیز کولبرٹ کے فرانس میں عہدِ پختگی پر پہنچا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں تجارت نے رفتہ رفتہ ترقی کی تو تجارتی انقلاب کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ کاروبار اور وسائلِ حمل ونقل کو پہلے سے جو اعانت مل رہی تھی، اس کے طریقے میں بھی اصلاح ہو گئی اور دائرہ بھی پھیل گیا، نیز اعانت کے نئے وسائل مکمل کر لیے گئے۔

تجارت کی مقدار و حجم میں غیر معمولی اضافہ ہُوا تو جہازوں اور ان کے سامان کے لیے بیمے کی طلب میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے لندن میں جو لوگ بیمے کے دلّال تھے، وہ بھی بہت سے دوسرے کاروباری آدمیوں کی طرح قہوہ خانوں میں جمع ہو جاتے اور وہیں کاروبار، وقت کی خبروں اور سیاسیات پر بحثیں کرتے۔ جن لوگوں کو بحری بیمے میں خصوصی ماہر سمجھا جاتا تھا، وہ ایڈورڈ لائڈ کے قہوہ خانے میں جانے لگے، جو لمبارڈ سٹریٹ میں واقع

تھا۔ لائڈ ۱۷۱۳ء میں فوت ہوگیا، تاہم بیمے کے ماہر اسی قہوہ خانے میں جمع ہوتے رہے۔ یوں لندن کے مشہور ایوان لائڈ کی ابتدا ہوئی۔ یہ نام قائم رہا، اگرچہ لائڈ کی فرم قہوہ خانے سے اٹھ کر ۱۷۷۴ء میں رائل ایکسچینج پہنچ گئی، جو زیادہ معزز مقام تھا۔ لائڈز ہی نے بحری بیمے کے لیے پالیسی کی ایک معیاری شکل قائم کی اور وہاں سے ایک فہرست شائع ہوئی، جس کا نام "لائڈز لسٹ"[1] تھا۔ جہازوں کے متعلق یہ پہلا صحیح اور مفصل اطلاع نامہ یا اخبار تھا۔ اس فرم نے ایک حد تک غم افزا شہرت بھی حاصل کی، کیونکہ جب کبھی کسی جہاز کی تباہی کی خبر ملتی تو اس کے اعلان کے لیے لائڈز کی طرف سے جہاز کی گھنٹی بجا دی جاتی۔

قہوہ خانے کی بے تکلف فضا نے لندن میں ایک اور بڑے ادارے کو نشو و نما دی، یعنی سٹاک ایکسچینج کا ادارہ۔ مشترکہ کمپنیوں میں حصّوں کی خرید و فروخت جاری تھی اور تاجر جونتھین[2] کے ہاں جمع ہونے لگے۔ ۱۷۷۳ء میں انھوں نے جونتھین کے قہوہ خانے کا نام بدل کر سٹاک ایکسچینج کا قہوہ خانہ رکھ دیا۔ تیس سال کے بعد قہوہ خانے کے لفظ بھی حذف کر دیے گئے اور کاروباری نام باقی رہ گیا، یعنی سٹاک ایکسچینج۔

اس اثنا میں تجارت کو مدد دینے والی دوسری چیزیں رونما ہو رہی تھیں۔ نقشوں کی اصلاح، روشنی کے میناروں کی تاسیس اور تیرتے ہوئے پہیوں کی ایجاد سے جہازرانی زیادہ محفوظ ہو گئی۔ سمندر میں جہازوں کے کپتان دو نئے آلوں کے ذریعے سے اپنے مقام و محل کا اندازہ کرنے لگے۔ ان میں سے ایک وہ آلہ تھا، جسے زاویہ پیما[3] کہتے تھے، دوسرے کا نام جہازی گھڑی یا وقت پیما[4] تھا۔ زاویہ پیما دوربین ہی سے تیار کیا گیا تھا۔ اس سے دوپہر کے وقت سُورج کے ارتفاع کا اندازہ ہو جاتا اور اس طرح جہاز کے عرض البلد کا پتا چل جاتا۔ جہاز کی رفتار کے باعث عام گھڑیاں غلط ہو جاتی ہیں، لیکن جہازی گھڑی (وقت پیما) ہر حال میں صحیح وقت دیتی ہے۔ اسے گرینچ[5] کے وقت کے مطابق رکھا گیا تھا۔ ان دو نئے آلوں کی مدد سے جہاز کے طول البلد کا بھی اندازہ ہو جاتا، جو گرینچ کے وقت اور جہاز کے مقامی وقت کے درمیان فرق واضح کر دیتا۔

خشکی پر آمد و رفت اور حمل و نقل کے وسائل میں اصلاح کی رفتار بہت سست تھی۔ سمندر میں یہ اصلاحات جلد جاری ہو گئیں۔ اگر فرانس کی اچھی شاہراہوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو یورپ کی سڑکیں محض عام پگ ڈنڈیاں تھیں یا ایسے راستے، جن میں گاڑیاں چلنے کے نشانات موجود تھے۔ اس وجہ سے خشکی پر سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا سلسلہ

---

[1] Lloyd's List   [2] Jonathan   [3] Sex Tant   [4] Chronometer

[5] Greenwich یہاں انگلستان کی شاہی رصد گاہ ہے، جو ۱۶۷۵ء میں قائم کی گئی تھی۔ یہیں سے معیاری وقت معلوم ہوتا ہے۔

۱۷۵۰ء سے بعد تک بھی بہت سست، غیر محفوظ اور گراں خرچ رہا، یہاں تک کہ جا بجا روک تھام کے لیے پھاٹک بن گئے اور نہریں جاری ہوگئیں۔ ان سے حالت کسی قدر بہتر ہوئی۔ انگلستان میں سب سے پہلی نہر وہ تھی جو برج واٹر کے ڈیوک نے ۱۷۵۹ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان نکالی تھی۔ اس نہر کے راستے اُن کانوں سے، جو ڈیوک کی جاگیرات میں تھیں، کوئلہ کارخانوں کے نئے شہر مانچسٹر پہنچنے لگا اور اس کا خرچ آدھا رہ گیا۔ پھر ڈیوک نے اس نہر کو مانچسٹر سے لورپول کی بندرگاہ تک پہنچا دیا اور دوسری نہریں کھُدنے لگیں۔ وسائل حمل و نقل میں انقلاب کی یہ ابتدا تھی، یہاں تک کہ ۱۸۰۰ء کے بعد بڑی بڑی شاہراہیں اور ریل کی سڑکیں تیار ہونے لگیں۔

کاروباری آدمیوں کے لیے کئی رکاوٹیں تھیں مثلاً گلڈ کے قواعد و ضوابط میں کئی پابندیاں موجود تھیں۔ پھر مقامی باٹوں اور پیمانوں کی کثرت، سکّوں کے اختلاف اور جا بجا محصولوں نے انھیں بہت پریشان کر رکھا تھا۔ مثلاً سویڈن میں ہر درجے کے سکّے کے لیے تانبا استعمال ہوتا تھا اور ان میں سے ایک سکّے کا وزن تینتالیس پونڈ تھا۔ بیڈن[1] جرمنی کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی، وہاں ماپ کے ایک سو بارہ مختلف پیمانے رائج تھے۔ اسی طرح خشک چیزوں کے پینسٹھ، مائعات کے ایک سو تیئیس اور غلّوں کے ایک سو تریسٹھ پیمانے رائج تھے۔ پونڈ وزن کرنے کے اسّی مختلف پیمانوں کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک جرمن تاجر نے دریائے ایلب کے راستے ڈریسڈن سے، جو سیکسنی میں ہے، ہیمبرگ تک لکڑی لے جانے کا ٹھیکہ دیا۔ اسے راستے کے قصبوں اور ریاستوں کو اتنے محصول دینے پڑے کہ ساٹھ شہتیروں میں سے، جو ڈریسڈن سے روانہ کیے گئے تھے، صرف چھ ہیمبرگ پہنچ سکے۔ اتنے فاصلے میں کشتی کے ذریعے سے سفر بیش از بیش ایک ہفتہ لیتا، لیکن مختلف مقامات پر ٹھہر ٹھہر کر محاصل ادا کرنے کے باعث ایک مہینا صرف ہو جاتا تھا۔ فرانس میں بھی جا بجا داخلی تجارت کے لیے رکاوٹیں موجود تھیں، حالانکہ لوئی چہاردہم چاہتا تھا کہ تمام چیزیں ایک نوعیت کی ہوں اور تمام اختیارات مرکز کے ہاتھ میں رہیں۔ مقامی فرانسیسی محاصل اتنے زیادہ اور پُرپیچ تھے کہ ایک ماہرِ مالیات فرانسیسی کو اعلان کرنا پڑا: "ایک پشت میں سے شاید ایک دو آدمی ایسے نکلیں، جنھیں ان محاصل کے متعلق پُورا علم ہو۔"

اقتصادی اصلاح کے داعیوں نے ۱۷۸۹ء سے پیشتر ہی ان خرابیوں پر نکتہ چینی شروع کی، لیکن انھیں کبھی کبھار ہی کامیابی حاصل ہوتی۔ بہرحال وہ روپے کو معیاری بنانے میں ضرور کامیاب ہُوئے۔ یہ بڑا اہم مسئلہ تھا۔ حکومت کی حالت یہ تھی کہ اگر وہ گلڈوں کے مفاد سے تعرض کرتی یا محاصل کے مقامی افسروں سے کچھ کہتی تو خود اُس کی خوش حالی پر بُرا اثر پڑتا۔ انگلستان مُدت سے ایک متحدہ قومی مملکت بن چکا تھا۔ اقتصادی مغائرت ختم ہو رہی

---

[1] Baden

تھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ اس کے برعکس جرمنی میں پھوٹ کا بازار گرم تھا اور تجارت سرد پڑ گئی تھی۔ صرف چند تاجر ایسے تھے، جو بیڈن کے باٹوں اور پیمانوں کا صحیح حساب سمجھ سکتے یا ایلب کے راستے لکڑی لانے کی کوشش کے لیے تیار ہوتے۔

جن لوگوں کے خاص اقتصادی مفاد تھے، وہ اٹھارھویں صدی میں ان سے بدستور مستفید رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارتی نظریۂ زر رکھنے والی مملکتوں کا اقتدار بہت محدود تھا۔ تجارتی نظریۂ زر کا تقاضا یہ تھا کہ تجارت مقامی سطح سے اُٹھ کر قومی سطح پر پہنچتی اور باقاعدگی اختیار کر لیتی، لیکن اٹھارھویں صدی کی کسی بھی حکومت کے پاس اتنے کارکن موجود نہ تھے، جو قومی ضوابط کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری تھے۔ مملکتوں کو اپنے کاروبار میں زیادہ تر انحصار نجی کمپنیوں اور افراد پر رکھنا پڑا۔ انگلستان بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ چنانچہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی مستعمرات پر عملاً کامل اختیارات حاصل تھے۔ موجد بہ طور خود محنت کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ حکومت کی طرف سے تجربہ گاہوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وقتاً فوقتاً کاروباری گروہوں کے دباؤ کے ماتحت حکومتوں کی طرف سے کسی اہم مقابلے میں انعامات کا اعلان کیا جاتا۔ انگلستان کی پارلیمنٹ نے بیس ہزار پونڈ کا انعام اُس شخص یا گروہ کو دینے کا اعلان کیا، جو اوقیانوس سے مشرقِ بعید تک شمالی و مغربی راستہ دریافت کر سکے۔ اسی طرح مزید بیس ہزار پونڈ کا انعام صحیح بحری گھڑی کی ایجاد کے لیے رکھا گیا۔ جس شخص نے بحری گھڑی ایجاد کی، اُسے اپنا انعام وصول کرنے میں پچیس سال صرف ہو گئے۔

مسسی سپی اور جنوبی سمندر کے بے سروپا منصوبے

نجی منچلے پن اور سرکاری تغافل کا فرقِ بہتر طریق پر سٹے بازی کے ان دو منصوبوں میں نمایاں ہوتا ہے، جو اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جاری ہوئے۔ ایک مسسی سپی کا بے سروپا منصوبہ، جس کا تعلق فرانس سے تھا، دوسرا جنوبی سمندر کا بے سروپا منصوبہ، جو انگلستان سے متعلق تھا۔ ۱۷۵۰ء میں یورپ کی کوئی بھی حکومت بڑے قرضوں کا انتظام نہیں کر سکتی تھی، جو جنگوں کے دوران میں بہت بڑھ گئے تھے، لیکن ہر حکومت کو ضرورت تھی کہ تمسکات اور دوسرے قرضوں پر سُود کی جو بہت بڑی رقمیں سالانہ ادا کرنی پڑتی تھیں، ان کا کوئی نہ کوئی انتظام سوچے یا دیوالیہ ہو جائے۔ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں نے تجربے کا راستہ اختیار کیا یعنی سرکاری قرضے کا انتظام مشترکہ کمپنیوں کے حوالے کر دیا اور انھیں تجارتی رعایتیں دے دیں۔ امید تھی کہ ان کمپنیوں کی تجارت میں بے حد نفع ہوگا اور اس نفع میں سے سرکاری تمسکات کا سُود ضرور ادا کیا جا سکے گا۔

جان لا[1] (۱۶۷۱ء۔۱۷۲۹ء) سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ ریاضیات میں اسے ساحر مانا جاتا تھا۔ فرانس کے تجربے کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں رہی۔ اس نے ڈوئیل[2] میں فریقِ مخالف کو مار دیا، اس لیے وہ برطانیہ سے

---

[1] John law

[2] Duel — یورپ میں دستور تھا کہ دو آدمی کسی معاملے پر اختلاف کرتے تو ایک دوسرے کو لڑائی کی دعوت دیتے، اس مبارزۂ شخصی کو ڈوئیل کہا جاتا تھا۔

جلاوطن ہُوا۔ فرانس پہنچ کر اُس نے قمار بازی سے بے اندازہ دولت جمع کر لی اور عظیم القدر لوگوں سے دوستی کے رشتے پیدا کر لیے۔ ان میں سے ایک اورلیانز[1] کا ڈیوک بھی تھا۔ لا نے مسائلِ زر اور بانک داری[2] کے طور طریقوں کا بھی مطالعہ کیا، خصوصاً ایمسٹرڈم میں، جو ان دنوں مالی اعتبار سے یورپ کا مرکز مانا جاتا تھا۔ لا تجارتی نظریۂ زر کا قائل تھا، مگر تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔ وہ اِس اصول سے متفق تھا کہ مملکتی قوّت کا انحصار اس روپے پر ہے، جو اس کے قبضے میں ہو، لیکن وہ کہتا تھا کہ سونے چاندی کے سکّے لازماً روپے کی مطلوب شکل نہیں۔ ان قیمتی دھاتوں کی رسد محدود ہے، اِس لیے ملک میں نقد روپے کی مقدار رائج کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاروبار کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ کاغذی سکّے جاری کیے جائیں اور قوم کی زرعی و تجارتی دولت ان سکّوں کی پشتیبان ہو۔ کاغذی سکّوں کی مقدار کاروبار کی ضروریات کے مطابق بڑھائی گھٹائی جا سکتی ہے۔ اس طرح تجارتی کمپنیوں کو ایسا فروغ حاصل ہوگا، جو پہلے انھیں کبھی نصیب نہیں ہُوا اور پُورا ملک ترقی کرے گا۔ جب خوشحالی عام ہو جائے گی تو حکومت کے قرضے بھی بیباق ہو جائیں گے۔

۱۷۱۵ء سے پیشتر لا نے اپنے مجوزہ نظام سے کام لینے کی کئی مرتبہ ناکام کوشش کی۔ جب لُوئی چہاردہم فوت ہُوا تو اسے وہ موقع مل گیا، جس کا مدّت سے منتظر تھا۔ اورلیانز کا ڈیوک قمار بازی میں اُس کا گہرا دوست تھا۔ اُسے فرانس کا نائب السلطنت بنا دیا گیا (۱۷۱۵ء-۱۷۲۳ء) اس نے لا کو پیرس میں ایک مرکزی بینک قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ فرانسیسی سکّے کی قیمت رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی، کیونکہ حکومت خود اسے مسلسل گھٹاتی چلی جا رہی تھی۔ لا نے جو بینک قائم کیا تھا، اس نے ایمسٹرڈم کے بینک کی پیروی شروع کر دی اور کاغذی سکّے جاری کر دیے۔ اس سے فوراً کاروبار کی گرم بازاری شروع ہو گئی۔ پھر لا نے مسس سپی کمپنی قائم کی، جسے لُوئی سی آنا میں تجارت کا اجارہ مل گیا۔ چنانچہ جلد ہی اس کمپنی نے دوسری فرانسیسی نو آبادیاتی تجارتی کمپنیاں اپنے اندر جذب کر لیں۔

اب لا کا نظام فرانسیسی اقتصادیات کے تقریباً ہر گوشے میں پہنچ چکا تھا۔ اسے فرانس کا کنٹرولر جنرل (محاسب اعلیٰ) بنا دیا گیا اور وہ پوری مملکت کا اقتصادی ڈکٹیٹر بن گیا۔ اس کی کمپنی نے سرکاری قرضے سنبھال لیے اور وہ تیار ہو گیا کہ سرکاری تمسکات مسس سپی کمپنی کے حصّوں کی جزوی ادائی میں قبول کر لیے جائیں۔ جن لوگوں کے پاس سرکاری تمسکات تھے، انھوں نے لا کی پیش کش کا پُرجوش خیر مقدم کیا، کیونکہ حکومت کا کاروبار گرا ہُوا تھا، اس وجہ سے تمسکات کی قیمت میں بیس فی صد کمی واقع ہو گئی تھی؛ لیکن کمپنی کا وسیع کاروبار جاری رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ لا اس کے مزید حصّے فروخت کرے، تاکہ ضروریات کے مطابق روپیہ مل جائے۔ نقد روپیہ دے کر حصّے خرید لینے والوں کو

---

[1] فرانس کا مشہور قصبہ Orleans
[2] Banking

اپنی طرف کھینچنے کے لیے اس نے کمپنی کے متعلق توقعات کا نہایت دلآویز نقشہ تیار کر دیا، یعنی خود مسس سپی کمپنی کے کاروبار میں گرم بازاری پیدا کی۔ کم یا زیادہ روپیہ لگانے والے لوگ گرم جوشی سے کمپنی میں شریک ہوئے اور کیفیت وہی تھی، جیسی بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں وال سٹریٹ کے اندر پیدا ہوتی تھی۔ غرض ۱۷۱۹ء کے اختتام پر مسس سپی کمپنی کا ہر حصہ چالیس گنا قیمت پر فروخت ہو رہا تھا۔

مگر یہ بلبلا جلد ہی پھٹ گیا، کیونکہ لا کے جاری کردہ کاغذی سکے نقد رقوم کے مطالبے کا ساتھ نہ دے سکے۔ حقیقت میں نقد روپے کے مطالبے بہت کم تھے، کیونکہ کاغذی سکوں کو وسیع اعتماد حاصل ہو چکا تھا، لیکن مسس سپی[1] کمپنی کے حصوں کی قیمت برابر بڑھتی گئی تو سرمایہ لگانے والوں میں سے محتاط آدمیوں کو یقین ہو گیا کہ یہ گرمیِ بازار زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انھوں نے نقد رقم کے حصول کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے اپنے حصے فروخت کر دیے اور قیمت میں نوٹ انھیں مل گئے۔ انھوں نے نوٹ لا کے بینک میں پیش کر کے نقد روپیہ لے لینا چاہا۔ بینک میں سونے چاندی کے جتنے بھی ذخیرے تھے، ختم ہو گئے۔ فروری ۱۷۲۰ء میں نقد رقموں کی ادائی روک دی۔ لا کو مجبوراً مئی ۱۷۲۰ء میں کنٹرولر جنرل کا عہدہ چھوڑنا پڑا اور وہ فرانس سے بھاگ گیا۔

مسس سپی کے بے سروپا منصوبے کی ناکامی کا اثر بین الاقوامی تھا۔ لا کے استعفے سے چند ہفتے بعد لندن میں جنوبی سمندر کا بے سروپا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ امید تھی کہ حکومتِ انگلستان کے قرضے کا انتظام بینک آف انگلینڈ کے حوالے ہوگا۔ اس بینک کی بنیاد ایک نجی ادارے کی حیثیت سے ۱۶۹۴ء میں پڑی تھی (اسے دوسری عالمی جنگ کے بعد قومی بنا لیا گیا)۔ اس نے مستقل نوٹ جاری کر کے قومی اقتصادیات میں محفوظ مقام حاصل کر لیا تھا اور لوئی چہاردہم کے خلاف آخری دو جنگوں میں بہت سی قیمتی خدمات انجام دی تھیں، لیکن قرض کا بار بینک نے نہیں، ساؤتھ سی[2] کمپنی (جنوبی سمندر کی کمپنی) نے سنبھال لیا، جس نے حکومت کو چھتر لاکھ پونڈ کی گراں قدر رقم ادا کر دی۔ اس کمپنی کے وسائل زیادہ نہ تھے اور یہ وسائل زیادہ تر تجارتی مراعات سے فائدہ اٹھانے پر موقوف تھے، جو برطانیہ نے ہسپانوی تخت نشینی کی جنگ کے اختتام پر اسی انٹو[3] کی مفاہمت کے تحت حاصل کی تھیں۔ ان حقوق کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ ہسپانیہ کی امریکی نوآبادیوں میں ہر سال چار ہزار آٹھ سو غلام پہنچائے جائیں اور عام تجارت کے لیے ہر سال صرف ایک جہاز پانامہ بھیجا جائے۔

ساؤتھ سی کمپنی نے بھی مسس سپی کمپنی کی طرح سرکاری قرض خواہوں کو دعوت دی کہ وہ اپنے تمسکات کمپنی کے حوالے کر دیں۔ حصوں کی قیمت بڑھانے اور نیا سرمایہ حاصل کرنے کے لیے کمپنی کے ڈائرکٹروں نے بعض عجیب و غریب

---

۱ Mississippi Companh ۲ South Sea Company ۳ Asiento یہ ہسپانوی لفظ ہے جس کے معنی ہیں معاہدہ۔ جیسا کہ مصنف نے خود واضح کر دیا ہے۔ انگریزوں کو ہر سال چار ہزار آٹھ سو حبشی غلام امریکہ پہنچانے کا حق دیا گیا تھا اور یہ حق طویل مدت کے لیے طے ہو گیا تھا، مگر حالات ایسے پیش آئے کہ زیادہ عرصے تک یہ معاہدہ جاری نہ رہ سکا۔

تدبیریں اختیار کیں۔ وہ حصّوں کی خفیہ خرید و فروخت سے گرمیِ بازار پیدا کرتے رہے اور خریداروں کو دعوت دیتے رہے کہ صرف دس فی صد نقد رقم دے کر حصّے خرید لیں۔ ساتھ ہی جھوٹی رودادیں شائع کرتے رہے کہ کمپنی کے جہاز بہت سا سامان لے کر آرہے ہیں، جس سے غیر معمولی نفع حاصل ہوگا۔

تھوڑی ہی مُدّت میں یہ بُلبلا بھی اپنی ترقی کا دور پورا کر کے تنزل کی طرف لوٹا اور پھُوٹ گیا۔ اس کمپنی کے ایک حصّے کی قیمت ایک سَو پونڈ تھی۔ جنوری ۱۷۲۰ء میں یہ ایک سَو اُنتیس پونڈ پر فروخت ہوتا تھا۔ جون میں اس کی قیمت ایک ہزار پچاس پونڈ پر پہنچ گئی۔ درجنوں دوسرے لوگ برسرِکار آگئے اور انھوں نے نئی کمپنیوں کی بنیاد رکھ دی۔ وہ عجیب و غریب منصوبوں کے اشتہار دیتے تھے، مثلاً ایسے پہیّے، جو ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں، نمکین پانی کو میٹھا بنانے کے طریقے، ایسی توپیں، جن سے مربّع گولے پھینکے جائیں گے۔ بعض بے شمار فوائد کا اعلان کر دیتے، مگر کسی کو نہ بتاتے کہ فوائد کی نوعیّت کیا ہے۔ بعض کے دعوے یہ تھے کہ سونے کی اینٹیں بنائی جائیں گی یا تانبے کو سونے کی شکل دے دی جائے گی۔ سرمایہ لگانے والے عوام کی خوش فہمی اور حسنِ اعتقاد کے بارے میں کیا کہا جائے، معلوم ہوتا ہے، یہ لاانتہا تھا۔ اگست ۱۷۲۰ء میں اس کمپنی کے حصّوں کی قیمت گھٹ کر آٹھ سَو اسّی پونڈ اور ستمبر میں صرف ڈیڑھ سَو پونڈ رہ گئی۔ اس پر پارلیمنٹ نے کمپنی کے معاملات کی چھان بین کا حکم دے دیا تاکہ حصّہ داروں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے اور ڈائرکٹروں کے املاک پر قبضہ کر لیا۔ ڈائرکٹروں نے کمپنی کی کتابیں جلا دیں اور عجلت کے ساتھ انگلستان چھوڑ کر نکل گئے۔

بے سروپا منصوبوں کے نتائج ان دو بے سروپا منصوبوں کی ناکامی سے بعض افسوسناک نتیجے پیدا ہوئے۔ مسِس سپی کے منصوبے کی ناکامی نے فرانس کی مالی حالت میں اور خرابیاں پیدا کر دیں۔ جان لا اس سلسلے میں تباہ ہو گیا۔ حالانکہ اس کی صلاحیتوں سے زیادہ دانشمندانہ طریق پر کام لیا جاتا تو حکومتِ فرانس جس مالی فالج کا شکار ہوتی چلی جا رہی تھی، اسے روکا جا سکتا تھا۔ انگلستان میں ساؤتھ سی منصوبے کی ناکامی کے باعث مُدّت تک نئی کمپنیاں ہی نہ بن سکیں، کیونکہ ان کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے میں بڑا روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ نیز اس سے بعض بلند پایہ اصحاب کی شہرت داغ دار ہو گئی۔ خود شاہ جارج اوّل اور اس کی داشتہ بھی نچلی سطح پر آگئے، کیونکہ انھوں نے اس منصوبے کی پُرجوش حمایت کی تھی۔ پارلیمنٹ کے تقریباً ایک سَو ممبروں نے کمپنی سے روپیہ قرض لے کر حصّے خرید لیے تھے اور ان کی رقمیں بالاقساط ادا کر رہے تھے۔ جن لوگوں کے پاس سرکاری تمسّکات تھے انھیں ڈائرکٹروں کی جائدادیں ضبط کرنے کے بعد صرف رقم مل سکی۔

تاہم یہ منصوبے محض بدقسمتی ہی کا باعث نہ تھے، وہ بہرحال یورپی اقتصادیات کی نشوونما کے سلسلے میں طبعی زحمتوں کا سامان تھے۔ ان سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ مملکتیں نئے اور حیران کُن مالی مسائل کے حل دریافت کرنے

میں لگی ہوئی ہیں۔ والٹیئر نے بعد میں اعلان کیا تھا کہ جان لا کے خیالی نظام سے حقیقی تجارت پیدا ہوئی اور قوم بہ حیثیتِ مجموعی زیادہ خوش حال ہو گئی۔ بہر حال اس تجربے کے باعث فرانسیسیوں کا کاروبار از سرِ نو اُس تعطّل سے باہر نکل آیا، جو لوئی چہار دہم کی شکستوں نے اس پر طاری کر دیا تھا۔ مسسی سپی کمپنی کو ۱۷۲۰ء کے بعد از سرِ نو منظم کیا گیا اور اسے کاروبار میں خاصا منافع ہُوا۔

انگلستان میں ساؤتھ سی کمپنی کے منصوبے کی ناکامی سے مستحکم اداروں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی بدستور سالانہ پانچ فی صد سے دس فی صد تک منافع تقسیم کرتی رہی۔ بینک آو انگلینڈ کو حکومت کی نظروں میں خاص درجہ حاصل کرنے کے لیے کوئی مقابلہ درپیش نہ تھا، کیونکہ ساؤتھ سی کمپنی ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ بینک سلطنت کا سب سے بڑا مالی سہارا بن گیا۔ کمپنی کی ناکامی کے باعث جو ہنگامہ بپا ہُوا، اس میں رابرٹ والپول[1] برسرِ اقتدار آ گیا، جس کا پروگرام یہ تھا کہ تمام قرضوں کو قومی قرضے قرار دے کر ادا کرے۔ یہ ایک نیا تصور تھا اور وقت کے مالی اخلاقیات کی جانب خاصا بڑا اقدام تھا، جو ایسے وقت میں کیا گیا، جب اکثر دوسری مملکتیں قرضوں کو بادشاہ کے ذاتی واجبات قرار دیتی تھیں اور مسلک یہ تھا کہ بادشاہ انھیں قبول کرے یا رد کرے، فیصلے کا مجاز وہی ہے۔

بڑے بڑے مالکان اراضی کی اصلاحات

زرعی انقلاب کو تغیرات کے بڑے سلسلے میں دوسرا درجہ حاصل تھا، جس سے موجودہ دنیا کے اقتصادیات نے نئی شکل اختیار کی۔ اس انقلاب کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اصلاحات کے ذریعے سے کسانوں کی کم تعداد زیادہ فصلیں پیدا کرنے کے قابل ہو جائے۔ ہمارے زمانے میں اصلاحات زیادہ تر فن اور سائنس کی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ کسان مشینری استعمال کرتے ہیں، ساتھ ہی کیمیائی اور حیاتیاتی چھان بین کا سلسلہ جاری ہے۔ عمدہ کھادیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مویشی سے سیب کے پیڑ تک بہتر سے بہتر بیج اور طریقِ تربیت سے کام لیا جاتا ہے۔ سائنس نے جو دریافتیں کیں، ان سے زراعت میں فائدہ اٹھانا کوئی نئی بات نہیں، یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری ہے، جب مصرِ قدیم نے آبیاری کے لیے کھال تیار کیے تھے اور اصلاح یافتہ ہل ایجاد ہُوئے تھے، نیز ازمنۂ وسطیٰ میں کھیتی باڑی کے لیے گھوڑوں سے کام لیا جانے لگا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں کھیتی باڑی کے طور طریقوں کی پیشبرد اتنی تیز ہو گئی کہ اس نے تقریباً انقلابی اقدامات کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس تحریک کے علمدار انگلستان کے وہ مالکانِ اراضی تھے، جو اصلاح یافتہ طریقوں سے کام لینے لگے، خصوصاً جیتھرو ٹل[2] ورنیکونٹ ٹاؤنشینڈ[3]، رابرٹ بیکویل[4] اور آرتھر ینگ[5]۔

---

[1] Robert Walpole — [2] Jethro tull — [3] Townshend

[4] Bakewell — [5] Arthur Young

جیتھرو ٹل (۱۶۷۴ء - ۱۷۴۱ء) نے فرانسیسی باغوں اور تاکستانوں کے مشقت خیز طریقے کا مطالعہ کیا۔ فرانسیسی باغبان چھوٹے چھوٹے قطعات سے اس لیے زیادہ پھل حاصل کرلیتے تھے کہ وہ پیڑوں کے بیج الگ الگ لگاتے تھے۔ پھر ہر پیڑ اور انگور کی ہر بیل کے اردگرد کی زمین کھرپے اور بیلچے کے ذریعے سے نرم رکھتے تھے اور نلائی کرتے رہتے تھے۔ ٹل نے فرانسیسیوں کا یہ طریقہ انگلستان کے بدرجہا بڑے بڑے غلّے کے کھیتوں میں استعمال کیا۔ پہلے عموماً بیج کو کھیت میں یونہی بکھیر دیا جاتا تھا۔ ٹل نے گھوڑوں کے ذریعے سے ہل چلا کر بیج باقاعدہ قطاروں میں لگانا شروع کیا اور نلائی کے لیے بھی گھوڑوں سے کام لیتا تھا۔ فصل کی پیداوار نے اس کے نئے طریقوں کو حق بہ جانب ثابت کردیا۔

وائیکونٹ ٹاؤنشینڈ (۱۶۷۴ء - ۱۷۳۸ء) کی جائداد نارفوک[ل] میں تھی۔ اس نے ہالینڈ سے دو قیمتی فصلوں کے بیج منگوائے اور ان کا تجربہ شروع کردیا۔ ان میں سے ایک شلجم کے بیج تھے، دوسرے تپتیا گھاس کے بیج۔ پھر اس نے شلجموں کا خاصا بڑا ذخیرہ فراہم کرلیا اور اس وقت تک مویشی کو یہی چارہ کھلاتا رہا، جب تک موسم بہار نہ آگیا اور چراگاہوں میں گھاس از سرِ نو نہ اگ آئی۔ عام طریقہ یہ تھا کہ موسم سرما میں مویشی کا ایک حصّہ ذبح کرلیا جاتا۔ ٹاؤنشینڈ نے اس طریقے سے انتہائی حد تک اجتناب کیا۔ تپتیا گھاس سے نائٹروجن زمین کے اندر محفوظ ہوگئی اور زرخیزی بڑھ گئی۔

پہلے ہر تین سال کے بعد زمین کو ایک سال کے لیے ناکاشتہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ اس میں قوت پیدا ہوجائے۔ ٹاؤنشینڈ نے جو طریقہ اختیار کیا، اس کے بعد زمین کو خالی چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہ رہی اور اس میں بڑا نقصان ہوتا تھا۔ ٹاؤنشینڈ نے فصلیں بدل بدل کر بونے کا سلسلہ شروع کیا۔ مثلاً شلجم، جَو، تپتیا گھاس اور گندم وہ یکے بعد دیگرے بوتا رہتا۔ یہی سلسلہ اکثر انگریزی جاگیرات میں رائج ہوگیا۔

رابرٹ بیکویل (۱۷۲۵ء - ۱۷۹۵ء) نے مویشی کی پرورش کے لیے سائنٹیفک اصول سے کام لیا۔ اس سے پیشتر زیادہ تر مویشی دُبلے پتلے رہتے تھے اور سخت ہونے کے باعث ان کا گوشت بھی لذیذ نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف اس قابل تھے کہ ان سے خاص کام لے لیا جائے یا وہ کھاد مہیا کرسکیں یا ان کے چمڑے اور اُون فروخت ہوسکیں۔ بیکویل نے بڑی احتیاط سے اچھی نسل کی بھیڑیں پالیں اور ان کی اُون عام بھیڑوں سے دُگنا ہوگیا اور وہ ایسے برے اور گوشت منڈیوں میں بھیجنے لگا، جو حقیقت میں اعلیٰ تھا اور اسے کھانے کو بھی جی چاہتا۔ اگرچہ نکتہ چینوں نے یہ شکایت کی کہ بیکویل جو گوشت مہیا کرتا ہے، اس کی قیمت بہت زیادہ ہے اور اس میں چکناہٹ زیادہ ہوتی ہے، تاہم اس کے اختیار کیے ہوئے طور طریقے ہر جگہ رائج ہوگئے۔

[ل] Norfolk

آرتھر ینگ (۱۷۴۱ء - ۱۸۲۰ء) نئے طریقِ زراعت کا بہت بڑا ناشر بن گیا۔ اسے سیر و سیاحت، مشاہدے اور دیکھی ہوئی چیزوں کے بیان میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اس نے برطانیہ اور برِّ اعظم یورپ کے خاص زرعی خطّوں میں منظّم سفر شروع کر دیے۔ ۱۷۶۰ء کے اواخر اور ۱۷۷۰ء کے اوائل تک پانچ سال میں اس نے زرعی معمولات اور اقتصادی مسائل کے متعلق ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع کر دیں۔ ٹُل اور ٹاؤنشینڈ نے جو نئے طریقے اختیار کیے تھے، انھیں رواجِ عام دینے کے لیے ینگ نے بڑی دلآویز دلیلیں پیش کیں اور عوام کو وہ دلیلیں اتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ جارج واشنگٹن، لافے یٹ[ل] اور ملکہ کیتھرائن نے اس سے خط و کتابت کی۔ جارج سوم شاہ انگلستان اور نپولین نے بھی اس کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔

زرعی انقلاب کا پھیلاؤ

۱۷۸۹ء سے پیشتر زرعی انقلاب کی ترقی بڑی غیر متوازن تھی۔ صرف وہی کسان اس کے حامی بن سکے، جو زیادہ منچلے تھے اور صرف چند ملکوں میں اسے قدم جمانے کا موقع مل سکا۔ برِّ اعظم میں پروشیا نے اس سلسلے میں سبقت کی۔ شاہ فریڈرک اعظم نے اپنی رعایا کو ہدایت کر دی کہ مویشی کی پرورش نئے اصول پر کریں۔ چارہ پیدا کرنے پر خاص توجّہ رکھیں۔ فصلیں بدل بدل کر بوئیں اور ان تمام امور میں انگلستان کے ترقی یافتہ طریقوں پر عمل کریں۔ زراعت کے نئے طریقے برطانیہ کے صرف ان لوگوں نے قبول کیے، جن کے پاس وسیع جاگیریں تھیں۔ جارج سوم کو ان میں علمدار کا درجہ حاصل تھا۔ اسی وجہ سے اُسے "کسان جارج" کا لقب ملا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں ہر حلقہ جزواً خود کفیل تھا۔ دورِ حاضر میں ضرورت پیش آگئی تھی کہ سرمایہ دارانہ طریق پر خاص فصلیں فروخت کے لیے پیدا کی جائیں۔ اس ارتقاء میں زرعی انقلاب کو ایک اہم مرحلے کی حیثیت حاصل تھی۔ اٹھارھویں صدی میں اصلاح دوست مالکانِ اراضی نے جن طور طریقوں کی طرف توجّہ کی، ان کی حیثیت سرمایہ دارانہ تھی، کیونکہ ان میں بڑی بڑی رقمیں لگائے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بڑے بڑے روایتی کھیت حلقہ جاتی معمولات سے فارغ ہو جائیں۔ مثلاً ہر کسان کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مہیّا کرنے کا سلسلہ جاری نہ رہے، مگر اکثر انگریزی دیہات کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے اردگرد کسانوں کے مشترکہ کھیت تھے، جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کے حوالے کیے گئے تھے۔ لہٰذا اصلاح دوست مالکانِ اراضی نے مطالبہ کیا کہ ان مشترکہ کھیتوں کے اردگرد جنگلے لگا دیے جائیں اور ہر نجی مالک کی زمین الگ الگ ہو جائے۔

ٹیوڈر حکمرانوں کے زمانے میں جنگلے لگانے کی تحریک کا مدّعا یہ تھا کہ بھیڑ بکریوں کے لیے نجی چراگاہوں کا سلسلہ

ل Lafayette

وسیع ہو جائے۔ نئی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مالکان اراضی کو درخت لگانے اور فصلیں پیدا کرنے کے لیے زیادہ زمین مل جائے۔ اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے اور انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں جنگلے لگانے کا سلسلہ کمال پر پہنچ گیا اور پارلیمنٹ کو الگ جنگلوں کے متعلق ایک قانون منظور کرنا پڑا، جس کا تعلق لاکھوں ایکڑ زمین سے تھا۔ اسی زمانے میں برطانوی دیہات کے وسیع کھیتوں کے اردگرد باڑیں لگ گئیں۔

مجلسی بہبود کے نقطۂ نگاہ سے جنگلے اور باڑیں ناخوش گوار نتائج کا باعث ہوئیں۔ اٹھارھویں صدی کے انگلستان میں بھی قدیم یونان و روما کی طرح بڑی بڑی جاگیروں کے ارتقاء نے جنھیں سرمایہ داری کے اصول پر چلایا جا رہا تھا، چھوٹے کسانوں کو تباہ کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے کسان جنگلے لگا ہی نہیں سکتے تھے، نہ آلات خرید سکتے تھے اور نہ بڑے بڑے کھیت بنا سکتے تھے، گویا وہ اصلاح زراعت کے سلسلے میں کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اس قاعدے نے بعض چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کو مجبور کر دیا کہ وہ بڑی بڑی زمینداریوں میں اجرت پر کام کرنے لگیں۔ دوسرے قصبوں میں پہنچ گئے تاکہ انھیں کوئی کام مل جائے۔

زرعی پیداوار کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جنگلے اور باڑیں لگانے کا سلسلہ ایک اچھا اقدام تھا۔ اس سے بڑے بڑے کھیت پیدا ہوئے، جن میں قطار در قطار بیج بوئے جا سکتے تھے۔ گھوڑوں کے ذریعے سے ہل چلائے جا سکتے تھے اور بدل بدل کر فصلیں بوئی جا سکتی تھیں۔ اس وقت تک برطانیہ کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے غذائی جنسیں مہیا کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ مزید برآں کھیتوں کی پیداوار بڑھ گئی اور مزدوروں کا ایک حصّہ کھیتوں سے باہر کام کرنے کے لیے آزاد ہو گیا۔ گویا زرعی انقلاب صنعتی انقلاب کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ اس کی برکت سے صنعتی قصبوں کے لیے ضرورت کے مطابق غذا اور آدمی مہیا ہونے لگے۔

صنعتی انقلاب کی ابتدا

صنعتی انقلاب کو کارخانوں کے لیے خام مال، مصنوعات کے لیے منڈیاں، کارخانے تعمیر کرنے اور مشینیں لگانے کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ خام مال اور منڈیوں کا مسئلہ سمندر پار کی نو آبادیوں نے جزواً حل کر دیا اور سرمایہ جزواً تاجروں سے مل گیا۔ یوں تجارتی انقلاب نے بھی صنعتی انقلاب کو تقویت پہنچائی، لیکن ان دونوں کے تعامل پر مفصل بحث آگے چل کر آئے گی، جب انیسویں صدی کی صنعت اور سامراج پر بحث ہوگی۔ یہاں ہم صرف ان امور پر زور دیں گے، جنھیں بڑے صنعتی تغیر کے مبادی سمجھنا چاہیے۔

صنعتی انقلاب سے سادہ دستی اوزاروں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ انسان یا مویشی کی قوت کے بجائے پانی یا بھاپ کی قوت استعمال ہونے لگی۔ چونکہ قوت سے چلنے والی مشینیں زیادہ بڑی، پُرپیچ اور گراں خرچ تھیں، لہٰذا ان کے لیے بڑے بڑے کارخانے لازم ہو گئے۔ یوں کارخانوں کا نظام وجود میں آیا اور دستکاری کی چھوٹی چھوٹی دکانیں یا چھوٹے چھوٹے دستکاروں کا گھروں پر کام ختم ہو گیا۔ ۱۷۸۹ء تک ان انقلابی تغیرات نے صرف

چند صنعتوں پر اثر ڈالا تھا، لیکن یہی صنعتیں کلیدی حیثیت رکھتی تھیں، مثلاً کان کنی، دھاتوں کی صفائی، اسلحہ سازی اور پارچہ بافی۔

کوئلے کی کانیں اٹھارھویں صدی میں بڑے کاروبار کا مرکز بن رہی تھیں۔ آرتھر ینگ نے دیکھا کہ برطانیہ میں جہاں کہیں کوئلے کا چھوٹا موٹا ذخیرہ ہے، وہاں کا ذرہ ذرہ سرگرمی اور صنعت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ نیوکیسل[1] انگلستان کے شمال میں ہے۔ ۱۷۷۱ء کی ایک رپورٹ مظہر ہے کہ وہاں کوئلہ نکالنے والوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا اور یہ تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ کوئلے کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی، کیونکہ لوہا بنانے والوں کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ صدیوں سے یہ لوگ خام دھات سے لوہا بنانے کے لیے لکڑی کا کوئلہ استعمال کرتے آئے تھے۔ سویڈن جیسے ملکوں میں یہ کام بدستور جاری رہا، کیونکہ وہاں لکڑی بہ کثرت موجود تھی، لیکن انگلستان میں تقریباً تمام جنگل کٹ چکے تھے اور لکڑی کے کوئلے کی قیمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوہا بنانے کے مصارف میں اسّی فی صد صرف کوئلے کا خرچ تھا۔ ۱۷۵۰ء تک یہ حالت پیدا ہو گئی کہ اگرچہ خام دھات کی بہم رسانی بہت بڑھ گئی تھی، مگر لوہا بنانے کی رفتار تیزی سے گھٹ گئی اور بیرونی ملکوں سے لوہا درآمد کیا جانے لگا۔ عام کوئلہ لکڑی کے کوئلے کی جگہ آہن سازی میں کام نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ اس کے کیمیائی اجزا لوہے کو زیادہ سخت اور بے لوچ کر دیتے تھے۔ یہاں ضرورت ایجاد کی ماں بن گئی۔ کول برک ڈیل[2] کے ایک خاندان ڈاروی نے شروپ شائر[3] میں تجربے کرتے کرتے معلوم کر لیا کہ کوئلے کی کیمیائی خرابیاں اس طرح دور کی جا سکتی ہیں کہ کوئلے کو بڑی بڑی بھٹیوں میں ڈال کر کوک[4] بنا لیا جائے۔ چونکہ کوک میں خالص کاربن رہ جاتی ہے، اس لیے اس سے اعلیٰ درجے کا لوہا بنتا ہے۔

ڈاروی خاندان اور دوسری نجی فرمیں انگلستان کے اندر دھاتیں صاف کرنے میں پیش رو تھیں۔ برِاعظم یورپ میں مختلف حکومتوں نے سبقت کی، حالانکہ ریاستیں عموماً اقتصادی مسائل کے حل میں اپنی نااہلی ظاہر کرتی رہی تھیں، مگر اس معاملے کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ جدال و قتال کے لیے اعلیٰ درجے کے اسلحہ کی ضرورت تھی۔ فرانس اور پروشیا نے اس ضرورت کو یوں پورا کیا کہ ایسے کارخانے اور اسلحہ سازی کے مرکز قائم کر دیے جن میں سرمایہ حکومتوں کا لگا۔

پارچہ بافی میں انقلاب کا مدعا یہ تھا کہ ارزاں نرخ کا سوتی کپڑا تیار کیا جائے۔ "اڑتی ہوئی نال" ایک فنی چیز تھی، جو پہلے پہل انگلستان کے دستی کرگھوں میں استعمال ہوئی (۱۷۳۳ء)۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک جلاہا دو جلاہوں کا کام کرنے لگا۔ جن کرگھوں میں یہ نال استعمال ہوتی تھی، وہ دھاگے کے ذخیرے انتہائی تیزی سے ختم کرنے لگیں۔

۱؎ New Castle ۲؎ Coalbrookdale ۳؎ Shropshire

۴؎ Coke کوک پتھر کا وہ کوئلہ ہے جسے اس غرض سے آنچ دے دیتے ہیں کہ بخارات بن کر اڑ جانے والا مادہ نکل جائے۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ لندن میں فنون، مصنوعات اور تجارت کی حوصلہ افزائی کے لیے جو انجمن بنی ہوئی تھی، اس نے اعلان کیا کہ جو شخص ہاتھ سے رُوئی کاتنے کے تکلیف دہ عمل میں اصلاح کا طریقہ ایجاد کرے گا، اُسے انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ جیمز ہارگریوز[1] نے ۱۷۶۴ء میں کاتنے کی کل ایجاد کی، جس میں سُوت کاتنے کی آٹھ چرخیاں بہ یک وقت کام کرتی تھیں۔ جلد ہی اس کل کے لیے پانی کی قوت استعمال ہونے لگی اور ایک سَو سے بھی زیادہ چرخیاں بہ یک وقت کام کرنے لگیں۔ مزید برآں اٹھارھویں صدی کے ساتویں عشرے میں سکاٹ لینڈ کے ایک فرد جیمز واٹ[2] نے دخانی انجن ایجاد کر لیا۔ اس نے آگے چل کر صنعت و حرفت کو پانی کی قوّت پر انحصار سے نجات دلا دی اور یہ قوّت یقیناً قابلِ اعتماد نہ تھی۔

اگرچہ برطانیہ میں ۱۷۸۹ء تک رُوئی کے تقریباً ڈیڑھ سَو کارخانے قائم ہو چکے تھے، مگر اُونی پارچات اور درجنوں دوسری بنیادی جنتیں دستی صنعت ہی پر موقوف رہ گئیں۔ انگلستان، نیز برّاعظم میں انفرادی دستکاروں اور چھوٹے چھوٹے کارکنوں کی تعداد بڑے بڑے کارخانوں کے مزدوروں سے کہیں زیادہ تھی۔ صنعتی نشو و ارتقاء کو پُورا زور اس وقت حاصل ہُوا، جب نہروں کے کُھدنے اور ریلوں کے بننے میں بھاری بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بہت ارزاں ہو گیا۔ سرمایے کی کمی اور کاریگروں کی قلت نے بعض اوقات صنعت و حرفت کی ترقی روکے رکھی۔ سویڈن کے ایک موجد نے اٹھارھویں صدی کے اوائل میں کاٹ چھانٹ کی نہایت عمدہ مشینیں ایجاد کیں، مگر اُسے ان سے کام لینے کے لیے سرمایہ نہ مل سکا۔ انگلستان میں یہ مشکل پیش آئی کہ واٹ کے انجن سے کام لینے کے صحیح پُرزے نہ بن سکے، اس لیے زیادہ وسیع پیمانے پر چیزیں نہ بنائی جا سکیں۔ اٹھارھویں صدی میں صنعتی انقلاب کے محض ابتدائی اقدامات ہُوئے۔ اُنیسویں صدی میں یہ انقلاب کمال کو پہنچا۔

---

[1] Hargreaves [2] Watt

تیسرا باب

مغربی طاقتیں

برطانیہ کا اثاثہ اقتصادی انقلابات میں برطانیہ کی قیادت نے اسے دُنیا کی امیر ترین قوم بنا دیا۔ برطانیہ کے بینکروں کی پشتیبانی بینک آو انگلینڈ کر رہا تھا۔ پھر انھوں نے قومی قرضے کا انتظام بڑی احتیاط سے کرلیا۔ اس طرح کاروبار میں ان کی ساکھ بہت بڑھ گئی اور وہ پانچ فی صد کی بہت معمولی شرح پر روپیہ دینے لگے۔ شہر جس کے ایک مربع میل میں شہر لندن واقع تھا اور اس کے ساتھ مالی ضلع بھی شامل تھا ساؤتھ سی کمپنی کی ضرب سے جلد سنبھل گیا اور تھوڑی ہی مدت میں ایمسٹرڈم سے ٹکر لینے لگا، جو بین الاقوامی تجارت و مالیات کا مرکز چلا آرہا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں برطانوی تاجروں نے اپنے تجارتی حریفوں یعنی ولندیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا اور فرانسیسیوں سے آگے بڑھنے لگے، جو نئے نئے مقابلے پر آئے تھے۔ تجارتی نظریۂ زر کی کسوٹیاں تین ہیں —— تجارت، نوآبادیاں اور بحری قوت —— برطانیہ ان کسوٹیوں کے اعتبار سے یورپ کی قوی ترین مملکت تھا۔

برطانوی نوآبادیوں کی نگرانی ایک سرکاری محکمے سے متعلق تھی، جسے تجارتی بورڈ کہتے تھے۔ یہ بورڈ خوش گوار تغافل کی سہل پالیسی پر کاربند تھا۔ اس کے برعکس دوسری سامراجی طاقتیں اپنے مقبوضات پر تجارتی نظریۂ زر کے تقاضوں کے مطابق سخت ضبط و نظم پر کاربند تھیں۔ صرف برطانیہ کی نوآبادیوں کو داخلی خود مختاریوں کے خاصے حقوق حاصل تھے۔ آگے چل کر یہ حقوق آبادکاروں کو مطمئن نہ رکھ سکے، جیسا کہ امریکی انقلاب سے واضح ہو گیا، مگر عارضی طور پر خوش گوار تغافل خاصا کامیاب رہا اور برطانوی سلطنت خوشحالی و خود اعتمادی میں سب پر فوقیت لے گئی۔

برطانوی بحری فوج بھی افسروں کی برتری اور جہازوں کی کثرت کے باعث سب پر فائق تھی۔ جو لوگ آگے چل کر کپتانی کے عہدے پر فائز ہوتے تھے، وہ سولہ سال یا اس سے بھی کم عمر میں سمندروں کا سفر شروع کر دیتے اور کمیشن لینے سے پیشتر عملی تعلیم و تربیت پوری کر لیتے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں وہ جن جہازوں کی کمان کرتے رہے، وہ بہ اعتبار وضع و ساخت دشمنوں کے جہازوں یعنی فرانس و برطانیہ سے فروتر تھے۔ وہ سمندر میں موجوں کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہیں کر سکتے تھے اور ان پر توپیں کم ہوتی تھیں، لیکن ان کی تعداد زیادہ تھی۔ مثلاً برطانیہ کے پاس فرانس کے ایک جنگی جہاز کے مقابلے میں دو، ایک تجارتی جہاز کے مقابلے میں چھ اور تجربہ کار ملاحوں —— تجارتی و جنگی —— کا تناسب دس اور ایک کا تھا۔ اگر جنگ پیش آجاتی تو بیڑا تجارتی جہازوں سے ملاح لے لیتا

اور حمل و نقل نیز دوسرے کاموں کے لیے اسے خاصی تعداد میں جہاز مل جاتے۔

دو سو سال پیشتر ملکِ معظّم کے جہازوں پر خدمت چنداں خوش گوار نہ تھی۔ جو خوراک ملاحوں میں تقسیم کی جاتی، وہ ایک ہی وضع کی ہوتی اور اس میں کیڑے پڑ جاتے اور وہ صحت کے لیے مضر تھی۔ کپتان اکثر ملاحوں کو سزا میں تازیانے لگواتے یا جہاز کے پیندے میں اتار کر بند کر دیتے۔ اٹھارھویں صدی کے چوتھے عشرے میں ٹوبیاس[1] سمولیٹ نے ایک سرجن کے رفیق کی حیثیت سے برطانوی جنگی جہاز پر سفر کیا۔ جو ظلم و ستم اُس زمانے میں جہازوں پر ہو رہے تھے، ان کا انکشاف اُس نے راڈرک[2] رینڈم نام ایک ناول میں کیا، جو انگریزی کے بالکل ابتدائی ناولوں میں ہے۔ راڈرک رینڈم ہمیں بتاتا ہے کہ اسے کیونکر "بھرتی کیا گیا":

"میں ٹاور[3] کے گھاٹ سے آگے بڑھا تو ایک موٹا اور ٹھگنا سا آدمی جس کے پہلو میں خنجر لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں ڈنڈا تھا، میرے پاس آیا اور پکار کر کہا: "او بھائی! تو میرے ساتھ آ۔" مجھے اس کا چہرہ اچھا معلوم نہ ہوا اور اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں تیز تیز چلنے لگا، تاکہ اس سے نجات حاصل کر لوں۔ یہ دیکھتے ہی اُس نے سیٹی بجائی۔ فوراً ایک اور ملاح میرے سامنے نمودار ہو گیا اور میرا گریبان پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ میں اس قسم کا سلوک برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اپنا گریبان چھڑایا اور ایک ڈنڈا اس کے سر پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب کوئی دس بارہ آدمیوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے بھی اس پھرتی اور کامیابی سے زور دکھانا شروع کیا کہ بعض مخالفوں نے تلواریں لے کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ خاصی کش مکش ہوئی، جس میں ایک بڑا زخم میرے سر پر لگا، ایک بائیں رخسار پر اور تمام ہتھیار چھین کر مجھے قیدی بنا لیا گیا۔ وہاں سے ایک جہاز کے تختے پر لے گئے اور مجرم کی حیثیت میں ایک مقام پر باندھ دیا۔ وہاں ارد گرد اور لوگ بھی بندھے ہوئے موجود تھے، جن کی شکلیں دیکھ کر مجھے سخت پریشانی ہوئی۔"[4]

غرض جبری بھرتی کرنا، سزا میں جہاز کے پیندے کے اندر اتار دینا، خراب غذا کھلانا اٹھارھویں صدی میں ملاحوں کے اندر عام تھا۔ پھر گوناگوں بیماریوں میں وہ لوگ مبتلا ہو جاتے۔

اس کے برعکس فوج برطانیہ کی خاص چیز تھی۔ اس کے افسر اخلاص کے لیے یورپ بھر میں مشہور تھے اور اس کے سپاہی عموماً درمیانے درجے کے لوگ ہوتے تھے، جو تنخواہ کے لالچ میں بھرتی ہو جاتے اور وہ عموماً جرمنی کی

---

۱ Jobias Smollett ۲ Roderick Random

۳ Tower لندن میں مشہور پرانا قلعہ، جو ٹیمز کے کنارے پر واقع ہے۔ ۴ راڈرک رینڈم ص ۱۴۳۔

ریاست ہیسّی کیسل[1] سے لیے جاتے تھے۔ برطانیہ کو بڑی فوج رکھنے پر اعتراض تھا، کیونکہ اس پر خرچ بہت ہوتا تھا۔ چونکہ جزائر برطانیہ نسبتاً محفوظ تھے، اس لیے فوج کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ اہلِ برطانیہ کو ایک اندیشہ یہ تھا کہ اگر مستقل فوج رکھی گئی تو وہ کسی نہ کسی وقت مطلق العنانی کا حربہ بن جائے گی۔ انھیں یاد تھا کہ کرامویل اور جیمز دوم نے اس حربے سے کتنا کام لیا تھا۔

کابینہ شاندار انقلاب نے فوج پر بے اعتمادی کی تصدیق کردی، نیز برطانیہ کو ایک یگانہ اور سب سے بڑا اثاثہ دے دیا یعنی بادشاہ پر پارلیمنٹ کی برتری۔ پارلیمنٹ نے جیمز دوم کی جگہ ولیم اور میری کو حکومت کی گدّی پر بٹھادیا تھا۔ ملکہ این[2] سٹوأرٹ خاندان کی آخری حکمران تھی۔ اس نے ۱۷۱۴ء میں وفات پائی تو پارلیمنٹ نے جانشینی کا فیصلہ خاندان ہینوور[3] کے حق میں کردیا۔ اس خاندان کے پہلے دو بادشاہوں کے ماتحت جو کابینہ بنی اسے بادشاہ پر پارلیمنٹ کی برتری قائم کرنے کا ذریعہ ہونا چاہیے تھا۔ جارج اوّل (۱۷۱۴ء - ۱۷۲۷ء) اور جارج دوم (۱۷۲۸ء - ۱۷۶۰ء) نے تمام شاہی اختیارات سے دست برداری اختیار نہ کی۔ مثلاً ساؤتھ سی کمپنی اور دوسرے مالی معاملات میں وہ براہِ راست دلچسپی لیتے رہے۔ بعض اوقات ڈپلومیسی اور جنگ میں بھی دخل دے دیتے تھے۔ جارج دوم انگلستان کا آخری بادشاہ تھا، جس نے میدانِ جنگ میں شخصاً فوجوں کی کمان کی۔ یہ ۱۷۴۳ء میں آسٹروی تخت نشینی کی جنگ کا واقعہ ہے مگر پہلے دو جارج تاج سے لطف اندوز نہ ہوئے، جو ان پر ٹھونسا گیا تھا۔ انھیں انگریزی زبان میں مہارت حاصل نہ ہوئی اور وہ طویل مدت کے لیے ہینوور چلے جاتے رہے، جہاں ان کے اختیارات پر پابندی عائد کرنے کے لیے کوئی پارلیمنٹ موجود نہ تھی۔ انھیں ہینوور کی یاد برابر ستاتی رہی۔ انگلستان میں ان کے لیے اطمینان کی کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ انھوں نے بہت سے امور میں ذمہ داری کابینہ کی طرف منتقل کردی۔

جارج اوّل اور جارج دوم اپنے وزیر وِگ پارٹی سے چنتے رہے۔ وجہ یہ نہ تھی کہ پارلیمنٹ نے انھیں اس پر مجبور کیا تھا، وجہ صرف یہ تھی کہ انھیں اسی میں سہولت نظر آئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ٹوریوں پر انھیں قطعاً اعتماد نہ تھا۔ وہ لوگ انھیں طور طریقوں کو پسندیدہ سمجھتے تھے، جو شاندار انقلاب میں بالکل بے وقعت ہوچکے تھے۔ بعض ٹوری جیمز دوم کے اخلاف کی ان سازشوں اور سرگرمیوں میں شامل پائے گئے، جو انگلستان کا تخت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اختیار کیں۔ اس کے برعکس وِگ شاندار انقلاب کے اصل بانی تھے۔ انھیں نے خاندان ہینوور کے لیے تخت نشینی کا انتظام کیا تھا اور انھیں کو دارالعوام میں اقتدار حاصل تھا۔

ساؤتھ سی کمپنی کی ناکامی کے بعد اکیس سال تک (۱۷۲۱ء - ۱۷۴۲ء) رابرٹ والپول وزیر اعظم رہا۔ وہ بھی

---

[1] Hesse Cassel   [2] Anne   [3] Hanover

دارالعوام میں وِگ پارٹی کا لیڈر تھا۔ والپول نے کابینہ کا اقتدار و وقار بڑھا دیا۔ اگرچہ وزیرِ اعظم کے لقب نے اس وقت تک سرکاری حیثیت اختیار نہیں کی تھی، مگر وہ واقعی وزیرِ اعظم تھا، کیونکہ سلطنت میں اسے ممتاز ترین شخصیت مانا جاتا تھا۔ ۱۷۳۳ء میں اس نے بعض وزیروں کو استعفے پر مجبور کر دیا، کیونکہ وہ چنگی میں وسیع تخفیف کے مخالف تھے اور والپول اس تخفیف کو لباسِ عمل پہنانا چاہتا تھا۔ یوں اس نے ایک نہایت نازک مسئلے میں کابینہ کی یک آہنگی کا اہم اصول قائم کر دیا۔

۱۷۶۰ء میں جارج دوم فوت ہُوا۔ رسم یہ تھی کہ بادشاہ اکثریت والے فریق سے اپنے وزیر منتخب کرتا، مگر اس وقت تک یہ چیز لازم و واجب نہیں ہوئی تھی۔ جارج سوم نے اس رسم کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وہ دارالعوام سے اس مسئلے پر جھگڑتا رہا، مگر ناکام ہُوا۔ انگریزی کابینہ کے نشو و ارتقا میں نازک ترین دَور ۱۷۶۰ء میں شروع ہُوا، لیکن ۱۷۹۰ء سے بیشتر ترکیب و ساخت کے زمانے میں کابینہ ایسی شکل اختیار کرنے لگا تھا، جس کے مطابق آگے چل کر پارلیمنٹ کے لیے، نیز دارالعوام کے انتخاب میں حصہ لینے والے عوام کے لیے تنقیدی معاملات میں ضبط و نظم یقینی ہو گیا۔

وِگ پارٹی کی حکومتِ عدیدہ

اُنیسویں صدی کے جلیل القدر ٹوری ڈزرائیلی نے پہلے دو جارجوں کے زمانے کی وِگ حکومت کو "وینس کی حکومتِ عدیدہ" قرار دیا تھا۔ اُس نے کہا: دورِ احیاءِ علوم کے وینس میں دولت مند تاجر اور ساہوکار خاندان آئین سازی اور نظم و نسق پر اقتدار قائم رکھے ہُوئے تھے، لیکن اصلاً وِگ حکومت حکومتِ عدیدہ ہونے کے باوجود وینس کی حکومت کی طرح نہ تھی، جیسا کہ ڈزرائیلی نے فرض کر لیا۔ وِگ پارٹی دراصل بڑے بڑے مالکانِ اراضی اور سرمایہ دار اُمراء کے اتحاد پر مبنی تھی، یعنی اس میں اُمراء، دیہاتی جاگیردار، لندن اور دوسرے شہروں کے کاروباری آدمی شامل تھے۔ گویا قصبوں اور مفصلات کے سیاسی لیڈروں کے درمیان اس اتحاد کی تجدید ہو گئی تھی، جو پہلے پہل ازمنۂ وسطیٰ کے آخری دَور میں نمایاں ہُوا، یعنی جب دیہاتی شرفاء اور شہری نمائندوں نے مل کر دارالعوام کی تشکیل کی تھی۔

وِگ پارٹی کو جن پارلیمنٹوں میں اکثریت حاصل رہی ان میں دیہاتی شرفاء کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی۔ مثلاً ۱۷۵۴ء میں دارالعوام کے اندر ان کا نیز تاجروں اور قانون دانوں کا تناسب پانچ اور ایک کا تھا۔ خاندانی رشتے، مشترکہ سیاسی مقاصد اور املاک کے لیے مشترکہ احترام وِگ پارٹی کے بڑے اور چھوٹے شرکاء کو اکٹھا کیے ہُوئے تھے۔ شاندار انقلاب کے فوائد کو مستحکم کرنے کی غرض سے وِگ پارٹی نے جیمز دوم کے اخلاف اور ان کے حامیوں کے تمام منصوبوں کی مخالفت کی اور وہ ہینوور خاندان کی حمایت میں سرگرم رہے، جو نمائشِ اقتدار کا عادی نہ تھا۔ اپنی زمینوں اور لگائے ہُوئے سرمایوں کی حفاظت کے لیے وہ قانون منظور کرتے رہے۔ مثلاً مویشی کے چُرانے، آلو بالو کے درخت کاٹنے اور اسی طرح املاک کے تقدس کی معمولی خلاف ورزی کی سزا بھی موت مقرر کر دی تھی۔

رابرٹ والپول خود بڑے بڑے مالکان اراضی اور سرمایہ دار عناصر کے اشتراک کی ایک مثال تھا۔ اس کا باپ ایک دیہاتی جاگیردار تھا۔ تمام اوضاع واطوار اور ذوق ومشرب اسی سے والپول نے میراث میں لیے۔ اس نے انگریز سیاست والوں کی یہ روایت قائم رکھی کہ ہفتے کے اواخر میں وہ دیہات کے اندر چلا جاتا اور شکار کھیلتا رہتا۔ اُسے نفاست ولطافت کا کوئی احساس نہ تھا۔ کھانے کی دعوتوں میں خوب شراب پیتا اور محفل کو فحش کہانیاں سناتا۔ بہت سے دوسرے لوگ شرفاء کی طرح والپول نے بھی ایک سرمایہ دار تاجر کے خاندان میں شادی کی۔ اس کی بیوی ایک بہت بڑے تاجر چوب کی بیٹی تھی، جو پہلے لندن میں لارڈ میئر بھی رہ چکا تھا۔ وزیر اعظم کی حیثیت میں والپول نے خود دیہاتی اشراف میں ہونے کے باوجود شہری مفاد کو تقویت پہنچائی۔ اس کی بنیادی پالیسی شہری پروگرام سے بالکل ہم آہنگ تھی، یعنی قومی قرضے میں تدریجی تخفیف، نظام کابینہ کے ذریعے سے سیاسی استواری اور نئے ہینوور ی خاندان کی حمایت۔

والپول کے انگلستان میں ایسی جمہوریت کا کوئی وجود نہ تھا، جس میں ہر قابل آدمی اپنی صلاحیت کی بناء پر ترقی کرسکتا یا اکثریت اپنی مرضی کے مطابق کارفرما ہوسکتی۔ مختلف پیشوں میں صرف شرفاء ہی آگے بڑھ سکتے تھے، جو مجلسی اعتبار سے اقلیت میں تھے۔ وہی فوج اور بحریات میں افسری کے درجے پر پہنچنے کی امید رکھتے۔ وہی قانون دانی، معلّم، پادری اور ڈاکٹر بن سکتے۔ سیاسیات میں لاکھوں عوام کے لیے دروازہ بند تھا، اگرچہ دولتمند تاجر لوگوں کی حکومتِ عدیدہ میں شامل ہوچکے تھے۔ صرف بڑے بڑے زمیندار ہی جج بن سکتے تھے، جو مقامی عدالتوں کا کاروبار چلاتے۔ تنخواہوں کے پیمانے مقرّر کرتے۔ غریبوں کی امداد کی نگرانی بھی انھیں کے حوالے تھی۔ وہی پُلوں اور شاہراہوں کی دیکھ بھال کے ذمہ دار تھے۔ گویا انگلستان کے مفصلات میں انھیں مطلق العنان حاکموں کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ لوگ ذاتی جائداد کی حفاظت میں بہت سخت تھے اور ان میں سے جو لوگ جج مقرر ہوتے، انھیں حکومت کا سب سے زیادہ غیر جاذب پہلو سمجھا جاتا۔ مجسٹریٹوں کی حیثیت میں وہ عموماً مدعا علیہم کے حقوق کو نظر انداز کیے رہتے اور معمولی چوریاں پر بھی ملزموں کو موت کی سزا دے دیتے۔ ایک ضرب المثل بن گئی تھی کہ "بھیڑ چراؤ یا برہ، پھانسی دونوں صورتوں میں پاؤ گے۔" یہ مثل ان لوگوں کے معیارِ انصاف کی حقیقت واضح کررہی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی صرف اشراف ہی کو پارلیمنٹ کے ممبروں کے لیے ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ بہت سے حلقہ ہائے انتخاب میں ووٹ دینے والوں کی تعداد کم تھی۔ اس لیے مختلف خرابیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی، خصوصاً ان قصبوں میں جنھیں ویران[1] یا پاکٹ[2] قصبے کہتے تھے۔ ان قصبوں میں ووٹ دینے والوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ پارلیمنٹ

---

[1] Roten
[2] Pocket Boroughs

کے یلے نمائندگی کسی دولت مند صاحب املاک کی "جیب" (اختیار) میں تھی۔ سیاست دانوں نے ووٹروں کو رشوت دینے کے مواقع سے پُورا فائدہ اُٹھایا یا وہ وعدہ کر لیتے کہ جو لوگ ووٹ دیں گے، انھیں سرکاری ملازمتیں دلا دی جائیں گی۔ نیوکیسل کا ڈیوک بڑا دولتمند وِگ تھا۔ اسے چار حلقہ ہائے انتخاب اور سات چھوٹے قصبوں کی ممبریوں پر پورا قابو حاصل تھا۔ جن خاندانوں کی رشتے داریاں ذی اثر اصحاب سے تھیں، وہ عموماً حکومت کی خاصی سرپرستی حاصل کر لیتے۔ ایک لوحِ مزار پر مالِ غنیمت کی جو فہرست درج ہے، اسے ایک نظر ملاحظہ فرمایئے:

"یہاں مسز ایلزبتھ بیٹ[1] کا جسدِ فانی محوِ آرام ہے۔
وہ مقدس رچرڈ بیٹ کی بیوہ تھی۔
ایک خاتون، جو حقیقی پرہیزگاری اور مثالی نیکی کا پیکر تھی۔
اس کا خاندان بڑا معزز تھا۔
سٹین ہوپ[2] کے نامور خاندان سے اس کا رشتہ تھا۔
اسے یہ استحقاق حاصل تھا
کہ اپنے شوہر اور بچوں کے یلے
بارہ مختلف ملازمتیں
کلیسا اور سرکار میں حاصل کر لے
وہ ۹ جون ۱۷۵۱ء کو پچھتر سال کی عمر میں فوت ہوئی[3]"

برِاعظم یورپ کی طرح برطانیہ میں بھی حکمران طبقہ ان عوام پر فرمانروا تھا، جنھیں ووٹ دینے کا کوئی حق نہ تھا، لیکن انگلستان کی بادشاہی اور برِاعظم کے ملکوں کی بادشاہیوں میں ایک اہم فرق تھا۔ برطانیہ کا حکمران طبقہ بھی یقیناً خودغرض اور تنگ دل تھا، بہ ایں ہمہ ان میں عوامی روح اور شہری امور سے دلچسپی اعلیٰ پیمانے پر موجود تھی۔ خود بڑے بڑے مالکانِ اراضی اور دولتمند تاجروں کے درمیان برِاعظم کے مقابلے میں بہت کم مجلسی رکاوٹیں تھیں اور انگلستان کے شرفاء بہ حیثیت عمومی اقتصادی تغیرات کی ضرورت کا زیادہ احساس رکھتے تھے۔ برِاعظم کے شرفاء کو ایسا احساس نہ تھا۔ آخر انگلستان کے شرفاء میں سیاسی اور مجلسی اصلاحات کا بھی جذبہ پیدا ہو گیا۔ بلاشبہ انگلستان میں اقتدار صرف چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں تھا اور خرابیاں بھی یقیناً موجود تھیں، تاہم برطانیہ کے پارلیمانی نظام نے

---

[1] Elizabeth Bate   [2] Stanhope

[3] ٹریویلین Trevelyan کی کتاب England under Queen Anne جلد سوم ص ۳۱۰۷

حد درجے روشن خیال اور ضرورتوں کے مطابق چلنے والی حکومت مہیا کردی، جو یورپ میں ان اوصاف کے لحاظ سے بہترین تھی۔

فرانس کے واجبات

جب برطانیہ قوی تھا، فرانس پر ضعف و بے چارگی کی حالت طاری تھی۔ لوئی پانزدہم کے فرانس (۱۷۱۵ء ـ ۱۷۷۴ء) کو مختلف امور سے نقصان پہنچا۔ مثلاً اس کا سامراجی نظام بڑا سخت تھا۔ اس کی بحری قوت کم درجے کی تھی اور اس کے اکثر مدبر اوسط درجے کی قابلیت کے تھے۔ وزارت بحریات سمندر پار کی سلطنتوں پر حکومت کرتی تھی۔ وہ ان مقبوضات کو بھی ایسے جنگی جہاز سمجھتی تھی، جو مستقل طور پر لنگر ڈالے پڑے ہوں۔ انگلستان کے تجارتی بورڈ کے برعکس فرانس نے اپنی کسی نوآبادی کو نظام خود اختیاری دے دینے سے انکار کردیا۔ گویا فرانس نے نوآبادیوں کے لیے انھیں مفصل ضوابط سے کام لیا، جو جزائر غرب الہند کے گنا پیدا کرنے والوں جزیروں اور کینیڈا کی ان چوکیوں کے لیے استعمال ہوتے رہے، جو دراصل اس وقت تک ویرانے میں تھیں، حالانکہ نوآبادیوں اور مذکورہ جزیروں، نیز چوکیوں کے درمیان کوئی مناسبت نہ تھی۔

اس نظام کے مطابق فرانس کو خوشحالی نصیب ہوئی، لیکن نوآبادیاں پسماندہ رہ گئیں۔ نانٹز، بوردو اور فرانس کی دوسری اوقیانوسی بندرگاہوں میں تجارتی سرگرمیاں دوگونہ ہوگئیں، جو خام شکر وادی لوپ اور مارٹینیق[1] کے مزرعوں سے آتی تھی، اس کی صفائی کے لیے نئے کارخانے بن گئے، لیکن نوآبادیوں میں ضوابط کا جو ہنگامہ بپا تھا اور ان میں سے اکثر سراسر احمقانہ تھے، ان کی وجہ سے آبادکاروں کی صلاحیت جدت کا گلا گھونٹا گیا۔ فرانس کے سامراجی نظام میں اتنی لچک اور سرگرمی نہ تھی کہ وہ جنگ کی آزمائش کا مقابلہ کامیابی سے کرسکتا۔

فرانس کی بحری قوت کو وسیع تر وسائل اور بہتر قیادت کی ضرورت تھی۔ اس کے جنگی جہاز بہ اعتبار وضع و ساخت بہت اچھے تھے، مگر ان کی تعداد ناکافی تھی۔ ولندیزی اور برطانوی جہازوں نے فرانس کی پھیلتی ہوئی تجارت کا خاصا بڑا حصہ سنبھال لیا۔ خود فرانس کے تجارتی جہاز اتنے کم تھے کہ جنگ پیش آجانے پر وہ بیڑے کو کوئی تقویت نہیں پہنچا سکتے تھے۔ فرانسیسی بحری افسروں نے بحریات کی تعلیم و تربیت بڑی عمدگی سے پائی تھی، لیکن انھیں وہ تجربہ حاصل نہ تھا، جو برطانوی جہازرانوں نے عمریں سمندر میں گزار کر حاصل کیا تھا۔ نظام قدیم کے بہترین و بدترین مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اونچے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افسر اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ طبقۂ اوسط کے افسروں کو ترقی نہ کرنے دیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ بھی کہہ دیا جائے، فرانسیسی حکمرانوں نے

---

[1] Guadeloupe and Martinique یہ غرب الہند کے درمیان دو جزیرے ہیں، جو فرانس کے قبضے میں تھے۔

بحریات سے تغافل برتا، تاکہ ان کی پوری توجہ بری فوج پر مرتکوز رہے۔ فرانس سب سے بڑھ کر ایک بری قوت تھا، اس کی شمالی و مشرقی سرحد غیر محفوظ تھی، کیونکہ وہ فلینڈرز کے میدان میں سے گزرتی تھی اور ادھر سے حملے کا خطرہ رہتا تھا۔

بے شک بری فوج کی تعداد زیادہ تھی، لیکن لوئی پانزدہم کی فوج کبھی لوئی چہاردہم کی عالی شان روایات سے مطابقت پیدا نہ کر سکی۔ فوج کی تربیت ناقص تھی۔ عسکری تنظیم میں بے مصرف افسر بہت زیادہ تھے۔ فرانسیسی فوج کے ہر پندرہ سپاہیوں میں ایک افسر ضرور تھا۔ اس کے برعکس پروشیا کی فوج میں جو زیادہ کارگزار مانی جاتی تھی، پینتیس سپاہیوں میں ایک افسر تھا۔ بحریات کی طرح بری فوج کے وہ افسر، جن کا تعلق طبقۂ امراء میں سے تھا، طبقۂ اوسط کے رفیقوں سے نفرت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر نے صرف اس لیے فوج میں کمیشن لے لیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ دولت پیدا کرنے کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اٹھارھویں صدی کی ایک جنگ کے دوران میں ایک فرانسیسی مارشل کو شکایت کرنی پڑی:

"لفٹنٹ اور کپتان کو ہرگز علم نہیں کہ کمپنیوں کی کمان کیونکر کی جاتی ہے۔ اسی طرح کرنیل، برگڈئیر اور لفٹنٹ جنرل اپنی رجمنٹوں، برگیڈوں اور ڈویژنوں سے صحیح کام لینے کے نااہل ہیں ..... ہمارے تمام افسر انفرادا ویسے ہی جری اور دلیر ہیں، جیسے دشمن کے افسر ہیں۔ ان میں قابلیت اور فہم و دانش زیادہ ہے، لیکن نہایت اہم معاملات میں وہ غلطیاں کرتے ہیں۔ ان میں سے چند ہی ہوں گے، جنھوں نے بطور خود مہم کے نقشے تیار نہیں کر لیے یا جو جرنیلوں کی اختیار کردہ تدابیر پر نکتہ چینی نہیں کرتے اور تقریباً سب کے سب اپنے درجے کو شخصیت سے فروتر سمجھتے ہیں۔"[1]

ہفت سالہ جنگ میں (جس کا ذکر آگے آتا ہے) فرانس نے شکستیں کھائیں تو ۱۷۶۳ء کے بعد بری اور بحری فوج میں اہم اصلاحات ہوئیں۔ جنگی جہازوں کی تعداد بڑھ گئی اور بری فوج کے افسروں میں سے ان تمام لوگوں کو نکال دیا گیا، جو نااہل تھے۔ فوجی اقدامات کے لیے افسروں کا نیا گروہ بھرتی کیا گیا۔ یہ لوگ بڑے جوشیلے اور سرگرم تھے۔ ان اصلاحات کے خوش گوار نتائج کا ثبوت اول امریکی انقلاب کی جنگ میں فرانس نے پیش کیا۔ پھر یہ ثبوت ان فوجی مہموں میں بروئے کار آیا، جو انقلاب فرانس کا نتیجہ تھیں، لیکن یہ اصلاحات بعد از وقت آئیں اور نظام قدیم کے زائل ہوتے ہوئے وقار کو بچا نہ سکیں۔

---

[1] یہ اقتباس ایلبرٹ سورل Sorel کی فرانسیسی کتاب "یورپ اور انقلاب فرانس" میں سے ہے۔ جلد اول ص ۲۰۱۔

نظامِ قدیم کی کمزوری جنگی قوّت یا نو آبادیوں کے موافق میں نہیں، بلکہ اس کے اصل مرکز یعنی بادشاہی میں تھی۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ ملوکیت کو کامیاب بنانے کا تقاضا یہ تھا کہ مسلسل قابل بادشاہ تخت کی زینت بنتے رہتے۔ لوبرٹ اور ریشلی جیسے قابل افراد ان کے معاون ہوتے۔ لوئی چہار دہم کی وفات کے بعد فرانس اُس جیسا بھی کوئی بادشاہ پیش نہ کر سکا اور بہت کم وزیر ایسے تھے، جو نامور پیشروؤں کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوتے۔

اورلیانز کا ڈیوک ۱۷۱۵ء سے ۱۷۲۳ء تک نائب السلطنت رہا۔ وہ قمار باز، شرابی اور گمراہ تھا۔ اس نے فرانسیسی لفظ "رُوے"[1] کو عام لوگوں کی زبان پر جاری کیا، کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے دوست چکّر میں بندھ کر سزا پانے کے مستحق ہیں، لیکن اس نے دو اہم انتظامی تجربے کیے، اوّل جان لاؔ کو اپنا "نظام" آزمانے کا موقع دے دیا، دوم وزراء کی ایک مجلس بنا دی، جس میں سلطنت کے نہایت ممتاز امراء کو شامل کیا، حالانکہ لوئی چہار دہم متفرّق وزراء کے ذریعے سے سارا کاروبار کرتا رہا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پہلے تجربے سے بعض مفید نتائج برآمد ہوئے، مگر دُوسرا تجربہ اس درجہ ناکام ہُوا کہ نائب السلطنت تین سال کے بعد اس سے دست بردار ہو گیا۔ اُمراء کو مشیروں کی حیثیّت میں پرانی جاگیرداری حقوق پر بحال کر دینے سے فرانسیسی حکومت کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ فرانس کا یہ دوسرا طبقہ (اُمراء) اپنی افادی حیثیت کھو بیٹھا۔ نیابت میں ثابت ہو گیا کہ امراء حکمرانی کے قابل نہیں رہے۔ وسط صدی میں جو جنگیں پیش آئیں، ان سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ امراء فرانسیسی افواج کی قیادت کر کے انھیں فتح نہیں دلا سکتے۔

خوش قسمتی سے اختیارات کی باگ ڈور بہت جلد کارڈینل فلیوری[2] کے حوالے ہو گئی، جو لوئی پانز دہم کا اتالیق تھا۔ فلیوری انقلاب سے پیشتر کے چند حقیقی مدبّروں میں سے ایک تھا۔ ۱۷۲۶ء سے ۱۷۴۳ء تک وزیر اعظم رہا اور نوّے سال کی عُمر میں وفات پائی۔ سن رسیدہ کارڈینل نے بنیادی اصلاحات کی کوئی کوشش نہ کی، تاہم فرانس کے لیے سانس لینے کا موقع پیدا کر دیا۔ والٹیر کے الفاظ میں اس نے سلطنت کو ایک طاقتور مضبوط جسم فرض کر لیا، جو اپنا علاج خود کر سکتا تھا۔ فلیوری نے فرانس کے مالی اوضاع کی مزمن اور گہری بے انصافی اور نالائقی کا کوئی مداوا نہ کیا، لیکن سکّے کی قیمت استوار کر دی اور محاصل کو زیادہ کاروباری بنیادوں پر پہنچا دیا۔ یعنی محاصل جمع کرنے والوں کو ساڑھے سات فی صد تک نفع لینے کی اجازت دے دی اور یہ بہت معمولی نفع تھا۔ اس نے فرانس کے بڑے شہروں میں رہن کی دکانیں کھول دیں، تاکہ قرضے کے حصول میں سہولت رہے۔ فلیوری کو اپنے مسلک میں جو کامیابی حاصل ہوئی، اس نے انگریزی سفیر کی بیوی لیڈی میری مانٹیگو[3] کو بہت متاثّر کیا، جو اٹھارھویں صدی کی بڑی بالغ نظر مبصّرہ تھی۔ لیڈی میری نے ۱۷۳۹ء میں لکھا:

---

[1] Roue
[2] Fleury
[3] Montagu

"فرانس کی بہت اصلاح ہو چکی ہے۔ یہ وہ ...... ملک نہیں، جس میں سے ہم بیس سال پیشتر گزرے تھے، جس چیز پر نظر پڑتی ہے، وہ بزبانِ حال کارڈینل فلیوری کی مدّاح ہے۔ سڑکیں بالکل سُدھر گئی ہیں...... رہزنوں سے حفاظت کے ایسے انتظامات کیے گئے ہیں کہ آپ بڑا ہاتھ میں لے کر ملک میں سے گزر سکتے ہیں......

اہلِ فرانس سڑکوں سے بھی زیادہ بدل گئے ہیں۔ پہلے وہ کمزور نظر آتے تھے۔ چہرے پیلے اور کمل اوڑھے ہُوئے۔ ہم نے انھیں اسی حالت میں دیکھا تھا، مگر اب دیہات خوشرنگ اور صحت مند کسانوں سے بھرے پڑے ہیں، جو اچھا اور صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں۔ پورے ملک میں افراط و قناعت کی جو فضا چھائی ہوئی ہے، وہ ناقابلِ یقین ہے[1]۔"

"افراط و قناعت" کی فضا اُس وقت کے بعد بھی قائم رہی، جب لوئی پانزدہم نے ۱۷۴۳ء میں شخصی حکمرانی کی ابتدا کی، لیکن جو نظامی استواری فلیوری نے پیدا کر دی تھی، وہ جلد رخصت ہو گئی۔ لُوئی خاصا ہوش مند تھا، مگر بودا اور عیّاش تھا۔ وہ حکمرانی کی تفصیلات کی دیکھ بھال میں نہ دلچسپی لے سکتا تھا اور نہ اس میں اتنا صبر تھا کہ دیکھ بھال کا حق ادا کر سکے۔ وہ وقتی جذبے یا اپنی داشتاؤں اور خوشامدیوں کے ایماء پر وزیر مقرر کرتا اور برطرف کر دیتا۔ مالیات اور وزارتِ خارجہ کے محکموں کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے وزیر بالاوسط دو دو یا تین تین سال رہے۔ جب وزراء میں تبدیلی ہوتی تو ساتھ ہی پالیسی بدل جاتی اور لوئی نے خود اپنے مقرر کیے ہُوئے وزیروں کے خلاف سازشیں کر کے استواری کو مزید نقصان پہنچایا۔ فرانس کی دو خارجہ پالیسیاں تھیں، جو باہم متصادم تھیں۔ ایک پالیسی وہ تھی، جسے سرکاری کہنا چاہیے اور سفیر اسی پر کاربند تھے۔ دوسری پالیسی وہ تھی، جسے بادشاہ کا خاص راز سمجھنا چاہیے اور اس کے کارندے اس پالیسی کو چلاتے تھے۔ یہ عموماً سفیروں کی باقاعدہ پالیسی کے خلاف ہوتی تھی۔ پھر لُوئی پانزدہم نے حکومت کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور وہ اس پر بھی آمادہ نہ ہُوا کہ حکمرانی کی دیکھ بھال کا کام زیادہ محکم ہاتھوں کے حوالے کر دے۔

باایں ہمہ فرانس ایک بڑی طاقت بنا رہا، اگرچہ لوئی پانزدہم نے پیش گوئی کر دی تھی کہ میرے بعد طوفانِ نوح[2] آنے والا ہے۔ فرانسیسی ذوق، فرانسیسی فکر اور فرانسیسی زبان کو بین الاقوامی دائرے میں امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ نظامِ قدیم کی بدنظمی اور دوسری کمزوریاں اضافی تھیں، مطلق نہ تھیں۔ وہ اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی تھی کہ فرانس اس وقت بھی بہ لحاظ آبادی یورپ کا سب سے بڑا ملک تھا اور اس کے قبضے میں قوّت کے تقریباً

۱؎ لیڈی میری کے خطوط ص ۲۷۱-۲۷۲۔

لامتناہی ذخیرے محفوظ تھے۔ اس کی فوج اگرچہ کمزور ہو گئی تھی، لیکن دنیا میں سب سے بڑی تھی اور بحری قوت کا درجہ دوسرا تھا۔ فرانس ہی نے سمندر پار کی تجارت کا راستہ دنیا کو دکھایا، اگرچہ آگے چل کر اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں انگلستان سب سے سبقت لے گیا۔

دوسری مغربی مملکتیں مغربی یورپ میں ہسپانیہ ہی دوسری سلطنت تھی، جو بڑی قوت کے درجے کی مدعی ہو سکتی تھی۔ سویڈن اور ہالینڈ سترھویں صدی میں جو بڑے بین الاقوامی کردار ادا کر چکے تھے، ان کا خاتمہ ان ملکوں کی کمزوری کے باعث ہو گیا تھا۔ چارلس دوازدہم (شاہ ہسپانیہ ۱۶۹۷ء تا ۱۷۱۸ء) کی ہمتوں نے سویڈن کے مردوں کا بہترین حصہ قتل کرا دیا اور سویڈن نے بحیرۂ بالٹک میں جو سلطنت قائم کی تھی، وہ درہم برہم ہو گئی (تفصیل آگے آئے گی)، چارلس کی وفات کے بعد دو گروہ نمودار ہوئے، جنھیں استہزاءً "ٹوپے[1]" اور "کلاہ[2]" کہتے تھے۔ یہ لوگ سیاسی اقتدار کے لیے باہم لڑتے رہے، یہاں تک کہ حکومت تقریباً برباد ہو گئی۔ ہالینڈ کی قوت لوئی چہاردہم کے خلاف جنگوں نے سلب کر لی تھی، ولندیزوں کے ہاتھ سے تجارتی قیادت چھن رہی تھی۔ وہ نہ کوئی بڑی بحری قوت مہیا کرنے کے قابل رہے تھے اور نہ ان کی کوئی آزاد خارجہ پالیسی تھی۔ اٹھارھویں صدی کا ہالینڈ فریڈرک اعظم کے الفاظ میں ایک چھوٹی سی کشتی تھی، جو انگریزی جہاز کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

ہسپانیہ کے تخت وتاج کے لیے جو بڑی جنگ ہوئی، اس کے نتیجے میں خود ہسپانیہ نے کوئی زیادہ نقصان نہ اٹھایا۔ یوٹریکٹ کے معاہدے (۱۷۱۳ء) کے مطابق بلجیم، نیز اٹلی کے بعض حصے چھن گئے۔ اس وجہ سے ہسپانوی سلطنت، جو بہت بے ڈھب ہو رہی تھی، اس پیمانے پر آ گئی کہ بہ آسانی اس کا انتظام کیا جا سکے۔ پہلے ہسپانیہ میں ہیپسبرگ خاندان کے جو خاندان حکمران رہے تھے، ان میں سے آخری حکمرانوں کے بجائے نئے بوربون بادشاہ یقیناً بہتر تھے۔ فلپ پنجم (۱۷۰۰ء۔ ۱۷۴۶ء) پہلا ہسپانوی بوربون بادشاہ تھا، جس نے ملک کے متحجر اداروں میں زندگی کی نئی روح پھونکی، کیونکہ وہ فرانسیسی سفیر اپنے ساتھ لے گیا، جنھوں نے لوئی چہاردہم کے نظام میں تجربے حاصل کیے تھے۔ نیز اس نے دو قابل منچلے آدمیوں کی خدمات حاصل کر لیں —— البرونی[3] اور ریپرڈا[4] —— جن کے عجیب وغریب کردار جان لا کے کردار سے بھی بازی لے گئے تھے۔ البرونی اٹلی کے ایک باغبان کا بیٹا تھا۔ وہ پہلے باورچی گری کرتا رہا، پھر اٹلی کی طرف سے میڈرڈ میں سفیر مقرر ہو گیا۔ آخر فرانس کا وزیر اعظم بن گیا اور کارڈینل کا رتبہ پایا۔ ریپرڈا ایک ولندیز تھا، جس نے کاروبار میں مہارتِ تامہ حاصل کی اور ڈپلومیٹ بن گیا۔ آخر فلپ سے اس کی نبھ نہ سکی اور سلطان مراکش کی ملازمت میں منسلک ہو گیا۔ مدت العمر کبھی پروٹسٹنٹ بن جاتا، کبھی کیتھولک۔

---

[1] Hats — [2] Caps — [3] Alberoni — [4] Ripperda

آخر اسلام قبول کر لیا اور اسی مذہب پر وفات پائی۔ فلپ اور اس کے ممتاز مشیروں نے ہسپانوی نظم کی غیر معمولی رسمیات ختم کر دیں، جن کی وجہ سے کاموں میں لامتناہی تاخیر ہوتی تھی۔ انھوں نے اس مجلسِ شوریٰ کے اختیارات گھٹا دیے، جن میں امراء کو غلبہ حاصل تھا اور یہی مجلسِ شوریٰ سترھویں صدی کے فرانس میں اختیار کا حقیقی مبنیٰ رہی تھی۔ علاوہ بریں نظام محاصل کی اصلاح کی۔ پارچہ بافی اور دوسری نئی صنعتوں کو تقویت پہنچائی۔ بحری قوت تعمیر کر لی اور ہسپانیہ کی امریکی سلطنت کے اہم نقاط میں قلعہ بندیاں کر لیں۔

لیکن ان اصلاحات سے ہسپانوی زوال کے بنیادی اسباب دُور نہ ہُوئے۔ گورنروں کی حرص اور تجارتی نظریۂ زر کی پابندیوں نے نو آبادیوں کی ترقی روکے رکھی۔ خود ہسپانیہ مفلس و قلّاش رہا۔ رجعت پسند امراء اور پادری اس کے لیے بار بنے ہُوئے تھے۔ آبادی بے حس تھی۔ سلطنت کے وسائل ناکافی تھے۔ خود فلپ ضعفِ اعصاب میں مبتلا تھا۔ مثلاً اس نے پاؤں کے ناخن کٹوانے سے انکار کر دیا اور یہ ناخن اتنے بڑھ گئے کہ وہ لنگڑا کر چلتا۔ اس کی دوسری بیوی ایلزبتھ فارنس[1] بڑی خود رائے تھی۔ وہی اس سے جو چاہتی، منوا لیتی۔ وہی البرونی کی نگران و سرپرست تھی۔ فلپ کے بعد تخت اس بیٹے کے لیے مخصوص تھا، جو پہلی بیوی کے بطن سے تھا۔ ایلزبتھ کی پوری زندگی صرف ایک نصب العین کے لیے وقف رہی اور وہ یہ کہ تخت اس کے دو بیٹوں کو مل جائے، جو فلپ سے تھے۔ ایلزبتھ نے ان کے لیے اطالوی ریاستیں حاصل کرنے کی جتنی کوششیں کیں، ان سے بار بار یورپ کا امن خطرے میں پڑتا رہا۔

---

[1] Farnese

چوتھا باب

اٹلی اور جرمنی

تمہید

بیسویں صدی میں دنیا غالباً سمجھ نے کہ اٹلی اور جرمنی مدت سے ممتاز طاقتیں چلی آتی ہیں، مگر حقیقتاً یہ دونوں ملک قومی سلطنتوں کے خاندان میں نسبتاً نو وارد ہیں۔ ان کا سیاسی اتحاد گزشتہ ایک صدی سے بھی کم مدت میں پایۂ تکمیل پر پہنچا۔ ۱۷۱۵ء میں اٹلی اور جرمنی قدیم تعبیر کے مطابق محض جغرافیائی نام تھے۔

تفرقہ زدہ اٹلی

سولھویں اور سترھویں صدی میں اطالوی ریاستیں وہ اقتصادی اور سیاسی قوت کھو چکی تھیں، جو انھیں دورِ احیاءِ علوم میں حاصل رہی۔ اس کے اسباب سمجھ لینا مشکل نہیں۔ سمندر پار نئی دنیائیں دریافت ہوئیں۔ ہسپانیہ، انگلستان اور دوسری اوقیانوسی طاقتیں بروئے کار آگئیں۔ اس وجہ سے بحیرۂ روم کی اہمیت طبعاً کم ہوگئی۔ خود بحیرۂ روم میں عثمانی ترک اور شمالی افریقہ میں ان کے متوسلین مدتِ دراز تک اطالوی جہاز رانی اور تجارت کے لیے خطرہ بنے رہے، پھر ۱۷۹۴ء میں فرانسیسیوں نے حملے شروع کر دیے اور اٹلی کو ان طاقتوں کی طرف سے براہِ راست تسخیر کا خطرہ پیدا ہو گیا، جو نئی نئی ابھر رہی تھیں۔

ہسپانوی ہیبسبرگ نے اٹلی کو فتح کر لیا اور ۱۷۱۵ء سے پیشتر تقریباً دو سو سال تک ہسپانیہ میلان، نیپلز اور سسلی پر براہِ راست حکمران رہا اور باقی جزیرہ نما پر بھی اسی کو غلبہ حاصل تھا۔ ہسپانوی تخت نشینی کی جنگ کے بعد یورپ میں توازنِ قوی کا ازسرِ نو انتظام کیا گیا تو اٹلی میں ایک اجنبی آقا کی جگہ دوسرے اجنبی آقا نے لے لی، یعنی آسٹرو ی ہیبسبرگوں نے اطالوی ریاستوں پر قبضہ جما لیا اور اپنے ہسپانوی چچیرے بھائیوں کی اطالوی سیادت خود سنبھال لی۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جزیرہ نما کے سیاسی نقشے سے واضح ہوتا ہے کہ آسٹریا لمبارڈی پر مسلط تھا۔ لمبارڈی کے دونوں پہلوؤں پر دو زوال پذیر تجارتی جمہوریتیں۔ وینس اور جینوا۔ تھیں اور شمال ومغرب کے پہاڑی علاقوں میں پیڈماں[ط] سیوائے کی ریاست تھی، جس کے اقتدار کا ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔ اصلاً اسے سارڈینیا کی بادشاہی کہنا چاہیے کیونکہ ۱۷۲۰ء میں بحیرۂ روم کا یہ جزیرہ یعنی سارڈینیا اسے مل گیا تھا۔ جزیرہ نما میں مزید نیچے ٹسکنی کی گرانڈ ڈچی تھی۔ اسے سابق میں جمہوریۂ فلارنس کہتے تھے۔ نیز پاپائیت کی جاگیریں تھیں

ط Piedmont—Savoy

اور آسٹریا کی دو سسلیاں۔ ان میں سے ہر ریاست ایک چھوٹی سی طاقت تھی۔ انتظامی اعتبار سے دو سسلیوں نیز پاپائی جاگیروں کی حالت وہی تھی، گویا وہ ازمنۂ وسطیٰ سے بھی پوری طرح باہر نہیں آ سکی تھیں۔

لیکن اٹھارھویں صدی کے یورپ میں اٹلی کو ایک ناقابلِ التفات علاقہ قرار دے کر ہمیں الگ نہ کرنا چاہیے۔ روما بدستور کیتھولک دنیا کا مرکز تھا۔ وینس میں بدستور بڑے بڑے مصوّر پیدا ہو رہے تھے اور نیپلز یورپی موسیقاروں کا معلّم تھا۔ پیدماں، لمبارڈی، ٹسکنی بلکہ نیپلز میں بھی اٹھارھویں صدی کی ذہنی اور اقتصادی ترقیات میں نمایاں حصّہ لیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اٹلی سیاسی توازنِ قوت میں خاص اہمیت کا حامل، مستقل جھگڑوں کا مرکز اور زیادہ طاقتور یورپی مملکتوں کے لیے مالِ غنیمت بنا رہا۔ ۱۷۲۰ء میں آسٹروی ہیبسبرگوں نے جزیرہ سسلی پر قبضہ کر لیا، جو ۱۷۱۳ء کے معاہدۂ یوٹریکٹ کے مطابق پیدماں کے حوالے ہوا تھا۔ پیدماں نے اس کے معاوضے میں سارڈینیا لے لیا، جو پہلے آسٹریا کو دیا گیا تھا۔ اس طرح آسٹروی ہیبسبرگوں کی خواہش یہ تھی کہ ہسپانیہ کی ملکہ ایلزبتھ فارنس کی اقتدار جوئی کا قصّہ ختم ہو۔ اٹھارھویں صدی کے چوتھے عشرے میں مبادلوں کا ایک پُرپیچ سلسلہ عمل میں آیا اور دو سسلیاں ایلزبتھ کے بڑے بیٹے "بیبی کارلوس[1]" کو مل گئیں۔ آسٹریا نے بعض چھوٹے چھوٹے علاقے لے لیے، ساتھ ہی ٹسکنی پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۶۸ء میں جینوا نے جزیرہ کارسیکا فرانس کے حوالے کر دیا۔ اٹلی میں مدافعت کی کوئی قوت نہ تھی اور وہ طبعاً حریص بادشاہوں اور سلطنت گردوں کا شکار بنا ہوا تھا۔

تفرقہ زدہ جرمنی —— ہیبسبرگوں کے علاقے

جرمنی بھی کم و بیش تین سو ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، جن میں سے بعض بڑی تھیں، بعض چھوٹی، بعض بہت ہی مختصر تھیں۔ ۱۶۴۸ء میں معاہدۂ ویسٹ فیلیا[2] کے مطابق تمام ریاستوں کے لیے حقوقِ سیادت تسلیم کیے جا چکے تھے اور ان کے برائے نام حاکمِ اعلیٰ یعنی مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ کا اقتدار درجۂ صفر پر پہنچ گیا تھا۔ جرمنی نے بھی سی سالہ جنگ اور لوئی چہاردہم کے حملوں کے تباہی خیز اثرات سے نقصان اٹھایا۔ پھر ازمنۂ وسطیٰ سے اس کے محاصل میں پیچیدگیاں چلی آتی تھیں اور پیمائش کے معیار بھی خاصے تکلیف دہ تھے، لیکن جرمنی اٹلی کی طرح مدافعت کی قوت سے محروم نہ تھا۔ اس میں دو طاقتیں خاصی بڑی تھیں، ایک آسٹریا، دوسرا پروشیا۔

آسٹروی ہیبسبرگوں نے اٹھارھویں صدی کے اوائل میں متعدد فوجی اور سفارتی فتوحات حاصل کیں۔ وہ خود مشرقی جانب پیشقدمی کے سلسلے میں ترکوں کے خلاف بڑھ رہے تھے اور لوئی چہاردہم کے خلاف آخری جنگ

---

[1] Baby Carlos بیبی کارلوس صرف اس لیے کہا کہ ملکہ اسے یونہی پکارتی تھی۔

[2] Westphalia

میں انھیں بلجیم نیز اٹلی کے کچھ حصے مل چکے تھے، لیکن ۱۷۱۳ء میں جو کچھ ان کے ہاتھ میں آیا، وہ آسٹریا اور ہنگری، بوہیمیا اور سیلیشیا کی مرکزی ہیپسبرگ زمینوں سے منفصل تھا۔ شہنشاہ چارلس ششم (۱۷۱۱ء - ۱۷۴۰ء) نے اپنی سلطنت کے وسیع اور بکھرے ہوئے حصوں میں اتحاد و استحکام پیدا کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ اس کا عہد حکومت صرف امراء کی منشور سلطانی کی تصدیق پر راضی کرنے میں صرف ہو گیا۔ یہ ایک دستوری راضی نامہ تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ بیٹے نہ ہونے کی صورت میں اس کی بیٹی میریا تھریسیا[1] تمام علاقوں کی وارث ہو گی۔ گویا یہ سلطنت، جو احتیاط سے محفوظ کر لی گئی، ایک خاندانی تخلیق تھی۔ یہ مختلف سرزمینوں کا ایک مجموعہ تھا، جن کے درمیان مشترکہ مفاد یا حقیقی اتحاد کا کوئی قابلِ ذکر رشتہ موجود نہ تھا۔ منشور سلطانی پر رضامندی حاصل کرنے کے سوا چارلس ششم، آسٹریا، بوہیمیا اور ہنگری کے خلاف کچھ نہ کر سکا، جنھوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے حقوق محفوظ رکھے اور جو مقامی جاگیروں اور ان کی پارلیمنٹوں پر ضبط و نظم قائم کیے ہوئے تھے۔ وہی محاصل کی منظوری دیتے، وہی افسر مقرر کرتے۔

مالیات اور فوج ہیپسبرگ نظام کی سب سے بڑی عملی کمزوری تھے۔ اگرچہ چارلس اتنی بڑی آبادی پر حکمران تھا، جو ہسپانیہ سے دگنی تھی، لیکن اس کا مالیہ برطانیہ کے نصف سے بھی کم تھا۔ ۱۷۴۰ء میں اس نے وفات پائی۔ اس وقت فوجی اور ملکی محکموں کی دو سال کی تنخواہیں ذمے تھیں، لہٰذا تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگرچہ فوج کی تعداد رجسٹروں میں ایک لاکھ تھی، مگر اصل میں اس سے کم تھی اور یہ فوج پروشیا سے جنگ آزمائی کے لیے ہرگز تیار نہ تھی اور اٹھارھویں صدی کے پانچویں عشرے میں پروشیا کی جنگ پیش آ گئی۔

پروشیا کا عروج

آسٹریا کو ایک بڑی طاقت کے ظواہر ضرور میسّر تھے، لیکن حقائق میسّر نہ تھے۔ اس کے برعکس پروشیا کے پاس ظواہر بہت کم تھے، مگر حقائق بدرجہا زیادہ حاصل تھے۔ ۱۷۱۵ء میں پروشیا دوسری جرمن ریاستوں کی طرح محض ایک چھوٹی سی ریاست معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاقے شمالی جرمنی میں مغربی جانب دریائے رہائن سے مشرقی جانب دریائے وسچولا تک پھیلے ہوئے تھے، بلکہ اس دریا سے بھی مزید مشرقی جانب جاتے تھے۔ ان خطّوں کی حالت ریت اور دلدلوں کے باعث نیم صحرائی تھی اور علاقوں کی زمینوں میں طبعی وسائل بہت معمولی تھے، صرف تجارت کا سلسلہ معمولی طریق پر جاری تھا۔ آبادی تیس لاکھ سے کم ہو گی اور اس لحاظ سے پروشیا کو یورپی مملکتوں میں بارھواں درجہ حاصل تھا۔ اس کا پایۂ تخت برلین دریائے سپری[2] پر واقع تھا، جسے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ روما، قسطنطنیہ، پیرس، لندن اور دوسرے بڑے مراکزِ حکومت کو جو جغرافیائی فوائد حاصل تھے، برلین ان سے بھی محروم تھا۔

کوئی بھی دانش مند پیش گو سمجھ سکتا تھا کہ آسٹریا جو کیتھولک مذہب کا پابند تھا، کبھی جرمنی کو متحد نہ کر سکے گا۔ جہاں

---

[1] Maria Theresa

[2] Spree

پروٹسٹنٹزم کو غلبہ حاصل تھا، البتہ وہ یہ پیش گوئی کر سکتا تھا کہ اگر نئی جرمنی وجود میں آئی تو اس کا مرکز فرینکفرٹ ہوگا، جو علاقۂ دریائے رھائن کے قلب میں واقع تھا یا سیکسنی کے لائپزگ[1] یا ڈریسڈن کو یہ عزت حاصل ہوگی، لیکن برلین کو وہ اس غرض سے منتخب کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا، جس میں فروغ و ترقی کا کوئی جوہر نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہوہینزولرن[2] کا معمولی خاندان اس فروغ و ترقی کا علمدار بن سکتا تھا۔ پروشیا کی عظمت بڑی حد تک بہت قابل ہوہینزولرن حکمرانوں کے ایک طویل سلسلے کی سرگرمیوں کے باعث شروع ہوئی اور حکمرانوں میں سے اس کا آغاز سترھویں صدی کے بڑے ایلیکٹر[3] سے ہُوا۔

ہوہینزولرن کے خاندان کی حکومت کی بنیاد پندرھویں صدی میں برنیڈن برگ کے ایلیکٹر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ جو دریائے ایلب اور دریائے اوڈر کے درمیان واقع تھا اور ازمنۂ وسطیٰ میں مشرق کی طرف پیش قدمی کو ایک چوکی سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک ہوہینزولرن ٹیوٹونی نائٹوں کا رئیس تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے اواخر میں ٹیوٹونی نائٹوں نے جرمنی کی سرحدیں وسچولا کی مشرقی جانب اس سرزمین تک پہنچا دیں، جسے پروشیا کہتے تھے اور جو بحیرۂ بالٹک کے جنوبی و مغربی گوشے میں واقع تھا۔ ۱۵۲۵ء میں برنیڈن برگ کا علاقہ پروشیا کو مل گیا، لیکن یہ ہوہینزولرن حکمرانوں کی قوت کے مرکز سے منقطع تھا کیونکہ بیچ میں پولینڈ کی زمینیں آجاتی تھیں۔ مغربی جرمنی میں ہوہینزولرن حکمرانوں نے سترھویں صدی کے اوائل میں دریائے رھائن کی زیریں وادی کے اندر کچھ علاقے حاصل کر لیے (کلیوز[4] اور مارک[5])۔ دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا جو سلسلہ قائم تھا، ان کی وجہ سے کلیوز اور مارک کے علاقے برنیڈن برگ سے الگ ہو گئے تھے۔

غرض جب فریڈرک ولیم (بڑا ایلیکٹر ۱۶۴۰ء۔ ۱۶۸۸ء) میں ہوہینزولرن ریاست کا وارث بنا تو سی سالہ جنگ اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ اس کے زیادہ تر مقبوضات برنیڈن برگ میں واقع تھے۔ مشرقی اور مغربی جانب متفرق علاقے بکھرے ہُوئے تھے۔ برنیڈن برگ پروشیا کے حکمرانوں نے آئندہ دو سو سال کے لیے غیر معمولی استقلال کے ساتھ اپنے علاقے کے بکھرے ہُوئے ٹکڑوں کو یکجا کرنے کی کوشش جاری رکھیں۔ یہ ایسا کام تھا، جو ۱۸۶۶ء میں کامیابی کی آخری منزل پر پہنچا۔ جرمنی کے دوسرے حکمران خاندانوں میں سے بڑے حریفوں — ہیبسبرگ جن کے قبضے میں وسیع غیر جرمن زمینیں تھیں، سیکسنی کے ویٹن[6] جن کے پاس پولینڈ کا تاج تھا، ہینوور کے گویلف[7]، جو

---

[1] Leip zig
[2] Hohenzollern
[3] Elector اس کے معنی ہیں انتخاب کرنے والا۔ جرمنی کے جن حکمرانوں کو شہنشاہ کے انتخاب کا اختیار ملا تھا، انھیں ایلیکٹر کہتے تھے۔
[4] Cleves
[5] Mark
[6] Wettins
[7] Guelfs

تاجِ انگلستان کے مالک بن گئے تھے — کے برعکس برنیڈن برگ پروشیا کے حکمرانوں نے جرمنی سے باہر کسی ترغیب میں اُلجھ جانے سے عموماً احتراز کیا۔ جب آگے چل کر وہ پولینڈ کی تقسیم میں حصہ دار بنے تو انھوں نے اپنی پولستانی سرزمینوں پر جرمن اُمراء کو آباد کیا۔

بڑے ایلیکٹر کی خارجہ پالیسی کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ پومیرینیا کے علاقوں میں سے اہلِ سویڈن کو نکال دیا جائے۔ یہ علاقے برنیڈن برگ اور بحیرۂ بالٹک کے درمیان واقع تھے اور ۱۶۴۸ء میں سویڈن نے ان پر قبضہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب لوئی چہاردہم سے ولندیزوں کو جنگ پیش آئی تو ایلیکٹر نے سترھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں سویڈن کے خلاف فرانس سے اتحاد کیا۔ پھر ۱۶۷۵ء میں پروشیا نے فہربیلن[1] کی لڑائی میں سویڈن کو شکست دی اور ۱۶۷۹ء میں صلح ہوئی تو پروشیا کو کچھ نہ ملا۔ یہ امر ایلیکٹر کے لیے سخت مایوسی کا باعث ہُوا۔ بڑے ایلیکٹر کا بیٹا فریڈرک اوّل (۱۶۸۵ء - ۱۷۱۳ء) درمیانے درجے کا آدمی تھا۔ اس کے عہد میں پروشیا نے ان جنگوں میں بہت معمولی حصہ لیا، جن میں لوئی چہاردہم کو نیچا دکھایا گیا۔ چنانچہ یوٹریکٹ کے معاہدے میں پروشیا کو بہت معمولی علاقے ملے۔

تاہم ہوہینزولرن حکمرانوں کے وقار میں مفید اضافہ ہُوا۔ ۱۷۰۱ء میں فریڈرک نے ہسپانوی تخت نشینی کی جنگ میں شرکت کی اور اپنے لیے شاہ پروشیا کا لقب حاصل کر لیا۔ اس نئی حیثیت کی توثیق یوٹریکٹ کے معاہدے میں ہو گئی۔ اگرچہ فریڈرک اصلاً خاص پروشیا کا بادشاہ تھا، جو مقدس رومی سلطنت کے حدود سے باہر واقع تھا، لیکن محض جزوی شاہی لقب نے خاندان کے لیے ایک نئے وقار کا انتظام کر دیا۔ پہلے ہوہینزولرن بادشاہ کے پوتے فریڈرک اعظم کے الفاظ میں:

> "جو شے ابتدا میں محض ایک بے بنیاد فخر کا کرشمہ سمجھی جاتی تھی، وہ تدبّر کا شکار بن گئی۔ شاہی تاج ایک طُعمہ تھا، جو فریڈرک نے اپنے جانشینوں کے سامنے رکھ دیا اور جس کی بناء پر وہ تمام جانشینوں سے کہتا ہُوا معلوم ہوتا تھا: مَیں نے تمھارے لیے ایک لقب مہیّا کر دیا ہے، اب تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو۔"[2]

بڑے ایلیکٹر نے خود زمین پوری طرح ہموار کر دی تھی تاکہ اس کے جانشین بادشاہی کی ذمّہ داریاں اٹھالیں۔ اس کے مقبوضات سی سالہ جنگ میں تباہ ہو چکے تھے۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ نصف آبادی کٹ چکی تھی۔ فوج صرف چند ہزار

---

۱ Fehrbellin

۲ یہ اقتباس رابرٹ ایرگینگ Eagang کی کتاب Potsdam Fuhrer میں نقل ہوا۔

آدمیوں کا ایک غیر منظم گروہ رہ گئی تھی۔ اس نے بڑے اہتمام سے تمام نقصانات کی تلافی کی۔ اس نے پولستانی یہودیوں اور مذہبی ظلم و جور سے بھاگے ہوئے دوسرے پناہ گزینوں ۔۔ خصوصاً بیس ہزار فرانسیسی ہیوجیناٹوں ۔۔ کی حوصلہ افزائی کی اور ہیوجیناٹوں کو بعض محاصل سے بھی جزواً مستثنیٰ کر دیا۔ بڑے الیکٹر نے ایک مختصر مگر کارداں باقاعدہ فوج مرتب کی، جس کی بدولت پروشیا کو لوئی چہاردہم کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کے لیے بیرونی ملکوں سے بڑی بڑی اعانتی رقمیں مل گئیں۔ امن کا وقت آجاتا تو الیکٹر اپنے سپاہیوں کو امور عامہ کے ضروری کاموں میں لگا دیتا۔ مثلاً دریائے ایلب اور دریائے روڈا کے درمیان نہر کی تیاری، برلن کے مشہور پارک کی تاسیس، تیرگارٹن[۱] اور انٹروڈن لنڈن[۲] جیسے بونیواردوں کی تعمیر۔

بڑے الیکٹر نے آخر میں سب سے بڑا اور اہم کام یہ انجام دیا کہ انتظامی معاملات میں اپنے خاندان کے لیے مرکزی مطلق العنانی کا نظام استوار کر دیا۔ ہوہینزولرن خاندان کی مشرقی سرزمینوں کے امراء کو جنکر[۳] کہتے تھے۔ الیکٹر نے ان کی خودنمائی پر پابندیاں عائد کیں۔ بہ ایں ہمہ انھیں فرانسیسی امراء کی طرح بالکل بیکار و معطل کر کے نہ بٹھا دیا، بلکہ ان کی جاگیروں میں زرعی غلاموں پر ان کے اقتدار کی توثیق کر دی۔ البتہ جنکروں کو صوبائی پارلیمنٹوں میں جو اقتدار حاصل تھا، اسے کم کر دیا اور برلین کو مملکتِ پروشیا کا حقیقی سیاسی مرکز بنا دیا۔ اس نے محاصل لگانے کا اختیار آہستہ آہستہ اپنے قبضے میں لے لیا اور اپنے مقرر کیے ہوئے آدمیوں سے یہ خراج وصول کرتا۔ یہی انتظام پروشیا کی مشہور سول سروس کی بنیاد بن گیا۔ اس طرح جو روپیہ حاصل ہوتا، وہ فوج پر خرچ کیا جاتا، جس کے افسر بڑی حد تک جنکروں میں سے چنے جاتے تھے۔ اٹھارھویں صدی تک کسی جنکر کے لیے شاہی خدمت کے سوا اور کوئی شغل ہی نہ تھا۔ بڑے الیکٹر کی امداد لوتھری کلیسا نے کی، جو عوام کو نظم و اطاعت کا سبق دیتا رہا۔ انھیں مقاصد کی پیشبرد کے لیے تعلیمی نظام تیار کیا گیا تھا۔

بڑے الیکٹر کا بیٹا فریڈرک اوّل لوئی چہاردہم کے شان و شکوہ کی نقالی کے جنون میں مبتلا تھا اور بہت سے جرمن حکمران بھی اسی جنون کا شکار تھے، جو پورے براعظم میں پھیلا ہوا تھا۔ فریڈرک کا خیال تھا کہ شادی ہی ایک بیوی کا پابند رہنا بادشاہ کی عظمت میں اضافے کا باعث ہے، لہٰذا اس نے بیوی سے حسنِ تعلقات کے باوجود ایک سرکاری داشتہ رکھ لی اور اس کے ساتھ بعد دوپہر بڑے اہتمام سے چہل قدمی کرتا۔ ورسائی میں عیش رانی کی گوناگوں صورتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ فریڈرک نے ان کی نقالی کی فضول کوششوں میں مملکت کو دیوالے کے گڑھے پر پہنچا دیا، تاہم وہ بادشاہ فریڈرک اوّل بن گیا۔ خود اس نے اور اس کی لائق ملکہ نے اپنی سرپرستی

۱؎ Tiergarten ۲؎ Unter Den Linden ۳؎ Junker

کی بدولت اہلِ علم اور فنکاروں کو اپنے دربار میں کھینچ لیا۔

فریڈرک ولیم اوّل

ہوہینزولرن خاندان کا دوسرا بادشاہ فریڈرک ولیم اول (سنہ ۱۷۱۳ء - سنہ ۱۷۴۰ء) تھا، جس نے بڑے ایلیکٹر کا مسلک اختیار کر لیا۔ فریڈرک اعظم نے اس تبدیلی کو ایک جامع قول میں یوں پیش کیا: "فریڈرک اوّل کے عہدِ حکومت میں برلین شمالی علاقوں کا ایتھنز بن گیا۔ فریڈرک ولیم کے عہدِ حکومت میں اس نے سپارٹا کی حیثیت اختیار کر لی۔" اس بادشاہ کی توجہات کا مرکز تین امور تھے، یعنی کفایت شعاری، مطلق العنانی اور فوج۔ والد کے لیے پُرتکلف تدفین کا انتظام کر چکنے کے بعد فریڈرک ولیم اوّل نے دربار کے تمام فالتو اور زائد ملازمین بیدردی سے برطرف کر دیے اور حکومت کے مصارف بے حد گھٹا دیے۔ اس نے حکم دے دیا کہ ہر دائرے میں توفیر دکھاؤ۔ اس طرح بھرپور خزانہ اپنے بیٹے کے حوالے کیا، لیکن وہ اُن منصوبوں میں روپیہ خرچ کرتے وقت خست سے کام نہ لیتا، جنھیں کسی نہ کسی اعتبار سے ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے جنوبی سمت کے بارہ ہزار جرمن پروٹسٹنٹوں کو نکال کر مشرقی پروشیا میں نئی زمینوں پر آباد کرنے کے سلسلے میں بے تکلف خرچ برداشت کر لیا۔

مرکزیت کی تقویت کے لیے فریڈرک ولیم نے ماہر منتظموں کی ایک چھوٹی سی مجلس بنا دی، جو تمام صوبوں اور سرکاری محکموں کا انتظام کرتی۔ اس مجلس کا نام جرمن زبان کے کم و بیش پچاس حرفوں کے ایک لفظ میں بیان کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں یوں ہوگا، جنرل[1] سپیریر فائننس اور اینڈ ڈومین ڈائرکٹری۔ اختصاراً اسے جنرل ڈائرکٹری کہتے تھے۔ بادشاہ کو محنت، جفاکشی اور پابندیِ وقت پر بے حد اصرار تھا۔ جنرل ڈائرکٹری کے مشیروں سے بھی وہ عام افسروں کا سا سلوک کرتا۔ بہت کم تنخواہ دیتا اور اگر کسی کام میں ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اپنے ہاتھ سے انھیں بید لگاتا۔ اگر کوئی شخص جنرل ڈائرکٹری کے روزانہ اجلاس کے لیے ذرا دیر سے آتا تو بھاری جرمانے کا سزاوار ہوتا اور اگر کوئی شخص معقول عذر کے بغیر اجلاس میں شریک نہ ہوتا تو اسے چھ مہینے کے لیے قید کر دیا جاتا۔

فریڈرک ولیم نے باقاعدہ فوج کی تعداد دگنی کر دی، لیکن ملک کی آبادی کم تھی اور مزدوروں کی تعداد بحال رکھنے کے لیے اس نے حکم دے رکھا تھا کہ فوج کے سپاہی سال بھر میں نو مہینے چھٹی پر رہیں اور اس اثنا میں کھیتوں پر کام کریں۔ توپوں اور وردیوں کے لیے اس نے سرکاری کارخانے قائم کیے۔ فوج اس کی فضول خرچی کا واحد ذریعہ تھی۔ اس نے ایک رجمنٹ ایسی مرتب کی، جس میں طویل القامت آدمی لیے جاتے۔ ہر ایک کا قد چھ فٹ یا اس سے اوپر ہوتا۔ وہ خاص ٹوپیاں پہنتے، جو کم از کم ایک فٹ اونچی ہوتیں۔ اس طرح ان سپاہیوں کے قامت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

[1] General Superior Finance war and Domain Directory یعنی جنگ و مملکت کے مالیات کی عام اعلیٰ نظامت +

اس رجمنٹ کے لیے بادشاہ نے کفایت شعاری سے دست برداری اختیار کر لی۔ کوڑیوں آدمی ملازم رکھے کہ مختلف جرمن مملکتوں میں پھر پھر کر طویل القامت آدمی تلاش کریں اور انھیں زیادہ سے زیادہ تنخواہیں دے دیں۔ ان کے لیے گھوڑے بھی وہ مہیّا کیے، جو انعام پا چکے تھے۔ فریڈرک ولیم کو امید تھی کہ اگر اپنے طویل القامت سپاہیوں کی شادیاں ویسی ہی عورتوں سے کرے گا تو عام انسانوں سے بالاتر انسانوں کی ایک نئی نسل پیدا ہو جائے گی، لیکن ایسی شادیوں کے نتیجے میں جو بچّے پیدا ہوئے، وہ اوسط قامت کے تھے، اس وجہ سے بادشاہ کی ہمّت پر اوس پڑ گئی اور تجربہ ناکام ثابت ہُوا۔

اٹھارھویں صدی کے مبصّر فریڈرک ولیم کے پروشیا کو "مسلح چھاؤنی" کہتے ہیں، تو یہ بالکل بجا ہے۔ قدیم زمانے کے اہل سپارٹا کی طرح فریڈرک ولیم بھی جنگ کے لیے تیّاریاں کرتا رہا۔ ثقافت، تہذیب اور علوم و فنون پر شاذ ہی توجّہ کی۔ فرانسیسی زبان کو وہ حقیر سمجھتا تھا۔ اپنی رعایا کی تعلیم سے بھی اس نے تغافل برتا۔ اپنی خسّت اور تنگ نظری کے باعث اس نے ججوں اور قانون دانوں کی ناکافی تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ اس وجہ سے رشوت خوری اور تساہل پروشیا کے محکمۂ عدل میں رکاوٹ بن گئے۔

یہ نظام بڑی اچھی طرح کام کرتا رہا۔ اگرچہ جنکروں کا نقطۂ نگاہ پُرانی وضع کا تھا، مگر وہ ہوہینزورن حکمرانوں کے بڑے وفادار تھے اور ان میں سے بعض اٹھارھویں صدی کے بہترین فوجی افسر ثابت ہُوئے۔ اگرچہ فوج تعداد میں فرانس روس اور آسٹریا کی فوجوں سے کم تھی، لیکن قواعد کے اعتبار سے بدرجہ بہتر اور نظم کے اعتبار سے یورپ بھر میں نہایت بلند پایہ تھی۔ جب سنہ ۱۷۴۰ء میں فریڈرک ولیم اوّل نے وفات پائی تو پروشیا کا داؤد آسٹریا کے جالوت سے لڑنے کے لیے تیار تھا۔[۱]

---

[۱] مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت داؤد ؑ جالوت کے مقابلے میں بہ ظاہر بہت حقیر تھے، اسی طرح پروشیا آسٹریا کے مقابلے میں بہت حقیر تھا، لیکن حضرت داؤد ؑ کی طرح پروشیا بھی فتح مند و کامران ہونے والا تھا۔

پانچواں باب

مشرقی یورپ کی طاقتیں

روس پیٹر اعظم کے ماتحت اٹھارھویں صدی کے اوائل میں پروشیا کی طرح روس نے بھی پہلی مرتبہ یورپی توازن میں ایک بڑے عنصر کی حیثیت اختیار کی۔ روس کی اس نئی اہمیت کا ذمہ دار زار پیٹر اعظم تھا (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۲۵ء)۔ یہ بڑا چوڑا چکلا آدمی تھا، چھ فٹ چھ انچ قد، گویا فریڈرک ولیم کی خاص رجمنٹ میں شامل ہونے کے لائق تھا۔ جب پے در پے بغاوتوں سے اُسے غصّہ آیا، تو اس نے مجرموں کے سر اپنے ہاتھ سے قلم کیے اور جب شراب نوشی کی کوئی محفل آراستہ کر لیتا تو اتنی شراب پیتا کہ ہفتوں تک کسی چیز کا کوئی سراغ نہ ملتا۔ اس سلسلے میں درباریوں کی زندگیوں کو خطرہ لگا رہتا۔ پیٹر چاہتا تھا کہ درباری ہر حال میں اس کا ساتھ دیں۔ ان بے اعتدالیوں سے خود زار کے آہنی جسم کو سخت نقصان پہنچ گیا۔

اوائلِ شباب ہی میں پیٹر پر شراب کا جادو چل گیا تھا۔ اس نے جرمن، ولندیز اور انگریز تاجروں اور طالع آزماؤں سے گفت و شنید کی، جو ماسکو کے جرمن حصے میں رہتے تھے۔ اسی طرح جو ولندیزی جہاز آرک اینجل کی بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوتے، ان کے ملاحوں سے ربط ضبط پیدا کرتا۔ اہلِ مغرب کی فوجی قوت اور فنّی کارناموں سے وہ اس قدر مسحور ہُوا کہ خود یورپ کے مختلف ملکوں کے دورے کا فیصلہ کر لیا (۱۶۹۷ء۔ ۱۶۹۸ء)۔ چھ سَو سال کے بعد یہ پہلا موقع آیا تھا، جب ایک روسی شہنشاہ نے فوجی مہم کے علاوہ وطن سے قدم باہر نکالا۔ پیٹر ایک ولندیزی گودی میں معمولی شاگرد کے طور پر کام کرتا رہا۔ یوں اس نے براہِ راست انگریزوں کے بحری اسلحہ کے بارے میں عملی معلومات حاصل کیں۔ اس کی آرزو سب سے بڑھ کر یہ تھی کہ روسی فوج کو اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دے اور مغربی طرز کا ایک بیڑا تعمیر کرے۔ اس طرح اسے امید تھی کہ روس بحیرۂ بالٹک کے علاقے سویڈن سے چھین لے گا اور جنوبی جانب ترکی سے مختلف علاقے چھین لے گا۔ اس نے بڑی شمالی جنگ میں سویڈن کو تباہ کر دیا (اس کی تفصیل آگے آئے گی)، اور اگرچہ ترکوں کو فیصلہ کن شکست نہ دے سکا مگر اس نے بعد کی روسی کامیابیوں کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

پیٹر نے داخلی پالیسی میں جو جدّتیں کیں، ان کا مدعا محض یہ تھا کہ فتح و تسخیر کے لیے میدان آراستہ ہو جائے۔ جنگ کے لیے مصارف کی ضرورت تھی۔ مصارف کے لیے مالیے میں اضافے ہی سے انتظام ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے محصولِ سر عائد کر دیا، جسے روسی ہر روح پر محصول کہتے تھے۔ فوج کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اس کے لیے

افسروں کی ضرورت تھی اور نظم ونسق کے لیے بھی بہت سے آدمی درکار تھے۔ چنانچہ اس نے بڑے بڑے آدمیوں کو مجبور کر دیا کہ سلطنت کی جو خدمت ان پر واجب ہے، اسے پابندی سے ادا کریں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جو شخص اپنا نام رجسٹر کرانے میں ناکام رہے گا، یہ سمجھا جائے گا کہ وہ شہری حیثیت میں مر چکا ہے یعنی اسے قانون کی حفاظت سے باہر سمجھا جائے گا اور ہر شخص اس پر حملہ کر سکے گا۔ نتائج کا اسے کوئی خوف نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے سب کے لیے مدت العمر تک جبری خدمت کا اصول جاری کر دیا۔ ہر امیر آدمی کو حکم تھا کہ اپنی جاگیر کسی بیٹے کے حوالے کرے تاکہ ہر پشت کے درمیان یہ تقسیم نہ ہوتی رہے۔ پندرہ سال کی عمر میں ہر لڑکے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خدمت کی غرض سے حاضر ہو جائے اور اسے کسی کام پر متعین کر دیا جائے، خواہ فوج میں ہو یا نظم ونسق کے محکموں میں یا دربار میں۔ پیٹر اپنے امراء سے عموماً وہ کام لیتا تھا، جنھیں وہ اپنے درجے سے فروتر سمجھتے تھے۔ وہ ان کے مناصب بیرونی لوگوں اور نو واردوں کے حوالے کر دیتا اور انھیں خطاب دے دیتا۔ اس قسم کی تذلیلات کو امراء چنداں اہم نہیں سمجھتے تھے۔ پیٹر نے رفتہ رفتہ خدمت گار امراء کا ایک پورا طبقہ پیدا کر لیا، جو ہر معاملے میں زار کا دست نگر تھا۔ نظم ونسق میں پیٹر نے جرمنی اور ہالینڈ سے مختلف محکموں کے نام مستعار لیے اور مرکزی تنظیم حکومت سویڈن کے انداز پر کی۔ اس سلسلے میں قابل ذکر وہ قاعدہ ہے، جس کے مطابق ہر وزارت کا کام ایک وزیر کی نگرانی میں نہیں چھوڑا جاتا تھا، بلکہ ناظموں کی ایک مجلس نگرانی کے لیے مقرر کر دی جاتی تھی۔ یہ نظام گراں بار ضرور تھا، مگر اس میں رشوت خوری مشکل ہو گئی کیونکہ مجلس کے ایک رکن کو اس کے دوسرے رفیق جہاں چاہتے روک سکتے تھے۔

پیٹر نے ایک کام یہ کیا کہ مرکز حکومت ماسکو سے، جو روس کے مرکز میں واقع تھا، سینٹ پیٹرز[ل] برگ میں منتقل کر لیا، جو سلطنت کے شمالی و مغربی گوشے میں بحیرۂ بالٹک کی ایک شاخ پر واقع تھا۔ نیا دار الحکومت اس نے اس زمین پر بنایا، جو اہل سویڈن سے چھینی گئی تھی۔ اپنے تمام امراء کو مجبور کیا کہ وہ سینٹ پیٹرز برگ میں عالی شان ایوان تعمیر کریں۔ اس مقام کو وہ مغربی دریچہ کہا کرتا تھا۔ تجارتی اور جنگی نقطۂ نگاہ سے سینٹ پیٹرز برگ واقعی ایک دریچہ تھا، کیونکہ نئے شہر کے بندرگاہ بن جانے کی امید تھی۔ ایک فرانسیسی سیاح نے نئے دار الحکومت کے متعلق کہا کہ یہ عالی شان قصروں کا شہر ایک الگ تھلگ مقام کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اس مقام کے بعض حصے نشیب میں واقع

ل St. Petersburg یہ اس مقام کا ابتدائی نام تھا، کیونکہ پیٹر نے اسے آباد کیا تھا لیکن لفظ برگ جرمن تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۴ء کی لڑائی شروع ہوئی تو اس نام کو روسی شکل دے کر پیٹرو گراڈ Petrograd بنا دیا گیا، پھر بالشویزم کی کامیابی کے بعد لینن کی یادگار میں اسے لینن گراڈ بنا دیا گیا۔

تھے، جہاں ہر وقت سیلاب کا خطرہ تھا اور یہ اندرونِ رُوس کے غلّہ پیدا کرنے والے مزرعوں سے خاصا دُور تھا۔ پیٹرز برگ میں بود و ماند کا خرچ بہت زیادہ تھا اور یہ امر بجائے خود خطرے کا باعث تھا۔ سیکڑوں مزدوروں کی جانیں شہر کی تعمیر میں تلف ہُوئیں۔ بھیڑیوں کے غول بازاروں میں پھرتے۔ ایک روز بعد دوپہر چند بھیڑیے ایک عورت کو پھاڑ کر کھا گئے۔ یہ دردناک واقعہ زار کے ایک خاص منظورِ نظر کے مکان کے عین سامنے پیش آیا، لیکن پیٹر کے نزدیک اس قسم کی مشکلات بے معنی تھیں، بلکہ وہ ان سے لطف اٹھاتا تھا۔

اگرچہ آرتھوڈکس کلیسا پہلے ہی سے عموماً رُوسی مملکت کے تابع تھا، مگر پیٹر نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ مذہبی گروہ کی طرف سے ہر ممکن مخالفت کو ختم کر کے چھوڑے گا۔ چنانچہ ۱۷۰۰ء میں بطریقِ اعظم نے وفات پائی تو زار نے اس کا کوئی جانشین مقرر نہ کیا۔ پھر اس نے کلیسا میں بھی وہی طریقہ رائج کر دیا، جو نظم و نسق میں رائج تھا۔ چنانچہ اس نے ایک چھوٹی سی تنظیمی مجلس بنا دی، جس کا نام پہلے روحانی مجلس رکھا گیا، پھر اسے ہولی[1] ڈائرکٹنگ سنڈ کہتے تھے۔ ایک شخص کو اس کا رئیس مقرر کیا جاتا اور وہ مذہبی گروہ میں سے نہ ہوتا۔ پیٹر نے بطریق کا عہدہ منسوخ کر دینے کے اسباب بڑی بے تکلفی سے صاف صاف بیان کر دیے:

"کلیسا کا انتظام ایک مجلس کے حوالے کر دینے سے ملک کو فسادات و مشکلات کا ویسا خطرہ نہیں رہا، جیسا ایک روحانی رئیس کی حیثیت میں ہو سکتا تھا۔ عام لوگ روحانی قوت اور مطلق العنانی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے، بلکہ سب سے بڑے مذہبی عہدہ دار کی شان و شکوہ سے متاثر ہو کر وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بھی کوئی دوسرا حکمران ہے اور اس کے قبضے میں بھی وہی اختیارات ہیں، جو مطلق العنان بادشاہ کے ہو سکتے ہیں، بلکہ اس سے زیادہ اختیارات ہیں اور روحانی قوت ایک دوسری اور بہتر دنیا کے لیے ہے۔ اگر زار اور بطریق کے درمیان اختلافِ رائے رونما ہو جائے تو بدرجہا آسانی سے لوگوں کو اس امر پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بطریق کے ساتھ ہو جائیں۔ اس غلط عقیدے کے ماتحت کہ وہ خدا کے لیے لڑ رہا ہے اور منصوبہ بازوں سے ایسی حرکت کا سرزد ہونا ممکن ہے۔"[2]

پیٹر قدیم مذہبی رسموں اور ریتوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس نے حکم دے دیا کہ تقویم کی ابتدا مسیحؑ کی پیدائش سے کی جائے۔ مغربیوں کا طریقہ یہی تھا۔ اس کے برعکس روسیوں کے ہاں وہ تقویم رائج تھی، جس میں سنین کا حساب ابتدائے تخلیق

---

۱ Holy Directing Synod یعنی مقدس مجلسِ ہدایت۔

۲ یہ اقتباس شوئیلر Schuyler کی کتاب پیٹرِ اعظم Peter the Great سے لیا گیا ہے، جلد دوم ص ۳۶۹۔

سے کیا جاتا تھا۔ اس نے جا بجا مغرب کی سرپرستی میں پیشوں اور فنون کی تعلیم کے لیے درسگاہیں جاری کر دیں۔ اس طرح تعلیم کے سلسلے میں پادریوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ روس ایک ہی پشت کے دوران میں مغربی طور طریقے اختیار کر لے، چنانچہ اس نے بیرونی ملکوں کی سائنٹیفک کتابوں کا ترجمہ روسی میں کر کے چھپوانے کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ سب داڑھیاں منڈا دیں۔ تمباکو پینے لگیں اور اپنے عام ڈھیلے ڈھالے لباس کی جگہ مغربی لباس پہن لیں۔ جس آدمی کے داڑھی ہوتی، اس سے محصول لینے کے لیے حکومت کے کارندے شہر کے دروازوں پر موجود رہتے اور دھات کی ایک خاص تختی دے دی جاتی تھی، جس پر یہ الفاظ کندہ ہوتے: "داڑھی ایک بے سود بار ہے۔"

آرتھوڈکس کلیسا نے مدت سے تعلیم دے رکھی تھی کہ انسان داڑھی والے خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا۔ روسیوں کی اکثریت داڑھی کے متعلق پیٹر کے نظریات کو گمراہی کا کرشمہ سمجھتی اور اس طرح اس کی تمام جدتوں کا ماتم کیا جاتا، جو لوگ زیادہ دیندار تھے، وہ زار کو دجال سمجھتے تھے یا کہتے تھے کہ یہ دنیا کے خاتمے کا نقیب ہے۔ تمام طبقے پیٹر کے ظلم و جور سے چیخ رہے تھے۔ امراء اور پادریوں کی امیدیں ایلیکسس[1] سے وابستہ تھیں، جو پیٹر کا بیٹا تھا، مگر اس سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ پیٹر نے اس نوجوان کو عذاب دے دے کر مروا دیا۔ کتابوں کا ترجمہ اچھے طریقے پر نہ کیا گیا اور وہ نہ فروخت ہو سکیں، نہ کسی نے انھیں پڑھا۔ آخر وہ آرتھوڈکس مذہب کی دعاؤں اور نمازوں کی کتابوں کے لیے غلاف کا کام دیتی رہیں۔ پیٹر کے خلاف قدامت پسندوں کا ردِ عمل اس سے زیادہ اچھے طریقے پر کیا نمایاں ہو سکتا تھا۔

پیٹر نے روسی تہذیب پر مغرب کا اثر بہت بڑھا دیا، یہاں تک کہ روس کے خاص سلافی خط و خال اور اس کی قدیم بیزنطینی میراث کے حامیوں میں مخالفت کا زبردست جذبہ بھڑک اٹھا۔ چنانچہ وہ (پیٹر) روس میں قدیم و جدید کے درمیان دائمی تنازع کا مجسم پیکر بن گیا۔ جن لوگوں نے اس کے کارناموں کا خیر مقدم کیا اور جو اس کی مذمت کرتے رہے، دونوں کا احساس یہ تھا کہ وہ ایک انقلابی شخصیت تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا پیٹر واقعی انقلابی تھا؟ اس نے روس کے نمایاں اوصاف و خصائص، کامل مطلق العنانی خدمت گزار امراء کے ایک طبقے پر نظم و نسق کا انحصار، اقتصادیات، جس کی بنیاد زرعی غلامی کا نظام تھا، کو بدلا نہیں، بلکہ شدید تر کر دیا۔ پیٹر کے عہد میں زار کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بے پناہ بن گئی۔ امراء پر ہمہ گیر خدمات کا سلسلہ زیادہ سختی سے ٹھونسا گیا۔ زرعی غلامی زیادہ مصیبت خیز بن گئی۔ اس کا دائرہ بھی پھیل گیا۔ یہ بڑی حد تک محاصل کے نئے نظام کا نتیجہ تھا۔ جب مالکان اراضی کو زرعی غلاموں سے نیا محصولِ سر (محصولِ روح) وصول کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا،

---

[1] Elexis پیٹر کا اکلوتا فرزند، جو اس کے حکم سے مارا گیا۔

تو پیٹر کی خواہش یہ تھی کہ ہر اس شخص کو فہرست میں شامل کر لیا جائے، جسے محصول دینا چاہیے تھا۔ چنانچہ ہزاروں مسکین افراد جو پہلے زیادہ گرے ہوئے محسوس نہ کرتے تھے، بے بس ہو گئے اور ان کے اخلاف کے نام زرعی غلاموں کی حیثیت میں محاصل کی فہرستوں پر آ گئے۔ فوج، تجارت اور ثقافت میں غیر ملکی اثرات پیٹر کی تخت نشینی سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے۔ پیٹر کے ماتحت ان میں اضافہ ہو گیا؛ حالانکہ کہا جاتا ہے، یہ چیزیں پیٹر سے شروع ہوئیں۔ کلیسا کو اس نے ایک ادارے کی حیثیت میں کمزور کر دیا، لیکن یہ پہلے سے کمزور ہو رہا تھا اور یہ کمزوری بھی مغربی اثرات کا نتیجہ تھی۔

پیٹر کو انقلابی موجد سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس نے اپنی رائے زور و قوت سے منوائی، وہ بڑا جسیم، بڑا ہنگامہ پرور تھا اور گرمجوشی اس میں سے اُبلی پڑتی تھی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی ہنگامہ آرائی کا مرکز معلوم ہوتا تھا۔ مزید برآں اس نے جس دائرے میں وسیع جدتیں پیدا کیں ——— ہر شخص کے اوضاع و اطوار اور چلن کے دائرے میں ——— اس سے لوگوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ایک شریف خاتون، جس کی تربیت قدیم روسی امارت کی فضا میں ہوئی تھی، پیٹر نے یکایک حکم دے دیا کہ وہ مغربی لباس پہنے، مرد و زن کی ملی جلی پارٹی میں شامل ہو، رقص کرے، شراب پیے (اگر وہ انکار کرتی تو پیٹر میں یہ حوصلہ تھا کہ اس کی ناک پکڑ کر شراب اس کے حلق میں اتار دے)۔ یقیناً اس عورت کے نزدیک یہ انقلابی تغیر تھا، اگرچہ اس سے روسی تاریخ پر کوئی گہرا اثر نہ پڑا۔ پیٹر کو ہاتھ سے محنت مشقت کرنے میں لطف آتا تھا۔ وہ محض ہنسی مذاق کے انداز میں رعایا کے دانت نکال دیتا۔ اسے آداب سے سخت نفرت تھی۔ کھلے بندوں سگریٹ پیتا، شراب پیتا اور قسمیں کھاتا۔ لہٰذا تعجب نہ ہونا چاہیے کہ پیٹر اعظم کے دورِ حکومت کے ساتھ بہت زیادہ بنیادی تغیرات منسوب کیے گئے، جو حقیقت میں پیش نہ آئے۔ البتہ ایک سب سے زیادہ نمایاں تغیر یہ تھا کہ پیٹر کی فتوحات کے نتیجے میں روس نے ایک نئی قوت کا درجہ حاصل کر لیا۔ مغربی یورپ کی کوئی حکومت روس کی صلاحیتوں یا اس کے عزائم کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

روس پیٹر کے بعد

پیٹر کی وفات کے بعد سینتیس سال (۱۷۲۵ء سے ۱۷۶۲ء) میں سات برائے نام روسی مطلق العنان شاہی محل کے انقلابات کے باعث تختِ حکومت پر بیٹھے۔ یہ انقلابات محافظ فوج کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ کبھی کبھی غیر ملکی سازشی سفیر بھی ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ ان سات حکمرانوں میں سے بعض نااہل عورتیں تھیں اور بعض کمزور نوجوان۔ ان میں سے کسی کو بھی پیٹر جیسے بڑے بڑے روسی حکمرانوں کی نمایاں شخصیت حاصل نہ تھی۔ مطلق العنانی میں عارضی کمزوری پیدا ہوئی تو حصولِ اقتدار کے لیے دوسری قوتیں حرکت میں آ گئیں۔ خصوصاً وہ امراء جو پیٹر کے عائد کردہ شدید قواعد سے تدریجاً رہائی حاصل کر چکے تھے۔ ان پر جو پابندیاں عائد تھیں، ان میں جزواً جزواً ڈھیل پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۱۷۶۲ء میں انھیں جبری خدمت سے کاملاً نجات مل گئی، لیکن جو خدمت جبری ہونے کے باعث سخت نفرت کا مرجع بنی ہوئی تھی، وہ اختیاری ہونے کے ساتھ ہی مجلسی زیب و زینت کا باعث بن گئی۔ امراء کے لیے سلطنت کی خدمت انجام دینے کے سوا اور کوئی کام تو تھا نہیں، اب وہ لوگ خاص حقوق کے مالک بن گئے اور ان پر قانونی ذمہ داری کوئی نہ تھی۔

زرعی غلامی کی ابتدا بڑی حد تک یوں ہوئی کہ جو لوگ زار کے ماتحت فوجی خدمات انجام دیتے تھے، ان کی جاگیروں کے لیے مزدوروں کی بہم رسانی ضروری ہو جائے۔ اخلاقی اعتبار سے زرعی غلامی کو اسی وقت منسوخ ہو جانا چاہیے تھا، جب فوجی خدمت انجام دینے والے لوگ خدمت سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ سیاسی لحاظ سے یہ ممکن نہ ہوا، کیونکہ جو امراء زار سے مراعات لے سکتے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ زرعی غلامی سے محروم ہو جائیں، جن کی وجہ سے انھیں زندگی میں بہت آرام ملتا تھا۔ جب امراء خود آزاد ہوئے تو ساتھ ہی زرعی غلامی پر ان کے حقوق اور سزا دینے کے اختیارات بہ طور آئین جاری ہو گئے۔ مزید برآں زرعی غلاموں کی تعداد ہر وقت بڑھتی گئی، کیونکہ بادشاہ وفادار امراء کو نئی نئی جاگیریں اور ان پر بسنے والے افراد بہ طور عطیات دے دیتا تھا۔

پیٹر کے بعد جو دَور آیا، وہ اس اعتبار سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ روس مغربی طاقتوں کی جنگوں اور ڈپلومیسی میں زیادہ سے زیادہ الجھتا گیا۔ روس کی قدیم علیحدگی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ ان عشروں میں فرانس کے تہذیبی اثر کی بڑی لہروں نے روسی امراء کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ لوگ فرانسیسی شرابوں، فرانسیسی اوضاع اور فرانسیسی ادبیات سے بالکل مسحور ہو گئے۔ مقامی زبان اور مقامی طور طریقوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ وہ فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتے اور ہر لمحہ فرانسیسیوں کی تقلید کرتے رہتے۔ اس سے روسیوں کی مجلسی زندگی پر گہرا اثر پڑا، کیونکہ فرانسیسی اثر صرف امراء کے طبقے تک پہنچا۔ نچلے طبقے علم سے بالکل بے بہرہ رہے اور وہ ماسکو کے قدیم طریقوں ہی کے شیدائی تھے۔ اس طرح فرانسیسیت اختیار کیے ہوئے امراء اور روسی عوام کے درمیان تفرقہ پیدا ہو گیا۔ یہ تفرقہ اتنا گہرا اور وسیع تھا کہ دونوں میں ایک دوسرے سے بات چیت کا امکان بھی گھٹتا گیا۔ بعد کی روسی تاریخ کے لیے یہ گہرا تفرقہ نہایت نازک اہمیت کا باعث بنا۔

پولینڈ اور ترکی

اٹھارھویں صدی میں روس ہی مشرقی یورپ کی بڑی طاقت تھا۔ پولینڈ اور ترکی نقشے پر بہت وسیع تھے اور ان کے پاس بڑے علاقے تھے، جو آگے چل کر انھیں چھوڑنے پڑے۔ ان دونوں ملکوں کو حکومت کی نااہلی اور آبادی کی پسماندگی سے سخت نقصان پہنچا۔ یہ دونوں زوال پذیر سلطنتیں تھیں، جن کے ماتحت بڑی بڑی نسلی اور مذہبی اقلیتیں موجود تھیں اور زیادہ طاقتور ہمسایوں کے جارحانہ جذبات ان سے برانگیختہ ہوتے تھے۔ صدی کے ختم ہونے سے پیشتر پولینڈ کے لیے ناپید ہو جانا مقدر تھا، وہ روس، پروشیا اور آسٹریا کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ ترکی قائم رہا اور اس نے "یورپ کے مردِ بیمار" کا خطرناک درجہ حاصل کر لیا۔

خود غرض امراء کی ایک مختصر سی تعداد نے اٹھارھویں صدی کے پولینڈ پر قبضہ کر لیا اور اسے تباہ کر ڈالا۔ انگریز امراء کے برعکس پولستانی امراء اقتصادی ترقی کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ پروشیا کے جنکروں کے برعکس پولستانیوں کے دماغ میں تاج کا کوئی تصور نہ تھا، بلکہ اپنے محدود طبقاتی مفاد کے سوا انھیں کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انھوں نے طبقۂ اوسط کو تباہ کر دیا۔ یہودی دکانداروں اور غیر ملکی تاجروں پر ظلم و ستم کیے۔ انھیں باہر سے چیزیں منگوانے یا باہر سامان

بھیجنے کی ممانعت کر دی۔ اس طرح وہ قصبے تباہ ہو گئے، جو ایک زمانے میں بڑے بارونق تھے۔ انھوں نے کسانوں سے نہایت سخت سلوک کیا، یہاں تک کہ لوگ پولینڈ کو کسانوں کا دوزخ کہنے لگے۔

پولستانی حکومت سیاسی عجائبات کی ایک دکان تھی۔ امراء کی مجلس بادشاہ کا انتخاب کرتی۔ امیدوار عموماً غیر ملکی افراد ہوتے، جو ممبروں کو زیادہ سے زیادہ رشوت دے سکتے۔ اس امر پر شاید تعجب کا اظہار کیا جائے کہ پولینڈ کا بادشاہ بننے کے لیے کسی کو روپیہ دینے کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ ہر نیا بادشاہ بڑی سنجیدگی سے معاہدہ کرتا تھا کہ وہ اپنے زیادہ تر اختیارات مجلس کے حوالے کر دے گا۔ مجلس کو غیر ملکی روپیہ رشوت خوری کی لت لگا چکا تھا اور بعض اوقات ایک نہایت غیر معمولی اقدام کے ذریعے سے پورا سلسلہ معطل ہو جاتا، یعنی مجلس کے ارکان میں سے کوئی ایک امیر جب چاہتا، ہر قانون کو لامتناہی مدت کے لیے روک دیتا۔ اس غرض سے ایک آدمی کو صرف یہ کرنا پڑتا کہ بلند آواز سے پکارتا: "میں مخالف ہوں۔" پھر گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سرپٹ دوڑاتا اور رفیق نہ اسے پکڑ سکتے، نہ رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکتے۔ اس افراتفری سے جو کمزوری پیدا ہوئی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اٹھارھویں صدی میں نہ تو پولینڈ کا سفارتی سلسلہ موجود تھا اور نہ باقاعدہ فوج موجود تھی۔

پولینڈ کے مقابلے میں سلطنتِ عثمانیہ بہر حال ایک ایسی مملکت تھی، جس کا کاروبار جاری تھا۔ بلاشبہ یہ پسماندہ تھی، خصوصاً اقتصادی و فنی معاملات میں۔ وہاں کوئی پیٹر اعظم پیدا نہ ہوا، جو اٹھارھویں صدی کے سلطانوں کو علیحدگی سے باہر نکال لاتا، وہ ان سرکش ینی چریوں کے قیدی بنے ہوئے تھے، جنھوں نے سپاہیانہ فرائض بالکل ترک کر دیے تھے۔ لیکن یہ پسماندہ اور تباہ حال حکومت بہر حال حکمرانی کے فرائض انجام دے رہی تھی اور جنگ میں خاصی قوت مانی جاتی تھی۔ اس طرح "یہ مردِ بیمار" اٹھارھویں صدی میں زندہ رہا۔ جزواً اس لیے کہ عثمانی علاقوں کی وراثت کے جو مدعی تھے، یعنی روس و آسٹریا، ان کے درمیان شدید رقابت تھی۔

چھٹا باب

اٹھارھویں صدی میں جنگ اور ڈپلومیسی

تمہید اٹھارھویں صدی کے اوائل میں یورپی مملکتوں کا جو جائزہ ابھی اختتام کو پہنچا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ توازنِ قوی مذبذب اور غیر یقینی تھا۔ اگر بڑی مملکتیں کمزور مملکتوں پر دستِ تصرّف دراز کرتیں، تو توازن یقینی طور پر خطرے میں پڑ جاتا۔ دو تیزی سے بڑھنے والی قوتیں یعنی روس اور پروشیا واقعی ہمسایوں کے علاقے چھین کر وسیع ہوئیں۔ گویا اٹھارھویں صدی میں دو بڑے مسئلے تھے، جن سے جنگ اور ڈپلومیسی کا تعلق تھا۔ اوّل روس کے جارحانہ اقدامات سویڈن، پولینڈ اور ترکی کے خلاف، دوم پروشیا کے ایسے ہی اقدامات آسٹریا اور پولینڈ کے خلاف۔ تیسرے بڑے بین الاقوامی مسئلے کا تعلق اوقیانوس کی طاقتوں سے تھا۔ یعنی برطانیہ نیز فرانس و ہسپانیہ کی بوربون مملکتوں کے درمیان استعماری اور تجارتی رقابت۔ ہر قسم کے ثانوی مسائل نے بین الاقوامی تناؤ میں اضافہ کر دیا۔ فرانسیسی بوربونوں اور آسٹروی ہیبسبرگوں کے درمیان پرانا مقابلہ بدستور تازہ تھا، کیونکہ ہیبسبرگوں کا روایتی نصب العین یہ تھا، وادی ڈینیوب کے ساتھ ساتھ بحیرۂ اسود کی طرف بڑھیں۔ ایلزبتھ فارنس (ملکہ ہسپانیہ) کے خاندانی عزائم تفرقہ انگیزی کا ایک اور عنصر تھے۔

بڑی شمالی جنگ اور اس کے نتائج توازنِ قوی میں پہلی بڑی تبدیلی شمالی اور مشرقی یورپ کے اندر رونما ہوئی۔ بڑی شمالی جنگ (۱۷۰۰ء تا ۱۷۲۱ء) نے بحیرۂ بالٹک پر ضبط و نظم کی کشمکش کا آخری فیصلہ کر دیا۔ اس میں چارلس دوازدہم شاہِ سویڈن کو ہار ہوئی اور روس کا پیٹر اعظم اس میں سب سے بڑا فاتح تھا۔ پیٹر نے پہلے ترکوں کے خلاف جارحانہ اقدام کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس طرح ترکوں اور ان کے متوسّلوں کو بحیرۂ اسود کے شمالی کنارے سے نکال دے گا۔ ۱۶۹۶ء میں اس نے ایزوب کی بندرگاہ حاصل کر لی تھی، جو بحیرۂ اسود کی شمالی شاخ پر واقع ہے۔ ۱۶۹۷ء میں پانزدہ سالہ چارلس دوازدہم سویڈن کے تخت پر بیٹھا۔ اس کی نوجوانی نے بحیرۂ بالٹک کا مسئلہ پیدا کر دیا، جو مملکتیں بحیرۂ مذکور کے مشرقی و جنوبی حاشیے پر واقع تھیں، انھیں اچھا موقع مل گیا تھا کہ سویڈن کے اس تسلط کو درہم برہم کر ڈالیں، جو گستاوس[1] اڈالفس نے سترھویں صدی کے

---

[1] Gustavus Adolphus

اوائل میں قائم کرلیا تھا۔ چنانچہ ۱۶۹۹ء میں پیٹر زار روس نے شاہ ڈنمارک اور آگسٹس الیکٹر سیکسنی کے ساتھ سویڈن کے خلاف ایک اتحاد کرلیا۔ ایلیکٹر سیکسنی کو پولینڈ کے تخت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

بڑی شمالی جنگ کے ابتدائی دَور ہی میں تیزی سے واضح ہوگیا کہ اتحادیوں نے چارلس دوازدہم کی نوجوانی کی بناء پر جو تصورات قائم کیے تھے، وہ بالکل بے بنیاد تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا مدِ مقابل کچھ نہ کرسکے گا، لیکن چارلس دوازدہم پیدائشی جنگجو تھا۔ اسے نوجوانی کے باوجود جنگ سے حیرت انگیز محبت تھی۔ اس کی خاص تفریح یہ تھی کہ زندہ بھیڑیں محل کی غلام گردش میں سے گزاری جاتیں اور وہ پے در پے ان کے سر کاٹتا جاتا۔ اس نے ۱۷۰۰ء میں تمام دشمنوں کو باری باری شکست دی۔ ڈنمارک کو جنگ سے علٰحدگی پر مجبور کردیا اور پیٹر کو جنگ نارور میں، جو خلیج فن لینڈ کے جنوبی کنارے پر واقع ہے، ذلت خیز شکست دی۔

لیکن نارور کے بعد چارلس نے پے در پے مہلک غلطیاں کیں۔ اس نے کئی سال اس کوشش میں صرف کردیے کہ آگسٹس (الیکٹر سیکسنی) سے پولینڈ کا تاج لے لے اور اسے ایک درمیانے درجے کے پولستانی امیر سٹینسلاس لش زنسکی[1] کے حوالے کردے۔ چنانچہ آخر اس نے یہ تاج اپنی کٹ پتلی کے لیے حاصل کرلیا، مگر یہ کامیابی بہت عارضی تھی۔ اس اثناء میں پیٹر کو روسی فوجیں از سرِ نو مرتب کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے سویڈن کے اس تھوڑے سے علاقے پر قبضہ کرلیا، جہاں بعد میں سینٹ پیٹرزبرگ کی بنیاد رکھی۔ چارلس نے دوبارہ روس کی طرف توجہ کی تو اپنے محدود وسائل پورے کے پورے مرکزی روس پر حملے کی بازی میں لگا دیے۔ آخر پولٹاوا[2] کی جنگ میں خوف ناک تباہی سے سابقہ پڑا (۱۷۰۹ء)۔ اس جنگ میں پیٹر کی فوج نے نارور کی شکست کا دھبّا دھو ڈالا۔ چارلس نے ترکوں کے پاس پناہ لی، جنھیں وہ پیٹر کے خلاف جنگ کے لیے اُبھارتا رہا۔ ۱۷۱۱ء میں ترکوں کی بہت بڑی فوج نے پیٹر کو گھیر لیا اور اسے مجبوراً ایزوب واپس کرنا پڑا، مگر چارلس کو کچھ نہ ملا۔ وہ سویڈن واپس پہنچا۔ چونکہ اسے مسلسل رزم و پیکار ہی پسند تھی، لہٰذا ناروے کے ساتھ لڑائی کے دوران میں اسے گولی مار دی گئی (۱۷۱۸ء)۔

سویڈن نے بالٹک میں جس تسلط کا جال بچھایا تھا، اب اس پر بدنصیبی کی آخری مُہر ثبت ہوگئی۔ نیسٹاٹ[3] میں ایک معاہدہ ہوا (۱۷۲۱ء)۔ اس کے مطابق روس نے خلیج فن لینڈ کے جنوبی و مشرقی کناروں پر سویڈن سے جو علاقے لے لیے تھے، وہ روس ہی کے قبضے میں رہے۔ سویڈن کی اس پریشان حالی سے پروشیا بھی مستفید ہوا۔ کفایت شعار فریڈرک ولیم جنگ میں حصہ لینے کے لیے راضی نہ ہوا۔ پیٹر نے زور دے کر اسے راضی کرلیا اور جنگ کے آخری دَور میں وہ شریک ہوا۔ اس طرح اسے پومیرینیا کے علاقے اور بالٹک کی ایک مشہور بندرگاہ اسٹیٹن[4] سویڈن سے لینے کا

۱؎ Stanislas Leszezynski
۲؎ Poltava
۳؎ Nystadt
۴؎ Stettin

موقع مل گیا۔

اس بڑی شمالی جنگ نے توازنِ قوت پر اثر ڈالا۔ اوّل اس طرح کہ روس اور پروشیا کی قوت بڑھ گئی، دوم اس طرح کہ ترکی اور پولینڈ بھی اس سلسلے میں اُلجھ گئے۔ کچھ مدت تک نظر آرہا تھا کہ بلقان اور بحیرۂ اسود میں ترکی سلطنت کا انجام بھی وہی ہوگا، جو بحیرۂ بالٹک میں سویڈن کی سلطنت کا ہُوا۔ اگرچہ عثمانی فوجوں نے ۱۷۱۱ء میں پیٹر کا زبردست مقابلہ کیا تھا، لیکن جلد ہی انھیں ہیپسبرگ شہنشاہ چارلس ششم کی جنگ میں شکست ہوئی۔ یہ پہلی ترکی جنگ (۱۷۱۶ء تا ۱۷۱۸ء) پسارووٹز[ل] کے معاہدے پر ختم ہوئی (۱۷۱۸ء)۔ یوں آسٹریا کو موقع مل گیا کہ ہنگری کا جو ٹکڑا عثمانیوں کے زیرِ حکومت تھا، وہ واپس لے لے۔ نیز اس نے موجودہ رومانیہ اور یوگوسلافیہ کے بعض حصے لے لیے۔ دوسری ترکی جنگ، ۱۷۳۵ء تا ۱۷۳۹ء میں ہوئی۔ اس سے آسٹری فوج کی کمزوری آشکارا ہوگئی۔ ترک اپنی صلاحیت سے کام لے کر بچ نکلے اور "مردِ بیمار" کے متوقع جانشینوں کے درمیان کش مکش پیدا ہوگئی، جو بالکل ناگزیر تھی۔ اس جنگ میں روس اور آسٹریا حلیف تھے، مگر جلد ہی متوقع مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق ان میں جھگڑے شروع ہوگئے۔ آخر آسٹریا نے وہ تمام فوائد کھو دیے جو معاہدہ پسارووٹز میں حاصل کیے تھے۔ روس کو امید تھی کہ وہ جزیرہ نمائے کریمیا حاصل کرلے گا اور اس طرح بحیرۂ اسود میں داخل ہوجائے گا، مگر وہ صرف ایزوب حاصل کرسکا۔

اس اثناء میں چارلس دوازدہم کی شکست کے باعث آگسٹس کو موقع مل گیا تھا کہ پولینڈ کا تاج سٹینسلاس لس زنسکی سے واپس لے لے، لیکن سویڈن کی کٹ پتلی نے اپنے تاریخی کردار کے تمام وسائل ختم نہیں کیے تھے۔ اس نے اپنی بیٹی ماری لشز نسکا[ٹ] کی شادی لوئی پانزدہم شاہِ فرانس سے کردی۔ آگسٹس نے ۱۷۳۳ء میں وفات پائی تو فرانسیسی سفیروں نے پولستان کی پارلیمنٹ کے ممبروں میں فیاضی سے رقمیں تقسیم کیں، تاکہ آگسٹس کی جگہ سٹینسلاس کا انتخاب عمل میں آئے۔ اس انتخاب نے نہایت نازک صورتِ حالات پیدا کردی، کیونکہ روس اور آسٹریا دونوں کو پسند نہ تھا۔ اس طرح فرانس کو پولینڈ کے بادشاہ پر اقتدار حاصل ہوجائے۔ روس نے تیس ہزار فوج پولینڈ بھیج دی اور پولینڈ کی پارلیمنٹ کے بچے کھچے ممبروں کا اجلاس منعقد کرکے آگسٹس الیکٹر سیکسنی کی جگہ اس کے بیٹے آگسٹس سوم کو بادشاہ منتخب کرلیا۔ یوں پولینڈ کی تخت نشینی کے سلسلے میں جنگ کے لیے سٹیج آراستہ ہوگیا (۱۷۳۳ء تا ۱۷۳۵ء)۔ سٹینسلاس، فرانس اور ہسپانیہ ایک طرف تھے، آگسٹس سوم، روس اور آسٹریا دوسری طرف۔

لڑائی نے زیادہ وقت نہ لیا، کیونکہ شرکاء میں سے کوئی بھی عمیق اور شدید جنگ کا خواہاں نہ تھا۔ فرانس اور آسٹریا کی فوجیں دریائے رھائن کی وادی اور شمالی اٹلی میں ایک دوسرے پر گولیاں چلاتی رہیں، حالانکہ یہ علاقے پولینڈ سے

ل Passarowitz

ٹ Marielesczynski

سیکڑوں میل دُور تھے۔ پھر مدبّروں نے ایک سمجھوتے کی راہ نکالی، جو تمام فریقوں کے نزدیک خوش گوار تھا۔ آسٹریا اور روس کی تسلّی یوں ہوگئی کہ آگسٹس سوم کو پولینڈ کا تخت مل گیا۔ فرانسیسی نقطۂ نگاہ سے سٹینسلاس لش زنسکی کے نقصان کی بخوبی تلافی یوں ہوگئی کہ اسے لورین[1] کا ڈیوک بنا دیا گیا۔ لورین فرانس کی شمالی و مشرقی سرحد پر ایک ریاست تھی۔ ساتھ ہی یہ شرط لگا دی گئی کہ جب سٹینسلاس مرجائے گا تو اس کی بیٹی ماری لوئین کی مالک بن جائے گی اور یہ ریاست فرانسیسی تاج کے قبضے میں چلی جائے گی۔ یوں فرانس اپنی طبعی سرحد کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھ جائے گا۔ لورین کے لیے پہلے سے ایک ڈیوک موجود تھا یعنی فرانسس، جو ہیبسبرگ خاندان کی وارث میریا تھریسیا کا شوہر تھا۔ اس پریشانی کا ازالہ یوں کیا گیا کہ فرانسس کو لورین کے معاوضے میں ٹسکنی کا گرانڈ ڈیوک بنا دیا گیا، جہاں پرانے حکمران خاندان کا سلسلہ ۱۷۳۷ء میں ختم ہو چکا تھا۔ اسی میں سے ایک اور سمجھوتا پیدا ہوگیا یعنی ایلزبتھ فارنس ملکۂ ہسپانیہ بیس سال تک اپنے بیٹے کے لیے کوشش کرتی رہی تھی۔ آخر اس نے نیپلز کی بادشاہی اپنے بڑے بیٹے کارلوس کے لیے حاصل کر لی۔

اٹھارھویں صدی کے اوائل کی ڈپلومیسی

پولستانی جانشینی کی جنگ بالکل فضول اور حقیر معلوم ہوگی کیونکہ بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ جنگ کے بعد جو فیصلہ ہوا، اس کا اثر زیادہ تر اٹلی اور لورین پر پڑتا تھا۔ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ مدبّروں کی بے ترتیبی کا ایک نمایاں معاملہ تھا، لیکن پورے پولستانی مسئلے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ حکمران خاندانوں کے مسلک و مشرب اور توازنِ قوی میں مسلسل تغیّر کی ایک عبرت انگیز مثال تھا۔ یقیناً اس سلسلے سے بڑے قومی وسائل وابستہ نہ تھے، البتہ فرانس، روس اور آسٹریا کے قومی وقار کا مسئلہ ضرور درپیش تھا، جو ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا، مگر اسے اہم سمجھا جاتا تھا۔ مدبّروں کے نزدیک تخت ڈپلومیسی کی نذریں تھے اور وہ عوام کی خواہش معلوم کیے بغیر جسے چاہتے، دے دیتے تھے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ اہلِ نیپلز سے کارلوس کے متعلق رائے پوچھ لی جائے یا سٹینسلاس اور آگسٹس کے متعلق پولستانیوں سے رائے لے لی جائے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تھا، جسے پولینڈ کی بہبود کا کچھ خیال ہوتا۔ نازک صورتِ حال سے صرف پولینڈ پر کمزوری کی ایک اور ضرب لگی۔

تاہم اٹھارھویں صدی کے چوتھے عشرے میں جو سمجھوتے ہوئے، ان میں توازنِ قوی قائم رہا کیونکہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ دے دیا گیا۔ اگرچہ مدبّرین پولینڈ کے متعلق معمولی سی جنگ کو نہ روک سکے، لیکن انھوں نے اسے بڑی جنگ نہ بننے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۱۳ء سے ۱۷۳۹ء تک ڈپلومیسی کی قوت جنگیں روکنے یا کم از کم انھیں مقامی لحاظ سے محدود رکھنے پر صرف ہوتی رہی۔ برطانیہ اور فرانس نے اس مہم میں سبقت کی حیثیت قائم رکھی تاکہ کوئی ایک طاقت

---

[1] Lorraine

بین الاقوامی سیاست کی "گاڑی" کو اُلٹ نہ دے۔ ایلزبتھ فارنس کی ابتدائی کوشش یہ تھی کہ اٹلی کا ایک حصّہ قوت کے بل پر لے لے۔ فرانس اور برطانیہ نے آسٹریا کے ساتھ مل کر ملکۂ فارنس کی مخالفت کی اور کارلوس کو نیپلز کی بادشاہی حاصل کرنے کے لیے بیس سال انتظار کرنا پڑا۔ بڑی شمالی جنگ کے آخری دَور میں برطانیہ نے اپنے بیڑے کا ایک حصّہ بالٹک بھیج دیا، تاکہ پیٹر زار روس زیادہ "فائدہ" نہ اٹھا سکے۔ "مردِ بیمار" کی زندگی بڑھانے کے لیے برطانیہ نے پسارووٹز کے مقام پر ترکی اور آسٹریا کی گفتگو میں اتالیقی کا وظیفہ انجام دیا (۱۷۱۸ء) اور فرانسیسیوں نے فرانسس اوّل اور دولتِ عثمانیہ کا قدیم اتحاد تازہ کر لیا۔ ۱۷۳۹ء میں آسٹریا سے اچھی شرطیں قبول کرانے میں فرانس نے ترکی کو امداد دی۔

برطانیہ اور بوربون بادشاہوں کے درمیان کش مکش

برطانیہ کا وزیر اعظم والپول اور فرانس کا وزیر اعظم فلیوری دونوں اٹھارھویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں صلح کے لیے کوشاں رہے کیونکہ بیرونی ملکوں میں صلح کی فضا قائم رہتی تو فرانس و برطانیہ کو اقتصادی بحالی میں مدد ملتی، لیکن ان دو اوقیانوسی طاقتوں کے درمیان غیر رسمی سفارتی افتراق زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا۔ ان میں تجارت اور سلطنت کے متعلق روز افزوں مقابلے نے اس اشتراک کو درہم برہم کر ڈالا۔ والپول اور فلیوری میں سے کوئی بھی برطانیہ اور فرانس کے درمیان اس عالمی جنگ کو روک نہیں سکتا تھا، جو ۱۷۳۹ء اور ۱۷۴۰ء میں شروع ہو گئی اور صلح کے متعدد وقفوں کے ساتھ ۱۸۱۵ء میں نپولین کی آخری شکست پر ختم ہوئی۔

یہ دوسری صد سالہ جنگ، ۱۷۳۹ء سے نصف صدی پیشتر لوئی چہار دہم کے زمانے میں شروع ہو گئی تھی۔ یوٹریکٹ کے معاہدے (۱۷۱۳ء) نے برطانیہ اور فرانس کی رقابت کا پورا تصفیہ نہیں کیا تھا اور فرانس کے بوربون شریک کار (ہسپانیہ) یوں ۱۷۳۹ء کی جنگ جس طرح ایک نئی جنگ تھی، اسی طرح ایک قدیم کش مکش کی تجدید تھی۔ ۱۷۳۹ء کے نازک حالات میں جو خاص مسئلہ کارفرما ہوا، وہ مقابلتاً بہت معمولی حیثیت کا تھا، یعنی برطانیہ کو ایسی اینٹو (ہسپانیہ کے ساتھ معاہدے) کے ذریعے سے جو حق ملا تھا، اس کے یاس انگیز نتائج پر برطانیہ کی آزردگی۔ ساؤتھ سی کمپنی سے واضح ہوا کہ ایسی انٹو سے برطانیہ کو ہسپانیہ کی امریکی نوآبادیوں کے ساتھ تجارت میں محض برائے نام حصّہ ملا۔ جو کچھ برطانوی جہاز رانی کو جائز اور آئینی طریق پر نہ مل سکا، انھوں نے مال کی ناجائز تجارت سے حاصل کر لیا۔ ہسپانیہ نے اس کے مقابلے میں امریکی سمندروں کے اندر جابجا محافظ مقرر کر دیے، تاکہ ناجائز تجارت کو روکا جائے۔ برطانوی تاجروں نے سخت شکایت کی کہ ہسپانیہ کے مقرر کیے ہوئے محافظ بُرا برتاؤ کرتے ہیں۔ ۱۷۳۸ء میں کپتان جینکنز[1] نے پارلیمنٹ کو دکھایا کہ ہسپانیہ کی وحشت میں میرا ایک کان اُڑ گیا۔ جینکنز نے اپنا کٹا ہوا کان پیش کر دیا، جو نمک اور رُوئی میں محفوظ تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ

---

[1] Jenkins

کان کٹنے پر اپنا ردِّ عمل پیش کرو، تو اس نے کہا کہ مَیں اپنی روح خدا کے حوالے کرتا ہوں اور اپنا معاملہ ملک کو سونپتا ہوں۔ والپول نے کہا کہ آئینی ہسپانوی محافظوں سے برطانیہ کے ناجائز کاروبار کرنے والوں کی حفاظت پارلیمنٹ کے لیے کوئی اہم معاملہ نہیں، لیکن نہ والپول ہسپانیہ کے خلاف جوش کو روک سکتا تھا، جس کی لہریں پورے ملک میں دوڑ گئی تھیں اور جینکنز نے اپنا معاملہ ملک کے حوالے کر دیا تھا اور نہ ان محبانِ وطن کے ہنگامہ خیز طبقے کو باز رکھا جا سکتا تھا، جو خود والپول کی وگ پارٹی میں پیدا ہو گیا تھا۔

اکتوبر ۱۷۳۹ء میں کلیسا کے گھنٹوں کی خوش گوار صداؤں کے درمیان برطانیہ نے ہسپانیہ کے خلاف جینکنز کے کان کی جنگ شروع کی۔ والپول نے کہا: "وہ اب گھنٹے بجا رہے ہیں، لیکن جلد ہی وہ کفِ افسوس ملیں گے۔" چنانچہ بحیرۂ کریبیا میں جنگ شروع ہوئی۔ برطانوی بیڑے نے ابتدا ہی میں معاملات بگاڑ لیے۔ گویا وہ والپول کی پیش گوئی کو درست ثابت کرنا چاہتا تھا۔ فرانس نے بہت جلد ہسپانیہ کی امداد کے عزائم کا اظہار کر دیا۔ دونوں ملکوں کے حکمرانوں کے درمیان جو خاندانی رشتے تھے، ان کی وجہ سے پولستانی جنگ میں دونوں متحد ہو چکے تھے۔ اب فرانس کا اقتصادی مفاد معرضِ خطر میں نظر آتا تھا، کیونکہ فرانس ہی اس مال کا بڑا حصہ مہیا کرتا تھا جسے ہسپانوی جہاز امریکہ لے جاتے تھے اور جسے برطانیہ کا بھیجا ہُوا ارزاں ناجائز مالِ تجارت فرانسیسی مال کی بِکری پر اثر ڈال رہا تھا۔

آسٹروی تخت نشینی کی جنگ (۱۷۴۰ء - ۱۷۴۸ء)

۱۷۴۰ء میں واقعات کا ایک سلسلہ پیش آیا، جس نے نوآبادیوں کی جنگ کے معاملے کو آسٹروی تخت نشینی کی جنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا، جو برِ اعظم یورپ کی ایک بہت بڑی جنگ تھی۔ شہنشاہ چارلس ششم نے ۱۷۴۰ء میں وفات پائی اور ہیپسبرگ مقبوضات اس کی بیٹی میری تھیریسا کو ملے، جو اس وقت تیئیس سال کی تھی۔ میریا تھیریسا نوجوان تھی، اُسے کوئی سیاسی تجربہ نہ تھا اور وہ عورت تھی۔ جرمنی کے شہزادوں نے اسے چکما دینے کے لیے اس شاہی فرمان سے چشم پوشی اختیار کر لی تھی، جس کے مطابق میریا تھیریسا ملکہ بننے والی تھی۔ وہ ہیپسبرگ حکمرانی کے خلاف کامیاب جنگ کر چکے تھے۔ اب انھیں ایک اور کامیابی کی توقع پیدا ہو گئی۔ بویریا کے ایلیکٹر کو خود مقدس رومی شہنشاہ بن جانے کی امید پیدا ہو گئی، لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم فریڈرک اعظم نے اٹھایا (۱۷۴۰ء - ۱۷۸۶ء) جو فریڈرک ولیم اوّل کی جگہ تخت پر بیٹھا تھا۔ دسمبر ۱۷۴۰ء میں فریڈرک نے سلیشیا پر حملہ کر دیا۔ یہ ایک ہیپسبرگ صوبہ تھا، جو دریائے اوڈر کی بالائی وادی میں برینڈنبرگ کی جنوبی و مشرقی جانب واقع تھا۔ اس نے سلیشیا کے مختلف حصوں پر خاندان کے پُرانے دعوے نکال لیے اور اپنے چچا جارج دوم شاہ انگلستان کو یقین دلا دیا کہ مَیں خاندان آسٹریا کے حقیقی فائدے کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ سب ریاکاری کی باتیں تھیں۔ فریڈرک چاہتا تھا کہ خاندان ہوہینزولرن اور پروشیا کا اقتدار بڑھا لے۔

آسٹروی تخت نشینی کی جنگ انگلستان اور روس، فرانس، ہسپانیہ، پروشیا اور بعض چھوٹی چھوٹی جرمن ریاستوں

کے خلاف تھے۔ فریڈرک نے برِّاعظم کی مہم میں ایک زبردست کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اسے شکستیں بھی ہوتی رہیں، تاہم پروشیا کی فوج سیلیشیا کے مفتوحہ علاقے کی حفاظت بڑے اہتمام سے کرتی رہی اور رات کے وقت طویل کوچوں کے بعد اچانک اطراف پر حملوں سے یورپ کو متحیر کر دیا۔ اسی طرح محاصروں کی جنگ کے عام طور طریقوں سے بالکل الگ طور طریقے اختیار کیے۔ تاہم فریڈرک نے حلیفوں کے دل میں شدید کدورت پیدا کر دی، کیونکہ وہ بار بار ان کا ساتھ چھوڑ کر آسٹریا سے خفیہ معاہدے کر لیتا۔ پھر اس نے بویریا کے ایلیکٹر کو شہنشاہی عزائم میں کوئی مدد نہ دی۔ چنانچہ اسے صرف مختصر سی مدت کے لیے شہنشاہ چارلس ہفتم بننے کا موقع ملا۔

انگلستان اور آسٹریا کے اتحاد نے بھی عمل کا کوئی ایسا ثبوت نہ دیا، جو فرانس اور پروشیا کے متحدہ عمل سے بہتر ہوتا۔ بہت سے انگریزوں کا احساس تھا کہ جارج دوم ہینوور کے دفاع اور جرمن سیاسیات میں الجھاؤ کے باعث سمندر پار کے انگریزی مفاد سے غداری کر رہا ہے۔ بایں ہمہ انگریز سٹوارٹوں کے مقابلے میں ہینوور خاندان ہی کو ترجیح دیتے رہے۔ ۱۷۴۵ء میں معزول جیمز دوم کا پوتا شہزادہ چارلس "جو" خوبرو اور ہشاش بشاش شہزادے" کے لقب سے مشہور تھا، فرانس کی امداد سے برطانیہ میں لنگر انداز ہوا۔ اس نے سکاٹ لینڈ کے کوہستانیوں (ہائیلینڈوں) میں سے خاصے رنگروٹ حاصل کر لیے، کیونکہ یہ لوگ مدت سے غیر مطمئن چلے آتے تھے مگر ۱۷۴۶ء میں کیولاڈن[1] کے مقام پر شکست فاش کھائی۔ ساتھ ہی جیمز کے جانشینوں کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یہ پہلے بھی زیادہ اہم سیاسی خطرہ نہ تھا۔

یورپ کے باہر یہ جنگ بالکل غیر فیصلہ کن تھی۔ نیو انگلینڈ کے آبادکاروں نے لوئی برگ لے لیا، جو کیپ بریٹن آئی لینڈ[2] میں فرانس کا بحری مرکز تھا اور وہاں بیٹھ کر دریائے سینٹ لارنس میں داخلے کے دروازے کی حفاظت کی جا سکتی تھی۔ دنیا کے دوسرے حصے میں فرانسیسیوں نے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدراس کی بندرگاہ لے لی۔ ۱۷۴۷ء تک برطانوی بیڑا کوئی فتح حاصل نہ کر سکا اور اس وقت تک انگریزی جہازوں پر فرانسیسیوں نے بے شمار حملے کیے، جب فرانسیسی تجارت پر برطانیہ کے انتقامی حملے ناکام رہے تو انگریزوں کی ذلت میں اور اضافہ ہو گیا۔ ناکامی کی وجہ یہ ہوئی کہ فرانسیسی سامان کا بیمہ لندن میں کرایا جاتا تھا، کیونکہ لندن کی شرحیں فرانس کے مقابلے میں بہت کم تھیں۔ لندن میں جو لوگ فرانسیسی مال کا بیمہ کرتے تھے، وہ اپنے فرانسیسی گاہکوں کو پہلے سے برطانوی جہازوں کی نقل و حرکت کے متعلق اطلاع دے دیتے تھے۔

آسٹریا کی تخت نشینی کی جنگ کے خاتمے پر صلح کا جو فیصلہ ہوا، اس میں اصل لڑائی کے نتائج منعکس ہیں۔ اس صلح کو معاہدۂ ایکس لاشپیل کہتے ہیں (۱۷۴۸ء)۔ اس کی رو سے سمندر پار لوئی برگ اور مدراس سابق مالکوں کو واپس کر دیے گئے۔ آگے چل کر برطانیہ ایسی اینٹو کے تکلیف دہ حق سے دست بردار ہو گیا۔ وسطی یورپ میں جنگ نے پروشیا کو

۱؎ Culloden

۲؎ Cape Breton Island

اوّل درجے کی طاقت بنا دیا اور فریڈرک کی فوج کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ صلح سے پروشیا کی آبادی میں تقریباً نصف کا اضافہ ہو گیا، کیونکہ سلیشیا ہمیشہ کے لیے پروشیا کو مل گیا۔ وہاں پارچہ بافی کی صنعت کو خاص فروغ حاصل تھا۔ کوئلے اور لوہے کے وسیع ذخیرے موجود تھے۔ آبادی کو جو خاصی بڑی تھی، اس کے علاوہ سمجھنا چاہیے۔ میریا تھیریسیا کو اس شدید نقصان کا معمولی معاوضہ ملا۔ اگرچہ اس کے شوہر فرانسس کو مقدس رومی شہنشاہ مان لیا گیا مگر اسے شمالی اٹلی کے بعض اور متفرق علاقے ہسپانیہ کی ملکہ ایلزبتھ فارنس کے دوسرے بیٹے فلپ کو دینے پڑے۔

بے اطمینان صلح ۱۷۴۸ء – ۱۷۵۶ء

۱۷۴۸ء میں جو صلح ہوئی، وہ آٹھ سال قائم رہی۔ پھر ایک اور جنگ شروع ہو گئی، جو اس سے بڑی تھی، یعنی ہفت سالہ جنگ (۱۷۵۶ء – ۱۷۶۳ء)۔ یہ ان پرانے مسائل کی وجہ سے شروع ہوئی، جنھیں ایکس لاشیپل کے معاہدے میں غیر منفصل چھوڑ دیا گیا تھا۔ بعض نئی شکایتیں بھی اس کا موجب ہوئیں، جو آسٹروی جنگ سے پیدا ہوئی تھیں۔ برطانیہ اور بوربونوں کے درمیان جو عالمی جنگ چلی آ رہی تھی اور اس سلسلے میں پیشتر جنگ کو محض ایک ابتدائی اور غیر فیصلہ کن کشمکش کی حیثیت حاصل تھی، وہ جاری رہی، مگر اسے صلح کے نام نہاد برسوں میں بے اعلان جنگ قرار دینا چاہیے۔

افریقہ سے تجارت کی بہترین جنس وہاں کے غلام تھے اور نئی دنیا میں گنے، چاول اور تمباکو کے کھیتوں کے لیے ان غلاموں کی مانگ مسلسل جاری تھی۔ برطانیہ اور فرانس نے کوشش کی کہ ایک دوسرے کو افریقہ کی اس تجارت سے محروم کر دیں۔ ایشیا میں انگریزی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنیاں جنوبی ہند کے مقامی حکمرانوں کی رقابتوں میں فریق بن کر باہم لڑتی رہیں۔ ۱۷۵۱ء تک فرانس کے سرگرم ناظم دوپلے نے اس بالواسطہ جنگ کے پہلے دور میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ۱۷۵۴ء میں فرانسیسی کمپنی کے ڈائرکٹروں نے دوپلے کو واپس بلا لیا۔ وہ تیار نہ تھے کہ اس کی جارحانہ پالیسی جاری رکھنے کے لیے جس سرمایے کی ضرورت تھی، اسے دیتے رہتے۔

شمالی امریکہ میں دونوں طاقتوں کے درمیان براہ راست جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز آبادکار اوقیانوسی ساحل سے اپنے تمام وسائل ایپے لیشنز[1] اور مسسی پی کے درمیان جو زرخیز بے آباد میدان تھا، اس کے لیے ہر شے کی بازی لگا چکے تھے۔ فرانسیسی بھی بالکل اسی علاقے کو اپنا لینے کا عزم کیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے انگریزوں سے پیشتر مغربی پنسلوینیا میں پرسکیل[2] آئل (بعد میں ایری[3]) سے جنوبی جانب فورٹ دوکین[4] (بعد ازاں پٹسبرگ[5]) تک جو دریائے اوہیو کے سرے پر واقع ہے، قلعوں کا ایک زنجیرہ تیار کر لیا تھا۔ ۱۷۵۴ء میں اہل ورجینیا کی ایک قوت نے نوجوان

---

۱ Appalachians ایک کوہستانی سلسلہ ہے۔ ۲ Presquisle

۳ Erie ۴ Port Duquesne ۵ Pittsburgh

جارج واشنگٹن کی سرکردگی میں فرانسیسیوں کو فورٹ ڈوکوین کی اہم جنگی حیثیت سے خارج کرنے کی ناکام کوشش کی ۱۷۵۵ء میں ایک انگریزی مہم نے جنرل بریڈک[1] کی کمان میں پھر ایک کوشش کی، وہ بھی ناکام رہی۔

آبادکار اور وطنی حکومت کے درمیان بنیادی پالیسی کے متعلق ہمیشہ اتّفاق رائے نہیں رہتا تھا۔ فرانسیسیوں نے ڈوپلے کو واپس بلالیا۔ یہ اختلاف رائے کی صرف ایک مثال تھی۔ دوسری مثال اس عجیب وغریب صورت حالات میں دیکھی جا سکتی ہے، جو جزائر غرب الہند میں موجود تھی۔ اس زمانے میں ان جزائر کو سلطنت کے بہترین خطّوں میں شمار کیا جاتا تھا کیونکہ دُنیا میں جتنی کھانڈ بنتی تھی، اس میں سے بیشتر کا مرکز یہی جزائر تھے۔ نیو انگلینڈ کے تاجر کھانڈ اور اس سلسلے میں بننے والی ضمنی چیزیں (شیرہ اور رَم) سانٹو ڈومنگو[2] (ہیٹی[3])، وادی لوپ اور مارٹی نیق کے فرانسیسی آبادکاروں سے سستے داموں خرید لیتے تھے۔ جمیکا اور برطانیہ کے دوسرے جزیروں میں جو کھانڈ بنتی تھی، وہ نسبتاً گراں تھی۔ فرانسیسی کھانڈ سے نیو انگلینڈ میں رَم بناتے تھے۔ نیو انگلینڈ کی رُم افریقی حبشیوں کو خوب بدمست کردیتی تھی۔ تجارت کی اس "مثلث" کو مکمل کرنے کے لیے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ فرانسیسی زمینداروں کے ہاتھ افریقی غلام فروخت کرکے امریکیوں کی جیبیں بھر جاتی تھیں۔ یہ سب کچھ تجارتی نظریۂ زر کے قواعد وضوابط کی مخالفت میں ہوتا تھا، جو فرانسیسی اور برطانوی دونوں سلطنتوں میں رائج تھے اور یہ طریقِ عمل برطانیہ کے زیرِ اثر تاجرانِ شکر اور فرانس میں نانٹز کے بردہ فروشوں کے لیے حد درجہ باعثِ اذیّت وپریشانی تھا، یہی کاروبار تھا، جس کی کشمکش نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو عالمی اقتدار کے راستے پر لگا دیا۔

یورپ کے اندر مختلف موافقتوں میں ڈرامائی تغیّرات پیدا ہوئے، جنھیں عموماً سفارتی انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نئی جنگ میں بھی بنیادی اختلافی گروہ پرانے ہی تھے ––– برطانیہ کے خلاف، پروشیا کے خلاف آسٹریا ––– مگر ان چاروں طاقتوں نے اپنی موافقتوں کا سلسلہ اُلٹا دیا۔ برطانیہ اٹھارھویں صدی کے پانچویں عشرے میں پروشیا کے خلاف آسٹریا کا حامی بن گیا تھا۔ اب اس نے فریڈرک اعظم سے سلسلۂ اتحاد جوڑ لیا۔ سفارتی انقلاب کے اس نہایت انقلابی تغیّر کا ایک کرشمہ یہ ہُوا کہ فرانس، جو پہلے فریڈرک کا معاون تھا، اب نہ محض اس کا مخالف ہوگیا، بلکہ اس کے موروثی دشمن ہیبسبرگ آسٹریا سے جاملا۔

۱۷۵۶ء میں جو سفارتی انقلاب ہُوا، اس میں بڑی طاقتوں نے آسٹری جنگ کے دوران میں پرانے شرکاء کی غیروفادارانہ روش پر ناراضی کا اظہار کیا۔ فرانسیسیوں کے ذہن میں فریڈرک کی بار بار کی غدّاری اور خفیہ مصالحانہ انتظامات کی تلخ یاد خصوصیّت سے تازہ تھی۔ برطانیہ، آسٹریا کی اس روش کا ماتم کر رہا تھا کہ وہ برّاعظم میں برطانوی مفاد کے دفاع

---

[1] Braddock   [2] Santodomingo

[3] Haiti یہ جزیرہ بحیرۂ کریبیا میں کیوبا اور پورٹوریکو کے درمیان واقع ہے۔

کو مقدم رکھنے پر مذبذب رہا۔ اس مفاد میں ہینوور کی علاقائی آزادی کا تحفّظ شامل تھا اور آسٹروی نیدرلینڈز سے فرانس کا اخراج ضروری تھا۔ آسٹریا ہینوور اور بلجیم کو اپنے بڑے مقصد یعنی سیلیشیا کی بازیافت کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ ۱۷۵۵ء میں برطانیہ نے روس سے ایک ضمنی معاہدہ کر لیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ شمالی جرمنی اور ہینوور میں جو صورتِ حالات موجود ہے، اسے قائم رکھا جائے۔ برطانیہ کے اس عمل نے نادانستہ سفارتی انقلاب کا خاکہ پُورا کر دیا۔

انگلستان و روس کے معاہدے نے فریڈرک اعظم کو چوکس کر دیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ آخر بالٹک اور پولینڈ کے ضبط و نظم میں روس سے جنگ پیش آئے گی۔ چنانچہ جنوری ۱۷۵۶ء میں پروشیا کے بادشاہ نے برطانیہ سے معاہدہ کر لیا، جس کے مطابق برطانیہ رُوس سے الگ ہو گیا۔ انگلستان اور پروشیا کے اتّحاد نے فرانس کو الگ کر دیا اور آسٹریا کے وزیرِ اعظم کانٹز[۱] کے لیے وہ موقع بہم پہنچا دیا، جس کا انتظار کر رہا تھا۔ فریڈرک سے بدلا لینے اور سیلیشیا حاصل کرنے کے لیے آسٹریا کو ایک ایسے حلیف کی ضرورت تھی، جس کے پاس بڑی فوج ہو۔ گویا وہ برطانیہ سے نہیں، فرانس سے اتحاد چاہتا تھا۔ چنانچہ کانٹز نے انگلستان اور پروشیا کے اتّحاد کی دلیل پیش کر کے لُوئی پانزدہم اور اس کی داشتہ مادام دپامپادور[۲] کو قائل کر دیا کہ بوربون اور ہیپسبرگ خاندانوں کے قدیم تنازع کو نظر انداز کرتے ہُوئے عملی اشتراک کا انتظام کر لینا چاہیے۔ سفارتی انقلاب کے سلسلے میں آخری قدم یہ تھا کہ روس کی ملکہ ایلزبتھ فرانس و آسٹریا کے اتّحاد میں شامل ہو گئی۔ روس نے آسٹروی تخت نشینی کی جنگ میں معمولی حصّہ لیا تھا اور وہ بعد میں آسٹریا اور انگلستان کا حلیف بنا تھا۔ ایلزبتھ نے خود زیادہ بڑا حصّہ لینے پر آمادگی ظاہر کی، کیونکہ اسے فریڈرک اعظم سے نفرت تھی اور خطرہ تھا کہ وہ روس کے خلاف ضرور جارحانہ اقدام کرے گا، اسی غرض سے اس نے روس کے انگریز حلیف کو الگ کر لیا تھا۔

ہفت سالہ جنگ

جب لڑائی شروع ہوئی تو پروشیا کے خلاف بڑی طاقتوں کا اتّحاد نامکمّل تھا۔ مئی ۱۷۵۶ء میں برطانیہ اور فرانس نے اس کش مکش کی حالت کا رسمی اعلان کر دیا، جو شمالی افریقہ میں پہلے سے ان کے درمیان جاری تھی۔ تین مہینے بعد فریڈرک اعظم نے اس اتّحاد کے خلاف جارحانہ اقدام کر کے، جو اس کے لیے خطرے کا باعث بنا ہُوا تھا، یورپ میں جنگ کا افتتاح کر دیا۔ اب یہ طاقتیں ایک ایسی جنگ میں مصروف ہو گئیں، جو اصلاً ایک نہیں، دو مختلف جنگیں تھیں۔ ایک کا تعلق برِاعظم یورپ سے تھا، دوسری کا بحریات اور نوآبادیوں سے۔

ہفت سالہ جنگ کی یورپی مہموں میں فریڈرک اعظم اور ہوہینزولرن خاندان کے نظام کو نہایت خوفناک آزمائش سے سابقہ آ پڑا تھا۔ پروشیا کا مقابلہ آسٹریا، فرانس اور روس کی فوجوں سے تھا، جن کی مجموعی آبادی پروشیا

---

۱ Kaunitz

۲ Madame de pompadour لُوئی پانزدہم کی مشہور داشتہ، جسے بادشاہ پر انتہائی اقتدار حاصل رہا۔

سے منڈرہ گنا تھی۔ برطانیہ کے سوا پروشیا کا کوئی حلیف نہ تھا اور برطانیہ روپے کی مدد تو دے سکتا تھا، لیکن اس سے حقیقی فوجی امداد بہت کم مل سکتی تھی۔ بڑے ایلیکٹر نے جو روایتیں قائم کردی تھیں، پھر فریڈرک ولیم اوّل اور فریڈرک اعظم نے انھیں نشو ونما دی، ان کی وجہ سے قوم اس خطرے کا مقابلہ کرتی ہوئی زندہ رہی۔ پروشیا کی آبادی بڑی فرماں بردار تھی۔ اس نے حُبِّ وطن سے کام لیتے ہوئے اپنی قوت کا آخری ذرہ جنگی مساعی کے لیے وقف کردیا۔ خود فریڈرک نے اس سلسلے میں عمل کا نمایاں نمونہ پیش کیا۔ ۱۷۵۸ء میں اس نے اپنے ایک فرانسیسی دوست کو لکھا:

> "مجھ پر ہر سمت سے حملہ ہوگیا۔ وطنی آزمائشیں، خفیہ تکلیفیں، عوامی پریشانیاں اور آنے والی مصیبتیں یہ رات دن کی میری قوت لایموت ہیں، لیکن یہ نہ سمجھیے، مَیں کمزوری دکھا رہا ہوں۔ اگر سب کچھ تباہ ہوگیا تو میں بڑے اطمینان سے ملبے کے نیچے دفن کر دوں گا۔ ان برباد کُن اوقات میں ضرورت ہے کہ فولادی عزم اور برنجی قلب کے ساتھ اپنے آپ کو مستحکم رکھا جائے۔ یہاں رواقیت کے مسلک کی بندی درکار ہے[1]۔ ایپی کیورس[2] کے شاگردوں کو یہاں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں[3]......"

رواقیت پسند بادشاہ ہفت سالہ جنگ کا قابل ترین فوجی لیڈر تھا۔ اگرچہ میدانِ جنگ میں مرنے والوں اور زخمیوں کی تکلیفیں دیکھ کر اسے سخت پریشانی ہوتی تھی، لیکن یورپی بادشاہوں میں سے وہ تنہا تھا، جو مہموں میں سپاہیوں کے دوش بدوش برابر مشکلات برداشت کرتا رہا۔

فریڈرک کے "فولادی عزم" اور "برنجی قلب" نے حصولِ مقاصد کے لیے اسے ہر جائز و ناجائز تدبیر اختیار کرنے پر آمادہ رکھا۔ اس کی فوج میں صفیں سپاہیوں سے خالی ہوگئیں تو اس نے بے دردی سے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے چھوٹے ہمسایوں میکلن برگ اور سیکسنی سے جبراً سپاہی بھرتی کر لیے۔ برطانیہ کی طرف سے جو روپے کی امداد ملتی تھی، اس سے صرف مصارفِ جنگ کا ایک حصّہ پورا ہوتا تھا۔ فریڈرک نے سیکسنی، پولینڈ اور روس کے سکوں پر قبضہ کرلیا۔ پھر انھیں پگھلا کر پروشیا کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ اس دھات سے نئے سکّے ڈھالے گئے اور انھوں نے از سرِنو پروشیا کے سکوں کی صورت میں رائج کردیا۔ اگرچہ فریڈرک کو آگے چل کر پروشیا کے سکوں کی قیمت گھٹانی پڑی، لیکن اس نے یہ کام بہت قابلِ الزام شکل میں پورا کیا۔ یعنی یہودی کارندوں

---

[1] رواقیت کا مطلب یہ تھا کہ جذبات پر قابو پالیا جائے اور غم و شادی کا احساس ختم کردیا جائے۔

[2] Epicurus فلسفۂ رواقیت کا بانی۔

[3] دیکھیے گوچ Gooch کی کتاب فریڈرک اعظم Frederick the great ص ۱۴۱۔

کے ذمّے یہ کام لگا دیا کہ اس پر طبعاً یہودیوں کے خلاف تحریک پیدا ہونی ناگزیر تھی۔ وہ تحریک پیدا ہوئی تو فریڈرک بڑے مزے سے اس کا خیر مقدم کرتا رہا۔

پروشیا کے بچاؤ میں ایک اور عامل بھی حصّہ کارگر ہُوا، جو غالباً سب سے اہم تھا یعنی اس کے خلاف جس اتّحاد کا انتظام کیا گیا تھا، وہ اتحاد ناکافی تھا۔ فریڈرک کی یہ انتہائی خوش نصیبی تھی کہ اس کے دُشمن اپنی فوجی کامیابی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے کاری ضرب لگانے کی صلاحیت کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکے۔ رُوس کے جرنیل بُزدل تھے۔ فرانس اور آسٹریا کے جرنیل بعض اوقات سراسر نااہل تھے۔ مزید برآں فرانسیسیوں کو، جو زبردست حریف تھے، دو محاذوں پر جنگ کرنی پڑی۔ ایک یورپ میں، دوسرے سمندر پار اور فرانس کے مالی وسائل دونوں جنگوں کے مصارف ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کانٹز نے جس بڑے اتّحاد کا انتظام کیا تھا، اس میں کش مکش، بے اعتمادی اور مقاصد کے تناقض سے رخنے پیدا ہوتے رہے اور دورانِ جنگ میں جو اتحاد کیے جاتے ہیں، انھیں ہمیشہ ایسے خطرات سے سابقہ پڑا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتّحاد زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ جنوری ۱۷۶۳ء میں روس کی ملکہ ایلزبتھ نے وفات پائی، تو پیٹر سوم اُس کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ وہ فریڈرک اعظم کا پُرجوش مدّاح تھا۔ اس نے فوراً ایلزبتھ کے حلیفوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور رُوسی فوجیں فریڈرک کے حوالے کر دیں کہ ان سے جو کام چاہو، لے لو۔ لہٰذا تعجّب نہ ہونا چاہیے کہ شکر گزار پروشیائی بادشاہ نے پیٹر سوم کے متعلق کہا: "وہ ایک خدائی حکمران ہے، میرا فرض ہے کہ اس کے لیے قربان گاہیں قائم کردوں۔" ۱۷۶۳ء کے اوائل میں فریڈرک نے جنگ فتح کر لی۔ آسٹریا ہیوبرٹس برگ[1] کے معاہدۂ صلح پر راضی ہو گیا، جس کے مطابق سلیشیا پروشیا کے قبضے میں رہا۔

فریڈرک کو سخت مقابلہ درپیش تھا۔ برطانیہ نے ہفت سالہ جنگ میں ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ حقیقتاً برطانیہ نے جنگ اچھے طریق پر شروع نہیں کی تھی۔ پہلے ڈیڑھ سال میں اسے تقریباً ہر محاذ پر شکستیں ہوتی رہیں۔ برِاعظم یورپ میں شاہ جارج دوم کے بیٹے ڈیوک آف کمبرلینڈ[2] نے حواس باختگی کے ایک کاغذ پر دستخط کیے۔ اپنی پوری فوج توڑ دی اور فرانسیسیوں کو ہینوور پر قبضے کی اجازت دے دی۔ سمندروں میں برطانیہ نے جزیرہ منورقہ[3] کھو دیا، جو بحیرۂ روم میں اس کا ایک اہم مرکز تھا (منورقہ جزائر بلیارک[4] میں واقع ہے)۔ یہ ایک تباہی تھی، جس میں برطانوی حکومت کا بھی خاصا حصّہ ہے، کیونکہ اس نے نہایت معمولی کمک امیر البحر بنگ[5] کی سرکردگی میں مناسب وقت کے بہت بعد بھیجی، پھر شکست کا پُورا الزام بنگ پر عائد کر دیا اور اُسے موت کی سزا دی۔ والٹیئر نے طنزیہ انداز میں کہا: "موت کی سزا اس لیے دی گئی کہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو۔" شمالی امریکہ میں برطانیہ کو پہلے ایک ناکامی ہوئی تھی یعنی جنرل بریڈک فورٹ دوکوین نہیں

---

۱ Hubertusburg ۲ Duke of Cumberland

۳ Minorca ۴ Balearic ۵ Byng

لے سکا تھا۔ اب ایک اور زک اُٹھائی، یعنی جھیل[1] اونٹیریو کے کنارے اوسُ[2] ویگو کی چوکی بھی چھن گئی۔ ایک اضطراری حملہ ٹوئی برگ پر کیا گیا، جو فرانسیسی کینیڈا کی کلید تھا۔

برطانیہ پر بدقسمتی کی سب سے بڑی ضرب ہندوستان میں لگی۔ جون ۱۷۵۶ء میں نواب بنگال نے، جو فرانسیسیوں کا ایک دیسی حلیف تھا، ایک سو چھیالیس انگریز قیدیوں کو چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا، جس میں صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ اس کا نتیجہ کلکتہ کی "کال[3] کوٹھڑی" کا وہ ہولناک حادثہ تھا، جس کی کیفیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز افسر نے یوں بیان کیا:

"انتہائی گرمی کا موسم تھا اور رات میں غیر معمولی امس تھا...... قیدیوں کے جسم ایک دوسرے سے بُری طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ جونہی دروازہ بند ہُوا، گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ قیدیوں کو یقین ہو گیا کہ اس خوف ناک بندی خانے میں رات گزارنا اور زندہ رہنا ممکن نہیں۔ دروازہ توڑنے کے لیے انتہائی کوششیں کی گئیں، مگر نہ ٹوٹ سکا، کیونکہ اندر کی طرف کھلتا تھا...

"اسیری کا فوری نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلسل اور بے اندازہ پسینا بہ نکلا، جس سے ناقابلِ برداشت تشنگی شروع ہوئی۔ پھر سینے میں نہایت اذیت افزا درد ہونے لگا۔ دم گھٹنے کے باعث سانس لینے میں دِقت محسوس ہوئی......

"دو بجے تک پچاس سے زیادہ آدمی زندہ نہ تھے، لیکن یہ تعداد بھی اتنی زیادہ تھی کہ تنگ کوٹھڑی کی فضا میں ٹھیک سانس نہیں لے سکتی تھی۔ تازہ ہُوا اور زندگی کے لیے کش مکش صبح تک جاری رہی....

"نواب کا بھیجا ہُوا ایک افسر آیا۔ اس کے پاس قید خانے کو کھول دینے کا حکم تھا۔ مُردے کوٹھڑی میں بُری طرح بھرے ہُوئے تھے اور زندوں میں بہت کم قوّت باقی رہ گئی تھی۔ تقریباً نصف گھنٹے تک مُردوں کو باہر نکالا جاتا رہا، کیونکہ مُردے دروازے کے ساتھ لگے پڑے تھے اور جب تک انھیں ہٹایا نہ جاتا، کسی کے لیے باہر آنے کا راستہ صاف نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک سو چھیالیس آدمی بند کیے گئے تھے، لیکن صرف تیئس آدمی زندہ بچے اور ان کی

۱؎ Ontario

۲؎ Oswego

۳؎ یہ پورا واقعہ سراسر جعلی اور ہالویل کا خود ساختہ ہے، جسے انگریز مورخ زیادہ سے زیادہ دردناک ظاہر کرتے رہے۔ نہ ایک سو چھیالیس آدمی اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں سما سکتے تھے، جس کا رقبہ دو سو ترسٹھ مربع فٹ تھا، نہ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا۔ یہ پوری داستان بے سر و پا ہے۔

شکلیں حد درجہ بھیانک تھیں۔"[1]

ولیم پٹ نے برطانیہ کی کایا پلٹ دی۔ "یہ عظیم القدر عوامی لیڈر" (یہ لقب اُسے اس لیے دیا گیا کہ دارالعوام میں اس نے بڑی طویل مدت تک نہایت قابلیت سے خدمات انجام دی تھیں) وگ پارٹی کی حکمران جماعت کا نہایت مشہور رُکن تھا۔ پارلیمنٹ میں وہ اولڈ سارم[2] کی طرف سے منتخب ہوتا تھا۔ یہ ایک مشہور "ویران" قصبہ تھا۔ ایک ملک التجار کا پوتا تھا۔ جسے ڈائمنڈ پٹ[3] کہتے تھے اور جس نے ہندوستان میں بڑی دولت جمع کی تھی۔ پٹ نے مسلسل شہر کے مفاد کی حمایت کی۔ اٹھارھویں صدی کے چوتھے عشرے میں اس نے والپول کی صلح جویانہ پالیسی کے خلاف وگ پارٹی کے باغیوں کی قیادت کی۔ یہی نوجوان محبانِ وطن تھے، جنھوں نے برطانیہ کو جینکنز کے کان کی جنگ میں شرکت پر مجبور کر دیا تھا۔ اب پٹ کی جنگی وزارت (۱۷۵۷ء۔ ۱۷۶۱ء) نے شکست کو فتح کی شکل میں بدل دیا۔ ان بے رنگ وزارتوں کی مذبذب پالیسی ختم ہوگئی، جو ۱۷۴۲ء میں والپول کے زوال کے بعد بروئے کار آتی رہیں۔ ۱۷۱۳ء کے بعد پہلی مرتبہ برطانیہ کے وسائل پوری قوت سے جنگ جاری رکھنے کے لیے استعمال کیے گئے۔ حکومت نے مالی مشکلات پر بہ آسانی قابو پا لیا۔ بجٹ کا خسارہ برابر بڑھتا گیا، لیکن پٹ اپنے ذاتی اور کاروباری تعلقات سے سرکاری قرضوں کا انتظام کامیابی کے ساتھ کرتا رہا۔ اس نے فریڈرک کو معتدبہ مالی امداد دے کر انگلستان و پروشیا کے اتحاد میں معنی پیدا کر دیے۔ ڈیوک آو کمبرلینڈ نے ہینوور کے سلسلے میں جو صورت حال قبول کر لی تھی اسے منسوخ کر دیا اور ہینوور کی انگریزی فوجیں پروشیا کے ایک کمانڈر کی تحویل میں دے دیں۔

پٹ نے سرگرم تدابیر سے بحریات اور نوآبادیاتی جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ جو جرنیل اور امیرالبحر غلطیوں کے باعث ابتدائی شکستوں کے ذمہ دار تھے، ان کی جگہ دوسرے آدمی مقرر کر دیے۔ اب فرانسیسیوں نے بالکل بے بس ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ رودبارِ انگلستان کو عبور کر کے برطانیہ کے قلب پر حملہ کر دیں، مگر وہ اپنی تیاریوں کو خفیہ نہ رکھ سکے۔ نہ ان کے پاس اتنے جہاز تھے کہ جو بڑی فوج کو برطانیہ پہنچانے کے لیے ضروری تھے۔ بہرحال جب برطانیہ کی شاہی و بحری قوت نے فرانسیسی بحری قوت کے دو بیڑوں کو شکست دے دی —— اوقیانوس کا بیڑا اور بحیرۂ روم کا بیڑا —— تو ۱۷۵۹ء میں برطانیہ پر حملے کی تجویز خود بخود ختم ہوگئی۔

برطانیہ کو سمندروں پر جو نمایاں غلبہ حاصل تھا، اس کی وجہ سے برطانیہ نہ محض ممکن فرانسیسی حملے سے محفوظ ہو گیا، بلکہ اور بھی دور رس نتائج نکلے۔ مثلاً برطانیہ کو موقع مل گیا کہ بیرونی تجارت کا سلسلہ کامیابی سے جاری رکھ سکے۔

۱؎ Orme کی کتاب A History of the Transactions of the British Nation in Indostan (ہندوستان میں برطانوی قوم کی کارروائیوں کی سرگزشت)۔

۲؎ Old Sarum ۳؎ "Diamond Pitt"

اس کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی سمندر پار تجارت تیزی سے گھٹ گئی، یہاں تک کہ وہ ماقبل جنگ کی تجارت کا صرف ⅙ حصہ رہ گئی۔ یوں فرانسیسی نو آبادیوں کو معمولی رقم اور سرسری امداد ملنے کا بھی کوئی موقع نہ رہا۔ ضروری امداد کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ برطانیہ کی اعلیٰ قوت سے مقابلہ درپیش تھا۔ ان حالات میں فرانسیسی سلطنت کی بیرونی چوکیاں تیزی سے یکے بعد دیگرے برطانیہ کے قبضے میں آ گئیں۔

افریقہ میں برطانیہ نے فرانس کے ان مرکزوں پر قبضہ کر لیا، جہاں سے بردہ فروشی جاری تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس میں مانٹز کے بردہ فروش تباہ ہو گئے۔ ہندوستان میں کلائو اور دوسرے لوگوں نے "کال کوٹھڑی" کے انتقام میں نواب بنگال کو سزا دی اور کلیدی فرانسیسی چوکیاں قبضے میں لے لیں۔ غرب الہند میں مانٹو ڈومنگو کے سوا وہ تمام جزیرے فرانسیسیوں کے قبضے سے نکل گئے، جہاں کھانڈ بنتی تھی۔ شمالی امریکہ میں پینسٹھ ہزار فرانسیسی آبادکار، جن کے پاس رسد بھی نہ تھی اور اچھی قیادت کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، دس لاکھ انگریز آبادکاروں کے مقابلے میں بے بس رہ گئے، جنھیں برطانیہ سے پوری امداد مل رہی تھی۔ آخر فورٹ ڈوکین پر قبضہ کر لیا گیا اور اس کا نام پٹسبرگ رکھا گیا، جو ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ برطانیہ نے اور فتوحات بھی حاصل کیں۔ انگریز جرنیل وُلف[1] کی بڑی کامیابیوں کے بعد کینیڈا کی تقدیر یقینی ہو گئی۔ وُلف نے ۱۷۵۸ء میں لوئی برگ پر قبضہ کیا۔ ستمبر ۱۷۵۹ء میں کوبیک[2] کے باہر میدان ابراہیم کو مسخر کر لیا۔ اسی جنگ میں وہ مارا گیا۔ مونٹ ریل[3] ۱۷۶۰ء میں فتح ہوا۔

معاہدۂ پیرس

مثبت فتوحات کے اس تواتر سے برطانوی عوام میں شادمانی اور توقعات کی نئی لہریں دوڑ گئیں، لیکن شادمانی پر جلد اوس پڑ گئی اور توقعات بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ پٹ نے جنگ میں کامیابی حاصل کی، مگر صلح اُس کے ہاتھوں انجام نہ پائی۔ انگلستان کا تخت ۱۷۶۰ء میں جارج سوم کو ملا، جو بڑا خود رائے آدمی تھا۔ اس نے اپنے زیادہ زبردست وزیر اعظم کو برطرف کر دیا۔ ۱۷۶۳ء میں معاہدۂ پیرس کے مطابق برطانیہ اور فرانس کے درمیان جنگ بند ہوئی۔ پٹ کے جانشینوں نے فرانس کو ہندوستان میں اپنے خاص مرکز واپس لے لینے کی اجازت دے دی اور افریقہ میں بردہ فروشی والا ساحل بھی اسی کے پاس رہا۔ غرب الہند کے جزیرے بھی اسے واپس مل گئے۔ بحیرۂ کیریبیا میں پرانے نظام کی بحالی برطانوی آبادکاروں کے لیے بڑے اطمینان کا باعث تھی، کیونکہ ان کی منڈیاں اس کھانڈ سے لبریز ہو گئی تھیں، جو دورانِ جنگ میں فرانسیسی جزیرے وادی لوپ سے حاصل ہوئی تھیں، لیکن ایک محبِّ وطن کو صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانیہ کے پنجے میں ایک بہت بڑا انعام آیا تھا، جو یکایک نکل گیا۔

اہلِ برطانیہ کو غصے میں یہ حد درجہ اہم حقیقت بھی فراموش ہو گئی کہ ہفت سالہ جنگ اور معاہدۂ پیرس نے کم از کم

---

١ Wolf ٢ Quebec ٣ Montreal

مستقبل قریب کے لیے فرانس کی تعمیر سلطنت کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ برطانیہ کو ہندوستان میں حقیقی برتری مل گئی۔ فرانس کے تجارتی مرکز اس کے قبضے میں رہے، لیکن ان میں قلعہ بندیوں کی اجازت نہ تھی اور نہ وہ سابقہ مسلک کے مطابق دیسی مملکتوں کے مدعیوں کی حمایت کر سکتا تھا۔ مزید برآں شمالی امریکہ میں فرانس تمام مقبوضات سے محروم ہو گیا۔ برطانیہ نے کینیڈا پر قبضہ کر لیا۔ نیز ایپے لیشینز اور مسسپی کا متنازعہ فیہ درمیانی علاقہ لے لیا۔ ہسپانیہ سے فلوریڈا حاصل کر لیا، جس نے ۱۷۶۲ء میں فرانس کا ساتھ دینے کی حماقت کی تھی، حالانکہ اس وقت تک فرانس جنگ میں ہار چکا تھا۔ اس کے بدلے میں ہسپانیہ کو لوئی سیانا[1] کی فرانسیسی نوآبادی مل گئی۔

بین الاقوامی توازن پر تبصرہ

ہیوبرٹس برگ اور پیرس میں جن معاہدات صلح کا انتظام ہوا، ان کے ذریعے سے وہ بین الاقوامی نازک صورت حالات ختم ہو گئے، جو لوئی چہاردہم کی وفات اور انقلابِ فرانس کے آغاز کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ ۱۷۶۳ء کے بعد جلد ہی نئے بحران رونما ہونے لگے، جن کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔ مثلاً ۱۷۶۸ء میں روس اور ترکی کے درمیان جنگ، ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کی پہلی تقسیم اور ۱۷۷۶ء میں امریکہ کی جنگِ آزادی، لیکن مشرق میں دو بحرانوں[2] نے توازن میں کوئی بڑا تغیر پیدا نہ کیا اور امریکی انقلاب میں اگرچہ برطانیہ کو تیرہ نوآبادیوں سے دست بردار ہونا پڑا، مگر اس نقصان سے اس بحری برتری پر کوئی خاص زد نہ پڑی، جو ۱۷۶۳ء میں برطانیہ نے حاصل کر لی تھی۔ جو بین الاقوامی توازن ۱۷۶۳ء میں قائم ہوا تھا، وہ ۱۷۸۹ء تک زیادہ تر غیر متغیر رہا۔ حصولِ اقتدار کی مسلسل کشمکش میں نہایت طاقتور مملکتیں — برطانیہ، پروشیا، روس — عموماً کامیاب رہیں، جو زیادہ موزوں ثابت نہ ہوئیں — فرانس، ہسپانیہ، آسٹریا، ترکی — انھوں نے اپنے آپ کو بحال رکھا اور جو زیادہ کمزور تھیں — پولینڈ اور اٹلی — البرونی کے الفاظ کے مطابق، جو صدی کے اوائل میں کہے گئے تھے، ان پر ولندیزی پنیر کی طرح تراش خراش کا عمل جاری رہا اور ٹکڑے کاٹ کاٹ کر الگ کیے جاتے رہے۔

ہفت سالہ جنگ کے دوران میں ڈیوک آف شوئزول[3] لوئی پانزدہم کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے کہا تھا کہ قوت کا اصل توازن تجارت میں مضمر ہے۔ یہ رائے بڑی حد تک درست تھی، لیکن حقیقت کا پورا نقشہ پیش نہیں کرتی تھی۔ برطانیہ اور بوربونوں کی سلطنتوں میں جو عالمگیر کشمکش جاری تھی، اس نے تجارتی نظریۂ زر کو یقیناً حق بہ جانب ثابت کر دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بین الاقوامی روابط میں مسلسل مقابلہ اور کشمکش جاری رہے۔ تجارتی نظریۂ زر کا اصول یہ تھا کہ تجارت کی ایک مقررہ مقدار اپنے قبضے میں ہو، لیکن کوئی مملکت موجودہ وسائل میں اضافہ کرنا چاہتی تو حریف مملکتوں کے حصے میں تخفیف کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ یہ تخفیف یا تو جنگ کے ذریعے سے ہو سکتی تھی یا دورِ امن میں ناجائز مال کی درآمد کے ذریعے سے ممکن تھی۔ اس

۱؎ Louisiana

۲؎ اس سے مراد ہے روس و ترکی کی جنگ اور تقسیم پولینڈ۔

۳؎ Duke of Choiseul

کے علاوہ حریفوں کے جواب میں انتقامی ضوابط نافذ کیے جا سکتے تھے۔ جینکنز کے کان کے متعلق جو جنگ ہوئی، اس نے ان تمام چیزوں کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ "ہفت سالہ جنگ" میں سمندر پار کی تجارت برطانیہ قائم رکھ سکا اور فرانس کو اس میں ناکامی ہوئی۔

اٹھارھویں صدی کی جنگ میں اقتصادی تحرکات اور اقتصادی وسائل نے زمانۂ ماضی کے مقابلے میں زیادہ فیصلہ کن کردار ادا کیا، لیکن اس صدی کے اندر بین الاقوامی توازن میں جو تغیرات ہوئے، ان کی پوری توجیہ محض اقتصادی تحرکات اور اقتصادی وسائل کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ پیٹر اعظم کی فتوحات یا فریڈرک کے جارحانہ اقدامات یا پولینڈ کے متعلق کش مکش کے مرکزی وسائل کی حیثیت تجارتی نہ تھی۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ روس کے رومانوف، پروشیا کے ہوہینزولرن اور آسٹریا کے ہیبسبرگ اپنا دائرۂ اقتدار بڑھانا چاہتے تھے۔ امراء اور جنکر اپنے اپنے حکمران خاندانوں کی حمایت کر رہے تھے، کیونکہ اسی طرح ان کے اقتدار میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ فریڈرک اعظم کی فتوحات کا انحصار جزوًا اس امر پر تھا کہ اس نے پروشیا کے اقتصادی وسائل سے احسن طریق پر کام لیا، لیکن یہ فتوحات زیادہ تر ان عوامل پر بھی مبنی تھیں، جنھیں اقتصادیات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً پروشیا کے معاشرے کا ضبط و نظم، فریڈرک کی شاندار اور بے پناہ قیادت۔ برطانیہ کو ٹیرٹولیل کے قول کی حمایت میں بہترین دلیل بن سکتا تھا، لیکن اس کی کامیابی بھی زیادہ تر مجلسی اور سیاسی نظام کی ممنون تھی۔ اسی کی وجہ سے پٹ کو بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ وہ موزوں وقت کے لیے نہایت موزوں آدمی تھا۔ غرض جنگ محض اقتصادیات کا آئینہ نہیں، بلکہ معاشرے کے اور بھی بہت سے اداروں کا آئینہ ہوتی ہے جو جنگ لڑتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں معاشرے نے جنگ کو روکنے یا اس کے تواتر میں کمی کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی، تاہم اٹھارھویں صدی کی جنگوں میں تدبیر و ضبط کے جوہر عموماً نظر آتے ہیں، جو ہم نے لوئی چہار دہم کے جارحانہ اقدامات میں دیکھے۔ اس سے اٹھارھویں صدی کے متعلق اس تعبیر کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ صدی نسبتاً استواری کا دور تھی۔ جنگوں کے باوجود اس دور میں مقابلۃً امن رہا۔ اس سے پیشتر مذہبی کشمکشوں کے دور کی یہ حالت نہ تھی اور بعد میں برلزم اور قوم پروری کے جو طوفان انقلاب فرانس کے باعث دنیا میں بپا ہوئے، ان کی حالت یہ نہ تھی۔ مثلاً اٹھارھویں صدی کی ہفت سالہ جنگ اس لیے شروع نہیں ہوئی تھی کہ تباہی خیزی میں سترھویں صدی کی سی سالہ جنگ کا ایک نیا مرقع فراہم کر دیا جائے۔ ہفت سالہ جنگ کی محض مدت ہی کم نہ تھی، بلکہ اس کی اور بھی بہت سی چیزیں غور طلب تھیں۔ بہت کم جنگجو تھے جن کا احساس یہ تھا کہ وہ کیتھولزم یا پروٹسٹنٹزم یا قومی آزادی جیسے کسی بڑے مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جنگ زیادہ منظم انداز میں ہوتی رہی۔ سو سال پیشتر یہ کیفیت نہ تھی۔ سپاہی زیادہ منظم تھے اور فوجیوں کے لیے ساز و سامان کی بہم رسانی کا بہتر انتظام تھا۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوجیں بہت کم لوٹ مار کرتیں اور غیر مصافی آبادی کے املاک و نفوس کے لیے یہ بڑا خطرہ نہیں رہی تھیں۔ خود طریقِ جنگ سے ظاہر ہو گیا کہ یہ صدی نظم، عقل و فہم اور روشن خیالی کی صدی تھی۔

اٹھارھویں صدی

دورِ تنویر

ساتواں باب

بنیادی اصول اور امتیازی اوصاف

تمہید

عقل و دانش، طبعی قانون اور ترقّی —— ان لفظوں کو اٹھارھویں صدی کے ذخیرۂ الفاظ میں، جسے عہدِ تنویر کہتے ہیں، کلیدی حیثیّت حاصل ہے۔ اِس دَور میں اکثر آدمیوں کا عقیدہ تھا کہ انسانی عقل و دانش عام انسانیت کو بہت سی بیماریوں سے نجات دلا سکتی ہے اور اسے یقینی طور پر دائمی امن، مثالی حکومت اور کامل و اکمل معاشرے پر پہنچا سکتی ہے۔ عقل طبعی قوانین دریافت کرے گی، جو بقا کے لیے ضوابط بنیں گے۔ اِس طرح انسانی نسل کی ترقّی زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے گی۔

رجائی عقیدے کے ان داعیوں کو فرانسیسی میں فلسفی کہتے تھے۔ اگرچہ وہ سب فرانسیسی نہ تھے اور ان میں سے صرف چند اشخاص ایسے تھے، جنھیں حقیقی معنی میں فلسفی کہا جا سکتا تھا۔ ان میں مقالہ نگار، ماہرینِ اقتصادیات، سیاسی سائنس دان اور مجلسی مصلحین سب شامل تھے۔ انھوں نے بنیادی اصول سترھویں صدی کے بڑے پیشروؤں، خصوصاً انگریز مفکّروں اور سائنس دانوں سے بھی لیے تھے۔ انسانی عقل کی قوّتوں پر اعتقاد انھوں نے جان لاک سے اور طبعی قانون پر اعتقاد سر آئزک نیوٹن سے لیا۔

لاک اور نیوٹن کی میراث

جان لاک ۸۹-۱۶۸۸ء کے شاندار انقلاب کا سب سے بڑا مدّاح تھا۔ اس نے حکومت پر دو رسالے لکھے۔ مطلق العنان بادشاہی کے خلاف اپنے نقطۂ نگاہ کو مستحکم کرنے کے لیے لاک نے نئی نفسیات کا خاکہ تیار کیا۔ جو لوگ سیاسی اور مذہبی مطلق العنانی کے حامی تھے، وہ کہتے تھے کہ بادشاہی خُدا کی طرف سے ہے اور یہ انسانوں کے لیے ایسی میراث ہے، جس سے انھیں مفر نہیں۔ مطلق العنان اقتدار کے سامنے جُھکنا ایک فطری رجحان ہے، جو پیدائش کے ساتھ ہی انسان میں موجود رہتا ہے۔ اس نے ۱۶۹۰ء میں اپنی مشہور کتاب مرتّب کی، جس کا نام تھا "انسانی فہم کے متعلق مقالہ"[1]۔ اس کتاب میں لاک نے فطری ادراک سے انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ نومولود کا قلب ایک سادہ لوح ہوتا ہے:

> "فرض کیجیے کہ یہ قلب ایک سفید کاغذ ہے، جو حروف سے بالکل خالی ہے۔ اس میں افکار قطعاً موجود نہیں۔ پھر یہ سب کچھ کہاں سے آتا ہے؟ ...... اس کا جواب

---

[1] Essay concerning Human understanding

ایک لفظ میں ہے: "تجربے سے"۔ ہمارا مشاہدہ بیرونی محسوس چیزوں یا قلب کے اندرونی اعمال کے متعلق کار فرما رہتا ہے۔ اس طرح جو کچھ ہمارے قلب پر منعکس ہوتا ہے، وہی ہمارے فہم کے لیے غور و فکر کا سرمایہ بہم پہنچاتا ہے۔ یہی دو چیزیں علم کا سرچشمہ ہیں، جن سے ہمارے تمام افکار پیدا ہوتے ہیں اور طبعاً انھیں پیدا ہونا چاہیے۔[1]"

دوسرے لفظوں میں علم کے دو سرچشمے ماحول سے متعلق تھے۔ ان کا تعلق عقیدے سے نہیں، بلکہ میراث اور عقل سے ہے۔ لاک کا عملی نقطۂ نگاہ اور اس کے تجربیت (تجربے پر انحصار) کے باعث وہ عقلیت پسندوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ اگرچہ انسانی عقل کائنات کی ہر چیز کے متعلق توجیہات پیش نہیں کر سکتی ہے، لیکن انھیں انسان کو جن چیزوں کے جاننے کی ضرورت ہے، وہ ضرور پیش کر دیتی ہے۔ جو قندیل ہمارے اندر رکھ دی گئی ہے، وہ ہمارے مقاصد کو واضح کرنے کے لیے خاصی روشنی بہم پہنچاتی رہتی ہے۔

لاک نے نظامِ قدیم کے انتقادی جائزے کا طریقہ بتایا۔ فلسفیوں نے حکومت کے متعلق اس کے رسالے اور انسانی فہم کے متعلق اس کے مقالوں کا مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہوئے۔ پھر لاک نے عقلِ عامہ کے لیے جو معیار پیش کر دیا تھا، اس سے مروجہ سیاسی و اقتصادی اداروں میں کام لیا اور وہ انھیں پُر پیچ و مہمل معلوم ہوئے۔ لاک کی نفسیات نے یہ طریقہ بتا دیا تھا کہ معلمین ابھرتی ہوئی نسل کے فکر کو نئے سانچے میں ڈھال لیں تو انسانی ادارے تیار ہو سکتے ہیں۔ فلسفیوں نے اس کھریا مٹی کی تلاش کی جو نوجوان قلوب کے اندر اثر پذیر سادہ الواح پر لکھنے میں کام آ سکتی تھی۔ نیوٹن کی عالمی مشین کے تصور میں انھوں نے اپنا مطلوب پا لیا۔

نیوٹن نے اپنی کتاب پرنسپیا (۱۶۸۷ء)[2] میں فلسفے کے متعلق استدلال کے چار اصول بتائے تھے:

"۱۔ ہمیں طبعی اشیاء کے اسباب میں صرف انھیں قبول کرنا چاہیے، جو درست بھی ہیں اور صورتِ حال کی صحیح توجیہہ بھی کر سکتے ہیں اور کسی سبب کو قبول نہ کرنا چاہیے۔"

اس سلسلے میں فلسفی کہتے ہیں کہ فطرت کوئی کام عبث نہیں کرتی۔ اگر تھوڑے سے کام چل سکے تو زیادہ پر زور دینا عبث ہے۔ فطرت سادگی کو پسند کرتی ہے۔ اسے فالتو اسباب و علل کا شکوہ درکار نہیں۔

"۲۔ لہٰذا ہمیں ایک قسم کے طبعی معلولات کے ساتھ تا بہ حدِ امکان ایک ہی قسم کے علل وابستہ کرنے چاہئیں۔"

"مثلاً انسان اور حیوان کا سانس لینا، ہمارے باورچی خانے کی آگ کی حدت اور سورج

---

[1] ایسے Essay کتاب دوم، باب اوّل

[2] Principia

کی حدت، زمین پر روشنی کا انعکاس اور سیاروں میں روشنی کا انعکاس۔

۳۔" ہمارے تجربے کے دائرے میں جتنے اجسام آتے ہیں، ان میں ایک ہی قسم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، لہٰذا ان خصوصیات کو تمام جسموں کی عالمی خصوصیات سمجھنا چاہیے۔

" اگر تجربے اور ستاروں کے مشاہدے سے یہ ظاہر ہو کہ زمین کے آس پاس کے تمام اجسام زمین کی طرف کھنچے آتے ہیں اور چاند کی کشش بھی زمین ہی کی طرف ہے۔ اسی طرح تیارے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں اور ٹوٹنے والوں تیاروں کی کشش سورج کی طرف ہے تو ہمیں اس عالمی قاعدے کے پیش نظر مان لینا چاہیے کہ تمام اجسام میں ایک دوسرے کی طرف کشش کا اصول ودیعت ہے۔

۴۔ تجربی فلسفے میں ہمیں ان قضیوں پر، جو مظاہر سے بہ وسیلۂ استقراء عام فراہم کیے جائیں، اس لحاظ سے غور کرنا چاہیے کہ وہ درست ہیں یا انھیں زیادہ سے زیادہ قرین صحت سمجھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ بعض مفروضات ان کے خلاف قیاس میں آسکیں۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہنا چاہیے، جب تک دوسرے ایسے مظاہر سامنے نہ آجائیں، جن سے ان کی مزید تصدیق ہو سکے یا وہ غلط ثابت ہو جائیں۔

" اس کا مطلب یہ ہے کہ استقراء کی دلیل سے مفروضات کی بناء پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔"[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ مادّی دنیا پر جو قوانین حاوی ہیں، وہ بہت سادہ ہیں (قاعدہ ۱)۔ وہ مستقیم ہیں۔ (قاعدہ ۲)۔ انھیں استقراء اور استنباط کے قاعدوں سے بہ حیثیت مجموعی کام لے کر ثابت کیا جاسکتا ہے (قاعدہ ۳ نیز ۴)۔ پہلے کسی قابلِ مشاہدہ شئے سے عام اصول کے لیے استدلال کیا جائے (استقراء) پھر اس قاعدے کو اُن مثالوں پر استعمال کیا جائے، جن کا مشاہدہ براہِ راست ممکن نہیں (استنباط)

فلسفیوں نے نیوٹن کے ان قواعدِ استدلال اور سائنٹیفک اکتشافات کو قطعی حقائق سمجھ لیا۔ جو لوگ نیوٹن کے ریاضیاتی احصاء کو سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے اس کا مطالعہ ابتدائی لاطینی یا اس کے ترجمے میں کیا۔ جو لوگ یہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے، انھوں نے وہ کتابیں پڑھ لیں، جن میں پرنسپیا کے مطالب کو عام فہم طریق پر پیش کیا گیا تھا۔ جس حد تک اصول کششِ ثقل کا تعلق ہے، نیوٹن نے اس طبعی قوت کو پالیا تھا، جس نے پوری کائنات کو یکجا کر رکھا

---

[1] Newton's mathematical principles ص ۳۹۸ – ۴۰۰۔

ہے، گویا اس نے کائنات کو قابلِ فہم بنا دیا۔ اٹھارھویں صدی کے لوگوں کو یقین تھا کہ اور نیوٹن پیدا ہوں گے، جو انسانی سرگرمیوں کے تمام پہلوؤں پر مادی قوانین دریافت کرلیں گے۔ فلسفیوں نے اپنے آپ کو ملکداری، انصاف اور اقتصادیات کے نیوٹن سمجھ لیا، جو اداروں کے نہایت پُرپیچ معاملات کو اسی قسم کے فارمولوں کی شکل دے سکتے تھے، جیسے نیوٹن نے اپنے ریاضیاتی قوانین و اصول میں پیش کیے تھے۔

فلسفی کہتے تھے کہ دنیا و مافیہا ایک بہت بڑی مشین سے مشابہ ہے۔ اب تک انسانوں نے اس مشین کے عمل کو روک رکھا، کیونکہ وہ اسے سمجھتے نہیں تھے، جب وہ بنیادی قوانین سمجھ میں آجائیں گے، جن کے مطابق یہ چل رہی ہے تو اس مشین کے اطمینان سے کارفرما رہنے کی صورت پیدا ہوجائے گی اور وہ افادی حیثیت میں کام کرے گی۔ اس عہد کی رجائیت کا خلاصہ ایک کتاب میں پیش کر دیا گیا، جس کا نام تھا: "ذہن انسانی کی ترقی"[1] (۱۷۹۴ء)۔ یہ کتاب ایک فلسفی نے لکھی تھی، جس کا نام کنڈورسٹ[2] تھا۔ یہ ایسے حالات میں لکھی تھی، جب وہ قید خانے میں تھا اور انقلابِ فرانس کی دہشت انگیز حکومت کی طرف سے اُسے موت کی سزا سُنائی جا چکی تھی۔ کنڈورسٹ نے پوچھا:

"اگر انسان تقریباً کامل یقین سے ان مظاہر کے متعلق پیشگوئی کرسکتے ہیں، جن کے قوانین سے وہ واقف ہیں، ...... تو کیا وجہ ہے کہ تاریخ انسانی کے نتائج کا مطالعہ کرکے عالم انسانیت کی آئندہ تقدیر کا نقشہ زیادہ سے زیادہ یقین کے ساتھ کھینچ دینے کو فعلِ عبث سمجھا جائے؟ طبعی سائنس میں عقیدے کی بنیاد صرف یہ فکر ہے کہ معلوم و نامعلوم عام قوانین، جن پر مظاہر کائنات کا انحصار ہے، باقاعدہ اور مستقیم ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس اصول کو انسان کے اخلاقی و ذہنی قویٰ کی نشوونما میں ہر لحاظ سے درست نہ سمجھا جائے، جس طرح فطرت میں اس کی کارفرمائی درست سمجھی جا سکتی ہے"[3]

کنڈورسٹ نے آخر میں لکھا: فطرت نے انسانی قویٰ کی تکمیل پر کوئی پابندی عائد نہیں کی اور اس ترقی کی تکمیل صرف اس کُرے کی مدّتِ حیات ہے، جس پر فطرت نے ہمیں جگہ دی ہے[4]

اٹھارھویں صدی میں سائنس

اٹھارھویں صدی میں فنی اور سائنٹیفک اقدامات نے طبعی قانون اور ترقی کے عقیدے کو مزید استحکام بخشا۔ فلسفیوں نے صنعت و زراعت میں عملی کارناموں اور خالص علوم کی تیزی سے پھیلتی ہوئی سرحدوں کا خیر مقدم کیا۔ حیاتیات اور کیمیا نے دورِ حاضر کا نقطۂ نگاہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ لنّائیوس[5] (۱۷۰۷ء - ۱۷۷۸ء)، سویڈن کا باشندہ تھا۔ اس نے حیاتیات میں خاندانی

---

1. The Progress of Human Mind
2. Condorcet
3. کنڈورسٹ کی کتاب ص ۲۰۳
4. ایضاً ص ۵
5. Linnaeus

تعلقات کے اندر طبعی قوانین کی کارفرمائی واضح کردی۔ اس کے ہر معلوم پودے اور جانور کو لے کر بہ لحاظ انواع ان کی درجہ بندی کردی۔ پھر مختلف انواع کو جنسوں کے اعتبار سے ترتیب دیا۔ اسی طرح اس نے جنسوں سے طبقوں تک درجہ بندی کا ایک سلسلہ قائم کردیا۔ یوں ماہرینِ حیاتیات نے ہر نمونے کے لیے دو لاطینی نام تجویز کرنے کا کام شروع کردیا، اوّل جنس، دوم نوع۔ لننائیوس اپسالہ[1] (نزد سٹاک ہالم) کی یونیورسٹی میں لکچر دیتا تھا۔ وہاں طلبہ اس تیزی سے کھچے چلے آئے کہ یونیورسٹی میں ان کی تعداد تگنی ہوگئی۔ لننائیوس نے درجہ بندی کے لیے جو جوش و خروش پیدا کیا تھا، اس سے غیر فنی آدمی نباتیات میں دلچسپی لینے لگے اور پیشہ ور ماہرینِ نباتات و حیوانیات نے نئے انواع کی دریافت شروع کردی۔

کیمیائی تجزیے کا نیا علم بلیک[2] اور لیوائزیر[3] سے شروع ہوا۔ جوزف بلیک (۱۷۲۸ء — ۱۷۹۹ء) سکاٹ لینڈ کا ایک پروفیسر تھا۔ اس نے یہ پرانا نظریہ غلط ثابت کردیا کہ ہوا صرف ایک عنصر سے بنی ہے۔ اس نے ہوا کی مانند متعدّد مادّے یا گیسیں ثابت کردیں۔ لیوائزیر (۱۷۴۳ء — ۱۷۹۴ء) کیمیا اور طبیعات کا ایک فرانسیسی ماہر تھا۔ بلیک نے گیسوں کا جو مطالعہ شروع کیا، لیوائزیر نے اسے جاری رکھا اور ایک گیس کا نام آکسیجن تجویز کیا۔ ساتھ ہی ثابت کردیا کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ تمام مادّے چند بنیادی کیمیائی عناصر سے مرکّب ہوتے ہیں۔ ان میں سے تیئیس عناصر کا سراغ لیوائزیر نے لگالیا۔

اس اثناء میں ہیئت اور طبیعیات ان بڑے اقدامات کو مستحکم کر رہے تھے، جو سترھویں صدی میں کیے گئے تھے۔ اسے غیر معمولی ذکاوت کی صدی کہا جاتا ہے۔ لیپلیس[4] (۱۷۴۹ء — ۱۸۲۸ء) کو فرانس کا نیوٹن کہا جاتا ہے۔ اس نے سماوی میکانکیات کے متعلق نیوٹن کے بڑے اکتشافات میں اضافے کیے۔ اٹھارھویں صدی کے آٹھویں اور نویں عشرے میں لیپلیس نے نظامِ شمسی کی حرکات ریاضیاتی فارمولوں اور ہندسی شکلوں کے ایک سلسلے میں پیش کیں۔ امریکہ کے متنوّع العلوم فاضل بنجمن فرینکلن (۱۷۰۶ء — ۱۷۹۰ء) نے یہ ثابت کیا کہ برق اور صاعقہ ایک چیز ہیں۔ اس نے فلاڈلفیا کے اندر ایک طوفانِ رعد میں پتنگ اُڑایا اور پتنگ کی ڈور سے جو کنجی باندھ رکھی تھی، اس نے بجلی کی ایک لہر اخذ کرلی۔ اس تجربے نے ادنیٰ و اعلیٰ میں وسیع دلچسپی پیدا کی۔ فرانس کے شاہی خاندان کو دکھانے کے لیے یہ تجربہ ورسائی میں دُہرایا گیا۔

غرض ہر شخص نے خواہ اس کی حقیقت کچھ بھی، تجربے شروع کردیے یا کم از کم وہ سائنس میں حصّہ لینے لگا۔ والٹیئر نے کیمیا کو اپنا خاص مشغلہ بنایا۔ مونٹیسکیو[5] نے طبیعیات کا مطالعہ کیا۔ ایک امیر فرانسیسی خاتون کے متعلق

---

[1] Upsala — [2] BLACK — [3] Lavoisier

[4] Laplace — [5] Montesqueu

بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی گاڑی میں ایک لاش رکھ لی تھی تاکہ سیر وسیاحت کے دوران میں اس پر قطع و برید کا عمل جاری رکھ سکے اور علم تشریح کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے۔ یورپ کی تقریباً ہر مملکت میں فلسفی موجود تھے۔ شاہی انجمنیں بن گئی تھیں یا علم دوست افراد نے علوم کی ترقی کے لیے مجلسیں بنادی تھیں۔ نیوٹن اور فرینکلن نے بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی۔ سویڈن کے سائنس دان لِنّائیوں کو دولتمند ولندیزوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس نے لائیڈن (ہالینڈ) کی یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ آکسفورڈ اور دربار ہسپانیہ میں کام کے لیے اسے پیشکشیں کی گئیں۔ سائنسدان اور فلسفی قومی سرحدوں کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے۔ جب ان ملکوں کے درمیان جنگیں چھڑ جاتی تھیں تو اس حالت میں بھی وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ یا کم از کم باہم خط و کتابت رکھتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کی آفاقیت کے باب میں یہ ایک ممتاز مثال ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس صدی کا مزاج عام کاروبار جاری رکھنے کے حق میں تھا۔

فرانس کی قیادت

دورِ تنویر کی جڑیں انگلستان میں سترھویں صدی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اس کی شاخیں سکاٹ لینڈ، جرمنی، اٹلی، ہسپانیہ اور نئی دنیا تک پھیل گئیں اور اسی کے ذریعے سے صدی کے آفاقی لوث اور خصائص پوری طرح نمایاں ہوئے۔ بہ ایں ہمہ سب نہیں تو اکثر فلسفی فرانسیسی تھے۔ فرانسیسی قیادت کی چھاپ پورے دورِ تنویر پر ناقابلِ محو طریق میں لگی ہوئی ہے۔ دورِ عقلیت فرانس کی ثقافتی برتری کا اعلیٰ ترین نقطہ تھا اور ایک عظیم القدر امریکی فلسفی ٹامس جیفرسن کا قول تھا کہ ہر انسان کے دو وطن ہیں، ایک اس کا اپنا وطن اور دوسرا فرانس۔ فرانسیسی زبان نے دورِ تنویر کے لیے ذریعۂ مخابرت مہیا کردیا۔ پیرس کے سیلونوں[2] نے دورِ تنویر کی تحریر کا اسلوب معین کیا۔ جو عظیم القدر انسائیکلوپیڈیا فرانس میں مرتب ہوکر شائع ہوا، وہ فکرِ روشن کا ایک عمدہ ذریعہ تھا۔

اٹھارھویں صدی تک فرانسیسی کو بین الاقوامی زبان مان لیا گیا تھا۔ لوئی چہار دہم نے ڈپلومیسی میں اس کا درجہ بہت بلند کردیا۔ ریسین[3] اور دوسرے کلاسیکیت پسند مصنفوں نے اسے ادبیات میں بلند حیثیت پر پہنچا دیا۔ ایک مثل مشہور تھی کہ فرانسیسی زبان میں ایک خطرناک تصنیف پورے یورپ کے اندر اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مثل خالی از حقیقت نہ تھی۔ دور افتادہ روس تک ہر جگہ حکمران امراء اور علم دوست اصحاب فرانسیسی زبان کو دیسی زبان پر ترجیح دیتے تھے۔ فریڈرک ولیم اوّل شاہِ پروشیا فرانسیسی ثقافت سے نفرت کے اظہار میں بہت بلند بانگ تھا، لیکن اسے جرمن زبان اتنی کم آتی تھی کہ جو کچھ لکھتا، فرانسیسی زبان میں لکھتا اور الفاظ کے خاتمے پر جرمن زبان کا کوئی پیوند لگا دیتا۔ اس کا بیٹا فریڈرک اعظم شاذ ہی جرمن زبان استعمال کرتا تھا۔ ۱۷۸۳ء میں برلن کی اکیڈیمی نے ایک مقابلے کا انتظام کیا۔ مقابلہ اس سوال کے متعلق تھا: "کس چیز نے فرانسیسی زبان کو عالمی بنا دیا؟" جس شخص نے انعام حاصل کیا، اس

---

[1] Tellesson
[2] Salon
[3] Racine

نے ایک فقرے میں جواب دیا: "کیونکہ یہ زبان غیر مبہم، واضح، ہر دلعزیز اور معقول ہے۔ یہ اب فرانسیسی نہیں رہی بلکہ انسانیت کی زبان بن گئی ہے۔"

پیرس کے سیلونوں نے مصنفوں کو دقیقہ سنجی اور معقولیت سکھائی، نیز ان میں ہر دلعزیزی کا رنگ پیدا کیا۔ سیلون بڑے بڑے مکانوں میں استقبال کرتے تھے، جہاں بعد دوپہر یا شام کو مہمان جمع ہوتے اور مہماندار خاتون کی رہنمائی میں بات چیت کرتے۔ یہ خاتونیں عموماً دولتمند ہوتیں۔ ان کا تعلق امراء کے طبقے یا بالائی تاجر طبقے سے ہوتا۔ یہاں جولی دالیسپیناسی[1] کے سیلون کے متعلق ایک معاصر روداد پیش کی جاتی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ سیلونوں کی کیفیت کیا تھی:

"...... یہ حلقہ ان افراد پر مشتمل تھا، جن میں باہم کوئی تعلق نہ تھا۔ جولی نے ادھر ادھر سے انھیں جمع کر لیا تھا، لیکن ان کا انتخاب نہایت عمدہ طریقہ پر کیا گیا تھا۔ جب یہ لوگ جمع ہوتے تو اس طرح ہم آہنگ نظر آتے، جس طرح کوئی مشاق ساز نواز رباب کے تاروں سے ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ..... جولی اس رباب کو ایسی پرکاری سے بجاتی، جو بالکل اعجاز معلوم ہوتی۔ معلوم ہوتا تھا، اسے علم ہے کہ جس تار پر وہ انگلی رکھنے والی ہے، اس سے کون سا سُر نکلے گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن قلوب اور کرداروں سے وہ واقف تھی، اس کے ایک لفظ کہنے سے وہ گفتگو شروع کر دیتے۔ اس سے زیادہ دلآویز اور دل کش گفتگو کہیں نہ ہوتی اور اس سے بہتر ضبط و نظم کا نقشہ بھی کسی جگہ نظر نہ آتا۔ ... جن قلوب سے یہ خاتون کام لیتی تھی، وہ نہ سطحی تھے اور نہ ضعیف۔ کانڈی لیک[2] اور ترگو[3] اس مجلس میں شریک ہوتے تھے اور جولی کے نزدیک دالمبرٹ[4] بیٹھتا تھا، جو ایک سادہ لوح اور فرماں بردار بچہ معلوم ہوتا تھا۔ جولی کو کوئی نہ کوئی خیال پیش کرنے میں کمال حاصل تھا اور اس وضع کے لوگ اس خیال پر بحث کرتے تو لطف آ جاتا۔ وہ خود بھی اس پر بڑی دقیقہ سنجی اور بعض اوقات فصاحت کے ساتھ گفتگو کرتی۔ اس کا ایک کمال یہ تھا کہ بحث کے لیے نئے نئے خیالات پیش کرتی اور گفتگو کا موضوع بدلتا رہتا۔ ...... میں کہتا ہوں کہ یہ کمالات ہر خاتون کو نصیب نہیں ہوتے۔ روزانہ چار گھنٹے تک گفتگو جاری رہتی اور اس کا اسلوب عالمانہ یا نمائشِ علم کا نہ تھا۔ پھر اس گفتگو سے طبیعت کبھی بیزار نہ ہوتی اور اس میں کوئی چیز ایسی نہ آتی، جو بے سود یا فضول ہوتی۔ جولی کو علم تھا کہ ان اربابِ کمال کے لیے

---

[1] Juliede Lespinasse

[2] Condillac

[3] Turgot

[4] D'Alembert

دلآویزی پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے "

اگرچہ ان سیلونوں میں اکثر امارت پرستی اور سطحیت کا بھی اظہار ہوتا رہتا، تاہم ان میں ایک نوع کی جمہوریت پر عمل ہوتا تھا۔ اگر نئے آدمیوں اور نئے افکار کی ضرورت پیش آجاتی تو ان کا خیر مقدم کیا جاتا۔ نوجوان فلسفیوں کو موقع مل جاتا کہ اچھا کھانا کھائیں اور جو کچھ سننا چاہتے ہیں، سنا لیں۔ ان کے دباؤ سے فرانسیسی اکیڈیمی کے نتائجِ انتخابات پر اثر پڑتا، جو اٹھارھویں صدی کے ساتویں عشرے میں فلسفیوں کے زیر اثر آگئے تھے۔ سب سے آخر میں یہ کہ سیلونوں کی مالک خاتونیں فلسفیوں کو ذہنی مستعدی اور ادبی سہل نگاری کی ترتیب دیتیں۔

فلسفیوں کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ انسائیکلو پیڈیا تھا، جس کی متعدد جلدوں میں سے پہلی ۱۷۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اگرچہ نہ یہ سب سے پہلا انسائیکلو پیڈیا تھا اور نہ یہ سب سے بڑھ کر درست تھا، تاہم یہ مشہور کتاب ہر لحاظ سے حد درجہ ذی اثر ثابت ہوگئی۔ اس کے مقالہ نگار ایک سو ساٹھ تھے۔ ان سے دورِ تنویر کے اکثر افراد کا علم ہو سکتا ہے۔ ان میں والٹیئر، مونٹسک، روسو[1]، کنڈورسٹ، کویسنے[2] اور ترگو شامل تھے۔ سالہا سال تک ڈینس دیدرو[3] (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۸۴ء) اس کا مدیرِ اعلیٰ رہا۔ وہ روزانہ چودہ گھنٹے کام کرتا اور ہر گھنٹہ عقل و ترقی کے لیے جہاد میں صرف ہوتا۔

دیدرو اور اس کے رفیقوں کا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا کہ حقیقی معلومات کا ایک بے جان ذخیرہ مہیا کر دیں۔ جب کہ دیدرو نے انسائیکلو پیڈیا پر مقالے میں واضح کر دیا تھا، ان کا مدعا یہ تھا کہ علم یکجا کر دیں:

"۔۔۔۔ تاکہ گزشتہ صدیوں کی محنت و مشقت آئندہ صدیوں کے لیے بیکار ثابت نہ ہو۔ ہمارے اخلاف کو بہتر معلومات حاصل ہو جائیں، نیز وہ زیادہ خوش اور زیادہ نیک بن سکیں "

انسائیکلو پیڈیا کا مقصد پند و موعظت تھا، یعنی مروجہ نظام کے عیوب کی پردہ داری، خصوصاً مذہبی توہمات اور نارواداری کی مخالفت۔ عوام کو طبعی قوانین کے فوائد اور سائنس کے عجائبات سے آگاہ کرنا، مثلاً دیدرو نئی صنعتی مشینوں سے کام لینا سیکھ چکا تھا اور وہ ہر مشین کو الگ الگ کر کے اس کی ساخت اور عمل کی تفصیلات بیان کر سکتا تھا۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ جرابیں بننے کی مشین پر انسائیکلو پیڈیا پر جو مقالہ لکھا گیا، وہ گرجوں پر مقالے سے دس گنا لمبا تھا۔

خوف ناک مخالفت کے باوجود انسائیکلو پیڈیا نے اپنا مقصد پورا کر دیا۔ کلیسا نے اس کی مادیت پسندی اور مذہبی معاملات کے متعلق حد درجہ انتقادی اور تشکک آمیز مقالوں کی مذمت کی۔ لوئی پانزدہم نے کوشش کی کہ یہ

---

[1] Russeau

[2] Quesnay

[3] Denis Didprot

کتاب نہ چھپ سکے اور نہ شائع ہو سکے۔ انسائیکلوپیڈیا کے ناشروں نے دیدہ رو سے پوچھے بغیر مختلف فیہ مقامے کم کرکے بے معنی بنا دیئے، کیونکہ چھاپنے والوں کو ایک عام حکم بھیج دیا کہ جن تحریرات سے کسی طبقے کے ناراض ہونے کا خیال ہو، انھیں حذف کر دیا جائے۔ لیکن دیدرو نے اس پر سخت خفگی کا اظہار کیا۔ فلسفیوں نے مختلف حصے حذف کر دینے والوں کا مذاق اُڑایا۔ انسائیکلوپیڈیا کے خریداروں کو ان چیزوں سے کتاب کے ساتھ حد درجہ دلچسپی پیدا ہوئی۔ پھر وزیر خارجہ کو ئیزیول اور مادام دا پمپادور نے ایڈیٹروں کی امداد کی۔ پمپادور خود بھی دورِ تنویر کی ایک روح تھی۔ ان امور نے مل کر احتساب کو درہم برہم کر دیا اور کتاب کی تکمیل میں سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ ۱۷۶۸ء میں ایک چھوٹے سے صوبائی شہر ڈائیجون[لہ] کے اندر انسائیکلوپیڈیا کی ساٹھ جلدیں موجود تھیں۔

لہ Dijon

آٹھواں باب

فلسفیوں کا اصلاحی پروگرام

عدم مداخلت کی پالیسی

فرینکوائس کویسنے (۱۶۹۴ء۔ ۱۷۷۴ء) نے انسائیکلوپیڈیا کے لیے جو مقالے لکھے تھے، ان میں دورِ تنویر کے اقتصادی پروگرام کا اعلان کر دیا تھا۔ کویسنے متنوع العلوم شخص تھا۔ اسے حیاتیات میں مہارت تھی۔ وہ اعلیٰ درجے کا سرجن تھا۔ لوئی پانزدہم اور مادام پمپادور نے اسے ذاتی طبیب مقرر کر لیا تھا۔ وہ مفکروں اور ناشروں کے ایک گروہ کا رئیس تھا، جنھیں اقتصادیات کے فلسفی کہا جاتا تھا۔ انھوں نے آگے چل کر اپنے لیے "فزیوکریٹ"[1] کا نام اختیار کر لیا، یعنی وہ لوگ جو قدرتی حکومت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اس نام سے ان کے دبستانِ فکر کا بنیادی نقطۂ نگاہ آشکارا ہوتا ہے۔ ان کا یہ احساس یقینِ کامل کی حد پر پہنچا ہُوا تھا کہ وہ اقتصادیات کے نیوٹن تھے اور کویسنے بار بار اعلان کر چکا تھا کہ ہم اقتصادیات کے ایسے فطری قوانین دریافت کر لیں گے، جنھیں علم الہندسہ یا جبر و مقابلہ کے قواعد و اصول کی طرح پختہ اور ناقابلِ تردید ثابت کیا جا سکے۔

"بادشاہ اور حکومت کو کبھی یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ زمین ہی دولت کا واحد ذریعہ ہے اور کھیتی باڑی سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔"[2] یوں کویسنے نے طبعی دولت کا نیا تصوّر پیش کیا، جو فطری حکومت کے حامیوں نے اختیار کر رکھا تھا اور تجارتی نظریۂ زر کو تقریباً فی الجملہ گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا۔ کویسنے نے روپے کی اہمیّت کو کم کرتے ہُوئے کہا: "لوگوں کو معاش کے لیے جس دولت کی ضرورت ہے، وہ روپیہ نہیں، بلکہ وہ سامان ہیں، جو جینے کے لیے ضروری ہیں، نیز ضروری ہے کہ ان سامانوں کی سالانہ پیداوار کا سلسلہ جاری رہے۔" کویسنے نے کہا کہ جن مملکتوں نے تجارتی نظریۂ زر اختیار کیا، ان سے پے در پے غلطیاں سرزد ہوئیں، کیونکہ انھوں نے نقد روپے پر حد سے زیادہ زور دیا۔ انھوں نے تجارت کو ضبط و نظم میں لانے کی کوشش کی، حالانکہ اسے آزاد چھوڑ دینا چاہیے تھا، پھر انھوں نے بروف اور بعض دوسرے بالواسطہ محاصل عائد کر کے سامانوں کو گراں خرچ بنا دیا، حالانکہ انھیں صرف ایک محصول لینا چاہیے تھا، یعنی وہ محصول، جو زمین کی اصل پیداوار پر عائد تھا۔

غرض فطری حکومت کے حامیوں نے عدم مداخلت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو

---

[1] Physiocrat

[2] ای ڈیئر کی مرتبہ کتاب Physiocrat میں کویسنے کا قول جلد اول ص ۸۲۔

اور فطرت کو اپنا کام کرنے دو۔ اسی وجہ سے تجارتی نظریۂ زر کی اقتصادیات کو رد کر دیا، جس پر حکومت کو ضبط و نظم حاصل تھا اور آزاد اقتصاد کا کلاسیکی یا لبرل نظریہ پیش کیا۔ وہ کہتے تھے: "مملکت کو طبعی اقتصادی قوتوں کی آزادانہ کارفرمائی میں خلل نہ ڈالنا چاہیے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے نجی املاک کے لیے خطرہ پیدا نہ کرنا چاہیے، جو زرعی دولت پیدا کرنے کے لیے حد درجہ ضروری ہے۔"

عدم مداخلت کی کلاسیکی ترتیب ایڈم سمتھ[1] نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ثروتِ اقوام"[2] میں پیش کی (۱۷۷۶ء)۔ فطری حکومت کے طرفداروں نے تجارتی نظریۂ زر کے نظری ڈھانچے پر جو حملہ کیا تھا، ایڈم سمتھ نے پورے زور سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور کہا کہ ملکی صنعتوں کی حفاظت کے لیے ٹیرف لگا کر درآمد کو محدود کرنا غیر طبعی بھی ہے اور خلافِ اقتصادیات بھی:

"کنبے کے ہر محتاط رئیس کا یہ اصول ہے کہ گھر میں کوئی ایسی چیز بنانے کی کوشش نہ کی جائے جس کے بنانے پر خریدنے سے زیادہ خرچ ہو۔ درزی اپنے جوتے بنانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا، بلکہ موچی سے خرید لیتا ہے۔ موچی کبھی کوشش نہیں کرتا کہ اپنے کپڑے خود سیے، وہ درزی سے سلا لیتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

"ہر کنبے کے نزدیک جو طرزِ عمل احتیاط کہلاتا ہے، وہ کسی بڑی سلطنت میں حماقت نہیں بن سکتا۔ اگر ایک غیر ملک ہمیں وہ جنس سستی مہیا کر دیتا ہے اور ہم خود اتنے پیسوں میں نہیں بنا سکتے تو بہتر یہی ہے کہ اپنی پیدا کردہ صنعتوں کا ایک حصّہ دے کر اسے خرید لیں۔"[3] ۔ ۔ ۔ ۔

سمتھ نے روپے کو اس بلند سطح سے بھی نیچے اُٹھا پھینکا، جس پر تجارتی نظریۂ زر کے حامیوں نے اسے بٹھا دیا تھا:

"اس امر کو سنجیدگی سے ثابت کرنے کی کوشش حد درجے مضحکہ خیز ہو گی کہ دولت نقد روپیہ یا سونا یا چاندی نہیں، بلکہ قوتِ خرید ہے اور روپیہ صرف اس لحاظ سے قیمتی ہے کہ اس سے چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یورپ کو امریکہ کی دریافت نے سونے اور چاندی کی درآمد کے باعث دولتمند نہیں بنایا۔ ۔ ۔ ۔ صرف اس لیے دولتمند بنایا کہ یورپ کے سر و سامان کے لیے نئی اور لامتناہی منڈیاں پیدا ہو گئیں۔ اس طرح یورپ نے از سرِ نو تقسیمِ محنت پر عمل کیا اور فنون کی اصلاح کی اور قدیم تجارت کے

---

[1] Adam Smith

[2] کتاب کا پورا نام یہ ہے: Inquiry into the Nature and cause wealth of Nations لیکن یہ مشہور صرف آخری نام سے ہے۔

[3] ثروتِ اقوام حصّہ چہارم باب ۲۔

تنگ حلقوں میں یہ چیزیں کبھی بروئے کار نہیں آسکتی تھیں، کیونکہ اپنی مصنوعات کا بڑا حصہ لے جانے کے لیے منڈیاں بھی موجود نہ تھیں۔"[1]

دیکھیے، یہاں تقسیم محنت پر زور دیا گیا۔ فطری حکومت کے حامیوں کی طرح ایڈم سمتھ قوموں کے سامان بنا لینے کو ان کی دولت قرار دیتا تھا۔ برطانیہ اس زمانے میں ممتاز تجارتی اور صنعتی مملکت تھا۔ اس مملکت کے شہری کی حیثیت میں سمتھ نے معاملے کی زرعی حیثیت پر چنداں توجہ نہ کی۔ ایڈم سمتھ کے نزدیک پیداوار زیادہ تر زمین پر نہیں (جو فطری حکومت کے حامیوں کا نقطۂ نگاہ تھا) بلکہ کسانوں، کاریگروں اور کارخانوں کے مزدوروں کی محنت پر موقوف تھی۔ سب سے آخر میں "ثروتِ اقوام" کی مشہور ترین عبارت کے مطابق ایڈم سمتھ نے حکومتوں کو صرف پولیس کی حیثیت دے دی۔ وہ کہتا ہے:

"طبعی آزادی کے نظام کے مطابق بادشاہ کو صرف تین فرائض پر توجہ رکھنی چاہیے۔۔۔۔
اوّل دوسرے آزاد معاشروں کے حملے اور تشدّد سے اپنے معاشرے کی حفاظت کا فرض،
دوم حتی الامکان معاشرے کے ہر رکن کو دوسرے ارکان کی بے انصافی اور ظلم و جور سے محفوظ رکھنے کا فرض یا بخشش عدل کا ایک صحیح نظام قائم کرنے کا فرض۔ سوم ایسے امورِ عامہ یا ادارہ ہائے عامّہ کے قیام و بقا کا فرض جو کوئی فرد یا افراد کی چھوٹی سی تعداد قائم کرنے اور محفوظ رکھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔"[2]

نظریۂ زر کے حامیوں نے مملکت کو فرد سے بہت بلند سطح پر رکھ دیا تھا اور قوموں کے درمیان ایک لامتناہی تجارتی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ ایڈم سمتھ اور فطری حکومت کے حامیوں نے اس صورتِ حال کو الٹ دیا، یعنی فرد کی اقتصادی آزادی اور قوموں کے درمیان تجارتی آزادی کو طبعی قوانین قرار دیا۔ دورِ تنزیر میں عدم مداخلت کا یہ پروگرام اقتصادی فکر میں ایک انقلابی تغیر کا نشان تھا اور انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کی انفرادیت نے اسی سے نشو و نما پائی، لیکن اس سے بڑی طاقتوں کے اقتصادی مسلک میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔ یورپ بھر میں سے صرف برطانیہ نے عدم مداخلت کی پوری آزمائش کی۔ برِ اعظم میں اقتصادی نظریۂ زر کو بدستور خاصی قوت حاصل رہی، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ ترگو فطری حکومت کے اصول کا سب سے بڑا شارح تھا۔ اس نے فرانسیسی زراعت اور فرانسیسی کاروبار کو اپنے مختصر سے عہدِ وزارتِ عظمیٰ میں الگ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یہ اٹھارھویں صدی کے آٹھویں عشرے کا واقعہ ہے۔

فطری حکومت کے حامی بھی وہ چیز فراموش کر گئے، جو بہت سے فلسفیوں نے فراموش کر دی، یعنی وہ سیاسیات کی پیچیدگیوں اور فطرتِ انسانی کی حقیقتوں کے درمیان فطری قانون نے سادہ و معقول تقاضوں کے مطابق مطابقت

---

[1] "ثروتِ اقوام" حصہ چہارم، باب ۹

[2] "ثروتِ اقوام" حصہ چہارم باب ۲

کی مشکلات کو نظر انداز کر گئے۔ اس نقطے کو فرانسیسی معاصرین کے مقابلے میں ایڈم سمتھ نے زیادہ واضح صورت میں بھانپ لیا تھا۔ ایک سکاٹ کی روایتی ہوشیاری و دُوربینی کے ساتھ اس نے پیشگوئی کی۔

"یہ امید رکھنا کہ برطانیہ عظمیٰ میں تجارت کی آزادی پوری طرح بحال ہو جائے گی، اتنا ہی مہمل ہے، جتنا یہ توقع رکھنا کہ ایک اوشیانا یا یوٹوپیا وہاں قائم ہو جائے گا۔ عوام کے تعصبات ہی نہیں، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر بہت سے افراد کے نجی مفاد اس کے سخت خلاف ہیں اور انھیں مسخر کرنا بڑی حد تک ناممکن ہے۔"[1]

انصاف

اقتصادی عدم مداخلت میں فطرت کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کی روش بہت نمایاں ہے۔ دورِ تنویر میں یہی نقطۂ نگاہ مسائلِ تعلیم و انصاف کے متعلق نمایاں رہا۔ فلسفیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر انسان کو آزادی ہونی چاہیے، اگرچہ وہ تنویر کا کھلا دشمن ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان نے جو قانون بنائے، وہ فطرت کے قوانینِ انصاف کے اجراء میں مانع ہیں۔ قدیم نظام کے غیر منصفانہ اور دقیانوسی ضوابط اور پُرپیچ عدالتی کارروائیاں فلسفیوں کے نزدیک ہولناک تھیں۔ ان کے ایک نئے جسٹینین کی ضرورت تھی، جو مجموعہ ہائے قوانین کو سہل بنا دیتا اور انھیں سہل و نرم بنا دیتا۔ ایک نئی سائنس کی ضرورت تھی، تاکہ جرم کی سزاؤں میں زیادہ ملائمت اور اثر پیدا کر دیتی۔ یہ نیا سائنس، جو دورِ حاضر کے اجتماعیات کا پیش خیمہ تھی۔ سیزر بکاریا[2] (۱۷۳۸ء۔۱۷۹۴ء) کے ذریعے سے فروغ پذیر ہُوا۔ یہ ایک اطالوی فلسفی تھا اور اس کی شہرت کا مدار ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے "جرائم و تعزیرات[3] پر ایک مقالہ ۱۷۶۴ء"۔ بکاریا نے انصاف کے تین طبعی قانون وضع کیے:

۱۔ سزا کا مقصد یہ ہونا چاہیے:

کہ مجرم کے لیے معاشرے کو مزید نقصان پہنچانا ناممکن بنا دے اور دوسروں کو ایسے جرائم کے ارتکاب سے روک دے، لہٰذا ایسی سزائیں انتخاب کرنی چاہئیں، جو دوسروں کے دل پر زبردست اور حد درجہ پائدار اثر چھوڑیں۔ ساتھ ہی مجرم کے جسم کو کم سے کم تکلیف پہنچے۔[4]

۲۔ انصاف جلد سے جلد ہونا چاہیے۔

.....کیونکہ سزا اور جرم کے درمیان جتنا کم وقفہ ہوگا، اتنا ہی دونوں کے درمیان تعلق زیادہ مستحکم اور پائدار سمجھا جائے گا۔[5]

---

[1] "ثروتِ اقوام" حصہ چہارم، باب ۲ [2] Cesare Beccaria

[3] Essay on Crimes and Punishments

[4] جرائم و تعزیرات باب ۱۲ [5] ایضاً باب ۱۹

۳- جرموں کو زیادہ مؤثر طریق پر سزا کی سختی کے ذریعے سے نہیں، بلکہ اس کی قطعیت کے ذریعے سے روکا جاتا ہے...... چھوٹی سی سزا کی قطعیت زیادہ سخت سزا کے خوف کے مقابلے میں بہت پائدار اثر کرے گی۔

...... اگر سزائیں بہت سخت ہوں گی تو آدمی طبعاً دوسرے جرائم کے ارتکاب پر مائل ہوں گے تاکہ پہلی سزا سے بچے رہیں.....[1]

بکاریا نے تعذیب اور سزائے موت دونوں کی سخت مخالفت کی، کیونکہ یہ دونوں چیزیں طبعی قانون سے بالکل متفاوت تھیں۔ اس نے کہا: تعذیب کے متعلق یہ غلط چیز فرض کر لی گئی ہے کہ در حقیقت کی آزمائش ہے۔ گویا حقیقت اس بدبخت کے رگ و پے میں بستی ہے، جو زیر تعذیب ہو۔ قید کی سزائیں دینی چاہئیں نہ کہ موت کی۔ ایک مجرم کی موت بڑا ہی خوف ناک مگر وقتی منظر ہے، لہٰذا یہ دوسروں کو جرائم سے باز رکھنے کا کم مؤثر طریقہ ہے۔ زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ایک انسان کو آزادی سے محروم کر دیا جائے۔ باربرداری کے جانور کی طرح اس سے محنت لی جائے، تاکہ اس طرح اس نقصان کی تلافی ہو جائے، جو اس نے معاشرے کو پہنچایا[2]۔ بکاریا کا دعویٰ یہ تھا، صرف سزا کافی نہیں، جرائم کے انسداد کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آزادی کو علم پر متوجہ کیا جائے اور نظام تعلیم مکمل کر لیا جائے۔

تعلیم تعلیم میں بھی نظام قدیم عقل اور طبعی قانون کے امتحان میں ناکام رہا۔ فلسفی اس امر کا ماتم کرتے رہے کہ تقریباً پورا نظام تعلیم مذہبی طبقے کے ہاتھ میں ہے، جو زیادہ تر زور دینیات، یونانی و لاطینی زبان اور تاریخ پر دیتا ہے۔ فلسفیوں کی رائے تھی کہ انسان پروری کی یہ تعبیر وحشیانہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس موجودہ دور کی زبانوں اور موجودہ دور کی تاریخ پر خاص توجہ کرے۔ دیدرو نے اعلان کیا:

"خطابیات کے نام سے تقریر کا فن سکھایا جاتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے غور و فکر کا فن سکھانا ضروری ہے اور جب تک اظہار کے لیے افکار موجود نہ ہوں، اچھا اسلوب یا حسنِ گفتار کیا فائدہ دے سکتی ہے؟

طبیعیات کے نام سے مادّے کے عناصر اور ارضی نظاموں کے متعلق تھکا دینے والی بحثیں سکھائی جاتی ہیں، لیکن تاریخِ طبعی یا صحیح کیمیا کے متعلق ایک حرف نہیں بتایا جاتا۔ یہاں کیفیت اجرام سماوی کی حرکت اور ان کے سقوط کے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں بہت کم تجربے کیے جاتے ہیں۔ علم تشریح اور جغرافیے کی حالت اور بھی خراب ہے"[3]

---

[1] "جرائم و تعزیرات" باب ۲۷، [2] ایضاً باب ۲۸، [3] دیدرو Plan of a University for the Russian Government یہ اقتباس اس میں سے منقول ہے ص ۲۰۸، ۲۰۹

ژین جیکوے روسو (۱۷۱۲ء - ۱۷۷۸ء) نے تعلیم میں حد درجہ وسیع اصلاح کی تجویز پیش کی۔ روسو ایک باغی تھا۔ اس نے اپنے مقامِ پیدائش یعنی کیلون کے ہمنوا جینوا کے نہایت پابند اور منظّم معاشرے کے خلاف بغاوت کی اور اوائلِ شباب میں اسے کتابوں کے وسیع مطالعے پر مجبور رہنا پڑا تھا۔ پھر پیرس کے سیلونوں میں اسے بعض مہذّب مراسم سے سابقہ پڑا۔ ان دونوں کے خلاف بھی اس نے بغاوت کا عَلَم بلند کیا۔ اس بغاوت کا نتیجہ ایمیل[1] نام ایک کتاب تھی جو ۱۷۶۲ء میں لکھی گئی۔ یہ نصف رسالہ اور نصف رومان ہے۔ اس میں ترقی پذیر تعلیم کے لیے بڑی طویل اور پُرجوش اپیل کی گئی ہے۔

ایمیل کتاب میں دو ہیرو رکھے گئے تھے، اوّل ایمیل، جو طالب علم تھا، دوسرا روسو، جسے معلّم کہنا چاہیے۔ روسو نے اپنے شاگرد کی تعلیم و تربیت کے لیے جو کچھ تجویز کیا، وہ اٹھارھویں صدی کے عمل سے بہ ہمہ وجوہ مختلف تھا:

"میں اسے سکھاؤں گا کہ زندگی ایک پیشہ ہے۔ جب وہ تعلیم سے فارغ ہو جائے گا، تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ نہ تو مجسٹریٹ بنے گا، نہ سپاہی، نہ پادری، بلکہ صرف انسان ہو گا"[2]

روسو نے اپنے شاگرد کے متعلّق عدمِ مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا۔ روسو نے ایمیل کو کبھی مجبور نہ کیا کہ ابتدائی دَور ہی میں تعلیم شروع کر دے۔ ایمیل نے دنیائے فطرت کا مطالعہ کتابوں سے نہیں، بلکہ براہِ راست تجربے سے کیا۔ اس نے خود جنگلوں میں راستے پیدا کر کے جغرافیہ سیکھا اور کھیتوں میں کام کر کے زراعت سیکھی۔ جب وہ تیرہ چودہ سال کا ہُوا تو پڑھنا سیکھ لیا۔ اسے سب سے پہلے ڈیفو[3] کی کتاب "روبنسن کروسو"[4] پڑھائی گئی، جو فطری اعتبار سے تعلیم کے متعلق بہترین کتاب ہے۔

روسو کے تعلیمی پروگرام میں متعدّد نقائص تھے۔ ایمیل میں اس نے مروّجہ درسگاہوں کی سخت مذمّت کی تھی، لیکن وہ ان کا بدل تجویز کرنے میں کوئی واضح بات نہ کہہ سکا۔ وہ عملی ضرورتوں سے بے بہرہ تھا، کیونکہ اس نے فرض کر لیا تھا، ہر بچّے کو ہر روز چوبیس گھنٹے کے لیے اتالیق کی غیر منقسم توجّہ کا مرکز بنے رہنا چاہیے۔ نیز اس نے معلّم پر شاگرد کے بظاہر مستقل اور کامل انحصار کی پرورش کی۔ چنانچہ جب ایمیل نے شادی کر لی اور اس کے بچّہ پیدا ہُوا تو اس حالت میں بھی اس نے اتالیق کو خدمت پر بحال رکھا اور کہا: "اب میں انسانیت کے فرائض سنبھال رہا ہوں اور مجھے پہلے سے زیادہ آپ کی ضرورت ہے۔"

بہ ایں ہمہ ایمیل ایک بلند پایہ کتاب تھی۔ روسو نے اس کے ذریعے سے آفاقی انسان کا وہ تصوّر تازہ کیا، جو دورِ احیاءِ علوم

---

[1] Emile — [2] ایمیل ص ۹

[3] Defoe مشہور انگریز مصنف — [4] Robinson Crusoe

میں پیدا ہوا تھا، ساتھ ہی سلامتِ قلب اور سلامتِ جسم کے متعلق یونانی نصب العین کو زندہ کردیا۔ پیسٹالوزی[۱] (۱۷۴۶ء ۔ ۱۸۲۷ء) کی کوشش سے، جو سوئٹزرلینڈ کا ایک معلّم اور انسانیت پرور تھا، ایمیل میں پیش کردہ مثالی پروگرام تعلیم کے عملی تقاضے پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کرلیا۔ پیسٹالوزی نے جغرافیے، ڈرائنگ اور دوسری نئی اور مفید چیزوں کی تعلیم اپنے تجرباتی سکول میں بڑے عمدہ طریق پر پیش کردی۔ پیسٹالوزی کو اس امر سے سخت اختلاف تھا کہ طلبہ کو بارکوں میں رکھ کر ڈرل کرائی جائے۔ اس طرح لامتناہی طریق پر ورزشوں کا اعادہ ہوتا رہے اور جسمانی سزائیں دی جائیں۔ بیسویں صدی کے طلبہ کو اٹھارھویں صدی کے مصلحینِ تعلیم کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہ طبعی قانون دریافت کرلیا کہ بچوں کے ساتھ بچوں کا سا سلوک ہونا چاہیے، نہ کہ چھوٹے درجے کے بالغوں کا سا۔

مذہب کے متعلق روش پادریوں کے طریقِ تعلیم پر نکتہ چینی کا سلسلہ زیادہ تیزی سے بڑھتا رہا۔ یہ دراصل اس کردار پر حملہ تھا، جو نظامِ قدیم کے پادریوں نے ادا کیا تھا۔ فلسفیوں نے نعرہ لگایا کہ اس مکروہ شے کو کچل دو۔ مذہبی تعصب اور ناروا داری کو پاؤں تلے روند ڈالو۔ انھوں نے یسوعی نظام پر بالتخصیص حملے کیے، جسے جنگجو کیتھولزم کا حربہ اور نشان سمجھا جاتا تھا۔ یسوعیوں کا نظام توڑ دینے کے لیے دباؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ پوپ کلیمنٹ[۲] ہفتم کو یہ مطالبہ ماننا پڑا۔ ۱۷۷۳ء میں اس نے انجمن یسوع مسیح ختم کردی۔ پھر نصف صدی تک اس کا احیاء نہ ہوسکا۔

اکثر فلسفی نہ صرف رواداری کے سرگرم حامی تھے، بلکہ انھوں نے مذہب کے سلسلے میں وہ روش اختیار کی، جسے عموماً مسلکِ فطرت کہا جاتا ہے[۳]۔ حامیانِ مسلکِ فطرت کے نظریات سترھویں صدی کے انگلستان میں پیدا ہوئے تھے، یعنی اس انگلستان میں، جہاں خانہ جنگیاں ہوتی رہیں اور جہاں نیوٹن کی سائنس نے جنم لیا۔ خانہ جنگیوں کی کثرت نے مسلکِ فطرت کے حامیوں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ مذہبی جھگڑوں کا فیصلہ تلوار کے بجائے عقل سے کریں۔ وہ کہتے تھے کہ تمام انسان چند بڑے بڑے مذہبی اصولوں پر متفق ہوسکتے ہیں۔ نیوٹن کی کائناتی مشین سے واضح ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی نوع کی میکانیت موجود ہے۔ مسلکِ فطرت کے حامی خدا کو کائنات کا خالق مانتے تھے اور کہتے تھے کہ انسانی کردار کا آخری موازنہ اسی کے ہاتھ میں ہے، مگر وہ اس سے انکار کرتے تھے کہ خدا دعاؤں کا جواب دیتا ہے یا اپنی رحمت سے لوگوں کو نوازتا ہے۔ اگر کامل انکار نہیں تو اس میں انھیں شبہ ضرور تھا۔ ان کے نزدیک کائنات کی مشین خدا کی براہِ راست مداخلت کے بغیر خوش اسلوبی سے جاری تھی۔ حامیانِ مسلکِ فطرت کے نزدیک خدا کو یا تو ماضی بعید میں کچھ کرنا پڑا یا مستقبل بعید

۱۔ Pestalozzi

۲۔ Clement VII

۳۔ Diesm یعنی وہ مسلک جس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ خدا کو پہچاننے کا طریقہ مظاہرِ فطرت کے سوا کوئی نہیں۔

میں وہ کچھ کرے گا۔ حال میں اس کے لیے کوئی کام نہ تھا۔

جان لاک نے مسلکِ فطرت کی کیفیت اپنی کتاب "فہم انسانی کے متعلق مقالہ" میں پیش کر دی، لاک کا استدلال یہ تھا کہ "ایمان کا تعلق صرف ان چیزوں سے ہے، جو ہمارے فطری قویٰ کی گرفت سے باہر اور عقل سے بالاتر ہیں"۔ ایمان عقلِ سلیم کے خلاف نہیں جا سکتا: "جو چیز عقل کے صاف اور بدیہی تقاضوں کے مطابق نہ ہو، اسے نہ ایمان قرار دیا جا سکتا ہے، نہ بطور ایمان قبول کیا جا سکتا ہے"۔[1]

والٹیئر (۱۶۹۴ء۔ ۱۷۷۸ء) فرانس میں مسلکِ فطرت کا سب سے بڑا داعی تھا اور اسی نے پادریوں کے خلاف "کچل دو" کا نعرہ ایجاد کیا۔ وہ بجائے خود تنویر کا مرکز تھا۔ وہ پیشہ ور مصنف تھا۔ اس نے اپنی بے پناہ سرگرمیوں اور گوناگوں صلاحیتوں کو نئے افکار کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے قلم سے ڈرامے، کہانیاں، رزمیہ نظمیں، تاریخیں، مقالے اور خطوط پے در پے نکلتے رہے۔ چونکہ اس کی تحریر ہر اعتبار سے واضح، بذلہ سنجی سے لبریز اور بعض اوقات حد درجہ طنز آمیز ہوتی، اس لیے اسے غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی۔ بعض اوقات اسے اپنی کتابیں فرانس سے باہر چھپوانی پڑیں اور ان میں مصنف کا نام فرضی اختیار کر لیا گیا، تاکہ احتساب سے محفوظ رہیں۔ مگر ان باتوں نے اس کی ہر دلعزیزی میں کمی نہ آنے دی۔ والٹیئر ہی نے فرانسیسیوں کو نیوٹن، لاک اور شیکسپیئر سے آگاہ کیا۔ اس نے تاریخ نگاری کا نیا نمونہ پیش کیا، کیونکہ اس میں سیاسیات اور جنگوں کے علاوہ اقتصادیات اور ثقافت پر بھی بحثیں کرتا تھا۔ اس طرح اس کی تاریخ نگاری بیسویں صدی کی نئی تاریخ یا تہذیبوں کے جائزے کا پیش خیمہ بنی۔

والٹیئر کو خود براہِ راست ناروا داری کا تجربہ ہوا۔ اوائلِ شباب میں اسے ایک سال بیسٹیل کے قید خانے میں اور تین سال انگلستان کی جلاوطنی میں گزارنے پڑے، کیونکہ اس نے فرانسیسی حکومت پر نکتہ چینی کی تھی اور مخصوص حقوق والے امراء میں سے ایک فرد کو ناراض کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ کے اندر نسبتاً مذہبی اور سیاسی آزادی نظر آئی تو اس پر گہرا اثر پڑا:

> "اگر انگلستان میں صرف ایک مذہب ہوتا، تو مطلق العنانی کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ اگر دو مذہب ہوتے تو دونوں کے پیرو ایک دوسرے کا گلا کاٹتے، لیکن یہاں تیس مذہب ہیں، لہٰذا وہ پُرامن طریق پر اور خوش خوش ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہے ہیں"۔[2]

---

[1] ایسّے حصّہ چہارم باب ۱۸ ء

[2] والٹیئر کے فلسفیانہ خطوط، خط ۶

فرانس واپس آکر والٹیئر نے زندگی بھر رواداری کا سلسلہ قائم رکھا۔ ۱۷۶۲ء میں ایک پروٹسٹنٹ تاجر جین کیلس[1] پر یہ الزام لگا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کیتھولک بن جانے سے روکنے کے سلسلے میں قتل کر دیا۔ کیلس نے بڑی بُری حالت میں وفات پائی، کیونکہ اسے پہیے سے باندھ کر اعضا شکنی کی سزا دی گئی تھی۔ والٹیئر کو پتا لگ گیا کہ کیلس کے خلاف جو الزام عائد کیا گیا تھا، وہ افواہ پر مبنی تھا اور جس عدالت نے اُسے موت کی سزا دی تھی، اُسے متعصب کیتھولک عوام کے دباؤ نے مجبور کر دیا تھا۔ والٹیئر نے تین سال تک اس کے لیے جہاد جاری رکھا، یہاں تک کہ ابتدائی فیصلہ اُلٹ دیا گیا اور کیلس کا نام ایک غلط الزام سے پاک ہُوا۔

شر کا وجود ـــــ یعنی ایسی بے انصافیوں کا وجود، جنھوں نے کیلس کو تباہ کیا ـــــ دورِ عقل میں ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر پیش ہُوا۔ فلسفیوں میں سے بہت کم لوگ اس روایتی مسیحی تعلیم کو مانتے تھے کہ شر ابتدائی گناہ سے پیدا ہُوا۔ اس کا تعلق آدمؑ و حواؑ کے ہبوط سے ہے۔ وہ پُوچھتے تھے کہ اگر خدا فیاض و مہربان ہے تو اس نے ایسی دنیا کو کیوں پیدا کیا، جس میں شر کو غلبہ حاصل ہے؟ کیا خُدا، جو ہر اعتبار سے کامل و اکمل ہے، کسی ناقص تخلیق کا ذمّہ دار ہو سکتا ہے؟ الگزانڈر پوپ والٹیئر کا عظیم القدر انگریز معاصر تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ دُنیا ممکن دنیاؤں میں بہترین ہے:

"پوری فطرت فن ہے، مگر تُو نہیں جانتا
تمام اتّفاقات ہدایت ہیں، مگر تُو نہیں دیکھتا
تمام نزاعات ہمہ آہنگی ہیں، مگر تُو نہیں سمجھتا
تمام جزوی بُرائیاں آفاقی اچھائیاں ہیں
اور تکبّر یا غلط کار عقل کے باوجود
ایک حقیقت روشن ہے، یعنی جو کچھ ہے، حق ہے۔"

مگر پوپ کُبڑا تھا۔ والٹیئر نے پُوچھا کہ پوپ اس بدصورتی کو کیونکر آفاقی اچھائی کی شہادت قرار دے سکتا ہے؟ والٹیئر نے کینڈیڈ[2] کے نام سے ایک مشہور کہانی لکھی تھی، جس میں رجائیوں کا مذاق اڑایا اور نہایت تلخ طنز یہ انداز میں ان تباہ کاریوں پر نکتہ چینی کی، جن سے ممکن دنیاؤں میں یہ بہترین دنیا لبریز تھی۔ کینڈیڈ کی تصنیف کا باعث ایک بہت بڑی تباہی ہوئی تھی، یعنی ایک خوفناک زلزلے اور بحری طوفان نے پرتگال کے مرکز لزبن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا (یکم نومبر ۱۷۵۵ء)۔ اس طرح تیس ہزار سے زائد انسان مارے گئے۔

---

[1] Jean Calas
[2] Candide

مسلکِ فطرت نے والٹیر کے دل میں کامل و اکمل خدا اور ناقص دُنیا کے درمیان اک گونہ مفاہمت پیدا کر دی۔ والٹیر کا ایمان تھا کہ خُدا ہی دُنیا کا خالق ہے:

"جب مَیں ایک گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں تو اِس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ایک دانشمند وجود نے اس کی مشینری کے کل پُرزے ترتیب دیئے تاکہ سُوئیاں صحیح وقت بتاتی رہیں۔ اسی طرح جب مَیں انسانی جسم کے کل پُرزوں کو دیکھتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ایک دانشمند و حکیم ہستی نے اس کے تمام اعضا ترتیب دیئے جو نو مہینے شکم ماں کے رحم میں رہ کر پرورش پاتے ہیں۔ پھر دیکھنے کے لیے آنکھیں، گرفت کے لیے ہاتھ وغیرہ وجود میں آئے۔"[1]

مگر والٹیر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، آیا خدا اس تخلیق کو کبھی مکمل کرنے کی کوشش کرے گا کہ نہیں؟

ایک نکتے کے متعلق والٹیر کو کوئی شبہ نہیں تھا، یعنی اس نے مذہب کی عمرانی افادیت میں کبھی شبہ نہ کیا۔ اس نے لکھا:

"انسان کو ہر حال میں ایک روک کی ضرورت تھی اور عوام کے لیے کوئی بھی مذہب خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو دہریت سے بہتر ہے۔"

بیرن دا ہولباش[2] (۱۷۲۳ء - ۱۷۸۹ء) دورِ تنویر کا نہایت صاف گو اور بے باک دہریہ تھا جس نے افادیت پر مبنی تمام دلائلِ مذہب کے خلاف اُلٹ دیئے۔ اُس نے کہا کہ مذہب ایسی روک نہیں، جس کی ضرورت انسان کو ہے۔ اور خدا محض خیال کا ایک دھوکا ہے اور اس دنیا میں جو شر موجود ہے، وہی اس کے وجود سے انکار کی دعوت دیتا ہے۔ ہولباش کہتا تھا کہ محض خود غرضی ہی انسانوں کو اخلاقی اعتبار سے خوش رفتار بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اگر منظم مذاہب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ عقل اور طبعی قانون کی حکمرانی جاری ہو جائے تو یہ دُنیا یقیناً ممکن دنیاؤں میں سے بہترین بن جائے گی۔

ہولباش دولت مند آدمی تھا اور اس کے سیلون میں جو بھی آتا، اس کی مہمانداری کی جاتی۔ ان میں وہ لوگ بھی پناہ گیر بھی شامل تھے، جو پادریوں کے مخالفوں کی سختیوں کا ہدف بنے ہُوئے تھے۔ اس کی رواداری نے دہریت سے بھی بڑھ کر معاصرین پر اچھا اثر ڈالا۔ زیادہ تر فلسفیوں نے مسلکِ فطرت ہی کو ترجیح دے رکھی، جو ایمان اور عدم ایمان کا درمیانی مقام تھا۔ مسلکِ فطرت کے الہامات اور بے یقینیاں دُورِ تنویر کی پوری مذہبی روش پر چھائی رہیں۔ فلسفی تنگ نظری تعصب اور ظلم و تشدد کے خلاف تھے۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ رواداری کے اہم اصول کے سوا اور کس چیز کے حامی تھے؟ تو یہ واضح نہ تھا۔

---

[1] والٹیر کی کتاب ما بعد الطبیعیات کے متعلق باب ۲۔ [2] Hobach

سیاسی پروگرام : مونٹسک

والٹیئر نے کہا : مذہب کی طرح سیاسیات میں بھی رواداری ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے نزدیک انگلستان شائستگی سے قریب تر تھا۔ والٹیئر نے برطانوی دستور کو نہایت اعلیٰ خراجِ تحسین ادا کیا، جب کہا کہ یہ دستور لاک، نیوٹن یا ارشمیدس نے ترتیب دیا۔ اس نے ستائش ضرور کی، مگر اس کی توضیح کی مونٹسک نے برطانیہ کے سیاسی محاسن کا تجزیہ بھی کیا اور ان کی تفصیل بھی پیش کی۔

مونٹسک (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۵۵ء) ایک فرانسیسی قانون دان اور فلسفی تھا، جس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ علم سیاست کا نیوٹن بن جائے۔ اس کی سب سے بڑی کتاب کا نام "روحِ قوانین"[1] ہے، جو ۱۷۴۸ء میں لکھی گئی۔ اس میں برطانوی دستور اور عام حکومتوں کے بنیادی اصول واضح کیے گئے ہیں۔ مونٹسک نے ابتدا ایک نہایت معقول تمہید سے کی، یعنی یہ کہ کوئی ایک نظامِ حکومت تمام ملکوں کے لیے موزوں نہیں۔ اس نے لکھا کہ قوانین :

> "۔۔۔۔ کو ہر ملک کی فضا اور آب و ہوا کے مطابق ہونا چاہیے۔ انھیں زمین کی حیثیت، موقع و محل اور وسعت کے مطابق رہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں باشندوں کے بڑے پیشے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے یعنی وہ کاشت کار ہیں یا شکاری یا گڈریے۔ قوانین کو آزادی کے اس درجے کے مطابق ہونا چاہیے، جو دستور تجویز کرے گا۔ اس سلسلے میں باشندوں کے مذہب، رجحانات، مال و ثروت، تعداد، تجارت اور اوضاع و مراسم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔"[2]

مونٹسک نے اس مفروضے کے خلاف انتباہ کر دیا تھا کہ پرانی رسموں اور روایتوں کو محض قانون بنا کر مٹایا جا سکتا ہے یا ان کی جگہ سادہ تر طبعی قوانین جاری کیے جا سکتے ہیں۔ اس نے پیٹرِ اعظم کی ناکامی کی نہایت برمحل مثال پیش کی، جس نے روس میں مغربی اوضاع کے نظام کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ حکومت کی شکلوں پر میراث اور ماحول کے اثر کی توضیح کرتے ہوئے اس نے کہا کہ جمہوریتیں چھوٹے اور بنجر ملکوں کے لیے نہایت موزوں ہیں، متوسط درجے کے زیادہ خوشحال ملکوں کے لیے محدود بادشاہیاں مناسب ہیں۔ وسیع سلطنتوں کے لیے مطلق العنانی لازم ہے۔

برطانیہ چونکہ متوسط درجے کا ملک ہے اور خوش حال ہے، اس لیے وہاں امرا نے جو محدود بادشاہی قائم کر دی، وہی مناسب تھی۔ موروثی امرا پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا میں بیٹھے، جن لوگوں کو قابلیت کے اعتبار سے بلند حیثیت حاصل تھی، نیز جو نمائندے چنے جاتے تھے ان سے دارالعوام مرتب ہوا۔ مونٹسک کی راہ میں یہ سب کچھ قابلِ قدر تھا۔ اسے جمہوریت پر اعتماد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عوام حکومت کے لیے حد درجہ ناموزوں ہیں۔ اگر فرانس میں امرا کے پرانے سیاسی

---

[1] the Spirit of the laws

[2] روحِ قوانین، حصہ اوّل باب ۳

وظائف قائم رہتے تو وہ کبھی پستی میں نہ گرتا۔

مونٹسکو کے نزدیک برطانیہ کی سیاسی برتری کی ایک کلید امراء کا غلبہ تھی، دوسری یہ کہ جابجا روک تھام اور توازن کا خیال رکھا گیا: پارلیمنٹ میں امراء اور عوام ایک دوسرے پر روک کا کام دیتے اور حکومت میں توازن کے قیام کا ذریعہ اختیارات کی علٰحدگی تھی:

> ”جب قانون سازی اور تنقید کے اختیارات ایک ذات میں جمع ہو جاتے ہیں یا ایک ہی مجسٹریٹ ان کا حامل بن جاتا ہے تو آزادی باقی نہیں رہ سکتی؛ کیونکہ خطرے پیدا ہو سکتے ہیں، بہادر ہی بادشاہ یا سینٹ ظالمانہ قوانین بنائے اور ان پر ظالمانہ طریق سے عمل کرائے۔
>
> مزید برآں اگر عدالتی اختیار قانون سازی اور تنقید کے اختیار سے الگ نہ کیا جائے تو بھی آزادی باقی نہیں رہتی۔ یہاں پر یہ اختیار قانون ساز مجلس سے مشترک ہو جائے گا، تو رعایا کی زندگی اور آزادی من مانی کارروائیوں کی زد میں آجائے گی کیونکہ جج خود ہی قانون سازی کرے گا۔ اگر اس اختیار کو تنفیذی اختیار سے ملا دیا جائے گا تو جج ظلم و جبر کا ارتکاب کر سکے گا۔“[۱]

مونٹسکو یہ نہ دیکھ سکا کہ برطانوی دستور اختیارات کی علٰحدگی کی طرف نہیں، بلکہ انھیں پارلیمنٹ کے ہاتھ میں دے دینے (خصوصاً دارالعوام کے ہاتھ میں) کے لیے سرگرم ہے۔ کابینہ قانون سازی کی برتری تنقیدیہ پر قائم کرنے کا آلہ کار تھی۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ بھی بتا دیا جائے، یہ امور ۱۷۴۸ء تک بالکل واضح نہ تھے، جب ”روح قوانین“ پہلے پہل منظر عام پر آئی تھی۔

مونٹسکو کو ایک اور مشکل اس وقت پیش آئی، جب اس نے اپنے عام اصول سے انسانی اداروں پر آب و ہوا اور جغرافیے کے اثرات کے متعلق خاص لوازم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ مطلق العنانی اور کیتھولسزم بحیرۂ روم کی مملکتوں میں فروغ پذیر ہیں، کیونکہ ان کی آب و ہوا گرم ہے اور طبعی ذخائر بہت زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس معتدل حکومت اور پروٹسٹنٹزم کے لیے شمالی یورپ کو زیادہ سخت ماحول اور زیادہ سرد آب و ہوا درکار ہے، لیکن تاریخی حقائق شمال و جنوب کے متعلق اس قاعدے کی ہر وقت توثیق نہیں کرتے۔ ہالینڈ اور برطانیہ پروٹسٹنٹ ملک تھے۔ ان کے باشندوں کو آزادی سے پیار تھا، لہٰذا انھوں نے شمالی انداز کے متعلق روش اختیار کر لی، لیکن اگر مونٹسکو کا دعویٰ سچا ہوتا تو پروشیا بھی ــــــ جو شمالی حصے میں واقع تھا، بنجر تھا اور پروٹسٹنٹ تھا ــــــ براعظم میں آزادی کا بہت بڑا حصار ہوتا۔ ہوہینزولرن مطلق العنانی کا گڑھ نہ ہوتا۔

---

[۱] روح قوانین حصہ ۲۱ باب ۶

ناکافی شہادت کے باوجود نتائج اخذ کرنے کے لیے مضطرب ہو کر مونتسک نے وہی غلطیاں کیں، جو دورِ تنویر میں عام تھیں، لیکن اس عہد کی ایک اور غلطی سے وہ محفوظ رہا۔ اُسے سیاسی حقائق کا بہتر اندازہ تھا، لہٰذا اس نے یہ قبول نہ کیا کہ حکومتیں ہر جگہ یکساں تھیں یا یکساں ہونی چاہئیں۔ شمال و جنوب کے متعلق اس کے غلط لوازم اس اہم نظریّے کو غلط ثابت نہ کر سکے کہ ایک قوم کے ماحول و میراث اس کے اداروں کی حیثیت متعیّن کرنے میں بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ آگے چل کر سیاسی مفکّروں نے "روحِ قوانین" کے بتائے ہُوئے تقابلی طریقوں سے بہت اچھا کام لیا اور جغرافیے، مذہب اور سیاسیات کے باہم تعلقات کے متعلق مونتسک کے فیصلوں کو معقول تر بنا لیا۔ امریکہ میں جن لوگوں نے دستور کی بنیاد رکھی، انھوں نے علیحدگیِ اختیارات کے متعلق مونتسک کا تصوّر اختیار کر لیا۔

سیاسی پروگرام: روسو

امریکی تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے مونتسک اور لاک دورِ تنویر کے اہم ترین سیاسی مفکّر ہیں۔ یورپی نقطۂ نگاہ سے اہم ترین حیثیت ژاں ژاک روسو کو حاصل ہے، جس کے افکار نے انقلابِ فرانس کے انتہا پسندوں میں جوشِ عمل پیدا کیا۔ روسو نے اپنے اصول کی ابتدا ایک ہمہ گیر تعمیم سے کی اور اس قسم کی تعمیمات دورِ تنویر میں عام تھیں۔ اس نے کہا کہ فطرت انسان کو شرف بخشتی ہے اور اس کا درجہ بلند کرتی ہے۔ تہذیب و تمدّن اسے بگاڑتے ہیں۔ اگر تہذیب و تمدّن کے ادارے فطری قوانین کی زیادہ سے زیادہ پیروی کریں تو انسان کی تخریب کا سلسلہ گھٹ جائے۔ یہی مضمون روسو کی اکثر بڑی تصانیف میں نمایاں رہا۔ ایمیل میں اس نے اس مضمون کو اپنی تعلیمی اصلاح کے پروگرام کا بنیادی نقطہ قرار دیا ہے۔ اس کی ایک اور کتاب ہے: "فنون و علوم[1] کے اخلاقی اثرات پر مذاکرہ" (۱۷۵۰ء) یہ ڈائیجون اکیڈمی کے مقابلے میں انعام حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اکیڈمی نے موضوع یہ رکھا تھا: "آیا فنون و علوم کی بحالی سے اخلاق پاکیزہ تر ہو گئے ہیں؟" انعام پانے والے نے جواب دیا: "قطعاً نہیں، بلکہ یہ تباہی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔"

اس نے ایک اور مذاکرہ "انسانی نامساوات کے مبادی" پر لکھا (۱۷۵۵ء[2])۔ اس میں روسو نے نجی جائداد پر تہذیب و تمدّن کے بُرے اثرات کو محرم ٹھہرایا:

> "پہلا آدمی، جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کو گھیر کر کہا کہ یہ میرا ہے، اور سادہ لوح لوگوں نے اس کا یہ دعویٰ درست سمجھ لیا، اصل میں سول معاشرے کا بانی تھا۔ اگر لوگ ڈنڈے اٹھا لیتے، خندقیں بھر لیتے اور ساتھیوں سے کہتے: خبردار! اس جھوٹے کی بات پر کان نہ دھرنا۔ اگر تم نے ایک مرتبہ یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ اس زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا

---

[1] Discourse on the Moral Effects of the Arts and Sciences

[2] On the Origin of the Inequality of Mankind

ہے، وہ ہم سب کا ہے اور خود زمین کی کی ملکیت نہیں تو ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاؤ گے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو عالم انسانیت کتنے جرموں، لڑائیوں، قتلوں، خوف ناک مصیبتوں اور بدنصیبیوں سے محفوظ ہو جاتا۔"[1]

انسان نے قوانین اور حاکم اپنی جائداد کی حفاظت کی خاطر قبول کر لیے:

"......ان میں بے شمار جھگڑے پیدا ہوئے اور ثالثوں کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ لالچ اور حرص نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ آقا ہی انھیں حدود کے اندر رکھ سکتے تھے۔ تمام لوگ آزادی حاصل کرنے کی امیدیں زنجیریں پہننے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ ان میں اتنی عقل باقی تھی کہ سیاسی اداروں کے فوائد کا اندازہ کر لیتے، لیکن اتنا تجربہ نہ تھا کہ اس کا خطرہ بھانپ لیتے۔"[2]

روسو نے آخر میں کہا، حکومت ایک شر ہے، لیکن ایسا شر، جس سے مفر نہیں: "سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟ کیا معاشروں کو بالکل ختم کر دیا جاے؟.... کیا ہمیں جنگلوں میں چلے جانا چاہیے تاکہ ریچھوں میں زندگی بسر کریں؟ ہرگز نہیں۔ متمدن انسان بہت پیچھے چھوڑی ہوئی اور ابتدائی عہد کی زندگی دوبارہ اختیار نہیں کر سکتے:" وہ پودوں اور شاہ بلوط کے پھلوں پر گزارہ نہیں کر سکتے۔ وہ قوانین اور مجسٹریٹوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"[3]

روسو نے اپنی بڑی سیاسی تصنیف "معاہدۂ عمرانی"[4] (۱۷۶۲ء) میں مثبت جواب دینے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرد کی آزادی اور حکومت کے اداروں کے درمیان مفاہمت کی ایک نئی اور انقلابی شکل پیدا کر دے، یعنی حکومت نظریۂ معاہدہ کے مطابق ہو۔ اس سے پیشتر قرونِ وسطیٰ سے جان لاک تک معاہدے کے جو نظریے پیش ہوئے، ان میں ایک فریق محکوم عوام ہوتے، دوسرا فریق ایک حاکم یا حاکموں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہوتا۔ ان نظریوں میں سیاسی معاہدہ فرض کر لیا جاتا۔ روسو کا پیش کردہ معاہدہ عمرانی تھا، جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہوتا ہے، یعنی پورے معاشرے نے اپنے ارادے سے محکومیت پر اتفاق کر لیا:

"ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات اور اپنے تمام اختیارات کو مشترکاً ایک اعلیٰ ہدایت کے تابع کر دیتا ہے اور ہم اجتماعی حیثیت میں انفراداً کل کے غیر منقسم حصے بن جاتے ہیں۔"[5]

روسو کہتا ہے: "ہر فرد کی ایک خاص رائے ہو سکتی ہے، جو رائے عامہ سے مختلف یا مخالف ہو اور یہ رائے وہ ایک

---

[1] معاہدۂ عمرانی اور مذاکرات ص ۱۹۲۔ [2] "معاہدۂ عمرانی" اور مذاکرات" ص ۲۰۵۔

[3] ایضاً ص ۲۲۸۔ [4] The Social Contract

[5] معاہدۂ عمرانی ص ۱۳۔

شہری کی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔" اگر فرد ذاتی مفاد کو جماعتی مفاد پر مقدم رکھنے کے لیے اصرار کرتا ہے تو اسے مجبور کرنا ضروری ہے کہ وہ رائے عامہ کا احترام کرے۔ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسے آزادی پر مجبور کیا جائے گا۔[۱]

"معاہدۂ عمرانی" کا مرکزی تصور رضائے عامہ تھا۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ تصور اخلاقی بھی تھا اور سیاسی بھی، کیونکہ اس ذریعے سے وہ چیز سامنے آئی، جو پوری قوم کے لیے بہترین تھی اور قوم کا فرض تھا کہ اس پر عمل پیرا ہوتی۔ یہ انسان کے نیک عمرانی وجدانات کے اظہار کا آلہ ہے اور اس ذریعے سے اس کے مذموم خود غرضانہ جذبات پر پابندی عائد ہوتی ہے۔

رضائے عامہ کی ترتیب کے سلسلے میں روسو کا عقیدہ تھا کہ یہ ہر شخص کا کام ہے۔ قانون سازی کا اختیار عوام سے کسی ادارے کی طرف (مثلاً برطانوی پارلیمنٹ) ٹھیک منتقل نہیں ہو سکتا:

"عوام کے مندوبین نہ عوام کے نمائندے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی حیثیت صرف نگرانوں کی ہے اور وہ کوئی قطعی عمل اختیار نہیں کر سکتے۔ ہر وہ قانون جس کی تصدیق عوام شخصاً نہ کریں، کالعدم سمجھنا چاہیے۔ دراصل وہ قانون ہی نہیں ہوتا۔ انگلستان کے عوام سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں، لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ وہ صرف اتنی مدت کے لیے آزاد ہوتے ہیں، جب پارلیمنٹ کے ممبر چنے جاتے ہیں، جب انتخاب ہو چکتا ہے تو عوام پر محکومی مسلط ہو جاتی ہے اور وہ بے حقیقت رہ جاتے ہیں۔"[۲]

رائے عامہ کی تنقید ایک چھوٹے سے گروہ کا کام ہو سکتی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مونٹسک کی طرح روسو کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ حاکموں کی تعداد مملکت کے رقبے اور وسائل کے مطابق ہونی چاہیے:

"شہنشاہی . . . . صرف دولتمند قوموں کے لیے موزوں ہے۔ امراء کی حکومت صرف ان مملکتوں کے لیے موزوں ہے، جن کا رقبہ اور دولت درمیانے درجے کے ہوں۔ جمہوریت چھوٹی اور غریب مملکتوں کے لیے موزوں ہے۔"[۳]

روسو کی رائے تھی کہ کوئی بھی مملکت انتہا درجے کی جمہوریت کے لیے تیار نہیں، جس میں بہت سے لوگ قانون نافذ کرتے ہیں: "جہاں عوام دیوتاؤں کی صورت اختیار کر لیں، وہاں جمہوری حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا مکمل نظامِ حکومت انسانوں کے لیے موزوں نہیں۔"[۴] روسو کو علم تھا کہ "معاہدۂ عمرانی" عملی سیاسیات کا دستور العمل نہیں۔ ایک اور موقع پر

---

[۱] معاہدۂ عمرانی اور مذاکرات، ص ۱۹۲۔
[۲] ایضاً، ص ۷۰۔
[۳] ایضاً ص ۶۵
[۴] ایضاً ص ۵۶۔

اس نے پولستانی حکومت میں اصلاح کی تجاویز پیش کیں اور جتنے مشورے دیئے، بڑے معتدل بلکہ قدامت پسندانہ تھے۔ اس نے ویٹو کی تنسیخ کے حق میں رائے دی، باقی اداروں کے متعلق اس کا مشورہ یہ تھا کہ تدریجاً انھیں بدلا جائے۔ بادشاہ کے انتخاب کا اصول قائم رکھا جائے۔ امراء کے اکثر حقوق محفوظ رہیں۔ تعلیم کے ذریعے سے انھیں فرض کا نیا احساس دلایا جائے اور زرعی غلام ضرور آزاد کیے جائیں، مگر صرف اس وقت جب ذمہ داریاں ان پر واضح کر دی جائیں۔

لیکن روسو کا اثر "معاہدۂ عمرانی" سے پیدا ہوا اور یہ اثر اعتدال اور قدامت پسندی کے حق میں نہ تھا۔ گزشتہ دو صدیوں میں جو بھی انتہا پسندانہ سیاسی نظریہ بروئے کار آیا، وہ کسی نہ کسی حیثیت میں روسو ہی سے پیدا ہوا تھا۔ محبانِ وطن اور قوم پرور اسے اس عقیدے کا ابتدائی داعی قرار دیتے ہیں کہ قوموں میں اختلاف ہوتا ہے اور اختلاف ہونا چاہیے۔ وہ اپنی تحریرات میں بار بار ملک سے محبت کا ذکر کرتا رہا۔ پولستانیوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے اس نے خاص زور اس بات پر دیا کہ وہ تعلیم اور حبِ وطن کو ترقی دینے والے تہواروں کے ذریعے سے اپنی قومی روح کی تجدید کریں۔ "معاہدۂ عمرانی" کا خاتمہ اس پر ہوا کہ ایک مذہب قائم ہو جانا چاہیے۔ روسو نے اجازت دے دی کہ ابتدائی مسیحیت کا اخلاقی ضابطہ قائم رکھا جائے، لیکن مملکت کو شہریوں کی وفاداری حاصل کرنے کے لیے کلیسا سے مقابلے کی کوئی ضرورت نہیں۔

غرض روسو کے افکار کی تعبیر یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ مملکت کا انتہائی احترام کرتا تھا اور قومی بہبود کو انفرادی مفاد سے برتر رکھتا تھا۔ اس نے نجی جائداد کی برائیوں پر جو نکتہ چینی کی اور زمین کی پیداوار سب کے لیے ہونے پر جو اصرار کیا، اس کے پیش نظر سوشلسٹوں اور اشتراکیوں نے سمجھ لیا کہ یہ اجتماعیت کے لیے وجہ جواز تھی۔ ڈکٹیٹروں نے رضائے عامہ کے اصول کو سامنے رکھ کر پولیس کے ذریعے سے نظم و نسق جاری رکھنے کے طریقوں کی تصدیق کر لی۔ ڈکٹیٹر اس چکر میں نہیں پڑتا کہ رائے عامہ دریافت کرے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ اسے تمام معاملات کے متعلق خاص علم حاصل ہے اور ہٹلر کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اپنے "وجدان" پر زور دیتا تھا۔ ڈکٹیٹر اپنے احکام نافذ کرتا ہے تو وہ روسو کے اصول کے مطابق انھیں جبراً آزادی دلاتا ہے۔

لیکن روسو جمہوریت اور انفرادیت کا بھی داعی تھا۔ اس کی تحریرات سے مطلق العنانی کی تعبیرات نکالنے والے لوگ نظامِ قدیم کے خلاف بغاوت کے متعلق روسو کے ذاتی اقتدار اور اس کی تحریرات کے زبردست مثالی رجحان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ "جہاں عوام دیوتا ہوں، وہاں جمہوری حکومت قائم ہو سکتی ہے۔" روسو کے جمہوری شاگردوں کے نزدیک یہ اعلان نہ تو انسانی فطرت کے نیک ہونے سے انکار کی دلیل ہے اور نہ یہ قنوطیت پر مبنی ہے۔ انقلابِ فرانس سے آج تک سب یہی کہتے رہے کہ روسو دورِ تنویر کی رجائیت میں حصہ دار تھا۔ اسے یقین تھا کہ عوام ایک روز واقعی دیوتا بن جائیں گے۔ "ایمیل" سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ تعلیم کس طرح اس معاملے میں معاون ہو سکتی ہے۔ "معاہدۂ عمرانی" میں بتایا گیا تھا کہ انسان کسی وقت اتنے نیک اور پارسا ہو جائیں گے کہ وہ خوشی خوشی رضائے عامہ کی پیروی کرتے رہیں اور انھیں جبراً راہِ آزادی پر

لگانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

تنویری مطلق العنانی

نظامِ قدیم میں جو خرابیاں موجود تھیں، ان سے جلد رہائی پانے کی امید نہ تو روسو کی مثالی جمہوریت نے پیدا کی اور نہ مونٹسک کی محدود و متوازن بہشت نے۔ بہت سے فلسفیوں نے قریب ترین راستے سے مثالی نظام پر پہنچنا چاہا۔ یہ طریقہ ادارۂ شاہی کے لیے عملی اور ہمدردانہ تھا۔ انھیں اس سے ایک ساحرانہ فارمولا مل گیا، یعنی یہ کہ مطلق العنانی کو روشن خیال ہونا چاہیے۔

روشن خیال مطلق العنانی کے بڑے مخالف حامیانِ مسلکِ فطرت تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ مونٹسک اور روسو دونوں نے وضعِ قوانین کے اختیارات کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ محض الفاظ کا ضیاع ہے۔ خدا قانون دینے والا تھا۔ فطرت نے اس آسمانی قانون کو محفوظ رکھا اور حکومت کا فرضِ محض یہ رہ گیا کہ ان طبعی قوانین سے کام لے۔ جمہوریت یا حکومتِ امرا، دونوں میں یہ مہلک کمزوری موجود ہے کہ نظم و نسق کے اختیارات افراد کے حوالے کر دیتے ہیں، جن کے عارضی ذاتی مقاصد قوم کی مستقل بہبود سے متصادم ہوتے ہیں۔ حامیانِ مسلکِ فطرت نے مقابلہ کر کے دکھا دیا کہ موروثی بادشاہوں کا ذاتی مفاد قومی مفاد کے عین مطابق ہوتا ہے، کیونکہ ان کے زیرِ حکومت جو علاقے ہوتے ہیں، انھیں قوم اور بادشاہ دونوں کی ملکیت سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا بادشاہوں کو مطلق العنان ہونا چاہیے۔ اس سے مراد نامناسب مطلق العنانی نہیں بلکہ ایسی مطلق العنانی ہے، جو قدیم یونان میں رائج تھی یا جیسے دورِ احیاءِ علوم کے مطلق العنان تھے۔ ضرورت ہے کہ کوئی نیا نپولین پیدا ہو۔ روشن خیال مطلق العنان خدا کے جاری کیے ہوئے طبعی قوانین دریافت کر لیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے مصنوعی قوانین کو ختم کر دیا جائے، جو ترقی کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی تجارتی نظریۂ زر غائب ہو جائے گا۔ زراعت اپنی اصل حیثیت اختیار حاصل کر لے گی اور قانون کے مجموعے دوبارہ مدوّن ہو جائیں گے۔ یوں یکایک اور معجز نما طریق پر یورپ کی کایا پلٹ جائے گی۔

چنانچہ روشن خیال مطلق العنانی کی فوری اور پُر جوش تائید یورپی بادشاہوں کی طرف سے حاصل ہوئی اور یہ تعجب کا مقام نہیں۔ اس طرح ان بادشاہوں کو موقع مل گیا کہ اپنے آپ کو عقل و ترقی کے مجاہد قرار دیں، ساتھ ساتھ اپنے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ مطلق العنان بناتے جائیں، جس کے لیے وہ مدّت سے لڑتے چلے آ رہے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں خود ساختہ روشن خیال مطلق العنان اکثر یورپی تختوں کی زیب و زینت بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے تین بہت بڑے تھے، یعنی فریڈرک اعظم والیِ پروشیا، ملکہ کیتھرائن والیۂ روس اور جوزف دوم فرمانروائے آسٹریا۔ ان کی زمینیں عہدِ عقل کے اقتصادی، عمرانی اور مذہبی پروگراموں کے لیے بڑی سازگار ثابت ہو رہی تھیں۔

نواں باب

روشن خیال مطلق العنان فرمانروا

پروشیا، فریڈرک اعظم اٹھارھویں صدی کے تمام بادشاہوں میں سے فریڈرک ثانی والیٔ پروشیا (۱۷۴۰ء تا ۱۷۸۶ء) جو اعظم کے لقب سے مشہور ہے، دورِ تنویر کے لیے سب سے بڑھ کر موزوں معلوم ہوتا تھا۔ نوجوانی کے عالم میں اس نے اپنے زبردست باپ فریڈرک ولیم اوّل کے غیر موزوں نقطۂ نگاہ اور تحکمانہ طریقوں کے خلاف بغاوت کی۔ اسے موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ بانسری بجاتا، جسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا۔ جنگی مہموں میں بھی اسے نہ چھوڑتا اور اس نے بانسری کے لیے ایک سو سے زیادہ گیت لکھے، حالانکہ اس آلے پر گیت گانا مشکل ہے۔ اس نے فلسفیوں کی تمام کتابیں بڑی توجّہ سے پڑھیں۔ ان سے خط و کتابت جاری رکھی۔ والٹیئر کو دعوت دے کر اپنے ہاں بلایا اور پنشن دے کر پاٹسڈم[1] میں، جو برلن سے قریب ہے، اس کے لیے سکونت کا انتظام کیا گیا۔ وہ میکیاولی کا سخت مخالف تھا۔ اس کے خلاف ایک رسالہ لکھا، جس میں "کتاب الملوک" کی بد اخلاقی کی مذمت کی، خود اس نے روشن خیال مطلق العنان کے بنیادی اوصاف واضح کیے:

> "امیر شہنشاہ اور بادشاہ اس لیے اعلیٰ اختیار کے مالک نہیں بنائے جاتے کہ وہ عیش و عشرت اور بدکاری میں ڈوبے رہیں . . . . ہر بادشاہ کو باربار یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ وہ بھی ویسا ہی انسان ہے، جیسے رعایا کے حقیر ترین افراد ہیں۔ اگر اسے قوم میں اعلیٰ جج، اعلیٰ سپہ سالار، اعلیٰ ماہر مالیات اور اعلیٰ وزیر کا منصب ملتا ہے . . . . تو غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان فرائض کو احسن طریق پر پورا کرے۔ جو یہ ممتاز عہدے اس پر عائد کرتے ہیں، وہ مملکت کا سب سے بڑا خادم ہے۔ اسے چاہیے کہ عدل و انصاف، عقل و دانش اور بے غرضی سے کام کرے۔ ہر لحظہ خیال رکھے کہ اسے نظم و نسق کے سلسلے میں شہریوں کے سامنے پورا حساب پیش کرنا ہے۔"[2]

فریڈرک متعدد اعتبارات سے اپنی ضروریات کے عین مطابق تھا۔ اسے بدکاری اور عیش و عشرت سے احتراز تھا۔ لباس عموماً معمولی اور میلا پہنتا۔ یقیناً وہ مملکت کا سب سے اعلیٰ خدمت گزار تھا۔ بڑی لمبی مدّت تک اپنی میز پر بیٹھا محنت و مشقت

---

[1] Potsdam

[2] فریڈرک کی فرانسیسی کتاب جس میں حکومت کی شکلیں اور بادشاہوں کے فرائض بیان کیے گئے ہیں۔

سے کام کرتا رہتا۔ میدانِ جنگ میں بھی ہمیشہ محنت و مشقت میں مصروف رہتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ عدل، عقل و دانش اور بے غرضی پر کاربند تھا؟ اس سلسلے میں اس کا عمل ناہموار تھا۔ بے شک اس نے میکیاولی کی مخالفت کی تھی، لیکن اس نے اپنی خارجہ پالیسی اور فوجی معاملات میں میکیاولی کا حقیقی طرزِ عمل برابر قائم رکھا۔ اس نے جن حرافیوں سے کام لے کر سیلیشیا پر حملہ کیا، وہ جیسے شخص کے لیے ہی باعثِ رشک تھیں۔ پاٹسڈم کے محل میں بیٹھ کر وہ خط و کتابت سے مملکت کا کاروبار انجام دیتا، لیکن اپنے ماتحتوں سے غلاموں کا سا سلوک کرتا تھا۔ سپہ سالار، ڈپلومیٹ اور پروشیائی نظم و نسق کے کامل الفن میکانک کی حیثیت میں فریڈرک اعظم بڑا قابل اور کامیاب تھا، لیکن وہ روشن خیال، مطلق العنان بادشاہ نہ تھا۔ دورِ تنویر کے ایسے شہرت کی بلندی اور پستی کا انحصار اس پر ہے کہ اس نے کون کون سی عمرانی اور اقتصادی اصلاحات نافذ کیں۔

حامیانِ مسلکِ فطرت میں سے کسی نے بھی اتنا کام نہ کیا، جتنا فریڈرک نے پروشیائی زراعت کی اصلاح کے لیے کیا۔ اس نے انگلستان سے تپتیا گھاس، باری باری فصلوں کی کاشت اور لوہے کا ہل منگوایا۔ لوہے کے ہل سے زمین بہت اچھی طرح جوتی جاتی تھی۔ پرانا لکڑی کا ہل اتنا کام نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے زیریں وادی اوڈر کی دلدلیں خشک کرائیں۔ سیلیشیا اور دوسرے مقامات پر نئے مزرعے قائم کیے۔ تین لاکھ آدمی باہر سے لا کر نئی زمینوں پر بسائے۔ "ہفت سالہ جنگ" سے بڑی تباہی پھیلی تھی۔ فریڈرک نے کسانوں کو آلات کشاورزی دیے۔ جانور مہیا کیے اور بیج دیا تاکہ تباہ شدہ کھیت پھر سے آباد ہو جائیں۔ اس زمانے میں جنگلات کی حالت بہت معمولی تھی۔ فریڈرک نے جرمنی کی شاندار روایات کے مطابق جنگلات کی حفاظت اور پرورش کا انتظام سائنٹیفک طریق پر کیا۔

تاہم وہ تجارتی نظریۂ زر کا حامی تھا اور حامیانِ مسلکِ فطرت کے اصول عدم مداخلت کا سخت مخالف تھا۔ اس نے فوجی مصارف کے لیے روپیہ بچانے کی غرض سے درآمد بالکل بند کر دی۔ اس کی اقتصادی پالیسی نے پروشیائی صنعت کی نشو و نما میں مدد دی، خصوصاً فوج کی ضرورت کے لیے کپڑے اور ہتھیار خاصے بننے لگے۔ فریڈرک کی وجہ سے رعایا پر محاصل کا ایسا بوجھ پڑ گیا، جس کے زیر اثر وہ لڑکھڑانے لگی۔ اسی طرح متعدد اقتصادی تجویزیں بروئے کار لایا جو بالکل مہمل تھیں۔ فریڈرک نے ملک میں ریشم کی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اس نے پروشیا کی ضرورت کے مطابق تمباکو کاشت کرانا چاہا، حالانکہ اس کے لیے آب و ہوا موزوں نہ تھی۔ جرمن قوم قہوے کی بڑی رسیا تھی، قہوہ منگوانے کے لیے خاصی رقمیں باہر بھیجی جاتی تھیں۔ فریڈرک نے اصرار کیا کہ قہوے کی جگہ دیسی بیئر پی جائے اور باہر سے قہوے کے جو بیج آتے تھے، ان پر بھاری محصول درآمد عائد کر دیا اور فرانس سے وہ لوگ بلائے جو سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ قہوہ ہے یا نہیں۔ انھیں اس غرض سے مقرر کیا کہ کوئی شخص ناجائز طریق پر قہوہ درآمد نہ کر سکے۔

فریڈرک کی مذہبی اور عمرانی پالیسی بھی عقلیت پسندی کے دور اور نظامِ قدیم کا مجموعہ تھی، یعنی ایک اعتبار سے نہایت معقول اور ایک اعتبار سے کم از کم روشن خیال۔ فریڈرک خود مسلکِ فطرت کا پابند تھا اور مذہبی رواداری پر فخر کیا

کرتا تھا۔ اس نے کیتھولک کی اقلیت کو پروٹسٹنٹوں کی بہت بڑی اکثریت میں محفوظ رکھا۔ ان سے اصرار کرکے گرجے کے مینار زیادہ سے زیادہ اونچے بنوائے۔ اس نے یسوعیوں کو دعوت دے کر بلا لیا، جس پر کیتھولک ملکوں میں ظلم و جور ہو رہا تھا، کیونکہ اسے یسوعیوں کی ذہنی قابلیت کا اعتراف تھا۔ وہ فخریہ کہا کرتا تھا کہ اگر مسلمان برلین میں آ بسیں تو میں ان کے لیے ایک مسجد تعمیر کراؤں گا، لیکن وہ سامیوں کا سخت مخالف بھی تھا۔ اس نے سکّے کی قیمت گھٹانے کا غیر ہر دلعزیز کام یہودیوں کے ذریعے سے پورا کرایا، ساتھ ہی یہودی رعایا پر خاص بھاری محصول بھی لگا دیا، نیز انھیں ملازمتوں اور پیشوں سے محروم رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ وہ کہتا تھا کہ یہودی مملکت کے لیے بالکل بے کار ہیں۔

فریڈرک نے عدالتی اصلاحات سے اہلِ پروشیا کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو عدالتیں سخت سزائیں دیتی تھیں اور متلوّن تھیں، پھر مقدمات پر روپیہ بہت خرچ ہوتا تھا۔ فریڈرک نے تعذیب سے کام لینے کا دائرہ محدود کر دیا۔ پہلے یہ عجیب طریقہ رائج تھا کہ عدالتوں میں جو فیصلے ہوتے، ان کی اپیلیں یونیورسٹی کی فیکلٹیز کے پاس کی جاتیں، فریڈرک نے اپیل کی عدالتوں کا باقاعدہ نظام قائم کیا۔ ججوں کو رشوتیں دی جاتی تھیں۔ فریڈرک نے حکم دے دیا کہ ایسی تمام رقمیں ایک جگہ جمع رہیں۔ پھر ہر جج اپنے حصے کے مطابق رقم لے لے۔

یہی فریڈرک ہے، جس نے عمرانی ذاتوں کے متعلق ازمنۂ وسطیٰ کا سا مسلک اختیار کیا۔ اس نے زرعی غلاموں کی زنجیریں ڈھیلی کرنے کے لیے کچھ نہ کیا اور پروشیا کے کسانوں کا بہت بڑا حصہ انھیں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ جب اس نے کسانوں کو مادّی امداد دی تو اس کا مقصد صرف فائدہ تھا۔ کسانوں کو معمولی نوشت و خواند کے سوا کچھ سیکھنے کا موقع حاصل نہ تھا اور وہ اپنی حالت پر غیر مطمئن رہ سکتے تھے۔ طبقۂ اوسط سے بھی اسے نفرت تھی۔ وہ صرف زمیندار امراء و شرفاء کا احترام کرتا تھا۔ جنکروں کو خاص حیثیت حاصل تھی، بہ ایں ہمہ وہ بھی فریڈرک کے کچوکوں سے بچ نہ سکے۔ اگرچہ فوجی افسر صرف جنکروں سے لیے جاتے تھے، لیکن فریڈرک کی کوشش یہ تھی کہ وہ شادیاں نہ کریں، کیونکہ افسر میدانِ جنگ میں مارے جاتے تو ان کی بیویاں مملکت کی طرف سے پنشن کی حقدار بن جاتیں اور مملکت پنشن نہیں دے سکتی تھی۔

ایک انگریز ڈپلومیٹ، جو فریڈرک سے بخوبی واقف تھا، اس کی بربریت اور انسانیت کے تضاد سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

> "میں نے اسے المناک واقعات پر روتے دیکھا ہے۔ وہ ایک بیمار کتّے کی ویسی ہی دیکھ بھال کرتا ہے، جیسی ماں پیارے بچّے کی، لیکن اگلے ہی دن وہ بے تکلّف ایک صوبے کی بربادی کا حکم دے دیتا ہے یا خواہ مخواہ محاصل بڑھا کر پورے علاقے کو برباد کر دیتا ہے۔ وہ اتنا محتاط ہے کہ شاذ ہی کسی مجرم کو موت کی سزا دے گا، لیکن پچھلی جنگ میں اس نے فوجی ڈاکٹروں کو حکم دے دیا، سپاہیوں کا مرجانا اس سے

بدرجہا بہتر ہے کہ ان کے عضو کاٹ کاٹ کر بیماروں کی تعداد اور ان پر خرچ بڑھایا جائے۔"[1]

فریڈرک دستور کے اعتبار سے عوام کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی جھگڑ پڑا، خصوصاً والٹیر سے۔ یہ عظیم القدر فرانسیسی، جو رواداری کا سرگرم حامی تھا، فریڈرک سے روزانہ ملاقات کی زحمت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ فریڈرک نے والٹیر سے کہا کہ میں نے جو متفرق نظمیں فرانسیسی میں لکھی ہیں، انھیں ترتیب دے دو۔ والٹیر نے کہا: "کیا مجھے بادشاہوں کے نجس کپڑے دھونے پڑے ہیں"۔ فریڈرک نے اپنے مہمان کو ایک نارنگی سے تشبیہ دی، جسے چوس کر پھینک دینا چاہیے۔ آخر ان دونوں کے درمیان دوستی کے رشتے پھر سے قائم ہو گئے، لیکن یہ سلسلہ صرف خط و کتابت تک جاری رہا۔ فریڈرک کو اپنی بیوی سے سخت نفرت تھی اور وہ اس سے تغافل برتتا تھا۔ جب وہ مرا تو رعایا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے وصیت کر دی تھی کہ مجھے محبوب کتوں کے پاس دفن کیا جائے۔ ایک فرانسیسی مبصر نے خوب کہا کہ انسانیت سے نفرت کا یہ آخری نشان ہے۔

اس سخت رائے کی بناء پر فریڈرک کے متعلق منصفانہ جائزے پر اثر نہ پڑنا چاہیے۔ درحقیقت فریڈرک میں دو سیاسی فلسفے جمع تھے، جو اکثر متصادم ہوتے ہیں، اوّل تنویر کے انسانی اصول، دوم ہوہینزولرن خاندان کی سخت و شدید روایات۔ عام زندگی میں غالباً وہ پہلے ہوہینزولرن تھا، پھر ایک روشن خیال مطلق العنان اور وہ بھی اس وقت جب عہد عقلیت کے اصول کو ہوہینزولرن بادشاہی کے حقائق سے مطابقت دی جا سکتی تھی۔

روس: ملکہ کیتھرائن

فریڈرک اعظم کے مداحوں میں سے اوّلین مقام روس کے گرانڈ ڈیوک کو حاصل تھا، جو ملکہ ایلزبتھ[2] (۱۷۴۱ء-۱۷۶۲ء) کا حقیقی بھانجا اور جانشین تھا۔ پیٹر نے بچپن گزار کر بھی بچپن کی عادتیں نہ چھوڑیں۔ اس نے سپاہیوں کی شکل کے کھلونے بنوا رکھے تھے، انھیں سے کھیلتا رہتا اور کبھی کبھی اپنے سپاہیوں کو قواعد کرانے لگتا۔ اس کی پوری تربیت جرمنی میں ہوئی تھی اور عمر بھر اس کا نقطۂ نگاہ جرمنوں کا رہا۔ شاہ پروشیا کا وہ انتہائی عقیدت مند تھا۔ یہ عقیدت اس عہد میں بھی قائم رہی۔ جب پروشیا ہفت سالہ جنگ میں روس کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ایلزبتھ کی وفات (جنوری ۱۷۶۲ء) کے بعد وہ تقریباً چھ مہینے تک پیٹر سوم کی حیثیت میں روس پر حکمران رہا۔ اس نے فریڈرک کے ساتھ صلح کر لی، جو فریڈرک کے لیے بہت فائدہ مند تھی اور پروشیائی فوج کا شدید ضبط و نظم روسی فوج پر عائد کر دیا بلکہ وہ آرتھوڈکس کلیسا کو بھی جرمنی کے لوتھری کلیسا کے لے آنے کی تجویزیں سوچ رہا تھا۔ اس کی بیوی کیتھرائن کے حامیوں نے ایک سازش کی جولائی ۱۷۶۲ء میں پیٹر سوم

---

[1] ہنزہیرس کی رائے۔ یہ اقتباس گوچ کی کتاب فریڈرک اعظم میں نقل ہوا۔

[2] پیٹر اعظم کی بیٹی جس سے تخت اس کے بھانجے کی طرف منتقل ہوا۔

مارا گیا اور کیتھرائن کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا۔

نئی ملکہ جرمنی کے ایک غیر معروف رئیس کی بیٹی تھی۔ اس میں وہ تمام صلاحیتیں، عملی گرمجوشی موجود تھی، جس سے اس کا شوہر محروم تھا۔ کیتھرائن نے اپنی روشن خیالی کی خوب نمائش کی۔ اس نے بڑی کتابیں پڑھیں۔ ڈرامے، طنزیہ نظمیں اور مقالے لکھے۔ لوگ چیچک کے ٹیکے کو شبہے کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیتھرائن نے اس شبہے کا خوب مذاق اڑایا اور انگلستان سے ایک ڈاکٹر صرف اس لیے بلایا کہ اسے اور لوگوں کے ٹیکے لگائے۔ فریڈرک اعظم قہوے کے خلاف جس تعصب کا اظہار کر رہا تھا، کیتھرائن اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ ہر صبح قہوے کی خاصی مقدار نوش کر لیتی۔ اس نے قہوہ تیار کرنے کا ایک خاص طریقہ دریافت کر لیا تھا، یعنی پانچ پونڈ پانی میں ایک پونڈ قہوہ شامل کرتی۔ جب وہ ملکہ بن گئی تو نشر و اشاعت کے فطری جذبے کے تحت فلسفیوں کو ساتھ ملا لیا، تاکہ اس کی طرف سے حمایت کا فرض انجام دیتے رہیں۔ اس نے لوگوں کو پھانسنے کے خاص طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ وہ ان کی زیادہ سے زیادہ خوشامد کرتی۔ اپنی صلاحیت کے متعلق عجز و انکسار پر عمل پیرا رہی اور مناسب موقعوں پر ان کے لیے وظیفے مقرر کر دیتی۔ چنانچہ فلسفی اس پھندے میں پھنس گئے اور وہ برابر اعلان کرتے رہے: کیتھرائن نئی منروا[1] ہے، نئی جونو[2] ہے، نئی سیرس[3] ہے۔ والٹیر کی زبان سے بھی انتہائی مدح و ستائش کے کلمے نکلے۔ وہ لکھتا ہے:

"...... اب سب کی نگاہیں قطب تارے کی طرف متوجہ ہو جانی چاہئیں۔ آپ علیا حضرت نے عظمت و شان کا ایک ایسا راستہ دریافت کر دیا ہے، جس سے تمام دوسرے فرمانروا بے خبر تھے...... آپ واقعی یورپ کی محسن بن گئی ہیں۔ آپ نے اپنی روح کی عظمت و برتری کی بدولت اس سے زیادہ رعایا حاصل کر لی ہے، جو دوسرے فرمانروا اسلحہ کے بل پر بھی مسخر نہیں کر سکے۔"[4]

کیتھرائن یقیناً کوئی بڑی ہستی نہ تھی۔ وہ حوصلہ مند، منچلی اور حصولِ مقاصد میں جائز و ناجائز سے بے پروا تھی۔ اس کی فطرت میں مطلق العنانی ودیعت کی گئی تھی اور وہ پیدائشی سیاست دان تھی۔ جس وقت سے اس کی شادی ہوئی، تمام اعمال میں اس کا انداز سیاسی رہا۔ پیٹر کے برعکس اس نے کھلم کھلا اپنے آپ کو جرمن کے بجائے روسی بنا لیا تاکہ عوام کی حمایت حاصل ہو جائے۔ روسی زبان پر عبور حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور روس کے ذی اثر امیر خاندانوں میں سے اس نے بہت سے دوست اور بہت سے عاشق چن لیے۔ وہ آرتھوڈکس کلیسا سے عقیدت کا اظہار بہت کرتی تھی اور نجی طور پر

---

[1] Minerva علوم و فنون کی دیوی۔ [2] Juno سب سے بڑی رومی دیوی جس کی پرستش عورتیں زندگی کے ہر نازک موقع پر کیا کرتی تھیں۔ [3] Ceres وہ دیوی جو زراعت کی محافظ تھی۔ [4] والٹیر کا خط مرقومہ ۱۲ جون ۱۷۶۶ء۔

کہتی رہتی تھی کہ ہیں نے لوتھر کے طریقے کو صرف سیاسی تدبیر کے طور پر چھوڑا ہے، جس طرح ہنری والی ناوار[1] نے کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ سینٹ پیٹرز برگ کے لیے بھی لاریب اس قسم کا ایثار کیا جا سکتا ہے۔

کیتھرائن یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی کہ سلطنت اس نے غصب کی تھی اور تاج اسے ان امرا کی بدولت ملا تھا، جو اس کی حمایت میں سرگرم تھے۔ اسے ہر لحظہ اضطراب تھا کہ اپنی حیثیت محفوظ رکھے۔ پھر اسے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ روس میں کوئی تغیر پیدا کرنا حد درجہ مشکل ہے، اس لیے وہ ایسی وسیع اصلاحات جاری کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئی، جو روشن خیال مطلق العنانی کے ذریعے میں مضمر تھی۔ احتیاط، قدامت پسندی اور مطلق العنانی اس کی داخلی پالیسی کی خصوصیات تھیں۔

داخلی معاملات میں تدبر کا پہلا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ایک کمیشن قوانین کی ترتیب کے لیے مقرر کر دیا۔ سرکاری افسروں، قصبوں کے باشندوں اور آزاد کسانوں، پادریوں اور زرعی غلاموں کے سوا روس کے ہر اہم عمرانی گروہ نے کمیشن کے لیے نمائندے بھیجے۔ ان لوگوں کے فائدے کے لیے ملکہ خود مفصل ہدایات مرتب کرنے کی غرض سے تین سال محنت و مشقت کرتی رہی اور ان ہدایات میں مونٹسکیو اور بکاریا کے بہت سے ترقی پذیر تصورات شامل کر دیے۔ لوئی پانزدہم کے وزراء نے کیتھرائن کا اعزاز لیں گیا کہ ہدایات کا کوئی نسخہ فرانس میں لانے کی ممانعت کر دی، مگر ان ہدایات میں کیتھرائن نے مطلق العنانی کے متعلق اپنے پختہ عقیدے کا صاف اظہار کر دیا اور روس کے سب سے بڑے عمرانی مسئلے یعنی ایک کروڑ زرعی غلاموں پر اظہار رائے سے دانشمندانہ اعراض کیا اور قوانین کی ترتیب دینے والے کمیشن کا اجلاس ہوا تو واضح ہو گیا کہ یہ انقلابیت سے منزلوں دور ہے۔

جو لوگ کمیشن میں نمائندے بن کر آئے تھے، انھیں خزانے سے رقمیں ملتی تھیں اور سزائے موت سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ ہر نمائندے کا فرض قرار دے دیا گیا تھا کہ اپنے ساتھ ہمسایوں کی طرف سے تحریری دستاویزیں لائے، جن میں ان کی شکایتیں اور تغیر کے متعلق مطالبات درج ہوں۔ ان دستاویزوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ روس میں جو مطلق العنانی رائج تھی، اس پر بہت کم بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا۔ عوام کی خواہش یہ تھی کہ مقامی خود اختیاری حکومت کے متعلق انھیں زیادہ حقوق و فرائض مل جائیں اور جو کچھ ان پر واجب قرار دیا جائے، اس کی ٹھیک ٹھیک وضاحت کر دی جائے تاکہ انھیں اپنے موقف کے متعلق پوری آگاہی حاصل ہو جائے۔ کمیشن میں جو بحثیں ہوئیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمائندوں کو صرف اپنے طبقے سے دلچسپی تھی۔ مثلاً آزاد کسان چاہتے تھے کہ انھیں زرعی غلام رکھنے کی اجازت دی جائے۔ ڈیڑھ سال کی بحث و تمحیص کے بعد ۱۷۶۸ء میں کیتھرائن نے کمیشن کو ختم کر دیا۔ اس نے

---

[1] Navarre جو فرانس کا بادشاہ بن گیا تھا۔ عقیدے کے لحاظ سے پروٹسٹنٹ تھا۔ اہل پیرس نے اسے اس شرط پر منظور کیا کہ کیتھولک بن جائے۔ چنانچہ اس نے مذہب تبدیل کر لیا۔

قوانین مدوّن نہیں کیے تھے، لیکن خود کیتھرائن کے نقطۂ نگاہ سے یہ بڑا مفید تھا، کیونکہ اس میں روس کے تمام طبقوں نے مطلق العنانی کی بنیادی حمایت کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غور و فکر کے متعلق بعض خامیوں کے باوجود یہ کمیشن زاروں کی حکومت کی طرف سے آخری اقدام تھا، جس میں عوام سے مشورہ کیا گیا۔ پھر ایک سو اڑتیس سال تک کبھی ان سے پوچھا نہ گیا، یہاں تک کہ انقلاب نے ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ دوما (پارلیمنٹ) قائم کرائی۔

کیتھرائن نے قانون سازی کی کمیشن کے ابتدائی کام سے بعد کی اصلاحات کے سلسلے میں خاصا فائدہ اٹھایا۔ یہ اصلاحات پوگاشیف[1] کے زیر قیادت کاسلو کی بڑی بغاوت (۱۷۷۳ء-۱۷۷۵ء) کا نتیجہ تھیں۔ پوگاشیف نے سرحدی قبائلیوں کو اس لیے کیتھرائن کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تھا کہ قبائلیوں کے خاص حقوق منسوخ کر دیے گئے تھے۔ اس نے زار پیٹر سوم ہونے کا دعویٰ کر دیا اور زرعی غلاموں کو زمین اور آزادی دے دینے کا وعدہ کر لیا اور وہ پوگاشیف کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ جنوبی و مشرقی روس میں پوگاشیف نے خاصا بڑا علاقہ پامال کر ڈالا، پھر ماسکو کا رخ کیا۔ سترھویں صدی کے ہنگاموں کی طرح پوگاشیف کی بغاوت سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ روس کے اندر سخت بے چینی موجود ہے، جس کا مدعا یہ نہیں کہ مطلق العنانی کے مرکز کا تختہ الٹے بلکہ اس بے چینی کے ذمہ دار زمینوں کے مالک اور مقامی افسر تھے۔ روس میں کسان نظام کے انھیں کارندوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے جن سے انھیں سابقہ پڑتا تھا اور وہ جب کبھی بغاوت برپا کرتے تو اپنے آقا کا نام لیتے۔ ان کا احساس یہ تھا کہ آقا بہت دور رہتا ہے اور بد طینت مالکان اراضی، نیز افسر اسے حقیقت سے بے خبر رکھتے ہیں۔ اپنے بہت سے پیشروؤں کی طرح پوگاشیف کو بھی حمایت حاصل کرنے کے لیے زار بننے کی ضرورت پیش آئی۔

پوگاشیف کی بغاوت کے زیر اثر صوبائی نظم و نسق کا پورا ڈھانچا درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ احکام مقامی حکام تک دیر سے پہنچے اور حکومت کی مدافعت کے لیے سپاہی بہت سستی سے اقدامات کرتے۔ جب بغاوت ختم کر دی گئی اور پوگاشیف کو لوہے کے ایک پنجرے میں بند کر کے شمالی جانب لے گئے تاکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو کیتھرائن نے عملی قدم اٹھایا۔ اس نے مقامی حکومتوں کی تنظیم نو میں بیس صوبوں کی جگہ پچاس صوبے بنا دیے (۱۷۷۵ء)۔ یوں اس نے تعداد میں کم، لیکن رقبے میں بڑے بڑے علاقوں کی جگہ تعداد میں زیادہ اور رقبے میں کم علاقے پیدا کر لیے، جن کا انتظام نسبتاً سہل تھا۔ ہر صوبے میں تین لاکھ سے چار لاکھ تک باشندے آباد تھے۔ ۱۷۷۵ء کی اصلاح کے مطابق امراء کو صوبائی مناصب میں زیادہ سے زیادہ حصہ مل گیا لیکن مرکزی حکومت کی ہدایت و نگرانی ان پر قائم کر دی گئی اور مرکز کی طرف سے ہر صوبے میں انتظامی، مالی اور قانونی نمائندے بھیجے گئے۔

دس سال بعد کیتھرائن نے امراء کے لیے تازہ مراعات کا انتظام کیا۔ ۱۷۸۵ء میں جو منشور شائع ہوا، اس میں امراء کو فوجی خدمت اور محاصل سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ زرعی غلاموں کی تقدیر ان کے ہاتھ میں دے دی گئی اور جاگیروں پر انھیں

---

[1] Pugashev

پورے اختیارات حاصل ہو گئے۔ انھوں نے ہر صوبے میں اپنی ایک مشترکہ مجلس بنائی جس کی خاص تنظیم تھی اور اعزاز میں ایک مارشل اس کا رئیس منتخب ہوتا تھا۔ اسی طرح قصبوں کو منشور ملا جس کے مطابق کیتھرائن نے تھوڑے سے، مگر ترقی پذیر طبقہ متوسط کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اسی طرح بلدیاتی معاملات میں خود اختیاری کا اصول قائم ہو گیا، لیکن یہ اصول عملاً بے اثر رہا، کیونکہ روس کے پسماندہ شوری مرکزوں میں طبقاتی امتیازات بڑے سخت تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں زیادہ تر آبادی ان پڑھ کسانوں اور مزدوروں کی تھی، جو اس وقت بھی غلامی کے جُوے کے نیچے کراہ رہے تھے اور جمہوریت کے لیے شاذ ہی موزوں تھی۔

زرعی غلاموں کے لیے یقیناً کوئی فرمان شائع نہ ہُوا۔ کیتھرائن نے سرکاری زمینیں نجی مالکوں کو دے دیں، جن سے اُسے سیاسی امداد ملی تھی۔ ان زمینوں میں آٹھ لاکھ انسان آباد تھے، وہ سب کے سب زرعی غلام بن گئے گویا زرعی غلامی روس کے ان قصبوں میں بھی پہنچ گئی جہاں پہلے اس کا کوئی اثر نہ تھا اور جو قواعد و ضوابط بنے، انھوں نے زرعی غلاموں کو اور بھی جکڑ لیا۔ مثلاً ۱۷۶۵ء میں زرعی غلام کو آقا کے خلاف شکایت پیش کرنے کی ممانعت تھی۔ گویا وہ تلافی مافات کے لیے بھی ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتا تھا۔ یوں زرعی غلامی کیتھرائن کے روس میں پھیل بھی گئی اور اس نے شدت بھی اختیار کر لی اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہُوا، جب بعض روشن خیال مطلق العنان بادشاہ اسے منسوخ کر رہے تھے یا کم از کم اس کی حیثیت گھٹا رہے تھے۔ اس وقت تک بہ حیثیت ادارہ زرعی غلامی کے خلاف عوام میں کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔ جس ملک کے آزاد کسان چاہتے تھے کہ زمینوں کے مالک بن جائیں اور کسانوں پر انھیں اقتدار حاصل ہو جائے، جو زرعی غلام تھے، ظاہر ہے کہ اس کے باشندوں میں زرعی غلامی کی تنسیخ کے لیے محکم جذبۂ عامہ پیدا کرنا خاصی تعلیم اور مغربی طور طریقوں کے اختیار کرنے پر مبنی تھا۔ جب ایسا جذبہ پیدا ہُوا تو اس کا اظہار سب سے پہلے مالکان اراضی میں ہُوا۔

ملکہ کیتھرائن کی خارجہ پالیسی سے اس امر کو تقویت پہنچتی ہے کہ روشن خیال مطلق العنانی ڈپلومیسی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔ کیتھرائن کو مغربی جانب پولینڈ میں روس کی توسیع مطلوب تھی اور یہ اس نے حاصل کر لی۔ اسی طرح جنوبی جانب وہ ترکی میں قدم بڑھانا چاہتی تھی۔ کیتھرائن کو تخت نشین ہوئے صرف ایک سال ہُوا تھا کہ پولینڈ کا تخت خالی ہو گیا اور ملکہ نے ایک ایسے شخص کو بادشاہ منتخب کرا لیا، جو روس کا حامی تھا یعنی سٹینسلاس پونیا ٹوسکی[1] جو پولینڈ کا ایک امیر تھا اور پہلے ملکہ کا عاشق رہ چکا تھا۔ فریڈرک اعظم بھی ملکہ کیتھرائن کے ساتھ اس مہم میں شریک ہو گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ کیتھولک پولینڈ میں آرتھوڈکس اور لوتھری اقلیتوں کو حقوق دیے جائیں جو بہت مظلوم تھیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ دونوں حکمران اصول رواداری کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، لیکن پولینڈ کی آزادی کے متعلق ان کے دل میں جو عزائم تھے اُن کے لیے اس اصول کو ایک مفید پردہ بھی بنا لیا تھا۔ پولینڈ کے امرا کیتھولک مذہب میں بڑے سخت اور جاگیردارانہ حُبِّ وطن میں بڑے

۱؎ Poniatowski

بے پناہ تھے۔ انھوں نے رواداری کے اصول کی مخالفت کی اور فرانس و آسٹریا سے امداد حاصل کرلی۔ فرانس و آسٹریا نے یہ تدبیر اختیار کی کہ ترکی کو روس سے بھڑا دیا تاکہ کیتھرائن کی توجہ پولینڈ سے ہٹ جائے۔

یہ تدبیر بُری طرح ناکام رہی۔ کیتھرائن نے روس و ترکی کی جنگ (۱۷۶۸ء – ۱۷۷۴ء) میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولینڈ کو سانس لینے کا موقع بھی نہ ملا۔ آزاد مملکت کی حیثیت میں اس کی موت قریب تر آگئی۔ ابھی کیتھرائن نے ترکی سے صلح نہیں کی تھی کہ اس کی کامیابیوں نے فریڈرک کو چونکا دیا، حالانکہ فریڈرک پولینڈ کی سازش میں کیتھرائن کا شریک تھا۔ اب اسے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اس نے اگر جلد کوئی قدم نہ اٹھایا تو روس پولینڈ کا بڑا حصہ لے جائے گا۔ اسے ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ ممکن ہے پولینڈ اور ترکی کے تجزیے پر آسٹریا و روس میں جنگ چھڑ جائے، اس لیے فریڈرک نے کوشش کی کہ پہلے پولینڈ کی تقسیم کا فیصلہ ہوجائے (۱۷۷۲ء)۔ چنانچہ پولینڈ کا ایک تہائی علاقہ اور نصف آبادی اس بین الاقوامی رہزنی میں پروشیا، آسٹریا اور روس کے حوالے ہوگئی، جسے ایک شرمناک فعل سمجھا جاتا ہے۔ اس لوٹ میں سے فریڈرک کو مغربی پروشیا ملا، جو اگرچہ بہت چھوٹا تھا، لیکن موقع و محل کے اعتبار سے بہت اہم تھا، کیونکہ اس میں پولینڈ کی وہ زمینیں آگئی تھیں، جو مشرقی پروشیا کو برینڈن برگ سے جدا کیے ہوئے تھیں۔ ہیپسبرگ ملکہ تھیریسا نے بادل ناخواستہ اپنے ترک اور پولستانی حلیفوں کو چھوڑ دیا۔ تاکہ اس لوٹ میں حصہ دار بن جائے۔ فریڈرک نے طعن آمیز انداز میں کہا کہ ماریا تھیریسا رو رہی تھی، مگر اس نے حصہ نہ چھوڑا۔

۱۷۷۲ء میں جو کچھ ہوا تھا وہ آگے چل کر ایک علامت بن گیا۔ اس تباہی نے امرا پر گہرا اثر ڈالا اور وہ ملک کے جاگیردارانہ اصول کو زیادہ مستحکم کرنے پر آمادہ ہوگئے، حالانکہ یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ یہ اصلاح آئندہ دو تقسیموں (۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء) کو روک نہ سکی جن کے باعث پولینڈ نقشے سے بالکل محو ہوگیا۔

کیتھرائن نے ترکی سے جو پہلی جنگ کی، وہ کوچک کینارجی[1] کے معاہدے پر ختم ہوئی (۱۷۷۴ء)۔ اس سے مشرق قریب کے توازن قوی میں نمایاں تغیر پیدا ہوگیا۔ کیتھرائن نے اس معاہدے کے مطابق وہ ترکی مقبوضات لے لیے جو بحیرۂ اسود کے شمال میں واقع تھے۔ نیز ایک مبہم سا وعدہ حاصل کرلیا کہ جو آرتھوڈکس مسیحی روس میں رہتے ہیں، ان کی حفاظت کی اجازت روس کو ہوگی۔ اس آخری دفعہ نے آگے چل کر روس کے لیے ترکی کے معاملات میں مداخلت کا ایک موزوں عذر بنا دیا۔ اب کیتھرائن کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ پرانی بیزنطینی سلطنت کو روس کے زیر سرپرستی از سرِنو زندہ کردیا جائے۔ اس نے اپنے ایک پوتے کا نام کانسٹنٹائن رکھا اور اسے بالاہتمام تیار کیا کہ بیزنطینی میراث کا حامل بن جائے۔ قسطنطنیہ سے اس کے لیے اتالیق طلب کیے۔ آسٹریا کو اس بڑے منصوبے میں شرکت کی دعوت دی کیونکہ اندیشہ تھا کہ اگر روس نے تنہا عثمانی سلطنت کے انہدام کی کوشش کی تو ہیپسبرگ خاندان کی طرف سے سخت مخالفت ہوگی۔

---

[1] Kutchuk—Kainardgi

۱۷۸۳ء میں کیتھرائن نے جزیرہ نمائے کریمیا پر قبضہ کر لیا، جسے ۱۷۷۴ء میں بظاہر ایک آزاد مملکت بنا دیا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک نئی اہم بندرگاہ اور ایک عظیم الشان مرکز بنایا یعنی سباسٹوپول[ل]۔ ترکوں نے نئی جنگ (۱۷۸۷ء تا ۱۷۹۲ء) میں ان تصرفات کی مخالفت کی۔ اس جنگ میں آسٹریا اور روس ترکوں کے خلاف متحد تھے۔ ان دونوں میں پھر ایک مرتبہ جھگڑا ہو گیا۔ جیسا کہ اٹھارھویں صدی کے عشرۂ چہارم کی جنگ میں ہوا تھا اور ترکی دوبارہ تباہی سے محفوظ رہ گیا۔ آسٹریا نے جنگ ختم ہونے سے پیشتر ہی دستکشی اختیار کر لی۔ اگرچہ کیتھرائن نے بحیرۂ اسود کے ساتھ ساتھ مزید ترکی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن وہ اپنا بڑا منصوبہ پورا نہ کر سکی۔

کیتھرائن نے ترکی اور پولینڈ کے علاقے ہتھیا کر توسیع کی اس پالیسی کو پورا کرنے کا خاصا انتظام کر لیا تھا، جو پیٹر اعظم نے شروع کی تھی، بلکہ کہنا چاہیے، کیتھرائن اپنے مسلک کے اعتبار سے پیٹر کی زیادہ صحیح جانشین تھی۔ اس نے ملک کو مغربی ثقافت کی روشن خیالی کے زیر اثر لانے کا کام برابر جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسی غلطی بھی نہ کی کہ نئے انتظامات کے بہت سے لقمے ایک دم روس کے حلق میں اتار دے۔ اُسے پورا احساس تھا کہ انگریزوں کے مجلسی، عمرانی اور سیاسی ادارے روس میں نہیں لائے جا سکتے، جنھیں فلسفی بہت پسند کرتے تھے۔ کیتھرائن نے مقامی خود اختیاری حکومت میں جو اصلاحات کی تھیں، ان میں سے اکثر پر پیٹر نعرہ ہائے تحسین بلند کرتا، لیکن امراء پر جو نوازشیں کی تھیں، انھیں کبھی پسند نہ کرتا، اگرچہ یہ سب کچھ حالات کی مجبوری کے باعث عمل میں آیا تھا۔ حقیقی روشن خیال مطلق العنان حکمران میں اتنی عقل اور سمجھ ہونی چاہیے تھی کہ کیتھرائن نے تاج اور امراء میں جو اتحاد کیا تھا، اس کے آئندہ بُرے اثرات کا پہلے سے اندازہ کر لیتا۔

آسٹریا: میریا تھیریسا اور جوزف دوم

آسٹریا میں تاج نے امراء کے جاگیردارانہ حقوق پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اس بڑے منصوبے کا ایک جزو تھا جس کا مدعا یہ تھا کہ ہیبسبرگ خاندان کے تمام متفرق علاقوں کو ملا کر ایک سیاسی وحدت بنا دیا جائے۔ اٹھارھویں صدی کے عشرۂ پنجم میں آسٹروی تاج و تخت کی جنگ شروع ہوئی تو اس میں ہیبسبرگ اقتدار کی بنیادی کمزوری عالم آشکارا ہو گئی اور ملکہ میریا تھیریسا (۱۷۴۰ء تا ۱۷۸۰ء) نے فوراً اصلاحات شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں اس نے ان اداروں کو مطمح نظر بنایا جو اس کے مقہور مگر کامیاب حریف فریڈرک والی پروشیا نے اختیار کر رکھے تھے۔ میریا تھیریسا نے محاصل میں اضافہ کر دیا، خصوصاً امراء پر۔ مرکزی حکومت کو مقامی مجلس امراء کے اختیارات گھٹا کر مستحکم کر لیا اور غیر جرمن صوبوں کو مجبور کیا کہ وی آنا کے جرمن افسروں اور جرمن زبان کی برتری قبول کریں۔ میریا تھیریسا نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے قوت بھی استعمال کی اور لوگوں کے دل موہ لینے کی کوشش کی۔ ہنگری کے امراء نے جب دیکھا کہ آسٹروی تاج و تخت کی جنگ میں نازک حالت پیدا ہو گئی

ل Sevastapol

ہے حسین وجمیل اور بہادر ملکہ خود اپنے شیر خوار بچّے کو لے کر مدد مانگنے کے لیے آگئی ہے تو وہ وقتی طور پر جرمن روایات کی مخالفت کو نظر انداز کر گئے۔

ملکہ پوری سلطنت کے لیے گھریلو زندگی کا پہلا نمونہ تھی، ساتھ ہی مملکت کی پہلی خادمہ تھی۔ وہ سولہ بچّوں کی ماں تھی اور اپنے متلوّن شوہر فرانسس سے انتہائی محبت رکھتی تھی۔ فرانسس نے اپنے وصیّت نامے میں داشتاؤں کے لیے بطور میراث جو کچھ لکھ دیا تھا، میریا تھیریسیا نے حرفاً حرفاً اُسے پورا کیا، تاہم وہ روشن خیال مطلق العنان فرمانروا نہ تھی، بلکہ ایک خوش عقیدہ مخلص مسیحیہ تھی اور دورِ عقلیت سے اسے بالطبع کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کیتھرائن ملکۂ روس نے اسے ایسی خاتون قرار دیا تھا، جس کا کام دعا و عبادت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میریا تھیریسیا نے روسو اور والٹیر کی تصانیف اپنی مملکت میں ممنوع قرار دے دیں، بلکہ کیتھولکوں نے ممنوع کتابوں کی جو فہرست شائع کر دی تھی، اس کی اشاعت بھی روک دی، تاکہ کہیں رعایا کے کسی شخص کو وہ فہرست دیکھ کر ممنوع کتابیں دیکھنے کا خیال نہ پیدا ہو جائے۔ ہیپسبرگ خاندان میں سے جوزف دوم روشن خیال مطلق العنانی کا نمائندہ تھا۔ وہ میریا تھیریسیا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں فرانسس نے وفات پائی تو میریا نے بیٹے کو شہنشاہ نامزد کر دیا تھا اور اپنا شریک کار بنا لیا تھا۔ فریڈرک اعظم نے نئے شہنشاہ کی کیفیت والٹیر کو یوں لکھی:

> "وہ ایک متعصّب و تنگ نظر دربار میں پیدا ہوا اور اوہام کی زنجیریں توڑ کر پھینک دیں۔ اس کی تربیت جاہ و جلال میں ہوئی، مگر خود سادہ طریقے اختیار کر لیے۔ تندخوئی میں تربیت پائی، مگر وہ منکسر المزاج ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ عظمت و شان حاصل کرے۔ وہ اپنے عزائم کو بیٹے کی حیثیت میں ماں کے لیے قربان کرتا رہتا ہے اور اپنے فرائض فرزندی بڑے اہتمام سے ادا کرتا ہے۔ اسے صرف نمائش پسند اتالیق ملتے رہے لیکن اس میں اتنا ذوق ہے کہ والٹیر پڑھے اور اس کے محاسن کا صحیح اندازہ کرے۔"[۱]

اس سلسلے میں فریڈرک نے تھوڑا سا مبالغہ کیا۔ جوزف فریڈرک کے فنی ذوق سے بالکل محروم تھا۔ (اس نے شکایت کہ موزارت کے اوپرا میں سر بہت زیادہ ہیں) تاہم وہ عقلیت پسندی کے دَور کا حقیقی شاگرد تھا۔ حد درجہ سرگرم اور محنتی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ فلسفے کو اپنی سلطنت میں قانون سازی کا مبنیٰ بنا لے۔ میریا تھیریسیا اپنی وفات تک (۱۷۸۰ء) جوزف کی مزاحمت کرتی رہی۔ پندرہ سال تک ماں اور بیٹے کے درمیان کش مکش جاری رہی، خصوصاً پادریوں کے خلاف جوزف کے خیالات و رجحان پر۔ ماں سے حد درجہ پیار کرنے والے بیٹے کی حیثیت میں جوزف نے میریا تھیریسیا کی موت کا ماتم کیا لیکن فلسفی کی حیثیت میں وہ بہت خوش ہوا کہ اس کے تسلط سے نجات ملی۔ یہ بے صبر شہنشاہ آسٹریا کا واحد حکمران بنا تو

---

[۱] "والٹیر کی خط و کتابت بادشاہوں سے"۔

سرگرمیوں میں غرق ہو گیا۔ دہ سالہ حکومت (۱۷۸۰ء-۱۷۹۰ء) میں اس نے گیارہ ہزار قوانین اور چھ ہزار شاہی فرمان ویانا سے جاری کیے۔

جوزف نے اپنی ماں کی مذہبی پالیسی بالکل اُلٹ دی۔ اپنے ولندیزی طبیب کو لکھا کہ آئندہ تعصب و تنگ نظری میری مملکت میں صرف اس حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے کہ مجھے ان سے انتہائی نفرت ہے۔ کیلون اور لوتھر کے پیرووں لیکن آرتھوڈکس مسیحیوں کے لیے کیتھولک آسٹریا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پوری رواداری کا اہتمام ہوا۔ شہنشاہ نے یہودیوں کے لیے جداگانہ آبادی کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بھی تدبیریں کیں اور یہ فیاضی ہیپسبرگ خاندان کے مذاکرات میں بالکل بے مثال تھی۔ اس نے یہودیوں کو خاص محاصل ادا کرنے سے نجات دے دی اور یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ آئندہ وہ زرد رنگ کی پٹی نہ باندھیں، جو نشان کمتری کے طور پر اس کے لیے تجویز کی گئی تھی۔

جوزف کیتھولک کلیسا کو سلطنت کے زیر اثر لے آیا۔ اپنے آپ کو آسٹریا کی کلیسائی سرگرمیوں میں پوپ سے بھی بڑا آمر بنا لیا۔ کیتھولک مذہب میں جو کچھ عمرانی اعتبار سے مفید تھا، اس کی پوری حوصلہ افزائی کی، لیکن جو کچھ نقصان رساں تھا، اسے سختی سے روک دیا۔ اس نے سینکڑوں گرجے قائم کر دیے۔ ساتھ ہی مذہبی تعطیلات کم کر دیں۔ رہبانیت کے خلاف شہنشاہ نے بار بار سختی سے نکتہ چینی کی۔ وہ کہتا تھا کہ راہب نہایت خطرناک ہیں اور ہر مملکت میں یہ بے کار لوگ ہیں۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ راہبوں کو مفید شہری بنا کر رہے گا۔ چنانچہ راہبوں اور راہباؤں کی تعداد گھٹا کر نصف کر دی۔ آسٹریا میں دو ہزار ایک سو خانقاہیں راہبوں اور راہباؤں کے لیے موجود تھیں، ان میں سے سات سو توڑ دیں۔ زیادہ تر خانقاہیں وہ تھیں، جن میں صرف گیان دھیان ہوتا تھا۔ جن خانقاہوں کے ذریعے سے تعلیمی یا خیراتی کام ہوتا تھا، انھیں بالکل نہ چھیڑا گیا۔ جو خانقاہیں توڑ دی گئی تھیں، ان کی زمینیں حکومت نے فروخت کر دیں یا ٹھیکے پر دے دیں۔ اس طرح جو روپیہ وصول ہوا، وہ ہسپتالوں کی امداد پر صرف کیا گیا، جن کی بدولت آسٹریا کو یورپ میں طبابت کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

فریڈرک اور کیتھرائن کے برعکس جوزف مجلسی مساوات اور تعلیم عام کا معتقد تھا۔ اس کی حکومت نے پرائمری سکولوں کے لیے معلموں اور نصاب کا انتظام کیا۔ سکول جانے کے قابل بچوں میں سے کم از کم ایک چوتھائی ضرور پڑھتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں یورپ کے اندر یہ بہترین ریکارڈ تھا۔ پریٹر[ط] ویانا میں بہترین باغِ عامہ ہے۔ اس میں شہر کے چھوٹے بڑے اعلیٰ اور ادنیٰ کو دعوت دی گئی۔ دروازے پر یہ عبارت مرقوم تھی: یہ تفریح کی جگہ ہے، جو تمام آدمیوں کے لیے ان کے دوست نے مہیا کی۔ امراء میں سے ایک خاتون نے یہ غلطی کی کہ اپنے بیٹے کے لیے فوج میں کمیشن حاصل کرنے کی خاطر جوزف سے امداد طلب کی۔ شہنشاہ نے جو سخت جواب دیا، وہ اس کے عمرانی و مجلسی نقطۂ نگاہ کا اچھا آئینہ دار ہے۔ اس نے لکھا:

"مادام! میں نہیں سمجھتا کہ بادشاہ پر اپنی رعایا میں سے کسی کو صرف اس بنا پر

ط Pratar

ملازمت دینا لازم ہے کہ وہ پیدائشی امیر ہے ...... کیا آپ نے یہ نہیں کہا کہ آپ کا متوفّی شوہر بڑا قابل سپہ سالار تھا۔ اسے سالاری میں اونچا درجہ حاصل تھا۔ اور اس کا تعلق ممتاز گھرانے سے تھا۔ نیز آپ کے خاندان کے لیے میرے فیّاضانہ رجحانات کے باعث آپ سمجھ رہی ہیں کہ آپ کے دوسرے بیٹے کے لیے فوج میں عہدہ مل جائے گا، جو ابھی سیر وسیاحت سے واپس آیا ہے؟

مادام! ممکن ہے کوئی شخص صرف سالار کا بیٹا ہونے کے اعتبار سے افسر بن جائے، اگرچہ اس میں افسری کا کوئی وصف موجود نہ ہو۔ ممکن ہے کوئی شخص اچھے خاندان کا ہو، مگر استحقاق کے بغیر اونچا عہدہ حاصل کرلے، لیکن کوئی امیر محض پیدائش کے اتفاق کی بناء پر عہدہ نہیں لے سکتا۔

مَیں آپ کے بیٹے کو جانتا ہوں اور ایک افسر کے ضروری اوصاف سے بھی آگاہ ہوں۔ اس علم کی بناء پر مجھے یقین ہے کہ آپ کے بیٹے میں فوجی بننے کی کوئی خصوصیّت نہیں اور وہ اپنے خاندان کی بلندی کے فخر وغرور میں اتنا منہمک ہے کہ مَیں اس سے کسی ایسی خدمت کا متوقّع نہیں ہوسکتا، جو کسی دن ملک کے لیے باعثِ فخر بن سکے۔

مادام! مجھے آپ پر اس لیے افسوس ہے کہ آپ کا بیٹا نہ فوج میں افسر بننے کے لائق ہے، نہ مدبّر بن سکتا ہے اور نہ پادری۔ غرض وہ کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ البتّہ امیر ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ صمیمِ قلب سے امیر ہے۔

آپ اپنی خوش نصیبی کا شکریہ ادا کیجیے کہ آپ کا بیٹا ہر قابلیت سے محروم ہُوا، لیکن آپ کو خاصی بڑی جاگیر ملی ہوئی ہے، جو اس کی ضرورتوں کی تلافی کرسکتی ہے۔ اس حالت میں میری خدمت انجام دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔[1]

جوزف نے ہتک آمیز الفاظ پر قناعت نہ کی بلکہ اس باب میں ایک قانون بھی نافذ کردیا۔ آسٹریا میں جو نیا مجموعۂ قوانین مرتّب ہُوا تھا، اس میں لکھا گیا کہ اصول کی پیروی کرتے ہُوئے موت کی سزا کے علاوہ زیادہ تر تعذیبات منسوخ کردی گئیں اور قانون کی نگاہ میں سب کو مساوات کا درجہ دے دیا گیا۔ اگر امراء سے بھی کوئی جرم سرزد ہوتا تو انھیں بھی عوام کی طرح شکنجے میں کسا جانے کی سزا دی جاتی اور ان سے وی آنا کے بازاروں میں جھاڑو دلائی جاتی۔ کسانوں کے متعلّق جوزف نے جو پالیسی اختیار کی، وہ اس کی مساوات پسندی کا سدرۃ المنتہیٰ تھی۔ اس نے زرعی غلاموں کو آزاد کردیا۔ مالکانِ اراضی کی طرف سے ان کے ذمّے

---

[1] Pamphleteer ص ۲۸۶ - ۲۸۷۔

جو واجبات تھے، ان میں سے اکثر منسوخ کر دیے۔ مالکانِ اراضی سے ازمنۂ وسطیٰ کا یہ حق چھین لیا کہ اپنے کسانوں کے مقدمات کی خود سماعت کریں۔

جوزف کی اقتصادی پالیسی میں حامیانِ مسلکِ فطرت کے نئے اصول اور تجارتی نظریۂ زر کے پرانے معمولات، دونوں چیزیں شامل تھیں۔ اس نے درآمد پر بھاری محصول عائد کر دیے اور کوئیسنے کی سفارش کے مطابق اراضی پر ایک ہی محصول وصول کرنے کا تجربہ کیا۔ سیاسیات میں وہ اپنی والدہ کے پروگرام پر عمل پیرا رہا، جس کا مدعا یہ تھا کہ پوری رعایا کو جرمن بنا دے۔ وہ عموماً جرمن میں بات چیت کرتے، جرمن مصنفوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا اور وی آنا میں فرانسیسی ڈراموں کا جو تھیئٹر تھا، اسے جرمن زبان کا تھیئٹر بنا دیا۔ بوہیمیا، بلجیم اور ہنگری کے خود اختیاری حقوق اس نے پامال کر دیے۔ جب ہنگری کے امراء نے غصّے میں احتجاج کیا تو وہ بالکل ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس نے کہا:

"جرمن میری سلطنت کی عام زبان ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کسی ایک صوبے میں قانون کے مطابق عمل یا معاملاتِ عامہ کا انتظام خود اس کی زبان میں ہو۔ میں جرمن سلطنت کا شہنشاہ ہوں اور جتنی مملکتیں میرے قبضے میں ہیں، ان کی حیثیت صوبوں کی ہے، جو مل کر ایک سلطنت بنتے ہیں اور میں اس کا رئیس ہوں۔ اگر ہنگری کی بادشاہی سب سے بڑھ کر اہم ہوتی اور میرے مقبوضات میں اسے اوّلیں مقام حاصل ہوتا تو میں اسی کی زبان کو پورے مقبوضات کی خاص زبان بنا لیتا، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔"[1]

جوزف کی اصلاحات نے مخالفت کا جو جوش پیدا کر دیا تھا، اس کے ازالے کے لیے تیز الفاظ لکھ دینے سے کچھ زیادہ سعی و کوشش درکار تھی۔ جاں نثار کسان اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ شہنشاہ ان کے مجلسی و اقتصادی درجے میں اصلاح کے لیے نیک نیتی سے کوشاں ہے، مگر وہ قدیم مذہبی مراسم میں مداخلت سے بہت ناراض تھے۔ اس نے مساوات کے لیے جو قانون بنائے تھے، امراء ان کے خلاف شور مچا رہے تھے۔ اراضی پر ایک محصول کے تجربے کی مخالفت اس شدت سے ہوئی کہ جوزف کو ایک مہینے کے بعد اپنا جاری کردہ فرمان منسوخ کرنا پڑا۔ اس نے مرکزیت پیدا کرنے کے لیے جتنی کوششیں کیں، ان سے ہنگری اور بلجیم میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اس وجہ سے وہ مجبور ہوا کہ ان کے خود اختیاری حقوق کی از سرِ نو تصدیق کر دے۔

خارجہ پالیسی میں بھی اس کی بڑی بڑی تجویزیں، جو یقیناً روشن خیالی پر مبنی نہ تھیں، اُلٹا اثر پیدا کرنے کا باعث ہوئیں۔ اس نے سلطنت ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر لینے کے سلسلے میں ملکۂ کیتھرائن کے بڑے منصوبے میں شرکت کر لی۔ بعد ازاں اٹھارھویں صدی کے نویں عشرے میں ترکی کے ساتھ جنگ ہو گئی۔ اس سلسلے میں آسٹریا کو بلقان میں سے ایک چھوٹا سا خطّہ ملا

---

[1] پیلیٹیئر XIX ص ۲۸۲

اور جوزف نے اس اثنا میں جنوبی جرمن ریاست بویریا کے اہم علاقوں کو ملحق کر لینے کی کوشش کی۔ وہاں کا حکمران خاندان ختم ہو چکا تھا اور جانشینی کے لیے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے، جو اٹھارھویں صدی میں عموماً پیدا ہوتے رہے۔ دونوں موقعوں پر فریڈرک اعظم کی طرف سے جوزف کی مزاحمت ہوئی، کیونکہ فریڈرک جرمنی میں ہیپسبرگ کی پیش قدمی روکنے کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔ آٹھویں عشرے میں آسٹریا اور پروشیا کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں فوجوں نے زیادہ تر وقت خوراک مہیا کرنے میں صرف کیا۔ اس سلسلے میں جوزف کو بویریا کی میراث میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملا۔ ۱۷۸۵ء میں اس نے پورے بویریا کو لے لینے کی کوشش کی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ جو شخص بویریا کا وارث بنا ہے، وہ آسٹری نیدرلینڈز لے لے۔ فریڈرک نے اس مبادلے کی مخالفت کے لیے جرمنی کے تمام حاکموں کی ایک جمعیت مرتب کر لی۔ یہ زندگی میں اس کی آخری ڈپلومیٹک فتح تھی۔

جوزف کے ایک دوست نے خوب کہا کہ وہ حکمرانی پر بہت زیادہ توجہ کرتا رہا اور نظم و نسق کی درستی پر کم توجہ کی۔ شہنشاہ نے حکومت کے تمام معاملات میں شخصی مداخلت کی عادت کو یوں حق بجانب ثابت کیا:

> "جو ملک ذہن و فہم، روح، جوش اور خلوص سے محروم ہے، اس میں میرے لیے چارۂ کار کیا ہے؟ میں اپنی جان مار رہا ہوں، کیونکہ جن لوگوں سے کام لینا چاہتا ہوں، ان میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن مجھے امید ہے کہ میں اس وقت تک نہیں مروں گا، جب تک مشین کو اس پیمانے پر درست نہ کر دوں کہ دوسرے اس میں خلل ڈال سکیں، اگرچہ وہ اس کے لیے کتنی ہی کوششیں کریں۔"[1]

جوزف مشین کو ٹھیک ٹھیک درست نہ کر سکا۔ وہ آسٹریا کی غیر روشن خیال دفتری حکومت میں پروشیائی ضبط و نظم پیدا نہ کر سکا، جو عام انسانی کوششوں سے بالا تھا اور اسی کی آسٹریا کو ضرورت تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ دی آنا کو دوسرا برلین نہ بنا سکا۔

جوزف نے اس حالت میں وفات پائی کہ اسے یقین کامل تھا، وہ صحیح راستے پر گامزن رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اس پر واضح تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکا۔ آنے والی نسل نے صورتِ حال منقلب کر دی۔ اب واضح ہو چکا تھا کہ جوزف واقعی سچا مطلق العنان حکمران تھا۔ اس نے دس سال میں اتنا کام کیا کہ فریڈرک یا کیتھرائن اس سے تگنے وقت میں بھی نہ کر سکے۔ اگرچہ اس کی بعض بڑی اصلاحات ——— مثلاً زرعی غلامی کی تنسیخ ——— اس کی وفات کے بعد منسوخ کر دی گئیں، مگر دوسری اصلاحات قائم رہیں اور ان کی وجہ سے ہیپسبرگ کی سلطنت دورِ حاضر کی مرکزیت مآب مملکت بن گئی، تاہم جوزف ثانی کے آسٹریا کو ایک ایسے لائحۂ عمل سے سابقہ پڑا، جو روشن خیالی میں بھی انتہا پسندانہ تھا اور اس کے طور طریقے بھی حد درجہ جابرانہ اور مطلق العنان تھے۔

---

[1] پرنس لگنی Ligni کے تذکار، خطوط اور متفرق کاغذات جلد دوم ص ۱۳۲۔

سویڈن اور ہسپانیہ کم درجے کے روشن خیال حکمرانوں میں سویڈن کے گستاوس سوم اور ہسپانیہ کے چارلس سوم کی حیثیت بلند تھی۔ دونوں نے اپنے ملکوں کو بے حیثیتی کے طویل سالوں سے عارضی طور پر نکالنے کی کوشش کی۔

گستاوس سوم (۱۷۷۱ء۔۱۷۹۲ء) اس صدی کا حد درجہ نمائشی اور ڈرامائی بادشاہ تھا۔ اس نے سویڈن کی مختلف پارٹی کے لیڈروں کو ایک شام اوپیرا میں مصروف رکھا اور اس کے سپاہیوں نے ہمت کرکے ایسے اقدامات کیے، جن کی وجہ سے شاہی اقتدار کے بعض ختم شدہ حقوق از سرِ نو زندہ ہو گئے اور اس نے ہیٹ اور کلاہ کے زبردست فریقوں کو درہم برہم کر ڈالا۔ اس طرح کامیاب گستاوس نے پارٹیوں کی وہ کش مکش ختم کر دی، جس نے سویڈن کی خارجہ پالیسی برباد کر دی تھی اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس طرح سویڈن سکنڈے نیویا کا پولینڈ بن جائے گا۔ اس نے پیرس کے سیلونوں سے حاصل کیے ہوئے افکار میں تربیت پائی تھی۔ چنانچہ وہ بڑی پُر زور تقریروں میں اپنے آپ کو دورِ عقلیت کا فدائی قرار دیتا رہا۔ اقتصادیات اور مذہب میں اس کی روشن خیالی اس کے چچا فریڈرک اعظم سے بھی آگے نکل گئی۔ اس نے عدم مداخلت کی پالیسی پر اس حد تک عمل کیا کہ اندرونی اور بیرونی تجارت کے راستے کی تمام مشکلات ختم کر دیں۔ یہودیوں کے لیے نیز مختلف مسیحی فرقوں کے لیے رواداری کا برتاؤ کیا۔ ان کامیابیوں سے گستاوس سوم کا سر پھر گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ مطلق العنان ہو گیا، تو امراء نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے گم شدہ اختیارات واپس لے کر رہیں گے۔ سٹاک ہالم میں نقاب پوشی کی ایک تقریب ہوئی (۱۷۹۲ء) اس میں گستاوس مارا گیا اور سویڈن میں روشن خیال مطلق العنانی کی جو شمع تھوڑی دیر کے لیے روشن ہوئی تھی، وہ جھلملا کر گُل ہو گئی۔

چارلس سوم (۱۷۵۹ء۔۱۷۸۸ء) الیزبتھ فارنیس کا بیٹی "کارلوس" تھا۔ اسے ہسپانوی تاج بڑے بھائی کی وفات کے بعد ملا۔ وہ حد درجہ بے تکلف بادشاہ تھا اور بہ ظاہر اس سے بادشاہی کی کوئی خصوصیت نظر نہ آتی تھی، لیکن مدت تک شاہ نیپلز کی حیثیت میں وہ جاگیرداروں اور پادریوں کی قدامت پسندی کے خلاف جدوجہد میں خاصا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ ہسپانیہ میں چارلس سوم نے بڑی سرگرمی سے وہ ترقی پذیر مسلک از سرِ نو زندہ کر دیا، جس کی ابتدا اس کے باپ فلپ چہارم نے کی تھی۔ اگرچہ وہ خود مخلص کیتھولک تھا، مگر کلیسا کے سیاسی اثر پر اس نے سخت اعتراض کیا اور یسوعیوں کو بانی کے وطن سے خارج کر دیا[1]۔ نیز اس نے تاج کا اقتدار مستحکم کر لیا اور امراء کے اختیارات گھٹا دیے۔ جو لوگ بھیڑوں کے بڑے بڑے گلوں کے مالک تھے اور انھیں چرائی کے وسیع حقوق حاصل تھے، جن کی وجہ سے ہسپانیہ کی زراعت کو سخت نقصان پہنچا اور غریب کسان قابلِ کاشت اراضی سے محروم ہو گئے۔ چارلس نے ان کے حقوق پر پابندیاں عائد کر دیں۔ پھر زمینوں کی درستی اور آبیاری کے منصوبے شروع کر دیے گئے۔ نئی سڑکیں اور نہریں بنیں۔ بینک قائم ہوئے۔ سوتی پارچے کے کارخانے بن گئے، جن سے ہسپانیہ کی نیم خوابیدہ اقتصادیات میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے۔ ان سرگرمیوں سے حیرت انگیز نتیجے نکلے۔ ہسپانیہ کی تجارت چارلس

---

[1] یسوعی فرقے کا بانی اگنیٹس لویولا Ignatius Loyola تھا (۱۴۹۱ء۔۱۵۵۶ء)۔ یہ ہسپانوی تھا، اس لیے ہسپانیہ کو بانی کا وطن کہا گیا۔

کے عہدِ حکومت میں پانچ گنا بڑھ گئی۔ بدقسمتی سے چارلس سوم کے جانشینوں نے دُور اندیشی کا یہ مسلک ترک کر دیا۔

روشن خیال مطلق العنانی کی حد بندیاں

مطلق العنان حکمرانی کے پورے نظام میں سب سے بڑا نقص جانشینی کے مسئلے نے پیدا کیا۔ پروشیا میں فریڈرک اعظم کی میراث اس کے بھتیجے فریڈرک ولیم دوم (۱۷۸۶ء تا ۱۷۸۹ء) نے سنبھالی، جو سراسر بیوقوف شہنشاہ تھا۔ روس میں کیتھرائن کا بیٹا پال اوّل (۱۷۹۶ء تا ۱۸۰۱ء) بادشاہ بنا۔ اس نے ماں کے تدبّر کا تو کوئی اظہار نہ کیا، البتّہ پیٹر سوم کی ضد ہر موقع پر اس سے نمایاں ہوتی رہی۔ گستاوس سوم کے قتل کے بعد سویڈن میں پھر چند افراد برسرِ اقتدار آ گئے اور انھوں نے اپنا کمزور طریقِ عمل جاری رکھا۔ صرف آسٹریا کو اس سلسلے میں مستثنےٰ حیثیّت حاصل رہی۔ وہاں پھر ایک روشن خیال حکمران برسرِ کار آ گیا یعنی لیوپولڈ دوم (۱۷۹۰ء تا ۱۷۹۲ء)۔ وہ ٹسکنی میں طویل مدت تک حکمرانی کی تربیّت حاصل کر چکا تھا اور اس نے اپنے بھائی جوزف دوم کی بعض اصلاحات ازسرِنو نافذ کیں۔

اگرچہ نہایت معمولی روشن خیال بادشاہوں نے بھی نظامِ قدیم کے بعض قبیح خط و خال کی اصلاح کر دی، لیکن ان میں سے بہترین بھی روشن خیالی اور مطلق العنانی کے درمیان ناخوش گوار توازن پیدا نہ کر سکے۔ جوزف دوم اصول پرست تھا اور اس کا عزم حد درجہ متزلزل تھا، اس لیے وہ دورِ عقلیت کے پورے اصلاحی پروگرام میں کام نہ لے سکا، اس کے برعکس کیتھرائن اور فریڈرک پر یہ خواہش غالب رہی کہ تاج کا اقتدار زیادہ سے زیادہ مستحکم کر لیں، گو امراء اور جنکروں پر حد سے بڑھ کر بھروسا کرتے رہے۔ اس طرح ان عناصر کے اقتدار نے قدم جما لیے، جو روشن خیالی کے دشمن تھے۔

دسواں باب

جارج سوم اور امریکی انقلاب

جارج سوم

جارج سوم شاہ انگلستان (۱۷۶۰ء۔۱۸۲۰ء) کا سوداوی کردار روشن خیال مطلق العنانی کے خطرات کی مزید شہادت مہیا کرتا ہے۔ ہینوور خاندان کا یہ پہلا بادشاہ تھا، جو انگلستان میں پیدا ہوا اور وہیں تربیت پائی۔ وہ اس کند ذہن خاندان میں پہلا شخص تھا، جس نے اپنی مملکت کے معاملات سے حقیقی دلچسپی لی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ شاہی اختیارات میں سے جتنے اختیارات پہلے دو جارجوں کے زمانے میں چھن چکے تھے، انھیں بحال کرے۔ اس نے ایسی پالیسی اختیار کرنے کی کوشش کی، جسے تھوڑے سے مبالغے کے ساتھ روشن خیال مطلق العنانی کی ایک حد درجہ ترمیم شدہ شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ جارج کو عموماً کسان جارج کہتے تھے۔ اس کی حقیقی روشن خیالی کا دائرہ اس سے زیادہ وسیع نہ تھا کہ وہ آرتھر ینگ کی "سرگزشت زراعت"[1] کے لیے شلجموں کی کاشت پر مقالے لکھا کرتا تھا۔ یقیناً وہ مستبد نہ تھا، لیکن اس نے دارالعوام کا ضبط و نظم وگ پارٹی کی مختصر جماعت سے چھین لینے کی کوشش کی، جو مدت سے مسلط چلی آرہی تھی اور یہ ضبط و نظم وگ پارٹی ہی کی تدبیروں سے کام لے کر اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کی؛ جہاں ضرورت سمجھی، کسی کی سرپرستی اختیار کرلی اور جہاں کوئی اور تدبیر کارگر نہ ہوئی، وہاں رشوت دے دی۔ گویا اس نے وگ پارٹی کو خود اسی کے حربوں سے کام لے کر شکست دینے کی کوشش کی۔

وہ شخصاً نیک تھا۔ خاندان سے اسے بڑی محبت تھی۔ بادشاہ ہونے کے لحاظ سے وہ ضدی اور تنگ نظر تھا، اس لیے آخر میں ناکام رہا۔ ابتداءً اسے وگ پارٹی کے داخلی اختلافات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ۱۷۶۱ء میں اس نے پٹ کو باہر نکال دیا۔ اپنے دوست اور اتالیق لارڈ بیوٹ[2] کو کابینہ کا رئیس بنا دیا۔ بیوٹ اور جارج معاہدۂ پیرس میں فرانس کو جزائر غرب الہند کے ان علاقوں سے محروم کر دینے میں ناکام رہے، جہاں گنّا بہ کثرت پیدا ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان علاقوں کو کھانڈ کے مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس ناکامی کے لیے وہ کوئی وجہ جواز پیش نہ کرسکے۔ دارالعوام نے معاہدے کی تصدیق کردی لیکن ۱۷۶۳ء میں بیوٹ کو برطرف کردیا، تاکہ برطانوی ڈپلومیسی کے نکتہ چینوں کی زبان بند کی جاسکے۔

سخت ترین نکتہ چینی جان ولکس[3] نے کی، جو دارالعوام کا رکن تھا۔ اس نے معاہدۂ پیرس کو معاہدۂ خدا قرار دیا، کیونکہ

۱؎ Anials of Agriculture ۲؎ Bute ۳؎ Wilkes

وہ فہم سے بالاتر تھا۔ یہ نکتہ چینی وِرکس نے اپنے اخبار "نارتھ[1] برٹن" میں کی تھی۔ بادشاہ کو اس پر سخت غصّہ آیا۔ دارالعوام نے بادشاہ کے غصّے کا احترام کرتے ہُوئے "نارتھ برٹن" کی وہ اشاعت نذرِ آتش کر دی، جس میں یہ نکتہ چینی شائع ہوئی تھی۔ وِرکس پہلے بھاگ کر فرانس چلا گیا، پھر تین مختلف اوقات میں پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہُوا۔ دارالعوام نے بادشاہ کے دباؤ کے تحت تینوں مرتبہ اس کا انتخاب منسوخ قرار دے دیا۔ ۱۷۷۴ء میں وِرکس پارلیمنٹ کے اندر پہنچا تو وہ عوام کے نزدیک ہیرو بن گیا۔ وِرکس اور آزادی مترادف سمجھے جانے لگے۔ اگر بادشاہ دانشمند ہوتا تو پہلو بچا جاتا، مگر جارج سوم نے وِرکس کے معاملے کو ٹھنڈا نہ پڑنے دیا اور اس کا یہ عزم کمزور نہ ہُوا کہ پارلیمنٹ اور کابینہ دونوں کو درست کرے۔ سات سال تک (۱۷۶۳ء۔ ۱۷۷۰ء) تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے ناستوار وزارتیں قائم ہوتی رہیں۔ آخر جارج نے بیوٹ کی جگہ لارڈ نارتھ کو اپنا پرانا کام سونپا۔ نارتھ کی وزارت کے زمانے میں (۱۷۷۰ء۔ ۱۷۸۲ء) شاہی لعنتوں کا مرجع وہ رہا۔ باہر بادشاہ شمالی امریکہ کی تیرہ نوآبادیوں سے محروم ہُوا اور وطن میں اس نے نادانستہ پارلیمنٹ کا اقتدار بڑھنے کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

انقلاب کا پس منظر امریکہ کے اعلانِ آزادی میں کہا گیا تھا:

"برطانیۂ عظمیٰ کے موجودہ بادشاہ کی تاریخ بار بار زخم لگانے، نقصان پہنچانے اور غصب کرنے کی تاریخ ہے۔ اس کی ہر تدبیر کا واضح مقصد یہ ہے کہ ان ریاستوں پر کامل استبدادی حکومت قائم کرے۔"

اعلان میں مبالغے سے کام لیا گیا۔ جارج سوم نے اٹھارھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں امریکیوں کو مراعات دینے سے انکار کر دیا اور وہ قوت کے استعمال پر تُل گیا، لیکن یہ امور برطانیہ اور نوآبادیوں کے درمیان بڑھتے ہُوئے اختلاف کے آخری واقعات میں سے ہیں۔ اختلاف نے پہلے "ہفت سالہ جنگ" کے بعد نازک صورت اختیار کی تھی، جب برطانیہ نے خوشگوار تغافل کی پرانی پالیسی میں ترمیم کا آغاز کیا۔ ۱۷۶۳ء تک نوآبادیاں اپنے معاملات کا انتظام خود کرنے کی عادی چلی آتی تھیں، اگرچہ ان کی مجلسوں کے قوانین گورنروں یا بادشاہ کی منظوری کے تابع تھے۔ جو وسیع علاقے برطانیہ نے ۱۷۶۳ء میں کینیڈا کے اندر اور ایلیگھینیز[2] کے مغرب میں حاصل کیے تھے، ان سے وسیع پیمانے پر فائدہ اٹھانے کے مزید مواقع میسّر آ گئے اور حکومت و دفاع کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہُوا۔ ۱۷۶۳ء میں مقامی باشندوں نے پونٹیاک[3] کی سرکردگی میں بغاوت کی اور وادی اوہیو نیز بڑی جھیلوں کے علاقے میں تقریباً ہر سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا یا اس کے لیے خطرہ پیدا کر دیا۔ نوآبادیوں کی ملیشیا کوئی متحدہ اور مؤثر اقدام نہ کر سکی، لہٰذا پونٹیاک کو دبانے کے لیے باقاعدہ برطانوی فوج بلائی گئی۔ مقامی باشندوں کی طرف سے خطرہ جاری رہا، اس لیے اکتوبر ۱۷۶۳ء میں ایک شاہی فرمان جاری ہُوا، جس میں بادشاہ نے اپنی محبوب رعایا کو اس خطّے کے مغرب میں آباد ہونے کی ممانعت کر دی، جو ایلیگھینیز کی چوٹی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ نوآبادیوں کی محبوب رعایا کے

۱۔ North ۲۔ Alleghenies یہ ایک سلسلۂ کوہستان ہے۔ ۳۔ Pontiac Briton

نزدیک بادشاہ کے اس اعلان کا مقصد یہ تھا کہ مغرب میں تجارت کے جو نفع بخش ممکنات نظر آتے تھے، ان سے محروم رکھا جائے۔

نوآبادیوں کے باشندوں کو پارلیمنٹ کی اس کوشش پر سخت رنج تھا کہ شمالی امریکہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جائے۔ حکومت برطانیہ کے نزدیک نوآبادیوں کے محاصل میں اضافے کے قوی وجوہ موجود تھے۔ قومی قرضہ ہفت سالہ جنگ میں تقریباً دُگنا ہو گیا تھا، نوآبادیاں سپاہی دینے یا محاصل بڑھانے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اس وجہ سے جنگ کا خرچ برطانوی باشندوں پر بہت بڑھ گیا تھا۔ برطانیہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے مسلسل مصارف پر مجبور تھا۔ یقیناً اہلِ امریکہ بڑھے ہوئے محاصل کی معقولیت کا اعتراف کر سکتے تھے۔

مگر وہ اس اعتراف کے لیے تیار نہ تھے۔ محاصل بڑھانے کے لیے پہلے پہل ۱۷۶۴ء میں قانونِ شکر منظور ہوا۔ مشرقی ساحلی علاقے کے تاجروں کو اس قانون نے چونکا دیا۔ کیونکہ چنگی وصول کرنے والے افسر شیرہ، رب، کھانڈ اور دوسری درآمدی جنسوں پر محصول وصول کرنے کے لیے تُلے بیٹھے تھے اور جو ناجائز مال درآمد کرتے تھے ان کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے مستعد تھے۔ اس طرح اس پرانی پالیسی سے انحراف ہُوا، جس میں خوشگوار تغافل کے ذریعے سے نوآبادیوں کو خاصی سہولتیں ملی ہوئی تھیں۔ نوآبادیوں کے اقتصادی حالات کے لیے ایک خطرہ یہ پیدا ہُوا کہ درآمدی محاصل نوآبادیوں ہی کے محدود سکّوں کی شکل میں ادا ہونے ضروری تھے۔ پھر پارلیمنٹ نے ۱۷۶۵ء میں اشٹام کا قانون منظور کیا، جس کی رُو سے جنسوں کی متعدّد اقسام پر محصول عائد کر دیے گئے۔ ان میں عدالتی اور تجارتی کاغذات، شراب کے لائسنس، تاش، شطرنج، اخبارات، کیلنڈر اور علمی ڈگریاں بھی شامل تھیں۔ ان محاصل کی وجہ سے بھی نوآبادیوں کے نقد روپے پر بوجھ پڑتا تھا اور ان کے پاس نقد روپیہ اتنا کم تھا کہ بعض تاجر دیوالیے کی نوبت پر پہنچے ہُوئے نظر آتے تھے۔

رقمیں وصول کرنے کی یہ تدبیریں بڑے تنازع کا باعث بن گئیں۔ نئی دنیا کے غضب آلود تاجروں نے محاصل ادا کرنے کے بجائے درآمد روک دی۔ اکتوبر ۱۷۶۵ء میں تیرہ نوآبادیوں میں سے نو کے نمائندے نیویارک شہر میں جمع ہُوئے۔ اس اجتماع کو "اشٹام کی کانگرس"[1] قرار دیا گیا۔ کانگرس نے یہ شکایت کی کہ نئے محاصل کے ذریعے سے آبادکاروں کے حقوق اور واجبات کو پسِ پشت ڈالنے کا بدیہی رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا:

> "ان آبادیوں میں ملک معظم کی وفادار رعایا ان طبعی حقوق و واجبات سے استفادے کی حقدار ہے، جو مملکت برطانیۂ عظمیٰ کی رعایا کو حاصل ہیں۔
>
> لوگوں کی آزادی کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے اور ہر انگریز کا قطعی حق ہے کہ اس

---

[1] Stamp Act Congress یعنی وہ مجلس، جو اشٹام کے قانون پر بحث کے لیے بلائی گئی۔

پر رضامندی کے بغیر کوئی محصول عائد نہ کیا جائے اور رضامندی شخصاً حاصل کی جائے یا نمائندوں کے ذریعے سے۔

ان نوآبادیوں کے باشندے برطانیۂ عظمیٰ کے دارالعوام میں نہ نمائندے بھیجتے ہیں اور نہ مقامی حالات کے پیشِ نظر بھیج سکتے ہیں۔

ان آبادکاروں کے نمائندے صرف وہی لوگ ہیں، جنھیں وہ خود چُنتے ہیں اور ان پر کوئی محصول عائد نہیں ہوا اور آئینی اعتبار سے عائد نہیں ہو سکتا، مگر وہ جو اُن کے نمائندوں کے اتفاق سے منظور ہوا۔"[1]

اس طرح اشٹام کی کانگرس نے یہ اصول پیش کر دیا کہ نمائندگی کے بغیر کوئی محصول وصول نہیں کیا جا سکتا۔ برطانیہ نے خاص اس مسئلے میں آبادکاروں کا مطالبہ قبول کر لیا، مگر اصول نہ چھوڑا۔ امریکیوں نے برطانوی مال کا مقاطعہ کر دیا تھا۔ اس وجہ سے لندن کے تاجر تباہی کے قریب پہنچ گئے۔ ان کی التجاؤں پر اشٹام کا قانون ۱۷۶۵ء میں منسوخ کر دیا گیا، تاہم آئندہ سال پارلیمنٹ نے ایک توضیحی[2] قانون منظور کیا، جس میں کہا گیا:

"امریکہ کی نوآبادیاں اور مزرعے ہمیشہ سے برطانوی تاج اور برطانیۂ عظمیٰ کی پارلیمنٹ کے تابع چلے آتے ہیں، تابع ہیں اور از روئے استحقاق تابع رہنے چاہئیں اور ملک معظم کو روحانی و دینی اُمراء اور برطانیۂ عظمیٰ کے عوام (جو پارلیمنٹ میں شامل ہیں) کی رضامندی اور مشورے سے پورا حق اور اختیار حاصل تھا، حاصل ہے اور از روئے استحقاق حاصل رہنا چاہیے کہ ایسے زبردست اور قوی قوانین وضوابط بنائے، جن کے مطابق نوآبادیاں اور باشندگانِ امریکہ تمام معاملات میں برطانیۂ عظمیٰ کے تاج کی تابعیت میں رہیں۔"[3]

آئندہ دس سال کے لیے برطانیہ توضیحی قانون کے اصول پر کاربند رہا اور نوآبادیوں کے انتہا پسند ویسی ہی استقامت سے نمائندگی کے بغیر محاصل کی مخالفت کرتے رہے۔ پارلیمنٹ نے پھر روپیہ وصول کرنے کے لیے تدبیریں اختیار کیں۔ اس مرتبہ وہ محاصل عائد کیے گئے جو ٹاؤنشینڈ کے نام سے منسوب ہیں (۱۷۶۷ء)۔ یہ محاصل چائے، کاغذ، روغنیات اور سیسے کی درآمد پر عائد کیے گئے تھے۔ فلاڈلفیا، نیویارک اور بوسٹن کے تاجروں نے ان کے مقاطعے کا انتظام کیا۔ ۱۷۷۰ء میں لارڈ نارتھ کی کابینہ نے ٹاؤنشینڈ کے تمام محاصل واپس لے لیے، صرف ایک محصول باقی رہ گیا، یعنی فی پونڈ

---

[1] تاریخ امریکہ کی دستاویزیں Documents of American History ص ۵۸۔

[2] Declaration Act

[3] تاریخ امریکہ کی دستاویزیں ص ۶۰-۶۱۔

چائے پر تین پنس کا محصول۔ اسے نو آبادیوں پر پارلیمنٹ کے اقتدار کا نشان قرار دے کر باقی رکھا گیا۔ تین سال کے بعد انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حالت دیوالے تک پہنچ گئی کیونکہ اس کے افسر سخت بدعمل اور رشوت خوار تھے۔ کمپنی نے لارڈ نارتھ سے چائے کی فالتو مقدار شمالی امریکہ بھیجنے کی اجازت لے لی اور وہ متوقع خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ اگر چائے کی فی پونڈ قیمت ناجائز طور پر برآمد شدہ ولندیزی چائے سے بہت گھٹا دی گئی تو اہلِ امریکہ تین پنس کا محصول گوارا کرلیں گے، جس سے وہ سخت نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسٹن میں ایک جماعت تیار ہو گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ چائے کی درآمد روک دی جائے۔ ۱۶ دسمبر ۱۷۷۳ء کو اہلِ بوسٹن کا ایک گروہ امریکہ کے سرخ فام انڈینز کا بھیس بدل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تین جہازوں پر جا پہنچا اور چائے کے تمام صندوق، جن کی قیمت ہزاروں پونڈ تھی، اٹھا کر سمندر میں پھینک دیے۔ ہزاروں افراد کنارے پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ جن لوگوں نے اس ہنگامے میں سرگرمی سے حصّہ لیا تھا، انھوں نے ولندیزی چائے ناجائز طریق پر درآمد کرنے میں سرمایہ لگا رکھا تھا۔

برطانیہ نے مزاحمت کو توڑنے کے لیے جبر استعمال کیا۔ آباد کاروں نے جبر کے مقابلے میں مزاحمت تیز تر کر دی۔ ۱۷۷۴ء میں ایک قانون منظور کیا گیا، جسے قانون کوئبک[1] کہتے ہیں۔ اس کے مطابق کوہستان ایلجنی کے آگے کی تمام زمینیں کینیڈا میں شامل کرلی گئیں۔ گویا نو آبادیوں کے لیے مغربی جانب توسیع کا دروازہ بند کر دیا۔ ان ناقابلِ برداشت قوانین کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوسٹن کی بندرگاہ میں تجارت روک دی گئی۔ اسی طرح میساچوسٹس میں انتخابات معطل کر دیے گئے۔ اپریل ۱۷۷۵ء میں میساچوسٹس کے صف آرا کسانوں نے لکسنگٹن[2] اور کنکورڈ[3] کے مقامات پر گولیاں چلائیں۔ یہ جنگِ آزادی کی پہلی آتشباری تھی۔ ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو پوری نو آبادیوں کے نمائندے فلاڈلفیا میں جمع ہوئے اور برطانیہ سے امریکہ کی آزادی کا رسمی اعلان کر دیا گیا۔

انقلاب کے لوازم: برطانیہ برطانیہ کے لیے امریکی انقلاب کے لوازم صرف تیرہ نو آبادیوں کی علیحدگی تک محدود نہ تھے۔ اس انقلاب میں برطانیہ کو چھوٹے پیمانے پر عالمی جنگ پیش آ گئی، جس کی وجہ سے اس کا بیرونی اقتدار خطرے میں پڑ گیا اور جارج سوم کا اقتدار و وقار برطانیہ میں کمزور ہو گیا۔ شمالی امریکہ کے اندر نہایت نازک جنگ ابتدائی دور ہی میں پیش آ گئی، یعنی ۱۷۷۷ء میں برگائن[4] کی برطانوی فوج نے سیراٹوگا[5] کے مقام پر حوالگی قبول کر لی۔ برگائن مونٹ ریل سے جنوبی جانب پیشقدمی کر رہا تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ وادی ہڈسن کے زیریں حصّے

---

[1] Quebec Act   [2] Lexington   [3] Concord

[4] Burgoyne   [5] Saratoga

میں پہنچ جائے اس طرح نیو انگلینڈ[1] اور دوسری باغی نوآبادیوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کردے۔ وہ اس مقصد ہی میں ناکام رہا، بلکہ اس کی حوالگی نے فرانسیسیوں کو یقین دلادیا کہ امریکی آبادکاروں کی حمایت کی گئی تو فرانس کو برطانیہ کے خلاف عالمگیر جدوجہد تازہ کرنے کا عمدہ موقع مل جائے گا اور ۱۷۶۳ء کی ذلت کا بدلہ لیا جاسکے گا۔ چنانچہ ۱۷۷۸ء میں فرانس بھی شریکِ جنگ ہوگیا۔ پھر اس نے ہسپانیہ کی اعانت بھی حاصل کرلی اور آگے چل کر اکثر دوسری یورپی مملکتوں سے امداد لے لی یا کم ازکم انھیں دوستانہ غیر جانبداری پر آمادہ کرلیا۔

شمالی امریکہ میں فرانس کی مداخلت، خصوصاً فرانسیسی بیڑے کی آمد نے جارج واشنگٹن کی فوجوں کے لیے فتح کا راستہ ہموار کردیا اور آخر ۱۷۸۱ء میں جارج ٹاؤن کے مقام پر برطانوی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ باقی رہی بحری جنگ تو برطانیہ کے تین ہزار تجارتی جہاز تباہ ہوگئے۔ پھر برطانیہ کی بحری قوت بہت بڑی تباہی سے بچاؤ کے لیے حرکت میں آئی۔ پیرس میں صلح نامے پر دستخط ہوگئے (۱۷۸۳ء)۔ برطانیہ نے اپنی سابقہ نوآبادیوں کی آزادی تسلیم کرلی۔ فلوریڈا[2] ہسپانیہ کو واپس کردیا گیا جو ۱۷۶۳ء میں اس سے لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی بحیرۂ روم میں جزیرہ منورقہ دوبارہ ہسپانیہ کو مل گیا، جسے اہم جنگی حیثیت حاصل تھی، البتہ جبل طارق اپنے پاس رکھا۔ ہسپانیہ اسے بھی واپس لے لینے کا امیدوار تھا۔ فرانس کو بہت معمولی علاقے دیے گئے۔

جنگ کے ابتدائی دور میں برطانوی عوام عموماً امریکیوں پر ڈاکٹر سیموئل جانسن کی تحریرات سے متفق رہے۔ جانسن نے کہا تھا: "جناب! اہلِ امریکہ مجرموں کی اولاد ہیں اور ہم پھانسی دینے سے کمتر اُن سے جو بھی سلوک کریں، اس کے لیے انھیں شکرگزار ہونا چاہیئے۔"[3] مگر جب امریکیوں کی قوت مزاحمت آشکارا ہوئی، برطانوی حکومت کی غلطیاں پے درپے سامنے آنے لگیں اور اہلِ یورپ باغی نوآبادیوں کے حامی بن گئے تو یہ رائے بدل گئی۔ ۱۷۸۰ء میں جارج سوم اور اس کی پالیسی کا وقار اتنا کم ہوگیا کہ دارالعوام کو ایک قرارداد منظور کرنی پڑی جس میں اعلان کیا گیا کہ تاج کا اثر بڑھتا رہا اور بڑھ رہا ہے، اسے کم کرنا چاہیے۔

تاج کا اثر یقیناً گھٹ گیا تھا۔ لارڈ نارتھ تین سال سے التجائیں کررہا تھا کہ میرا استعفا قبول کرلیا جائے۔ آخر ۱۷۸۲ء میں اس کے لیے جارج سوم کا سیاسی ترجمان ہونے کی ناقابلِ تحفظ حیثیت اور بھی نازک ہوگئی اور اس نے منصب چھوڑ دیا۔ آئندہ سال وزیراعظم کا منصب "ہفت سالہ جنگ" کے بہادر پٹ کے بیٹے ولیم پٹ صغیر کے حوالے کیا گیا۔ نیا وزیراعظم صرف پچیس سال کا تھا لیکن وہ بڑا تجربہ کار پارلیمانی تھا اور آئندہ اٹھارہ سال تک کابینہ کا رئیس رہا۔ پٹ کے آجانے سے برطانوی سیاسیات کا ضبط ونظم بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر پیشہ ور مدبّروں کے قبضے میں چلا گیا۔ جارج سوم تھوڑی مدت تک تاج وتخت سے

۱؎ New England امریکہ کی ایک ریاست۔ ۲؎ Florida

۳؎ باسویل Boswell کی حیاتِ جانسن جلد دوم ص ۳۱۲۔

دست برداری کا ارادہ کرتا رہا۔ پھر اس نے رفتہ رفتہ دستوری بادشاہ کے بیرنگ کردار پر قناعت کر لی۔ ۱۷۸۸ء میں پہلی مرتبہ اس پر جنون کا سخت حملہ ہُوا۔ اس کی وجہ سے اس کے عہد حکومت کا نصف ثانی برابر متاثر رہا۔ برطانیہ میں روشن خیال مطلق العنانی سے دکھاوے کی محبت کا جو سلسلہ جاری ہُوا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔

انقلاب کے لوازم : امریکہ

باغی نو آبادیوں میں رائے عامہ بالاتفاق انقلاب کے حق میں نہ تھی۔ بہت سے آبادکار، جن میں جنوب کے مالکان اراضی اور پنسلوینیا کے خوشحال کویکر بھی شامل تھے یا تو برطانیہ کے حامی تھے یا انھوں نے جنگ میں غیر جانبداری اختیار کر لی۔ نیویارک نے جارج واشنگٹن کے بجائے جارج سوم کو زیادہ رنگروٹ دیے۔ جب آزادی حقیقت ثابتہ بنتی نظر آئی تو یہ "وفاشعار" یا "ٹوری" بھاگ کر کینیڈا چلے گئے۔ اندازہ کر لیا گیا ہے کہ تمام آبادکاروں میں سے صرف ایک تہائی نے گرمجوشی سے انقلاب کی حمایت کی۔

انقلابی اقلیت جزواً ان عمرانی گروہوں سے تعلق رکھتی تھی، جو ہر قائم شدہ اقتدار پر اعتراضات کے عادی تھے، یعنی سرحدوں پر بسنے والے علمدار آبادکار بے شمار پریسبیٹیری کلیسائی خود مختاری کے حامی اور دوسرے اولوالعزم پروٹسٹنٹ طبقے۔ لڑکے بالغ ہو جاتے ہیں تو وہ کسی کے تابع نہیں رہنا چاہتے۔ اسی طرح آبادکار بھی آبائی وطن کی فرمانبرداری پر آمادہ نہ تھے، لیکن کینے سے وابستگی کا سلسلہ انھوں نے قائم کر رکھا تھا۔ اسٹامپ کے قانون سے متعلق جو کانگرس منعقد ہوئی تھی، اس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ملک معظم کی جو رعایا نو آبادیوں میں موجود ہے، وہ بھی طبعاً ان تمام حقوق و مقاصد کی حقدار ہے، جو برطانیہ عظمیٰ کی مملکت کے باشندوں کو حاصل ہیں۔ امریکہ کے انقلابیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اس مثال کی پیروی کر رہے ہیں، جو انگریزوں نے ۱۶۸۸ء میں پیش کی تھی اور جسے جان لاک نے حق بجانب ثابت کیا تھا۔

لاک اور نیوٹن کے افکار سب کو معلوم تھے اور یورپ کی طرح شمالی امریکہ میں بھی ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ اعلان آزادی کی تہ میں وہی خیالات کارفرما تھے :

> "جب انسانی وقائع کے دور میں کسی ایک قوم کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان سیاسی بندھنوں کو توڑ دے، جو اسے دوسری قوم سے وابستہ کیے ہُوئے ہیں اور دنیا کی قوتوں کے درمیان وہ جداگانہ اور مساوی مقام اختیار کر لے، جو فطرت اور خدائے فطرت کے قوانین کے رو سے اسے ملنا چاہیے تو عالم انسانیت کی آرا کے مناسب احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ان اسباب کا اعلان کر دیا جائے، جو علیحدگی کے موجب ہُوئے۔"

اعلان آزادی کے اس ابتدائی حصے میں عالمی مشین کا تصور پیش نظر رکھا گیا ہے جس میں فطرت اور خدائے فطرت کے قوانین کی حکمرانی ہے۔ دوسرے حصے میں لاک کے نظریۂ معاہدہ اور جوازِ انقلاب کے اصول کا اطلاق نو آبادیوں پر کیا گیا ہے :

"ہم ان حقائق کو بدیہی سمجھتے ہیں کہ تمام انسان یکساں حیثیت لے کر پیدا ہوئے اور خالق نے انھیں بعض ایسے حقوق دے دیے، جو قطعاً چھینے نہیں جا سکتے۔ ان حقوق میں زندگی، آزادی اور سعیِ راحت شامل ہیں۔ انھیں حقوق کے حصول کے لیے انسانوں کے درمیان حکومتیں بنتی ہیں۔ وہ اپنے تمام جائز اختیارات محکوموں کی رضامندی سے حاصل کرتی ہیں۔ جب حکومت کی کوئی شکل ان مقاصد کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہے تو لوگوں کا حق ہے کہ اسے بدل دیں یا ختم کر دیں اور اس کی جگہ نئی حکومت قائم کر لیں....."

انقلاب امریکہ میں دورِ تنویر کے انگریز داعیوں سے جتنا فائدہ اٹھایا گیا، اس کا اظہار اعلان آزادی میں کیا گیا۔ نئی جمہوریت کا دستور بنا تو فرانسیسی فلسفیوں، خصوصاً مونٹسک کا احسان نمایاں ہو گیا۔ ۱۷۸۷ء میں دستوری کنونشن بمقام فلاڈلفیا منعقد ہوئی۔ اس کے باشندوں نے "روحِ قوانین"[۱] سے تنفیذیہ، مقننہ اور ادبیّہ کے اختیارات کی علیحدگی کا نظریہ مستعار لیا۔ صدر جمہوریہ کو ویٹو کے ذریعے سے کانگریس پر اختیار دے دیا گیا۔ کانگریس کے لیے تنفیذیہ اور عدلیہ پر اقتدار قائم کر دیا گیا، کیونکہ کانگریس غلط کاموں کی مذمت کر سکتی تھی۔ تقررات کی توثیق کا حق اسی کو تھا۔ کانگریس پر یوں پابندی عائد کی گئی کہ جب تک دونوں ایوان کسی قانون پر راضی نہ ہوں، وہ قانون نہیں بنے گا۔ یہ تمام تدبیریں امریکی دستور میں توازن قائم رکھنے کے لیے اختیار کی گئیں اور یہ سب مونٹسک سے لی گئی تھیں۔ صدر اور کانگریس کے درمیان بار بار جو اختلافات پیدا ہوتے رہے، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل امریکہ نے برطانیہ کے ایک دستوری معمول کے مطابق اٹھارھویں صدی کے فرانس کی ایک تعبیر قبول کر لی، جو غلط فہمی پر مبنی تھی۔ دستور سازوں نے تیرہ نوآبادیوں کے دساتیر سے بھی بعض چیزیں لیں اور انگریزی معمولات بھی پیشِ نظر رکھے۔ ۱۷۹۳ء میں دستور کے اندر پہلی مرتبہ دس ترمیمیں ہوئیں، جن میں مذہب و مطابع کی آزادی اور دوسرے بنیادی حقوق کی توثیق کی گئی۔ وہ انگریزوں کے حقوق نامے سے لی گئی تھیں، جو ۱۶۸۹ء میں منظور ہوا۔

دستور میں بہ کثرت سمجھوتوں سے کام لیا گیا تھا۔ کوشش یہ کی گئی تھی کہ ریاستوں کے حقوق اور وفاقی حکومت کے مرکزی اختیارات میں، نیز دار المندوبین — جس کے نمائندے براہ راست چنے جاتے تھے — کے جمہوری اصول اور قدامت پسند سینٹ — جس کے نمائندوں کا انتخاب بالواسطہ ہوتا تھا — کے امرائی اصول میں توازن پیدا ہو جائے۔

جیمز میڈیسن[۲] نے دستور بنانے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس نے سمجھوتوں کے دفاع میں جو کچھ کہہ دیا، اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا دفاع دو قوتوں پر مبنی تھا، ایک جائداد، دوسری روحِ حزب۔ اس کے نزدیک یہ دونوں قوتیں انسانی فطرت میں مضمر تھیں:

۱؎ Spirit of the Laws

۲؎ Madison

"..... جب تک انسانی رائے میں غلطی کا امکان موجود ہے، وہ اس سے کام لینے میں آزاد ہے۔ مختلف رائیں قائم کی جائیں گی..... انسانوں کی صلاحیتوں میں تنوّع موجود ہے۔ اس سے ملکیت کے حقوق پیدا ہوتے ہیں۔ مفاد کی یکسانی میں یہ کوئی معمولی مشکل نہیں۔ حکومت کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کی حفاظت کرے۔ ملکیتیں حاصل کرنے کی مختلف اور غیر مساوی صلاحیتوں کی حفاظت سے مختلف قسموں اور مختلف درجوں کی ملکیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ان سے متعلقہ مالکوں کے آراء و جذبات پر جو اثر پڑتا ہے، اس سے معاشرے میں مختلف مفادوں اور فریقوں کی تقسیم چلتی ہے۔

. . . .

"مفاد مختلف قسم کے ہیں، مثلاً زمین کا مفاد، صنعت و حرفت کا مفاد، تجارتی مفاد، روپے کا مفاد اور بعض چھوٹے چھوٹے مفاد ہیں، جو متمدّن قوموں میں ضرورت کے مطابق پیدا ہوتے ہیں اور قوموں کو مختلف طبقوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ یہ مختلف جذبات و آراء سے پیدا ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر کی قانون سازی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ان مختلف النوع اور ایک دوسرے میں مداخلت کرنے والے مفادوں کے درمیان نظم و ترتیب پیدا ہو جائے اور حکومت کے ضروری اور عام کاروبار میں احزابی روح پیدا کر دے۔"[۵]

گویا امریکی دستور سمجھوتے پر مبنی تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ دولتمندوں اور غریبوں، طبقۂ امراء اور طبقۂ جمہور کی امداد حاصل کر لی جائے۔ ابتدا میں اس سے کوئی بھی فریق خوش نہ ہوا اور سمجھوتوں کی کیفیت یہی ہوتی ہے لیکن اس پر عمل سے واضح ہو گیا کہ جمہوریۂ امریکہ بخوبی کام کرنے لگی اور ابتدائی دستور ساز فلسفیوں کے نظریات اور عملی سیاسیات کے حقائق میں مطابقت پیدا کر سکے۔

۵۔ The Fedralist ص ۴۲-۴۳

گیارھواں باب

دورِ تنویر کی ثقافت

تمہید دورِ تنویر میں ایسے خوش گوار سیاسی نتائج شاذ ہی رونما ہوئے، جن سے ریاست ہائے متحدہ مشرف ہوئیں۔ بہ حیثیت عمومی فلسفیوں کو امید تھی کہ جب لوگوں سے کہا جائے گا کہ صدیوں کے عادات ترک کردو اور اپنی روش پر قانونِ طبعی کے مطابق نظرِ ثانی کر لو تو وہ فوراً حقیقتِ حال کا اندازہ کرلیں گے، لیکن انسانوں نے ہمیشہ عقل سے کام نہیں لیا۔ جوزف ثانی (ہیبسبرگ شہنشاہ) کو رنج و غم سے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ غیر معقول مراسم اور غیر طبعی روایات سے چمٹے رہتے ہیں۔ دورِ تنویر کی عقلیت اپنے اندازوں کی بناء پر فطرت انسانی کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتی رہی۔

اس بڑی کوتاہی کی ذمہ داری ایک حد تک سترھویں صدی کی کلاسیکی روح پر عائد ہوتی ہے، جو اٹھارھویں صدی کے دورِ تنویر کو میراث میں ملی۔ لوئی چہاردہم کے عہد میں جتنے مصنّف ہوئے، انھوں نے اپنے کلاسیکی نمونوں میں مروّجہ معیاروں کی توثیق نہیں کی تھی، بلکہ بہتر اور سادہ تر معیار پیش کیے تھے، جنھیں اٹھارھویں صدی کے فلسفیوں نے بہ آسانی فطرت کے سادہ منصوبے کے تصوّرات سے مطابق بنا لیا۔ سترھویں صدی کے ڈراما نگار مولیار[1] نے اپنے ڈرامے "بخیل"[2] میں ہارپاگون[3] کردار پیدا کیا، تو وہ کسی یگانہ شخصیت کا مرقّع نہ تھا یعنی نرا بخیل تھا، بہت بڑا بخیل۔ اس میں شبہ نہیں کہ بڑے بڑے مصنّف ذہنی مجرّدات کو بھی زندگی کا لباس پہنا دیتے ہیں اور اس طرح جزئی و کلی کے درمیان مفاہمت پیدا کرلیتے ہیں، لیکن چھوٹے درجے کے مصنّف صرف ایسے نمونے پیش کرتے ہیں، جن میں زندگی اور روح نہ ہو اور اپنے سامعین و قارئین میں — مرد اور عورتیں جو مجلسی و عمرانی تغیرات کا موجب ہوتی ہیں — ایسے عقیدے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ یہ سادہ سی ذہنی تخلیقات دراصل زیادہ حقیقی اور زیادہ مطلوب ہیں۔ وہ حقیقی وجود مطلوب و مرغوب نہیں، جن سے رات دن انھیں زندگی میں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کلاسیکی روح کی طرح طبعی سائنس کی روح بھی حد سے آگے بڑھ گئی، جب اسے سوچے سمجھے بغیر انسانی روابط کے مسائل پر استعمال کیا گیا۔ اس سے لوگوں کے دل میں یہ التباس پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے، وہی کچھ مدّت بعد حقیقت بن جائے گا۔

ۓ Moliere

ۓ The Misar. فرانسیسی نام L. A. Vare

ۓ Harpagon

ایک چھوٹے درجے کا فلسفی ایبی میبلی[1] اس مرکزی مسئلے کی حقیقت پا گیا اور اس نے اسے ایک سوال کی صورت میں پیش کیا، یعنی کیا معاشرہ طبیعیات کی ایک شاخ ہے؟ اکثر فلسفیوں اور ان کے پیروؤں کا عقیدہ یہی تھا۔ انھوں نے انسان کی ان سرگرمیوں کے تعلق میں، جن کی نسبت پیشگوئی نہیں کی جا سکتی، ریاضیات کے وہ محکم طریقے استعمال کیے، جن سے علوم طبعی میں کام لیا جاتا تھا۔ حامیانِ مسلکِ فطرت نے کوشش کی کہ اقتصادی پیچیدگیوں کو کم کرتے کرتے سادہ زرعی قوانین کی شکل دے دیں۔ مونٹسک کی کوشش یہ تھی کہ حکومت کی پیچیدگیوں کو گھٹاتے گھٹاتے آب و ہوا کے فارمولے کی شکل پر لے آئیں۔ جس طرح سیارے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں، اسی طرح انسانوں کو نیوٹن کی عالمی مشین میں پیوست کر دینے کی کوشش کی گئی۔

فلسفہ

اٹھارھویں صدی کے اکابر میں سے بہت کم نے باہم اختلاف کیا۔ ڈیوڈ ہیوم[2] (۱۷۱۱ء - ۱۷۷۶ء) سکاٹ لینڈ کا ایک درخشاں فلسفی تھا۔ اس نے یہ فرض کر لینا قرینِ یقین نہ سمجھا کہ معاشرہ علوم طبعی کی شاخ ہے، بلکہ اس نے ہر شے میں شک کیا۔ اس کے متشکک قلب و ذہن کو اصرار تھا کہ تمام اصول مشاہدۂ حقائق کی کسوٹی پر کسے۔ اس نے کہا کہ فلسفیوں کے اغلاط و التباسات صرف اس کوتاہی کا نتیجہ ہیں کہ وہ حقائق کا مشاہدہ نہیں کرتے، بلکہ دو مجرد اصول ــــ طبعی قانون پر ایمان اور عقل پر یقین ــــ سے ایسے نتیجے اخذ کر لیتے ہیں، جن کا امتحان کبھی نہیں کیا۔ فلسفیوں نے فطرت کی طرف توجہ کی دعوت دی تھی۔ ہیوم نے انھیں بے بنیاد ثابت کر دیا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ قوانینِ انصاف ہرگز فطرت اور خدائے فطرت مطلق اور غیر متبدل قوانین نہیں:

"فرض کر لیجیے کہ ایک معاشرہ عام ضروریات سے محرومی کی ایسی حالت پر پہنچ جاتا ہے کہ انتہائی کفایت شعاری اور محنت و مشقت کے باوجود لوگوں کی بڑی تعداد کو تباہ ہونے سے بچایا نہیں جا سکتا اور پورا معاشرہ انتہائی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، بے تامل اعتراف کر لیا جائے گا کہ قوانینِ انصاف کی پوری پوری پیروی ایسے مجبور کن حالات میں معطل ہو جائے گی اور اس کی جگہ ضرورت و حفاظت نفس کے محکم تر محرکات لے لیں گے۔ اگر جہاز سمندر میں تباہ ہو جائے تو کیا یہ جرم ہے کہ ہر انسان اپنے بچاؤ کا جو بھی ذریعہ یا وسیلہ مناسب سمجھے، اس سے کام لے لے اور ملکیت کے سابقہ حدود کو بھی نظر انداز کر دے یا اگر کوئی محصور شہر بھوک سے تباہ ہو رہا ہو تو کیا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے بچاؤ کا کوئی ذریعہ سامنے ہوتے ہوئے بھی زندگیاں ضائع کر دیں گے اور محض اس خیال کی بناء پر کہ دوسرے حالات میں انصاف و مساوات کے قاعدوں کا تقاضا کیا ہوتا؟"[3]

لہ ۱ Abe Mabbly — لہ ۲ David Hame

لہ ۳ An Enquiry concerning the principles of Morals (اصولِ اخلاق کے متعلق تحقیقات) ص ۱۸۶

دراصل انسانی روش کا تجزیہ اس طریق پر کیا ہی نہیں جا سکتا جس طرح ہم ہندسہ یا جبر و مقابلہ کے حقائق عقل کے ذریعے سے دریافت کرتے ہیں:

"یہ حقیقت سب پر آشکارا ہے کہ انسانی اعمال کے حقیقی مقاصد کا جائزہ کسی کی حالت میں عقل کی بناء پر نہیں لیا جا سکتا بلکہ وہ کاملاً جذبات اور انسانی مالوفات سے متعلق ہوتے ہیں، عقلی اوصاف پر منحصر نہیں ہوتے۔ کسی سے پوچھو کہ وہ ورزش کیوں کرتا ہے؟ جواب ملے گا کہ وہ صحت بحال رکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہ صحت بحال رکھنے کا کیوں خواہاں ہے؟ فوراً جواب ملے گا کہ بیماری تکلیف دہ ہے۔ اگر آپ اسی طرح استفسار کرتے جائیں گے اور پوچھیں گے کہ اسے درد و الم سے کیوں نفرت ہے؟ تو ناممکن ہے کہ وہ کوئی جواب دے سکے۔

".... غالباً آپ کے دوسرے سوال (صحت کا کیوں خواہاں ہے) کا جواب وہ یہ دے کہ صحت پیشے میں مصروف رہنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہ وہ پیشے میں مصروف رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہے؟ جواب دے گا کہ اسے اور مال کی خواہش ہے۔ اگر آپ پھر پوچھیں کیوں؟ وہ کہے گا کہ راحت کا وسیلہ یہی ہے۔ اس سے آگے سوالات کرنا سراسر مہمل ہوگا۔"[1]

ہیوم ہی کے خیالات و افکار سے آگے چل کر افادیت پسندوں کا دبستان پیدا ہوا، جو تمام اعمال کا فیصلہ لذّت کی تقویت اور الم کے ازالے میں افادیت کی بناء پر کرتے ہیں۔ ہالباش کے علاوہ ہیوم کے لیے بھی یہ واضح کرنا مشکل ہوگیا کہ جس دنیا پر فیّاض اور حاضر و ناظر خدا کی حکومت ہے، اس میں شر کہاں سے آیا۔ ہالباش کو اس مسئلے کا حل دہریت میں ملا، کیونکہ وہ آسمان پر خدا اور زمین پر شر کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکال سکا۔ ہیوم کی رائے یہ نہ تھی۔ اگرچہ وہ خدا کے وجود کا کوئی ثبوت نہ دے سکا، لیکن یہ بھی ثابت نہ کر سکا کہ خدا موجود نہیں۔ متشکک قلب و ذہن کے لیے صرف ایک شے یقینی تھی اور وہ یہ کہ حامیانِ مسلکِ فطرت کی محض عقل مذہبی حقیقت کی طرف رہنما نہیں ہو سکتی اور متصوّفین کے سوا کوئی شخص معمائے کائنات کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتا:

"جو شخص عقلِ طبعی کی خامیوں کے احساس سے پوری طرح بہرہ ور ہو وہ الہامی حقیقت پر انتہائی تیزی سے اُڑ کر پہنچے گا۔"[2]

ڈیوڈ ہیوم دورِ عقلیت کے اوّلیں نقادوں میں سے تھا اور زبردست نقاد تھا۔ آئندہ نسل کے رومانیت پسند

---

[1] اصولِ اخلاق ص ۲۹۳

[2] Dialogues concerning natural Religion مرتبہ این کے سمتھ ص ۲۸۲۔

عقل کی خامیوں کے متعلق اس کے انتباہات دُہراتے رہے اور جذبات، نیز انسانی مالوفات کے متعلق اس کی التجاؤں کا اعادہ کرتے رہے۔ ہیوم کو زندگی میں مدح وستائش کا زیادہ خراج نہ مل سکا تاہم اس کے اقوال صدا بہ صحرا نہ تھے۔ روسو اور کانٹ کو بھی تقریباً ویسے ہی مسائل پریشان کر رہے تھے۔

روسو دورِ تنویر کا بھی نمائندہ تھا اور اس کے خلاف اس نے بغاوت کی بھی داغ بیل ڈال دی۔ کسی فلسفی نے قانونِ طبعی کی مدافعت روسو کے برابر گرمجوشی سے نہ کی اور کسی رومانیت پسند نے جذبے اور ایمان کی حمایت روسو سے زیادہ دل نشیں انداز میں نہ کی۔ وہ ایمیل میں لکھتا ہے: "عقل ہمیں اکثر دھوکا دیتی ہے۔ ہمارے پاس معقول وجہ موجود ہے کہ اس پر شک کریں، لیکن ضمیر ہمیں کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ وہی انسان کا سچا رہنما ہے۔ جو شخص ضمیر کی پیروی کرتا ہے، وہ فطرت کا پیرو ہے اور اسے گمراہی کا کوئی خوف نہ ہونا چاہیے۔"[1]

عمانوئیل کانٹ (۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء) کو انگز برگ[2] (مشرقی پروشیا) کی یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ اس نے روسو کے استدلال کو ماورائے طبیعت کی سطح پر پہنچا دیا۔ کانٹ ایک حقیقت عالیہ پر اعتقاد رکھتا تھا، جو آخر خدا تک پہنچاتی تھی۔ اسے بھی ایک ایسی ہی دنیا تصور کرنا چاہیے، جیسے افلاطون کا عالم اعیان تھا۔ کانٹ اس عالم اعلیٰ کے دائمی حقائق کو مادی دنیا کے "فی نومینا"[3] کے مقابلے میں نومینا[4] قرار دیتا تھا۔ کانٹ کا اعتقاد یہ تھا کہ نومینا کی دنیا کا علم انسان عقل کے ذریعے سے کرسکتے تھے، لیکن وہ عقل نہیں، جو دورِ تنویر کی مصطلحہ تھی۔ عقلِ عامہ بھی نہیں، جسے وجدان یا تقریباً تصوف سمجھنا چاہیے۔ کانٹ کی عقلیت کا اعلیٰ ترین مظہر "ضمیر کا حکم[5] آخر" تھا۔ یہی اخلاقی قانون تھا، یعنی ضمیر، جسے خدا نے انسان کی فطرت میں ودیعت فرمایا۔ یہ فرد کے اندر حقیقت کا ایک ایسا ناگزیر جوش وانفجار تھا کہ اگر اس کے سامنے اخلاقی انتخاب کا موقع آجائے تو وہ یقیناً خیر کو اختیار کرے گا اور شر سے گریزاں رہے گا۔

کانٹ نے عقل کی ازسرِ نو تعبیر کردی اور ضمیر کو پھر اس کی اصل جگہ بٹھا دیا۔ اس سے بعد کے فلسفے کی پوری تاریخ متعین ہوگئی۔ لیکن کانٹ کا فوری اثر محدود تھا، کیونکہ اس کے پُر پیچ استدلال کو ذہن نشین کرنے کے لیے انتہائی صبر و علم درکار تھا۔ دورِ تنویر کے غلبۂ تعقل کے خلاف ذہنی ردِعمل کانٹ کے ساتھ نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ اس کے عوامی نتیجے نے تبلیغ انجیل کے احیاء کی شکل اختیار کر لی، جو اٹھارھویں صدی کے جرمن "داعیانِ تقویٰ"[6] سے شروع ہوئی۔

تبلیغِ انجیل کا احیاء

داعیانِ تقویٰ سولھویں صدی کے ان مسیحیوں کے روحانی وارث تھے، جو ہر مسیحی کے بالغ ہونے پر

---

۱ ایمیل ص ۲۴۹ - ۲۵۰۔
۲ Konigsberg
۳ Phenomena یعنی مظاہر فطرت۔
۴ Noumena ذوات اشیاء۔
۵ Categorical Imperative
۶ Pietists یعنی وہ لوگ جو عبادت میں اخلاص اور تقوے کے حامی تھے۔

بپتسمے کی تجدید کے قائل تھے۔[1] وہ لوگ اس امر کی بھی مذمت کرتے تھے کہ لوتھر نے مذہب کے ظاہری پہلوؤں کے لحاظ پر بہت زور دیا ہے۔ اسی طرح حامیانِ مسلکِ فطرت کا زور طبعی قانون کی طرف منتقل ہوگیا، ان کی بھی مذمت کرتے تھے۔ داعیانِ تقویٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ مذہب کا تعلق دماغ سے نہیں، دل سے ہے۔ ان کا خدا دنیا کا خالق و موجد ضرور تھا، مگر وہ دُنیا سے دُور تھا۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا لیڈر، ایک جرمن امیر کاؤنٹ زِنزن ڈارف[2] (۱۷۰۰ء تا ۱۷۶۰ء) تھا جس نے موریویائی[3] انجمنِ اخوت کی بنیاد رکھی۔ اہل موریویا نے مسیحی اصول کی بناء پر ایک مثالی معاشرے کی بنیاد رکھی تھی اور جو اہلِ موریویا امریکہ پہنچے، انھوں نے پنسلوینیا کے ایک مقام بیت اللحم میں ایک نوآبادی قائم کی اور کفایت شعاری، سخت محنت اور مذہبی احکام کی پابندی کے متعلق ولندیزی روایات پنسلوینیا میں زندہ کر دیں۔ انگلستان میں زِنزن ڈارف اور دوسرے حامیانِ تقویٰ کی مثال نے جان ویسلے[4] پر گہرا اثر ڈالا۔

جان ویسلے (۱۷۰۳ء تا ۱۷۹۱ء) کلیسائے انگلستان کا ایک پادری تھا۔ ابتدا میں اس نے مذہب کے رسمی پہلو پر خاص زور دیا، لیکن جارجیا کی نوآبادی میں دو سال تک (۱۷۳۶ء تا ۱۷۳۷ء) پادری کی خدمات انجام دینے کے بعد کچھ کامیابی نہ ہوئی تو اسے یقین ہوگیا کہ مذہب کی رسمی حیثیت چنداں مؤثر نہیں، جو آنکھوں سے پردہ دُور ہُوا تو ویسلے کو خود اپنا ایمان بھاپ کی طرح اڑتا نظر آیا۔ وہ کہتا ہے: "مَیں اس غرض سے امریکہ گیا تھا کہ وہاں کے قدیم باشندوں کو مسیحی بناؤں، مگر میرے دل میں احساس ہُوا کہ آہ! خود مجھے کون مسیحیت کا پابند بنائے گا؟ وہ کون ہے اور کیا حیثیت رکھتا ہے، جو مجھے نامومن قلب، کی بے یقینی سے نجات دلائے گا۔"[5] تحریک تقویٰ نے ویسلے کو از سرِ نو ایمان پر پختہ کیا۔ اس کی ملاقات انگلستان اور امریکہ میں موریویائی برادری کے ارکان سے ہوئی تھی۔ ان کی تعلیمات پر عمل کرتے ہُوئے ویسلے نے اندرونی وجدانی یقین کے ذریعے سے ایمان کی دولت پالی۔

ویسلے پچاس سال سے بھی زیادہ مدّت تک اپنی دریافت دوسروں تک پہنچانے کے لیے اَن تھک محنت کرتا رہا۔ وہ جزائر برطانیہ کے طول و عرض میں پھرا۔ کلیساؤں، کھیتوں، کانوں، بلکہ جیلوں میں بھی وعظ کہے۔ لوگ غُصّے سے بھرے ہُوئے آتے کہ اس کا مذاق اڑائیں۔ باتیں سُنتے تو اس کے ساتھ دعا میں شریک ہونے کے لیے ٹھہرے رہتے۔ جن مناظر سے ویسلے کو سابقہ پڑتا رہتا تھا، ان میں سے ایک کی کیفیت اس نے یوں پیش کی:

"مَیں شام کے وقت گھر واپس ہُوا۔ گاڑی سے جونہی قدم باہر نکالا، لوگوں کی بڑی

---

[1] Anabaptists یعنی وہ لوگ، جو بچّے کو بپتسمہ دینے کے قائل تھے کیونکہ وہ بپتسمہ دینے کا مطلب ہی نہیں سمجھتا تھا اور کہتے تھے کہ بالغ ہونے کے بعد بپتسمے کی تجدید ہونی چاہیے۔ پہلی جلد میں ان کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے۔

[2] Zin Zen Dorf

[3] Moraivan—Brethren

[4] John Wesley

[5] جان ویسلے کا جرنل جلد اوّل ص ۹۷۔

تعداد میرے دروازے پر جمع ہو چکی تھی۔ انھوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں خوش ہُوا۔ خدا کی تمجید کی۔ مدت سے مجھے ایسے ہی موقع کا انتظار تھا۔ جو لوگ مجھ سے قریب تھے، انھیں راستبازی اور آنے والے فیصلے کے متعلق باتیں سنانی شروع کیں۔ ابتدا میں بہت کم لوگوں نے میری باتیں سُنیں، کیونکہ آس پاس شور غُل بہت زیادہ تھا، لیکن رفتہ رفتہ سکون و سکوت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ پورا مجمع خاموش ہو کر میری باتیں سُننے لگا۔ جب میں نے وعظ ختم کیا تو وہ لوگ میرے ساتھ بڑی محبت کا اظہار کرنے لگے اور میرے لیے برکت کی دعائیں کیں[۱]۔"

۱۷۹۱ء میں ویسلے نے وفات پائی تو اس کے پیروؤں کی تعداد ایک لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ انھیں میتھوڈسٹ[۲] کہتے تھے، کیونکہ وہ منظم طریق پر تقویٰ و پرہیز گاری کے لیے وقف تھے اور پیوریٹنوں کے اصول کے مطابق سادہ لباس پہنتے اور سادہ طریق پر زندگی بسر کرتے۔ اگرچہ ویسلے اپنے آپ کو کلیساے انگلستان کا ایک خوش عقیدہ رکن سمجھتا تھا، لیکن اس کے پیروؤں یعنی میتھوڈسٹوں نے اپنی جداگانہ تنظیم قائم کر لی۔ ان کا کلیسا قائم شدہ کلیسائے انگلستان کے برعکس کسی کی تقلید نہیں کرتا تھا۔ اس نئے فرقے کو تمام پیرو زیریں اور متوسط طبقوں سے ملے۔ یہ لوگ مذہبی جذبے اور تسکین کے خواہاں تھے۔ یہ چیزیں انھیں مسلکِ فطرت کے حامیوں اور کلیساے انگلستان کی سخت رسم پرستی میں نہیں ملتی تھیں۔

میتھوڈزم[۳] کو روشن خیال عقلیت سے تصادم پیش آگیا۔ فلسفیوں کا مشورہ یہ تھا کہ عوامی طور طریقوں کی اصلاح کی جائے۔ میتھوڈسٹ نجی خیر پر زور دیتے تھے۔ فلسفیوں کی دعوت یہ تھی کہ مجلسی و عمرانی بُرائیوں کے اسباب پر حملہ کیا جائے۔ میتھوڈسٹ اِن بُرائیوں کو خُدا کے ناقابلِ فہم منصوبے کا ایک حصّہ سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان بُرائیوں کے آثار و علائم میں تخفیف کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے شراب نوشی، بردہ فروشی، قیدیوں، بیماروں اور دیوانوں سے وحشیانہ سلوک کے خلاف سعی و جہد شروع کر دی۔ عامِ تعلیم کی اشاعت پیشِ نظر رکھتے ہُوے جان ویسلے نے کان کنوں کے بچّوں کے لیے سکول قائم کر دیے۔ اس نے ایسے ڈاکٹروں کو لعن طعن کی، جو غریب بیماروں سے سنگدلی کا برتاؤ کرتے تھے۔ ساتھ ہی لندن اور برسٹل کے غریبوں کے لیے دواخانوں کی بنیاد رکھ دی۔ اس نے طب پر گھریلو استعمال کے لیے ایک کتابچہ لکھا، جسے اس کے داعیوں نے جا بجا تقسیم کر دیا۔ اس کا نام تھا "قدیم طبیعیات یا اکثر بیماروں کے

---

[۱] جان ویسلے کا جرنل جلد اول صفحہ ۲۸۷۔

[۲] Methodists یعنی وہ لوگ جو منظم طریق پر مذہب کی پابندی کرتے تھے اور اس کی تبلیغ کے درپے رہتے تھے۔

[۳] Methodism میتھوڈسٹوں کا طریق و مسلک۔

علاج کے طبعی طریق پر ایک مقالہ[1]۔ میتھوڈسٹ بھی پیورٹینوں کی طرح کسی کے مقلد نہ تھے۔
ان کی کامیابی جزواً مجلسی پروگرام پر موقوف تھی۔ جزواً جان ویسلے اور اس کے قابل رفیقوں کی مقناطیسیت کا نتیجہ تھی۔ جان کے بھائی چارلس ویسلے نے ساڑھے چھ ہزار بھجن مرتب کیے۔ ویسلے کا ایک واعظ جارج وائٹ فیلڈ[2] میسوپوٹیمیا کا تلفظ اس خوبی و خوش اسلوبی سے ادا کرتا تھا کہ مشہور ایکٹر گیرک[3] نے یہ تلفظ سُنا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ امریکہ میں میتھوڈسٹوں کے جو مشنری آئے، ان کا سرگرم رئیس فرانسس آسبری[4] تھا۔ نیوجرسی میں اس کے نام پر آسبری پارک بنایا گیا۔ اسی مقام پر ایک زمانے میں میتھوڈسٹ خیمے لگا کر جلسے منعقد کیا کرتے تھے۔ ویسلیوں کے قائم کیے ہوئے جو کالج، جو گرجے اور جو بازار آسبری کے نام سے موسوم ہیں، وہ امریکہ کی تاریخ میں میتھوڈزم کی اہمیت کی شہادت دے رہے ہیں۔

ادب متوسط طبقے کے جو لوگ میتھوڈزم کی طرف کھچے چلے آئے تھے، انھوں نے انگریز مصنف سیموئل رچرڈسن[5] (۱۶۸۹ تا ۱۷۶۱ء) کے ناولوں کا خیر مقدم کیا۔ رچرڈسن پیشے کے اعتبار سے پرنٹر تھا۔ زندگی کے آخری دور میں لکھنے کی طرف مائل ہو گیا اور تین ضخیم ناول لکھے، جن کے بڑے کردار خطوط کی شکل میں اپنے افکار پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے "کلیریسا ہارلو"[6] (۱۷۴۸ء) بہترین ناول ہے۔ اس کا ذیلی نام تھا: "ایک نوجوان خاتون کی سرگزشت[7]، جس میں نجی زندگی کے نہایت اہم معاملات درج ہیں اور خصوصیت سے وہ تکلیفیں اور مصیبتیں واضح کی گئی ہیں، جو شادی کے متعلق والدین اور بچوں کے غلط طرزِ عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔" رچرڈسن نے باریک ٹائپ کے دو ہزار چار سو صفحات میں کلیریسا کے مصائب بیان کیے ہیں، جس کا عاشق ایک بدمعاش تھا اور اس کے رشتہ دار حریصوں کا ایک گروہ تھے۔ وہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ غریب کلیریسا کی جائداد ہتھیا لیں۔ اسے کوئی نشہ آور چیز پلا کر بیہوش کر لیا گیا اور اس کی رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ آخر وہ ہر چیز کھو بیٹھی اور زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی لیکن آخر میں اس کے اندر اتنی صلاحیت باقی رہی کہ اپنے مصائب کو لباسِ تحریر پہنا دے۔ اگر کلیریسا ہارلو میں کسی سے کوئی پہلو نظر انداز ہو جائے

---

[1] primitive Physic or An Essay and a Natural Method of Curing Most Diseases

[2] Whitefield

[3] Gorrick

[4] Asbury

[5] Richardson

[6] Clarissa Marlowe

[7] The history of a young lady comprehending of the most Important concerns of private Life and particularly showing the Distresses that may attend the misconduct both of parents and children in Relation to marriage

تو چاہیے کہ رچرڈسن کا دیباچہ ایک نظر دیکھ لے:

"پیشِ نظر کتاب میں جو خاص مقصد سامنے رہا، یہ تھا کہ ایک صنف کے بے خیالوں اور غیر مآل اندیشوں کو دوسری صنف کے کمینے حربوں اور عیّاریوں سے آگاہ کیا جائے۔ والدین کو بتایا جائے کہ بچوں پر شادی کے بڑے معاملے کے سلسلے میں طبعی اقتدار کا استعمال حد سے نہ بڑھنا چاہیے۔ یہ واضح کرنا بھی مقصود ہے کہ ایک خوش باش آدمی کو دیانتدار آدمی پر اس خطرناک اور عام تصوّر کے مطابق ترجیح نہ دینی چاہیے کہ ایک اصلاح یافتہ رند بہترین شوہر ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کتاب میں محض اخلاقیات ہی نہیں، بلکہ مسیحیّت کے بھی نہایت اہم اعلیٰ اصول کی چھان بین مقصود ہے۔ زیبا اور شایاں کرداروں میں اس اصول پر عمل کا نقشہ واضح کیا گیا ہے اور جن غیر شایاں کرداروں نے ان اصول کی مخالفت کی، انھیں انجام کار کیسے کی سزا ملی۔"

ممکن ہے دورِ حاضر کے قارئین کو کلیریسا ہار بو بے کیف اور جذباتیّت پر مبنی معلوم ہو، لیکن اٹھارھویں صدی کے لوگ اسے پڑھ کر بے خود ہو گئے تھے۔ جب کنبے کے لوگ یکجا ہوتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ ناول کلیریسا بلند آواز سے پڑھا جاتا تھا اور جب اس کی کسی نئی مصیبت کا ذکر پڑھ کر دلوں پر اثر ہوتا تھا تو کنبے کے تمام لوگ اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے، تاکہ الگ بیٹھ کر اچھی طرح رو لیں۔ اگرچہ جذباتیّت میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا، تاہم رچرڈ نے ضمیر اور جذبات کی کش مکش کے جو واضح نقشے پیش کیے، ان سے لوگوں کے دل میں جذباتی اور نفسیاتی یقین پیدا ہو گیا۔ روسو نے اپنے ناول "لا نوول ہیلائز" ۱؎ ۱۷۶۱ء میں انھیں خصوصیات کا اظہار کیا۔ اس کی ہیروئن نے بھی کلیریسا کے نمونے پر ضمیر ہی کو انسانیّت کا سچا رہنما قرار دیا۔ روسو کی ہیروئن کلیریسا سے زیادہ خوش نصیب تھی، کیونکہ اس نے ناجائز محبّت کا راستہ چھوڑ کر شادی اور امومت میں شادمانی حاصل کی۔

ناول کی ادبی شکل اٹھارھویں صدی میں پیدا ہوئی، خصوصاً انگلستان میں انگریزوں کے کامل الفن افسانہ نگار سب کے سب جذباتیّت کے پیرو نہ تھے۔ ٹوبیاس سمولٹ نے راڈرک رینڈم (۱۷۴۸ء) میں جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں، بحری زندگی کے متعلّق صحیح روداد پیش کی تھی، جس میں بتایا تھا کہ تجربات کے کارکنوں پر کیا کیا ظلم ہوتے ہیں اور انھیں کیسی کیسی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ ہنری فیلڈنگ ۲؎ نے اسلوب تحریر میں طنز کی آمیزش کر لی اور رچرڈسن کی لغویات کا مذاق اڑایا۔ ٹام جونز ۳؎ (۱۷۴۹ء) فیلڈنگ کا شہکار تھا۔ اس میں انگلستان کی پوری مجلسی و عمرانی زندگی کے نقشے پیش کیے گئے۔ ان نقشوں میں دیہاتی امیر بھی شامل تھے، جو سواری کے بڑے مشتاق تھے اور شہر کے گندے حصّوں میں رہنے والے

۱؎ La Nonvelle Heloise   ۲؎ Fieldins   ۳؎ Tom-Jones

پست کردار بھی۔ رچرڈسن نے انگریزی ناول میں جذباتی اور اخلاقی خلوص پیدا کیا۔ سمولٹ اور فیلڈنگ نے حقیقت پسندی کا اضافہ کر دیا۔

غرض دورِ تنویر نثر نگاری کا دور تھا، چند مستثنیات کے ساتھ ــــ خصوصاً الگزانڈر پوپ (۱۶۸۸ء - ۱۷۴۴ء) ــــ اس دور میں کوئی بڑا شاعر پیدا نہ ہوا۔ اس زمانے کی ادبی یادگاریں یا تو انگریزوں کے بڑے بڑے ناول تھے یا والٹیئر کے مقالات و حکایات یا فلسفیوں کے خطوط اور متفرق تحریرات۔ سب سے آخریں، مگر کسی سے کمتر نہیں، گبن کی کتاب آتی ہے یعنی "سلطنتِ[1] روما کے زوال و ہبوط کی سرگزشت" (۱۷۸۸ء)۔ ایڈورڈ گبن نے تاریخ کے ذریعے سے والٹیئر کے انداز میں مسیحی تعصب پر حملہ کیا اور سسرو کے اسلوب نثر نگاری کو کمال پر پہنچا دیا، جس کا توازن اور نظم دورِ عقلیت کے کلاسیکی مزاج کے عین مطابق تھا۔ روشن خیال فضلاء نے فرانس میں بڑا انسائیکلوپیڈیا تیار کیا اور ڈاکٹر جانسن نے انگلستان میں ڈکشنری مرتب کی (۱۷۵۵ء)۔

ڈاکٹر سیموئل جانسن کی حیثیت ایک مستبد و خود مختار کی سی تھی۔ وہ انگریزی زبان میں نیوٹن کا درجہ حاصل کرنے پر تُل گیا۔ ڈکشنری کی تمہید میں اس نے اعلان کیا:

> "جب میں نے پیشِ نظر کام کا ابتدائی جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہماری زبان بڑی وسیع ہے، مگر اس میں کوئی نظم اور کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ میں نے جس طرف نظر دوڑائی، یہی معلوم ہوا کہ کسی نہ کسی پیچیدگی کی عقدہ کشائی ضروری ہے اور کسی نہ کسی پریشانی کو ضبط و نظم میں لانا لازم ہے۔ میرے سامنے تنوّع کا ایک بیکراں سمندر موجود تھا، اس میں سے مختلف چیزیں منتخب کرنی تھیں اور انتخاب کے کوئی قائم شدہ اصول موجود نہ تھے۔ تصرّفات کا سراغ لگانا تھا، لیکن اخلاص و پاکیزگی کا کوئی مسلّمہ معیار موجود نہ تھا۔ مختلف اسالیبِ بیان موجود تھے، جن کے بارے میں ردّ و قبول کا فیصلہ کرنا تھا۔ مگر کوئی ایسی دستاویز موجود نہ تھی، جو کلاسیکی شہرت یا مسلّمہ سند کے کسی مصنّف کی طرف سے موجود ہوتی۔"

ڈاکٹر جانسن نے جن مشکلات کا ذکر کیا، ان سے بڑی حد تک وہ قابلیّت کے ساتھ عہدہ برآ ہوا، اگرچہ بعض اوقات دانش فروشی اور تعصّب اس پر غلبہ پاتا رہا۔ مثلاً اس نے کھانسی کی تعریف یوں کی ہے: "پھیپھڑوں کا تشنّج جس سے اضطراراً تر پانی نکلتا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ تعریف لاطینی کے کم معلوم الفاظ کے استعمال کی نہایت خوف ناک مثال ہے۔ جانسن خود ٹوری تھا۔ لفظ وِگ اس کی ڈکشنری میں آیا تو لکھ دیا کہ یہ ہمارے ہاں تفرقے کی ایک نہایت ناخوشگوار اصطلاح ہے۔

---

[1] History of the Decline and Fall of the Roman Empire

اس کے برعکس لفظ ٹوری کی تشریح کی: "وہ شخص جو مملکت کے قدیم دستور سے وابستہ ہو" اور جہاں اسے موقع ملتا، وہ اپنے محبوب ہدف یعنی اہلِ سکاٹ لینڈ پر گولہ باری کرنے سے کبھی نہ چوکتا۔ مثلاً جَو کی تعریف یوں کی: "ایک غلّہ، جسے انگلستان میں عموماً گھوڑوں کو کھلاتے ہیں، مگر سکاٹ لینڈ میں لوگ کھاتے ہیں۔"

فن دورِ تنویر کی کلاسیکیت نے فن پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ گبن کی طرح عظیم القدر تاریخ ماہرین آثار قدیمہ اور فضلاء کی چھان بین ۱۷۴۸ء میں قدیم رومی پومپی آئی کے محفوظ کھنڈروں کی برآمد (جو ویسوویس[1] کے لاوے میں دبے ہوئے تھے) نے کلاسیکی قدامت کے متعلّق دلچسپی اعلیٰ پیمانے پر قائم رکھی۔ یونانی اور رومی معبدوں کا توازن و تناسب دورِ تنویر کے نزدیک عمارتوں میں طبعی قوانین کی پابندی کی ایک مثال تھا۔ ماہرینِ تعمیرات باردنی اسلوب سے ہٹ گئے تھے، جس میں آرائش پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا تھا اور انھوں نے کلاسیکی نمونے اختیار کر لیے تھے، جن میں ہنرمندی اور تنوع کے کرشمے دکھائے۔ شہر لندن کے مقاموں کی نفاست، پیرس میں پلیس[2] دالاکنکورد کے آس پاس کی عمارتوں کی عظمت و شان، مونٹ ورنون[3] میں جارج واشنگٹن کے مکان کی دیہاتی جاذبیت جیسی چیزیں پیدا ہوئیں۔ بیسویں صدی میں نوآبادیاتی اور جارجی نمونوں کی ہردلعزیزی اٹھارھویں صدی کی نئی کلاسیکیت کے پائدار اثر کی شہادت ہے۔

اس صدی کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ مکانوں کی آرائش کے لیے سادہ، خوش وضع، مگر اچھا طریقہ اختیار کیا گیا۔ فرانسیسی کاریگروں نے وہ نمونے تیار کیے، جنھیں "لوئی پانزدہم" اور "لوئی شانزدہم" کہتے ہیں۔ ہیپل وھائٹ[4] اور شراٹن[5] نے انگریزی مکانوں کے لیے نئی کلاسیکی وضع کا فرنیچر تجویز کیا۔ یوشیا ویجوڈ[6] (۱۷۳۰ء۔۱۷۹۵ء) نے چینی کے نہایت عمدہ ظروف تیار کر دیے، جو واجبی قیمت پر بکنے لگے۔ ویجوڈ نے قدیم نمونوں اور نقشوں کا بھی احترام قائم رکھا۔ پھر نومولود صنعتی انقلاب کی نئی تکنیک بھی استعمال کی۔ اس نے ظروف بنانے کے لیے دخانی انجن سے کام لیا۔ ساتھ ہی کاریگر مزدور کام میں لگائے، لیکن چینی کے برتنوں پر یونانی اور رومی وضع کی آرائشیں کیں۔ اس نے اپنے کارخانے کا نام اتروریا[7] رکھا۔ یہ قدیم رومی

---

[1] یہاں مصنّفین کو غلط فہمی ہوئی۔ ویسوویس کے دامن میں دو بڑے شہر تھے، ایک ہرکولینیم، دوسرا پومپی آئی۔ لاوے کا رخ ہرکولینیم کی طرف رہا اور اس کی کوئی چیز سلامت نہیں نکلی، کیونکہ لاوا مکانوں کے اندر خالی جگہوں میں بھر کر سرد ہوا تو پورا شہر ایک چٹان بن گیا۔ پومپی آئی کی جانب صرف سنگریزے اور راکھ آئی تھی، یہ شہر انھیں چیزوں میں دب گیا تھا، چنانچہ اس کے اکثر مکان اور دبے ہوئے ڈھانچے سلامت نکل آئے اور اب پومپی آئی کا نقشہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے۔ اکثر مکانوں کی دیواریں اور بازار محفوظ ہیں۔

[2] Place de Concorde پیرس کا مشہور چوک۔ [3] Mont Vernon ورجینیا ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک قصبہ، جو جارج واشنگٹن کا وطن تھا اور واشنگٹن سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ [4] Hepplemhite

[5] Sheraton [6] Josiah Wedgwood [7] Etruria

زمانے میں گلی ظروف بنانے کا خاص مقام تھا۔

انگریزی مصوری بھی نئے کلاسکی اثر سے باہر نہ رہی۔ جارج کے زمانے کے انگلستان میں سر جوشوا رینلڈز[۱] (۱۷۲۳ء۔ ۱۷۹۲ء) کو فن میں سب سے اونچا مرتبہ حاصل تھا۔ وہی رائل اکاڈمی کا پہلا صدر تھا۔ اس نے اکاڈمی کو بتایا کہ جمالِ فطرت کے یکساں، دائمی اور غیر متبدّل قوانین پر مبنی ہے۔ اس کی چھان بین عقل کے ذریعے سے کی جاسکتی ہے اور اسے مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ جن تصاویر میں تناسب نہیں، وہ سب باطل ہیں:

"اعضاء کا عدم تناسب درست نہیں، کیونکہ یہ حقیقت کا نمائندہ نہیں ہو سکتا، جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ اعضاء یا اجزاء کو کُل سے کوئی تعلق نہیں۔ رنگ اُسی وقت صحیح ہوتا ہے، جب چمک دمک، ملائمت، ہم آہنگی اور مشابہت میں آنکھ سے طبعی مطابقت پیدا کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تصویر ریاضیاتی شکل کی مانند درست ہو۔ اس کی درستی کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو ایسی چیزوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔"[۲]

سر جوشوا اور اس کے معاصرین اگرچہ مدلّل جمالیات کی دعوت دیتے رہتے تھے، مگر دولتمند انگریز اُمراء کی جو تصویریں انھوں نے بنائیں، ان میں گرمجوشی اور زندگی پیدا کرتے رہے۔ یہ رینلڈز، لارنس، گینز بارو[۳]، رومنی[۴] اور بہت سے دوسرے لوگوں کا دَور تھا، جسے انگریزی مصوری کا عہدِ زرّیں کہنا چاہیے۔

یہ ولیم ہوگارتھ[۵] (۱۶۹۷ء۔ ۱۷۶۴ء) کا بھی دور تھا، جس نے نئی کلاسیکیت کی دبستانی پابندیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تاکہ فن میں وہی کارنامے انجام دے، جو فیلڈنگ کے ناول میں انجام دیے تھے۔ وہ چند دولتمند سرپرستوں کے لیے تصویریں بنانے کے بجائے کھُدی ہوئی تصویروں کی منڈی تلاش کر رہا تھا اور اس لیے ان کی ہزاروں نقلیں تیار کرلیں۔ اس نے لندن کے تناسب اور ہم آہنگی کے بجائے انتہائی بے تکلفی سے لندن کے مصائب کے خاکے پیش کیے۔ اس کی تصویر "میریج آلاموڈ"[۶]، "دی ریکس پروگریس"[۷]، "دی ہارلٹ پروگریس"[۸]، "بیئر سٹریٹ"[۹] اور "جن لین"[۱۰] معاشرے پر طنز اور عبرت کی حیثیت رکھتی تھی، خصوصاً معاشرے کے شراب نوشوں اور تعیش پسند لوگوں کے لیے۔

نئے کلاسکی فن کے عام رجحان کے خلاف ہوگارتھ کی خصوصیت محض حقیقت پسندی تک محدود نہ تھی۔ شرقی، طبعی اور گاتھی آثار نے انیسویں صدی کے اوائل کی رومانیت پسندی میں اہم عناصر کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ان کی ابتدا ہوگارتھ ہی کے

۱۔ Gohnsa Reynolds ۲۔ رینلڈز کے مکالمات ص ۹۷ ۳۔ Gani sbaraugh

۴۔ Romney ۵۔ Mogarth ۶۔ Marriageala mode

۷۔ The Rahesprogress ۸۔ The Harlotprogress

۹۔ Beer Street ۱۰۔ Gin Lane

زمانے میں ہوئی۔ بیرونی چیزوں کا ذوق زیادہ ہو گیا تھا، اس وجہ سے چینیوں کی پیروی میں دیواروں پر کاغذ لگانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹامس[1] چپنڈیل نے چینی فرنیچر تیار کیا اور پلیٹوں پر چینیوں کے عام طریقے کے مطابق بیل کے نقش بننے لگے۔ باغوں میں پگوڈے، مینار اور چھوٹی چھوٹی مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ باغبانوں نے لوئی چہار دہم کے زمانے کی طرح ہندسی نمونے اور جھاڑیوں کی مصنوعی ساخت ترک کر دی اور اس کی جگہ انگریزی وضع کے باغ عام ہو گئے، جن میں کوئی خاص ترتیب اور تراش خراش پیش نظر نہ ہوتی تھی۔ باغ جتنا زیادہ سے زیادہ بے ترتیب ہوتا اور اس سے قلب پر طبعی اثر پڑتا، اتنا ہی اسے اچھا سمجھا جاتا۔

نئے کلاسیکی فن تعمیر کی عظمت بھی خطرے میں پڑ گئی۔ انگلستان کے مشہور وزیر اعظم رابرٹ والپول کے بیٹے ہاریس والپول نے سٹرابیری[2] ہل رنز (لندن) میں ایک مکان بنوایا، جس میں گاتھی طرز تعمیر کے احیاء کے بدترین خط و خال جمع کر دیے گئے۔

بڑے بڑے موسیقار

اٹھارھویں صدی کی ثقافت کا تاج عظمت موسیقی کو حاصل ہوا۔ صدی کا نصف اوّل باخ ہینڈل کا دور تھا اور نصف دوم میں ہاون اور موزارٹ کا دور دورہ رہا۔ جوہن[3] سیبسٹین باخ (۱۶۸۵ء سے ۱۷۵۰ء) نے سترھویں صدی کے نغمہ نگاروں کی باروقی تکنیک کمال پر پہنچا دی۔ اس نے فوگ[4] کے مشکل فن پر عبور حاصل کیا۔ یہ دورہ خوانی کی ایک پیچیدہ تعبیر ہے، جس میں نولے اصلی کی ہر آواز از سر نو شروع ہوتی ہے اور باقی آوازوں کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔ اس نے ریاضیات موسیقی کے پُر پیچ مسئلے کو شش بحری نوگ کی ایجاد سے حل کر دیا۔ یہی چیز اس نے اپنے ہدیۂ موسیقی کے لیے اختیار کی، جس کی اساس نوائی فریڈرک اعظم شاہ پروشیا کی نوا پر مبنی تھی۔ باخ نے ضمناً ارغنون کے لیے مختلف نوائیں بہ کثرت ایجاد کیں اور ارغنون حد درجہ باروقی و مذہبی آدم موسیقی ہے۔ باخ کی مذہبی موسیقی ڈرامائی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا اثر بہت گہرا تھا۔ یہ دورِ تنویر کے خلاف مذہب مزاج سے ایک جداگانہ دنیا تھی۔

باخ ایک جرمن ارغنون نواز اور مذہبی گانوں کا کامل الفن استاد تھا۔ جارج فریڈرک ہینڈل[5] (۱۶۸۵ء سے ۱۷۵۹ء) نے ہنگامہ خیز بین الاقوامی کردار ادا کیا۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا، اٹلی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر جوانی کا زیادہ تر وقت انگلستان میں صرف کیا۔ جہاں وہ اوپیرا کمپنی کی تنظیم کے لیے سرگرم کوششیں کرتا رہا، لیکن سازشوں، طبائع کے اختلاف اور مالی پریشانیوں نے، جو فن میں ناگزیر ہیں، اسے تباہ کر دیا۔ پھر بھی اس نے چالیس تمثیلیں لکھیں، جن میں ورکیسز بھی شامل تھی۔ اس نے بائیبل کے رزمیہ مضامین تمثیلوں کے لیے منتخب کیے۔ انھیں میں مسیح بھی شامل ہے۔ یہ تمثیلیں بڑے بڑے مجمعوں میں گانے بجانے کے ساتھ پیش کی گئیں۔ یہ سترھویں صدی کے اٹلی کی تمثیلوں سے مختلف تھیں۔

---

[1] Clippendale

[2] Strawberry Hill

[3] Johann Sebastian Bach

[4] Jugue ایک سُر کا نام۔

[5] Handel

اگرچہ باخ اور ہینڈل نے آلاتِ موسیقی کے بہت سے نغمات و سرود پیدا کیے، لیکن صدی کے نصف دوم میں آرکسٹرا کی موسیقی نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ پھر نئے آلات بروئے کار آگئے، جن میں سے پیانو کو سب سے بلند حیثیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے پردوں والے قدیم آلات کا محدود حلقہ بہت وسیع ہوگیا۔ گیت اور ہم آہنگی کی نئی شکلیں پیدا ہوئیں اور ہم آہنگی کو زیادہ تقویت جوزف ہاون[1] (۱۷۳۲ء – ۱۸۰۹ء) نے دی۔ ہاون نے پچاس سے زیادہ پیانو کے لیے مختلف گیت لکھے، جن میں دو متبادل مضمون باری باری آتے ہیں اور انھیں اس طرح باہم ملا دیا کہ وہ ایک خاص چیز بن گئی۔ ہاون نے آخر کے آرکسٹرا میں گیت استعمال کیے۔

اوپیرا، ہم آہنگی اور متعلقہ چیزوں نے اوجِ کمال وُلف گینگ اماڈیوس موزارت[2] (۱۷۵۶ء – ۱۷۹۱ء) کے عہد میں حاصل کیا۔ طفلی کی حالت میں موزارت سے اس کے باپ نے بیدردی کے ساتھ کام لیا۔ اسے یورپ بھر میں پھرایا، تاکہ نغمہ نگاری کے متعلق اس کی حیرت انگیز قابلیت سب پر نمایاں ہو جائے۔ اسے عمر بھر بے حد کام کرنا پڑا اور آخری دور میں قرضوں کے بوجھ سے دب گیا۔ پینتیس برس کی عمر میں وفات پائی، اس وقت وہ قلّاش محض تھا۔ بچپن ہی میں ہونہاری کے بہترین جوہر اس سے آشکارا تھے، لیکن دوسرے غیر معمولی بچّوں کی طرح وہ خرابیوں سے محفوظ رہا۔ اس کی صلاحیتِ موسیقی جلد اوجِ کمال پر پہنچ گئی، خصوصاً سہولت اور تنوع میں اس نے بہت اعلیٰ درجہ حاصل کیا۔ اس نے متعدد تمثیلیں لکھیں، جن میں سے "جادو کی بانسری"[3] آخری تمثیل ہے۔ اس میں عام اطالوی انداز چھوڑ کر اس نے اسے جرمن انداز بخشا۔ موسیقی بڑی پُرلطف اور خوش گوار ہے۔ البتہ اس میں مبہم سیاسی اہمیت کا ایک پہلو موجود ہے، جس میں جوزف دوم کی روشن خیالی کی حمایت اور میریا تھیریسا کی قدامت پسندی کی مذمت واضح ہوتی ہے۔

ان بڑے بڑے نغمہ نگاروں میں انسانیت کا پہلو بھی موجود تھا، جو دورِ عقلیت میں اکثر ناپید نظر آتا ہے۔ ان لوگوں نے عوامی سُروں اور نغموں سے بھی بے تکلف استفادہ کیا۔ وقت کی ہردلعزیز موسیقی بھی پیشِ نظر رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موسیقی عام بازاروں میں پہنچ گئی۔ موزارت کی تمثیلیں، ہاون کی سمفونی، باخ اور ہینڈل کے مذہبی گیت آج بھی عوام میں ہردلعزیز ہیں۔ ان میں سامعین کے جذبات کو اُبھارنے کی جو صلاحیت ابتدا میں موجود تھی، وہ اب تک باقی چلی آتی ہے۔ اس لحاظ سے موسیقی نے اٹھارھویں صدی کی تہذیب و تمدن کے بڑے تنازع ـــــ عقل و جذبات کے درمیان تنازع، دورِ تنویر کے مجردات اور انسانی زندگی کے حقائق کے درمیان تنازع ـــــ کو خوشگوار طریق پر حل کے قریب پہنچا دیا۔

۱؎ Joseph Haydn

۲؎ Wolfgang Amadeus Mozart

۳؎ The magic flute

صدی اختتام کے قریب پہنچی، تو دوسرے دائروں میں تنازع کو سرگرمی سے جاری رکھنے کے لیے محاذ تیار کر لیے گئے۔ افکار کی دنیا میں کانٹ اور ہیوم کے نظریات فلسفیوں کی عقلیت کو چیلنج کر رہے تھے۔ رومانیت پسند فن کار اور رومانیت پسند اہل قلم کلاسیکیت کے محافظوں پر حملے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ سیاسیات میں صدی کے اختتام پر قوتیں انقلاب فرانس کی روک تھام کے لیے کوشاں تھیں۔ انقلاب فرانس کو روئے زمین پر دورِ تنویر کے عقلی و طبعی قانون اور ترقی کے خواب کی تعبیر کے لیے سب سے بڑی کوشش سمجھنا چاہیے۔

انقلابِ فرانس اور نپولین

بارھواں باب

انقلاب کے اسباب

تمہید ۱۷۸۹ء کے بہت بڑے انقلابِ فرانس کا فوری سبب مالی تھی۔ بجٹ میں خسارہ تیزی سے بڑھتا رہا۔ پھر فرانس نے امریکی انقلاب میں جو امداد دی، اس سے خسارے میں بہت اضافہ ہو گیا اور بادشاہی دیوالے کی طرف پیشقدمی کرتی رہی۔ لوئی شانزدہم نے یکے بعد دیگر مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کیں، مگر سب عبث ثابت ہوئیں۔ آخر "مجلس[1] عام" کا اجلاس طلب کرنا پڑا، جو فرانس کے تمام طبقات کی نمائندہ مجلس تھی اور پونے دو سو سال سے اس کا کوئی اجلاس نہیں ہوا تھا۔ جب قومی نمائندے جمع ہو گئے تو انھوں نے اصلاحات جاری کیں، جن کی وجہ سے فرانس کا نظامِ قدیم تباہ ہو گیا۔

انقلابِ فرانس کے بنیادی اسباب ملک کے معاشرے، اقتصادیات، نیز سیاسی و ذہنی تاریخ میں دُور تک جاتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے نویں عشرے میں جو نازک مالی حالات پیدا ہوئے، وہ سابقہ عشروں نہیں، صدیوں کی مالی بدنظمی کا نتیجہ تھے۔ حکومت دراصل کم از کم لوئی چہاردہم کے زمانے سے دیوالے کو دعوت دے رہی تھی۔ اُمراء اور مذہبی طبقے نے ازمنۂ وسطیٰ کے باقی ماندہ حقوق محفوظ رکھنے کے اہتمام میں وہ حِصّہ لینے سے انکار کر دیا، جو بارِ محاصل کے سلسلے میں از روئے انصاف ان پر عائد ہوتا رہا۔ جن طبقات کو حقوق حاصل نہ تھے، یعنی کسان، مزدور اور سب سے بڑھ کر متوسط شہری طبقہ (بورژوا)، ان میں غیر منصفانہ محاصل اور نا اہل حکومت کے خلاف غیظ و غضب کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ فلسفیوں نے تنویر و روشن خیالی کے جن افکار کی اشاعت کی تھی، ان کے زیرِ اثر طبقۂ اوسط کے غیظ و غضب نے زبردست اصلاحات کے ایک پروگرام کی شکل اختیار کر لی۔

سلطنت فرانس تنویر و روشن خیالی کا مرکز تھا، مگر اسے نپولین کے ظہور تک کوئی روشن خیال مطلق العنان فرمانروا نصیب نہ ہوا۔ لوئی پانزدہم نظامِ قدیم کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے کوئی فیصلہ کُن قدم اٹھانے سے انکار کر چکا تھا۔ جو کام لوئی پانزدہم نے نہیں کیا تھا، وہ اس کا پوتا اور جانشین لوئی شانزدہم (۱۷۷۴ء۔ ۱۷۹۲ء) نہیں کر سکتا تھا، حالانکہ وہ اپنے دادا کے برعکس پُرخلوص، نیک نیّت اور پرہیزگار تھا۔ اگرچہ اس کا جسم فربہ اور بھدّا تھا، مگر اس نے اپنے خاص مشاغل یعنی شکار اور قفل سازی میں حقیقی مہارت حاصل کر لی تھی، لیکن ذہن کا ذرا کُند تھا۔ پھر اس میں نہ عزم تھا اور نہ استقامت تھی۔ اسے

---

[1] Estates General یعنی وہ مجلس، جس میں فرانس کے تین طبقے، یعنی مذہبی طبقہ، طبقۂ اُمراء اور طبقۂ عوام کے نمائندے شامل ہوتے تھے۔

ایک مزید رکاوٹ یہ پیش آئی کہ اس کی شادی سیاسی مصلحتوں پر مبنی تھی اور اس کے نقطۂ نگاہ سے وہ خوشگوار ثابت نہ ہوئی۔ اس کی بیگم ماری انتوائنٹ[1] سبک سر بھی تھی اور حالات سے بھی بالکل بے خبر تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ہیبسبرگ خاندان سے میریا تھیریسا کی بیٹی تھی اور اسے دیکھ کر محبِ وطن فرانسیسیوں کے دل میں فرانس و آسٹریا کے اتحاد کی یاد تازہ ہوتی رہتی تھی جس نے ہفت سالہ جنگ میں فرانس کے لیے ذلت کا سامان فراہم کیا تھا۔

مرکزی شاہی مطلق العنانی کی مشینری کے پُرزے تدریجاً الگ الگ ہو رہے تھے، کیونکہ اس مشینری کو ضبط و نظم میں رکھنے کے لیے جس زبردست میکانک کی ضرورت تھی، وہ مہیا نہیں ہُوا تھا۔ وہ مشینری صرف اس لیے کام دیتی رہی کہ نسبتاً چند قابل منتظم اسے مل گئے، خصوصاً وہ منتظم، جن کے حوالے صوبجات فرانس کا نظم و نسق تھا۔ ان میں سے بہترین منتظموں ــــ مثلاً ترگو، جو اصولِ فطرت کے مطابق حکومت کے کاروبار چلانے کا حامی اور لموجیز[2] میں کار فرما تھا ــــ نے روشن خیال مطلق العنانی کی خوشگوار فضا پیدا کر دی، مگر وہ مرکزی حکومت کے تدریجی انحلال کو روکنے کا زیادہ انتظام نہ کر سکی۔

پورا قانونی اور عدالتی نظام اصلاح طلب تھا۔ قانون کو دورِ حاضر کی ضروریات کے مطابق لانا لازم تھا اور تدوینِ نو میں ازمنۂ وسطیٰ کے بیکار باقیات کو حذف کر دینا چاہیے تھا تاکہ دو قانونی نظاموں ــــ رومی اور جاگیر دارانہ، جو فرانس میں رائج تھے ــــ کے درمیان تصادم و تداخل کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ عدالتوں کے کاروبار میں ایسی ترمیمات ناگزیر تھیں، جن کے بعد ان میں مقدمات کے فیصلے جلد ہو سکتے۔ پُورے انصاف سے کام لیا جاتا اور فریقینِ مقدمہ کا خرچ کم ہوتا۔ بہت سے جج اور قانون دان عہدے خرید لیتے یا میراث میں پاتے۔ وہ ان عہدوں کو ایک عوامی امانت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ نجی حصولِ زر کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ لُوئی پانزدہم نے ایک موقع پر سیاسی جمود سے بیدار ہو کر ــــ اور ایسے مواقع شاذ ہی آئے ــــ اپنے وزراء کو اجازت دے دی تھی کہ پیرس کی پارلیمنٹ کو حملے کا ہدف بنائیں، جو خود غرضیوں کا مستحکم حصار اور فرانس کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ اس کے عہدِ حکومت کے آخری کاموں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس پارلیمنٹ کے خاص حقوق منسوخ کر دیے۔ لُوئی شانزدہم تخت نشین ہُوا تو اس نے سب سے پہلے جو کام کیے، ان میں ایک یہ تھا کہ اس پارلیمنٹ کا پورا اقتدار بحال کر دیا۔

طبقۂ اوّل اور طبقۂ دوم | سلطنت کی طرح نظامِ قدیم کی عمرانی اور اقتصادی بنیادیں بھی ہلنی اور گرنی شروع ہو گئی تھیں ۱۷۸۹ء میں تینوں طبقوں کی تعداد اور اراضی کا اندازہ الگ الگ ایک نقشے میں پیش کر دیا گیا ہے[3]

[1] Marie Antoinette
[2] Limoges

[3] ۱۷۸۹ء میں تینوں طبقوں کی کیفیت

	تعداد	تناسب بہ لحاظ آبادی	تناسب بہ لحاظ اراضی مقبوضہ
پہلا طبقہ (مذہبی گروہ)	ایک لاکھ سے دو لاکھ تک	ایک فی صد سے کم	دس فی صد
دوسرا طبقہ (امراء)	چار لاکھ	دو فی صد سے کم	پچیس فی صد
تیسرا طبقہ	دو کروڑ چالیس لاکھ	۹٪ فی صد	
ا کسان	دو کروڑ سے اوپر	-	تیس فی صد
ب متوسط شہری طبقہ	بیس لاکھ سے کم	-	پچیس فی صد

یہ محض سرسری اندازے ہیں جو جی لیفیبر G Lefebvre کی کتاب "انقلاب فرانس" پر مبنی ہیں۔ غالباً شاہانِ فرانس کو دس فی صد میں سے بہت زیادہ زمین حاصل تھی۔

پہلے طبقے کو اٹھارھویں صدی کے فرانس میں نمایاں اہمیت کا مقام حاصل تھا۔ پادریوں کے پاس وسیع اور نفع بخش اراضی تھیں۔ وہ موت وحیات کے اعداد مہیا رکھتے، غریبوں کو امداد دیتے اور جیسا بھی تعلیمی نظام تھا، اسے چلاتے، لیکن کلیسائے فرانس میں تفرقہ موجود تھا۔ نچلے درجے کے پادری تقریباً تمام کے تمام تیسرے طبقہ (طبقۂ عوام) سے لیے جاتے تھے اور طبقۂ عوام ہی کی آرزوئیں اور لغزشیں ان میں بھی موجود تھیں۔ وہ بڑے مسکین تھے، معمولی تنخواہیں پاتے اور عموماً انھیں سخت محنت کرنی پڑتی، لہٰذا وہ اپنے کلیسائی بالادستوں کی دولت اور تکبّر پر سخت خفا تھے۔ بشپوں اور ایبٹوں کا نقطۂ نگاہ امراء کا سا تھا۔ اسی طبقے سے ان کا تعلق تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض اپنے فرائض بڑی سنجیدگی اور اہتمام سے ادا کرتے تھے، مگر کلیسائی عہدوں کو اپنے لیے اطمینان بخش آمدنی کا ایک موزوں ذریعہ تصور کرتے تھے۔ درجنوں رؤسائے کلیسا نے اپنے اپنے مذہبی حلقوں یا خانقاہوں کا انتظام ماتحتوں کے حوالے کر رکھا تھا۔ وہ عہدے کی آمدنی جیبوں میں ڈالتے، پیرس یا درسائی میں زندگی بسر کرتے۔

دولت کی فراوانی اور نظم کی نا استواری نے کلیسا کو اعتراضات کا ہدف بنا دیا۔ نیک دل کیتھولک اس امر کا ماتم کرتے رہتے تھے کہ راہبوں اور راہباؤں کی تعداد فرانس میں کم ہو رہی ہے اور خانقاہوں میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اپنے املاک سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ خوشحال کسان اور شہری لوگ زرخیز کلیسائی جاگیرات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ محصول گزاروں کو شکایت تھی کہ کلیسا ان سے عُشر وصول کر رہا ہے، حالانکہ اگرچہ عُشر کی اصطلاح میں دسواں حصّہ لینا شامل تھا، مگر شاذ ہی لیا گیا تھا۔ پھر انھیں یہ شکایت تھی کہ کلیسا کو محاصل سے بالکل مستثنےٰ کر دیا گیا ہے اور محاصل کے بدلے میں پادری جو حقیر سی رقم بہ طور "ہدیۂ آزاد" دیتے ہیں، وہ بہت کم ہے۔

کسان بہ حیثیتِ عمومی وفادار کیتھولک رہے اور وہ بشپ کا نہیں تو گاؤں کے پادری کا احترام کرتے تھے اور اس سے محبت رکھتے تھے۔ شہری طبقۂ اوسط پادریوں کے خلاف فلسفیوں کے آراء زیادہ سے زیادہ قبول کرتا گیا۔ والٹیئر نے کہا تھا کہ مکروہ شے کو کچل ڈالو۔ فرانس کے طبقۂ اوسط نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ کلیسا کے اختیارات گھٹانے اور اس سے دولت چھین لینے کا یہ اذن نامہ ہے۔

نظامِ قدیم کے امراء بھی بلند منصب مذہبی لوگوں کی طرح دولت وحقوق سے مستفید تھے۔ ساتھ ہی غیر ہردلعزیزی میں بھی حصّہ دار تھے۔ وہ بھی محاصل سے حقیقتاً بالکل مستثنےٰ تھے۔ فوجی کمیشنوں اور اعلیٰ کلیسائی عہدوں پر ان کی اجارہ داری قائم تھی، لیکن فرانس کا طبقۂ اُمراء کسی ایک عمرانی عنصر پر مشتمل نہ تھا، بلکہ اس میں مختلف گروہ شامل تھے۔ سب سے اونچا درجہ موروثی امراء کا تھا۔ ان میں سے چند کا سلسلۂ نسب شاہی خاندان سے ملتا تھا۔ چند ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردار تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی، جو گزشتہ دو یا تین صدیوں میں امراء کے درجے پر پہنچے تھے۔ یہ "امرائے شمشیر زن" اپنے ہم وطنوں کو، جن میں چھوٹے درجے کے امراء بھی شامل تھے، پست درجے کے انسان سمجھتے تھے۔ اگرچہ اورلیانز کے عہدِ نیابت میں وہ بُری طرح ناکام ہو چکے تھے، پھر بھی خواب دیکھ رہے تھے کہ اسی طرح فرانس پر حکومت کریں گے، جس طرح ازمنۂ وسطیٰ میں جاگیردار حکومت کرتے تھے۔ اگر وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے

تو وہ مونٹسک کی "روحِ قوانین" تھی، کیونکہ اس میں موروثی امارت کی تحسین کی گئی تھی۔ وہ سب دربار سائی میں جمع ہو گئے تھے اور سلطنت کے اوّلیں امراء کی حیثیت میں فرائض کو نذرِ تغافل کر دیا تھا۔ آرتھر ینگ ایک مبصر انگریز ماہرِ اقتصادیات تھا، جس نے اٹھارھویں صدی کے نویں عشرے میں فرانس کا دورہ کیا تھا۔ اس نے جنوبی و مغربی فرانس کی غیر مزروعہ اراضی کا ذکر کیا ہے، جن کے مالک اُمراء تھے:

"ان بنجر زمینوں میں سے زیادہ تر کا مالک پرنس ڈی سوبائیز[۱] ہے، جو ان کا کوئی حصّہ بیچنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اسی طرح آپ جہاں کہیں بڑے امیر سے ملیں گے، جس کی لاکھوں کی آمدنی ہوگی، اس کی جائداد یقیناً بنجر ہو چکی ہو گی۔ بوئلان[۲] کے ڈیوک اور مذکورہ بالا پرنس فرانس کے دو سب سے بڑے زمیندار ہیں اور مَیں نے ان کی عظمت کے جتنے بھی آثار دیکھے، بنجر اور صحرا نظر آئے۔ ان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور بوٹیاں اُگی ہوئی تھیں۔ آہ! اگر مَیں ایک دن کے لیے فرانس میں قانون ساز بن جاؤں، تو مَیں ان بڑے بڑے اُمراء کو پھر معمولی خدمت گار بنا دوں۔"[۳]

اُمراءِ شمشیر زن کے بعد ان اُمراء کا درجہ تھا، جنھیں خلعت کے امراء کہنا چاہیے۔ ان میں پیرس کی پارلیمنٹ، دوسری اعلیٰ عدالتوں کے جج اور بے شمار سرکاری افسر تھے۔ ان لوگوں نے یا ان کے آباو اجداد نے منصبِ امرائی خریدا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں یہ مناصب باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملتے تھے، اس لیے ان کی حیثیتِ خرید رفتہ رفتہ مرورِ زمان کے ساتھ گم ہو گئی۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں امراء کے اس گروہ اور امراءِ شمشیر زن میں بہت کم فرق رہ گیا تھا۔ دونوں میں باہم شادی بیاہ کے مراسم عام تھے۔ مزید برآں اگرچہ دوسرے درجے کے امراء اونچے خاندانی شجرے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے، مگر انھیں عہدے حاصل تھے اور دولت بہ کثرت جمع کر لی تھی۔ بہ حیثیتِ مجموعی یہ لوگ امراءِ شمشیر زن سے زیادہ دولتمند تھے اور ورسائی کے سوا تقریباً ہر مقام پر ان کا اثر و اقتدار بہت بڑھا ہُوا تھا کیونکہ یہ کلیدی سرکاری مناصب پر مضبوطی سے قابض تھے۔ نظامِ قدیم پر جانکنی کا دَور طاری تھا تو پارلیمنٹ کے دولتمند جج خاص حقوق کے قابل ترین اور مستعد ترین حامی بنے ہُوئے تھے۔

بہت سے اُمراء کے پاس دولت، اقتدار یا شان و شکوہ کم تھا۔ ان کا تعلّق فرانسیسی امراء کے سب سے نچلے اور بہ اعتبار تعداد سب سے بڑے طبقے کے ساتھ تھا۔ انھیں "ہوبرٹیو"[۴] کہتے تھے، یعنی چھوٹے باز یا چڑیاں مارنے والے باز۔ یہ لوگ اٹھارھویں صدی میں ازمنۂ وسطیٰ کے سادہ نائٹوں کا مثنیٰ تھے، جو جاگیرداری کے مینار میں سب سے نیچے تھے۔ یہ اپنے مضافاتی مرکز میں رہتے، کیونکہ نہ کوئی سرکاری عہدہ خرید سکتے تھے اور نہ دربار میں تعیش کے مصارف برداشت کر سکتے تھے۔ ان میں سے بعض اتنے غریب تھے کہ خود اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ روایتی حیثیت میں سے جو کچھ بھی باقی رہ گیا ہے، اسے محفوظ رکھیں۔ چنانچہ یہ کسانوں سے جاگیردارانہ رقمیں وصول کرنے پر سخت اصرار کرتے تھے۔ انھوں نے

---

[۱] Prince de Soubise [۲] Bouillon

[۳] Travels in France (فرانس میں سیاحت)، ص ۴۲ [۴] Hobersaux

پرانی دستاویزیں کھود کھود کر نکالیں، جن کی بناء پر بھولے ہوئے محاصل از سرِ نو عائد کر دیے۔ اس طرح کسانوں میں یہ انتہائی نفرت وحقارت کا ہدف بن گئے۔ انھیں کی وجہ سے دورِ انقلاب میں دستاویزیں نذرِ آتش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہر امیر درباری نہ تھا اور نہ اپنی حیثیت برقرار رکھنے کا غرض پرستانہ داعی تھا۔ بعض رفتہ رفتہ اپنا درجہ چھوڑ کر عمرانی زینے میں نیچے اُتر آئے اور کسان بن گئے۔ بعض نے دولت کے لالچ میں کاروبار شروع کر دیا۔ امراء کے بلند ترین خاندانوں نے بھی روشن خیال لوگ پیدا کیے، جنھوں نے انقلاب کی حمایت کی۔ کاؤنٹ[1] ڈی لے نوجوان امراء میں، جو لوئی شانزدہم کے دربار سے وابستہ تھے، ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کیا:

"بہ ظاہر ہم ایک دقیانوسی نظام کے قدیم باقیات کا احترام کرتے رہے۔ اگرچہ عمارت کی وضع قطع محفوظ تھی، ہم نے اندازہ نہ کیا کہ اندر سے اس کی بنیاد کھوکھلی کی جا رہی ہے۔ قدیم درباریوں اور پادریوں نے روحِ جدّت کی سخت مذمّت کی۔ اس طرح خطرے کا اظہار کیا مگر ہم ان کے شور و غل کو محض ایک مذاق سمجھتے تھے۔ ہمارے تھیٹروں میں جب جمہوریت کے مناظر آتے، تو دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے۔ اپنے فضلاء کے فلسفیانہ مذاکرات، نیز اہلِ قلم کے جسارت آمیز بیانات کی ستائش کرتے۔ آزادی کی زبان خواہ کچھ ہوتی، یہ اپنی بلندی کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتی۔ مساوات کو ہم سہل سمجھتے۔ اس وقت تک جھکے رہنا باعثِ مسرّت ہے، جب تک انسانوں کو یقین ہو کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق سیدھا بھی کھڑا ہو سکے گا۔ بہ ہر حال ہم نے امیری کے فوائد سے لذّت حاصل کی، ساتھ ہی عوامیّت کے فلسفے کے مزے لیتے رہے۔ مستقبل کے متعلق ہم میں کوئی دُور بینی موجود نہ تھی۔"[2]

یہی نوجوان اُمراء تھے، جنھوں نے "فگارو[3] کی شادی" کے ڈرامے میں باتدبیر فگارو کو بومارشائس[4] کے مقام پر اپنے مجلسی برتروں کو چکما دیتے ہوئے دیکھا تو نعرے بلند کیے، حالانکہ یہ ڈراما اُمراء پر ایک طنز تھا اور یہ پہلے پہل ۱۷۸۴ء میں سٹیج پر دکھایا گیا تھا۔

تیسرا طبقہ

پہلے دو طبقوں میں فرانسیسی قوم کا صرف ایک چھوٹا سا حصّہ شامل تھا۔ کم از کم پچانوے فی صد فرانسیسی ۱۷۸۹ء میں تیسرے طبقے سے تعلّق رکھتے تھے۔ ان میں سے بہت بڑی اکثریت کسانوں کی تھی۔ بعض اعتبارات سے فرانس میں کسانوں کی حیثیت یورپ کے دوسرے حصّوں کے بجائے خاصی خوشگوار تھی۔ زرعی غلامی لورین[5] اور فرانش کومٹے[6] کے سوا پورے فرانس سے غائب ہو چکی تھی، اگرچہ یہ مشرقی اور وسطی یورپ میں عام تھی۔ انگلستان میں امراء اپنے املاک کو محصور کر کے چھوٹے

---

۱ Count de Segur — ۲ The Memoirs and-Anec- dotes of the Count de Segur

۳ The marriage of Figaro — ۴ Beaumarchais

۵ Lorraine — ۶ Franche Comte یہ برگنڈی کا ایک ضلع ہے

کسانوں کو تدریجاً باہر نکال رہے تھے۔ فرانس میں لاکھوں چھوٹے کسانوں کے پاس زمینیں موجود تھیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر چار بالغ کسانوں میں سے تین کے پاس تھوڑی بہت زمین ضرور تھی۔

تاہم آرتھر ینگ کی گہری نظر نے ۱۷۸۷ء اور ۱۷۸۹ء میں دیہات کے اندر بدحالی کے بہت سے آثار دیکھے۔ مثلاً وہ جنوبی و مغربی فرانس کی حالت بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:

"پیرک[1] سے آگے بڑھتے ہی بہت سے بھکاری ملے۔ پہلے ایسی حالت کبھی نہ دیکھی تھی۔ ملک کی تمام لڑکیاں اور عورتیں جرابوں اور جوتوں کے بغیر دیکھیں اور ہل چلانے والے اس حالت میں کام کرتے پائے گئے کہ نہ ان کے پاس کھڑاؤں[2] تھی، نہ جرابیں۔ یہ افلاس کی ایسی صورت ہے کہ قومی خوشحالی کی جڑ پر ضرب لگاتی ہے ...... یہ حالت دیکھ کر مجھے آئرلینڈ کی بدحالی یاد آگئی۔"[3]

ینگ نے خوشحال خطے بھی دیکھے۔ اگرچہ زرعی بدحالی کے درجات صوبہ بہ صوبہ مختلف تھے، لیکن مجموعی تصویر روشن نہ تھی۔ مصیبت کا اصل باعث تین عامل تھے: یعنی زراعت کے پسماندہ طریقے، زمین کی قلت اور آبادی کی زیادتی۔

زرعی انقلاب کے عمدہ طریقے ۱۷۸۹ء سے پیشتر فرانس میں عام نہ ہو سکے۔ وسیع رقبوں میں فصلیں بوئی ہی نہیں جاتی تھیں یا ازمنۂ وسطیٰ کے دستور کے مطابق انھیں ہر دوسرے یا تیسرے سال بے کاشت چھوڑ دیا جاتا تھا۔ آبادی بہت زیادہ ہو چکی تھی اور مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اسے نہ پورے وقت کے لیے روزگار کا کوئی ذریعہ ملتا تھا اور نہ وہ اچھی زندگی بسر کر سکتی تھی۔ قدیم زمانے کی زراعت کے لیے وسیع رقبے درکار تھے، لیکن جو نقشہ ہم پہلے پیش کر چکے تھے، اس پر ایک نظر ڈال لینے سے واضح ہو جائے گا کہ تین چوتھائی فرانسیسی کسانوں کے پاس ایک تہائی سے بھی کم زمین تھی۔ ملکیت کا اوسط اتنا کم تھا کہ جب فصل اچھی نہ ہوتی تو خاصی بڑی زمین کے مالک کے لیے بھی بھوکوں مرنے کا خطرہ درپیش رہتا۔ جن کسانوں کے پاس کوئی زمین نہ تھی، وہ یا تو بھیک مانگتے یا چوری کرتے۔

قیمتوں کی زیادتی اور محاصل کی گرانباری نے کسانوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں اشیاء کی قیمتیں فرانس کے اندر بڑھتی گئیں۔ اس سے اکثر قصبے خوشحال ہو گئے، لیکن پسماندہ دیہاتی طبقے کی اقتصادی حالت کے لیے یہ افراطِ زر ایک نئی مصیبت بن گئی۔ کھیتوں میں پیدا ہونے والی جنسوں کی قیمت اُس تیزی سے نہ بڑھی، جس تیزی سے اُن اشیاء کی قیمت بڑھ گئی، جن کی خرید پر کسان مجبور تھے۔ اس وجہ سے کسانوں کی حقیقی آمدنی کم ہو گئی۔ وہ اعلیٰ درجۂ معیشت کے شکار بن گئے۔

۱۔ Payrac
۲۔ Sobots یہ لکڑی کے جوتے ہوتے تھے جو فرانس اور بلجیم کے کاشتکار ہل چلاتے وقت پہنتے تھے۔
۳۔ فرانس میں سیاحت ص ۲۳-۲۴۔

کسان کلیسا کو عُشر دیتے تھے اور امراء نے دقیانوسی واجبات عائد کر کے انھیں وصول کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ان کے علاوہ کسان سلطنت کو زمین کا مالیہ، انکم ٹیکس، محصولِ سر اور دوسرے محاصل ادا کرتے تھے، جن میں سب سے بڑھ کر قابلِ نفرت محصول وہ تھا، جسے گیبلؔ[1] کہتے تھے، یعنی وہ حکومت سے نمک خریدنے پر مجبور تھے، جو عموماً بہت گراں قیمت پر ملتا۔ حکومت نے معاملات میں مزید خرابی یوں پیدا کر دی کہ امراء کی زمینوں پر بھی وہی ایک چوتھائی مالیہ لگایا، جو عوام کی زمینوں پر عائد تھا۔

فرانس میں زرعی بدامنی کی تاریخ بہت طویل ہے اور یہ چودھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۷۸۹ء تک بے روزگاری اور افلاس نے کسانوں میں انقلابی مزاج پیدا کر دیا تھا۔ وہ حکومت کی شکل میں تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے دورِ تخویر کے اصلاحی پروگرام کو نظر انداز کر دیا، لیکن انھیں مزید زمینوں کی حد درجہ ضرورت تھی اور وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مذہبی گروہ اور امراء سے بھی زمینیں لے لینا جائز سمجھتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ان پر جو واجبات عائد تھے، چاہتے تھے کہ وہ ختم ہو جائیں اور وہ اس نظامِ محاصل سے نجات کے خواہاں تھے، جس کی سب سے بڑی زد اُن لوگوں پر پڑتی تھی جو ادا کرنے کی کم سے کم صلاحیت رکھتے تھے۔

تیسرے طبقے میں مزید شہری مزدور اور کاروباری لوگ تھے۔ ان کے لیے بھی نظامِ قدیم سے وابستگی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں مزدوروں سے وہ لوگ مراد لیے جاتے ہیں، جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور خود آگاہ جماعت کی حیثیت میں زندگی گزارتے ہیں۔ انقلاب سے پیشتر کے فرانس میں ایسی کوئی چیز موجود ہی نہ تھی، تاہم ہر اچھے قصبے میں اُجرت پر کام کرنے والے لوگ موجود تھے، جو معمولی کاروبار یا دوکانوں میں ملازم تھے۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں کا سب سے زیادہ اثر انھیں شہری مزدوروں پر پڑتا تھا، لیکن انقلاب میں کوئی بڑا حصّہ لینا اُن کے لیے ممکن نہ تھا، کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے یہ بکھرے ہوئے تھے اور ان میں کوئی طبقاتی اتحاد موجود نہ تھا، البتہ وہ متوسّط شہری طبقے کی رہنمائی میں چل نکلنے کے لیے تیّار تھے۔

فرانس کے متوسّط شہری طبقے میں مختلف وسائل اور مختلف مفادوں کے لوگ شامل تھے۔ شہروں میں دولتمند تاجر اور بینکر، دیہات میں سٹور کیپر اور قانون دان، قصبوں میں ڈاکٹر اور دوسرے پیشہ ور آدمی اور ہزاروں دستکار، جو اپنا معمولی کاروبار چلا رہے تھے۔ وہ خاص حقوق والی جاگیرداریوں کے سخت دشمن تھے اور فلسفیوں کے پروپیگنڈے کا خیر مقدم انھوں نے گرمجوشی سے کیا تھا۔ ان رشتوں نے اس متوسّط طبقے کو ایک سیاسی قوت میں تبدیل کر دیا تھا۔ انھیں کسانوں اور مزدوروں کے مقابلے میں بہت کم مشکلات سے سابقہ تھا، لیکن یہ نظامِ قدیم کی خرابیوں پر بہت رنجیدہ تھے۔ اگرچہ یہ اپنی آمدنی کا بہت کم حصّہ محاصل میں ادا کرتے تھے، لیکن نامساواتِ تشخیص کی مذمّت میں یہ سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ قیمتوں کے بڑھ جانے سے زیادہ دولتمندوں اور زیادہ منچلے آدمیوں کو بہت فائدہ پہنچا تھا، تاہم انھیں گلڈ کے ضابطوں اور پرانی پابندیوں کے متعلق شکایت تھی، جو اُن کی آزاد تجارتی سرگرمیوں میں رکاوٹ کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس بات پر بھی

[1] Gabelle

ناراض تھے کہ اُمراء انھیں حقیر نظروں سے دیکھتے ہیں اور بادشاہ کی دوسرے درجے کی رعایا کا سا سلوک کرتے ہیں۔ نیز انھیں فوج اور کلیسا کی ملازمتوں سے باہر رکھا جاتا ہے۔

غرض متوسط شہری طبقے کو اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ وہ برابر کے سیاسی اور عمرانی حقوق حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ چونکہ وہ کسانوں اور اُجرت پر کام کرنے والے مزدوروں سے زیادہ مالدار، بہتر تعلیم یافتہ اور بدرجہا بلند آہنگ تھے، اس لیے انھوں نے پورے تیسرے طبقے کی طرف سے شکایات مرتب کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ یہ شکایات بیانات کی شکل میں پیش کی گئیں، جنھیں "کاہیئر"[1] کہتے تھے اور یہ ۱۷۸۹ء میں قومی مجلس کے سامنے پیش کر دی گئیں۔

وردن کے ضلع لونگویاں[2] کے تیسرے طبقے نے جو شکایات پیش کی تھیں، انھیں متوسط شہری طبقے کے اصلاحی پروگرام کا ایک اچھا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ شکایت نامے کا خاصا بڑا حصّہ صرف مقامی مسائل سے متعلق تھا، مثلاً لوہا پگھلانے والوں کے لیے ایندھن مہیا کرنے کی غرض سے ضلع کے جنگلات کی بربادی وغیرہ۔ بعض حصّوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو وقت کے بڑے مسائل کا پورا احساس ہے۔ مثلاً کہا گیا تھا کہ مطابع کو آزادی ہونی چاہیے، جو خرابیوں کے خلاف مستحکم ترین ذریعۂ حفاظت اور آزادیِ قوم کی بحالی کا انتہائی یقینی ذریعہ ہیں۔ ساتھ ہی تعزیری قوانین کی سختی کا ماتم کیا گیا تھا اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ انھیں فرانسیسی قوم کے کردار و مراسم کے مطابق لانا چاہیے، جو کائنات انسانیت کی شریف ترین قوم ہیں۔ سفارش کی گئی کہ ایک عمرانی معاہدہ، یا عوام و بادشاہ کے درمیان ایک معاملہ ہو جانا چاہیے، جس کے مطابق تمام شہریوں کی شخصی آزادی محفوظ ہو جانی چاہیے اور ان تمام تباہی خیز معاملات کے اعادے کا انسداد لازم ہے، جو فی الحال بادشاہ اور قوم کے لیے باعثِ اذیت ہیں۔ علاوہ بریں شکایت نامے میں شخصی ملکیت کے تقدّس پر زور دیا گیا تھا اور روسو کے سیاسی فلسفے کے ساتھ ساتھ اس کے اقتصادی اصول کی مذمت کی گئی تھی۔ بہ ایں ہمہ لونگویاں کے تیسرے طبقے کا عقیدہ یہ تھا کہ مساوات کا درجہ زیادہ وسیع ہونا چاہیے۔ مثلاً عام فرانسیسیوں کو حق اور امید ہے کہ وہ ہر درجے کا فوجی اور کلیسائی عہدہ حاصل کر سکیں گے۔ مروّجہ محاصل ختم کر دینے چاہئیں، ان کی جگہ تمام املاک کے مطابق مالکوں پر بلا امتیاز محاصل عائد کر دینے چاہئیں۔ کسی درجے اور حیثیّت کا امتیاز نہ ہونا چاہیے۔

مالی بحران

فرانسیسی سلطنت کی مزمن مالی مشکلات میں متوسّط طبقے کے مصلحین کی حیثیّت مستحکم کر دی۔ سرکاری قرضہ لوئی شانزدہم کی مسند نشینی کے وقت تک خاصا بڑھ گیا تھا۔ ۱۷۷۴ء اور ۱۷۸۹ء کے درمیان یہ تین گنا ہو گیا۔ ان میں سے نصف اضافہ صرف امریکہ کی جنگِ آزادی میں فرانسیسیوں کی شرکت کے باعث ہوا۔ ۱۷۸۹ء میں قرضہ ساڑھے چار ارب ریور[3] تھا۔ ۱۷۸۸ء کے بجٹ کا مطالعہ (جو نظامِ قدیم کا آخری بجٹ تھا) چونکا دینے والا تھا:

---

[1] Cahier اس شکایت نامے کا پورا متن B. F. Hyslop: A Guide to the General Cahiers of 1789

[2] Longuyon

[3] LIVRES فرانس کا ایک سکّہ، جو تقریباً ساڑھے نو پنس کے برابر ہے

مدِ خرچ	رقم
بہ سلسلۂ قرضہ	اکتیس کروڑ اسی لاکھ
دربار	ساڑھے تین کروڑ
دوسرے مصارف	ستائیس کروڑ ساٹھ لاکھ
میزان	باسٹھ کروڑ نوّے لاکھ
مدِ آمد	پچاس کروڑ تیس لاکھ
تخمینۂ خسارہ	بارہ کروڑ ساٹھ لاکھ [1]

یہاں دربار کے نسبتاً بہت ہی معمولی مصارف پر نظر رکھیے، ساتھ ہی دیکھیے کہ قرض پر سود کے سلسلے میں کتنی رقم صرف کی گئی۔

لوئی شانزدہم نے اپنے معمولی حلیمانہ طریق پر بڑھتی ہوئی کیفیت کے مقابلے کی کوشش کی۔ ۱۷۷۴ء میں وہ تخت نشیں ہوا تو ترگو کو وزیرِ اعلیٰ بنا دیا، جو مسلکِ فطرت کے حامیوں میں ممتاز تھا اور لموجیز کے صوبے میں شاندار کارنامے انجام دے چکا تھا۔ ترگو نے انتہائی کفایت شعاری سے کام لے کر (خصوصاً مصارفِ دربار کے سلسلے میں) خسارہ عارضی طور پر بہت کم کر دیا۔ خوشحالی کو بڑھانے اور تیسرے طبقے کو مطمئن رکھنے کے لیے اس نے گلڈ کی قدیم اجارہ داریوں میں تخفیف کر دی۔ غلے کو اندرونِ ملک میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر جو پابندیاں عائد تھیں، وہ اُڑا دیں اور کسانوں سے شاہراہوں پر جو کام لیا جاتا تھا، اس کی جگہ ایک محصول تجویز کر دیا، جو امراء اور عوام دونوں پر یکساں عائد تھا۔ اس صورت کو غرض مند طبقوں نے منظور نہ کیا اور ماری انتوانت کی امداد سے ترگو کو ۱۷۷۶ء میں برطرف کرا دیا۔ جاتے ہوئے ترگو نے لوئی شانزدہم کو متنبہ کر دیا: "دیکھیے حضور! یاد رکھیے، چارلس اوّل کی کمزوری ہی اس کا سر جلّاد کی تلوار کے نیچے لانے کا باعث بنی تھی۔"

لوئی نے ترگو کے انتباہ کو نظر انداز کر دیا۔ حکومت نے نئے قرضے لیے، جن کی مقدار ۱۷۸۳ء اور ۱۷۸۶ء کے درمیان پینسٹھ کروڑ تیس لاکھ لیور تھی۔ ۱۷۸۶ء میں بینکروں نے نئے قرضے دینے سے انکار کر دیا۔ اب فرانسیسی حکومت ایک مخمصے میں پڑ گئی۔ ایک طرف تیسرا طبقہ مطالبہ کر رہا تھا کہ محاصل گھٹائے جائیں۔ اس مطالبے کو رد کرنا مشکل تھا۔ دوسری طرف باقی طبقے مالی ذمہ داریوں سے آزادی کی پوزیشن ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سلطنت نے سہل انگاری سے کام لیا اور قرض لیتی رہی، یہاں تک کہ ایسی حالت آ گئی، نہ قرض لیا جا سکتا تھا اور نہ مطالبات سے تغافل برتا جا سکتا تھا۔ کیلون [2] ۱۷۸۶ء میں وزیرِ مال تھا۔ اس نے ترگو کی اصلاحات زندہ کر کے بحرانی کیفیت کا مقابلہ کرنا چاہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح پہلے دو طبقوں کو بھاری محاصل پر راضی کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے ممتاز افراد کی مجلس بلائی، جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امراء اور مذہبی پیشوا شامل تھے، لیکن یہ لوگ کوئی چیز ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

---

[1] یہ اعداد لیفیبرے کی کتاب "انقلابِ فرانس" پر مبنی ہیں ص ۲۱-۲۲۔ [2] Calonne

لوئی شانزدہم نے مجلس ختم کر دی اور کیلون کو وزارت سے الگ کر دیا۔ پھر غیر معمولی عزم سے فیصلہ کیا کہ ساری زرعی جائداد پر یکساں محصول لگایا جائے گا اور کسی مالک کے عمرانی درجے کا کوئی خیال نہ رکھا جائے گا۔ مذہبی لوگوں نے اس کے جواز میں اپنا ہدیۂ آزاد ۱۷۸۸ء کے لیے معمول سے گھٹا کر ½ کر دیا۔ پیرس اور دوسرے صوبوں کی پارلیمنٹوں نے اعلان کر دیا کہ محاصل کا نیا قانون ناجائز ہے اور جب تک قوم کی مجلسِ عامہ نہ بلائی جائے، ایسی دُوررس نئی تجویز جاری نہ ہونی چاہیے۔ ۱۷۸۸ء کے موسم گرما میں بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا اور اعلان کر دیا کہ آئندہ موسم بہار میں مجلسِ عامہ بلائی جائے گی۔

مجلسِ عام کا انتخاب

یوں لوئی شانزدہم نے ایک نیم فراموش شدہ ادارے کو زندہ کیا، جو ایک خاص انداز میں قوم کا نمائندہ تھا اور اس سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وسیع عمرانی و اقتصادی اصلاحات کا انتظام کرے گا۔ قوم کے تینوں طبقوں کی تعداد میں بڑا فرق تھا، تاہم ان کی نمائندگی ابتدا سے بالکل یکساں چلی آتی تھی۔ اس وجہ سے دو بالائی طبقے جنھیں خاص حقوق حاصل تھے، عوامی نمائندوں سے زیادہ ووٹ لے جاتے تھے، مگر ۱۷۸۹ء کی مجلس عام یگانہ حالات میں منعقد ہوئی۔

اوّل اس کا انتخاب ہُوا، بعد میں اجلاس منعقد کیا گیا۔ یہ بڑے سخت اقتصادی بحران کا دَور تھا، جس کی وجہ سے عمرانی و اقتصادی تناؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ ۱۷۸۶ء میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہُوا جس کے رُو سے برطانوی مصنوعات کے لیے فرانسیسی محاصل گھٹا دیے گئے اور انگریزی پارچات نیز معدنی مصنوعات سستے داموں بہ کثرتِ فرانس پہنچانے کی اجازت دے دی گئی۔ ۱۷۸۹ء تک ہزاروں فرانسیسی دستکار بیکار ہو گئے۔ محض اتنا ہی نہ ہُوا بلکہ ۱۷۸۸ء میں پہلے سخت ژالہ باری ہوئی، پھر خشک سالی کا دَور آ گیا، اس وجہ سے فصلیں تباہ ہو گئیں۔ ۸۹-۱۷۸۸ء کا سرما اتنا سخت تھا کہ پیرس کے پاس دریائے سین کا پانی جم گیا اور پانی کے راستے غلّہ لانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ بلدیہ نے جا بجا الاؤ جلانے کا انتظام کر دیا تھا اور اہلِ پیرس، جنھیں بھوک اور سردی نے سخت پریشان کر رکھا تھا، جا بجا الاؤ کے گرد جمع ہو کر آگ تاپ رہے تھے۔ ۱۷۸۹ء کے موسم بہار میں گیہوں کی قیمت تقریباً دُگنی اور بعض مقامات پر چوگنی ہو گئی۔

فرانس کساد بازاری، موسم کی خرابی، فصل کی بربادی زمانۂ ماضی میں کئی مرتبہ برداشت کر چکا تھا، لیکن اسے انقلاب کا تجربہ کبھی نہ ہُوا۔ اس مرتبہ بڑھتی ہوئی اقتصادی مشکلات نے آبادی کو مصیبت کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ بھوکے کسان بھیک مانگتے، قرض لیتے، چوری کرتے۔ بڑے بڑے امراء نے جا بجا محفوظ شکارگاہیں بنا رکھی تھیں، ان میں گھس کر جانور شکار کر لیتے۔ شکارگاہوں کے پاسبان مانع آتے تو ان پر حملے کرتے۔ پیرس میں فتنہ و فساد ایک ہنگامہ میں (اپریل ۱۷۸۹ء) تیز تر ہو گیا۔ امریکہ کی طرف سے اس وقت ٹامس جیفرسن[ے] فرانس میں سفیر مقرر تھا۔ اس نے یہ ہنگامہ دیکھا اور کیفیت یوں بیان کی:

ے Jefferson

"..... فوبورگ سینٹ انتوائن[1] شہر کا ایک ایسا محلہ ہے، جس میں دن بھر اُجرت پر کام کرنے والے یا پھیری والے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں یہ افواہ پھیل گئی ایک بڑے کاغذ ساز نے ...... تجویز پیش کی ہے ..... کہ اُن کی اُجرتیں گھٹا کر پندرہ شو[2] یومیہ کر دی جائے (یعنی لیور کا تین چوتھائی حصہ یا تقریباً پچھتر سینٹ) ..... یہ لوگ کثیر تعداد میں کاغذ ساز کے مکان پر پہنچ گئے اور اس کی ہر چیز تباہ کر ڈالی۔ پھر اس کے گودام اور کارخانے کی طرف پلٹے۔ خود رتی برابر چیز نہ اُٹھائی۔ تباہ کاری میں مصروف تھے کہ باقاعدہ فوج بلائی گئی۔ انھیں متنبہ کیا گیا، لیکن کسی نے پروا نہ کی۔ آخر گولی چلانی پڑی۔ باقاعدہ اقدام ہُوا، جس میں ایک سو کے قریب آدمی مارے گئے، جب جا کر باقی منتشر ہوئے۔"[3]

اِن فسادات نے مجلسِ عام کے نمائندوں پر حالات کی نزاکت پوری طرح واضح کر دی تھی۔

ثانیاً نمائندوں کے انتخاب میں جو طریقہ استعمال کیا گیا، اس سے حامیانِ اصلاحات کو تقویت پہنچی۔ معمول کے خلاف اور پارلیمنٹوں کی شدید مخالفت کے باوجود تیسرے طبقے نے دُگنی نمائندگی حاصل کر لی۔ یعنی اسے مجلسِ عام میں اتنی ہی نشستیں مل گئیں، جتنی مذہبی طبقے اور امراء کے طبقے کو بہ حیثیت مجموعی حاصل تھیں۔ پھر فرانس کے ہر ضلع میں تیسرے طبقے کے نمائندوں کا انتخاب خفیہ بیلٹ کے ذریعے سے نہیں، بلکہ جلسہ ہائے عام میں ہُوا۔ یہ طریقِ عمل متوسط شہری طبقے کے خطیبوں کے لیے بے زبان کسانوں اور مزدوروں کے مقابلے میں بہت سازگار تھا۔ متوسط طبقے کے قانون دانوں نے عوامی نمائندوں میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ پھر تیسرے طبقے کے انتہا پسندوں کو دوسرے طبقے میں سے بھی چند ہمدرد مل گئے۔ اسی طرح پہلے طبقے کی بھی خاصی حمایت انھوں نے حاصل کر لی۔ ایک بڑا حلقہ چھوٹے طبقے کے پادریوں کا تھا، جنھوں نے خاصے نمائندے بھیجے۔ بہرحال ۱۷۸۹ء میں مجلسِ عام کی طبقہ وار نمائندگی کا نقشہ یہ تھا:

طبقہ	تعداد مندوبین
بلند منصب پادری	۹۴
نچلے درجے کے پادری	۲۰۰ (سے زیادہ)
طبقۂ امراء	۲۷۰
عوام	۵۷۸

---

[1] Fausbourg St. Antoine [2] Sou فرانس کا ایک چھوٹا سکہ۔

[3] Autobiography of Thomas Jefferson (جیفرسن کی خود نوشت سوانح عمری) ص ۱۲۳ - ۱۲۴۔

ان مندوبین کی اکثریت نظامِ قدیم میں وسیع تغیرات کے لیے تیار تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ آیا وہ تغیرات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ مجلسِ عام کے تمام سابقہ اجلاسوں میں طریقہ یہ تھا کہ ہر طبقہ دو بالائی طبقوں اور تاج کی رضامندی سے کسی قانون کی منظوری کے لیے الگ الگ غور کرتا اور الگ الگ ووٹ بھی لیے جاتے۔ ۱۷۸۹ء میں بھی بادشاہ اور بالائی طبقوں کی رائے یہ تھی کہ ترتیب وار ووٹوں کا یہ سلسلہ قائم رہے، مگر تیسرے طبقے نے مطالبہ کیا کہ تمام مندوبین ایک وحدت کی حیثیت میں بیٹھیں اور فرداً فرداً ووٹ گنے جائیں۔ پمفلٹ شائع کرنے والوں نے اس امر پر زور دیا کہ روسو کے تصور کے مطابق رائے عامہ پیشِ نظر رکھی جائے۔ ایبے سیئیز[1] نے پوچھا: "تیسرا طبقہ کیا چیز ہے؟" پھر خود ہی جواب دیا: "ہر چیز":

> "...... اگر طبقہ وار ووٹ لیے جائیں تو پچاس لاکھ شہری عوامی مفاد کی ہر چیز کا فیصلہ نہیں کر سکیں گے، کیونکہ یہ امر خاص حقوق رکھنے والے دو لاکھ آدمیوں کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو گا۔ ایک فرد کا ویٹو ایک سو سے زیادہ افراد کی رائے و عزم کو برباد کر دے گا۔"[2]

قومی مجلس کی پیدائش (جون ۱۷۸۹ء)

مجلسِ عام ۵۔ مئی ۱۷۸۹ء کو ورسائی میں منعقد ہوئی تو طریقِ کار کے متعلق یہ نہایت نازک مسئلہ سامنے آ گیا۔ سیئیز اور میرابو[3] (جس کا تعلق امراء سے تھا، مگر وہ امراء کو چھوڑ چکا تھا) اس امر پر زور دینے میں پیش پیش تھے کہ ووٹ افراد کی بناء پر لیے جائیں۔ ۱۷ جون کو تیسرے طبقے نے طریقِ کار کے مسئلے کی تمام مشکلات یوں ختم کر دیں کہ سیئیز کی دعوت قبول کرتے ہوئے اپنے آپ کو "قومی مجلس" قرار دے لیا۔ ساتھ ہی دوسرے طبقوں کے مندوبین کو دعوت دے دی کہ چاہیں تو آ کر اس قومی مجلس میں شامل ہو جائیں۔ اس طرح نظامِ قدیم کی انقلابی تنسیخ مکمل کر لی۔

مذہبی طبقے کے نمائندوں کی اکثریت نے جس میں چھوٹے چھوٹے طبقوں کے نمائندے شامل تھے، یہ دعوت قبول کر لی، امراء نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے عوامی نمائندوں کے لیے جلسہ گاہ کے دروازے بند کر دیے۔ انھوں نے ۲۰ جون کو ایک مشہور ٹینس کورٹ میں اجلاس منعقد کیا اور سنجیدگی سے حلف اُٹھا لیا کہ فرانس کے لیے ایک دستور کا انتظام کیے بغیر وہ منتشر نہ ہوں گے۔ اس حلف کے جواب میں لُوئی نے حکم دے دیا کہ تمام طبقے علیحدہ علیحدہ غور و فکر شروع کر دیں۔ تیسرے طبقے کے تمام مندوبین اور پہلے طبقے کے چند نمائندوں نے یہ حکم مان لیا۔ لُوئی کچھ مدت تک عادت کے مطابق مذبذب رہا۔

---

[1] Abbesieyes

[2] سیئیز کی فرانسیسی کتاب ص ۸۲۔

[3] Mirabean

پھر اس نے پیش آمدہ حالت قبول کر لی اور ۲۷-جون کو اُمراء نیز پادریوں کے نام حکم بھیجا کہ وہ قومی مجلس میں شامل ہو جائیں۔ قوم اپنے نمائندوں کے ذریعے سے بادشاہ اور خاص حقوق رکھنے والے طبقوں کے اختیارات کو کامیابی سے چیلنج کر چکی تھی۔ مجلسِ عام ختم ہو گئی اور اس کی جگہ قومی مجلس نے لے لی جو معاشرے کی اصلاح اور فرانس کے لیے دستور کے انتظام کا حلف اُٹھا چکی تھی۔ گویا انقلاب شروع ہو چکا تھا۔

گویا شمالی امریکہ کی تیرہ نو آبادیوں کی طرح فرانس میں بھی مالی بحران نے انقلاب پیدا کیا۔ یہ دو انقلاب محض متوازی ہی نہ تھے بلکہ ایک دوسرے سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ امریکہ کی جنگِ آزادی میں فرانس نے جو امداد دی تھی، اس کی وجہ سے قرضے میں ڈیڑھ ارب لیور کا اضافہ ہوا اور امریکیوں کی مثال نے غیر مطمئن فرانسیسیوں کے افکار مشتعل کر دیے۔ ان فرانسیسیوں کے نزدیک بنجمن فرینکلن —— فرانس میں امریکہ کا نہایت ہر دلعزیز سفیر —— تنویر اور روشن خیالی کا پیکر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سمندر پار کی نئی جمہوریت (جمہوریۂ امریکہ) فلسفیوں کی مثالی حکومت ہو جائے گی۔ بہر حال امریکی نمونے نے فرانس میں انقلابی حالات کی رفتار تیز کر دی۔ جو بنیادی عوامل ۱۷۸۹ء کے انقلاب کا موجب ہوئے وہ ۱۷۷۶ء میں تقریباً پوری طرح نشو و نما پا چکے تھے۔ چونکہ فرانس میں انقلاب کے موجبات امریکہ کے مقابلے میں زیادہ گہرے اور زیادہ پُر پیچ تھے، اس لیے فرانس کا انقلاب بھی زیادہ شدید اور ہمہ گیر صورت اختیار کر گیا۔

تیرھواں باب

بادشاہی کا خاتمہ

عوامی ہنگامے
جولائی ۱۷۸۹ء

قومی مجلس نے ابھی کام شروع ہی کیا تھا کہ فرانس بھر میں ہنگاموں کی نئی لہریں دوڑ گئیں، جن کی وجہ سے بادشاہ کی حیثیت اور کمزور ہو گئی۔ ۱۷۸۹ء کے موسم گرما میں اقتصادی بدحالی زیادہ شدید صورت اختیار کر گئی۔ بے روزگاری بڑھ گئی۔ روٹی کا ملنا مشکل ہو گیا اور اس کی قیمت کم از کم اس وقت تک کے لیے زیادہ ہو گئی، جب تک موسم خزاں میں نئی فصل نہ آ جاتی۔ اس اثنا میں عوامی نمائندوں کو خوف لگا ہوا تھا کہ کہیں بادشاہ اور خاص حقوق رکھنے والے طبقے جوابی انقلاب بپا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جولائی کے اوائل میں پیرس کے اندر فوج کے بڑے بڑے دستے نمودار ہوئے۔ بادشاہ کے نزدیک ان کی غرض یہ تھی کہ امن بحال رکھیں اور قومی مجلس کی حفاظت کریں لیکن اہلِ پیرس کو شبہ تھا کہ لوئی مجلس کو بالجبر توڑ دینے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ نیکر[1] لوئی کا ہر دلعزیز وزیرِ مال تھا اور وہی بادشاہ کا سب سے بڑا مشیر تھا۔ لوئی نے اُسے برطرف کر دیا تو شبہات گہرے ہو کر یقین کی صورت اختیار کر گئے۔

نیکر کی برطرفی کا فوری اور انقلاب انگیز نتیجہ نکلا۔ جن لوگوں نے پیرس کی طرف سے تیسرے طبقے کے نمائندے چُنے تھے، انھوں نے ۱۲ اور ۱۳ جولائی کو ایک نئی بلدی حکومت بنالی اور نئی ملیشیا مرتب کر لی۔ یہ دونوں قومی مجلس کی وفادار تھیں۔ گویا پیرس وہ حربے تیار کر رہا تھا، جن کی برکت سے وہ انقلاب کا علمدار بن گیا۔ عوام گروہ در گروہ بازاروں میں گھوم رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے کہ "روٹی سستی کرو۔" انھوں نے نیکر کے مجسّمے اٹھا رکھے تھے اور انھیں ماتمی لباس پہنا رکھا تھا۔ وہ سرکاری عمارتیں توڑ کر ہتھیار حاصل کرنے کے درپے تھے۔ ۱۴ جولائی کو مسلّح ہجوم نے بیسٹیل[2] پر حملہ کیا۔ یہ شہر کے مشرقی حصّے میں ایک مشہور قلعہ تھا اور اس میں جو فوج متعین تھی، اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

بیسٹیل کے سقوط کی عملی اہمیت بہت کم تھی، لیکن ایک نشان کی حیثیت میں اس کی قدر و قیمت بے پناہ تھی۔ یہ تاریک عمارت ایک دیو پیکر سنتری کی طرح پیرس کے اس محلّے کو گھور رہی تھی، جس میں بے چین مزدور رہتے تھے۔ اس پر قبضہ اور بعد ازاں انہدام اس حقیقت کا انکشاف تھا کہ نظامِ قدیم کی زنجیریں ڈھیلی ہو گئیں۔ مزید برآں عوام سمجھتے تھے کہ بیسٹیل میں وہ بے گناہ بھرے ہوئے ہیں، جو شاہی جبر و استبداد کا ہدف بنے۔ حقیقتاً وہاں کُل سات قیدی تھے، جنھیں رہائی دلائی

گئی۔ ان میں سے پانچ مجرم تھے (زیادہ تر جعلساز) اور دو کے دماغ ماؤف تھے، لیکن بعد میں جو حقائق بروئے کار آئے، وہ اصل افسانے کو درہم برہم نہ کر سکے۔ ۱۴۔ جولائی ۱۷۸۹ء فرانسیسیوں کے نزدیک اُسی طرح بڑی قومی تعطیل ہے، جس طرح امریکیوں کے لیے ۴۔ جولائی۔

جولائی کے اواخر میں فرانس کے اندر جابجا ہنگامے پھُوٹ پڑے۔ صوبوں کی آبادی نے یا تو پیرس کی خبریں سُن کر پیروی شروع کر دی یا بہ طور خود حرکت میں آ گئے۔ ہر قصبے میں عوام نے ان مقامات پر یورشیں کیں، جو بیسٹیل کے مثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں آرتھر ینگ السّاس[1] کے اندر زراعت کی چھان بین کر رہا تھا۔ اس نے سٹراسبورگ[2] میں جو منظر دیکھا، اس کی کیفیت بیان کرتا ہُوا لکھتا ہے:

"...... پیرس کی روح ہنگامہ تیزی سے پھیل گئی۔ یہ یہاں بھی پہنچ گئی۔ فوج کے ذمّے یہ کام لگا دیا گیا ہے کہ جن لوگوں سے ہنگامہ آرائی کے آثار ظاہر ہوں۔ ان پر نظر رکھے۔ چنانچہ عوام نے مجسٹریٹوں میں سے بعض کی کھڑکیاں توڑ دیں، جنھیں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اب بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا ہے اور شور غل مچا کر مطالبہ کر رہا ہے کہ گوشت کی قیمت پانچ سُو فی پونڈ ہونی چاہیے"[3]

اس اثناء میں مفصلات کے اندر خوفِ عظیم کی کیفیت طاری تھی۔ مغالطے کا یہ نہایت غیر معمولی واقعہ ہے، جو تاریخی صفحات پر مرقوم ملتا ہے۔ دہ بہ دہ اور موضع بہ موضع پیغام بھیج دیا گیا کہ ڈاکو آ رہے ہیں، جن کا انتظام امراء نے کیا ہے۔ وہ فصلیں اور دیہات تباہ کر دیں گے اور قومی مجلس کو مجبور کر دیا جائے گا کہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ در اصل لٹیرے اور ڈاکو قطعاً موجود نہ تھے البتہ وقتاً فوقتاً بھُوکے کسان کھانے پینے کی کوئی چیز چُرا لیتے تھے۔ کسان اکثر ضلعوں میں آمادۂ پیکار ہو گئے۔ انھوں نے بیلچے، کھُرپے، خیلیاں یا ہر وہ چیز اٹھا لی جس سے حربے کا کام لیا جا سکتا تھا۔ جب ڈاکو نہ آئے تو انھیں اشیاء خوردنی کی قلت اور ان اقتصادی شکایات کا خیال ہُوا، جو مدّت سے چلی آتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے امیروں کے بنگلوں پر حملے کیے اور ہر اُس عمارت کو توڑ کر اندر گھس گئے، جس کے متعلق خیال تھا کہ اس میں غلّہ جمع ہو گا یا وہ نفرت انگیز دستاویزیں جمع ہوں گی، جن کی بناء پر پڑنے واجبات نئے سرے سے عائد کیے گئے۔ جو امراء سیانے تھے، انھوں نے کسانوں کی ضرورت کی ہر شئے ان کے حوالے کر دی۔ باقی لوگوں کے ذخیرے اور کاغذات محفوظ رکھنے کے صندوقچے نذرِ آتش ہو گئے۔ خوف ایک نفسیاتی مغالطے کی بناء پر شروع ہُوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسان اپنے روایتی ظالموں کے خلاف ہنگامے پر اُتر آئے۔

---

[1] Alsas [2] Strasbourg

[3] سیاحتِ فرانس ص ۱۸۱ ؛ Grea. feare [4]

ابتدائی انقلاب پر تبصرہ جولائی ۱۷۸۹ء کے اختتام تک چار قسم کے انقلابی واقعات فرانس میں پیش آ چکے تھے :

۱۔ جون کا دشواری انقلاب، جس نے قومی مجلس کے قیام کی شکل اختیار کی۔

۲۔ پیرس کا انقلاب اور بیسٹیل پر قبضہ۔

۳۔ صوبائی شہروں اور قصبوں میں ایسے ہی ہنگامے۔

۴۔ وہ ہنگامے، جو کسانوں کے مغالطہ آمیز خوفِ عظیم سے پیدا ہوئے۔

ان چاروں قسموں کے ہنگاموں نے نظام قدیم کے تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی۔ مجلسِ عام تبدیل ہئیت سے قومی مجلس بن گئی اور نئی مقامی حکومتیں وجود میں آگئیں۔ اس طرح پہلے دو طبقوں کی سیاسی برتری ختم ہوگئی۔ کسانوں کے مغالطہ آمیز خوف نے پادریوں اور امراء کے خاص عمرانی واقتصادی حقوق کی جڑ پر کلہاڑا رکھ دیا۔ ہر مقام سے وہ افسر نکال دیے گئے، جو قانوناً مقرر تھے۔ محاصل کسی نے وصول نہ کیے۔ قیمتی دستاویزیں برباد کردی گئیں۔ ۱۷۸۹ء کے موسم گرما میں قصرِ حکومت میں آہستہ آہستہ تزلزل نہیں آرہا تھا، بلکہ وہ تیزی سے زمین بوس ہو رہا تھا۔

"ایامِ اکتوبر" میں سال کا آخری بحرانی دور رونما ہوا۔ اس میں لوئی شانزدہم کی بے دست وپائی اور اس کی جوش میں آئی ہوئی رعایا کی قوت پھر ایک مرتبہ نمایاں ہوگئی۔ ۱۷۸۹ء کا موسم خزاں آیا، تو اہلِ پیرس پھر روٹی لینے کے لیے قطاریں باندھ کر کھڑے رہتے اور اس شاہی فوج کو شبہے کی نگاہوں سے دیکھتے، جو شہر کے قریب متعین تھی۔ ملک کی روش کے متعلق افواہوں نے عوام کو اور بھی برانگیختہ کردیا۔ شاہی افسروں کی طرف سے ایک دعوت کا انتظام ہُوا۔ ماری انتوانت اس دعوت میں ڈرامائی طریق پر شریک ہوئی۔ ولیعہد کو اس نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ یہ وہی طریقہ تھا، جس سے اس کی والدہ میریا تھیریسا نے اٹھارھویں صدی کے عشرۂ پنجم میں امراء ہنگری کی حمایت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور وہ موثر ثابت ہُوا تھا۔ جب اسے معلوم ہُوا کہ عوام کو روٹی نہیں ملتی تو بیان کیا جاتا ہے کہ ملکہ نے بڑی سنگدلی سے کہا: "وہ کیک کھالیں"۔ یہ واقعہ بالکل غلط تھا، لیکن نئے پیرس کے اخباروں میں اس کی صدائے بازگشت بار بار گونجتی رہی اور وہ خوش ہو کر "آسٹریا دی کُتیا" کی مذمت کرتے تھے۔

۵۔ اکتوبر ۱۷۸۹ء کو پیرس کی پُرعزم خواتین صف بندی کرکے بارش میں بارہ میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی پیرس سے ورسائی پہنچیں۔ انھوں نے قومی مجلس کا اجلاس درہم برہم کرڈالا اور حیرت زدہ لوئی شانزدہم سے ایک بوسہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اس مظاہرے کے نتائج بڑے اہم تھے۔ ۶۔ اکتوبر کو یہ عورتیں پیرس واپس آئیں اور ان کے ساتھ "نانبائی کی بیوی اور نانبائی کا بیٹا" بھی تھے، یعنی بادشاہ اور اس کا پورا خاندان ساتھ آیا اور تولریز[1] کے محل میں سکونت

---

[1] Tuileries تلسب پیرس میں مشہور شاہی محل۔

اختیار کی۔ قومی مجلس بھی ورسائی سے پیرس چلی آئی۔ فرانس کے سب سے بڑے انقلابی مقام نے نظامِ قدیم کے نشان پر بھی قبضہ کرلیا اور نئے نظام کے نقیب کا نشان بھی اسی کے قبضے میں رہا۔

قومی مجلس کے کارنامے (۱۷۸۹ء - ۱۷۹۱ء)

قومی مجلس نے جو کام کیا، اس کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ طبقاتی امتیازات کی تنسیخ: ایام اکتوبر سے پیشتر ہی نئے نظام کے خط و خال متعین ہونے لگے تھے۔ "خوفِ عظیم" نے قومی مجلس کو اس امر پر آمادہ کیا کہ کسان جس چیز کو تباہ کر رہے تھے، اسے قانوناً ختم کر دیا جائے۔ ۴۔ اگست ۱۷۸۹ء کی شام کو ایک آزاد خیال امیر وائیکاؤنٹ نوئلس نے مندوبین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"(مفصلات نے) مناسب سمجھا کہ اپنے دفاع کے لیے ہتھیار سنبھال لے۔ وہ کسی پابندی کا روادار نہیں رہا۔ لہٰذا اس وقت سلطنت کی حالت یہ ہے کہ وہ دو متبادل صورتوں کے درمیان لٹک رہی ہے۔ ایک طرف معاشرے کی تباہی، دوسری طرف ایک ایسی حکومت کا قیام جو پورے یورپ کے لیے مدح و ستائش کا مرجع اور ایک مثال بن جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی حکومت قائم کیونکر ہو؟ اس طرح کہ عوام بالکل مطمئن ہو جائیں۔ اس ضروری اطمینان کے لیے میری تجویز یہ ہے:

ا۔ ... محاصل سلطنت کے تمام افراد کو مایہ کے تناسب سے ادا کرنے چاہئیں۔

ب۔ آئندہ تمام سرکاری مصارف تمام لوگ یکساں برداشت کریں۔"[۲]

مندوبین نے نوئلس کی یہ تجویز قبول کرلی۔ ساتھ ہی پادریوں نے عشر چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ طبقۂ امراء کے آزاد خیالوں کی اقلیت نے محفوظ شکارگاہوں اور ازمنۂ وسطیٰ کے تمام حقوق و واجبات سے دست برداری اختیار کرلی۔ مجلس نے زرعی غلامی منسوخ کر دی۔ عدالت اور عدالتی عہدوں کی فروخت روک دی۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ تمام شہری بلا امتیاز خاندان تمام مذہبی، ملکی اور فوجی خدمات و مناصب کے حقدار ہیں۔ جب یہ یادگار اجلاس، جس کی ابتدا نوئلس کی تقریر سے ہوئی تھی، ۵۔ اگست کی رات کو دو بجے ختم ہوا تو نظامِ قدیم مر چکا تھا۔

۲۔ اعلان حقوقِ انسانی: تین ہفتے بعد ۲۶۔ اگست ۱۷۸۹ء کو قومی اسمبلی نے حقوقِ انسانی کا اعلان تیار کیا۔ اس میں کہا گیا: تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور سب کے حقوق برابر ہیں (دفعہ ۱)۔ ان حقوق کی کیفیت یہ ہے: آزادی، حقِ ملکیت، حقِ حفاظت اور ظلم کے خلاف حقِ مزاحمت (دفعہ ۲)۔ حقِ ملکیت ایک مقدس حق ہے، جسے توڑا نہیں جا سکتا (دفعہ ۱۷)۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی مقررہ حدوں کے اندر رہ کر انسان طبعی حقوق سے کام لے (دفعہ ۴)۔ قانون رضائے عامہ کا مظہر ہے اور

ا۔ Vicount de Novilles ۲۔ Archives parlementaires سلسلۂ اوّل VII ۴۴۳

عام شہریوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کی وضع و ساخت میں خود یا نمائندوں کی طرف سے حصہ لیں (دفعہ ۶)۔ ہر معاشرے کو جس میں حقوق کی ضمانت نہ دی گئی ہو، یا اختیارات الگ الگ نہ کیے گئے ہوں، دستور سے محروم سمجھنا چاہیے (دفعہ ۱۶)۔

حقوقِ انسانی کا اعلان طبقۂ اوسط کی سیاسی و اقتصادی روش کا آئینہ دار تھا۔ اس کے مطابق فرانسیسیوں نے دستوری آزاد خیالی کے عقیدے کا اعلان کیا، جس کی توثیق انگریز بھی ۸۹-۱۶۸۸ء میں اور اہلِ امریکہ ۱۷۷۶ء میں کر چکے تھے۔ اس میں فلسفیوں کی کلیدی ترکیبیں شامل تھیں، یعنی طبعی حقوق، رضائے عامہ اور اختیارات کی علٰحدگی۔ قومی مجلس نے دورِ تنویر کے مقاصد سے متعلق ایک زبردست بیان دیا، لیکن جیسا کہ انقلاب کی تاریخ میں جلد واضح ہو گیا، اسمبلی کے پاس کوئی طلسمی فارمولا نہ تھا، جس کی بنا پر ان مقاصد کو عمل میں لے آتی۔

۳۔ اقتصادی تدابیر: قومی مجلس کے اقتصادی قوانین بھی توجہ طلب ہیں۔ تمام فرانسیسیوں کے لیے یکساں محاصل کے نظریے پر عقیدہ اہم عملی مسائل طے نہیں کر سکتا تھا، جو نیا مالیہ مندوبین نے عائد کیا تھا، وہ یقیناً منصفانہ تھا، لیکن جمع نہ ہو سکا۔ محصلین، نظامِ قدیم کے خاتمے میں غائب ہو گئے تھے اور کسانوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ حکومت کی طرف سے ان کے ذمے کچھ نہیں رہا، کیونکہ وہ انقلابی بن گئی ہے۔ چنانچہ سلطنتِ فرانس نے پھر قرض کا انتظام کیا، یہاں تک کہ اس کی ساکھ ختم ہو گئی۔ پھر حالتِ اضطرار میں قومی مجلس نے کلیسائی اراضی ضبط کر لینے کا حکم صادر کر دیا (نومبر ۱۷۸۹ء)۔ اعلان کے الفاظ یہ تھے: "مذہبی طبقے کی دولت قوم کے سامنے حاضر ہے۔" ساتھ ہی توضیح کر دی کہ کلیسائی جاگیریں اس ملکیت میں شامل نہیں، جسے اعلانِ حقوقِ انسانی میں قابلِ حرمت قرار دیا گیا تھا، کیونکہ یہ زمینیں افراد کی نجی ملکیت نہیں، بلکہ ادارے کی ملکیت ہیں۔

اس طرح حکومت نے ایک ایسا اثاثہ فراہم کر لیا ...... جس کی قیمت تقریباً دو ارب لیور تھی۔ اس کی بنیاد پر کاغذی نوٹ جاری کیے گئے، تاکہ حکومت کا قرض اُتارا جا سکے۔ مالی نقطۂ نگاہ سے جو کچھ ہوا، ٹھیک تھا۔ نوٹوں کے لیے خاصی ضمانت موجود تھی، اس طرح مالی بحران میں تخفیف کے آثار پیدا ہو گئے، مگر افسوس کہ انقلابیوں نے جان لا کی غلطی کا اعادہ کیا، یعنی وہ خیال نہ رکھ سکے کہ کہاں رُک جانا چاہیے۔ مملکت نے ضبط شدہ زمینوں کے ٹکڑے فروخت کرنے شروع کر دیے۔ گویا وہ ضمانت گھٹتی گئی جس کی بنا پر کاغذی سکے جاری ہوئے تھے۔ ضروری تھا کہ فروخت شدہ ٹکڑوں کے ساتھ ساتھ اسی مناسبت سے نوٹ بھی کم کر دیے جاتے، مگر نوٹوں کی مقدار کم کرنے کی رغبت غالب آ گئی۔ نتیجہ افراطِ زر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ضمانت تدریجاً گھٹتی گئی، تو سکے کی قیمت میں بھی کمی آ گئی۔ یہاں تک کہ ۱۷۹۵ء میں کاغذی سکے گرتے گرتے ابتدائی قیمت کا صرف پانچ فی صد رہ گئے تھے۔

اس اقتصادی تجربے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کی بعض بہترین زرعی زمینیں پھر ایک مرتبہ تقسیم ہوئیں۔ بہت سے کسانوں نے کلیسائی زمینیں خرید کر اپنی ملکیت بڑھا لی تھی، لیکن شہری متوسط طبقے نے بھی زمینوں ہی میں بھاری سرمایہ لگا دیا۔ غریب اور بے زمین کسانوں کے ہاتھ کچھ نہ آیا، کیونکہ ان کے پاس خرید کے لیے روپیہ ہی نہ تھا۔ قومی مجلس نے عدمِ مداخلت کا

اصول پیشِ نظر رکھتے ہوئے غریب کسانوں کی امداد کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی مجلس کی اقتصادی پالیسی میں اشتراکیت یا پدرانہ حکومت کا کوئی اشارہ موجود نہ تھا۔ اس نے گلڈ بھی منسوخ کر دیے اور داخلی محاصل وغیرہ بھی ختم کر دیے۔ اس وقت مزدوروں کی چند دقیانوسی انجمنیں موجود تھیں، قومی مجلس نے انھیں بھی اقتصادی آزادی پر ایک غیر طبعی روک قرار دیا، چنانچہ ان کے خاتمے کا بھی اعلان کر دیا۔ جون ۱۷۹۱ء میں ہڑتالیں شروع ہوئیں تو ایک قانون منظور کیا گیا جس کے مطابق ہڑتالیں اور مزدوروں کی یونینیں ممنوع قرار پائیں۔

۴۔ پادریوں کے لیے ملکی دستور: چونکہ پادریوں نے کلیسائی عُشر ترک کر دیا تھا اور کلیسا کے املاک پر قبضہ کر لیا گیا تھا، اس لیے کوئی ذریعۂ آمد کلیسا کے پاس باقی نہ رہا، لہٰذا قومی مجلس نے پادریوں کو تنخواہیں دینے پر اتفاق ظاہر کیا۔ نئے انتظام کے تحت فرانسیسی کلیسا کا ملّا قومی بن گیا اور یہ مستقل سرکاری ضوابط کے تابع آگیا۔ مجلس کے اس فیصلے کو لباسِ عمل پہنانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ خانقاہوں اور راہب خانوں کو توڑ دیا جائے۔ ان میں سے اکثر ادارے معرضِ زوال میں آ چکے تھے، لیکن جب پادریوں کے درجے اور حیثیت میں تبدیلی کا قانون منظور ہوا تو ایک شور دب گیا۔

پادریوں کے لیے ملکی دستور (منظورہ جون ۱۷۹۰ء) کے مطابق فرانس کا کلیسائی نقشہ از سرِ نو مرتب ہوا۔ اس کے رُو سے بشپوں کے عہدوں میں ایک تہائی کی تخفیف کر دی گئی۔ باقی مذہبی حلقوں کو عام ملکی قانون کی انتظامی وحدتیں بنا دیا گیا، جنھیں ڈیپارٹمنٹ[1] کہتے تھے۔ اس کے مطابق بشپ اور پادری ملکی عہدہ دار بن گئے۔ انھیں مملکت تنخواہیں دیتی تھی اور مختلف حلقوں کی آبادیاں انھیں چنتی تھیں۔ کیتھولک اور غیر کیتھولک (آخری گروہ عموماً چھوٹی سی اقلیت ہی رہا) دونوں ان انتخابات میں رائے دے سکتے تھے۔ نئے بشپ کو مملکت کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ دستور میں یہ لکھ دیا گیا:

> "...... اسے اپنے عہدے کی تصدیق کے لیے پوپ کے پاس درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ عالمی کلیسا کے مشہور رئیس کی حیثیت میں اسے ضرور لکھنا چاہیے تاکہ مذہبی اتحاد و جمعیت قائم رہے۔"[2]

ان دفعات نے عالمی کلیسا کے مشہور رئیس کو فرانسیسی پادریوں پر مؤثر اقتدار سے محروم کر دیا اور یہ دستور رومی کلیسا کی ساری روایت کے خلاف تھا، کیونکہ اس میں سلطنت کو ایک خود مختار کلیسائی حلقہ بنا لیا گیا تھا۔ طبعاً پوپ نے اس دستور کی مذمت کی۔ قومی مجلس نے مفاہمت کی ناکام کوششوں کے بعد لازم قرار دے دیا کہ ہر فرانسیسی پادری دستور کی حمایت کا حلف اٹھائے۔ صرف سات بشپوں اور نصف سے کم پادریوں نے اسے قبول کیا۔ یوں قومی مجلس نے انقلاب اور بہت بڑی آبادی کے

---

[1] Department فرانس کی اصطلاح میں اس سے مراد صوبہ یا قسمت یعنی ڈویژن ہے۔

[2] A Documentury Survey of the French Revolution (انقلابِ فرانس کا دستاویزی جائزہ) ص ۱۷۶

درمیان تفرقہ پیدا کر دیا۔ لُوئی شانزدہم سے معمولی کسانوں تک خوش عقیدہ کیتھولک انھیں پادریوں کے گرد جمع ہو گئے، جنھوں نے حلف سے انکار کیا تھا۔ پادریوں کے لیے جو ملکی دستور بنایا گیا تھا اس نے بغاوت اور خانہ جنگی کی صورت پیدا کر دی اور انقلاب کی یہ پہلی بڑی غلطی تھی۔

۵۔ ۱۷۹۱ء کا دستور: قومی مجلس نے اپنے ذمے جو سب سے بڑا کام لیا، یہ تھا کہ محدود اختیارات کی بادشاہی کو مستقل بنیاد پر قائم کر دے۔ اسی کا نتیجہ ۱۷۹۱ء کا دستور تھا۔ مجلس نے مقامی حکومت کا ایک عمدہ و منظّم سلسلہ مرتّب کیا جس نے صوبائی وحدتوں کی جگہ لے لی اور وہ نظام قدیم کے تحت جمع ہوتے ہوتے خاصی پریشان کُن صورت اختیار کر چکی تھیں۔ اس دستور کے مطابق فرانس کو تقریباً یکساں رقبے کی تراسی ڈیپارٹمنٹوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ڈیپارٹمنٹ کا دائرہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے مرکزی شہر سے ہر گاؤں تقریباً ایک دن کی مسافت پر تھا۔ ہر ڈیپارٹمنٹ کا نام اس کے کسی دریا یا سلسلۂ کوہ یا کسی اور طبعی نشان پر رکھا گیا۔ پھر ان ڈیپارٹمنٹوں کو ضلعوں میں اور ضلعوں کو چھوٹے حلقوں یا بلدیات میں بانٹ دیا گیا۔ یہ انتظام چھوٹے پیمانے پر امریکہ کے قصبے، ضلع اور ریاست کے عین مطابق تھا۔ حلقوں اور ڈیپارٹمنٹوں میں منتخب مجلسیں اور عہدہ دار خود اختیاری حکومت سے خاصے مستفید تھے۔ بہرحال جس حد تک کاغذی معاملات کا تعلق ہے، نئے فرانس کے نظم و نسق میں نظام قدیم سے مرکزیت خاصی کم تھی۔

مرکزی حکومت کی ترتیبِ نَو میں تقسیم اختیارات کو معیاری اصول کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۷۹۱ء کے دستور کے مطابق عدالتوں کا ایک آزاد سلسلہ قائم ہُوا، جس کے لیے ججوں کا باقاعدہ انتخاب ہوتا تھا اور قانون سازی کا اختیار ایک ایوان کے حوالے کیا گیا، جس کے تمام ممبر چُنے جاتے تھے۔ اگرچہ بادشاہ بھی شعبۂ تنفید کا رئیس تھا، لیکن اس کی تمام کارروائیوں کے لیے وزیروں کی منظوری لازم تھی، تاہم اسے ویٹو کا اختیار دے دیا گیا تھا اور ویٹو بھی ایسا تعطّل انگیز، جو چار سال تک قانون سازی کو روک سکتا تھا۔ لُوئی شانزدہم اب مطلق العنان شاہِ فرانس نہیں رہا تھا، بلکہ اسے نیا دستوری لقب دے دیا گیا تھا، یعنی فرانسیسیوں کا بادشاہ۔

نئے دستور میں بہت سے اصول شامل کر لیے گئے تھے، جو براہِ راست دورِ تنویر میں بروئے کار آئے۔ اس کے مطابق طے کر لیا گیا کہ فرانس کے لیے ایک نیا مجموعۂ قوانین مرتب ہوگا۔ شادی اب مقدس معاہدہ نہ رہی، بلکہ فریقین کے درمیان ایک مدنی معاہدہ ہو گئی۔ مملکت نے تمام پرانے مذہبی وظائف اپنے ذمے لے لیے، مثلاً پیدائش و موت کے اعداد کی بہم آوری، خیرات اور تعلیم کا انتظام۔ دستور کے مطابق تمام شہریوں کے لیے ان شعبوں میں مفت تعلیم کا نظام تیار کرنے کا وعدہ کر لیا گیا، جو انسانوں کے لیے ناگزیر ہیں[1]۔ انقلاب کے متاخر مظاہر میں جو شدید قسم کی قومیت رونما ہُوئی، اس کے ابتدائی

---

[1] انقلاب فرانس کا دستاویزی جائزہ، ص ۲۳۲۔

تصورات پیشِ نظر رکھتے ہوئے دستور سازوں نے اعلان کر دیا:

"انقلابِ فرانس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے قومی تہواروں کا انتظام کیا جائے گا، تاکہ شہریوں کے درمیان اخوت قائم رہے اور وہ دستور، وطن اور قوانین سے وابستگی استوار کرلیں۔"[1]

انقلابی فرانس کی خارجہ پالیسی کو زیادہ اچھے اصول پر چلانے کا انتظام کیا گیا اور یہ پالیسی مطلق العنان فرانس کے مقابلے میں کم جارحانہ تھی:

"فرانسیسی قوم ہر اُس جنگ سے دست برداری کا اعلان کرتی ہے، جس کا مدعا نئے علاقے کی تسخیر ہو اور یہ اپنی قوت کبھی کسی قوم کی آزادی کے خلاف استعمال نہیں کرے گی۔"[2]

۱۷۹۱ء کا دستور عوامی حکومت کے قیام کی جانب خاصی بڑی پیشقدمی کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے مطابق جمہوریت ٹھیک ٹھیک قائم نہیں ہوئی تھی۔ اعلانِ حقوقِ انسانی میں جس سیاسی مساوات کا اعلان کیا گیا تھا، اسے محدود کرتے ہوئے فرانسیسیوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اوّل فعال، دوم غیر فعال۔ حقِ رائے صرف فعال شہریوں کے لیے مخصوص رہا، جو سالانہ اپنے محاصل ادا کرتے تھے، جتنی تین دن کی مزدوری ہوتی تھی۔ غیر فعال شہریوں میں تقریباً ایک تہائی مردانہ آبادی شامل تھی۔ اسے قانون کی پوری حفاظت حاصل تھی، لیکن حقِ رائے حاصل نہ تھا۔ مزید برآں نئی قانون ساز مجلس بالواسطہ انتخاب کے ذریعے سے چنی جاتی تھی۔ اور عام فعال شہریوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ دولتمند لوگوں میں سے آدمی منتخب کریں۔ گویا فرانس کے طبقۂ اوسط کے نزدیک سیاسی دانشمندی کے لیے دنیوی اسباب کی ایک خاص مقدار کا مالک ہونا ضروری تھا۔

۱۷۹۱ء کے دستور کے مطابق جو محدود اور مرکزیت سے محروم بادشاہی قائم کی گئی تھی، اس کی ناکامی میں شبہے کی گنجائش نہ تھی۔ دستور اتنا انتہا پسندانہ تھا، جو بادشاہ کے مزاج کے مطابق نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اسی طرح امراء بھی اسے سازگار نہیں سمجھ سکتے تھے اور وہ اتنا انتہا پسندانہ نہیں تھا کہ متوسط شہری طبقہ اس پر مطمئن ہوتا۔ اس طبقے کا رجحان جمہوریت کی طرف تھا۔ قومی مجلس کی اکثریت دستور کی حمایت کے سلسلے میں اس ذہنیت کا شکار بنی جو انقلاب میں سیاسی اعتدال پسندوں کو عموماً پیش آتی ہے۔ انتہا پسندوں نے اعتدال پسندوں کو نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اعتدال پسندانہ ارادوں کے باوجود وہ لوگ بعض انتہا پسندانہ قوانین بنانے پر مجبور ہو گئے خصوصاً پادریوں کے لیے ملکی دستور جس کے مطابق خود ان کی حیثیت کمزور ہو گئی اور وہ ایک مؤثر جماعتی تنظیم قائم نہ کر سکے۔ حالانکہ جو انتہا پسند بہرحال اقلیت میں تھے، وہ اپنی قوت بڑھاتے رہے۔

یہ انتہا پسند جیکوبن[3] کہلاتے تھے، کیونکہ ان کا تعلق "انجمن محبانِ دستور"[4] سے تھا۔ پیرس میں اس انجمن کا مستقر اُس جگہ تھا، جہاں پہلے جیکوبن خانقاہ تھی۔ وہ لوگ ۱۷۹۱ء کے دستور کے مخلص محب نہ تھے۔ انھوں نے صرف وقتی مصلحت کے پیشِ نظر

---

[1] انقلاب فرانس کا دستاویزی جائزہ ص ۲۳۲۔ [2] انقلاب فرانس کا دستاویزی جائزہ ص ۲۶۰۔

[3] Jacobin [4] Society of the Friends of the Constitution

اسے قبول کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ جلد بادشاہی کو ختم کر کے ایسی جمہوریت قائم کر دیں، جو رائے عامہ پر مبنی ہو جمہوریت کی تیاری کے سلسلے میں جیکوبن گروہ نے وہ تمام حربے استعمال کیے، جو دوسروں پر سیاسی دباؤ ڈالنے والا ہر گروہ عموماً استعمال کرتا ہے۔ وہ اخباروں میں ایسے مکالمے لکھواتے، جن سے عوام میں اشتعال پیدا ہوتا اور قومی مجلس کے اجلاس کے موقع پر شور و غل مچانے والے ناظرین جمع کر لیتے۔ انھوں نے تمام صوبوں میں کلب قائم کر رکھے تھے، بلکہ کہنا چاہیے، ان کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ ان کے ذریعے سے ان کی تنظیم فرانس میں پوری قوم کے اندر پھیل گئی تھی۔ نئے صوبوں اور چھوٹے حلقوں کی مجلسوں کی تمام نشستوں پر انھوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مقامی انتخابات میں بھی انھوں نے وہی طریقہ استعمال کیا، جس سے مجلسِ عام کے انتخابات میں کام لیا تھا، یعنی بڑی حد تک ناخواندہ اور سیاسی اعتبار سے ناتجربہ کار اکثریت کے مقابلے میں ایک قابل اور باعزم اقلیت قائم کر دی۔

نظامِ قدیم کے حامی خود جیکوبن گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ ۱۷۸۹ء کے موسم گرما سے ہراس زدہ امراء اور پادری ایک سیل کی شکل میں فرانس چھوڑ کر بھاگنے لگے اور اپنے پیچھے نہایت عمدہ جاگیریں چھوڑ گئے، جنھیں ضبط کر لیا گیا۔ یوں جیکوبن گروہ کے خطیبوں اور صحافیوں کو ان لوگوں کی مذمت کا بڑا عمدہ موقع مل گیا۔ وہ کہنے لگے کہ "دیکھو یہ چوہے جہاز کو ڈوبتا ہوا فرض کر کے چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر تارکینِ وطن امیر جرمن رھائن لینڈ میں جمع ہو گئے، تاکہ آسٹریا اور روس کو ابھار کر جوابی انقلاب کا انتظام کریں۔ بادشاہ قانون سازی پر تعطل انگیز ویٹو کے بجائے مطلق العنانی کو ترجیح دیتا تھا۔ جیکوبن گروہ کے حامی اخباروں کو ایک عجیب بات سوجھی، یعنی انھوں نے لوئی شانزدہم اور ماری انتوائن کو موسیو ویٹو اور مادام ویٹو کا لقب دے دیا۔ بادشاہ کو پادریوں کے ملکی دستور کے متعلق شبہات تھے۔ ان شبہات نے اُسے اس امر پر آمادہ کر دیا کہ فرانس و جرمنی کی سرحد پر تارکینِ وطن امراء سے جا ملے۔ یہ کوشش تباہ کن تھی۔ جون ۱۷۹۱ء میں لوئی اور ماری انتوانئت نے خدمتگار اور استانی کا بھیس بدلا اور توئی لریز سے نکل پڑے۔ لوئی نے یہ غیر دانشمندانہ حرکت کی کہ اپنا چہرہ عوام کو دکھا دیا اور راستے کا ایک مقامی افسر بادشاہ کی صورت پہچانتا تھا، چنانچہ فوراً خبر آگے بھیج دی گئی اور شمالی و مشرقی فرانس میں وارن[1] کے مقام پر فوج کے ایک دستے نے بادشاہ اور ملکہ کو پیرس کی طرف واپسی پر مجبور کر دیا۔ وارن کی طرف بھاگنے کی ناکام کوشش کے بعد لوئی شانزدہم کو ایک غدار کی حیثیت دے دی گئی اور تُوئی لریز میں اس کی نگہداشت کا پورا انتظام کر لیا گیا۔ گویا دستوری بادشاہی کا تجربہ نہایت ناسازگار حالات میں شروع ہوا۔

مجلسِ قانون ساز
اکتوبر ۱۷۹۱ء۔ ستمبر ۱۷۹۲ء

یکم اکتوبر ۱۷۹۱ء کو اس قانون ساز مجلس کا اجلاس شروع ہوا، جو نئے دستور کے مطابق منتخب ہوئی تھی۔ یہ پہلی اور ایک ہی مجلس تھی، جو اس دستور کے مطابق وجود میں آئی۔ کسی بھی گروہ کو نئی مجلس میں عددی اکثریت حاصل نہ تھی۔ مجلس کی کیفیت سیاسی نقطۂ نگاہ کے مطابق ذیل میں درج ہے:

---

[1] Varennes فرانس کا ایک مقام جو مشرقی سرحد سے بالکل قریب ہے۔

جماعت	تخمینی تعدادِ مندوبین
دایاں بازو (دستوری بادشاہی کے حامی)	۲۶۵
مرکز (ناطرفدار)	۳۴۵
بایاں بازو (جیکوبن اور جروندن)	۱۳۰

(برِ اعظم یورپ کی اکثر مجلسوں میں اب تک یہ دستور ہے کہ دایاں بازو صدرِ اسمبلی کے دائیں ہاتھ بیٹھتا ہے۔ بایاں بازو بائیں ہاتھ اور مرکز بیچ میں۔ یہی کیفیت زیرِ بحث قانون ساز مجلس میں تھی)

سیاسی اقتدار کا توازن ان مندوبین کے ہاتھ میں تھا، جنھیں مرکز کے اجزاء قرار دیا گیا، لیکن وہ لوگ مذبذب اور بے عزم تھے۔ نہ وہ دستور کے زبردست حامی تھے اور نہ اس وقت تک پکّے جمہوریت پسند بنے تھے۔ چونکہ ایوان میں انھوں نے سب سے نچلی نشستوں پر قبضہ کیا تھا، اس لیے انھیں تذلیلاً بے رنگ یا دلال کہتے تھے۔ بائیں بازو کے قابل سیاستدانوں نے جلد سے جلد مرکزی گروہ کے ووٹوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح ایک باعزم اقلیت کی قوت کا نیا مظاہرہ ہُوا۔

اس اقلیت کی قیادت جیکوبن گروہ کے اس چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں تھی، جسے جروندی[۱] کہتے تھے۔ یہ مندوبین بوردو کے حلقۂ جروندے سے آئے تھے۔ جروندیوں کو ایسی خطابت میں کمال حاصل تھا، جس میں حُبِّ وطن کا اظہار ولولہ انگیز طریق پر کیا جائے۔ انھوں نے تقریروں میں انقلاب فرانس کی ایک ایسی تصویر پیش کی، جو قدامت پسندوں کی سازشوں کی زد میں ہو اور یہ سازشیں تارکینِ وطن امیروں کی انگیخت پر کی جا رہی ہوں۔ وطن کے اندر حلف نہ اٹھانے والے پادری اور شاہی خاندان کے افراد اس سازش کے معاون ہوں۔ مزید برآں بیرونی بادشاہوں کی جمعیت۔ اس میں شریک ہو اور ہولیولڈ دوم شہنشاہ آسٹریا اس جمعیت کا رئیس وسرکردہ ہو۔ جروندی لیڈر بریسو[۲] نے جنوری ۱۷۹۲ء میں مجلس سے کہا:

"کھُلی جنگ بے اعلان جنگ کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔ آزاد قوم کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ڈپلومیسی کی باریکیوں میں اُلجھے رہنے کے بجائے فوجی فتح وظفر کی بناء پر اپنی آزادی کی حفاظت کرے۔"[۳]

اگرچہ لوئی شانز دہم واَرن بھاگ گیا تھا، مگر وہ غدّار نہ تھا اور لیوپولڈ دوم نے تارکینِ وطن کی امداد محدود رکھی اور اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا۔

مارچ ۱۷۹۲ء میں اچانک لیوپولڈ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا فرانسس دوم جانشین ہُوا۔ وہ زیادہ محتاط نہ تھا، نیز ناتجربہ کار تھا، اس وجہ سے آسٹریا کے خطرے میں اضافہ ہو گیا۔ عین اسی زمانے میں جنگجو جروندیوں نے فرانس کی ڈپلومیسی

۱؎ Girondin ۲؎ Brissot

۳؎ Archives parlementaires سلسلۂ اوّل جلد ۳۷ ص ۴۶۴ - ۴۶۶

اپنے قبضے میں لے لی۔ ۲۰۔اپریل ۱۷۹۲ء کو قانون ساز مجلس نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ فرانسیسیوں کے نزدیک یہ جنگ دفاعی تھی، جارحانہ جنگ نہ تھی، جس سے الگ رہنے کا اعلان دستور کی دلکشا عبارت کے ذریعے سے کیا گیا تھا۔

ابتدا میں جنگ فرانس کے لیے سازگار ثابت نہ ہوئی۔ پروشیا آسٹریا کے ساتھ مل گیا۔ ۲۵۔جولائی ۱۷۹۲ء کو برنزوک[1] کے ڈیوک نے، جو پروشیائی فوج کا کمانڈار تھا، اپنا منشور شائع کیا، جو تارکینِ وطن امرا میں سے ایک شخص نے مرتب کیا تھا۔ اس دستور میں اتحادیوں کے جنگی مقاصد یوں پیش کیے گئے تھے:

"...... فرانس میں بدنظمی کی روک تھام۔ تخت و تاج اور کلیسا کے خلاف حملوں کا انسداد۔ آئینی اقتدار کا دوبارہ قیام۔ بادشاہ کے لیے حفاظت و آزادی کی بحالی، جس سے وہ محروم کردیا گیا ہے اور اس کے لیے ایسی حیثیت کی استواری کا انتظام، جس سے وہ اپنے جائز اقتدار سے کام لے سکے۔"[2]

اس کے بعد دھمکی دے دی گئی، یعنی اگر توئی لریز پر عملاً یا قولاً حملہ کیا گیا اگر شاہی خاندان کے خلاف خفیف سا حملہ بھی کیا گیا اور اگر بادشاہ اور ملکہ کی حفاظت، بحالی اور آزادی کے لیے فوری اقدامات شروع نہ ہوئے تو پیرس کو ایک ایسی انتقامی کاروائی کا نشانہ بنایا جائے گا، جو کبھی فراموش نہ ہوگی اور جو لوگ بدنظمی کے ذمہ دار ہوں گے، انھیں تعذیب کے حوالے کردیا جائے گا، جس کے وہ بجا طور پر سزاوار ہیں۔[3]

برنزوک کے منشور نے فرانسیسیوں کو ہرگز ہراساں نہ کیا، حالانکہ منشور کا مدعا یہی تھا۔ اس کے برعکس وہ جمہوریت پر اور بھی باعزم طریق پر پختہ ہوگئے اور فیصلہ کرلیا کہ بادشاہی کو ختم کردیں۔ ۱۷۹۲ء کے اوائلِ گرما میں پیرس کے جیکوبن بغاوت بپا کرنے کے لیے سازشیں کرتے رہے۔ انھیں زبردست معاونوں کی امداد حاصل ہوگئی، جن میں محبانِ وطن، فوجی رنگروٹ اور صوبوں کے انتہا پسند شامل تھے، جو بیسٹیل پر قبضے کی تیسری سالگرہ منانے کے لیے پیرس آگئے تھے۔ پیرس کے مزدوروں میں اس وجہ سے ناراضی پھیل گئی کہ نوٹوں کی قیمت گھٹ گئی تھی۔ غذائی قلت از سرِ نو شروع ہوگئی تھی اور حکومت اقتصادی مشکلات کے خلاف کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے میں ناکام رہی تھی۔ ایک ایک کرکے پیرس کے اڑتالیس وارڈ جیکوبن گروہ کے سیاسی ضبط و نظم میں آگئے اور پورے پیرس کے صرف اڑتالیس ہی وارڈ تھے۔ ۹ اور ۱۰۔اگست ۱۷۹۲ء کی رات میں معاملات نزاکت کی آخری حد تک پہنچ گئے۔ مختلف وارڈوں کے لیڈروں نے از روئے دستور مقرر کردہ اربابِ اختیار کو پیرس کے بلدیاتی نظم و نسق سے الگ کردیا اور اس کی جگہ جیکوبن گروہ کا ناجائز اقتدار قائم ہوگیا۔

پیرس میں بلدیاتی انقلاب سے معاً فیصلہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ ۱۰۔اگست کی صبح کو نئے بااقتدار گروہ کی فوجوں نے توئی لریز

---

[1] Brunswick

[2] Le moniteur universel مورخہ ۳۔اگست ۱۷۹۲ء

[3] Le moniteur universel مورخہ ۳۔اگست ۱۷۹۲ء

پر حملہ کیا اور بادشاہ نے سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کی جو محافظ فوج مقرر کر رکھی تھی، اسے قتل کر ڈالا اور لوئی شانزدہم اور شاہی خاندان نے عارضی طور پر مجلس قانون ساز میں پناہ لی۔ ۱۰۔ اگست کی اس بغاوت نے بادشاہی کی بد انجامی پر آخری مُہر لگا دی۔ مجلس قانون ساز پر ہراس طاری ہو گیا اور اس کی حیثیت پیرس کی ناجائز مقتدر جماعت کے ایک قاعد کی سی رہ گئی۔ دائیں بازو اور مرکز کے اکثر ممبر مجلس قانون ساز سے غیر حاضر تھے۔ اس حالت سے فائدہ اُٹھا کر مجلس نے بادشاہی کا منصب ختم کر دیا۔ شاہی خاندان کے لیے قید کا حکم صادر ہو گیا اور ایک نئے دستور ساز کنونشن[ل] کا حکم صادر کر دیا گیا۔ اس نئی نمائندہ مجلس کے انعقاد پر جیکوبن گروہ کی ایک مجلس حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے مقرر ہو گئی۔ یوں فرانس کی پہلی جمہوریت کا ستارہ طلوع ہُوا۔

ل Convention

چودھواں باب

پہلی جمہوریت

ستمبر ۱۷۹۲ء کی خونریزی

۱۰۔ اگست اور کن وینشن کے انعقاد (۱۱۔ستمبر) کے درمیانی ہفتے بحران وکشاکش کے ہفتے تھے۔ نوٹوں کی قیمت صرف اگست میں چالیس فی صد گر گئی۔ جیکوبن پیرس کے عوام کو برابر مشتعل کر رہے تھے۔ انھیں اقتصادی مشکلات اور توئلریز پر قبضے نے پہلے ہی نعل در آتش کر رکھا تھا۔ جب یہ خبر پہنچی کہ پروشیا کی فوجیں شمالی ومشرقی فرانس پر حملہ آور ہو گئی ہیں تو جوش اور بھی بڑھ گیا۔ اس نازک وقت میں جیکوبن فریق کا وزیر اعظم دانتن[1] تھا، جس نے دشمن کو کچلنے کا راستہ دکھا کر غیر فانی شہرت حاصل کر لی۔ اس نے کہا: "کچلنے کا راستہ یہ ہے، مردانگی دکھاؤ اور زیادہ مردانگی دکھاؤ، ہمیشہ مردانگی دکھاتے رہو۔"

پیرس کی ہنگامہ آرائی نے ستمبر کی خونریزیوں کی شکل اختیار کر لی، جن لوگوں کو غدار یا دشمن کے کارندے سمجھا جاتا تھا، ان لوگوں کو پکڑ کر عوام نے خود بخود سزائے موت دے دی۔ ۲۔ستمبر سے پانچ روز تک جیکوبن گروہ کے بھڑکائے ہوئے خونریز عوام ایک ایک قید خانے میں پھرے۔ جہاں جاتے، فوری عدالت بٹھا کر قیدیوں کے مقدمات کی سماعت کرتے اور وہیں انھیں موت کی سزا دے دیتے۔ مظلوموں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں عام مجرم بھی شامل تھے، امرا بھی، وہ پادری بھی، جنھوں نے دستور کی اطاعت کا حلف نہیں اٹھایا تھا۔ یہ سب بالکل بے گناہ تھے۔ ان پر غداری کا جو الزام لگایا گیا تھا، اس سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سلسلے کا حد درجہ دردناک واقعہ یہ تھا کہ شہزادی دالمبال[2] کو بری طرح قتل کیا گیا، جو ملکہ کی ندیم تھی۔ عوام اس شہزادی کا کٹا ہوا سر برچھی پر رکھ کر اس قید خانے کے قریب پہنچے، جہاں شاہی خاندان بند تھا اور کھڑکی کے سامنے وہ کٹا ہوا سر اونچا کیا گیا تاکہ ماری انتوائنت دیکھ لے، عوام استبداد کے پیکروں سے بدلہ کیونکر لیتے ہیں۔

ستمبر کی اس وحشت انگیز خونریزی سے فرانس میں دہشت کا دور شروع ہو گیا۔ آئندہ دو سال میں انقلابی بخار کا پارہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ حرارت کی شدت ہی نے اسے جلا ڈالا۔ اس اثنا میں فرانس برسر جنگ رہا۔ والمی[3] میں

۱؎ Danton انقلاب فرانس کی شہرۂ آفاق شخصیت، جسے رابس پیئر نے خوامخواہ موت کی سزا دلائی۔

۲؎ Princesse de Lamballe

۳؎ Valmy فرانس کا ایک مقام، جہاں فرانسیسی اور پروشیائیوں کی لڑائی ہوئی تھی۔

فرانس نے ایک فتح حاصل کی (۲۰ ستمبر ۱۷۹۲ء)۔ اس پر برنزوک ٹوٹ گیا اور پروشیائی فوج نے پیرس کی جانب سے رخ موڑ لیا۔ آگے چل کر فرانسیسیوں کو مزید محکم کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ پانسا پھر ایک مرتبہ پلٹا اور موسمِ خزاں کی کامیابیوں کے اثرات محو ہو گئے۔ ۱۷۹۳ء کے موسمِ گرما تک نیم شکست خوردہ فرانس کے سامنے یورپ کی تمام بڑی طاقتوں کا اتحاد لڑنے کے لیے تیار تھا تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس وجہ سے کن ونشن کو برابر فوری ضرورت کی مستقل فضا میں کام کرنا پڑا۔

جرونڈے اور کوہستانی

نظری اعتبار سے قومی کن ونشن کے انتخاب (اگست وستمبر ۱۷۹۲ء) سے فرانس میں صحیح سیاسی جمہوریت کی ابتدا ہوئی۔ اس موقع پر تمام "فعّال" اور "غیر فعّال" شہریوں کو ووٹ دینے کی دعوت دی گئی، تاہم ستر لاکھ ووٹروں میں سے صرف دس فی صد ووٹ دے سکے۔ باقی لوگوں نے احتراز کیا یا وہ جیکوبن گروہ کے کارندوں کی کوششوں کے باعث لوٹا دیے گئے۔ یہ کارندے ہمیشہ دیکھتے رہتے تھے کہ کون کون سے لوگ انقلاب کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت کے حامیوں کو بے پناہ اکثریت حاصل ہو گئی۔ اس کی کیفیت ستمبر ۱۷۹۲ء کے اعدادِ انتخاب سے واضح ہو سکتی ہے:

جماعت	مندوبین کی تخمینی تعداد
دایاں بازو (جرونڈی)	۱۶۵
مرکز (غیر جانبدار)	۴۳۵
بایاں بازو (کوہستانی)	۱۵۰

کن ونشن کی انتہا پسندی جیکوبن گروہ کے سابقہ اعمال سے واضح تھی، خواہ ان کا تعلق دائیں بازو سے تھا یا بائیں بازو سے۔ جرنڈیوں اور کوہستانیوں[1] ——— بائیں بازو کے مندوبین کو کوہستانی اس لیے کہا گیا کہ یہ ایوان میں اونچی نشستوں پر بیٹھتے تھے ——— کے درمیان اشتراک کے کئی رشتے تھے۔ دونوں گروہوں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ دونوں فلسفیوں کے افکار سے حد درجہ متاثر تھے۔ دونوں متفق تھے کہ فرانس میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے (۲۱ ستمبر ۱۷۹۲ء)۔

تاہم جرونڈیوں اور کوہستانیوں کے درمیان جلد عداوتیں اور رقابتیں رونما ہو گئیں۔ جرونڈی مندوبین صوبائی مفادوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مندوب نے کن ونشن کو بتایا:

> "مجھے پیرس کی مطلق العنانی سے ڈر لگتا ہے ..... مَیں نہیں چاہتا کہ پیرس سازشیوں کی رہنمائی میں مملکتِ فرانس کے اندر وہی مقام حاصل کر لے، جو رومہ نے سلطنت رومہ کے اندر حاصل کر لیا تھا۔ پیرس کا اثر ایک سو تراسی درجے گھٹنا چاہیے، تاکہ وہ دوسرے علاقوں اور حلقوں کے برابر ہو جائے۔"[2]

۱؎ Mountain

۲؎ پارلیمانی دستاویزیں سلسلۂ اوّل جلد ۵۲ ص ۱۳۰۔

جرونڈی ستمبر کی خونریزی کا ماتم کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انقلابی قانون سازی کے لیے تھوڑی سی مہلت مل جائے، کیونکہ سیاسی پروگرام کا خاکہ اس دستور کے مسودے میں شامل ہو گیا تھا جو ۱۷۹۳ء کے اوائل میں مکمل ہوا اور اسے مکمل کرنے والا کنڈورسٹ[1] تھا، جو جرنڈیوں میں سے ممتاز ترین مندوب اور انسانی ترقی کے لیے پیشگو تھا۔ کنڈورسٹ کے مسودے میں حکومت کی مرکزیت بڑی حد تک کم کر دی گئی تھی (اس کے لیے انقلابی اصطلاح وفاقیت استعمال کی گئی تھی)۔ قانون سازی اور تنفیذیہ (ایگزیکٹو) کو ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تھا اور ان کا انتخاب بھی الگ الگ تھا۔ انتخاب کے نتائج کا فیصلہ متناسب نمائندگی پر رکھا گیا۔ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جو قوانین بنائے جائیں گے، اُن کے متعلق استصواب رائے عامہ کیا جائے گا اور ووٹروں کو حق حاصل ہوگا کہ منتخب افسروں میں سے جو نالائق ثابت ہوں، انھیں الگ کرا دے۔ اس طرح دستور پر زائد پابندیاں عائد ہو گئیں اور مزید توازن کا انتظام کر دیا گیا۔

اس کے برعکس کوہستانی جماعت کے لیڈر چاہتے تھے کہ وفاقیت کے بجائے مرکزی حکومت کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنایا جائے۔ جرونڈیوں کے نزدیک عدم مداخلت کی پالیسی بہتر تھی۔ کوہستانیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اقتصادی معاملات میں مداخلت کرنی چاہیے۔ اسی طرح وہ اپنے شہری حامیوں کو مطمئن کر سکتے تھے۔ کوہستانیوں کا سب سے بڑا لیڈر میکسی ملین رابس پیئر[2] (۱۷۵۸ء - ۱۷۹۴ء) تھا۔ یہ مخلص نوجوان قانوندان انقلابیوں جیسا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے بال بڑی خوش اسلوبی سے سنوارتا، ان پر پوڈر چھڑکتا۔ ہلکے نیلے رنگ کا کوٹ اور گھٹنوں تک برجس پہنتا۔ یہ نظام قدیم کا فیشن تھا۔ بایں ہمہ رابس پیئر ایک متشدد سیاسی آدمی تھا، جس کی تقریریں غیر مذہبی وعظ معلوم ہوتی تھیں۔ انھیں نئے الہامات کے طور پر سنجیدہ زبان میں پیش کیا جاتا تھا۔ فروری ۱۷۹۴ء میں اس نے اپنا عقیدہ نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا:

"ہم سب کس نصب العین کی طرف جا رہے ہیں؟ ہماری غرض یہ ہے کہ آزادی اور مساوات سے پُرامن طریق پر مستفید ہوں۔ دائمی عدل کی حکومت سے متمتع حاصل کریں، جس کے قوانین انسانوں کے دلوں پر مرتسم ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ غلام کا قلب بھی ان سے ناآشنا نہیں، جو ان سے تغافل برتتا ہے اور استبداد دوست کے قلب پر بھی ان کی مُہر لگی ہوئی ہے جو ان سے انکار کرتا ہے۔

ہم ایک نظام پیدا کرنا چاہتے ہیں ... جس کے تحت ہمارا وطن ہر فرد کی بہبود کا یقین دلائے، جس میں ہر فرد اپنے وطن کی خوش حالی اور عظمت و شان سے فخر کے ساتھ محظوظ ہو، جہاں سب کی روحیں جمہوری جذبات کے مسلسل اظہار سے نشوونما پائیں، جہاں

---

[1] Condorcet

[2] Maximilien Robespierre

فنون آزادی کا زیور بن جائیں، جس کی وجہ سے فنون میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تجارت
ثروت عامہ کا سرچشمہ ہو۔ چند گھرانوں کی شیطانی زراندوزی کا ذریعہ نہ رہے۔" [1]

رابس پیئر خلوص سے یقین رکھتا تھا کہ معاہدۂ عمرانی کے مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ روسو کی طرح اسے بھی انسانیت کی فطری خیر پسندی پر بھروسا تھا اور ان قوانینِ عدل پر یقین تھا، جو لوگوں کی طرح قلب پر مرتسم تھے۔ اس کے نزدیک جمہوریت صرف حکومت کی بہترین شکل ہی نہ تھی، بلکہ ایک مذہب بھی تھی، جو انسانی خیر و صالحیت کا عمدہ ترین مظہر تھی۔ رابس پیئر کو یقین تھا کہ اُسے رضائے عامہ کا علم ہے اور رضائے عامہ کا مطالبہ یہ ہے کہ خیر و صالحیت کی جمہوریت قائم ہو جائے۔ اگر اہلِ فرانس رضاکارانہ آزاد و خیر پسند نہ ہوں تو وہ انھیں مجبور کرے گا کہ آزاد ہوں اور خیر و صالحیت ان کے حلق میں اُتار دے گا۔

رابس پیئر اور اس کی جمہوریتِ خیر نے کامیابی حاصل کی۔ جب مرکزی گروہ سے ووٹ لینے کا مقابلہ ہُوا (اور توازن کا رشتہ مرکز ہی کے ہاتھ میں تھا) تو کوہستانیوں نے جرونڈیوں کو شکست دے دی۔ ۱۵ جنوری ۱۷۹۳ء سے "شہری لُوئی کاپٹ" [2] پر بحث شروع ہوئی۔ ایک سَو گھنٹوں کے مسلسل ووٹوں کے بعد جرونڈیوں نے شکست فاش کھائی اور کن وینشن نے اعلان کر دیا کہ شہری لُوئی کاپٹ ملک سے غداری کا مجرم ہے اور نہایت معمولی اکثریت سے فیصلہ کر دیا کہ اسے بلاتاخیر گلوٹین پر موت کی سزا دی جائے۔ لوئی شانزدہم نے ۲۱۔ فروری ۱۷۹۳ء کو مردانہ وار موت قبول کی۔ اگرچہ فرانسیسی آبادی کی اکثریت بادشاہ کے قتل کو ناپسند کرتی تھی، لیکن کن وینشن پر اس اکثریت کو عمل دخل حاصل نہ تھا۔ تقریروں میں بعض جرونڈی مندوبین نے کہا تھا کہ لُوئی موت کی سزا کا مستوجب نہیں۔ انھوں نے دورِ تنویر کے انسانیت پرور اصول کی حفاظت میں مردانہ موقف اختیار کیا۔ ساتھ ہی وہ جوابی انقلابی ہونے کے الزام کا ہدف ٹھہرے۔

حالات کی رفتار نے جرونڈیوں کو تباہ کر دیا۔ فروری ۱۷۹۳ء میں کن وینشن نے کنڈورسٹ کا دستوری مسودہ ٹھکرا دیا۔ فوج نے دوموریا [3] کے زیرِ سرکردگی (جو جرونڈی جرنیل تھا) ممالک زیریں میں شکستیں کھائیں۔ اپریل میں دوموریا دشمن سے جا ملا۔ فروری ۱۷۹۳ء میں کن وینشن برطانیہ، فرانس، اور ہالینڈ کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکی تھی اور فرانس کو دشمنوں کی خوفناک تعداد سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ خود وطن میں بے روزگاری تھی، چیزوں کی قیمتیں بڑھ چکی تھیں، غذائی جنسیں کم رہ گئی تھیں۔ جرونڈیوں کے پاس اس کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی کہ وہ کہیں تعطل کی پالیسی جاری رہنی چاہیے۔ کوہستانیوں کے لیڈروں نے اس امر پر زور دیا کہ قیمتوں پر ضبط و نظم قائم کیا جائے۔ غذائی جنسیں بالجبر حاصل کی جائیں اور جرونڈیوں کو جیکوبن گروہ کے تمام کلبوں سے نکال دیا جائے۔ ۲۔ جون ۱۷۹۳ء کو پیرس کے جیکوبنوں نے کن وینشن پر حملہ کر دیا اور اسے مجبور کیا کہ انتیس جرونڈی

---

[1] لامانی تیئر یونیورسل ۷۔ فروری ۱۷۹۴ء

[2] Citizen Louis Capet انقلاب کے بعد مساوات کے پیشِ نظر سب کے لیے شہری کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ کاپٹ لُوئی کا خاندانی نام تھا، اس لیے بادشاہ کے بجائے اسے لُوئی کاپٹ کہتے تھے۔

[3] Dumouricz

مندوبین کو گرفتار کرلیا جائے۔ ان مسلّح اہلِ پیرس کی امداد کے بل پر کوہستانیوں نے مرکزی گروہ کو بے دست و پا کر دیا اور کن وینشن نے گرفتار شدہ جرونڈیوں کو گلوٹین پر موت کی سزا دلا دی۔ وحشت و دہشت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

حکومت دہشت و وحشت
(جون ۱۷۹۳ء - جولائی ۱۷۹۴ء)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کے وکیلوں نے فرانس پر ایسی جابر و بیدرد مطلق العنانی کیوں ٹھونسی؟ اس کے متعلّق رابس پیئر کی توجیہہ ملاحظہ فرمایئے:

"...... جمہوریت کے قیام واستحکام اور دستوری قوانین کی پُرامن حکومت کے لیے ہمیں پہلے استبداد کے خلاف آزادی کی جنگ پایۂ تکمیل پر پہنچانی چاہیے...... ضروری ہے کہ ملک کے اندر اور باہر جمہوریت کے دشمنوں کو تباہ کیا جائے۔ یہ نہ ہو گا تو ہم خود تباہ ہو جائیں گے۔ اگر دورانِ امن میں جمہوری حکومت کا سب سے بڑا سہارا خیر و صالحیت ہے تو دورِ انقلاب میں جمہوری حکومت کو نیکی اور دہشت پر انحصار رکھنا چاہیے۔ دہشت عدل کے سوا کچھ نہیں۔ فوری، سخت اور غیر متزلزل عدل، یہ نیکی سے پیدا ہوتا ہے...... کہا گیا ہے کہ دہشت مطلق العنان حکومت کا سب سے بڑا سہارا ہے...... دورِ انقلاب کی حکومت استبداد کے خلاف آزادی کی مطلق العنانی کا دوسرا نام ہے۔"[1]

کن وینشن نے اس جمہوری دستور پر منظوری کی مُہر ثبت کر دی، جو کوہستانیوں نے تیار کیا تھا۔ اس میں ہر بالغ کو حقِ رائے دیا گیا اور پورے اختیارات مل گئے۔ ایک قانون ساز ایوان منظور ہُوا جس میں جرونڈیوں کی پابندیاں اور توازن موجود نہ تھے۔ جب یہ دستور رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے پیش ہُوا، تو ستّر لاکھ فرانسیسی ووٹروں میں سے بیس لاکھ سے بھی کم نے ووٹ دیے اور نتیجہ اس دستور کی تصدیق کے سوا کچھ نہ نکلا۔ پھر کن وینشن نے ۱۷۹۳ء کے دستور کا نفاذ غیر معیّن مدّت کے لیے ملتوی کر دیا اور یہ ردّی کی ٹوکری میں پڑا رہا۔ رابس پیئر نے خود کہہ دیا تھا کہ جمہوریت کے قیام واستحکام سے پہلے ہمیں استبداد کے خلاف آزادی کی جنگ پایۂ تکمیل تک پہنچا دینی چاہیے۔

دورِ دہشت و وحشت کی عنانِ حکومت بارہ آدمیوں کی ایک مجلس کے حوالے تھی، جسے "مجلس حفظِ عامّہ"[2] کہتے تھے۔ یہ مجلس رابس پیئر اور دوسرے بڑے بڑے کوہستانیوں پر مشتمل تھی۔ اگرچہ مجلس برائے نام کن وینشن کے روبرو جواب دہ تھی، مگر اسے خود مختاری کے وسیع اختیارات حاصل تھے اور یہ جنگی کابینہ کی حیثیت میں کام کرتی تھی۔ مندوبین کا ایک اور گروہ پولیس کی سرگرمیوں کا نگران تھا اور جمہوریت کے مشتبہ دشمنوں کو نئی انقلابی عدالت کے حوالے کرتا رہتا تھا۔ اسے "مجلسِ تحفّظِ عامّہ"[3] کہتے تھے۔ انقلابی عدالت کے سولہ جج اور سولہ ارکانِ جُوری تھے، جنھیں متعدد عدالتوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا تاکہ ظلم و جبر کا کام جلد سے جلد پُورا ہو جائے۔ جس حد تک مقامی خود اختیاری کا تعلّق ہے، کوہستانیوں نے اس خود اختیاری نظام کا بڑا حصّہ ختم کر دیا، جو

---

[1] لامانی تیٹر یونیورسل ۵ - فروری ۱۷۹۴ء۔
[2] Committee of Public Safety
[3] Committee of Public Security.

۱۷۹۱ء کے دستور کے مطابق نافذ ہوا تھا۔ مقامی جیکوبن کلبوں نے ان تمام لوگوں کو مختلف انتظامی محکموں سے الگ کر دیا، جو از روئے سیاست ناقابلِ اعتماد تھے اور خاص مقامی عدالتوں نے انقلابی عدالت کے خوفناک کام میں زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹایا۔ گو منتاینوں کو یہ بھی خیال تھا کہ تمام صوبے چُپ چاپ ساتھ رہیں، چنانچہ انھوں نے کن ونشن کے بعض مستند علیہ ارکان کو کارندے بنا کر جا بجا بھیج دیا۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے دورِ دہشت ایک طرف بیسویں صدی کی مطلق العنانی کا پیش خیمہ تھا، دوسری طرف اس نے فرانس کے قدیم ترین اصولِ مرکزیت کو اپنا لیا تھا۔ جن نمائندوں کو صوبوں میں کارِ خاص پر بھیجا گیا تھا، انھوں نے صوبہ داروں کی حیثیت اختیار کر لی۔

دورِ دہشت و وحشت کا ریکارڈ

دورِ دہشت و وحشت کا ریکارڈ ذیل میں ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ کشتگانِ ظلم و جور: رابس پیئر نے تیز، سخت اور غیر متزلزل عدل کا وعدہ کیا تھا۔ اس میں بیس ہزار فرانسیسی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ ان میں مادی انتوائنٹ سے عام بے گناہ مردوں اور عورتوں تک سب شامل تھے، جن کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ روسو کی تعلیمات کو پوری طرح سمجھتے نہ تھے۔ بعض مظلوم وینڈی[1] سے آئے۔ یہ مغربی فرانس میں کیتھولکوں کا ایک علاقہ تھا، جو شاہ پرست تھے۔ انھوں نے جمہوریت کے خلاف بغاوت کی تھی، تاکہ سپاہی بھرتی کریں۔ ہمارے زمانے میں ہمہ گیر لڑائیوں، بیگار کے مرکزی کیمپوں اور مُردوں سے پٹی ہوئی شاہراہوں نے معاملہ اس درجے پر پہنچا دیا ہے کہ بیس ہزار کشتگانِ ظلم کا عدد کچھ زیادہ بڑا معلوم نہ ہوگا، لیکن اٹھارھویں صدی کے معیاروں کے مطابق یہ خونریزی کا خوفناک ریکارڈ تھا اور جس معیار سے بھی کام لیا جائے، یہی معلوم ہوگا کہ دورِ دہشت و وحشت نے بعض نہایت ہولناک کارنامے انجام دیے۔ نانتز میں دو ہزار سے زیادہ مشتبہ افراد کو ایسی کشتیوں پر بٹھا کر دریائے لوار میں چھوڑ دیا، جن میں پانی آتا تھا اور وہ سب کے سب ڈوب گئے۔

۲۔ جنگ: دورانِ جنگ میں جس جنونی کیفیت نے دورِ دہشت کی ستم رانیوں کے لیے وجہِ جواز مہیا کی، اس نے ایک خاص وضع کی محبتِ وطن کو بھی تقویت پہنچائی۔ ۲۳۔ اگست ۱۷۹۳ء کو ایک فرمان جاری کیا، جس میں جیکوبنوں کی جمہوری قوم پروری کا خلاصہ پیش کر دیا:

> "اس لمحے سے اُس وقت تک، جب دشمن جمہوریت کے علاقوں سے نکال دیے جائیں گے، تمام فرانسیسیوں کو فوجی خدمت کے لیے مستقل طور پر بُلا دیا جا رہا ہے۔
> نوجوان میدانِ جنگ میں پہنچیں گے۔ بیاہے ہوئے لوگ اسلحہ تیار کریں گے۔ رسد کا سامان پہنچائیں گے۔ عورتیں خیمے اور وردیاں بنائیں گی اور ہسپتالوں میں خدمات انجام دیں گی۔ بچے پُرانے کپڑوں سے پٹیاں تیار کریں گے۔ بوڑھوں کو اجتماعِ عامّہ کے مرکزوں میں پہنچایا

---

[1] Vendee یہ فرانس کا ایک صوبہ ہے۔

جائے گا، تاکہ سپاہیوں کے حوصلے بڑھائیں۔ بادشاہوں کے خلاف نفرت پھیلائیں اور جمہوریت کے اتحاد پر زور دیں۔"[1]

مجلس حفظِ عامہ نے ان اصول پر فوراً عمل شروع کردیا۔ اٹھارہ سال سے پچیس سال کی عمر تک کے تمام کنوارے اور رنڈوے فوج میں بھرتی کرلیے گئے۔ پیرس میں سیکڑوں زیرِ سما کارخانے قائم کردیے گئے، جن میں اسلحہ بنتے تھے۔ بارود کے لیے قلمی شورے کی ضرورت تھی اور اس کی درآمد جنگ کی وجہ سے بند تھی، لہٰذا حکومت نے ایک بڑی مہم کا انتظام کیا تاکہ تہ خانوں اور اصطبلوں سے قلمی شورے کے ٹکڑے نکال لیے جائیں۔

۱۷۹۳ء کے اختتام پر جمہوری افواج نے غیرملکی فوجوں کو سرزمین فرانس سے نکال دیا۔ جنگ میں پانسا پلٹنے کا سہرا صرف جیکوبن گروہ کے سر نہ تھا۔ جنگی کامیابیاں اس امر کا ثبوت تھیں کہ نظامِ قدیم کے عہدِ جانکنی میں فوج کی حالت بہتر ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی یہ کامیابیاں فرانس کے خلاف اتحادی قوّتوں کی کمزوری کا نشان تھیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نئی جمہوری روح کے بغیر ان کا حصول مشکل تھا۔ یہی نئی روح تیسرے طبقے میں سے لوگوں کو افسر بنانے کی ذمہ دار تھی اور جیکوبن گروہ کے پیدا کیے ہوئے جنگی جوش و حمیت کی بدولت فرانسیسی فوج عزم و شجاعت کے لحاظ سے یورپ بھر میں بہترین بن گئی۔ جس حد تک سپاہی مقاصد کے لیے جنگ کرتے ہیں، بے شبہہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۴ء میں فرانسیسی فوج آزادی اور مساوات کے لیے لڑتی رہی۔

۳۔ اقتصادیات: پوری قوم کو میدانِ جنگ کے لیے تیار کردینے کا مطلب یہ تھا کہ ویسی ہی اقتصادی قربانیاں کی جاتیں۔ افراطِ زر اور قلّتِ خوراک کے دو شیطانوں کو پابند رکھنے کے لیے دورِ دہشت و وحشت کی حکومت نے قیمتوں اور اُجرتوں کا ایک پیمانہ مقرر کردیا۔ اُجرتیں ۱۷۹۰ء کی شرح پر تقریباً پچاس فی صد زائد کردی گئیں اور اشیاء کی قیمتیں تینتیس فی صد زائد رکھی گئیں۔ جو جنسیں کمیاب تھیں، ان کی راشن بندی ہوگئی۔ میدے کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔ تمام محبانِ وطن کو ہدایت کردی گئی کہ سب ایک ہی قسم کی روٹی کھائیں۔ اس روٹی میں پورا گیہوں استعمال ہوتا تھا، بھوسی چھان بھی الگ نہیں رکھا جاتا تھا۔ پھر ۱۷۹۴ء کے اوائل میں کن ونشن نے "قوانین ونتوس"[2] (یہ) انقلابی تقویم کا ایک مہینا تھا، جس میں یہ قوانین منظور ہوئے۔ ان کے مطابق تارکینِ وطن اور مخالفینِ جمہوریت کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں اور انھیں بے اراضی فرانسیسیوں میں تقسیم کردیا گیا۔

اشتراکی مورخوں نے اکثر ان قوانین کو اس امر کی شہادت قرار دیا ہے کہ حکومتِ دہشت و وحشت سیاسی جمہوریت سے عمرانی جمہوریت کی طرف متوجہ ہورہی تھی اور جمہوریۂ خیر عمرانی انقلاب کی ابتدا کررہی تھی۔ لیکن یہ قوانین اقتصادی ضبط و نظم کے ان وسائل سے بھی پوری طرح مشابہ نہ تھے، جو غیر اشتراکی ریاست ہائے متحدہ نے دوسری عالمی جنگ میں اختیار کیے

---

[1] لامانی تیئر یونیورسل، ۲۴ اگست ۱۷۹۳ء [2] The laws of Ventose

اور یہاں تک فیصلہ کر دیا کہ اجرتیں قیمتوں کے تناسب سے ذرا زیادہ رہیں گی۔ اگرچہ ان قوانین کے ذریعے سے کاغذی نوٹوں کی قیمت میں رُجحانِ تخفیف رُک گیا، مگر چور بازاری کا ہنگامہ گرم رہا، بلکہ حکومت بھی اس کی سرپرستی کرتی رہی۔

اگرچہ "قوانین ونتوس" کے مطابق جائداد کی از سرِ نو تقسیم اشتراکیت کا پیش خیمہ تھی، مگر یہ قوانین کبھی جاری نہ ہوئے۔ مزید برآں کِن ونیشن کو یقین دلا دیا گیا کہ کوہستانی املاک پر عام یورش کا ارادہ نہیں رکھتے تھے:

"انقلاب نے ہم پر یہ اصول واضح کر دیا کہ جس شخص نے ملک سے دشمنی کا اظہار کر لیا ہے وہ جائداد کا مالک رہنے کا حقدار نہیں۔ محبانِ وطن کی جائدادیں درخورِ احترام ہیں، لیکن سازشیوں کا مال اسباب صرف بے نواؤں کے لیے ہے۔"[1]

حقیقی اشتراکی کے نزدیک محبانِ وطن کی جائدادیں بھی مقدس نہیں۔ دورِ دہشت و وحشت میں طبقۂ متوسط سے جو لیڈر اُبھرے، وہ حقیقی اشتراکی نہ تھے، صرف انقلاب کے ہنگامی حالات نے انھیں عدم مداخلت کی پالیسی کے ترک پر مجبور کر دیا۔ لازم تھا کہ وہ شہری باشندوں کے لیے غذائی جنسیں ارزاں رکھتے اور یہ بھی ضروری تھا کہ وہ لوگوں کو آئندہ کی بہبود کی کچھ نہ کچھ امید دلاتے۔ اس وجہ سے یہ قوانین بنے۔

۴۔ معاشرہ اور ثقافت۔ دورِ دہشت و وحشت کے انتہائی انقلابی اثرات وسیع عمرانی و ثقافتی اصلاحات کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ رابس پیئر نے اعلان کیا: "ہم اپنی سرزمین میں بادشاہی کی تمام خرابیوں اور لغویتوں کی جگہ جمہوریت کے تمام فضائل و کمالات رائج کرنا چاہتے ہیں۔" "تمام" سے رابس پیئر کی مراد تھی، لباس، فنون، تفریحات، تقویم (کیلنڈر) اور مذہب۔ جمہوریت کی فضیلت کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی جس سے نظامِ قدیم کی بُو آئے۔ مرد اور عورت کے لیے عام طریق خطاب "موسیو اور مادام" تھا۔ اس کی جگہ مرد اور عورت کے لیے "شہری" کا لفظ اختیار کر لیا گیا۔

۱۷۹۰ء سے انقلابیوں نے پُرتکلف گون اور گھٹنوں تک برجس پہننا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ ان لباسوں کو کاہلی اور خاص عمرانی درجے کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ ایک رابس پیئر کو مستثنیٰ کر دیئے کے بعد تمام جمہوریت پسندوں نے گھٹنوں تک برجسیں چھوڑ دی تھیں۔ وہ ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنتے تھے، جو عام کسانوں اور مزدوروں کا لباس تھا۔ عورتیں بھی سادگی کی نمائش کرتیں۔ وہ ویسے ہی لباس پہنتیں، جو قدیم رومیوں کے لباس کی نقل تھے۔ گویا رومہ پیرس کے لیے ایک نمونہ بن گیا، لیکن جمہوری رومہ، نہ کہ سلطنت والا رومہ۔ عورتیں عموماً لباس اور وضع و روش میں رومی خواتین کی پیروی کرتیں اور بچوں کے نام بھی مشہور رومیوں کے نام پر رکھے جاتے، مثلاً بروٹس[2] یا کیئس[3] یا گریکس[4]۔ تھیٹروں میں ریسین[5] اور کارنیل[6] کے

۱؎ لامانی تیر یونیورسل، ۲۷ فروری ۱۷۹۴ء ۲؎ Brutus ۳؎ Cais

۴؎ Gracchus یہ تینوں مشہور رومی تھے۔ ۵؎ Racine

۶؎ corneille

شہکار ترک کر کے اُن ڈراموں کی نمائش شروع ہو گئی، جن میں رومی مشاہیر کی عظمت دکھائی جاتی تھی۔ نجّاروں نے لُوئی شانزدہم کا خوش وضع اور شاندار اسلوب ترک کر کے ایسا فرنیچر تیار کرنا شروع کیا، جس پر رومیوں کے نشانوں سے آرائش کی جاتی۔ رابس پیئر نے کہا تھا: "فنون آزادی کا زیور ہیں اور آزادی ان میں عظمت و شان پیدا کرتی ہے۔" جو ڈراما نگار، مصنّف اور ایڈیٹر آزادی کے لیے مناسب زیب و زینت کا انتظام نہ کر سکے، ان پر سنسر بٹھا دیے گئے، بلکہ بعض کو موت کی سزا دی گئی۔ جیکوبن گروہ نے اوائلِ انقلاب کے اکثر جوشیلے اخباروں کو بند کر کے صرف چند بے مزہ اخبار جاری رہنے دیے، جو اصل میں حکومت کی ترجمانی کرتے تھے۔

تقویم میں اصلاح (اکتوبر ۱۷۹۳ء) جیکوبنوں کی مداخلت کا ایک نمایاں کرشمہ تھی۔ ۲۲ ستمبر ۱۷۹۲ء کو جمہوریت قائم ہوئی تھی، اسے سال کا پہلا دن قرار دیا گیا۔ برسوں کے لیے رومی اعداد استعمال کیے گئے، البتہ مہینوں کے سلسلے میں روایتی افسانوی نام ترک کر دیے گئے۔

تقویمِ انقلاب کے مہینے تقویمِ انقلاب کے مہینے حسبِ ذیل ہیں۔ سال کو پہلے چار فصلوں پر تقسیم کیا گیا، یعنی خزاں، سرما، بہار اور گرما۔ پھر ہر موسم کے تین تین مہینے فصلوں یا آب و ہوا کی خصوصیّت کے اعتبار سے مقرر کیے گئے، تفصیل ذیل میں درج ہے:

مؤسم	مہینا	توضیح
خزاں	وندیمیئر	فصلِ انگور (انگور پکنے کا وقت)
"	برومیئر	کُہر آلود (اس میں کُہر شروع ہو جاتی تھی)
"	فری میئر	زیادہ سرد (سردی شروع ہو جاتی تھی)
سرما	نی ووس	برفانی (برفباری کا موسم)
"	پلوویوس	برسات (بارش کا موسم)
"	ونتوس	پُرباد (تیز ہوائیں چلتی تھیں)
بہار	جرمینل	تخم (اس میں فصلیں بوئی جاتی تھیں)
"	فلوریل	شگوفہ کاری (شگوفے اور پھول نکل آتے تھے)
"	پریریل	مرغزار (گھاس اتنی ہو جاتی ہے کہ جانور چریں)
گرما	میسی ڈور	فصلِ گندم (فصل تیار ہو جاتی تھی)
"	تھرمی ڈور	گرمی (یہ سب سے گرم مہینا تھا)
"	فرکٹی ڈور	بار آوری (پھل پک جاتے تھے)[1]

[1] حوالے کے لیے دیکھیے صفحہ ۱۹۵

ہر مہینے کے تیس دن مقرر کیے گئے، جو دس دس دن کے تین ہفتوں میں منقسم تھے۔ ہر دسواں دن راحت و آسائش کے لیے وقف تھا یا اس میں کسی نہ کسی خوبی اور فضیلت کی یاد منائی جاتی تھی، جنھیں رابس پیئر خاص قدر و منزلت سے دیکھتا تھا۔ مثلاً ظالموں، استبدادیوں اور غداروں سے نفرت۔ شجاعت، کفایت شعاری، رواقیت، مہر پدری اور لطف مادرم کا احترام۔ سال کے آخر میں پانچ دن باقی رہ جاتے تھے۔ اعلان کر دیا گیا کہ یہ خاص تعطیلات ہوں گی، جو اعلیٰ ذکاوت، مزدوری، حسن و خوبی کے اعمال، عطیات اور آراء کے لیے وقف رہیں گی۔ نئی تقویم اپنے تمام مقدس تاثرات کے ساتھ دورِ تنویر کی ایک قابلِ قدر یادگار تھی، لیکن مزدور اس کے مخالف ہو گئے۔ انھیں پسند نہ تھا کہ چھ دن کام کے بعد ایک تعطیل کے بجائے نو دن کام کے بعد ایک تعطیل منائیں۔ یہ تقویم کبھی پوری طرح عمل میں نہ آسکی اور دس سال بعد نپولین نے اسے منسوخ کر دیا۔ کن وینشن نے اور جو اصلاحات کیں، ان میں سے ایک خاصی کامیاب رہی یعنی نظام اعشاری، یہ عہد عقلیت کی روح سے قریب تر تھی۔ ایک خاص مجلس بنا دی گئی تھی، جس میں کنڈورسٹ، لیپلیس، لاوان بے اور دوسرے ممتاز اہل علم شامل تھے۔ انھوں نے نئے پیمانے اور اوزان تجویز کیے، جو نظام اعشاری کے یکساں استعمال پر مبنی تھے اور ان کے سلسلے میں کوئی مبہم اور غیر منطقی طریقہ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اگست ۱۷۹۳ء میں ایک فرمان کے ذریعے سے میٹر کو طول کی معیاری اکائی قرار دے دیا گیا تھا اور ۱۷۹۵ء میں ایک اور قانون کے ذریعے سے لیٹر[۱] کو حجم کا معیاری پیمانہ بنا دیا گیا اور گرام[۲] وزن کی اکائی قرار پایا۔ اینگلو سیکسن ملک اب تک قدیم پیمانوں سے چمٹے ہوئے ہیں، جو کم معقول ہیں۔ ان میں بھی سائنس والوں نے وہی سادہ نظام اعشاری اختیار کر لیا ہے، جو انقلابی فرانس میں بروئے کار آیا۔

تاہم روایت کی قوت دورِ دہشت و وحشت کے لیے زیادہ قوی ثابت ہوئی۔ یہ قوت سب سے بڑھ کر نئے مذہب کے متعلق قانون بنانے کے سلسلے میں نمایاں ہوئی۔ قدیم مذہب کے اکثر گرجے جبراً بند کر دیے گئے اور انھیں فوجوں کے لیے یا شعبہ ہائے نظم و نسق کے لیے دفتر بنا دیا گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ان کی کھڑکیوں کے لیے جو شیشے استعمال ہوئے تھے، یا جو مجسمے تراشے گئے تھے، وہ سب تباہ کر دیے گئے۔ بعض جیکوبن عوام کو مسیحیت سے منحرف کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے جو مہم جاری کی، اس کا مدعا یہ تھا کہ کیتھولکوں کو فلسفی اور ان کے گرجوں کو عقلیت کے معبد بنا دیئے، مگر رابس پیئر کو عقلیت کی یہ پرستش پسند نہ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ فضیلت والی جمہوریت میں بھی اخلاق کے اعلیٰ جج کا عقیدہ ضروری ہے۔ لہٰذا کن وینشن

(صفحہ ۱۷۸ کا حوالہ)

[۱] litre یہ ایک پیمانہ تھا، جس سے چیزوں کے حجم کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ [۲] Gram وزن کا پیمانہ

نے فیصلہ کیا (مئی ۱۷۹۴ء) کہ فرانسیسی قوم ایک بالاتر ہستی کا وجود تسلیم کرتی ہے اور روح کو غیر فانی مانتی ہے۔ ۸۔جون ۱۷۹۴ء کو بالاتر وجود یعنی خدا کا تہوار منایا گیا۔ اس موقع پر رابس پیئر نے تین بُتوں کو آگ لگائی۔ ایک بُرائی کا نمائندہ تھا، دوسرا حماقت کا اور تیسرا دہریت کا۔ ان کی راکھ سے عقل کا بُت اُبھرا، لیکن تدبیر کی غلطی کے باعث یہ دھوئیں سے خراب ہو چکا تھا۔ اس پر حاضرین نے قہقہہ لگایا۔ خُدا کا روحی تصوّر حد درجہ مصنوعی تھا اور اس کے ذریعے سے فرانسیسیوں کے مذہبی جذبات کو متاثر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ماہِ گرما کا ردِّ عمل

یہ پورا جمہوری نظام مجرّد افکار کا مجموعہ تھا اور اس میں ایسی سرگرمیاں شروع کر دی گئی تھیں، جن کے لیے عوام کی تائید حاصل ہونا مشکل تھا۔ کیلون کے جینوا کی طرح رابس پیئر کا فرانس بھی دو چیزوں کا طلبگار تھا، اوّل ادائے فرض کے لیے انسانیت سے بالاتر ایثار، دوم خونریزی سے انسانیت کُش تغافل۔ ۱۷۹۴ء کے نصفِ اوّل میں رابس پیئر نے دہشت و وحشت پر بیدردی سے عمل جاری رکھا، حتّٰی کہ مجلس حفظ عامہ اور مجلس تحفظ عامہ کے ارکان بھی محسوس کرنے لگے غالباً آئندہ ان کی باری آ جائے گی۔ چنانچہ کوہستانیوں میں سے جن مندوبین کے دل پر خوف طاری ہو چکا تھا، وہ مرکزی گروہ کے بچے کھچے ارکان سے مل گئے، تاکہ رابس پیئر کو کن وینشن کی حمایت سے محروم کیا جا سکے۔ اس نے دوسرے انقلابی سال کے ماہ گرما کی نویں تاریخ (۲۷۔ جولائی ۱۷۹۴ء) کو مندوبین سے خطاب کی کوشش کی۔ ایک دم نعرے بلند ہوئے: "ظالم مُردہ باد!" کن وینشن نے رابس پیئر کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور دوسرے روز وہ بھی گلوٹین کے حوالے ہو گیا۔ ساتھ ہی دورِ دہشت و وحشت اختتام کو پہنچا۔

اس ردِّ عمل کے لیڈروں میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی، جو پہلے جیکوبن رہ چکے تھے۔ انھوں نے دورِ دہشت و وحشت کی قائم کردہ ہر چیز برباد کر ڈالی۔ مثلاً انقلابی عدالت توڑ دی گئی۔ جو لوگ باہر دیکھ بھال کے لیے بھیجے گئے تھے، انھیں واپس بُلا لیا گیا۔ مجلسِ حفظ عامہ اور مجلسِ تحفّظ کو وسیع اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔ پیرس میں جیکوبن کا کلب توڑ دیا گیا۔ جرونڈی مندوبین میں سے جو لوگ سزائے موت سے بچ رہے تھے، انھیں دعوت دے گئی کہ کن وینشن میں اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ انھوں نے کیتھوسزم کو بحال کرنے کی طرف پہلا قدم یہ اُٹھایا کہ پادریوں کو اجتماعی دعا کی اجازت دے دی، اگرچہ اس میں حکومت کی نگرانی قائم رکھّی اور اس کے لیے کوئی رقم منظور نہ کی۔ اخباروں اور تھیئٹروں کی آزادی بحال ہو گئی۔ تفریحات کے خواہاں لوگ پھر پیرس میں جمع ہو گئے، جو فضیلت والی جمہوریت سے نجات پا چکا تھا۔ فرانس کے حالات پھر طبعی صورت اختیار کرنے لگے۔

فکرِ طبعی افتاد کے لیے بھی قیمت ادا کرنی پڑی۔ جنوبی اور مغربی فرانس میں جوابی انقلاب شروع ہو گیا۔ اسے "سفید دہشت و وحشت"[۱] کہا گیا، جو دورِ دہشت و وحشت کی انتہائی خطرناک حالت سے خونریزی میں کم نہ تھا۔ اس میں بہت سے لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔

۱؎ white Terror

مقتولین میں محض وہی لوگ شامل نہ تھے، جو کوہستانیوں کی حمایت کرتے رہے تھے، وہ لوگ بھی شامل تھے، جنھوں نے کلیساؤں اور امراء کی زمینیں خریدی تھیں۔ موسم گرما کے انقلابیوں نے دورِ دہشت و وحشت کے اقتصادی قوانین کی تنسیخ سے افراطِ زر کی نہایت نازک حالت پیدا کر دی۔ قیمتوں پر پابندی کا قانون منسوخ ہُوا، تو غذائی جنسوں کی قیمتیں ۱۷۹۰ء کی سطح سے سو گنا بڑھ گئیں اور کاغذی نوٹوں کی قیمت اتنی گر گئی کہ کاروباری لوگ انھیں قبول نہیں کرتے تھے۔ قلاش اہلِ پیرس نے ۱۷۹۵ء میں موسم گرما کے انقلابیوں کے خلاف متعدّد مظاہرے کیے۔ مظاہرین بعض اوقات بدنام کوہستانیوں کے حق میں نعرے لگاتے تھے۔ ۱۷۹۳ء کے جمہوری دستور کی حمایت کرتے تھے۔ بعض اوقات بادشاہی کے طرفدار انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے تھے، مگر ان کے عام نعرے یہ تھے کہ روٹی کا مناسب انتظام کیا جائے اور قیمتیں گھٹائی جائیں۔

جو دستور ۱۷۹۵ء میں منظور ہُوا، وہ کن وینشن کا آخری بڑا کارنامہ تھا۔ اس پر موسم گرما کا انقلاب ختم ہو گیا۔ یہ انقلابی جمہوریت کو بھی قائم رکھنا چاہتے تھے اور ان طبقوں کے اقتدار کی بحالی کے بھی خواہاں تھے، جن کے پاس املاک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۹۵ء کے دستور میں قوم کے غریب ترین طبقے کو ووٹ کا حق نہ دیا گیا اور صاف صاف کہہ دیا گیا کہ جو لوگ کوئی سرکاری عہدہ لینا چاہیں، ضروری ہے کہ ان کے پاس خاصی جائداد ہو۔ نئے دستور میں دو ایوان رکھے گئے، ایک ایوانِ زیریں، جس کا نام "مجلسِ پنج صد"[۱] تھا کیونکہ اس کے پانچ سو ممبر تھے، دوسرا ایوانِ بالا، جسے "مجلسِ اکابر"[۲] کہتے تھے۔ دونوں کے لیے انتخابات امریکہ کے طریقِ عمل کے مطابق جزءاً جزءاً ہوتے تھے، یعنی ہر دو سال کے بعد ہر مجلس کے ایک تہائی ممبروں کی میعادِ رکنیت ختم ہو جاتی تھی اور صرف خالی شدہ نشستوں کے لیے انتخاب عمل میں آتا تھا۔ عمر اور شادی کو بھی سیاسی استواری کے لیے مزید ضمانت کے ذریعے سے سمجھا گیا تھا، اس لیے واضح کر دیا گیا کہ ایوانِ زیریں کے لیے امیدوار کی عمر تیس سال اور ایوانِ بالا کے لیے چالیس سال ضروری ہے۔ نیز اسے بیاہا ہُوا یا رنڈوا ہونا چاہیے۔ "مجلس پنج صد" ڈائرکٹر نامزد کرتی تھی اور "مجلس اکابر" پانچ ڈائرکٹر چنتی تھی، جو انتظامی معاملات کے رئیس تھے۔ اس ایک چیز (انتخاب) کو چھوڑ کر ڈائرکٹری تمام معاملات میں قانون ساز مجالس سے تقریباً کامل آزاد تھی۔

فرانس کے لیے پائدار حکومت مہیا کرنے کے سلسلے میں ۱۷۹۵ء کا دستور انقلابیوں کا تیسرا کارنامہ تھا۔ اس میں ایک حد تک ۱۷۸۷ء کا امریکی نمونہ پیشِ نظر رکھا گیا۔ ایک حد تک ۱۷۹۱ء کے فرانسیسی نمونے سے کام لیا گیا اور سب سے بڑھ کر مونٹسکیو کے اصول پر عمل ہُوا۔ اس میں انتظامی و عدالتی اختیارات الگ الگ کر دیے گئے اور اس میں اشرافیتِ نسبی کے بجائے اشرافیتِ مالی کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ ۱۷۹۳ء کے دستور کی سیاسی جمہوریت ترک کر دی گئی، جس پر قطعاً عمل نہیں ہُوا تھا اور اس کی جگہ ۱۷۹۱ء کا محدود حقِ رائے اختیار کر لیا گیا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ انقلاب کا انتہا پسندانہ دَور گزر چکا ہے۔

۱؎ Council of Five Hundred

۲؎ Council of Elders

ڈائرکٹری
اکتوبر ۱۷۹۵ء - نومبر ۱۷۹۹ء

نئے نظام نے شاہ پسندوں یا انتہا پسند جیکوبنوں کی متواتر سازشوں کا ازالہ سختی سے کیا۔ "سازشِ ہمسراں"[۱] (۱۷۹۶-۹۷ء) کو بہ آسانی دبا دیا گیا۔ اس سازش کا بانی گریک ہس بابیوف[۲] تھا اور دورِ انقلاب میں وہی شخص تھا، جس کی اشتراکیت شک و شبہہ سے بالا تھی۔ ان کامیابیوں کے باوجود ڈائرکٹری میں سیاسی استواری پیدا نہ ہو سکی۔ ڈائرکٹروں اور قانون ساز مجلسوں کے درمیان برابر تصادم ہوتا رہتا تھا۔ ہر فریق چاہتا تھا کہ سیاسی توازن اپنے حق میں پیدا کر لے، اس وجہ سے ہر فریق دستور کی خلاف ورزی کرتا رہتا تھا۔ قانون ساز مجلسیں ڈائرکٹروں کو میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی چلتا کر دیتیں اور ڈائرکٹر باقاعدہ منتخب شدہ ممبروں کو مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

ڈائرکٹری نے اقتصادی مسائل کے حل کے لیے زبردست کوشش کی۔ اس نے حفاظتی محصول بہت بڑھا دیے۔ یہ ایک طرف انگلستان کے خلاف جنگی تدابیر کا ایک جزو تھی، دوسری طرف فرانس کے کاروباری آدمیوں کو اس سے فائدہ پہنچا۔ پھر کاروباری آدمیوں ہی کے دباؤ کی وجہ سے ڈائرکٹری نے وہ پلیٹیں تیار کرا دیں، جن پر نوٹ چھپتے تھے اور ۱۷۹۷ء میں تمام نوٹ واپس لے لیے۔ مشکوک روپے کے سلسلے میں حکومت کو سخت اقتصادی تدبیریں اختیار کرنی پڑیں۔ ان تدبیروں کی ابتدا یوں ہوئی کہ قومی قرضے کے شدید بوجھ سے نجات پانے کے لیے دو تہائی قرضہ ویسے ہی ختم کر دیا گیا۔ غرض ڈائرکٹری نے عزمن مالی افراتفری سے کم از کم ایک نظم کی شکل ضرور پیدا کی۔

تاہم اس سے امن قائم نہ ہوا۔ یہی امر ڈائرکٹری کے سقوط کا باعث بنا۔ جنگ مسلسل جاری تھی اور جنگی سرگرمیوں ہی پر ڈائرکٹری کی توجہ تھی۔ جلد ہی تمام فرانسیسی گروہ فوج کی سیاسی امداد حاصل کر لینے میں مشغول ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موسمِ خزاں کے ماہ برومیر (۱۷۹۹ء) میں ایک اقدام ہوا اور نپولین بوناپارٹ نے ڈکٹیٹری قائم کر لی۔

---

۱ Conspiracy of the Equals

۲ Babeuf

نپولین اور فرانس

برک کے افکار

برطانیہ کے سیاسی فلسفی ایڈمنڈ برک[1] نے اس طویل میلے کا نتیجہ بھانپ لیا تھا، جس کی وجہ سے نپولین، فرانس اور یورپ میں برسرِ اقتدار آیا۔ برک نے "انقلاب فرانس پر افکار" (۱۷۹۰ء[2]) میں حقیقت حال صاف صاف بیان کر دی تھی:

"آپ نے جیسی حکومت قائم کر رکھی ہے، اس میں تمام معاملات کا انحصار فوج پر ہے، کیونکہ آپ لوگوں نے تمام آراء ... اور تمام جذبات بالاہتمام تباہ کر دیے ہیں، جن سے حکومت کو تقویت پہنچتی ہے۔ لہٰذا جس وقت آپ کی قومی مجلس اور قوم کے کسی حصے میں اختلاف پیدا ہوگا تو لازماً آپ کو قوت سے کام لینا پڑے گا، اور کوئی ذریعہ آپ کے پاس ہے ہی نہیں ....

- - - - - - - -

"یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ آیا آپ کی مجلس ایک فوج کا ضبط و نظم اور جذبۂ فرمانبرداری پیدا کر لینے کے قابل ہے؟ سب جانتے ہیں کہ اب تک فوجوں کے لیے کسی سینٹ یا عوامی اقتدار کی فرمانبرداری متذبذب اور غیر یقینی ہی رہی ہے۔ اگر فوج کے افسر وکیلوں کے دائرے کا واجب احترام اور کامل انقیاد شروع کر دیں تو وہ فوجی خصوصیات کا گلا گھونٹ دیں گے، خصوصاً اس حالت میں تو اطاعت ممکن ہی نہیں، جب وہ جانتے ہیں کہ نئی عدالت موجود ہے، جس میں بے شمار وکیل کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔ ... جب ایک قسم کا اعتدار کمزور ہوگا اور تمام اقتداروں میں تذبذب پیدا ہو جائے گا تو فوج کے افسر کچھ مدت تک باغی رہیں گے، پھر کوئی ہردلعزیز سالار جو سپاہیوں کو راضی کرنے کا فن جانتا ہے اور کمانداری کی حقیقی روح سے بہرہ مند ہے تمام لوگوں کی نظریں اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ فوجیں شخصاً اس کی اطاعت کریں گی۔ جیسے حالات اب موجود ہیں ان میں فوجی اطاعت حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں، لیکن جس وقت ایسی حالت

[1] Edmund Burke
[2] Reflections on the Revolution in France

پیش آئے گی تو فوج کو زیرِ اثر رکھنے والا شخص آپ پر مسلّط ہو جائے گا۔ وہی آپ کا آقا، آپ کا بادشاہ، آپ کی مجلس کا مختار اور آپ کی جمہوریت کا مالک بن جائے گا۔[1]

۱۷۹۰ء میں برک کی اس پیشگوئی پر کسی نے توجہ نہ کی۔ کسی نے فرانسیسی قوم پر نظر نہ رکھی۔ بیرونی حکمران اور مدبّر اس امر کا ماتم کرتے رہے کہ فرانس نے نظامِ قدیم پر انقلابی حملہ کیا ہے، مگر وہ سمجھتے تھے کہ داخلی مسائل کی شدّت نے فرانس کو زبردست خارجہ پالیسی اختیار کرنے کا نااہل بنا دیا ہے۔ روس کی ملکہ کیتھرائن نے ۱۷۹۲ء میں کہہ دیا تھا کہ انقلابِ فرانس نے قوتوں کو اس طرح درہم برہم کر ڈالا ہے کہ صرف دس ہزار سپاہی پورے فرانس کی تسخیر کے لیے کافی ہیں۔ فرانس سے باہر جو فلسفی اور آزاد خیال لوگ موجود تھے، وہ انقلاب کے شاندار اور پُرامن مقاصد کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ بیسٹیل پر قبضہ ہُوا تو انگلستان کا ممتاز لیڈر چارلس جیمز فوکس[2] خوشی سے بیخود ہو کر بولا: "یہ کتنا عظیم واقعہ ہے، جیسا دنیا میں کبھی پیش نہیں آیا اور کیسا بہترین واقعہ ہے۔"

پہلی اتّحادی جمعیت کے خلاف جنگ
۱۷۹۲ء - ۱۷۹۵ء

۱۷۹۲ء کے موسمِ بہار میں جو جنگ چھڑی، اس نے فرانس کے فوجی ضعف اور پُرخلوص آزاد خیالی کے فریب کا پردہ تار تار کر ڈالا۔ فرانس کو پہلی اتّحادی جمعیت سے سابقہ پڑا اور ایسی متعدد جمعیتیں بروئے کار آئیں، جو دورِ انقلاب اور عہدِ نپولین میں جارحانہ اقدامات کرتی رہیں۔ جنگ پر ایک ہی سال گزرا تھا کہ اتّحادی جمعیت کے ابتدائی ارکان آسٹریا اور پروشیا کے ساتھ ہالینڈ اور ہسپانیہ بھی شامل ہو گئے اور سب سے بڑھ کر قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ برطانیہ نے بھی اس جمعیت میں شرکت قبول کر لی۔ برطانیہ کو اس کش مکش میں لانے کے موجبات نظریاتی بھی تھے اور جنگی بھی۔ اہلِ برطانیہ کا خیال تھا کہ تو ئی لریز پر حملہ، ۸ ستمبر کی خونریزی اور لوئی شانزدہم کو سزائے موت ایسے واقعات تھے، جو انسانی شرافت کے نقطۂ نگاہ سے عموماً اور ادارۂ ملوکیت کے نقطۂ نگاہ سے خصوصاً سراسر نازیبا تھے۔ جب فرانس نے ۱۷۹۲ء کے موسمِ خزاں میں آسٹروی ندرلینڈز پر حملہ کیا، تو یہ ناخوشگوار تصور سامنے آ گیا کہ بلجیم پر فرانس قابض ہو جائے گا۔ برطانیہ اور فرانسیسی جمہوریت کے درمیان جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ کن ونشن نے یکم فروری ۱۷۹۳ء کو اس کا سرکاری اعلان کر دیا۔

دو سال بعد پہلی اتّحادی جمعیت ٹوٹنے کے قریب پہنچ گئی۔ ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ حالاتِ جنگ ناسازگار ہو گئے۔ پھر ۱۷۹۲ء کے اواخر میں فرانس نے والمی کی فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلجیم پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۹۳ء میں پھر حالات خراب ہو گئے۔ فرانس نے شکست کھائی اور دوموریا، جو فرانسیسی فوج کا سپہ سالار تھا، دشمن سے جا ملا۔ ۱۷۹۴ء میں فرانس نے دوبارہ کامیابی حاصل کی اور ۱۷۹۵ء تک فرانسیسی فوجیں بلجیم اور ہالینڈ کے علاوہ جرمنی کے اس حصّے پر قابض ہو چکی تھیں، جو دریائے رائن کے مغرب میں واقع تھا۔

---

1. "افکار" ص ۲۱۵ - ۲۱۶ - ۲۱۷
2. Fox

فرانسیسی کامیابیوں کی ایک وجہ یہ تھی، جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی کن ونیشن نے قومی وسائل کو حرکت میں لانے کے لیے بڑی سرگرمی دکھائی۔ دوسری وجہ جو یکساں اہم ہے (مگر اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے) پہلی اتحادی جمعیت کی کمزوری تھی۔ اس جمعیت کے پاس نہ اوّل درجے کا کوئی سالار تھا اور نہ جمعیت کے مختلف شرکاء کے درمیان اتحادِ عمل کا کوئی مؤثر طریقہ اختیار کیا جا سکا۔ برنزوک کا ڈیوک ۱۷۹۲ء میں پیرس نہ لے سکا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ اچھا جرنیل نہ تھا، ایک سبب یہ بھی تھا کہ والمی کی جنگ میں اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ مزید برآں ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء میں پولینڈ کی تقسیمیں عمل میں آئیں۔ اس سے بھی فرانس کو بڑی مدد ملی۔ مسئلۂ پولینڈ نے کیتھرائن کو دس ہزار سپاہ مہیا کرنے سے باز رکھا، حالانکہ وہ اس سپاہ سے پورے فرانس کو پامال کر دینے کا تصوّر کیے بیٹھی تھی۔ انھیں تقسیموں کے باعث پروشیائی فوج کا بہترین حصہ نئے حاصل شدہ علاقوں پر قبضہ جمانے میں مصروف ہو گیا، نیز اس سے پروشیا اور آسٹریا کے درمیان تازہ مشکلات رونما ہو گئیں۔ ۱۷۹۵ء میں حالات ایسی صورت اختیار کر چکے تھے کہ پروشیا فرانسیسیوں پر اس خوف سے حملے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، مبادا اس کا برائے نام حلیف عقب سے حملہ کر دے۔

پروشیا جمعیت کا سب سے پہلا رکن تھا جس نے صلح کر لی۔ بال[1] کے مقام پر معاہدہ ہوا (۱۷۹۵ء)۔ اس کے مطابق پروشیا نے بکھرے ہوئے علاقے، جو دریائے رھائن کے مغرب میں تھے، اس شرط پر فرانس کے حوالے کر دیے کہ ان کا معاوضہ اسے جرمنی میں مل جائے گا۔ ہسپانیہ اور ہالینڈ بھی جمعیت کو چھوڑ کر الگ ہو گئے (۱۷۹۵ء)۔ ہسپانیہ نے جزائر غرب الہند میں سے سانٹو ڈومنگو[2] کا نصف مشرقی حصہ فرانس کے حوالے کر دیا۔

اس طرح ۱۷۹۵ء میں فرانس نے اپنے طبعی حدود بحال کر لیے۔ بلجیم اور رھائن لینڈ کے علاوہ اس نے سیوائے[3] اور نیس بھی لے لیے تھے۔ اس طرح اس کی جنوبی و مشرقی سرحدیں کوہستان ایلپس کی چوٹی تک پہنچ گئی تھی۔ مگر ان فتوحات نے انقلابی مقاصد کی تغلیط کر دی۔ ۱۷۹۲ء میں آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہوئے مجلسِ قانون نے حلف اٹھایا تھا کہ ۱۷۹۱ء کے دستور کا وعدہ پورا کیا جائے گا اور دوسرے ممالک کی تسخیر کے لیے کوئی جنگ نہیں کی جائے گی اور یہ جنگ قوم کے خلاف قوم کی جنگ نہیں، بلکہ ایک بادشاہ کے ناجائز جارحانہ اقدام کے خلاف ایک آزاد قوم کا حق پرستانہ عزمِ دفاع ہے، لیکن پہلی جمہوریت کی فاتح افواج اُس دن کو قریب تر لے آئیں، جب قوم کے خلاف قوم لڑے گی، جب قانون ساز مجلس کے یہ الفاظ غیر فرانسیسی قومیں خود فرانس کے خلاف استعمال کریں گی کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ کسی بادشاہ کا نہیں، بلکہ انقلابی فرانس کے ناجائز جارحانہ اقدام کے خلاف آزاد قوموں کا حق پرستانہ عزمِ دفاع ہے۔

فرانس کے جارحانہ اقدامات نے ۱۷۹۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ہمدردی ختم کر دی۔ امریکیوں سے یقیناً

---

[1] Basel
[2] Santo Domingo
[3] Savoy

یہی توقع تھی کہ وہ اس ملک کے تجربۂ جمہوریت میں دوستانہ دلچسپی لیں گے، جس نے خود ان کی جمہوریت کو کامیاب بنانے کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ فرانس نے امریکیوں کو رشوت اور قوت کے ذریعے سے اس امر پر آمادہ کیا کہ برطانوی برآمد کے خلاف فرانسیسیوں کی ناکا بندی کی پابندی کی جائے۔ اس طرح فرانسیسیوں نے دونوں جمہوریتوں کے درمیان ایک غیر رسمی بحری قزاقی کی جنگ قائم رکھی، جو اٹھارھویں صدی کے دسویں عشرے کے اواخر تک قائم رہی۔

نپولین کا ظہور ۱۷۹۵ء کے اواخر میں صرف برطانیہ اور آسٹریا سرکاری طور پر فرانس کے خلاف برسرِ جنگ رہ گئے۔ ڈائرکٹری نے فیصلہ کیا کہ آسٹریا جنگ کا پہلا ہدف ہے اور نپولین بوناپارٹ کو اس فوج کا سالار بنایا، جو شمالی اٹلی میں ہیپسبرگ کی فوجوں پر حملے کے لیے مامور ہوئی تھیں۔ نوجوان کمانڈر فلسفی بھی تھا، انقلابی بھی۔ بیدار مغز اور بالغ نظر سالار بھی تھا اور بے پناہ صاحب عزم منچلا بھی۔ کارسیکا میں ایسے وقت پیدا ہوا (۱۷۶۹ء)، جب فرانس نے بحیرۂ روم کا یہ جزیرہ زوال پذیر جمہوریۂ جینوا سے لیا تھا۔ نپولین نے زندگی بھر خاندانی وفاداری کے رشتے قائم رکھے۔ کارسیکا کے معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ اس کے ہاتھ سے بوناپارٹ کنبے کے ارکان نے فتوحات کے تمام غنائم بلکہ تخت بھی حاصل کیے۔

ابتدائے شباب میں نپولین نے فرانس میں فوجی سکول کے اندر تعلیم پائی۔ وہ اپنے تمام ہم جماعتوں سے الگ تھلگ رہتا تھا، کیونکہ اسے اجنبی سمجھا جاتا تھا۔ پورا وقت مطالعے میں صرف کرتا رہا۔ بے شمار کتابیں پڑھیں، خصوصاً روسو کی تصانیف اور اس دن کے خواب دیکھتا رہا، جب وہ اپنے وطن کو فرانس کے قبضے سے نجات دلائے گا۔ آگے چل کر کارسیکا کی آزادی کے لیے اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب فرانس میں انقلاب بپا ہوا تو نپولین نے کارسیکا میں نظامِ قدیم کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی، مگر جلد ہی فرانس واپس گیا اور اپنی فوجی ملازمت سنبھال لی۔

نوجوان نپولین نے کن وینشن کی حفاظت کی، لیکن یہ کام کسی سیاسی عقیدے پر مبنی نہیں تھا، بلکہ ایک فوری ضرورت کے طور پر سامنے آگیا تھا۔ وہ جیکوبن کن وینشن کی افواج میں توپ خانے کا افسر تھا اور دسمبر ۱۷۹۳ء میں طولون[۱] کو واپس لیا۔ بحیرۂ روم کی یہ بندرگاہ باغی ہو گئی تھی۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں اس نے "گراب کی شہرۂ آفاق پھٹ"[۲] سے غیر مطمئن اہلِ پیرس کی بغاوت ختم کر دی اور ماہ گرما کی کن وینشن کو بچا لیا۔ پھر اس نے جوزیفین دا بوآرنے[۳] سے شادی کر لی، جو بیوہ تھی اور عمر میں نپولین سے چھ سال بڑی تھی۔ ڈائرکٹروں کے گروہ سے جوزیفین کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ انھیں تعلقات اور توپ خانے کے افسر کی حیثیت سے نپولین کی پیش کردہ صلاحیت کی بدولت اسے ۱۷۹۶ء میں اطالوی فوج کی سالاری مل گئی۔

ایک سال کے اندر نپولین نے آسٹریوں کو اٹلی سے باہر نکال دیا اور صلح کی درخواست پر مجبور کر دیا۔ اس مہم میں، جو شہرت کا اعلیٰ پیمانہ حاصل کر چکی ہے، نپولین نے حیرت انگیز صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ وہ انتہائی تیزی سے حملہ کرتا اور حملہ اتنا

---

۳ Josephine de Beaunarnais ۲ famous whiff of grapeshot ۱ Toulon

اچانک ہوتا کہ دشمن کو دفاعی انتظامات مستحکم کر لینے کا بھی موقع نہ ملتا۔ اسی موقع پر اس نے ایک اور احساس کا نہایت عمدہ مظاہرہ کیا، جسے آج کل ہم پروپیگنڈے اور روابط عامہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذرا یہ اعلان ملاحظہ فرمائیے، جو اس نے ۲۶ ؍ اپریل ۱۷۹۶ء کو کیا:

"بہادرو! دو ہفتوں میں تم نے چھ مرتبہ فتح حاصل کی۔ پندرہ ہزار قیدی پکڑے، دس ہزار آدمی مقتول و مجروح ہوئے۔

"تم ہر چیز سے محروم تھے۔ بہ ایں ہمہ تم نے ہر کام پورا کر لیا۔ تم نے توپوں کے بغیر لڑائیاں فتح کیں۔ پلوں کے بغیر دریا عبور کیے۔ بوٹوں کے بغیر یلغاریں کرتے رہے۔ برانڈی کے بغیر راتیں گزاریں۔ اکثر کھانے کے لیے روٹی بھی تمھارے پاس موجود نہ تھی۔ صرف جمہوریت کے نیزہ باز اور صرف آزادی کے شمشیر زن وہ تمام مصیبتیں جھیل سکتے تھے، جو تم نے مردانہ وار جھیلیں۔

"تم سب کے سینوں میں یہ آگ روشن ہے کہ اہلِ فرانس کی عظمت کا پرچم ہر فضا میں اُڑاؤ۔ اُن مغرور بادشاہوں کو نیچا دکھاؤ، جنھوں نے ہمیں زنجیروں میں جکڑنے کی تجویزیں سوچیں۔ پھر اپنے وطن واپس جاؤ اور فخریہ کہو: "ہم اس فاتح قوم کے بہادر ہیں، جس نے اٹلی فتح کی۔"

"دوستو! میں یقین دلاتا ہوں کہ تم فتح حاصل کرو گے، مگر ایک شرط ہے۔ حلف اٹھاؤ کہ اسے ضرور پورا کرو گے۔ شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے جا رہے ہو، حلف اٹھاؤ، تم ان کا احترام کرو گے۔ حلف اٹھاؤ کہ خوفناک لوٹ مار کو ختم کرو گے۔

"اٹلی کے باشندو! فرانسیسی فوج تمھاری زنجیریں کاٹنے کے لیے آ رہی ہے۔ اعتماد کے ساتھ اس کا استقبال کرو۔ تمھاری جائدادوں، تمھارے مذہب اور تمھارے عادات و مالوفات کا پورا احترام کیا جائے گا۔"[1]

یہ نپولین کی پالیسی کی خصوصیت تھی کہ وہ تمام لوگوں سے ہر چیز کا وعدہ کر لیتا تھا۔ اس نے فرانسیسی سپاہیوں کے قومی جذبے کی حوصلہ افزائی کی، جن کے مشاہرے بھی کم تھے اور تنخواہیں بھی قلیل تھیں۔ لوٹ مار کے لیے ان کی اشتہا تیز کی۔ ساتھ ہی اطالویوں کے قومی جذبے کو ابھارا۔ انھیں آسٹریا کی محکومی سے نجات دلانے کا وعدہ کیا۔ فرانسیسی فوج کے منظّم

---

[1] لاانی تیئر سے خلاصہ مورخہ ۷؍ مئی ۱۷۹۶ء

طرزِ عمل کا یقین دلایا۔ اطالویوں کو قطعاً نہ بتایا کہ یہ فتح ان کے لیے صرف آقاؤں کی تبدیلی لائے گی۔ اس امر کا بھی ذکر نہ کیا کہ اس نے اطالوی حکومت کا روپیہ قبضے میں کر لیا تھا اور فنونِ لطیفہ کے شہکار اطالوی نگار خانوں سے لے کر فرانس بھیج دیے تھے۔

معاہدۂ کیمپو فورمیو[1] (۱۷۹۷ء) نے اطالوی مہم ختم کر دی۔ آسٹریا نے بلجیم اور لمبارڈی کا نقصان تسلیم کر لیا۔ شمالی و مغربی اٹلی میں نپولین نے من مانے طریق پر اپنے زیرِ حمایت جو حکومتیں قائم کی تھیں، انھیں تسلیم کر لیا، یعنی جمہوریۂ جینوا اور جمہوریۂ لمبارڈی۔ ساتھ ہی ہیبسبرگوں کو جمہوریۂ وینس کے علاقے دے دیے گئے اور فرانس نے یقین دلا دیا کہ پروشیا کے ساتھ معاہدۂ بال (۱۷۹۹ء) کے باوجود جرمنی میں سے کوئی علاقہ رھائن لینڈ کے علاقوں کے معاوضے میں نہیں دیا جائے گا۔ اس معاہدے کے دوران میں نپولین کی روش یہ رہی، گویا بین الاقوامی معاملات میں اسے مدت سے تجربہ حاصل ہے۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی، جو یہ محیر العقول سالار نہیں کر سکتا تھا، کوئی بھی چیز نہیں، صرف یہ بھاری کام رہ گیا کہ وہ انگلستان کو شکست نہ دے سکا۔

اب نپولین نے اس طرف توجہ کی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ براہِ راست برطانیہ پر حملہ کرے گا، لیکن اس کے بجائے مصر کے ذریعے سے حملہ کیا، جو اس زمانے میں ترکی کا ایک صوبہ تھا۔ یہ نیا سکندرِ اعظم تھا، جو نئی دنیائیں فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے نہر سویز کھودنے کے متعلق بھی اونچے پیمانے پر باتیں کیں۔ فرانسیسی تاجروں سے وعدہ کیا کہ انھیں ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے نیا اور قریب تر راستہ مل جائے گا اور کلائیو نے "ہفت سالہ جنگ" میں جو فتح حاصل کی تھی، اس کا انتقام لیا جائے گا، اگرچہ اس فتح پر خاصا وقت گزر چکا تھا۔ نپولین کو سائنس اور آثارِ قدیمہ سے خاص دلبستگی تھی اور یہ عہدِ تنویر کی ایک خصوصیت تھی، لہٰذا اس نے علماء آثارِ قدیمہ اور دوسرے ماہرین کو بھی فوج کے ساتھ چلنے کی دعوت دے دی اور اس علم کی بنیاد رکھی، جسے آج کل "مصریات"[2] کہتے ہیں۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک ماہر شمپولین[3] نے مقام رشید[4] سے نکالے ہوئے پتھر کی عبارت پڑھی۔ قدیم مصری ہیروغلافی (تصویری رسم الخط) کے ترجمے کی یہ پہلی کلید تھی۔ نپولین کے ساتھ جو اہلِ علم تھے، انھوں نے مصر میں فرانس کے ثقافتی سامراج کی ایک چوکی قائم کر دی، جو بیسویں صدی تک قائم رہی۔

فوجی نقطۂ نگاہ سے مصر کی مہم کاملاً ناکام رہی۔ برطانیہ کا جو بیڑا نیلسن کی کمانداری میں بحیرۂ روم کے اندر تھا، نپولین اس سے بچتا ہوا جولائی ۱۷۹۸ء میں مصر پہنچ گیا۔ مملوک وہاں حکمران تھے، انھیں تیزی سے شکست دے دی۔ پھر آفت آ گئی۔ یکم اگست ۱۷۹۸ء کو نیلسن نے پتا لگا لیا کہ فرانسیسی بیڑا خلیج ابوقیر[5] (ساحلِ مصر) میں ہے اور یہ بیڑا بچ کر نکلنے سے پیشتر ہی تباہ کر دیا گیا۔ نیلسن کی فتح سے فرانسیسیوں کے لیے رسد اور کمک کا سلسلہ مسدود ہو گیا، بلکہ وطن سے خبریں بھی رک گئیں۔ پھر نپولین ایک سال کے بعد مشرقِ قریب میں ایک بیکار مہم لے گیا۔ آخر اگست ۱۷۹۹ء میں یکایک مصر سے نکل کر

۱؎ Camqofoymio — ۲؎ Egypteology — ۳؎ Champollion

۴؎ Rosetta — ۵؎ Abukir

فرانس پہنچ گیا۔ جن سپاہیوں کو مصر میں چھوڑ گیا تھا، وہ اتنے خوش نصیب ثابت نہ ہوئے۔ ۱۸۰۱ء تک مصر ہی میں رہے، پھر ان کے تخلیے کا انتظام ہو سکا۔[1]

نیا انقلاب

بظاہر مصر میں ناکام رہنے سے نپولین پر کوئی اثر نہ پڑا اور جب وہ فرانس واپس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ فیصلہ کُن سیاسی ضرب کے لیے وقت ساز گار ہو گیا ہے۔ اس کی غیر حاضری میں جیکوبن گروہ کی سرگرمیاں تازہ ہو گئی تھیں۔ قانون ساز مجلسوں کے سدہا ممبر جیکوبن کلب سے متعلق تھے، جسے "انجمنِ دوستدارانِ حرّیت و مساوات"[2] کے نام سے از سرِ نو زندہ کر لیا گیا تھا۔ ڈائرکٹری نے ملک سے باہر چار نئی جمہوریتیں قائم کر دی تھیں، جو جمہوریۂ فرانس کے زیرِ اثر تھیں۔ ان کے لیے کلاسیکی نام تجویز کیے گئے، مثلاً ایک کا نام رومی جمہوریت تھا، دوسری کا پارتھی نوپین[3]، جو نیپلز میں قائم ہوئی۔ بٹاوین[4] جمہوریت ہالینڈ میں اور ہلویشین[5] جمہوریت سوئٹزرلینڈ میں۔ لیکن فرانسیسی سامراج کی ان کامیابیوں نے یورپ کے توازنِ قوی میں خلل ڈال دیا اور براعظم یورپ میں از سرِ نو جنگ کا دروازہ کھل گیا۔ ہیبسبرگ اس امر پر ناراض ہوئے کہ فرانس نے ان کے سابقہ اطالوی مقبوضات میں اپنا اثر بڑھا لیا ہے۔ پال اول (۱۷۹۶ء تا ۱۸۰۱ء) زارِ روس کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ نپولین مشرقی بحیرۂ روم میں روسی مقاصد کو نقصان پہنچائے گا۔ لہٰذا دسمبر ۱۷۹۸ء میں روس اور آسٹریا برطانیہ کے ساتھ مل گئے اور دوسری اتحادی جمہوریت وجود میں آئی۔ اگست ۱۷۹۹ء تک آسٹروی اور روسی فوجوں نے فرانسیسیوں کو اٹلی سے نکال دیا اور نیپلز، رومہ اور لمبارڈی کی جمہوریتیں ختم کر دیں۔

ان حالات میں فرانسیسی محبانِ وطن ہر فوجی ہیرو کے خیر مقدم پر آمادہ تھے اور قدامت پسند فرانسیسی ہر اس شخص کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھے، جو عملاً ان کا حامی ہو اور جیکوبنوں کے نئے خطرے کا سدِباب کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نپولین مصر سے فرانس پہنچا تو اُس کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ جلد ہی اس نے ڈائرکٹری کا تختہ اُلٹنے کے لیے سازش شروع کر دی۔ پانچ ڈائرکٹروں میں سے دو اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ایک راجر ڈوکو[6]، دوسرا سیئیز[7]۔ یہ دونوں طبقۂ عوام کے حامی تھے۔ ۹ اور ۱۰ نومبر ۱۷۹۹ء (تقویم انقلاب کے مطابق ۱۸ اور ۱۹ برومیئر) کو اس سازش پر عمل شروع ہوا۔ پہلے نپولین نے ان تین ڈائرکٹروں کو استعفے پر مجبور کر دیا، جو سازش میں شامل نہ تھے۔ پھر دونوں قانون ساز مجلسوں کی رضامندی حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ظاہر یہ کیا کہ جیکوبنوں کی جانب سے سازش کا خطرہ ہے۔ "مجلس اکابر" نے اسے منظوری دے دی، مگر "مجلس پنج صد" میں وہ اپنے آپ پر ضبط قائم

---

[1] (مترجم) افسوس کہ مصنفینِ کرام نے نپولین کے متعلق جو کچھ لکھا، اس سے ان کا جذبۂ مخالفت نمایاں ہے۔ یہ روش فاضل مورخوں کے لیے زیبا نہ تھی۔

[2] Society of the Friends of Liberty and Equality [3] Parthenoneau پارتھینو۔ نیپلز کا پرانا نام تھا۔

[4] Batavian بٹاوی ایک قبیلے کا نام تھا اور یہی نام ابتدا میں ہالینڈ کا تھا۔

[5] Helvetian ہلویٹی ایک ٹیوٹانی قبیلہ تھا، جو پہلے پہل سوئٹزرلینڈ میں آباد ہوا۔

[6] Roger Ducos [7] Sieyes

نہ رکھ سکا۔ کچھ بے تکی باتیں کیں اور بیہوش ہو گیا۔ اس کا بھائی لوسیئن "مجلس پنج صد" کا صدر تھا۔ اس نے حالات اس وقت تک قابو میں رکھے، جب تک نپولین کو ہوش نہ آ گیا اور فوج کے ایک دستے نے مجلس پنج صد کی اکثریت کو ایوان سے باہر نکال دیا۔

برومیر کے اس تقریباً مضحکہ خیز فوجی اقدام نے ڈائرکٹری کا خاتمہ کر دیا۔ قانون ساز مجلس کے ممبروں میں سے صرف اقلیت بوناپارٹ کی حامی تھی۔ اس نے حکومت اور نئے دستور کی تیاری کا کام تین کامیاب اشخاص کے سپرد کر دیا۔ یعنی راجر ڈوکو، سییز اور نپولین۔ ان میں سے نپولین ہی نے آخر مقتدر حیثیت اختیار کی۔ جس شخصی حکومت کا خاتمہ ۱۷۸۹ء میں ہوا تھا، وہ پھر نظامِ قدیم کی راکھ سے چنگاری بن کر ابھر آئی۔ گویا تمام حالات اسی انداز میں رونما ہوئے، جس کی پیشگوئی ایڈمنڈ برک نے کر دی تھی:

> "اقتدار کے ضعف کی حالت میں کوئی عوامی سالار لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف پلٹ لے گا۔ افواج صرف اس کی شخصی حیثیت میں اس کا حکم مانیں گی۔ . . . جس شخص کو فوج پر حقیقی اقتدار حاصل ہوگا، وہی آپ کا آقا بن جائے گا۔"

نپولین کی حکومت

انقلاب برومیر کے فوراً بعد سییز نے دستور کا مسودہ تیار کر لیا، جو مطلق العنانی کے اس اصول پر مبنی تھا کہ "اعتماد نیچے سے اور امر و اختیار اوپر سے"۔ بوناپارٹ نے دستور میں حسب منشا ترمیمات کر لیں۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ دستور ہمیشہ مختصر ہونا چاہیے اور اس کی دفعات مبہم رکھنی چاہئیں۔ انقلاب کے آٹھویں سال کے اس دستور میں مرکزی حکومت کو زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھا گیا، البتہ پردہ پوشی کے لیے رومی اصلاحات سے کام لیا گیا اور ظاہری آرائش و زیبائش کے لیے جمہوریت پرستوں کے مختلف اصول شامل کر لیے گئے۔ مرکزی اقتدار تین "کونسلوں" کے حوالے کیا گیا، لیکن ان میں سب سے بڑھ کر صاحب اقتدار نپولین تھا، جس کا لقب "کونسلِ اوّل" قرار پایا۔ باقی دو رفیقوں کو برائے نام اختیار حاصل رہا۔ چار مختلف مجلسوں کو قانون سازی کا ذمہ دار قرار دیا گیا:

۱۔ کونسل آف سٹیٹ (مجلس دولت)، جو قانون تجویز کرتی تھی۔

۲۔ ٹریبیونیٹ۔ یہ قانون پر بحث کرتی تھی، لیکن ووٹ نہیں دیتی تھی۔

۳۔ ہیئت قانون ساز۔ یہ قانون پر ووٹ دیتی تھی، بحث نہیں کرتی تھی۔

۴۔ سینٹ۔ اسے ہر قانون پر ویٹو کا حق حاصل تھا۔

ان چاروں مجلسوں کے ممبر یا تو "کونسل اوّل" نامزد کرتا تھا یا بالواسطہ ان کا انتخاب ہوتا تھا اور یہ طریقہ اتنا پُرپیچ تھا کہ بوناپارٹ کو اپنی پسند کے امیدوار منتخب کرانے کا خاصا موقع حاصل تھا۔

پورے نظام کی بنیاد کونسل آف سٹیٹ تھی۔ اس میں بوناپارٹ کے چُنے ہوئے آدمی بھرتی کر لیے گئے تھے۔ یہ مجلس کابینہ کا کام بھی دیتی تھی اور پورے ملک کی اعلیٰ انتظامی عدالت بھی تھی۔ باقی تین مجلسوں کا کام صرف یہ تھا کہ بوناپارٹ جو قانون بنوانا چاہے، اس کے متعلق قانون سازی کی رسم پوری کر دیں، مگر اس حالت میں بھی بعض اوقات ٹریبیونیٹ کے اندر بحث اس طرح شروع ہو جاتی کہ بوناپارٹ

کے راستے میں رکاوٹ پیش آجاتی۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً ٹربیونیٹ کے اختیارات گھٹاتا رہا اور ۱۸۰۷ء میں اسے بالکل منسوخ کردیا۔ مگر اس وقت تک قانون سازی کے لیے غور و فکر کی حیثیت ایسی ہو چکی تھی، جسے ایک معاصر نے "صحرائے سکوت کی صداؤں" سے تعبیر کیا۔

نپولین نے آہستہ آہستہ وہ چند پابندیاں بھی ختم کردیں، جو آٹھویں سال کے دستور کے مطابق اس کے اختیارات پر عائد کی گئی تھیں۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے قانون ساز مجلسوں کے ممبروں کو اس امر پر راضی کرلیا کہ اس کی میعاد پر ابتدا میں جو دس سال کی قید لگائی گئی تھی، اُسے اُڑا دیں اور زندگی بھر کے لیے "کونسل اوّل" بنادیں۔ ساتھ ہی یہ اختیار حاصل کرلیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کرسکتا ہے اور دستور کو جب چاہے، بدل سکتا ہے۔ ۱۸۰۴ء میں اس نے آخری منطقی قدم اٹھایا اور اپنے آپ کو فرانسیسیوں کا موروثی شہنشاہ قرار دے دیا۔ ۲ دسمبر کو پیرس کے گرجے "نوتردام"[1] میں تاجپوشی کی رسم دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ پوپ نے شہنشاہ کو برکت دی۔ نپولین نے تاج خود اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ ایک ہزار سال پیشتر شارلمین نے روما میں یہی کیا تھا۔

نپولین جب کبھی دستور میں ترمیم کرتا تو ہمیشہ جمہوری طریق کا خیال رکھتا، یعنی ہر تبدیلی کے متعلق عوام سے رائے لی جاتی اور ہر مرتبہ رائے عامہ انتہائی اکثریت کے ساتھ اس کے حق میں ہوتی۔ ۱۷۹۹ء - ۱۸۰۰ء میں جو ووٹ لیے گئے تو تیس لاکھ گیارہ ہزار ایک سو سات ووٹ نپولین اور آٹھویں سال کے دستور کے حق میں آئے اور ایک لاکھ پان سو باسٹھ خلاف۔ ۱۸۰۲ء میں پینتیس لاکھ اڑسٹھ ہزار آٹھ سو پچاسی ووٹ نپولین اور تاحیات اس کے "کونسل" ہونے کے حق میں تھے اور آٹھ ہزار تین سو چوہتّر خلاف۔ ۱۸۰۴ء میں پینتیس لاکھ بہتّر ہزار تین سو اُنتیس ووٹ نپولین اور اس کی شہنشاہی کے حق میں تھے اور دو ہزار پان سو اُناسی خلاف تھے۔ اگرچہ ووٹروں پر خاصا سرکاری دباؤ ڈالا گیا تاہم یہ حقیقت ہے کہ فرانسیسیوں کی بہت بڑی اکثریت بے شک و شبہ نپولین کی حامی تھی۔ اس کی فوجی فتوحات فرانسیسیوں کی بڑھتی ہوئی قومیت کے نزدیک پسندیدہ تھی اور اس نے ملک کے اندر امن و نظم کی استواری کے لیے جو کچھ کیا، اس سے مزید انقلابی تغیّرات کا دروازہ بند ہوگیا۔ کم از کم کچھ وقت تک سییز کا اصول کامیاب رہا، یعنی نیچے سے اعتماد اور اوپر سے امر و اقتدار میں اضافہ ہوتا گیا۔[2]

اگر اتفاقیہ نیچے سے اعتماد کا معاملہ اطمینان بخش طریق پر پورا نہ ہوتا، تو نپولین کو کامل اختیار حاصل تھا کہ مخالفین کا فیصلہ کرسکے۔ مقامی خود اختیاری حکومتیں انقلاب کے ابتدائی دَور سے چلی آتی تھیں، نپولین نے وہ سب ختم کردیں۔ پہلے مقامی لوگ افسروں کا انتخاب کرتے تھے۔ نپولین نے خود تمام افسر مقرر کیے —— علاقوں میں گورنر، تعلقوں میں نائب گورنر اور حلقوں میں میئر —— اور سب کو ہدایت کردی گئی تھی کہ شہنشاہ کی طرف سے جو فرمان جاری ہو، اس سے سب کو متّفق رکھا جائے۔ یوں نپولین نے جیکوبنوں سے بھی بدرجہا بڑھ کر فرانس کو ایک ایسی مملکت بنادیا، جس کے نظام حکومت میں مرکز کو زیادہ اہم حیثیت حاصل

---

[1] Notre Dame

[2] (مترجم) ظاہر ہے کہ جب قوم کی بہت بڑی اکثریت نپولین کی حامی تھی اور مسلسل حمایت کرتی رہی تو اس کے خلاف گوناگوں تعبیرات تکلف سے پیدا کرنا کیونکر مناسب ہے۔ حق یہ ہے کہ اس سلسلے میں فاضل مورخوں نے اپنے حدود کا خیال نہ رکھا۔

تھی اور اس کا کاروبار پولیس کی نگرانی میں چلتا تھا۔

ہر سیاسی پس منظر کے آدمی شہنشاہی نظم و نسق میں بھرتی کر لیے گئے۔ نپولین کا پہلا مقصد یہ تھا کہ اوّل درجے کی سیاسی صلاحیت تلاش کرے۔ جہاں یہ چیز مل جاتی تھی، اسے قطعاً پروا نہ ہوتی کہ ملازمت اختیار کرنے والا شخص ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب واپس آ گیا ہے یا زمانۂ سابقہ میں اس کا تعلق جیکوبن گروہ سے تھا۔ ان افراد کے سابقہ حالات کا تنوّع تنگ نظرانہ گروہ بندی کو ختم کرنے کا موجب ہُوا اور سلطنت وسیع تر سیاسی بنیاد پر قائم ہو گئی۔ نپولین اپنے افسروں کو اچھے مشاہرے دیتا تھا۔ علاوہ بریں ان کے لیے عمدہ خطابات حاصل کرنے کے مواقع موجود تھے۔ سلطنت قائم ہوتے ہی اس نے درجنوں کی تعداد میں لوگوں کو ڈیوک اور سیکڑوں کی تعداد میں بیرن بنا دیا۔ جن فوجی سالاروں نے ممتاز خدمات انجام دیں، انھیں مارشل کا درجہ دے دیا اور چھوٹے درجے کے انتظامی افسروں کو لیجن آف آنر[1] عطا کرتا رہا۔ نپولین نے خود کہا کہ طبقۂ امراء ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ آپ اونچے درجے کے لوگوں کو اِس طبقے سے خارج کر دیجیے، بلکہ طبقے ہی کو مٹا دیجیے۔ یہ متوسّط طبقے کے دولتمند اور طاقتور گھرانوں میں منتقل ہو جائے گا۔[2] نپولین نے جو طبقۂ امراء پیدا کیا، اس کی وجہ سے متوسّط طبقے کے لیڈروں کو عمرانی امتیاز حاصل ہو گیا، جسے وہ اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

قانون اور انصاف

نپولین نے نظامِ قدیم کی امرائی شان و شوکت کے بعض پہلو از سرِ نو تازہ کر لیے، مگر وہ واضح اور نمایاں عدمِ مساوات کا روادار نہ ہُوا۔ اس نے قوانین کا ایک سلسلہ مرتّب کرایا، جو "مجموعۂ نپولین"[3] کے نام سے مشہور ہے (۱۸۰۴ء - ۱۸۱۰ء)۔ اس میں اعلان کر دیا گیا کہ قانون کی نگاہ میں تمام لوگ برابر ہیں۔ عمرانی درجے اور دولت کا کوئی امتیاز نہیں۔ ہر شخص کو حق دے دیا گیا کہ جو پیشہ چاہے، اختیار کرے اور جس مذہب کو چاہے، اپنا لے۔ اس مجموعے کے مطابق رومی اور جاگیردارانہ قانونی نظاموں کا اختلاف ختم ہو گیا اور فرانس کو ایک مرتّب نظامِ قانون مل گیا، جس کا مطالبہ فلسفی کرتے رہتے تھے اور انقلابی حکومت کو اس کی ترتیب کے لیے مہلت نہیں مل سکی تھی۔

لیکن مجموعۂ نپولین میں دورِ تنویر کا پورا عدالتی اصلاحی پروگرام شامل نہ تھا۔ اس میں رومی قانون کے بعض اطلاقی پہلو شامل تھے۔ نپولین نے اس انقلابی قانون کی تصدیق کر دی تھی کہ میاں بیوی کو باہم رضامندی سے طلاق کی اجازت ہے۔ اس نے خود جوزیفین کو طلاق دی؛ تاہم بہ حیثیّت عمومی کنبے میں مرد کی مطلق العنان قانونی برتری قائم رکھی۔ مجموعے میں ان انقلابی قوانین کو منسوخ کر دیا گیا، جن کے مطابق بیویوں، نابالغوں یا ناجائز اولاد کے حقوق کی حفاظت کی گئی تھی۔ مجموعے کے مطابق مقدّمات کے سلسلے میں تعزیر سے کام لینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کی رُو سے مدّعی کو مدّعا علیہ پر ترجیح دی گئی تھی اور فرد کے حقوق پر مملکت کا مفاد مقدّم رکھا گیا تھا۔ عدالتی اور انتظامی اختیارات علٰحدہ نہیں کیے گئے تھے۔ نپولین خود جج مقرّر کرتا اور گورنروں کو اختیار تھا کہ وہ جیوری کے ارکان چن لیں۔ ۱۷۸۹ء کے اصول کی کبھی توثیق کر دی گئی اور کبھی ان سے اختلاف کیا گیا۔ غرض نپولین نے عدل کا

---

[1] Legion of Honor ۔ [2] یہ اقتباس ایچ، اے، ایل فشر (Fisher) کی کتاب "نپولین" سے لیا گیا۔ [3] Code of Napoleon

جو نظام تیار کیا وہ سلطنت کے زمانے میں انقلاب کی تقدیر کا ایک مناسب خلاصہ تھا۔

شہری حقوق کے متعلق بھی نپولین کی روش میں ابہام موجود تھا۔ ایک طرف اس نے وحشت و وحشت کا کوئی دَور گوارانہ کیا۔ مذہبی معاملات میں خاص حد تک رواداری اختیار کی اور جن لوگوں کو سابق میں خارجی قرار دے دیا گیا تھا، انھیں نظم و نسق میں شامل کر لیا۔ دوسری طرف نپولین کی فیاضی ہمیشہ ضرورت کی بناء پر رونما ہوتی رہی۔ وہ آزادی کے متعلق کسی بنیادی عقیدے پر مبنی نہ تھی۔ اگر مصالحت ناکام رہتی تو وہ قوت استعمال کرتا۔ مغربی علاقوں میں شاہ پسندوں نے کئی مرتبہ بغاوتیں کیں اور ویندی[1] کی بغاوت کے بعد یہ مرض مزمن ہو گیا۔ نپولین نے ان تمام باغیوں کو قتل کرا دیا جنھوں نے ١٨٠٠ء میں عفو عام کی پیشکش ٹھکرا دی۔ ١٨٠٤ء میں اس نے ڈیوک آنگین[2] کو جرمنی کی ایک غیر جانبدار ریاست بیڈن[3] سے اغوا کرا لیا، کیونکہ ڈیوک شاہ پسند سازشیوں کے نزدیک تختِ فرانس کا امیدوار سمجھا جاتا تھا۔ نپولین پر ڈیوک کی بے گناہی جلد سے جلد واضح ہو گئی، مگر اس کے باوجود اسے موت کی سزا دی گئی۔

جمہوریت پسندوں کی نگاہوں میں نپولین کی شہرت کو زیادہ نقصان آزادیِ تقریر کے روک دینے سے ہوا۔ مثلاً جولائی ١٨٠١ء میں اس نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ تمام اخبار احتیاط سے پڑھے:

> "... جو کچھ ان میں درج ہوتا ہے اور اس سے عوام کے نقطۂ نگاہ پر اثر پڑ سکتا ہے، اس کا خلاصہ تیار کر رکھنا۔ مذہب، فلسفہ اور سیاسی آراء بہ طور خاص پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ ہر روز یہ خلاصہ پانچ اور چھ بجے کے درمیان میرے پاس بھیج دینا۔
>
> ہر دس دن کے بعد ان تمام کتابوں اور رسالوں کا تجزیہ میرے پاس بھیجنا، جو شائع ہوں۔ ان عبارتوں کا خاص خیال رکھنا، جن کا تعلق اخلاقی مسائل سے ہو یا جو سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے میری دلچسپی کا موجب سمجھی جائیں۔
>
> جتنے ڈرامے تھیٹروں میں دکھائے جاتے ہیں، ان سب کے نسخے فراہم کر لینے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا جائے۔ ان کا بھی ایک تجزیہ میرے لیے تیار کر لیا جائے اور وہ باتیں بطور خاص سامنے رہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ تجزیہ زیادہ سے زیادہ کسی کھیل کے دکھائے جانے کے بعد اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر میرے پاس پہنچ جانا چاہیے۔"[4]

بالکل اسی طرح مسودہ ہائے قانون، پوسٹروں، اشتہاروں، ادبی مجلسوں، مواعظ اور اہم مقدموں کے متعلق حکم دے دیا گیا۔ غرض رائے عامہ کے بارے میں کوئی بھی چیز نپولین کی دست اندازی سے محفوظ نہ تھی۔ اس نے پیرس کے اخباروں میں سے[5] حصہ

لہ Vendee   ٢ه Duke of Enghien   ٣ه Baden

٤ه دیکھیے ٹامپسن (Thompson) کی کتاب "Napoleon Self Revealed" ص ٨١۔

بند کر دیا اور تھیئٹروں کے منتظموں کو بار بار ڈراموں کی اصلاح پر توجہ دلائی، تاکہ ان میں حبِ وطن کا جذبہ نمایاں ہو جائے۔ جب وہ فرانسیسیوں کو کسی امر پر آمادہ کرنا چاہتا تو اخباروں میں ایک مہم کا آغاز کرا دیتا۔ مثلاً ۱۸۰۱ء میں اس نے حکم دیا:

"ضروری ہے کہ انگلیکی کلیسا کے ہاتھوں آئرلینڈ کے کیتھولکوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، ان کے متعلق شور غل بپا کیا جائے ..... بشپوں سے ملاقات کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ دعائیں کریں، تاکہ انگلیکی کلیسا آئرستانی کیتھولکوں کے خلاف ظلم و جور بند کر دے۔ مگر نظم و نسق کو زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اخباروں کو اصل مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، لیکن یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ حکومت کا اصل مقصد کیا ہے..... پروٹسٹنٹوں کی جگہ انگلیکی کلیسا کی اصطلاح استعمال کی جائے، کیونکہ پروٹسٹنٹ فرانس میں موجود ہیں اور انگلیکی کلیسا موجود نہیں۔"[۵]

مذہب مذہب کے متعلق نپولین نے جو فیصلے کیے، ان پر بھی سیاسی مصالح کا رنگ چڑھ گیا۔ "مجھے مذہب میں تجسم کے راز کا کوئی پتا نہیں ملتا، مگر ایک عمرانی نظام کا راز اس میں پاتا ہوں۔ مذہب آسمان کی طرف نظریۂ مساوات کا انتساب کرتا ہے، جس کے مطابق دولتمند آدمی غریبوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔"[۶] مزید برآں فرانسیسی کیتھولک دورِ انقلاب کی مخالفتِ مذہب سے بیزار تھے، اس لیے نپولین نے سمجھا کہ روما کے ساتھ مصالحت سے اسے بہرحال فائدہ ہوگا۔ اگر وہ کلیسا کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس طرح اسے وہ چیز مل جائے گی، جسے اس نے "روحانی پولیس" سے تعبیر کیا۔

نپولین نے پوپ پائس ہفتم (۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۳ء) سے ۱۸۰۱ء میں ایک معاہدہ کیا اور مصالحت ہو گئی۔ مملکتِ فرانس نے اقرار کر لیا کہ تمام پادریوں کو باقاعدہ تنخواہیں دی جائیں گی۔ بشپوں یا پادریوں کا انتخاب عوام کے ذریعے سے نہ ہوگا، بلکہ حکومت بشپوں کو نامزد کرے گی، پھر ان کے لیے پوپ سے تقدیس حاصل کی جائے گی اور بشپ پادریوں کو مقرر کریں گے۔ اس نقطے پر پہنچ کر نپولین کی مراعات ختم ہو گئیں۔ معاہدے میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ کیتھولسزم "فرانسیسیوں کی اکثریت" کا مذہب ہے، گویا یہ مملکت کا مذہب نہیں، اس طرح معاہدے میں پروٹسٹنٹوں اور یہودیوں کے ساتھ رواداری نہ برتاؤ کا انتظام کر لیا گیا۔ مزید برآں حکومتِ فرانس کو ایک مبہم، مگر وسیع اختیار کلیسائی سرگرمیوں کے ضبط و نظم کے متعلق مل گیا۔ ۱۸۰۱ء کا معاہدہ نپولین کے لیے ایک ڈپلومیٹک فتح تھا اور اس کے مطابق ۱۷۸۹ء کے اصول کی پُرزور توثیق ہو گئی۔ پادریوں کے لیے جو شہری دستور بنا تھا، اس کی صرف وہ دفعات اس معاہدے کے مطابق منسوخ ہوئیں، جو حد درجہ انتہا پسندانہ تھیں۔ پائس ہفتم نے عُشر کی تنسیخ بھی منظور کر لی اور کلیسائی جائدادوں کی ضبطی بھی مان لی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نپولین کو اختیاراتِ تنظیم دے دیے

---

[۵] نپولین کے غیر شائع شدہ مکاتیب ص ۹۳-۹۴ ۔ [۶] فشر کی کتاب نپولین۔

اور فرانسیسی کلیسا کو مملکتِ فرانس کی حفاظت کا ایک مؤثر ذریعہ بننے کا موقع عطا کر دیا۔

جس حد تک فرانس کا تعلق تھا، اس معاہدے پر نہایت اچھی طرح عمل ہوا۔ کیتھولکوں کی بڑی تعداد اس پر مطمئن ہو گئی، البتہ وہ لوگ اس کے مخالف رہے، جو پادریوں کے سخت خلاف تھے اور ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ اصل معاہدہ ۱۹۰۵ء تک قائم رہا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ اس سے فرانس اور ویٹیکن میں مستقل صلح نہ ہوئی۔ نپولین کو اصرار تھا کہ پوپ کو قیصر کی چیزیں قیصر کے حوالے کر دینی چاہئیں۔ پوپ پائس ہفتم نہیں چاہتا تھا کہ پاپائی جاگیرات کو فرانس کے نئے قیصر کی تابعیت میں دے دے اور وہی حالت پیدا کر لے، جو ازمنۂ وسطیٰ کے شہنشاہوں کے زمانے میں تھی۔ چنانچہ اس نے نپولین کو روحانی اور دنیوی اختیارات کی مناسبت پر لیکچر دینے شروع کیے۔ بہرحال پوپ پائس ہفتم نے حکومتِ نپولین کے ماتحت قیدی کی حیثیت میں زندگی بسر کی۔ وہ پہلے شمالی اٹلی میں رہا، پھر فرانس میں۔

تعلیم انقلاب اور نپولین نے کلیسا کے ہاتھ سے تعلیم و تربیت کی اجارہ داری چھین لی۔ ۱۷۹۱ء کے دستور میں وعدہ کیا گیا تھا کہ فرانس کے اندر سرکاری سکولوں کا ایک نظام جاری ہوگا۔ کن وینشن نے اس اصول سے ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں کچھ زیادہ کام نہ لیا، لیکن خاص فنون کی تربیت کے لیے اداروں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ ان میں سے خاص شہرت انجنیئری کی درسگاہ کو حاصل ہے، جسے "ایکول پولی ٹیکنیک"[1] (دارالفنون) کہتے تھے۔ اسی طرح ہر صوبے میں ایک مرکزی سکول قائم کر دیا گیا، تاکہ اعلیٰ درجے کی ثانوی تعلیم کا انتظام ہو اور اس پر خرچ نسبتاً کم آئے۔ نپولین نے ۱۸۰۲ء میں یہ کامیاب درسگاہیں بند کر دیں اور ان کی جگہ "لیسی"[2] جاری کیے، جن میں نسبتاً کم طلبہ شریک ہوتے، جو تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتے یا انھیں حکومت کی طرف سے وظیفے ملتے۔ اس تبدیلی کا اصل مقصد سیاسی تھا۔ ان درسگاہوں میں طلبہ خاص وردیاں پہنتے، فوجی باجے کے ساتھ باہر نکلتے اور لعاب میں بھی حُبِ وطن کی روح پیدا کرنے کا خاص خیال رکھا جاتا۔ مثلاً شہنشاہ (نپولین) نے مندرجہ ذیل قواعد مقرر کر دیے تھے، جن کے مطابق تاریخِ فرانس کے متعلق نصابی کتابوں میں ترمیم ہوتی اور انھیں عہدِ حاضر کے قریب تر لایا جاتا:

"یہ کام صرف ان مصنفوں کے حوالے نہیں ہونا چاہیے، جو حقیقی صلاحیت کے مالک
ہیں بلکہ ——— اور یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے ——— حکومت کے متوسلین بھی
ان کے ساتھ شامل ہونے چاہئیں، جو اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق حقائق پیش کریں گے
اور یوں صحت مند تعلیم کی بنیادیں استوار ہوں گی۔ . . ."[3]

درسگاہوں کی عام نگرانی کے لیے نپولین نے ۱۸۰۸ء میں ایک جماعت بنائی، جسے "یونیورسٹی" کا غلط نام دیا۔ دراصل یہ

---

[1] Ecole Polytechnique یعنی وہ درسگاہ، جس میں مختلف فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔

[2] Lycee یعنی درسگاہ۔ [3] ٹامپسن کی کتاب نپولین ص ۲۱۶۔

جماعت ان کمیٹیوں سے زیادہ مشابہ تھی، جو امریکہ میں سکولوں کے انتظام کے لیے ترتیب پاتی ہیں۔

اُس وقت نپولین کا عقیدہ دورِ حاضر کی طرح جمہوریت پروری کا نہ تھا، جس کے رُو سے درسگاہوں میں آزاد تعلیم دی جاتی یا اسے سیاسی اعتبار سے معقول حد تک غیر جانبدار تربیت کہا جا سکتا۔ اس نے ابتدائی تعلیم سے کامل تغافل برتا، لیکن انقلابی بنیادوں پر عمارت اٹھاتے ہوئے اس نے جو نظامِ تعلیم جاری کیا، وہی تھا، جو اب تک فرانسیسی درسگاہوں کا عام نظام ہے۔ کلیسا اور مملکت کے درمیان تعلیمی مقابلہ، جو فرانسیسی زندگی کا ایک تلخ مسئلہ بنا رہا، انقلاب اور نپولین ہی کے وقت سے شروع ہوا۔

اقتصادیات

جو شہنشاہ قومی اتحاد کو ترقی دینا چاہتا تھا، اس کا اقتصادی پروگرام بھی سیاسی مقاصد پر مبنی تھا۔ فرانسیسی کسان چاہتے تھے کہ انھیں بالکل نہ چھیڑا جائے اور ۱۷۸۹ء سے انھوں نے جو نئی آزادی حاصل کی تھی، اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ نپولین نے ان کے معاملات میں دخل دینا گوارا نہ کیا، البتہ فوج کے لیے رنگروٹ ضرور حاصل کرتا رہا۔ طبقۂ اوسط کو متوازن قومی بجٹ مطلوب تھا، نیز یہ خواہش تھی کہ دورِ انقلاب میں کاغذی سکّوں کا جو تجربہ کیا گیا تھا، وہ ختم ہو جائے اور اقتصادیات پر ضبط و نظم قائم نہ رہے۔ نپولین نے روپے کے متعلق ڈائرکٹری کی محکم پالیسی قائم رکھی، لیکن ڈائرکٹری کے عمل کے برعکس بجٹ متوازن رکھا۔ یہ توازن اس امر کا نتیجہ تھا کہ اسے جنگ میں لُوٹ کا خاصا سامان مل گیا تھا۔ اس نے محصّلین کی صلاحیت و نگرانی میں بہت اصلاح کر دی اور ۱۸۰۰ء میں بینک فرانس قائم کر دیا، جو نیم سرکاری ادارہ تھا۔ اسی کو حکومت کے مالی معاملات کا کارندہ بنایا۔ ۱۷۹۱ء میں لاشاپلیر[1] نے مزدوروں کے متعلق قانون بناتے وقت جو پابندیاں عائد کی تھیں، انھیں اور بڑھا دیا اور مزدوروں کو مجبور کیا کہ اپنے تحریری اقرار اور عام شہرت کے مطابق کام کریں۔ چونکہ جنگیں جاری تھیں، لہٰذا جنگی ساز و سامان کے متعلق بڑے بڑے اجارے دیے جاتے تھے اور مالی امداد کا انتظام بھی ہوتا رہتا، اس لیے روزگار کی کمی نہ تھی اور منافع خاصے زیادہ تھے، لیکن جنگیں بدستور جاری رہیں اور نپولین کے لیے کسانوں اور طبقۂ متوسط کے لوگوں کو مطمئن رکھنا بہت مشکل ہو گیا۔ اگرچہ مفتوحہ ملکوں سے بھی خاصی تعداد میں آدمی بھرتی کر لیے جاتے تھے، پھر بھی فرانسیسی کسانوں سے بھرتی لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ ساتھ ہی نمک، شراب اور تمباکو پر جو محاصل عائد تھے، ان میں اضافہ ہوتا رہا، اگرچہ عوام کو یہ اضافہ پسند نہ تھا۔

غرض نپولین نے داخلی معاملات کے متعلق جو روش اختیار کی، وہ ایک حد تک ویسی ہی تھی، جیسی مشہور مطلق العنان افراد سیزر سے لُوئی چہاردہم اور لُوئی چہاردہم سے موجودہ زمانے کے ڈکٹیٹر تک اختیار کرتے رہے۔ سیزر کی طرح نپولین نے بھی جمہوریت کے متعلق زبانی جمع خرچ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، ساتھ ہی وہ جمہوری اداروں کو دباتا رہا۔ اس نے صوبائی عہدہ داروں سے کام لے کر مرکزی اقتدار کمال پر پہنچایا۔ اس سے پیشتر لُوئی چہاردہم نے اسی ذریعے سے کام لیا تھا۔ ہٹلر اور سٹالن کی طرح نپولین کو بھی آزادیٔ تقریر سے نفرت تھی، لیکن نپولین ایک واقعی روشن خیال مطلق العنان تھا۔ اس کا مجموعۂ قوانین اور اس کی تعلیمی اصلاحات بالخصوص فلسفیوں کو یکسر شادمانی بنا دیتیں۔ اس نے شہری کشمکش ختم کر دی، لیکن تقسیم شدہ زمینوں کا سوال از سرِ نو نہ اٹھنے دیا، نیز ۱۷۸۹ء میں قانون کے رو برو مساوات کا جو اصول قائم ہو چکا تھا، اس پر کوئی زد نہ پڑنے دی۔ اس نے بعض انقلابی جدتیں ترک کر دیں، بعض میں ترمیم کر لی، بعض کی تکمیل کا انتظام کر دیا۔ اس طرح نپولین نے انقلاب کو ایک خاص نظم کے تابع کر دیا، اسے کاملاً برباد نہ ہونے دیا۔

[1] Le Chapelier

سولھواں باب

نپولین اور یورپ

تمہید اکثر فرانسیسیوں کے نزدیک نپولین "مردِ تقدیر" تھا اور ان کے ملک کی طویل تاریخ میں اسے درخشاں ترین حکمران کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے برعکس اہلِ یورپ میں سے اکثر کے نزدیک نپولین وہ مکروہ آدمی تھا، جو اسپ سوار آیا۔ وہ انفرادی اور قومی خودمختاری کا بے پناہ دشمن تھا۔ فرانس کی فتوحات میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی سرحدیں آگے بڑھتی رہیں اور جو ملک برائے نام آزاد تھے، وہ فرانسیسیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلیاں بنتے گئے۔ ساتھ ساتھ نپولین کے ناقابلِ تسکین سامراج سے یورپ کی نفرت بڑھتی گئی۔ نپولین نے فرانس کی ایک وسیع سلطنت پیدا کر لی، مگر ساتھ ہی دوسری یورپی قوموں میں سخت ترین دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی۔

جنگ (۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۵ء) نپولین نے "کونسل" بنتے ہی میدانِ جنگ کا راستہ لیا۔ اس کے خلاف جو دوسری اتحادی جمعیت بنی تھی، وہ ۱۷۹۹ء میں کامیابی کے اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔ پھر اس کے ٹکڑے ہونے لگے۔ پال اول زارِ روس کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل تھا۔ اس نے ۱۷۹۹ء کے موسمِ خزاں میں برطانوی اور آسٹروی حلیفوں کو چھوڑ دیا۔ ۱۸۰۰ء کے موسمِ بہار میں نپولین نے اٹلی کے اندر آسٹریا پر حملہ کیا۔ جون میں ایک فتح حاصل کی۔ پھر ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آسٹریا صلح کی درخواست پر مجبور ہو گیا۔ معاہدۂ لیونیول ط (۱۸۰۱ء) کے مطابق نپولین نے آسٹریا سے وہ تمام علاقے واپس لے لیے، جو چار سال پیشتر کیمپو فورمیو کے معاہدے میں حاصل کیے تھے۔ اس مرتبہ آسٹریا نے مان لیا کہ جن ریاستوں سے فرانس نے دریائے رھائن کے مغرب میں علاقے لے لیے تھے، ان کا معاوضہ رھائن کے مشرق میں دے دیا جائے اور ان معاوضوں کا فیصلہ کرنے کا حق فرانس کو حاصل رہے، گویا لیونیول کے معاہدے کے مطابق نپولین کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ جرمنی کی تشکیلِ نو اپنے زیرِ نگرانی کرائے۔

کیمپو فورمیو کے بعد کی طرح لیونیول کے بعد بھی صرف برطانیہ فرانس سے برسرِ پیکار رہ گیا۔ ۱۷۹۷ء میں پٹ کو چک نے برطانیہ کو برسرِ جنگ رکھا تھا، لیکن ۱۸۰۱ء میں جب کہ پٹ وزیرِ اعظم نہ تھا، برطانوی محصول گزار چاہتے تھے کہ جنگی محاصل کے بھاری بوجھ سے انھیں نجات مل جائے۔ برطانوی تاجروں کی خواہش تھی کہ برِاعظم کی تجارتی منڈیوں سے ان کے روابط ازسرِنو قائم ہو جائیں اور ۱۷۹۳ء سے ان منڈیوں کے دروازے جزوی طور پر ان کے لیے بند ہو چکے تھے۔ اگرچہ برطانیہ یورپ میں نپولین کی فتوحات نہ روک سکا، مگر ۱۸۰۱ء میں اس نے بحریات اور نوآبادیوں کی جنگ میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مثلاً سابق ولندیزی اور ہسپانوی نوآبادیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ نیلسن کے بیڑے نے فرانسیسیوں کو مصر سے، نیز مرکزی بحیرۂ روم کے اہم جنگی جزیرے مالٹا سے فرانسیسیوں کو نکال دیا تھا۔ کابینہ برطانیہ کو یقین تھا کہ اسے گفت و شنید کی

ط Luneville

محکم حیثیت حاصل ہے اور نپولین سے سازگار شرطوں پر صلح کی جا سکتی ہے، مگر فرانسیسی نمائندوں نے نااہل برطانوی نمائندوں پر فوقیت حاصل کر لی۔ آمیاں[1] کے مقام پر معاہدہ ہوا (۱۸۰۲ء) اس میں برطانوی نمائندوں نے اپنی تقریباً تمام فتوحات سے دست برداری اختیار کر لی اور معاوضے میں انھیں کچھ بھی نہ ملا۔ فرانسیسیوں نے نہ تو برِ اعظم کو برطانوی برآمد کے لیے کھول دینے پر آمادگی ظاہر کی اور نہ بلجیم کو چھوڑا، جسے نپولین قلبِ برطانیہ پر ایک بھرا ہوا پستول قرار دیتا تھا۔

آمیاں کا یکطرفہ معاہدہ فرانس و برطانیہ کی عالمگیر کشمکش میں صرف مختصر سا متارکہ ثابت ہوا۔ نپولین کا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا کہ اس کشمکش کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دے۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانیہ کی تجارتی اور استعماری برتری تباہ ہو جائے، گویا اس نے صد سالہ جنگ کا رخ پلٹ دیا تھا۔ عین اس اثناء میں وہ آسٹریا اور پروشیا کے لیے موجب پریشانی بنا ہوا تھا کیونکہ لیونیول کے معاہدے کے مطابق اسے جرمنی کا نقشہ نئے سرے سے بنانے کی منظوری مل گئی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں ایک سو سے زیادہ جرمن ریاستیں ختم کر دی گئیں۔ یہ زیادہ تر شہری ریاستیں یا چھوٹی چھوٹی کلیسائی امارتیں تھیں۔ اس علاقائی ردّ و بدل سے زیادہ تر فائدہ بویریا، ورٹم برگ اور بیڈن کی جنوبی جرمن ریاستوں کو پہنچا۔ نپولین چاہتا تھا کہ اس طرح ایک نئی جرمنی بروئے کار آئے، جو فرانس کے تابع ہو۔ آسٹریا اور پروشیا کی خود مختار جرمن ریاستوں کے درمیان یہ "تیسری" جرمنی تھی۔

۱۸۰۳ء میں نپولین نے ایک نیا قانون محاصل بنایا۔ اس سے برطانیہ میں سخت تشویش پھیلی، کیونکہ یہ ان انگریز تاجروں کے خلاف تھا، جو مال باہر بھیجتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ امریکہ میں ایک زبردست استعماری سلطنت قائم کی جائے، جس کا مرکز ہیٹی[2] (سانٹو ڈومنگو) ہو۔ نیز یہ سلطنت لوئی سیانا کے وسیع علاقے پر مشتمل ہو، جو ہسپانیہ نے ۱۸۰۱ء میں فرانس کو واپس دے دیا تھا۔ فرانسیسی سپاہیوں نے ہیٹی کا جزیرہ قابل حبشی سردار "توسنت لوورتور"[3] سے جبراً چھین لیا، لیکن اہلِ ہیٹی نے مزاحمت جاری رکھی۔ پھر وہاں "تپِ زرد" وبائی شکل اختیار کر گیا۔ اس میں فرانسیسی فوج کو سخت نقصان پہنچا اور نپولین کو امریکی منصوبے سے دست بردار ہونا پڑا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں نپولین نے لوئی سیانا کو ایک کروڑ گیارہ لاکھ ڈالر پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

لوئی سیانا کی خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہونے تک فرانس و برطانیہ کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی تھی۔ ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۵ء تک نپولین انگلستان پر حملے کی تیاری کرتا رہا۔ اس نے آبنائے ڈوور کی فرانسیسی سمت میں تقریباً ایک ہزار جہاز لعہ ایک لاکھ فوج جمع کر لی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں امیر البحر ویلنو[4] اور فرانسیسی بیڑے کو جزائر غرب الہند کی طرف بھیج دیا تھا۔ یہ دراصل ایک چکما تھا، مدعا یہ تھا کہ انگریزی بیڑا یورپ سے باہر نکل جائے۔ ویلنو کو حکم تھا کہ ایسی صورت پیش آتے ہی وہ تیزی سے لوٹ آئے اور فرانسیسی حملہ آور فوج کو رودبارِ انگلستان سے محفوظ گزار کر برطانیہ پہنچا دے۔ نیلسن اس اثناء میں بحیرہ کریبیا (غرب الہند) کے اندر سرگرداں پھرتا رہا۔

ویلنو نیلسن کو نہ جزائر غرب الہند میں چکما دے سکا، نہ واپسی میں اس سے مخلصی حاصل کر سکا۔ وہ یورپی سمندروں میں پہنچا تو بہ نظر اقتیاط

---

[1] Amiens

[2] Haiti

[3] Tossaint L Quverture

[4] Villeneuve

ہسپانیہ کے متحدہ بیڑوں سے راس ٹریفالگر[1] کے قریب جنگ کی، جو ہسپانیہ کے جنوبی و مغربی گوشے میں واقع ہے (۲۱ اکتوبر ۱۸۰۵ء)۔ اس لڑائی میں نیلسن مارا گیا، مگر مرنے سے پیشتر اس نے اپنے دشمنوں کے نصف جہاز تباہ کر ڈالے اور خود اس کے ایک بھی جہاز کو نقصان نہ پہنچا۔ جنگ ٹریفالگر سے برطانیہ کو سمندروں پر کامل اقتدار حاصل ہو گیا اور رودبار عبور کر کے کامیابی سے برطانیہ پر حملہ آور ہونے کی تمام امیدیں مایوسی سے بدل گئیں۔

تیسری اتّحادی جمعیت (۱۸۰۵ء - ۱۸۰۷ء)

اس وقت تک آسٹریا اور روس برطانیہ سے مل چکے تھے اور تیسری اتّحادی جمعیت وجود میں آ چکی تھی۔ بوناپارٹ نے برِاعظم کے دشمنوں کا استیصال ایک ایسی مہم کے ذریعے سے کر دیا، جسے اس کی مہموں میں درخشاں ترین سمجھنا چاہیے۔ اُلم[2] میں، جو بالائی ڈینیوب پر واقع ہے، اس نے تیس ہزار آسٹرویوں کو جنگی اسیر بنا لیا (اکتوبر ۱۸۰۵ء)، جو روسی حلیفوں کا انتظار کیے بغیر مغربی جانب حرکت کر چکے تھے۔ بڑی روسی فوج اور باقی آسٹروی فوج سے اس کا مقابلہ آسٹرلٹز[3] (موریویا کا ایک گاؤں) کے قریب ہُوا۔ پھر جو جنگ ہوئی (۲ دسمبر ۱۸۰۵ء) وہ نپولین کی تاجپوشی کی پہلی سالگرہ کے دن ہوئی۔ گویا اس جنگ کے ذریعے سے سالگرہ منائی گئی۔ نپولین خفیہ خفیہ تیزی سے کمک لے آیا اور دشمنوں کو پیکرِ حیرت بنا دیا۔ ان کے مقتولین و مجروحین کی تعداد نپولین کے مقتولین و مجروحین سے تین گنا زیادہ تھی۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس نے ہیپسبرگ شہنشاہ فرانسس دوم کو پریسبرگ[4] کے ذلّت خیز معاہدے پر دستخط کے لیے مجبور کر دیا۔ اس معاہدے کے مطابق آسٹریا نے آسٹروی ٹائیرول[5] بویریا کو اور وینس نپولین کی قائم کردہ اطالوی بادشاہی کو دے دیا۔

پروشیا کو اس سے زیادہ بدبختی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷۹۵ء کے بعد پروشیا پہلی مرتبہ جنگ میں آنے پر مجبور ہُوا، کیونکہ بویریا نے جرمنی کے معاملات میں بار بار مداخلت کی تھی۔ پروشیا کی فوج ناکافی تھی اور فریڈرک اعظم کی مہموں کے بعد جو فوجی اصلاحات جاری کی گئی تھیں، ان کی وجہ سے وہ پھر میدان جنگ میں آ گئے۔ اکتوبر ۱۸۰۶ء میں فرانسیسیوں نے پروشیا کی بڑی فوج کو جینا[6] اور آورسٹاٹ[7] کی دوگونہ جنگوں میں پیس کر رکھ دیا اور برلین پر قبضہ کر لیا۔ نپولین نے پوٹسڈم میں فریڈرک اعظم کے محل کو ادب و احترام سے دیکھا اور ہوہینزولرن خاندان کے اس بڑے فاتح نے جنگوں میں فتح کے جتنے نشان حاصل کیے تھے، وہ اٹھا کر پیرس بھجوا دیے۔ پروشیا کے آخری فیصلے کو اس وقت تک ملتوی کر دیا، جب تک روس میدانِ جنگ میں باقی تھا اور وہی برِاعظم میں اس کا واحد مخالف رہ گیا تھا۔ جون ۱۸۰۷ء میں روس نے بھی فریڈلینڈ[8] کی جنگ میں شکست فاش کھائی۔

تیسری اتّحادی جمعیت کے خلاف نپولین کی فتوحات کا شاندار سلسلہ جزواً دشمنوں کی غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ آسٹریا اور پروشیا کے سالاروں نے جو غلط اندازے کیے، وہی آسٹرلٹز اور جینا میں بڑی حد تک فرانسیسیوں کی کامیابی کا موجب بنے۔ مزید برآں فرانس کی فوج اس وقت

---

[1] Trafalgar [2] Ulm [3] Austerlitz

[4] Pressburg [5] Tyrol [6] Jena

[7] Auerstad [8] Friedland

یورپ کی بہترین تجربہ کار فوج تھی۔ اس کے ہر درجے کے سپاہی نہایت عمدہ تربیت پا چکے تھے اور اس کے افسروں کی حیثیت اس وجہ سے بہت اچھی ہوگئی تھی کہ ان کی ترقی صلاحیت پر موقوف تھی، نہ کہ مدّتِ ملازمت میں تقدّم یا اثر و رسوخ کی بناء پر۔ سب سے آخر میں یہ کہ بوناپارٹ نے اس وقت تک شاذ ہی جنگ کی، جب تک اس کی فوج تعداد میں دشمن کی فوج کے برابر نہ پہنچ گئی اور جب فوج کی تعداد برابر ہوتی تو اس کا انحصار زیادہ تر ڈرامائی اور اچانک نقل و حرکت پر رہتا اور اس وقت وہ پوری قوت بازی پر لگا دیتا، جیسا کہ آسٹرلٹز[1] میں کیا۔ بہ ایں ہمہ فرانسیسی فوج میں بھی نقائص موجود تھے۔ مثلاً تنخواہ کم تھی اور بے قاعدہ ملتی تھی۔ طبّی انتظامات خرابی میں ذلّت کی حد تک پہنچے ہوئے تھے اور رسد کے انتظامات اتنے بُرے تھے کہ فرانسیسی سپاہیوں کو عموماً غارت گری پر زندگی بسر کرنی پڑتی۔ آخر یہی کمزوریاں اس فوج کی قوّتِ زد و تاخت میں ضعف کا باعث ہوئیں، مگر ۱۸۰۷ء میں وہ نپولین کو برتری سے باز نہ رکھ سکیں[1]۔

سلطنت کا دورِ عروج ۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۲ء

نپولین کا نیرِ اقبال نصف النہار پر اس وقت پہنچا، جب اس نے اپنے روسی حریف الیگزانڈر اوّل (۱۸۰۱ء تا ۱۸۲۵ء) سے ایک کشتی میں ملاقات کی، جو دریائے نیمن[2] میں بمقام ٹلسٹ[3] (مشرقی پروشیا) ٹھہری ہوئی تھی۔ وہاں جولائی ۱۸۰۷ء میں دونوں شہنشاہوں نے ایک معاہدہ کیا، جس میں یورپ کو باہم تقسیم کر لیا۔ الیگزانڈر نے مغربی اور وسطی یورپ پر فرانس کی برتری تسلیم کر لی اور مشرقی یورپ کو روسی حلقہ منوا لیا۔ نپولین نے یہ اقرار بھی کر لیا کہ اگر عثمانی سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو روس کو بھی مالِ غنیمت میں سے حصّہ دیا جائے گا۔ شکست خوردہ زار سے اس نے کوئی علاقہ نہ لیا، صرف یہ اقرار کافی سمجھا کہ برطانیہ سے تجارت کا سلسلہ منقطع کر لیا جائے گا اور جنگ میں اس کے خلاف شرکت کی جائے گی۔

ٹلسٹ کے معاہدے میں سب سے بڑی زد پروشیا پر پڑی۔ جب دونوں شہنشاہ کشتی میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، تو پروشیا کا بادشاہ فریڈرک ولیم سوم (۱۷۹۷ء تا ۱۸۴۰ء) بحالت اضطراب دریائے نیمن کے کنارے پر ٹہل رہا تھا۔ پروشیا نے پولینڈ کے جو صوبے لیے تھے، انھیں الگ کر کے ایک نئی امارت کی شکل دے دی گئی، جس کا نام وارسا کی گرانڈ ڈچی رکھا گیا۔ نپولین نے یہ امارت حلیف شاہ سیکسنی کو دے دی۔ پروشیا کا جو علاقہ دریائے ایلب[4] کے مغرب میں تھا، وہ نپولین نے خود لے لیا، تاکہ اس سے جو سلوک چاہے کرے۔ ذلّت کی آخری حد یہ تھی کہ نپولین نے پروشیا میں اپنی فوج متعیّن کر دی اور پروشیا کے متعلق طے کیا کہ اس کی فوج بیالیس ہزار سے کبھی نہیں بڑھے گی۔

---

[1] مترجم: ظاہر ہے کہ اس پورے حصّے میں نپولین کی عظمت کو زیادہ سے زیادہ کم کر کے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی جنگ لڑی گئی ہو، جس میں کسی ایک فریق کی فتح فریقِ مقابل کی بعض غلطیوں یا کمزوریوں کا نتیجہ نہ ہو۔ نپولین کی عظمت اسی سے واضح ہے کہ اس سے پیشتر یا اس کے بعد فرانس یا کسی دوسرے ملک کی فوجیں بیک وقت اتنے حریفوں کا مقابلہ کر کے ایسی بے مثال فتوحات حاصل نہ کر سکیں اور کسی کی حقیقی حیثیت سے انکار کی ایسی اضطراب افزا کوشش غیر جانبدار مورخوں کے لیے قطعاً زیبا نہیں۔

[2] Niemen [3] [4] Elbe

آخری دور میں اس نئے سیزر نے یورپ کو تقریباً تین حصّوں میں بانٹ لیا تھا۔ اوّل سلطنتِ فرانس، جس میں فرانس کے علاوہ ۱۷۸۹ء سے بعد کے حاصل کردہ تمام علاقے شامل تھے۔ دوم وہ تابع حکومتیں، جن میں سے اکثر پر نپولین کے رشتہ دار حکمراں تھے۔ سب سے آخر میں آسٹریا، پروشیا اور روس کی مملکتیں، جن پر نپولین کا کم سے کم اثر تھا اور شکستیں کھا کر انھوں نے فرانس کے حلیف بننا منظور کیا۔ صرف برطانیہ، سویڈن اور ترکی نپولین کے قائم کردہ نظام سے باہر تھے۔

سلطنتِ فرانس کی سرحدیں زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کی حالت میں یہ تھیں: بلجیم، ہالینڈ، دریائے رھائن کے مغرب میں بحیرۂ شمالی کے ساتھ ساتھ جرمنی کے کچھ خطّے۔ پیدماں، جینوا، ٹسکنی اور رومہ کے علاقے اٹلی میں سے، پھر "الّلیلیائی صوبے"[1] جو ایڈریاٹک کے ڈلمیشیائی ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھے اور ۱۸۰۹ء میں آسٹریا سے لیے گئے تھے۔ ان کا نام وہی رکھا گیا، جو پرانے رومی صوبے کا تھا۔ ان تمام ملحقات کو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان پر فرانس کے مختلف علاقوں کی طرح صوبہ دار حاکم تھے۔

تابع امارتیں سلطنتِ فرانس کے حواشی پر واقع تھیں، مثلاً سلطنتِ اٹلی، جس میں شمالی اور وسطی اٹلی کے وہ علاقے شامل تھے، جن کا الحاق براہِ راست فرانس سے نہیں ہوا تھا۔ خود نپولین اس سلطنت کا بادشاہ تھا اور خود اس کا علاتی فرزند یوجین دابوحارنہ[2] بطور نائب السلطنت حکمران تھا۔ جنوبی اٹلی میں نپولین نے نیپلز کے بوربون بادشاہ کو ۱۸۰۵ء میں معزول کر دیا اور یہ بادشاہی پہلے اپنے بھائی جوزف کو، پھر اپنے بہنوئی "جوآخم مورا"[3] کو دے دی۔ مورا نپولین کی بہن کارولین[4] کا شوہر تھا۔ جوزف ۱۸۰۸ء میں نیپلز سے میڈرڈ چلا گیا، کیونکہ ۱۸۰۸ء میں نپولین نے وہاں کے ہسپانوی بوربون بادشاہ کو اس لیے معزول کر دیا تھا کہ اہلِ ہسپانیہ کو ان کی خواہش کے خلاف برطانیہ سے برسرِ جنگ رکھا جا سکے۔

وسطی یورپ میں نپولین سرگرمی سے کوششیں کرتا رہا کہ تیسری جرمنی کے صوبے کو لباسِ عمل پہنا دے۔ ۱۸۰۶ء میں اس نے ایک فرمان کے ذریعے سے جرمن ریاستوں کی تعداد اور گھٹا دی اور آخر مقدس رومی سلطنت کو ختم کر دیا، جو دراصل عجائب خانے میں نمائش کی ایک چیز رہ گئی تھی۔ اس کی جگہ نپولین نے ایک وفاق پیدا کیا، جس کا نام "وفاقِ رھائن"[5] رکھا۔ اس میں آسٹریا اور پروشیا کے سوا تقریباً ہر جرمن ریاست شامل کر لی گئی اور اس وفاق کا قلب ویسٹ فیلیا کی مملکت کو تجویز کیا۔ یہ مملکت اپنے بھائی جیروم کو دے دی۔ اس میں پروشیا سے حاصل کیے ہوئے وہ علاقے بھی شامل تھے، جو معاہدۂ ٹلسٹ کے مطابق دریائے ایلب کے مغرب میں لے لیے گئے تھے۔ صرف دو امارتیں اس وفاق سے باہر رہیں، ایک سوئٹزرلینڈ، دوسری وارسا کی گرانڈ ڈچی۔ یوں فرانس کی حاشیہ نشین امارتوں کا سلسلہ مکمل ہو گیا۔ یورپ رومی شہنشاہ کے دورِ عروج کے بعد ایسی سلطنت سے آشنا نہیں ہوا تھا۔

نپولین کی آرزو تھی کہ اپنی اس تخلیق میں وقار و دوام پیدا کر دے۔ یہ کافی نہ تھا کہ اس کے بھائی اور سالے یورپ کے نصف درجن تخت سنبھال لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ خود ایک حکمراں خاندان کی بنیاد رکھے۔ اس کی یہ خواہش اس لیے پوری نہ ہو سکی کہ پندرہ سال کی زوجیت

---

[1] Illyian Provinces — اس علاقے کو پرانے زمانے میں الّلیلیا کہتے تھے۔
[2] Eugene de Beauharrais
[3] Joachum Murat
[4] Carohne
[5] Confederation of the Rhine

میں جوزیفین کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے جوزیفین کو طلاق دے دی اور ۱۸۱۰ء میں یورپ کے نہایت مشہور حکمراں خاندانوں میں سے ہیپسبرگ شہنشاہ فرانسس دوم کی بیٹی ماری لوئیز[1] سے شادی کرلی۔ ماری لوئیز کے ایک بیٹا پیدا ہوا، جسے باپ یعنی نپولین نے شاہ روما کا پُرافتخار لقب دے دیا۔

یہ آگے چل کر نپولین دوم مشہور ہوا، مگر اسے نہ تو روما میں حکمرانی کا موقع ملا اور نہ کسی اور جگہ۔ بونا پارٹ نے غیر فرانسیسی رعایا اور ملحقہ ممالک کے باشندوں کو سب کچھ دے دیا، مگر وہ چیز نہ دی، جو انھیں سب سے بڑھ کر عزیز تھی۔ اس نے ہر جگہ کلیسا کے اقتدار پر پابندیاں لگائیں۔ زرعی غلامی منسوخ کردی۔ سڑکیں تعمیر کرائیں اور نیا فرانسیسی مجموعۂ قوانین نافذ کردیا۔ ساتھ ہی ہر جگہ سے تابعیت کا بھاری خراج وصول کیا۔ سال بہ سال حاشیہ نشین امارتوں میں سے سپاہیوں اور مادی وسائل کے باب میں مطالبات بڑھتے گئے۔ مثلاً مملکت اٹلی میں خراج کی شرح آسٹریوں سے دُگنی ہوگئی اور اٹلی سے جو رقمیں وصول ہوتی تھیں ان کا نصف حصّہ فرانسیسی فوج اور حکومت فرانس پر خرچ کیا جاتا تھا۔

نپولین کے جو رشتہ دار مختلف علاقوں میں حکمراں بنائے گئے تھے، ان کے پاس برابر ہدایات پہنچتی رہتی تھیں کہ حکومت کس طرح کرنی چاہیے اور جب کبھی وہ مقامی مفاد کو فرانس کے مفاد پر ترجیح دینے کی طرف راغب بھی ہوتے تھے تو نپولین ان کی خوب گوشمالی کرتا۔ لوئی بونا پارٹ نے ہالینڈ میں شہنشاہی فرامین سے بے اعتنائی کی جسارت کی تو نپولین نے اسے شدید زجر و توبیخ کی:

> ”ہالینڈ کے تخت پر بیٹھنے کے بعد اعلیٰ حضرت بھول گئے ہیں کہ آپ اصلاً فرانسیسی ہیں۔ آپ نے استدلال کے تمام سرچشموں سے کام لیا اور اپنے ضمیر کو زحمت میں ڈالا، تاکہ ثابت کرسکیں، آپ ولندیز ہیں، جو ولندیز فرانس کی طرف راغب تھے، انھیں آپ نے نظرانداز کیا اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ جو ولندیز انگریزی مقاصد کی خدمت انجام دے رہے تھے، انھیں ترقی دی . . . . . مجھے اس رنج و غم کا تختۂ مشق بننا پڑا کہ فرانس کا نام نیک اس ہالینڈ میں رسوا ہوا، جس پر میرا بھائی اور ہم وطن حکمراں ہے۔“[2]

لوئی کو اپنی جسارت کے باعث تخت سے دست بردار ہونا پڑا اور ولندیز آزادی کے رہے سہے حصّے سے بھی محروم ہوگئے۔ ۱۸۱۰ء میں ہالینڈ کو فرانس سے ملحق کرلیا گیا۔

یورپ کے لیے اقتصادی نظام

نپولین کا سامراج سب سے بڑھ کر پورے یورپ کے اقتصادیات کو خود اپنی مصلحتوں کے مطابق منظم کرنے کی کوشش میں نمایاں ہوا۔ اس نے یورپ کے لیے جو اقتصادی نظام تجویز کیا، اس کے مقصد دو تھے، اوّل فرانس کی برآمدی تجارت اعلیٰ پیمانے پر پہنچ جائے، دوم برطانیہ کا تجارتی نظام درہم برہم ہوجائے۔ انقلابی فرانس نے برطانوی سامان پر محاصل بہت بڑھا لیے تھے، کہ فرانس میں اس سامان کی درآمد رک جائے۔ رودبار

[1] Marie Louise

[2] نپولین کے غیر مطبوعہ خطوط جلد اوّل۔ ص ۳۸۲ - ۳۸۳۔

کو عبور کر کے انگلستان پر حملے کا جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس کی ناکامی نے نپولین کو مجبور کر دیا کہ ان اقتصادی تدابیر پر عمل پیرا ہو کر "دوکانداروں کی قوم" (انگریزوں) کو دیوالیہ بنا دے۔ تیسری اتحادی جمعیت کی شکست نے اسے وسیع پیمانے پر اقتصادی جنگ کے تجربے کا موقع دے دیا اور وہ تجارتی نظریۂ زر کے تمام جنگجویانہ مضمرات منطقی انتہا تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا۔

نپولین نے نومبر ۱۸۰۶ء میں برلین سے ایک فرمان جاری کیا تھا، جس کے مطابق جزائر برطانیہ سے تجارت اور برطانوی مال کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی تھی۔ ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ برّ اعظم میں جتنے برطانوی موجود ہوں، انھیں گرفتار کر لیا جائے اور ان کی جائداد قبضے میں کر لی جائے۔ برطانیہ نے جواب میں یہ اعلان کر دیا کہ غیر جانبدار ملکوں کے جو جہاز فرانس سے تجارت کے خواہاں ہوں اور برطانوی بندرگاہوں میں آئیں تو محصول ادا کریں۔ اس کے مطابق برطانیہ غیر جانبدار ملکوں کے اُس منافع میں حصہ دار بن گیا، جو فرانس کی تجارت سے انھیں حاصل ہوتا تھا۔ نپولین نے دسمبر ۱۸۰۷ء میں ایک فرمان جاری کیا، جو فرمانِ میلان کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق حکم دے دیا کہ غیر جانبدار ملکوں کے جو جہاز نئی برطانوی پالیسی کے مطابق عمل پیرا ہوں، انھیں قبضے میں لے لیا جائے۔ گویا عملاً غیر جانبدار ملکوں کی کیفیت یہ ہو گئی کہ کریں، جب بھی مریں، نہ کریں، جب بھی مریں۔

نپولین کے باجگزار اور حلیف یورپ کے لیے نئے اقتصادی نظام کی امداد پر مجبور تھے، ورنہ انھیں نتیجہ بھگتنا پڑتا۔ لوئی بوناپارٹ کی جتنی "غیر فرانسیسی" سرگرمیاں تھیں، نپولین کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ان میں سے بدترین یہ تھی کہ جو انگریزی سامان ولندیز ناجائز طریق پر لے آتے تھے، لوئی نے اُس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ شہنشاہ کو امید تھی کہ حاشیہ نشین ممالک فرانس کی صنعتی خوشحالی میں معاون ہوں گے۔ جب اہلِ اٹلی نے ریشم کی برآمد کے خلاف ضابطے پر اعتراض کیا تو نپولین نے اپنے نائب السلطنت یوجین کو اقتصادی زندگی کے حقائق پر ایک لکچر دیا:

> "چونکہ مملکت اٹلی سے خام ریشم انگلستان جاتا ہے۔۔۔ اس لیے میری طبعی خواہش یہ ہوئی کہ اس ریشم کو اپنے فرانسیسی ریشم بافوں کے فائدے کے لیے استعمال کروں۔ اگر ایسا نہ کروں تو میرے ریشم کے کارخانے، جو فرانسیسی تجارت کا ایک بڑا ذریعہ ہیں، بھاری نقصان اٹھائیں گے۔۔۔۔ میرا بنیادی اصول یہ ہے کہ فرانس کو ہر معاملے میں مقدم رکھا جائے۔
>
> . . . .
>
> اٹلی کے لیے ایسے منصوبے تیار کرنا بے سود ہیں، جن میں فرانس کی خوشحالی پیش نظر نہ رکھی جائے۔
>
> اٹلی کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ دونوں ملکوں کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔"[1]

فرانس کو ہر معاملے میں مقدم رکھنے کی زبردست کوشش بُری طرح ناکام ہو گئی۔ یورپ بھر کے لیے اقتصادی نظام سے صرف چند فرانسیسی صنعتوں کو فائدہ پہنچا۔ جزائر غرب الہند سے چینی کی درآمد رک گئی۔ اس وجہ سے سفید چقندر کی کاشت شروع ہو گئی

۱؎ ٹامپسن کی کتاب Napoleon Self Revealed ص ۲۷۴-۲۷۵۔

اور برطانیہ کے مقابلے میں فرانس کے پارچات کے لیے تحفظ کا انتظام کرکے لیونز کی صنعت ریشم بافی، نیز شمالی فرانس اور السّاس کے سُوتی کارخانوں کو عارضی طور پر خاصا نفع حاصل ہُوا۔ اس کے مقابلے میں سمندر پار کی تجارت کے زوال سے بوردو نیز فرانس کی دوسری اوقیانوسی بندرگاہوں پر گہری افسردگی طاری ہوگئی۔ پھر یہ مصیبت پیش آئی کہ خام روئی حاصل کرنا مشکل ہوگیا اور اس کی قیمت بہت بڑھ گئی، لہٰذا سُوتی پارچہ بافی کی ترقّی رُک گئی۔ بے روزگاری پھیل گئی۔ اگرچہ نپولین نے سُوتی پارچہ بافی کی اعانت کے لیے روپیہ خرچ کیا، مگر اس صنعت والوں کا دیوالا نکل گیا۔ بے شک برّاعظم میں فرانس کو نئی مُنڈیاں مل گئیں، مگر وہ سمندر پار پرانی منڈیوں کا نقصان پورا نہ کرسکیں، چنانچہ ۱۸۰۵ء اور ۱۸۱۳ء کے درمیان برآمدات فرانس کی قیمت میں ایک تہائی کی کمی ہوگئی۔

نپولین کے اس اقتصادی نظام نے برطانیہ کو قطعاً تباہ نہ کیا۔ برطانیہ کو بحری بیڑے اور تجارتی بیڑے میں نمایاں فوقیّت حاصل تھی۔ پھر اقتصادی انقلابات میں اس کے لیڈر بہت اچھے تھے، اس لیے وہ طوفان کا مقابلہ کرسکا۔ اگرچہ زرعی پیداوار میں سخت مشکلات رونما ہوئیں اور غذائی جنسوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ برطانوی تجارت و صنعت نپولین کے نقطۂ نگاہ سے حد درجہ خوشحال رہیں۔ جو تاجر اپنا مال باہر بھیجتے تھے، انھیں نہ صرف امریکہ میں نئی نفع بخش منڈیاں ملیں، بلکہ برّاعظم کے پُرانے گاہکوں کو بھی مال پہنچانے کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ وہ اپنا مال غیر جانبدار جہازوں پر لادلیتے اور اس پر ساختۂ فرانس کی جعلی مُہریں لگالیتے۔ نپولین کے پاس اتنی بحری قوّت نہ تھی کہ ناجائز درآمد کا انسداد سمندر میں کرسکتا اور ایسے دیانت دار افسر بھی موجود نہ تھے، جو پورے اہتمام سے بندرگاہوں میں ناجائز مال کی درآمد روک لیتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکا کہ ناجائز درآمد کے جس مال کا علم اسے فروخت کے بعد ہوتا، اسے ضبط کرکے فروخت کردیتا۔ اس طرح کُھلے بندوں اپنی ناکامی کا اقرار کرتا۔ مزید برآں فرانسیسی فوج برطانوی کارخانوں کی بعض چیزوں کے بغیر گزارہ ہی نہیں کرسکتی تھی، لہٰذا نپولین خود اپنے فرامین کے خلاف اختیار دے دیتا کہ برطانیہ کا کپڑا اور چمڑا وردیوں کے لیے خفیہ خفیہ حاصل کرلیا جائے۔

اس اقتصادی نظام نے غیر جانبدار طاقتوں اور نپولین کے حلیفوں کو یکساں مخالف بنادیا۔ فرانسیسیوں نے فرمانِ میلان کے مطابق ان امریکی جہازوں پر قبضہ کرلیا جو فرانسیسی بندرگاہوں میں موجود تھے۔ اس طرح امریکہ اور فرانس کے تعلّقات میں خطرناک کشیدگی پیدا ہوگئی۔ دس سال پیشتر کی بے اعلان جنگ کا احیاء صرف اس لیے رُکا رہا کہ برطانیہ نے بھی جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، ان سے امریکیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ برطانیہ امریکی ملاّحوں کو اس عذر کی بناء پر گرفتار کرلیتا تھا کہ وہ برطانوی بحری فوج کے معزورین ہیں اور امریکی چاہتے تھے کہ کینیڈا پر قبضہ کرلیں۔ یوں انگریزوں اور امریکیوں کے درمیان ۱۸۱۲ء میں ایک غیر فیصلہ کُن جنگ شروع ہوگئی جو ۱۸۱۴ء تک باقی رہی۔

سرکش قومیّت: ہسپانیہ

برّاعظم کے لیے اقتصادی نظام نے یورپ میں جو سیاسی اور فوجی نتائج پیدا کیے، وہ نپولین کی تاریخ میں ایک فیصلہ کُن اور تباہی خیز باب ہیں۔ اس باب کی ابتدا ۱۸۰۷ء میں ہوئی۔ جب یورپ کے آقا (نپولین) نے برطانیہ سے پرتگال کے اقتصادی تعلقات ناقابلِ برداشت قرار دے دیے۔ نپولین

نے پرتگال پر برّ اعظم کا اقتصادی نظام جبراً عائد کرنے کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کر دی کہ پرتگال ہسپانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم ہو جائے۔ ہسپانیہ کے حکمران نے اس سے اتفاق کر لیا۔ اسے قطعاً شبہ نہ ہُوا کہ نپولین اس طرح پرتگال کی مہم کو خود ہسپانیہ پر فرانس کے فوجی قبضے کا بہانہ بنائے گا۔ ۱۸۰۷ء میں پرتگال پر قبضہ ہُوا۔ آئندہ سال نپولین نے ہسپانوی شاہی خاندان کو میڈرڈ سے اپنے پاس بلا لیا اور اپنے بھائی جوزف کو ہسپانیہ کا بادشاہ بنا دیا۔ اس سلسلے میں نپولین نے جتنی تدابیر اختیار کیں — نااہل بوربونوں کی علاحدگی، غیر ملکی بادشاہ کا تقرر، برّ اعظم کے اقتصادی نظام کا جبری نفاذ، محکمۂ تعزیر مذہبی کا خاتمہ، امراء اور پادریوں کے حقوق میں تخفیف — وہ ہسپانوی روایات کے خلاف تھیں اور اس سے ہسپانوی قومیّت کا جذبہ مجروح ہُوا۔ چنانچہ ۱۸۰۸ء میں ناراضمند ہسپانویوں نے نپولین کے خلاف جنگ شروع کر دی۔

اس کے بعد "جزیرہ نما کی جنگ" شروع ہو گئی۔ یہ نام جو جزیرہ نمائے آئبیریا — ہسپانیہ و پرتگال — کی بناء پر رکھا گیا۔ ابتدا میں یہ معمولی سی کھجلی معلوم ہوتی تھی، مگر بہت جلد اس نے سلطنت نپولین کے جسم میں مہلک سرطان کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہسپانویوں نے چھاپہ ماری طور طریقے اختیار کر لیے۔ مثلاً وہ جا بجا فرانسیسی فوجوں کی گھات میں بیٹھ جاتے۔ کنوؤں میں زہر ڈال دیتے۔ برطانیہ نے جو مہم ان لوگوں کی امداد کے لیے بھیجی، اس نے برطانوی فوجی ضعف کا ہر تاثر درہم برہم کر ڈالا۔ اس فوج کی کمانداری پر سر آرتھر ویلیزلی مامور تھا، جو آگے چل کر ڈیوک آف ولنگٹن بنا۔ وہ قابل سپہ سالار تھا۔ برطانیہ سے ہر ضروری چیز فیاضانہ طریق پر بھیجی گئی۔ اس فوج کا مرکز پرتگال میں تھا اور سمندروں پر برطانیہ کی غیر متزلزل حکمرانی اس کی پشت بانی کر رہی تھی۔ نپولین نے جزیرہ نما کی مہم میں تین لاکھ سے زیادہ فوج بھیج دی، لیکن وہ برطانوی اور ہسپانوی افواج کو آسٹرلٹز یا جینا جیسی شکست نہ دے سکا۔ ۱۸۱۲ء میں مخالفوں کو نپولین پر فوقیت حاصل ہو گئی، جب وہ اپنی فوج روس پر حملے کے لیے لے گیا۔ ۱۸۱۳ء میں شاہ جوزف ہمیشہ کے لیے میڈرڈ سے نکل گیا اور ولنگٹن ہسپانیہ کو آزاد کرا چکنے کے بعد سرحد عبور کر کے جنوبی فرانس میں داخل ہو گیا۔

سرکش قومیّت: جرمنی

نپولین کے سامراج نے جرمنوں میں بھی قومی روح بیدار کر دی، اگرچہ وہ روایتی اعتبار سے تفرقہ زدہ تھے۔ جرمن رومانیت کے علمداروں نے نئی قومیّت کی ثقافتی بنیادیں رکھ دی تھیں، کیونکہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے جرمن ادب کی مدح و ستائش کرتے رہے اور پرانے جرمن بہادروں — مثلاً فریڈرک اعظم، شارلمین اور آرمینیس[۱] — کو زیادہ سے زیادہ بلند حیثیت میں پیش کرتے رہے۔ آرمینیوں کی ستائش بطور خاص کی جاتی تھی، کیونکہ تاریخی آرمینیس نے قیصر آگسٹس کی فوجوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے دریائے رھائن کے پار پہنچا دیا تھا اور امید تھی کہ آرمینیس اٹھے گا اور نئے قیصر (نپولین) کو بھی باہر نکال دے گا۔ فرانسیسی زبان اور فرانسیسی ثقافت نے دورِ تنویر میں جرمنی پر جو برتری حاصل کر لی تھی، اہل علم نے اس کے خلاف زبردست مہم کا انتظام کیا۔ جوہن گرم[۲] اور اس کے بھائی

۱ـ Arminius

۲ـ Johann Crimm

ولہیلم[1] نے ۱۸۱۲ء میں "پریوں کی کہانیاں"[2] نام ایک کتاب شائع کی، جو بے حد ہر دلعزیز ہوئی اور یہ ہر اعتبار سے جرمن تھی۔ پھر انھوں نے لسانی تحقیقات (فقہ اللغت) کی بنیاد رکھ دی، جس کا مدعا یہ تھا کہ جرمن زبان کی حقیقی برتری سب پر آشکارا ہو جائے۔ فشٹے[3] فلسفی نے برلین میں حُبّ وطن سے لبریز جلسے دیے، جن کا عنوان تھا "جرمن قوم[4] سے خطابات" (۱۸۰۷ء، ۱۸۰۸ء)۔ ان میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اصل زبان صرف جرمن ہے اور وہی شمالی افلاطونی زبان ہے۔ جرمن قوم ہی دنیا کی قدیم ترین اور عظیم ترین قوم ہے۔ اسی کو حقیقتاً برگزیدہ قوم سمجھنا چاہیے۔

نپولین کو جرمن قومیت کا اثر محسوس ہونے لگا تھا، جب ۱۸۰۹ء میں آسٹریا شریک جنگ ہو گیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہیبسبرگ شہنشاہی نے پوری قوم کو حرکت میں لانے کی کوشش کی۔ یہ ویسی ہی کوشش تھی جیسی فرانسیسی کنونشن نے ۱۷۹۳ء میں کی تھی۔ چنانچہ فوجی خدمت کے قابل تمام نوجوان بلا لیے گئے اور فرانسیسیوں کے خلاف باقاعدہ نغمہ وسرود کا انتظام کیا گیا۔ نئے جوش وخروش کے باوجود آسٹریا نے جنگ میں شکست کھائی اور بارہ سال کی مدت میں چوتھی مرتبہ نپولین کی تجویز کردہ شرطوں پر سر جھکا دیا۔ ۱۸۰۹ء میں شون برون[5] کا معاہدہ ہوا۔ اس کے مطابق آسٹریا سے اللیلیا کے صوبے لے لیے گئے اور آسٹریا کے پولستانی علاقوں میں سے گلیشیا[6]، وارسا کی گرانڈ ڈچی میں شامل کر دیا گیا۔ فرانسس دوم نے اپنی بیٹی کی شادی نپولین سے کر دی اور اس کا شکست خوردہ ملک فرانس کا نارضامند حلیف بن گیا۔ اس کے بعد جرمنی کے احیا میں علمبرداری کا منصب پروشیا کو مل گیا۔

ینا اور ٹلسٹ کی خوف ناک ناکامیوں نے پروشیا کو اس خواب غفلت سے بیدار کر دیا، جو فریڈرک اعظم کی وفات (۱۷۸۶ء) سے اس پر طاری ہو چکا تھا۔ ۱۸۱۰ء میں برلین کی نئی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ فشٹے اور جرمن قومیت کے دوسرے داعی وہاں پہنچ گئے۔ اگرچہ شاہ فریڈرک ولیم سوم بے رنگ سا بادشاہ تھا، مگر وہ قابل سالاروں اور مدبروں کو بروئے کار لایا۔ جنرل شارن ہورسٹ[7] نے، جو فوجی افسروں کے ایک طبقے کا رئیس تھا، فوج کی صلاحیت اور ہمت وحوصلہ میں اضافہ کیا۔ انھوں نے طبقہ بندی کے وہ قاعدے منسوخ کر دیے، جو بدیہی طور پر خلاف انسانیت نظر آتے تھے اور تمام طبقوں کے لیے فوجی خدمت لازم قرار دے دی۔ تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقوں کو پہلے چھوڑ دیا گیا تھا، اب انھیں بھی فوجی خدمت میں شامل کر لیا گیا۔ نپولین نے پروشیا کے لیے سپاہیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد بیالیس ہزار رکھی تھی۔ اس پابندی سے بچنے کی تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ ایک طبقے کو کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ فوجی تربیت دے دی جاتی، پھر انھیں الگ کر کے رنگروٹوں کے دوسرے گروہ کو لے لیا جاتا۔ ۱۸۱۳ء میں پروشیا میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آدمی تربیت پا چکے تھے، جنھیں فوراً جنگ میں بھیجا جا سکتا تھا۔

۱ـ Willheim ۲ـ Fairy Tale ۳ـ Fsichte

۴ـ Addresses to the German Nation ۵ـ Schonbrunn ۶ـ Galicia

۷ـ Scharnhorst

پروشیائی مملکت کی عمرانی اور انتظامی تنظیمِ نو کی روحِ رواں شٹائن[1] تھا، یعنی بیرن شٹائن، جو اُمرائی طبقے کا ایک روشن خیال فرد تھا۔ شٹائن نے طبقۂ اوسط کو شہروں اور قصبوں میں کسی قدر خود اختیاری حکومت دے کر راضی کر لیا، البتہ عدل اور پولیس میں مملکت کا ضبط و نظم بحال رہا۔ کسانوں کی اصلاح کے لیے شٹائن نے ۱۸۰۸ء میں فرمان جاری کیا، جس کے مطابق زرعی غلامی منسوخ کر دی گئی، مگر اس سے پورا زرعی مسئلہ حل نہ ہُوا، کیونکہ اس فرمان نے نہ تو جنکروں کی بڑی بڑی جاگیریں توڑیں، نہ آزاد زرعی غلاموں کے لیے زمینیں مہیا کیں، نہ عدل کے لیے وہ جاگیردارانہ حقوق ختم کیے، جو جنکروں کو کسانوں پر حاصل تھے۔
شٹائن اور اس کے ہمسروں نے نظامِ قدیم کی صرف بدترین خرابیاں حذف کیں اور حقیقی اختیار و اقتدار وہیں رہنے دیا، جہاں پہلے سے چلا آ رہا تھا، یعنی بادشاہ، فوج اور امراء کے پاس۔ گو ہوہینزولرن خاندان کی مملکت میں چنداں اصلاح تو نہ ہوئی، البتہ اس میں فریڈرک ولیم اوّل اور فریڈرک اعظم کی روایت بحال ہو گئی۔

۱۸۱۲ء اور بعد کے واقعات

جرمن قومیت میں نپولین کے خلاف پورا جوش اس وقت پیدا ہُوا، جب ۱۸۱۲ء میں فرانسیسی فوج روس کے اندر تباہ ہو گئی۔ ۱۸۰۷ء کے بعد فرانسیسیوں نے جو اقدامات کیے، ان سے زار الیگزانڈر کو جلد یقین ہو گیا کہ نپولین نے ٹلسٹ میں جو وعدہ کیا تھا، اس کا پابند رہنے پر آمادہ نہیں، بلکہ مشرقی یورپ میں روسی حلقۂ اثر کے اندر قدم رکھ رہا ہے۔ ۱۸۰۹ء میں فرانس نے آسٹریا سے اللیریا کے صوبے لے لیے تھے۔ اس سے یہ ناخوشگوار تاثر پیدا ہُوا کہ فرانس بلقان پر اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے۔ پھر گلیشیا آسٹریا سے لے کر وارسا کی گرانڈ ڈچی کو دے دیا گیا۔ یہ شبہ قوی ہو گیا کہ نپولین کا یہ باجگزار آئندہ روس سے پولستانی علاقے واپس لینے کا مدعی بن جائے گا۔ اس اثنا میں نپولین برابر کوششیں کرتا رہا کہ روس میں بھی برِ اعظم کا اقتصادی نظام جاری ہو جائے۔ اس وجہ سے الیگزانڈر کے غصے کی آگ تیز تر ہو گئی، جب فرانسیسیوں نے شمالی و مغربی جرمنی کے علاقے لے لیے، تو زار کی آنکھوں سے پردہ بالکل اُٹھ گیا، کیونکہ اس طرح اولڈن برگ[2] کی مملکت بالکل محو ہو گئی، جہاں زار کا ایک رشتہ دار حکمران ڈیوک تھا۔
روس پر حملے کے لیے نپولین نے تقریباً پانچ لاکھ آدمی جمع کیے۔ ان سپاہیوں میں سے اکثریت غیر فرانسیسیوں کی تھی، جنھیں ایک اجنبی آقا نے خلافِ مرضی بھرتی کر لیا تھا۔ اس عظیم القدر فوج کی رسد کا سلسلہ تقریباً شروع ہی میں درہم برہم ہو گیا اور روسیوں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے ہر چیز تباہ کر دینے کی جو پالیسی اختیار کی تھی، اس کے بعد گزارے کی بظاہر کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ اس فوج نے مشرق کی طرف پیشقدمی شروع کی تو نپولین کے ایک رفیق نے لکھا:

"وہاں کوئی باشندہ نہیں ملتا تھا۔ کوئی قیدی بھی نہیں تھا۔ اکا دکا راہ گم کردہ آدمی بھی ناپید تھے۔ ہم روس کے آباد حصوں کے عین قلب میں تھے، لیکن ہماری حیثیت اس جہاز کی سی تھی، جو وسیع سمندر کے وسط میں ہو اور اس کے پاس قطب نما

---

[1] Stein
[2] Oldenburg

نہ ہو۔ اُسے یہ بھی علم نہ ہو کہ گردوپیش کیا ہو رہا ہے۔[1]

نپولین چلتے چلتے ماسکو پہنچ گیا، مگر روسیوں پر کوئی کاری ضرب لگانے کا موقع نہ پا سکا۔ اس نے پانچ ہفتے (ستمبر۔ اکتوبر ۱۸۱۲ء) اس شہر میں گزارے، جسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس امید خام میں مبتلا رہا کہ زار الیگزانڈر صلح پر آمادہ ہو جائے گا۔ روسیوں کے تمرد اور رسد کی قلت نے اسے مراجعت پر مجبور کر دیا، جس نے آگے چل کر ایک کابوس کی شکل اختیار کر لی۔ سپاہیوں کے پاس نہ ضرورت کے مطابق کپڑے تھے، نہ کہیں اطمینان سے رات گزار لینے کا انتظام تھا، نہ خوراک کا سامان کافی تھا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ واپس ہوتی ہوئی فرانسیسی فوج کے متفرق دستوں پر روسی جیش حملہ کر دیتے تھے۔ سرما کا حملہ سب سے بڑھ کر مہلک تھا۔ سپاہیوں نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ مراجعت میں فوج کا ایک چوتھائی سے بھی کم حصہ زندہ بچا۔ باقی فوجی یا تو قید کر لیے گئے، یا زخموں، بھوک، بیماری اور برفباری کے باعث تباہ ہو گئے۔

برطانیہ نے سب سے پہلے نپولین کا کامیاب مقابلہ کیا تھا۔ مثلاً ٹریفالگر میں، نیز اقتصادی میدان ہائے جنگ میں، پھر ہسپانویوں نے مزاحمت کی۔ سب سے آخر میں روسی مقابلے پر اترے۔ ۱۸۱۳ء تک یورپ کی تقریباً ہر قوم فرانسیسیوں کے خلاف آخری اتحادی جمعیت میں شامل ہو گئی۔ نپولین نے چار لاکھ کی نئی فوج فراہم کر لی، لیکن جو سامانِ جنگ وہ روس میں ضائع کر چکا تھا، اس کا بدل مہیا کرنا سہل نہ تھا۔ اکتوبر ۱۸۱۳ء میں بمقام لیپزگ (سیکسنی) وہ جنگ ہوئی، جو "جنگ اقوام"[2] کے نام سے مشہور ہے۔ اپریل ۱۸۱۴ء میں اتحادی جمعیت کی فوجیں پیرس پر قابض ہو گئیں۔ شہنشاہ تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا اور ایلبا[3] نام ایک چھوٹے سے جزیرے میں، جو اطالوی ساحل سے زیادہ دور نہیں، عزت مندانہ جلاوطنی کی زندگی شروع کی۔

فاتح اتحادی جمعیت کے مدبر دی آنا میں جمع ہوئے تاکہ صلح کی شرطیں طے کر لیں۔ بوربون پھر فرانس پہنچ گئے، لوئی شانزدہم کا چھوٹا بھائی لوئی ہیژدہم فرانس کا بادشاہ بن گیا۔ اسے احساس تھا کہ نظام قدیم کو بالکلیہ بحال نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ۱۸۱۴ء میں ایک منشور کے ذریعے سے دستوری بادشاہی قائم کر دی گئی، مگر جو لوگ مدت کی جلاوطنی کے بعد واپس آئے تھے، وہ ایسی دانشمندی و دُور اندیشی نہ دکھا سکے۔ انھوں نے انقلاب اور اس کے تمام کاموں کے خلاف سفید فام دہشت و وحشت کا نیا دُور شروع کر دیا۔ یکم مارچ ۱۸۱۵ء کو بونا پارٹ نے جرأت افزائی کا آخری کارنامہ انجام دیا۔ یعنی وہ فرانس کے جنوبی ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔

ایک سو دن کے لیے سلطنتِ فرانس از سرِ نو زندہ ہو گئی اور نپولین ۲۰ مارچ ۱۸۱۵ء کو دوبارہ پیرس میں داخل ہو گیا۔ شہنشاہ نے پھر ایک مرتبہ فرانسیسیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اس مرتبہ وعدہ کیا حقیقی لبرل نظام قائم کیا جائے گا،

۱؎ کالنکور (Caulincourt) کی کتاب With Napoleon in Russia (نپولین کے ساتھ روس میں)، ص ۶۲ +

۲؎ Battle of the Nation ۳؎ Elba

مگر اس وعدہ کے ایفا کی نوبت ہی نہ آئی۔ کیونکہ ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو برطانوی فوج نے ولنگٹن کے ماتحت اور پروشیائی فوج نے بلیشر[ل] کے ماتحت واٹرلو کے میدان میں آخری ضرب لگادی۔ نپولین کو پھر جلاوطن ہونا پڑا۔ اس مرتبہ اسے برطانیہ پر ایک دُور افتادہ جزیرے سینٹ ہلینا بھیج دیا گیا، جو جنوبی اوقیانوس میں واقع ہے۔ وہیں ۱۸۲۱ء میں عارضۂ سرطان سے اس نے وفات پائی۔

انقلاب اور نپولین کی میراث

بونا پارٹزم بھی ۱۸۱۵ء یا ۱۸۲۱ء میں نہیں مری، جس طرح اس سے پیشتر رومۂ قدیم کی قیصریت ۱۵ مارچ ۴۴ء ق م کو سیزر کی موت کے ساتھ نہیں مری تھی۔ نپولین کے متعلق ایک افسانہ پیدا ہوا، جس میں اس کی خطاؤں اور ناکامیوں کو نظر انداز کر دیا گیا اور اسے ایسا رنگ دے دیا گیا، گویا وہ حُبِّ وطن اور روشن خیالی کا محافظ تھا۔ یوں ۱۸۴۸ء میں دوسرے نپولین کے لیے راستہ ہموار کیا گیا۔ یہ افسانہ مشاہیر پرستی اور جنگجویانہ قومیت کے لوازم کے ساتھ اس میراث کا ایک عنصر تھا، جو انقلاب اور نپولین کے فرانس نے پیچھے چھوڑی۔ ایک اور، مگر زیادہ طاقت ور عنصر بڑا انقلابی اصول تھا، یعنی حریت، مساوات اور اخوت۔ یہ اصول زندہ رہا۔ اس نے آگے چل کر فرانس اور دوسرے ملکوں میں جیکوبنوں کی نسلوں میں روحِ حیات پھونکی اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زیرِ غور اصول کی بناء پر فرانسیسیوں کو ۱۸۱۵ء میں حریت، مساوات اور اخوت کا وہ درجہ حاصل تھا جو ۱۷۸۹ء سے پیشتر کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔

کوئی شبہ نہیں کہ کوہستانیوں نے جو لوگ بغرضِ احتساب بیرونی اضلاع میں بھیجے تھے، ان کی وجہ سے نیز نپولین کے احتسابات اور پھر اُن کے بھیجے حاکموں کی وجہ سے مطلق العنانی کی پرانی روایات اور حکومت میں مرکزیت کے رجحان کو نئی قوت مل گئی، مگر انقلاب نے آزادی کی ایک نئی اور قوی روایت قائم کردی۔ طبقۂ اوسط نے فرسودہ پابندیوں سے آزادی حاصل کرلی۔ پروٹسٹنٹوں، یہودیوں اور دوسرے آزاد خیال لوگوں سے فرانس میں نیز فرانس کے زیرِ اقتدار علاقوں میں رواداری کا برتاؤ ہونے لگا تھا۔ یقیناً ۱۸۱۵ء میں فرانسیسی ادارے آزاد خیالی کے اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں پہنچے تھے، جن کا اظہار اعلانِ حقوقِ انسانی میں کیا گیا تھا، مگر نصب العین قائم ہو چکے تھے اور انیسویں صدی میں فرانس کی داخلی تاریخ کا خاص موضوع یہی تھا کہ ان نصب العینوں تک پہنچنے کی سرگرم کوششیں جاری رہیں۔

حقوقِ انسانی کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ انسان آزاد اور مساوی حقوق لے کر پیدا ہوئے۔ سیاسی مساوات اس وقت حاصل نہ ہوئی، جب تک فرانس کے اندر ۱۸۴۸ء میں تمام بالغوں کو حقِ رائے نہ مل گیا۔ دوسرے نقطہ ہائے نگاہ کے انقلابی حکومتوں اور نپولین کے نظام نے مساوات کے وسیع پیمانے قائم کر دیے۔ محاصل کے یکساں عائد کرنے کا اصول نافذ ہو گیا۔ پادریوں اور امراء کی جاگیریں توڑ دی گئیں۔ چھوٹے اور بڑے کاروباری آدمیوں کے راستے کی ممانعتیں دور کر دی گئیں۔ اس طرح طبقۂ عوام کے زیادہ بڑے حصے کے لیے اقتصادی مواقع سے شادکام ہونے کا انتظام ہو گیا۔ نظامِ قدیم میں بدترین قسم کی قانونی اور عمرانی نامساواتیں موجود تھیں۔ مجموعۂ نپولین نے ان سب کو اتنا گہرا دفن کر دیا کہ پھر انھیں نکال لینے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ نپولین نے جو یہ کہا تھا تو بڑی حد تک درست تھا:

فرسٹ کونسل یا شاہنشاہ کی حیثیت سے میں صرف عوامی حکمران تھا۔ میں نے قوم کی خاطر

ل Blucher

اور اس کے مفاد کے مطابق حکومت کی اور بعض لوگوں کے ذاتی مفاد یا چیخ پکار سے متاثر ہو کر کبھی اِدھر اُدھر منحرف ہونا گوارا نہ کیا۔

....

مساوات کے جو تصورات انقلاب کے موجب بنے تھے، وہ آج حکومت کی استواری کے لاینفک اجزا ہیں۔ آج حکومت پر بے اتحادی پیدا نہیں ہوتی تو وجہ یہ ہے کہ کسی کو ترجیحی سلوک کا نہ شبہ ہے اور نہ توقع۔ نیز کسی خاص گروہ پر نوازش کی کوئی وجہ بھی حکومت کے سامنے نہیں۔ تمام معاملات میں حکومت کے عدل پر عوام کا اعتماد کامل اس کے لیے اختیارات کے برابر اقتدار بھی مہیا کر دیتا ہے میری کامیابی کا راز اس کے سوا کچھ نہیں[1]

انقلاب اور نپولین نے اخوت کو آئینی حیثیت میں ترقی دی کیونکہ تمام فرانسیسیوں کو قانون کی نظر میں یکساں بنا دیا۔ وسیع تر پیمانے پر مساوات کی پیشبرد کا انتظام یوں ہُوا کہ قومیت کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ فرانسیسیوں کی زیادہ سے زیادہ اجتماعی زندگی پر زور دیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہیں۔ فرانسیسی قومیت ۱۷۸۹ء سے پیشتر بھی موجود تھی۔ جون آو آرک، ہنری چہارم اور کولبرٹ اپنے اپنے زمانے میں نہایت اچھے قوم پرور لوگ تھے لیکن نیا اور اعلیٰ درجے کا قومی عقیدہ کنونشن نے ۲۲۔ اگست ۱۷۹۳ء کے حکم نامہ کے ذریعے سے پیدا کیا، جب کہ وہ پوری فرانسیسی قوم کو جنگ کے لیے حرکت میں لایا گیا۔ نپولین کی سلطنت نے ثابت کر دیا کہ قومیت نہایت آسانی سے حد درجہ غیر معمولی پیمانے پر نہایت غیر معمولی حیثیت کے سامراج کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ انقلاب اور نپولین کے فرانس نے تمام انسانوں کی اخوت کا تصور تو شاید ہی کیا ہو، جو تمام قومیتوں سے بالا تھا۔ ان کے نزدیک تمام انسان صرف اس وقت تک بھائی تھے، جب تک وہ فرانسیسیوں کی قیادت قبول کرتے جاتے۔

الیکسس دے توکویل جمہوریت کا بڑا فرانسیسی داعی تھا۔ اس نے تقریباً ایک سَو سال پیشتر لکھا تھا:

> انقلاب فرانس سیاسی انقلاب تھا... جو اپنے عمل اور وضع میں مذہبی انقلاب سے مشابہ تھا۔ اس میں مذہبی تحریک کے تمام اوصاف و خصائص موجود تھے۔ یہ دوسرے ملکوں میں صرف پھیلا ہی نہیں، بلکہ باقاعدہ دعوت اور پروپیگنڈے کے ذریعے سے پہنچایا گیا۔
>
> اس نے ایسے جذبات کو انگیخت دی، جو کسی سخت سے سخت سیاسی انقلاب نے بھی پیدا نہیں کیے تھے.... اسی وجہ سے اس پر مذہبی انقلاب کا رنگ چڑھ گیا، جس سے معاصرین پر دہشت طاری ہو گئی.... یا کہنا چاہیے یہ بجائے خود ایک نیا مذہب بن گیا۔ مگر ناقص مذہب،

---

[1] کالنکور (Caulincourt) کی کتاب With Napoleon in Russia (نپولین کے ساتھ روس میں) ص ۳۶۴۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔

جس میں نہ خدا کے لیے کوئی جگہ تھی، نہ عبادت کے لیے اور نہ آخرت کی زندگی کے لیے۔ بہ ایں ہمہ اس نے بھی اسلام کی طرح اپنے سپاہی، اپنے داعی اور اپنے شہید رُوے زمین کے میدانوں میں بکھیرے[1]

اس کے ابتدائی حامی سخت انتہاپسند تھے۔ مثلاً رابسپیئر اور جیکوبن۔ بعد کے داعیوں — تھرمیڈور اور برمیڈور میں کام کرنے والے — نے عملیت و اعتدال کے پیش نظر عقیدے میں تھوڑی سی ترمیم کر لی۔ نپولین کے ہاتھ میں انقلاب ایک غیر کلیسائی مذہب بن رہا جس کا تقاضا یہ تھا کہ سیاسی آرتھوڈکسی سے خفیف سا انحراف بھی واجب التعزیر ہے۔ چنانچہ لُوئی بونا پارٹ شاہ ہالینڈ کو سزا دی گئی اور ہم آئندہ باب میں دیکھیں گے کہ ۱۸۱۵ء کے بعد انقلاب فرانس کے سپاہی۔ داعی اور شہید رُوے زمین کے میدانوں میں پہنچتے رہے۔

---

[1] توکویلی کی کتاب The State of Society in France before the Revolution (۱۷۸۹ء کے انقلاب سے پیشتر فرانس میں معاشرے کی حالت) تیسرا ایڈیشن ص ۹ - ۱۱۔

انقلاب اور جوابی انقلاب

(۱۸۱۵ء — ۱۸۵۰ء)

سترھواں باب

رومانی احتجاج

تمہید زوالِ نپولین کے بعد مغربی دنیا کی نصف صدی کی تاریخ اہم واقعات سے لبریز ہے۔ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان صنعتی انقلاب حدِ بلوغ پر پہنچ گیا۔ اشتراکیت کے موجودہ نظریات نے جنم لیا۔ ڈارون نے سائنس میں بڑا انقلاب پیدا کردیا۔ حقیقت پسند مصنّفوں اور فنکاروں نے ثقافت میں بڑے بڑے تغیرات کا دروازہ کھول دیا۔ سیاسیات پر نظر ڈالی جائے تو اس دَور میں برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جمہوریت کے عملی قیام کی طرف بالاستقلال پیش قدمی کی۔ اٹلی اور جرمنی میں قومی اتحاد تکمیل پر پہنچ گیا۔ یہ تمام بڑے بڑے واقعات جو انیسویں صدی کے وسط میں ہی نمایاں ہو چکے تھے، آخری منزل پر ۱۸۷۰ء یا اس سے فوراً بعد پہنچے۔ تاریخی ترتیب کے علاوہ پیشکش کی وضاحت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہم ان واقعات پر مفصّل بحث متاخر ابواب —— صنعت کاری کا اثر دقیانوسی جمہوریتوں کے نشوو ارتقا پر، اٹلی اور جرمنی کا اتحاد، ڈارون اور حقیقت پسندوں کا ذہنی انقلاب —— پر ملتوی کردیں۔ زیرِ نظر باب میں ہماری توجہ سیاسیات و ثقافت کے تعامل پر مرتکز رہے گی، خصوصاً ۱۸۱۵ء کے فوراً بعد کے دَور میں براعظم یورپ کے اندر۔

یورپی تاریخ کے اس دَور میں ایک ضروری حقیقت "ردِّ عمل" اور "جوابی انقلاب" کی اصطلاحات میں سامنے آتی ہے۔ ۱۸۱۵ء تک یورپ انقلاب فرانس کے خلاف بھی سخت ردِّ عمل میں مصروف تھا، کیونکہ اسی کی وجہ سے نپولین بروئے کار آیا اور یہ ردِّ عمل عہدِ تنویر کے بھی خلاف جارہا تھا، کیونکہ اسی کی وجہ سے انقلاب برپا ہوا تھا۔ دورِ تنویر کے خلاف ردِ عمل نے رومانی تحریک کی شکل اختیار کی۔ رومانی مصنّفوں اور فنکاروں کا احتجاج اٹھارھویں صدی کی عقلیت کے خلاف تھا، جسے ہمہ گیر قوت کی حامل سمجھ لیا گیا تھا۔ انھوں نے ایمان، جذبات، روایات اور دوسری قدروں کی حمایت کی جنھیں دورِ عقلیت میں ٹھکرادیا گیا تھا۔ سیاسی جوابی انقلاب وی آنا کی کانگرس میں زیادہ نمایاں ہوا (۱۸۱۴ء – ۱۸۱۵ء) جہاں نپولین کے خلاف آخری اتحادی جمعیت کے لیڈروں نے یورپ کی قوتوں میں نیا توازن پیدا کیا اور ان انقلابی اصول پر خطِ نسخ کھینچ دیا، جن کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کا توازن درہم برہم ہوا تھا۔ مختلف سیاسی لیڈروں اور اکثر رومانیت نوازوں کے اندازے کے مطابق عقلیت اور قانون طبیعی نے ترقی کی طرف رہنمائی نہیں کی تھی، بلکہ یہ دونوں چیزیں دورِ دہشت و وحشت، محاربات نپولین اور سامراج کا موجب بن گئی تھیں۔

تاہم ۱۷۸۹ء کی روح ۱۸۱۵ء کے بعد بھی قائم رہی۔ ردِّ عمل کے بعد دوسری بڑی چیز انقلاب کا تواتر ہے۔ اگرچہ ۱۸۱۵ء میں انقلاب کی مخالف قوتیں غلبہ پا چکی تھیں اور رومانیت کی طرف سے قدیم روایات کے احترام کی دعوت جاری تھی،

مگر آزاد خیالی اور قوم پروری کو بھی فروغ حاصل رہا۔ اس وجہ سے از سرِ نو انقلابات پیدا ہوئے۔ مثلاً انیسویں صدی کے تیسرے عشرے، ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۸ء کے انقلابات، لیکن ان میں سے کوئی بھی ویسا خوفناک نہ تھا، جیسا ۱۷۸۹ء کا ہنگامہ تھا۔ بایں ہمہ صورتِ حال میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور پیدا ہوا۔

رومانی دور

عقلیت کے خلاف رومانی احتجاج نے انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں پوری قوت حاصل کی ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۰ء کے زمانے کو عموماً "رومانی" زمانہ قرار دیا جاتا ہے، مگر حقیقتاً دورِ تنویر کے خلاف ردِّ عمل، جس سے رومانی تحریک پیدا ہوئی، ۱۷۵۰ء کے بعد شروع ہو چکا تھا۔ مذہب میں ویسلے اور "حامیانِ تقویٰ" نے فلسفیوں کی فطرت پسندی کو چیلنج دے دیا تھا۔ روسو نے عقل کو نہیں، ضمیر کو انسانیت کا حقیقی رہنما قرار دیا۔ ہیوم نے عقل سے نہیں انسانوں کے جذبات و مالوفات سے اپیل کی۔ کانٹ نے مثالیت اور دائمی حقائق کی برتری پر زور دیا۔ پھر ۱۷۹۰ء میں ایڈمنڈ برک اٹھا، جو رومانیت کا سب سے بڑھ کر قدامت پسند سیاسی فلسفی تھا۔ فلسفیوں کا عام شیوہ یہ تھا کہ نیوٹن کے سائنس کے سادہ ریاضیاتی قوانین پیش کرتے رہتے تھے۔ برک نے انتہائی صفائی سے ان کی یہ دلیل انھیں کے خلاف پلٹ دی۔ اس نے کہا کہ طبعی حقوق:

> "..... نورانی کرنوں کی طرح عام انسانی زندگی میں داخل ہوتے ہیں، جو دبیز واسطے کو چھیدتی ہوئی اندر داخل ہو جاتی ہیں، مگر قانونِ فطرت کے مطابق وہ خطِ مستقیم سے منعطف کر دی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی جذبات و مالوفات کے رلے چلے اور پُر پیچ انبار میں انسانوں کے ابتدائی حقوق اس گوناگوں انعطافات اور انعکاسات کا تختۂ مشق بنتے ہیں، جس کے بعد یہ کہنا لا کل جہل رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی سمت میں بدستور جاری ہیں۔ انسانی فطرت پیچیدہ ہے۔ معاشرے کے مقاصد زیادہ سے زیادہ مختلف الاجزاء اور پیچ در پیچ ہیں[۱]
> ......"

ادبیات: عقلیت کے خلاف بغاوت

رومانی احتجاج کا مطالعہ سب سے بڑھ کر ادبیات میں کیا جا سکتا ہے اٹھارھویں صدی کے وسط تک انگلستان و فرانس میں، ایسے ناول فروغ پا رہے تھے، جن کا موضوع جذبات اور فرض تھا۔ مثلاً رچرڈ کا ناول کلاریسا اور روسو کا ناول "ہیلوئز جدید"[۲]۔ اٹھارھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں جرمنی کی ادبی دنیا میں ایک تحریک رونما ہوئی، جسے "طوفان و فشار"[۳] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] برک کی کتاب Reflection on the Revolution in France [۲] Norvella Heloise

[۳] جرمن Storm and Drang (Storm and Stress)

یہ تحریک اس نام کے معمولی ڈرامے سے پیدا ہوئی، جس کا مصنف ایک غیر معروف ڈرامہ نگار تھا۔ اس ڈرامے کا ہیرو کسی جگہ جم کر رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ یورپ چھوڑ کر امریکہ چلا گیا، تاکہ وہاں کی انقلابی جنگ میں شریک ہو سکے:

"میں نے سب کچھ بننے کی کوشش کی۔ مزدوری بھی کرتا رہا۔ کوہستان الپس میں بکریاں چرائیں۔ دن اور راتیں آسمان کے سائبان کی بے حد و نہایت وسعت میں گزاریں۔ ہوائیں میرے جسم کو ٹھنڈک پہنچاتی رہیں، لیکن میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ مجھے کہیں امن نہ ملا۔ میں نے کہیں چین نہ پایا۔ دیکھیے میں اس طرح جذبہ و قوت سے لبریز ہو گیا اور چاہا کہ اس آگ سے نجات حاصل کروں۔ میں ایک رضا کار کی حیثیت سے مہم میں شریک رہا ہوں۔ وہاں میری روح کو بالیدگی حاصل ہو گی۔ اگر وہ لطفاً مجھے گولی مار دیں گے تو اس سے بہتر کیا ہو گا؟"[1]

"طوفان و فشار" کی یہ بے چینی اور دلسوزی "رنجہائے[2] ورتھر نوعمر" میں خصوصیت سے نمایاں ہوئی؛ جو نوجوان گوئٹے کا ایک حد درجہ ہر دلعزیز اور غم انگیز مختصر سا ناول تھا۔ نپولین جیسے حقیقت پسند کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ میں نے یہ ناول سات مرتبہ پڑھا اور ہر مرتبہ ہیرو کی خودکشی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

خود گوئٹے (۱۷۴۹ء - ۱۸۳۲ء) بھی، جس نے رومانی دور میں بے شمار چیزیں لکھیں، محض رومانی نہ تھا۔ بعض اعتبارات سے وہ اٹھارہویں صدی کا ایک کامل الفن مفکر تھا، جسے طبیعیات سے گہری دلچسپی تھی۔ ویمر کی چھوٹی سی جرمن ریاست کی روشن خیال فضا میں اطمینان و آسائش کی زندگی بسر کی؛ انقلاب فرانس اور نپولین جیسے مسائل سے بھی بالکل الگ تھلگ رہا، حالانکہ یہ وقت کے بہت اہم مسائل تھے۔ تاہم رومانی قدریں اس کی سب سے بڑی تصنیف میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، یعنی "فاؤسٹ" میں جسے اکثر اصحاب جرمن زبان کی سب سے بڑی تصنیف قرار دیں گے۔ "فاؤسٹ" کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی، جب گوئٹے عمر کے تیسرے عشرے میں تھا۔ یہ طویل منظوم ڈرامہ رسمی لحاظ سے ڈراما نہ تھا، بلکہ یورپی فکر کی بڑی بڑی لہروں پر ایک فلسفیانہ انتقاد تھا۔ عام روایت کے مطابق فاؤسٹ ایک سن رسیدہ آدمی تھا، جو کتابی علوم سے تنگ آ گیا۔ دائمی شباب کے لیے وہ ترس رہا تھا۔ اس نے اپنی روح شیطان کے پاس فروخت کر دی۔ معاوضے میں ایک مقررہ وقت کے لیے جوانی کی لذت سے لطف اندوز ہوا۔ آخر دہشت زدگی کے عالم میں دوزخ جاوید کی نذر ہو گیا۔ گوئٹے نے اس افسانے کی صورت بدل دی۔ بیشک فاؤسٹ کو علمی مشاغل بے سود نظر آئے اور ابتدا میں اس نے جو اچھا تصور قائم کر رکھا تھا، وہ بے بنیاد ثابت ہوا:

---

[1] کلنگر (Klinger) کی کتاب "طوفان و فشار"۔

[2] Sorrows of Young Werther

".......تمام نظریے زرد ہیں،
صرف زندگی کا شجرِ زرّیں سرسبز ہے[1]"

فاؤسٹ نے شیطان سے معاہدہ کرلیا، لیکن آخر وہ اس وجہ سے بچ گیا کہ اسے احساس ہُوا، ذاتی اغراض کو دوسروں کی بہبود کے لیے قربان کردینا چاہیئے۔ چنانچہ وہ انسانیت کے فائدے کے لیے دلدلوں سے پانی نکالتا ہُوا مرا۔ اپنے کیے سے توبہ کرچکا تھا اور اسے نجات کا یقین ہوچکا تھا۔ یہ ڈراما انسان کے گناہ، سعی وجہد اور کفارے پر مشتمل تھا، اس لیے اسے ازمنۂ وسطیٰ کی آخری بڑی نظم قرار دیا گیا۔

پوری رومانی تحریک کا ممتاز ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں ازمنۂ وسطیٰ کی طرف عود کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ کیفیت ہم آگے چل کر دیکھیں گے، فی الحال ہمیں عقل کے خلاف رومانی احتجاج پر تبصرہ جاری رکھنا چاہیئے۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد اوائل میں یورپ کے اندر رومانی مصنّف "طوفان وفشار" سے مسحور ہوگئے اور انھوں نے کلاسیکی روح کے خلاف بغاوت کردی۔ ریسین اور پوپ کے مصنوعی اور تکلف آمیز اشعار کی مذمّت سب کرتے تھے اور سب کی زبانوں پر بائیبل، ہومر اور شیکسپیئر کے انداز روحیّت کی مدح وستائش تھی۔ سب پُرجوش اعلانات کرتے تھے کہ ادبی آزادی نئے ادبی احیاء کی متقاضی ہے۔ فرانس کلاسیکی روح کا گھر تھا، وہاں بغاوت نے آہستہ آہستہ زور پکڑا اور یہ اس وقت کمال پر پہنچی جب وکٹر ہیوگو (سنہ ۱۸۰۲ء تا سنہ ۱۸۸۵ء) نے اپنے تاریخی ڈرامے "کرامویل"[2] کا مقدمہ لکھا (سنہ ۱۸۲۷ء)۔ ہیوگو کو انسان اور فطرت کی پیچیدگی وتنوّع کے رومانی نظریے سے گہری وابستگی تھی، چنانچہ وہ پُرجوش طریق پر کہتا ہے:

".......واضح ہوجائے گا کہ تخلیق کی ہر چیز خوب صورت نہیں، خوب صورت چیزوں کے ساتھ زشت ونازیبا چیزیں بھی موجود ہیں۔ خوش اندامی کے ساتھ ساتھ زشت اندامی بھی نظر آتی ہے۔ متناسب کے ہمراہ غیر متناسب بھی موجود ہے۔ اسی طرح خیر کے ساتھ شر اور نور کے ساتھ ظلمت بھی پائی جاتی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ آیا انسان خدا کے کاموں کی درستی کے خواہاں ہیں؟ اگر مقطوع الاعضاء فطرت زیادہ خوب صورت ہے...... تو میں فطرت کی پیروی کروں گا۔ اپنی تحریرات میں نور وظلمت اور متناسب وغیر متناسب کو ملا کر پیش کروں گا۔ دوسرے لفظوں میں میری عبارت کے اندر جسم وروح اور حیوانیت وروحانیت دونوں موجود ہوں گے۔"

غیر متناسب، بدصورت اور بدوضع چیزیں ہیوگو کے ناول "نوتردام"[3] (سنہ ۱۸۳۱ء) میں موجود ہیں جو پندرھویں کی زندگی

---

[1] فاؤسٹ۔ [2] وکٹر ہیوگو کی کتاب کرامویل کا مقدمہ۔ [3] Notre Dame de Paris

کا ایک روشن نقشہ ہے۔ یہ کازی موودو[1] کی کہانی ہے، جو "نوتردام" کا کبڑا تھا۔

انگلستان میں رومانی احتجاج ایک نسل پہلے جوش و خروش سے شروع ہو چکا تھا اور اس کی ابتدا "نغماتِ تغزل[2]" (۱۷۹۸ء) میں ورڈز ورتھ اور اس کے دوست کولرج نے کی۔ انگلستان میں دوسرے بڑے بڑے رومانی شاعر موجود تھے، مثلاً شیلے، کیٹس، بائرن، مگر ورڈز ورتھ (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۵۰ء) اور کولرج (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۳۴ء) نے کلاسیکیت اور عقلیت کے خلاف ردِّ عمل کو بہت آگے پہنچا دیا۔ "نغماتِ تغزل" کا مدعا یہ تھا کہ قارئین کا زیادہ وسیع حلقہ مہیا ہو جائے اور شعر کا مطالعہ صرف محدود دائرے میں نہ رہے۔ ورڈز ورتھ نے "نغماتِ تغزل" کے مقدمے میں خود بتا دیا تھا کہ یہ ایک تجربہ ہے، جو معاشرے کے طبقۂ اوسط اور طبقۂ زیریں کے عام مکالمات کی زبان میں کیا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ انسانی جذبات، انسانی کردار اور انسانی وقائع کو ان کی اصل شکل میں پیش کیا جائے۔ آگے چل کر کولرج نے اس مقصد کی مزید وضاحت کر دی:

> "دورِ حاضر میں شاعر کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نئی اور نظروں کو کھینچنے والی تصویریں پیش کرے۔ ایسے واقعات سامنے لائے، جو مالوفات کو دلکش معلوم ہوں یا حسِ تعجب کو انگیخت دیں۔ شاعر اپنے کرداروں اور توضیحات کو زیادہ سے زیادہ محدود اور انفرادی بنانے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ کہنا چاہیے، وہ ہو بہو تک پہنچ جاتا ہے، البتہ اپنے اسلوبِ بیان اور روزن میں وہ مقابلتہً بے پروائی سے کام لیتا ہے۔"[3]

دونوں شاعروں نے اپنا مقصد پورا کر لیا۔ کولرج نے قدیم بحر پیما[4] کی داستان لکھی۔ یہ ایک ماورائے فطرت کہانی تھی، جس میں ایک ملاح پر اس لیے لعنت طاری ہوئی کہ اس نے ایک ایلبیٹراس[5] کو مار ڈالا تھا۔ اس سے بھی زیادہ شہرت کولرج کے ان شعروں نے حاصل کی، جن سے ایک اور نظم کا آغاز ہوتا ہے:

> "زناڈو میں قبلا خاں نے
> عیش و عشرت کا ایک عالیشان محل بنانے کا حکم دیا
> جہاں ایک مقدس دریا ایلف بہتا ہے۔
> ان غاروں میں سے، جنھیں انسان ناپ نہیں سکتا
> ایسے سمندر کی طرف جو سورج کی روشنی سے محروم ہے"[6]

---

[1] Quasi Modo
[2] Lyrical Ballado
[3] کولرج ص ۱۷۳۔
[4] Ancient Mariner
[5] Albatross۔ اوقیانوس کے پرندوں کی ایک نوع، جنھیں ہسپانوی اور پرتگالی زبانوں میں الکاتروز کہا جاتا تھا۔ عربی میں انھیں قادوس کہنے لگے۔
[6] کولرج کی نظم قبلا خاں۔

قدیم بحر پیماؤں اور سورج کی روشنی سے محروم سمندروں کے درمیان پہنچ کر ہم فلسفیوں کی رجائی کائنات سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔

کولرج کے مقابلے میں ورڈز ورتھ کو ماورائے فطرت چیزوں سے زیادہ دل بستگی نہ تھی، لیکن اس نے بھی تنویر کو ٹھکرا دیا۔ بعض اوقات وہ علم و فکر ہی کا دشمن بن جاتا تھا:

"اُٹھ، اُٹھ میرے دوست! کتابوں کو ایک طرف پھینک دے
ورنہ یقیناً تو دُگنا موٹا ہو جائے گا۔
اُٹھ، اُٹھ میرے دوست! کتابیں دھو ڈال
آخر اس محنت و مشقت کا فائدہ کیا؟

....

آ، اشیا کی روشنی میں آ
فطرت کو اپنا معلّم بن جانے دے
اس کے پاس مہیّا دولت کی ایک دنیا ہے۔
ہمارے دل اور رُوحیں اس سے برکت حاصل کر سکتی ہیں۔
ہمیں ایسی عقل مل سکتی ہے، جو صحت سے معمور ہو۔
سچائی مل سکتی ہے، جو مسرت بخشے۔
موسمِ بہار کے جنگل کا ایک جذبہ
تمھیں انسان کے متعلق زیادہ سکھا سکتا ہے۔
اخلاقی برائی اور اچھائی کی بہتر تعلیم دے سکتا ہے۔
دانشمندوں کی پوری جماعت ویسی خدمت، انجام نہیں دے سکتی۔

فطرت کا علم سراسر شیریں ہے۔
ہماری دخل انداز ذہنیت
اشیا کی خوب صورت شکلیں بگاڑ دیتی ہے
ہم اس غرض سے قتل کرتے ہیں کہ چیر پھاڑ کر سکیں۔

سائنس اور فن کو چھوڑ دو
ان بنجر اوراق کو بند کر دو
آؤ اور ایسا دل لے کر آؤ،
جو مشاہدہ کر سکے اور صحیح تاثرات لے سکے[1]۔"

یہ شعر ورڈز ورتھ کے پیش نظر نقطے کو بالکل واضح کر دیتے ہیں، لیکن ان سے اس کی شاعرانہ صلاحیت کا درجہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا اور فطرت کے متعلق پر اسرار احساس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ورڈز ورتھ کو بہترین شکل میں دیکھنا ہو تو اس کی نظم "افتتاحِ نغمہ"[2] پڑھنی چاہیے، جو درحقیقت ایک طویل خود نوشتہ سوانح کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں اس میں سے ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس میں سرِّ حیات کی بابت اس کی بنیادی روش واضح ہوتی ہے:

بیشک ہم خاک ہیں، لیکن غیر فانی روح بالیدگی پاتی ہے۔
موسیقی میں آہنگ کی طرح۔ یہاں ہے ایک تاریک
ناقابلِ فہم کاریگری، جو ملا دیتی ہے
متفرق عناصر کو، وہ ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں۔
ایک معاشرے کی شکل میں[3]۔"

ظاہر ہے کہ نیوٹن کے قوانین نے روشنی ڈالی تھی۔ ورڈز ورتھ کا اندازہ یہ ہوا کہ یہ ایک تاریک اور ناقابلِ فہم ہنر مندی ہے۔ فلسفیوں نے انسان کی کمالیت کا عقیدہ عقلِ فانی کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ ورڈز ورتھ نے اس عقیدے کی بنیاد فرد کی فانی روح پر رکھی۔

ادبیات: ماضی کی طرف بازگشت

ورڈز ورتھ کی غیر نیوٹنی دنیا سے ازمنۂ وسطیٰ کے لیے رومانیوں کے جوش و خروش تک عموماً اور اپنی اپنی قوموں کی ابتدائی تاریخ کے خاص جذبے تک خصوصاً ایک لمبی جست معلوم ہوگی، تاہم قومیت اصلاً ایک غیر معقول بلکہ تقریباً پُر اسرار قوت ہے، جو متفرقِ عناصر کو ملا کر ایک معاشرے کی شکل دے دیتی ہے، اگر ہمیں تاریخی حقائق کی طرف لوٹنا چاہیے۔ ۱۸۱۵ء تک یورپ میں قومیت کے متعلق جو خاص احساس ہر جگہ رونما ہوا تھا، جزواً سیاسی اعتبار سے حفاظتِ نفس کا معاملہ تھا۔ سابقہ باب میں دکھایا جا چکا ہے کہ کس طرح مختلف قومیں فرانس کی جارحانہ قومیت کے خلاف متحد ہو گئیں۔ نپولین کی جنگوں سے جو نازک حالت پیدا ہوئی، اس میں اہلِ ہسپانیہ اپنی ہسپانوی میراث سے اور جرمن اپنی میراث سے زیادہ آگاہ ہو گئے۔ یہی حالت دوسری

---

[1] ورڈز ورتھ کی نظم The Tables Turned (پانسا پلٹ گیا) یہ نظم نغماتِ تغزل میں شامل ہے۔

[2] The Prelude

[3] "افتتاحِ نغمہ"۔

قوموں پر بھی طاری ہوئی۔ ماضی کی طرف رومانیت پسندی کی بازگشت ۱۷۸۹ء سے پہلے شروع ہوگئی تھی اور یہ تنویر سے عام بازگشت کا ایک حصّہ تھی۔ بلا شبہ انقلابِ فرانس اور نپولین نے اس بازگشت میں شدت پیدا کی۔ فلسفی ازمنۂ وسطیٰ، خصوصاً مذہب میں انہماک سے متنفّر تھے۔ رومانیت پسندی کی تحریک کے علمدار طبعاً اُس شے سے محبت کرنے لگے؛ جسے فلسفی حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

ان واقعات کی ایک اچھی مثال جرمن مصنّف ہرڈر[1] (۱۷۴۴ء۔۱۸۰۳ء) اور اس کے شاگردوں نے پیش کی۔ ہرڈر نے ثقافتی قومیّت کا نظریہ مرتب کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ہر قوم انفرادی وجود کی طرح اپنا خاص تشخص اور نشو و ارتقاء کا ایک خاص نمونہ رکھتی ہے۔ قوم کے نشو و ارتقاء کا حقیقی پیمانہ اس کا ادب ہے۔ قوم اوائلِ شباب میں ہو تو ادب عموماً شعر کی شکل اختیار کرتا ہے اور جب قوم پختگی کی منزل پر پہنچ جائے تو نثر کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہرڈر سے متاثر ہو کر شائقین علم نے ازمنۂ وسطیٰ کے جرمن ادب میں سے عوامی گیت فراہم کیے اور گرِم بھائیوں نے "پریوں کی کہانیاں" مرتب کر دیں۔ ۱۷۸۲ء میں "نبالنجن لائڈ"[2] کا پہلا مکمل متن شائع ہُوا۔ یہ قوم کے اوائلِ شباب کی ایک رزمیہ نظم تھی، جسے ازمنۂ وسطیٰ کے آخری دور میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعد کی صدیوں میں یہ بالکل فراموش کر دی گئی۔

ماضی کے جرمن ادب کو ایک نئی قدر و قیمت دے کر ہرڈر نے اپنے عہد کے جرمن ادب کو فرانسیسی ثقافت کی غلامی سے نجات دلا دی، تاہم ہرڈر تنگ نظر قوم پرست نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ قومی فخر میں مبالغے کو وہ سب سے بڑی حماقت قرار دیتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ مہذب و علم دوست فرد کو اپنی ثقافت کے علاوہ دوسری ثقافتوں سے بھی بہرہ مند ہونا چاہیے۔ یوں ہرڈر نے جرمن زبان میں تراجم کے اس سیل کو تقویت پہنچائی، جو ۱۸۰۰ء کے قریب پوری جرمنی میں بہ نکلا۔ مثلاً شیکسپیئر کے ترجمے ہوئے۔ ڈان کوئکسٹ[3] کے علاوہ ہسپانوی اور پرتگیزی نظموں کے ترجمے کیے گئے، یہاں تک کہ سنسکرت کی کتابیں اس سلسلے میں نظر انداز نہ ہوئیں۔

بعض جرمن رومانیت پرور حبِّ وطن کے اس جذبے سے متأثّر ہوئے، جو جینا اور ٹلسٹ کے بعد عام ہو گیا تھا۔ انھوں نے قومی جوش و خروش کو اس انتہا پر پہنچا دیا جس کے ماتم سے ہرڈر کبھی باز نہ رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ نیٹے اور گرِم بھائیوں نے جرمن زبان کے لیے انتہائی تقدم کا دعویٰ کیا۔ ڈرامانگار کلیسٹ[4] نے "جنگ آرمینیس" میں قدیم زمانے کے جرمنوں کی جنگی قوت پر فخر و ناز کا کوئی موقع فروگذاشت نہ کیا، جنھوں نے ۹ء میں رومی لشکروں کو شکست دی تھی۔ انتہا پسند رومانیوں کے نزدیک محض جرمن ہونا ہی تمام بنیادی خوبیوں کا مرقّع تھا، لیکن ایسے لوگوں کو مستثنیات سمجھنا چاہیئے۔ اکثر جرمن مصنّفوں نے قومی اور آفاقی مفادوں کے درمیان ہرڈر کے قائم کیے ہوئے خشک توازن کی پابندی

---

[1] Herder
[2] Nibelungenlied
[3] Don Quixote اس کا ہسپانوی تلفظ "ڈان کی" ہوتا ہے
[4] Kleist

جاری رکھی۔ مثلاً گوئٹے نے "فاؤسٹ" کی کہانی ازمنۂ وسطیٰ کے جرمن ادب سے لی۔ بہ ایں ہمہ وہ دوسری ثقافتوں کا بھی مداح تھا اور خود اپنے محض جرمن ہونے پر نہیں، بلکہ اچھے یورپی ہونے پر فخر کرتا تھا۔

بہت سی قوموں نے رومانی دَور میں ادب قدیم کو زندہ کیا۔ برطانیہ میں سر والٹر سکاٹ (۱۷۷۱ء - ۱۸۳۲ء) نے ازمنۂ وسطیٰ کے اچھے لوک گیت جمع کرنے میں مدد دی اور تیس سے زیادہ تاریخی ناول لکھے جنھوں نے بڑی شہرت پائی۔ ان میں سے "آئیونہو"[1] کا تعلق رچرڈ شیر دل کے عہد سے تھا۔ فرانس میں وکٹر ہیوگو نے نوتردام لکھا۔ روس کے بڑے شاعر پشکن[2] (۱۷۹۹ء - ۱۸۳۷ء) نے اپنے ادبی موضوع دو سو سال پیشتر کی روسی تاریخ سے لیے۔ یہ دَور دراصل روس کے لیے دَورِ مصائب تھا۔ پشکن ہی نے دورِ حاضر کے روسی ادب کی تخلیق کی۔ اس نے مغربی زبانوں سے مستعار لینے کی عادت ترک کر دی۔ آرتھوڈکس کلیسا کے فرسودہ سلافی ذخیرے چھوڑ دیے اور قومی زبان میں حبلی کلاسیکی تصانیف کی بنیاد رکھی۔

موسیقی

موسیقاروں نے بھی عوامی نغموں اور قومی ماضی کے افسانوں سے کام لیا۔ جن لوگوں نے اوپیرا (تمثیلات) اور گیت مرتب کیے، وہ رنگ اور ڈرامائیت پیدا کرنے کی غرض سے عموماً شیکسپیئر کے ڈراموں، سکاٹ کے ناولوں، گوئٹے اور پشکن کی نظموں کی طرف متوجہ ہوتے رہے۔ غرض ادب اور موسیقی نے رومانی دور میں اکثر نشوو ارتقاء کے متوازی راستے اختیار کیے، لیکن یہ متوازیت کبھی مکمل نہ ہوئی۔ رومانی دَور کے موسیقاروں نے اٹھارھویں صدی کے بڑے پیشروؤں سے اس طریق پر کبھی بغاوت نہ کی جس طریق پر رومانی دور کے شاعر فلسفیوں کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رومانی موسیقار پُرامن طریق پر پُرانے کلاسیکی دبستان سے ترقی کرتے ہوئے اوپر نکل گئے۔ موسیقی کے مصنفوں میں سے جس شخص نے اس ارتقا میں ممتاز ترین کردار ادا کیا، وہ باتووِن[3] ہے (۱۷۷۰ء - ۱۸۲۷ء) جس کے آبا و اجداد فلینڈرز کے باشندے تھے مگر اس نے خود وی آنا میں توطن اختیار کر لیا۔ کولرج نے کہا تھا کہ رومانی فنکار اسلوب اور وزن کے معاملات میں بے پروا ہو سکتا ہے۔ باتووِن نے ان اشکال و فنون سے کلاسیکی تعلق قائم رکھا جنھیں موسیقی میں اسلوب و وزن کے بدل قرار دیا جاتا ہے۔ بہ ایں ہمہ اس نے باہ، ہادن اور موزارت سے جو روایت ورثے میں ملی تھی، اسے نئی شکل دے دی۔ باقی جدّتوں کے علاوہ باتووِن نے اس بڑے آلۂ موسیقی سے خوب کام لیا، جو اس کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، یعنی پیانو۔

۱۸۳۰ء میں باتووِن کی موت تک آلات موسیقی سے کام لینے والے ارباب فن ارتقاء کے مختلف نمایاں وسیلوں کی چھان بین کر رہے تھے۔ اسی دَور میں وسیع پیمانے پر آرکسٹرا سے کام لیا گیا۔ اس شعبے میں عملداری کا منصب ایک فرانسیسی برلیوز[4] کو حاصل ہے (۱۸۰۳ء - ۱۸۶۹ء) جو نازیبا اور غیر متناسب سے وکٹر ہیوگو کی طرح لطف اُٹھاتا تھا۔ برلیوز نے

---

[1] Ivanhoe سکاٹ کا مشہور ناول۔ [2] Pushkin [3] Beethoven

[4] Berlioz

آرکسٹرا کو پھیلاتے پھیلاتے چار سو پینسٹھ آلات پر پہنچا دیا۔ ان آلات میں ایک سو بیس ولایتی سارنگیاں (وائلن) تھیں، سینتیس سارنگیاں، تیس پیانو، بیس بربط۔ برلیوز پہلا موسیقار تھا جس نے آلاتِ موسیقی سے پورا کام لیا۔ فرانز شوبرٹ[1] (۱۷۹۷ء-۱۸۲۶ء) نے آواز اور پیانو کو چھ سو نہایت عمدہ گیتوں میں شامل کر کے فن لطیف کے درجے پر پہنچا دیا۔ ان میں سے ستر نظمیں گوئٹے کی تھیں۔ جرمنی کے فان ویبر[2] (۱۷۸۶ء-۱۸۲۶ء) نے حقیقی قومی اوپیرا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ روس کے گلنکا[3] (۱۸۰۴ء-۱۸۵۷ء) نے اطالوی اثرات سے نجات حاصل کر لی، جو روس کی سیکولر موسیقی پر مسلّط ہو چکے تھے۔

فنونِ لطیفہ فنونِ لطیفہ کے دائرے میں رومانیت کی قوتوں نے ایسی کوئی فتح حاصل نہ کی، جیسی ادب اور موسیقی کو حاصل ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں میں جس شخص کو ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل رہی، وہ فرانس کا ایک نوکلاسیکی مصوّر ڈیوڈ (۱۷۴۸ء-۱۸۲۵ء) تھا۔ یہ جیکوبنوں کا مصوّر رہا اور اس نے معاصر واقعات کی تصویریں ڈرامائی انداز میں پیش کیں، مثلاً ٹینس کورٹ[4] کے حلف کی تصویر۔ وہ عموماً روایتی تکنیک سے کام لیتا تھا۔ مثلاً ٹینس کورٹ کے حلف میں اس نے مندوبین کی تصویریں پہلے بہ حالت برہنگی بنائیں، گویا وہ مندوبین نہ تھے، بلکہ کسرتی آدمیوں کا ایک گروہ تھا۔ لبعد میں رنگ و روغن کے ذریعے سے انھیں لباس پہنا دیے۔

زیادہ مستقیم و پُرتاثیر ——— اور رومانی مزاج سے بہ درجہا قریب تر ——— تصویریں ہسپانیہ کے بڑے مصوّر گویا[5] کی تھیں (۱۷۴۶ء-۱۸۲۸ء) گویا نے چارلس سوم اور اس کے نااہل جانشینوں کی جو تصویریں بنائیں، انھیں دیکھ لینے کے بعد کسی کو ہسپانوی حکمران خاندان کے بارے میں کوئی وہم و شک باقی نہیں رہ سکتا تھا کہ یہ تباہ کاریاں نپولین کی فوج کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ گویا نے ہسپانویوں کے چھاپوں کے جو خاکے تیار کیے، ان میں ہسپانوی محبانِ وطن کا خون استعمال کیا گیا تھا، جن کی جانکنی کے نقشے پیش کیے جا رہے تھے۔ گویا کی مجروح حبِّ وطن اور خوفناک اتصال کی نقل بہت کم لوگ کر سکے، یعنی گویا ان شخصیتوں کی مثال تھا، جن کے متعلق ناقابلِ تقلید جوہرِ ذکاوت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

کانسٹیبل[6] اور دیلاکرا[7] رومانی دبستانِ مصوری کے قیام کے ذمہ دار ہیں۔ کانسٹیبل (۱۷۷۶ء-۱۸۳۰ء) نے انگلستان کے مناظر کی ایسی دلاویز تصویریں بنائیں کہ فطرت پھر ایک مرتبہ فنی نقطۂ نگاہ سے مرکزِ احترام بن گئی۔ دیلاکرا (۱۷۹۹ء-۱۸۶۳ء) فرانسیسی تھا۔ اس نے خطوط کی کلاسیکی صفائی کے بجائے رنگ و نور پر زیادہ زور دیا اور کہا کہ نوجوان مصوّروں کو روبنز[8] کی وہ

---

[1] Franz Schubert   [2] Von Weber

[3] Glinka   [4] Tenis-Court Oath اس سے مراد تیسرے طبقے کے نمائندوں کا وہ حلف ہے جو ۲۰ جون ۱۷۸۹ء کو ورسائی کے شاہی ٹینس کورٹ میں اٹھایا گیا یعنی یہ کہ جب تک ملک کو نیا دستور نہ مل جائیگا ہم لوگ منتشر نہ ہوں گے اس حلف نے انقلاب کا راستہ ہموار کیا۔

[5] Goya   [6] Constable   [7] Delacroix   [8] Rubens

روغنی تصویریں دیکھنی چاہییں، جو درخشاں ہیں اور جنھیں ڈیوڈ نے آرتھوڈوکس فنکاری کے دائرے سے باہر نکال دیا تھا۔ دیلا کراے کہتا تھا کہ فن کا مقصد فطرت کی نقالی نہیں، بلکہ تخیل میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے "سیو کے قتلِ عام"[1] کی تصویر بنا کر اپنے معاصرین کے تخیل پر ضرب لگائی۔ یہ یونان کی جنگ آزادی کی خونریز تصویر ہے۔ آج اسے دیکھیں تو زیادہ تر رسمی معلوم ہوتی ہے اور اس میں بہت کم تاثیر نظر آتی ہے۔ گویا نے جزیرہ نما کی جنگ کے چھاپوں کی جو تصویریں پیش کیں، وہ زیادہ مؤثر معلوم ہوتی ہیں، لیکن جب بنی تھیں تو انھیں وحشیانہ، مجنونانہ اور مدہوشانہ قرار دیا گیا تھا، بلکہ کہا گیا تھا کہ تصویروں کا قتل عام کیا گیا ہے۔ اس وقت فرانسیسی مصور دو مخالف دبستانوں میں بٹ گئے، ایک دیلا کراے کا رومانی دبستان، دوسرا ڈیوڈ کے شاگردوں کا دبستان۔

انیسویں صدی کے آغاز میں فن تعمیر کے اندر دو متخالف اسلوب موجود تھے، ایک نوکلاسیکی، دوسرا نوگاتھی۔ صدی آگے بڑھی تو رومی اسلوب تعمیر، جسے انقلاب فرانس نے جاری کیا تھا، نپولین کے ماتحت "محرابِ فتح"[2] نیز میڈ رلن[3] کے شاندار کلیسائے پیرس میں اوج کمال کو پہنچ گیا۔ میڈرلن کا کلیسا اصل میں ایک رومی معبد کی نقل تھا، جو نیمز (فرانس) میں بنایا گیا اور اسے "مربع مکان" کہتے تھے۔ امریکہ میں ٹامس جیفرسن نے "مربع مکان" کو مکعب اسلوب تعمیر کا مکمل نمونہ قرار دیا اور اسے غیر کلیسائی اغراض کے لیے استعمال کیا، مثلاً ورجینیا کے دارالحکومت رچمنڈ[4] کی عمارتوں میں۔ جیفرسن کو نوکلاسیکی فن تعمیر میں کمال حاصل تھا۔ اس نے شارلٹس ول[5] کے نزدیک اپنے لیے ایک مفصلاتی مکان بنایا اور خالص امریکیوں کے انداز میں اس کے لیے ہر قسم کی انوکھی طرزوں سے کام لیا۔ شارلٹس ول میں ورجینیا کی یونیورسٹی بنانے کی تجویز ہوئی۔ یہ متعدد علمی عمارتوں کا ایک عمدہ مجموعہ تھا، جن کے مرکز میں مدور کتب خانہ تھا۔ کتب خانہ رومی پینتھین[6] (دارالاصنام) کی نقل تھا اور اسے گردی فن تعمیر کا مکمل نمونہ قرار دیا گیا تھا۔ لائبریری سے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی عمارتوں کی دو قطاریں نکلتی تھیں اور دونوں طرف کی عمارتیں دو مختلف رومی معبدوں کے نمونے پر بنائی گئی تھیں اور انھیں ستونوں کی قطاروں سے ملا دیا گیا تھا۔

برطانیہ میں نوکلاسیکی فن تعمیر کو فروغ حاصل تھا، مگر گاتھی فن تعمیر از سر نو زندہ ہو کر مقابلے پر آ گیا تھا۔ گاتھی فن تعمیر کے احیاء کی کئی وجہیں تھیں، مثلاً سکاٹ کے ناولوں کے ذریعے سے ازمنۂ وسطیٰ کے فن تعمیر کی بیشتر چیزیں تازہ ہو گئیں۔ مذہب کا احیاء ہوا اور اس فن تعمیر پر زیادہ توجہ خانقاہ فونٹ ہل[7] کی عمارت سے ہوئی۔ اس خانقاہ کی تعمیر ۱۷۹۶ء میں ایک خودراے کروڑپتی نے شروع کرائی تھی۔ اس میں بڑی حد تک بہت اونچے طویل رواق تھے۔ اگرچہ اس پر پانچ لاکھ پونڈ خرچ ہوئے،

۱؎ The Massace of Scio ۱۸۲۲ء میں یونانی باغیوں نے قتل کا ہنگامہ بپا کیا تھا انھیں سزا دی گئی تھی۔

۲؎ Arc de Triomphe پیرس کی وہ مشہور محراب، جو نپولین نے فتوحات کی یادگار میں بنوائی تھی۔

۳؎ Madelein ۴؎ Richmond ۵؎ Charlothesville

۶؎ Pantheon ۷؎ Fonthill Abbey

مگر عمارت ایسی گھٹیا درجے کی تھی کہ اس کا مرکزی بُرج پچیس سال کے بعد ڈھے گیا۔ برطانوی ماہرینِ فن پر اس واقعے سے کوئی ہراس طاری نہ ہُوا اور انھوں نے ۱۸۲۰ء کے بعد ہر قسم کی عمارت کو گاتھی انداز پر ڈھال لیا۔ محض گرجے اور پارلیمنٹ کے ایوان ہی نہیں، بلکہ ریلوے سٹیشن، نہایت عمدہ کوشک اور چھوٹے چھوٹے مکان بھی اسی انداز پر بنائے۔ محرابی چھتوں کی بلندی، کھڑکیوں کی محرابیت اور عام تاریکی کے پیشِ نظر گاتھی فنِ تعمیر سکونتی عمارتوں کے لیے بالکل غیر موزون تھا۔ پھر ازمنۂ وسطیٰ کے فرنیچر کا فیشن ہو گیا۔ اس فرنیچر میں نوکیں باہر نکلی ہوتی تھیں اور آرائشوں پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک نقاد نے نوگاتھی طرز کے کمرے میں رہنے والے شخص کو متنبّہ کیا: "اگر آرائش کے "کانٹوں" سے محفوظ رہ گئے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنا۔"

گاتھی طرزِ تعمیر کا احیاء فنی اعتبار سے محض مصیبت ہی کا سامان نہ تھا، اس کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کے شہکاروں کی حفاظت و بحالی کا انتظام ہو گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان ایک صدی پیشتر ثابت کر چکے تھے ـــــ اور کالجوں کی عمارتیں بعض اوقات آج ثابت کرتی ہیں ـــــ کہ فنِ تعمیر کا ایک ماہر ہی پرانے اندازِ تعمیر کو کامیابی و خوش اسلوبی سے نئے تقاضوں کے مطابق بنا سکتا تھا۔ گاتھی اندازِ تعمیر کا احیاء ایک اور لحاظ سے بھی خوشگوار ثابت ہُوا۔ رومانیت پسندوں کی آرزو یہ تھی کہ عملی نقطۂ نگاہ سے بالاتر ہو جائیں، جو انیسویں صدی کی زندگی پر بُری طرح حاوی تھا۔ گاتھی طرزِ تعمیر نے اس آرزو کو شاندار کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔

مذہب اور فلسفہ

نوگاتھی طرزِ تعمیر کا احیاء مذہبی احیا کا صرف ایک نشان تھا، جو ازمنۂ وسطیٰ کے لیے رومانیت پسندوں کے جوش و خروش کا نتیجہ تھا۔ دوسرا نشان ۱۸۱۴ء میں نمودار ہوا، جب پوپ نے یسوعی فرقہ از سرِ نو قائم کر دیا۔ یہ لوگ ان تمام چیزوں کا نشان تھے، جن کی مخالفت دورِ تنویر میں ہوتی رہی۔ ہالباخ کی مادّیت اور والٹیئر کی طرف سے نرم تر الفاظ میں پادریوں کی مخالفت سے اکثر رومانیت پسندوں پر حیرت طاری ہو گئی۔ شیلے، جو کھلے بندوں دہریت کا حامی تھا، اس عام قاعدے سے مستثنیٰ رہا۔ جرمنی کے اندر رومانی مصنّفوں میں سے اکثر کیتھولک بن گئے انگلستان میں ورڈز ورتھ اور کولرج نے قائم شدہ کلیسا کا پُرزور دفاع کیا۔ کولرج نے اعلان کر دیا کہ ہر چیز ہمیں مذہبی اعتقاد پر آمادہ کرتی ہے:

> "فطرت ایمان پیدا اور تازہ کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے ہر لحظہ الہام ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے احساسات اس کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور ضمیر کے قانون کا واضح حکم یہی ہے۔"[1]

فطرت، احساسات اور ضمیر رومانیت پسندوں کے مذہبی فکر کا سب سے بڑا سرچشمہ تھے۔ اسی بنا پر کولرج کو کہنا پڑا:

> ...... مسیحیت کا منصوبہ ہمیں عشائے ربّانی کی رسم یا کلیساؤں کے مواعظ میں سکھایا

۱؎ Biographia Literaria ص ۱۰۶۔

جاتا ہے۔ اگرچہ یہ انسانی عقل سے ثابت نہیں ہو سکتا، مگر اس کے عین مطابق ہے اور ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی متصل چلی آ رہی ہے۔ مذہب اس وقت تک عقل میں نہیں آتا، جب تک عقل کی آنکھ اپنے افق کے اندر رہتی ہے۔ آگے چل کر ایمان عقل ہی کا تسلسل ہے[1]..... "

یہ عقیدہ پیشِ نظر رکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانٹ کا اخلاقی فلسفہ از سرِ نو پیش کیا جا رہا ہے اور کولرج واقعی کانٹ اور اس کے شاگردوں کی تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔

کانٹ کا سب سے بڑا شاگرد اور ہر اعتبار سے رومانیت پسند فلسفی ہیگل[2] تھا (۱۷۷۰ء - ۱۸۳۱ء) وہ برلین کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ اپنے معلّم کی طرح ہیگل نے بھی تنویر کے اس رجحان کی سخت مخالفت کی تھی کہ وہ انسانی فطرت اور انسانی تاریخ کو اسی طرح تسلیم کرنا چاہتی ہے، جس طرح یہ اوّل نظر میں سامنے آتی ہے۔ اس نے انسان کی اخلاقی صلاحیتوں کی بڑی ستائش کی:

" یہ انسان کی مطلق اور اعلیٰ تقدیر کی مُہر ہے کہ وہ اچھائی اور بُرائی سے آگاہ ہے اور اس کی تقدیر اس صلاحیّت میں مضمر ہے کہ وہ چاہے اچھائی کا ارادہ کر لے چاہے بُرائی کا[3]....."

ہیگل کے نزدیک انسانی تاریخ کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے تو وہ اچھا بننے کے لیے انسانی کوششوں کی تاریخ ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے اس طرح دنیا کے لیے اپنے منصوبے کو واضح کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اچھائی:

"..... خدا ہے۔ خدا دنیا پر حکمراں ہے۔ اس کی حکمرانی کا عمل یعنی اس کے منصوبے پر کاربندی دنیا کی تاریخ ہے[4]"

ہیگل کے نزدیک تاریخ ایک جدلی عملیہ تھا، یعنی متضادات کا ایک سلسلہ۔ اس تصادم میں دو عنصر تھے۔ ایک زندگی کا قائم شدہ نظم، دوسرا نظامِ قدیم سے مبازرت۔ ان دونوں کے تصادم سے جنھیں وہ تھیسس[5] اور اینٹی تھیسس[6] قرار دیتا ہے، سِن تھیسس[7] (ترکیب) پیدا ہوتی ہے۔ اس سے مراد دو عنصروں میں مصالحت نہیں، بلکہ ایک نئے اور بہتر طریقے کا پیدا ہونا ہے۔ اسی طرح انسان آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتا ہوا بہترین ممکناتِ عالم پر پہنچ رہا ہے۔ "سِن تھیسس" میں شکست کے آثار نمودار ہوتے ہیں تو "تھیسس" اور "اینٹی تھیسس" میں از سرِ نو کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش سے ایک اور "سِن تھیسس" پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلا جا رہا ہے۔

---

[1] Biographia Literaria ص ۳۳۴ ۔ [2] Hegel [3] Philosopby of History by Sibree (فلسفۂ تاریخ) ص ۳۴ ۔ [4] ایضاً ص ۳۶

[5] Thesis [6] Antithesis

[7] Synthesis

رومی جمہوریت کے عالمِ احتضار سے ہیگل کو عملیۂ جدل کی ایک اچھی مثال مل گئی۔ اس میں "تھیسس" زوال پذیر جمہوریت تھی اور "اینٹی تھیسیس" "مشرقی مطلق العنانی"۔ "سن تھیسس" ابتدائی رومی سلطنت کی قیصریت نے مہیا کی۔ ہیگل نے واضح کر دیا کہ اس اہم تغیّر کو کوئی اتفاقی واقعہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک ضروری چیز تھی، جو خدائے بزرگ و برتر کے منصوبے کا ایک جزو تھی۔ ہیگل کے نزدیک جولیس سیزر ایک ہیرو تھا اور چند عالمی تاریخی شخصیتوں میں سے تھا، جسے وقت کے تقاضوں کے متعلق بصیرت حاصل ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اب کونسی چیز پختگی کے قریب پہنچ چکی ہے۔[1]

ہیگل کے افکار میں تاریخ کا یہ جدلی فلسفہ ایک بالکل جدید اور حد درجہ اہم عنصر تھا۔ اسی کو کارل مارکس کی جدلی مادیّت کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔ بیسویں صدی کے جمہوریت پسند شہری شاید سمجھ نہ سکیں کہ ہیگل کو کسی زمانے میں آزاد خیال مثالیت پسند کی حیثیت میں زیادہ شہرت حاصل تھی۔ وہ ادائے فرض پر خاص زور دیتا تھا۔ الگزانڈر اعظم، سیزر اور نپولین کو عالمی تاریخی ہیرو سمجھتا تھا اور اس کا دعویٰ یہ تھا کہ مملکت صرف اپنے لیے زندہ رہتی ہے۔ ان افکار سے خیال ہوتا ہے کہ ہیگل اور مطلق العنانی کے درمیان براہ راست رشتہ موجود تھا، لیکن حق و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بتا دیا جائے، خود ہیگل کے تصور میں آخری سیاسی ترکیب (سن تھیسس) یہ نہ تھی کہ ایک وحشیانہ مطلق العنان مملکت پیدا کر لی جائے، بلکہ وہ روشن خیال، پروشیائی بادشاہی کا قائل تھا۔

رومانیت پسندی پر تبصرہ

اس طرح ہیگل بھی انسان کے کمال کا معتقد تھا، اگرچہ یہ بھی کہتا تھا کہ اصل عملیّہ اتنا پیچیدہ اور دشوار ہے، جو کنڈورسٹ جیسے فلسفی کے ذہن میں نہیں سما سکتا تھا۔ رومانیت پسندوں ہی نے یونہی دورِ تنویر کے محبوب معتقدات سے بے تعلقی اختیار نہیں کی تھی، بلکہ ترقی کے ترمیم شدہ نظریّے کے علاوہ اٹھارھویں صدی کی آفاقیت بھی رومانیت پسندی ہی پر قائم رہی۔ ہومر، سروانٹیز، شیکسپیئر اور سکاٹ نے بہت سے ملکوں میں وسیع حلقہ ہائے مدّاحی پیدا کر لیے۔ اس دَور کی عظیم ترین شخصیتیں، مثلاً گوئٹے اور باتووِن دنیا بھر کے شہری کہلانے کی مستحق ہیں۔

موازنہ کیا جائے تو رومانیت پسندی اور تنویر کے درمیان اشتراکات کے بجائے اختلافات کی تعداد زیادہ ہے۔ اُنیسویں صدی کے اوائل میں نیوٹن کی عالمی مشین نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اس کی جگہ مذہبی اسرار کی نوگا تھی دنیا، ہیگل کی دنیائے جدلیات اور ورڈز ورتھ کی دنیائے جذبات نے لے لی تھی۔ رومانیت پسندی کی سب سے بڑی میراث یہ دعویٰ تھا کہ معاشرہ طبعیات کی محض ایک شاخ نہیں اور انسان کو عالمی مشین کا محض ایک دندانہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] فلسفۂ تاریخ ص ۳۱۱۔

اٹھارھواں باب

قدامت پسندوں کا نظریہ اور وی آنا کے فیصلے

تمہید رومانیت پسندی نے سیاسیات کی رفتار پر یقیناً گوناگوں اثرات ڈالے۔ اس کی انفرادیت نے آگے چل کر روشن خیالی کو تقویت پہنچائی اور اس کی قومیت ایک انقلابی قوت بن گئی۔ بہ ایں ہمہ رومانیت پسندی کا فوری سیاسی اثر اتنا آزاد خیالی اور قوم پروری پر مبنی نہ تھا، جتنا قدامت پسندی اور انقلاب کی مخالفت پر مبنی تھا۔ انگریز رومانیت پسندوں میں سے صرف بائرن اور شیلے دورِ تنویر کے انتہا پسندانہ سیاسی اصول پر قائم رہے۔ ورڈز ورتھ اور کولرج کے دل میں بہ عالم شباب حریّت، مساوات اور اخوت کے لیے جو جوش و خروش تھا وہ جلد زائل ہو گیا۔

برک اور میٹرنخ نیا انتہا پسندانہ سیاسی نقطۂ نگاہ بڑی حد تک ایڈمنڈ برک (۱۷۲۹ء - ۱۷۹۷ء) کی تحریرات کا ممنون تھا۔ جیسا کہ پہلے ایک اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، برک انسانی فطرت کے متعلّق فلسفیوں کے سادہ اور رجائی نقطۂ نگاہ کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی فطرت بڑی پُر پیچ ہے اور معاشرے کے مقاصد حد درجہ اُلجھے ہوئے اور پیچیدہ ہیں، لہذا وہ اُنھیں اداروں کا احترام کرتا تھا، جو تاریخ بشریت کے طویل دور میں بروئے کار آ گئے، مگر یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ ادارے متحجر ہو چکے ہیں یا ان میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ زمانۂ ماضی میں تدریجاً نشو و نما پاتے رہے اور آئندہ بھی تدریجاً نشو و نما پاتے رہیں گے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سیاسی تغیر ممکن ضرور ہے، مگر مشکل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اصلاحات لازماً جاری ہوں گی، تاکہ جو چیزیں مدّت سے قائم ہو چکی ہیں ان کے مفید اجزاء محفوظ رہیں۔ گویا اصلاحات کا انتظام انتہائی دقّتِ نظر اور احتیاط سے کرنا چاہیئے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قدامت پسندی کا قائل تھا۔

برک نے امریکی انقلاب کی حمایت کی۔ اس کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ یہ انقلاب نہیں، بلکہ ۱۶۸۸ء کی شاندار روایت کی توثیق ہے اور اصلاً یہ ایک قدامت پسندانہ عمل ہے۔ اسی طریق استدلال نے برک کو انقلاب فرانس کی شدید مذمت پر آمادہ کر دیا۔ ۱۷۸۹ء کے انقلابیوں نے ہر شے تباہ کر ڈالی۔ انھوں نے نیک و بد، تر و خشک، کسی کی تمیز روا نہ رکھی۔ اس نے کہا: "غیظ و جنون کی حالت میں ان چیزوں کو آدھ گھنٹے کے اندر برباد کیا جا سکتا ہے جنھیں احتیاط، تدبر اور پیش بینی سے ایک سو سال میں تعمیر کیا جا سکتا ہے"[1]۔

---

[1] برک کی کتاب "انقلاب فرانس کے متعلق افکار" ص ۱۶۴۔

گویا معاہدۂ عمرانی بھی معرضِ خطر میں پڑ گیا۔ بلاشبہ برک نے کہا کہ معاشرہ بھی ایک معاہدہ ہے، مگر اس کا مطلب وہ نہ تھا، جو روسو کا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت کو مرچ یا قہوے، کپڑے یا تمباکو یا ایسی ہی کسی دوسری معمولی چیز کے لیے حصّہ داری کے شرکت نامے جیسی چیز نہ سمجھ لینا چاہیے۔ یہ شرکت نامے معمولی عارضی فائدوں کے لیے کرلیے جاتے ہیں اور جب فریقین چاہیں، انھیں توڑ سکتے ہیں۔ مملکت کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے، کیونکہ یہ محض ان چیزوں میں اشتراک نہیں، جو عام حیوانی اغراض کی خاطر عارضی طور پر اختیار کرلیا جاتا ہے اور وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ مملکت کا اشتراک تمام علوم اور تمام فنون میں اشتراک ہے۔ ہر نیکی اور ہر کمال میں اشتراک ہے۔ اس اشتراک کے مقاصد بہت سی نسلوں میں بھی پورے نہیں ہوتے، لہٰذا یہ اشتراک محض زندوں تک محدود نہیں، بلکہ مُردوں اور پیدا ہونے والی نسلوں پر بھی حاوی ہے[۱]۔

نپولین کے بعد یورپ میں سیاسیات کا جو دور شروع ہُوا، اس میں روایت کی قوت کو خاص اثر حاصل تھا، کیونکہ یہ میٹرنخ کا دور تھا، پرنس کلیمنٹ وینسلس، لوتھیئر، نیپومیوسین، میٹرنخ کا دور[۲] (۱۷۷۳ء۔ ۱۸۵۹ء)، جو ۱۸۰۹ء سے ۱۸۴۸ء تک آسٹریا کا وزیر خارجہ رہا اور اپنے طویل عہد مشغولیت میں یورپی ڈپلومیسی کے اندر ممتاز ترین فرد تھا۔ میٹرنخ کا تعلّق طبقۂ امراء سے تھا اور اس طبقے کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ وہ خوشرو اور خوش روش آدمی تھا اور اسے اپنے آپ پر انتہائی اعتماد تھا۔ اس نے ایک مرتبہ کہا کہ غلطی کبھی میرے قلب و ذہن تک نہیں پہنچ سکی۔ وہ بھی ماضی کے احترام میں برک کا ہمنوا تھا:

> "حق یہ ہے کہ انسان دستور نہیں بنا سکتا۔ دستور وقت بناتا ہے ..... لوگ جتنا چاہیں، لکھیں ـــــ اور جتنا کم لکھیں، اتنا ہی بہتر ہوگا ـــــ مگر تمھارے ہاتھ ایک کاغذ کے سوا کیا آئے گا؟ انگلستان کے پاس ایک دستور ہے، جس میں منشور اعظم کو ایک ضمنی عنصر کی حیثیت حاصل ہے، لیکن انگریزی دستور صدیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ..... عمرانی نظام کی ترقی کا طریقہ یہی ہے اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں کیونکہ یہی قانون فطرت ہے[۳]۔"

میٹرنخ کی قدامت پسندی خود اس کے سیاسی تجربات سے پیدا ہوئی، اس کا خاندان جرمن رہائن لینڈ میں مقیم تھا اور انقلاب فرانس سے اُسے سخت نقصان پہنچا۔ وہ ایک ایسی مملکت کا خدمت گزار تھا، جس پر جوزف دوم کی انتہاپسندانہ روشن خیالی سے تخریبی اثرات پڑ چکے تھے اور جو فرانسیسی افواج کے ہاتھوں ذلّتیں اُٹھا چکی تھی۔ ان مصائب نے میٹرنخ کو یقین دلا دیا کہ آسٹروی سلطنت کو آزاد خیالی اور قوم پروری کی ان قوتوں سے بالتخصیص نقصان پہنچتا رہے گا، جو تنویر و انقلاب کی بدولت بروئے کار

---

[۱] برک کی کتاب "انقلاب فرانس کے متعلق افکار" ص ۹۳۔

[۲] Prince Clement Wenceslas Lothair Nepomucene Methernich

[۳] Memoirs of Princ Methernich

آئیں ۔ ہیپسبرگ سلطنت کے مختلف حصوں کو صرف روایت ہی اکٹھا رکھ سکتی تھی ۔

وی آنا کی کانگرس

۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۵ء میں وی آنا کی کانگرس کا اجلاس ہُوا ۔ میٹرنخ شہر کائے کانگرس کا مہماندار تھا ۔ یہی کانگرس تھی جس نے حقیقی قدامت پسندانہ تدبّر سے یورپ کی تعمیر نو کا کام شروع کیا ۔ خاصی لمبی مدت تک مدبّرین ناچ، دعوتوں، گانے کی مجلسوں کے علاوہ تمسکار کھیلنے میں مصروف رہے ۔ ایک مبصّر نے خوب کہا کہ کانگرس ناچ رہی ہے، مگر چل نہیں رہی ۔ حقیقت یہ ہے کہ شاندار مجلسی زندگی نے اصل کاروباری مقصد کو فائدہ پہنچایا ۔ چھوٹے درجے کے نمائندے رنگ رلیوں میں مصروف ہو گئے اور جن مدبّروں کو خاص اہمیت حاصل تھی، وہ نجی مشوروں میں اصل معاملات طے کرتے رہے ۔

چار آدمی وی آنا کے بڑے بڑے فیصلے کرنے کے ذمہ دار تھے، اوّل میٹرنخ، دوم کیسلری[1]، سوم تالیراں[2]، چہارم زار الگزانڈر اوّل ۔ وائی کاؤنٹ کیسلری برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا ۔ وہ قدامت پسندی میں میٹرنخ کا مثنیٰ تھا ۔ اسے فرانسیسیوں کے سابقہ گناہوں کی سزا دینے کا اتنا خیال نہ تھا، جتنا اس امر کا خیال تھا کہ آئندہ کے لیے کوئی نیا رابس پیئر اور کوئی نیا بونا پارٹ برسرِ کار نہ آسکے ۔ اس نے خود اعلان کیا تھا کہ میں فتوحات کے نشان حاصل کرنے کے لیے وی آنا نہیں گیا تھا، صرف اس غرض سے گیا تھا کہ دنیا پھر امن پسندی کی زندگی پر استوار ہو جائے ۔

تالیراں فرانس کے نئے بادشاہ لوئی ہیژدہم کا وزیر خارجہ تھا ۔ اس نے وی آنا میں زندگی کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی ۔ وہ ابتدا میں نظام قدیم کا ایک بشپ تھا اور چاہتا تھا کہ روپیہ جمع کرلے ۔ پھر وہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کا حامی بن گیا ۔ پادریوں کے لیے جو ملکی دستور بنا تھا، اس کی حمایت کی ۔ نپولین کے ماتحت وزیر خارجہ تھا ۔ ٹلسٹ کے بعد شہنشاہ نپولین کے خلاف خفیہ خفیہ سازشیں کرتا رہا ۔ پھر اس نے بحال شدہ بوربون بادشاہ کی ملازمت کرلی اور بہ عہد پیری اسے ۱۸۳۰ء کے انقلاب میں اہم حصّہ لینا پڑا ۔ سو وہ ایسا مدبّر تھا، جو ہر نئے تغیّر سے موافقت پیدا کر لینے میں یگانہ تھا ۔ وی آنا پہنچتے ہی اس نے ایسی چالیں چلیں کہ وہ اندرونی حلقے میں شامل ہو گیا اور فاتح طاقتوں کے نمائندوں نے شکست خوردہ فرانس کے اس نمائندے کو اپنا ہمسایہ سمجھ لیا ۔ تالیراں کو اپنی مزاحمت کی قدر و قیمت سے آگاہی تھی اور اس صورت حال سے فائدہ اُٹھانے میں وہ خاص دسترس کا حامل تھا ۔ چنانچہ جن مدبّروں کی حیثیتِ ترجمانی اونچے درجے کی نہ تھی اور وہ کانگرس کے مباحث میں شریک نہ کیے جانے کے باعث ناراض تھے، تالیراں اُن کا ترجمان بن گیا اور فاتحوں میں جو اسے اختلافات نظر آئے، انھیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا، تاکہ خود فائدہ اُٹھا سکے ۔

ان اختلافات میں سب سے بڑا حصّہ الگزانڈر اوّل کا تھا ۔ میٹرنخ زار کو جیکوبن قرار دیتا تھا، کیونکہ اُسے روشن خیال ہونے کی شہرت حاصل تھی اور روس میں اس نے خاصی وسیع اصلاحات جاری کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ۱۸۱۴ء تک الگزانڈر کی روشن خیالی اور آزاد منشی کی جگہ مذہب کے لیے رومانیت پسندانہ جوش و خروش نے لے لی تھی ۔ چنانچہ زار گھنٹوں دعا میں مصروف

۱؎ Castlereagh

۲؎ Talleyrand

رہتا اور بیرونس فان کرودنر[1] کے ساتھ بائیبل کا مطالعہ کرتا رہتا۔ بیرونس موریو بائی برادری کے زہد و اتقاء کی سرگرم حامی تھی۔ اس نے زار کو بتا دیا تھا کہ آپ دنیا کی تعمیرِ نَو کی مقدّس سرگزشت کا زندہ مقدمہ ہیں۔ زار اور بیرونس نے ایک مقدّس اتحاد کا خاکہ تیار کیا، جس کی پابندی سے تمام مملکتوں کی پالیسیاں تعلیماتِ مسیحؑ کی حرف بہ حرف پیروی کرتے ہوئے حیاتِ تازہ حاصل کر سکتی تھیں۔ وی آنا کانگریس کے ابتدائی دور میں الگزانڈر کے منصوبۂ اتحادِ مقدس کی وجہ سے نہیں، بلکہ پولستانی پالیسی کی وجہ سے معاملات ناکامی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ تقسیم سے پیشتر کے پولینڈ کو جزواً بحال کیا جائے اور خود اسے بادشاہ تسلیم کر لیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق آسٹریا اور پروشیا کو وہ علاقے چھوڑنے پڑتے تھے، جو انھوں نے گزشتہ صدی میں ہتھیا لیے تھے۔ الگزانڈر نے پروشیا کی امدادیوں حاصل کر لی کہ سیکسنی کے مطالبۂ الحاق میں پروشیا کی تائید کی، کیونکہ سیکسنی کا بادشاہ نپولین کا وفادار رہا تھا، مگر میٹرنخ آسٹریا کے روایتی حریف پروشیا کو اتنا بڑا علاقہ دے دینا نہیں چاہتا تھا۔ مزید برآں میٹرنخ اور کیسلری یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ایک بڑا پولینڈ از سرِ نو وجود میں آجائے اور وہ روس کے زیرِ اقتدار رہے۔

سیکسنی اور پولینڈ کے جھگڑے نے تالیران کو فائدہ اُٹھانے کا نہایت عمدہ موقع دے دیا۔ چنانچہ جنوری ۱۸۱۵ء میں شکست خوردہ فرانس کا نمائندہ میٹرنخ اور کیسلری کا ہمنوا بن گیا۔ ساتھ ہی روس اور پروشیا سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اگر اپنے مطالبات نرم نہ کیے تو جنگ میں بھی دریغ نہ کیا جائے گا۔ اس دھمکی نے معاملہ فوراً طے کر دیا۔ الگزانڈر نے پولینڈ لے لیا، مگر وہ اس کے حدود کم کرنے پر آمادہ ہو گیا اور تقسیم سے جو لُوٹ پروشیا اور آسٹریا کے حصّے میں آئی تھی، انھیں کے قبضے میں رہی۔ پروشیا نے تقریباً نصف سیکسنی لے لیا، باقی شاہ سیکسنی ہی کے پاس رہا۔

سیکسنی اور پولینڈ کا مسئلہ طے ہو گیا تو کانگرس نے دوسرے اہم خاندانی اور علاقائی مسائل خوش اسلوبی سے سلجھا لیے۔ تالیران نے قانونی جواز کا مقدّس اصول مان لیا تھا۔ چنانچہ مختلف ملکوں کے حکمرانوں اور حدود کا فیصلہ اسی اصول کی بنا پر ہو گیا یعنی ۱۷۸۹ء سے پیشتر کی تمام چیزیں قبول کر لی گئیں، لیکن عملاً قانونی جواز کو جتنی مرتبہ نافذ کیا گیا، تقریباً اتنی ہی مرتبہ توڑا گیا تھا۔ وی آنا میں جمع ہونے والے مدبّر عملی مشکلات سے واقف نہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ انقلاب اور نپولین نے جتنے تغیرات پیدا کر دیے تھے، ان سب کو کالعدم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ فرانس، ہسپانیہ اور نیپلز کے تخت قانونی جواز کے اصول پر بوربونوں کے حوالے کر دیے گئے، مگر ان سیکڑوں جرمن ریاستوں کو از سرِ نو زندہ نہ کیا گیا، جو ۱۷۸۹ء سے محو ہو چکی تھیں۔

جرمنی میں کانگرس نے اُنتالیس ریاستوں کا انتظام کیا اور انھیں ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کی شکل دے دی۔ جرمن وفاق در اصل ناکارہ مقدس رومی سلطنت کا احیاء تھا۔ اس کا سب سے بڑا ادارہ ایک پارلیمنٹ تھی، لیکن حقیقتاً اسے پارلیمنٹ یا نمائندہ قومی مجلس نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ وہ مختلف خود مختار ریاستوں کے سفیروں کی ایک مجلس تھی۔ پروشیا اور آسٹریا نے

---

[1] Beroness Von Krudener

وی آنا میں نئے اہم علاقے حاصل کر لیے۔ پروشیا نے سیکسنی کے الحاق کے علاوہ مغربی جرمنی میں ہوہینزولرن خاندان کی بکھری ہوئی زمینوں کی جگہ ایک نیا صوبہ حاصل کر لیا، جس کا نام ”صوبۂ رھائن“ رکھا گیا۔ آسٹریا بلجیم کھو بیٹھا، کیونکہ اسے نیدرلینڈز کی بادشاہی میں شامل کر دیا گیا، مگر اسے لمبارڈی کا پرانا ہیپسبرگ علاقہ مل گیا اور وینس بھی اسی میں شامل ہو گیا، بلکہ نپولین کے وہ علاقے بھی آسٹریا ہی نے حاصل کر لیے، جنھیں ایریائی صوبے کہا جاتا تھا اور جو بحیرۂ ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھے۔

اٹلی میں بھی وی آنا کی کانگرس نے روایتی سیاسی افتراق کی تصدیق کر دی۔ جنوب میں نیپلز کے اندر بوربون بادشاہی بحال ہو گئی۔ وسط میں پاپائی جاگیریں پوپوں کو مل گئیں۔ شمال مغرب میں جینوآ، پیڈمان سارڈینیا کی بادشاہی کو مل گیا۔ آسٹریا کو اٹلی میں برتر حیثیت حاصل رہی کیونکہ لمبارڈی اور وینس پر براہِ راست قبضے کے علاوہ دوسری اطالوی ریاستوں سے بھی ہیپسبرگوں کے خاندانی تعلقات تھے۔

علاوہ بریں وی آنا کی کانگرس نے سوئٹزرلینڈ کی خود مختار جمہوریت بحال کر دی، بلکہ اس میں کسی قدر توسیع کر دی گئی۔ ناروے کو ڈنمارک کی حکومت سے نکال کر سویڈن کی حکومت میں شامل کر دیا گیا۔ اس کے معاوضے میں سویڈن نے فنلینڈ روس کو دے دیا۔ برطانیہ کو مالٹا مل گیا، جو بحیرۂ روم کے وسطی حصے پر تصرّف کا وسیلہ تھا۔ یورپ سے باہر ہالینڈ کی سابقہ نوآبادیاں، یعنی سیلون اور راس امید اسے دے دی گئیں۔ فرانس کے لیے ابتدا میں ۱۷۹۲ء کے حدود طے ہوئے تھے، جن میں تھوڑے سے علاقے اور شامل کر دیے گئے تھے، جو اوائل انقلاب میں فرانس نے حاصل کیے تھے۔ پھر نپولین ایلبا سے چلا آیا اور ایک سو دن کے لیے ازسرِنو اس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ واٹرلو کی جنگ کے بعد فرانس کا آخری فیصلہ ہوا تو اسے ۱۷۹۰ء کے حدود دیے گئے۔ یہ حدود عملاً وہی تھے، جو نظامِ قدیم کے مطابق فرانس کو حاصل تھے۔ علاوہ بریں فرانسیسیوں کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ نپولین نے جو اعلیٰ درجے کی فنی چیزیں لے لی تھی، وہ جائز مالکوں کے حوالے کی جائیں اور فاتح اتحادیوں کو ستّر کروڑ فرانک (تقریباً چودہ کروڑ ڈالر) تاوانِ جنگ دیا جائے اور پانچ سال تک قابض فوج کا خرچ ادا کیا جائے، جو فرانس میں رہے گی۔

فرانس پر پابندیاں

وی آنا کے مدبّروں کی خواہش بہ ظاہر یہ نہ تھی کہ فرانس کو سزا دی جائے، بلکہ وہ اسے ایسی پابندیوں میں جکڑے رکھنا چاہتے تھے، جس کے بعد کسی نئے جارحانہ اقدام کا امکان نہ رہے۔ کیسلری کی پالیسی یہ تھی کہ فرانس کے ہمسایوں کو تقویت پہنچائے، تاکہ آئندہ ہر فتنہ اُٹھانے والے کو قبضے میں رکھا جا سکے۔ چنانچہ شمالی جانب فرانس کے لیے بلجیم اور ہالینڈ کی متحدہ بادشاہی قوت تھی۔ شمالی و مشرقی جانب پروشیا کا صوبۂ رہائن تھا۔ مشرق میں سوئٹزرلینڈ اور پیڈمان کی ریاستیں پھیلی ہوئی تھیں۔

نومبر ۱۸۱۵ء میں ”چہارگانہ اتحاد“[1] پر دستخط ہو گئے۔ یہ پابندیوں کا دوسرا بڑا سلسلہ تھا۔ چار اتحادی —— برطانیہ، پروشیا، آسٹریا اور روس —— وی آنا کے تصفیے کو بحال رکھنے کے لیے بہ شرطِ ضرورت قوت کے استعمال پر متفق ہو گئے۔ ہر فریق نے وعدہ کیا کہ اگر فرانس کی طرف سے کوئی جنگی اقدام ہوا تو ساٹھ ہزار فوج میدانِ جنگ میں بھیجی جائے گی۔ کیسلری کے اصرار پر اتحادیوں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وقتاً فوقتاً مشورے کرتے رہیں گے تاکہ قوموں کے امن و خوش حالی اور صلحِ یورپ کی حفاظت کے لیے نہایت مناسب تدبیریں

[1] Quadruple Alliance

سوچی جاسکیں۔ اس چہارگانہ اتحاد کا ایک مقصد یہ تھا کہ فرانس پر نگرانی و نگہبانی کا سلسلہ جاری رہے۔ دوسرا مقصد بین الاقوامی شوریٰ کے ذریعے سے حکمرانی کا تجربہ تھا۔

افسوس کہ رائے عامہ (خصوصاً انگریزی بولنے والے ملکوں کی رائے عامہ) اس چہارگانہ اتحاد کو الگزانڈر کا اتحادِ مقدس قرار دیتی رہی اور اتحادِ مقدس اس رائے عامہ کے نزدیک قبیح ترین ارتجاعی حرکت تھی۔ اتحادِ مقدس پر ستمبر ۱۸۱۵ء میں دستخط ہوئے تھے۔ یہ ایک بے ضرر سی دستاویز تھی، جس کے مطابق تجویز کر دیا گیا تھا کہ طاقتوں کی پالیسی ان حقائق کے مطابق ہونی چاہیے، جن کی تعلیم ہمارے نجات دہندہ خدا کے دائمی مذہب نے دی۔ جن بادشاہوں نے اس پر دستخط کیے، انھوں نے عہد کیا کہ:

"وہ حقیقی اور ناقابلِ فسخ برادرانہ رشتوں میں متحد رہیں گے۔ ایک دوسرے کو ہموطن سمجھیں گے۔ ایک دوسرے کو ہر مقام اور ہر موقع پر مدد دیں گے۔ اپنی اپنی رعایا اور اپنی اپنی فوجوں کے تعلق میں کنبوں کے باپوں کی روش پر قائم رہیں گے[1]...."

اگرچہ بڑے یورپی حکمرانوں میں سے اکثر نے اس اتحاد پر دستخط کیے مگر زار الگزانڈر کے سوا کسی نے اس پر سنجیدگی سے توجہ نہ کی۔ کیسلری نے اسے تصوّف اور لغویت کا ایک نہایت عمدہ کارنامہ قرار دیا۔ پوپ نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ ویٹیکن مسیحی تعلیمات کے متعلق اہلِ دنیا کی تعبیرات سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

وی آنا کے تصفیے پر تبصرہ

ویسٹ فیلیا (۱۶۴۸ء)، یوٹریکٹ (۱۷۱۳ء) اور ورسائی (۱۹۱۹ء) کے تصفیوں کے ساتھ وی آنا کا تصفیہ (۱۸۱۴-۱۵ء) یورپ کی مجموعی سیاسی تعمیرِ نو کی شاذ کوششوں میں سے ایک تھا۔ ان چاروں کوششوں میں سے وی آنا کی کوشش مختلف اعتبارات سے کامیاب ترین ثابت ہوئی۔ مثلاً اُنیسویں صدی کے چھٹے عشرے تک، جنگ کریمیا کے سوا یورپ میں کوئی بڑی جنگ نہ ہوئی اور ۱۹۱۴ء تک پورا یورپ کسی جنگ میں نہ اُلجھا۔ جو ممتاز مدبّرین وی آنا میں جمع ہوئے تھے، ان میں سے اکثر کیسلری کے ہمزبان ہو کر کہہ سکتے تھے کہ وہ دنیا کو پُرامن عادات پر واپس لے آئے۔ مفتوح چیرہ دست سے فاتحوں نے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک شاذ ہی کیا، جیسا تصفیۂ وی آنا میں کیا گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس منصوبے کے لیے اعزاز کا سہرا کیسلری کے سر ہے کہ اس نے بین الاقوامی جھگڑوں کے تصفیے کے لیے "چہارگانہ اتحاد" کے مشورے ضروری قرار دیے۔

عملاً "چہارگانہ اتحاد" نے کیسلری کے بلند مقاصد کبھی پورے نہ کیے۔ وی آنا کی کانگرس کے بعد پانچ سال کے اندر اندر یورپ میں پھر انقلاب برپا ہو گیا۔ اس سے "چہارگانہ اتحاد" میں شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ ان انقلابوں کے لیے خود وی آنا کانگرس ذمّہ دار تھی، کیونکہ اس نے آزادانہ اور قومی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔

---

[1] Translations and Reprints from the Original Sources of European History

(یورپی تاریخ کے اصل مصادر کے متعلق تراجم وطبع ثانی) جلد اول ۳ ص ۹۔

اُنیسواں باب

انقلابات کا تواتر

تمہید اُنیسویں صدی کے اوائل میں جو انقلابی لیڈر تھے، وہ ان روایات کو ترقی کے لیے بے سود پابندیاں قرار دے کر ٹھکرا رہے تھے جنھیں قدامت پسند انتہائی احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ تخت و کلیسا یعنی بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں نے جوابی انقلاب کے لیے جو اتحاد کر رکھا تھا، انقلابی لیڈر اس کے مخالف تھے اور وہ حریت، مساوات و اخوت کے داعی تھے۔ ۱۸۱۵ء کے بعد بھی انقلاب کے اس عظیم القدر نعرے کا مفہوم نہیں بدلا تھا۔ "حریت و مساوات" کا مطلب یہ تھا کہ سیاسیات میں دستوریت کا مسلک اختیار کیا جائے۔ معاشرے میں جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے جو خاص حقوق حاصل کر رکھے تھے، اُنھیں منسوخ کر دیا جائے اور اقتصادیات میں صرف چند مستثنیات کے ساتھ عدم مداخلت کے اصول کو راہِ عمل بنایا جائے۔ "اخوت" نے رفتہ رفتہ واضح ہوتے ہوتے "قومیت" کے زبردست اصول کی شکل اختیار کر لی۔ اٹلی کے مشہور آزاد خیال اور قوم پرور لیڈر مینزینی[1] نے اعلان کیا:

> "ہر قوم کا ایک خاص مشن ہے اور تمام قوموں کے لیے ضروری ہے کہ انسانیت کے عام مشن کو پورا کرنے کے لیے تعاون کریں۔ یہی مشن ہر قوم کی قومیت ہے، قومیت مقدس ہے۔"

۱۸۱۵ء کے بعد قوم پروروں کی جو نسل بروئے کار آئی، اس کے پیشِ نظر ایک مثالی نقشہ تھا۔ اس کے مطابق ہر قوم کو ایک دوسروں کے تسلط سے آزاد ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر ضروری تھا کہ تمام قومیں مل جل کر ہم آہنگی کی زندگی بسر کریں۔ اس مثالی نقشے کے اصول کو عملی سیاسیات میں ڈھالا گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ قومی آزادی اور قومی اتحاد کے لیے تحریکیں شروع ہو گئیں، مثلاً اہلِ بلجیم کی کوشش کہ ولندیزوں سے آزادی حاصل کریں۔ اہلِ پولینڈ روس کے خلاف، یونانی ترکوں کے خلاف، اسی طرح اطالوی، جرمن، چیک اور یوگوسلافی اور اہلِ ہنگری آسٹری ہیبس برگوں کی حکومت ویانا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

۱۸۲۰ء کے انقلابات ہنگامے سب سے پہلے ہسپانیہ، پرتگال اور نیپلز میں بپا ہوئے۔ ان تینوں مملکتوں میں جاگیرداروں

---

[1] Joseph Mazzini اٹلی کا مشہور محبِ وطن اور حریت پسند۔

کی مسندیں بحال ہوئیں تو "نظامِ قدیم" انتہائی ارتجاعی صورت میں برسرِکار آگیا۔ آبادی کی اکثریت نے اس کا استقبال اطمینان سے نہیں، جوش و خروش سے کیا۔ طبقۂ امراء اس لیے خوش ہو گیا کہ اس کے قدیم حقوق بحال ہو گئے۔ غریب اور ناخواندہ کسانوں نے متعارف روایات کا خیر مقدم کیا، مگر ایک چھوٹی سی اقلیت نے ـــــ جو زیادہ تر طبقہ اوسط کے آدمیوں نیز اہلِ علم اور اہلِ فوج پر مشتمل تھی، روشن فکری کی ان اصلاحات کے محو ہو جانے پر شدید پشیمانی کا اظہار کیا، جو نپولین نے نافذ کی تھیں۔ آزاد خیال اقلیت کی یہ بے اطمینانی سنہ ۱۸۳۰ء کی انقلابی تحریک پر منتج ہوئی۔

آشوب کی ابتدا ہسپانیہ سے ہوئی۔ جزیرہ نمائی جنگ[1] کے دوران میں قادس[2] اور دوسرے تجارتی شہروں کے نمائندوں نے سنہ ۱۸۱۲ء کا دستور مرتب کیا تھا۔ اس کے مطابق تمام بالغوں کو حقِ رائے دے دیا گیا تھا اور بادشاہ کے حقوق بہت محدود کر دیے گئے تھے۔ یہ دستور آزاد خیالی میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اسے بہ حیثیتِ مجموعی عملی دستور نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ بوربون بادشاہ فرڈی نینڈ ہفتم نے سنہ ۱۸۱۴ء میں بادشاہی سنبھالی اور دستور کو معطل کر دیا بلکہ اس کے حامیوں پر سختیاں کیں اور نظامِ قدیم کی عمرانی تمام باتیں ازسرِنو بحال کر دیں۔ ساتھ ہسپانوی پادریوں کے دو آلہ ہائے روحانیت پھر سے قائم کر دیے: اوّل یسوعی فرقہ[3]، دوم مجلس تفتیشِ عقائد[4]۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ ہسپانیہ کی جو نوآبادیاں امریکہ میں تھیں انھیں دوبارہ قبضے میں لے آئے۔

نوآبادیوں میں آزادی کی جو تحریک جاری ہوئی تھی، اسے ابتدائی کامیابی بوئنوس آئرس[5] میں حاصل ہوئی (سنہ ۱۸۱۰ء) پھر یہ تحریک ہسپانیہ کے دوسرے امریکی مقبوضات میں پھیل گئی۔ بغاوت کا براہِ راست سبب یہ ہوا کہ نوآبادیوں کے لوگ نہ تو نپولین کے بھائی جوزف بوناپارٹ کو اپنا بادشاہ[6] تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے، نہ وہ نوآبادیوں اور ہسپانیہ کے درمیان ان گہرے روابط کے حق میں تھے، جو ہسپانوی محبانِ وطن کی طرف سے تجویز ہو رہے تھے۔ ہسپانیہ کے امریکی مقبوضات کی، تحریکِ آزادی کے پسِ پردہ دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے مثلاً امریکہ اور فرانس کے انقلابوں کی پُرتاثیر مثالیں، برطانیہ کی ہمدردانہ دلچسپی (اور برطانیہ کو برابر یہ اضطراب رہا کہ امریکی نوآبادیوں کی زیادہ نفع بخش منڈیوں کو ہسپانویوں کے تجارتی نظریۂ زر کی پابندیوں سے آزاد کرائے) سب سے آخر میں وہ تلخی اور خفگی تھی جو ہسپانوی گورنروں کی بے پروایانہ حکمرانی کے باعث مدت سے نوآبادیوں کے باشندوں میں پرورش پا رہی تھی۔ فرڈی نینڈ ہفتم نے دھمکی دے دی کہ باغیوں کو فوجی قوت سے کچل دیا جائے گا۔ چنانچہ فوج امریکی نوآبادیوں میں بھیجنے کی غرض سے اس نے اپنے چھوٹے سے بیڑے میں اضافہ ضروری سمجھا اور

---

1. اس سے مراد ہے وہ جنگ جو نپولین کے اخراج کے ساتھ جزیرہ نمائے پرتگال و ہسپانیہ میں ہوئی۔
2. Cadiz ہسپانیہ کی مشہور بندرگاہ جو جنوب و مغرب میں ٹرلفاگر (طرف الغار) کے پاس ہے۔
3. Jesuits
4. Inquisition یعنی تفتیشِ عقائد کے بعد سزا دینے والی مذہبی انجمن۔
5. Buenos Aires (ارجنٹینا جنوبی امریکہ) کا مرکزِ حکومت۔
6. نپولین نے سنہ ۱۸۰۸ء میں اپنے بھائی جوزف کو ہسپانیہ کا بادشاہ بنا دیا تھا۔

روس سے تین جہاز خرید لیے، جن میں سوراخ تھے اور ان سے پانی رس رس کر اندر آتا تھا۔ ۱۸۱۹ء کے اواخر میں یہ نیا بوقلموں بیڑا بیس ہزار فوج کے ساتھ قادس سے لنگر اُٹھانے کے لیے تیار تھا۔

یہ بیڑا روانہ نہ ہو سکا۔ یکم جنوری ۱۸۲۰ء کو قادس میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ آزاد خیال کرنیل ریگو[1] اس بغاوت کا رئیس تھا۔ جلد ہی میڈرڈ، برسلونا[2] اور دوسرے ہسپانوی شہروں میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ انقلابی ریگو کا تیار کیا ہُوا گیت گا رہے تھے جس میں ٹیپ کا مصرع یہ تھا: "اے ننگی جا او کتے!" اس سے مراد ۱۸۱۲ء کا دستور تھا۔ آخر فرڈی ننڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پرتگال اور اٹلی کی آزاد خیال اقلیتوں نے بھی ہسپانوی انقلابیوں کی پیروی کی۔ ۱۸۲۰ء میں حکومت پرتگال کا کاروبار ایک فوجی گروہ نے سنبھال لیا۔ مجلس تفتیش عقائد منسوخ کر دی اور ۱۸۱۲ء کے ہسپانوی دستور جیسا ایک دستور بنا لیا۔ نیپلز کا انقلاب اس گروہ کا کام تھا جسے کاربوناری[3] (زغال سوز) کہتے تھے۔ یہ ایک خفیہ انجمن تھی جس کا پروگرام مبہم سا تھا، مگر آزاد خیالی پر مبنی تھا اور اس کے ارکان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ یہ انجمن ابتدا میں فرانس کے مقابلے کے لیے بنی تھی، مگر اب اس نے فرڈی ننڈ اول کی مخالفت شروع کر دی جو دو سسلیوں[4] کا بادشاہ تھا اور رشتے میں ہسپانیہ کے فرڈی ننڈ ہفتم کا چچا لگتا تھا۔ اپنے ہسپانوی بھتیجے کی طرح نیپلز کے فرڈی ننڈ نے بھی ۱۸۲۰ء میں انقلاب کے ابتدائی آثار دیکھتے ہی سر جھکا دیا اور ہسپانوی وضع کا دستور منظور کر لیا۔

۱۸۲۰ء کی انقلابی تحریک جس تیزی سے ابھری تھی، اسی تیزی سے فرو ہو گئی۔ ۱۸۱۲ء کا ہسپانوی دستور ان مملکتوں میں کامیاب نہ ہو سکا، جن کی آبادیاں خود اختیاری حکومت کے تجربے سے بالکل نا آشنا تھیں۔ مزید برآں نئے آزاد خیال مدبرین بھی ایک لحاظ سے اتنے ہی نااہل تھے، جتنے دونوں فرڈی ننڈ (یعنی فرڈی ننڈ اول شاہ نیپلز اور فرڈی ننڈ ہفتم شاہ ہسپانیہ) جو اصلاحات عجلت سے نافذ کی گئیں، ان سے ملکی آبادی کا بڑا حصہ بے تعلق ہو گیا اور بڑی طاقتوں کے قدامت پسند لیڈروں کو بھی ان اصلاحات نے چونکا دیا۔

انقلاب کے خلاف اقدامات (۱۸۲۱ء – ۱۸۲۳ء)

۱۸۲۰ء کے انقلابات میں تصفیۂ وی آنا کی استواری اور "اتحاد چہارگانہ" کے استحکام کی آزمائش ہوئی۔ اس آزمائش میں تصفیۂ وی آنا بالکل صحیح و سالم رہا، مگر اتحاد چہارگانہ تباہ ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں اٹلی اور ہسپانیہ کے اندر جائز وارث بحال ہو گئے، لیکن اس بحالی کے سلسلے میں اتحاد چہارگانہ کے شرکا دو حصوں میں بٹ گئے۔ برطانیہ میں دوسری مملکتوں کے داخلی معاملات کے اندر دخل دینے سے احتراز کا رجحان پہلے

۱۔ Riego ۲۔ Barcilona ہسپانیہ کی مشہور بندرگاہ۔ ۳۔ Carbonari

۴۔ Two Sicilies یعنی سسلی اور نیپلز۔

ہی موجود تھا اور یہ تدریجاً بڑھتا گیا۔ آسٹریا، روس اور پروشیا کا رجحان یہ تھا کہ انقلاب کو دبانے کے لیے مسلح مداخلت کی جائے، چنانچہ یہ تینوں طاقتیں اسی مسلک پر گامزن رہیں۔

انقلاب اس وقت نمایاں ہوا، جب ۱۸۲۰ء کے اواخر میں "اتحاد چہارگانہ کے نمائندوں کا اجتماع ٹروپا[1] (سیلیشیا) میں ہوا۔ کیسلری کو علم تھا کہ نیپلز کے انقلاب نے اٹلی میں ہیپسبرگ خاندان کی برتری کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس پر راضی تھا کہ آسٹریا نیپلز کے معاملات میں دخل دینا چاہے تو دے، مگر اتحادیوں کو اس میں آسٹریا کا ہاتھ نہ بٹانا چاہیے۔ کیسلری نے اعلان کیا، اتحاد کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ:

"دنیا بھر پر حکمرانی کے لیے یا دوسری مملکتوں کے داخلی معاملات میں نگرانی کی غرض سے ایک متحدہ قوت کے طور پر کام کیا جائے۔

اگر یورپ کے نظام کو حقیقی خطرہ پیدا ہوا تو ہم اپنی اپنی جگہ سنبھال لیں گے، اگر برطانیہ ذہنی اور قیاسی اصول احتیاط پر حرکت میں نہیں آسکتا اور نہیں آئے گا[2]۔"

اس کے برعکس میٹرنخ عزم کیے بیٹھا تھا کہ اتحاد ہر معاملے میں کارفرما ہو، کیسلری کو اس سے سخت اختلاف تھا۔ میٹرنخ چاہتا تھا کہ نیپلز کے معاملات میں آسٹریا کی مداخلت کے لیے پوری اخلاقی حمایت کی جائے۔ برطانوی احتجاج کے باوجود آسٹریا، پروشیا اور روس نے نومبر ۱۸۲۰ء میں ٹروپا کے مسودۂ تحریر پر دستخط کر دیے۔ اس میں واضح کر دیا تھا کہ:

"جن مملکتوں کی حکومتیں انقلاب کی بنا پر بدلیں، ان سے دوسری مملکتوں کو بھی خطرہ پیدا ہوا، لہٰذا وہ یورپی اتحاد میں شریک نہیں رہ سکتیں اور انھیں اُس وقت تک الگ رکھا جائے گا، جب تک حالات آئینی نظم و استواری کی یقینی صورت اختیار نہ کر لیں۔

اگر اس قسم کی تبدیلیوں کے باعث دوسری ریاستوں کے لیے فوری خطرہ پیش آجائے تو معاہد قوتیں اقرار کرتی ہیں کہ پُرامن ذرائع سے یا ضرورتاً قوت سے کام لے کر مجرم مملکت کو "اتحاد کبیر" میں واپس لائیں گی[3]۔"

معاہدہ ٹروپا کی شرطوں کے مطابق آسٹروی فوج نے ۱۸۲۱ء میں نیپلز کی انقلابی حکومت کو ختم کر دیا اور ۱۸۲۳ء

---

[1] Troppan یہ مقام آج کل شمالی چیکوسلواکیہ میں ہے۔ کپڑے، مشینری اور کھانڈ کی صنعت کا مرکز ہے اور اس کا موجودہ نام اوپاوا (Opava) ہے۔

[2] British Foreign and State Papers

[3] The Confederation of Europe ص ۲۰۸-۲۰۹۔

میں فرانسیسی فوج کوہستان پرینیز سے گزر کر ہسپانیہ میں داخل ہوئی اور وہاں فرڈی ننڈ ہفتم کا مطلق العنان اقتدار قائم کر دیا۔ فرڈی ننڈ کے حکم کے مطابق ہسپانیہ کے سیکڑوں آزاد خیال افراد کو موت کی سزا دی گئی۔ کرنل ریگو کی نعش کے پانچ ٹکڑے کر لیے گئے، تاکہ ان پانچ شہروں میں ان کی نمائش کی جائے، جو ہسپانوی دستوری حکومت کے مرکز تھے۔ ہسپانیہ میں فرانسیسیوں کی مداخلت پر برطانیہ نے زبردست احتجاج کیا۔ اس طرح "اتحاد چہار گانہ" درہم برہم ہوگیا۔

۱۸۲۲ء میں کیسلری کی جگہ کیننگ[1] برطانیہ کا وزیر خارجہ مقرر ہوا۔ اسے شبہ تھا کہ برّاعظم یورپ کی قوتیں شاید ہسپانیہ کی امریکی نوآبادیوں کو واپس لینے کی کوشش کریں۔ بالکل یہی شبہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو تھا اور ریاستہائے متحدہ کی حکومت لاطینی امریکہ کی جمہوریتوں کو تسلیم کر چکی تھی۔ جمہوریۂ امریکہ کو یہ شبہ بھی تھا کہ شاید روس ایلاسکا[2] سے ساحل بحرالکاہل کے ساتھ ساتھ جنوبی جانب پیشقدمی کرے اور برطانیہ بحیرۂ کریبیا میں اپنا دائرۂ اقتدار بڑھانے کے لیے قدم اُٹھائے۔ لہذا جب کیننگ نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے ایک بیان لاطینی امریکہ میں یورپی مداخلت کے خلاف شائع کر دیا جائے تو صدر منرو[3] کی حکومت نے اس دعوت کے قبول سے انکار کر دیا۔

منرو نے دسمبر ۱۸۲۳ء میں امریکہ کی کانگرس کے نام ایک پیغام بھیجا، جس میں وہ بیان بھی شامل تھا، جو تاریخ میں "نظریۂ منرو" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس بیان کے کلیدی فقرے ذیل میں درج ہیں:

> "یورپی طاقتوں کی جنگوں اور ان کے داخلی معاملوں میں ہم نے کبھی حصہ نہیں لیا اور ایسا کرنا ہمارے لیے زیبا بھی نہ تھا۔ اگر ہمارے حقوق پر حملہ کیا جائے یا وہ سخت خطرے میں پڑ جائیں تو ہمارے دل میں یقیناً ناراضی پیدا ہوگی یا ہم اپنے دفاع کے لیے تیاری شروع کر دیں گے۔ اس نصف کُرے (براعظم امریکہ) کی تحریکات سے ہمیں لازماً قریبی وابستگی ہے اور اس کے اسباب تمام روشن فکر اور غیر جانبدار ناظروں پر آشکارا ہیں۔ متحدہ طاقتوں کا سیاسی نظام اس بنا پر اساساً امریکی نظام سے مختلف ہے...... لہذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ صفائی سے اعلان کر دیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ان طاقتوں کے درمیان موجودہ خوشگوار تعلقات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اگر ان طاقتوں کی طرف سے اس نصف کُرے کے کسی حصے میں اپنے نظام کی توسیع کے لیے کوشش کی گئی تو یہ ہمارے امن و تحفظ کے لیے خطرے کا باعث ہوگی۔ ہم نے

---

[1] Canning [2] Alaska ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست جو کینیڈا کے مغرب میں واقع ہے، یہ علاقہ پہلے روس کے پاس تھا، بعد میں امریکہ نے اسے روس سے خرید لیا تھا۔ [3] Monroe وہ ۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۵ء تک دو مرتبہ امریکہ کا صدر رہا۔ ۱۸۳۱ء میں وفات پائی۔

> موجودہ نوآبادیوں یا کسی یورپی طاقت کے ملحقات میں مداخلت نہیں کی اور کبھی نہیں کریں گے، مگر جو حکومتیں آزادی کا اعلان کر چکی ہیں اور انھوں نے آزادی بحال رکھی ہے۔ نیز ہم نے خاصے غور و فکر اور منصفانہ اصول پر اُن کی آزادی تسلیم کر لی ہے ہم ان پر کسی یورپی طاقت کی طرف سے جبراً کوئی نظام عائد کرنے یا کسی دوسرے طریقے پر ان کی تقدیر ضبط و نظم میں لانے کی حرکت کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے خلاف غیر دوستانہ ارادے کے مظاہرے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھیں گے۔

یہ مشہور دستاویز امریکی جمہوریتوں کی طرف سے اعتمادِ نفس اور اہم اعلانِ مسلک کا ایک ممتاز کارنامہ تھی، لیکن اس کی فوری بین الاقوامی حیثیت بالکل معمولی تھی۔ یورپی طاقتوں نے اس امر کا قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ہسپانیہ کی امریکی سلطنت بحال کر دیں اور اگر وہ طاقتیں اس عزم سے باز رہیں تو وہ نظریۂ منرو کی وجہ سے نہیں، بلکہ کیننگ اور برطانوی حکومت کی مخالفت کے باعث باز رہیں۔ انھیں برطانوی بیڑے کی مخالفت کا خطرہ تھا۔

یونان کی جنگ آزادی (۱۸۲۱ء ۔ ۱۸۲۹ء) برطانوی بیڑے نے بہت جلد قومی آزادی کی ایک اور کوشش کو کامیاب بنانے میں اہم حصہ لیا، یعنی سلطنت عثمانیہ کے خلاف یونانی بغاوت۔ اس انقلاب کی قیادت اس گروہ کے ہاتھ میں تھی، جسے عموماً "جزائری یونانی" کہتے تھے۔ یہ بحیرۂ ایجہ کے جزیروں اور بندرگاہوں کے تاجر تھے جو مشرق قریب کی تجارت پر چھائے ہُوئے تھے اور انھوں نے وی آنا، مارسائی، لندن اور اوڈیسہ (بحیرۂ اسود میں روسی بندرگاہ) میں کامیاب تجارتی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ ان لوگوں نے صرف پُرانی یونانی تجارتی روایت ہی کو زندہ نہ کیا، بلکہ خود اختیاری حکومت کے لیے قدیم جوش بھی تازہ کر دیا۔ انھوں نے اپنے جزائری جزیروں اور دُور افتادہ تجارتی مرکزوں سے لبریز حُبِّ وطن اعلانات و مواعظ کا سیل بہا دیا، نمونے کی اپیل میں دورِ حاضر کے یونانیوں کو برانگیختہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا!

> "اپنی قوم کا قدیم احترام یاد کرو۔ سوچو کہ تم ہومروں اور ارسطوؤں، افلاطونوں اور سفوکلیزوں[1] کے نمائندے ہو، جن کی کاوشوں سے یونان نے عظمت حاصل کی جب وہ زندہ تھے، ان کے ناموں کا احترام کیا جاتا تھا۔ یونان پر زوال طاری ہو گیا، مگر ان کی یادیں بدستور زندہ ہیں۔ اب اپنے ملک کے رہنما اور معلّم تم ہو۔ وہ وقت قریب آ رہا ہے، جب تمھیں قانون سازی کرنی پڑے گی۔"[2]

ثقافتی اور تہذیبی معاملات میں یونانی قوم پروری نے ایک مہم کی شکل اختیار کر لی جس کا مقصد یہ تھا کہ یونانی زبان کو ترکی اور سلافی الفاظ سے پاک کر کے از سرِ نو عہد پیریکلیز[3] کی کلاسیکی زبان بنا دیا جائے۔ سیاسی دائرے میں اس قوم پروری نے ایک خفیہ انجمن کی شکل

۱؎ Sophocles اصل عبارت میں یہ نام نیز دوسرے نام بہ طور جمع استعمال ہُوا ہے۔ یہ یونان کا مشہور ڈراما نگار تھا۔

۲؎ by Tannent History of Modern Greece ٹینِنٹ کی کتاب تاریخ یونان حاضر)۔

۳؎ Pericles یونان کا مشہور مدبّر (وفات ۴۲۹ ق م)

اختیار کی، جو اٹلی کے "زغال سوزوں" اور فری میسنوں کے نمونے پر بنائی گئی تھی۔

۱۸۲۱ء کے اوائل میں سازشیوں نے موریا[1] (قدیم پیلو پونی سوس) کے دہقانوں میں بغاوت برپا کر دی۔ اس پر جو جنگ آزادی چھڑی، وہ ابتدا ہی سے شدید و خونریز تھی۔ موریا کے کسانوں نے ہر اُس ترک کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جو اُن کی دسترس میں آگیا۔ حکومت عثمانیہ نے اس کے بدلے میں زد و کشت کے علاوہ تیس ہزار یونانیوں کو غلام بنا کر بیچ دیا اور یہ لوگ بحیرۂ ایجہ کے خوشحال جزیرے چیوس[2] (سیو) کے باشندے تھے۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر دیلا کرائے نے ایک مشہور تصویر بنائی[3]۔ بغاوت فرو کرنے کے سلسلے میں عثمانی سلطان نے اپنے طاقتور مصری باجگزار محمد علی پاشا سے بھی مدد لی۔ ۱۸۲۷ء تک صاف نظر آرہا تھا کہ محمد علی پاشا نے جس تعزیری مہم کا انتظام کیا تھا، اس میں باغیوں کا آخری گڑھ بھی مسخر ہو جائے گا۔ پھر برطانیہ، فرانس اور روس یونان کی آزادی کو بچانے کی غرض سے نہایت نازک وقت پر حرکت میں آئے[4]۔

ان تین طاقتوں کا عمل رائے عامہ اور اہم جنگی مقامات کے جذبۂ حفاظت کے مشترکہ دباؤ کا نتیجہ تھا۔ برطانیہ اور فرانس، بلکہ جرمنی اور ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں حمایتِ یونان کی تحریک کے لیے بڑے بڑے گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ شیلے نے ۱۸۲۱ء میں اعلان کیا کہ ہم سب یونانی ہیں:

> "ہمارے قوانین، ہمارا ادب، ہمارا مذہب، ہمارے فنون ان سب کی جڑیں یونان میں ہیں۔ اگر
> یونان نہ ہوتا تو روما اپنے جنگی اسلحہ کے ذریعے سے کوئی روشنی نہ پھیلا سکتا اور شاید ہم اب تک
> وحشی اور بُت پرست رہتے[5]۔"

یونانیوں کی حامی مجلسوں نے رسد اور روپیہ بھیجا۔ مہذّب حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ کھلّم کھلّا مداخلت کریں۔ مداخلت کا انحصار روس کے عمل پر تھا۔ ملکہ کیتھرائن نے روس کو ترکی کے "مردِ بیمار" کا ولیعہد مقرر کر دیا تھا اور روس ہی ان مسیحیوں

---

[1] Morea اس کا قدیم نام Peloponnesus تھا۔ [2] (Scio) Chios

[3] (مترجم) دیکھیے یہاں بھی مذہبی تعصب کار فرما رہا۔ دیلا کرائے مسیحی تھا اس نے یونانی مظلومیت کو ابھارنے کی کوشش کی، لیکن آفاقی انسانیت دوست کی حیثیت میں ان مظلوم ترکوں کا کوئی خیال نہ آیا، جو بے خبری کے عالم میں نام نہاد یونانی حریت خواہوں کے ہاتھوں مارے گئے، گویا یورپ میں فن، روشن خیالی اور آزادی خواہی بھی خاص مذہب کی پابند تھی۔

[4] (مترجم) یہاں پھر مذہبی تعصّب سب کے سامنے ہے۔ فرانس برطانیہ اور روس تینوں بیرونی علاقوں اور ملکوں پر قابض تھے۔ چونکہ وہ ملک اور علاقے مسیحی نہ تھے، اس لیے ان کی آزادی کا کوئی خیال نہ آیا، مگر اس یونان کی آزادی کا خیال ضرور آیا جس کے باشندے آزاد حکومت کے اہل ہی نہ تھے، جیسا کہ آگے چل کر ثابت ہوا۔ [5] شیلے کی نظم ہیلاس (Hellas یہ نام یونان کے لیے مستعمل تھا) کی تمہید۔

کا محافظ تھا، جو ترکوں کی حکومت میں مقیم تھے۔ یونانی محبانِ وطن نے روسیوں کی امداد سے روس کی سرزمین پر بہ مقام آڈیسہ ایک خفیہ انجمن بنائی۔ کچھ وقت تک میٹرنخ نے روس کو روکے رکھا، پھر روس کھلّم کھلّا یونانی تحریک کا حامی بن گیا۔ برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں پر بھی یونان کی حمایت کے پروپیگنڈے میں برابر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اب یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر روس تنہا یونانیوں کی حمایت میں سرگرم رہا تو پورے مشرق قریب پر وہی اقتدار حاصل کرلے گا اور "مردِ بیمار" کی موت قریب تر آجائے گی۔ چنانچہ تین طاقتوں کی مشترکہ مداخلت کے سوا کوئی ایسا ذریعہ نظر نہ آیا، جو ایک طرف یونانیوں کو بچا سکتا، دوسری طرف روسیوں کا اقدام روک سکتا۔[1]

یہ دونوں مقصد "کُلّاً" نہیں، صرف جزواً پورے ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں روس، برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ بیڑے نے ترکی اور مصری جہازوں کو ڈبو دیا، جو مغربی یونان میں بہ مقام نوارینو[2] ٹھہرے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی یونانیوں کا ایک بڑا مرکز تباہ ہوگیا۔ ۱۸۲۹ء میں معاہدۂ ادرنہ (ایڈریانوپل) ہوا۔ اس میں روس کو ترکی کا براہِ راست بہت تھوڑا علاقہ ہتھیا لینے کی اجازت دی، مگر سلطنتِ عثمانیہ کے جو صوبے دریائے ڈینیوب پر واقع تھے یعنی مالڈیویا[3] اور ولاشیا[4] عملاً روس کی حفاظت میں دے دیے گئے۔ یہی دونوں صوبے امروزہ رومانیہ کی بنیاد بنے۔ مدّت تک کشمکش جاری رہی، پھر یورپی طاقتوں نے ایک معمولی سی خود مختار یونانی ریاست رسمی طور پر تسلیم کرلی اور یونانیوں کی خاصی بڑی آبادی بدستور سلطنتِ عثمانیہ میں رہی۔ سرگرم تلاش کے بعد بویریا کے ایک شہزادے اوٹو[5] کو، جو رجعت پسند تھا، یونان کے نئے تزلزل تخت پر بیٹھنے کے لیے راضی کرلیا۔

اس یونانی جنگ میں نہ قوم پروری کو پوری فتح حاصل ہوئی اور نہ آزاد خیالی کو۔ یونانی محبّانِ وطن ایسے موقع کے لیے کوشاں رہے کہ اپنی نئی سلطنت کی حدیں بہت وسیع کرلیں۔ یونانی مدبّروں نے خود اس مختصر سی ریاست کی استواری بھی خطرے میں ڈال دی۔ یونانی آزادی کے جو محبّ ملک سے باہر بیٹھے تھے، انھوں نے بادشاہ اوٹو کو چیلنج دے دیا اور وہ لامتناہی جھگڑے جاری ہوگئے، جنھوں نے آزادی کی سخت کشمکش میں بھی انھیں تفرقے کا شکار رکھا۔

روس میں دسمبریوں کی بغاوت روس نے دوسرے ملکوں میں انقلاب کے نتائج کا تصفیہ کرنے میں انتہائی سرگرمی دکھائی

---

[1] (مترجم) دیکھیے یہاں یونان کی آزادی نہیں، بلکہ روس، برطانیہ اور فرانس کا سامراج یا اس کی مصلحتیں بروئے کار آیا۔

[2] Navarino (مترجم) یہاں طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترکی اور مصری بیڑے کی تباہی کیوں عمل میں آئی۔ کیا سلطنتِ عثمانیہ کو اپنے علاقوں کی حفاظت کا حق حاصل نہ تھا؟ یہ بھی نہ آزادی تھی، نہ روشن خیالی، بلکہ اسلام دشمنی تھی اور مذہبی تعصب۔

[3] Wallachia [4] Moldavia [5] Otto

تھی، اب خود اس کے اندر بھی انقلابی لہریں اُٹھیں، اگرچہ ان کی قوت زیادہ نہ تھی۔ دسمبر ۱۸۲۵ء میں ایک مختصر سی بغاوت ہوئی اور جنوری ۱۸۲۶ء میں زار الگزانڈر اوّل نے وفات پائی۔ اس بغاوت کے لیڈروں کو دسمبری[1] کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اصلاحات کا ایک اچھا پروگرام جاری کرنے اور اسے توسیع دینے کی ناکام کوشش کی، جسے زار خود جاری کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔

الگزانڈر نے حکومت کے ابتدائی دور میں وعدہ کر لیا تھا کہ وہ روس میں وسیع انتظامی تغیرات پیدا کر دے گا۔ اس کی تعلیم و تربیت دادی کیتھرائن کے ایماء پر روشن خیالی کے ترقی یافتہ افکار میں ہوئی تھی۔ اس نے بیسٹیل کے سقوط کی خبر سنی تو خوش ہُوا اور فرانس کے ابتدائی انقلابیوں کے مقاصد سے اسے عمومی ہمدردی تھی۔ اس پر ایک سازش میں شرکت کا الزام لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے باپ پال اوّل کا گلا گھونٹا گیا (۱۸۰۱ء) تخت پر بیٹھتے ہی الگزانڈر نے اپنے گرد روشن خیال نوجوان امراء اور دوسرے آزاد خیال لوگوں کا ایک حلقہ جمع کر لیا، جو غلاموں کی حالت سدھارنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور دوسرے تغیرات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان آزاد خیال لوگوں میں سے ایک سپیرنسکی[2] تھا، جس نے دستور کا مسودہ تیار کیا۔ اس مسودے کے مطابق مقامی، صوبائی اور قومی سطحوں پر نمائندہ مجلسیں قائم ہو جاتیں۔

ان بڑے بڑے منصوبوں کا عملی نتیجہ بہت کم نکلا۔ الگزانڈر نے بڑے بڑے زمینداروں کو نجی طور پر اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو غلاموں کو آزاد کر دیں، لیکن اس سے غلاموں کی صرف ایک فی صد آبادی کو نفع پہنچا اور الگزانڈر نے نمائندہ حلقوں کے ذریعے انتظامات کا پرپیچ سلسلہ ختم کر دیا اور حکومت کے مختلف محکموں میں انفرادی ذمّہ داری کا عام نظام جاری کر دیا۔ یہ تغیر بلاشبہ روشن خیالی پر مبنی تھا، مگر اس سے مطلق العنانی کو تقویت پہنچی اور اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی۔ ابتدا ہی سے اکثر امراء زار کی آزاد خیالی کے سخت مخالف رہے۔ ۱۸۱۲ء میں سخت نازک حالات پیدا ہو گئے، پھر نپولین نے حملہ کر دیا۔ اس حالت میں ہر انتظامی اور اصلاحی چیز گلدستۂ طاقِ نسیاں بن گئی۔

جب امن قائم ہو گیا تو الگزانڈر نے پھر آزاد خیالوں کو امّید بندھائی۔ اس نے پولینڈ اور فن لینڈ کے ان علاقوں کے لیے دستور منظور کیے، جو وی آنا کے تصفیے میں حاصل کیے گئے تھے، مگر روس کو کچھ نہ دیا۔ الگزانڈر نے وی آنا، ٹروپا اور دوسرے مقامات پر جو سفارتی کارنامے انجام دیے تھے، ان سے مسحور ہو کر اس نے اپنا دو تہائی وقت روس سے باہر صرف کیا۔ خود روس میں اس نے تعلیم پر سخت ضبط و نظم قائم کر لیا۔ ریاضیات کے اساتذہ کو ہدایت کر دی کہ مثلّث کو تثلیث کا نشان ہونے پر زور دیتے رہیں۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ فوج کے لیے رنگروٹ برابر مہیا ہوتے رہیں، ساتھ ہی حکومت کا بڑھا ہُوا خرچ گھٹ جائے۔ اس غرض سے اس نے فوجی نوآبادیوں کا منصوبہ تیار کیا۔ اس

---

[1] Decembrists انھیں دسمبری اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی بغاوت دسمبر میں ہوئی۔

[2] Speransky

منصوبے کے مطابق سپاہیوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ زمین لے کر آباد ہوں، کسان عورتوں سے شادیاں کریں۔ ان کے بچے پیدا ہوں تو وہ فوجی خدمات انجام دیں۔ اس طرح الگزانڈر نے پانچ لاکھ سے زیادہ لوگوں کو خلاف مرضی ان نو آبادیوں میں دھکیل دیا۔ یہ منصوبہ اس وجہ سے اور بھی مکروہ ہو گیا کہ اس کا نگراں ایک جاہل افسر کو مقرر کیا، جس کا نام آراک چیو[1] تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ایک سپاہی کو ضبط و نظم سکھاتے ہوئے اس کا کان کاٹ لیا۔ جو کسان عورتیں اس کی جاگیروں پر آباد تھیں، انھیں مجبور کرتا کہ ہر سال ایک بیٹا جنو، ورنہ جرمانہ ادا کرو۔

زار کی پالیسی پر اوہام پرستی اور رجعت کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ ملک میں آزادی کے خیالات داخل ہو رہے تھے۔ نسبتاً روشن فکر مغرب اور پسماندہ روس کے درمیان جو نمایاں فرق تھا، اس سے ان تمام افسروں پر گہرا اثر پڑا، جو نپولین کے خلاف مہموں میں شریک رہے۔ جن دسمبریوں نے آگے چل کر بغاوت کی، ان کے ایک لیڈر کا بیان سن لیجیے:۔

"ہم فرانس سے سمندر کے راستے روس واپس آئے۔ فوجی گارد کا پہلا ڈویژن اورانین بام[2] میں لنگر انداز ہوا اور اس نے فتح کے شادیانے سُنے..... دعا کے دوران میں پولیس اُن لوگوں کو بیدردی سے مار رہی تھی، جو صف بند فوجوں کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے.... پھر زار نمودار ہوا۔ محافظ دستہ اس کے ساتھ تھا۔ وہ خود بادامی رنگ کے خوب صورت گھوڑے پر سوار تھا۔ برہنہ تلوار علم تھی۔ اس تلوار کو ملکہ کے روبرو جھکانا تھا۔ عین اس موقع پر ایک کسان بازار سے گزرتا ہوا اس کے گھوڑے کے پاس پہنچا تو زار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور برہنہ تلوار سے بھاگتے ہوئے کسان کی طرف بڑھا۔ پولیس نے اس بچارے پر لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے نگاہیں پھیر لیں اور اپنے محبوب زار کی روش پر شرم میں ڈوب گئے"[3]

سینٹ پیٹرزبرگ میں اعلیٰ درجے کے افسروں نے ایک خفیہ انجمن بنائی، جسے "انجمن شمالی" کہتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ روس کو ایک ایسی بادشاہی بنا دیا جائے، جس کے اختیارات محدود ہوں اور زیادہ تر انتظامی حقوق صوبوں کی طرف منتقل کر دیے جائیں۔ گویا صوبوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں، جو جمہوریہ متحدہ امریکہ کی ریاستوں کو حاصل ہیں۔

---

[1] Arakcheev [2] Oranienbaum خلیج فن لینڈ کے جنوبی ساحل کی ایک بندرگاہ۔ [3] اناطول جی مزور (Anatole G Mazour) کی کتاب The First Russian Revolution پہلا روسی انقلاب) ص ۵۵۔

زرعی غلاموں کو آزاد کر دیا جائے، البتہ انھیں زمین دینے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ تمام اصلاحات پُرامن طریقے پر نافذ کرنا منظور تھا۔ ایک اور خفیہ انجمن جنوبی روس میں منظم ہو گئی، اس لیے اسے "انجمن جنوبی" کہتے تھے۔ یہ زیادہ انتہا پسندانہ تھی۔ کرنل پیسٹل اس کا لیڈر تھا۔ اس فوجی افسر کے افکار جیکوبنوں کے سے تھے اور اس کی رکنیت زیادہ تر اُن افسروں پر مشتمل تھی، جو نسبتاً مفلس ہو چکے تھے۔ ہر مسئلے پر "انجمن جنوبی" کا پروگرام "انجمن شمالی" سے بہت آگے جاتا تھا۔ "انجمن جنوبی" روس میں ایک ایسی جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھی جس کے تمام اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ہوں۔ نیز اس کی خواہش تھی کہ جن زرعی غلاموں کو آزاد کیا جائے انھیں زمینیں بھی دی جائیں اور حصولِ مقاصد کے لیے قوت و تشدد سے کام لیا جائے۔

دونوں انجمنوں یعنی شمالی اور جنوبی نے اس سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھانا چاہا، جو الگزانڈر اوّل کی موت کے فوراً بعد پیدا ہو گئی تھی، چونکہ اس کے کوئی بیٹا نہ تھا، اس لیے تاج و تخت طبعاً اس کے چھوٹے بھائی کانسٹنٹائن کی طرف منتقل ہو گیا، جو پولینڈ میں نائب السلطنت تھا۔ کانسٹنٹائن ایک خفیہ دستاویز کے ذریعے اپنے تمام حقوق بادشاہی چھوٹے بھائی نکولس کے حوالے کر چکا تھا، لیکن نکولس کو اس دستاویز کا کوئی علم نہ تھا۔ چنانچہ الگزانڈر کی وفات پر کانسٹنٹائن نے اعلان کر دیا کہ از روئے آئین نکولس زار ہے۔ نکولس نے اعلان کر دیا کہ اصل زار کانسٹنٹائن ہے۔ دونوں بھائی اپنے اپنے موقف کی توضیح میں مشغول تھے۔ اس اثناء میں "انجمن شمالی" نے پیٹرزبرگ کی فوج کو نکولس کے خلاف بغاوت کی دعوت دے دی چنانچہ ۲۶۔ دسمبر ۱۸۲۵ء کو باغی پیٹرزبرگ کے اس چوک میں اپنی جگہ جمے کھڑے رہے، جسے سینٹ سیکر کہتے ہیں، یہاں تک کہ نکولس نے ان کی بغاوت فرو کی۔ دو ہفتے بعد "انجمن جنوبی" نے علمِ بغاوت بلند کر دیا، لیکن اس کی ناکامی صاف مقدر نظر آ رہی تھی، کیونکہ اس کے لیڈر پیسٹل کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اگرچہ دسمبریوں کی بغاوت بہ ظاہر بہت معمولی تھی، لیکن حقیقتہً نہایت اہم واقعہ تھی۔ اس نے زار نکولس اوّل (۱۸۲۵ء۔ ۱۸۵۵ء) کو اس درجہ چونکا دیا کہ اس نے شدید مطلق العنانی کی پالیسی پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ حد درجہ غیر ہر دلعزیز آراکچیو کو الگ کر دیا اور فوجی نوآبادیاں توڑ دیں، مگر ساتھ ہی پانچ دسمبریوں کو موت کی سزا دلائی اور ایک سو سے زیادہ کو سائبیریا میں جلا وطن کر دیا۔ دسمبری دورِ حاضر کے روس کی طویل سیاسی جد و جہد کے پہلے شہید تھے۔

بیسواں باب

۱۸۳۰ء کے انقلاب

فرانس انقلاب جولائی

۱۸۳۰ء میں جو انقلابی لہر اُٹھی، وہ فرانس سے اُٹھی، جو یورپ کا روایتی مرکز تھا۔ لوئی ہیژدہم (۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۴ء) نے بوربون حکومت کی بحالی کے ساتھ حکومت کا آغاز پُرامید طریق پر کیا تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا، جسم بہت موٹا ہو گیا تھا۔ وجع المفاصل نے اسے خاصا پریشان کر رکھا تھا، تاہم اس نے اچھے تدبّر کا ثبوت دیا، اگرچہ ہر اچھا کام آہستہ آہستہ کرتا رہا۔ ابتدا ہی سے اس نے درمیانی راستہ اختیار کر لیا تھا اور اس منشور پر کاربند رہا، جو ۱۸۱۴ء میں منظور کیا تھا۔ اس کی تمہید میں اس نے شاہی استحقاق یوں واضح کر دیا تھا: "فرانس میں اختیار و اقتدار کا مرکز و مامن بادشاہ کی ذات ہے[1]"۔ اس دستاویز کے مطابق دستوری بادشاہی کا قیام منظور تھا۔ آئین سازی کے دو ایوان تجویز کیے گئے تھے۔ ایک ایوان امراء، جس کے ممبر بادشاہ نامزد کرتا تھا، دوسرا ایوان مندوبین، جس کے ممبر منتخب ہوتے تھے، مگر حق رائے حد درجہ محفوظ تھا، یہاں تک کہ فرانس کی تین کروڑ آبادی میں سے تقریباً ایک لاکھ آدمیوں، بلکہ اس سے بھی کم کو یہ حق دیا گیا تھا۔ منشور میں واضح کر دیا گیا تھا کہ حیثیت حاکمہ کا مامن بھی بادشاہ کی ذات ہے، لیکن عملاً لوئی نے بادشاہی کے حقوق محدود رکھے۔ وہ ایسے وزیر مقرر کرتا تھا جنھیں قانون سازی کے ایوان میں اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ منشور کے رو سے اکثر فیصلہ کن تغیرات کی توثیق کر دی گئی تھی، جو ۱۷۸۹ء سے فرانس میں ہو چکے تھے۔ مذہبی رواداری، قانون کے روبرو سب کی مساوات، ملکی اور فوجی عہدوں کے لیے سب کے یکساں حق کو منظور کر لیا گیا تھا۔ مجموعۂ قوانین نپولین کے ذریعے سے انقلابی دور میں املاک کا جو فیصلہ کر دیا گیا تھا، اسے بھی قبول کر لیا گیا۔

تاہم یہ منشور ان لوگوں کے لیے سخت رنجش کا باعث ہوا، جو بادشاہی کے انتہا پسند حامی تھے اور یہ سب امراء اور مذہبی پیشوا تھے، جو دورانِ انقلاب میں جلاوطن رہے اور بوربونوں کی بحالی کے بعد فرانس آئے۔ یہ رجعت پسند لوگ بادشاہ کے چھوٹے بھائی کاؤنٹ آرٹائس[2] کے گرد جمع ہو گئے اور انھوں نے وہ تمام حقوق اور املاک واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا، جو دورانِ انقلاب میں ان کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ لوئی ہیژدہم نے پانچ سال تک ان لوگوں کو کوئی قدم نہ اُٹھانے دیا۔ ۱۸۱۵ء کے انتخابات میں

۱؎ یورپی تاریخ کے ابتدائی مآخذ کے متعلق تراجم جلد اوّل ص ۳ ۔ ۲؎ Artois

ان لوگوں کو ایوانِ مندوبین کے اندر اکثریت حاصل ہو گئی تو لوئی نے ایوان کو برطرف کر دیا اور نئے انتخابات کرائے، جن کے بعد نسبتہً کم متعصب لوگوں کو اکثریت حاصل ہوئی۔ اس نے اعتدال پسند وزیر منتخب کیے جنھوں نے فاتح اتحادیوں کو تاوان ادا کرنے کا انتظام کر لیا اور فرانس کے مالیات کو منظم کر دیا۔ پھر فرانس کو ایک اور خطرہ لاحق ہوا، جو انقلاب کے خلاف تھا۔ یہ خطرہ ہسپانیہ اور اٹلی کے انقلابات سے پیدا ہوا، نیز بادشاہ کا بھتیجا ڈیوک بیری[1] قتل کر دیا گیا (۱۸۲۰ء کے اوائل میں) آخر انتہا پسندوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ لوئی ہیژدہم کو رجعت پسند وزارت کے تقرر پر مجبور کر دیا، جس نے مطابع کی آزادی پر پابندی لگا دی اور فرڈی نینڈ ہفتم کی حمایت کے لیے فرانسیسی فوجیں ہسپانیہ بھیج دیں۔

جب لوئی ہیژدہم کا انتقال ہو گیا اور انتہا پسندوں کا لیڈر آرٹائس چارلس دہم (۱۸۲۴ء۔ ۱۸۳۰ء) کے لقب سے بادشاہ بنا تو رجعت پسندی کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ چارلس کی کوشش دراصل یہ تھی کہ وقت کی سوئی پیچھے کی طرف دھکیل دے اور ایک ایسا بادشاہ بن جائے، جس کے تمام حقوق آسمانی ہوں۔ اس نے کلیسا کو زیادہ اثر پھیلانے کا موقع دے دیا۔ یسوعیوں کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی، حالانکہ ان کا وجود قانوناً فرانس میں ممنوع تھا۔ ساتھ ہی پادریوں کو مملکت کے نظامِ تعلیم میں بڑے بڑے انتظامی عہدے دے دیے۔ جو لوگ دورانِ انقلاب میں جلا وطن رہے تھے، ان کے نقصانات کی تلافی کے لیے چارلس نے سالانہ وظیفے مقرر کر دیے۔ ان وظیفوں کے لیے روپے کی ضرورت پیش آئی۔ چارلس نے اس کی تدبیر یہ سوچی کہ سرکاری تمسکات کا سود پانچ فی صد سے گھٹا کر تین فی صد کر دیا۔ "جلا وطنوں" کو معاوضہ دینے کا معاملہ محض حق و انصاف ہی کی بنا پر جائز ثابت کیا جا سکتا تھا اور معقول سیاسی تدبیر کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان جائدادوں کی ضبطی کا خطرہ ٹل گیا، جو مختلف لوگوں نے انقلاب کے دوران میں حاصل کر لی تھی، لیکن سرکاری تمسّکات کے سود کی تخفیف سے اکثر ذی اثر سرمایہ دارانِ پیرس اور تمسک دار ناراض ہو گئے۔

چارلس دہم کی مخالفت میں تیزی سے اضافہ ہو گیا۔ اس سلسلے میں دو نوجوان مؤرّخوں نے خاصی امداد دی، جن کے لیے فرانسیسی سیاسیات میں اہم کردار ادا کرنا مقدر تھا۔ اوّل اڈولف تیار[2] (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۷۷ء)، جس نے "انقلاب فرانس کی ایک تاریخ[3]" مرتب کی، اس میں نقطۂ نگاہ ہمدردانہ تھا۔ نیز وہ پیرس کے ایک آزاد خیال اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ دوم فرینکوا[4] گویزو (۱۷۸۷ء۔ ۱۸۷۴ء) جس نے تاریخ تہذیب و تمدّن[5] مرتب کی۔ یہ کتاب ان دولت مند سرمایہ داروں کے ظہور و کامرانی کی ایک پُر جوش سرگزشت ہے، جنھیں انتہا پسندوں سے سخت نفرت تھی۔ گویزو ایک وسیع قومی تنظیم کا بھی رئیس تھا، جس کا نام تھا "ہمّتِ مرداں مددِ خدا[6]"۔ یہ تنظیم فرانسیسیوں کو دعوت دیتی تھی کہ چارلس دہم نے قوم کے آئینی حقوق میں جو تصرّفات کیے ہیں، ان کی حفاظت کی جائے۔

---

[1] Berri

[2] Adolphe Thiers

[3] History of the French Revolution

[4] Francois Guizot

[5] History of Civilization

[6] یعنی جو لوگ اپنی مدد آپ کرتے ہیں خدا بھی اُن کی مدد کرتا ہے۔

۱۸۲۹ء میں چارلس نے پولیناک[1] کو وزیرِ اعظم مقرر کر لیا۔ یہ رجعت پسندی میں سب سے آگے تھا اور ایک جنونی مذہبی آدمی تھا، جو کہتا تھا کہ مریم عذراؑ نے خواب میں نمودار ہو کر مجھے بار بار کامیابی کا یقین دلایا ہے۔ اس تقرر سے سیاسی کشیدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ پولیناک کو امید تھی کہ اپنے شہنشاہ کے زوال پذیر وقار کو ایک زبردست ڈپلومیٹک فتح کے ذریعے سے بحال کر دے گا۔ اسی خیال سے اس نے الجزائر کے حکمراں پر حملہ کر دیا، جو عثمانی سلطان کا باجگزار تھا اور بڑی حد تک اسے خود مختاری حاصل تھی۔ اس نے بحری بربر قزاقوں کی امداد میں خاصی بدنامی حاصل کر لی تھی اور ان قزاقوں سے سب کو نفرت تھی۔ چنانچہ جون ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر قبضہ ہو گیا اور شمالی افریقہ میں فرانسیسی سلطنت کی داغ بیل ڈال دی گئی[2]۔ اس اثنا میں دارالمندوبین کے آزاد خیال گروہ نے اعلان کر دیا کہ پولیناک کی وزارت خلافِ آئین ہے کیونکہ اس نے کبھی قانون ساز مجالس کی منظوری حاصل نہیں کی۔ چارلس دہم کو امید تھی کہ نئے انتخابات میں زیادہ سازگار نمائندے آ جائیں گے، لہٰذا مئی ۱۸۳۰ء میں نئے انتخابات کرائے گئے، مگر کامیابی مخالفین کو حاصل ہوئی۔ ۲۵ر جولائی ۱۸۳۰ء کو چارلس اور پولیناک نے قانون ساز مجلس کی منظوری لیے بغیر

---

[1] Polignac

[2] (مترجم) یہاں مصنّفین نے الجزائر پر فرانسیسی حملے کے اصل واقعات پیش نہیں کیے اور اس معاملے کو محض یہ کہ کر ختم کر دیا کہ الجزائر کا حاکم بحری قزّاقوں کا دوست اور مربی تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپی ممالک کو بحیرۂ روم میں اپنے جہازوں کے لیے مختلف قسم کے خطرے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک خطرہ قزاقوں کا بھی تھا جس کی ابتدا خود یورپیوں نے کی۔ تفصیل بیان ممکن نہیں۔ مختلف یورپی ملکوں نے اپنی حفاظت کی غرض سے حاکم الجزائر کے لیے سالانہ رقمیں مقرر کر رکھی تھیں، جو باقاعدہ پہنچتی رہتی تھیں اور یہ سلسلہ مدّتِ دراز سے جاری تھا۔ منازعت کی اصل بنا بعض واجب الادا رقموں سے ہوئی۔ الجزائر کے یہودی تاجر فرانس کو ہر سال غلّہ دیتے تھے اور اس سلسلے میں ایک معاہدہ ہو گیا تھا۔ غلّے کی قیمت باقاعدہ ادا ہوتی رہتی تھی۔ فرانس میں انقلاب بپا ہُوا تو کچھ رقم باقی رہ گئی اور کسی نے اس کی ذمّہ داری قبول نہ کی۔ ۱۸۱۳ء میں دوبارہ معاہدہ ہُوا اور غلّہ فرانس پہنچنے لگا۔ اس معاہدے کے بعد پھر ایک مرتبہ افراتفری پھیل گئی، کیونکہ نپولین شکست کھا کر گرفتار ہُوا اور سینٹ ہلینا پہنچ گیا۔ بوربون آئے تو انھیں ترتیبات میں خاصی دیر لگی۔ بہرحال بھاری رقم فرانس کے ذمّے ہو گئی تھی۔ حاکم الجزائر نے سفیرِ فرانس سے اس رقم کا ذکر کیا اور آخر میں ایک خط بادشاہ کے نام لکھ دیا۔ یکم شوال ۱۲۴۳ھ (۱۶۔ اپریل ۱۸۲۸ء) کو سفیرِ فرانس حاکمِ الجزائر کی ملاقات کے لیے حاضر ہُوا تو حاکم نے دوبارہ اس رقم کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ خط کا جواب بھی نہیں آیا۔ سفیرِ فرانس نے انتہائی حماقت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا: ”ہمارے بادشاہ سلامت برابر کے لوگوں کے خطوط کا جواب دیتے ہیں، ہر شخص کے خط کا جواب نہیں دیتے“۔ یہ کلمہ انتہائی گستاخانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ حسین پاشا حاکم الجزائر کو سخت غصّہ آیا۔ ہاتھ میں چھتری تھی، غصّے میں وہی اُٹھا کر سفیر کے منہ پر ماری۔ اس واقعہ کو جس کی ابتدا خود سفیرِ فرانس کی غلط روش سے ہوئی، بہانہ بنا کر فرانس نے حملہ کیا اور جو ظلم توڑے، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تقریباً ایک سو تیس برس کے بعد الجزائر فرانس کے پنجے سے آزاد ہُوا۔ اس اثنا میں الجزائریوں کا جہادِ آزادی بدستور جاری رہا۔ امیر عبدالقادر مرحوم کے وقت سے اب تک لاکھوں مجاہدوں نے اس جہاد میں شہادت پائی۔

چند فرمان جاری کر دیے مثلاً مطابع پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ جس ایوان کے انتخابات تازہ تازہ ہوئے تھے، اسے برطرف کر دیا گیا اور نئے انتخاب کے لیے حق رائے ایسے انداز میں تجویز کیا گیا کہ وہ متوسط شہری طبقہ اس حق سے محروم ہو گیا، جو مخالفین کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ بادشاہ اور اس کے وزیر اعظم کو خیال تھا کہ الجزائر میں کامیابی کے باعث رائے عامہ جولائی کے خاص فرامین کو ٹھنڈے دل سے قبول کرے گی۔ یہ اندازہ سراسر غلط تھا۔

تیار اور دوسرے آزاد خیال صحافیوں نے احتجاجات کی دعوت دی۔ موسم بہت اچھا تھا۔ حکومت کی فوجیں کمزور تھیں۔ ان چیزوں سے حوصلہ پا کر پیرس کے مزدوروں اور طلبہ نے ایک ہنگامے کا انتظام کر لیا۔ انھوں نے جا بجا مورچے بنا لیے اور ۲۸ جولائی کو پیرس کے شہری ہال پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی ان کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ فرانس میں جمہوری حکومت قائم کر دی جائے گی اور مارکوئس دولافایت[1] اس کا صدر ہو گا۔ یہ سن رسیدہ شخص انقلاب کا ایک نشان تھا۔ ایوان مندوبین کے آزاد خیال لیڈر دستوری بادشاہ کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ بادشاہی زیادہ حفاظت و دانش کا ثبوت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سنہ ۱۸۳۰ء کے انقلاب کو فرانس کے لیے ویسا ہی بنا دیں، جیسا سنہ ۱۶۸۸ء کا انقلاب انگلستان کے لیے تھا۔ چنانچہ آزاد خیالوں نے تیار کی سرکردگی میں دولت مند ساہوکار لافت[2] اور مستقل بادشاہ گر تالیران کی حمایت سے کامیابی حاصل کر لی۔ ان کے پاس روپیہ تھا، عقل و دانش تھی اور تخت کے لیے ایک صحیح امیدوار موجود تھا یعنی لوئی فلپ ڈیوک[3] اورلیانز۔

لوئی فلپ کے باپ نے سنہ ۱۷۸۹ء کے موسم گرما میں پیرس کے اندر انقلابی ہنگامے برپا کرنے میں خاصی مدد دی تھی اور گلوٹین کے نیچے مرنے سے پیشتر "فلپ مساوات" کا لقب حاصل کر لیا تھا۔ خود لوئی فلپ والمی کی جنگ میں (سنہ ۱۷۹۲ء) انقلابی فوج کے ساتھ ہو کر لڑ رہا تھا، لیکن دور دہشت و وحشت کے نازک صورت اختیار کرنے سے پیشتر سنہ ۱۷۹۳ء میں ملک چھوڑ گیا تھا۔ اسے نہ تو جیکوبنوں کی انتہا پسندی سے دل چسپی تھی اور نہ شاہی طمطراق سے۔ وہ ایک اچھے کاروباری اور سنجیدہ آدمی کا لباس پہنتا اور در اصل وہ کاروباری ہی تھا۔ جولائی سنہ ۱۸۳۰ء کے اواخر میں دور اندیش لوئی فلپ خوش فہم لافایت کو، جو جمہوریت کا حامی تھا، راضی کر لیا۔ چنانچہ اس بڑے جمہوری لیڈر کی تائید سے آزاد خیال مندوبین نے لوئی فلپ کو بادشاہ بنا دیا۔ چارلس دہم بادشاہی سے دست بردار ہو کر انگلستان بھاگ گیا۔ آزاد خیالوں نے سنہ ۱۸۱۴ء کے منشور کی اکثر دفعات قائم رکھیں، اگرچہ بادشاہ کے مطلق العنان اقتدار کے متعلق تمام اشارے حذف کر دیے اور بوربونوں کے سفید پرچم کی جگہ انقلاب کے سہ رنگہ پرچم کو دے دی۔ حق رائے میں توسیع کر دی گئی، لیکن اس توسیع کے باوجود یہ محدود ہی رہا کیونکہ ووٹ دینے والے فرانسیسیوں کی تعداد دو لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہوئی۔

---

[1] de Lafayette　　[2] Laffittee

[3]

جولائی ۱۸۳۰ء کے انقلاب میں کوئی خونریزی نہیں ہوئی تھی، لیکن اس نے فرانس کو جمہوریت سے بڑی دور کر دیا۔ یہ ایک انتہائی اعتدال پسندانہ تحریک آزادی تھی، جو انقلاب کبیر کے مقاصد کی محدود تعبیر پر مبنی تھی۔ ۱۸۳۰ء کی تحریک حرّیت ومساوات واخوت کے حقیقی علمدار وہ جمہوریت پسند تھے، جو پیرس کے شہری ہال میں شکست کھا چکے تھے۔

بلجیم

پیرس میں جولائی کے ہنگامے کے ایک ماہ بعد بلجیم میں ایک قوم پرور اور آزاد خیال انقلاب شروع ہو گیا۔ ۱۸۱۵ء میں جو لوگ صلحنامے تیار کرنے کے ذمہ وار تھے، انھوں نے بلجیم اور ہالینڈ کو متحد کر دیا تھا۔ یہ اتحاد صرف اقتصادیات میں استوار رہا۔ ہالینڈ کی تجارت اور نوآبادیوں سے خام جنسیں آتی تھیں اور بلجیم کے صنعت گروں کو، جن کی تعداد بڑھ رہی تھی، نئی منڈیاں مل گئی تھیں۔ اس زمانے میں بلجیم صنعتی اعتبار سے برّاعظم یورپ کا سب سے ترقی یافتہ خطّہ تھا۔ سیاسیات و مذہب میں ندرلینڈز کا بادشاہ ولیم اوّل مطلق العنانی کے اختیارات استعمال کرتا۔ تدبّر کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بعض مراعات کا انتظام کر دیتا۔ اس نے اپنی پوری مملکت میں ولندیزی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا اور بلجیم میں کیتھولک کلیسا کو خاص حقوق دینے سے انکار کر دیا۔ اہل بلجیم نے قانون ساز مجلس میں نمائندگی بڑھانے کے لیے درخواست کی۔ ولیم نے اس کی منظوری سے انکار کر دیا۔ بلجیم کی آبادی ہالینڈ سے دُگنی تھی، مگر اسے پارلیمنٹ میں ہالینڈ سے نصف نشستیں حاصل تھیں۔ بلجیم میں قومیّت کی بنیاد کیتھولک کلیسا کی مشترکہ وفاداری اور مقامی مراسم وحقوق کے لیے مشترکہ وابستگی کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ اس لیے متحد ہو گئے کہ دو مختلف حصوں میں دو مختلف زبانیں مروّج تھیں۔ فلینڈرز کی زبان اُن صوبوں میں، جو برسلز کے شمال میں تھے اور فرانسیسی زبان جنوبی صوبوں میں۔

۲۵۔ اگست ۱۸۳۰ء کو برسلز میں انقلاب بپا ہوا۔ اس کی ابتدا ایک اوپیرا سے ہوئی، جس میں بغاوتِ نیپلز کے حالات پیش کیے گئے تھے۔ طلبہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ پیرس کی مثال سب کے لیے حوصلہ افزائی کا موجب تھی —— غالباً فرانسیسی کارندے انگیخت بھی دیتے رہے تھے —— جو لوگ اوپیرا میں بیٹھے تھے وہ ولندیزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ستمبر کے اختتام تک ولندیزی فوجیں برسلز سے نکال دی گئیں اور ولندیزی حکومت بلجیم کے ہر حصے میں درہم برہم ہونے لگی۔ باغیوں نے زیادہ تر مزدوروں کو لڑنے کے لیے بھرتی کر لیا تھا۔ ان کی حالت بڑی خراب تھی۔ اجرتیں کم ملتی تھیں اور اکثر بیکار رہنا پڑتا تھا، لیکن بلجیم کے مزدوروں کی حالت پیرس کے مزدوروں سے مختلف نہ تھی۔ نہ ان کے لیے اچھی بغاوت کا انتظام تھا اور نہ ان کے سامنے کوئی مستقل سیاسی پروگرام تھا۔ طبقۂ اوسط کے آزاد خیال لوگ زیادہ منظم تھے، انھوں نے جلد انقلابی تحریک پر قبضہ کر لیا اور نومبر ۱۸۳۰ء میں بلجیم کی جو قومی کانگرس بلائی گئی، اس میں اکثریت طبقۂ اوسط ہی کو حاصل تھی۔

اس کانگرس نے بلجیم کی آزادی کا اعلان کر دیا اور دستوری بادشاہی قائم کر دی۔ نیا دستور حقیقی مقامی خود اختیاری پر مبنی تھا۔ بادشاہ کے اختیارات پر سخت پابندیاں لگا دی گئی تھیں اور ہیئتِ حاکمہ کو مجلس قانون کے تابع کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ عام بالغوں کو حق رائے نہ دیا گیا، لیکن بلجیم میں حق رائے کا مالی پیمانہ برطانیہ اور فرانس سے کمتر تھا اور ووٹروں کی تعداد

نسبتاً زیادہ تھی۔

کانگریس نے لوئی فلپ کے ایک بیٹے ڈیوک نمور[1] کو بادشاہ چن لیا۔ برطانیہ نے سخت احتجاج کیا، کیونکہ اس طرح بلجیم فرانس کے حلقۂ اثر میں پہنچ رہا تھا۔ پھر کانگریس نے لیوپولڈ کو بادشاہ منتخب کر لیا، جو ایک جرمن شہزادہ تھا اور اس کا تعلق سیکسکوبرگ خاندان سے تھا۔ اس کی شادی برطانیہ کے بادشاہ جارج چہارم کی بیٹی سے ہوئی تھی، مگر یہ بیوی مر چکی تھی۔ لیوپولڈ ایک نئی مملکت میں دستوری بادشاہ کا کردار ادا کرنے کے لیے ازحد موزوں تھا۔ پہلے اسے یونان کا تخت پیش کیا گیا تھا، مگر اس سے انکار کر کے اس نے سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ اب اس نے لوئی فلپ کی ایک بیٹی سے شادی کر لی۔ اس طرح ڈیوک نمور کی امیدواری کے ناکام ہونے سے فرانسیسیوں کو جو مایوسی ہوئی تھی، اس کی ایک حد تک تلافی ہو گئی۔

بلجیم کے انقلاب نے وی آنا کے تصفیے میں پہلا مستقل رخنہ پیدا کیا۔ اس سے بڑی طاقتوں میں کوئی خاص جوش پیدا نہ ہوا، مگر انھوں نے قبول کر لیا۔ برطانیہ، فرانس، پروشیا، آسٹریا اور روس کے نمائندے ۱۸۳۰ء کے اواخر میں لندن کے اندر جمع ہوئے اور انھوں نے بلجیم کی آزادی اور غیر جانبداری کی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا۔ ہالینڈ کا بادشاہ ولیم بڑا ضدی تھا۔ اس نے ۱۸۳۱-۳۲ء میں بلجیم کو بہ زور فتح کرنے کی کوشش کی۔ ایک فرانسیسی فوج اور ایک برطانوی بیڑے نے بلجیم کی طرف سے کامیاب مدافعت کی۔ مدت تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ آخر ہالینڈ نے ۱۸۳۹ء میں بلجیم کی نئی حیثیت قبول کر لی۔

پولینڈ ۱۸۳۰ء کے انقلاب ہر جگہ کامیاب نہ ہوئے۔ بلجیم کے مقابلے میں پولینڈ کی مثال بڑی دردناک ہے۔ ۱۸۱۵ء میں پولینڈ کو ایسا دستور حاصل تھا، جو برّ اعظم میں آزاد خیالی کے لحاظ سے سب پر فائق تھا۔ بیس سال بعد پولینڈ سلطنت روس کی ایک نو آبادی رہ گیا۔ الگزانڈر اوّل نے جو دستور پولینڈ کے لیے تیار کیا تھا، اس میں نپولین کا مجموعۂ قوانین اور وہ دوسرے روشن فکر وسائل باقی رکھے گئے تھے، جو فرانسیسیوں نے وارسا کی گرانڈ ڈچی میں نافذ کیے تھے۔ ایک لاکھ پولستانیوں کو حق رائے مل گیا۔ یہ تعداد لوئی ہیژدہم کے فرانس کی تعداد سے زیادہ تھی، حالانکہ فرانس کی آبادی پولینڈ کے مقابلے میں دس گنا تھی۔ انتخابی پارلیمنٹ کو وضع قانون میں وسیع اختیارات حاصل تھے۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا تھا کہ پولستانیوں کو فوج اور نظم و نسق سے بھرتی کیا جائے گا اور الگزانڈر محض ایک فیاض دستوری بادشاہ کا کردار ادا کرتا رہے گا۔

۱۸۲۵ء میں نکولس اوّل بادشاہ بنا جو سخت رجعت پسند تھا۔ اس نے سیاسی کشمکش بڑھا دی، جو پہلے ہی قومیت کے رومانی نظریات کی ہردلعزیزی سے فروغ پا چکی تھی۔ پولستانی قوم پروروں نے دستور کی پوری پابندی ہی کا مطالبہ نہ کیا، بلکہ یہ بھی کہا کہ روس سے وہ صوبے پولینڈ کی طرف منتقل کر دیے جائیں، جو مملکت پولینڈ کی تقسیم سے پیشتر پولینڈ سے وابستہ تھے، یعنی لتھوانیا، سفید روس اور یوکرین۔ "زغال سوزوں" کے نمونے پر خفیہ انجمنیں ان تین صوبوں اور خود پولینڈ میں قائم ہو گئیں۔ وارسا کے زیر تربیت فوجی افسروں کی خفیہ انجمن نے نومبر ۱۸۳۰ء میں انقلاب شروع کر دیا، مگر انقلابیوں کی ناکامی ابتدا ہی سے واضح ہو گئی۔ وہ دو

---

[1] Nemours

حریف طبقوں میں بٹ گئے، ایک "سفید"، دوسرا "سرخ"۔ "سفید" سابق جاگیردار امراء کے نمائندے تھے۔ "سُرخ" عام طبقۂ شرفاء کی ترجمانی کرتے تھے۔ کسانوں کی امداد نہ "سفید" گروہ کو ملی، نہ "سُرخ" گروہ کو، کیونکہ دونوں غریب کسانوں پر مدت سے ظلم کرتے چلے آرہے تھے۔ پھر ہیضہ نہایت خوفناک وبائی صورت میں شروع ہوگیا۔ یورپ میں اس وبا کا پہلا ظہور تھا۔ اس سے پولستانیوں کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ روسی فوجیں ابتدائے انقلاب سے بے خبر تھیں اور انھیں اچانک اس نازک حالت سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ حالات پر قابو پاتی گئیں، یہاں تک کہ ۱۸۳۳ء میں وہ ہنگامے کو ہر جگہ فرو کر چکی تھیں۔ کامیابی حاصل ہوتے ہی نکولس اوّل نے الگزانڈر کا دستور منسوخ کر دیا اور مارشل لا کی حکومت کا اعلان ہوگیا۔ وارسا اور ولنا (لتھوانیا) کی یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں اور پولینڈ کے قوم پرور پروپیگنڈے کے یہی دو مرکز تھے۔ نکولس کے انتقام سے بچنے کے لیے پولستانی اہل علم ہزاروں کی تعداد میں ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف فرڈی ننڈ ہفتم کے ہسپانیہ نے ویسے شدید ردِّ عمل کا تجربہ کیا تھا، جیسا پولینڈ کو پیش آیا۔

اٹلی اور جرمنی

اٹلی اور جرمنی کے آزاد خیال وقوم پرور طبقوں کو بھی اٹھارھویں صدی کے عشرۂ چہارم کے اوائل میں ناکامی ہوئی۔ اٹلی کے باغیوں نے تھوڑی دیر کے لیے پارما[1] اور موڈینا[2] کی ڈچیوں پر قبضہ کر لیا تھا اور پاپائی جاگیروں سے بھی خاصا بڑا علاقہ لے لیا تھا۔ ان کا بھروسا فرانس کی امداد پر تھا، مگر لوئی فلپ کی نئی حکومت اس بات کے لیے تیار نہ تھی کہ ہیپسبرگوں کے خاص حلقوں میں دخل دے کر آسٹریا سے لڑائی کا خطرہ مول لے۔ پھر ۱۸۳۱ء میں میٹرنخ نے فوجیں بھیج دیں، تاکہ اٹلی میں حقداروں کا حق بحال ہو جائے۔

میٹرنخ کو جرمنی میں حقداروں کا حق بحال رکھنے کے لیے فوج کی ضرورت نہ تھی۔ جب کوئی نازک دَور پیدا ہوتا تو جرمن کنفیڈریشن کی پارلیمنٹ آسٹریا کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑتی۔ شاعر ہائین[3] نے جرمنی کے خرّاٹے سُن لیے تھے:

> "جرمنی اپنے چھتیس بادشاہوں کے زیر حفاظت امن سے سویا پڑا تھا۔ اُن دنوں تاج بادشاہوں کی پیشانیوں پر خوب جمے ہوئے تھے اور رات آتی تو بادشاہ شب خوابی کی ٹوپیاں تاجوں پر اوڑھ لیتے اور لوگ امن سے ان کے قدموں میں محوِ خواب رہتے"[4]

نظامِ قدیم کے نمونے کی شاہی مطلق العنانی اس وقت بھی جرمن سیاسیات پر حاوی تھی۔ پروشیا میں شاہ فریڈرک ولیم سوم (۱۷۹۷ء تا ۱۸۴۰ء) نے دستور کی منظوری کا وعدہ کر لیا تھا، مگر وہ پورا کبھی نہ ہُوا۔ صرف ویمر اور چند دوسری جنوبی جرمن مملکتوں میں معمولی آزاد خیالی کے دستور بنے، جو ۱۸۱۴ء کے فرانسیسی منشور کے مطابق تھے۔ گویا فرانسیسی اثر اس وقت تک بھی خاصا پھیلا ہُوا تھا۔

---

[1] Parma

[2] Modena

[3] Heine

[4] Reaction and Revolution by Artz

آرٹز کی کتاب رجعت اور انقلاب، ص ۱۳۷

جرمن عوام کی اکثریت آزاد خیالی اور قوم پروری سے بالکل بے حس تھی اور جیسا کہ ہائینؔ نے کہا تھا، وہ اطمینان سے اپنے حکمرانوں کے قدموں میں سو رہی تھی۔ سیاسی تحریک صرف اہل علم کی ایک چھوٹی سی اقلیت یعنی صحیفہ نگار، رومانی مصنف، یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور طلبہ نے شروع کی۔ ۱۸۱۵ء کے بعد جرمن یونیورسٹی کے طلبہ نے ایک نئی تنظیم کی، جس کا نام برشن شافٹ[1] تھا، یعنی طلبہ کی یونین۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں لوتھر کے پچانوے مطالبات کی سہ صد سالہ سالگرہ منائی گئی۔ اس تقریب پر بڑا اجتماع ہوا اور طلبہ کی یونین نے پروشیائی افسروں کا ایک سرپوش اور کمر بند جلایا، نیز اور حرکتیں کیں۔ مارچ ۱۸۱۹ء میں ایک مذہبی طالب علم نے کوٹزبو[2] کو قتل کر دیا، جو ایک رجعت پسند مصنف اور ایک روسی کارندہ تھا۔ یہ اقدام غالباً طلبہ کی یونین میں سے انتہا پسندوں کے زیر اثر ہوا۔

میٹرنخ پہلے ہی طلبہ کے بے ضرر شور و غل (۱۸۱۷ء) پر چونک اٹھا تھا۔ اب اس نے سخت کارروائی شروع کی، چنانچہ اس کے زیر ہدایت جرمن کنفیڈریشن کی پارلیمنٹ نے وہ احکام منظور کر دیے، جو احکام کارلس باد[3] کے نام سے مشہور ہیں، (ستمبر ۱۸۱۹ء)۔ ان احکام کے مطابق مطابع پر پابندیاں سخت کر دی گئیں اور طلبہ کی یونین توڑ دی گئی۔ تعلیمی آزادی پر سخت ضرب لگی:

> "جو حکومتیں کنفیڈریشن میں شامل ہیں، وہ عہد کرتی ہیں کہ یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں سے وہ تمام اساتذہ الگ کر دیے جائیں گے، جو ادائے فرض سے بدیہی انحراف یا اپنے وظائف کے حدود سے تجاوز یا نوجوانوں پر اپنے اثر کے غلط استعمال یا امن عامہ کے لیے نقصان رساں نظریات کی اشاعت یا قائم شدہ سرکاری اداروں کی تخریب کے موجب ہو سکتے ہیں اس طرح وہ اس اہم منصب کے نااہل ہونے کا غیر مشتبہ ثبوت بہم پہنچاتے ہیں، جس پر وہ فائز تھے"[4]

احکام کارلس باد کے باوجود جرمن اہل علم میں سیاسی ہنگامے جاری رہے۔ مئی ۱۸۳۲ء میں پچیس ہزار انقلابی ہمدرد ہمباخ میں جمع ہوئے، جو دریائے رہائن کے نزدیک ہے، تا کہ لافایت کی سلامتی کا جام نوش کریں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جمہوریت کے ماتحت جرمن مملکتیں بھی متحد ہو جائیں۔ پھر ان انقلابیوں نے فرینکفرٹ پر قبضہ کرنے کی معمولی سی کوشش کی، جو جرمن کنفیڈریشن کا مرکز اور پارلیمنٹ کا مقام تھا۔ اس کے بعد بے حسی طاری ہو گئی۔

ے۱ Burschenschaft

ے۲ Kotzebue

ے۳ Carlsbad

ے۴ یورپی تاریخ کے اصل مآخذ جلد اوّل ص۳ ۔

۱۸۳۰ء کے سبق

۱۸۳۰ء میں یورپ کے اندر جو انقلابی تحریکیں جاری ہوئیں، ان میں سیاسی زندگی کی دو بڑی حقیقتوں پر زور دیا گیا۔ اوّل شرق و غرب کے درمیان افتراق وسیع ہو گیا۔ برطانیہ اور فرانس اپنے اندر اور ہمسایہ بلجیم میں معمولی درجے کی آزاد خیالی کی حمایت کرنے پر آمادہ تھے۔ اس کے برعکس روس، آسٹریا اور پروشیا پہلے سے بھی زیادہ پختگی کے ساتھ اُن مندّ انقلاب اصول پر قائم ہو گئے تھے، جو ٹروپا کے معاہدے میں شامل تھے۔ ۱۸۳۳ء میں نکولس اوّل، میٹرنخ اور فریڈرک ولیم سوم نے رسماً اقرار کیا کہ جب کوئی بادشاہ انقلاب کے خطرے سے دوچار ہوگا تو تینوں حکومتیں مل کر بادشاہ کی حمایت کریں گی۔

دوسرا سبق یہ تھا کہ ۱۸۳۰ء کا انقلاب صرف فرانس اور بلجیم میں کامیاب ہُوا، یعنی جہاں اسے آبادی کی بہت بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ یہ ہر اُس ملک میں ناکام ہُوا، جہاں آبادی کا صرف ایک جزو انقلابیوں پر مشتمل تھا۔ پولینڈ زرعی ملک تھا۔ وہاں کسانوں کی اکثریت "سفید گروہ اور سُرخ گروہ دونوں کو ظالم سمجھتی تھی۔ اٹلی کے انقلابی زغال سوزوں کی رومانی روایت اور غیر ملکی امداد کی بے سروپا امید پر اعتماد کیے بیٹھے رہے۔ جرمنی میں انقلاب صرف طلبہ کے ہنگاموں کا معاملہ بنا رہا یا لافایت کا جام صحّت نوش کیا گیا یا ایسے ہی دوسرے معمولی کام ایک چھوٹی سی اقلیت نے انجام دیے۔ آزاد خیال اور قوم پرور اہل علم کے لیے ضروری تھا کہ اپنے نظریات معاشرے کی جڑوں میں داخل کرتے۔ یا کم از کم طبقۂ اوسط کی زیریں سطحوں تک پہنچاتے۔ نیز انھیں قابل سیاسی رہنما بروئے کار لانے اور سیاسی اصلاحات کے بالغ نظرانہ پروگرام تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ ۱۸۳۰ء کے بعد انھوں نے یہی کام اپنے ذمّے لیے اور ان کاموں میں کامیابی کی آزمائش اس نہایت خوفناک اور وسیع سیاسی ہنگامے میں ہونے والی تھی، جو انیسویں صدی کے یورپ میں رونما ہوا، یعنی ۱۸۴۸ء کے انقلاب ؂

اکیسواں باب

۱۸۴۸ء کے انقلاب

مشترک عناصر

۱۸۴۸ء کے انقلابات جیسے پُر پیچ بین الاقوامی مظاہر کا جائزہ لینے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ درختوں میں اُلجھ کر جنگل کو نظر انداز نہ کریں، یعنی جزئی واقعات کے سلسلے میں اصول و کلّیات فراموش نہ ہونے پائیں۔ ہمیں یہ حقیقت ہر لحظہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ۱۸۴۸ء میں جو مختلف شورشیں ہوئیں، ان سب کی تہ میں مشترک عناصر کارفرما تھے۔ ان میں سے ایک مشترک عنصر قومیّت کی قوت تھا جس نے جرمنوں اور اطالویوں کو سیاسی اتحاد کے لیے کوششوں پر ابھارا اور جس نے ہیبسبرگوں کی سلطنت کے محکوم علاقوں کو سیاسی اور ثقافتی معاملات میں خود اختیاری نظاموں کے مطالبے پر آمادہ کیا۔ رومانی تحریک نے صرف پولستانیوں اور یونانیوں ہی کے قومی جذبات کو نہیں ابھارا تھا، بلکہ وسطی اور مشرقی یورپ کے اکثر باشندوں میں بھی یہی روح پیدا کر دی تھی۔ مثلاً چیک قوم کی زبان اٹھارھویں صدی کے اواخر میں محو ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی، کیونکہ بوہیمیا کی آبادی زیادہ تعداد میں جرمن زبان استعمال کرتی تھی، جو اس کے آسٹروی حکمرانوں کی زبان تھی۔ ۱۸۴۸ء تک چیک زبان کا لسانی وادبی احیاء پورے زور سے جاری تھا۔ ماہرین علم اللسان نے زبان کے مصادر کا مطالعہ کیا اور دوسری سلافی بولیوں سے اس کے تعلق کا سراغ لگایا۔ بوہیمیا کی جو تاریخیں محبّانہ انداز میں لکھی گئی تھیں، نیز چیک لوک شاعری کے ذخیروں نے قومی ماضی سے گہری وابستگی پیدا کی اور چیک سلافی اتحاد کے خواب دیکھنے لگے، جو تمام سلافیوں کو متحد کر دینے کے موجب ہو سکتے تھے۔

۱۸۴۸ء میں بعض قوم پروروں نے میزینی کے اس اصول کی تبلیغ کی کہ ہر قوم کا ایک مشن ہے اور اسی کے ذریعے انسانیت کے عام مشن کی تکمیل ہو گی۔ دوسروں نے زیادہ جارحانہ پروگرام پیش کیا جس میں قوموں کے درمیان ہم آہنگی کے بجائے متنازع حقوق پر زور دیا گیا تھا۔ انگلستان کے مشہور آزاد خیال مصنف جان سٹوارٹ مِل نے قوم پروری کی اس روش کا ماتم کیا، جو :

> "انسانیت کے ہر حصّے کی بہبود نظرانداز کر رہے تھے۔ صرف ان لوگوں کی بہبود پر نظر رکھتے تھے، جن کا نام ایک تھا اور جو ایک زبان بولتے تھے...... یورپ کے پسماندہ حصّوں میں اور جرمنی میں بھی (جہاں بہتر خیالات کی توقع تھی)، قومی جذبات آزادی کی محبت پر اتنے غالب ہیں کہ لوگ ہر اس قوم (جو اُن کی نسل سے نہیں اور ان کی زبان نہیں بولتی) کی آزادی اور خود مختاری کو کچلنے میں اپنے حکمرانوں کی اعانت پر آمادہ ہیں۔[1]"

---

[1] The French Revolution and its Assailants ص ۱۷۔ اپریل ۱۸۴۹ء

آزاد خیالوں کا گروہ دوسرا ضروری عنصر تھا، جو ان انقلابوں میں مشترک رہا اور اس میں وسیع پروگرام شامل تھے۔ وسطی اور مشرقی یورپ میں نظام قدیم زندہ تھا۔ وہاں آزاد خیالوں کا مطالبہ یہ تھا کہ دستور بن جائیں، جن کے مطابق مطلق العنان بادشاہی کے اختیارات محدود کر دیے جائیں۔ نیز جاگیرداری کے پرانے حقوق و واجبات میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اسے بھی ختم کر دیا جائے۔ اس کے برعکس فرانس میں بہت سے آزاد خیال لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ لوئی فلپ کی دستوری بادشاہی کی جگہ ایک ایسی جمہوریت قائم کی جائے، جو بالغوں کے حق رائے پر مبنی ہو۔ اصل میں فرانسیسی آزاد خیالی نے اشتراکیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں پیرس کے انتہا پسندوں نے نہ صرف سیاسی جمہوریت کے لیے ایک متفقہ مہم شروع کر دی، بلکہ وہ عمرانی و اقتصادی جمہوریت کے بھی خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص کو حق کار اور دوسرے معاملات کی ضمانت دے دی جائے، جو آج ایک صدی بعد بھی ایک حد تک اشتراکی مطالبے معلوم ہوتے ہیں۔

بالآخر ۱۷۸۹ء کے فرانس کی طرح ۱۸۴۸ء کے یورپ میں بھی ایک فوری عمرانی بحران نے بے اطمینانی کو انقلاب کی شکل دے دی۔ ۱۸۴۵ء میں آئرلینڈ پر ایک تباہ کن آسمانی آفت نازل ہوئی، جس میں آلو کی فصل تباہ ہو گئی۔ پھر یہ آفت یورپ بھر میں پھیل گئی۔ ۱۸۴۶ء میں مغربی یورپ کے اندر غلے کی فصل تباہ ہو گئی اور روٹی کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ اگرچہ روس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سے کثیر مقدار میں غلہ حاصل کیا گیا، لیکن روٹی کے سلسلے میں فسادات ہوئے اور قحط پڑ گیا۔ زرعی بحران نے مصائب میں اضافہ کر دیا اور مغربی یورپ میں شدید صنعتی کساد بازاری پیدا ہو گئی۔ ۱۸۴۲ء کے بعد ریل کی سڑکیں بننے کا غلغلہ پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں ایک دم سب کچھ رک گیا اور کاروبار پر بھی برا اثر پڑا۔

فرانس

اقتصادی بحران نے فرانس پر خصوصیت سے سخت ضرب لگائی۔ ریل کی پٹڑی بن رہی تھی، وہ تقریباً رک گئی اور پانچ لاکھ سے زیادہ مزدور بے روزگار ہو گئے۔ ساتھ ہی کوئلے کی کانوں اور لوہے کے کارخانوں میں آدمیوں کو الگ کرنا پڑا۔ وسیع بے روزگاری نے فرانسیسی مزدوروں میں بے چینی بڑھا دی۔ وہ پہلے ہی اجرتوں کی قلت پر ناراض تھے، نیز اس بات پر بہت بگڑے ہوئے تھے کہ لوئی فلپ کی حکومت انھیں حقیر سمجھتی تھی۔ اس حکومت کو جولائی کی بادشاہی کہا جاتا تھا۔ اس نے تجارت اور صنعت کو تیزی سے پھیلایا، صنعتی شہروں کی آبادی بڑھ گئی۔ مثلاً روبا[۱] شمالی فرانس کا ایک شہر تھا، جو پارچہ بافی کی صنعت کا مرکز بن گیا تھا۔ ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۱ء کے درمیان دس سال میں اس شہر کی آبادی دس ہزار سے چونتیس ہزار تک پہنچ گئی، لیکن حکومت نے نئی خوشحالی کے بعد کی عمرانی خستگی کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔ اٹھارہ سال کے دورۂ حیات میں اس حکومت نے صرف دو مرتبہ صنعتی مزدوروں کی بہبود کے لیے قدم اٹھائے۔ ۱۸۳۳ء میں پرائمری سکولوں کے نظام کو وسعت دی۔ ۱۸۴۱ء میں ایک ڈھیلا ڈھالا قانون منظور کیا، جس میں بچوں کے لیے مزدوری کے اوقات محدود کر دیے گئے۔ ڈی ٹاکوویل[۲] ایک تیز نظر سیاسی مبصر تھا۔ اس نے جو فیصلہ صادر کیا تھا، وہ بڑی حد تک درست تھا، یعنی "ان دنوں حکومت ایک صنعتی کمپنی سے مشابہ تھی، جس کا ہر قدم صرف اس

---

۱ Roubax

۲ De Tocqueville

لیے اٹھتا تھا کہ اس کے حصہ داروں کو فائدہ پہنچے۔"

دو لاکھ مالکان اراضی، سرمایہ کار اور کاروباری آدمی جولائی کی بادشاہی کے حصہ دار تھے اور انھیں کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ جو لوگ حق رائے میں توسیع کے طلبگار تھے، گویزو انھیں یہ جواب دیتا کہ دولت مند بن جاؤ۔ جو بھی ووٹ کا حقدار بننا چاہتا تھا، اس کے لیے لازم تھا کہ اتنی دولت جمع کرے، جو رائے دہی کی کڑی مالی شرطوں کو پورا کر سکے۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد پیرس اور لی اونز میں مزدوروں نے جمہوریت اور زیادہ اجرت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس پر ہنگامے برپا ہو گئے۔ حکومت نے ہنگاموں میں حصہ لینے والوں کو سخت سزائیں دیں اور مزدوروں کی تنظیمات کو ممنوع قرار دے دیا۔ جولائی کے انقلاب کے بعد جو اخبار جاری ہوئے، انھوں نے کاروباری بادشاہ کا ایک ایسا کارٹون بنایا جس میں اس کا چہرہ ناشپاتی کی وضع کا رکھا اور ہاتھ میں چھاتا تھما دیا۔ اس پر اخباروں کے لیے احتساب نافذ کر دیا گیا۔

اگرچہ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد مخالفت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا، مگر سنہ ۱۸۴۰ء کے بعد مخالفت تیزی سے از سرِ نو زندہ ہو گئی، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس میں اتحاد نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب کی رفتار یکساں نہ رہی۔ ایک گروہ کی سرکردگی اڈولف تیار کر رہا تھا، جو جولائی کی بادشاہی قائم کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں لوئی فلپ نے تیار کو الگ کر کے گویزو کو وزیر اعظم بنا لیا تھا اور وہ سنہ ۱۸۴۸ء تک اس منصب پر مامور رہا۔ تیار دستوری بادشاہی کے اصول کا حامی تھا۔ دونوں میں بڑا فرق یہ تھا کہ تیار منصب سے محروم تھا اور گویزو منصب پر مامور تھا۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے بالوس جمہوریت پروروں نے ایک اور حزب مخالفت بنا لیا۔ یہ تیسرا اور سب سے چھوٹا گروہ تھا، جس میں مختلف اشتراکی بھی شامل تھے اور انھوں نے سنہ ۱۸۴۰ء کے بعد کی اقتصادی کساد بازاری میں خاصے رفیق حاصل کر لیے۔ حقیقتاً جس گروہ میں سب سے بڑھ کر خوفناک بن جانے کی صلاحیت تھی، وہ بوناپارٹ خاندان کے حامیوں کا گروہ تھا، مگر ان کے جذبات اس وقت تک غیر منظم اور مبہم تھے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں شہنشاہ کی نعش سینٹ ہلینا سے پیرس پہنچی تو جنگجو اور پُر عظمت نپولین کا افسانہ پھر تازہ ہو گیا، جو عظمت سے محروم اور امن دوست لوئی فلپ سے بالکل مختلف تھا۔

سنہ ۱۸۴۷ء کے موسم گرما میں دستوری بادشاہ کے حامی، جن کا تعلق تیار کے گروہ سے تھا، جمہوریت پسندوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور انھوں نے فرانس بھر میں سیاسی دعوتوں کا انتظام کیا۔ ان میں اصلاحات کے علاوہ گویزو سے استعفے کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ مہم حقیقتاً بے ضرر سی معلوم ہوتی تھی، مگر ۲۲۔ فروری سنہ ۱۸۴۸ء کو ایک نہایت زبردست دعوت کا اعلان پیرس کے اس حلقے میں ہوا، جہاں انتہا پسند رہتے تھے۔ گویزو کی وزارت نے اس دعوت کو روکا تو اہل پیرس نے بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا۔ ۲۳ فروری کو لوئی فلپ نے گویزو کی وزارت برطرف کر دی اور تیار کو وزارت کی دعوت دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن یہ مطالبہ اصل وقت گزر جانے کے بعد منظور کیا گیا۔ اہل پیرس نے مزدوروں، طلبہ اور انتہا پسند جمہوریت پرور لیڈروں کی امداد سے ۲۲۔ فروری کے مظاہرے کو ۲۳ فروری تک ایک ہنگامے کی شکل دے دی۔ ہجوم نے گویزو کے مکان پر حملہ کر دیا تو سپاہیوں نے ہجوم کے پچاس سے زیادہ آدمی مار ڈالے۔ لوئی فلپ واقعات کا رُخ یکایک بدل جانے سے اتنا پریشان ہوا کہ ۲۴۔ فروری کو تاج و تخت چھوڑ دیا۔

جولائی ۱۸۳۰ء کی طرح فروری ۱۸۴۸ء میں بھی انتہا پسند مزدوں اور اعتدال پسند طبقہ متوسط کے نمائندوں کے درمیان اس سیاسی خلا کو پورا کرنے کے لیے مقابلہ شروع ہو گیا، جو بادشاہ کے تخت و تاج چھوڑنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ انتہا پسندوں کا مطالبہ یہ تھا کہ جمہوریت قائم کی جائے اسی کے ذریعے سے وہ عمرانی اور اقتصادی تغیرات پیدا ہوں گے، جو حق کار کے فارمولے میں مضمر ہیں۔ یہ انتہا پسند ہر اعتبار سے انقلابی تھے، مگر ان میں ضروری تنظیم نہ تھی کہ انقلاب کو کامیابی سے منزلِ مراد پر پہنچا سکیں۔ ان کے نئے لیڈر بھی ویسے ہی خوش فہم تھے، جیسے لافایت ۱۸۳۰ء میں ثابت ہوا تھا۔ اعتدال پسند طبقۂ اوسط کے نمائندے بالغوں کو حق رائے دینے کے لیے تیار تھے، لیکن حقِ ملکیت کی حفاظت پر مضبوطی سے قائم تھے اور انھوں نے یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ اقتصادی اور عمرانی مراعات کا درجہ کم سے کم رہے۔

۲۵۔ فروری کو جو عارضی حکومت بنائی گئی، اعتدال پسند طبقے نے اس میں مقتدر حیثیت حاصل کر لی۔ اہلِ پیرس کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لیے انھوں نے حق کار کی ضمانت کا وعدہ کر لیا اور اختیار دے دیا کہ پیرس میں قومی کارخانے قائم کیے جائیں۔ بہ ظاہر یہ تجویز لوئی بلینک (۱۸۱۱ء – ۱۸۸۲ء) نے پیش کی تھی، جو اشتراکی تھا۔ لوئی بلینک مدت سے ان کارخانوں کے قیام کی وکالت کر رہا تھا، جن کا نام اس نے اشتراکی کارخانے رکھا تھا، یعنی مزدور ان کارخانوں کے مالک ہو جائیں گے اور انھیں حکومت کی مالی امداد سے چلائیں گے مگر ۱۸۴۸ء میں جو قومی کارخانے قائم ہوئے، وہ اس اشتراکی پروگرام کے مطابق نہ تھے، بلکہ صرف اعانت کی غرض سے نیم عسکری اصول پر منظم کر دیے گئے تھے اور ان میں پیرس اور صوبوں کے ایک لاکھ سے زیادہ بیکار مزدور بھرتی ہو گئے تھے۔ تقریباً دس ہزار کو جلدی اصلاحات کے سلسلے میں کام کے لیے دو فرینک روزانہ ملتے تھے، مثلاً پیرس کے استحکامات کی مرمت اور شانز دمار[۱] کے میدان پر بڈ کی ہمواری۔ باقی لوگوں کو ایک فرینک روزانہ مالی اعانت دی جاتی۔

اعتدال پسندوں کو عارضی حکومت میں اقتدار حاصل ہو گیا تو اپریل ۱۸۴۸ء کے انتخاب میں انھوں نے مزید قوت حاصل کر لی۔ یورپی تاریخ میں یہ پہلا انتخاب تھا جس میں ملک کی تقریباً پوری بالغ آبادی نے ووٹ کا حق استعمال کیا۔ اسی لاکھ فرانسیسیوں نے ووٹ دیے، تاکہ اس قومی مجلس کے ممبر چنے جائیں، جس کا کام نئے دستور کی تیاری تھا۔ قدامت پسند کسان اس وقت بھی فرانس کی آبادی کا بڑا حصہ تھے۔ انھوں نے جولائی کی بادشاہی کا خاتمہ منظور کر لیا تھا، لیکن نجی املاک پر حملے یا ملتی جلتی حرکات سے بہت خوفزدہ تھے۔ اس انتخاب میں تقریباً نو سو مندوب چنے گئے۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق طبقۂ اوسط سے تھا اور تقریباً ایک سو مندوب ایسے تھے، جنھیں پیرس کے انتہا پسندوں سے ہمدردی تھی۔

پیرس کے انتہا پسندوں نے ملک کا یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ۱۵ مئی کو ایک ہنگامہ پرور اور بڑی حد تک غیر مسلح، ہجوم قومی مجلس کے ایوان پر حملہ آور ہوا اور تجویز پیش کی کہ مجلس توڑ دی جائے اور ایک نئی عارضی حکومت قائم کی جائے، جو پیرس کے

---

[۱] Camps de Mars

شہری ہال میں منعقد ہو۔ اس پر اعتدال پسند چونک اُٹھے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ قومی کارخانے امن و نظم کے لیے خطرے کا باعث ہیں؛ کیونکہ وہاں بہت سے ایسے لوگ جمع ہو گئے ہیں، جو اقتصادی لحاظ سے مضطر الحال ہیں۔ چنانچہ مجلس نے یہ کارخانے منسوخ کر دیے اور جو لوگ ان میں رہتے تھے، انھیں موقع دے دیا کہ چاہیں تو فوج میں بھرتی ہو جائیں، چاہیں تو صوبوں میں کام کرنا منظور کر لیں۔ پیرس کے مزدوروں نے مزاحمت کی۔ ۲۳ جون سے ۲۶ جون ۱۸۴۸ء تک پیرس کے وہ حصے برسرِ بغاوت رہے، جن میں مزدور رہتے تھے۔ آخر مستعد وزیرِ جنگ جنرل کیوِنیاک فوج لایا اور ہنگامہ فرو کیا گیا۔

ماہِ جون کے یہ ایام دورِ حاضر کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقی طبقاتی جنگ کا یہ پہلا وسیع ہنگامہ تھا۔ دونوں فریق زبردست طبقاتی احساسات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اشتراکی انقلاب کے ہوّے نے جو پہلی مرتبہ تلخ حقیقت کا لباس پہن کر آیا تھا فرانس اور یورپ کے تمام طبقوں کو ڈرا دیا، جن کے پاس جائدادیں تھیں۔ یہی خوف باغیوں کی سخت سرکوبی کا موجب ہُوا۔ کم از کم پندرہ سو لڑائی کے دوران میں مارے گئے اور چار ہزار سے زیادہ بعد میں جلاوطن کیے گئے۔ جلاوطنوں میں سے زیادہ تر کو الجزائر بھیجا گیا۔ تمام اشتراکی کلب اور اخبار بند کر دیے گئے۔ لوئی بلینک بھاگ کر انگلستان چلا گیا اور پورے فرانس میں جنرل کیوِنیاک کے ماتحت ایک فوجی ڈکٹیٹری قائم ہو گئی۔

اعتدال پسندوں کے خطرے دوسری فرانسیسی جمہوریت کے رسمی دستور میں بھی واضح تھے، جو قومی مجلس نے نومبر ۱۸۴۸ء میں مکمل کیا تھا۔ مجلس نے جائداد کو ہر مداخلت سے محفوظ قرار دیا اور یہ تحریک مسترد کر دی کہ حقِ کار فرانسیسی شہریوں کے بنیادی حقوق میں شامل کر دیا جائے۔ اس دستور کے مطابق قانون سازی کا صرف ایک ایوان رکھا گیا، جس کے لیے ہر تین سال کے بعد تمام بالغ مردوں کے ووٹوں سے انتخاب ہوتے تھے۔ اس کے مطابق انتظامی اور تنفیذی اختیارات صدرِ جمہوریت کے حوالے کر دیے گئے، جس کا انتخاب ہر چار سال کے بعد رائے عامہ سے ہوتا تھا۔ نومبر ۱۸۴۸ء کے فرانسیسی دستور نے ایک ایسا نظامِ حکومت جاری کیا جو جزواً مونٹسکیو کے اصولِ علیحدگیِ اختیارات (انتظامی و عدالتی اختیارات کی علیحدگی) اور جزواً امریکہ کی صدارتی حکومت کے نمونے پر تھا۔ برطانوی پارلیمانی نظام کی نقل ۱۷۹۱ء کے دستور میں کی گئی تھی۔ پھر اسے ۱۸۱۴ء کے منشور میں دہرایا گیا۔ ۱۸۴۸ء کے دستور میں اسے بالکل ترک کر دیا گیا۔ جائدادوں کے تحفظ کے خاص اضطراب کے باوجود یہ دستور سیاسی جمہوریت کے سلسلے میں ایک حوصلہ مندانہ اقدام تھا۔

تاہم فرانس سیاسی جمہوریت کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ کیوِنیاک نے فوجی حکومت جاری رکھی۔ قومی مجلس دستور کی تیاری میں لگی رہی۔ یہ اچھی علامت نہ تھی۔ دستور فوجی حکومت ہی کا نتیجہ تھا اور دوسری جمہوریت کے ماتحت صدارتی انتخابات (دسمبر ۱۸۴۸ء) ہُوا۔ پانچ لاکھ سے کم ووٹ تین حقیقی جمہوری امیدواروں کو ملے۔ پندرہ لاکھ ووٹ جنرل کیوِنیاک کے حق میں ڈالے گئے۔ پچپن لاکھ ووٹ لُوئی نپولین بوناپارٹ (برادرزادہ نپولین) کو ملے اور وہی جمہوریت کا صدر ہو گیا۔ اس نے ۱۸۵۱ء میں جمہوریت دبا دی اور نپولین سوم کے لقب سے اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ گویا ۱۸۴۸ء کے انقلابِ فرانس نے بھی ۱۷۸۹ء کے انقلاب کی طرح جمہوریت

Cavaignac

قائم کی، جو آخر ایک نپولینی سلطنت بن گئی

اٹلی

۱۸۴۹ء میں فرانس کے صدر نپولین[1] نے فرانسیسی فوجیں روم بھیجیں تاکہ اطالوی انتہاپسندوں کے خلاف پوپ کی حفاظت کریں اس وقت تک اطالوی انقلاب روبہ زوال تھا۔ انقلابی تحریک کے مقاصد بڑے بلند تھے، مگر یہ کمزور تھی اور اس کے کارکنوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ انقلابیوں نے آسٹروی سیادت کو ختم کرنے کی کوشش کی، مگر ان کے پاس جو فوجی وسائل تھے، وہ صرف جداگانہ اطالوی ریاستوں کے تھے۔ یہ وسائل اصل مقصد کے لیے قطعاً کافی نہ تھے۔ پیدمان نے ۱۸۴۸ء میں انقلابی فرانس کی پیش کش امداد مسترد کردی اور بڑے فخر سے جواب دیا: "اٹلی یہ کام تنہا انجام دے گا۔"

۱۸۴۸ء کے بعد وہاں تین آزاد خیال دبستان بروئے کار آئے اور ان میں قیادت کے لیے مقابلہ شروع ہو گیا، مگر ان سے کسی کو بھی وسیع عوامی تائید حاصل نہ تھی۔ ان میں سے دو صرف معتدل آزاد خیال تھے۔ وہ اس فیصلے پر راضی ہو گئے کہ آزاد اٹلی میں سیاسی اقتدار صرف امراء اور سرمایہ داروں کے پاس رہنا چاہیے، مگر متحدہ اٹلی کی قیادت کے مسئلے پر ان میں اتفاق نہ ہو سکا۔ اعتدال پسندوں کا ایک گروہ کمتمال میں تھا، وہ پیدمان کو لیڈر رہنا چاہتے تھے۔ دوسرا گروہ اپنے آپ کو "نو گلف[2]" کہتا تھا۔ کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے گلفوں کی طرح اسے بھی امید تھی کہ پوپ اٹلی کو جرمن شہنشاہ کے ضبط و نظم سے آزاد کرائے گا۔ نوگلفوں کا لیڈر جیوبرتی[3] (۱۸۰۱ء۔۱۸۵۲ء) تھا اس نے اعلان کر دیا کہ اٹلی کی تقدیر روما اور تورین[4] (پیدمان کا دارالحکومت) کے اتحاد پر موقوف ہے۔ پوپ اطالوی ریاستوں کی فیڈریشن کا رئیس ہوگا۔ اور پیدمان کی فوج فیڈریشن کی حفاظت کرے گی۔ ہر ریاست کا دستور آزاد خیالی پہ مبنی ہوگا۔

تیسرا گروہ، جس کا نام "نوجوان اٹلی" تھا، چاہتا تھا کہ اٹلی ایک متحدہ مملکت بن جائے اور اس کا نظام جمہوری ہونا چاہیے۔ "نوجوان اٹلی[5]" کا بانی میزینی ۱۸۰۵ء۔۱۸۷۲ء، تھا، جو اٹلی کی تاریخ جدید کا ایک زبردست جمہوریت پرور فرد تھا میزینی کے سیاسی عقیدے کے متعلق ایک بیان ملاحظہ فرمائیے:

> "ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام قوموں کو مقدس اتحاد کر لینا چاہیے۔ ہمارے دور میں یکسانی کا یہی وسیع ترین فارمولا ہے۔ تمام قوموں کو حریت و مساوات حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر حقیقی اشتراک ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم قومیت کے قائل ہیں، جو قوموں کا خمیر ہے اور جس کی بنا پر وہ اشتراک کے کام میں اپنا اپنا حصہ پورا کرتی ہیں...... یہ روئے زمین پر ان کا

---

[1] نپولین اعظم کا بھتیجا لوئی نپولین پہلے جمہوریہ فرانس کا صدر بنا تھا، پھر اس نے شہنشاہی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

[2] Neo-Guelfs — [3] Gioberti — [4] Turin

[5] Young Italy

مشن ہے، یعنی ان کی انفرادیت، جس کے بغیر نہ حریت ممکن ہے اور نہ مساوات۔ ہم مقدس، وطن پرستی کا عقیدہ رکھتے ہیں، جو قومیت کا گہوارہ اور افراد کی قربانگاہ اور کارگاہ ہے۔ افراد ہی سے قوم معرض وجود میں آتی ہے۔"[1]

میزینی نہایت سرگرم اطالوی قوم پرست تھا۔ ساتھ ہی اچھا یورپی بھی تھا۔ اسی کی وجہ سے "نوجوان جرمنی"، "نوجوان پولینڈ" اور اس قسم کی دوسری تحریکیں جاری ہوئیں۔ ان سب کا نصب العین یہ تھا کہ تمام قومیں مل کر ایک فیڈریشن بنا لیں اور اس اتحاد کو وہ "نوجوان یورپ" کہتے تھے۔ میزینی نے پیشگوئی کر دی تھی کہ "نوجوان اٹلی" سرزمین یورپ کو سیاسی نجات کی منزل پر پہنچائے گا، مگر ۱۸۴۸ء کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اچھا پیشگو نہ تھا۔

پہلے پہل انقلاب دو سسلیوں کی بادشاہی میں برپا ہوا (جنوری ۱۸۴۸ء)، جہاں بادشاہ کو مجبور کر دیا گیا کہ آزادی کا ایک معتدل دستور منظور کرے، جو ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور کے مطابق تھا۔ آئندہ دو ماہ میں چارلس ایلبرٹ شاہ پیڈماں، پوپ پائس نہم اور گرانڈ ڈیوک ٹسکنی نے علم انقلاب بلند کیا۔ پھر وی آنا میں انقلاب برپا ہونے کی خبریں پہنچیں تو میلان میں بھی ایک کامیاب بغاوت شروع ہو گئی، جو آسٹروی لمبارڈی کا مرکز حکومت تھا (مارچ ۲۲-۱۸۴۸ء)۔ عین اسی زمانے میں وینس نے، جو ایک اور آسٹروی صوبے کا مرکز تھا، خود مختار جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ لمبارڈی اور وینیشیا میں ہیبسبرگوں کی حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا تو آسٹرویوں کے خلاف ایک قومی جہاد شروع کر دیا گیا۔ پیڈماں کے بادشاہ چارلس ایلبرٹ نے کمانداری سنبھالی۔ نیپلز، ٹسکنی اور پوپ نے سپاہ بھیجی اور جزیرہ نما کے ہر حصے سے رضاکار فوج میں شامل ہو گئے۔ کچھ مدت تک معلوم ہوتا رہا کہ قومیت اور آزاد خیالی دونوں اٹلی میں کامیاب ہوں گی۔

مگر امید کا یہ چراغ صرف تھوڑی مدت کے لیے روشن رہا۔ ۱۸۴۸ء کے موسم بہار اور ابتائی گرما میں پیڈماں نے لمبارڈی اور وینیشیا کے علاوہ پارما اور موڈینا کی دو چھوٹی چھوٹی ڈچیوں کا الحاق کر لیا۔ دوسری اطالوی ریاستوں کی آبادیوں کو اپنی مخصوص روایات سے خاص محبت تھی۔ انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں پیڈماں سب پر مسلط نہ ہو جائے۔ ان کا اصل مقصد تو یہ نہ تھا۔ وہ تو صرف اٹلی کے اتحاد کی خواہاں تھیں۔ ۲۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو پوپ نہم نے اعلان کر دیا کہ مجھے تمام لوگوں سے یکساں محبت ہے، اس لیے مجبور ہوں کہ آسٹریا کے ساتھ جنگ میں غیر جانبدار رہوں، چنانچہ اس نے اپنے سپاہی واپس بلا لیے۔ یہ درست ہے کہ پوپ بہ یک وقت اطالوی محب وطن اور بین الاقوامی روحانی لیڈر نہیں رہ سکتا تھا۔ مزید برآں پائس کو روما آبادی کے بڑھتے ہوئے انتہا پسندانہ سیاسی جوش سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ جرمن بشپ اپنا جداگانہ پوپ بنا لینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ یوں نو گلفوں کے مقاصد پر مہلک ضرب لگی۔ مئی ۱۸۴۸ء میں اپنی فوج جنگ سے واپس بلا لی۔ آسٹرویوں نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا اور چارلس ایلبرٹ کی فوج کو کسٹوزا[2] کے

---

[1] Life and Writings of Joseph Mazzini: جلد سوم ص ۱۲۹

[2] Custozza

کے میدانِ جنگ میں (جولائی ۱۸۴۸ء) تباہ کر ڈالا۔ "اٹلی تنہا یہ کام انجام دے گا" یہ بڑا اونچا دعویٰ تھا۔ مگر بے سروپا ثابت ہوا۔ اٹلی تنہا یہ کام انجام نہ دے سکا۔

چند ماہ بعد انقلابی تحریک پھر زوروں پر آئی۔ رومی انتہا پسند مارچ کے معتدل دستور آزادی سے مطمئن نہ تھے۔ نومبر ۱۸۴۸ء میں وہ دوبارہ اُٹھے۔ پوپ پائس نہم روما چھوڑ کر نیپلز کے علاقے میں چلا گیا۔ انتہا پسندوں نے پاپائی جاگیروں پر قبضہ کر کے جمہوریہ روما کی بنیاد رکھ دی۔ مزینی اس جمہوریت کا صدر رہا۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں پیڈمان کے انتہا پسندوں نے چارلس البرٹ کو آسٹریا کے خلاف دوبارہ آغازِ جنگ پر مجبور کر دیا، مگر نوواراؔ کی جنگ میں (۲۳۔ مارچ) آسٹریا نے پھر پیڈمان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس نئی مصیبت نے اطالوی انقلابیوں کو درہم برہم کر ڈالا۔ آسٹریا نے وینس کا محاصرہ کر لیا، جو عرصے تک جاری رہا۔ گولہ باری بھی ہوئی۔ آخر اگست ۱۸۴۹ء میں وینس کی جمہوریت نے ہتھیار ڈال دیے۔

اٹلی پھر متعدد آزاد ریاستوں میں بٹ گیا اور ان پر مستبد گروں نے پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یہ ملک اسی درجے پر پہنچ گیا جہاں انقلابی تحریک سے پہلے تھا۔ تصویر کا صرف ایک روشن پہلو تھا اور وہ یہ کہ اطالوی قوم پرستی اور آزاد خیالی کی طبعی قیادت پیڈمان کو مل گئی۔ کسٹوزا اور نوارا کی شکستوں کے باوصف اور ۱۸۴۸ء میں عارضی طور پر الحاق کردہ علاقوں کے نقصان کے باوجود پیڈمان کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ اس نے دو مرتبہ نفرت انگیز اطالویوں کا مقابلہ کیا۔

جرمنی

جرمنی میں بھی ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی رفتار فی الجملہ وہی رہی، جو اٹلی میں تھی۔ جرمنی میں بھی آزاد خیالی اور قومیت نے ابتدا میں کامیابیاں حاصل کیں۔ پھر داخلی افتراق اور آسٹروی مزاحمت کے باعث انقلابی تحریک درہم برہم ہو گئی۔ جرمنی میں اس تحریک کی ناکامی زیادہ حیرت انگیز ــــ اور نامبارک ــــ تھی، کیونکہ وہاں انقلابی تحریک نے کسانوں اور مزدوروں کی امداد حاصل کر لی تھی۔ کسان چاہتے تھے کہ جاگیرداری کے پرانے واجبات ختم ہو جائیں۔ مزدور صنعتی انقلاب کی وجہ سے پریشان حال تھے۔ آزاد خیالی اور قوم پرور شورش کا اصل مرکز خوشحال کاروباری لوگ اور پیشہ ور طبقے تھے، خصوصاً یونیورسٹی کے پروفیسر، جنھیں یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنے ملک کے اندر زیادہ احترام و رسوخ حاصل تھا۔ چند جمہوریت پرور اور اشتراکیوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جرمنی کے آزاد خیال لوگ زیادہ تر اعتدال پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مختلف جرمن مملکتوں میں دستوری بادشاہیاں بن جائیں۔ میٹرنخ نے جو تکلیف دہ برتری قائم کر رکھی ہے وہ ختم ہو جائے اور جرمن کنفیڈریشن (وفاق) کو تقویت پہنچے۔

آزاد خیال جرمنوں کا ہیرو فریڈرک ولیم چہارم شاہ پروشیا (۱۸۴۰ء۔۱۸۶۱ء) تھا۔ وہ خاصا تعلیم یافتہ اور جاذب شخصیت کا حامل تھا۔ بادشاہی کے آسمانی تصور نے اسے مسحور کر رکھا تھا۔ اس نے وعدے بڑے کر لیے، مگر عمل بہت تھوڑا کیا۔

ل Novara

اس تھوڑے عمل میں بھی لامتناہی ہچکچاہٹ جاری رکھی۔ اس کا وعدہ یہ تھا کہ میرے والد نے پروشیا کو دستوری حکومت اور نمائندہ مجلس دینے کا عہد کیا تھا، مگر اُسے پُورا نہ کیا، میں اُسے پورا کروں گا لیکن اس نے جو مجلس شوریٰ ۱۸۴۷ء میں بلائی، اس کے ممبر رائے عامہ سے منتخب نہیں ہوئے تھے اور نہ اسے وضع قوانین کا پورا حق حاصل تھا۔

پروشیا نے ۱۸۴۸ء سے پیشتر جرمنی کے اتحاد کے لیے جو ٹھوس کارنامہ انجام دیا، وہ اس سلحشور جرمن بادشاہ کی وجہ سے نہیں، بلکہ "زولبرین"؎ (اتحادِ گمرک) کی وجہ سے انجام پایا۔ ۱۸۱۸ء میں پروشیا نے اپنی مملکت کے بکھرے ہوئے علاقوں کے اندر چُنگی کے محاصل ختم کر دیے تھے اور ایک یکساں محصول درآمد کے لیے مقرّر کر دیا تھا۔ اس معقول جدّت سے تجارت کو اتنی ترقی ہوئی کہ ۱۸۴۰ء تک پہلے پروشیا کے قریبی ہمسایے، بعد ازاں آسٹریا کے سوا تقریباً تمام جرمن ریاستیں اس اتّحادِ گمرک میں شریک ہو گئیں۔ اتحادِ گمرک نے جرمنی کو مقامی محاصل اور چُنگی کے تکلیف دہ بوجھ سے نجات دلادی اور اس غیر معمولی اقتصادی نشوونما کے لیے راستہ صاف کر دیا، جو صدی کے آخر میں جرمنی کو حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس سے سیاسیات پر کوئی فیصلہ کن اثر نہ پڑا، تاہم اتنا واضح ہو گیا کہ جس مملکت نے جرمنوں کے سیاسی اتحاد کا کارنامہ انجام دیا ہے، وہی طبعاً سیاسی اتحاد میں بھی سبقت کرے گی۔

۱۸۴۸ء میں سیاسی اتحاد یقینی معلوم ہوتا تھا۔ پیرس کی مثال سے متاثر ہو کر انقلابیوں نے پہلے فروری ۱۸۴۸ء کے اواخر میں مغربی جرمن ریاستوں کے اندر کامیابی حاصل کر لی۔ مارچ کے وسط تک مظاہرین نے برلن میں مورچہ بندی شروع کر دی تھی۔ فریڈرک ولیم چہارم کے سامنے یہ صورتِ حالات آئی کہ یا تو اپنے بعض شاہی حقوق سے ناخوشگوار دست برداری قبول کرے یا سپاہیوں کو حکم دے کہ اہلِ برلن پر گولی چلائیں جنھیں بادشاہ اپنی محبوب رعایا قرار دیتا تھا۔ ابتدا میں اس نے اصل مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ اس طرح کہ آزاد خیالوں کے بعض مطالبے مان لیے۔ ساتھ ہی اپیل کی: "اے میرے حسین و جمیل برلین کے باشندو! ذرا نرمی اور طمانیت سے کام لو۔" یہ اپیل بے اثر رہی، بلکہ اپیل تمام لوگوں تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ بلوے شروع ہو گئے اور تشدد نے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی۔ دو سو سے زیادہ بلوائی مارے گئے، جن میں سے اکثر مزدور تھے۔ ہجوم نے شاہی محل پر ہلّہ بول دیا اور بادشاہ کو مجبور کیا کہ باہر آئے اور مقتولوں کی لاشوں کو سلامی دے۔ فریڈرک ولیم نے آزاد خیالوں اور قوم پروروں کے تمام مطالبات مان لیے۔ اس نے پروشیا کے لیے ایک دستوری کنونشن بُلائی۔ اعلان کر دیا کہ پروشیا جرمنی میں مدغم ہو گیا اور اپنے آپ کو آزاد جرمن قوم کا بادشاہ قرار دے لیا جس نے نیا جنم لیا تھا۔

اس وقت سے جرمن وفاق میں وسیع اصلاحات شروع ہو گئیں۔ مئی ۱۸۴۸ء میں ایک بڑی دستوری کنونشن کا پہلا اجلاس فرینکفرٹ میں سینٹ پال کے گرجے کے اندر منعقد ہُوا۔ فرینکفرٹ ہی وفاق کا مرکز تھا۔ اس کے ممبر جرمنی بھر میں عوام نے منتخب کیے تھے اور وہ تعلیم یافتہ طبقے کے گلہائے سرسبد تھے۔ ان میں سے اٹھارہ ڈاکٹر تھے، تیس پادری، انچاس یونیورسٹی پروفیسر،

؎ Phyme and Revolution in Germany -
by J.G. Legge ص ۳۹۷

ستاون سکول ٹیچر، دو سو تینتیس قانون داں اور جج ان میں صرف ایک کسان تھا اور مزدور کوئی نہ تھا۔

فرینکفرٹ کی مجلس کا پہلا کام یہ تھا کہ جرمنی کے جغرافیائی حدود طے کرے۔ اس وفاق میں بھی مقدس رومی سلطنت کی طرح آسٹریا کو شامل رکھا گیا تھا، مگر ہیپسبرگوں کی سلطنت کے بیشتر غیر جرمن علاقے الگ کر دیے گئے تھے۔ پروشیا کے مشرقی صوبے بھی شامل نہ تھے، خصوصاً وہ علاقے، جو پولینڈ کی تقسیم سے حاصل کیے گئے تھے۔ آسٹریا کے مسئلے نے مجلس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ بزرگ جرمنوں کا اور دوسرا خُرد جرمنوں کا۔ بزرگ جرمن آسٹریا اور بوہیمیا کو مجوزہ جرمن مملکت میں شامل رکھنا چاہتے تھے، خُرد جرمن اس کے خلاف تھے۔ چونکہ آسٹریا نے جرمنی کلاں کی مخالفت کی، لہٰذا مجلس نے جرمنی خرد کی تجویز قبول کر لی۔

جب پروشیائی پولینڈ کا مسئلہ سامنے آیا تو مجلس کی قومیت آزاد خیالی پر غالب آئی۔ بھاری اکثریت سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ پروشیائی علاقے شامل کر لیے جائیں، جن میں پولستانی آبادی کی اکثریت تھی۔ مجلس کے مباحث میں پولستانیوں کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئیں، ان سے جرمن قومیت اپنی انتہائی شکل میں بے نقاب ہو گئی۔ ایک خطیب نے اعلان کیا کہ جرمن اقلیت کو پولستانیوں پر حکمرانی کا طبعی حق حاصل ہے، کیونکہ ان کی ثقافت کا درجہ جرمنوں سے کمتر ہے:

> "وقت ہے کہ ہمارا خوشگوار قومی انا بیدار رہے اور ہم ہر مسئلے میں اپنے وطن کی عزت و بہبود کو ہر چیز پر مقدم رکھیں..... ہمارا حق وہی ہے، جو قومی ترکہ ہے اور جو فتح کے رو سے ہمیں حاصل ہوا ہے۔"[۱]

اسے نظر انداز کرتے ہوئے فرینکفرٹ کی مجلس کا بنایا ہوا قومی دستور (مارچ ۱۸۴۹ء) یقیناً ایک لبرل دستاویز تھا۔ اس میں امریکہ کے وفاقی نظام کے اصول اور برطانوی پارلیمنٹ کے معمولات کو ملا دیا گیا تھا۔ مختلف جرمن ریاستوں کو اپنے بہت سے حقوق وفاقی جرمن حکومت کے حوالے کرنے پڑے۔ وفاقی قانون ساز مجلس کا ایک ایوان زیریں تھا، جس کے ممبروں کا انتخاب عام بالغوں کے حق رائے کی بنا پر ہوتا تھا اور ایک ایوانِ بالا تھا، جس کے ممبر مختلف ریاست ہائے ترکیبی کی حکومتیں اور قانون ساز مجلسیں چنتی تھیں۔ وزیر قانون ساز مجلس کے روبرو جوابدہ تھے اور وہی وفاقی ہیئت حاکمہ تھے۔ سب سے اوپر دستوری بادشاہ رکھا گیا، یعنی جرمن شہنشاہ۔

دستور فرینکفرٹ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ مجلس نے شاہ پروشیا کو شہنشاہ منتخب کیا، مگر فریڈرک ولیم نے مارچ ۱۸۴۸ء کے تمام وعدے پس پشت ڈال دیے اور آسٹریا کی مخالفت سے پریشان ہو کر پیشکش مسترد کر دی۔ اس نے دستور فرینکفرٹ کو ایک "ناجائز" دستور قرار دیا:

> "یہ تاج حقیقی تاج نہیں، یعنی ایسا تاج، جسے ہوہینزولرن خاندان کا فرد قبول کر سکے.....

---

[۱] Rhine and Revolution in Germany by J. G. Legge ص ۲۹۷

کیونکہ یہ ایسی مجلس کا تخلیق کردہ ہے، جو انقلابی بیج سے پیدا ہوئی...... نہیں، ہمارے لیے ایسا تاج چاہیے جس پر خدائے قادر مطلق کی مُہر ہو، یعنی جو شخص وہ تاج اختیار کرے، موہبتِ الٰہی کی بنا پر حکمراں بنے......"ل

چونکہ شہنشاہی کا واحد امیدوار کنارہ کش ہو چکا تھا، اس لیے فرینکفرٹ کی مجلس ختم ہو گئی۔ غیر ملکی حکومتوں نے اسے تسلیم نہ کیا۔ یہ محاصل میں ایک پائی بھی وصول نہ کر سکی اور اس نے جرمنی میں کبھی کوئی اختیار استعمال نہ کیا۔ اس کا واحد مثبت کارنامہ یہ تھا کہ عام چندے کے ذریعے سے سرمایہ فراہم کیا گیا اور اس سے ہیمبرگ میں دو پرانے جہاز خریدے گئے۔ یہی جہاز جرمن بحریات کی ابتدا تھے۔ اس طرح ظاہر ہو گیا کہ جرمنی کا اتحاد محض اخلاقی وعظ و نصیحت سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

جرمنی کی آزاد خیالی پر بھی زبردست شکست نے ضرب لگائی۔ انقلاب کا ابتدائی دھچکا گزر چکا تو جرمنی کے رئیسوں نے ۱۸۴۸ء کے منظور شدہ دستور یا تو منسوخ کر دیے یا ان کے اختیارات گھٹا دیے۔ پروشیا میں فریڈرک ولیم اور اس کے قدامت پسند مشیر متواتر ۱۸۴۸ء کے دستوری کنونشن کے کام کی قطع و برید میں لگے رہے۔ ۱۸۵۰ء کے پروشیائی دستور اساسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروشیا مطلق العنانی اور اقتدار امراء کے لیے پہلی جنگ عظیم کے آخر تک سازگار رہا۔

ہیبسبرگوں کے علاقے

۱۸۴۸ء میں جرمنی اور اطالوی قومیت کی تقدیر جزواً سلطنت ہیبسبرگ میں انقلابات کے نتیجے پر موقوف تھی۔ اگر یہ انقلابات ہیبسبرگوں کی حکومت کو خاصی مدت تک معطل رکھتے تو اطالوی اور جرمن اتحاد کی تحریکیں کامیاب ہو جاتیں۔ بیشک آسٹریا میں انقلاب کی لہریں پے بہ پے اُٹھتی رہیں، لیکن وہ طوفان کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا۔ جب سلطنت میں انقلاب کو شکست مل چکی تو اٹلی اور جرمنی میں اس کی کامیابی یقینی ہو گئی۔

ہیبسبرگوں کے انقلابات کی نوعیت اور کامیابی ان قومیتوں کی پُرپیچ ترکیبی حیثیت پر موقوف تھی، جن پر آسٹردی سلطنت مشتمل تھی۔

ہیبسبرگوں کے ماتحت قومیتیں ۱۸۴۸ء

قومیتوں کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

قومیت	تناسب بہ حیثیت مجموعی
جرمن	۲۳ فی صد
میگیار (اہلِ ہنگری)	۱۴ "
چیک اور سلوواک	۱۹ "

ل Rhine and Revolution in Germany by J. G. Legge ص ۵۱۶-۵۱۷-

یوگوسلافی	۴	فی صد
کروٹ	۴	"
صرب	۵	"
پولستانی	۷	"
روتھینی	۸	"
رومانی	۸	"
اطالوی	۸	"

(یہ تناسبات ایل۔بی نیمیر[1] سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو "۱۸۴۸ء اہل علم کا انقلاب" مشمولہ کارروائیہائے برٹش اکیڈمی ۱۹۴۴ء ص ۲۵۹)۔

اس پیچیدگی میں مزید الجھاؤ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ یہ قومی گروہ اپنے اپنے حلقے میں جغرافیائی اعتبار سے واضح طور پر الگ الگ نہ تھے۔ مثلاً سلطنت کے جس حصے میں ہنگری واقع تھا، وہاں میگیاروں کو دوسرے گروہوں پر فوقیت حاصل تھی، مگر وہ پوری آبادی میں اکثریت کے حامل نہ تھے۔ جغرافیائی ہنگری میں شمالی جانب سلوواکوں، مشرقی جانب (ٹرانسلوینیا) رومانویوں، جنوبی جانب کروٹوں اور صربوں کی اہم اقلیتیں موجود تھیں اور جرمن پورے ہنگری میں بکھرے ہوئے تھے۔

قوم پرست میگیار

قوم پرستی نے نہ صرف اطالویوں اور چیکوں بلکہ میگیاروں اور کروٹوں کے درمیان بھی ایک خاص قوت پیدا کر دی۔ میگیاروں کی قوم پروری نے ۱۸۴۴ء میں پہلی کامیابی حاصل کی۔ اس وقت تک ہنگری کی سرکاری زبان لاطینی چلی آتی تھی، مگر ۱۸۴۴ء کے بعد لاطینی کی جگہ ہنگری کی زبان جاری کر دی گئی۔ پھر ہنگری زیادہ تر زرعی ملک تھا۔ بڑے بڑے امیر اور شہری افسر سیاسی زندگی پر حاوی تھے۔ اضلاع کی مجالس اور مرکزی پارلیمنٹ کی نشستیں انھیں کی اجارہ داری میں تھیں۔ میگیار قوم پروروں کا ایک دبستان چاہتا تھا کہ ہنگری کی ثقافت اور اقتصادیات کو انگریزوں کے طریق کے مطابق تدریجاً نئے اصول پر لے آیا جائے۔ لیکن قوم پروروں کا ایک گروہ اس قسم کی اعتدال پسندی کا قائل نہ تھا۔ اس گروہ کی ترجمانی لوئی کوشوت[2] (۱۸۰۲ء۔۱۸۹۴ء) کر رہا تھا، جسے خطابت میں سحر انگیزی کا کمال حاصل تھا۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ وہ اپنی سرزمین کی سیاسی حیثیت میں انقلاب پیدا کر دیں گے۔ ان انتہا پسندوں کے نزدیک ۱۸۴۴ء کی لسانی اصلاح مجوزہ اصلاحات میں سے صرف پہلی تھی۔ وہ حکومت وی آنا سے تمام رشتے کاٹ دینے کے خواہاں تھے۔ اس وجہ سے میگیار قوم پروروں کو سلافی رعایا خصوصاً کروٹوں کی سیاسی بیداری سے شدید اختلاف تھا۔ سلافیوں، خصوصاً کروٹوں کے ہاں

---

[1] Namier

[2] Louis Kossuth

قومی احیاء اس وقت ہو چکا تھا، جب اُن کے وطن میں انقلابی اثرات پڑنے لگے تھے، کیونکہ ان کا وطن الیریائی صوبوں کی حیثیت میں سلطنت نپولین کا جزو بن چکا تھا۔

کروٹوں اور میگیاروں کے درمیان مخالفت سے واضح ہو گیا کہ سلطنت ہیپسبرگ کے اندر قومی تحریکوں میں کتنا تصادم تھا۔ بعض قومی گروہ —— اطالوی، میگیار، چیک اور پولستانی —— حکومت وی آنا میں جرمن اقتدار پر نالاں تھے۔ دوسرے گروہ خصوصاً کروٹ اور رومانوی اتنے جرمنوں کے مخالف نہ تھے، جتنے ہنگری والوں کے مخالف تھے، کیونکہ انھیں زیادہ تر میگیار آقاؤں سے سابقہ پڑتا تھا۔ یہ ایسی صورت حال تھی، جس سے فائدہ اٹھا کر حکومت "تفرقہ ڈالو اور فتح حاصل کرو" کی پالیسی کامیابی سے چلا سکتی تھی۔ مثلاً میگیاروں کے مخالف عناصر کو ان میگیاروں کے خلاف استعمال کرتی، جو جرمنوں کے مخالف تھے۔ یوں دونوں پر قابو پا لیتی۔ ۱۸۴۸ء میں یہی ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں گلیشیا کے اندر بغاوت ہوئی۔ آسٹریا نے یہ صوبہ پولینڈ کی تقسیم میں حاصل کیا تھا۔ وہاں یہی پالیسی اختیار کی گئی تھی۔ جب پولستانی مالکان اراضی نے بغاوت کی تو روتھینیا[1] کے وہ کسان ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے، جو سالہا سال سے مالکانِ اراضی کے ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ حکومت وی آنا نے ان کسانوں کی امداد کی۔

شکایات و احتجاجات

ہیپسبرگوں کے خلاف جو انقلاب بپا ہوئے، ان میں آزاد خیالی نے بھی نمایاں حصّہ لیا۔ آسٹریا آزاد خیالوں کی بے چینی کا مرکز تھا۔ روز افزوں طبقۂ اوسط شہری آزادی کا خواہاں تھا اور اس کی آرزو تھی کہ حکومت میں حصّہ مل جائے۔ نیز تجارتی نظریۂ زر کے سلسلے میں جو دقیانوسی پابندیاں عائد ہیں اور ان سے کاروباری سرگرمیوں میں مواقع پیدا ہوتے ہیں، وہ ختم ہو جائیں۔ پیرس اور برلین کی طرح وی آنا میں بھی مزدوروں نے وسیع جمہوری اصلاحات کا مطالبہ پیش کر دیا۔

۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۸ء تک ہیپسبرگ حکومت ان شکایتوں اور احتجاجوں کو عملاً ٹالتی رہی، جو سلطنت کے ہر حصّے سے کیے جا رہے تھے۔ اگر میٹرنخ کو مرضی کے مطابق کام کرنے کا موقع مل جاتا تو وہ دستور منظور کر لیتا۔ بیشک یہ دستور قدامت پسندی پر مبنی ہوتا، تاہم اس میں ایسی مراعات کا انتظام کر دیا جاتا، جو آزاد خیالوں اور قوم پروروں کے لیے باعث تسکین ہوتیں، مگر میٹرنخ کو خارجی معاملات میں پوری آزادی حاصل تھی، لیکن داخلی پالیسی میں وہ من مانی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ شہنشاہ اس کے آڑے آ رہے تھے۔ ان میں سے پہلا فرانسس اوّل تھا (۱۷۹۲ء۔ ۱۸۳۵ء)، جسے نوکر شاہی کا طریقہ پسند تھا۔ دوسرا فرڈی نند اوّل (۱۸۳۵ء۔ ۱۸۴۸ء)، جو ضعیف العقل اور مرگی کا مریض تھا۔ شہنشاہوں کے علاوہ امراء بھی بدستور مزاحم تھے۔ ہیپسبرگ حکومت ایک نااہل مطلق العنان حکومت تھی، جس کی حمایت میں مبصروں (ارباب احتساب) اور جاسوسوں کی پوری فوج مصروفِ عمل تھی، لیکن اس حکومت کا کام چونکہ بڑی دھیمی رفتار سے چلتا تھا، اس لیے اسے قابلِ برداشت سمجھ لیا گیا تھا۔ میٹرنخ نے بالکل صحیح کہا تھا کہ آسٹریا میں نظم و نسق تو ہے، مگر حکمرانی کا کوئی انتظام نہیں۔

---

[1] Ruthenia

چار جداگانہ انقلاب

پیرس میں فروری کا انقلاب بپا ہوا اور یہ خبر آسٹریا پہنچی تو سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ چار جداگانہ انقلاب مارچ ۱۸۴۸ء میں بہ یک وقت بپا ہو گئے۔

۱۔ اٹلی کے اندر لمبارڈی اور وینس میں بغاوت پھوٹ پڑی۔

۲۔ ہنگری میں کوشوت اور اس کے پُرجوش میگیار حامیوں نے شہنشاہ فرڈی ننڈ کو مارچ کے قوانین مان لینے پر مجبور کر دیا۔ ان کے مطابق ہنگری کو سلطنت کے اندر سیاسی خود مختاری مل گئی۔ ان کے مطابق پارلیمانی حکومت کا انتظام ہُوا اور قدیم جاگیردارانہ مجلس کی جگہ ایک ایسی قانون ساز مجلس نے لے لی جس کے ممبر منتخب ہوتے تھے۔ ان قوانین کے مطابق زرعی غلامی منسوخ کر دی گئی۔ امراء اور شرفاء محاصل سے بالکل فارغ تھے۔ یہ فراغت بھی ختم ہو گئی، یعنی ان پر بھی محاصل عائد ہو گئے، مگر نئے دستور نے ہنگری کی غیر میگیار آبادیوں سے بے پروائی اختیار کر لی۔ مثلاً جو شخص قانون ساز مجلس کے لیے انتخاب میں امیدوار بننا چاہتا، اس کے لیے لازم قرار دے دیا گیا کہ ہنگری کی زبان ضرور جانتا ہو۔

۳۔ ہنگری کی بغاوت سے متاثر ہو کر وی آنا کے مزدوروں اور یونیورسٹی کے طالب علموں نے بھی بغاوت کر دی۔ اگلے روز (۱۳۔ مارچ) میٹرنخ نے اس منصب سے استعفاء دے دیا، جو انتالیس سال تک اس کے قبضے میں رہا تھا اور وہ ایک معزز انگریز کا بھیس بدل کر انگلستان بھاگ گیا۔ اگرچہ شہنشاہی حکومت نے بار بار اصلاحات کے وعدے کیے، مگر وی آنا میں فسادات جاری رہے اور مئی تک سیاسی فضا اس درجہ بگڑ چکی تھی کہ شہنشاہ فرڈی ننڈ اور اس کا کنبہ دارالحکومت چھوڑ گیا۔ قرار یہ پایا تھا کہ جولائی میں دستور اساسی کے لیے ایک مجلس منعقد کی جائے۔ اس کے انعقاد تک وی آنا میں حکومت کی باگ ڈور ایک انقلابی مجلس کے حوالے کر دی گئی، جسے مجلس تحفظ کہتے تھے۔

۴۔ اس اثناء میں بوہیمیا کے مرکز پراگ کے قوم پرور چیک ویسے ہی حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے، جیسے قوانینِ مارچ کے مطابق میگیاروں کے لیے منظور ہو رہے تھے۔ جب یہ اطلاع ملی کہ جرمنوں کی اکثریت کی پارٹی فرینکفرٹ میں اس امر پر غور کر رہی ہے کہ بوہیمیا کو جرمن فیڈریشن میں شامل کرے تو بیچینی اور بھی بڑھ گئی۔ جون ۱۸۴۸ء میں چیکوں نے تمام سیاسی عناصر کی ایک کانگرس کا انتظام کیا تاکہ بوہیمیا کو جرمنوں کے تصرف سے محفوظ رکھنے کے لیے تمام سلافی گروہ ایک محکم محاذ قائم کر لیں۔ سلافی کانگرس نے بازاروں میں مظاہروں کی تجویز منظور کر لی۔ ان مظاہروں کے سلسلے میں پراگ کی آسٹری فوج کے کماندار شہزادہ وِنڈِش گراٹز[۱] کی بیوی اتفاقیہ ماری گئی (۱۲۔ جون ۱۸۴۸ء)۔ پانچ روز بعد شہزادے نے پراگ پر گولہ باری کی، چیک انقلابیوں کو منتشر کر دیا اور بوہیمیا میں فوجی ڈکٹیٹرشپ قائم کر لی، گویا انقلاب کے خلاف حرکت شروع ہو گئی۔

ایک مہینے کے بعد آسٹروی فوج نے اٹلی میں پیدمان کو بمقام کستوزا شکست دی۔ ستمبر ۱۸۴۸ء میں وی آنا کی دستور ساز

---

[۱] Windischgratz

مجلس نے، جس میں اٹلی اور ہنگری کے سوا تمام صوبوں کے نمائندے شریک تھے، اصلاحات کا ایک وسیع پروگرام منظور کیا۔ اس سے انقلاب کی مخالفت کو مزید تقویت پہنچی۔ اس اصلاحی پروگرام کے مطابق کسان غلامی کی آخری زنجیر سے نجات پا گئے، خصوصاً ان پر مالکان اراضی کے لیے کام کرنے کی پابندی باقی نہ رہی۔ کسان ہیبسبرگ آبادی کا سب سے بڑا حصّہ تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے مقاصد پورے کر لیے، لہٰذا وہ مزید انقلابی سرگرمیوں کی حمایت سے دستکش ہو گئے۔

حالات "تفرقہ ڈالو اور فتح کرلو" کی پالیسی کے لیے بڑے سازگار تھے، چنانچہ ہنگری کے صوبوں میں جرمن، سلوواک، رومانوی، صرب اور کروٹ سب کے سب میگیاروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ قوانینِ مارچ کے مطابق ان سب قوموں کے مقابلے میں میگیاروں سے امتیازی سلوک روا رکھا گیا تھا۔ ستمبر ۱۸۴۸ء میں شہنشاہی حکومت نے یلاشیش[1] حاکمِ کروٹیا[2] کو حکم دے دیا کہ مرکزی ہنگری پر حملہ آور ہو جائے۔ میگیار جانبازوں نے یلاشیش کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اس اثناء میں وی آنا کے انتہا پسندوں نے دوبارہ بغاوت کر دی اور اعلان کر دیا کہ ہم میگیاروں کے حامی ہیں اور آسٹریا میں جمہوری حکومت قائم کر لی گئی۔ یلاشیش اور ونڈش گراتز کی فوجوں نے وی آنا کے انقلابیوں کو کچل ڈالا (۳۱-اکتوبر ۱۸۴۸ء) اور انتہا پسند لیڈروں کو موت کی سزا دے دی گئی۔

اب انقلاب کی مخالف قوتوں نے سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ نومبر ۱۸۴۸ء میں شہزادہ فیلکس شوارزن برگ[3] (۱۸۰۰ء، ۱۸۵۲ء) ہیبسبرگ حکومت کا وزیرِ اعظم بن گیا۔ وہ ونڈش گراتز کا برادرِ نسبتی تھا اور اگرچہ بڑا سرگرم رکن تھا، مگر اصولِ اخلاق سے اسے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس نے دسمبر میں ساز باز کر کے فرڈی ننڈ اوّل کو تاج و تخت سے دست برداری پر راضی کر لیا، جو نا اہل تھا اور اس کے ہیژدہ سالہ بھتیجے فرانسس جوزف (۱۸۴۸ء-۱۹۱۶ء) کو شہنشاہ بنا دیا۔ اس میں اور کوئی خوبی تھی یا نہ تھی، مگر وہ ناقص العقل تھا اور مرگی کا مریض تھا۔ ساتھ ہی شوارزن برگ نے اعلان کر دیا کہ سابق شہنشاہ نے جو وعدے کیے تھے، وہ قانوناً جانشین کو پابند نہیں کر سکتے، لہٰذا آسٹروی دستور ساز مجلس نے جو دستوری تجویزیں منظور کی تھیں، وہ سب کی سب ردّی کی ٹوکری میں ڈال دی گئیں۔

شوارزن برگ نے وی آنا کا اقتدار از سرِ نو بحال کر دیا۔ اس پر میگیاروں میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ وحشیوں کی طرح لڑے۔ اپریل ۱۸۴۹ء میں ہنگری کی پارلیمنٹ نے اعلان کر دیا کہ ہمارا ملک ایک آزاد جمہوریت ہے اور کوشوت کو ہیئتِ انتظامیہ کا رئیس مقرر کر دیا۔ عین اس موقع پر آسٹریا کو غیبی مدد مل گئی۔ نکولس اوّل زارِ روس کو یہ خطرہ نظر آیا کہ انقلابی وبا کو روکا نہ گیا تو یہ روسی پولینڈ میں بھی پھیل جائے گی، لہٰذا اس نے آسٹریا کو فوجی امداد کی پیشکش کر دی۔ شوارزن برگ نے زار کی پیشکش قبول

---

[1] Jellachich [2] Croatia

[3] Felix Schwarzenberg

کرلی اور اگست ۱۸۴۹ء میں روسی فوجوں نے جمہوریۂ ہنگری کی تسخیر میں آسٹریا کا ہاتھ بٹایا۔

۱۸۴۸ء کے سبق

زار نکولس اوّل نے ۱۸۵۰ء میں فخریہ کہا تھا کہ قدرت نے یورپ کو دستوری حکومت کے چنگل سے نجات دلانے کا کام میرے سپرد کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء تک پورے براعظم میں ان دستوری حکومتوں سے نجات حاصل کرنے کا عمل جاری تھا، جو ۱۸۴۸ء میں قائم ہوئی تھیں۔ فرانس میں صدر بونا پارٹ، پروشیا میں فریڈرک ولیم چہارم، آسٹریا اور اٹلی میں شوارزن برگ مطلق العنانی کے احیا کی کامیاب رہنمائی کر رہے تھے۔ کوشوت، میزینی اور دوسرے انقلابیوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ ۱۸۴۸ء کے ابتدائی مہینوں کا خیر مقدم پُرجوش آزاد خیالوں نے یہ کہتے ہوئے کیا تھا کہ قوموں کا موسم بہار آ گیا، مگر یہ جھوٹی بہار ثابت ہوئی۔

میزینی نے خود یہ حقیقت واضح کی کہ انقلاب کی مخالف قوتیں کس وجہ سے قوموں کے موسم بہار کی بربادی کا موجب بنیں۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے لندن کے اندر بیٹھے ہوئے لکھا:

> "پھر رجعت کیوں کامیاب ہوئی؟ اس کے ذمہ دار خود ہم ہیں۔ ہم میں تنظیم موجود نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے پر برابر بے اعتمادی کرتے رہے، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے لڑتے رہے۔ ہم میں ضبط و نظم کی وہ روح قطعاً موجود نہ تھی، جو تنہا عالیشان نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ ہم نے اپنی قوتوں کو متعدد چھوٹے چھوٹے مرکزوں اور حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ طریقہ انحلال کے لیے نہایت موثر اور تشکیل کے لیے سراسر بے اثر ہے۔
>
> سبب یہ ہے کہ ہم نے تعلیم و تربیت کے عظیم الشان معاملے کی جگہ مادی فوائد کی پرستش شروع کر دی، حالانکہ تعلیم و تربیت ہی کے ذریعے سے ہماری کوششوں میں وجہ جواز پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم نے روحِ تربیت کی جگہ تنگ نظرانہ قوم پروری کو دے دی۔ ہر قوم نے حماقت سے یہ فرض کر لیا کہ وہ تمام سیاسی، عمرانی اور اقتصادی مسائل تنہا حل کر سکتی ہے۔ ان سب نے یہ بنیادی حقیقت فراموش کر دی کہ تمام قوموں کا مسئلہ ایک ہے اور ہمیں اپنے مسائل کے لیے انسانیت پر انحصار رکھنا چاہیے ..... فرینکفرٹ میں تنگ نظر قومیت کی زبان نے جرمنی کا انقلاب برباد کر دیا، جس طرح خاندان سیوائے (پیدمان) کی حرصِ توسیع نے اطالوی انقلاب کو تباہی کے غار میں گرا دیا۔"[۵]

۱۸۴۸ء کے انقلابیوں نے ۱۸۳۰ء کے واقعات سے پوری عبرت حاصل نہیں کی تھی۔ انھوں نے زیادہ تر اس امر پر

---

[۵] "میزینی کی حیات و تحریرات" جلد سوم ص ۷۶ - ۷۷۔

انحصار کیا کہ عوام خود بخود اُن کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان کی سرگرمیاں بیشتر طبقاتی اور گروہی دلائل میں صرف ہوتی رہیں اور ان کی قوت باہمی کشمکشوں میں ضائع ہو گئی۔ مثلاً انتہا پسند مزدوروں اور طبقۂ اوسط کے اعتدال پسندوں کی کشمکش، جیوبرٹی اور میزینی کے پیرووں کی کشمکش۔ چھوٹے جرمنوں اور بڑے جرمنوں کی کشمکش، میگیاروں اور سلافیوں کی کشمکش۔ میزینی نے مادی فوائد کی پرستش کا ذکر بھی کیا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فرانس کے سرمایہ دار اور کسان پیرس کے اشتراکیوں سے ڈر رہے تھے کہ کہیں ان کی نجی جائدادیں برباد نہ ہو جائیں اور سلطنت ہیبسبرگ کے کسانوں نے قدیم جاگیردارانہ حقوق حاصل کر لیے تو انقلاب سے انھیں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

قوم پروری کی تنگ نظرانہ روح ۱۸۴۸ء کے بعد ختم نہ ہوئی۔ یہ ہیبسبرگوں کی سلطنت میں برابر ہراس انگیز بنی رہی اور آخر اس سلطنت کی تباہی کا موجب ہوئی۔ آزاد خیال ۱۸۴۸ء میں جرمنی اور اٹلی کو متحد نہ کر سکے اور قومی تحریک کی قیادت انقلابیوں کے ہاتھ سے نکل کر پیڈمان اور پروشیا کے پیشہ ور سیاستدانوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ جس حد تک اٹلی کا تعلق ہے، اس تبدیلی سے فائدہ پہنچا، کیونکہ اطالوی ریاستوں میں پیڈمان کے سوا کوئی نہ تھی، جس نے ۱۸۴۸ء میں ایسا دستور حاصل کر لیا تھا، معتدل آزاد خیالی پر مبنی تھا۔ باقی رہا جرمنی کا معاملہ تو وہاں آزاد خیالی کے دشمن بسمارک نے وہ مقصد خون اور فولاد کے ذریعے سے پورا کیا، جو فرینکفرٹ کی مجلس پُرامن ذرائع سے حاصل نہیں کر سکی تھی۔

جون میں پیرس کے اندر طبقاتی جنگ کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔ سیاسی حقوق اور دستور کے لیے پرانے مطالبات کے ساتھ عمرانی اور اقتصادی حکومتوں کے مطالبے بھی شامل ہوتے رہے، صنعت کاری سے جو قوتیں اُبھری تھیں، یورپ میں ان کا اثر محسوس کیا جا رہا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں محض انقلابات ہی بپا نہ ہوئے، بلکہ مارکس[۱] اور اینجلز[۲] کا کمیونسٹ منشور[۳] بھی پہلی مرتبہ شائع ہُوا۔

---

[۱] Marx

[۲] Engels

[۳] The Communist Manifesto

اقتصادی انقلابات کا ٹکراؤ

بائیسواں باب

صنعتی انقلاب

تمہید یکم مئی ۱۸۵۱ء کو ملکہ وکٹوریہ نے لندن میں تمام قوموں کے آثارِ صنعت کی بڑی نمائش کا افتتاح کیا۔ یہ اس قسم کی عالمی نمائشوں میں سے پہلی تھی، جس میں آخری مکانیکی عجائبات ایک ایسی نمائش گاہ میں رکھے گئے تھے، جو بجائے خود انجنیئری کا ایک حیرت انگیز کارنامہ تھی "یعنی کاخِ بلّور"[1]، لوہے اور بلّور کی ایک عظیم الشان عمارت، جو ہائیڈ پارک[2] کے اندر ایک تہائی میل سے بھی زیادہ رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جو لوگ "کاخ بلّور" میں پہنچے، اُن پر آشکارا ہوگیا کہ برطانیہ دنیا بھر کی کارگاہ ہے اور صنعتی انقلاب منزل بلوغ پر پہنچ چکا تھا۔

یقیناً لندن کی نمائش نہ تو صنعتی انقلاب کی ابتدا تھی اور نہ انتہا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مشینوں اور کارخانوں کی وجہ سے انگلستان کی ظاہری وضع وہیئت میں تبدیلی شروع ہوگئی تھی اور ۱۸۵۱ء کے بعد ایک صدی کے اندر اندر نہ محض برطانیہ اور دوسری قوموں، بلکہ روئے زمین کے اکثر ملکوں میں گہرے تغیّرات پیدا ہوگئے تھے۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں مبرہن ہو چکا تھا کہ تجارتی اور فنی تشکیلات میں انقلابی تبدیلیوں سے معاشرے اور سیاسیات میں انقلابی نتائج رونما ہو رہے ہیں۔

صنعت کاری نے قوموں کو ایک دوسری سے قریب تر کر دیا، کیونکہ اس سے بین الاقوامی مبادلے بہت بڑھ گئے، حمل و نقل اور آمد و رفت کے وسائل میں اصلاحات کے باعث فاصلے کم رہ گئے، لیکن اس سے بین الاقوامی تناؤ کو بھی تقویت پہنچی، کیونکہ قومیت اقتصادی عزائم کی پشتیبانی سے زیادہ محکم ہوگئی۔ خام مال کی بہم رسانی اور مصنوعات کے لیے منڈیوں کی اجارہ داری کے سلسلے میں ایک ایسی جنگ شروع ہوگئی، جو خونریزی سے بالکل پاک تھی، کاروباری آدمیوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ قومی پالیسی ایسی رکھی جائے، جس سے تیز اور نفع بخش اقتصادی نشو و ارتقا کو مدد ملے۔ ساتھ ہی انھوں نے سیاسی حقوق کی صدا لگائی، تاکہ پالیسی کے فیصلے میں خود انھیں بھی رائے دینے کا موقع مل سکے۔ صنعتی انقلاب سے معیار ہائے معیشت بلند ہو گئے اور انسانوں کی بڑی تعداد آسائشِ حیات کے لطائف و لوازم سے بہرہ مند ہونے لگی۔ ساتھ ہی بے روزگاری، کم اجرت، رہنے سہنے اور کام کرنے کے خراب عادت نے نازک صورت اختیار کرلی۔ صنعتی مزدور کارکردگی، تنظیم، ہڑتال اور ووٹ دینے کے حق کے لیے شور مچانے لگے۔

---

[1] Crystal Palace [2] Hyde Park

صنعت اور مزدوری کے ظہور نے ایسے دبستان پیدا کر دیے، جن کے عمرانی اور سیاسی افکار متصادم تھے۔ ایک دبستان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس آزاد خیالی پر قائم رہنا چاہیے، جس کی تلقین عدم مداخلت کے داعیوں نے کی اور جس پر فرانس میں "جولائی کی بادشاہی" عمل پیرا رہی۔ وہ کہتے تھے کہ جو چیز کاروبار کے لیے مفید ہے، لازم ہے کہ وہ مزدوری کے لیے بھی مفید ہو۔ اگر ایک مزدور اقتصادی تحفظ اور سیاسی حیثیت کا خواہاں ہے تو یہ چیزیں اسے کوشش سے حاصل کرنی چاہییں، یعنی خاصا دولتمند ہو جائے اور وہ اُسے مل جائیں گے۔

آزاد خیالوں کے دوسرے دبستان کا عقیدہ یہ تھا کہ مملکت کو وقتاً فوقتاً مفید و فیاضانہ اصلاحات کرتے رہنا چاہیے، جن سے مزدوروں کو فائدہ پہنچے۔ یہ اعتدال پسند مصلحین بعض مزدوروں کو تو مطمئن کر سکے، لیکن دوسرے مزدور زیادہ وسیع، مگر پُرامن تغیّرات کے حامی تھے، جن کا نمونہ لوئی بلینک اور مثالی اشتراکیت کے دوسرے وکیلوں نے پیش کیا تھا۔ مزدوروں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا، جس نے انقلابی اشتراکیت قبول کر لی تھی، یعنی وہ پُرتشدد اور ناگزیر طبقاتی جنگ، جس کی پیشگوئی مارکس اور اینجلز نے کمیونسٹ منشور میں کی تھی۔

اکثر بڑے سیاسی اور اقتصادی مسائل، جو آج بھی بڑی حد تک ہمارے سامنے ہیں، ایک صدی پیشتر بروئے کار آ گئے تھے۔ صنعت کاری نے مزدوروں کا نیا مسئلہ پیدا کر دیا اور کسانوں کے قدیم مسئلے میں مزید شدت پیدا ہو گئی، جو لوگ نسبتاً آزاد بین الاقوامی تجارت کے حامی تھے، نیز اُن اقتصادی قوم پروروں کے درمیان، جو حفاظتی محاصل کا مطالبہ کر رہے تھے، اختلافات تیز تر ہو گئے۔ آزاد خیال دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک گروہ فلاحی مملکت کا حامی بن گیا اور دوسرا مخالف۔ مزدوروں کی ایک انتہا پسند جماعت پیدا ہو گئی، پھر دو حریف دبستانوں میں بٹ گئی۔ ایک مثالیت کے حامیوں کا دبستان اور دوسرا مارکسی اشتراکیت کا دبستان۔ یوں انسانی تاریخ کی رفتار میں بدرجہا زیادہ نمایاں تبدیلی ہوئی، ایسی تبدیلی کسی بڑے سیاسی ہنگامے، مثلاً ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہی بڑا واقعہ ہے، جسے تاریخ میں صنعتی انقلاب قرار دینا بالکل بجا ہے۔

پس منظر

صنعتی انقلاب کا پس منظر مغربی یورپ کی تاریخ میں بہت پیچھے تک چلا گیا ہے۔ جن عوامل نے یورپ کو صنعت کاری کے لیے تیار کیا، ان میں وہ سیاسی، مذہبی، سائنٹیفک اور ذہنی قوتیں شامل تھیں جن سے دورِ حاضر کی ابتدائی دنیا نے تشکیل پائی۔ متقابل مملکتی نظام کا ظہور، پروٹسٹنٹوں کا زور سخت محنت پر، سترھویں صدی کے سائنسدانوں اور اٹھارھویں صدی کے فلسفیوں کی طرف سے روایت کے متعلق بے اعتنائی، ان تمام چیزوں نے ایک ایسے معاشرے اور ایسی ثقافت کی تخلیق میں حصہ لیا، جو وسیع اقتصادی تغیّرات کے لیے سازگار تھے۔ اگرچہ صنعتی انقلاب کے قطعی اسباب انسانی اداروں کے وسیع حلقے پر مبنی تھے، مگر فوری اسباب زیادہ تر اقتصادی تھے۔ چار چیزیں براہِ راست انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کا موجب نبیں اور ان چاروں کے درمیان گہری وابستگی تھی:

۱۔ صنعتی پیداوار کے لیے قوت کے ذریعے سے چلنے والی مشینوں کا زیادہ استعمال۔

۲۔ کوئلے، لوہے اور فولاد کی زیادہ عمدہ پیداوار۔

۳۔ ریلوں حمل و نقل اور آمد و رفت کے زیادہ تیز وسائل کا ظہور۔

۴۔ بینکوں اور اعتباری سہولتوں میں توسیع۔

مشینیں | ایک سو سال پیشتر مکانیکی صنعتوں میں روئی کو سب سے اونچا درجہ حاصل تھا۔ روئی کاتنے کی مشین اٹھارھویں صدی کے ساتویں عشرے میں بنی تھی، پھر روئی کی صنعت کے مختلف حصوں میں مشینوں سے کام لینے کا سلسلہ تدریجاً پھیلتا گیا۔ سنہ ۱۷۹۳ء میں امریکہ کے ایک شخص ایلی وٹنے[1] نے روئی صاف کرنے کی ایک مشین ایجاد کی۔ یہ ایک انجن تھا، جو خالص روئی کو بنولوں سے الگ کرتا تھا اور اس کے ذریعے سے ایک غلام اتنا کام انجام دے سکتا تھا، جو پہلے پچاس غلام ہاتھ سے انجام دیتے تھے۔ اس اثنا میں برطانوی موجدوں نے سوتی کپڑا بننے کے لیے ایک کرگا ایجاد کیا، جو ہاتھ سے چلتا تھا۔ سنہ ۱۸۳۰ء تک برطانیہ میں ایسے پچاس ہزار کرگے برسرکار آ چکے تھے اور سوتی پارچے کی برآمد برطانیہ کی پوری برآمدی تجارت میں نصف ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۸۵۱ء کی برطانوی مردم شماری سے واضح ہوا کہ پانچ لاکھ مزدور صرف روئی کی صنعت میں کام کر رہے تھے۔

مکانیکی انجنیئری میں پیش رفت کے باعث یہ تیز توسیع ممکن ہو گئی۔ ابتدا میں یہ مشکل پیش آتی رہی کہ جو پرزے گھس جاتے تھے، ان کی جگہ ویسے ہی پرانے تیار کر کے لگا لینا ممکن نہ تھا۔ اس وجہ سے مشینوں کی افادی حیثیت بڑی حد تک محدود رہی۔ ان مشینوں میں وٹ[2] دخانی انجن بھی شامل تھا۔ پھر برطانوی انجنیئروں نے گھڑیاں اور کلاک بنانے والے لوگوں کی تکنیک کا گہرا مطالعہ کیا۔ پھر خراد تیار کر لیا گیا، جس کے ذریعے سے بالکل یکساں قبضے بنائے جا سکتے تھے۔ اس طرح مختلف مشینوں کے نشو و ارتقاء کو مدد ملی، مثلاً ارہ کشی، سوراخ کنی، نیز ان کندوں کو چرخیوں کے ذریعے سے پھرایا جا سکتا تھا، جس سے برطانوی جہاز محاربات نپولین میں کام لیتے رہے۔ اس اثناء میں ایلی وٹنے اپنے کارخانۂ اسلحہ (واقع کنکٹیکٹ[3]) میں ایک اہم تجربہ کر رہا تھا۔ سنہ ۱۷۹۸ء میں اس نے بتایا کہ ہیں مختلف، توپوں کے پرزے، مثلاً ضامن اس درجہ یکساں بنا رہا ہوں، جیسے تانبے کی پلیٹ پر کھدے ہوئے نقوش کی مسلسل دابیں یکساں ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وٹنے معیاری اور باہم بدلے جانے والے پرزے تیار کر رہا تھا اور ہم آج جس طریقہ پر مشینوں سے کام لے رہے ہیں، اس کا ایک بنیادی اصول ہاتھ آ گیا تھا۔

تاہم امریکن اور برطانوی صنعتکاروں نے تقریباً پچاس سال تک وٹنے کے تجربات کا انقلابی اصول نظر انداز کیے رکھا۔ اگرچہ مشینوں کا استعمال بڑھ گیا تھا، تاہم رفتار ایسی تیز نہ تھی۔ دستکاریاں بدستور جاری تھیں، مثلاً سوتی اور اونی صنعت کے سلسلے میں مشینوں کا استعمال سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد شروع ہوا، جب برطانیہ نے اون کاتنے کی مشین تیار کر لی اور امریکی آئزک سنگر[4] نے سلائی کی مشین کو ہر دلعزیز بنا دیا۔

کوئلہ اور لوہا | روئی کے ساتھ کوئلہ بھی ایک ایسی صنعت تھا، جس کے اہم فنی مسائل کے حل کی طرف سب سے پہلے توجہ کی گئی

---

[1] Eli Whitney [2] Watt [3] Connecticut

[4] Isaac Singer

دخانی انجن کانوں سے پانی باہر نکالتے تھے۔ تازہ ہوا کے لیے منفذ بھی رکھے جاتے تھے اور دخانی قوت سے چلنے والے پنکھے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ حفاظتی لیمپوں[1] کے ذریعے سے کانوں کی خطرناک گیسوں کے محفوظ رہنے کا انتظام ہو گیا تھا۔ اس طرح کان کن ایک ہزار فٹ سے زیادہ گہرائی میں کام کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس وقت برطانیہ کوئلے کی صنعت میں سب پر فائق تھا۔ وہاں ۱۸۱۶ء میں ایک کروڑ ساڑھے لاکھ ٹن کوئلہ تھا۔ ۱۸۳۶ء میں اس کی مقدار تین کروڑ ٹن اور ۱۸۵۲ء میں چھ کروڑ ٹن ہو گئی۔

زیادہ کوئلہ صنعت آہن کی توسیع میں صرف ہونے لگا، کیونکہ کوئلے کی بڑی مقدار سے کوک بنایا جاتا تھا، جو لوہا پگھلانے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ پگھلانے کا طریقہ انجن بھٹی کے بن جانے (۱۸۲۸ء) کے بعد بہت ترقی کر گیا۔ انجن بھٹی میں گرم ہوا لوہے پر گرم کوک کا عمل تیز کرنے میں مدد دیتی تھی۔ اس بھٹی کی بدولت برطانیہ میں ایسا سخت لوہا بننے لگا جو پلوں اور کارخانوں کی عمارتوں میں استعمال کرتے تھے، لیکن لوہا بہتر سے بہتر درجے پر پہنچ جانے کے بعد بھی فولاد کی بے پناہ قوت کا حامل نہیں بن سکتا تھا۔ فولاد بنانے کے لیے لوہے کو بھی مدت تک تیز حرارت دے دے کر صاف کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس میں کاربن کی مقدار بہت کم رہ جاتی ہے۔

فولاد اُنیسویں صدی کے اوائل میں بھی بنایا جا سکتا تھا، لیکن اس پر خرچ زیادہ ہوتا تھا۔ مثلاً ایک ٹن لوہے پر جتنا خرچ ہوتا تھا، ایک ٹن فولاد پر اس سے پانچ گنا خرچ ہوتا تھا۔ پھر ایک فرانسادی الاصل انگریز بیسمر[2] نے ۱۸۵۶ء میں ایک مشین ایجاد کی، جس سے پگھلی ہوئی دھات کو ہوا دے دے کر سے تمام خرابیوں سے پاک کر لیا جاتا تھا۔ دس سال بعد سیمنز[3] نام ایک جرمن نے، جو انگلستان میں رہتا تھا، کھُلی بھٹی کا طریقہ تجویز کیا۔ اس میں ٹوٹا پھوٹا لوہا اور نیا لوہا دونوں استعمال ہوتے تھے اور بیسمر کی مشین سے کہیں زیادہ مقدار میں دھات کو پگھلا کر صاف کر لیا جاتا تھا۔ غرض بیسمر اور سیمنز کی ایجادات نے فولاد بنانے کے مصارف اتنے کم کر دیے کہ ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان فولاد سازی کی مقدار میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔

حمل و نقل اور آمد و رفت

لوہا اور فولاد زیادہ تر ریل کی سڑکوں میں استعمال ہونے لگے، جن سے وسائل حمل و نقل میں انقلاب انتہا پر پہنچ گیا۔ اُنیسویں صدی کے پہلے تین عشروں میں یورپ اور شمالی امریکہ کے اندر سیکڑوں میل نہریں کھودی گئی تھیں۔ شاہراہوں کی درستی کا انتظام میک ایڈم[4] نے کیا، جو سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اسی نے سنگپاروں سے پائدار سڑکیں بنانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا، جو اب تک اسی کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن نہروں اور سڑکوں کے ذریعے سے کوئلے اور لوہے جیسی بھاری چیزیں جہازوں میں لاد کر جا بجا نہیں پہنچائی جا سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں اصل مشکل کا حل ریل کی سڑکوں نے مہیا کیا۔ اُنیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک برطانیہ میں کئی سو میل چھوٹی پٹڑی بچھ چکی تھی جس پر گھوڑا گاڑیاں سامان لاتی لے جاتی تھیں۔ پٹڑیوں کے لیے ریلیں بنانے اور پختہ پشتے تیار کر لینے کا طریقہ معلوم تھا، صرف اتنا کام باقی رہ گیا تھا کہ دخانی قوت سے چلنے والی گاڑیوں کی تیاری مکمل ہو جائے۔ ۱۸۲۷ء میں جارج سٹیفن سن[5] اور دوسرے

---

[1] Safety Lamp

[2] Bessemer

[3] Siemens

[4] Macadam

[5] Stephenson

لوگوں نے دخانی انجن تیار کرلیا، جو خود بخود چلتا تھا۔ دو سال کے بعد سٹیفن سن کے "راکٹ"[1] نے یہ مظاہرہ کیا کہ دخانی قوت سے ایک انجن لورپول اور مانچسٹر کے درمیان نئی پٹڑی پر ترپن منٹ میں بارہ میل سفر طے کر گیا۔ یہ پہلی پٹڑی تھی جس پر دخانی انجن کے ذریعے گاڑیاں چلنے لگیں۔ پھر ریل کی پٹڑیاں بچھنے کا ایک ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ۱۸۳۵ء تک برطانیہ میں ریل کی پٹڑی پانسو میل تک تھی۔ ۱۸۵۰ء میں چھ ہزار چھ سو میل اور ۱۸۷۰ء میں ساڑھے پندرہ ہزار میل تک پہنچ گئی۔

بھاپ نے آبی حمل ونقل میں بھی انقلاب پیدا کر دیا، فلٹن[2] نے ایک دخانی کشتی تیار کی، جس کا نام کلرمونٹ[3] تھا۔ اس نے ۱۸۰۷ء میں دریائے ہڈسن پر کامیاب سفر کیا۔ پھر ریاستہائے متحدہ امریکہ اور یورپ کی اندرونی آبی شاہراہوں پر دخانی جہاز چلنے لگے، البتہ سمندروں پر چلنے والے جہازوں پر خرچ زیادہ ہوتا تھا، کیونکہ بحری انجن اچھے نہیں بنے تھے۔ جب سیموئیل کیونارڈ[4] نام ایک باشندۂ سکاٹ لینڈ نے اوقیانوس میں جہازرانی کا پہلا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا (۱۸۴۰ء میں لورپول اور بوسٹن کے درمیان) تو جو کوئلہ سفر کے لیے ساتھ رکھا گیا، اس نے جہاز کا تقریباً نصف حصہ گھیر لیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ صرف مسافروں اور ڈاک کو دخانی جہاز میں بھیجا جا سکا۔ زیادہ تر سامان اچھے بادبانی جہازوں ہی میں بھیجا جاتا رہا۔ آخر ۱۸۶۰ء کے بعد بہتر بحری انجن تیار کر لیے گئے اور جہاز چلانے کی چرخی کی جگہ پنکھا استعمال ہونے لگا۔ اس وجہ سے بادبانی تجارتی جہاز بالکل ختم ہو گئے اور سارا کام دخانی جہازوں کے ذریعے سے ہونے لگا۔

اس اثناء میں آمد و رفت کے وسائل بھی بہتر ہوتے رہے۔ ۱۸۴۰ء میں درستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ حکومت برطانیہ نے ایک پنس کی ڈاک کا سلسلہ شروع کیا، مثلاً لندن سے ایڈنبرا خط بھیجنا ہوتا تو صرف ایک پنس خرچ کرنا پڑتا، جو پیشتر کے خرچ کے مقابلے میں ۱/۲ حصے سے بھی کم تھا۔ دوسرے ممالک نے بھی برطانیہ کی اس مثال کی پیروی کی اور کم خرچ میں ڈاک کا زیادہ عمدہ انتظام کر لیا۔ پھر حد درجہ ضروری پیغامات کے لیے تار برقی کا استعمال شروع ہُوا۔ سب سے پہلا برقی پیغام بالٹی مور سے واشنگٹن بھیجا گیا (۱۸۴۴ء)۔ پھر آبدوز تار برقی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے پہل رود بارِ انگلستان میں اس تار کا انتظام ہُوا (۱۸۵۱ء)۔ اوقیانوس پار تار برقی کا سلسلہ ۱۸۶۶ء میں شروع ہوا اور ٹیلیفون کے ذریعے سے پہلا ربط و ضبط ۱۸۷۶ء میں قائم کیا گیا۔

بینک اور سرمایہ

ان نئی ایجادوں اور دریافتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تازہ سرمایہ درکار تھا۔ چنانچہ متموّل تاجروں نے جو پہلے سے خاصے سرمایہ دار چلے آتے تھے، نئے صنعتکاروں کی اعانت کی۔ گلاسگو میں تمباکو کے جو تاجر موجود تھے، انھوں نے وہ سرمایہ مہیا کر دیا، جو اُن کے شہر کو سکاٹ لینڈ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بنا دینے کا موجب ہُوا۔

---

[1] Rocket یہ اس دخانی انجن کا نام تھا، جو سب سے پہلے سٹیفن سن نے بنایا۔

[2] Fulton

[3] Clermont

[4] Samuel Cunard

اسی طرح لندن اور برسٹل میں جہاز کے جو سوداگر تھے، انھوں نے جنوبی ویلز کی صنعت آہن کے لیے روپیہ مہیا کیا۔ بینکروں نے اتنا اہم کردار ادا کیا کہ برطانوی مدبّر ڈزرائیلی[1] نے لندن کے بیرنگ[2] خاندان اور راکس چائلڈ[3] کے بین الاقوامی خاندان کو یورپ کی بہت بڑی قوتوں میں شمار کیا۔

راکس چائلڈ پانچ بھائی تھے، جو ایک جرمن یہودی سرمایہ دار کے بیٹے تھے۔ ان پانچوں میں سے ہر ایک نے لندن، پیرس، فرینکفرٹ، نیپلز اور ویانا میں اہم اقتصادی مرکز قائم کر لیے۔ آسٹروی حکومت نے ہر بھائی کو مالی خدمات کے عوض میں بیرن کا خطاب دے دیا۔ ساتھ ہی لندن اور پیرس کے بھائیوں کو اپنے سفارتی نمائندے بنا دیا۔ راکس چائلڈ خاندان نے اس لیے ترقی کی کہ وہ نسبتاً بہت کم منافع لیتے تھے، اور جس عہد میں سٹہ بہ کثرت جاری تھا، وہاں غیر معمولی خطرناک کاروبار میں سرمایہ نہیں لگاتے تھے۔ مزید برآں اس خاندان نے مختلف ملکوں میں شاخیں قائم کر کے بین الاقوامی حیثیت پیدا کر لی تھی اور ایک ملک کے باشندوں کو دوسرے ملک کے منصوبوں میں روپیہ لگانا سہل ہو گیا تھا، مثلاً راکس چائلڈ کا جو مرکز پیرس میں تھا، اس نے ۱۸۴۰ء کے بعد فرانس کی ریلوے پٹڑیوں کے لیے انگلستان کا سرمایہ حاصل کر لیا۔

بینکوں نے نقد کی جگہ چیکوں اور ہنڈیوں کے استعمال کو فروغ دیا۔ اس سے اقتصادی توسیع میں بڑی مدد ملی۔ محاربات نپولین کے دوران میں سکے کم ہو گئے اور برطانوی کارخانہ دار مجبور ہوئے کہ مزدوروں کو اجرت میں یا تو جنس دے دیتے یا مختلف حوالے اُن کے سپرد کر دیتے، جن کی قیمت نا استوار تھی۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے مقامی بینکوں کو اختیار دے دیا کہ وہ کاغذی نوٹ جاری کر دیں، تاکہ سکوں کی کمی کی تلافی ہو سکے۔ لیکن جب مالی بحران واقع ہوتا —— اور ایسے بحران ۱۸۵۰ء سے پہلے اکثر پیش آتے رہے —— تو درجنوں مقامی بینکوں کا کاروبار بند ہو جاتا اور ان کے نوٹوں کی کوئی قیمت باقی نہ رہتی۔ رفتہ رفتہ پارلیمنٹ نے زیادہ مستقل علاج تجویز کیے۔ اس نے بڑے بڑے اور زیادہ استوار بینکوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ چھوٹے بینکوں کو اپنے اندر شامل کر لیں اور ۱۸۴۴ء میں بینک آف انگلینڈ کو نوٹوں کے اجراء کا اجارہ دے دیا۔ اس طرح کاغذی سکے بہت قابلِ اعتماد ہو گئے۔ اسی طرح پارلیمنٹ نے پہلے ریلوے پٹڑی کی کمپنیوں، پھر دوسری کمپنیوں پر محدود ذمہ داری کا اصول استعمال کیا اور برطانوی فرموں کے نام کے ساتھ لمیٹڈ کا متعارف لفظ اب تک اس کی شہادت دے رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے اوائل میں اکثر برطانوی کمپنیوں کے حصہ داروں کی ذمہ داری لامحدود تھی۔ ایسا بھی ممکن تھا کہ ان کی نجی جائدادیں پوری کی پوری ناکام کمپنی کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے ضبط کر لی جاتیں۔ جب کمپنی کے ہر حصہ دار کی ذمہ داری اس کے حصوں کی قیمت تک محدود ہو گئی تو وسیع پیمانے پر سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی ہوئی کیونکہ

ا؎ Disraeli

۲؎ Baring

۳؎ Rothschild

خطرے گھٹ گئے تھے۔

برطانیہ کی قیادت

اُنیسویں صدی میں برطانیہ کو صنعتی قیادت کا درجہ حاصل رہا۔ مالیات کے متعلق قانون سازی اس کا محض ایک جزو تھی۔ برطانیہ کے پاس کوئلے اور لوہے کے بڑے بڑے ذخیرے موجود تھے اور ان سے بآسانی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ نیز برطانوی جزیرے جغرافیائی اعتبار سے متحد تھے، اس لیے کان سے دھات پگھلانے کے مقام تک، اور کارخانے سے بندرگاہ تک فاصلہ بھی مقابلۃً کم تھا اور خرچ بھی کم ہوتا۔ آبادی خاصی زیادہ تھی۔ مزدور بہ کثرت ملتے تھے، وہ فنی ہنر سیکھنے کے لیے بھی تیار تھے اور نئے کارخانوں میں نسبتاً ارزاں اُجرت پر کام کرنے کو بھی آمادہ تھے۔ مزدوروں کے اہم سرچشمے دو تھے، اوّل وہ بیکار مزدور، جو جاگیروں کے گرد احاطہ بندی کے باعث زمین سے خارج ہو چکے تھے، دوم آئرلینڈ کے باشندے، جو اپنے افلاس زدہ اور کثیر الانفار جزیرے سے بچ نکلنا چاہتے تھے۔

تجارت اور بحریات میں برطانیہ نے اٹھارھویں صدی کے اندر قیادت حاصل کر لی تھی۔ محاربات نپولین میں یہ قیادت پختہ تر ہو گئی اور اس سے برطانیہ کے لیے صنعتی قیادت کا راستہ ہموار ہُوا۔ اس وجہ سے خام جنسوں اور منڈیوں کی تلاش میں سہولت پیدا ہو گئی۔ سمندر پار کی تجارت کے منافع بڑھ گئے اور سلطنت نے سرمایہ بڑھا دیا، جسے صنعت میں لگایا جا سکتا تھا۔ خود محاربات نپولین نے دھاتوں کے سامان اور نئی مشینوں کی ایجاد کو تقویت پہنچائی۔ انھیں جنگوں کے دوران میں زیریں دریائے ٹیمز کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی گودیاں تعمیر ہو گئیں اور لندن یورپ میں سب سے بڑا اقتصادی مرکز بن گیا۔

۱۸۵۰ء تک برطانوی اقتصادی اقتدار کے محسوس آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ مثلاً لندن کی گودیوں میں گہما گہمی، شہر کے مالی مراکز کی خوشحالی، کارخ بلور میں اشیاء کی نمائش، انگلستان کے وسطی اور شمالی حصّوں اور کرۂ ارض کے دوسرے خطّوں میں صنعتی شہروں کا ظہور، برطانوی سرمایہ اور ہزاروں برطانوی کاریگر مزدوروں نے فرانس کے اندر ریل کی سڑکیں بنانے میں حصّہ لیا۔ امریکی ٹرینیں ان پٹڑیوں پر چلتی تھیں جو برطانوی کارخانوں میں ڈھالی گئی تھیں۔ لنکا شائر کے سُوتی پارچات نے دنیا کے خاصے بڑے حصّے کے لیے کپڑا فراہم کیا۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں برطانیہ کے اندر دنیا بھر کے لوہے کا نصف حصّہ تیار ہوتا تھا۔ پارچہ بافی کی کیفیت پیشِ نظر رکھی جائے تو برطانیہ میں ایک کروڑ دستی لاکھ تکلے کام کر رہے تھے، جو دخانی قوت سے چلتے تھے۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں تکلے صرف پچپن ہزار اور فرانس کے صرف چالیس ہزار تھے۔ بعض دو ملک برطانیہ سے مقابلے میں پیش پیش تھے۔ تاہم برطانیہ قیادت کے اوجِ کمال پر بھی فنِ ایجاد کا اجارہ دار نہ تھا۔ مثلاً فرانس نے کپڑے کو سفید کرنے کے لیے کلورین کا عملیہ تجویز کیا اور پُر پیچ نمونے بُننے کے لیے جیکوارڈ[1] کے کرگے سے کام لیا۔ جرمنی نے زرعی کیمیا اور کوئلے کی قیمتی ذیلی پیداوار کو زراعت میں استعمال کیا۔ اس طرح دنیا میں وہ قیادت کے درجے تک پہنچ گیا۔ بلجیم میں سولوے[2] نے

---

[1] Jacquard [2] Solvay

صنعتی سوڈا اور دوسرے مرکبات بنانے کا طریقہ دریافت کر لیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایلی وھٹنے، مورس[1] اور تار برقی، سنگر اور سلائی کی مشین اور سائیلس میکارمک[2] پیدا ہوئے۔ آخر الذکر نے ۱۸۳۱ء میں فصل کاٹنے کا آلہ تیار کیا تھا۔ یہ اکثر زرعی مشینوں میں سے پہلی مشین تھی، جو امریکہ نے تیار کی۔

صنعتکاری کا نظام اوقات

مگر صنعتکاری کا نظام اوقات ایجادات کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں پر موقوف تھا۔ کارخانوں کو خام جنسوں، سرمایے کی بڑی رقموں، کاریگر مزدوروں اور سازگار سیاسی فضا کی ضرورت تھی۔

ان تمام عناصر کے وجود نے اُنیسویں صدی میں برطانیہ کو دنیا کی کارگاہ بنا دیا، لیکن جب دوسرے ملکوں، خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی میں صنعتی ضرورتیں مہیا ہو گئیں تو برطانیہ کو قیادت کا منصب حاصل نہ رہا، جو ابتدا میں اس نے حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ نیو انگلینڈ کے پارچات ۱۸۰۰ء کے بعد سے رواج پذیر ہو رہے تھے، مگر اعلیٰ درجے کے زرعی وسائل سے فائدہ اٹھانے کا سلسلہ خانہ جنگی کے وقت تک امریکی اقتصادیات پر حاوی رہا۔ جرمنی کی صنعتکاری کو اس ملک کے سیاسی اتحاد کا انتظار تھا۔ ۱۸۷۱ء میں یہ اتحاد کامیابی سے منزلِ تکمیل پر پہنچا اور صنعتکاری کو تحریک ملی۔ اُنیسویں صدی کے ثلث آخر میں امریکہ اور جرمنی کی صنعتی ترقیوں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۰ء تک وہ برطانیہ کے زبردست حریف بن گئے۔

۱۹۰۰ء سے صنعتی انقلاب کا سلسلہ برابر پھیلتا اور تیز تر ہوتا گیا۔ تیل اور بجلی نے کوئلے کی برتری ختم کر دی۔ ایلومینیم اور دوسرے مرکبات نے فولاد کو چیلنج دے دیا۔ نقلی ریشم اور دوسرے ترکیبی دھاگوں نے جزواً رُوئی اور اُون کی جگہ لے لی۔ موٹروں، ٹرکوں اور ہوائی جہازوں نے ریل کی پٹڑیوں پر فوقیت حاصل کر لی۔ رُوئی کی صنعت میں سب سے پہلے مشینوں کا استعمال شروع ہوا تھا۔ اس میں بھی اب تک انقلابی تغیر جاری ہے۔ اب کپاس چُننے کے لیے مشین ایجاد ہو چکی ہے۔ امریکہ میں خصوصیت سے تازہ تکنیکی ترقیات پے بہ پے بروئے کار آئیں۔ روس پہلی مرتبہ گزشتہ ربع صدی میں بہت بڑی صنعتی قوت بن گیا، یہ اس کے پنج سالہ منصوبوں کا نتیجہ ہے۔

صنعت نے ہماری دنیا اور ہماری زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ صرف چند اور حد درجہ بدیہی نتیجے ملاحظہ فرما لیجیے اس کی وجہ سے بڑی بڑی کمپنیاں بن گئیں، جو آج بجائے خود عظیم الشان قوتیں ہیں صنعت کی بدولت اخبار، ریڈیو اور رابطہ ضبط عامہ کے دوسرے وسائل پیدا ہوئے۔ صنعتی انقلاب کی اصل نوعیت اور پورے نتائج (خصوصاً ۱۹۰۰ء کے بعد سے) کتاب کے آئندہ ابواب میں نمایاں ہوں گے، جب ہم گزشتہ صدی میں ممتاز ممالک کی تاریخ کا جائزہ لیں گے۔ زیر غور باب میں ہمیں انیسویں صدی کے اندر صنعتکاری کے صرف اقتصادی اور عمرانی نتائج ہی پیش نظر رکھنے چاہییں۔

---

[1] Morse

[2] Cyrus Mcormick

تیئسواں باب

صنعتکاری کے اقتصادی اور عمرانی نتائج

زرعی انقلاب صنعت کی ترقی سے کشاورزی میں بھی اصلاح ہوئی۔ اس طرح زرعی انقلاب کی رفتار تیز تر ہوگئی، جو اٹھارھویں صدی میں شروع ہوا تھا۔ کارخانوں کے بنے ہوئے آلات کشاورزی (مثلاً فصل کاٹنے کی مشین یا فولادی ہل) سے شمالی امریکہ کے مرغزاروں میں کاشتکاری کا انتظام ہوگیا اور نہایت ارزاں سامان سے تیار ہونے والے نلوں کی بدولت بیکار دلدلی زمینیں زرخیز کھیت بن گئیں۔ اسی طرح مکھن الگ کرنے کی مشین تیار ہوئی، جس نے ڈیری کو ایک بڑا کاروبار بنا دیا۔ ریل کی سڑکوں اور جہازوں کے ذریعے کھیتوں کی پیداوار تیزی سے منڈیوں میں پہنچنے لگی۔ اسی طرح مختلف چیزوں کو ڈبوں میں بند کرنے یا درجۂ انجماد پر رکھنے کا انتظام ہوا۔ ان تمام چیزوں کی حیثیت اصلاً صنعتی تھی اور یہ سب وسائل پہلے پہل اُنیسویں صدی کے ثلث کے قریب وسیع پیمانے پر استعمال ہوئے اور بہت سی خراب ہو جانے والی جنسوں کو تقریباً لامحدود مدت تک محفوظ رکھنا ممکن ہو گیا۔

کسانوں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ ان کی منڈیاں پھیل رہی ہیں۔ کارخانوں کو خام جنسوں کی ضرورت تھی اور نئے کارخانوں کے جو شہر بن گئے تھے، ان میں کام کرنے والے ہزاروں مزدوروں کے لیے خوراک درکار تھی۔ کھیتوں کی پیداوار کے متعلق اُنیسویں صدی کے نصف ثانی میں بین الاقوامی تجارت بھی تیزی سے بڑھ گئی۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے زرخیز میدانی علاقوں سے گندم کی سالانہ برآمد اُنیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں دو کروڑ بیس لاکھ بُشل[1] تھی۔ ۱۸۸۰ء میں برآمد پندرہ کروڑ بُشل تک پہنچ گئی۔ شمالی امریکہ سے آرد گندم بھی برطانیہ میں درآمد کیا جاتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں اس آرد کی مقدار کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ برطانیہ میں جتنی روٹی تیار ہوتی تھی، اس سے ایک چوتھائی اسی آرد سے بنتی تھی۔ آٹھویں عشرے میں اس آرد کی درآمد اتنی بڑھ گئی کہ پورے برطانیہ میں جتنی روٹی کھائی جاتی تھی، اس کے نصف میں یہی آٹا صرف ہوتا تھا۔ ڈنمارک اور نیدرلینڈز سے لحم خنزیر، مکھن، انڈے اور پنیر زیادہ مقدار میں برطانوی دسترخوانوں پر پہنچنے لگے۔ آسٹریلیا سے بھیڑ بکری کا گوشت اور ارجنٹینا سے گائے کا گوشت آتا تھا۔

---

[1] بُشل تقریباً اُنتیس سیر کا ہوتا ہے۔

پہلے سائنٹیفک زراعت میں برطانیہ کو عملداری حاصل تھی، پھر جرمنی جزواً برطانیہ کا شریک ہوگیا۔ جرمن تجربہ کاروں نے ۱۸۰۰ء سے کچھ مدت بعد شیریں چقندر سے کھانڈ اتنی مقدار میں حاصل کرلی کہ وہ تجارتی جنس بن گئی اور یورپ جزائر غرب الہند کے گنے کی کھانڈ کا محتاج نہ رہا۔ انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں ایک جرمن ماہر کیمیا لائی بگ[1] نے نامیاتی کیمیا سے زراعت میں کام لینے کے متعلق مؤثر کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ وہ کہتا تھا کہ پودوں کی نشو ونما تین بنیادی عناصر پر موقوف ہے، اول نائٹروجن، دوم پوٹاشیم، سوم فاسفورس، لیکن فصلوں اور چارے کی پیداوار زمین سے یہ عناصر کھینچ لیتی ہے۔ اگر یہ عناصر دوبارہ زمین کے لیے مہیا نہ کیے جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جو زمینیں پہلے زرخیز تھیں، ان کی حالت وہی ہو جائے گی جس کا تجربہ ورجینیا کے زرخیز خطے میں ایک مرتبہ ہو چکا ہے۔ اب اس کے مختلف حصوں میں پہلے کی طرح گندم اور تمباکو جیسی چیزیں پیدا نہیں ہوتیں۔ لائی بگ نے جو یاس انگیز پیشگوئی کی تھی، وہ درست ثابت نہ ہوئی، کیونکہ اس کی تعلیمات نے کھادوں کے استعمال کو وسیع پیمانے پر فروغ دے دیا۔ جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ بحری پرندے جزیروں میں بکثرت رہتے تھے، ان کی بیٹ اور چلی کے نائٹریٹ، یورپ میں پوٹاش کی کانوں سے پوٹاشیم کھاد کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

انیسویں صدی میں زراعت نے ایسی ترقی کی، اتنی پھیلی اور اس قدر نفع بخش ہوئی کہ پیشتر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، لیکن اس زرعی انقلاب نے بڑی گراں قیمت وصول کی۔ چقندر سے بننے والی کھانڈ بازار میں آئی تو جزائر غرب الہند میں طویل کساد بازاری شروع ہوگئی، جس پر آج تک قابو نہیں پایا جاسکا۔ اعلیٰ درجے کے صنعتی ممالک میں بھی زراعت کی عمرانی اور سیاسی اہمیت گھٹ گئی۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کے لیے کھیتی باڑی سب سے بڑا پیشہ نہ تھی اور صرف زمین ہی ثروت یا سیاسی قوت کا ہمہ گیر معیار نہیں رہی تھی۔ برطانیہ کے صنعتکاروں اور تاجروں نے قوانین غلہ کی تنسیخ کی مہم میں مالکان اراضی پر فیصلہ کن فتح حاصل کرلی، یعنی گندم اور دوسری اشیائے خوردنی کی درآمد پر جو محاصل عائد تھے، انگریز ان سب کو غلے سے تعبیر کرتے تھے۔ قوانین غلہ کی وجہ سے برطانوی کسان محفوظ تھے، لیکن مزدوروں اور صنعتکاروں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ آخر الذکر طبقوں نے قوانین غلہ کے خلاف ایک طاقتور لیگ منظم کی۔ احتجاج کیا کہ ان محاصل کی وجہ سے ملک میں اشیائے خوردنی کی قیمت مخواہ مخواہ بڑھ گئی ہے اور دوسرے ملکوں کو صنعتی چیزیں دے کر اشیائے خوردنی حاصل کرلینے کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ اس لیگ نے کہا کہ اصل علاج آزاد تجارت ہے۔ ۱۸۴۶ء میں قوانین غلہ منسوخ ہوئے تو آزاد تجارت شروع ہوگئی۔ فیصلہ کن عامل وہ بیماری تھی، جس کی وجہ سے آئرلینڈ میں آلو کی فصل متواتر دو سال برباد ہوتی رہی اور ارزاں قیمت پر غلے کی درآمد ناگزیر ہوگئی۔ اس کے بغیر آئرلینڈ میں وسیع قحط کو روکنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ گویا صنعتی برطانیہ نے غذائی جنسوں میں خودکفیل بننے کی کوشش ترک کردی۔

آبادی | حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کی آبادی انتہائی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اسے خودکفیل بنانا ممکن ہی نہ تھا۔ انیسویں صدی میں

---

[1] Liebig

انگلستان اور ویلز کے باشندوں کی تعداد دگنی سے بھی بڑھ گئی۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں کل باشندے نوّے لاکھ تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ سوا تین کروڑ ہو گئے۔ بعض ان ممالک میں بھی، جہاں زراعت کو پہلا درجہ حاصل تھا، آبادی اسی رفتار سے بڑھی، جس رفتار سے صنعتی برطانیہ میں بڑھی تھی۔ مثلاً روس کے اندر اُنیسویں صدی میں اکثریت دیہاتی آبادی کو حاصل تھی۔ اس ملک کے اندر کل باشندوں کی تعداد سنہ ۱۸۰۱ء میں تین کروڑ ساٹھ لاکھ تھی سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ تعداد دس کروڑ پر پہنچ گئی۔

صنعتی انقلاب سے جو نہایت اہم عمرانی تغیر ہُوا، وہ آبادی کی افزائش نہ تھا، بلکہ اس کی ترکیب اور توازن میں تغیر تھا۔ جہاں کہیں کانیں کھودی گئیں یا کارخانے قائم ہو گئے، قصبے اور شہر وجود میں آ گئے۔ انگلستان کے جو بڑے بڑے خطّے کسی زمانے میں دیہاتی تھے، شہر بن گئے۔ ایسی ہی تبدیلی ہیئت گلاسگو کے اردگرد سکاٹ لینڈ کے میدانی علاقوں میں شروع تھی۔ یہی کیفیت شمالی فرانس میں لِل[1] کے میدانوں، جرمن رھائن لینڈ اور شمالی و مشرقی جمہوریۂ امریکہ کے دریاؤں کے ساتھ ساتھ رونما ہوئی۔ شہری آبادی میں اضافے کی وجہ سے ان دو عمرانی طبقوں کی تعداد اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہُوا جنھیں صنعتی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل ہے، یعنی کاروباری لوگ اور مزدور۔ صنعتکار، بینکر، کارخانوں اور فرموں کے مینجر اور ہر قسم کے سرمایہ دار سابقہ مسلّمہ سرمایہ داروں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح دورِ حاضر کا طبقۂ اوسط (بورژوا) وجود میں آ گیا۔ کارخانوں، ریلوے اور کانوں میں کام کرنے والے لوگوں، محرّروں اور بہت سے دوسرے افراد نے اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد بڑھا دی۔

سرمائے اور مزدوری کے ٹکراؤ سے جو اثر صنعتکار قوموں کی زندگی پر پڑا، وہ اُنیسویں صدی کے وسط میں زیادہ نمایاں ہو گیا۔ بعض آثار مستقل مادی ترقی کی طرف رہنما تھے۔ مثلاً "کاخِ بلّور" کے عجائبات یا ریلوے دخانی جہاز اور تارِ برقی کے ذریعے سے مکانی حدود کی تسخیر۔ مگر دوسرے آثار خطرناک اختلال اور پُرتشدد تغیر کی خبر دے رہے تھے۔ قوانینِ غلّہ کی تنسیخ سے برطانیہ میں پرانا زرعی طریقِ حیات ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔ اُنیسویں صدی کے پانچویں عشرے کے اواخر میں صنعتی کساد نے اقتصادی کساد کا ایک چونکا دینے والا نمونہ پیش کیا۔ لاکھوں مزدور بے روزگار ہو گئے۔ اس سے عمرانی بےچینی میں اضافہ ہُوا۔ پیرس کے اندر سنہ ۱۸۴۸ء کے پُرتشدد ایّامِ جون میں واقعی طبقاتی جنگ پھوٹ پڑی۔

اب تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ صنعتی انقلاب کے پُرامن، نیز خلل انگیز عمرانی اثرات، دونوں پر توجہ مرکوز کرے۔ بے روزگاری اور صنعتی مزدوروں کی دوسری مصیبتوں نے تاریخِ حاضر کے بعض نہایت غم انگیز اوراق مہیا کیے ہیں، مگر ان سے پوری کہانی واضح نہیں ہوتی۔ جدید صنعتی قصبوں میں ایک سو سال پیشتر غریبوں کے جو بدنما محلّے تھے، وہ یقیناً بڑے رنج افزا تھے، لیکن ان کی یہ رنج افزائی بھی اضافی حیثیت رکھتی تھی۔ شہروں کے یہ غلیظ محلّے بعض اوقات دیہات کے غلیظ محلّوں سے یقیناً بہتر تھے، جن میں کارخانوں کے اندر کام کرنے والے مزدوروں کے اجداد رہتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دیہات کی جن جھونپڑیوں

---

[1] Lille

پر سفیدی پھیر دی جاتی تھی یا اُن پر انگور کی بیلیں چڑھا دی جاتی تھیں، ان کے خوشنما ظاہر کے پیچھے عموماً پینے کا پانی گندہ اور جراثیم سے آلودہ ہوتا۔ حفظانِ صحت کے وسائل کاملاً ناپید ہوتے۔ بچوں کی شرح اموات اور تپ دق کے حوادث دل پر لرزہ طاری کر دیتے۔ شہروں میں بچوں کی شرح اموات گھٹ گئی، کیونکہ طبی امداد اور حفظان صحت کے انتظامات بہتر تھے۔ بالغوں کی زندگی کا اوسط بڑھ گیا، کیونکہ ان کے لیے ہسپتال موجود تھے، جہاں علاج ہوتا۔ وہ متوازن اور قوت بخش غذا کھاتے اور ذاتی صفائی کا اعلیٰ معیار قائم رکھتے۔ صنعتی انقلاب نے اس لحاظ سے اپنا کردار بہتر طریق پر ادا کیا کہ مزدوروں کے لیے تازہ غذا بہم پہنچانے کا انتظام کر دیا اور اُن کے لیے ارزاں سُوتی کپڑے مہیا کر دیے، جنھیں دھویا جا سکتا تھا۔ جو اُونی کپڑے وہ پہلے پہنتے تھے، وہ شاذ ہی دھوئے جاتے تھے۔

طبقۂ اوسط کے عزائم

ایک مشہور اخلاقی حکایت پہلے پہل فرانس میں شائع ہوئی تھی (۱۸۱۹ء) اس سے طبقۂ اوسط کے عزائم کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ اس حکایت کا مصنف سینٹ سائمن[1] تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ اچانک فرانس کے پچاس بہترین مکانیکی سول اور فوجی انجینئر، ماہرین تعمیرات، ڈاکٹر، سرجن، دواساز، ملاح اور گھڑی ساز ضائع ہو گئے، پچاس بہترین بینکر، اور دو سو بہترین کاروباری آدمیوں پر بھی افتاد پڑی وغیرہ۔ اسی طرح مصنف نے صنعت، علوم اور فنون کے تین ہزار ممتاز آدمی گنا دیے۔ سینٹ سائمن نے بیان کیا کہ یہ آدمی حقیقی معنی میں فرانسیسی معاشرے کے گلہائے سرسبد تھے اور ملک کو اُن سے انتہائی فائدہ پہنچ رہا تھا، ان کے ضائع ہو جانے کے بعد قوم بالکل ایک بے رُوح جسد رہ گئی:

"آئیے، تاکہ دوسرے مفروضات پر متوجہ ہوں۔ فرض کیجیے کہ فرانس کے وہ تمام غیر معمولی افراد محفوظ رہتے ہیں، جو علوم، فنون لطیفہ اور مختلف پیشوں میں موجود ہیں، مگر اسی روز یہ بدنصیبی پیش آجاتی ہے کہ بادشاہ کا بھائی اور شاہی خاندان کے بہت سے دوسرے افراد ضائع ہو جاتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اسی روز فرانس کے شاہی گھرانے کے بڑے بڑے افسر، تمام وزیر (خواہ ان کے پاس قلمدانِ وزارت ہوں یا نہ ہوں)، تمام مشیر، تمام مجسٹریٹ، مارشل کارڈینل، آرچ بشپ، بشپ، جج اور دس ہزار امیر ترین لوگ مر جاتے ہیں، جو امراء کے انداز پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"اس بدبختی پر اہلِ فرانس یقیناً غمزدہ ہوں گے، کیونکہ وہ رقیق القلب ہیں اور ہم وطنوں کی اتنی بڑی تعداد کے اچانک ناپید ہو جانے سے بے پروا نہیں رہ سکتے، مگر ان تیس ہزار آدمیوں کا ضیاع، جو مملکت کے لیے نہایت اہم سمجھے جاتے ہیں، محض رقتِ جذبات کی بنا پر ہوگا، اس سے مملکت پر کوئی سیاسی آفت نازل نہ ہوگی۔

---

۱ Saint-Simon

ان مفروضات سے موجودہ سیاسیات کی نہایت اہم حقیقت نمایاں ہوتی ہے، یعنی یہ کہ ہماری عمرانی تنظیم حد درجہ ناقص ہے .....

سائنسدان، فنکار اور کاریگر ہی وہ لوگ ہیں، جن کا کام معاشرے کے لیے مثبت طریق پر فائدہ مند ہے اور اس پر معاشرے کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ انھیں شہزادے اور دوسرے حکمراں دبائے رکھتے ہیں، حالانکہ وہ کم و بیش نااہل لوگ ہیں۔ وہی لوگ ہیں، جو اعزازات اور دوسرے قومی عطیات کے مختار ہیں۔ وہ جس برتری سے بہرہ مند ہیں، وہ محض پیدائش کے ایک اتفاقی واقعے یا خوشامد، سازش اور دوسرے مشتبہ وسائل پر مبنی ہے ......

ان مفروضات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ ایک ایسی دنیا ہے، جس کا نیچے کا حصّہ اوپر ہے، اوپر کا نیچے ہے[1]

طبقۂ اوسط کے افراد کے نزدیک مملکت کی یہی کیفیت تھی۔ اُنیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں صنعتکاروں کو قومی پالیسی کے بنانے کا موقع بہت کم حاصل تھا۔ ان میں سے صرف چند لوگ پارلیمنٹ کے ممبروں کے ووٹ دے سکتے تھے۔ مانچسٹر اور برمنگھم جیسے بارونق صنعتی شہروں کی طرف سے ایک بھی نمائندہ دارالعوام میں نہیں بھیجا جاتا تھا۔ کاروباری آدمیوں کی بہت بڑی تعداد کا تعلق کلیسائے انگلستان سے نہیں، بلکہ غیر انگلیکی پروٹسٹنٹ گرجوں سے تھا۔ آج کل ان لوگوں کو غیر مقلّد پروٹسٹنٹ کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی عہدہ نہیں لے سکتے تھے اور اپنے بیٹوں کو آکسفورڈ یا کیمبرج نہیں بھیج سکتے تھے۔ ایسے حقوق صرف انگلیکیوں کو حاصل تھے۔ فرانس کے اندر ۱۷۸۹ء میں بہت کچھ ہو چکا تھا، تاہم طبقۂ اوسط (بورژوا) کو صرف دوسرے درجے کی شہریّت حاصل تھی، جس کا نقشہ سینٹ سائیمن نے پیش کیا ہے۔

طبقۂ اوسط نے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا، جس کا انھیں اپنے خیال کے مطابق استحقاق تھا۔ برطانیہ میں اصلاحات کے تدریجی عمل سے انھیں وہ سب کچھ حاصل ہو گیا، جس کے وہ خواہاں تھے۔ توانینِ غلّہ کی تنسیخ سے بھی کہیں بڑھ کر اصل شے ۱۸۳۲ء کا مسودۂ اصلاحات تھا، جس کے مطابق طبقۂ اوسط کو حقِ رائے ملا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فرانس میں طبقۂ اوسط نے انقلاب بپا کیا (۱۸۰۳ء)، جولائی کی بادشاہی حاصل کی اور اپنے ہمسر شہری کو بادشاہ بنا دیا۔ اس طبقے کے امیر لوگوں کو ۱۸۳۰ء میں ووٹ کا حق مل چکا تھا۔ باقی مرد آبادی نے ۱۸۴۸ء میں یہ حق حاصل کر لیا۔ بلجیم کے اندر ۱۸۳۰ء کے انقلاب سے طبقۂ اوسط کے اختیارات میں بہت اضافہ ہو گیا۔ دوسرے ملکوں میں ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۸ء کی تحریکات سے جو نتیجے نکلے وہ چنداں سازگار نہ تھے لیکن زیادہ سے زیادہ خوشگوار صورت میں بھی فرض کر لینے کے باوجود یہ مان لینا چاہیے کہ طبقۂ اوسط نے سیاسی ارتقاء میں ایک

---

[1] سینٹ سائیمن کی کتاب Selected Writings (منتخب تحریرات) ص ۷۲-۷۴

قدم آگے بڑھایا۔

مزدوروں کی شکایات

مزدوروں کی شکایات آقاؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھیں اور ان کی تلافی بھی زیادہ مشکل تھی۔ مثلاً ایک شکایت یہ تھی کہ مزدوروں کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے، دوسری یہ کہ انھیں موقع ملنا چاہیے اپنی یونینیں بنائیں اور ان کی سرگرمیاں حسب دلخواہ جاری رہیں۔ برطانیہ میں مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد نے ۱۸۶۷ء میں ووٹ کا حق حاصل کر لیا، یعنی دولتمند طبقہ اوسط سے ایک پشت بعد فرانس میں تمام بالغوں کو حق رائے مل گیا (۱۸۴۸ء) بالائی طبقہ اوسط اٹھارہ سال پیشتر سیاسیات میں رائے کا حق حاصل کر چکا تھا۔

اُنیسویں صدی میں بڑی مدت تک مزدوروں کی یونینوں اور ہڑتالوں کو طبعی اقتصادی قوانین کے آزادانہ عمل پر غیر مناسب پابندیاں سمجھا جاتا تھا، لہٰذا انھیں اٹھارھویں صدی کے اختتام پر قوانین اجتماع کے مطابق باقاعدہ ممنوع قرار دیا گیا۔ ۱۷۹۹ء کے قانون کے مطابق تمام معاہدے:

> "میثاق اور اتفاق نامے تحریری یا غیر تحریری، ناجائز اور منسوخ قرار دے دیے گئے، جو کسی وقت کسی پھیری والے یا صنعتکار یا کسی دوسرے مزدور یا شخص نے اجو اس مملکت کے اندر رہتا ہے، بیشی تنخواہ لینے کے لیے ...... یا کام کے عام اوقات میں تخفیف یا تبدیلی کے لیے یا کام کے وقت کو بدلنے اور کام کی مقدار کو گھٹانے کے لیے کیے[1]...."

براعظم کی حکومتوں نے بھی ایسی ہی پابندیاں عائد کر دیں، مثلاً فرانس کی قومی مجلس نے ۱۷۹۱ء میں ایسا ہی قانون منظور کیا۔ مزدوروں کو یونینوں کی سرگرمیاں قانوناً منوانے میں بڑا وقت لگا۔ مثلاً جرمنی میں ۱۸۶۹ء تک، آسٹریا میں ۱۸۶۷ء تک اور نیدرلینڈز میں ۱۸۷۲ء تک یہ سرگرمیاں تسلیم نہیں کی گئی تھیں۔ فرانس میں جولائی کی بادشاہی نے ہڑتالوں کو بڑی بیدردی سے دبایا۔ آخر ۱۷۹۱ء کے قانون میں کوئی ستر سال بعد تھوڑی سی ڈھیل پیدا ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں یہ منسوخ کر دیا گیا، برطانوی پارلیمنٹ کے اجتماع کے قوانین میں اُنیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے اندر ترمیمیں کر دی گئیں اور ۱۸۷۶ء میں یہ منسوخ ہوئے۔ اُنیسویں صدی کے تین چوتھائی حصے میں برطانوی مزدوروں کو ہڑتال کے بہت محدود حقوق حاصل تھے۔

تاہم مزدوروں کے سیاسی اور آئینی حقوق کا معاملہ صنعتی انقلاب کے ابتدائی دَور میں محض ایک ضمنی مسئلہ تھا۔ ان کے سامنے زیادہ اہم اور ضروری مسائل تھے۔ انھیں ایسے کاموں کی تلاش تھی، جو ناکافی اُجرتوں کی حالت میں ان کا گزارہ کر سکتے۔ دورِ حاضر کی مغربی دنیا میں کاروباری دنیا کے اندر خوشحالی و بدحالی کے دَور آتے رہے ہیں۔ کبھی سب کے لیے روزگار کا انتظام ہو جاتا، کبھی خاصی بڑی تعداد بے روزگار رہ جاتی۔ صنعتی انقلاب نے اس چکّر کو تیز تر کر دیا۔ جب کاروبار فروغ پر ہوتا تو خوب

---

[1] English Economic History (تاریخ اقتصادیات انگلستان) ص ۶۲۶-۶۲۷۔

زور ہوتا، پھر یکایک کساد پیدا ہوجاتا اور کساد اس صدی کے پانچویں عشرے میں بہت بڑھ گئے اور ان کی شدت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ مزید برآں کارخانوں نے ابتدا میں ملازمت کا متوازن پیمانہ قائم نہ رکھا، جو کاروبار کے فروغ اور کساد، دونوں حالتوں میں قائم رہتا۔ جب بہت سے آرڈر مل جاتے، مشینوں سے انتہائی کام لیا جاتا اور مزدور لباط کی آخری حد تک محنت کرتے، تاکہ آرڈر بروقت پورے ہوجائیں۔ پھر کارخانے بند کرکے نئے آرڈروں کا انتظار کیا جاتا، وقتاً فوقتاً بے روزگاری کے دَور شروع ہوگئے۔ ایسے دَور اب بھی کبھی کبھی آجاتے ہیں، خصوصاً کپڑے کی صنعت میں۔ ایک سو سال پیشتر ایسے دَور عام تھے مستثنیٰ نہ تھے۔

ایک صدی یا اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے مزدوروں کو اتنی کم اُجرتیں ملتی تھیں کہ ان پر صرف ایک آدمی زندگی بسر کرسکتا تھا۔ فرانس اور انگلستان کے جو مزدور کپڑے کے کارخانوں میں کام کرتے تھے، اُن میں سے کُنبے والوں کے لیے ضروری تھا کہ بیوی اور بچّوں کو بھی کام پر لگا دیں تاکہ کنبے کا گزارہ ہوسکے۔ انسانیت دوست روایت نے غالباً حالات کو مبالغہ آمیز صورت میں پیش کیا، جب کہا کہ صنعت نے عورتوں اور بچّوں سے ناواجب فائدہ اُٹھایا اور ان کے شرف کو نقصان پہنچایا۔ غالباً انھوں نے انتہائی تکلیف کی چند مستثنیٰ مثالیں لے لیں اور انھیں عام صورت حال کا نقشہ قرار دے لیا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ناجائز فائدہ اُٹھانے اور شرف زائل کرنے کا سلسلہ ایک حد تک درست تھا۔ جس طرح ایک شخص کو عدالتی فیصلے کے بغیر بذاتِ خود موت کی سزا دے دینا (لنچنگ) دل کو سخت صدمہ پہنچاتا ہے، اسی طرح ایسی ایک واقعے کی مثال واقعی صدمہ پہنچاتی ہے، جو کارخانے کے ایک مزدور سیموئیل کولسن[1] نے اپنی شہادت میں برطانیہ کی پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش کی (۱۸۳۱ء تا ۱۸۳۲ء):

"سوال: جب کام زیادہ ہوتا تھا تو لڑکیاں صبح کو کس وقت کارخانے میں جاتی تھیں؟

جواب: کام کا زور تقریباً چھ ہفتے رہتا تھا۔ لڑکیاں صبح کو تین بجے کام پر جاتی تھیں اور دس بجے یا تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو آتی تھیں۔

سوال: اُنیس گھنٹے کی اس مزدوری میں انھیں آرام یا کھانے پینے کے لیے کتنی مرتبہ کتنی کتنی دیر کے لیے اجازت دی جاتی تھی؟

جواب: ناشتے کے پندرہ منٹ، کھانے کے لیے آدھا گھنٹہ، پینے کے لیے پندرہ منٹ۔

سوال: کیا ان اوقات میں سے کوئی وقت مشینیں صاف کرنے میں بھی صرف ہوتا تھا؟

جواب: انھیں عموماً وہ کام کرنا پڑتا تھا جنھیں مشینیں خشک کرنے کا کام کہنا چاہیے۔ بعض اوقات ان میں ناشتے یا پینے کی مہلت پوری کی پوری ختم ہوجاتی تھی اور انھیں اپنا کھانا یا ناشتا کسی نہ کسی طرح کھا لینا پڑتا تھا۔ اگر کھا نہیں سکتی تھیں تو گھر لے آتی تھیں۔

---

[1] Samuel Coulson

سوال: کیا آپ کے لیے خاصا مشکل نہ تھا کہ اپنے بچّوں کو اس قسم کی انتہائی محنت کے لیے علی الصّباح اٹھاتے تھے؟

جواب: ہاں، ابتدا میں واقعی ہم انھیں سوتے سوتے اٹھا کر فرش پر کھڑا کر دیتے تھے، تاکہ لباس پہنا دیں۔ پھر انھیں کام پر بھیجتے تھے، لیکن عام گھنٹوں میں ایسی تکلیف پیش نہیں آتی تھی۔

سوال: وہ کتنی دیر تک بستر میں سوئے رہتے تھے؟

جواب: ہم کچھ کھلا پلا کر گیارہ بجے انھیں سلا دیتے تھے، پھر میری بیوی رات بھر جاگتی رہتی تھی، مبادا ہم سوئے رہیں اور کام کے لیے وقت پر تیار نہ ہو سکیں۔

سوال: گویا بچے کام کی زیادتی کے اوقات میں چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکتے تھے؟

جواب: جی ہاں، اس سے زیادہ نہیں سو سکتے تھے۔

سوال: یہ سلسلہ لگاتار کتنی مدت تک جاری رہتا تھا؟

جواب: تقریباً چھ ہفتے۔ ایسا تقریباً اسی وقت ہوتا تھا جب کام بڑھ جاتا تھا، اکثر ایسا نہیں ہوتا تھا۔

سوال: کیا کام کے عام اوقات چھ بجے صبح سے رات کے ساڑھے آٹھ تک تھے؟

جواب: جی ہاں۔

سوال: کیا کھانے کے لیے بدستور مہلت دی جاتی تھی؟

جواب: جی ہاں، بدستور۔

سوال: کیا بچّے اس محنت سے سخت تھک جاتے تھے؟

جواب: اکثر اوقات بہت تھک جاتے تھے۔ جب ہم انھیں کھانے کو کچھ دیتے تھے تو اکثر روتے تھے۔ انھیں ہلانا پڑتا تھا۔ وہ اکثر کھانے کی چیز منہ میں رکھے ہوئے سو جاتے تھے۔

سوال: کیا اس شدید محنت کے دوران میں بیدردی سے بھی کام لیا جاتا تھا؟

جواب: ہاں، جب بچّے زیادہ تھک جاتے تھے، تو ان پر اکثر تازیانہ استعمال کیا جاتا تھا۔

کیا تمھارے بچّوں میں سے کسی کو تازیانے لگے؟

جی ہاں، ہر ایک کو لگے۔ میری بڑی لڑکی کو دیکھیے۔ میں دو ہفتے کے لیے لنکاشائر گیا تھا جب واپس آیا، تو اس کے کندھے دیکھے، میں نے پوچھا، اینؔ! کیا ہوا؟

لہ Ann لڑکی کا نام۔

اس نے بتایا کہ ناظر نے مجھے تازیانے لگائے، مگر آپ کو اس کے پاس جا کر شکایت نہ کرنی چاہیے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو کام ہم سے چھن جائے گا۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا، میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے تازیانے کیوں لگائے؟

لڑکی نے بتایا کہ میں سوت کا گودڑ اٹھا رہی تھی۔ اس اثنا میں ناظر آگیا اور بولا: کیا کر رہی ہو؟ اسے چھوڑ دو۔ میں نے کام جاری رکھا اور اس نے تازیانے لگائے۔

سوال: جب کام زیادہ نہیں ہوتا تھا تو مزدوری کیا ملتی تھی؟

جواب: تین شلنگ فی ہفتہ۔

سوال: جب کام زیادہ ہوتا تھا تو اس وقت کیا مزدوری دیتے تھے؟

جواب: تین شلنگ ساڑھے سات پنس۔

سوال: کیا اتنی مزید محنت کے لیے ہفتے میں صرف ساڑھے سات پنس مزدوری بڑھاتے تھے؟

جواب: اس سے زیادہ نہیں۔[1]

کام بہت زیادہ، اجرت کم، رہنے سہنے کے حالات رنج افزا۔ ابتدائی دور کے صنعتی مزدوروں کی یہ عام شکایات تھیں۔ بہت سے کارخانوں کے حالات ایسے تھے، جو کام کرنے والوں کے لیے خاصے خطرناک تھے۔ خطرناک مشینری سے محفوظ رہنے کی تدبیریں بہت کم اختیار کی گئی تھیں۔ سوتی کپڑے کے کارخانوں میں فضا کو اعلیٰ پیمانے پر گرم اور مرطوب رکھا جاتا، کیونکہ ایسی فضا میں دھاگا بہت کم ٹوٹتا تھا۔ یہاں ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جو اگرچہ پوری صنعت کی طرف سے کوئی مثالی واقعہ نہیں، مگر بجائے خود خاصا رنج افزا ہے۔

۱۸۲۳ء میں سوت کاتنے والے ایک انگریزی کارخانے کے اندر، جو مانچسٹر سے نزدیک تھا، مزدور اسّی درجے سے چوراسی درجے تک کی حرارت میں چودہ چودہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ اگر وہ تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کھول لیتے تو ایک شلنگ جرمانہ ہوتا۔ جرائم کی فہرست خاصی لمبی تھی، جن پر جرمانے ہوتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ کام کے اوقات میں پاک صاف نہ رہنا، ایک شلنگ جرمانہ۔

۲۔ اگر مزدور کام کے اوقات میں منہ ہاتھ دھو لیتا تو ایک شلنگ جرمانہ ہوتا۔

۳۔ اگر شام کے وقت مزدور جلد گیس کی روشنی کر دیتا تو ایک شلنگ جرمانہ ہوتا۔

---

[1] تاریخ اقتصادیات انگلستان ص ۵۱۰-۵۱۲۔

۴۔ اگر صبح کے وقت زیادہ دیر تک روشنی رہتی تو پھر بھی ایک شلنگ جرمانہ ہوتا۔

۵۔ کام کرتے کرتے سیٹی بجانے پر بھی ایک شلنگ جرمانہ کیا جاتا۔

۶۔ سب سے بڑھ کر مصیبت اس مزدور کے لیے تھی، جو بیماری کی حالت میں خود کام پر نہ آسکتا۔ اگر وہ اپنی جگہ کوئی دوسرا اچھا کارکن نہ بھیج دیتا تو اس پر چھ شلنگ جرمانہ ہوتا۔

بہت سے مزدور اچھا مکان نہیں لے سکتے تھے۔ اگر ان کے پاس مکان لے لینے کی استطاعت ہوتی تو مکان نہ ملتا۔ کارخانوں کے جو نئے شہر بنے تھے، ان کے نقشے سوچ سمجھ کر بنائے گئے تھے۔ گلیاں چوڑی رکھی گئی تھیں۔ پارکوں اور صحنوں کے لیے خاصی جگہ چھوڑی گئی تھی۔ بعض میں اچھا پانی بہم پہنچانے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی گندے پانی کے نکاس کے لیے بدرئیں بنا دی گئی تھیں، مگر لندن اتنی تیزی سے بڑھا کہ کوئی خاص انتظام نہ کیا جاسکا اور دریائے ٹیمز بہت جلد گندے پانی کا مخرج بن گیا۔ اس سے اتنی بُو آتی تھی کہ جو مکان دریا کے کنارے تھے، اُن میں رہنے والے بدبو کے خوف سے کھڑکیاں نہیں کھولتے تھے۔ مزید برآں انگلستان میں کھڑکیوں پر بھی پابندی تھی، کیونکہ ایک پرانا ضابطہ چلا آتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مکان میں آٹھ سے زیادہ کھڑکیاں ہوں، اس میں ہر زائد کھڑکی پر ٹیکس لیا جاتا تھا۔ یہ ضابطہ ۱۸۵۱ء تک منسوخ نہ ہوا۔ فرانس کے شہر للّ اور انگلستان کے لورپول اور مانچسٹر میں غریبوں کے جو محلے تھے، ان میں انسانوں کی بہت بڑی تعداد بھی بھری پڑی تھی۔ سنہ ۱۸۴۰ء کے کساد میں مانچسٹر کے حالات کے متعلق ایک پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ ملاحظہ فرمائیے:

"مانچسٹر میں عمارتیں بنانے کا کوئی قانون نہیں، لہٰذا ...... ہر مالک جس طرح چاہتا ہے، مکان بنا لیتا ہے..... چھوٹے چھوٹے مکانوں کی کسی قطار میں پانی کا انتظام اچھا نہیں۔ بازاروں اور گلیوں میں گڑھے پڑے ہوئے ہیں، جو لبالب پانی سے بھرے ہوئے ہیں انھیں میں مری ہوئی بلیاں اور کتے ڈال دیے جاتے ہیں اور کوئی ان حالات پر جز بز نہیں ہوتا۔

جب تک مانچسٹر اور دوسرے بڑے بڑے صنعتی شہروں میں کاروبار اعلیٰ پیمانے پر موجود تھا، سب لوگوں کو روزگار ملا ہوا تھا، تنخواہیں اچھی تھیں۔ کھانا وافر ملتا تھا اور جب تک مزدوروں کے کنبوں کو کھانا اچھا ملتا تھا ان کی صحتیں تہ خانوں اور بند عمارتوں میں بھی اچھی رہتی تھیں۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ غذائی جنسیں مہنگی ہیں۔ مزدوری کمیاب ہے مختلف شعبوں میں اجرتیں بہت تھوڑی ہیں، لہٰذا بیماریوں اور موت کا دور دورہ ہے۔

... اس صنعتی ضلع میں کساد کی ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی، جیسی اب ہے۔ بازاروں میں کوئی فرش نہیں۔ بدرروؤں کا انتظام ناقص ہے۔ گلیاں تنگ ہیں۔ صحنوں اور تہ خانوں میں تازہ ہوا کا کوئی انتظام نہیں۔ اس حالت کے تلخ نتائج محتاج بیان نہیں ..... مانچسٹر میں

کوئی باغ عامّہ یا کھلا میدان نہیں، جہاں آبادی ٹہل سکے اور تازہ ہوا کھا سکے..... اس اعتبار سے مانچسٹر شرمناک حد تک ناقص ہے۔ زیادہ تر اس لیے کہ کاروبار میں یہ سلطنت کے تمام دوسرے حصوں سے بڑھا ہوا ہے۔ زمین کرایے پر دے کر روپیہ حاصل کرنے کے لیے اس حیثیت کا ہر فائدہ قربان کیا جا رہا ہے[1]۔"

جب کوئی آدمی ایک غلیظ اور گرم کارخانے کے اندر دن بھر پسینے میں شرابور رہے گا تو جب وہ اپنی قیامگاہ کی ٹھنڈی اور مرطوب فضا میں پہنچے گا —— جہاں نہانے کی کوئی آسائش نہیں۔ ساتھ ہی صرف روٹی اور آلو کھا کر وقت گزارے گا۔ تو اس کی صحت پر یقیناً بُرا اثر پڑے گا۔ لارڈ شیفٹسبری[2] اس دور کا ایک مصلح تھا۔ اس نے پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر حالات کی اصلاح نہ ہوئی تو لنکا شائر بہت جلد بالشتیوں کا ایک حلقہ رہ جائے گا۔ صنعتکار قوموں نے یہ فیصلہ بھی کر رکھا تھا کہ نیم خواندہ قومیں رہیں گی۔ اُنیسویں صدی کے ثلث آخر میں جب تک آزاد درسگاہوں کا انتظام نہیں ہوا تھا، تعلیمی سہولتیں حد درجہ ناکافی تھیں انگلستان میں صرف اتوار کو کھلنے والی درسگاہیں ہی مزدوروں کے بچّوں کے لیے ابجد سیکھ لینے کا موقع بہم پہنچاتی تھیں۔ خود مزدور کی یہ کیفیت تھی کہ اگر اس میں خواندگی کا خاص جذبہ ہوتا اور وہ ہمّت سے کام لینے کے لیے تیار ہوتا تو اپنی فرصت کے شاذ اوقات بالغوں کی کسی درسگاہ میں صرف کر سکتا جنھیں اُس زمانے میں مکانیکی ادارے کہا جاتا تھا۔ پھر اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اُنیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں جن مردوں اور عورتوں نے انگلستان میں شادیاں کیں، ان میں سے ایک تہائی مرد اور نصف عورتیں شادی کے رجسٹر پر دستخط نہیں کر سکتی تھیں اور نشان بنا دینے پر اکتفا کی گئی۔ اس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ قدامت پسند مصلح ڈزرائیلی نے اپنے عمرانی ناول سِبل[3] (۱۸۴۵ء) کے کرداروں کو دو قوموں کے متعلق بحث کا موقع دیا، جن میں برطانیہ بٹا ہُوا تھا :

"ایگرمونٹ[4] نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا، خوب، ممکن ہے، ہمارا معاشرہ حالتِ طفلی میں ہو اور تم جو چاہو، کہو، ہماری ملکہ دنیا کی سب سے بڑی قوم پر حکمران ہے، جواب تک وجود میں نہیں آئی۔"

"نوجوان اجنبی نے پوچھا، کون سی قوم؟ ملکہ تو دو قوموں پر حکمران ہے۔ اجنبی کچھ دیر کے لیے رُک گیا۔ ایگرمونٹ چُپ رہا، مگر اس کی نگاہوں سے واضح ہوتا تھا کہ کچھ پوچھ رہا ہے۔

نوجوان اجنبی نے تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا، ہاں، دو قوموں پر حکمران ہے،"

---

[1] تاریخ اقتصادیات انگلستان ص ۵۲۰-۵۲۱۔ [2] Shatesburg

[3] Sybil ڈزرائیلی کا مشہور ناول۔ [4] Egrement

جن کے درمیان نہ کوئی ربط ضبط ہے اور نہ ہمدردی۔ یہ قومیں ایک دوسری سے اچھی طرح بیگانہ ہیں، جس طرح ان کی عادتیں، ان کے افکار اور ان کے احساسات بیگانہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں مختلف منطقوں میں رہتی ہیں یا دو مختلف سیّاروں میں ان کا بسیرا ہے۔ ان کی تربیت کے حلقے مختلف ہیں، خوراک مختلف ہے۔ اوضاع و اطوار مختلف ہیں اور ایک ہی قسم کے قوانین ان پر نافذ نہیں۔

اگیرمونٹ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، تم غریبوں اور امیروں کی بات کر رہے ہو؟"

لہ سبل صفحہ ۷۶-۷۷۔

چوبیسواں باب

آزاد خیالوں کی تدبیریں

عدم مداخلت کی پالیسی:

"تکلیف اور برائی فطرت کی طرف سے انتباہات ہیں۔ ان سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ قانون کے ذریعے ان چیزوں سے دنیا کو پاک کرنے کی جو بیتاب کوششیں اہلِ خیر و فلاح نے کیں ۔ ۔ ۔ ان سے اچھائی کے بجائے زیادہ برائی رونما ہوئی۔"[1]

یہ دلیل برطانوی پارلیمنٹ کے ان آزاد خیال ممبروں کی تھی، جو عدم مداخلت کے قائل تھے اور یہ دلیل اس وقت دی گئی، جب صحت عامہ کی حفاظت کے لیے پہلا مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہوا تھا۔ صنعتی انقلاب نے جو نازک عمرانی مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے حل کے لیے آزاد خیالوں کی طرف سے ابتدائی تدبیر کا خلاصہ یہی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فطرت کے عملئے میں انسانی مداخلت سے حالات اور بگڑ جائیں گے۔ فطرت کو اپنے انداز و اسلوب کے مطابق کام کا موقع دینا چاہیے۔

کلاسیکی ماہرین اقتصادیات

جن مفکروں نے انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں یہ افکار پیش کیے، وہ ایڈم سمتھ کے پیرو تھے، تاریخ میں انھیں کلاسیکی ماہرین اقتصادیات کہا جاتا ہے اور مخالفوں نے انھیں ایک غم افزا علم[2] کے معمار قرار دیا۔ ان میں مشہور ترین دو انگریز تھے۔ ایک ٹامس ملتھس[3] (۱۷۶۶ء – ۱۸۳۴ء) دوسرا ڈیوڈ رکارڈو[4] (۱۷۷۲ء – ۱۸۲۳ء)۔ ملتھس کے نظریات کو وحشت انگیز علم قرار دینا کوئی زیادہ سخت اصطلاح نہیں۔ اسے مذہبی تعلیم دی گئی تھی لیکن وہ تاریخ میں پہلا پیشہ ور عالم اقتصادیات بن گیا اور اس نے اپنی زندگی کا دورِ پختگی لندن کے نزدیک ایک کالج کی تعلیم و تدریس میں گزارا، جہاں نوجوانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ ۱۷۹۸ء میں اس نے "اصول آبادی کے متعلق اپنا مشہور مقالہ"[5] شائع کیا۔ اس میں یہ غم انگیز انتباہ کیا گیا تھا کہ نوعِ انسانی میں چونکہ پیدائش کا سلسلہ جاری ہے، وہ قحط سے دوچار رہے گی۔

اپنے مقالے میں ملتھس نے طبعی قوانین کا ایک سلسلہ پیش کیا:

---

[1] The Economist بابت ۱۳ مئی ۱۸۴۸ء [2] Dismal Science

[3] Mathus [4] (Ricardo)

[5] Essay on the Principles of Papulation

"آبادی کی افزائش بدرجہا زیادہ ہے اور زمین میں انسانوں کے لیے غذا پیدا کرنے کی اتنی قوت نہیں۔"

"اگر آبادی کو روکا نہ جائے تو وہ ہندسی تناسب سے بڑھے گی۔ اس کے برعکس خوراک کی افزائش کا تناسب حسابی ہے۔ . . . . فطرت نے حیوانی اور نباتی دائروں میں زندگی کا بیج بڑی کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی سے بکھیر رکھا ہے۔ لیکن ان کی پرورش کے لیے ضروری غذا کی بہم رسانی کا دائرہ مقابلۃً تنگ ہے۔ . . . . مگر ضرورت، جو فطرت کا ہمہ گیر اور اہم قانون ہے، سب کو مقررہ حدود کے اندر رکھتا ہے۔ نباتات و حیوانات میں اس کا اثر یہ ہے کہ بہت سے بیج بیماری یا قبل از وقت موت کے ذریعے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ انسان احتیاج اور برائی کے ہدف بنتے ہیں۔"[1]

ملتھس کا عقیدہ تھا کہ احتیاج اور برائی کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، کیونکہ انسانوں کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ مزدوروں کی مانگ گھٹ جائے گی اور آخر ان کی اجرت بھی کم ہو جائے گی:

"جب مزدور کی اجرت دو بچوں کا گزارہ بھی نہیں کر سکتی، تو اس آدمی کا کیا حال ہوگا، جو شادی کر لیتا ہے اور پانچ چھ بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ سخت بدبختی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس کی مزدوری ایک کنبے کے گزارے کے لیے کفالت نہیں کرتی۔ . . . . وہ دولتمندوں پر حرص کا الزام عائد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہی ہمیں مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ہمارے گزارے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ معاشرے کے جانبدارانہ اور غیر منصفانہ اداروں کو مورد الزام ٹھہراتا ہے، جن کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں اسے ناکافی حصہ ملا۔ وہ خدا پر طعن میں متامل نہیں ہوتا، کیونکہ اسے معاشرے میں ایسا مقام ملا، جو ناگزیر تکلیف اور انحصار سے محصور تھا۔ وہ الزام کے ہدف تلاش کرنے کی کوشش میں اس اصل سرچشمے پر نظر نہیں رکھتا، جس سے اس کی مصیبتیں نکلیں۔ وہ اپنے آپ کو کبھی ملزم نہ ٹھہرائے گا، حالانکہ اصل ذمہ دار وہ خود ہے۔[2] . . . ."

مایوسی کے اس داعی نے مصیبت زدہ انسانیت کے لیے امید کا صرف ایک راستہ بتایا اور وہ یہ کہ شرح پیدائش گھٹائی جائے۔ اس سلسلے میں تدبیر یہ بتائی کہ انسان اپنے آپ پر اخلاقی ضبط و نظم قائم کریں، خصوصاً شادیاں ذرا متاخر کی جائیں اور شادی تک

---

[1] ملتھس کا مقالہ کتاب اوّل باب ۱۔

[2] ایضاً کتاب چہارم باب ۳۔

پوری زندگی پاک دامنی میں گزاری جائے۔

رکارڈو بھی مایوسی ہی کا داعی تھا۔ وہ ایک زمیندار تھا، ساتھ ہی سٹّا کھیلتا رہا۔ کاروبار میں کامیابی سے اتنی دولت پیدا کر لی کہ بیس ہزار پونڈ دے کر آئرلینڈ کے ایک حلقے سے دارالعوام کا ممبر بن گیا۔ اس کی کلاسیکی تصنیف کا نام "محاصل اور سیاست اور ان کے اصول"[1] ہے۔ اس نے اقتصادی سرگرمی کی تین بڑی قوتیں بتائیں، مثلاً بڑے بڑے طبعی وسائل کے مالکوں (جیسے زمینوں اور کانوں) کا کرایہ، ان وسائل سے فائدہ اٹھانے والے سرگرم افراد کا نفع، ان مزدوروں کی اجرت، جو اس سلسلے میں محنت کرتے ہیں۔ ان تین قوتوں میں سے کرایے کو اہم ترین حیثیت حاصل ہے۔ ملتھس کے پیرو کی حیثیت میں رکارڈو کا عقیدہ یہ تھا کہ انسانی عنصر طبعی عنصر پر فائق ہو جائے گا۔ زمینیں قوت کھو بیٹھیں گی، کانوں کے ذخیرے ختم ہو جائیں گے، مگر ان کی طلب بدستور جاری رہے گی۔ گویا کرایے کا حصہ اقتصادی فعالیت میں سب سے بڑا ہو گا۔ سرمایہ داروں کی منفعت اور مزدوری کی اجرت گھٹتی جائیں گی۔

رکارڈو نے بھی اپنی یاس انگیز پیش گوئیوں میں بہت سے قیود و تحفظات لگا دیے۔ مثلاً اس کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ اقتصادی فعالیت کی مقدار معیّن ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ عالم انسانیت کی پوری دولت منجمد حالت میں نہیں، تاہم اصول سیاست مدن میں جو تصویر پیش کی گئی، وہ ایسی تھی کہ آخر معاملات ایک حد پر پہنچ کر ٹھہر جائیں گے اور انسان فائدہ اٹھائے گا، وسائل کو ہضم کرتا جائے گا اور آخر سب کچھ تلف کر دے گا۔ ایڈم سمتھ نے تقسیم کار اور افزائش اجرت کو اقتصادی زندگی کا مرکز قرار دیا تھا۔ رکارڈو مزدوری اور اجرت کو ملتھس کے فارمولے کے تحت لے آیا، وہ کہتا ہے:

"مزدوری بھی دوسری چیزوں کی طرح خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ اس کی بھی ایک طبعی اور بازاری قیمت ہے۔ مزدوری کی طبعی قیمت وہ ہے جو مزدوروں کو پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے اور اپنی نسل قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ نہ اس میں اضافہ ہو، نہ کمی۔

. . . .

"مزدوری کی بازاری قیمت وہ ہے جو حقیقتاً ادا کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں طلب و رسد کے تناسب پر عمل ہوتا ہے۔ جب مزدور کم ہوں تو مزدوری گراں ہو جائے گی۔ مزدور زیادہ ہوں تو وہ ارزاں ہو گی۔ . . . . جب مزدوری کی بازاری قیمت طبعی قیمت سے بڑھ جائے تو مزدوری کی حالت عمدہ اور خوش گوار ہو جائے گی۔ وہ زندگی کے نسبتہً زیادہ لذائذ و ضروریات سے استفادے کے اہل ہوں گے۔ اس وجہ سے صحت مند اور تعداد میں زیادہ بچوں کی پرورش کر سکیں گے، مگر جب اعلیٰ اجرتوں کی حوصلہ افزائی سے آبادی بڑھے گی

---

[1] The Principles of Political Economy and Taxation

تو مزدوروں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ اجرتیں طبعی قیمت پر آ جائیں گی، بلکہ بعض اوقات اس سے نیچے گر جائیں گی۔"[1]

رکارڈو کے شاگردوں نے اس اصول کو سخت کرتے کرتے "اجرتوں کا آہنی قانون"[2] بنا دیا، جس نے مزدوروں کو اعلیٰ اجرتوں اور وسیع کنبوں کے ایک دائمی چکّر سے وابستہ کر دیا، یعنی مزدوروں کی تعداد بڑھے گی، جو اسی تناسب سے کاموں کے لیے مقابلہ زیادہ ہو جائے گا اور اجرتوں میں ناگزیر طور پر کساد شروع ہو جائے گا۔ آخر مزدور ایک بندھے ٹکے دائمی اقتصادی نظام پر قناعت کے لیے مجبور ہوں گے۔ خود رکارڈو اس چکّر کو آہنی قانون نہیں سمجھتا تھا، بلکہ کہتا تھا کہ یہ امکان موجود ہے اور جو عوامل آج ہمیں نظر نہیں آ رہے اور ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، وہ کل نمودار ہو کر اس کی رفتار بدل سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مزدوروں کی حالت تدریجاً بہتر ہو جائے لیکن رکارڈو کو ایک امر کا یقین تھا کہ نادیدہ عوامل صرف فطرت کے ہاتھ میں ہیں:

"تمام دوسرے معاہدوں کی طرح اجرتوں کو بھی بازار کے آزاد مقابلے پر چھوڑ دینا چاہیے اور قانونی مداخلت سے ان پر ضبط و نظم قائم نہیں کرنا چاہیے۔"[3]

آزاد خیالی اور عدم مداخلت

یہ سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں کہ ملتھس اور رکارڈو کو کس وجہ سے عدم مداخلت کی پالیسی کے بڑے شارح قرار دیا گیا، لیکن بیسویں صدی کے مبصر کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ انھیں آزاد خیالوں میں کیوں شمار کیا گیا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ کلاسیکی فضلائے اقتصادیات ایک لحاظ سے یقیناً آزاد خیال تھے۔ اٹھارھویں صدی کے فلسفیوں کی طرح انھیں بھی قطعاً شبہ نہ تھا کہ فطری قوانین انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے برتر ہیں۔ رکارڈو آخر تک آزاد تجارت کا معتقد رہا، اگرچہ اس سے خود اس کی آمدنی پر زد پڑتی تھی۔ اس نے قوانینِ غلّہ کے خلاف تحریک کی حمایت کی۔ یہ ان قوانین کی تنسیخ سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اگرچہ وہ خود بڑا زمیندار ہونے کی وجہ سے غلّہ پیدا کرتا تھا اور غذائی جنسوں کی درآمد پر حفاظتی محاصل قائم رہنے سے خود اسے نفع پہنچتا تھا۔

جو چیز ان اقتصادیوں کو دورِ تنویر کے پیشروؤں سے ممتاز کرتی تھی، وہ ان کی قنوطیت تھی۔ غم انگیز علم سے تمسّک کرنے والے لوگ فطرت کو مہربان خدا کی تخلیق نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ خدا پرستوں کا عقیدہ تھا۔ وہ فطرت کو بہتر سے بہتر صورت میں ایک غیر جانبدار قوت اور بدتر صورت میں شر انگیز قوت مانتے تھے۔ ان کے نزدیک خود انسان، جو بے پروا، کوتاہ اندیش اور مُسرف تھا، پھر ایک مرتبہ ابتدائی گناہ کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ملتھس، جس نے انسان کے متعلق ایسا بُرا فیصلہ کیا، مسیحی عقائد و اصول کے مطابق تربیت پا چکا تھا اور ان عقائد میں انسان کے رجحانِ گناہ پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ یقیناً کلاسیکی علمائے اقتصادیات نے انسان کی حالتِ زار کے حقائق پر از سرِ نو زور دیا اور فلسفیوں کی رجائیت کی اصلاح کی جو واقعی اصلاح کی محتاج تھی۔

---

[1] اصول سیاست مُدن، باب ۵ ۔ [2] IRON Law of Wages

[3] اصول سیاست مُدن ۔

لیکن کلاسیکی فضلائے اقتصادیات کا عقیدہ بھی محض سادہ لوحی پر مبنی تھا۔ انھوں نے اقتصادی دنیا کا نقشہ ایک عالمی مشین کی شکل میں کھینچا، جس میں چند سادہ اور تقریباً غیر متبدل قوانین کارفرما تھے۔ مثلاً ملتھس کا قانون آبادی اور رکارڈو کے قوانین اجرت و کرایہ۔ گزشتہ صدی کی تاریخ نے اس نقشے کا ناکافی ہونا آشکارا کر دیا۔ ملتھس کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ سائنس کی ترقیات زراعت کی پیداوار بڑھا کر یقیناً ہندسی تناسب پر پہنچا دیں گی۔ اسے بالکل معلوم نہ تھا کہ شرح پیدائش کی افزائش بعض اوقات موانع حمل کے استعمال سے روکی جا سکتی ہے۔ یہ موانع انیسویں صدی کے دوران میں عام ہوئے۔ اس افزائش کا ایک علاج نقلِ وطن بھی تھا۔ لاکھوں آدمی یورپ کی گھنی آبادی سے نکل کر انیسویں صدی میں امریکہ پہنچ گئے، جہاں آبادی کم تھی خصوصاً آئرلینڈ سے خروج کا سلسلہ پانچویں عشرے کے قحط کے بعد برابر جاری رہا اور ۱۹۱۰ء تک آئرلینڈ کی آبادی پچاس سال پیشتر کی آبادی سے نصف رہ گئی۔ قحط اب تک دنیا کے لیے شدید پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے اور نئے ملتھوسی اہلِ قلم اب بھی شرح پیدائش کی زیادتی، قحط، آندھی اور دوسری زرعی آفتوں پر چونک اٹھتے ہیں، تاہم غذائی قلت نے اب تک انسانی اعداد کے اضافے کو روکا نہیں اور نہ انسانی بقا کے لیے معیار میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔ اقتصادی دائرہ رکارڈو کی توقعات سے بہت زیادہ پھیل گیا ہے اور اسی کے تناسب سے کرایہ، نفع اور اجرت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

کلاسیکی علمائے اقتصادیات نے ان وسیع تغیرات کا پورا اندازہ نہیں کیا تھا، جو زرعی اور صنعتی انقلاب سے پیدا ہو رہے تھے۔ بہ ایں ہمہ آزاد خیالی کے تحت جس عدم مداخلت کی حمایت انھوں نے کی، نئے صنعتی سرمایہ داروں نے اس کی ستائش بہ طور خاص کی۔ بڑے بڑے صنعت کار غالباً رکارڈو کی اس پیشگوئی سے مضطرب تھے کہ نفعوں میں کمی آنا ناگزیر ہے، مگر انھیں اس نظریے سے بڑی آسودگی حاصل ہوئی کہ تکلیف اور برائی فطرت کی طرف سے انتباہات ہیں۔ گویا دولتمندوں کو یہ بتانا موجب راحت تھا کہ غریب غریب ہی رہنے کے مستحق ہیں، کیونکہ وہ اپنی خواہشوں کو حدِ اعتدال سے بڑھ کر پورا کرتے رہتے ہیں۔ عدم مداخلت کے اقتصادیات کی دنیا میں جو کچھ موجود تھا، وہی درست تھا، یا کم از کم اس میں شبہ نہ تھا کہ فطرت کا فیصلہ وہی تھا۔

تاہم مزدوروں کے لیے عدم مداخلت کا مطلب یہ تھا کہ انھیں کھانا پورا نہ ملے۔ رہنے کے لیے کافی اچھے مکان نہ ہوں۔ کبھی ان سے زیادہ کام لیا جائے اور کبھی وہ بیکار رہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مالک بدل جائیں یعنی طبقۂ اوسط نے وہی حقوق حاصل کر لیے (یا ان کا رجحان یہی تھا) جو نظام قدیم میں امرا نے اپنے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔ غریبوں کو یہ چیز قطعاً گوارا نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ غریب ہی رہنے کے مستحق ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں احساس پیدا ہو رہا تھا: جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہے۔ اسے بدلنا چاہیے اور ضرورت پڑے تو جن قوانین کو فطرت کے مقدس قوانین قرار دیا جاتا ہے، ان میں مداخلت بھی کی جائے۔

غرض مثبت عمرانی برائیوں کے پیشِ نظر کلاسیکی علمائے اقتصادیات نے عدم مداخلت کا سبق پڑھایا۔ یہ اصولاً ایک سلبی پالیسی تھی۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے علمائے اقتصادیات بڑے مخلص افراد تھے اور نیک نیتی سے سمجھ بیٹھے تھے کہ صحیح علاج فطری قوانین ہی کی پیروی میں مضمر ہے، مگر ان پر یہ الزام عائد ہو سکتا تھا کہ ان کے دل پتھر اور ضمیر مردہ ہیں اور

وہ ایسے اقتصادی نظریات پیش کر رہے ہیں، جو ان کے اقتصادی منافع کو محفوظ رکھیں۔ لہٰذا اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ عدم مداخلت کی آزاد خیالی عملی اور عمرانی سیاسی فلسفے کی حیثیت میں آج تقریباً ناپید ہے۔

نظریۂ افادیت: بنتھم

عدم مداخلت سے رجوع کا واقعہ حیرت انگیز طریق پر ظہور میں آیا۔ اس کی ابتدا اس شخص کے ہاتھ سے ہوئی جو کلاسیکی علماے اقتصادیات کا دوست اور سرپرست تھا یعنی جرمی بنتھم[1] (۱۷۴۸ء - ۱۸۳۲ء) جرمی بنتھم ایک غیر معمولی ذہن و ذکاوت کا آدمی تھا اور آکسفورڈ کی ڈگری سولہ سال کی عمر میں لے لی تھی۔ وہ دولتمند تھا اور شادی نہیں کی تھی۔ اس نے وہی طریقہ اختیار کیا، جو رائے عامّہ کے مطابق ایک غیر معمولی فلسفی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس نے ایک مرتبہ کھانے پر مہمان بلائے، لیکن کھانے سے پہلے باغ میں اچھل کود اور بھاگ دوڑ سے مہمانوں کو متحیر کر دیا۔ خود اس نے اس اچھل کود اور بھاگ دوڑ کو "کھانے سے پیشتر کا گھومنا" قرار دیا۔ موت کے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش کو حنوط کر کے لندن کے یونیورسٹی کالج میں رکھا جائے! جس کی تاسیس میں وہ شریک رہا تھا۔ زندگی میں اس نے درجنوں منصوبے انسانی نسل کی اصلاح کے لیے بنائے۔ ان میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ نمونے کے قید خانے اور قیدیوں کی اصلاح کے ادارے بنائے جائیں۔ انھیں وہ "گول قید خانے"[2] کہہ رہا تھا، یعنی ایسے قید خانے، جن میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں ایک دائرے میں ہوں اور پہرے دار مرکز میں، تاکہ تمام قیدیوں کی پوری نگرانی کر سکیں۔ اس نے درجنوں نئے لفظ بنائے، جن میں سے بعض فراموش کر دیے گئے ہیں، لیکن بعض زبان میں ایک قیمتی اضافہ ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ افادیت بھی ہے، جسے اس کے افکار سے پوری مطابقت تھی۔

بینتھم نے تمام انسانی اداروں اور اصول کے لیے افادیت کو سب سے بڑا معیار بنایا۔ وہ ان اصول اور اداروں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا جو اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ فرانسیسی انقلابیوں نے حقوق انسانی کا اعلان کیا۔ اس اعلان پر بینتھم نے کہا: "طبعی حقوق بالکل لغو ہیں۔ طبعی حقوق اور ایسے حقوق، جو ساقط نہ ہو سکیں، ایک خطیبانہ لغویت ہیں۔ ایسی لغویت، جو بانس کے ڈنڈوں پر کھڑی ہو۔" یہ حقوق اس لیے لغو تھے کہ بینتھم معاشرے کی تنظیم کا قائل ہی نہ تھا اور نہ اس امر کا قائل تھا کہ طبعی اصول کی بناء پر اخلاقیات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "فطرت نے انسانیت پر دو بڑے مقتدر آقا مسلّط کر دیے ہیں، یعنی الم اور لذّت۔ یہی دو آقا بتاتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں، جو کچھ سوچتے ہیں، سب میں انھیں کی کارفرمائی ہے۔ ہم ان کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو کوشش کریں گے، وہ ان کے وجود کا ثبوت ہو گی اور اس کی تصدیق کرے گی۔ انسان قولاً ان کے اقتدار کو ٹھکرا دینے کا مدعی ہو سکتا ہے، مگر حقیقتاً وہ پورا وقت ان کی تابعیت

---

[1] Jeremwy Bentham

[2] Panopticon

میں گزارتا ہے۔ افادیت کا اصول ان آقاؤں کی محکومی ثابت کرتا ہے اور اس نظام کی بنیاد استوار ہوتی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عقل اور قانون کے ہاتھوں سے راحت کی پرورش ہو۔

"۔۔۔ اجتماعی فائدہ ایک عام ترکیب ہے، جو اخلاقیات کے سلسلے میں بہ کثرت استعمال ہوتی ہے۔ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس کے معنی کا اکثر لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماع ایک فرضی وجود ہے۔ یہ ان افراد سے مرکّب ہے، جو اس کے ارکانِ ترکیبی سمجھے جاتے ہیں۔ پھر اجتماعی فائدے کا مطلب کیا ہے؟ ان متعدد افراد کا فائدہ، جو اس اجتماع میں شامل ہیں۔

"جماعت کے فائدے کی بات چیت اس وقت تک بالکل فضول ہے جب تک فرد کے مفاد کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیا جائے۔ ایک چیز کو ایک فرد کا مفاد قرار دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اس سے اسے نفع ہوگا جب وہ چیز اس شخص کی مسرتوں میں اضافہ کر دے یا جو مجموعی دُکھ اُسے پہنچ رہے ہیں، ان میں اس چیز سے تخفیف ہو جائے۔"[1]

بینتھم نے افادیت کا جو نظریہ پیش کیا، اس کی تاریخ طویل ہے، جو ہیوم اور ہالباش میں سے ہوتی ہوئی دنیائے قدیم کے لذتیّوں تک پہنچ جاتی ہے، لیکن بینتھم پہلا شخص تھا، جس نے افادیت کا پورا نظام مرتب کر دیا۔ اس نے ایک درجن سادہ لذائذ و آلام کی فہرست تیار کی، مثلاً حواس کے لذائذ اور ان کے مقابلے میں آلام، دولت کے لذائذ اور ناداری کے آلام، ہنرمندی کے لذائذ اور بے ہنری کے آلام وغیرہ۔ پھر ہر صنف کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کیا۔ حواس کے لذائذ کی کئی تقسیمیں کیں، مثلاً لذّتِ ذائقہ، لذّتِ نشہ، لذّتِ شامّہ، لذّتِ مس، لذّتِ سامعہ، لذّتِ باصرہ، لذّتِ جنسیّت، لذّتِ صحت، لذّتِ جدّت وغیرہ پھر ہر لذّت و الم کے فیصلے کے مختلف معیار قائم کیے، مثلاً لذّت یا الم کی شدّت کا درجہ کیا ہے؟ وہ کتنی دیر تک قائم رہتا ہے؟ اس کے متعلق یقینی یا بے یقینی کا کیا عالم ہے؟ وہ قریب ہے یا بعید؟ اس سے اور کیا کچھ پیدا ہوتا ہے اور وہ خالص ہے یا اس میں کوئی دوسری جنبش شامل ہے؟ بینتھم نے اس کا نام "احصائے مسرّت" رکھا۔ اٹھارھویں صدی میں ایک ناقابلِ پیمائش چیز کو ناپنے کی جو کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک اچھی مثال ہے اور اس امر کی بھی اچھی مثال ہے کہ طبعی سائنس کے متعیّن قاعدوں کو انسانی روش کی باریکیوں کے تعلق میں کیونکر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بہ ایں ہمہ بینتھم کوئی نظریہ ساز فلسفی نہ تھا۔ اٹھارھویں صدی میں سیاسی ذرائع کا نظریہ مروّج تھا۔ بینتھم نے اس نظریے کو

---

[1] اصول اخلاق و قانون سازی کی تمہید۔ باب ۱ صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۷۔

[2] An Introduction to the Principles of Morals and Legislation by Wilfride

افسانہ قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ اس کا عام عقیدہ یہ تھا کہ حکومتیں بطور خود اپنی رعایا کے تحفظ کے لیے بہترین وسائل اختیار کر سکتی ہیں۔ عمرانی اور اقتصادی معاملات میں انھیں پولیس کے ایسے جوان کی روش اختیار کرنی چاہیے، جو فعال نہ ہو۔ یوں بینتھم اور کلاسیکی علمائے اقتصادیات کے درمیان ایک گہرا اور ہمدردانہ ربط پیدا ہو گیا، تاہم بینتھم کو احساس تھا کہ بعض اوقات حکومتوں کو زیادہ نقاہت سے کام لینا پڑے گا اور عدم مداخلت کی آزاد خیالی نے جو وظائف ان کے لیے تجویز کر دیے تھے، ان سے قدم آگے بڑھائے بغیر چارہ نہ رہے گا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ لوگ بعض اوقات ذاتی منافع کی سعی و جستجو میں دوسرے افراد کے بہترین مفاد سے متصادم ہو جائیں گے، لہٰذا اگر زیادہ تر افراد کے آلام چند افراد کے لذائذ سے بڑھ جائیں تو حکومت کے لیے قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہ ہوگا اور اسے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ ایسے حالات میں بینتھم سمجھتا تھا کہ حکومت ہمہ گیر اقتدار کی بنا پر عوام کی بہبود کے لیے تدبیریں اختیار کرنے کی اہل ہوگی۔ بیسویں صدی میں فلاحی مملکتوں کے جو نظریات سامنے آئے، وہ بڑی حد تک بینتھم کی اقتصادیات پسندی کے اسی پہلو سے پیدا ہوئے۔

وفات تک بینتھم کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے پرتگال، روس، یونان اور مصر کے مدعیانِ اصلاح کو مشورے دیے اور اس کی تحریرات سے وسیع اثر پیدا ہوا خصوصاً فرانس، ہسپانیہ اور ہسپانوی امریکی جمہوریتوں میں۔ اس نے گول قید خانوں کی جو تجویز پیش کی تھی۔ اس کے مطابق ۱۹۲۰ء میں امریکہ نے ایک قید خانہ قائم کیا (جولیٹ[1] واقع ریاست الینوائس[2] میں)، لیکن اس کے نہایت اہم شاگرد انگریز تھے۔ آئندہ چل کر واضح ہوگا کہ شاگردوں کے ایک گروہ نے، جنھیں فلسفی انتہاپسند کہا جاتا ہے، پارلیمانی قانون کے ذریعے سے اصلاحات پر زور دیا۔ یہاں ہم صرف یہ واضح کریں گے کہ اس کے نہایت مشہور انگریز شاگرد پردوم مل نے افادیت پسندی کو وسعت دے کر اور اس میں گہرائی پیدا کر کے ایک جمہوریت پرورانہ آزاد خیالی کا نظریہ بنا دیا۔

جمہوریت پرورانہ آزاد خیالی: مل

جان سٹوارٹ مل[3] (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) نے اس فضا میں پرورش پائی، جو افادیت پسندی اور کلاسیکی علمائے اقتصادیات کی تعلیمات سے لبریز تھی۔ مل کا باپ بینتھم کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا اور وہ رکارڈو کا گہرا دوست تھا۔ اسی سے جان سٹوارٹ مل نے پوری تعلیم حاصل کی، جس کی شدت اور رفتار کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مل نے تین سال کی عمر میں یونانی زبان کی تعلیم پائی اور بارہ سال کی عمر میں اس نے تاریخ نگاری شروع کر دی تھی۔ سولہ سال کا ہوا تو اس نے ایک افادیت پسند معاشرے کی تنظیم شروع کر دی۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ مل جیسا ذہین و فطین شخص محنت و مشقت کی زیادتی کے باعث اعصابی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ وہ خود نوشتہ سوانح میں اعتراف کرتا ہے کہ میں محض ایک استدلالی مشین بن گیا ہوں۔ جذبات کی اہمیت کا وہ پورا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے

---

[1] IOLIET [2] ILLINOIS [3] STUART MILL

موسیقی کی طرف توجہ کی۔ ورڈزورتھ اور کولرج کے اشعار کا مطالعہ کیا۔ پھر اسے مسز ٹیلر سے محبت ہوگئی جو ایک گرمجوش خاتون تھی۔ مل نے بعد کی تصانیف کے لیے زیادہ اعزاز اسی خاتون کو دیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بیس سال تک فلاطونی دوستی جاری رہی۔ پھر مسٹر ٹیلر کے مرجانے سے دونوں کی شادی کا دروازہ کھلا۔ مل کی ذاتی سرگذشت کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اسی سے واضح ہوتا ہے، اس نے کیوں آزاد خیالی کے عقیدے کو ان اوصاف سے بہرہ مند کیا، جو کلاسیکی علماے اقتصادیات میں ناپید تھے۔ گویا مل نے اس عقیدے کو نئی حرارت اور رافت بخشی۔

مل کی انسانیت پرور آزاد خیالی آزادی پر مقالے[1] (۱۸۵۹ء) اور خود نوشتہ سوانح[2] (۱۸۷۳ء) میں پوری طرح واضح ہے نیز یہ زیادہ تر ان تصانیف میں واضح ہے، جن کی حیثیت زیادہ تر فنی تھی، خصوصاً "اصول سیاست مدن[3]" میں۔ اس حد درجہ کامیاب نصابی کتاب کی اشاعت ۱۸۴۸ء میں ہوئی تھی۔ پھر متعدد مرتبہ اس پر نظر ثانی ہوئی اور ہر نظر ثانی میں یہ کتاب رکارڈو اور ملتھس کے "غم انگیز علم" سے دور تر ہوتی گئی۔ اس کتاب کی پہلی ہی اشاعت میں اجرتوں کے آہنی قانون کے تاریک مضمرات رد کر دیے گئے تھے:

> "اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ افلاس کا مقابلہ کن وسائل سے کیا جائے؟ کم اجرتوں کی برائی کا مداوا کیا ہے؟ اگر وہ تدبیریں جو عموماً پیش کی جاتی ہیں، اصل مقصد پورا کرنے کے لیے موزوں نہیں تو کیا مزید تدبیریں نہیں سوچی جا سکتیں؟ کیا اس مسئلے کو لاینحل سمجھ لینا چاہیے؟ کیا "سیاسیات مدن" اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی؟ صرف ہر چیز پر اعتراض کر سکتی ہے اور یہ بتا سکتی ہے کہ کچھ کرنا ممکن نہیں"[4]؟

یقیناً کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا تھا اور مل نے آبادی کی افزائش کو روکنے کے لیے جن منصوبوں کا خاکہ پیش کیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ زائد آبادی کو نو آبادیوں میں منتقل کر دینے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور مزدوروں کو تعلیم دے کر ان کے عادات و خصائل میں بلندی پیدا کی جائے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو مملکت کو چاہیے کہ جبراً تعلیم دے اور خرچ خود برداشت کرے۔

اس ایک مثال سے واضح ہو سکتا ہے کہ مل نے مثبت اصلاحی تدبیروں کی تلاش میں کیونکر عدم مداخلت کی روش تبدیل کر دی جو آزاد خیالی کے ساتھ ابتدا سے وابستہ چلی آ رہی تھی۔ فرانس میں "قومی کارگاہ" کا جو منصوبہ پیش ہوا تھا (۱۸۴۸ء)، مل کو اس کے ساتھ پوری ہمدردی تھی۔ اسی طرح بعض اعتدال پسندانہ اشتراکی منصوبوں سے ہمدردی تھی، جن کا جائزہ آگے چل کر

---

[1] ON LIBERTY — [2] AUTOBIOGRAPHY

[3] The Principles Political economy — [4] مل کی سیاست مدن کتاب ۲ باب ۱۳۔

لیا جائے گا۔ اگرچہ مِل نے نجی جائیداد کو منسوخ کر دینے کا اشتراکی حل قبول نہ کیا، مگر دولت کے متعلق اس کے نظریات اربابِ املاک کے نزدیک چنداں باعثِ آسودگی نہ تھے۔ وہ کہتا ہے:

"جدید یورپ کے عمرانی انتظامات املاک کی تقسیم سے شروع ہوئے، جو منصفانہ نہیں تھی یا محنت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ تغلب و تشدد کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ صنعت صدیوں سے قوت کے کام میں ترمیم کر رہی ہے، مگر اس نظام میں اب بھی ابتدا کے بہت سے آثار باقی ہیں۔ قوانینِ ملکیت اب تک ان اصول کے مطابق نہیں ہوئے، جن پر نجی املاک کے جواز کا انحصار ہو سکتا ہے ..... ان میں انسانوں کے درمیان توازن قائم نہیں رکھا گیا، بلکہ بعض کے سامنے پے در پے رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور بعض کو نفع جوئی کا موقع دے دیا گیا، گویا عمداً نامساوات کو تقویت پہنچائی گئی اور سب کے لیے اس دور میں منصفانہ طریق پر شرکت کی مہلت بہم نہ پہنچائی گئی۔[1]"

مِل کی رائے تھی کہ اگر مزدوروں کو پیشہ ورانہ انجمنیں (ٹریڈ یونین) قائم کر دینے کا موقع دے دیا جائے، وہ تعاونی انجمنیں بنالیں، اجرتیں بڑھ جائیں، بلکہ منافع میں بھی انھیں شامل کر لیا جائے تو قوانینِ ملکیت کا عمل زیادہ منصفانہ ہو جائے گا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ یہ تبدیلیاں نجی جدوجہد ہی سے کرائی جا سکتی ہیں، عوامی مداخلت مناسب نہیں۔ مگر وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ بعض معاملات حد درجہ نازک صورت اختیار کر چکے ہیں اور حکومت کے لیے دخل دینا لازم ہے۔ پارلیمنٹ نے تحقیقِ احوال کے لیے جو مجلسیں بنائی تھیں (اور ان کا ذکر پیشتر آ چکا ہے)، ان کی روداد میں مِل پڑھ چکا تھا۔ ان میں انسانوں سے ناجائز نفع اٹھانے اور ان کا شرف زائل کرنے کے جو بیانات موجود تھے، وہ اس کے نزدیک بہت رنج افزا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کم عمر مزدوروں کی حفاظت، رہنے سہنے اور کام کرنے کے ناقابلِ برداشت حالات کی اصلاح کے لیے قوانین سازی کی حمایت کی۔

بینتھم نے نجی ملکیت کا تقدس قبول کر لیا تھا، مِل نے اسے محلِ نظر قرار دیا۔ بینتھم نے بالغوں کے حقِ رائے اور عمومی تعلیم کو صرف مستقبل بعید کا ایک نصب العین سمجھا تھا، مِل نے ان چیزوں کو فوری مقاصد بنا دیا۔ وہ کہتا تھا کہ تمام انسانوں کو حقِ رائے حاصل ہونا چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمام لوگ کم سے کم تعلیم پانے کے لیے تیار رہیں۔ مزید برآں عورتوں کو بھی یہی حق ملنا چاہیے اور مِل تحریکِ آزادیٔ نسواں کا علمدار تھا۔ اس کی ایک تجویز یہ تھی کہ دارالعوام کی نمائندگی کے سلسلے میں متناسب انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے تاکہ سیاسی اقلیتوں کو یقین ہو جائے، انھیں اپنا نقطۂ نگاہ ظاہر کرنے کا پورا موقع حاصل ہے اور اکثریت کے استبداد میں ان کی صدا گم نہ ہو جائے گی۔

متناسب نمائندگی کا منصوبہ اور وہ خطرات، جن کی وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوئی، مِل کی ایک مستثنیٰ خصوصیت ہے۔ اس نے

---

[1] مِل کی سیاستِ مدن کتاب ۲ باب ۲۔

انفرادی حقوق کی حفاظت کو اپنے مشہور مقالۂ آزادی کی بنیاد بنایا۔ وہ کہتا ہے :

"کوئی حکومت ایسی سرگرمی کی روادار نہیں ہو سکتی، جو انفرادی جد وجہد اور پیشرفت میں رکاوٹ پیدا کرے، بلکہ ضروری ہے، اس کی سرگرمی انفرادی جد وجہد اور پیشرفت میں امداد اور تحریک کی موجب ہو۔ خرابی اس وقت شروع ہوتی ہے، جب افراد وجماعات کی سرگرمی اور اختیارات سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہ ان کی سرگرمی کو نظر انداز کر کے اپنی سرگرمی شروع کر دیتی ہے۔ یہ نہیں کرتی کہ انھیں صحیح راستہ دکھائے، مشورے دے اور ضرورت پڑے تو ان کی مذمت بھی کرے، بلکہ انھیں زنجیروں میں جکڑ کر ان سے کام لینا چاہتی ہے یا کہہ دیتی ہے کہ تم ایک طرف ہو جاؤ اور ان کی جگہ خود کام شروع کر دیتی ہے۔ کسی مملکت کی قدر وقیمت بہرحال ان افراد کی قدر وقیمت پر موقوف ہے، جو اس مملکت میں موجود ہیں۔ جو حکومت اپنے افراد کی قدر وقیمت اس لیے گھٹاتی ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں میں فرمانبردار آلہ ہائے کار بنے رہیں (اگرچہ اس کے مقاصد سراسر فلاحی ہوں) اسے جلد معلوم ہو جائے گا کہ چھوٹے آدمیوں کے ذریعے سے کبھی بڑے کارنامے انجام نہیں دیے جا سکتے[1]..."

بہرحال مل نے کلاسیکی علمائے اقتصادیات کی آزاد خیالی کو رد نہ کیا، بلکہ اس میں ترمیم کی اور اسے وسعت دے دی۔ اس کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ عدم مداخلت کی پالیسی عمومی اعتبار سے بہترین ہے، مگر بعض افراد کی کامل آزادی دوسرے افراد کے لیے مضر ہو تو وہ عدم مداخلت کا حامی نہیں۔ غالباً مل کا ضمیر ایڈم سمتھ یا رکارڈو یا بینتھم سے زیادہ نازک اور حساس تھا۔ یقیناً اس نے مذکورہ اصحاب سے بعد کے دور میں زندگی بسر کی، جب صنعتکاری کی برائیاں نمایاں تر ہو چکی تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے عدم مداخلت کے قاعدے میں بدرجہا زیادہ اور اہم تر مستثنیات تجویز کیے، جو اس کے پیشروؤں کے خواب وخیال میں بھی نہیں آئے تھے۔

---

[1] Utilitarianism, LIBERTY AND REPRESENTATIVE GOVERNMENT ص ۱۶۹-۱۷۰

پچیسواں باب

اشتراکی تدبیریں

(۱)

حامیانِ مثالیت

اشتراکیت کی تعریف

زندگی کے آخری دَور میں مِل اپنے آپ کو اشتراکی کہتا رہا۔ اس کے معیار کے مطابق ہم میں سے اکثر آج غیر فعال اشتراکی ضرور ہیں۔ تمام بالغ مردوں (اور عورتوں) کے لیے حقِ رائے، عام آزاد تعلیم، عدم مداخلت میں بہبودِ عامہ کے نقطۂ نگاہ سے تقیّدات، اختیارات محاصل سے کام لے کر نجی املاک کی فراہمی کی تحدید —— یہ تمام بڑی اصلاحات جو مِل کے پیش نظر تھیں، بیسویں صدی کے تمام جمہوریّت پروروں کے نزدیک مسلّم ہیں، لیکن یہ چیزیں حقیقتاً اشتراکی نہیں۔ حقیقی اشتراکی دولت کی "تقسیم" کے سلسلے میں یہاں نہیں رکتا جیسے مِل رُک گیا، بلکہ وہ پیداوار کے انتظام میں بھی انتہائی تغیّرات تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیداوار کے تمام وسائل افراد کے ضبط ونظم سے نکال کر بہ حیثیّت مجموعی جماعت یا قوم کے نظم وضبط میں دے دینے چاہئیں۔

اشتراکیت —— فاشزم، لبرلزم اور جمہوریت کی طرح —— سیاسی لغت کے ان کلیدی الفاظ میں سے ہے، جنھیں اخلاقی تعبیرات سے اس درجہ گرانبار کر دیا گیا ہے کہ ان کے متعلّق بحث وتنازع سے مفر نہیں۔ ہر شخص یہ لفظ استعمال کرتا ہے، مگر زیادہ تر اس لیے کہ ایک خاص پالیسی کے متعلق قطعی پسند وناپسند کا اظہار کر دے۔ مورّخ یہ لفظ مقاصدِ بیان کے لیے استعمال کرتا ہے (اور یہی غیر جانبداری کا شیوہ ہے) کوئی خاص فیصلہ صادر کرنے کے واسطے استعمال نہیں کرتا۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے اشتراکیت ہر اُس سیاسی یا اقتصادی فلسفے کا اظہار ہے، جس کا مقصد یہ ہو کہ وسائلِ پیداوار نجی افراد کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ معاشرے کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ اس کا عام مطلب یہ ہے کہ حکومت قوم کے ٹرسٹی (امین ومتولّی) کی حیثیت میں تمام بڑی صنعتوں مثلاً کوئلہ، ریلوے اور فولاد کی مالک بن جائے۔ اشتراکیت اپنی انتہائی شکل میں چاہتی ہے کہ پیداوار کے تقریباً تمام وسائل زمین سے معدنی دولت تک عوام کی ملکیت ہیں۔

آج کل ہم انتہائی شکل کو کمیونزم کہتے ہیں، مگر آج سے ایک صدی پیشتر یہ دونوں اصطلاحیں مشترک طریق پر استعمال ہوتی تھیں۔ ایک سو سال کی تاریخ نے ان میں وہ امتیاز پیدا کر دیا، جو آج کل سب پر واضح ہے۔ امتیاز ایک چیز کی غیر مکمّل اور مکمّل تعبیر میں نہیں، آج کل کے اشتراکی اور کمیونسٹ دونوں املاک کے اشتراک و اشتمال کے حامی ہیں، خواہ جائداد کو قومی بنا دیا جائے یا مقامی

سطح پر بلدیات کی تحویل میں دے دیا جائے، لیکن آج سوشلسٹوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ چیزیں طبعی سیاسی ذرائع سے پُرامن طریق پر اور تدریجاً پایۂ تکمیل تک پہنچانی چاہئیں اور مالکوں کو کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور دے دینا چاہیے۔ کمیونسٹ یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصد جلد سے جلد تشدد کے ذریعے سے حاصل کر لینا چاہیے اور انقلاب برپا کر کے تمام چیزوں پر قبضہ کر لینا ضروری ہے۔ اگرچہ مقاصد کی یکسانی واضح ہے، تاہم وسائل میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ یہ نمایاں اختلاف انیسویں صدی کے اشتراکی فکر میں دو مختلف دبستانوں کے بروئے کار آنے کا ثبوت ہے۔ اوّل مثالیت کا دبستان، دوسرا مارکسی دبستان۔ سرسری نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی لیبر پارٹی کی اشتراکیت جزوًا انیسویں صدی کے حامیانِ مثالیت کی جانشین ہے اور روسی کمیونسٹ مارکس کے وارث ہیں۔

مثالیت کے حامی اشتراکی دورِ تنویر کے نیک دل فرزند ہیں۔ اگر انسان صنعتی اقتصادیات کے مسائل حل کرنے کے لیے عقل و فہم سے کام لیں، انسان کی پیدا کردہ نامساواتیں ختم کر کے اخوت کے طبعی قانون کو کارفرما ہونے دیں تو مثالیت ان کی دسترس میں آجائے گی۔ عمرانی و اقتصادی ترقی خود بخود شروع ہو جائے گی۔ یہ مشترک عقیدہ انیسویں صدی کے ابتدائی دَور کے چار بڑے مثالیوں —— سینٹ سائیمن، فوریا، رابرٹ اووِن اور لوئی بلینک —— کو ملا دیتا ہے۔

سینٹ سائیمن

ہنری کاؤنٹ سینٹ سائیمن[1] (۱۷۶۰ء تا ۱۸۲۵ء) کا تعلق فرانس کے ایک امیر خاندان سے تھا۔ یہ خاندان اتنا پُرانا تھا کہ شارلمین کے وارثوں میں سے ہونے کا مدّعی تھا۔ اس نے فلسفیوں سے تعلیم پائی تھی اور فرانسیسی فوج کے ساتھ ہو کر امریکہ کی جنگِ آزادی میں لڑتا رہا۔ انقلابِ فرانس کے دوران میں اس نے کلیسا اور تارکینِ وطن کی ضبط کردہ جائدادوں کے کاروبار میں بڑی دولت پیدا کر دی۔ پھر ایک بددیانت شریک کار کی جعل سازی کے باعث یہ دولت برباد ہو گئی۔ اپنی پریشانیوں اور ناکامیوں کے باوجود یہ ان کاروباری آدمیوں اور مزدوروں کا ہمیشہ مدّاح رہا جنھوں نے صنعتکاری کے ذریعے سے فروغ حاصل کیا۔ اس کا جوش اعلیٰ صورت میں اس حکایت کے اندر ظاہر ہُوا، جس کا تعلق فرانس کے قدیم اور جدید لیڈروں سے تھا اور یہ داستان ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

سینٹ سائیمن چاہتا تھا کہ اعلیٰ سیاسی اختیار، صنعت، سائنس اور فنون کے بڑے بڑے لیڈروں کو مل جائے۔ ساتھ ہی انھیں یاد دلاتا تھا: "مسیحیت کا حکم یہ ہے کہ تمام اختیارات سے کام لے کر غریبوں کی عمرانی بہبود کو جلد از جلد بڑھا دو۔"[2] اس کے دل میں سائنس کے لیے دورِ تنویر کا سا احترام موجود تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ ایک سائنس، جو سب پر فائق ہے، یہ ہے کہ "قاعدۂ زرّیں" کی تلاش کی جائے۔ مسیحیت کے سلسلے میں اصل خرابی یہ پیش آئی کہ اس کی آزمائش کبھی نہ کی گئی۔ سینٹ سائیمن کا نظریہ وہی تھا، جو عمرانی مصلحین اکثر اختیار کرتے رہے۔

اصلاح پُرامن طریق پر دوسروں کو راضی کر کے اور اچھی مثالیں ان کے سامنے رکھتے ہوئے ہونی چاہیے۔ ضروری ہے کہ اس کا اثر

---

[1] SAINT SIMON

[2] سینٹ سائیمن کی منتخب تحریرات ص ۱۱۶۔

ان سُست روؤں اور فلسفیوں پر پڑے، جو موجودہ معاشرے کے تن آسان دولت مند ہیں۔ تمام انسان بھائی ہیں اور مختلف قوموں کے انسان بھی اس برادری سے باہر نہیں۔ سینٹ سائیمن کا تصوّر یہ تھا کہ یورپی مملکتوں کے درمیان ایک وفاق پیدا ہو جائے گا اور اس کی ابتدا ترقی یافتہ ممالک مثلاً فرانس و برطانیہ کے اتحاد سے ہونی چاہیے۔ جب باقی مملکتیں اتنی منظم ہو جائیں گی کہ وہاں عوام کی نمائندگی برسرِ کار آ جائے گی تو ایک یورپی پارلیمنٹ قائم ہو جائے گی۔ سینٹ سائیمن کا محبوب لفظ تنظیم تھا، جس کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے، مگر یہ کبھی نہ بتایا کہ اس سے حقیقی مقصود کیا تھا۔

فوریا

سائیمن کے برعکس اس کے ہموطن اور معاصر فوریا[ل] (۱۷۷۲ء – ۱۸۳۷ء) نے ایک مفصّل اشتراکی منصوبہ تیار کیا، جس میں ایک تفصیل درج تھی۔ فرانس کی صنعت پارچہ بافی کا مرکز لیانز تھا۔ فوریا وہاں دولت و افلاس کے انتہائی مناظر دیکھ کر ہراساں زدہ رہ گیا۔ پیرس میں اسے یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا کہ ایک سیب کی قیمت اتنی زیادہ ہے، جس سے مفصّلات میں ایک سَو سیب خریدے جا سکتے ہیں۔ ان حالات سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ معاشرے اور اقتصادیات میں ایسی خرابیاں ضرور ہیں، جن کی وجہ سے یہ حیرت انگیز تفاوت رونما ہُوا ہے۔ اس نے اپنے تاریخی سیب کا مقابلہ نیوٹن کے سیب سے کیا۔ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا، یقین کیے بیٹھا تھا کہ مَیں عمرانی امور کا نیوٹن ہوں۔ نیوٹن نے ایک ایسی قوّت دریافت کر لی تھی، جس کے مطابق اجرام سماوی ایک دوسرے کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ فوریا نے اس قوّت کی دریافت کا اعلان کیا، جو انسانی معاشرے کے افراد میں ایک دوسرے سے ربط و تعلق پیدا کرتی ہے اور انھیں باہم مربوط رکھتی ہے۔

فوریا کے قول کے مطابق انسان اپنے جذبات کی بناء پر ایک دوسرے کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ اس نے جذبات کا ایک نقشہ تیار کیا، جو بینتھم کی فہرست لذائذ سے ملتا جلتا تھا، یعنی جنسیت، رفاقت، غذا، عیش، تنوّع وغیرہ۔ فوریا کو صاف نظر آ رہا تھا کہ موجودہ معاشرے نے ان وجدانات کی تسکین درہم برہم کر ڈالی ہے۔ لہٰذا اس کی ازسرِنو ترتیب ضروری ہے اور اسے ایسی اکائیوں میں نئے سرے سے منظّم کر دینا چاہیے، جنھیں وہ "صفوف" قرار دیتا ہے۔ ہر صف میں تقریباً اٹھارہ سَو رضاکار ہونے چاہئیں۔ یہ ایک جماعت کی کمپنی ہوگی، جس کے شرکاء منافع تین طریقوں پر تقسیم کریں گے۔ ۵/۱۲ حصّہ ان لوگوں کو ملے گا، جو کام کریں، ۴/۱۲ انھیں، جو انتظامیہ کی ذمّہ داری اٹھائیں، ۳/۱۲ انھیں، جو سرمایہ فراہم کریں۔

فوریا کے منصوبے میں منتظموں اور سرمایہ داروں کو نسبتاً فیاضانہ حصّہ دیا گیا تھا اور کامل مساوات پیدا نہ ہو سکی، تاہم اس میں مزدوروں کو منافع کا سب سے بڑا حصّہ مل گیا اور اس میں عمرانی منصوبہ بندی کے اور بھی بہت سے پہلو موجود تھے، مثلاً بالغ مزدور، سب سے بڑھ کر خطرناک یا ناخوشگوار کام انجام دیتے تھے۔ ان کا معاوضہ بھی سب سے زیادہ رکھا گیا تھا۔ ہر اکائی کے باشندوں کے لیے ایک بڑی عمارت میں رہنا ضروری تھا۔ اسے ایک بڑا ہوٹل قرار دینا چاہیے۔ اس میں انسان کے عمرانی وجدانات کی زیادہ سے زیادہ تسکین کے مواقع مہیّا رکھنے ضروری تھے۔ روزانہ زندگی کا انتظام بدرجہا بہتر طریق پر پیشِ نظر تھا، یعنی سیکڑوں مختلف اکائیوں کے لیے ایک مرکزی باورچی خانہ تجویز کیا گیا تھا۔ گھر بار کے زیادہ گندے کام بچّوں کے حوالے کر دیے گئے تھے، کیونکہ وہ ہر حال میں

ل FOURIER

گردو غبار کے اندر رہنا پسند کرتے تھے اور ان کے مختلف طبقے آلائش کی چیزیں اور غلاظت اٹھا کر پھینک سکتے تھے۔

ابتدا سے انتہا تک یہ اکائیاں دراصل عام مزدوروں کی بے کیف زندگی کے خلاف فوریا کے ردِ عمل کی ایک شہادت تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ کام کرنے کے مقامات کو مختلف قسم کی رنگین آرائشوں کے ذریعے سے انتہائی حد تک خوش گوار بنا دینا چاہیے۔ ایک اکائی کے ارکان دن بھر میں آٹھ مرتبہ کام تبدیل کریں، کیونکہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ کسی کام میں جوش و جذبہ قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ان اکائیوں کو خود کفیل رکھا گیا تھا یعنی لازم تھا کہ ضرورت کی چیزیں وہ خود پیدا کریں یا بنا لیں۔ ان کے باشندوں کو چار یا پانچ بجے صبح سے آٹھ نو بجے شب تک کام کرنا تھا اور نیند کے لیے صرف پانچ گھنٹے ملتے تھے، ہر کام میں تنوع پیدا ہونے کے باعث انھیں تھکاوٹ کا احساس نہ ہوگا اور جلد ہی وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ مند ہو جائیں گے۔

فوریا کو امید تھی کہ کوئی لکھ پتی اس منصوبے کے لیے روپیہ دے دے گا چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ میں ہر روز دوپہر کے وقت دفتر میں رہوں گا۔ وہ دس سال تک روزانہ ایک گھنٹہ دفتر میں بیٹھا رہا، مگر کوئی مخیّر دولت مند اس مدت میں نمودار نہ ہوا۔ تاہم فوریا کوئی محض بے اثر خیال پرست نہ تھا۔ بلاشبہ اس کے کئی انتہاپسندانہ تصوّرات بے سروپا تھے اور انسانی ارتباط کے اصول کو انتہائی حد پر لے گیا تھا، یہاں تک کہ اپنی اکائیوں میں جنسی تقیّدات بھی باقی نہیں رکھے تھے۔ گویا اس نے آزاد محبت اور مثالی اشتراکیت کو مترادف بنا دیا تھا، مگر اس نے اشتراکی نظریے اور عمرانی نفسیات کے لیے بھی ٹھوس کام کیا۔ اس کی بعض سفارشیں ـــــ مثلاً خطرناک کام کرنے والوں کو زیادہ اجرتیں دینا یا کام کی بے کیفی کو زائل کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا ـــــ موجودہ کاروبار کی دنیا میں عموماً رائج ہو چکی ہیں۔

اودن اکابر مثالیوں میں سے ایک رابرٹ اودن (۱۷۷۲ء۔۱۸۵۱ء) تھا، جو مانچسٹر (انگلستان) کا ایک خوشحال صنعتکار تھا۔ اس نے کاروبار میں سب کچھ اپنی محنت سے پیدا کیا۔ سکاٹ لینڈ میں ایک مقام نیو لنارک ہے، جہاں گلاسگو سے سواری میں ایک دن کے اندر پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا روئی کا کارخانہ تھا، جسے اودن نے سنبھال لیا۔ سابقہ مالک، وقت کے معیار کے مطابق فیاض سمجھا جاتا تھا، لیکن اودن کارخانے کی حالت دیکھ کر لرز گیا۔ اس میں ایڈنبرا کے خیراتی اداروں میں سے چھ چھ آٹھ آٹھ سال کے بچے بھرتی کر لیے گئے تھے۔ ان بچّوں کو کام کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت کم وقت ملتا۔ اودن نے دیکھا کہ وہ جسم و ذہن کے اعتبار سے پاشکستہ ہیں۔ وہاں کے بالغ مزدوروں کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ اودن لکھتا ہے:

> "چوری کرنا یا چوری کی چیزیں فروخت کی غرض سے لے لینا اُن کا پیشہ تھا۔ کاہلی اور شراب نوشی ان کی عادت تھی۔ جھوٹ اور دھوکا ان کا لباس تھا۔ ملکی اور مذہبی معاملات میں جھگڑے ان کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ وہ صرف ایک معاملے میں متحد تھے، یعنی مالکوں کی پُرجوش اور منظّم مخالفت میں۔"[1]

---

[1] رابرٹ اودن کی کتاب A New View of the Society (معاشرے کا نیا نظریہ) ص ۵۰۔

اوون نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کارخانے کے منافع میں بھی اضافہ کرے گا، ساتھ ہی مزدوروں کی حالت بھی بہتر بنائے گا۔ اس نے جلد ہی نیولنارک کو نمونے کا ایک صنعتی گاؤں بنادیا۔ بالغوں کے لیے کام کرنے کے حالات بہتر بنا دیے۔ وہ صرف ساڑھے دس گھنٹے کام کرتے، زیادہ اجرتیں لیتے، کشادہ تر اور صاف تر مکانوں میں رہتے۔ سکاٹ لینڈ کے روایتی طریقے کے مطابق وہ لوگ ہفتے کی رات کو بے حد شراب پیتے۔ اوون نے ان کی اس عادت پر یوں پابندی لگادی کہ شراب نوشی کے جتنے بڑے مرکز تھے، ان سب کو بند کر دیا۔ ساتھ ہی ان لوگوں کے لیے بہتر شراب ارزاں قیمت پر حاصل کرنے کا انتظام کر دیا۔ اگر کوئی شخص شراب پی کر برسرِ عام ہنگامہ بپا کرتا تو اسے سزا دی جاتی، مگر سکاٹ لینڈ والوں کی ایک روایت پر رابرٹ اوون بھی قابو نہ پاسکا، یعنی وہ سبت کا دن اس پابندی سے مناتے کہ اس روز گھر سے باہر نکل کر ورزش کرنا بھی گناہ سمجھا جاتا، مگر اس نے اپنے مزدوروں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ ہفتے اور اتوار کو کام سے فارغ ہو کر اپنے باغوں کی درستی میں لگ جاتے۔ بچوں کے متعلق اس نے فوریا جیسی روش اختیار نہ کی۔ ملازمت کے لیے کم سے کم دس سال کی عمر مقرر کر دی۔ امید تھی کہ وہ اس عمر کو رفتہ رفتہ بارہ پر لے آئے گا اور تمام بچوں کے لیے بہتر تعلیم کا انتظام کر دیا۔ ساتھ ہی تعلیم کے لیے انھیں خاصا وقت دے دینا۔ اوون کا طریقِ تعلیم بڑی حد تک روسو کے طریق سے ملتا تھا۔ بڑی بڑی علمی کتابوں کو الگ رکھا گیا۔ دستکاریوں کے علاوہ فطرت کے مطالعے اور دوسرے عملی معاملات پر زیادہ توجّہ کی جاتی۔

اوون کے نزدیک برطانوی صنعتکاری کی تمام بیماریوں کا علاج تعلیم تھا۔ لاک کی طرح اوون کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ بچّے کی لوحِ قلب و ذہن صاف تختی ہوتی ہے اور مناسب تربیت کے ساتھ اسے انتہائی حد تک درجۂ کمال پر پہنچایا جاسکتا ہے۔ صحیح تعلیم کے ذریعے سے قدیم نامناسب رسمیں ختم کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح انسان مساوات کی بلند سطح پر پہنچ جائیں گے اور انسانی ترقی ایسی صورت اختیار کرے گی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ کہتا تھا کہ جس قوم کو صحیح تربیت مل جائے، وہ ملتھس کی تاریک و یاس افزا پیشگوئیاں عملاً غلط ثابت کرسکتی ہے:

> "تمام انسان محتاط و مناسب قوانین اور تربیّت کے ذریعے سے ایسا علم حاصل کرسکتے ہیں اور ایسی عادتوں کے حامل بن سکتے ہیں، جو انھیں اپنی ضرورت اور استفادے سے بدرجہا زیادہ سامان پیدا کرنے کے قابل بنا سکتی ہیں . . . .
>
> "جب مسٹر ملتھس کہتا ہے کہ دنیا کی آبادی پیداوار سے برابر تطابق قائم کرتی جاتی ہے تو وہ درست کہتا ہے، لیکن اس نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ایک سمجھ سوچ والی اور جفاکش قوم اس خطّے سے بہت زیادہ جنسیں پیدا کرسکتی ہے۔ اس کے برعکس جاہل اور غیر مہذب قوم اتنی جنسیں پیدا نہیں کرسکتی۔
>
> "انسان کو خوراک پیدا کرنے کے بارے میں اپنی قوّت کی حدود کا علم نہیں۔ دیکھیے، خود ان جزیروں میں (انگلستان، سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ) یہ قوّت کتنی بڑھ گئی ہے، حالانکہ

یہ علم ابھی حالتِ طفلی میں ہے۔"[1]

اووِن کو زیادہ تر رجائیت فلسفیوں سے میراث میں ملی تھی۔ ساتھ ہی ان کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اس نے پائیں۔ بحیثیت سرمایہ دار کی حیثیت میں اس نے بڑی کامیابی حاصل کی، مگر بہت کم کاروباری آدمیوں نے اس کی پیروی ضروری سمجھی۔ اس سے وہ مایوس ضرور ہوا، مگر دل شکستہ نہ ہوا۔ اس نے بھی نیولنارک کے لیے ایک مثالی منصوبہ بنایا، جو فوریا کے منصوبے سے ملتا جلتا تھا اور چند مالدار حامی بھی اسے مل گئے، جن میں سے ایک رکارڈو تھا۔ اس نے اپنے مثالی منصوبے کا نام متوازی الاضلاع شکل رکھا، کیونکہ عمارتیں متوازی الاضلاع ہی بنانے کی تجویز تھی۔ تجویز یہ تھی کہ اس تنظیم میں لوگ رضاکارانہ داخل ہوں۔ ہر جزو کا دائرہ محدود رکھا جائے۔ کاشتکاری اور صنعت کے درمیان توازن رہے اور بعض اہم معاملات کے بارے میں اووِن کی رائے ترک کی تھی، مثلاً شادی اور کنبہ۔

۱۸۲۰ء کے بعد اووِن نے نیوہارمونی (انڈیانا) میں اپنی مثالی سکیم قائم کرنے کے لیے روپیہ لگایا، لیکن کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کام میں وہ مالی اعتبار سے تباہ ہوگیا۔ ساتھ ہی اس کے جوش وخروش پر اوس پڑ گئی۔ باقی عمر اس نے عمرانی اصلاحات کے منصوبوں کی تائید یا ان کے متعلق کتابیں لکھنے کے مفید کام میں گزار دی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ تمام مزدوروں کو ایک بڑی یونین بنا لینی چاہیے —— یہ تجربہ کیا گیا، مگر ناکامی ہوئی —— اس کی خواہش یہ بھی تھی کہ مزدور تعاونی اصول پر صارفین کی انجمنیں بنا کر خرچ گھٹا لیں۔ یہ تجربہ کامیاب ہوا، لیکن جنسی آزادی کی وکالت کے سلسلے میں، نیز قائم شدہ مذہب پر والٹیئر کے انداز میں حملوں کے باعث بہت سے معاصرین کو اس نے ناراض کر دیا۔ آخری عمر میں احضار ارواح سے اسے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی۔

ابتدائی دور کے مثالیوں کا جائزہ

اووِن اور فوریا کو اپنے وطنوں ہی میں نہیں، ریاستہائے متحدہ میں بھی بہت سے پیرو مل گئے۔ ریاست ہائے متحدہ کے اندر مختلف فرقے جماعتی زندگی بسر کرنے میں مصروف تھے۔ امریکہ میں فوریا کے جتنے پیرو تھے، ان میں بہت سے اہلِ علم بھی شامل تھے۔ انھیں میں ایک مجاہد ایڈیٹر ہاریس گریلے[2] اور ایک شاعر جان گرین لیف وہیٹئر[3] بھی شامل تھے۔ انھوں نے تیس سے زیادہ کوششیں مختلف مرکز قائم کرنے کے لیے کیں۔ ان میں سے دو کوششیں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ایک برک فارم[4] (نزد بوسٹن) ہیں، دوسری فلینکس[5] (نیوجرسی) میں۔ امریکہ میں نیوہارمونی[6] کے علاوہ بھی اووِن کے پیروؤں نے کم وبیش نصف درجن تجربے کیے، مگر نیوہارمونی کی طرح اکثر کوششیں یا تو کامیاب ہی نہ ہوئیں، یا زیادہ دیر تک ان پر عمل نہ کیا جا سکا اور جو چند کوششیں کامیاب ہوئیں، یعنی اووِن کے اصول پر آبادیاں قائم ہوگئیں، وہ بھی کچھ مدت بعد عام طور طریقوں پر رجوع کر آئیں، یعنی انفرادی فوائد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور خانہ داری کا عام طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ اووِن اور فوریا دونوں کی رائے تھی کہ لوگ خود بخود ان کے پیش کردہ نمونوں کے مطابق آبادیاں قائم کرتے جائیں گے، پھر ان کی تقلید ہر جگہ

۱۔ رابرٹ اووِن کی کتاب "معاشرے کا نیا نظریہ" ص ۱۷۴-۱۷۵۔
۲۔ Horace Greeley
۳۔ JOHN GREENLEAF WHITTIER
۴۔ BROOK FARM
۵۔ PHALANX
۶۔ NEW HARMONY

ہو گی، اس طرح معاشرہ نئے اصول پر منظم ہو جائے گا۔ سینٹ سائیمن کو بھی مثال کی قوت پر پورا اعتماد تھا اور وہ بھی تنظیم پر زیادہ زور دیتا تھا۔ بہ ظاہر اس نے گورنمنٹ کے ذمّے زیادہ بڑا کردار عائد کیا تھا۔ فرانس میں سینٹ سائیمن کے ابتدائی پیروؤں نے عمرانی مسیحیت قائم کرنے کی کوشش کی جس میں حضرت مسیحؑ کی تعلیمات پیش نظر رکھی گئیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک عجیب و غریب مذہبی فرقہ بنالیا۔ آگے چل کر سینٹ سائیمن کے بعض پیروؤں نے عملی تنظیم کے نمایاں پہلو حاصل کر لیے۔ انھیں میں ایک فرڈینینڈ ڈی لیسپسؔ[1] بھی تھا، جس نے نہر سویز کھدوائی، لیکن تنظیم کی سفارش حکومت کے لیے وسیع تر پیمانے پر کرنا سینٹ سائیمن کے ایک اور پیرو لوئی بلینک کے لیے مقدر تھا۔

لوئی بلینک (۱۸۱۳ء۔ ۱۸۸۲ء) جولائی کی بادشاہی کے سرمایہ پرستانہ مسلک کا بے پناہ نقاد تھا۔ اس نے وہ منصوبہ سوچا، جس نے ۱۸۴۸ء کے انقلاب پیرس میں متنازعہ فیہ کارگاہ قائم کرنے میں ہاتھ بٹایا۔ اس نے پہلے اپنا منصوبہ ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جس کا نام تھا "مزدوروں کی تنظیم"[2] (۱۸۳۹ء)۔ وہ لکھتا ہے: "پرولتاریوں کو جس شے کی ضرورت ہے، وہ مزدوروں کے اوزار ہیں۔ یہ حکومت کا وظیفہ ہے کہ ان کا انتظام کرے۔ اگر ہمیں مملکت کے متعلق اپنا تصور پیش کرنے کا موقع ملے تو ہمارا جواب ہو گا کہ مملکت غریبوں کی بینکر[3] ہے۔ حکومت ہی وہ چیزیں خریدنے کے لیے روپیہ دے سکتی ہے۔ جو سامان بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ وہی نگرانی کر سکتی ہے۔ وہی عمرانی کارگاہ بنا سکتی ہے۔ طبعاً ایسی حکومت جمہوری ہونی چاہیے۔ جب کارگاہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو حکومت اس کی اعانت و نگرانی سے دستکش ہو سکتی ہے۔ جیسے جیسے فرانس میں کارگاہیں پھیلتی جائیں گی، نجی کاروبار کی جگہ اشتراکی کاروبار لیتا جائے گا۔ منافعے ختم ہو جائیں گے اور معاشرے میں ایک طبقہ باقی رہ جائے گا یعنی کارکنوں کا طبقہ۔ تمام مزدوروں کو یکساں تنخواہ ملے گی۔ جس مساوات کا وعدہ ۱۷۸۹ء میں کیا گیا تھا، وہ آخر ایک حقیقت بن جائے گی۔

لوئی بلینک کی اشتراکیت کا بیشتر حصہ رسمی اعتبار سے مثالی ہے۔ مثلاً وہ بھی اجتماعی زندگی کے انتظام میں مزدوروں کی رضاکارانہ شرکت پر اعتماد رکھتا تھا۔ اس کے منصوبے میں حقیقی نئی چیز وہ کردار ہے، جو مملکت کے ذمّے لگایا گیا، اگرچہ اس کی مدت کتنی ہی مختصر ہو۔ بلینک کے ساتھ ہی اشتراکیت نے نجی "رفاہ عام" کے دائرے سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔

---

[1] FERDINAND DE LESSEPE

[2] THE ORGANISATION OF LABOUR

[3] ۱۸۴۸ء کا انقلاب فرانس مصنفہ جے۔ آر۔ میریٹ (MARRIOTT)

چھبیسواں باب

اشتراکی تدبیریں

(۲)

کارل مارکس

تمہید کارل مارکس (۱۸۱۸ء-۱۸۸۳ء) جسے سرخ پیشوائی کا لقب ملا، کے ساتھ اشتراکیت نے انتہائی شکل اختیار کرلی، جسے انقلابی کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دور کے اشتراکیوں کو امید تھی کہ حالات تدریجاً پُرامن طریق پر ارتقاء پاتے ہوئے مثالیت کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ کارل مارکس نے ایک عوامی اور پُر تشدد پرولتائی انقلاب کی پیشگوئی کی۔ اشتراکیوں نے بڑی حد تک حکومتوں پر بے اعتمادی ظاہر کی تھی۔ مارکس نے مزدوروں کو پُرزور دعوت دی کہ حکومتوں پر قبضہ کرلیں اور ان کے ذریعے سے پرولتاریوں کی بہبود کا انتظام کریں۔ تمام اشتراکیوں میں سے کارل مارکس کو اپنے اصول کا کامل اذعان تھا اور اپنے متعلق بھی اسے پورا یقین تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ تنہا اسے تمام جوابات کا علم ہے اور انسانیت کا مستقبل ناگزیر طریق پر اسی طرح نشوونما پائے گا، جس کا نمونہ اس نے تاریخ میں سے تلاش کیا۔

بنیادی اصول مارکس نے تاریخ کے نمونے پر تین قانون قائم کیے، اوّل "اقتصادی جبر"[۱]۔ اسے یقین تھا کہ اقتصادی حالات ہی کی بناء پر زیادہ تر انسانی اداروں — معاشرے، حکومت اور فنون — کا فیصلہ ہوتا ہے۔ دوم طبقاتی کش مکش[۲]۔ مارکس کو یقین تھا کہ تاریخ ایک جدلی عملیہ ہے، یعنی حریف اقتصادی گروہوں — "داروں" (جن کے پاس ہے) اور "ناداروں" (جن کے پاس کچھ نہیں) — کے درمیان کشمکشوں کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ سوم کمیونزم کی ناگزیری[۳]۔ مارکس کو یقین تھا کہ طبقاتی کشمکش سے ایک بہت بڑا طوفانی انقلاب پیدا ہوگا، جس سے پرولتاری ہمیشہ کے لیے مفتوح سرمایہ داروں پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔

مارکسی فلسفۂ تاریخ نے بیشتر پرانے دبستان ہائے فکر سے مختلف چیزیں حاصل کی تھیں۔ خود مارکس انیسویں صدی میں پیدا ہوا، اور اسی میں مرگیا، تاہم اس کا روحانی تعلق جزوًا اٹھارھویں صدی سے تھا۔ اس کا دادا اور پردادا دونوں یہودی ربی تھے، مگر اس کا

---

[۱] ECONOMIC DETERMINISM [۲] CLASS STRUGGLE [۳] INEVITABILITY OF COMMUNISM

باپ خدا پر عقیدہ رکھتا تھا، اگرچہ متشکک تھا۔ اس نے مارکس کو دورِ تنویر کی عقلیت کے مطابق تربیت دی۔ اس نے فطری قانون کے متعلق ایسا اعتقاد حاصل کر لیا، جو فلسفیوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ اس کے نزدیک فطری قوانین پر عقیدے کا مطلب یہ تھا کہ اقتصادی جبر اور طبقاتی کشمکش پر یقین رکھا جائے۔ اسی بناء پر مارکس اور اس کے شاگرد ہمیشہ فخریہ کہتے رہے کہ صرف ہماری اشتراکیت سائنٹیفک ہے، باقی رہے مثالی ان کی اشتراکیت خوابیدہ اور غیر حقیقی اصول پر مبنی ہے۔

ہیگل کے فلسفے نے مارکسیت کے لیے ذہنی استواری کا سامان فراہم کیا۔ اگرچہ ہیگل ۱۸۳۱ء میں وفات پا چکا تھا، مگر اس کا اثر برلین یونیورسٹی میں اس وقت تک قائم تھا جب مارکس نے وہاں تعلیم حاصل کی (۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۱ء)۔ مارکس نے ہیگل کی جدلیت کو طبقاتی کشمکش کی شکل میں ڈھال لیا۔ اس نے سرمایہ داروں کو تھیسس اور پرولتاریوں کو اینٹی تھیسس قرار دیا۔ اس میں ترکیب یوں پیدا ہو سکتی تھی کہ کمیونسٹ انقلاب برپا ہو اور ایک ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آجائے جس میں کوئی طبقاتی امتیاز نہ ہو۔ عمر کے آخری دور میں مارکس نے ہیگل سے اپنے تعلق کی کیفیت واضح کرتے ہوئے کہا:

> "میرا جدلی قاعدہ نہ محض ہیگل سے مختلف ہے، بلکہ اس کے سراسر خلاف ہے۔ ہیگل کے نزدیک انسانی دماغ کا "عملیۂ حیات ...... جسے وہ "فکر" قرار دیتا ہے، ایک مستقل موضوع ہے۔ یہی اس کے نزدیک حقیقی دنیا کا آفریدگار ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی دنیا فکر کی ظاہری اور خارجی شکل کا نام ہے۔ اس کے برعکس میرے نزدیک "فکر" مادی دنیا کے سوا کچھ نہیں، جو انسانی قلب کے ذریعے سے منعکس ہوتی ہے اور "فکر" کی مختلف شکلوں میں ڈھلتی ہے۔"[1]

مگر مارکس نے یہ اعلان بھی کیا:

> "جدلیت نے ہیگل کے ہاتھوں ایک حد تک ابہام کی شکل اختیار کی۔ بہ ایں ہمہ وہی پہلا شخص ہے، جس نے اس کے عمل کو جامع اور خود آگاہانہ طریق پر پیش کیا۔ اس کے ہاں یہ چیز سر کے بل کھڑی ہے۔ اگر آپ کو اس پُراسرار قشر کے اندر معقول مغز مل جائے تو آپ اسے پاؤں کے بل کھڑا کر سکتے ہیں۔"[2]

مارکس نے تیس سال کی عمر تک اپنی سائنٹیفک انقلابی اشتراکیت کے نظریے کا سرسری خاکہ مکمل کر لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے وطن جرمنی سے ہمیشہ کے لیے جلا وطن ہو چکا تھا۔ برلین کی یونیورسٹی سے نکل کر وہ کولون (پروشیائی رھائن لینڈ) کے ایک اخبار میں کام کرتا رہا۔ جب اس کے ایک دہریانہ مقالے نے اربابِ اختیار کو اس کے مخالف بنا دیا تو ۱۸۴۳ء میں وہ پیرس چلا گیا۔ وہاں لوئی فلپ کی حکومت سرمایہ داروں کے حلاف اس کے پروپیگنڈے سے خوف زدہ تھی۔ چنانچہ اُسے پھر نکلنا پڑا اور ۱۸۴۵ء میں برسلز پہنچ گیا۔ وہ جہاں گیا، وسیع پیمانے

---

[1] مارکس کی کتاب CAPITAL (سرمایہ) کے دوسرے ایڈیشن کی تمہید ص ۲۵ + [2] ایضاً ایضاً۔

برگزشتہ ماہرینِ اقتصادیات کا مطالعہ کرتا رہا اور اپنی نسل کے اشتراکیوں، نیز دوسرے انتہا پسندوں سے اس کی طویل گفتگوئیں جاری رہیں۔ مارکس نے جو کچھ پڑھا اور جس جس سے ملاقات کی، اسے یقین ہو گیا کہ سرمایہ دارانہ نظام غیر منصفانہ اور فرسودہ ہے اور اس کے لیے سقوط ناگزیر ہے۔ ایڈم سمتھ نے مزدور کا نظریۂ قیمت پیش کیا تھا: اس سے کارل مارکس نے یہ نظریہ نکالا کہ ہر جنس کی فروخت سے جو نفع حاصل ہو، وہ مزدور کو ملنا چاہیے، کیونکہ جنس کی قیمت پیدا کرنے والے کی محنت کے مطابق متعیّن ہوتی ہے۔ اُجرتوں کے آہنی قانون سے مارکس کے اس عقیدے کی توثیق ہو گئی کہ سرمایہ دار کبھی مزدوروں کو ان کا جائز معاوضہ لینے نہ دیں گے۔ دوسرے ماہرینِ اقتصادیات کی تصانیف کے مطالعے اور انیسویں صدی کے پانچویں عشرے کے اواخر میں جو کساد پیدا ہُوا تھا، اس کے مشاہدے سے کارل مارکس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اقتصادی بحران اس نظام کے تحت بار بار پیش آتے رہیں گے، جس نے مزدوروں کو بہت کم خرچ کرنے اور سرمایہ داروں کو بہت زیادہ پیدا کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔

اس اثناء میں کارل مارکس کا طویل گہرا علاقہ اور اشتراک، فریڈرک اینجلز[1] (۱۸۲۰ء تا ۱۸۹۵ء) سے شروع ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان مختلف صورتوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ مارکس غریب اور جھگڑالو تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد بہت کم تھی، البتّہ اسے اپنی بیوی اور بچّوں سے بڑی محبت تھی۔ اس کا پورا وقت اقتصادیات کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ اس کے برعکس اینجلز ایک دولتمند کارخانہ دار کا بیٹا تھا اور خاندان نے جو کاروبار لورپول اور مانچسٹر میں شروع کر رکھا تھا، اس کی نگرانی کرتا تھا۔ اسے کھیلوں، عورتوں اور اعلیٰ زندگی سے محبت تھی۔ ساتھ ہی وہ صنعتکاری میں بے انصافیوں سے متنفّر تھا۔ جب وہ مارکس سے ملا تو اپنی نہایت تلخ تصنیف مکمّل کر چکا تھا۔ جس کا نام تھا "انگلستان میں مزدوروں کی حالت"[2]۔ اینجلز اور مارکس دونوں نے کمیونسٹ لیگ میں دلچسپی لی۔ یہ انتہا پسند مزدوروں کی ایک چھوٹی سی بین الاقوامی تنظیم تھی۔ ۱۸۴۷ء میں کمیونسٹ لیگ کے مرکز لندن نے درخواست کی کہ ایک پروگرام تیار کر دیا جائے۔ اینجلز نے اس کا پہلا مسوّدہ تیار کیا۔ مارکس نے اوّل سے آخر تک اس پر نظرِ ثانی کی۔ اس محنت کا نتیجہ کمیونسٹ پارٹی کا وہ منشور[3] تھا، جو جنوری ۱۸۴۸ء میں شائع ہُوا۔

کمیونسٹ منشور

آج اس منشور کی ابتدائی اشاعت پر ایک سو سال سے زیادہ مدّت گزر چکی ہے، لیکن یہ اب بھی مارکسی اشتراکیت کے متعلق ایک کلاسیکی بیان سمجھا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اس ڈرامائی اعلان سے ہوتا ہے کہ یورپ کی فضا میں ایک کابوس منڈلا رہا ہے۔ یہ کمیونزم کا کابوس ہے۔ اس کا اختتام اس انتہائی پُر اعتماد اپیل پر ہوتا ہے:

> "کمیونسٹ انقلاب پر تمام حکمران طبقوں کو لرزنے دو۔ پرولتاریوں کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ہوگا تو محض یہ کہ ان کی زنجیریں کٹ جائیں گی اور تسخیر کے لیے دنیا ان کے سامنے ہے۔ تمام ملکوں کے مزدورو! متحد ہو جاؤ۔"

ح ۱ FRIEDRICH ENGELS

ح ۲ The Condition of the working class in England

ح ۳ THE MANIFESTO OF THE COMMUNIST PARTY

منشور کے صفحات چند درجن تھے۔ مارکس اور اینجلز نے انھی میں اپنے نظریے کے بڑے بڑے خطّ وخال جمع کر دیے: "جو معاشرہ اب تک قائم رہا، اس کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔" بدلتے ہُوئے اقتصادی حالات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کش مکش پے در پے آزاد و غلام، امیر و عوام، آقا و محکوم، بڑے تاجر اور پھیری والے کے درمیان جاری رہے گی۔ پہلے گلڈوں کا نظام جاری تھا، پھر چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کی بڑی تعداد نے صنعتی کاروبار شروع کیا۔ آخر ان کی جگہ بڑے بڑے صنعتکاروں نے لے لی۔

موجودہ دَور کی صنعت فرینکنسٹائن[1] کی وضع کا ایک عفریت ہے، جو سرمایہ داروں کے معاشرے کو لازماً تباہ کر ڈالے گا۔ اس صنعت نے اتنا سامان پیدا کر لیا، جسے یہ فروخت نہیں کر سکتی تھی۔ اس وجہ سے اقتصادی دباؤ بڑھتا گیا۔ سرمایہ داروں کا حلقہ تنگ تر ہوتا گیا۔ چند افراد نے زیادہ دولت سمیٹ لی۔ اکثر آدمی ملکیت سے محروم ہو کر پرولتار کے درجے تک پہنچ گئے۔ اس طرح عمرانی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ دباؤ اس درجے پر پہنچ رہے ہیں، جہاں انقلابی دھما کا پیدا ہوتا ہے، یعنی نجّی جائداد پر ایک بے پناہ حملہ ہوگا۔ زمینداری منسوخ کر دی جائے گی۔ دوسری جائدادیں بھی بھاری انکم ٹیکس لگا کر آہستہ آہستہ ختم کر دی جائیں گی اور حق وراثت سے انکار کر دیا جائے گا۔ آخر عمرانی طبقے ختم ہو جائیں گے، ساتھ ہی تناؤ ناپید ہو جائے گا۔ پھر ایک ایسا ارتباط وجود میں آ جائے گا، جس میں ہر ایک کو آزادانہ نشو و ارتقاء کا موقع حاصل ہوگا، مگر وہ سب کا آزادانہ نشو و ارتقاء ہوگا۔

ہر فرد کا نشو و ارتقاء سب کے آزادانہ نشو و ارتقاء کی شرط ہے۔ منشور میں اس معاشرے کا ایک مبہم نقشہ پیش کیا گیا، جو انقلاب کے بعد رونما ہوگا۔ مارکس نے سیاسی اقتدار کی توضیح کرتے ہُوئے کہا تھا کہ یہ ایک طبقے کا منظّم اقتدار ہوگا، جو دوسرے طبقات کو ختم کر دے گا۔ بہ ظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ طبقات سے پاک نظام کی تخلیق کے بعد مملکت ناپید ہو جائے گی۔ اس نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ تاریخ کے بہت بڑے جدلی عملیّے سے جو بے طبقہ معاشرہ پیدا ہوگا، وہی نشو و ارتقاء کی آخری ہیئت ترکیبی ہوگی۔ ساتھ ہی اس عملیّے کی کارفرمائی روایتی شکل میں ختم ہو جائے گی اور یہ فنون اور فلسفے کے دائروں میں کارفرما ہو جائے گا، لیکن منشور کے قاری سوال کر سکتے ہیں کہ آیا اس عملیے کی تبدیل ہیئت ممکن ہے؟ کیا یہ نہ ہوگا کہ جدلیّت کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اقتصادی اور سیاسی تھیسس اور اینٹی تھیسس برابر پیدا ہوتے جائیں گے؟ کیا مملکت ہمیشہ قائم نہ رہے گی؟ ان سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب مارکس نے نہیں دیا، صرف یہ کہتا رہا کہ کسی نہ کسی طرح سرمایہ داری کے اختتام سے انسانی تاریخ کا رخ سراسر بدل جائے گا اور نسلِ انسانی درجۂ تکمیل پر پہنچ جائے گی۔

یقیناً مارکس نے انسانوں کے غیر مادی فوائد و عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کو نہایت سادہ انداز میں

---

[1] FRANKENSTIEN ، ایک طالب علم نے انسان کے مختلف اجزاء مختلف مقامات سے چُن چُن کر انھیں جوڑ دیا اور ایک خوفناک وجود تیار ہو گیا اور برقی رَو سے اسے زندہ کر لیا گیا۔ وہ بیچارہ ہمدردی کا متمنّی تھا، مگر سب اس سے دور بھاگتے تھے۔ پھر اس میں ایسی نفرت بھر گئی کہ اس نے ہر چیز تباہ کر ڈالی اور خود بھی تباہ ہو گیا۔ ایسا ہی عفریت وہ تھا، جو بوڑھے معاشرے نے پیدا کیا۔

پیش کر دیا۔ کمیونسٹ منشور کی اشاعت کے بعد ایک سو سال کی تاریخ نے آشکارا کر دیا ہے کہ پرولتار یا بورژوا ویسے سادہ اقتصادی وجود نہیں، جیسا کارل مارکس نے انھیں سمجھ لیا تھا۔ مزدوروں نے بھی بعض اوقات ایسا طریقہ اختیار کر لیا، جو مارکس کے بیان کردہ طریق کے لیے یقیناً باعثِ ہتک تھا۔ ان کی ذہنیت اور نقطۂ نگاہ بھی ویسا ہی ہو گیا، جیسا بورژوا کا سمجھا جاتا رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام امریکی اپنے آپ کو طبقۂ اوسط کے افراد سمجھتے ہیں۔ سرمایہ داروں نے بھی کارخانوں کے نظام کی بدترین خصوصیتیں ختم کر کے اپنی حالت سدھار لی ہے۔ ملتھس کی طرح مارکس کو بھی معیارِ معیشت میں اس نمایاں ترقی کا کوئی اندازہ نہ تھا، جو انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط تک پیش آنے والی تھی۔

مارکس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ قومیت کی بڑھتی ہوئی قوت کا مشاہدہ نہ کر سکا۔ منشور میں پورے اعتماد کے ساتھ امید ظاہر کی گئی تھی کہ طبقاتی کشمکش قومی حدود پر فوقیت لے جائے گی۔ عمرانی اور اقتصادی جنگ میں قومیں قوموں کے خلاف یا مملکتیں مملکتوں کے خلاف صف آرا نہ ہوں گی۔ ہر مقام کے پرولتار بورژوا سے لڑیں گے۔ مارکس نے کہا تھا، مزدوروں کا کوئی ملک نہیں۔ قومی اختلافات اور عداوتیں روز بروز محو ہو رہی ہیں۔ مارکس کی زندگی میں بھی قومی اختلافات اور عداوتیں روز بروز بڑھ رہی تھیں۔ منشور کی اشاعت سے چند ماہ بعد ۱۸۴۸ء کے انقلابات میں اطالویوں اور آسٹریوں، آسٹریوں اور ہنگریوں، ہنگریوں اور سلافوں، سلافیوں اور جرمنوں کے درمیان عداوتیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ قومیت نے صرف بورژوا کو نہیں، بلکہ مزدوروں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ وہ بھی روز افزوں جوش کے ساتھ اس قومی جذباتی اپیل سے متاثر ہو رہے تھے۔

اس طرح کمیونسٹ منشور نے مارکسی اشتراکیت کے تاریک پہلو واضح کر دیے۔ کمیونسٹ تحریک کی بعد کی تاریخ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ قومیت کی اہمیت کا صحیح اندازہ عموماً نہ کیا گیا اور انسانی فطرت کو اقتصادی جبر کے سخت سانچے میں بند کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ساتھ ہی یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ یہ منشور ان نصف درجن تحریروں میں سے ایک تھا، جو عالمِ انسانیت کی پوری تاریخ میں حد درجہ مؤثر ثابت ہوئیں۔ جس طرح اس میں بین الاقوامی کمیونزم کی کمزوریاں قبل از وقت ظاہر ہو گئیں، اسی طرح اس کی قوت کے چہرے سے بھی پردہ اٹھ گیا۔

اوّل اس منشور سے کمیونسٹ پروپیگنڈے کی نمایاں حیثیت آشکارا ہوئی۔ اسی منشور نے سب سے پہلے وہ مؤثر اور دلچسپ جملے مہیّا کیے، جو کمیونسٹ تحریک کے عام جملے ہیں، یعنی بورژوا کے اخلاق، قانون، املاک پر طنز، یورپ کی فضا میں منڈلانے والے کابوس کی طرف ڈرامائی اشارے اور پرولتاریوں کا یہ کہنا کہ ان کی زنجیریں کٹ جانے کے سوا کوئی نقصان نہ ہو گا۔

دوم منشور نے پرولتاری انقلاب پیدا کرنے کی غرض سے پارٹی کے کردار پر آگے چل کر خاص زور دیا۔ مارکس نے ۱۸۴۸ء میں اعلان کیا کہ کمیونسٹ نیزے کی انی ہیں، "ہر ملک کے مزدوروں کی جماعتوں میں سب سے آگے بڑھے ہوئے ہیں جس حد تک نظریے کا تعلق ہے، انھیں عام پرولتاری گروہوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ خطِ اقدام، احوال و ظروف اور پرولتاری تحریک کے عام نتائج سے ٹھیک ٹھیک آگاہ ہیں۔

سوم منشور نے اس کردار کا بھی پورا اندازہ کر لیا، جو انقلاب میں مملکت ادا کرنے والی تھی۔ مارکس نے جس بات پر زور دیا، وہ یہ تھی کہ اقتدار و اختیار کی مرکزیت مملکت کے ہاتھوں میں رہنی چاہیے۔ تمام کارخانوں اور وسائلِ پیداوار کی توسیع مملکت کی ملکیت میں رہے۔ یوں منشور نے مبہم، ساتھ ہی غیر مشتبہ طریق پر سوویٹ یونین کی مطلق العنان مملکت کا نقشہ تیار کر دیا، جس کی باگ ڈور ایک فریق کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہ تھی۔ سب سے آخر میں اس منشور نے کمیونزم اور اشتراکیت کی دوسری شکلوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر دی۔ مارکس کی اذعانیت، اس کے فلسفۂ تاریخ، ہمہ گیر، بے پناہ اور متشددانہ انقلاب کی ضرورت پر اس کا عقیدہ، یہ تمام چیزیں اسے اشتراکیت کی دوسری قسموں سے بالکل الگ کر دیتی ہیں۔ مارکس سمجھتا تھا کہ ایک مذہبی پیغمبر کی طرح اس پر کائنات اور اس کی معنویت کا پورا انکشاف ہو چکا ہے۔ اسے امید تھی کہ جو کتاب اس نے پیش کی ہے، وہ تمام دوسری کتابوں کا استیصال کر دے گی۔ مثالی اشتراکیوں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور انھیں قابلِ رحم سمجھتا تھا۔ اس نے لکھا کہ یہ لوگ ویسے ہی بے اثر اور بے حقیقت ہیں، جیسے خیراتی کاموں کی تنظیم کرنے والے لوگ یا انسدادِ بے رحمی حیوانات کی انجمنوں کے ممبر یا ٹیمپرنس سوسائٹیوں کے ارکان وغیرہ۔ ان کے منصوبے چھوٹے چھوٹے تجربے ہیں، جن کا ناکام ہونا ناگزیر ہے۔ وہ ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور نئے یروشلم کے پاکٹ ایڈیشن ہیں۔

مارکس کی بقیہ زندگی

عمر نے نہ مارکس میں ملایمت پیدا کی، نہ اس کے نظریات میں کوئی بڑا تغیر ہوا۔ ۱۸۴۹ء سے اپنی موت (۱۸۸۳ء) تک وہ لندن میں رہا۔ وہاں اس کی اپنی مالی بدنظمی کے باعث اس کے کنبے کو سخت پریشان حالی سے سابقہ پڑا اور وہ لوگ سوہو[1] کے غلیظ ماحول میں پرولتاری زندگی بسر کرتے رہے۔ افلاس اور انتہائی احتیاج کے باعث جو فاقہ کشی کے قریب پہنچی ہوئی تھی، اس کے تین بچے وفات پا گئے۔ آخر مارکس کے لیے اس کی اپنی تصانیف اور اینجلز کی فیاضی کی بدولت متوسط درجے کی آمدنی کا انتظام ہو گیا۔

مارکس مسلسل مطالعے اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔ اس نے بہت سے رسالے لکھے، جن میں سب سے بڑھ کر شہرت اس رسالے نے پائی، جو لوئی نپولین کے متعلق تھا اور جس کا نام تھا: "لوئی نپولین کی اٹھارھویں برومیئر"[2]۔ اس میں دوسری فرانسیسی جمہوریت کے اسبابِ سقوط کی چھان بین کی گئی تھی۔ اس جمہوریت کی عمر بہت کم تھی۔ چھٹے عشرے میں وہ برطانوی سیاسیات اور بین الاقوامی حالات کے متعلق ہارس گریلے کے انتہا پسند اخبار "دی نیویارک ٹریبیون" کے لیے ہفتہ وار مقالے لکھتا رہا۔ اس اثنا میں اس نے اپنا پورا وقت برٹش میوزیم میں گزارا اور پارلیمنٹوں کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی رپورٹیں پڑھتا رہا۔ انھیں رپورٹوں سے اس نے

---

[1] SOHO لندن کا ایک حصہ۔

[2] The Eighteenth Brumaire of Louis Napoleon لوئی نپولین، نپولین بوناپارٹ کا بھتیجا تھا، جو پہلے جمہوریۂ فرانس کا صدر بنا، پھر حالات سے فائدہ اٹھا کر ۹۔ اور ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء کو اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دوسری فرانسیسی جمہوریت ختم ہو گئی، جو لوئی فلپ کے فرار پر قائم ہوئی تھی۔

کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں کے حالات کے متعلق بے شمار تفصیلات فراہم کیں اور اس کی مشہور اقتصادی تصنیف "سرمایہ"[1] کے لیے مسالہ فراہم ہوا۔ سرمایہ داری کے اس ضخیم تجربے کی پہلی جلد ۱۸۶۷ء میں چھپی۔ مزید دو جلدیں اس کے فراہم کردہ نوٹوں کا انبار سامنے رکھ کر اس کی موت کے بعد مرتب کی گئیں۔

"سرمایہ" میں مارکس نے کمیونسٹ منشور کے اصول کی پوری توضیح کر دی مگر ان پر نظرِ ثانی نہ کی۔ مثلاً اس نے مزدوروں کے متعلق اپنا نظریۂ قیمت پیش کر دیا۔ مارکس کے نزدیک مزدور ہی جنس کی پوری قیمت کی تخلیق کا ذمہ دار تھا، تاہم اسے اجرت کی شکل میں اس قیمت کا صرف ایک حصہ ملا جس پر وہ چیز فروخت کی گئی۔ قیمت فروخت اور اجرتِ مزدور کا فرق مارکس کے نزدیک زائد سرمایہ تھا۔ زائد سرمایے یا قیمت کے متعلق مارکس کے اس مشہور نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ اصل چیز مزدور نے پیدا کی۔ سرمایہ داروں نے اس پر قبضہ کر لیا اور اسے منافع کا نام دے دیا۔

"سرمایہ" میں اسی طرح زائد قیمت کی بحث چلی جا رہی ہے، یہاں تک کہ وہ سرمایے کی بربادی کا باعث بن جاتی ہے۔ مارکس کہتا ہے سرمایہ داری کی فطرت ہی یہ ہے کہ مزدوروں کی جگہ مشینوں سے کام لے کر اپنا نفع کم کرے اور زائد قیمت کا سرچشمہ بند کر دے۔ اسی طرح ضرورت سے زیادہ پیداوار اور خرید کی کمی بحرانی کیفیت لائے گی، جس کی پیشگوئی منشور میں کی گئی تھی۔ "سرمایہ" کی جلد اول کے اختتام پر ایک عبارت ہے، جس میں مارکس نے سرمایہ داری کا مقابلہ ایک ایسی کھال، جلد یا قشر سے کیا ہے، جس کے اندر دباؤ بڑھتا جائے، ایک روز یہ اندرونی دباؤ ناقابل برداشت ہو جائیں گے۔

"کھال پھٹ جائے گی۔ سرمایہ داروں کی نجی املاک کی موت کا گھڑیال بج جائے گا۔ دوسروں کے مال پر دست درازی کرنے والے خود دست درازی کا نشانہ بن جائیں گے۔"[2]

"سرمایہ" کی پہلی جلد چھپنے سے تین سال پیشتر یعنی ۱۸۶۴ء میں مارکس مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی انجمن قائم کرنے میں شریک ہوا۔ یہ بہت بڑی کوشش تھی کہ ہر ملک اور ہر قسم کے انتہا پسند مزدوروں کو منظم کیا جائے۔ لیکن یہ پہلی بین الاقوامی انجمن ٹریڈ یونینوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق تھا۔ کوئی متحد سیاسی پارٹی نہ تھی۔ پھر اس میں اضمحلال کا عمل شروع ہو گیا اور ۱۸۷۶ء میں اس نے دم توڑ دیا۔ دشمن حکومتوں کی بڑھتی ہوئی سختیوں، اور تعزیروں نے اس کی بربادی میں خاصی امداد کی، لیکن داخلی جھگڑے بھی تباہی کا موجب تھے، جو لیڈروں اور عام ممبروں میں بار بار ہوتے رہتے تھے۔ مارکس نے خود اختلاف کر کے ناروا داری کی مثال پیش کی۔ نیز یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ وہ عملی سیاسیات کی کسی صلاحیت سے بہرہ مند نہیں۔

۱۸۸۹ء میں دوسری بین الاقوامی انجمن منظم کی گئی جو پہلی جنگ عظیم اور روس میں بالشویکوں کے انقلاب تک قائم رہی۔ یہ دوسری بین الاقوامی انجمن پہلی کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریق پر منظم کی گئی تھی اور زیادہ سیاسی تھی۔ اس میں مارکسی اشتراکی

---

[1] Das Kapital یعنی سرمایہ۔ یہ کتاب کا جرمن نام ہے۔ [2] "سرمایہ" ص ۸۳۷

پارٹیوں کی نمائندگی تھی، جو براعظم یورپ کے بڑے بڑے ملکوں کی سیاسی زندگی میں اہم قوتیں بن رہی تھیں، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ اس کے لیڈروں میں ایسے آدمی شامل تھے، جو سیاسی معاملات میں مارکس سے بدرجہا زیادہ ماہر تھے، لیکن پرانے حزبی رجحانات اس تنظیم کو کمزور کرتے رہے۔ بعض لیڈروں نے اس پر اصرار کیا کہ جو قوانین آقاؤں کی طرف سے ہمیں ملے ہیں، ان سے اشتراکی اور بورژوا سیاسی فریقوں کے درمیان تعاون ممنوع ہے۔ یہ اصل آرتھوڈکس کمیونسٹ تھے، دوسرے لوگ ان آرتھوڈکس لوگوں کے نزدیک "ملحد" تھے۔ وہ بھی اپنے آپ کو مارکس کے ہی شاگرد کہتے تھے، لیکن وہ طبقوں کے درمیان موت وحیات کی کشمکش کے بجائے تعاون کے قائل تھے اور انھیں اعتماد تھا کہ انسانی شرافت وفہم سے کام لیا جائے تو طبقاتی جنگ کے خوفناک اثرات روکے جا سکتے ہیں۔

اگرچہ "آرتھوڈکس اور "ملحد" کمیونسٹوں کے درمیان اختلافات کی اصل تعبیرات کے باب میں اختلاف ہے۔ تاہم یہ دونوں گروہ اب تک موجود ہیں۔ اس سلسلے میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ماسکو اور یوگو سلافیہ کے ٹیٹو[1] کے درمیان انقطاع ہوا۔ پھر ماسکو کے حکمران طبقے نے بار بار پارٹی کے افراد پر ہاتھ صاف کیا۔ جس گروہ بندی نے پہلی بین الاقوامی تنظیم برباد کی تھی، وہی دوسری بین الاقوامی انجمن اور اس کی بیسویں صدی کی جانشین تنظیمات — کومن ٹرن اور کومن فارم — کے لیے وجہ مصیبت بنی رہی۔

---

[1] Tito ۔ یوگوسلافیہ کا صدر مارشل ٹیٹو

[2] Comintern

[3] Cominform

ستائیسواں باب

دوسرے گروہ کی تدبیریں

تمہید

مارکسی اور مثالی اشتراکیت، سرمایہ داروں اور جمہوریت پروروں کی آزاد خیالی، انیسویں صدی کے اقتصادی و عمرانی مسائل کے حل کی نہایت اہم تدبیریں تھیں، مگر محض یہی تدبیریں نہ تھیں، جو ان مسائل کے حل کے لیے اختیار کی گئیں۔ قوم پروروں نے تجارتی نظریۂ زر کا قدیم اقتصادی فلسفہ زندہ کر لیا۔ انھوں نے ایک طرف وطنی اقتصادیات کی حفاظت کے لیے محاصل عائد کرنے کی وکالت کی، دوسری طرف مطالبہ کیا کہ سلطنتیں قائم کی جائیں تاکہ فالتو پیداوار کی فروخت کے لیے نئی منڈیاں مہیا ہو جائیں اور زائد آبادی کے لیے نئی بستیاں بسائی جا سکیں۔ نئے تجارتی نظریۂ زر کے تجزیے پر غور و فکر آگے چل کر ہو گا۔ یہاں ہم صرف دو طبقوں کی تدبیروں کا ذکر کریں گے، اوّل انارکزم (نراج) دوم وہ اصلاحی پروگرام، جسے مسیحی اشتراکیت" یا مسیحی جمہوریت کہا جاتا ہے۔

انارکسٹ

انارکسٹ (نراجی) کا عقیدہ یہ ہے کہ حکومت کا بہترین نقشہ نفیِ حکومت ہے۔ اشتراکیت کے لیے جتنے نسخے تیار کئے گئے ان میں انارکزم کا کچھ نہ کچھ جزو شامل تھا۔ مثلاً مثالیت کے پیرو ہر حکومت کو بے اعتمادی کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مارکس کو امید تھی کہ جب اس کا پیدا کیا ہوا انقلاب بروئے کار آئے گا تو ایک ایسا معاشرہ بن جائے گا، جو طبقاتی امتیازات سے بالکل پاک ہو گا اور خود مملکت بھی کافور ہو جائے گی۔ مارکس کے بعض معاصرین کے نزدیک اتنا کافی نہ تھا کہ مملکت مستقبل بعید میں کافور ہو جائے گی۔ وہ کہتے تھے کہ ظلم و جور کے اس آلۂ کار کو جلد از جلد فنا کے گھاٹ اتار دینا چاہیئے۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ دہشت انگیزی کے سوا کچھ نہ تھی اور ان کی توجّہ خصوصیّت سے اس نکتے پر مرتکز تھی کہ بڑی بڑی مملکتوں کے رؤسا کو قتل کر دیا جائے۔

انارکسٹ دہشت کی وضع قطع ہمارے دماغوں میں یہ بسی ہوئی ہے کہ ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں ہیں، آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہے، انہوں نے بم اٹھا رکھے ہیں اور سیاسی عقیدے کے اعتبار سے وہ انتہا پسند ہیں۔ طنز کے طریق پر ان کا حلیہ یہی دکھایا گیا ہے۔ نصف صدی یا اس سے بھی بیشتر ان کے اقدامات قتل نے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ مثلاً ۱۸۹۴ء میں فرانس کا صدر کارنو[1]، ۱۹۰۰ء میں اٹلی کا بادشاہ، ہمبرٹ[2]، ۱۹۰۱ء میں امریکہ کا صدر میکنلے[3] مارے گئے۔ اس کے سوا دہشت انگیزی

---

[1] Carnot

[2] Humbert

[3] McKinley

سے براہ راست کچھ حاصل نہ ہوا، البتہ جن حکومتوں سے انارکسٹوں کو نفرت تھی انھوں نے دفاع اور انتقام کے لیے زیادہ سخت تدبیریں اختیار کر لیں۔ غرض یہ تحریک اگرچہ سلبی اور تباہی خیز تھی، تاہم اس نے بھی پرولتاری تحریک پر اپنا اثر چھوڑا۔

انارکزم کا مشہور شارح روس کا بکونن تھا (۱۸۱۴ء-۱۸۷۶ء) جس نے اپنے وطن کی انقلابی تحریک کو ایک خاص شکل دینے میں مدد کی اور پہلی بین الاقوامی انجمن میں اس کی شرکت سے بیشتر ملکوں کے مزدوروں کی توجہ منعطف ہوئی۔ بکونن ایک عشائیت پسند آدمی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مملکتیں بصورت موجود ختم ہو جائیں اور ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی خود مختار اکائیوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بن جائے۔ اس طرح نجی ملکیت کی بے انصافیاں بھی ختم ہو جائیں گی اور افراد کے دل میں کامل آزادی کا یقین بھی استحکام کی صورت اختیار کرے گا۔ بکونن کے نزدیک خیر و برکت کا دور ایک بین الاقوامی بغاوت کے ذریعے سے آئے گا۔ یہ بغاوت انارکسٹ سازشیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ پیدا کر لیں گے۔

بکونن[1] نے اس پروگرام کی ترتیب میں مدد دی، جسے "انارکو سنڈیکل ازم"[2] کہتے ہیں۔ لفظ انارکو (نراج) سے سیاسی عمل کی بے اعتمادی نمایاں ہے۔ سنڈیکل ازم فرانسیسی کے لفظ سنڈیکیٹ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں اقتصادی گروہ، خصوصاً ٹریڈ یونین۔ گویا انارکو سنڈیکل ازم کے پیرو سیاسی جماعتوں پر اعتماد نہیں رکھتے تھے اور مارکسی بھی انھیں میں شامل تھے، جن پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ صرف مزدوروں کا براہِ راست اقدام قابلِ اعتماد ہے۔ براہ راست اقدام کی بہترین شکل یہ تھی کہ مزدور خود بخود ہڑتال کر دیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو سرمایہ داروں کے جوئے سے نجات حاصل کر لیں گے۔ اس اثناء میں وہ یونین بناتے رہیں گے اور سرمایہ داروں کے خلاف تخریبی اقدامات کرتے رہیں گے۔ یوں انھیں بڑے یوم نجات کے لیے تیاری اور مشق کا موقع ملتا جائے گا۔

پراؤدھن

جس مصنّف سے انارکو سنڈیکلسٹ زیادہ اقتباسات پیش کرتے ہیں، وہ پراؤدھن[3] تھا۔ (۱۸۰۹ء-۱۸۶۵ء)۔ اس فرانسیسی مصنّف نے بہت سی کتابیں لکھیں اور اس کی تحریرات میں اشتراکیوں کی طرف سے سرمایہ داری کی برائیوں پر براہِ راست حملہ کیا گیا۔ اس نے ۱۸۴۰ء میں ایک مشہور رسالہ لکھا جس میں سوال کیا کہ جائداد کیا ہے؟ جائداد چوری ہے۔ کارل مارکس نے اس کی سائنٹیفک سوشلزم کی بڑی ستائش کی اور پیشنگوئی کر دی کہ پراؤدھن کا یہ رسالہ آنے والے عمرانی انقلاب کے سلسلے میں وہی کردار ادا کرے گا جو تیسرے طبقے کے متعلق سییز کے مشہور رسالے نے ۱۷۸۹ء کے سلسلے میں ادا کیا تھا، مگر چند سال بعد مارکس کی ستائش حقارت میں بدل گئی۔ پراؤدھن نے ایک اور رسالہ "فلسفۂ افلاس"[4] لکھا۔ مارکس نے فوراً اس کا جواب ایک رسالے میں دیا، جس کا نام تھا "افلاسِ فلسفہ"[5]۔ مصیبت یہ تھی کہ پراؤدھن عمرانی و اقتصادی نظام کی اصلاح کے بہترین طریق میں مارکس کا ہمنوا نہ تھا۔

---

[1] Bakunin

[2] Anarcho-Syndicalism اس کا ترجمہ نراجی اکتسابی اشتراکیت ہو سکتا ہے۔

[3] Proudhon

[4] The Philosophy of Poverty

[5] Poverty of Philosophy

مزید برآں جس جائداد کو پراؤدھن "چوری" قرار دیتا ہے، وہ ہر جائداد نہ تھی بلکہ صرف وہ آمدنی تھی، جو لوگ بلا استحقاق اور بلا محنت حاصل کر رہے تھے، یعنی دولتمند سرمایہ لگا کر اس سے رقمیں وصول کر رہے تھے۔ خود ان کی پیشانیاں محنت کے پسینے سے نم آلود نہیں ہوتی تھیں۔ بلا استحقاق آمدنی کی تمام شکلوں میں سے پراؤدھن کے نزدیک بدترین شکل سود کی آمدنی تھی۔ جسے وہ آمدنی کا "جذام" قرار دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ نابکارترین شیطانِ سرمایہ داری وہ شخص ہے، جو سود کا کاروبار کرتا ہے۔ موجودہ حالات میں صرف وہ لوگ قرض لے سکتے تھے، جو دولتمند تھے، لیکن پراؤدھن نے جس مثالی معاشرے کا نقشہ تجویز کیا تھا، اس میں ہر شخص اعتماد کی بنا پر ادھار لے سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ نجی بینکوں یا بینک فرانس کے بجائے ایک عوامی بینک ہونا چاہیئے، جو لوگوں کو بلا سود قرض دے اور نوٹ جاری کرتا جائے، وہی نوٹ عام روپے کی جگہ لے لیں گے۔ پراؤدھن کے پیشِ نظر حقیقت میں جنس بہ جنس مبادلے کا معاملہ تھا، یعنی ہر فرد اپنی پیدا کردہ چیزیں دے دے اور ان کے بدلے میں دوسروں کی پیدا کردہ چیزیں لے لے۔ عوامی بینک ہر فرد کے لیے ساکھ کا انتظام کر دے گا، لہٰذا ہر فرد کچھ نہ کچھ پیدا کرنے کا اہل بن جائے گا۔

گویا مارکس ایک ایسے انقلاب کی پیشنگوئی کر رہا تھا، جس میں وسائلِ پیداوار کی ملکیت عوام کے ہاتھ میں آجائے گی۔ پراؤدھن کے پیشِ نظر صرف ساکھ کا انقلاب تھا، یعنی ایسا انقلاب جس کے ذریعے سے پیداوار کے لیے روپیہ مل سکے۔ مارکس کی تجویز یہ تھی کہ پرولتاری سرمایہ داروں کو ختم کر دیں۔ پراؤدھن کی تجویز یہ تھی کہ پرولتاریوں کو سرمایہ داروں کی سطح پر پہنچا دیا جائے اور ہر مزدور مالک بن جائے۔ پراؤدھن کا مثالی نقشہ اجتماعی یا اشتراکی نہ تھا۔ بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں طبقۂ اوسط کی ایک انجمن کا تصور تھا، جس کی تنظیم خاصی کمزور تھی۔ پراؤدھن کو افراد پر پابندیاں عائد ہو جانے کا خوف تھا، اس لیے اس نے لوئی بلینک کی عوامی کارگاہ اور فوریا کے متساوی الاضلاع منصوبوں کی مخالفت کی۔ وہ کہتا تھا، ان میں پابندیاں زیادہ ہیں۔ پراؤدھن نے ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا، جو "احتیاج باہمی" پر مبنی تھا۔ اقتصادی اعتبار سے "احتیاج باہمی" چیزیں پیدا کرنے والوں کی انجمنیں بن جائیں گی۔ ان تعاونی انجمنوں کی شکل اختیار نہ کریں گی، جو ڈیری کے سلسلے میں آج ہمیں نظر آتی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے "احتیاج باہمی" ان انجمنوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق ہوں گی۔ جو مقتدر مرکزی حکومتوں کی جگہ لے لیں گی۔

پراؤدھن کے نظریات فرانس جیسے ملک کے لیے بڑے جاذب ثابت ہوئے، کیونکہ وہاں انفرادیت کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، جہاں چھوٹے چھوٹے کاروبار والے آدمیوں کی کثرت تھی۔ فرانس میں لاکھوں چھوٹے کاروبار کرنے والے آدمی موجود تھے، جن کا تعلق طبقۂ اوسط کے حاشیۂ زیریں سے تھا، یعنی ان کے متعلق اکثر ڈر رہتا تھا کہ ایک ہی ضرب سے وہ پرولتار بن جائیں گے۔ بینکر ان کے لیے مالی ساکھ تسلیم کرنے سے اکثر انکاری تھے۔ اسی وجہ سے پراؤدھن نے ان پر سخت حملہ کیا۔ مزید براں "احتیاج باہمی" اور وفاقیت انقلابی روایت کا ایک جزو تھے جو ۱۷۹۱ء کے دستور اور جیرونڈیوں کی تقریروں سے ورثے میں ملی تھی۔ پراؤدھن نے طبعاً انار کو سنڈیکل ازم کے ذریعے سے انارکسٹوں کے دل میں نیا جذبہ پیدا کر دیا۔

لیکن پراؤدھن کی تعلیمات کا بیشتر حصہ سنڈیکل ازم کے منافی تھا۔ وہ ٹریڈ یونینوں کو اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ ان کے ذریعے

سے قرض کی آزادی پر غیر طبعی پابندیاں عائد ہوتی تھیں۔ وہ ان تمام پابندیوں کے خاتمہ میں سرگرم تھا، جن سے طبقاتی کشمکش پیدا ہو سکتی تھی۔ ان میں ہڑتالیں بھی شامل تھیں، جن سے سنڈیکلسٹ (اکتسابی اشتراکیت کے حامی) خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ بعض اوقات پرادھن انارکزم کے باوجود ایسے طریقوں کی حمایت کرتا تھا، جو صرف مطلق العنان حکومت اختیار کر سکتی تھی۔ اسے فاشزم کا نقیب بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً اگر حریف جماعتیں رضاکارانہ تعاون پر آمادہ نہ ہوں تو پرادھن کوئی مضائقہ محسوس نہ کرتا تھا کہ انھیں چند افراد کے ذریعے سے بالجبر تعاون پر آمادہ کیا جائے۔ اسے بینکروں سے نفرت تھی اور فرانس میں ساہوکارہ زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس وجہ سے پرادھن سامیوں کا مخالف ہوگیا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ پرادھن کو سیاسیات میں بائیں ہاتھ انتہا پر رکھا جائے یا دائیں ہاتھ انتہا پر۔

مسیحی اشتراکیت

مسیحی اشتراکیوں کو سیاسی مرکز کے قریب رکھنا چاہیے۔ تاریخی اعتبار سے یہ اشتراکی انگریز مصلحین کے ایک چھوٹے سے گروہ پر مشتمل تھے، جو قائم شدہ کلیسا کے پادریوں میں سے تھے اور انیسویں صدی کے وسط میں بڑے سرگرم رہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے کلیسا کو مذہبی مسائل ایک طرف رکھ دینے چاہییں اور پوری کوشش عمرانی خرابیوں کے ازالے پر صرف کر دینی چاہیے۔ اس طبقے کے مشہور ترین لیڈروں میں سے ایک چارلس[1] کنگسلے (۱۸۱۹ء — ۱۸۷۵ء) ایک ناول نگار تھا، جس نے واٹر بیبیز[2] اور ویسٹ ورڈ ہو[3] لکھیں۔ کنگسلے نے اپنے زمانے میں پُرخلوص عمرانی ناول لکھ کر خاصی شہرت حاصل کرلی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے عدم مداخلت کی خرابیوں پر چھوٹے چھوٹے رسالوں کا ایک سلسلہ مرتب کر دیا۔ اس وقت خیاطی تمام صنعتوں میں سب سے بڑھ کر خرابیوں سے لبریز تھی۔ اس پر کنگسلے نے بالخاصہ شدید ضربیں لگائیں۔ اس نے "آلٹون لاک"[4] کے نام سے ایک نصیحت آموز ناول لکھا۔ "چیپ کلودس[5] اینڈ نیسٹی" (ارزاں کپڑے اور گندے) کے نام سے ایک سخت رسالہ لکھا۔ یہ دونوں چیزیں ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئیں۔ ان میں کپڑوں کی نمائشی دکانوں اور بنے بنائے کپڑوں کی دکانوں کے حقیقی حالات واشگاف طریق پر بیان کر دیئے، کیونکہ ان میں درزیوں اور درزنوں سے جبراً سخت محنت لی جاتی تھی اور انھیں دیر تک کام کرنا پڑتا تھا، مگر تنخواہ بہت ہی کم ملتی تھی۔ جن مقامات پر وہ لوگ کام کرتے تھے، وہاں بہت ہجوم ہوتا تھا اور حفظان صحت کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔

---

۱ Charles Kingsley

۲ The Water Babies

۳ Westward Ho

۴ Alton Locke

۵ Cheap Clothes and Nasty

گنگسلے نے ان دکانوں کے لیے اصلاح کی جو تجویزیں پیش کیں، ان کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے!

"اوّل یہ اصلاح ممکن العمل ہے۔ ہر اس شخص کو، جو اپنے آپ کو مسیحی کہتا ہے ــــ اور ہر انسان کو جو اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے ــــ کبھی ان دکانوں سے چیزیں خرید کر اپنے آپ کو ذلیل نہ کرنا چاہیے۔ ان کے حالات سے آگاہی بہت سہل ہے۔ ٹکٹ لگی ہوئی پوشاکیں، بیہودہ تزئینیں، نازیبا آرائشیں زبانِ حال سے اپنی داستان سنا رہی ہیں..... کسی شخص کو ان دکانوں پر نہ جانا چاہیے۔ یہ دکانیں مولوک[1] کے مندر ہیں۔ ان کی دہلیزیں انسانی خون سے آلودہ ہیں۔ ...."

"دوم چاہیے کہ بارہ یا پچاس یا ایک سو پھیری والے ایک دوسرے سے کہیں کہ دیکھو مقابلہ ہمیں برباد کر رہا ہے۔ مقابلے کا مطلب ہے تفرقہ، پھوٹ۔ ہر شخص صرف اپنے آپ پر نظر رکھے، ہر شخص اپنے بھائی کے خلاف کام کرے۔ علاج یہ ہے کہ ہم مل جل کر رہیں، تعاون سے کام کریں، ایک دوسرے کے لیے ذاتی قربانی پر آمادہ ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اکٹھے ہو کر اپنی دکانوں یا اپنے گھروں میں اور اپنے فائدے کے لیے کام نہ کریں؟ ....

....

"ضروری ہے کہ ایک آدمی یا نصف درجن آدمی اٹھیں، جن کا ایمان یہ ہو کہ دنیا شیطان کی نہیں، بلکہ خدا کی ہے اور گروہ در گروہ لوگ تباہی و بربادی کے موجب نہیں، جب ملتمس کے پیرو کہتے ہیں، بلکہ حکمران کے لیے قوت کا ذریعہ ہیں، جیسا (حضرت) سلیمانؑ کا عقیدہ تھا..... چاہیے کہ چند اہلِ زر آگے بڑھیں، جن کا عقیدہ یہ ہو اور انسانی کردار ادا کریں۔

"ضروری ہے کہ وہ ہر ممکن ذریعے سے مل جل کر کام کرنے کو تقویت پہنچائیں اور ترقی دیں۔ انھیں چاہیے کہ معزز خیاطوں کو مشورہ دیں۔ سمجھائیں کہ ابھی وقت ہے، اپنے آپ کو بنے بنائے کپڑے بیچنے کی ذلت سے بچالیں اور پھیری والوں کو اپنے نفع میں سے حصہ دیں..... جب انجمن بن جائے تو ایسی دکان کا انتظام کریں، جس میں ہوا اور روشنی آسکے اور مناسب کرایے پر یہ دکان خیاطوں کی انجمن کے حوالے کر دیں۔ مجھے یقین ہے

---

[1] Moloch فنیقیوں کا ایک دیوتا جس کے مندر میں بچے قربان کیے جاتے تھے۔

کہ انھیں نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ راستبازی کے طریق پر کام کریں گے۔ خدا ان کے روپے کی حفاظت کرے گا اور دنیا اس کے حکم کے ماتحت خوب منظم ہو رہی ہے۔ نمونے کی قیامگاہیں، تمام حمام، غسل خانے، بیمہ کے دفتر بن رہے ہیں۔ جو شخص ان میں روپیہ لگاتا ہے، اسے معقول نفع حاصل ہوگا۔

"سب سے بڑھ کر یہ کہ جب یہ لوگ مشترکہ نفع کے لیے ایک دوسرے کی خاطر قربانی کے جذبے کے ساتھ مل جل کر کام کریں گے تو ضروری ہے کہ ہر شریف انسان اور ہر مسیحی ان لوگوں سے کاروبار کرنا عزت اور ضمیر کے شایان سمجھے گا۔ دوسروں کو بھی اسی پر آمادہ کرے گا۔ ہم ان لوگوں کو قرضے یا تحفے دے کر ان کی اتنی امداد نہیں کر سکتے، جتنی گاہکوں کے ذریعے سے کر سکتے ہیں[۱]۔"

اس عبارت میں اشتراکیوں کے مثبت نظریات کا خلاصہ آگیا۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس میں مادیت کی مذمت کی گئی ہے اور غیر برادرانہ کشمکش کے خلاف برادرانہ محبت پہ زور دیا گیا ہے۔ یہ نصیحت کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے ناجائز نفع اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ ایک دوسرے کا مقابلہ نہ کرو۔ مل جل کر اور تعاون سے کام کرو۔ پھر اس میں رجائیت بالکل نمایاں ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر لوگ مسیحیوں کی طرح عمل پیرا ہوں گے تو وہ اپنے عمرانی مسائل حل کر سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیحی اشتراکی اتنے اشتراکی نہ تھے، جتنے مسیحی تھے۔ انھیں حکومت کی مداخلت کے بجائے رفاہِ عام پر زیادہ اعتماد تھا۔ کنگسلے کو بھی یہی امید تھی کہ وعظ و نصیحت سے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور جب لوگوں کو مسلّمہ مسیحی مقاصد اور حقیقی اقتصادی عمل کا فرق بتایا جائے گا تو ان پر اثر ہوگا۔ خود کنگسلے نے مثبت اصلاح کی ایک مثال پیش کردی، یعنی مزدوروں کے لیے لندن میں ایک کالج قائم کرایا اور ایسی دوسری سرگرمیوں کو تقویت پہنچائی، جو وائی، ایم، سی، اے کے ذریعے سے جگہ جگہ متعارف ہو چکی ہیں۔

کیتھولکوں کی تدبیریں

کیتھولکوں میں صنعت کاری کی برائیوں کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ اصلاً ان کا پروگرام انگلیکی مسیحی اشتراکیوں سے ملتا جلتا تھا، مگر انھوں نے مسیحی جمہوریت یا عمرانی مسیحیت کا زیادہ صحیح نام اختیار کیا۔ دنیائے حاضر کے مسائل کے لیے کیتھولکوں نے جو تدبیر پیش کی، اس میں مسیحی جمہوریت کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ ان مسائل سے کلیسا پر گہرا اثر پڑا۔ پادریوں کے خلاف جو قوانین منظور ہوئے تھے، ان سے فرانس، جرمنی، اٹلی اور دوسرے ملکوں میں مسیحیت کی حیثیت کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا۔ پہلے پاپائی جاگیریں، پھر شہر روما ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک پاپائی حکومت کے تابع رہنے کے بعد اٹلی کی نئی متحدہ بادشاہی کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ صنعتی

---

[۱] کنگسلے کی کتاب ایلٹن لاک ص ۱۰۳-۱۰۷

انقلاب سے سائنس، قومیت اور مادی نظریات پیدا ہوئے۔ یہ سب انسانوں کی عقیدت حاصل کرنے کے لیے مذہب کے مقابلے میں آ گئے تھے۔ جن ملکوں کا مذہب کیتھولک تھا، وہاں کے مزدور طبقے کلیسا سے دور جا رہے تھے۔

کلیسا نے پہلے ان مسائل کے سلسلے میں ماضی کے اندر پناہ لینے کی کوشش کی۔ پوپ پائس نہم[۱] (۱۸۴۶ء۔ ۱۸۷۸ء) نے "مجموعہ خطایا"[۲] میں غیر مصالحانہ موقف اختیار کیا۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس نے ان تمام نظریات و ادامات کی مذمت کی، جن پر صدیوں کی روایات کی مہر تقدیس نہیں لگی تھی۔ یعنی مزدوروں کی یونینوں اور جمہوری حکومتوں کو مذموم قرار دیا، جن کے لیے مزدور کوشاں تھے اور یہ فرض کر لینا "خطا" قرار دے دیا کہ پوپ ترقی، آزاد خیالی یا دورِ حاضر کی تہذیب و تمدن سے موافقت و ہم آہنگی پیدا کرے گا اور اسے پیدا کر لینی چاہیے۔

تاہم کیتھولک کلیسا ترقی، آزاد خیالی اور جدت سے منہ موڑ کر اتنی مدت قائم نہیں رہا۔ پوپ پائس نہم کے بعد لیو سیزدہم[۳] (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۰۳ء) مسند نشین ہوا جو دورِ حاضر کا ممتاز پوپ تھا۔ لیو نے ان تیز تغیرات کا کامل اعتراف کر لیا، جو سائنس اور فنکاری کی بدولت رونما ہو رہے تھے۔ پوپ کے سفیر کی حیثیت میں وہ بلجیم، فرانس اور جرمنی کے صنعتی حلقوں میں ان تغیرات کا مشاہدہ براہِ راست کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیتھولسزم ریاستہائے متحدہ امریکہ کی جمہوری فضا میں ترقی کر رہی تھی، حالانکہ اسے مخالف فضا قرار دیا جاتا تھا۔ مزید براں ٹامس اکوئیناس کے مطالعے سے اس پر واضح ہو گیا کہ اگر کلیسا عمرانی اور اقتصادی مسلک میں درمیانی راستہ اختیار کرے (جس کی تجویز ازمنہ وسطیٰ کے بڑے بڑے کلامیوں نے کی تھی) تو اسے نقصان کم ہوگا اور فائدہ زیادہ۔ چنانچہ پوپ لیو سیزدہم نے دنیائے حاضر سے مصالحت کا راستہ اختیار کیا اور اس ضمن میں مشہور دستاویزوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا۔ ان میں سب سے زیادہ اس گشتی مراسلے نے شہرت پائی، جس کا عنوان تھا۔ "نئی چیزوں[۴] کے متعلق" یہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اس مراسلے میں لیو نے سرمایہ داری کے عیوب اسی زور سے واشگاف کر دیئے جیسے کوئی اشتراکی کرتا۔ پھر املاک کے متعلق اشتراکی نظریے اور طبقاتی جنگ سے متعلق اشتراکی اصول پر بھی اسی شدت سے حملہ کیا۔ اس نے اعلان کیا۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ:۔

"ہر طبقہ دوسرے طبقے کا طبعی دشمن ہے۔ دولت مند اور مزدور فطرتاً ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ محنت کے بغیر کچھ

۱؎ Pius IX

۲؎ Syllabus of Errors

۳؎ Leo XIII

۴؎ Rerum Novarum Concerning New Things لاطینی نام

نہیں کر سکتا۔ محنت سرمایہ کے بغیر بے مصرف ہے۔ دائمی کشمکش فساد اور وحشت پیدا کرتی ہے[1]۔"

لہٰذا لیو نے اس امر پر زور دیا کہ ہر اقتصادی آدمی کو مسیحی کی خیر سگالی اختیار کر لینی چاہیے:-

"مذہب مزدوروں کو یہ سکھاتا ہے..... کہ جو معاہدے اس نے آزادانہ طریق پر کیے ہیں، ان پر حق و دیانت سے کاربند رہے۔ نہ آقا کی جائداد کو نقصان پہنچائے، نہ اس کی ذات کی بے حرمتی کرے۔ نہ تشدد سے کام لے، نہ فتنہ و فساد سے سروکار رکھے۔ ان آدمیوں سے الگ تھلگ رہے جن کے اصول بُرے ہیں، جو خوش آئند وعدوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ایسی احمقانہ امیدیں بٹھا دیتے ہیں، جو عموماً بے سود پشیمانیوں کا باعث بنتی ہیں۔ آخر دیوالا نکل جاتا ہے۔ مذہب دولتمند مالکوں اور کارخانہ داروں کو یہ سکھاتا ہے کہ ان کے ماتحت کام کرنے والے لوگوں کو غلام نہیں سمجھنا چاہیے۔ انھیں ایک انسان اور ایک سمی کی طرح ہر انسان کے وقار اور وقعت کا احترام کرنا چاہیے۔ مزدوری ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو شرمندگی ہو۔ اگر ہم عقل سلیم سے کام لیں اور مسیحی فلسفے کا معیار استعمال کریں تو یہ ایک معزز پیشہ ہے، جو انسان کو راستبازی اور عزت مندی کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے۔ انسانوں کو ردی مال سمجھنا شرمناک اور منافیِ انسانیت ہے۔ انھیں کے ذریعے سے روپیہ پیدا کیا جاتا ہے، پھر سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض کام کرنے والے اعصاب یا محض جسمانی قوت کے حامل ہیں[2]۔"

مملکت کو ان افراد کے مفاد کے تابع رکھنا چاہیے، جن سے وہ مرکب ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت عدم مداخلت کا مسلک اختیار کرے۔ اس کے خلاف لیو نے بار بار سینٹ ٹامس کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ مملکت کو عوام کی بہبود کے لیے ضروری تدبیریں اختیار کرنی چاہیں۔ جس حد تک سرمایے کا تعلق ہے، مملکت کو چاہیے، شورش پسندوں کو دبائے اور جائدادوں کو تشدد سے بچائے رکھے۔ جس حد تک مزدوروں کا تعلق ہے، اسے چاہیے کہ وہ تمام اسباب ختم کر دے، جن سے کارفرما اور کارگر کے درمیان کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً نفع جوئی پر پابندیاں لگائے، بچوں سے کام لینے کے قاعدے تجویز کرے۔ کام کے گھنٹوں کی حد مقرر کر دے اور اقرار کرے کہ اتوار کو مذہب اور آرام کے لیے تعطیل رہے۔ لیو کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ مزدوروں کو خود اپنی مدد کرنی چاہیے۔ چنانچہ گشتی مراسلے کے اختتام پر اس نے پر زور اپیل کی کہ کیتھولک ٹریڈ یونینیں بنائی اور پھیلائی جائیں۔

---

[1] پوپ لیو کے گشتی مراسلے ص ۲۱۸ [2] ایضاً ص ۲۱۹

یہ کیتھولک یونینیں آج بھی موجود ہیں، لیکن مزدوروں کے منظم حلقے میں ان کی حیثیت اقلیت کی ہے۔ لیوسیزدہم کی مسیحی جمہوریت یا مسیحی اشتراکیت نے وہ سب کچھ حاصل نہ کیا جس کی امید ان اداروں کے بانیوں کو تھی۔ بہ ایں ہمہ بہت سے لوگ ان کی طرف کھچے چلے آئے۔ برطانیہ کی مزدور جماعت میں مسیحی اشتراکیت کے اتنے عناصر موجود ہیں جن کا خیال بھی امریکیوں کو نہیں ہو سکتا۔ باقی رہے مسیحی جمہوریت پرور تو وہ بہتر سے بہتر صورت میں بھی نیم دل جمہوریت پرست ہیں۔ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد میں کیتھولک ملکوں کی سیاسیات میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کم از کم انگلیکی اور کیتھولک مصلحین نے صنعتکاری کے سلسلے میں آزاد خیالوں کی تدبیروں کو تقویت پہنچائی ہے اور آزاد خیالی کی اپیل کا دائرہ وسیع کر دیا۔

مغربی جمہوریتیں اُنیسویں صدی میں

اٹھائیسواں باب

جامعۂ اوقیانوس شمالی کا پس منظر

جامعۂ اوقیانوس شمالی

ہر نسل کے مورخین کا رجحان یہ ہے کہ وہ پیشِ نظر مطالب کو اپنے عہد کے اہم سیاسی حقائق کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں۔ ہمارے عہد کا بڑا سیاسی واقعہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریتوں اور مطلق العنان حکومتوں (جن میں فاشسٹ اور کمیونسٹ دونوں شامل ہیں) کے درمیان پھوٹ اور کشمکش رہی۔ لہٰذا اس کتاب میں ہم جامعۂ اوقیانوس شمالی سے مراد بیسویں صدی کے وسط میں مملکتوں کی اس گروہ بندی سے لیں گے جو سوویٹ یونین کے خلاف تھی۔ جامعۂ اوقیانوس شمالی میں بنیادی حیثیت برطانیہ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کو حاصل ہے۔ اٹلی بھی بعض اعتبارات سے بنیادی مملکت کی حیثیت رکھتا ہے، مگر جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے وہ بحیرۂ روم کی قوت ہے اور زمانہ حال تک وہ فاشسٹ ملکوں میں سے ایک تھا۔

آزاد خیالی اور جمہوریت

ان بنیادی مملکتوں نے صنعتی انقلاب، مطلق العنانی کے خلاف سیاسی انقلابات اور اٹھارہویں صدی کی تنویر کے ذہنی انقلاب کا تجربہ کیا۔ ان مملکتوں کی گزشتہ ایک سو یا دو سو سال کی تاریخ کے لیے آزاد خیالی یا جمہوریت کی بنی بنائی اصطلاحات استعمال نہیں کی جا سکتیں۔ پھر ان مملکتوں میں آزاد خیالی اور جمہوریت کے مفہوم ایک نہ تھے۔ مزید برآں وہاں ایسے نزاعی اور سرکش آدمی پیدا ہوئے اور ایسی تحریکیں اٹھیں، جنھیں کسی بھی اعتبار سے از روئے حق و انصاف آزاد خیالی یا جمہوریت کی حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً ۱۹۱۴ء السٹر[1] کے اتحادیوں کی سازش، انگریز اور فرانسیسی بادشاہوں کے بہت سے نمائندے، لوئی نپولین، مسولینی، ہووے لونگ[2]۔

بڑی مملکتیں

شمالی و مغربی یورپ کی چھوٹی مملکتیں — ہالینڈ، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، سکنڈے نیویائی ممالک — بھی جامعۂ اوقیانوس شمالی کا حصہ ہیں۔ یہ تمام چھوٹے چھوٹے ملک آزاد خیالی اور جمہوریت کی اپنی قومی

---

[1] السٹر شمالی آئرلینڈ کا وہ صوبہ، جو کیتھولک آئرلینڈ سے منقطع ہو کر برطانیہ سے مل گیا ہے۔ آئرلینڈ کے لوگ اس صوبے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں ایک سازش ۱۹۱۴ء میں بھی ہوئی تھی۔

[2] Hueylong

تعبیرات پر عمل پیرا ہے، خصوصاً سکنڈے نیویائی ملک، جن کی آبادیاں یک جنس تھیں اور مشترک مذہب لوتھری تھا، پھر روایات مشترک تھیں اور ان میں خواندگی کا تناسب بہت بلند تھا۔ وہ بعض اوقات جمہوری وظائف کو مؤثر بنانے میں بڑی سلطنتوں پر بھی سبقت لے جاتی رہیں۔ کوپن ہیگن[1] یا سٹاک ہوم[2] پہنچنے والے سیاح ان شہروں کی صفائی ہی سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ یہ دیکھ کر بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ وہاں نہ کوئی غلیظ آبادیاں ہیں اور نہ افلاس کے دوسرے نشان نظر آتے ہیں۔ ڈنمارک اور سویڈن میں امدادِ باہمی کا کاروبار اعلیٰ پیمانے پر جاری ہے اور اسے اشتراکیت اور بے ضبط انفرادیت میں درمیانی راستہ سمجھ کر سراہا جاتا ہے۔

شخصیتیں

ان چھوٹی مملکتوں کی جداگانہ تاریخیں لازماً سرسری طور پر ہی پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن یہ بھولنا نہ چاہیے کہ ان ملکوں نے بین الاقوامی سیاسیات میں توازن کی خدمت انجام دی اور مختلف دائروں میں ان کے شہریوں نے موجودہ مغربی ثقافت کے لیے بہ مقابلہ آبادی بہت زیادہ کام کیا ہے۔ سوئٹزرلینڈ سے برک ہارٹ[3] پیدا ہوا جو دورِ احیائے علوم کا بڑا مورخ تھا۔ مشہور شاعر اور ڈراما نگار میٹرلنک[4] بلجیم کا باشندہ تھا۔ سبی لیوس[5] ایک ماہرِ موسیقی تھا، جس کا تعلق فن لینڈ سے تھا۔ ناروے میں ابسن[6] پیدا ہوا، جس نے دورِ حاضر کے عمرانی ڈرامے لکھے۔ ہالینڈ سے لورینٹز[7] جیسا طبیعی اٹھا، جس نے ۱۹۰۲ء میں نوبل کا انعام حاصل کیا۔ سویڈن میں نوبل[8] پیدا ہوا، جو آتش گیر مادوں کا ملک التجار تھا۔ اسی نے امن و مصالحت کے لیے نوبل کا انعام مقرر کیا تھا۔

جمہوری اشکال

انیسویں صدی کے اختتام تک جدید پارلیمانی یا مغربی جمہوریت کی شکلیں جامعۂ اوقیانوس شمالی سے باہر پھیل چکی تھیں۔ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ زاروں کے روس میں بھی مقامی مجلسیں موجود تھیں اور ۱۹۰۵ء کے بعد وہاں قومی پارلیمنٹ (دُوما) بن گئی۔ بلقانی ریاستوں میں بھی نمائندہ مجلسیں قائم ہوگئیں۔ وسطی یورپ کی دو بڑی سلطنتوں آسٹریا ہنگری اور جرمنی میں قانون ساز مجلسیں وسیع حق رائے کی بنا پر منتخب ہوتی تھیں۔ صدی کے موڑ پر بہت سے جرمنوں کا احساس تھا کہ ہوہنزولرن خاندان کی بادشاہی نے شہنشاہ ولیم دوم کی تقریروں کے باوجود محدود بادشاہی تھی، لیکن دو عالمی جنگوں میں جرمنی مغرب کے خلاف میدانِ عمل میں آیا اور اس نے جمہوریت کے خلاف فلسفہ اور ادارے پیدا کر لیے اور اب وہ ان طریقوں اور مغرب کے درمیان کشمکش میں ہے اور شارلیمن کے زمانے سے وہ اسی کشمکش میں چلا آتا ہے۔ کمیونسٹ روس نے اپنی ثقافت پیدا کر لی ہے، جو اگرچہ جمہوریت کے طلسمی لفظ سے مستعار ہے، مگر وہاں جرمنی سے بھی زیادہ مغرب کی آزاد خیال جمہوریت کی مخالفت موجود ہے۔

---

۱ Copenhagen ناروے کا مرکزِ حکومت ۲ Stockholm سویڈن کا مرکزِ حکومت

۳ Burck Hardt ۴ Maeterlinck ۵ Sibelius

۶ Ibsen ۷ Lorents ۸ Nobel

جداگانہ تاریخ کی ضرورت

جامعۂ اوقیانوس شمالی تمدن کا وارث ہے۔ جن قومی مملکتوں سے یہ مرکب ہے وہ اکثر چیزوں میں متحد ہیں۔ مثلاً مطلق العنانی کے خطرات کے مقابلے میں ان کا مفاد مشترک ہے۔ ان کی ثقافت مشترک ہے، جس کا سراغ ان صفحات میں لگایا جا چکا ہے، تاہم میراث کے مختلف پہلوؤں کے سلسلے میں ان کے درمیان اختلاف بھی ہے، خصوصاً ان پہلوؤں کے سلسلے میں، جنھیں ہم قومیت کے پُرپیچ لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاریخ کا انگریز فلسفی آرنلڈ ٹائنبی یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ اوقیانوس شمالی کی مملکتیں بہ حیثیت مجموعی ایک "معاشرہ" یا مغربی تہذیب تمدن ہیں اور اس کے اجزاء بعض اعتبارات سے صرف صوبائی قومی ریاستیں ہیں، جو دنیا میں باہم لاینفک طریق پر وابستہ ہیں۔ تاہم ان مغربی مملکتوں کو جو بنیادی مسائل درپیش ہیں، انھیں سمجھا نہیں جا سکتا، جب تک گزشتہ ایک سو یا اس کے آس پاس کی جداگانہ اندرونی تاریخ کا سراغ نہ لگایا جائے۔ اب ہم اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

انتیسواں باب

برطانیہ

(۱)

۱۸۱۵ء - ۱۹۱۴ء

عملیۂ اصلاحات

۱۷۹۲ء۔۱۸۱۵ء کی عالمی جنگ میں برطانیہ نے اپنے حریف پر فتح پائی۔ برطانوی اقتصادیات نے جنگ کا خرچ پورا کر دیا، اس کی مالی اور صنعتی صلاحیتیں بڑھ گئیں۔ یقیناً برطانوی معاشرہ طبقاتی مفاد میں بٹا ہوا تھا، مگر ——— وسطی آئرستانیوں کو چھوڑ کر ——— پورا معاشرہ اساساً حُبِ وطن اور وفاداری پر متحد تھا۔ برطانیہ کا سیاسی نظام جمہوری نہ تھا، مگر شاہی اختیارات خاصے محدود تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ پارلیمنٹ کی جڑیں رائے عامہ کے اندر نہیں پہنچی ہوئی تھیں۔ عام حالات میں برطانوی رعایا کو شہری حقوق کی پوری حفاظت حاصل تھی۔

واٹرلو کی جنگ کے فوراً بعد جو سال آئے، ان میں برطانیہ کو ایک ایسے بعد از جنگ اقتصادی بحران سے گزرنا پڑا، جو ایسے موقع پر پیش آتے ہیں۔ فروخت ناشدہ سامان جمع ہو گیا۔ مزدور طبقوں کو وسیع بے روزگاری اور تکالیف سے سابقہ پڑا۔ قوانینِ اجتماع کے رو سے ٹریڈ یونین (پیشہ ور انجمنیں) بنانا ممنوع تھا۔ تاہم مزدوروں نے ہڑتالیں کیں اور ہنگامے بپا ہوئے جن سے ۱۸۳۲ء کے قانونِ اصلاحِ پارلیمنٹ کا راستہ ہموار ہوا۔ سنہ ۱۸۲۰ء کے بعد اقتصادی حالات سدھر گئے اور برطانیہ سیاسی اصلاحات کے پہلے مرحلے میں داخل ہوا۔ یہی اصلاحات اسے ایک جمہوری مملکت بنانے کا باعث ہوئیں۔

اس عملیے میں اقتصادی اور عمرانی کوششیں بھی کارفرما رہیں اور بیسویں صدی کے وسط کا برطانیہ محض مکمل سیاسی جمہوریت ہی نہ بنا، بلکہ اقتصادی اور عمرانی جمہوریت بھی بن گیا۔ تاہم یہ کہہ دینا چاہیے کہ اصلاح کا عمل مثبت سیاسی مقاصد پر مبنی تھا۔ اس عمل پر انگریزوں کو بڑا فخر ہے کیونکہ یہ کسی انقلاب یا کسی تشدد کے بغیر ——— یا کم از کم کسی بڑے شہری فتنہ و فساد کے بغیر تکمیل کو پہنچ گیا۔ بحث و نظر، تعلیم اور پروپیگنڈا تینوں چیزیں ایک خاص اصلاحی مسودۂ قانون میں جمع ہو گئیں۔ پھر تیاری کا ایک روز آیا، جس کے بعد نیا اصلاحی مسودۂ قانون پیش ہوا۔

پارلیمانی اصلاح

یہ عملیہ پارلیمانی اصلاح کے مختلف مراحل میں واضح ہوتا ہے جس کی وجہ سے برطانیہ کی حکومت عہدہ داروں کے بجائے جمہوری حکومت بنی۔ محارباتِ نپولین سے برطانیہ کامیاب برآمد ہوا تو اس کی انتظامی باگ ڈور کابینۂ وزراء کے ہاتھ میں تھی، جس کا صدر وزیرِ اعظم تھا اور یہ کابینہ پارلیمنٹ کے ضبط و نظم میں تھا۔ تاج کی حیثیت

انیسویں صدی کے سیاسی صاحبِ قلم "بیج ہاٹ[1]" کے قول کے مطابق بڑی حد تک آرائشی تھی۔ یہ آرائشی منصب انیسویں صدی کے بیشتر حصے میں ملکہ وکٹوریہ کو حاصل رہا جس سے ایک دور اور ایک ثقافت نے انتساب پایا۔ یہی شخصیت وفادار برطانوی رعایا کے جذبات حُبِ وطن کا مرکز تھی۔ وکٹوریہ نے غالباً کبھی یہ نہ سمجھا کہ وہ محض ایک نمائشی شخصیت ہے۔ وہ بڑی پُرعزم، دانشمند، جذباتی، پابندِ آداب و مراسم اور ذہنی اعتبار سے اپنے عہد کی ایک روشن خیال خاتون تھی۔

حقیقی اقتدار قانون سازی کے شعبے میں مرتکز تھا اور یہ شعبہ براہِ راست عوام کا نمائندہ نہ تھا۔ دارالامراء — جس کے ممبر امراء کے محدود طبقے سے لیے جاتے تھے — کو مالی مسودات قانون کے سوا ایوان زیریں کے برابر اختیارات حاصل تھے۔ دارالامراء کے ممبروں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس کے ممبر طبقۂ شرفاء، پیشہ ور گروہوں اور کامیاب کاروباری آدمیوں میں سے چنے جاتے تھے، تاہم بالغ مردوں کے ⅐ سے بھی کم حصے کو حقِ رائے حاصل تھا۔ ہم حقِ رائے کے اوصاف اور پارلیمانی حلقہ ہائے انتخاب کی تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ اصلاح سے پیشتر کی پارلیمنٹ میں یہ چیزیں مختلف حیثیتیں رکھتی تھیں۔ ازمنۂ وسطیٰ سے مختلف قوانین منظور ہوتے رہے۔ اور ان کے مطابق حقِ رائے اور حلقہ ہائے انتخاب میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۱۵ء میں شہروں اور دیہات کے مزدور اور خاصے خوشحال لوگ — مگر نمایاں طور پر کامیاب طبقۂ اوسط کے افراد نہیں — حقِ رائے سے خارج تھے۔ مزید برآں جنوب میں زیادہ تر دیہاتی آبادی تھی اور یہ کسی زمانے میں مملکت کا آباد ترین علاقہ تھا۔ اسے اتنی نمائندگی حاصل تھی، جس کا یہ مستحق نہ تھا اور شمال کے نئے صنعتی مرکزوں کی نمائندگی استحقاق سے بہت کم تھی۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں نظامِ نمائندگی کو جدید اصول پر لانے کی تجویزیں جاری ہوئیں مگر فرانس کے انقلاب اور نپولین کے ظہور نے اصلاح ناممکن بنائے رکھی۔ جنگ کے زمانے میں اور اس کے فوراً بعد اعتدال پسند مصلحین کو بھی انقلابی قرار دے کر ہدفِ طعن بنایا جاتا تھا۔ ۱۸۱۹ء میں ایک مضطرب ٹوری حکومت نے ایک بڑے اور پُرامن مجمع پر گولی چلانے کی اجازت سپاہیوں کو دے دی، جو مانچسٹر کے نزدیک سینٹ پیٹرز فیلڈ[2] میں پارلیمانی اصلاح کے متعلق تقریریں سننے کے لیے جمع ہوا تھا۔ انگریزی تاریخ میں اس حادثے کو پیٹرلو[3] کا واقعۂ قتل کہتے ہیں۔ اس میں متعدد موتیں ہوئیں۔ سینکڑوں آدمیوں کے زخم لگے اور آزادیِ تقریر و تحریر عارضی طور پر محدود کر دی گئی۔ لیکن سر جھکانا انگریزوں کا طریقہ نہیں تھا۔ پیٹرلو کے تھوڑے ہی عرصے بعد پھر شور و غل شروع ہو گیا۔ ۱۸۳۲ء کا قانونِ اصلاح اس کا نتیجہ تھا۔

۱۔ Bagehot ۲۔ St. Peters Field ۳۔ Peterloo

یہ واٹرلو کے وزن پر بنایا گیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس میدان کے اندر پُرامن لوگ تقریر سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ان پر گولی چلائی گئی۔ گیارہ آدمی مارے گئے اور پانچ سو کے قریب زخمی ہوئے۔

اس شور غل میں طبقۂ اوسط طبقات زیریں سے بھی امداد کی اپیلیں کرتا رہا اور اس سلسلے میں عوامی حقوق اور عام حق رائے پر بھی زور دیا گیا۔ بہت سے عوامی لیڈروں نے ایسے انداز میں باتیں کیں۔ گویا اصلاح کے مسودۂ قانون کے ساتھ ہی انگلستان میں ایک دم سیاسی جمہوریت قائم ہو جائے گی، لیکن اصلاح کے لیے تیاری کا حقیقی کام آزاد خیال شورشیوں کا نہیں، بلکہ قدامت پسندوں کا تھا۔ ٹوریوں کی حکومت نے کیننگ اور رابرٹ پیل جیسے روشن خیال افراد کی رہنمائی میں ۱۸۲۰ء کے بعد شہری حقوق پر سے وہ مختلف پابندیاں اٹھالیں جو دورانِ جنگ میں یا بعد از جنگ بحرانی زمانے میں عائد کی گئی تھیں۔ قوانین اجتماع بھی جزواً منسوخ کر دیے گئے، جو پیشہ ور انجمنوں کے خلاف تھے۔ فرسودہ مجموعۂ تعزیرات کی اصلاح ہوئی اور حفاظتی محاصل گھٹنے لگے، یہاں تک کہ معاملہ آزاد تجارت پر پہنچ گیا۔ اگرچہ سترھویں صدی کے "قانون آزمائش"[1] پر عمل نہیں ہوتا تھا، مگر قانوناً مسلمہ انگلیکی کلیسا سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کو سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ قانون منسوخ کر دیا گیا۔ اسی طرح بعض قوانین کے مطابق کیتھولک سرکاری ملازمت میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں بھی منسوخ کر دیا گیا۔ بین الاقوامی سیاست میں کیننگ نے برطانیہ کو آزاد خیال قوت کی حیثیت میں پیش کیا۔ اس کے مقابلے میں وسطی اور مشرقی یورپ کی بادشاہیاں قدامت پسند تھیں۔

اصلاحی مسودۂ قانون وگ پارٹی کے لارڈ گرے کی قیادت میں منظور ہوا۔ اس کے لیے ایجی ٹیشن بھی پورے زور سے جاری رہا اور مختلف گروہوں کے دباؤ بھی پڑے۔ جو ٹوری اس اصلاح کے مخالف تھے انھیں منوا لیا گیا، یہاں تک کہ سب سے بڑا ٹوری ڈیوک آف ولنگٹن بھی آخری وقت میں ہمنوا بن گیا۔ مگر دارالامراء کے ٹوری راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ اس نازک حالت کے پیدا ہوتے ہی لارڈ گرے نے شاہ ولیم چہارم (۱۸۳۰ء - ۱۸۳۷ء) کو راضی کر لیا کہ شاہی حق سے کام لے کر اتنے وگ امراء کو دارالامراء کے ارکان بنا دے جس کے بعد اصلاحی مسودۂ قانون کی منظوری میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ جب دارالامراء کو ایسا کرنے کی دھمکی دی گئی، نیز عوام کی طرف سے تشدد کا خطرہ پیدا ہوا تو ۴۔ جون ۱۸۳۲ء کو یہ مسودہ منظور ہو گیا۔

اس پہلے اصلاحی قانون سے انگلستان میں سیاسی جمہوریت پیدا نہ ہوئی۔ مگر انتخابی حلقوں کی بڑی بڑی بے قاعدگیاں کم ہو گئیں۔ کوئی پچاس سے زیادہ چھوٹے چھوٹے حلقے ختم کر دیے گئے اور جن صنعتی قصبوں کی نمائندگی کا کوئی انتظام نہ تھا، انھیں چالیس کے قریب نئی نشستیں دی گئیں۔ حق رائے میں زیادہ یکسانی پیدا ہو گئی۔ ووٹروں کی تعداد میں پچاس فی صد اضافہ ہو گیا، یعنی طبقۂ اوسط کے تقریباً تمام بالغوں کو حق رائے مل گیا۔ البتہ مزدوروں کو حق رائے نہ ملا۔ بلکہ چند انتخابی حلقوں میں ان سے حق رائے چھن گیا، جہاں اس میں زیادہ توسیع ہو گئی۔

جزواً اصلاح یافتہ پارلیمنٹ کو بنیاد بنا کر حق رائے کی مزید توسیع کے لیے پروپیگنڈا جاری رہا۔ طبقۂ اوسط کو جو کچھ حاصل

---

[1] Test Act یہ ۱۶۷۳ء میں منظور ہوا جس کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری ملازمت میں آنے والے ہر شخص سے چند حلف اٹھوائے جاتے تھے۔ ان میں ایک حلف یہ بھی تھا کہ اسے قائم شدہ کلیسا سے اتفاق ہے۔

کرنا تھا۔ اس نے حاصل کر لیا۔ لیکن مدّعا یہ نہ تھا کہ انھیں حکمران طبقے میں شامل کر لیا جائے، مدّعا یہ تھا کہ تمام اہل آدمیوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہو جائے۔ زیریں طبقہ میں خواندگی پھیلی۔ ان میں سیاسی بیداری رفتہ رفتہ پیدا ہوئی، اس لیے درمیانے درجے کے لوگ حق رائے کی توسیع سے انکار کے لیے کوئی موزوں وجہ نہیں پاتے تھے۔ مزید برآں ان طبقوں کے بیشتر آدمی پورے خلوص سے چاہتے تھے کہ حق رائے وسیع کر دیا جائے۔

دوسرا اصلاحی مسودۂ قانون ۱۸۶۷ء میں آیا۔ اس کے ضمن میں بحرانی کا کوئی ایسا سلسلہ پیش نہیں آیا تھا، جیسا ولنگٹن اور ولیم چہارم کو ہمنوا بنانے کے لیے ۱۸۳۲ء میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ عجیب امر یہ ہے کہ یہ مسودۂ قانون اس قدامت پسند گروہ کی طرف سے پیش ہوا، جو ہمیشہ حق رائے کو وسعت دینے کی مخالفت کرتا رہا۔ مگر ۱۸۳۲ء کے بعد تیس سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی جس میں پارلیمنٹ کی اصلاح کے لیے جد و جہد جاری رہی۔ مختلف صورتیں سامنے آئیں۔ بعض لوگ انتہا پسند تھے اور وہ جمہوریت کی صدائیں لگا رہے تھے، بعض لوگ مطمئن تھے کہ جمہوریت بہر حال آئے گی، اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ ڈزرائیلی (۱۸۰۴ء ۔ ۱۸۸۱ء) دارالعوام میں ٹوریوں کا لیڈر تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک پارٹی نے مسودۂ اصلاح پیش نہ کیا تو دوسری پارٹی اسے پیش کر دے گی۔ دور اندیش سیاستدانوں کی طرح حقیقت کا احساس کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اصلاح کا یہ سہرا خود اس کی پارٹی کے سر بندھنا چاہیے۔ چنانچہ یہ کام اس نے انجام دیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں نے وگ پارٹی کے ارکان کو غسل کرتے ہوئے پایا اور ان کے کپڑے اٹھا کر چلتا بنا۔ ڈزرائیلی کا خیال یہ بھی تھا کہ شہری مزدوروں کے جس طبقے کو اب حق رائے ملے گا، وہ طبقۂ اوسط کے آقاؤں کا دشمن ہے۔ حق رائے حاصل کر چکنے کے بعد مزدور بہر حال ٹوریوں کے حق میں رائے دیں گے، جن کی حیثیت دیہاتی اشراف کی تھی اور وہ طبقاتِ زیریں کی نگرانی کے ذمّہ دار سمجھے جاتے تھے۔ طبقۂ اوسط کے کاروباری آدمیوں کی طرح ان سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ ڈزرائیلی یقیناً دور اندیش تھا، لیکن اس معاملے میں اس کا تصور فوراً درست ثابت نہ ہوا۔ اصلاح کے بعد جو پہلا انتخاب ہُوا (۱۸۶۸ء)، اس میں ووٹروں نے ٹوریوں کو اقتدار سے محروم کر دیا۔

دوسرے اصلاحی مسودۂ قانون میں تمام بالغوں کو حق رائے نہیں ملا تھا۔ پہلے اصلاحی قانون کی طرح جو کچھ ہُوا، تدریجاً ہوا، نیز انتخابی حلقوں میں زیادہ یکسانی اور مساوات پیدا ہو گئی، مگر از منۂ وسطیٰ کی تقسیمات برابر قائم رہیں۔ تمام مالکانِ مکان کو ووٹ کا حق دے دیا گیا —— وہی لوگ اپنے مکانوں میں مستقل طور پر رہتے تھے یا ان کے سلسلے میں ٹیکس ادا کرتے تھے —— اور ووٹروں کی تعداد تقریباً دگنی ہو گئی، لیکن کنوارے جن کے ہاں خانہ داری کا کوئی انتظام نہ تھا، نوکر چاکر اور عورتیں ووٹ سے محروم رہیں۔ بہ ایں ہمہ ۱۸۶۷ء کا قانون بہت اہم تھا۔ اس سے لاکھوں مزدوروں اور نچلے طبقوں کے لوگوں کو ووٹ کا حق مل گیا۔

اس سلسلے کی مزید اصلاحات زیادہ معقول تھیں اور یہ لبرل پارٹی نے گلیڈسٹون (۱۸۰۹ء ۔ ۱۸۹۸ء) کے

زیر قیادت کیں۔ لبرلوں کا لقب پہلے وِھگ تھا۔ یہ اصلاحات ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۵ء میں ہوئیں۔ ان سے واضح جمہوری یکسانی پیدا نہ ہوئی جو فرانس میں قائم ہو چکی تھی۔ حلقہ ہائے انتخاب کا مُلاً یکساں نہ تھے۔ چند ہزار افراد ایسے بھی تھے جنھیں کاروبار کی وجہ سے ایک حلقے میں حق حاصل تھا اور ان کا مکان دوسرے حلقے میں واقع تھا۔ گویا وہ دوہرے ووٹ کے حقدار بن گئے تھے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے گریجویٹ خاص یونیورسٹیوں کے ممبروں کیلئے دوسری مرتبہ ووٹ دے سکتے تھے۔ تاہم ۱۸۸۵ء کا مسودۂ قانون واضح طور پر سیاسی جمہوریت کا قانون تھا، کیونکہ لوگوں کی اکثریت دارالعوام کے نمائندوں کے ذریعے سے بہ لحاظ سیاسی مقتدر بن گئی۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ دارالامراء کو ایسے تمام قوانین کو ویٹو کر دینے کا حق حاصل تھا، جو روپے سے متعلق نہ تھے۔ یہ آخری پابندی ۱۹۱۱ء میں ایک ایسے قانون کے ذریعے سے دور ہوئی، جسے انیسویں صدی کی اصلاحات کا نمونہ سمجھنا چاہیے۔ اس قانون کے بعد دارالامراء کے تمام اختیارات چھن گئے، البتہ وہ بعض قوانین کی منظوری میں تاخیر ضرور کر سکتا تھا۔

دو پارٹیوں کا نظام لبرل اور کنسرویٹو

برطانوی دستور کو جمہوری بنانے کے سلسلے میں انیسویں صدی کے اندر جو خاص قوانین منظور ہوئے، ان کی کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس عملیے کی کارفرمائی جزواً ایسی ہے، جس کے لیے طبقاتی کشمکش کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی میں "ناداروں" نے ـــــ غالباً بہتر یہ ہوگا کہ انھیں "کمدار" کہیں ـــــ سیاسیات برطانیہ میں دخل دینے کا حق حاصل کر لیا، جو ۱۸۱۵ء میں انھیں حاصل نہ تھا۔ لیکن اس سلسلے میں عمل کا مرکز پارٹی ہوتی ہے اور پارٹی میں "کمداروں" اور "بیش داروں" کے درمیان کوئی واضح حدبندی نہ تھی۔ یہ چیز اس بیان سے بھی ظاہر ہے، جو ہم اصلاحات کے مسودہ ہائے قانون کے سلسلے میں پیش کر چکے ہیں۔ ڈزرائیلی نے ۱۸۶۷ء میں تاریکی کے اندر جست لگائی تھی۔ وہ کنسرویٹو (قدامت پسند) لیڈر تھا، انتہا پسند نہ تھا۔ اسے امید تھی کہ جن مزدوروں کو حق رائے مل رہا ہے، وہ کنسرویٹو پارٹی کے لیے ووٹ دیں گے، نہ کہ انتہا پسندوں کے لیے۔ ۱۸۶۸ء میں اس کی رائے یقیناً غلط ثابت ہوئی، لیکن آگے چل کر یہ چنداں غلط نہ رہی، کیونکہ اس کی موت کے بعد کنسرویٹو پارٹی ۱۸۸۵ء کے وسیع تر حق رائے کے ماتحت دس سال (۱۸۹۵ء ـــ ۱۹۰۵ء) کے لیے برسر اقتدار آ گئی۔ یقیناً بعض غریب اور متوسط درجے کے انگریزوں نے کنسرویٹو پارٹی کے لیے ووٹ دیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کا احزابی نظام صاحب املاک طبقے اور بے ملکیت طبقے کی مخالفت پر مبنی نہ تھا۔ اٹھارہویں صدی میں وِھگوں اور ٹوریوں کے گروہ بہت کم تھے۔ انیسویں صدی کے اندر ان کی ہیئت خاصی بدل گئی، یعنی موجودہ دور کی لبرل اور کنسرویٹو پارٹیاں وجود میں آ گئیں، جن کی حیثیت عوامی تھی۔ دونوں پارٹیاں قومی بنیادوں پر منظم ہوئیں اور ان کی ابتدا مقامی مجلسوں سے ہوئی تھی۔ ووٹ حاصل کرنے کے لیے پارٹیوں کی مشینری سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ وِھگوں کا حلقہ پھیلا تو وہ لبرل بن گئے۔ وہ ایک ایسی انتخابی بنیاد پیدا کرنا چاہتے تھے، جو پرانے بڑے کنبوں سے ـــــ ان کنبوں کی نمائندگی صدی کے اوائل تک گرے اور پامرسٹن جیسے آدمی کر رہے تھے ـــــ چھوٹے اور بڑے کاروباری آدمیوں

مسیحی غیر مقلدوں اور انتہا پسندوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ ٹوریوں نے وسعت پائی تو وہ کنسرویٹو بن گئے۔ وہ ایسی بنیاد کے خواہاں تھے، جو پہلے پیل، پھر ڈزرائیلی کے زیر قیادت دیہاتی شرفا اور انگلیکی پادریوں سے زرعی مزدوروں، اچھوتے درجے کے شہری لوگوں اور شہری مزدور طبقات تک پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں فریق جب اپیلیں کرتے تھے تو وہ قوم کا نام لیتے تھے۔ کنسرویٹو نے پرمروز[1] پھول کو اپنا نشان بنا لیا تھا، کیونکہ ڈزرائیلی کو وہ پھول پسند تھا۔ اسی نام سے ایک لیگ قائم کر لی تھی۔ وہ قوم سے اپیل کرتے تو ملکہ اور ملک کی محبت کا واسطہ دیتے۔ کارخانوں کے نئے نظام کی بدترین برائیوں کے خلاف اپنے عمرانی قوانین کے حوالے دیتے۔ انھوں نے بھی پارٹی کی مشین بنانے سے ویسی ہی سرگرمی دکھائی جیسی لبرلوں نے۔ وکٹوریہ کے دورِ عروج میں نہایت آزاد خیال گلبرٹ[2] نے آیولینتھی[3] کے نام سے ایک تمثیل لکھی تھی، جس میں چوکیدار نے یہ گیت گایا تھا:-

"ہر لڑکا اور ہر لڑکی

جو اس دنیا میں زندہ پیدا ہوتا ہے

یا تو چھوٹا لبرل ہوتا ہے

یا چھوٹا کنسرویٹو"

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہر پارٹی پتھر کا ایک بلاک تھی اور اس کے تمام ارکان سیاسی معاملات میں کاملاً ہم آہنگ تھے۔ حقیقتاً ہر پارٹی مختلف گروہوں کی ایک جمعیت تھی، جو انتخابات میں کسی نہ کسی طرح اکٹھے رہتے تھے۔ مزید برآں یہ گنجائش رہتی تھی کہ کوئی چھوٹا سا ٹکڑا الگ ہو جائے اور کسی اہم مسئلے پر اصل پارٹی سے کٹ کر تیسری پارٹی بن جائے۔ لیکن دو پارٹیوں کا نظام برطانیہ میں اس درجہ قوت پکڑ چکا ہے کہ تیسری پارٹی جلد سے جلد سابق مخالف پارٹی میں ضم ہو جاتی ہے۔ اس کی پالیسی میں ہلکا سا اختلاف پیدا کر دیتی ہے اور دو پارٹیوں کا توازن از سر نو قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیل کے پیروؤں نے یہی کیا۔ وہ ۱۸۴۶ء میں لبرلوں سے الگ ہوئے۔ جن حالات میں الگ ہوئے وہ ابھی بیان کیے جائیں گے اور ان میں زیادہ تر لوگ اچھے لبرل بن گئے۔

دو پارٹیاں کیوں؟

دو پارٹیوں کا نظام صرف انگریزی بولنے والی قوموں ـــ برطانیہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ممالک دولت مشترکہ برطانیہ ـــ تک محدود ہے۔ برّاعظم یورپ پر نظر ڈالی جائے تو نہ صرف فرانس بلکہ اٹلی، ہٹلر سے پیشتر کے جرمنی، علاوہ بریں سکنڈے نیویائی جمہوریتیں، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ

---

[1] PRIMROSE بسنتی رنگ کا ایک پھول، جو ڈزرائیلی کو بہت پسند تھا۔

[2] GIBERT

[3] IOLANTHE

اور بلجیم میں زیادہ پارٹیوں کا نظام رائج ہے اور حکومتیں مختلف پارٹیوں کے باہم اتحاد کر لینے سے بنتی ہیں، جن کی تنظیمیں بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ غالباً انگریزی بولنے والی قومیں متعدد پارٹیوں کی جمہوریت کے خطرات و عیوب میں مبالغے سے کام لے رہی ہیں۔ کم از کم اچھے اقتصادی حالات اور جنگ کا بڑا خطرہ موجود نہ ہونے کی حالت میں تیسری فرانسیسی جمہوریت اختلافات کے باوجود سیاسی اعتبار سے خوب کامیاب تھی، مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ دو پارٹیوں کی جمہوریت کے واضح فائدے ہیں۔ مثلاً وہ زیادہ استوار ہوتی ہے۔ اس کی پالیسی میں تسلسل پیدا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ ایک گروہ کو زیادہ مدت تک برسرِ اقتدار رہنے اور کام کرنے کا موقع مل جائے۔ مؤرخ کا فرض ہے کہ واضح کرے، انگریزی بولنے والی قوموں نے کیوں یہ یگانہ ادارہ پیدا کر لیا؟ اسے برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ کے لیے الگ الگ توجیہیں کرنی چاہئیں، کیونکہ اگرچہ ان ملکوں میں دو پارٹیوں کے نظام ہیں، مگر ان کے سیاسی حالات قطعاً یکساں نہیں۔

سیاسی نفسیات کی زبان میں دو پارٹیوں کے نظام کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں ووٹر، جن سے پارٹیاں بنیں، اپنی پارٹی کے موقف کے متعلق اختلاف کے بجائے ہم خیال نہیں یا کم از کم جب وہ کسی امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ امیدوار انھیں مقاصد کے لیے کھڑا ہوا ہے، جو پیشِ نظر ہیں، ان کے لیے نہیں، جو ہمارے پیشِ نظر نہیں۔ ہر ووٹر اپنے دل میں ایک قسم کا سمجھوتا کر لیتا ہے اور عملاً اس سے کم توقع رکھتا ہے، جو اصولاً رکھنی چاہیے۔ اس قسم کا سمجھوتا ۱۸۸۰ء کے بعد کے فرانسیسی کو کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ فرانسیسی ایک درجن یا اس سے بھی زیادہ پلیٹ فارموں اور امیدواروں میں سے اسے چنتے ہیں، جو ان کی آرزوؤں سے قریب تر ہو۔

ہمیں یہ سوال بھی کرنا چاہیے کہ انگریز ایسا سمجھوتا کیوں کر لیتے ہیں؟ اور کیوں وہ اختلاف سے زیادہ اتفاق پر زور دیتے ہیں؟ اس کا جواب برطانوی تاریخ کے طویل عمل میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس جواب کا ایک حصہ اس حقیقت میں تلاش کیا جا سکتا ہے کہ جزیرہ برطانیہ کو بیرونی جنگوں کے مستقل دباؤ کے بغیر پختہ و استوار ہونے کا موقع مل گیا۔ جنگ کے فوری بحران اس قوم میں عارضی اتحاد پیدا کر سکتے ہیں، جسے خطرہ لاحق ہو۔ ۱۷۹۲ء سے ۱۷۹۴ء کے فرانس میں یہی صورت پیش آئی، مگر جب جنگ کا مستقل خطرہ سر پر منڈلاتا رہے ــــ اور برِّ اعظم کی تمام مملکتوں میں یہی صورت پیش آئی ــــ تو معلوم ہوتا ہے کہ جس ملک کو خطرہ درپیش ہو، اس میں پارٹیوں کے درمیان تفرقہ بڑھتا ہے، نفسیاتی رجحانات ترقی پاتے ہیں، تاکہ کوئی آخری اور انتہائی حل تلاش کیے جائیں۔

برطانیہ کی یہی اضافی علیحدگی اس امر کا باعث ہوئی کہ مغربی دنیا میں جاگیرداری اور نئے نمونے کی مرکزی حکومت کے درمیان جو عام کشمکش پیدا ہوئی، وہ برطانیہ کے اندر نسبتاً نرم رہی۔ فرانس اور برِّ اعظم کے دوسرے ملکوں میں نئے نمونے کی مرکزی حکومتیں سترھویں صدی میں کامیابی حاصل کر چکی تھیں اور وہاں خداداد بادشاہیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ یہ مملکتیں انیسویں صدی میں مطلق العنانی کی ترمیم کے لیے عوامی انقلاب سے گزری ہی تھیں ــــ یا گزر رہی تھیں ــــ

اور اب تک وہاں امراء کے اونچے طبقے اور متوسط طبقے کے درمیان بڑی زبردست کشمکش جاری تھی اور مذہبی طبقہ امراء کا حامی تھا۔ مگر انگلستان میں یہ کشمکش ڈیڑھ صدی پیشتر ہو چکی تھی اور وہاں اس نے کبھی وہ تلخ صورت اختیار نہ کی، جس کی کیفیت ہم برّاعظم میں دیکھتے ہیں۔ اس کشمکش نے انگلستان کو اس حکمران طبقے کی تحویل میں دے دیا تھا، جو بڑے بڑے مالکان اراضی اور نئے تجارتی طبقات کے درمیان سمجھوتے کی پیداوار تھا۔ یہ حکمران طبقہ اعتدال و مفاہمت کے عادات کو خود بخود نشو و نما دے سکتا تھا۔ انقلاب فرانس نے برّاعظم میں انیسویں صدی کے شاہ پسندوں اور جمہوریت پروروں کے درمیان جو گہری خلیج کھود دی تھی، وہ انیسویں صدی کے انگلستان میں موجود نہ تھی۔

پس یہ امر اور بھی ضروری ہے کہ لبرل اور کنسرویٹو پارٹیوں کی حیثیت میں الگ الگ تھے، مگر اس کے ارکان اپنے اختلافات پارٹی کے مشترکہ عمل میں ختم کر سکتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں پارٹیوں کے دائرے سے باہر باہم اتفاق کا وسیع حلقہ موجود تھا۔ واضح تر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کنسرویٹو اور لبرل پارٹیوں کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ جب ایک پارٹی اقتدار سے محروم ہوتی اور دوسری برسرِاقتدار آتی تو مملکت کا جہاز ذرا سی دیر کے لیے رُکتا، لیکن اس کا رُخ نہ بدلتا۔ کنسرویٹو ڈزرائیلی اور لبرل گلیڈسٹون کے باب میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پارلیمانی بحثوں کے دوران میں وہ صرف فرضی مُکا بازی کرتے تھے، مگر ان کی مُکا بازی کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک دوسرے کو ختم کر دیں یا گرا دیں۔ معاصر مصنف والٹر بیج ہارٹ اپنے عہد کے حالات بخوبی سمجھتا اور بیان کرتا تھا۔ اس نے عہد وکٹوریہ کی سیاسیات پر ایک عبارت میں خوب روشنی ڈالی ہے۔

"..... شاید یہ عجیب معلوم ہو، جب کہا جائے کہ نمائندہ حکومت میں جماعتی تنظیم کو بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے اور یہ تنظیم مستقل طور پر اصلاح ہوتی ہے، کیونکہ اس کے ممبر زیادہ سرگرم فریق باز نہیں ہوتے۔ جماعت یقیناً پُرجوش ہوتی ہے، مگر اس کے اجزاء ٹھنڈے رہتے ہیں۔ اگر حالت اس کے برعکس ہوتی تو پارلیمانی حکومت بدترین حکومت ہوتی۔ اسے فرقے کی حکومت کہا جاتا۔ جو پارٹی برسرِاقتدار ہو، وہ اُس حد تک ضرور جائے گی، جس حد تک اس کے خطیب لے جائیں۔ ان کے تمام فارمولے عمل میں آئیں گے، جو وہ مختلف اوقات میں پیش کر چکے۔ لیکن انگریزی پارلیمنٹ کے فریق بازوں کا مزاج ایسا نہیں..... وہ اپنی پارٹی کے اصول کو ناممکن نتائج تک لے جائیں۔ اس کے برعکس ان کا طریقہ یہ ہے کہ مستقل اور غیر منطقی اعتدال سے کام لیں اور یہی بہترین طریقہ ہے..... زیادہ تر کاروباری آدمی تھوڑی بہت شورش پسند کرتے ہیں۔ وہ لوگ زندگیاں ممکنات اور شکوک کی فضا [illegible]۔ جہاں کوئی چیز واضح نہیں ہوتی، جہاں بہت سے

واقعات کے مواقع ہوتے ہیں، جہاں مختلف طریقِ عمل کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، اگر ایک ہی طریقِ عمل عزم سے انتخاب کیا جائے گا اور اس پر اہتمام سے کاربند رہنا ہوگا۔ وہ ایسی دلیلیں سننا پسند کرتے ہیں، جو ان کے ذہنی ابہام کے لیے سازگار ہوں۔ دلائل کے بیان میں احتیاط یا تذبذب انھیں کمزوری معلوم نہ ہوگا، بلکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ اسی تجویز کی عملیت کا نشان ہے۔ وہ ایسے کاروبار کے ذریعے سے دولتمند بنے جس کے لیے وہ دلیلوں سے ثبوت فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ وہ صرف ایک واضح نتیجہ چاہتے ہیں، اگرچہ وہ اعتدال پر مبنی ہو۔ وہ مجرد دلیل نہیں چاہتے۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ ایسی دلیل زندگی کے حقائق کی شکل میں ڈھل کر آئے۔ ایک بے صبر نوجوان نے ایک مرتبہ کہا کہ پیل کی دلیلوں میں کہیں رکاوٹ معلوم نہیں ہوتا، لیکن اسی امر نے رابرٹ پیل کو ہمارے وقت کے دارالعوام کا بہترین لیڈر بنا دیا۔ ہمیں یہی پسند ہے کہ دلیل میں سے درشتی نکال لی جائے اور اصل جوہر باقی چھوڑ دیا جائے۔"

خلاصہ یہ کہ بحث و مباحثہ کے ذریعے سے حکومت، ملکۂ معظمہ کی حکومت اور ملکۂ معظمہ کا حزبِ اختلاف دونوں مقررہ آداب کے پابند تھے۔ دونوں روود بار انگلستان اور برطانوی تجربات کی پناہ میں ایک خوشحال سرزمین کے اندر جہاں طبقاتی جھگڑے اور حد بندیاں زیادہ گہری نہ تھیں۔ ان تمام چیزوں نے باشندگانِ برطانیہ میں مفاہمت، پابندیِ قانون اور اک گونہ سیاسی کھلاڑی پن کے عادات پیدا ہوئے۔ یہ عادات بیسویں صدی کے وسط میں بھی موجود ہیں، جب وکٹوریہ کے عہد کا جغرافیائی تحفظ ہوائی جہازوں کے ساتھ ختم ہو چکا اور وکٹوریہ کے عہد کی خوشحالی صنعتی میدان میں مقابلہ کرنے والی قوموں کے ظہور سے کافور ہو گئی۔

افادیت پسندوں کی اصلاحات

۱۸۳۲ء کے قانونِ اصلاح کے بعد بڑی بڑی اصلاحات کے مزید اقدامات ہوئے، جن سے انگریزوں کی نہ سیاسی بلکہ اقتصادی و عمرانی زندگی میں بھی تغیرات کو مدد ملی۔ ان اصلاحات کی تحریک بڑی حد تک طبقۂ اوسط کے اس چھوٹے، مگر ذی اثر گروہ سے ملی، جسے فلسفی انتہا پسند یا افادیت پسند کہتے تھے۔ اس گروہ کے افراد بنتھم کے شاگرد اور تنویر سے مستفید تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسانوں کو تعلیم مل جائے تو وہ معقول منفعتِ ذاتی کی رہنمائی میں خود بخود وہ سب کچھ کرنے لگیں، جو ہم جنسوں کے لیے بہترین ہیں۔ ان فلسفی انتہا پسندوں کے زیرِ اثر برطانیہ کی مقامی حکومت اور قانونی نظام میں خاص سادگی پیدا ہو گئی اور بعض کا ڈیں

ے ہیج ہارٹ کی کتاب THE ENGLISH CONSTITUTION (دستورِ انگلستان) ص ۱۴۳ - ۱۴۴

ختم ہو گئیں، جو مدّت سے چلی آتی تھیں اور جن سے حکمرانی کی صلاحیت پر اثر پڑتا تھا۔ طبقۂ اوسط کے انتہا پسندوں کا یہ بھی پختہ عقیدہ تھا کہ بہترین حکومت وہی ہے، جو حکمرانی سے کم از کم سروکار رکھے۔ اور ان کی کوشش یہ تھی کہ حکومت کے محدود سروکار سے جلد از جلد فائدہ اٹھائیں، نہ یہ کہ اس کے کام میں اضافہ کر دیں۔ تعلیم پر انھیں پورا بھروسہ تھا، لیکن جبری تعلیم پر۔ نجی تعلیم کا انتظام ان کی رائے میں ایسا ہی تھا کہ حکومت جو کچھ کر رہی تھی، اسے زیادہ ناقص طریق پر اور زیادہ بڑے رنگ میں کیا جائے۔ چنانچہ برطانوی تعلیم عام کی اصلاح میں حکومت نے ۱۸۷۰ء تک کوئی بڑا قدم نہ اٹھایا۔ اس اثناء میں افادیت پسند نجی وسائل سے کام لے کر میکانیکی اداروں اور بالغوں کی تعلیم کے دوسرے وسائل کی تبلیغ کرتے رہے۔ انھوں نے نجی سکولوں اور لندن، مانچسٹر اور بعض دوسرے شہروں کی یونیورسٹیوں کی بھی سرپرستی کی۔

افادیت پسندوں کی خاص اصلاح، جس نے رائے عامہ کو خوب بیدار کر دیا، ۱۸۳۴ء کے نئے "قانون بے نوایاں"[1] کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ اس مسودۂ قانون میں عوام کی امداد کے ایک پُرپیچ نظام کو زیادہ مرتب، زیادہ مدوّن اور زیادہ مرکزی بنا لیا گیا تھا، جس کی ابتدا ایلزبتھ کے "قانون بے نوایاں" (۱۶۰۱ء) اور ٹیوڈروں کے ابتدائی قوانین سے ہوئی، بلکہ اس میں ایک پہلو زیادہ قابل توجہ تھا۔ اس نے امداد کی بنیاد بدل دی۔ مفلسین کی امداد کا جو پرانا طریقہ تھا، اس نے رفتہ رفتہ عجیب صورت اختیار کر لی تھی، یعنی مختلف حلقوں میں جو کم اُجرت پانے والے مزدور رہتے تھے، انھیں کچھ رقم زائد دے دی جاتی۔ بچوں کے لیے اس میں اضافہ کر دیا جاتا۔ یہ امداد تو تھی، لیکن فیاضانہ نہ تھی اور اس میں خاصی تاخیر ہو جاتی تھی۔ نئے نظام کے تحت تاریخ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ افادیت پسندوں کو انسانی عقل پر پورا بھروسا تھا، لیکن وہ لوگوں کی طبعی کسلمندی سے ڈرتے تھے۔ انھوں نے "قانون بے نوایاں" پر عمل کے لیے یونینیں بنا دیں، جن کے ذریعے سے حلقوں کو متحد کر کے زیادہ کارگر بنا دیا گیا اور خود کارگاہوں میں بے نواؤں کی امداد شروع کر دی۔ اس سے سلیم الاعضاء بے نواؤں کو خاصی تکلیف ہوتی تھی اور تکلیف سے بچنے کے لیے وہ باہر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے، تاکہ اپنی ضروریات کے خود کفیل بن سکیں۔ نئے قانون بے نوایاں نے بالائی طبقے کے انسانیت دوستوں کو سخت صدمہ پہنچایا اور یہ ان جمہوریت پروروں کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا، جنھوں نے پہلے قانون اصلاح کی حمایت اس توقع پر کی تھی کہ اس سے مزدور طبقوں کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ بہ ایں ہمہ نیا قانون طبقۂ اوسط کے کاروباری آدمیوں کے نقطۂ نگاہ سے بہتر تھا، کیونکہ اس سے بے نواؤں کو جو امداد ملتی تھی۔ وہ انھیں زیادہ سرگرم اور زیادہ کفایت شعار بناتی۔

آزاد تجارت افادیت پسندوں کی سب سے بڑی اصلاح، جس کے نتائج دیرپا تھے، ۱۸۴۶ء میں قوانینِ غلّہ کی

---

[1] Poor Law

تنسیخ تھی۔ اس کے لیے اُس جمعیت نے طویل مہم جاری رکھی، جو قانونِ غلّہ کی مخالفت کے لیے بنی تھی۔ اس گروہ نے دونوں سیاسی پارٹیوں پر مؤثر دباؤ ڈالا۔ غلّے پر محاصل کے خلاف تحریک کی رہنمائی رچرڈ کابڈن[1] نے کی۔ وہ یقیناً ایک ایجی ٹیٹر تھا، مگر اتنا معزز، اتنا عالی حوصلہ، وکٹوریائی ثقافت کا ایسا پیکر کہ وہ ایجی ٹیٹر معلوم نہیں ہوتا۔ آزاد تجارت کے حامی چاہتے کہ ایک ایسی سیاستِ مدن جاری ہو جاتی، جس میں غذائی جنسیں اور خام مال محاصل کے بغیر باہر سے آسکیں اور مصنوعہ اشیاء ملک سے درآمد کی قیمت ادا کرنے کے لیے برآمد کی جائیں۔ یہ مقصد پورا ہو گیا۔ آگے چل کر ایک اور صدی میں برطانیہ کے لیے مشکل یوں پیش آئے گی کہ دنیا کے دوسرے حصے بھی صنعتی کارگاہیں بن جائیں گے۔ فوری اثر یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے اوائل میں محاصل کی پابندی انگریزی زراعت کے حق میں تھی، جس کے باعث ارزاں غلّہ درآمد کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔ اسی مشکل کو ختم کرنے کے لیے انگریز صنعت کار تیار ہوئے اور قوانینِ غلّہ کے خلاف مہم جاری ہوئی۔ ۱۸۴۶ء میں کامیابی اس بنا پر حاصل ہوئی کہ کنسرویٹو لیڈر رابرٹ پیل کو ہمنوا بنا لیا گیا۔ چنانچہ پیل کے پیرووں اور لبرلوں کے اتحاد نے یہ مسودہ منظور کرایا۔ گویا برطانوی قوم آزاد تجارت کی حامی بن گئی۔ دنیا میں یہی ایک بڑی قوم تھی، جس نے آزاد تجارت کا سلسلہ جاری کیا، مگر کبھی تجارتی نظریۂ زر کے تصورات اور عادات گم نہ کیے۔

مزدوروں کی بنیاد

اصلاحات کے ایک اور سلسلے نے ڈزرائیلی اور گلیڈسٹون کے انگلستان کو زیادہ خوشحال بنانے میں مدد دی۔ یہ کارخانوں کے قانون تھے، جو ۱۸۰۲ء اور ۱۸۱۹ء میں ان مسوّدات سے شروع ہوئے، جن کی تائید رابرٹ پیل کے باپ نے کی۔ جو لوگ تاریخ کی اقتصادی تعبیر کے رسیا ہیں، کہتے ہیں کہ یہ اصلاحات بھی طبقۂ اوسط نے کرائیں، جس طرح انھوں نے یہ "قانونِ بے نوایاں" منظور اور قوانینِ غلّہ منسوخ کرائے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے زمینداروں اور بالائی طبقے کے اہلِ علم نے یہ قانون منظور کرائے۔ جنھیں شہریوں کی نئی دولت پر حسد تھا اور وہ صنعتی قصبوں کی بدوضعی اور مکروہ حالات سے متاثر تھے۔ انہوں نے کارخانوں کے قانون بنوائے تاکہ کام کے اوقات باضابطہ ہو جائیں، حفظِ صحت بہتر نظر آئے، عورتوں اور بچوں سے کام لیا جائے۔ یہ درست ہے کہ تحریک کے بہت سے لیڈر، جنھوں نے حکومت کے اختیار کو اقتصادی آمدنی کے بعض حصوں کی باقاعدگی کے لیے استعمال کیا، خود کاروباری یا صنعت کار نہ تھے۔ یا تو وہ حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے پرانے ٹوری تھے یا اہلِ علم مثلاً ڈزرائیلی، کارلائل، رسکن اور میتھو آرنلڈ، جنھوں نے عہدِ وکٹوریہ کے خوشحال انگلستان میں مزدوروں کی حالتِ زار کے متعلق تقریریں کیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ برطانیہ کے کاروباری طبقے کا رسمی فلسفہ عدم مداخلت تھا، مگر عمل کا معاملہ دوسرا تھا۔ کارخانوں کے قوانین یا انیسویں صدی کی ایسی دوسری اصلاحات میں سے کوئی بھی پارلیمنٹ کے اندر منظوری حاصل نہ

---

۱ RICHARD COBDEN

کرسکتا تھا، جب تک دونوں پارٹیوں کی طرف سے حمایت حاصل نہ ہوتی۔ مزید برآں نہ بڑے بڑے زمیندار، نہ صنعتکار اور کاروباری آدمی حقیقتاً الگ الگ طبقے تھے۔ تعلیم، شادی اور اقتصادی مفاد میں بھی وہ بالکل مخلوط تھے۔ بڑے بڑے زمینداروں نے تمسکات اور کمپنیوں میں روپیہ لگا رکھا تھا۔ صنعتکاروں کا روپیہ اراضی جاگیرات میں لگا ہوا تھا۔ رابرٹ پیل کا باپ، جو کارخانوں کے قوانین کا واضع تھا، اپنی سعی و ہمت سے صنعتکار بنا۔

قوانین کارخانہ جات سے بھی ایک نتیجہ نکلا، جو اِن قوانین سے چنداں مختلف نہ تھا، جو حق رائے کی اصلاح کے لیے بنے تھے۔ ابتدائی قوانین بہت ہی معمولی تھے۔ ان میں صرف بعض خوفناک حالات کی اصلاح منظور تھی۔ مثلاً ۱۸۱۹ء کے قانون کا تعلق صرف روئی کی صنعت سے تھا۔ اس کے مطابق رات کے وقت بچوں سے کام لینے کی ممانعت کردی گئی تھی اور دن کا کام صرف بارہ گھنٹہ رکھا گیا تھا، مگر اس میں موثر نگرانی کا کوئی انتظام نہ تھا اور بہت سے کارخانہ دار اس کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ ۱۸۳۳ء کے قانون کے مطابق نو سال سے کم عمر کے بچوں کو مزدوری سے بالکل روک دیا گیا۔ تیرہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے کام کے صرف نو گھنٹے رکھے گئے اور اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے بارہ گھنٹے۔ ساتھ ہی تنخواہ دار انسپکٹر مقرر کر دیئے گئے، جو اس قانون کے نفاذ پر نظر رکھتے تھے۔

انیسویں صدی کے اختتام پر کتاب ضوابط میں مزدوروں کے متعلق ایک خاصا مجموعۂ قوانین شامل ہو چکا تھا، مثلاً ہر مزدور کے لیے کام کے اوقات کا تعین، عورتوں اور بچوں کے لیے خاص حفاظت کا انتظام اور ایسی قانونی دفعات کا انتظام، جن کے مطابق کارخانہ دار صنعتی حادثوں میں مزدوروں کو معاوضہ دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں قومی انشورنس کا (بیمہ) قانون بنا، جس کے مطابق حکومت، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی طرف سے ایک رقم صحت اور بے روزگاری کے بیمے کے لیے لازماً وصول کی جاتی۔ غرض لیبر پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے سے پیشتر برطانیہ میں فلاحی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

تیسواں باب

برطانیہ

(۲)

سنہ ۱۸۱۵ء - سنہ ۱۹۱۴ء

تعلیم

تعلیم کے سلسلے میں بھی یہی صورت پیش آئی کہ جزواً جزواً اصلاح ہوتے ہوتے ایک اچھی خاصی منزل طے ہو گئی۔ ابتدا میں خیال تھا کہ تعلیم حقیقتاً حکومت کا وظیفہ نہیں، اس وجہ سے سنہ ۱۸۷۰ء تک عام تعلیم کا قانون رکا رہا۔ معاملے میں پیچیدگی انگلیکیوں اور مسیحی غیر مقلدوں کے جھگڑے سے پیدا ہوئی، کیونکہ بہت سے سکول جو موجود تھے ایک سوسائٹی کے زیر نگرانی تھے، جو کلیسائے انگلستان کے نظریات کے مطابق جبری تعلیم کی قائل تھی۔ سنہ ۱۸۷۰ء سے پیشتر بھی پریوی کونسل کی کمیٹی مقامی تعلیمی بورڈوں کو قومی خزانے سے امداد دے کر تعلیم کی قائل تھی (سنہ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۶۰ء میں ان گرانٹوں کی تعداد دس لاکھ پونڈ تک پہنچ چکی تھی)۔ اس کمیٹی نے تعلیم کے لیے انسپکٹروں کا انتظام کیا اور معلموں کی تربیت کی تنظیم میں امداد دی، لیکن مدرسوں میں شریک ہونا لازم نہ تھا اور سکول چھوڑنے کا اوسط عمر گیارہ سال رکھا گیا تھا جب ۱۸۶۷ء میں مزدوروں کو حق رائے مل گیا تو تشویش زدہ ٹوریوں اور برلوں نے نعرہ لگانا شروع کیا کہ اپنے آقاؤں کو تعلیم دو۔ سنہ ۱۸۷۰ء کا مسودۂ قانون ولیم فورسٹر[1] نے پیش کیا، جو گلیڈسٹون کی وزارت میں وزیر تعلیم تھا۔ اس کے مطابق ابتدائی سطح پر جبری قومی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ مقامی بورڈوں کو اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ بچوں کو حاضری پر مجبور کریں۔ لیکن قومی امداد اور نگرانی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ مذہبی مشکل کا حل یہ تجویز کیا گیا کہ جن سکولوں کو امداد ملتی ہے، وہاں غیر فرقہ وار تعلیم دی جائے۔ طلبہ کی طلب کے مطابق تعلیم نہ دی جائے۔ کلیسائی درسگاہوں کو خزانۂ عامہ سے امداد دی گئی اور یہ سلسلہ ہمارے زمانے تک جاری رہا۔

بہ ایں ہمہ اس قانون کے ذریعے سے وسیع پیمانے پر جبری تعلیم کی بنیاد استوار ہو گئی اور صدی کے اواخر تک برطانیہ میں ناخواندگی تقریباً ناپید ہو چکی تھی۔ ابتدا اُن درسگاہوں سے ہوئی، جو عوامی مدد سے چل رہی تھیں اور ثانوی تعلیم سے یہ سلسلہ شروع ہوا، اگرچہ برطانوی پبلک سکولوں نے جنھیں امریکہ میں پرائیویٹ سکول کہتے ہیں، برطانوی عمرانی

---

[1] FORSTER

نظام میں اپنی خاص حیثیت ہمارے زمانے تک قائم رکھی۔ جرمنی، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پبلک سکولوں کے جو نظام تھے، ان کے مقابلہ میں برطانیہ کا تعلیمی نظام پہلی عالمی جنگ تک انتظامی نقطۂ نگاہ سے پُرپیچ اور غیر مادی قواعد سے لبریز تھا۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی یہ نظام کامیاب رہا اور برطانیہ کا عام تعلیمی درجہ کم از کم دوسری جمہوریتوں جتنا بلند ضرور تھا۔

منشوریت

انیسویں صدی کی صرف ایک بڑی اصلاحی تحریک بہ ظاہر کاملاً ناکام رہی۔ یہ "منشوریت"[١] کی تحریک تھی، جس نے انیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے سیاسی ہنگاموں میں بڑا کردار ادا کیا اور قدامت پسند طبقوں کو بڑی حد تک چونکا دیا۔ منشوریت کے حامی برّ اعظم کی ان انتہا پسند پارٹیوں سے قریب تر تھے جنھوں نے انقلاب فرانس میں جنگجو بنوں کی روایت کی پیروی کی۔ ان میں نو مولود اشتراکیت کے عناصر شامل تھے۔ ان لوگوں نے ایک پروگرام تیار کر لیا تھا، جسے عوامی منشور کا نام دیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ تمام بالغوں کو حق رائے ملے۔ ووٹ خفیہ دیئے جائیں۔ پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے جائداد کی شرط منسوخ کر دی جائے۔ ممبروں کو تنخواہیں ملیں۔ حلقہ ہائے انتخاب یکساں رکھے جائیں اور ہر سال پارلیمنٹ کا انتخاب ہو۔ اس جماعت کی اصل قوت صنعتی شہروں کے پرولتاری تھے، خصوصاً پرولتاریوں کے زیادہ سرگرم اور انتہا پسند ممبر، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر ان کی مرضی کے مطابق سیاسی جمہوریت قائم ہو گئی تو عوام انھیں کو ووٹ دیں گے، وہ پوری اشتراکیت قائم نہ کر سکیں گے تو کم از کم تدریجی انکم ٹیکس کے ذریعے سے آمدنیاں ایک سطح پر لے آئیں گے۔ ان کے لیڈر اکثر نظریہ باز انتہا پسند تھے، جو مختلف افکار پر باہم جھگڑتے رہتے اور مذہب جیسے معاملات میں سرمایہ داروں کے احساسات کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں کی اکثریت ان سے خوفزدہ ہو گئی، کیونکہ سمجھا جاتا تھا، منشوریت کے حامی انگلستان کو اسی راستے پر لے جانا چاہتے ہیں، جس پر چل کر فرانسیسیوں نے وحشت و دہشت پیدا کیا۔ یہ تحریک اس وقت افسردہ ہوئی، جب پارلیمنٹ کے پاس بے اندازہ دستخطوں سے ایک محضر پیش کیا گیا، جس پر کبھی غور نہ ہوا۔ پھر صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے میں خوشحالی بڑھ گئی تو ساتھ ہی یہ تحریک بھی مر گئی۔ تاہم ابتدائی حامیانِ منشور کے پروگرام میں ایک کے سوا ـــ پارلیمنٹ کے سالانہ انتخاب کا مطالبہ، جسے امراء انتہا پسند بھی بے معنی سمجھنے لگے تھے ـــ ہر مطالبہ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑنے تک پورا ہو چکا تھا۔

خارجہ پالیسی

انیسویں صدی میں برطانوی پارٹیوں کی بہ ظاہر ۱۹۱۴ء کے باوجود ان کا بنیادی اتحاد زیادہ واضح طریق پر خارجی روابط میں نمایاں ہوا۔ مثبت معاملات کے متعلق سینکڑوں تفصیلات کے باب میں کشمکش یقیناً حقیقی ہے، لیکن برطانوی پالیسی کے عام خط و خال میں بنیادی اتحاد بھی اتنا ہی یقینی ہے۔ تقریباً تمام اہل برطانیہ ملک کے

---

[١] CHARTISM اس کی پوری کیفیت مصنفین نے متن میں پیش کر دی ہے۔

اساسی موقف کے باب میں متفق الرائے تھے، یعنی یورپی معاملات میں توازن قائم رکھنا فوجی اقدام کے بجائے سفارتی سعی و کوشش کو مرجح سمجھنا۔ یورپ میں کسی نئے علاقے کی خواہش نہ رکھنا، برطانوی بحریات کے ذریعے سے سمندروں کی دیکھ بھال کرنا، برطانوی مال، دنیا بھر کی منڈیوں میں بھیجنا۔ برطانوی سلطنت کا وسیع جال قائم رکھنا ـــــ افریقہ میں اسے توسیع دینا ـــ جو خود مختار علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انگریزی بولنے والے علاقے بھی شامل ہیں اور وہ استعماری مقبوضات بھی، جن میں سیاہ فام لوگ رہتے ہیں۔ یہ یقیناً درست ہے کہ لبرل قولاً اور بہ اعتبار جذبات یورپ میں لبرل قومی تحریکوں کے ساتھ تھے اور انھیں اطالویوں، یونانیوں اور پولستانیوں کی جدوجہد آزادی سے ہمدردی تھی اور وہ میٹرنخ کی پالیسی پر چلنے والے ملکوں کو پسند نہیں کرتے تھے، خصوصاً روس کو۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک لبرل ـــ یا کہنا چاہیے، آخری دور کے وِھگ ـــ وزیر خارجہ مثلاً پامرسٹن نے صدی کے وسط میں مظلوم قوموں کے لیے مداخلت کی سرگرم پالیسی اختیار کی اور اٹلی کے اتحاد میں برطانیہ کی ہمدردی بھی ایک بڑا عامل تھی۔

تاہم سنہ ۱۸۱۵ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان برطانیہ صرف ایک یورپی جنگ میں شریک ہوا اور وہ کریمیا کی جنگ (سنہ ۱۸۵۴ء ـــ سنہ ۱۸۵۶ء) تھی جس میں فرانس اور انگلستان حلیفوں کی حیثیت میں ترکی کو بچانے اور مشرق قریب میں اپنے مفادات کو روسی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے روس کے خلاف شریکِ جنگ ہوئے۔ اس جنگ میں دونوں فریق ایک حد تک غلطی پر تھے، تاہم اس سے کم از کم مدت کے لیے روسی پیش قدمی رک گئی اور زوال پذیر ترکی سلطنت کے برطانوی خطوں کا فیصلہ پورے یورپ کا معاملہ بن گیا۔ یہ جنگ بھی دراصل توازنِ قوی کے لیے تھی، جس میں برطانیہ نے اپنے روایتی کردار کے مطابق اس بڑی طاقت کے خلاف ہتھیار اٹھائے، جو بہ ظاہر ناواجب انداز میں علاقوں پر متصرف ہو رہی تھی یا اپنا دائرہ اثر بڑھا رہی تھی۔

سامراجی پالیسی

جس حد تک سامراجی پالیسی کا تعلق ہے، پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی رائے عامہ بُری طرح بٹی ہوئی تھی۔ ڈزرائیلی اور گلیڈسٹون کے درمیان ایسا تیز و تند معرکہ کبھی نہ ہوا، جب کنسرویٹو سلطنت کی عظمت کا دفاع کر رہے تھے اور لبرل ملک کے اندر اور باہر سامراج کو ایک غیر مسیحی اور غیر دانشمندانہ چیز قرار دے کر مذموم ظاہر کر رہے تھے۔ یہ کہنا بے سود ہوگا کہ [illegible]، ان دونوں کے درمیان کوئی حقیقی فرق نہ تھا۔ ڈزرائیلی نے ایک طرف اپنی ملکہ وکٹوریہ کو شاہی سے بھی اونچا منصب دے دیا یعنی قیصرہ ہند (سنہ ۱۸۷۶ء)۔ جب خدیو مصر مالی مشکلات میں مبتلا ہوا تو ایک فرانسیسی کی بنائی ہوئی نہر سویز کے حصے خدیو سے خرید لیے۔ اس طرح [illegible] پر برطانوی اقتدار کی ابتدا ہوئی۔ دوسری طرف گلیڈسٹون نے افغانستان سے فوجیں واپس بلالیں۔ برطانوی جنرل گورڈن[1] کے حالات سے تغافس [illegible] ار کر لیا جسے سوڈان میں باغیوں[2]

---

[1] GORDON [2] (مترجم) سید محمد احمد ـــ جو مہدی سوڈان کے لقب سے مشہور ہیں ـــ کے ساتھیوں (بقیہ اگلے صفحہ)

نے محصور کر لیا تھا۔ جنوبی افریقہ میں بوئروں کی جمہوریت کا حق آزادی تسلیم کر لیا، تاہم گلیڈسٹون نے ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر فوجیں قائم رکھیں۔ اسی کے عہدِ وزارت میں برطانیہ نے سکندریہ پر بمباری کی۔ (۱۸۸۲ء) اور مصر پر ضبط و نظم کر لیا۔ پھر گلیڈسٹون نے گورڈن کے بچاؤ کے لیے فوجیں بھیجیں، اگرچہ وہ وقت کے بعد پہنچیں اور جنوبی افریقہ میں بھی بوئروں کی جمہوریت برطانیہ کی سیادت میں آزاد کی گئی۔ غرض گلیڈسٹون کو سلطنت پر تاسف تھا اور اس سے غفلت بھی برتی، تاہم اسے قائم رکھا۔

من حیث الکل دونوں پارٹیوں نے برطانیہ اور سمندر پار کی نوآبادیوں کے درمیان نہایت عمدہ ربط ضبط ممکن بنایا۔ اسی طرح نوآبادیوں ــــ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ ــــ میں ذمہ دار حکومت کے فکر و عمل میں نشو و ارتقاء ہوا۔ اس سلسلے میں پہل لبرلوں نے یا لبرل مشہور ہونے سے پیشتر وھگوں نے کی۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے تاریخ سے سبق سیکھ لیا تھا۔ صدی کے چوتھے عشرے میں کچھ مدت کے لیے معلوم ہو رہا تھا کہ غالباً کینیڈا بھی وہی راستہ اختیار کرے گا، جو ۱۷۷۶ء میں ریاستہائے متحدہ کی تیرہ نوآبادیوں نے اختیار کیا تھا۔ کینیڈا کی جنوبی (فرانسیسی) اور شمالی (انگریز یا سکاٹ اور انگریز) مستعمراتی مجلسیں گورنروں اور مشیروں سے جھگڑ رہی تھیں، جو تاجِ برطانیہ کی طرف سے مقرر ہوتے تھے اور اسی کے روبرو جوابدہ تھے۔ ۱۸۳۷ء میں ان جھگڑوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نوآبادیوں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ ایک بڑے وھگ امیر ڈرہم کو وہاں بھیجا گیا اور ۱۸۳۹ء میں بغاوت فرو ہو جانے کے بعد اس نے اپنی مشہور روداد میں شمالی و جنوبی کینیڈا کے وفاق کی سفارش کر دی۔ ساتھ ہی کہہ دیا کہ انھیں داخلی آزادی دے دی جائے۔ آخری سیاسی فیصلے رائے عامہ سے منتخب شدہ مجلسوں اور ان کے کابینوں نے کیے۔ برطانوی گورنر صرف تاج کی نمائندگی کی ایک نشانی رہ گیا۔ وہ اتنا ہی با اختیار تھا جتنی وکٹوریہ برطانیہ میں با اختیار تھی۔

ڈرہم کی روداد محض ایک ابتدا تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۴۰ء کے قانونِ اتحاد کے مطابق بالائی اور زیریں کینیڈا کو متحد کر دیا۔ ذمہ دار حکومت خالص برطانوی انداز میں کسی رسمی قانون کے ذریعہ سے نہ آئی، بلکہ ۱۸۴۹ء میں عملاً قائم ہو گئی، جب لارڈ ایلجن[1] کینیڈا کا گورنر جنرل تھا۔ ۱۸۶۷ء میں برطانیہ نے شمالی امریکہ کے قانون کے ذریعے سے بحری صوبے کینیڈا میں شامل کر دیئے اور اسے ایک مستقل ڈومینین بنا دیا۔ مغربی کینیڈا کی وسیع زمینیں نوآبادیوں کے لیے کھلی چھوڑ دی گئیں۔ وہاں آہستہ آہستہ نئے صوبے بن گئے۔ بالکل ویسی ہی صورت پیش آئی، جیسی ریاستہائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۴) کو باغی قرار دینا ایک خوفناک تاریخی غلطی ہے۔ سوڈان گورڈن مصریوں کا تھا یا سوڈانیوں کا؟ وہاں ناقابلِ برداشت ظلم و جور ہو رہا تھا۔ سید محمد احمد کے پیروؤں نے اس ظلم و جور کے خاتمے اور سوڈان کی آزادی کے لیے جہاد کیا۔ وہ آزادی کے مجاہد تھے جو استبداد کے خلاف لڑے، باغی نہ تھے۔

[1] Elgin

متحدہ میں پیش آئی تھی، یعنی مغربی حصے نو آبادیوں کے قیام اور نئے صوبوں کی تاسیس کے لیے کھلے پڑے تھے۔ پورا عمل اتنا سہل نہ تھا جتنا سرسری بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیوبک کے صوبے میں فرانسیسی بولنے والے لوگ موجود تھے اور اس وجہ سے وہاں خاص مشکلات رونما ہوئیں۔ یہ معاملہ صبر و سکون ہی سے طے کیا جا سکتا تھا۔ غالباً یہی مشکلات اس امر کا باعث ہوئیں کہ قانوناً کینیڈا کو ریاستہائے متحدہ کی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ریاستی حقوق حاصل ہیں۔

یہی عمل دوسری برطانوی نو آبادیوں میں جاری ہوا۔ وہاں بھی مشکلات پیش آئیں۔ جداگانہ آسٹریلوی نو آبادیوں کو ۱۸۵۰ء میں داخلی آزادی دے دی گئی تھی اور وفاقی اتحاد (فیڈرل یونین) ۱۹۰۱ء میں بنا، جب آسٹریلیا دولتِ مشترکہ کا جزو بن گیا۔ نیوزی لینڈ نے نو آبادی کا درجہ ۱۹۰۷ء میں حاصل کیا۔ سب سے بڑھ کر مشکل مسئلہ جنوبی افریقہ کا تھا، جسے جنوبی افریقہ کی یونین کے اندر ۱۹۱۰ء میں شامل کیا گیا۔ یہ یونین انتہائی مشکلات کے بعد بنی تھی۔ یہاں کی قومی اور نسلی کشمکش کے حالات ایسے تھے کہ یہ خطہ بیسویں صدی کے وسط تک بھی برطانوی دولتِ مشترکۂ اقوام سے نامکمل طریق پر مرتبط رہا۔[1]

مسئلہ آئرلینڈ

خود برطانیہ کے نزدیک ایک قومیت کا مسئلہ انیسویں صدی کے اواخر میں زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا۔ اس مسئلے کے سلسلے میں کنسرویٹو اور لبرل پارٹیوں کے درمیان اختلاف قول سے آگے بڑھ گیا۔ یہ آئرلینڈ کا مسئلہ تھا۔ آئرلینڈ کا مسئلہ انگلستان میں اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب انگلستان کے نارمنوں نے بارھویں صدی میں آئرلینڈ کو فتح کیا تھا۔ اس وقت سے یہ مسئلہ کبھی نازک صورت اختیار کر لیتا، کبھی معمولی حالت پہ آ جاتا۔ جو انگریز اور سکاٹ سولھویں اور سترھویں صدی میں آئرلینڈ کے صوبہ السٹر کے اندر آباد ہو گئے تھے، وہ بڑی بڑی جاگیرات پہ قابض رہے اور ان کے کسان مقامی آئرستانی تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز پہ ان شہروں نے دونوں مملکتوں کے رسمی اتحاد سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔ تجویز یہ تھی کہ آئرلینڈ کے نمائندے برطانوی پارلیمنٹ میں شامل ہو جائیں، جہاں وہ بہر حال اقلیت میں رہتے۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کی جو مزاجی کیفیت تھی، اس کے پیش نظر آئرستانیوں کو تمام سیاسی حقوق سے محروم رکھنا بالکل ناممکن تھا۔ ابتدا ۱۸۲۹ء کے قانون سے ہوئی، جسے کیتھولکوں کی آزادی کا قانون کہا جاتا ہے۔[2] ساتھ ہی حق رائے میں متعدد اصلاحات ہوئیں۔ یہ تمام قوانین آئرلینڈ میں بھی جاری ہو گئے۔ آئرستانیوں نے ڈینیل اوکونل[3] کی سرکردگی میں جسے نجات دہندۂ اعظم کا لقب ملا، سیاسی تنظیم کر لی، تاکہ اصلاحات کیلئے زور دیا جا سکے۔ پھر ویسی ہی داخلی خود مختاری تدریجاً حاصل ہونے لگی، جیسی نو آبادیوں کو حاصل تھی۔ آئرستانی محض سیاسی داخلی خود مختاری (ہوم رول) کے

---

[1] اب جنوبی افریقہ کی جمہوریت دولت مشترکہ سے الگ ہو چکی ہے۔

[2] Catholic Emancipation Act اس کا مطلب یہ ہے کہ کیتھولکوں کو جن حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا، وہ بحال ہو گئے اور انھیں دوسروں کے برابر آزادی مل گئی۔

[3] Daniel O'Connell.

خواہاں نہ تھے، بلکہ چاہتے تھے، زرعی اصلاحات بھی ہو جائیں اور آئرلینڈ میں جو انگلیکی کلیسا قائم تھا، وہ ختم کر دیا جائے۔
صدی کے عشرۂ پنجم میں آلو کی فصل کے تباہ ہونے سے جو قحط پڑا، اس سے انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور آفت نے وہ فصل برباد کر دی، جو آئرلینڈ کی غذا کے لیے حد درجہ ضروری تھی۔ اگرچہ حمل و نقل کے لیے ریلیں اور دخانی جہاز موجود تھے، مگر حکومت برطانیہ نے منظم طریق پر فوری اور سرگرم وسائل اعانت کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ نہ کوئی ایسی بین الاقوامی تنظیم موجود تھی، جو صلیب احمر کی طرح امداد کا انتظام کر سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب کے قلب میں ازمنۂ وسطیٰ ایسا قحط پڑ گیا، جس میں لاکھوں آدمی بھوک سے مر گئے اور لاکھوں وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر ریاست ہائے متحدہ امریکہ چلے گئے۔ تارکینِ وطن نے برطانیہ کے لیے مشکلات پیدا کر دیں، کیونکہ یہ لوگ جہاں گئے، انگریزوں کے خلاف بغض و عناد ساتھ لے گئے۔ انھوں نے مختلف جتھے بنا لیے۔ جیسے ایک جتھا "فینین برادری"[1] کے نام سے نیویارک میں بنا تھا (۱۸۵۸ء)۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آئرستانیوں کو برطانیہ کی مزاحمت کے لیے تیار کیا جائے اور اس سلسلے میں سرمایہ جمع کیا جائے۔ غرض برطانیہ کے خلاف ہنگامہ آرائی جہاں کہیں شروع کی جا سکتی تھی، شروع کر دی گئی۔

حکومت برطانیہ نے جزواً جزواً اصلاحات کیں۔ ۱۸۶۹ء میں انگلیکی کلیسا آئرلینڈ کے اندر توڑ دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں آئرلینڈ کے قانون اراضی سے زرعی اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ مزارعین کو مالکانِ اراضی کے استحصال بالجبر سے محفوظ کیا جائے۔ بڑے بڑے زمیندار کبھی فوجی خدمت کے سلسلے میں آئرلینڈ آئے ہوں گے۔ پھر وہاں سے چلے گئے۔ چونکہ آئرلینڈ میں آبادی زیادہ تھی اور مقابلہ شدید تھا، اس لیے وہ جتنا زیادہ مالیہ وصول کر سکتے، کر لیتے جو اصلاحات کی گئیں، وہ نہ تو زیادہ دور رس تھیں اور نہ تیزی سے جاری ہوئیں، کہ آئرستانیوں کو مطمئن کر سکتیں۔ مزید برآں ابتدائی تعلیم کے ساتھ آئرستانی قومیت کی جذباتی قوت میں اضافہ ہو گیا اور عام ادبی و ثقافتی معاملات میں قومی خود آگاہی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی۔ گویا آئرلینڈ کا مسئلہ صرف زمین یا مذہب ہی کا مسئلہ نہ تھا، بلکہ ثقافتی اختلافات اور قومیت کے شعور نے بھی خاصا اونچا درجہ حاصل کر لیا تھا، جسے دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ صدی کے آٹھویں عشرے میں چارلس پارنل[2] نام ایک زبردست آئرستانی لیڈر بروئے کار آ گیا۔ وہ خود پروٹسٹنٹ تھا اور ایک سابق انگریز عسکری کے اخلاف میں سے تھا، لیکن پختہ آئرستانی محب وطن تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں آئرستانی قوم پروری کی قیادت پارنل کے ہاتھ آئی تو اس نے تمام قوم پروروں کو متحد کر کے ایک استوار و منظم پارٹی قائم کر لی۔ اگرچہ اس پارٹی کے ممبروں کی تعداد ایک سو سے بھی کم تھی، لیکن وہ لبرل اور کنسرویٹو پارٹیوں کے درمیان جب چاہتے، توازن بدل سکتے تھے۔

۱؎ Fenian Brotherhood یہ آئرلینڈ کی ایک انقلابی انجمن تھی۔ فن (Fun) ایک افسانوی جنگجو تھا جس کے پیرو فی آنا (Fianna) کہلاتے تھے۔ اسی کے نام پر آئرستانیوں نے یہ انجمن بنائی۔

۲؎ Parnell

۱۸۸۵ء میں گلیڈسٹون آئرلینڈ کے لیے ہوم رول کا حامی بن گیا اور اس نے ہوم رول کا پہلا مسودۂ قانون پیش کر دیا، جس کا مفاد یہ تھا کہ آئرلینڈ کی الگ پارلیمنٹ بنا دی جائے۔ سیادت کے متعلق اس پر بعض پابندیاں عائد تھیں اور یہ سب کچھ برطانوی تاج کے ماتحت رکھا گیا۔ گلیڈسٹون کے فیصلے نے اس کی پارٹی میں پھوٹ ڈال دی، جس طرح پیل کے حامیٔ تجارت آزاد بن جانے سے ۱۸۴۶ء میں آزاد کنسرویٹو پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ گلیڈسٹون کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ الگ ہو گیا اور اس نے لبرل یونینسٹ پارٹی کا نام اختیار کیا۔ جوزف چیمبرلین[1] اس پارٹی کا لیڈر تھا جس نے برمنگھم شہر میں اصلاحی لیڈر کے طور پر سیاسی زندگی شروع کی تھی۔ آخر یہ لوگ کنسرویٹو پارٹی میں شامل ہو گئے۔ آئرلینڈ کی مجوزہ علیحدگی پر برطانیہ میں جذبات بھڑک اٹھے اور یہ لوگ آئندہ چند عشروں تک صرف یونینسٹ پارٹی کہلاتے رہے۔ اس مسئلے پر انتخابات ہوئے تو گلیڈسٹون ہار گیا اور ہوم رول وقتی طور پر معرض التوا میں ڈال دیا گیا۔

آئرلینڈ میں جدوجہد جاری رہی۔ جب پارنل طلاق کے ایک معاملے میں الجھا[2] اور نیک دل گلیڈسٹون، نیز اس کے بعض آئرستانی پیروؤں نے پارنل کی لیڈری سے علیحدگی اختیار کر لی تو آئرلینڈ میں شورش تیز ہو گئی۔ ۱۸۹۲ء میں گلیڈسٹون نے آئرلینڈ کے مسئلے پر پھر انتخاب میں کامیابی حاصل کر لی، جس کا درجہ بہت معمولی تھا یا کہنا چاہیے کہ اسے انگریزوں کی اتنی نشستیں مل گئیں، جن کی بنا پر دوسرا ہوم رول بل اکاسی آئرستانی قوم پروروں کی امداد سے دارالعوام میں منظور کرایا جا سکتا تھا۔ دارالامرا میں کنسرویٹو ممبروں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہاں یہ مسودۂ قانون نامنظور ہوا اور اسے دوبارہ ترک کرنا پڑا۔ ۱۸۹۵ء میں کنسرویٹو پارٹی کو دس سال کے لیے حکمرانی کا موقع ملا تو ان کی کوشش یہ رہی کہ لطف و محبت سے ہوم رول کی تحریک ختم کر دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے متعدد زرعی اصلاحات کیں، جن کے مطابق آئرلینڈ چھوٹے چھوٹے مالک کاشتکاروں کا ملک بن گیا۔

تاہم آئرلینڈ لطف و محبت کی دسترس سے باہر جا چکا تھا اور وہاں کا مسئلہ پہلے کی طرح بڑی حد تک اقتصادی و انتظامی نہیں رہا تھا، بلکہ آئرستانی قومیت نے ایک مستقل عقیدے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اسے انگریزی اور گالک[3] زبان کے حیرت انگیز ادبی احیاء سے نشوونما ملی۔ ڈبلیو۔ بی۔ یٹس[4] ایک خانقاہی اہل علم ہے۔ ہمارے زمانے میں اسے دور حاضر کا ایک مشکل گو اور عظیم القدر شاعر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی لوگوں میں پھر پھر کر تلقین کرتا تھا۔ اس نے

---

[1] Chamberlain

[2] پارنل کو مسز روشی سے محبت ہو گئی تھی۔ پہلے یہ محبت چھپی رہی، پھر مسز روشی کی جلد بازی سے یہ طشت از بام ہوئی اور طلاق کا مقدمہ قائم ہوا۔ اس وجہ سے پارنل کی شہرت کو سخت نقصان پہنچا۔

[3] Gaelic اس سے مراد ہے سکاٹ لینڈ کی زبان۔

[4] Yeatos

کیتھلین فی ہولی ہان[1] کے نام سے ایک ایکٹ کا کھیل لکھا، جس کا پس منظر ۱۷۹۸ء کے آئرلینڈ میں رکھا۔ وہاں فرانسیسی انقلابی لنگرانداز ہونے والے تھے۔ کیتھلین آئرلینڈ کا روایتی نشان ہے اور وہ ایک روایتی بڑھیا کے روپ میں پیش ہوتی ہے۔ وہ آئرلینڈ کے ایک لڑکے مکائیل[2] سے باتیں کرتی ہے۔ وہ اسے ایک غریب بوڑھی عورت سمجھتا ہے، جو اس کے گاؤں میں پھرتی رہی۔

مکائیل :۔ بڑی بی! آپ کے ساتھ کوئی مرد نہیں؟

بڑھیا :۔ نہیں۔ بہت سے عاشقوں نے مجھ سے اظہار عشق کیا، لیکن میں نے کسی کے لیے بستر خواب مہیا کرنے کی حامی نہ بھری۔

مکائیل :۔ تو کیا آپ تمام سڑکوں پر پھرتی ہیں؟

بڑھیا :۔ میرے ساتھ میرے افکار ہیں اور میری امیدیں ہیں۔

مکائیل :۔ آپ کیا امیدیں رکھتی ہیں؟

بڑھیا :۔ امید ہے کہ میرا خوبصورت مزارع مجھے پھر مل جائے گا۔ امید ہے کہ اغیار میرے گھر سے باہر نکل جائیں گے۔

مکائیل :۔ بڑی بی! یہ کیونکر ہوگا؟

بڑھیا :۔ میرے اچھے دوست ہیں، جو میری مدد کریں گے۔ وہ اب میری امداد کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ اگر آج انھیں دبا دیا گیا ہے تو کل وہ ضرور غلبہ حاصل کریں گے (بڑھیا اٹھتی ہے) اب مجھے اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے جانا چاہیے۔ وہ میری مدد کے لیے آ رہے ہیں۔ مجھے وہاں پہنچنا چاہیے، تاکہ ان کا خیر مقدم کر سکوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے خیر مقدم کے لیے اپنے ہمسایوں کو جمع کر لوں۔

مکائیل کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ اپنی منگیتر سے رشتہ توڑ کر کیتھلین نی ہولی ہان کی امداد کے لیے روانہ ہو گیا۔ کھیل کے خاتمے پر مایوس خوشدامن پوچھتی ہے :۔

"کیا آپ نے کسی بڑھیا کو اس طرف جاتے دیکھا ہے؟"

پیٹرک :۔ میں نے نہیں دیکھا، البتہ ایک نوجوان لڑکی دیکھی، جس کی چال کا انداز ملکہ کا سا تھا۔"

۱۹۰۵ء کے بعد لبرل دوبارہ برسراقتدار آ گئے[3] اور انھیں معلوم ہوا کہ دارالامراء کے ویٹو کا اختیار ختم کرنے کے

---

[1] Cathleen Ni Hoolihan

[2] Michael

[3] Proteetionists یعنی درآمدی محاصل کے ذریعے سے ملکی تجارت کی حفاظت اور بچاؤ کے حامی۔

لیے وہ جو تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے آئرستانی قوم پروروں کی امداد درکار ہے۔ کچھ مدت تک سوچ بچار کرنے کے بعد لبرلوں نے سودا کر لیا۔ وہ یوں کہ دارالامراء کا اقتدار ختم کرنے کے لیے آئرستانی قوم پرور ووٹ دیں، لبرل پارلیمنٹ میں ہوم رول کا مسودہ پیش کر دیں گے۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں یہ مسودہ پیش ہوا۔ جو قانون بن گیا۔ ۱۹۱۱ء میں پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعے سے دارالامراء کو ویٹو کا جو حق تھا، وہ ختم کر دیا گیا، لیکن یہ ہوم رول کبھی نافذ نہ ہوا۔ کیونکہ ساتھ ہی شمالی آئرلینڈ کے صوبہ السٹر نے جہاں پروٹسٹنٹوں کو اکثریت حاصل تھی، برطانیہ سے آئرلینڈ کی علیحدگی کی سخت مخالفت شروع کر دی، بلکہ انھوں نے مسلح مزاحمت کی تیاری کر لی تھی۔ چنانچہ ہوم رول بل کے ساتھ ایک دفعہ لگا دی گئی کہ یہ قانون اس وقت تک عمل میں نہ آئے گا، جب تک السٹر کا مسئلہ طے نہ ہو جائے گا۔ ۱۹۱۴ء میں عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ اور اس مسئلے کے طے کرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ یوں ہمارے عہد کے آئرستانی انقلاب کے لیے میدان آراستہ ہو گیا۔

گلیڈسٹون نے ہوم رول کو اپنا کر سیاسی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ برطانیہ اور باہر کے لبرل حلقوں نے اُسے لبرل اصول کی پابندی کا نتیجہ قرار دیا تھا، مگر اب اس نظریے کی مدافعت ممکن ہے کہ یہ دانشمندانہ کام نہ تھا۔ اسے قبل از وقت شروع کیا گیا۔ لبرل پارٹی کا اتحاد تباہ ہو گیا اور آئرلینڈ کے عمرانی، مذہبی اور اقتصادی مسائل کا تدریجی اور خاموش حل اس نے ناممکن بنا دیا۔ اگر یہ سلسلہ آہستہ آہستہ جاری رہتا تو ممکن تھا کہ السٹر کے پروٹسٹنٹوں کو پورے آئرلینڈ کے لیے نوآبادیوں کا درجہ دے دینے پر راضی کر لیا جاتا۔

آزاد تجارت کے لیے خطرہ

برطانیہ بیسویں صدی کے قریب پہنچا تو عہدِ برطانیہ کی یقین افروزی اور بنیادی اطمینان میں خلل ڈالنے کے لیے نئے مسائل پیدا ہو گئے، مثلاً بوئروں اور آئرستانیوں کی پیدا کردہ مشکلات بڑھتا ہوا بین الاقوامی تناؤ، جس نے پہلی عالمی جنگ کی شکل اختیار کی، قومی آمدنی کی نئی تقسیم کے مطابق عمل پیرائی کی مشکلات یہ نئی تقسیم فلاحی مملکت کے پیش نظر ناگزیر ہو چکی تھی۔ یہ مسائل ایک دم اہلِ برطانیہ کے سامنے آ گئے۔ اگرچہ تاریخ میں کسی ایک ہی بنیادی سبب پر توجہ جمانے کی ترغیب سے گنارہ کش رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا عامل برسرِ کار تھا۔ برطانیہ کو صنعتی انقلاب میں سرکردگی کا منصب حاصل رہا تھا، اب وہ منصب چھننے لگا۔ کیونکہ دوسری قوموں نے بھی وسیع پیمانے پر چیزیں بنانے کے سلسلے میں فنی مہارت حاصل کر لی تھی۔ جرمنی، بلجیم، ہالینڈ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ، بلکہ ایک لحاظ سے تمام مغربی ممالک دنیا کی منڈیوں میں برطانیہ کے مقابلے پر آ گئے۔

ان حالات میں طبعی تھا کہ بعض انگریز آزاد تجارت کے مسلک کی محکمی کے بارے میں متذبذب ہو جاتے، جس کی بنا پر ۱۸۴۶ء میں کامیابی ہوئی تھی۔ جرمن اور دوسرے صنعت کار محض بیرونی منڈیوں ہی میں برطانیہ سے کمتر نرخ پر چیزیں فروخت نہیں کر رہے تھے، بلکہ برطانیہ کی وطنی منڈیوں پر بھی انھوں نے حملہ شروع کر دیا تھا۔ اب سوال سامنے آیا کہ کیوں حفاظتی محاصل کے ذریعے ان منڈیوں کو محفوظ نہ کر لیا جائے؟ چند انگریزوں نے حماقت سے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنے جزیروں

کے اردگرد حفاظتی محصول کی دیواریں کھینچ کر خود کفیل اقتصادیات میں کامیاب ہو سکتے ہیں، حالانکہ صدی کے نویں عشرے سے برطانیہ کی آبادی بڑھ گئی تھی اور اس کے لیے غذائی جنسیں بہم پہنچانا مشکل ہو رہا تھا، لیکن سلطنت بہت وسیع تھی۔ اس کے وسائل کی فراوانی میں شبہہ نہ تھا۔ ہزاروں مربع میل زمینیں زراعت کے لیے وقف تھیں۔ ان انگریزوں کا خیال تھا کہ سلطنت میں مصنوعات دے کر خام مال لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کلاسیکی نظریۂ زر کے مطابق تبادلے کی بنا پر ایک متوازن اقتصادی نظام مہیا ہو سکتا ہے۔ اگر برطانیہ دنیا کے لیے کارگاہ نہیں بن سکتا تو کم از کم ایک چوتھائی دنیا کے لیے ـــ برطانوی دولت مشترکہ اور سلطنت ـــ تو کارگاہ رہ سکتا ہے۔

وہی جوزف چیمبرلین جس نے آئرلینڈ کے لیے ہوم رول کے مسئلے پر لبرل پارٹی سے علیحدگی اختیار کی تھی، اب ایک مسئلے پر علیحدگی کا رہنما بن گیا، جس کی بنیادی حیثیت بہت زیادہ تھی۔ وہ حامیٔ[1] تامین بن گیا۔ اس نے سامراجی ترجیح کا ایک نظام قائم کر لینے کو خاص اہمیت دی، جس کے ذریعے سے تاج کے ماتحت تمام علاقے ایک اتحادِ محاصل میں مرتبط ہو جاتے تھے۔ کنسرویٹو پارٹی کبھی آزاد تجارت پر راضی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور نئی جماعت نے تحفظ کو اپنے پروگرام کا سب سے بڑا معاملہ بنا لیا، تاہم ابھی تک مخالف لبرل خاصے طاقتور تھے اور خود کنسرویٹو پارٹی کے ارکان بھی مخالفت پر آمادہ تھے۔ چیمبرلین نے کابڈن کی پیروی کرتے ہوئے اصلاح محاصل کے لیے ایک لیگ اٹھی، اصول پر منظم کر لی، جن پر صدی کے پانچویں عشرے میں غذائی جنسوں خام مال (یہ زیادہ تر اس لیے رکھا گیا کہ نو آبادیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی بنیاد بن سکے۔ کیونکہ ان کے ہاں بجائے خود ایک محاصلی نظام موجود تھا) اور مصنوعہ غیر ملکی سامان پر درمیانے درجے کا محصول بحال کر دیا۔ مگر کنسرویٹو پارٹی کا لیڈر بالفور اس حد تک جانے کی جرأت نہ کر سکا۔ چنانچہ چیمبرلین نے استعفا دے دیا اور اس کا مسودۂ قانون منظور نہ ہوا۔ ۱۹۰۵ء کی نئی لبرل حکومت نے آزاد تجارت کی پالیسی جاری رکھی۔

فلاحی مملکت

تاہم لبرل ایک اور پالیسی کے بھی حامی تھے، جو برطانیہ کو صنعتی حریفوں سے براہ راست مقابلے کے قابل بنانے کے لیے طے نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ عدم مداخلت کے کلاسیکی فلسفے سے اتنی ہی متضاد تھی، جتنا تحفظ۔ یہ فلاحی مملکت کی پالیسی تھی، یعنی حکومت کے زیر انتظام جبری بیمے کے ذریعے سے عمرانی تحفظ۔ اس بیمے میں حکومت کا روپیہ بھی جزواً شامل تھا۔ اجرتوں کی کم سے کم شرح متعین کر دی گئی۔ آمدنی اور وراثت پر تدریجاً ترقی پذیر ٹیکس لگائے گئے۔ تعمیرات عامہ اور ہر قسم کی خدمات لازمی قرار دے دی گئیں۔ اس پروگرام پر عمل کے سلسلے میں ڈرامائی مقام اس وقت آیا، جب ۱۹۰۹ء کا عوامی بجٹ ایک ایسے شخص نے پیش کیا، جو سیاسی سٹیج پر نیا نیا آیا تھا، یعنی لبرل پارٹی کا وزیر مال لائڈ جارج (۱۸۶۳ء ـــ ۱۹۴۴ء)۔ اس بجٹ میں دولت مندوں پر صاف صاف ٹیکس تجویز کر دیے گئے

---

[1] Protectionists یعنی درآمدی محاصل کے ذریعے سے ملکی تجارت اور بچاؤ کے حامی۔

تاکہ نئے فلاحی مسائل کے لیے روپیہ مہیا ہو سکے، نیز نئے بحری مصارف کے لیے روپیہ درکار تھا کیونکہ جرمنی کے ساتھ اسلحہ کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ تاہم یہ بجٹ کوئی معمولی وسیلۂ محاصل نہ تھا، بلکہ برطانیہ کے عمرانی و اقتصادی نظام کو بدل دینے کا ایک ذریعہ تھا۔ مخالفوں نے بالکل بجا کہا کہ یہ بجٹ نہیں، ایک انقلاب ہے۔ دارالعوام نے اسے منظور کر لیا۔ مگر دارالامراء نے ٹھکرا دیا۔ اگرچہ یہ ایک مالی معاملہ تھا جس میں دارالامراء کو دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا۔ لبرل پارٹی نے اہل ملک سے اپیل کی۔ پُرجوش انتخاب ہُوا جس میں لبرل پارٹی نے دو نشستیں حاصل کیں، تاہم وہ ۱۹۱۱ء کا قانون پارلیمنٹ منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے مطابق دارالامراء سے کسی مالی مسودے میں ترمیم کا اختیار چھین لیا گیا اور ان کے قبضے میں صرف ایک اختیار رہ گیا کہ جب چاہتے تین سال کے کسی مسودۂ قانون کی منظوری میں تاخیر کرا سکتے تھے۔ لبرل پارٹی کا عمرانی پروگرام محفوظ ہو گیا۔

مگر کیا یہ لبرل پروگرام تھا؟ لبرل پارٹی کے جن ممبروں کو اس سے اختلاف تھا اور انھوں نے صدی کے نویں عشرے میں چیمبرلین کے زیرِ سرکردگی پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، اُن کی رائے تھی کہ یہ لبرل پروگرام نہیں۔ چیمبرلین کے دو بیٹے آسٹن[1] اور نیویل[2] اسے عام اور طبعی پروگرام سمجھتے رہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے سیاسیات میں اہم کردار ادا کیا اور وہ اپنے آپ کو کنسرویٹو سمجھتے تھے۔ ۱۸۸۰ء کے بعد کی نسل میں جو کچھ پیش آیا وہ برطانوی پارٹیوں کے سیاسی پروگرام میں ایک بڑا تغیر تھا۔ لبرلوں کا عقیدہ تھا کہ جو حکومت حکمرانی سے کم از کم سروکار رکھتی ہے، وہی بہترین ہے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ غریب طبقے کی امداد کے لیے اقتصادی زندگی میں مداخلت ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے عمرانی بیمے کے ذریعے سے قومی ثروت کی ازسرِ نو تقسیم کا وہ منصوبہ اختیار کر لیا، جو لائڈ جارج نے پیش کیا۔ اس کے لیے روپیہ دولت مندوں اور خوشحال لوگوں پر ٹیکس لگا کر حاصل کیا گیا۔ کنسرویٹو انیسویں صدی کے وسط میں کارخانوں کے قانون کی حمایت کر چکے تھے۔ یہ بھی فلاحی مملکت ہی کی نرم شکل تھی۔ ۱۸۵۰ء میں وہ بڑی حد تک اس پروگرام کے حامی بنا لیے گئے، جو ۱۸۵۰ء میں لبرلوں کا تھا۔

لیبر پارٹی

اس تغیر میں ایک عامل یہ تھا کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی نے نشو و ارتقاء پایا۔ اس کی ابتداء متعدد گروہوں سے ہوئی، جو انیسویں صدی کے اواخر میں بن گئے تھے، ایک گروہ لیبر یونینسٹ مقاصد کی بنا پر کارکردگی کے حالات بہتر بنانا چاہتا تھا۔ دوسرا گروہ فیبین[3] کہلاتا تھا۔ اس میں سڈنی[4] بیٹرائس ویب[5]، جارج برنارڈ شا[6]

---

[1] Austen [2] Neuille [3] Fabian، یہ لفظ عموماً احتیاط کوشی اور تاخیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے حریف کو شکست دینے کے لیے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، جو اسے تھکا دے۔

[4] Sydney [5] Beatrice Webb

[6] Bernard Shaw

اور ایچ جی ویلز[1] جیسے اہلِ علم شامل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تدریجاً اشتراکیت جاری کردی جائے۔ اسی لیے انھوں نے فیبین نام اختیار کیا۔ یہ ایک رومی جرنیل فیبین سے لیا گیا تھا، جو ہر معاملے میں تاخیر کا عادی تھا۔ تیسرے گروہ کی قیادت کیئر ہارڈی[2] کر رہا تھا۔ مزدوروں کی طرف سے وہ پارلیمنٹ کے پہلے ممبروں میں تھا۔ وہ یوٹوپین تھا اور کسی تقلید کا قائل نہ تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ اشتراکیت تمام عمرانی مسائل کا واحد صحیح حل ہے۔ ایک چھوٹا سا گروہ مارکس کے پیرووں کا تھا۔ یہ لوگ بڑے باعزم تھے۔

مزدور کبھی پوری طرح متحد نہ ہوئے۔ ہمیشہ ان کے دائیں بائیں بازوؤں میں اختلاف قائم رہا، لیکن پارٹی اتنی منظم ہو چکی تھی کہ سنہ ۱۹۰۵ء کے انتخابات میں اسے دارالعوام کے اندر ترپن فی صد نشستیں مل گئیں۔ وہ بھی فلاحی مملکت کی حامی تھی اور پارٹی کے بعض ممبر اشتراکی مملکت کے خواہاں تھے جس میں کم از کم بڑی بڑی صنعتیں قومی بنالی جائیں۔ عمرانی قانون سازی کے لیے ممبروں کے پروگرام کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ وہ لیبر پارٹی سے پہلے یہ کام انجام دے دینا چاہتے تھے۔ جس طرح سنہ ۱۸۶۷ء میں ٹوری نہاتے ہوئے وھگوں کے کپڑے اٹھا کر چلتے بنے تھے اور مزدوروں کو ووٹ کا حق دے دیا تھا، اسی طرح سنہ ۱۹۱۱ء میں لبرلوں نے لیبر پارٹی کے کپڑے چرالیے اور مزدوروں کے لیے عمرانی تحفظ کا انتظام کردیا، مگر یہ تدبیریں جس طرح انیسویں صدی میں کامیاب نہ ہوسکی تھیں، بیسویں میں بھی کامیاب نہ ہوئیں اور مزدور بہ حیثیت عمومی لیبر پارٹی سے چمٹے رہے۔ لبرلوں کو اپنی موت مرجانے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

مگر بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں لبرلوں کی ہر تحریک کا منشا لیبر پارٹی کا خوف نہ تھا۔ جزواً وہ عدم مداخلت سے ہٹ کر مستقلاً عمرانی تحفظ کے معتقد بن گئے تھے۔ جو جمہوری اصول انھوں نے اختیار کیے تھے، ان کی منطق کا تقاضا یہی تھا کہ حکومت کی کوشش سے برطانیہ میں معیشت کا عام درجہ بلند کیا جائے۔ پورے جمہوری مغرب میں یہی ہو رہا تھا۔ مثلاً فرانس میں یہی کیفیت چھوٹی جمہوریتوں میں تھی۔ چند دہائیوں کے بعد یہی حالت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پیش آئی۔ ان تمام ممالک میں سرمایہ داروں کے ایک اہم حصے نے رائے بدل لی۔ وہ نظریۃً اشتراکی تو نہ بنے، لیکن انھوں نے عمرانی قانون سازی کا پروگرام وسیع جمہوری حقِ رائے کے ماتحت حکومت کی مشینری کے ذریعے سے منظور کرایا۔ انگریز حامیانِ منشوریت نے انیسویں صدی کے اوائل میں یہ رائے قائم کی تھی کہ بالغوں کے حقِ رائے کے ذریعے سے بڑی اقتصادی مساوات کا راستہ صاف ہوجائے گا۔ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ حامیانِ منشوریت اس رائے میں کاملاً غلطی پر نہ تھے۔

---

۱ Wells

۲ Keir Hardie

اکتیسواں باب

فرانس

دوسری سلطنت اور تیسری جمہوریت

۱۸۵۱ء کا فوری تغیر

ایک سو سال پیشتر فرانس اکثر انگریزی بولنے والے نقادوں کے نزدیک جمعیت اقوام کا ایک غیر یقینی رکن معلوم ہوتا تھا۔ بالکل یہی کیفیت آج ہے۔ اُس پر جمہوری خصائص کے ذریعے سے حکومت ہو رہی تھی، یعنی معاملات پر بحث مباحثہ ہوتا تھا۔ پارٹیوں کے نظام کے ذریعے سے پُرامن طریق پر تبدیلیاں کرلی جاتی تھیں اور انسانی حقوق سب کو حاصل تھے۔ ۱۸۴۸ء میں جمہوریت بڑی خوشگوار امیدوں کے ساتھ شروع ہوئی، مگر ۱۸۵۲ء میں ایک بوناپارٹ —— نپولین اوّل کا بھتیجا —— نپولین سوم کے لقب سے تختِ فرانس پر متمکن ہو گیا۔ لوئی نپولین دوسری جمہوریت کے صدر کی حیثیت میں قومی مجلس سے لڑ پڑا، کیونکہ مجلس نے ۱۸۴۸ء کے دستور میں ترمیم کرکے اسے دوسری مرتبہ صدر بننے کی اجازت نہیں دی تھی۔ قومی مجلس نے انتہا پسندوں اور اشتراکیوں کے خوف سے بالغوں کے عام حق رائے میں (جو ۱۸۴۸ء میں منظور ہوا تھا) کمی کر دی تھی۔ اس طرح لوئی نپولین کو بہ حیثیت صدر مظلوم عوامی جمہوریت کا حامی و ناصر بننے کا موقع مل گیا۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو فوری اقدام ہوا۔ اسی تاریخ کو نپولین اوّل کی تخت نشینی ہوئی (۲ دسمبر ۱۸۰۴ء)۔ اسی تاریخ کو آسٹرلٹز کی سالگرہ (۲ دسمبر ۱۸۰۵ء)۔ فوج لوئی نپولین اور اس کے معاون سازشیوں کے قبضے میں تھی۔ لہٰذا قومی مجلس کو مخالف عناصر سے بہ آسانی پاک کیا جا سکا اور نئے دستور کے لیے عوام سے رائے لینے کا راستہ نکال لیا گیا۔ پیرس کی مورچہ بندی میں بازاروں کے اندر لڑائی متوقع تھی اور یہ ۳ دسمبر کو شروع ہوئی، تاہم اس میں زیادہ خون نہ بہا۔ بے شک اس میں خاصے لوگ شہید ہوئے، مگر سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم امر یہ ہے کہ اس کی وجہ سے صدر کو ضبط و نظم کا مدافع بننے کا موقع مل گیا۔ مشہور یہ کیا گیا کہ اشتراکیوں نے سازش کی تھی، حالانکہ یہ چیز بڑی حد تک خیالی تھی۔ نپولین نے فوراً رائے عامہ لے لی اور چھ لاکھ چالیس ہزار ووٹوں کے مقابلے میں چھتر لاکھ ووٹوں سے نیا دستور بنانے کا حق حاصل کر لیا۔

رائے عامہ لے لینے کے بعد بڑی ہوشیاری سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا، لیکن یہ کوئی جبر و قوت کا کام نہ تھا۔ نپولین کے مخالفوں کی بڑی تعداد نے ووٹ ہی نہ دیئے۔ معلوم ہوتا ہے، اکیس سال سے زائد عمر کے فرانسیسیوں کی اکثریت آمادہ تھی کہ پھر ایک ڈکٹیٹر کا تجربہ کر لیا جائے۔ لوگوں نے متعدد وجوہ سے حق میں ووٹ دیئے۔ مثلاً تقریباً سب کے سب گزشتہ تیس سال کی کشمکش سے تنگ آ گئے تھے۔ اکثر اشتراکیت کے کابوس سے خوف زدہ تھے اور اشتراکیت نے پہلی مرتبہ ایک معین

نام سے مغربی سیاسیات میں قطعی عامل کی حیثیت اختیار کی تھی۔ تقریباً تین عشروں سے مروجہ فرانسیسی ادب پوری قوت کے ساتھ نپولین کا افسانہ تیار کر رہا تھا اور نپولین کے نام کو فرانسیسی حُبِّ وطن کے اجتماعی احترام کا مترادف قرار دیا جا رہا تھا۔ غرض اکثر آدمیوں نے لوئی نپولین کے حق میں ووٹ دیئے، مگر یہ ووٹ لوئی نپولین کے لیے نہ تھے، بلکہ مارسائی کے انقلابی نغمے کے لیے تھے یا آسٹرلٹز کی توپوں کے لیے اور فرانس کی عظمت و شان کے لیے۔

حقیقت میں نپولین کا افسانہ دورِ حاضر کے پُرپیچ معاشرے میں ایک کلاسیکی مثال ہے کہ ایک شخصیت کے بڑے بڑے خیالات کا مجموعہ کیونکر وابستہ کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ایک فرد یا گروہ نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ یہ کسی منظم مہم کے طریقے پر لوگوں کے ذہنوں میں نہیں بٹھایا گیا تھا جس طرح ہمارے زمانے میں کوششیں کی جاتی رہی ہیں، بلکہ بہت سے گروہوں نے بالعمد پروپیگنڈے کے طریقے استعمال کر کے ایک ایسی چیز پیدا کی جس کے لیے انیسویں صدی کے فرانس کے طبعی حالات سازگار تھے۔ صدی کے پانچویں عشرے میں نپولین اوّل ایک ہیرو اور قوم پرستی کا ایک مقدس وجود بن گیا۔ عوامی شاعر[1] بیرنجر نے عوامی یادگار کے زیرِ عنوان لکھا کہ بچے اپنی بوڑھی دادیوں سے اس کے متعلق پوچھتے ہیں:۔

"مگر جب شمپین[2] پر یورش ہوئی
اور وہ غریب غیروں کے پاؤں تلے کچلا گیا۔
تو صرف وہ (نپولین) تنہا اٹھا، بروئے کار آیا
ہمارے ملکی دشمن کے خلاف کسی امداد کے بغیر
ایک مرتبہ (معلوم ہوتا ہے، جیسے آج شب کو)
دستک ہوئی، دروازہ بند تھا۔
میں جلدی سے اٹھی، دروازہ کھولا، اللہ! یہ تو وہی تھا۔
اس کے ساتھ تھوڑی سی محافظ فوج تھی
وہ بیٹھ گیا۔ سامنے کی کرسی پر
اس کے لبوں پر ایک کراہ جاری ہوئی
آہ ملعون جنگ!
بی اماں! وہ اس کرسی پر بیٹھا تھا
اس کرسی پر بیٹھا تھا"[3]

---

[1] Beranger [2] Champagne [3] بیرنجر کے گیت

گویا اس نظم میں نپولین کو جنگ سے متنفر قرار دے دیا گیا تھا۔

دوسری سلطنت (۱۸۵۲ء سے ۱۸۷۰ء) ملکی حالات

نئے دستور میں ایک ڈکٹیٹری قائم کردی گئی، جس کے چہرے پر ہلکا سا پردہ تھا۔ یہ نپولین اوّل کی ڈکٹیٹری سے مشابہ تھی۔ نئیں سلطنت (وہ ۲ دسمبر ۱۸۵۲ کی مقدس تاریخ کو رسماً شہنشاہ بن گیا) کو پورا اختیار حاصل تھا۔ وہ صرف قوم کے روبرو جوابدہ تھا۔ اس نے وزیروں، ججوں اور نوکر شاہی کے پورے نظام کے ذریعے سے کاروبار حکومت چلایا اور ان سب کے تقرر کا آخری حق اسی کو تھا۔ جو مجلس رائے عامہ سے منتخب ہوئی تھی، وہ سرکاری امیدواروں سے بھر دی گئی۔ یہ امیدوار صوبوں کے قابل افسروں کے زیر اثر چنے گئے۔ مگر اس مجلس کو قانون بنانے یا ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا، صرف ویٹو کا اختیار تھا، جسے ابتدائی چند سال میں اس نے گاہے گاہے استعمال کیا۔ با ایں ہمہ نپولین سوم اصرار کرتا رہا کہ میں ان طبقات کا آلہ کار نہیں، جن کے قبضے میں دولت یا اس کے وسائل ہیں۔ میں قدامت پسند نہیں، بلکہ حقیقی اصلاحات جاری کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں عوامی شہنشاہ ہوں۔ گویا اس کا وجود اس پوری جمہوریت پرور کا مثنیٰ تھا، جس کا مدعی ڈزرائیلی بن رہا تھا۔ ایسے دعوے دورِ حال کے بھی تقریباً تمام ڈکٹیٹر سٹالین سے پیرون[1] تک کرتے رہے۔ وہ اپنے آپ کو حقیقی جمہوریت پرور اور کلاسیکی مغربی جمہوریتوں میں عوام کے حقیقی محافظ قرار دیتے رہے، جو ان کے نزدیک سرمایہ داروں کی ناجائز نفع جوئی کے ہدف ہیں۔ نپولین سوم کو بعض اوقات دورِ حاضر کے ڈکٹیٹروں میں سے پہلا قرار دیا گیا ہے۔ گویا وہ اوّلین فاشسٹ تھا اور اس کے حالات کا مطالعہ احتیاط سے کرنے والے فرد کو بہت کچھ مل جائے گا، جس سے خود ہمارے موجودہ مسائل پر روشنی پڑے گی۔

نپولین نے مزدوروں کے فائدے کے لیے جو مثبت کارنامے انجام دیئے، وہ یقیناً جرمنی، برطانیہ یا سکنڈے نیویا کے متاثر عمرانی قوانین کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ اس نے تعمیرات عامہ کے ایک بڑے پروگرام پر عمل کرایا۔ پیرس کے کوتوال ہاسمان[2] نے ازمنہ وسطیٰ کی پرپیچ گلیاں ختم کر کے چوڑی اور سیدھی سڑکیں نکالیں، جن سے سب لوگ واقف ہیں۔ ان سڑکوں پر توپوں کی آتشباری سے دور دور تک مفسدوں کو ساتھ لیا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے بازاروں میں رزم و پیکار بہت مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے مکان بنانے میں مدد دی۔ مزدوروں کے لیے امداد باہمی کی مجلسیں بنوائیں، لیکن ۱۸۶۰ء کے فرانس میں مزدوروں کے لیے جو مجموعۂ قوانین بنا تھا، وہ انگلستان کے مجموعۂ قوانین کے مقابلے میں فروتر تھا۔ اسی طرح فرانسیسی مزدوروں کا معیارِ معیشت بڑھتی ہوئی آبادی کے شہروں میں برطانیہ، نیز جرمنی اور چھوٹی جمہوریتوں سے کم تھا۔ ۱۸۵۰ء کے بعد فرانس میں برطانیہ کی طرح عام خوشی کا جو دور آیا، اس سے فرانسیسی مزدوروں کو فائدہ پہنچا، لیکن اجرتوں میں جو اضافہ ہوا، وہ اس وجہ سے قابل توجہ نہ رہا کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔

---

[1] Peron یہ مدت تک ارجنٹینا کا ڈکٹیٹر رہا۔

[2] Haussmann.

حقیقت یہ ہے کہ دوسری سلطنت میں سب سے زیادہ فائدہ سرمایہ داروں نے اٹھایا۔ نپولین کی حکومت نے بینکوں کی سہولتوں میں اضافہ کیا۔ سرکاری امداد سے فرانس سے ریلوے کا جال پھیلا اور ۱۸۵۰ء کے بعد دو عشروں میں صنعت کاری نے عام ترقی حاصل کی۔ یہ ترقی ــــ خصوصیت سے وسیع پیمانے پر بڑی سلطنتوں کے سلسلے میں برطانیہ اور ارتقا پذیر جرمن صنعت سے درجے میں فروتر تھی۔ لیکن بہرحال یہ ترقی تھی۔ پیرس بہت بڑا شہر بن گیا۔ لیانز اور روئیمں[1] جیسے مرکزوں نے پارچہ بافی میں کلرماں فیریند[2] اور سینٹ آتین[3] نے معدنیات میں، نیز بہت سے دوسرے قصبوں نے حقیقی صنعتی اقتصادیات کا نظام پیدا کر لیا۔ وہاں غریبوں کے گندے مکانوں کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ پیشہ ور یونینیں بھی بن رہی تھیں اور عہد حاضر کے دوسرے آثار بھی موجود تھے۔ تاہم بعد کی فرانسیسی حکومتوں کی طرح کاروبار کے پرانے طریقے جاری رہے۔ چھوٹی چھوٹی فرمیں کنبوں کے ضبط و نظم میں تھیں۔ عیش و عشرت کے سامان کے سلسلے میں مشینوں کے بجائے دستکاری کو اہمیت حاصل رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقدار پیداوار میں فرانس صنعت کار مغرب سے پیچھے رہ گیا۔ اگرچہ قومی پیداوار کے اعداد مکمل میسر نہیں، تاہم اگر دور حاضر کے اوائل کے اعداد پیش نظر رکھ لیے جائیں تو ثابت ہوگا کہ کولبرٹ کا فرانس انیسویں صدی میں درجۂ قیادت کے قریب پہنچا ہوا تھا اور بیسویں صدی کا فرانس اپنے بڑے مغربی حریفوں کی سطح پر نہیں تھا۔ اس کی آبادی کی شرح افزائش بھی دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئی۔ انیسویں صدی کے اختتام پر وہ ابتدا کے مقابلے میں اس کی آبادی پچاس فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ یہ اس حالت کا نقشہ ہے، جب آبادی کے کسی خاص حصے نے نقل وطن نہیں کیا تھا۔ برطانیہ سے بہت بڑی آبادی باہر نکل گئی تھی۔ تاہم اس کی آبادی تگنی ہو گئی تھی اور جرمنی بھی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اٹلی کے طبعی وسائل بہت معمولی تھے اور فرانس کے مقابلے میں صنعت بھی کم تھی، تاہم اس کی آبادی بھی فرانس کے مقابلے میں تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ہمارے زمانے میں وہ فرانس پر فوقیت لے گیا۔

دوسری سلطنت کی خارجہ پالیسی

تاہم دوسری سلطنت کے دور میں بھی فرانس بہت بڑی قوت تھا اور اس کے اضافی انحطاط کی وسعت معاصرین کو واضح طور پر نظر نہیں آتی تھی۔ اگرچہ فرانس نے جنگ کریمیا سے کچھ حاصل نہ کیا، لیکن اس کے لیے تسلی کا یہ سامان پیدا ہو گیا کہ جنگ کے بعد ۱۸۵۶ء میں جو کانگرس منعقد ہوئی، وہ پیرس میں ہوئی گویا فرانس کو اس موقع پر مہمانداری کا شرف حاصل ہوا۔

---

[1] Ronan

[2] Clermont Ferrend

[3] St. Etienne

پیرس کے اندر ایک نمائش ہوئی تھی، جو دراصل ۱۸۵۱ء کی مشہور نمائش لندن کا مثنیٰ تھی۔ اس نمائش نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس وقت نپولین سوم کا اقتدار کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اس نے حلف اٹھالیا تھا کہ اس اقتدار کو امن کے لیے استعمال کرے گا، لیکن وہ اٹلی کی آزادی کے لیے آسٹریا کے خلاف جنگ میں الجھ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مظلوم قومیتوں سے اسے رومانی دلچسپی تھی، دوسری وجہ وہی تھی، جو ہمیشہ ایسے مواقع پر پیش آتی ہے، یعنی وقار۔ ۱۸۵۹ء کی اس جنگ میں فرانسیسی افواج نے فتوحات حاصل کیں۔ پھر اہلِ اٹلی نے تمام معاملات خود سنبھال لیے اور وہ پورے برِاعظم میں اطالوی بادشاہی کی تنظیم کے لیے وقف ہو گئے۔ اس میں پاپائے روم بھی شامل تھا۔ نپولین کو یقین تھا، فرانس کے کیتھولکوں کی امداد سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ پاپائی قوت کو محو ہونے سے بچائے گا۔ مزید برآں اس کی تجاویز کی کامیابی سے یورپ کا توازنِ قوی خطرے میں پڑ گیا، لہٰذا وہ ذرا نرم ہو گیا اور اس نے موقع دے دیا کہ خاندان سیوائے کے ماتحت اٹلی کا زیادہ بڑا حصہ متحد ہو جائے، اگر پوپ کا دنیوی اقتدار روما میں فرانسیسی فوجوں کے ذریعے سے محفوظ رکھا جائے۔ وینس کو آسٹریوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے اور اطالوی پیدماں سے نیس اور سیوائے کا جو علاقہ کوہستان ایلپس میں تھا، اس کی فرانسیسی بولنے والی آبادی خود سنبھال لے اور اسے اپنی خدمات کا معاوضہ سمجھے۔ اس سے اکثر اطالوی بگڑ گئے اور بالکل یہی کیفیت ان کیتھولکوں کی ہوئی جو فرانس میں اس کے معاون تھے۔

حالات میں ایک اور ابتری پیدا ہو گئی۔ نپولین نے ۱۸۶۱ء میں ایک اور عجیب غریب منصوبہ تیار کر لیا۔ یعنی آسٹریا کے شہزادے میکسملین[۱] کو فرانسیسی اسلحہ اور آدمیوں کے ذریعے سے میکسیکو کے شاہی تخت پر بٹھائے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اس وقت خانہ جنگی میں مبتلا تھیں، وہاں کی حکومت کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ اسے منرو کے اصول کی اس خلاف ورزی کو روکنے کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے تھا۔ جب ریاستہائے متحدہ میں امن بحال ہو گیا تو وہاں کی حکومت نے سخت احتجاج کیا۔ میکسیکو میں بھی نپولین کی مخالفت ہوئی، اس لیے اس نے حمایت سے دست برداری اختیار کر لی۔ میکسملین کو ۱۸۶۷ء میں گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔

لبرل سلطنت

۱۸۴۸ء کے عمرانی انقلابیوں کی طرف سے انتہائی مطالبات پیش ہو رہے تھے۔ نپولین ان کے خلاف قومی اتحاد کا داعی بن کر برسرِ اقتدار آیا تھا، لیکن استصوابِ رائے عامہ کے باوجود یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی گئی کہ فرانس کا قومی اتحاد مطلق العنانی کی وضع کا نہ تھا، بلکہ ایسا اتحاد تھا جس پر جدید وضع کی مغربی

---

۱ Maximilian

سیاسی زندگی کے کھلے مقابلے میں عمل پیرا ہونا ضروری تھا یعنی پارٹیاں ہوں، پارلیمانی بحثیں ہوں، اخبار ہوں اور حکومت کا کام بحث مباحثہ سے جاری رہے۔ نپولین کسی مملکت کا ایسا رئیس نہیں بن سکتا تھا جس کی حیثیت محض نشان کی ہو اور یہ پارٹیوں کی کشاکش سے بالا ہو یا جسے آخری ثالث مان لیا جائے۔ وہ جمہوریت پرور بن نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ فرانس کا بیشتر حصہ جمہوریت پرور تھا۔ وہ صحیح قسم کا شاہ پسند بھی نہیں بن سکتا تھا۔ حالانکہ فرانس کے خاصے بڑے حصے میں قدامت پسندوں کے نظریات اقتدار پسندانہ تھے اور وہ بوربونوں کی جائز وراثت یا حامیان اورلیانز کی ایک حد تک مشتبہ وراثت کے وفادار تھے۔ وہ مخلص کیتھولک بھی نہیں بن سکتا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی ملکہ یوجینی[1] کٹر کیتھولک تھی۔ بوناپارٹ خاندان کے پس منظر پر اٹھارھویں صدی کی مخاصمت پیشوایان مذہب کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اٹلی کے معاملات میں اس کی وجہ سے جو خرابی پیدا ہوئی، اس پر مذہبی طبقے کا دل سخت مجروح ہو چکا تھا۔ وہ صرف ایک سرکاری پارٹی کا رئیس بن سکتا تھا۔ پارلیمنٹ کی پیچ پیچ مشیری سے ٹھیک ٹھیک کام لینے کے لیے اس کا بھروسا نوکر شاہی کے افراد کی ہنر مندیوں پر تھا۔ یہ نظام نپولین اول نے مطلق العنانی کے لیے نقاب کے طور پر تیار کیا تھا۔

جب حقیقی مخالف پارٹیوں کا دباؤ بڑھ گیا تو نپولین نے تشدد کے وسائل ترک کر دیے اور اپنے آپ کو ایک دستوری بادشاہ کی حیثیت دینی چاہی۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے قانون کے مطابق قانون ساز مجلس کو اختیار مل گیا کہ تاج کی طرف سے جو خطبہ دیا جاتا ہے، اس پر آزادانہ بحث کر سکے اور اس کے ساتویں عشرے میں ایسے اختیارات کے اندر توسیع ہوتی رہی، یہاں تک کہ سلطنت کو "قبول سلطنت" قرار دے دیا گیا۔ تدریجاً فرانس کی سیاسی زندگی نے پارلیمانی حکومت کا رنگ اختیار کر لیا، جس میں دایاں بازو بھی تھا بایاں بازو بھی اور مرکزی پارٹی میں تیس جمہوریت پرور تھے۔ ۱۲؍جولائی سنہ ۱۸۶۹ء کو نپولین نے ہتھیار ڈال دیے اور قانون ساز مجلس کو قوانین بنانے، بجٹ پر نکتہ چینی کرنے اور منظوری کی مہر لگانے کے اختیارات دے دیے۔ جنوری وزارتی ذمہ داری ملنے والی تھی کہ نپولین نے بہت بڑی کثرت رائے سے حکومت اعتدال پسندوں کے رئیس ایمیل اولیویئر[2] کے حوالے کر دی۔ مئی سنہ ۱۸۷۰ء میں رائے عامہ لی گئی تو ان تغیرات کی پوری تصدیق ہو گئی۔

کم از کم یہ ممکن ضرور تھا کہ یوں دوسری سلطنت دستوری بادشاہی بن جاتی۔ ابتدائی ایجی ٹیشن محض سیاسی نہ تھا، بلکہ اقتصادی بھی تھا، کیونکہ ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انتہا پسند جمہوریت پرور تعداد میں بہت بڑھ جاتے۔ سلطنت اس صورت میں ڈوب جاتی لیکن فرانس و پروشیا کی جنگ میں ــــ جس کا جال بسمارک نے نپولین کے لیے ہنر مندی سے بچھا دیا تھا ــــ فرانسیسی فوجوں کی تباہی خیز شکستوں نے لبرل سلطنت کا تجربہ اختتام تک پہنچا دیا۔ سیڈان[3] میں ذلت خیز

---

[1] Eugenie

[2] Emile Ollivier

[3] Sedan یہاں بہت بڑی فرانسیسی فوج نے جرمنوں کے روبرو ہتھیار ڈالے۔

حوالگی کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو پیرس کے ایک ہجوم نے قانون ساز مجلس کے ممبروں کو مجبور کر دیا کہ سلطنت کے سقوط کا اعلان کر دیں۔ یہ اعلان فرانسیسی جمہوریت کے کلاسیکی مرکز پیرس کے شہری ہال میں ہوا اور جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔

تیسری جمہوریت کا ظہور

نئی جمہوریت ۱۷۹۲ء کی جمہوریت کا ایک عجیب بچہ تھی جو قومی دشمن کے خلاف جنگ سے دست برداری کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ قومی دفاع کے لیے جو حکومت بنی تھی، اس نے جنگ جاری رکھنے کی کوشش کی، مگر والمی[1] کا معجزہ دہرایا نہ جا سکا۔ اکتوبر میں جنرل بیزین[2] ایک بڑی فرانسیسی فوج کے ساتھ میٹز[3] میں حوالگی پر آمادہ ہو گیا اور دوسری فوجوں کے غیر منظم عناصر ناقوتور جرمن فوجوں کے خلاف بے دست و پا تھے۔ تکان زدہ قوم جنگ سے تنگ آ چکی تھی۔ فروری ۱۸۷۱ء میں ایک قومی مجلس کا انتخاب ہوا، جو بوردو میں جمع ہوئی اور صلح کی درخواست پیش کر دی۔ انتخاب کے خاص حالات نئی جمہوریت کے لیے ایک مزید مشکل کا باعث بن گئے۔ اس اثنا میں جرمنوں نے پیرس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اہل پیرس بڑی مستعدی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ غذائی قلت نے جنوری ۱۸۷۱ء میں حوالگی پر مجبور کر دیا۔ محاصرے کی سختی کے باوجود پیرس کے انتہا پسندوں نے اختیارات پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ۱۷۹۲ء کے پیرس کمیون یا شہری حکومت کو از سر نو زندہ کر دیں۔ یہ لوگ حوالگی برداشت نہیں کر سکتے تھے، جس کے لیے باقی ملک تیار ہو رہا تھا۔ انتخابات میں ان کی انتہا پسندی نے زیادہ تر صوبائی ووٹروں کو قدامت پسند امیدواروں کی طرف راغب کر دیا، جو صلح کا حلف اٹھا چکے تھے اور جو جمہوریت نہیں پرانی بادشاہی بحال کرنا چاہتے تھے۔

نئی قومی مجلس نے یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو صلحنامہ منظور کر لیا۔ السائس اور لورین جرمنی کے حوالے کر دیے اور پانچ بلین فرینک (تقریباً ایک ارب ڈالر) تاوان دینا منظور کیا۔ پھر پیرس کی قومی محافظ فوج، جس سے جرمنوں نے ہتھیار نہیں لیے تھے، انتہا پسندوں سے مل گئی اور پیرس کی مستقل حکومت قائم کر دی گئی۔ مارکسیوں نے ۱۸۷۱ء کی مستقل حکومت پیرس کو پہلی بڑی اشتراکی حکومت قرار دے کر اس کی تقدیس پر زور دیا۔ اس قومی حکومت کے ارکان جیکوبن، انتہا پسند اور ایسے جمہوریت پرور تھے، جن کے دل میں حُبِ وطن کا طوفان موجزن تھا۔ وہ نجی جائداد کی تنسیخ کے قائل نہ تھے۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے خود مختار دکانداروں اور کاریگروں کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال ان کے لیے محصور شہر میں وسیع عمرانی اصلاحات کا کوئی موقع نہ تھا۔ لیکن انھوں نے باقی فرانس کو چونکا دیا اور صلحنامے کو قبول کرنے سے ان کا انکار قومی مجلس کو چیلنج تھا اور اس کا مقابلہ کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ جرمنوں کا پہلا محاصرہ ہی خاصا خوفناک تھا۔ اس میں قومی مجلس کی حکومت کے نئے محاصرے نے مزید مصیبتیں پیدا کر دیں۔ قومی حکومت کی فوجیں ورسائی میں جمع ہوئیں اور

۱؎ Valmy اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انقلابی فوجوں نے بعض مقامات پر شکست کے باوجود اس لڑائی میں زبردست فتح حاصل کی تھی (۱۷۹۲ء) اور حریف میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

۲؎ Bazeme

۳؎ Metz

۲۱ مئی سے ۲۸ مئی تک کے خونریز ہفتے میں ان فوجوں نے مزاحمتوں کو توڑتے ہوئے شہر کو مخالف عناصر سے پاک کر دیا۔

یوں تیسری فرانسیسی جمہوریت اغیار اور خانہ جنگی کی فضا میں پیدا ہوئی۔ اور کام شروع کیا تو اسے غیر منفصل اختلافات کا ایک ذخیرہ میراث میں ملا، بلکہ ۱۸۷۱ء میں یہ واضح بھی نہ تھا کہ تیسری جمہوریت قائم ہو چکی ہے۔ نئی قومی مجلس کے نصف سے زیادہ ممبر شاہ پسند تھے اور وہ جمہوریت کے اس رسمی اعلان کو ختم کر دینا چاہتے تھے، جو سیدان میں جوانگی کے ساتھ ہی ہو چکا تھا۔ اب ہمارے سامنے وہ مثبت واقعات آتے ہیں جن کا تاریخی سراغ اُن غیر شخصی قوتوں میں لگانا مایوس کُن ہے، جو انسانی یا شخصیت کے عمل دخل سے ماورا ہیں۔ یہ وسیع غیر شخصی قوتیں تھیں جو انسانیت کی دسترس سے باہر تھیں۔ شاہ پسندوں میں سے تقریباً نصف مندوب اُس بوربون نسل کو جائز وارث قرار دے رہے تھے، جس کی نمائندگی کا دعویدار چارلس دہم کا پوتا کاؤنٹ آف شامبور[۱] تھا، باقی نصف اس اورلیان خاندان کے حامی تھے جو ۱۸۳۰ء میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس کی نمائندگی لوئی فلپ کا پوتا کاؤنٹ آف پیرس کر رہا تھا۔ ممکن ہے، شامبور فرانس کا شاہ ہنری پنجم بن جاتا، جیسا کہ اس کے حامی چاہتے تھے، مگر ضروری تھا کہ وہ اورلیانی جذبات سے ہلکی سی رعایت برتتا اور سہ رنگہ (نیلا، سفید اور سرخ) انقلابی پرچم اختیار کر لیتا، جسے لوئی فلپ فرانس کا پرچم تسلیم کر چکا تھا۔ لیکن شامبور اصرار کرتا رہا کہ میں سفید ہی پرچم اختیار کروں گا۔ جس پر بوربونوں کے سنہرے سوسن بنے ہوئے تھے اور جو کروڑوں فرانسیسیوں کے نزدیک ان تمام واقعات کی تردید تھی جو ۱۷۸۹ء سے پیش آ رہے تھے۔ وہ بادشاہ بننا چاہتا تھا، مگر وکٹوریہ کی طرح محض نشان نہیں بننا چاہتا تھا، لیکن ایسا بادشاہ بننے کا فرانس میں کوئی امکان نہیں رہا تھا۔

یوں توقف کی حالت پیدا ہوئی تو جمہوریت پروروں کی اقلیت اپنی جگہ قائم رہی اور آہستہ آہستہ اس نے قوت حاصل کر لی۔ تیار اورلیانی بادشاہی کے زمانے کا تجربہ کار مدبر تھا۔ وہ نپولین سوم کے زمانے میں حزب مخالف کا لیڈر بن گیا تھا۔ اسے جمہوریت کا صدر قرار دے دیا اور اسی کے ذریعے سے جرمنی کے ساتھ آخری فیصلہ ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں اس کی جگہ مارشل میکماہون[۲] نے لے لی۔ وہ سپاہی بھی تھا اور شاہ پسند بھی۔ اسے اس لیے چنا گیا تھا کہ حکومت کو متحد رکھے تاکہ اس اثنا میں شاہ پسندوں کی اکثریت بوربونوں اور اورلیانیوں کے درمیان صلح کرا دے۔ صلح ہو نہ سکی، کیونکہ شامبور سفید پرچم پر مصر رہا اور ۱۸۷۵ء میں دستوری تدبیروں کے ایک سلسلے کے ذریعے سے تیسری جمہوریت قائم کر دی گئی۔

۱۸۷۵ء کا دستور

ان قوانین کو بہ حیثیت مجموعی ۱۸۷۵ء کا دستور قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ صدر کا انتخاب سینٹ اور ایوانِ مندوبین کے مشترکہ اجلاس میں اکثریت کی بنا پر کیا جائے۔ اس کے

۱۔ Coant of Chamhord

۲۔ Macmahon

ساتھ وزیروں اور قانون سازی کے دو ایوان ہوں جن کا انتخاب بالغوں کے عام حق رائے کی بنا پر ہو۔ سینٹ کا انتخاب بالواسطہ ہوتا تھا اور ایوان مندوبین کا بلاواسطہ، ہر قانون کے لیے لازم تھا کہ دونوں ایوانوں میں منظور ہو۔ مالی معاملات میں صرف ایوانِ زیریں پہل کا حقدار تھا۔ وزراء کی ذمہ داری کا معاملہ نازک تھا۔ اگر صدر کو انھیں موقوف کرنے کا اختیار دے دیا جاتا تو نیا پولین سوم بہ آسانی بروئے کار آسکتا تھا، جو جمہوریت کو تباہ کر دیتا۔ میکماہون نے یہ اختیار استعمال کرنے کی کوشش کی۔ جب اس نے وزیر اعظم جیولس سائمن[1] کو موقوف کر دیا۔ (۱۶ مئی ۱۸۷۷ء) جو پادریوں کے خلاف تھا، مگر اس نازک موقع پر قومی انتخابات ناگزیر ہو گئے اور نئے ایوان نے پارلیمنٹ کی برتری کا اصول قائم رکھا۔ ۱۸۷۹ء میں میکماہون کو استعفاء دینا پڑا اور اس کی جگہ پختہ کار جمہوریت پرور جیولس گریوی[2] صدر بنا۔ گویا نو سال تک برائے نام قائم رہنے کے بعد آخر تیسری جمہوریت ایک حقیقت ثابتہ بن گئی۔ وضع کے اعتبار سے یہ دستوری بادشاہی معلوم ہوتی تھی، جس پر جمہوریت کا پیوند لگا دیا گیا تھا۔ آئینی بادشاہ کی طرح اس کا ایک زیبائشی صدر تھا۔ دستور میں یہ مرقوم تھا کہ صدر چاہے تو ایوان کو برطرف کر کے ملک میں نئے انتخابات کرا سکتا تھا، مگر ۱۶ مئی کے بعد میکماہون کا جو حشر ہوا، وہ بڑا عبرت ناک تھا اور ایوان کو برطرف کرنے کا طریقہ اتنا ذلیل ہو چکا تھا کہ پھر کبھی اسے آزمایا نہ گیا۔ انگلستان کی طرح اصل انتظامی جماعت وزارت تھی، جو قانون ساز مجلس —— یا کہنا چاہیے ایوانِ مندوبین —— کے روبرو جوابدہ تھی۔ وہی ایوان جلد سے جلد سیاسی عمل کا مرکز بن گیا اور سینٹ صرف سن رسیدہ مدبروں کے لیے ایک معزز مامن جمہوریت بن گیا۔ ایوان مندوبین میں ملک کے سیاسی افکار منعکس ہوتے تھے۔ اس میں دو نہیں، بلکہ ایک درجن یا اس سے بھی زیادہ پارٹیاں تھیں اور ہر وزارت کی حمایت کے لیے مختلف پارٹیوں کا اکٹھا ہونا ضروری تھا۔ پھر پارٹیاں جگہیں بدلتی رہتی تھیں۔ اس طرح شخصیتیں اور اصول بروئے کار آتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وزارتیں حد درجہ ناپائدار بن گئیں۔ تیسری جمہوریت کے ماتحت کسی وزارت کی متوقع میعاد بہ مشکل ایک سال ہوتی تھی۔

مگر یہ عدد غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے۔ تیسری جمہوریت کے ماتحت فرانسیسی وزارت عموماً استعفا نہیں دیتی تھی بلکہ اس کی جگہ یکایک مختلف وزارت لے لیتی جس کا پروگرام بھی مختلف ہوتا اور یہی کیفیت چوتھی جمہوریت کے تحت بھی پیش آتی رہی۔ ہوتا یہ کہ بعض افراد بدل دیئے جاتے، بعض پارلیمانی گروہوں سے مصالحت کر لی جاتی اور نئی وزارت اسی طرح جاری رہتی جس طرح پرانی —— وزارت جاری تھی۔ مثلاً بریاں[3] اجتماعی تحفظ کا بہت بڑا مجاہد تھا۔ وہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۳۲ء تک مختلف وزارتوں میں وزیر اعظم رہا۔ ڈلکاسے[4] نے فرانس کا اتحاد انگلستان

---

۱ Jules Simon

۲ GRANEY

۳ BRIAND

۴ DELCASSE

سے کرایا تھا۔ وہ مسلسل متعدد وزارتوں میں وزیر خارجہ رہا اور یہ مدت سات سال تھی (۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۵ء) خود ہمارے زمانے میں ایک ہی پارٹی کے دو فرد شومین[1] اور بیدو[2] چوتھی جمہوریت کے ایک درجن کابینوں میں باری باری وزیر خارجہ بنتے رہے۔ مزید برآں حکومت کا روزانہ کاروبار سول سروس انجام دیتی ہے۔ ان میں ثانوی عدالتوں اور تعلیمی نظام کے ماہرین انتظامی محکموں کے ذمہ دار سب شامل ہیں۔ یہ مستقل ملازمین فرانس کا سیاسی سلسلہ کاروبار بنیادی طور پر جاری رکھتے ہیں۔ صرف بڑے بڑے معاملات میں پالیسی کا فیصلہ وزارتیں کرتی ہیں۔

نظام ہر لحاظ سے اعلیٰ پیمانے کا جمہوری ہے، کیونکہ ہر کام مسلسل اور پُرپیچ مفاہمتوں کے ذریعے سے مجلس قانون ساز کی متعدد پارٹیاں انتخابات کے بعد قائم کرتی ہیں۔ انگریزی بولنے والے ملکوں میں ایسی مفاہمتیں انتخاب سے پہلے ہوتی ہیں اور ان کی ذمہ داری دو بڑی پارٹیوں پر رہتی ہے۔ انگریزی بولنے والے ملکوں کا طریقہ مخالفتوں کو چھپائے رکھتا ہے اور ارادی مفاہمت کا طریقہ برّاعظم کے نظام کے مقابلے میں زیادہ موثر طریق پر بروے کار لاتا ہے، تاہم اگر مخالفتوں کا اصل سبب زیادہ گہرا ہوا اور مفاہمت نہ ہو سکے تو کوئی بھی طریقہ کارگر نہ ہو سکے گا۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اندر دو پارٹیوں کا نظام بظاہر ۱۸۶۱ء میں ناکام رہا۔

بولانژہ اور پاناما

تیسری فرانسیسی جمہوریت ۱۸۷۹ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان تلخ مخالفتیں خطرے کا باعث بنی رہیں، مگر اسے تباہ نہ کر سکیں۔ جمہوریت میں دائیں بائیں جو مخالف گروہ موجود تھے، وہ کبھی اکٹھے نہ ہو سکے۔ دائیں جانب کے شاہ پسندوں نے بوربون اور لیان کے جھگڑے ختم کر لیے اور اگرچہ انھیں ادبی حلقوں میں بھی کسی قدر حمایت حاصل تھی، لیکن انھیں وہ قوت پھر حاصل نہ ہو سکی، جسے وہ صدی کے آٹھویں عشرے میں برباد کر چکے تھے۔ بوناپارٹ خاندان کے حامی بھی رائے عامہ کے کسی قابل ذکر حصے کو اپنا حامی نہ بنا سکے، اگرچہ وہ ایک سیاسی گروہ کی حیثیت میں بیسویں صدی کے اندر بھی زندہ رہے۔ کیتھولک اکثر جمہوریت پروروں کی خلاف مذہب پالیسی میں نیا جوش پیدا ہونے سے خوفزدہ تھے، مگر ۱۸۷۸ء میں لیو سیزدہم پوپ بنا۔ اس کے بعد کیتھولکوں نے آزادیٔ عبادت کا وہ طریقہ قبول کر لیا، جو جمہوریت نے ان کے لیے متعین کیا تھا۔ یوں انھوں نے اپنے طریقِ حیات کو تقویت پہنچائی۔ جو لوگ جمہوریت کے دشمن تھے، انھوں نے خود اپنے قدامت پسندانہ اصول مشروع کو جبراً دبا لیا اور کسی نئے آدمی کے انتظار میں بیٹھ گئے، جو دورِ حاضر کی صنعتی مملکت کی مروّج مشینری میں انھیں کامیاب بنا سکتا اور وہ اپنی ڈکٹیٹری قائم کر لیتے۔

صدی کے نویں عشرے میں انھیں امید پیدا ہو گئی کہ نیا آدمی جنرل بولانژہ[3] کی شکل میں مل گیا ہے۔ وہ ایک نعمت جو

۱؎ Schuman　　۲؎ Bidault

۳؎ Boulanger

سپاہی تھا اور وزیرِ جنگ کی حیثیت میں فرانسیسیوں کے جذبات جرمنی سے انتقام لینے کے لیے بھڑکاتا رہا تھا۔ مگر یہ تحریک ایک ایسے آدمی کے بل پر قائم ہوئی، جس کی حقیقی حیثیت پرِ کاہ کی تھی۔ جنرل بولانشرہ شکل و صورت میں خاصا مؤثر تھا۔ ایوان کی خالی نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات میں اس نے ثابت کر دیا کہ اسے عوامی حمایت حاصل ہے۔ مگر قدامت پسندوں کے نقطۂ نگاہ سے بولانشرہ مفاہمت پر تیار رہتا تھا۔ اس کے بعض دوست انتہا پسند تھے۔ جب واضح ہو گیا کہ بولانشرہ برسرِ اقتدار آ گیا تو ممکن ہے ملک کو جنگ میں دھکیل دے، اس وجہ سے ساتھیوں نے علیحدگی کی دھمکی دے دی۔ جنوری ۱۸۸۹ء میں پیرس کے ضمنی انتخاب کے اندر اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، مگر جب اسے اس اقدام سے سابقہ پڑا، جسے انقلابی قرار دیا جاتا ہے تو بولانشرہ کی ہمت نے جواب دے دیا۔ چنانچہ اس نے اسلحہ کے زور سے اختیارات پر قبضہ کرنے کے بجائے اپنی محبوبہ کے ہاں پناہ لے لی۔ اب حکومت کو بھی حوصلہ ہوا۔ اس نے بولانشرہ کے خلاف غداری کا مقدمہ قائم کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ برسلز بھاگ گیا اور ۱۸۹۱ء میں اپنی محبوبہ کی قبر پر خودکشی کر لی۔ جمہوریت پہلے بڑے بحران سے صحیح و سالم باہر نکل آئی۔

بولانشرہ کے مقصد کو جمہوری صفوں کے ایک افسوسناک واقعے سے تقویت پہنچی۔ صدر گریوی کے داماد ڈینیل ولسن پر یہ الزام لگا کہ وہ فرانس کے ایک اعلیٰ اعزاز (لیجین آدآنر)[۱] کو فروخت کر رہا ہے۔ مخالف اخباروں نے دعویٰ کیا کہ حکومت رشوت خواری سے سراپا ملوث ہے۔ صدی کے دسویں عشرے کے اوائل میں جلتی آگ پر تیل یوں ڈالا گیا کہ ایک اور واقعے کے چہرے سے پردہ اٹھ گیا۔ یہ رشوت ستانی، تباہ کاری اور رسوائی کے ان واقعات میں سے تھا، جو دورِ حاضر کے مغربی معاشروں سے مختص واقع ہوتے ہیں۔ یہ نہر پاناما کا واقعہ تھا، جس کا ذمہ دار ڈی لیسپس تھا۔ اس نے نہر سویز کی کھدائی میں کامیابی حاصل کی تھی، مگر نہر پاناما کی کھدائی میں ناکام رہا۔ اس معاملے میں مجرمانہ رشوت خواری کے الزامات وزیروں، مندوبوں اور اربابِ ثروت پر لگے۔ ایک بدنصیب یہودی بینکر نے جس کا نام ریناخ[۲] تھا، یا تو مقدمہ شروع ہونے سے پیشتر خودکشی کر لی یا اسے قتل کر دیا گیا۔ بہ ایں ہمہ پاناما کا قضیہ معاملۂ ڈریفوس[۳] کے سامنے ماند پڑ گیا۔

معاملۂ ڈریفوس

ڈریفوس ایک یہودی تھا، جسے فرانسیسی فوج میں کپتان کا عہدہ حاصل تھا۔ اتفاقیہ وہ جاسوسی کی ایک سازش، نیز یہودیوں کی مخالفت کا ہدف بن گیا، جو اُس وقت فرانس میں عام تھی، خصوصاً فوجی اور کیتھولک حلقوں میں۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ فوجی راز روپیہ لے کر جرمنوں کے حوالے کر دیے ہیں۔ چنانچہ اسے قربانی کا بکرا بنا کر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸۹۴ء میں اسے غداری کی سزا ملی۔ کرنل پکارٹ[۴] کو، جو محکمۂ اطلاعات کا اعلیٰ افسر تھا، یقین

۱۔ Legion of Honor

۲۔ Reinach

۳۔ Dreyfus

۴۔ Picquart

ہو گیا کہ دریفوس کو جس دستاویز کی بنا پر سزا دی گئی ہے، وہ جعلی ہے اور اصل غدار ایک بدنام طالع آزما ہے، جو نسلاً ہنگیری تھا، مگر پیدا فرانس میں ہوا، یعنی میجر استرہازی[1] ہے۔ پکارٹ کے بالادست افسروں نے اسے چپ چاپ جہاز میں سوار کر کے افریقہ بھیج دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اصل معاملہ یونہی دبا رہے، مگر دریفوس کے خاندان نے خود تفتیش شروع کر دی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اصل مجرم استرہازی ہے، لہٰذا مقدمہ از سرِ نو شروع ہونا چاہیے۔ چنانچہ استرہازی پر مقدمہ چلا اور وہ بری کر دیا گیا، مگر اس اثنا میں معاملہ عوام تک پہنچ چکا تھا اور اسے چھپائے رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں مشہور ناول نگار امیل زولا[2] نے ایک کھلا خط شائع کیا، جس کا عنوان تھا، "میں الزام لگاتا ہوں۔" زولا نے اس خط میں فوجی لیڈروں میں سے ایک ایک کو مجرم قرار دے دیا کہ انھوں نے فوج کی نیکنامی محفوظ رکھنے کے لیے ایک بے گناہ آدمی کو دیدہ دانستہ قربان کیا۔ خط کے خاتمے پر زولا نے حقیقت کے لیے اپنے شوق و شیفتگی کا اظہار یوں کیا:

> "میں نے جن چند آدمیوں پر الزام لگایا، ان سے بالکل ناواقف ہوں۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ میرے دل میں ان کے خلاف کوئی کینہ اور نفرت نہیں۔ میرے نزدیک ان کی حیثیت ایسے وجودوں کی ہے، جو ایک عمرانی بے انصافی کا موجب بنے۔ میں نے اس سلسلے میں جو کام انجام دیا، وہ ایک انقلابی طریقہ ہے تاکہ حق و انصاف جلد سے جلد بروئے کار آجائے۔
>
> "میرے دل میں صرف ایک جذبہ ہے اور وہ یہ کہ انسانیت کے نام پر حقیقت روشن ہو جائے۔ اس نے سخت مصیبت اٹھائی اور اسے راحت و مسرت کا حق ہے۔ میرا آتشیں احتجاج میری روح کی پکار ہے[3]....."

اب فرانس دو گروہوں میں بٹ گیا۔ ایک گروہ دریفوس کا پاسدار تھا، دوسرا اس کا مخالف۔ دریفوس کے پاسدار جمہوریت کا دفاع کر رہے تھے اور مخالفین نے جمہوریت کو ہدف بنائے رکھا تھا۔ بائیں بازو کے جو لوگ اب تک اس معاملے سے الگ تھلگ رہے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ یہ سرمایہ دار سلطنت کی انتہائی خرابیوں کی ایک اور مثال ہے، اب وہ بھی تیسری جمہوریت کے پشتیبان بن گئے۔ دریفوس کو سزا دے کر ڈیولز آئیلنڈ[4] (فرانسیسی گائنا) کے قید خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں سے اسے واپس بلایا گیا اور مقدمہ از سرِ نو شروع ہوا۔ اس اثناء میں اخباروں اور پلیٹ فارموں کی تقریروں کے ذریعے سے پُرزور مہم شروع ہو چکی تھی۔ فوجی عدالت کے سامنے نئی شہادت پیش ہوئی۔ یہ شہادت کرنل ہنری کی خودکشی

---

[1] Esterhazy [2] Zola

[3] زیوائے (Zevaes) نے یہ اقتباس تیسری جمہوریت کی تاریخ میں دیا ہے، ص ۲۲۷

[4] Devils Island ۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، یہ فرانسیسی گائنا میں مجرموں کی ویسی ہی نوآبادی تھا، جیسے جزائر انڈیمان انگریزوں کے ماتحت پاک و ہند رہے۔

سے فراہم ہوئی۔ یہ شخص اُن تمام دستاویزوں کے جعل کا ذمہ دار تھا جن کی بنا پر ڈریفوس کو مجرم بنایا گیا تھا۔ بہ ایں ہمہ دریفوس کو دوبارہ غداری کا مجرم قرار دیا گیا، مگر ساتھ ہی ایک ناقابل یقین توضیح کر دی گئی کہ یہ ایسی غداری ہے، جسے احوال و ظروف کی بنا پر اصل جرم میں تخفیف کا باعث سمجھنا چاہیے۔ اس سارے تکلف کا مقصد یہ تھا کہ ظاہر داری قائم رکھی جا سکے، مگر وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ صدر جمہوریت نے ۱۸۹۹ء میں ڈریفوس کو معافی دے دی اور ۱۹۰۶ء میں تنازع ختم ہو گیا تو اسے تمام الزامات سے بری قرار دے کر فوج میں میجر کے عہدہ پر بحال کر دیا گیا۔

ڈریفوس کا معاملہ ایمانی نفسیات کے مطالعے کے لیے ایک ایسا مقدمہ ہے جس کے ساتھ پوری دستاویزیں شامل ہیں۔ اصل عدالتی معاملہ یہ تھا کہ آیا یہ شخص مجرم ہے یا نہیں۔ عوامی جوش و خروش میں یہ معاملہ کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔ بہت سے فرانسیسی ڈریفوس یا یہودیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے دل میں کلیسا، فوج اور دائیں بازو کے پورے نظام کا احترام تھا۔ بہ ایں ہمہ وہ بھی چاہتے تھے کہ محض حقائق کی بنا پر ایک رائے قائم کر سکیں۔ مگر دونوں فریقوں میں اکثر افراد بہ حالت جوش ایسے مقام پر پہنچ جاتے جہاں ڈریفوس کے جرم کا مسئلہ دو طبقوں کی کشمکش میں بالکل گم ہو گیا۔ عوام کے لیے صرف یہ کافی تھا کہ کرنل ہنری نے جعلسازی کا اعتراف کرتے ہوئے خودکشی کر لی۔ وہ سمجھے کہ ڈریفوس بیگناہ ہے۔ لیکن جو لوگ ڈریفوس کے شدید مخالف تھے ان کے نزدیک ہنری ایک ہیرو اور "شہید" بن گیا، جس نے ملک کی خاطر جان دے دی۔ پیرس میں ایک گشتی مراسلہ شائع کیا گیا، جس میں عوام سے درخواست کی گئی کہ ہنری کی یادگار قائم کریں۔ یہ مراسلہ مظہر تھا:-

> "کرنیل ہنری ملک کا سچا خادم تھا۔ عوام کو اس کی یادگار قائم کرنے کے لیے چندہ دینا چاہیے۔ جب ایک افسر مزعومہ جعلسازی پر مجبور ہوتا ہے، تاکہ ملک میں امن بحال رکھے اور ایک غدار سے اسے نجات دے، اس افسر کا ماتم ضروری ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں اپنی زندگی نذر کر دیتا ہے تو اسے شہید سمجھنا چاہیے۔ اگر وہ بہ طیب خاطر اپنی جان قربان کرتا ہے۔ تو وہ ایک ہیرو ہے۔"[1]

ایک صوبائی اخبار نے اعلان کیا:-

> "جب یہودا اسکریوتی نے تیس سکے پاکدامنی کے خون کی قیمت میں وصول کر لیے تو وہ ایک کھیت میں چلا گیا اور وہاں اپنے آپ کو پھانسی دے لی۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور آنتیں باہر نکل کر زمین پر گر پڑیں۔
>
> یہ فطری انصاف تھا، جو بروئے کار آیا......"

---

[1] ڈریفوس کا مقدمہ ص ۲۹۰

فطری انصاف ۔۔۔۔۔۔۔

وہ کل یہودی کے پوتے دریفوس نے جرمنوں سے روپے لیے اور ہمارے ملک سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر بیچے۔ وہ مجرم قرار پایا۔ اس کی رسوائی ہوئی۔ اس کا ایک ایک بٹن توڑا گیا۔ فرانسیسی افسر کی معزز وردی سے ایک ایک زرتار حصہ الگ کیا گیا۔ اب وہ ایک پنجرے میں بند ہے جس میں اس کا جرم نہیں سما سکتا اور موت کی کھڑکھڑاہٹ اس کے گلے میں ہو رہی ہے۔ اس کا جرم جس سزا کا مستوجب ہے، اس کے لیے یہ پنجرہ بہت وسیع ہے۔

فطری انصاف ۔۔۔۔۔۔۔

"اب سوچو کہ یہ ننگ بشر اسرائیلی سامنے آیا ہے اور فرانسیسی فوج کے جنرل سٹاف کو دھمکی دے رہا ہے، جو ملک کے خون اور ہڈیوں سے بنا ہے۔ اس سٹاف کے ممبروں کو ایسے انکشافات کی دھمکی دے رہا ہے جن کا ذکر آتے ہی وہ بھاگ جائیں گے اور نہایت ذلیل مجرموں کی طرح اپنے چہرے چھپا لیں گے۔" [1]

جمہوریت دریفوس کے بعد

دریفوس کے حامیوں کو کامیابی حاصل ہوئی تو جمہوریت کا رخ بائیں بازو کی طرف ہوا۔ چنانچہ کلیسا کو فوج کی حمایت اور دریفوس کی مخالفت کی سزا دی گئی۔ کامیاب جمہوریت پروروں نے سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء کے درمیان متعدد قوانین منظور کیے، جن کے بعد سنہ ۱۸۰۱ء کا وہ میثاق برباد ہو گیا، جو نپولین اوّل اور پوپ کے درمیان ہوا تھا اور جس کے مطابق مذہب کیتھولک کو مملکت فرانس میں ایک مخصوص حیثیت ملی تھی۔ کیتھولکوں نے تعلیمات کے لیے جو نظام بنا رکھا تھا، وہ درہم برہم ہو گیا اور بارہ ہزار کیتھولک سکول، جو مملکت کے تعلیمی نظام کے زبردست حریف تھے، بند کرنے پڑے۔ مملکت نے فیصلہ کر لیا کہ پادریوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملے گی۔ عقیدت مندوں کو چاہیئے کہ نجی تنظیمات قائم کریں، جن کے ذریعے سے عبادت کے مصارف ادا ہوں، نیز کلیساؤں کی ملکیت اور بحالی کی ذمہ داری ان پر ڈالی جائے۔ کیتھولکوں نے یہ فیصلہ قبول نہ کیا اور کلیسا رسماً حکومت کی ملکیت رہے۔

بہ ایں ہمہ اگرچہ علیحدگی کا فیصلہ بڑی تلخی کے درمیان ہوا تھا اور اگرچہ بحثوں میں ایسی تیز و تند زبان استعمال کی گئی تھی، جس سے اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے کی یاد تازہ ہو گئی۔ مگر تشدد کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ کیتھو سسٹم ممنوع قرار نہ پائی، مگر کسی نہ کسی طرح کلیساؤں میں عبادت کا سلسلہ جاری رہا، جو قانونی اعتبار سے عقیدت مندوں کی ملکیت نہ تھے۔ البتہ

---

[1] ژورنال ڈی سنتر Journal De Contre مورخہ ۲۸ جون سنہ ۱۸۹۸ء

کیتھولکوں کے تعلیمی نظام میں سخت رکاوٹ پیدا ہوئی، اگرچہ ان پر رسمًا کوئی سختی نہ کی گئی۔ علیحدگی سے فرانس کی بنیادی عمرانی حیثیت میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ شمال و مغرب کے بالائی طبقے اور کسان وفادار کیتھولک بنے رہے۔ جنوب مغرب اور دیہات کے لوگ وہی رہے، جو گزشتہ چند صدیوں سے چلے آتے تھے، یعنی بے پروا سے کیتھولک یا پکے دنیا دار۔

جمہوریت کی مرکزی پارٹی انتہا پسند اشتراکیوں پر مشتمل تھی۔ اس کو جمہوریت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی، مگر وہ حقیقتًا اشتراکی نہ تھے، بلکہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تھے، جنھیں فرانس کے پیروانِ جیفرسن کہنا چاہیے۔ دراصل تیسری فرانسیسی جمہوریت بیسویں صدی کے اندر ایک سرمایہ دار مملکت تھی۔ اس نے عمرانی تحفّظ اور رہنے سہنے کے حالات بہتر بنانے کے لیے مزدوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے اور بعض مراعات دے دیں، لیکن وہ مراعات اتنی ہی تھیں جتنی برطانیہ کی دستوری بادشاہی مزدوروں کو دے چکی تھی۔ فرانس میں مزدوروں کی پیشہ ور یونینوں کو آئینی سمجھا جاتا تھا، لیکن فرانسیسی مزدور واجبات ادا نہیں کرتے تھے اور یونین کے ضبط و نظم کے قبول سے متامّل تھے۔ اس وجہ سے یونینوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ بہرحال فرانس جس کے وسائل کشاورزی زمانۂ قدیم کے تھے اور دیسی صنعتوں کا ملک، جن کا ضبط و نظم کنبوں کے ہاتھ میں تھا اور کاروبار کے طریقے بہت قدامت پسندانہ تھے۔ یقینًا وہاں چند بڑی صنعتیں بھی تھیں اور ان کے ساتھ صنعتی پرولتاری بھی تھے، جن کی تعداد زیادہ نہ تھی اور وہ اشتراکیت کے حامی تھے۔ تاہم فرانس کی سرزمین بڑی صنعت کے معیار سے پسماندہ تھی، البتہ پرانے خودکفیل اقتصادی معیار کے لحاظ سے خاصی متوازن تھی۔

تیسری جمہوریت داخلی اختلافات کے طوفانوں کا مقابلہ نہ کر سکی اگرچہ بعض فرانسیسی انھیں سخت ناپسند کرتے تھے اور اگرچہ اکثر فرانسیسیوں کا احساس یہ تھا کہ یہ حکومت پر بے اعتمادی ہے۔ جو امریکی جمہوریت میں کالعدم ناپید ہے۔ اکثر فرانسیسی اسی کو اپنے وطن کا مجسّم سمجھتے تھے۔ ان میں یقینًا اختلافات پیدا ہوئے، خصوصًا سامراجی پالیسی کے مسائل پر۔ فرانس کے مقبوضات افریقہ، ہند چینی اور اوشیانا میں بہت وسیع ہو گئے اور اس طرح فرانس برطانیہ کے بعد دوسرے درجے کی عالمی سلطنت بن گیا۔ لیکن یہ توسیع ایک باعزم اقلیت کا کام تھی۔ بہت سے فرانسیسی نوآبادیوں کے مخالف تھے یا کم از کم ان سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔

۱۸۷۰ء کے بعد فرانس کے اندر داخلی معاملات اور سامراجی مسائل میں بعض اوقات خطرناک اختلافات پیدا ہوتے رہے تاہم خارجہ پالیسی میں تیسری جمہوریت اساسًا متحد تھی۔ خارجہ پالیسی کے بڑے بڑے مسائل پر اختلاف وقتی تفصیلات کے متعلق تھا نہ کہ اصل مقاصد کے متعلق۔ فرانس ۱۸۷۰ء کا بدلا لینا چاہتا تھا۔ اس کا عزم تھا کہ الساس اور لورین واپس لے لے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء کے بین الاقوامی سیاسیات کے پُرپیچ عمل میں تیسری جمہوریت کے وزراء خارجہ بدلتے رہے، کیونکہ وہاں متعدد پارٹیوں کا نظام جاری تھا۔ بایں ہمہ فرانس ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا، جہاں جرمنی سے بدلا لینا ممکن تھا۔ جن مملکتوں میں زبردست بادشاہیاں قائم ہوں یا ان پر ڈکٹیٹر قابض ہوں، ان

کے مقابلے میں جمہوریتوں کے لیے خارجی روابط میں بعض اوقات مشکلات پیش آتی ہیں۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں جمہوری فرانس تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے خلاف جرمنی اتحاد کے ایک حیرت انگیز انقلاب کا مرکز بنا ہوا تھا، مگر ۱۹۱۴ء میں جمہوری فرانس، طاقتور برطانیہ اور کم از کم وقتی طور پر طاقتور روس سے محکم اتحاد قائم کر چلا تھا اور جرمنی کو ایک کمزور آسٹریا ہنگری کے سوا کسی کی رفاقت حاصل نہ تھی۔

بتیسواں باب

اٹلی

سنہ ۱۸۴۸ء - سنہ ۱۹۱۴ء

تمہید

اٹلی کا قومی اتحاد سنہ ۱۸۴۸ء اور سنہ ۱۸۴۹ء کے واقعات کے بعد بہت بعید معلوم ہوتا تھا، مگر سنہ ۱۸۵۹ء اور سنہ ۱۸۷۰ء کے درمیان یہ اتحاد کامیابی کی منزل پر پہنچ گیا۔ سلطنت اٹلی سنہ ۱۸۶۰ء کے بعد ابھرنی شروع ہوئی، جس کا دستور تیسری فرانسیسی جمہوریت کا سا تھا، البتہ وہاں زیبائشی صدر کے بجائے زیبائشی بادشاہ تھا۔ وزارت ایوان زیرین کے روبرو ذمہ دار تھی، اور ایوان زیرین میں فرانس کی طرح متعدد پارٹیاں وجود میں آ گئی تھیں۔ ابتدا میں رائے دہی بہت محدود تھی اور اس کے لیے ایک خاص درجے کی ملکیت ضروری قرار دے دی گئی تھی۔ سنہ ۱۸۸۱ء کے بعد رائے دہی کا معیار بہت گھٹا دیا گیا —— انیس لیرا یا تقریباً چار ڈالر براہ راست ٹیکس ادا کرنے کی شرط —— اس طرح رائے دہندوں کی تعداد بیس لاکھ پر پہنچ گئی، مگر بالغوں کا حق رائے سنہ ۱۹۱۲ء تک جاری نہ ہو سکا۔

کاوور اور تکمیلِ اتحاد

اٹلی کے اتحاد کا معمار کاوور[1] تھا (سنہ ۱۸۱۰ء — سنہ ۱۸۶۱ء) جو سنہ ۱۸۵۲ء میں پیدمان کا وزیرِ اعظم بنا۔ اگرچہ اصل و نسل میں اس کا تعلق طبقۂ امراء سے تھا اور اس نے فوجی افسر کی تربیت حاصل کی تھی، جو حد درجہ قدامت پسند تھے، مگر کاوور نے کاروباری طبقات کے عزائم اور اقتصادی انقلابات کی پرجوش حمایت کی۔ وہ اوائل شباب میں فرانس اور انگلستان کی سیاحت کر چکا تھا اور ان کے اقتصادی کارناموں، نیز اقتصادی افکار سے بے حد متاثر تھا۔ وہ پیدمان واپس آیا تو اپنی خاندانی جاگیرات میں زراعت کے نئے طریقے استعمال کیے۔ ساتھ ہی دخانی جہازوں، ریلوں، صنعتوں اور بنکوں کو ترقی دی، تاکہ پیدمان متحدہ اٹلی کی قیادت کے لیے تیار ہو جائے۔ کاوور انیسویں صدی کے وسط کا ایک اچھا اور اعتدال پسند لبرل تھا۔ ساتھ ہی اس میں حقیقت پسندانہ ڈپلومیسی پر جسے اکثر حقیقی سیاست قرار دیا جاتا ہے، کاربند ہونے کی انتہائی صلاحیت موجود تھی۔ جب وہ پیدمان کا وزیر اعظم بنا تو فرانس و انگلستان کی حمایت حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہو گیا۔ جنگِ کریمیا میں اس نے روس کے خلاف فرانس و برطانیہ کا ساتھ دیا، اگرچہ

---

[1] Cavour

فوراً اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ انگلستان کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا جس سے آسٹریا ناراض ہو جائے۔ اگرچہ اس سے کاوور کو بڑی مایوسی ہوئی تاہم اس نے یہ شکست بہ ظاہر خوشدلی سے برداشت کر لی اور آخر نپولین سوم کو اس امر پر رضامند کر لیا کہ شمالی اٹلی پر آسٹریا کا تسلط زمانہ قدیم کی ایک چیز ہے اور یہ اصول قومیت کے سراسر خلاف ہے۔
۱۸۵۹ء میں فرانس اور پیدماں نے آسٹریا کے خلاف جنگ شروع کر دی اور جون میں مجنتا[1] اور سولفرینو[2] کے مقامات پر خونریز فتوحات حاصل کیں۔ ٹسکنی اور پاپائی جاگیرات میں ہمدرد عوام نے بغاوت کر دی۔ اس اثنا میں پروشیا نے آسٹریا کو امداد دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس پر نپولین چونک اٹھا۔ اس نے ولافرنکا[3] میں آسٹریا کے شہنشاہ فرانسس جوزف سے بات چیت کی (جولائی ۱۸۵۹ء)۔ وہاں ایک سمجھوتا ہو گیا جس کے مطابق لمبارڈی پیدماں کو مل گیا۔ وینس بدستور آسٹریا کے تابع رہا اور باقی جزیرہ نمائے اٹلی متفرق ریاستوں میں بٹا رہا۔ کاوور نے اس پر سخت احتجاج کرتے ہوئے استعفا دے دیا۔

تاہم وہ اصل میں کامیاب ہو چکا تھا۔ شمالی اور وسطی اٹلی کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ایک ہمہ گیر آشوب بپا ہوا، گویا ایک قطرۂ خون بہائے بغیر انقلابات شروع ہو گئے۔ عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ پیدماں کے ساتھ الحاق کے لیے رائے عامہ لی جائے۔ چنانچہ کاوور نے پھر وزارت سنبھال لی، تاکہ الحاقات منظور کرے اور جنوب میں پاپائی جاگیرداروں کے اندر جو امید افزا حالت پیدا ہو گئی تھی اس سے فائدہ اٹھائے۔ مئی ۱۸۶۰ء میں ایک انتہا پسند بلکہ جمہوریت پسند قومی لیڈر گیری بالڈی[4] کے زیر قیادت نیپلز اور سسلی کی طرف تاریخ کی ایک نہایت کامیاب مہم شروع ہو چکی تھی۔ کاوور خود تو شاہ پسند تھا، مگر اس خداداد امداد کے موقع کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اس مہم کو خفیہ خفیہ امداد دی۔ گیری بالڈی اور اس کے ایک ہزار "سرخ پوشوں[5]" کو سسلی میں بوربون بادشاہ فرانسس دوم کی کمزور مخالفت پر قابو پا لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ رضاکار گیری بالڈی نے پیدماں کے بادشاہ وکٹر عمانوئیل[6] سے وفاداری کا اعلان کر دیا اور وہ برطانوی وزیر لارڈ پامرسٹن کی منظوری سے خلیج میسینا[7] کو عبور کر کے سسلی پہنچ گیا۔ وہاں اپنا فاتحانہ اقدام جاری رکھا۔ کاوور کو یہ خوف پیدا ہوا کہ مبادا گیری بالڈی روما پر قبضہ کر کے نپولین کے ساتھ روابط میں بحرانی کیفیت پیدا کرے۔ لہٰذا اس نے پیدماں سے افواج پاپائی جاگیروں میں بھیج دیں۔ پاپائی افواج پر بہ آسانی قابو پا لیا گیا اور روما کے ارد گرد تمام علاقوں پر قبضہ ہو گیا۔ پھر رائے عامہ لی گئی۔ نیپلز اور سسلی نے شمال کے ساتھ اتحاد کے حق میں رائے دی۔

---

[1] Magenta

[2] Solferine

[3] Villafranca

[4] Garibaldi اٹلی کا مشہور محب وطن

[5] Red Shirts. چونکہ گیری بالڈی کے سپاہی سرخ وردی پہنے تھے، اس لیے سرخ پوش مشہور ہوئے۔

[6] Victor Emmanuel. یہ اتحادِ اٹلی کا بانی تھا۔

[7] Straits of Messina وہ تنگ آبنائے جو سسلی کو اٹلی سے جدا کرتی ہے۔

ان تیزی سے پیش آنے والے واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وکٹر عمانویل کو مارچ ۱۸۶۱ء میں اٹلی کا رئیس قرار دے دیا گیا۔ کاوور نے جون ۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔ لیکن جو کام دو سال پیشتر ولافرنیکا میں ناممکن نظر آرہا تھا، وہ پورا ہو گیا البتہ رومہ پر فرانسیسیوں کا قبضہ تھا اور وینس آسٹریا کے تصرف میں تھا۔ یہی دو علاقے باہر رہ گئے تھے، جنھیں محبان وطن نئی مملکت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ گیری بالڈی نے ۱۸۶۲ء میں ایک مہم کے ذریعے سے رومہ کو لینے کی کوشش کی لیکن نئی سلطنت کی فوجوں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔ مگر جلد معافی دے دی گئی۔ جب فرانسیسی رومہ سے نکل گئے تو ۱۸۶۷ء میں اس نے ایک اور کوشش کی لیکن فرانسیسی دوبارہ واپس آ گئے اور گیری بالڈی نے پھر شکست کھائی۔

وینس اور رومہ بین الاقوامی سیاسیات کے چکر میں سلطنت اٹلی کا جزو بن گئے اور اس کام کے لیے اٹلی کو چنداں خونریزی کا تختۂ مشق نہ بننا پڑا۔ ۱۸۶۶ء میں پروشیا اور آسٹریا کے درمیان مختصر سی جنگ ہوئی۔ اٹلی نے پروشیا کا ساتھ دیا۔ آسٹریا نے شکست کھائی۔ وینس اٹلی کو اس خدمت کے صلے میں مل گیا۔ ۱۸۷۰ء میں پروشیا سے جنگ چھڑی تو نپولین سوم پاپائی علاقے سے دست کشی پر مجبور ہوا۔ ۲۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سلطنت اٹلی نے رومہ پر قبضہ کر لیا اور وہی سلطنت کا دار الحکومت بن گیا۔ اب پورا جزیرہ نما ایک حکومت کے ماتحت آگیا، البتہ شمال میں ٹریسٹ[1] اور ٹرینٹ[2] الگ رہ گئے تھے۔ "بازنایافتہ"[3] اٹلی کے یہ دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی کم اہم نہ تھے، کیونکہ اطالوی محبان وطن انھیں آسٹریا کے زیر اقتدار رکھنے پر کبھی راضی نہ ہوئے، چنانچہ ۱۹۱۵ء میں آسٹریا اور اپنے حلیف جرمنی کے خلاف اٹلی کی شرکت جنگ زیادہ تر انھی علاقوں کے حصول کے لیے تھی۔

متحدہ اٹلی کا اثاثہ اور واجبات

نئی سلطنت کا آغاز سازگار رائے عامہ کے اثاثے سے ہوا۔ مغربی دنیا کے تمام غیر کیتھولک حصے اس کے حامی تھے۔ اٹلی کا قومی اتحاد طبعی اور مطلوب شے معلوم ہوتا تھا اور یہ زیادہ خونریزی کے بغیر مکمل ہو گیا تھا۔ اس کی تکمیل میں گیری بالڈی کی رومانیت اور کاوور کی حقیقت کے درمیان آمیزش ہو گئی تھی۔ سلطنت کے اندر جس خروش نے اٹلی کا احیا کیا تھا، وہی متحدہ اٹلی کی خدمت کا ذریعہ بن گیا۔ اطالوی باشندے کفایت شعار اور محنتی تھے۔ شمال میں مشینی دور کی نئی صنعت کا امید افزا طریق پر آغاز ہوا۔

لیکن نئی اٹلی کو قدم قدم پر مشکلات بھی پیش آرہی تھیں۔ مذہبی گروہ اور مخالفین پیشوایانِ مذہب۔ مناسب

۱؎ Trieste ۲؎ Trent

۳؎ Italia Irredenia (اٹالیا اِرّیڈینیا) یعنی وہ اٹلی، جسے غنیم کے قبضے سے آزادی نہیں دلائی گئی۔

یہ ہے کہ کہا جائے، مسیحیوں اور آزاد خیالوں ـــــ کے درمیان انقلاب فرانس نے جو خلیج پیدا کر دی تھی، وہ اٹلی میں بھی اتنی گہری تھی، جتنی فرانس میں تھی، بلکہ اٹلی میں اتحاد کے لیے آخری کوشش کے خاص حالات نے اسے اور زیادہ گہرا کر دیا تھا۔ مثلاً پاپائی جاگیرات کا الحاق پوپ کی مرضی کے خلاف عمل میں آیا۔ یوں مسئلہ رومہ پیدا ہوا۔ اٹلی میں کوئلہ اور لوہا نہیں تھا۔ دورِ حاضر کے بین الاقوامی اقتصادی مقابلے کی اصطلاح میں وہ نادار ملک تھا۔ وسطی اٹلی کا بیشتر پہاڑی حصہ اور جنوبی اٹلی کا پورا جنوبی حصہ انیسویں صدی کی مغربی تہذیب کے محض حاشیے پر تھے۔ ان پڑھ اور افلاس زدہ کسان ان قدیم مقامی طور طریقوں پر جمے بیٹھے تھے، جو دورِ جدید کی شہری زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ پھر چھوٹے چھوٹے جاگیردار امراء تھے، جن کے لیے کاوور جیسا آدمی بالکل ناقابلِ فہم تھا۔ نیپلز اور سسلی کے باشندے متحدہ سلطنت شمالی حصے کے اطالویوں کا سیاسی غلبہ دیکھ کر سخت خفا ہو رہے تھے، جس طرح خانہ جنگی کے بعد جنوبی ریاستوں کے امریکی شمالی ریاستوں کے امریکیوں پر ناراض تھے۔ مزید برآں کم از کم نصف اٹلی کے باشندوں کو خود اختیاری حکومت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہاں بحث مباحثہ کے ذریعے سے حکومت کی کوئی روایت موجود نہ تھی پھر یہ بھی ضروری تھا کہ قانون کی پابندی کی جاتی اور طبقۂ اوسط مفاہمت سے کام لیتا۔ ایسا کوئی طبقہ تھا ہی نہیں۔ یقیناً اٹلی مختلف مخلوط انواع ـــــ سورج کی نشاط افروزی، تاریک جذبات، موسیقی اور رہزنی ـــــ کی سرزمین نہ تھا، جیسا کہ شمالی ممالک کے یورپی اور امریکی سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ ایسی سرزمین تھا، جس میں طبقاتی کشمکش، علاقائی تنوع، سرگرم مقامیت زمانہ قدیم سے چلے آ رہے تھے، لہٰذا وہاں جمہوری حکومت کے لیے بڑی مشکلات موجود تھیں۔

رومہ کا مسئلہ نازک ہونے سے کہیں زیادہ مزمن ہو گیا۔ پوپ نے نئی سلطنت کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے محل واقع ویٹیکن میں "قیدی" بن کر بیٹھا رہا۔ ویٹیکن بدستور رومی کیتھولک کلیسا کی عالمی تنظیم کا مرکز رہا اور پوپ کو اپنے پیروؤں پر، جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے، اپنا اثر و اقتدار استعمال کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ خود اٹلی کے اندر کلیسا نے کیتھولکوں کو سیاسیات میں حصہ لینے سے منع کر دیا اور باقی کیتھولکوں سے کہا کہ وہ نئی سلطنت سے مقاطعہ کر لیں۔ رفتہ رفتہ کیتھولک سیاسیات میں زیادہ حصہ لیتے گئے۔ تاہم روما کا مسئلہ ۱۹۲۹ء تک طے نہ ہو سکا۔ پھر مسولینی اور پوپ پائس یازدہم کے درمیان اتفاق ہو گیا اور ویٹیکن شہر میں ایک خود مختار ریاست قائم کر دی گئی، جو ایک سو آٹھ ایکڑوں پر مشتمل تھی۔

نئی اطالوی سلطنت نے خاصی اقتصادی ترقی کی۔ ملک میں ریلیں بنائی گئیں، جن کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ریلیں پسماندہ جنوبی علاقوں میں بھی تیزی سے پہنچ گئیں۔ ایک نیا تجارتی بیڑا بن گیا جس کی بدولت نیا اطالوی پرچم سات سمندروں میں پہنچ گیا۔ فوج اور بحری بیڑے نے نئی سلطنت کو ایک طاقت کا درجہ دے دیا۔ قومی مالیات بھی قدامت پسندوں کی رہنمائی میں بخوبی منظم رہے، لیکن صدی کے نویں عشرے میں حالات خراب ہو گئے۔ پارلیمنٹ

میں سہل انگاری اور رشوت خوری بڑھ گئی۔ مزید برآں اٹلی نے سامراجی عزائم کا راستہ اختیار کر لیا۔ فرانس —— جس سے لاطینی الاصل ہمسر ہونے کی بنا پر مقابلہ تھا —— اور برطانیہ سلطنتیں پیدا کر چکے تھے اور بڑی طاقت کے لیے سلطنت ضروری تھی۔ چونکہ اٹلی بھی —— یا کہنا چاہیے، اس کا رہنما گروہ —— بڑی طاقت بننا چاہتا تھا، لہٰذا توسیع حدود کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنا ضروری ہو گیا۔ استعماری سعی و کوشش کے لیے رسمی اقتصادی، توجیہہ چنداں معقول معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ صدی کے نویں اور دسویں عشرے کا اٹلی کوئی ایسا ملک نہ تھا جس سے اہم سامان برآمد کیا جا سکتا۔ اسے نوآبادیوں میں منڈیوں کی کوئی ضرورت نہ تھی اور خود ملک کے اندر خاصی مشکلات موجود تھیں۔ یہ درست ہے کہ اٹلی کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اس آبادی کے لیے ملک کے اندر اقتصادی مواقع نسبتاً محدود تھے، خصوصاً جنوبی اٹلی میں۔ نیز دوسرے ملک سلطنت آرائی کا سلسلہ بہت پہلے شروع کر چکے تھے اور اٹلی کے لیے بہت کم علاقے باقی رہ گئے تھے۔ نیز جو علاقے باقی تھے، وہ اہلِ یورپ کی آبادکاری کے لیے موزوں نہ تھے۔ صرف افریقہ کے چند غریب تر علاقے موجود تھے، جن سے اتنا نفع حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے لیے تسخیر و تصرف کی زحمت گوارا کی جاتی۔

بایں ہمہ حبشہ (جسے اس وقت ایبی سینیا کہتے تھے) پر قبضے کی کوشش میں سلطنت کے وسائل پر بہت بوجھ پڑ گیا، پھر اہلِ حبش نے اطالوی فوج پر عدوہ[1] میں تباہی خیز ضرب لگائی (۱۸۹۶ء)۔ دسویں عشرے کے عام کساد، ایک بینک کی بدنظمی اور عدوہ کی ناکامی نے اٹلی کے صدی کے آخری سال بہت ناخوشگوار بنا دیئے۔ مئی ۱۸۹۸ء میں میلان کے اندر روٹی کے لیے خوفناک فساد شروع ہو گئے، جنھیں مئی کے "واقعات" قرار دیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک انارکسٹ نے شاہ ہمبرٹ کو قتل کر دیا۔ اس کی جگہ وکٹر عمانوئیل سوم بادشاہ بنا۔ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے رجحانات آزادانہ ہیں، اس لیے اکثر لوگوں کی ہمت بندھی۔ پہلی عالمی جنگ سے پیشتر کے برسوں میں نسبتاً امن و خوشحالی رہی۔ کلیسا سے جزوی مصالحت ہو گئی اور عام بالغوں کو حق رائے مل گیا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۴ء تک جیولتی سیاسی لیڈر بنا رہا۔ وہ بھی اپنے پیشروؤں کی طرح بڑا رشوت خوار اور انتخابات میں ہیر پھیر کر لینے والا شخص تھا، لیکن ساتھ ہی دانشمند اعتدال پسند تھا۔ اس نے عمرانی تناؤ کو ختم کرنے کے لیے بہت کچھ کیا اور مغربی نمونے کی سیاسی پارٹیوں کے پھولنے پھلنے کو تقویت پہنچائی۔ اب معلوم ہو رہا تھا کہ پارلیمانی جمہوریت کی جڑیں زمین کے اندر پہنچ گئی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان بہت سے لوگ شمالی اور جنوبی امریکہ چلے گئے، جن کی تعداد صرف ۱۹۱۳ء میں —— جس میں زیادہ سے زیادہ آدمی باہر گئے —— پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس وجہ سے اٹلی کی شرح پیدائش کی بنا پر جو شدید اقتصادی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں، وہ چھپی رہیں۔

تاہم جو آدمی اٹلی کا انتظامی کاروبار سنبھالے بیٹھے تھے، وہ اپنے ملک کی اس حیثیت پر قانع نہیں رہ سکتے تھے کہ اسے

---

[1] 'Idowa'

بحیرۂ روم کا سویڈن سمجھ لیا جاتا، جو سلطنت کے لیے مقابلے اور بڑی طاقتوں کے دائرے سے باہر متصور ہوتا۔ اٹلی بڑی طاقت نہ تھا، مگر اس کے لیڈر اور اس کے لاکھوں پیرو بڑی طاقت بن جانے کے خواہاں تھے۔ وہ ابی سینیا سے باہر نکالے گئے۔ بین الاقوامی سیاسیات کے بڑھتے ہوئے تناؤ میں انھیں تونس کے اندر فرانسیسیوں کے سامنے جھکنا پڑا۔ آخر اٹلی نے دوسری بڑی طاقتوں سے مل کر طرابلس کے افلاس زدہ اور بے آباد علاقے میں من ملنے اقدامات کی اجازت لے لی۔ یہ شمالی افریقہ میں ترکی سلطنت کا ایک بچا کھچا حصہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر ترکی سے جنگ شروع کر دی۔ اس طرح بلقانی ریاستوں کی جنگ کا دور شروع ہوا جس نے آگے چل کر پہلی عالمی جنگ کی صورت اختیار کی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ

تمہید پہلی عالمی جنگ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مجلس اقوام کے ایک اور نووارد یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ نے بین الاقوامی توازن میں پورا حصّہ لیا۔ ریاستہائے متحدہ کی مختصر سی قومی تاریخ کے سلسلے میں سادہ ترین اور مختلف اعتبارات سے اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ صدی سے کچھ ہی مدت زائد کے اندر اندر ریاستہائے متحدہ نے بلحاظ قوت ان بڑی مملکتوں کی حیثیت حاصل کرلی جن کے ذکر سے کتاب کے متعدد ابواب لبریز ہیں۔ یعنی آسٹریا، فرانس، انگلستان اور دوسری مملکتیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ بہت بڑی طاقت بن گئیں۔ اگرچہ ان کے اقوال وجذبات ایسے تھے کہ وہ بین الاقوامی مقابلے کے دائرے سے باہر اور الگ تھلگ رہیں۔ یہ حقیقت اعداد کے دو مجموعوں سے بخوبی آشکارا ہو سکتی ہے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں ریاستہائے متحدہ کا رقبہ آٹھ لاکھ بانوے ہزار مربع میل اور سنہ ۱۹۱۰ء میں سینتیس لاکھ چون ہزار مربع میل تھا۔ اس سے بھی اہم تر معاملہ آبادی کا ہے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں آبادی انتالیس لاکھ، انتیس ہزار اور سنہ ۱۹۱۰ء میں نو کروڑ انیس لاکھ بہتر ہزار تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ریاستہائے متحدہ کی آبادی جرمنی اور برطانیۂ عظمیٰ سے زیادہ تھی اور یہی دونوں یورپ کی نہایت طاقتور مملکتیں تھیں۔ یہ آبادی صرف روس سے دوسرے درجہ پر تھی۔ اس سے بھی اہم تر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کی صنعتی اور زرعی صلاحیتیں دنیا کے ہر ملک سے بہت بڑھی ہوئی تھیں۔

فیڈرل یونین جو سرزمین ایک صدی کی مختصر سی مدت کے اندر اتنی طاقتور ہو گئی، وہ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں کوہستان ایلیگینیز[1] کے آگے تقریباً خالی پڑی تھی، البتہ کہیں کہیں قدیم دیسی باشندے بکھرے ہوئے تھے، جن کی ثقافت حجری دور کی تھی اور یہ لاکھوں مربع میل زمین ہر لحاظ سے انسانوں کے استعمال کے لیے ویسی ہی موزوں تھی، جیسے یورپ کا کوئی خطہ موزوں ہو سکتا تھا۔ یہ حقیقت زیادہ تر مبصروں پر سنہ ۱۷۸۱ء میں واضح تھی اور انہیں امید تھی کہ براعظم شمالی امریکہ کے وسطی حصے ضرور آباد ہو جائیں گے، مگر ان میں سے اکثر کو،

---

[1] Alleghenies.

جن میں جیفرسن بھی شامل تھا، یہ یقین نہ تھا کہ یہ آبادی اتنی تیزی سے پھیل جائے گی۔ مزید برآں زیادہ سے زیادہ خوش امید اصحاب کے سوا کسی کو خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ خالی خطے آبادی اور نشو و ارتقاء کے بعد ایک سیاسی حکومت کے ماتحت رہ سکیں گے۔ انھیں احساس تھا کہ تقسیم کا عمل جاری ہوگا، جس طرح جنوبی امریکہ کے برِاعظم میں جاری ہوا اور یورپی وضع کی متعدد آزاد قومیں ظہور میں آجائیں گی۔ حد درجہ قنوطی یا مخالف مبصروں کو بھی یقین نہ تھا کہ ساحل اوقیانوس کی جن تیرہ نو آبادیوں نے برطانیہ کے خلاف جنگ کے لیے اتحاد کیا تھا، وہ اپنا اتحاد برقرار رکھ سکیں گی۔ یہاں پیشگوئی کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-

> "جس حد تک امریکہ کی آئندہ عظمت اور ایک ابھرتی ہوئی سلطنت کا تعلق ہے، جو ایک رئیس کے ماتحت جمہوری یا شاہی طرزِ حکومت اختیار کرے تو یہ ایک نہایت مہمل خیالی تصور ہے، جو رومان نگاروں کے دماغ میں بھی شاید ہی آیا ہو۔ امریکیوں کے درمیان ایک دوسرے سے نفرت موجود ہے۔ ان کے مفاد متصادم ہیں، حکومتوں کے درمیان اختلاف، عادات اور اوضاع و اطوار بالکل مختلف ہیں۔ ان حقائق سے آشکارا ہوتا ہے کہ وہ ایک اتحادی مرکز کے ماتحت نہیں رہ سکیں گے اور ان کے مفاد میں کبھی اشتراک پیدا نہ ہوگا۔ وہ کبھی ایک متحدہ ملک پیدا نہ کر سکیں گے خواہ اس کی حکومت کی وضع کوئی رکھی جائے۔ وہ متفرق ہی رہیں گے۔ ایک دوسرے پر شبہات و بے اعتمادی رکھیں گے۔ وہ طبعی حدود، سمندر کی بڑی بڑی خلیجوں، وسیع دریاؤں، جھیلوں اور کوہستانی سلسلوں کی بنا پر چھوٹی چھوٹی دولتوں اور ریاستوں میں بٹتے جائیں گے"[1]

اس کے باوجود سابقہ نو آبادیاں متحد رہیں۔ اگرچہ بعض اوقات اتحاد کے لیے شدید آزمائش کا دور آیا (خصوصاً امریکیوں کی سب سے بڑی جنگ میں)، مگر مرکزی تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ نے لاطینی امریکی ریاستوں کا راستہ اختیار نہ کیا۔ رہی یہ بات کہ اتحاد کیوں قائم رہا تو اس کی توضیح میں کوئی ایک عامل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ریاستہائے متحدہ کے لیے جغرافیہ یقیناً لاطینی امریکیوں کے مقابلے میں زیادہ مہربان ثابت ہوا۔ اپالاشیائی[2] سلسلۂ کوہ اٹھارھویں صدی

---

[1] جیوشیا ٹکر (Josiah Tucker) کا اقتباس جسے جان فسکے Fiske نے اپنی کتاب "امریکی تاریخ کا نازک دور" (The Critical Period of American History ۱۷۸۳ء تا ۱۷۸۹ء) میں نقل کیا ہے، ص ۵۷-۵۸

[2] Appalachians

میں بھی کوئی روک نہ تھا۔ اسی طرح راکیز[1] بھی ویسی روک نہ تھے، جیسا کوہستان اینڈیز[2] تھا۔ ایمیزان[3] کے برعکس وادی مسسیپی[4] کی وجہ سے آبادکاری اور مخابرت کو تقویت پہنچی، مزاحمت پیش نہ آئی۔ پھر ریل کی سڑکیں بن گئیں، تار کا سلسلہ بروقت جاری ہوگیا۔ اس طرح سامان اور افکار کا مبادلہ دور دور سے اور تیز تر طریق پر ہونے لگا۔ یوں امریکی اکٹھے رہے۔ مخابرت اور حمل و نقل کے وسائل کا جو جال ۱۸۶۰ء تک ملک میں بچھ چکا تھا، اس کی وجہ سے شمالی ریاستیں خانہ جنگی کی فیصلہ کن کشمکش میں مغربی ریاستوں سے امداد لے سکیں۔ ۱۸۰۳ء میں نپولین سے مسسیپی اور مسوری کی وادیاں خریدی گئیں۔ ان کے شمول سے نئی جمہوریت اتنی وسیع ہوگئی، جو زمانہ قدیم کی بڑی بڑی سلطنتوں سے مشابہ تھی، مثلاً ایران یا روما کی سلطنت، جن کے اندر مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف نسل کی قومیں سرسری طور پر اکٹھی تھیں، اگرچہ متحدہ قومی سلطنت نہ تھیں۔ دورِ حاضر کی فنکاری کے کارناموں نے وسعت رقبہ کو انتظام کے قابل بنا دیا۔ ۱۸۶۹ء میں پورے براعظم کے اندر ریل کی پٹڑی بچھ گئی تو کیلیفورنیا کے باشندے اس قدر جلد وفاقی مرکز میں پہنچ جاتے تھے کہ ۱۸۰۰ء میں نیویارک کے باشندے وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

مگر ریاستہائے متحدہ کو اکٹھا رکھنے کے سلسلے میں صرف مادی عوامل پر زور دینا کافی نہیں۔ برطانیہ کی مزاحمت نے مختلف ریاستوں میں وطن و قوم کی محبت کا حقیقی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ بلاشبہ نوآبادیوں میں اختلاف تھے۔ نیوانگلینڈ میں پیورٹین اور جنوبی حصوں میں سلحشور آباد تھے۔ وسطی نوآبادیوں میں ولندیزی اور جرمن عناصر بھی موجود تھے۔ ان اختلافات کے باوجود ان سب نے ایک زبان، ایک قانون اور ایک بنیادی ثقافت اختیار کرلی۔ تقریباً تمام آبادیوں میں مغربی کناروں پر سرحدی علاقے موجود تھے۔ جہاں کے زندہ دل لوگ نئے صحرائی علاقوں پر قبضہ کرتے چلے جا رہے تھے۔ یہ سرحدی آبادی بھی اتحاد کی ایک زبردست قوت تھی۔ ان لوگوں کو پرانے نوآبادیاتی (اب ریاستی) مرکزوں کے گروہی شعور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں اپنی بدیہی تقریر پر پورا بھروسا تھا اور وہ نئی فیڈرل حکومت کی برکات و سرپرستی میں مغربی جانب بڑھتے چلے گئے، جہاں ان پر مرکز کا محض برائے نام ضبط و نظم قائم تھا۔

امریکہ نے خانہ جنگی میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ ساتھ ہی ایک عمرانی انقلاب آیا، جو فرانس کے دورِ دہشت و وحشت کے مقابلے میں بہت معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ جب شاہ پسندی کے قائل کینیڈا یا برطانیہ چلے گئے تو امریکیوں کو اپنی قومی زندگی اختیار کر لینے کا یوں موقع مل گیا اور اس میں اجنبی اقلیتوں کی کوئی خاص مزاحمت موجود نہ تھی۔ ۱۷۸۷ء میں فلاڈلفیا کے کنونشن اور آئندہ دو سال کے اندر فیڈرل دستور اختیار کر لینے کی مہم میں ایک مرکزی حکومت قائم

ا؎ Rockies ۲؎ Andes

۳؎ Amazon ۴؎ Mississippi

ہوگئی جس میں تمام حکومتوں کے بنیادی اوصاف موجود تھے۔ یعنی لوگوں پر ٹیکس لگانے کی صلاحیت (ٹیکس کا مقصد روپیہ حاصل کرنا یا متحدہ ریاستوں سے چندہ لینا نہ تھا)، مسلح افواج پر ضبط و نظم اور خارجی تعلقات میں مختاری کا تحفظ۔ نئے دستور سے ایک مقتدر فیڈرل حکومت وجود میں آگئی۔ یہ مقتدر ریاستوں کی محض جمعیت نہ تھی۔ یہ نتیجہ بہ حیثیت مجموعی قدامت پسند گروہوں کی سرگرمی میں حاصل ہوا۔ جو اپنے اقتصادی اور عمرانی حقوق قائم رکھنے کے لیے مضطرب تھے اور انھیں خوف تھا کہ جداگانہ اور نیم خود مختار ریاستوں میں جمہوریت بہت آگے نکل جائے گی۔ امریکی انقلاب کے بعد اس قدامت پسند رجحان کے باعث نومولود فیڈرل سٹیٹ (وفاقی مملکت) کو ابتدائی دور میں محفوظ طریق پر آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ پھر کینیڈا پر برطانوی اقتدار سے خطرہ پیدا ہوا، اس لیے داخلی اختلافات پر پابندی عائد رہی۔ گویا ریاستہائے متحدہ ابتدائی برسوں میں اس لیے متحدہ طریق پر نشو و نما پاتی رہیں کہ انھیں غیر ملکی خطرہ نظر آرہا تھا اور اتحاد ان کے لئے ناگزیر تھا۔

نئی جمہوریت اس وقت عالمی جنگ میں شریک ہوئی (۱۸۱۲ء)، جب یورپ کے اندر نپولین برسرِ اقتدار تھا۔ برطانیہ یا فرانس کسی نے بھی تجارتی آزادی قائم رکھنے کی کوشش نہ کی۔ ریاستہائے متحدہ برابر غیر جانبدار ہونے کی حیثیت میں اس حق پر زور دیتی رہیں۔ ۱۸۱۲ء تک برطانیہ نے سمندروں پر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں برطانیہ حقوق غیر جانبداری کی خلاف ورزی زیادہ کر رہا ہے۔ مزید برآں امریکہ کے جو لوگ توسیع کے خواہاں تھے (اور انھیں جنگی عقاب کہا جاتا تھا) وہ چاہتے تھے کہ برطانیہ سے کینیڈا کو چھین لینے کا بڑا اچھا موقع ہے اور فرانس سے ایسی کوئی قیمتی چیز حاصل نہیں ہو سکتی، چنانچہ انھوں نے کینیڈا پر حملہ کرنے کی کوشش کی، جو ناکام رہی۔ اوّل اس لیے کہ حملہ پوری تیاری سے نہ کیا گیا، دوم اس لیے کہ اہل کینیڈا نے اولوالعزمی سے مزاحمت کی۔ سمندر میں بھی متفرق لڑائیاں ہوئیں اور ریاستہائے متحدہ نے فتوحات حاصل کیں جن سے خشکی پر ناکامیوں کی تلافی ہو گئی اور امریکہ کے قومی فخر میں اضافہ ہو گیا۔ جنگ کوئی فیصلہ کن صورت اختیار نہ کر سکی۔ امریکہ کو نہ کوئی خاص فائدہ ہوا اور نہ کوئی خاص نقصان۔

خانہ جنگی اور تعمیرِ نو

نئی جمہوریت کو سخت آزمائش اس وقت پیش آئی، جب شمالی ریاستوں کے خیال کے مطابق "خانہ جنگی" اور جنوبی ریاستوں کی رائے کے مطابق "ریاستوں کے درمیان جنگ" چھڑی۔ یہ جنگ ۱۸۶۱ء میں شروع ہوئی۔ اس سے پیشتر شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان کشمکش مدت سے چلی آ رہی تھی۔ یہ خانہ جنگی دراصل ایک ناکام قومی انقلاب کی حیثیت رکھتی تھی جس میں جنوبی ریاستوں نے اپنی جداگانہ یونین قائم کرنے کی کوشش کی۔ جنوبی ریاستیں زیادہ تر زرعی تھیں۔ وہاں کا معاشرہ کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں پر مبنی تھا اور وہاں زیادہ تر ایک بڑی فصل ـــ کپاس ـــ بوئی جاتی تھی جسے باہر بھیج دیتے تھے۔ شمالی ریاستوں میں صنعت خاصی ترقی کر چکی تھی اور ان کا معاشرہ آزاد مزدوروں اور آزاد مالکان اراضی پر مشتمل تھا۔

اقتصادی مفاد کے لیے کشمکش میں مقاصد اور طریق زندگی کا اختلاف بھی شامل ہو گیا۔ تمام انسانی معاملات میں ہمیشہ

بھی ہوتا ہے۔ یہ کشمکش نہ اتنی گہری تھی، نہ اس میں مصالحت ناممکن تھی۔ البتہ ۱۸۶۱ء میں جو لوگ برسرپیکار ہوئے انھیں یہ مخالفت گہری بھی معلوم ہوتی تھی اور ناقابل مفاہمت بھی۔ اگر ایسا ہوتا تو جنوبی ریاستیں بھی آئرلینڈ یا پولینڈ کی طرح دوبارہ آزادی کے لیے کوشش کرتیں، لیکن کشمکش کی آگ کو غلامی کے مسئلے نے بطور خاص ہوا دی۔ شمالی ریاستوں میں سے اکثر غلامی کو سراسر منافی اخلاق سمجھتی تھیں اور جنوبی ریاستوں میں سے اکثر کے نزدیک یہ معاملہ ایک فطری نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ دونوں طرفوں کے مبلغوں اور مصنفوں نے بھی اس آگ کو ہوا دی۔ شمالی ریاستوں کے باشندے اپنے آپ کو پیوریٹنوں کے جانشین اور جنوبی ریاستوں کے باشندے سلحشوروں اور جنگجوؤں کے وارث سمجھتے تھے۔ جب جنوبی کیرولینا[۱] اور اس کی ہمسر ریاستوں نے علیحدگی اختیار کر لی تو کشمکش اس درجے پر پہنچ گئی، جہاں کھلی جنگ کے سوا چارہ نہ تھا۔

آج حالات پر نظر بازگشت ڈالی جائے تو شمالی ریاستوں کی کامیابی ناگزیر نظر آتی ہے، خصوصاً اس لیے کہ ۱۸۶۱ء سے وسطی اور بالائی مسسیپی شمال کے ساتھ اقتصادی اور ثقافتی رشتوں میں پوری طرح وابستہ ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں بہ لحاظِ آبادی ـــ کیونکہ جنوبی ریاستیں حبشیوں کو سپاہی بنا کر میدان جنگ میں نہیں لا سکتی تھیں اور ایسی جرأت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ بڑے قابل فوجی افسروں کا ایک گروہ موجود تھا، نیز ان کے حوصلے بلند تھے اور مظلوموں کے حوصلے عموماً بلند ہوتے ہیں۔ پھر شمالی ریاستوں کو اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا، جو ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ ان حالات کے باعث ابتداء میں جنوبی ریاستوں نے کامیابیاں حاصل کیں، جس سے ان کے مقاصد کو بڑی تقویت پہنچی۔ جنوبی ریاستوں نے برطانیہ کی مداخلت پر زور دیا اور شمالی ریاستوں نے ان کی کوششیں ناکام بنا دیں۔ پھر شمالی ریاستوں نے آہستہ آہستہ بحری قوت فراہم کر لی اور جنوبی ریاستوں کی ناکا بندی کر لی گئی لہٰذا وہ ضروری سامان جنگ بھی درآمد کرنے کے قابل نہ رہیں۔ سب سے آخر میں یہ کہ شمالی ریاستوں کے پاس آدمیوں اور ساز و سامان کی فراوانی تھی، اس وجہ سے جنوبی ریاستوں کی فوجیں تھک گئیں۔

خانہ جنگی کے سلسلے میں قابل توجہ امر یہ ہے کہ شمالی ریاستوں نے میدان جنگ میں کامیابی حاصل کی اور جنوبی ریاستوں نے جنگ کے فیصلے کو آخری فیصلہ مان لیا اور جس یونین (اتحاد) میں امریکیوں نے نشو و ارتقاء پایا، وہ پائدار و استوار ثابت ہوا۔ ۱۸۶۵ء کے بعد از سر نو اتحاد کا راستہ سہل نہ تھا۔ جنگ کے بعد ابتدائی برسوں میں تعمیر نو کا دور شروع ہوا تو اکثر لوگ اس تعمیرِ نو کو ناممکن تصور کرتے تھے۔ پھر ۱۸۶۵ء میں دیوانے بوتھ[۲] نے لنکن[۳] کو قتل کر دیا۔ وہ تنہا ایک عظیم القدر اعتدال پسند تھا، جو شمالی انتہا پسندوں کی انتقام گیری میں رکاوٹ پیدا کر سکتا تھا۔ وہ ختم ہو گیا۔ جنوبی ریاستوں پر شمالی ریاستوں کے سیاہی قابض ہو گئے۔ ان پڑھ حبشی غلاموں کو حق رائے دے دیا گیا۔ اہلِ جنوب اہلِ شمال کو "سیاسی طالع آزما" کہتے تھے اور

---

۱ South Carolina

۲ Booth.

۳ Abraham Lincon

اہلِ شمال اہلِ جنوب کو نحیف اور مریل قرار دیتے تھے۔ بہت سے مختلف شمالیت پسندوں کو یقین تھا کہ گمراہ اہلِ جنوب کو آزادی اور مساوات پر لانے کے لیے سختیوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایسا دور شروع کر دیا جو پرانے زمانے کے اہلِ جنوب کو دورِ دہشت معلوم ہوتا تھا۔

تاہم اس ابتدائی دور میں بھی خانہ جنگی ختم نہیں ہوئی تھی، جس طرح عموماً ایسی جنگیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ ہمہ گیر تادیبی کارروائیاں عمل میں آئیں۔ لوگوں کو موت اور جلاوطنی کی سزائیں دی گئیں۔ مگر جنوبی لیڈروں میں بہت کم جلاوطن ہوئے۔ جنوبی ریاستوں کے سیاسی گھروں کو واپس گئے تو ان کے گھر ویران تھے اور ان کے اثاثے ختم ہو چکے تھے، لیکن انھیں پوری معافی مل گئی تھی۔ تدریجاً اہلِ شمال کا جوشِ انتقام ٹھنڈا پڑا۔ بعض اہلِ شمال منتقل ہو کر جنوب میں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ریاستوں کا انتظام سنبھال لیا۔ غلامی لنکن کے ١٨٦٣ء کے اعلان سے منسوخ ہو چکی تھی۔ یہ پھر بحال نہ ہوئی، مگر حبشیوں کا حقِ رائے عملاً چھین لیا گیا۔ گوروں کی برتری بحال ہو گئی اور نئی جنوبی ریاستوں میں نسلی مسئلہ سابقہ شکل پر آ گیا۔

اب جنوبی ریاستوں کا پہلا دور باقی نہیں رہا تھا، بلکہ نیا دور شروع ہوا۔ یہ ایک بنیادی سبب ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ خانہ جنگی کو ختم شدہ مان لیا گیا اور سابقہ دور کے لیے صرف خیالی اور جذباتی یاد باقی رہ گئی۔ رفتہ رفتہ انیسویں صدی کے اواخر میں وہاں صنعتیں قائم ہو گئیں۔ کپاس کی اجارہ داری سے جنوب کو آزادی مل گئی اور اس کے اقتصادیات اور اس کا معاشرہ باقی ملک میں ضم ہو گئے۔ بیسویں صدی میں یہ عمل تیزی سے تکمیل کو پہنچا۔ اس اثنا میں جنوبی ریاستیں نسبتاً پسماندہ رہیں، کیونکہ وہاں افلاس، ناخواندگی اور نسلی مشکلات کے مسائل درپیش تھے۔ مگر وہ کوئی اجنبی سرزمین نہ تھی۔ وہاں کے باشندے کوئی ایسی قوم نہ تھے، جو مظلومیت کی بنا پر بغاوت کی مشتاق ہو۔

تعمیرِ نو کا کام عام خیال کے مطابق ١٨٧٦ء میں ختم ہوا۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے اس حصے پر ضبط و نظم قائم کر لیا، جسے ٹھوس جنوبی حصہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طبعی واقعہ تھا، کیونکہ دورانِ جنگ میں رہنمائی کی باگ ڈور ریپبلکن پارٹی کے حوالے رہی تھی اور اسی پارٹی نے تعمیرِ نو کی کوشش کی تھی۔ اس سے امریکہ کے اندر دو پارٹیوں کے نظام کو تقویت پہنچی۔ کیونکہ جب جنوب میں ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے اتنا بڑا املاک پیدا ہو گیا تو ریپبلکن پارٹی کے لیے دو ہی راستے باقی رہ گئے! اوّل یہ کہ وہ اپنی پارٹی کا اتحاد برقرار رکھے، دوم یہ کہ اتحاد سے محروم ہو جائے۔ شمال میں جو لوگ ڈیموکریٹک تھے، انہوں نے جنوبی بازو سے مفاہمت کر لی۔ یہ حقیقت ہے کہ صدارتِ جمہوریت (جو سیاسی سرگرمی کا سب سے بڑا انعام تھی) صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی، جب انتخابی کالج میں اکثریت حاصل کر لی جاتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ علاقائی مفادات کا توازن پوری احتیاط سے قائم رکھا جائے۔ امریکی سیاسیات میں اقلیت والی پارٹی کے لیے کوئی مقام نہیں۔

برطانیہ کی طرح امریکہ نے مدت سے دو پارٹیوں کا نظام قائم رکھا ہے، مگر اس کی پوری توضیح کے لیے ہمارا بیان کافی نہیں۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ دو پارٹیوں کا نظام دونوں ملکوں میں اتنے عرصے تک برابر قائم رہا، اگرچہ دونوں ملکوں کی سیاسی مشینری میں بہت اختلاف ہے۔ امریکہ کی سیاسی مشینری میں روک تھام نیز ہیئتِ انتظامیہ، ہیئتِ مقننہ اور عدلیہ کے درمیان

توازن قائم رکھا جاتا ہے۔ برطانیہ کی سیاسی مشینری میں مرکزی حیثیت با اقتدار پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ دونوں ملکوں میں سیاسی مفاہمت کی عادت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور دونوں میں بحث مباحثے سے حکومت کرنے کا سلسلہ طویل مدت سے چلا آتا ہے اور یہی ان میں وجہ اشتراک ہے۔

اقتصادی اور عمرانی نشوونما ارتقاء

۱۹۱۵ء میں بھی امریکی اقتصاد مختلف اعتبارات سے نوآبادیاتی تھا، یعنی یہاں غذائی جنسیں اور دوسری خام جنسیں پیدا کی جاتی تھیں۔ انھیں دے کر مصنوعات حاصل کر لی جاتی تھیں۔ مالی اعتبار سے یہ اقتصاد غیر ملکی مالی منڈیوں پر مبنی تھا زیادہ تر لندن پر۔ ۱۹۱۴ء تک ریاستہائے متحدہ اعلیٰ درجے کا صنعتی ملک بن چکی تھی۔ اس کی زرعی پیداوار میں اعلیٰ پیمانے پر مشینیں استعمال ہو رہی تھیں اور اس کے مالی وسائل اتنے وسیع تھے کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد نیویارک نے دنیا کے مرکز مالیات کی حیثیت میں ایک حد تک لندن کی جگہ لے لی۔ یہ تبدیلی ہیئت آدمیوں کی فراوانی کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی تھی اور یقیناً نہیں آئی۔ اس کے علاوہ بہت سے طبعی وسائل تھے، جنھیں چھوا تک نہیں گیا تھا۔ پھر انفرادی منچلے پن اور کاروبار میں خود مختاری کی روح موجود تھی۔ یہ اہل امریکہ میں ان لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوئی، جو مغربی سرحدوں پر بیٹھے تھے اور جن کی ہمت وری کی بدولت بے آباد علاقے آباد ہوئے۔ یورپ نے بھی امریکہ کے اقتصادی نشوونما ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا، کیونکہ لگانے کے لیے سرمایہ مہیا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تارکین وطن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ثروت میں بڑی توسیع فیڈرل حکومت کے متعلق اس نظریے کی وجہ سے ہوئی۔ (جس کی تائید بہت بڑی اکثریت نے کی) کہ اسے کاروبار میں براہ راست دخل نہ دینا چاہیے، صرف نظم عام قائم رکھنا چاہیے، البتہ جو معاہدے ہو جائیں، وہ پورے کرانے چاہییں۔ سکے پر ضبط و نظم میں کوئی کمی نہ آنی چاہیے اور حفاظتی محاصل قائم رکھنے ضروری ہیں۔ علاوہ بریں ریاستوں اور مقامی حکومتوں کو بھی نامناسب حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ یہ نقطۂ نگاہ ان کلاسیکی ماہرین اقتصادیات کا ہے، جو برطانیہ نیز بعض یورپی ملکوں میں ایڈم سمتھ کے پیرو تھے۔ یہی نقطۂ نگاہ تھا جس پر مغرب کے اندر صنعتی انقلاب کے ابتدائی مراحل میں عمل ہوتا رہا۔ یہ انقلاب ریاستہائے متحدہ میں متاخر پہنچا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کاروباری آزادی اور اقتصادی سرگرمیوں میں حکومت کی کم سے کم مداخلت کے اعتقاد پر امریکہ کے اندر زیادہ استواری سے عمل ہوا۔ مغربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بیسویں صدی کی۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس اعتقاد کو دستور کے اندر چودھویں ترمیم سے تقویت پہنچی۔ یہ ترمیم ۱۸۶۶ء میں منظور ہوئی۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ جو حبشی جنوبی ریاستوں میں غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں، ان سے شہری حقوق چھیننے کی کوشش کی جائے تو حکومت ان کی حفاظت کرے۔ ترمیم میں یہ مشہور الفاظ شامل تھے کہ "کوئی ریاست کسی شخص کو زندگی، آزادی یا ملکیت کے حق سے واجب کارروائی کے بغیر محروم نہیں کر سکتی"۔ خانہ جنگی کے بعد آزاد کاروبار کا دور شروع ہوا، اس میں ریاستہائے

متحدہ کے سپریم کورٹ نے اس مشہور دفعہ کی تعبیر یہ کی کہ کسی ریاستی حکومت کو حق حاصل نہیں کہ کاروباری آدمیوں — جن میں افراد کی جمعیتیں بھی شامل ہیں — کو اجرتوں، قیمتوں، مزدوری کے احوال وغیرہ کی تنظیم کر کے جائدادوں سے محروم کرے۔

سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد مشرقی اور جنوبی یورپ سے لاکھوں اجنبی مرد و زن ترکِ وطن کر کے امریکہ پہنچ گئے۔ وہ امریکی طور طریقوں سے بالکل نا آشنا تھے۔ چنانچہ اخلاق باختہ لوگوں اور رسمی کارخانہ داروں نے ان سے بُری طرح فائدہ اٹھایا۔ یہ لوگ یونینوں کی شکل میں منظم نہیں ہو سکتے تھے۔ نیز وہ خود اور ان کے بچے اصل وطن سے نکالے اور دھکیلے گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً یہ امریکی عقیدہ اختیار کر لیا کہ کوئی آدمی فطرت کی رو سے پرولتاری نہیں۔ لہٰذا الطمع کاری کے اس دور "یا قزاق امیروں کے دور" میں بھی فلاحی مملکت کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بہ ظاہر اسی دور میں عدم مداخلت کا اصول عام طور پر مانا گیا تھا۔ (بہ استثناء محاصل تحفظ) اور جو کاروباری آدمی انیسویں صدی کے امریکہ سے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں کاروبار حکومت کی مداخلت سے بالکل محفوظ تھا، وہ ایک افسانہ ایجاد کر رہے ہیں۔

جن اسباب نے برطانیہ میں کارخانوں کے قوانین بنوائے، وہی اسباب رفتہ رفتہ ریاستہائے متحدہ میں ایسے قوانین لائے، جن کی بنا پر اقل اجرت مقرر کر لی گئی۔ بچوں اور عورتوں سے کام لینے کے اوقات معین ہو گئے۔ حفظانِ صحت کے قواعد جاری ہو گئے۔ مزدوری کے اوقات کا تعین کر دیا گیا۔ مزدوروں کے لیے معاوضے کا انتظام ہو گیا۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ چودھویں ترمیم کے باوجود یہ تمام قوانین قومی سطح پر نہیں، بلکہ حکومت کی سطح پر منظور ہوئے اور مختلف ریاستوں میں یہ مختلف تھے۔ وسکونسن[1] کی ریاست نے سب سے پہلے اعلیٰ پیمانے کے عمرانی قوانین میں شہرت حاصل کی۔ پرانی شمالی و مشرقی ریاستوں میں سے اکثر نے اس تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک رائے عامہ ایسی ہو چکی تھی کہ قومی حکومت کو اقتصادی زندگی کے ضوابط میں نمایاں حصہ لینا چاہیئے۔

تھیوڈور روزویلٹ[2] سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک صدر رہا۔ اس نے مزدوروں سے حق و انصاف کا وعدہ کیا اور بڑے بڑے ٹرسٹوں یا جمعیتوں پر شدید حملے شروع کیے، جو امریکی اقتصادیات کے بڑے حصے کے اجارہ دار بن چکے تھے، اگرچہ تھیوڈور روزویلٹ اپنے وعدے ہمیشہ پورے نہ کر سکا۔ اس کے عہد میں حکومت میں تمباکو اور ریلوے کے ٹرسٹوں پر حملے ہوئے اور بڑی بڑی کمپنیوں کو وفاقی حکومت کے زیر نگرانی لے آیا۔ ووڈرو ولسن[3] کے پہلے دور (سنہ ۱۹۱۳ء — سنہ ۱۹۱۷ء) میں تحریک زور پکڑ گئی۔ زیادہ انضباطی قوانین منظور ہوئے، خصوصاً ۱۹۱۳ء کا فیڈرل ریزرو ایکٹ[4]

ا۔ Wisconsin ۲۔ Theodore Roosevelt

۳۔ Woodrow Wilson ۴۔ Federal Reserve Act

جس کی رو سے وفاقی حکومت کے کارکنوں کو بینکوں، قرضہ اور کرنسی پر زیادہ اقتدار حاصل ہوا۔ لیکن ان قوانین کی منظوری پر سب متفق نہ تھے، کیونکہ اہل امریکہ ماوراء الطبیعات سے عام کھیلوں تک ہر چیز میں مختلف الرائے ہیں اور اختلاف کا اظہار وسیع پیمانے پر زور شور سے کرتے ہیں۔ خانہ جنگی کے سوا عموماً یہی ہوتا ہے کہ ان کا اختلاف صرف زبانی اظہارِ رائے تک محدود رہتا ہے۔ وہ عقیدے اور عمل کے اختلاف کو قبول کر لیتے ہیں۔ جہاں ایسا کرنا غیر ضرر رساں ہو، وہ قانون سے اتفاق کرتے ہیں اور شاذ ہی تشدد پر اترتے ہیں۔ بیرونی لوگوں اور بہت سے مقامی نکتہ چینوں کے نزدیک بھی خانہ جنگی اور ۱۹۱۷ء کے درمیان کی امریکی زندگی ایک بڑا ہنگامہ معلوم ہوتی تھی؛ یعنی دولت اور اقتدار کے لیے ڈارون کی جدوجہد سے بھی کچھ زیادہ جدوجہد، لیکن بہ ظاہر اس غیر منظم معاشرے میں غیر معمولی مادی ترقیات بروے کار آئیں۔ پل، بند، ریل کی سڑکیں، بڑے بڑے شہر وجود میں آگئے، جس میں لاکھوں مرد و زن کا تعاون درکار تھا، جو ایک مشترکہ کام کے لیے منظم ہوں۔ ریاستہائے متحدہ میں کرخت انفرادیت اور عمرانی ہم آہنگی کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے کا یہ تضاد اب بھی امریکی منظر کے بہت سے نقادوں کو پریشان رکھتا ہے۔

حکومت پر بے اعتمادی کا معاملہ مغربی دنیا میں عام ہے۔ غالباً انسانی روایت یہی ہے۔ بہ ایں ہمہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت نے سب کی زندگیوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ اگرچہ یہ دعویٰ مقامی اور ریاستی حکومتوں کے سلسلے میں بھی درست ہے، مگر وفاقی حکومت نے اس سلسلے میں زیادہ کام کیا۔ رفتہ رفتہ وفاقی حکومت کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ریاستی حکومتوں کی طرف سے بطور خود کوئی کام شروع کرنے کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔ یہ چیز ۱۷۸۹ء سے ۱۹۱۷ء تک اتنی ہی نمایاں ہے، جتنی آبادی اور ثروت میں ریاستہائے متحدہ کی مادی ترقی۔

انقطاع کا افسانہ

اسی طرح ریاستہائے متحدہ کا ایک بین الاقوامی بڑی قوت کی حیثیت سے ظہور بالکل نمایاں ہے، اگرچہ خود امریکیوں کے درمیان یہ امر اب تک لامتناہی بحث کا موضوع ہے۔ ریاستہائے متحدہ نے عملاً انقطاع کبھی اختیار نہ کیا۔ ابتدا سے ہی اس کی حکومت کا ایک محکمہ تھا، جس میں وزیروں، قونصلوں اور سفیروں کے انتظامات موجود تھے۔ نپولین کے دور میں امریکہ نے عالمی جنگ کی شرکت قبول کی۔ ۱۸۲۰ء کے بعد اصولِ منرو کی بنا پر اس نے یہ محکم موقف اختیار کیا کہ یورپی طاقتوں کو اپنے محدود علاقوں کا دائرہ نصف کرۂ مغربی میں پھیلانا نہیں چاہیے۔ یہ امریکی دعاوی کی نفی نہیں، بلکہ ان کی سرگرم توسیع کا ثبوت تھا، جس کا دائرۂ اثر خود ریاستہائے متحدہ سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اگرچہ امریکیوں نے یورپ کی پُر پیچ سیاسیات توازنِ قوی میں کوئی حصہ نہ لیا، تاہم وہ مشرق بعید میں توازنِ قوی کے متعلق زیادہ توجہ کا اظہار کرتے رہے، جہاں طویل مدت سے ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیہ سے ایک مختصر جنگ ہوئی۔ جس کا تعلق کیوبا سے تھا اور کیوبا سے ریاستہائے متحدہ کو ہمیشہ گہرا تعلق رہا۔ اس کے بعد امریکیوں کو جزائر فلپین، ہوائی، پورٹوریکو[1] کا الحاق کرنا پڑا۔

---

[1] Puerto Rico

گویا امریکہ نے ایک سلطنت پیدا کر لی۔

تھیوڈور روزویلٹ زبردست سامراجی تھا۔ اس نے نہر پانامہ تعمیر کرائی اور ریاستہائے متحدہ کے جو مفاد مشرق بعید میں تھے، انھیں آگے بڑھایا، نیز وہ زیادہ بڑے بڑے بیڑے کا خواہاں تھا۔ نئی بحری سرگرمیوں نے، جن کے داعی برطانیہ اور جرمنی میں بھی موجود تھے، اپنے بہت سے اصول ایک امریکی افسر کپتان الفریڈ[1] ٹی ماہن سے حاصل کیے۔ ماہن کی کتاب "تاریخ پر فطری قوت کا اثر"[2] (سنہ ۱۸۹۰ء) اور اس کی بعض تصانیف نے بحریات کو قوت و اقتدار کے معیار میں ایک نمایاں حیثیت دے دی۔

مزید برآں اس مدت میں دولت اور تجارت ترقی پاتی رہیں اور ریاستہائے متحدہ نے بین الاقوامی تجارتی تعلقات میں پورا حصہ لیا۔ ان تعلقات میں وفاقی حکومت تجارتی حقوق کی حامی رہی، اگرچہ کہیں جنگ ہو رہی تھی؛ اس نے غیر جانبداروں کے حقوق کی حفاظت کی۔ ۱۹۱۴-۱۸ء کی عالمی جنگ میں یہی معاملہ ریاستہائے متحدہ کو الجھانے کا موجب بنا اور یہی معاملہ سنہ ۱۷۹۲ء اور سنہ ۱۸۱۵ء کی عالمی جنگ میں شرکت کا سبب بنا تھا لیکن سنہ ۱۹۱۷ء میں امریکہ دنیا کے مملکتی نظام میں بہت بڑا اور سرگرم حصہ دار تھا۔ سنہ ۱۸۱۲ء میں اس کی حیثیت یہ نہ تھی۔

---

[1] Mahan.

[2] The Influence of Sea Power upon History

وسطی اور مشرقی یورپ

(پہلی عالمی جنگ کے آغاز تک)

تینتیسواں باب

جرمنی

(۱)

سنہ ۱۸۵۰ء - سنہ ۱۹۱۴ء

تمہید

ان ابواب میں ہم جرمنی (سنہ ۱۸۵۰ء - سنہ ۱۹۱۴ء) ہیپسبرگ شہنشاہی (سنہ ۱۸۵۰ء - سنہ ۱۹۱۴ء) اور روس (سنہ ۱۸۲۵ء - سنہ ۱۹۱۴ء) کے حالات بیان کریں گے۔ یہ تینوں سلطنتیں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں پولینڈ کی تقسیمات کے لیے شریک جرم تھیں اور میٹرنخ نے سنہ ۱۸۱۵ء میں یورپ کے اندر توازن کے لیے جو نظام بنایا تھا اس پر پختگی سے قائم اور باہم متحد تھیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ سب شریک جنگ ہوئیں۔ جرمنی اور آسٹریا، روس کے خلاف حلیف تھے۔ داخلی اعتبار سے ان میں بہت کچھ مشترک تھا، اگرچہ ان سب کے راستے الگ تھے۔ مغربی یورپ کے ممالک کے برعکس ان سرزمینوں میں مطلق العنان بادشاہیاں قائم تھیں اور پارلیمنٹیں نسبتاً متاخر وجود میں آئیں اور نسبتاً ان کے اختیارات کم تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ تینوں "سلطنتیں" تھیں۔ یورپ کے اندر سلطنت کے لفظ کے لیے صرف متزلزل دولت عثمانیہ مدعی تھی۔ یہ لفظ ایسے دعاوی کا نشان بن گیا تھا جنھیں بجا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

جرمنی

سنہ ۱۹۱۴ء میں عسکریت پسند اور قوم پرور جرمن سلطنت بڑی طاقتور، متحد اور صنعت کار مملکت تھی، جس کی آبادی اعلی التعلیم پاچکی تھی اور قابل و فرمانبردار تھی۔ جرمنی نے بلقانی معاملات میں اپنے حلیف آسٹریا ہنگری کے مسلک کی حمایت کی۔ اس طرح پوری دنیا کو بیسویں صدی کی پہلی جنگ میں ڈھکیلا، جس میں اندھا دھند قتل و خونریزی ہوئی۔ جرمنی صرف سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد بر اعظم کی ایک بڑی طاقت بن کر ابھرا۔ اس سے پیشتر چودہ سو سال تک لاکھوں جرمن قلب یورپ میں گوناگوں سیاسی نظاموں کے ماتحت زندگی بسر کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے جرمنی کی عسکریت، مطلق العنانی اور پورے عمرانی و ثقافتی آہنگ سے یہ واضح ہوتا تھا کہ سلطنت پروشیا نے جرمنی کا اتحاد ممکن بنایا۔ مخصوص پروشیائی اوضاع دوسرے جرمنی طور طریقوں پر غالب آگئے تھے اور غیر پروشیائی آبادی پر انھیں مسلط کر دیا گیا تھا۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں پروشیا کی کامیابی کمال پر پہنچ گئی۔ پروشیا، بسمارک اور بڑے مالکان اراضی سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۷۱ء کے درمیان، خصوصاً سنہ ۱۸۶۲ء

کے بعد پروشیا کو انتہائی تیزی سے پے درپے کامیابیاں ہوئیں۔ جن لوگوں کو پروشیا کی روش کے متعلق شبہات تھے اور جو احتجاج کرتے تھے، انھیں ہرنئے کارنامے کی درخشانی سے خاموش یا متحیر کر دیا گیا۔ اخلاقی اعتراضات کو منافی حبِ وطن سمجھا گیا۔ بسمارک پالیسی کا واضع اور رہنما تھا۔ اس نے معاملات کی قانونی حیثیت اور شائستگی وسلیقہ مندی کو انسانیت پرور بکواس قرار دیا اور ایک ایسے دور کا اعلان کر دیا، جس میں سب کچھ فولاد اور خون ہی کی بنا پر طے ہوسکتا تھا۔ مقاصد کی تکمیل اس درجہ خوشگوار معلوم ہوئی اور یہ اتنی تیزی سے پایۂ تکمیل پہنچے، کہ بڑے بڑے معلمین اخلاق بھی اپنے آپ کو سمجھا لیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ اس سلسلے میں وسائل کی چھان بین غیر ضروری ہے۔ وہ حکومت کے لیے نئی مالی امداد منظور کر لیتے تھے، اگرچہ ان کے دل زیرِ غور معاملے پر مطمئن نہ تھے۔

سامراج جرمنی کی تخلیق سب سے بڑھ کر آٹو فان[ل] بسمارک کا کام تھی (۱۸۱۵ء۔ ۱۸۹۸ء)۔ وہ بڑا دور اندیش، اخلاقی ضوابط سے بے پروا اور بے پناہ شخص تھا۔ چالوں میں اس نے کمال حاصل کر لیا اور حقیقی عزائم کو انتہائی خوش اسلوبی سے چھپائے رکھتا تھا۔ وہ اکثر پالیسی میں حیرت انگیز حد تک متناقص تھا۔ بعض اوقات وہ بہ ظاہر ایک ہی وقت میں متناقص طرزِ عمل اختیار کر لیتا اور بالکل آخری وقت میں یہ فیصلہ کرتا کہ اسے کس مسلک پر چلنا چاہیے۔ وہ طویل مدت تک برسرِاقتدار رہا۔ اس اثنا میں تاج پروشیا کے لیے اس کی انتہائی رواداری میں ذرا فرق نہ آیا۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں ولیم دوم نے اسے برطرف کیا۔ اس کا احساس یہ تھا کہ میرا کام ادھورا رہ گیا۔ وہ اکثر شہنشاہ اور نظامِ حکومت میں اپنے جانشینوں کے لیے اضطراب پریشانی کا موجب بنتا رہا۔ وہ نکتہ چینی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لبرلوں، کیتھولکوں اور اشتراکیوں سے اسے مختلف ادوار میں نفرت رہی اور جو لوگ ذہنی اعتبار سے فروتر تھے، انھیں ہمیشہ حقیر سمجھتا رہا، اگرچہ ان کا تعلق خود اسی کے طبقے سے تھا، یعنی پروشیا کے بڑے بڑے مالکانِ اراضی جنھیں یونکر کہا جاتا تھا۔

یونکروں نے جماعت کی حیثیت سے کبھی معقول روش کا وہ طریقہ اختیار نہ کیا جو انگلستان میں وھگ اور ٹوری اختیار کر چکے تھے۔ انھیں اپنے حقوق پر پورا اعتماد تھا۔ اپنی جاگیروں میں کسانوں پر حکومت کرتے تھے۔ پروشیا کی فوج کے بڑے عہدے ان کے لیے وقف تھے اور پروشیائی مملکت کے نظم ونسق میں انھیں کو سب سے بڑھ کر اقتدار حاصل تھا۔ ان کی طرف سے بادشاہی کی طرف سے اور اپنے عہدے کے پیشِ نظر بسمارک سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ فوری مقاصد کے لیے عارضی طور پر تباہی کے غار میں گرا دینے کے لیے کوشاں ہو جاتا۔ وقتی طور پر اس کی پالیسی کچھ ہوتی، لیکن اس کی تہہ میں قوت کارفرما رہتی۔ وہ ۱۸۶۲ء سے پیشتر بھی خاصا ذی اثر بن چکا تھا۔ سنہ ۱۸۶۲ء سے سنہ ۱۸۷۱ء تک وہ پروشیا میں، اس کے بعد سنہ ۱۸۹۰ء تک سلطنت جرمنی میں سب سے بلند مرتبہ شخص تھا، لیکن اگر جرمن قوم اس کی حمایت میں نہ ہوتی تو اس کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکتیں۔ اور جرمن اتحاد کے لیے بہت پہلے سے کوشاں چلے آتے تھے۔

ل Otto Von Bismarck

پروشیا اور جرمن وفاق
۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۹ء

۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد وسطی یورپ کے مدبروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جرمن وفاق پر پروشیا یا آسٹریا کو اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں سوال کی صورت یہ تھی کہ وفاق کون سی شکل اختیار کرے گا۔ وفاق کی تخلیق وی آنا کی کانگرس میں ہوئی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں جو حالات پیش آئے، ان کی وجہ سے یہ عارضی طور پر تنزل ہوا اور اس میں شگاف پڑ گئے۔ اب اسے نئے سرے سے تعمیر کرنے کی ضرورت تھی۔ جرمنی کلاں کا رجحان یہ تھا کہ آسٹریا کے ساتھ وفاق کیا جائے۔ جرمنی کوچک، آسٹریا ہی سے نہیں بلکہ جنوبی جرمنی سے بھی علیحدگی کا حامی تھا۔ آخری پروگرام کا مطلب یہ تھا کہ پروشیا ان جرمن ریاستوں پر مسلط ہو جائے، جو براہِ راست آسٹریا کے مانع نہ تھیں۔ یہی پروگرام بسمارک کا نصب العین بن گیا۔

۱۸۴۸ء کے بعد جو دور شروع ہوا، اس کے اوائل ہی میں حل کے لیے پروشیا کو شکست ہوئی۔ مجلس فرینکفرٹ نے شہنشاہی تاج فریڈرک ولیم چہارم کے روبرو پیش کیا تھا، مگر اس نے جواب دیا کہ میں بازاری آدمیوں سے تاج قبول نہیں کر سکتا تاہم اسے امید تھی کہ یہ سن کر جرمن شہزادے اور حکمران اسے شہنشاہ بنا لیں گے۔ آسٹریا ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد اس کے متعلقات میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر فریڈرک چہارم نے ارفرٹ[۱] میں جرمن شہزادوں کی ایک یونین قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ سب کے فوجی وسائل یکجا ہو جائیں۔ یہ یونین اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ پروشیا کو تمام جرمن شہزادوں میں سیاسی اور فوجی قیادت حاصل ہو جائے۔

آسٹریا نے کوشش کر کے روس کی طرف سے پروشیا پر دباؤ ڈلوایا۔ زار ہر حال میں جرمن اتحاد کا مخالف تھا، خواہ وہ کسی کے ماتحت ہوتا۔ چنانچہ نومبر ۱۸۵۰ء میں پروشیا نے بمقام المٹز[۲] ایلفرڈ کی یونین سے دست برداری اختیار کر لی اور بادلِ ناخواستہ پہلے وفاق کے احیاء پر راضی ہو گیا۔ اس واقعے کو المٹز کی تذلیل کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ اہل پروشیا اسے کتنا تلخ سمجھتے تھے، تاہم خود بسمارک نے اصل معاہدے کا دفاع کیا اور وہ خود پروشیا کی طرف سے نمائندہ بن کر وفاق کی پارلیمنٹ میں شامل ہُوا۔

اگرچہ بسمارک نے ایک تقریر میں معاہدہ المٹز کی حمایت کی تاہم آسٹریا کے خلاف پارلیمنٹ میں برابر کام جاری تھا۔ مدعا یہ تھا کہ آسٹریا کا کوئی بھی ارادہ پورا نہ ہو سکے۔ اس پالیسی کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس نے پروشیا کو جنگ کریمیا (۱۸۵۴ء سے ۱۸۵۶ء) میں غیر جانبدار رکھا، جس میں انگلستان و فرانس ترکی کے ساتھ ہو کر روس کے خلاف لڑتے تھے اور آسٹریا نے روسیوں کو امداد دینے کی بجائے انھیں ہراس زدہ کیا تھا۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ آسٹریا کی روش روس کے لیے ناراضگی کا باعث ہو رہی ہے اور روس کی دوستی اس وقت پروشیا کے لیے بہت مفید ثابت ہو گی، جب آسٹریا اور پروشیا کے درمیان جنگ چھڑے گی تو بسمارک نے زیادہ لبرل پروشیائیوں کو مایوس کر دیا۔ اسے امید تھی کہ پروشیا روس کے خلاف جنگ میں شامل ہو گا اور اس طرح مغربی طاقتوں کے پہلو بہ پہلو صف آرا ہو جائے گا۔ بسمارک کو

---

[۱] Erfurt

[۲] Olmutz

یقین تھا کہ آسٹریا کو شکست ہوگی اور اسے جرمنی سے باہر نکال دیا جائے گا۔ اس کا احساس یہ تھا کہ جرمنی اتنا بڑا نہیں، جس میں دو طاقتیں سما سکیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے نپولین سوم شہنشاہ فرانس سے بھی لگاؤ کا بندوبست کیا، حالانکہ بہت سے پروشیائی ایک بوناپارٹ سے روابط قائم کرنے پر سخت مضطرب تھے، جسے وہ انقلاب فرانس کا جانشین سمجھتے تھے۔ فریڈرک ولیم چہارم کی دماغی حالت بگڑ گئی اور اس کا چھوٹا بھائی نائب السلطنت بن گیا۔ ۱۸۵۹ء کے اوائل میں بسمارک کو پارلیمنٹ واپس بلا کر بطور سفیر روس بھیج دیا گیا۔ وہ آٹھ سال تک پروشیائی نمائندے کی حیثیت سے فرینکفرٹ رہا تھا۔ اسی دور میں اس کے غیر معمولی جوہر آشکار ہوئے۔ اعلیٰ درجے کی دور اندیشی، اپنے مقاصد پر استقامت اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں ہنرمندی۔ انھی جوہروں کی بدولت آسٹریا جرمنوں کی قیادت حاصل نہ کر سکا۔

یہی اسی موقع پر یعنی صدی کے چھٹے عشرے میں پروشیا کے آئندہ نشو و ارتقا کی دستوری اور اقتصادی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۵۰ء کا پروشیائی دستور پہلی عالمی جنگ کے اختتام تک قائم رہا۔ اس میں دو ایوان تجویز کیے گئے تھے، ایک بالائی ایوان، جس میں امرا اور بادشاہ کے نامزد اصحاب شامل تھے، دوسرا ایوان زیریں، جس کے ممبر چنے جاتے تھے، لیکن ایوان زیریں کے انتخاب کا طریقہ ایسا رکھا گیا جس کے مطابق رائے عامہ کو کامیاب بنانا بالکل ناممکن ہوگیا۔ تمام رائے دہندوں کو محاصل کی مقدار کے مطابق تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اگرچہ امیر لوگ کم تھے جو زیادہ ٹیکس ادا کرتے تھے اور غریب لوگ بہت زیادہ تھے جن کے ٹیکسوں کی مقدار معمولی تھی، تاہم امیروں اور غریبوں کے نمائندوں کی تعداد یکساں تھی۔ چار فی صد نمائندے بہت زیادہ ٹیکس دیتے تھے، انھیں ایک تہائی نمائندوں کے انتخاب کا حق تھا۔ چودہ فی صد رائے دہندوں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا، وہ متوسط درجے کے ٹیکس دیتے تھے۔ انھیں ایک تہائی نمائندے چننے کا حق تھا۔ باقی بیاسی فی صد رائے دہندے معمولی ٹیکس دیتے تھے۔ وہ بھی ایک تہائی نمائندے منتخب کرتے تھے۔

علاوہ بریں ایوان زیریں کو بجٹ کی منظوری کے سوا چنداں اختیار نہ تھا۔ پالیسی کے تمام معاملات ایوان بالا میں طے ہوتے، بلکہ خود بادشاہ اور اس کے سیاسی و فوجی مشیروں کا حلقہ سب کچھ فیصلہ کر لیتا۔ بادشاہ وزیر مقرر کرتا۔ جس قانون کو وہ پسند نہ کرتا، ویٹو کر دیتا۔ ایک خاص رقم اپنی صوابدید کے مطابق صرف کرنے کے لیے اس کے حوالے کر دی جاتی۔ ایک اس کی خاص فوجی کابینہ تھی، جس کا تعلق عسکری معاملات سے تھا۔ اس کے نہ فیصلے وزیروں کے پاس جاتے نہ قانون ساز مجلسوں کے پاس، گویا عملاً بادشاہ اور یونکر پروشیا کے تمام انتظامی معاملات چلا رہے تھے۔

پروشیا کو مغربی جرمنی میں بھی بعض مقبوضات حاصل تھے، جن میں روہر؎ شامل تھا۔ یہاں کوئلے کے ایسے ذخیرے تھے، جن کا مقابلہ یورپ کا کوئی خطہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب پروشیا نے لوہے اور فولاد کی صنعت پر خاص توجہ کی، جس کے بغیر اس کی آئندہ فوجی اور سیاسی کامیابیاں ناممکن ہو جائیں۔ پورے براعظم یورپ میں صرف پروشیا تھا جس نے ریلوں کے

؎ Ruhr


جرمنی کا اتحاد ۱۸۶۶ء - ۱۸۷۱ء
پروشیا نے الحاق کر لیا ۱۸۶۶ء
روس ۱۸۶۶ء سے پہلے
دیگر ریاستیں جو شمالی جرمن بالا وفاق کی تشکیل کے لیے پروشیا سے مل گئیں
شمالی جرمن بالا وفاق کی حد، ۱۸۶۶ء
جو ریاستیں جرمن سلطنت بنانے کے لیے بالا وفاق میں شامل ہو گئیں۔
صلحنامہ فرینکفرٹ کے ذریعے الحاق کیے ہوئے علاقے
جرمن سلطنت ۱۸۷۱ء کی حد
مقامات جنگ
میل
بحیرۂ شمالی
بحیرۂ بالٹک
ہیلگولینڈ
ڈنمارک
سویڈن
کونگزبرگ
ڈینزگ
پومیرینا
ہولسٹین
میکلین برگ
ہیمبرگ
بریمن
ہنوور
برنزوک
سٹیٹن
برینڈنبرگ
برلن
پوزین
دریائے وسچولا
روس
ویسٹ فالیا
منسٹر
والڈیک
کولون
بلجیم
کیسل
سیکسنی
ڈریسڈن
برسلاؤ
سائیلیشیا
ساڈووا
پراگ
نساؤ
کوبلنز
فرینکفرٹ
امارت بویریا
نورمبرگ
لورین
سٹراسبورگ
فرانس
ورٹمبرگ
سٹٹ گارٹ
ہوہین زولرن
میونخ
سوئٹزرلینڈ
دریائے رائن
دریائے ڈینیوب
دریائے اوڈر

نئے نظام کی منصوبہ بندی فوج کے جنرل سٹاف کے حوالے کی۔ جنرل سٹاف نے تمام ریلیں اس نقطۂ نگاہ سے بنائیں کہ جب ضرورت پیش آئے فوجیں تیزی سے نقل و حرکت کرتی ہوئی جلد سے جلد مناسب مقامات پر پہنچائی جا سکیں۔ چنانچہ نئی ریلوں نے پروشیا کو اکٹھا کر دیا۔ ۱۸۵۹ء میں اٹلی کی آزادی کے لیے نپولین سوم نے آسٹریا سے جنگ کی تو حکومت پروشیا نے بھی فوجوں کو نقل و حرکت کا حکم دے دیا۔ بسمارک کو امید تھی کہ پروشیا کے لیے فرانس کی امداد ضروری ہو گی۔ جو لوگ پرانے خیالات کے تھے وہ سمجھتے تھے کہ پروشیا آسٹریا کو مدد دے گا۔ پروشیا نے حقیقتاً کسی کا بھی ساتھ نہ دیا، تاہم نئی ریلوں کی آزمائش ہو گئی۔ فوجی جنرل سٹاف نے عملی سبق سیکھ لیے، جن سے سات سال بعد پورا فائدہ اٹھایا۔

بسمارک کا اقتدار

یہ فوجی سبق بسمارک کو پروشیا کے معاملات میں سب پر برتری دینے کا موجب بنے۔ نائب السلطنت ولیم ۱۸۶۱ء میں شاہ ولیم اوّل بنا۔ وہ عملاً فوجی آدمی تھا۔ اس کا وزیر جنگ فان رُون[1] بسمارک کا دوست تھا۔ اس نے بادشاہ کو بہ آسانی راضی کر لیا کہ فوج کی از سرِ نو تنظیم ضروری ہے۔ فان رون کی خواہش یہ تھی کہ جبری خدمت دینے والوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ چنانچہ وہ ہر سال چالیس ہزار سے تریسٹھ ہزار تک نئے رنگروٹ بلا لیتا اور ان کی مدت خدمت اس نے دو سال کے بجائے تین سال کر دی۔ فان رُون کے فوجی منصوبے کی تہ میں سیاسی مقصد کارفرما تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوج کو جس حد تک ممکن ہو، آزاد خیالی سے دُور رکھے اور اس کی تعداد زیادہ سے زیادہ بڑھائے تاکہ اس کے ذریعے سے مملکت میں آزاد خیالی یا انقلابی رجحانات کی روک تھام کر سکے۔ ۱۸۶۱ء و ۱۸۶۲ء میں ان مقاصد کے متعلق طویل سیاسی بحران پیدا ہوا، کیونکہ پروشیائی پارلیمنٹ نے بجٹ کی منظوری سے انکار کر دیا۔ جب بحران کمال پر پہنچ گیا تو فان رون نے بسمارک کو برلین واپس بلا لیا اور بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ ایسا شخص ہے جو پارلیمنٹ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے بسمارک کو پروشیا کا وزیر اعظم اور وزیر خارجہ مقرر کر دیا۔

بسمارک نے ایک مغالطہ آمیز اصول کی بنا پر کہا کہ دستور میں ایک خلا ہے جس کی بنا پر حکومت کو حق حاصل ہے کہ محاصل وصول کر سکے، اگرچہ پارلیمنٹ نے بجٹ منظور نہ کیا ہو۔ چنانچہ وہ ناجائز طریق پر محاصل لیتا اور خرچ کرتا رہا۔ بار بار اس نے پارلیمنٹیں توڑیں۔ نئے سرے سے انتخاب کراتا۔ جب ایوان میں مخالفت سے سابقہ پڑتا تو پھر پارلیمنٹ کو توڑ دیتا۔ خود اس نے کہا۔ "اگر کسی معاملے پر سمجھوتہ نہ ہو سکے اور جھگڑا پیدا ہو تو جھگڑا قوت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ جس کے پاس قوت ہو گی وہ اپنی رائے کے مطابق عمل کرے گا۔"[2] بسمارک کے پاس قوت تھی۔ اس نے تمام مخالف اخبار اس دستوری دفعہ کے باوجود بند کر دیئے کہ اخباروں کو آزاد رہنا چاہیے۔ دستور میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سند وین پر کسی ایسی بات کے لیے باقاعدہ الزام

---

[1] Von Roon

[2] Bismarck and the German Empire (بسمارک اور جرمن سلطنت) ص ۶۱

نہیں لگایا جا سکتا، جو ایوان کے اندر کہی جائے۔ بہ ایں ہمہ بسمارک نے مخالف پارٹی کے ایک مندوب پر باقاعدہ الزام لگایا، حالانکہ وہ جج تھا اور وفادار پروشیائی مانا جاتا تھا۔ چار سال تک (۱۸۶۲ء — ۱۸۶۶ء) اس نے یہ غیر آئینی روش جاری رکھی، پھر سب کچھ اپنی خواہش کے مطابق پورا کر لیا۔ کیونکہ خارجہ پالیسی میں اس نے درخشاں کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔

بسمارک چاہتا تھا کہ جرمن وفاق کو (وہ جیسا بھی اس وقت تھا) ختم کر دے، لہٰذا آسٹریا نے وفاق کی اصلاح کے لیے جتنی کوششیں کیں، بسمارک ان کا مخالف رہا۔ آسٹریا چاہتا تھا کہ وفاق کی ایک پارلیمنٹ بن جائے جس میں تمام مملکتوں کے چنے ہوئے نمائندے شریک ہوں۔ مختلف حکومتوں کے والی ان کے علاوہ نمائندے نامزد کر دیں اور چھ بادشاہوں کی ایک نظامت ہو۔ آسٹریا نے اس تجویز پر بحث کے لیے حکمرانوں کی ایک مجلس بلائی۔ بسمارک نے ولیم اول کو اس میں شرکت سے روک دیا۔ اس طرح یہ مجلس بے نتیجہ رہی (۱۸۶۳ء)۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے آسٹریا کو جرمنی کی کسٹم یونین (اتحادِ گمرک) سے باہر رکھا، کیونکہ وہ نپولین سوم سے تعلقات خوشگوار رکھنا چاہتا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے فرانس سے تجارتی معاہدہ کر لینے کی حمایت کی۔ اگرچہ گمرکی اتحاد میں شریک ہونے کے باعث پروشیا کو ایسے معاہدے کا آئینی اختیار حاصل نہیں رہا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں پولینڈ کے اندر بغاوت ہوئی تو بسمارک نے اس بغاوت کے دوران میں روس سے خوشگوار تعلقات استوار کر لیے۔ اس سلسلے میں الونسلیبن[1] میں یہ اصول طے کر لیا کہ اگر بھاگتے ہوئے پولستانی پروشیائی علاقے میں آ جائیں تو روس اس علاقے کے اندر بھی مفرورین کا تعاقب کر سکے گا اور انھیں گرفتار کرے گا۔ یوں بسمارک نے روس کو دوسری مرتبہ خوش کر لیا۔ پہلے جنگِ کریمیا کے موقع پر خوش کیا تھا۔

شلیسوگ ہالسٹین کا مسئلہ ۱۸۶۳ء — ۱۸۶۵ء

۱۸۶۳ء میں شاہ ڈنمارک نے وفات پائی اور شلیسوگ ہالسٹین[2] کا مسئلہ سامنے آ گیا، جس سے بسمارک کو اپنے کمالات دکھانے کا مزید موقع مل گیا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ صرف تین آدمی اس پُر پیچ مسئلے کو سمجھتے تھے، ان میں سے ایک مر چکا ہے، ایک پاگل ہے اور تیسرا میں ہوں، لیکن میں اس کے متعلق سب کچھ بھول گیا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ شلیسوگ ہالسٹین کے علاقے جزیرہ نمائے ڈنمارک کے جنوب میں واقع تھے اور شاہ ڈنمارک ان پر حکمران رہا، مگر یہ ڈنمارک کا جزو نہ تھے۔ ان علاقوں کو پندرھویں صدی میں یقین دلا دیا گیا تھا کہ انھیں کبھی ایک دوسرے سے الگ نہ کیا جائے گا۔ ان میں سے ہالسٹین کی آبادی میں بہت بڑی اکثریت جرمنوں کی تھی۔ شلیسوگ میں جرمن اور ڈین (اہلِ ڈنمارک) ملے جلے رہتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پروشیا ایک بین الاقوامی کانفرنس میں ایک ایسے داشت پر راضی ہو گیا تھا، جو ڈنمارک کے تحت اور ان علاقوں کے دونوں کا مالک ہو گا۔ ساتھ ہی پروشیا نے دوسری طاقتوں سے مل کر

---

[1] Alvensleben

[2] Schleswig Holstein

سفارش کی کہ ڈنمارک اور یہ دو علاقے ایک دستور کے ذریعے سے متحد ہو جائیں۔ جب ڈنمارک نے دستوری اتحاد کے لیے قدم اٹھایا، تاکہ شلیسوگ ہالسٹین کو اپنے ساتھ شامل کرے تو دونوں علاقوں نے شدید مزاحمت کی۔ اہلِ ڈنمارک نے شلیسوگ کو اپنے ملک میں شامل کرا لینے کی کوشش کی۔ جرمن محبانِ وطن نے اس پر اعتراض کیا۔ پروشیا اور آسٹریا دونوں چاہتے تھے کہ شلیسوگ اور ہالسٹین کو ڈنمارک کی پارلیمنٹ میں خاص نمائندگی مل جائے۔ ساتھ ہی دونوں کا اصرار تھا کہ شلیسوگ کو ڈنمارک میں ضم نہ کرنا چاہیے۔ بایں ہمہ شاہ ڈنمارک نے ۱۸۶۳ء میں الحاق کی پالیسی اختیار کی۔

یہ حالات تھے، جب بسمارک نے دونوں علاقے پروشیا کے لیے لے لینے کا فیصلہ کیا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس طرح پروشیا کا اقتدار بڑھ جائے گا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ہالسٹین کی بندرگاہ کیل[1] تجارتی اعتبار سے بے حد قیمتی ہے۔ چنانچہ بسمارک نے پہلے ایک چال چلی، جس سے پروشیا اور آسٹریا نے مل کر ڈنمارک کے خلاف کامیاب جنگ کی (۱۸۶۴ء)، اگرچہ آسٹریا کو ان علاقوں سے براہ راست کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر اس نے ان علاقوں کے نظم و نسق کے متعلق آسٹریا سے جھگڑا پیدا کر لیا۔ گیسٹین[2] میں ایک کنونشن منعقد ہوئی (۱۸۶۵ء)۔ اس میں فیصلہ ہو گیا کہ پروشیا سلیشوگ کا انتظام کرے اور آسٹریا ہالسٹین کا انتظام سنبھال لے، مگر یہ انتظام محض ایک عارضی معاملہ تھا، جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ بسمارک نے آسٹریا کے خلاف کاروائی کے سلسلے میں تھوڑے عرصے کے لیے سستانے کا موقع نکال لیا تھا۔

آسٹریا سے جنگ (۱۸۶۶ء)

بسمارک نے ہالسٹین میں آسٹریا کی روش کے متعلق وی آنا پر نکتہ چینی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے فرانس کو اتحاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ لیکن اطالویوں کو ہموار کر لیا اور وہ خفیہ خفیہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اگر پروشیا نے تین مہینے کے اندر آسٹریا سے جنگ چھیڑی تو وہ پروشیا کا ساتھ دیں گے۔ یہ فیصلہ جرمن وفاق کے دستور کے خلاف تھا۔ کیونکہ دستور کا کوئی ممبر کسی دوسرے ممبر کے خلاف غیر ملکی طاقت سے اتحاد نہیں کر سکتا تھا۔ ولیم اول کو اس غیر آئینی کاروائی پر اتنی پریشانی ہوئی کہ جب آسٹری شہنشاہ نے پوچھا، آیا کوئی ایسا معاہدہ موجود ہے؟ تو ولیم نے بے تکلف جھوٹ بولا اور صاف انکار کر دیا۔ پھر بسمارک نے یکایک یہ تجویز پیش کر دی کہ جرمن وفاق کی اصلاح کی جائے اور تمام جرمنوں کی پارلیمنٹ بالغوں کے حق رائے کی بنا پر منتخب ہو، حالانکہ سب جانتے تھے، بسمارک اس سے متنفر ہے۔

غالباً بسمارک نے بالغوں کے حق رائے کی تجویز اس غرض سے پیش کی تھی کہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ آسٹریا سے اس کا جھگڑا محض شلیسوگ ہالسٹین کے مسئلے پر موقوف نہیں، مگر اس تجویز کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ بسمارک جانتا تھا کہ تمام

---

[1] Keal

[2] Gastein

جرمن بالغوں کو حق رائے دے دینے سے وہ ترقی پسند پارٹی کمزور ہو جائے گی، جو ۱۸۴۵ء کی آزاد دنیا کی وارث تھی اور کسانوں میں سے بہت سے قدامت پسند اور شاہ پسندوں کو ووٹ کا حق مل جائے گا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ نپولین کیونکر فرانس میں صرف بالغوں کے حق رائے کی بنا پر شہنشاہ بن گیا۔ پھر اس نے ایک جرمن اشتراکی فرڈیننڈ لسال[1] سے بات چیت کی، جس نے مدلل طریق پر ثابت کر دیا کہ تمام بالغوں کو حق رائے مل جائے گا تو طبقۂ اوسط کمزور ہو جائے گا۔ اس سے بھی بسمارک پر بہت اثر پڑا۔ اسے امید تھی کہ آسٹریا اس منصوبے کو رد کر دے گا۔ وفاق کے دوسرے ممبروں نے پروشیا سے درخواست کی کہ اصلاح کا پورا منصوبہ پیش کر دیا جائے۔ اب آسٹریا نے شلیسوگ ہالسٹین کا مسئلہ وفاقی پارلیمنٹ کے روبرو پیش کر دیا۔ بسمارک نے پروشیائی فوجوں کو حکم دے دیا کہ ہالسٹین میں داخل ہو جاؤ۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ آسٹریا نے جو تحریک پارلیمنٹ میں پیش کی ہے وہ غیر آئینی ہے۔ یوں آسٹریا سے جنگ چھیڑنے میں بسمارک کامیاب ہوا۔ یہ تمام جرمنوں کے درمیان خانہ جنگی تھی، کیونکہ بویریا، ووٹمبرگ، سیکسنی اور ہینوور (چار جرمن بادشاہیاں) اور اکثر دوسری چھوٹی ریاستیں آسٹریا کی حامی بن گئیں۔

یہ جنگ صرف سات ہفتے جاری رہی اور تین ہفتوں میں تمام فیصلے ہو گئے۔ آسٹریوں کو اپنی فوج کا خاصا بڑا حصہ اٹلی کے خلاف متعین کرنا پڑا۔ پروشیائیوں نے ریلوے کے جال، تار اور دوسرے اعلیٰ اسلحہ کے ذریعے سے شمالی جرمنی کو تیزی کے ساتھ پامال کر ڈالا۔ بوہیمیا پر حملہ کر دیا اور آسٹریا کو کونگ گراٹز[2] (سڈووا) میں شکست دی۔ اس جنگ کو وہی حیثیت دی جاتی ہے، جو امریکہ کی خانہ جنگی میں گیٹسبرگ[3] کو حاصل ہوئی، یعنی اس جنگ میں علی الخصوص پروشیائیوں نے کامیابی حاصل کی۔ پروشیائیوں نے بویریا کو شکست دی اور وہ فرینکفرٹ میں داخل ہو گئے، جو جرمن وفاق کا مرکز تھا۔ ہینوور، ہیسی کیسل[4]، نساؤ[5] پروشیا میں شامل کر لیے گئے اور ان کے حکمرانوں کو باہر نکال دیا گیا۔ شلیسوگ ہالسٹین اور فرینکفرٹ کے آزاد شہر پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

فوجی سالار (بلکہ خود بادشاہ بھی) چاہتے تھے کہ آسٹریا کو سخت سزا دی جائے۔ بسمارک نے اس رائے کی مخالفت کی اور وہ کامیاب ہوا۔ آسٹریا وینس اٹلی کے حوالے کرنے پر مجبور ہوا، لیکن جنگ کے بعد پراگ میں جو صلح ہوئی (۱۸۶۶ء) اس میں اور کوئی علاقہ اس سے نہ لیا گیا۔ البتہ تھوڑا سا تاوان دینا پڑا۔ بسمارک کے نقطۂ نگاہ سے اہم واقعہ یہ تھا کہ آسٹریا جرمن وفاق سے ہمیشہ کے لیے دستکش ہو گیا۔ ساتھ ہی وفاق پر خط تنسیخ کھچ گیا۔ جرمنی کے جو علاقے دریائے مین کے شمال میں تھے، ان کے لیے ایک نیا وفاق ضروری ہو گیا جس کا انتظام پروشیا نے کیا۔ اس کا نام "شمالی جرمن وفاق"

---

۱ Lassalle
۲ (Sadova) Kong Gratz
۳ Gettysburg
۴ Hesse-Cassel
۵ Nassan

رہ گیا۔ ساتھ ہی یہ طے پایا کہ دریائے مین کے جنوب میں جو جرمن ریاستیں ہیں وہ اپنی ایک الگ یونین بنا لینے کی مجاز ہوں گی لیکن بسمارک پہلے ہی جنوبی ریاستوں میں سب سے اہم ریاستوں —— بویریا، ورٹمبرگ اور بیڈن —— کے ساتھ خفیہ معاہدے کر چکا تھا اور انھوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر جنگ ہوئی تو اپنی فوجیں شاہ پروشیا کے حوالے کر دیں گی۔ لہٰذا جنوبی جرمن ریاستوں کی یونین کبھی نہ بنی۔ یوں پراگ کا معاہدہ وجود میں آتے ہی درہم برہم ہو گیا۔ یہ ہنرمندانہ ڈپلومیسی کا ایک عجیب کارنامہ تھا۔ بسمارک نے آسٹریا سے جو نرم برتاؤ کیا تھا، یہ کسی فیاضی کا نتیجہ نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ پروشیا کو آگے چل کر آسٹریا کی ضرورت پیش آئے گی۔ اب وہ آسٹریا کو جرمنی سے نکال چکا تھا اپنا حل نافذ کر چکا تھا اور پروشیا کو برتری کی اعلیٰ حیثیت دے چکا تھا۔ گویا اس کا اصل مقصد پورا ہو گیا تھا۔

اب اصل معاملات سے فارغ ہو کر بسمارک نے پروشیا کی پارلیمنٹ پر توجہ کی جس کے ساتھ چار سال سے جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا کہ مجھے ایک تصدیق نامہ دو اور اس میں لکھ دو کہ ۱۸۶۱ء سے میں نے جتنی رقمیں بجٹ کی منظوری کے بعد غیر قانونی طریق پر جمع اور غیر قانونی طریق پر خرچ کیں وہ سب قانونی طریق پر خرچ کی گئی تھیں۔ پارلیمنٹ کے نمائندے ڈنمارک اور آسٹریا کے خلاف اس کے جنگی کارناموں سے سراپا حیرت بنے ہوئے تھے۔ بہت بڑے نئے علاقے اور نیا اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ انھوں نے نہ صرف تصدیق نامہ دیا، بلکہ انھوں نے بسمارک کے لیے شخصاً تقریباً تین لاکھ پونڈ کا نقد ہدیہ پیش کر دیا۔ یہ تصدیق نامہ پارلیمانی حکومت کی ایک اہم شکست تھا۔

شمالی جرمنی کا وفاق

ایک مجلس بلائی گئی جس کے لیے تمام بالغوں کے حق رائے سے ممبر چنے گئے۔ اس مجلس نے نئے وفاق کا دستور بحث کے بعد منظور کر لیا۔ پروشیا کے بادشاہ کو اس کا صدر مانا گیا۔ بسمارک نے اس غرض سے ایک مسودہ اس مجلس کے پاس پیش کیا۔ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے سے پارلیمانی نظام کو ختم کرنے کے عزم کا شاہد عادل تھا۔ آئندہ کی پارلیمنٹ (ریشتاغ[1]) کو بجٹ پر کوئی اختیار باقی نہ رہا اور یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ وزرا پارلیمنٹ کے روبرو جوابدہ نہ ہوں گے۔ اس کی جگہ ایک فیڈرل کونسل بنڈسرات[2] یعنی وفاقی مجلس قائم کر دی گئی جو شامل ہونے والی ریاستوں سے مرکب تھی۔ وہ اپنے حکمرانوں کی ہدایت کے مطابق ووٹ دیتے تھے۔ کلیدی پالیسی کے متعلق تمام فیصلے خفیہ طریق پر اسی مجلس میں ہو جاتے تھے اور پارلیمنٹ کی طرف سے جو قانون منظور ہوتا تھا، اس پر ویٹو کا حق قائم تھا۔ ایک چانسلر وفاقی مجلس کی صدارت کرتا، مگر اسے پارلیمنٹ کے روبرو اپنے کسی فیصلے کی توضیح یا جوابدہی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ وفاقی مجلس میں پروشیا اور دوسری ریاستوں کے بھی ووٹ شامل تھے۔ اس لیے بسمارک کے منصوبے کے مطابق پروشیا

---

[1] Reichstag

[2] Bundesrat

کے بادشاہ کو جرمنی کے معاملات میں مختاری کا درجہ مل گیا۔

اس منصوبے میں صرف خفیف سی ترمیم ہوئی، یعنی آئندہ چانسلر کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ شاہ پروشیا وفاق کے صدر کی حیثیت میں جو اقدام کرے، اس کی توثیق کی جائے مگر مجلس انتظامیہ کو پارلیمنٹ کے روبرو جوابدہ نہ بنایا گیا۔ بسمارک کے منصوبے میں یہ بھی طے کر دیا گیا تھا کہ پانچ سال بعد فوج کی تعداد قانوناً معین کر دی جائے گی اور پارلیمنٹ کو بجٹ پر ووٹ دینے کا حق ہوگا، لیکن بسمارک خود چانسلر بن گیا اور اس نے ایسا انتظام کر لیا کہ فوجی بجٹ پر ہر سال بحث نہ ہو سکے، بلکہ بڑی بڑی رقمیں طویل مدت پیشتر ہی لے لی جاتی تھیں۔ گویا دستور نے جرمنی پر پروشیا کی فوجی برتری کی تصدیق کر دی اور اس کے سوا کچھ نہ ہوا۔

فرانس سے جنگ

وی آنا کے نظام کو تباہ کر کے بسمارک نے پروشیا کے زیر اقتدار جو نیا جرمنی پیدا کیا تھا، اس کا اثر چار سال بعد ہر جگہ محسوس ہونے لگا۔ جب تک نپولین سوم کے متعلق بسمارک کو غیر جانبداری ضروری محسوس ہوئی، وہ برابر کہتا رہا کہ اگر نپولین بلجیم پر قابض ہو جائے گا تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اب خوش فہم نپولین پر واضح ہوا کہ بسمارک یہ معاملہ فراموش کر چکا ہے۔ نپولین کو امید تھی کہ آسٹریا اور پروشیا کے درمیان صلح کرانے میں اس نے جو امداد دی ہے، اس کے بدلے میں شاہ ہالینڈ سے لکسمبرگ خرید لینے کا موقع دے دیا جائے گا۔ چنانچہ اس غرض سے اس نے ناجائز کوششیں شروع کر دیں۔ بسمارک نے پھر اس کی مخالفت کی۔ یکایک فرانسیسی عوام اور فرانسیسی جرائد میں سے اکثر نے سدووا کا بدلا لینے کی امید پر جرمنی کی زبردست مخالفت شروع کر دی۔ جرمنی کے اخباروں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ نپولین سوم نے آسٹریا اور اٹلی سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ جرمنی کو مزید توسیع سے باز رکھا جا سکے، مگر آسٹروی کسی پکے فیصلے پر آمادہ نہ ہوئے اور اطالویوں کے ساتھ اس لیے معاملہ طے نہ ہو سکا کہ روما کے مسئلے پر فرانسیسیوں سے اختلاف تھا۔

۱۸۶۸ء میں اہل ہسپانیہ نے اپنی ملکہ کو ملک سے خارج کر دیا اور ہسپانوی تخت کے لیے جو لوگ امیدوار بنے، ان میں سے ایک ہوہنزولرن شہزادہ بھی تھا۔ بسمارک خفیہ خفیہ اس کی حمایت کر رہا تھا اور اس نے بعض ذی اثر ہسپانویوں کو رشوت بھی دی۔ خاندانی معمول کے مطابق امیدوار شہزادے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ولیم اول شاہ پروشیا کی رضامندی حاصل کرے۔ شاہ رضامندی دینے پر آمادہ نہ تھا۔ بسمارک نے رضامندی حاصل کر لی، مگر اس امر کی طرف اشارہ تک نہ کیا کہ اس کے نتیجے میں فرانس سے جنگ ہو سکتی ہے۔ نپولین بھی ہسپانیہ کے معاملے میں خاصا الجھا ہوا تھا۔ اسے یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر ہسپانیہ کے تخت پر کوئی ہوہنزولرن آ بیٹھا تو فرانس دو طرف سے حملے کا ہدف بن جائے گا۔ چنانچہ شاہ ولیم پر براہ راست فرانسیسی سفیر کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا اور ہوہنزولرن امیدوار نے اپنا نام واپس لے لیا۔ اس موقع پر صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بسمارک کو شکست ہوئی۔ فرانسیسیوں نے اپنی کامیابی کے متعلق مبالغہ آمیز تصور پیدا کر لیا اور مطالبہ پیش کر دیا کہ شاہ ولیم باقاعدہ امیدواری سے دستکشی کے اعلان کی تصدیق کرے، نیز وعدہ کرے کہ آئندہ کبھی ایسی حالت پیدا نہ ہونے دے گا۔ ولیم اس وقت ایمس میں تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے فرانسیسی مطالبہ ٹھکرا دیا اور فرانسیسی سفیر سے جو بات چیت ہوئی تھی، اس کے

متعلق بسمارک کو تار دے دیا۔ بسمارک نے ایمس[۱] کے اس مشہور برقی پیغام کی تلخیص اخبارات اور یورپی وزارتوں کے حوالے کر دی۔ پیغام کی شکل ایسی بنا دی کہ معلوم ہو، بادشاہ ولیم نے فرانسیسی سفیر کی خوب گوشمالی کی اور فرانسیسی سفیر کا رویہ بادشاہ کے متعلق اشتعال انگیز تھا۔ رائے عامہ میں اشتعال پیدا ہوا اور نتیجہ ٹھیک وہی نکلا، جو بسمارک کے تصور میں تھا۔ یعنی فرانسیسیوں نے ۱۹۔ جولائی ۱۸۷۰ء کو اعلانِ جنگ کر دیا۔

چھ ہفتوں کے اندر اندر جرمن فوجیں فرانس میں بڑھیں۔ ایک فرانسیسی فوج کو حصار میٹز کے اندر بند کر دیا۔ دوسری کو سیدان میں شکست دی اور خود نپولین سوم کو گرفتار کر لیا۔ پھر پیرس کا محاصرہ شروع ہو گیا، جس نے کسی قدر طول پکڑا۔ ۱۸۷۱ء کے اوائل میں پیرس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ نئی فرانسیسی حکومت کو صلح کرنی پڑی۔ بسمارک نے فرانس کو مجبور کر دیا کہ ایک ارب ڈالر تاوان دے۔ السانس اور لورین کے زرخیز صوبے جرمنی کے حوالے کر دے۔ جرمنی کے فوجی ماہرین ان صوبوں پر اس لیے قبضہ کرنا چاہتے تھے کہ اگر آئندہ کبھی فرانس جرمنی پر حملہ آور ہو تو اس کے خلاف دفاع کر سکیں۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ جب تک تاوانِ جنگ ادا نہیں کیا جائے گا، جرمن فوج فرانس پر مسلط رہے گی، اس کا خرچ حکومت فرانس ادا کرے گی۔

---

۱ Ems

چونتیسواں باب

جرمنی

سنہ ۱۸۵۰ء - سنہ ۱۹۱۴ء

(۲)

جرمن سلطنت

صلح سے پیشتر ہی ولیم شاہ پروشیا کو قصر ورسائی (تعمیر کردہ لوئی چہاردہم) کے ایوان بلوریں میں شہنشاہ جرمنی بنا دیا گیا تھا۔ بسمارک کو نئی سلطنت میں جنوبی جرمن ریاستوں کے شمول کی غرض سے چند غیر اہم مراعات دینی پڑیں لیکن اس نے پارلیمنٹ سے کوئی مشورہ نہ کیا، البتہ پارلیمنٹ نے جلد ایک وفد اس غرض سے بھیج دیا کہ شہنشاہ سے قبول تاج و تخت کی التجا کرے۔ اعلان شہنشاہی کے وقت امراء، شہزادے، اور سپاہی موجود تھے۔ جب نئی سلطنت کے لیے دستور منظور کیا گیا تو یہ اس دستور ہی کی توسیع تھا، جو سنہ ۱۸۶۷ء میں شمالی جرمن ریاستوں کے وفاق کے لیے منظور ہوا تھا۔ اگرچہ جرمن سلطنت بسمارک کی چالاکی اور خود رائی کے باعث ظہور میں آئی تھی، مگر یہ جرمن عوام کے دلی مطالبے کے عین مطابق تھی اور انھیں یہ احساس ہو گیا کہ ان کی قومی تقدیر کامیابی کی منزل میں پہنچ گئی ہے۔ خود بسمارک کو پرنس کا منصب دیا گیا اور دس لاکھ ڈالر حسن خدمات کے صلے میں اسے ملے۔

جرمن سلطنت کے چانسلر کی حیثیت میں بسمارک سنہ ۱۸۷۱ء سے سنہ ۱۸۹۰ء تک یورپ کا ممتاز سیاستدان بنا رہا۔ اس کا احساس یہ تھا کہ اب جرمنی کو کوئی مزید علاقہ فتح کرنے یا جنگ لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُنیسویں صدی کے ایک حقیقت پسند سیاستدان کی طرح اس نے عالمی سلطنت کا خواب کبھی نہ دیکھا اور اس کے محدود مقاصد پورے ہو چکے تھے۔ اب ایک مدبر کی حیثیت میں وہ جرمنی کے بیرونی خطروں سے حاصل کردہ فوائد کی حفاظت میں کوشاں رہا۔ زیادہ تر خطرہ یہ تھا کہ مبادا جرمنی کے خلاف بیرونی قوتیں کوئی اتحاد پیدا کر لیں۔ سیاست دان کی حیثیت میں اس نے تمام مخالف طوفانوں سے پروشیائی نظام کو محفوظ رکھنے کی سعی جاری رکھی۔

بسمارک کی چانسلری کے دو طبعی دور ہیں:

۱۔ لبرلوں کے تعاون اور کیتھولکوں کی مخالفت میں آزاد تجارتی دور (سنہ ۱۸۷۱ء — سنہ ۱۸۷۸ء)

۲۔ حفاظتی مسائل، کیتھولکوں اور اشتراکیوں کی مخالفت کا دور (سنہ ۱۸۷۸ء — سنہ ۱۸۹۰ء)

پہلا دور (۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۸ء)

نئی سلطنت کی تخلیق سے ملک کے اندر متعدد اقتصادی اور آئینی مسائل پیدا ہو گئے۔ پارلیمنٹ میں اعتدال پسند لبرل پارٹی کے تعاون سے بسمارک نے مشترکہ سکہ جاری کیا۔ ایک مرکزی بینک بنایا۔ ریلوں اور ڈاک کا نظام متحد کر دیا۔ اسی طرح قانونی اور عدالتی نظام میں یکسانی پیدا کر لی گئی۔ ۱۸۷۱ء میں پارلیمنٹ نے منظوری دے دی کہ ایک فی صد آبادی کو تین سال کے لیے مسلح رکھا جائے۔ ۱۸۷۴ء میں استعفےٰ کی دھمکی دے کر اس نے پارلیمنٹ سے یہ منظوری حاصل کر لی کہ چار لاکھ ایک ہزار فوج سات سال کیلئے تیار رکھی جائے۔ (۱۸۸۱ء تک) اس دور کے خاتمے سے ایک سال پیشتر (۱۸۸۰ء میں) اس نے فوج کی تعداد چار لاکھ ستائیس ہزار منظور کرالی اور اسے مزید سات سال کے لیے رکھا گیا۔ (۱۸۸۸ء تک) چونکہ فوج کو ایک خاص بلند حیثیت حاصل تھی، اس لیے لڑکوں کے لیے فوجی خدمت زیادہ جاذب اور مستحق توجہ بن گئی۔ یہ امر جرمنی کی اکثریت کے لیے ایک مستقل مہمیز بنا رہا۔

۱۸۷۰ء کے بعد جرمنی میں ایک اور بڑا ڈراما شروع ہوا، یعنی بسمارک نے رومن کیتھولک کلیسا پر حملہ کر دیا اور اسے "تہذیب کے لیے جنگ"[1] قرار دیا۔ پوپ نے ۱۸۶۴ء میں مشہور مجموعۂ خطایا شائع کیا تھا۔ اس میں دوسرے مذاہب سے رواداری کے برتاؤ، سیکولر تعلیم اور معاملات کنیسہ میں مملکتوں کی مداخلت کی سخت مذمت کی تھی۔ پھر ۱۸۷۰ء میں کلیسا کی ایک عام مجلس منعقد ہوئی۔ دور اصلاح کنیسہ میں مجلس ٹرینٹ کے بعد یہ پہلی مجلس تھی۔ اس میں پھر یہ عقیدہ ضروری قرار دیا گیا کہ پوپ اپنے منصب کی حیثیت میں ہر غلطی اور خطا سے بالا ہے۔ جن مملکتوں کا مذہب کیتھولزم نہ تھا، انھوں نے اس کا مطلب یہ قرار دیا کہ کیتھولک شہریوں سے کامل وفاداری کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

جرمنی میں کیتھولکوں کی خاصی بڑی تعداد تھی، اگرچہ وہ اقلیت میں تھے۔ انھوں نے ایک سیاسی پارٹی بنا لی تھی۔ جسے مرکزی پارٹی کہا جاتا تھا۔ یہ جلد ہی مملکت میں دوسرے درجے کی زبردست پارٹی بن گئی۔ اس پارٹی نے پوپ کی معصومی کا اعلان کیا اور وہ چاہتی تھی کہ پوپ کا دنیوی اقتدار بھی بحال ہو جائے جو اٹلی کے اتحاد سے ختم کر دیا گیا تھا۔ جرمنی کے پولستانی صوبے کے کیتھولک مرکزی پارٹی کے محب تھے، بلکہ کیتھولکوں نے مزدوروں کی ایک خاص تحریک کی سرپرستی بھی کی، جس نے ایک عمرانی خطرے کی صورت اختیار کر لی۔ کیتھولک کسان اور مزدور، پادری اور امیر، سب کے سب پروٹسٹنٹوں کے شہری طبقۂ اوسط اور پروشیا کے فوجی اقتدار کے خلاف تھے۔ بسمارک نے مذہبی طبقے کے مخالفوں کو فرانس اور آسٹریا کے کارندے قرار دے دیا۔ یہی دو قومیں تھیں جنھیں نئی جرمنی کی تخلیق کے سلسلے میں اس نے شکستیں دیں۔

اب بسمارک نے لبرلوں کے تعاون سے بعض قوانین منظور کرا لئے، مثلاً یسوعیوں کو جرمنی سے نکال دیا جائے۔ مذہبی طبقے کے لوگ حکومت پر نکتہ چینی نہ کریں۔ جو مدرسگاہیں مذہبی طبقے کے زیر انتظام جا رہی تھیں انھیں بند کر دیا جائے۔ پروشیا

---

[1] Kultur Kampf

میں سول میرج[1] (قانونی شادی) کا انتظام کر دیا گیا۔ کیتھولک کلیسا کو جو روپیہ ملتا تھا، وہ روک دیا گیا، اور پادریوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ سیکولر یونیورسٹیوں میں تعلیم پائیں۔ پوپ نے ان تمام قوانین کو کالعدم قرار دیا اور کیتھولکوں کو دعوت دی کہ ان قوانین کو تسلیم نہ کریں۔ شہروں اور دیہات میں کیتھولک مراسم مذہبی بند کر دیئے گئے اور بہت سے کیتھولکوں کو دینی حیثیت سے محروم ہونا پڑا۔

بسمارک کو ہرگز یہ پسند نہ تھا کہ کلیسا ظلم و جبر سے بلند حیثیت حاصل کرے اس نے اعلان کیا کہ میں کبھی کینوسا[2] نہیں جاؤنگا۔ پھر اس نے جرمن شہنشاہ ہنری چہارم کی تصویر پروٹسٹنٹ جرمنوں کے سامنے پیش کی، جس میں شہنشاہ پوپ کے سامنے جھکا ہوا دکھایا گیا تھا (۱۰۷۷ء)۔ ایک نوجوان کیتھولک نے بسمارک کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ جب کیتھولکوں کے خلاف قوانین سختی سے نافذ کیے گئے تو بڑا جوش پیدا ہوا۔ آخر بسمارک کو جھکنا پڑا اور کیتھولکوں کے خلاف جو قوانین صدی کے آٹھویں عشرے میں منظور کئے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر نویں عشرے میں منسوخ کر دیئے گئے۔ اس وقت تک بسمارک کے لیے اپنے سابقہ حلیفوں یعنی لبرلوں کے خلاف مرکزی پارٹی کی امداد ضروری ہو گئی تھی۔ لبرل زیادہ اختیارات کے طلبگار تھے اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا خطرہ ترقی کرتا گیا۔ علاوہ بریں پروٹسٹنٹ کلیسا اور بہت سے قدامت پسند پروشیائی امراء بھی کیتھولکوں کے خلاف مہم کی تیزی سے چونک اٹھے تھے۔

دوسرا دور (۱۸۷۸ء — ۱۸۹۰ء)

۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء میں بسمارک کی پالیسی کا رخ رفتہ رفتہ بدلنے لگا تھا۔ پہلے پہل اس لیے کہ زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ سلطنت کے لیے روپیہ جزواً بالواسطہ محاصل سے فراہم ہوتا تھا جو پارلیمنٹ کی منظوری سے تمباکو، شراب، چنگی اور ایسی دوسری چیزوں پر لگائے گئے تھے۔ باقی روپیہ مختلف ریاستیں دیتی تھیں، جو براہِ راست محاصل عائد کرنے اور لینے کی ذمہ دار تھیں۔ وہ اپنے اپنے بجٹ میں سلطنت کی رقمیں شامل کر لیتیں۔ فوجی خرچ بڑھ گیا تو سرکاری آمدنی ناکافی ثابت ہوئی اور بسمارک نہیں چاہتا تھا کہ سلطنت اپنے اجزائے ترکیبی پر منحصر رہے اور ان سے بار بار رقمیں بڑھانے پر اصرار کرتی جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ پارلیمنٹ بالواسطہ محاصل کی مقدار بڑھا دے۔ پارلیمنٹ کے لبرل ممبروں کو شبہہ پیدا ہو گیا کہ اگر ہم نے مقدار محاصل بڑھانے کی منظوری دے دی تو بسمارک ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا، جو اس نے پروشیائی پارلیمنٹ سے کیا تھا۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ اگر جھگڑا پیدا ہوا تو بسمارک پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ہی حکمرانی کا سلسلہ جاری رکھے گا اور روپیہ بڑھے ہوئے بالواسطہ محاصل سے حاصل کرتا رہے گا۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ بسمارک کو زیادہ محاصل وصول کر لینے کا موقع دے دینے سے پیشتر

---

[1] سول میرج یعنی قانونی شادی سے مراد وہ شادی ہے جس میں مذہبی مراسم ادا نہیں کیے جاتے۔ مرد عورت کسی مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہو کر میاں بیوی ہونے کی تصدیق کرا لیتے ہیں۔

[2] Canossa جنوبی مشرقی اٹلی کا ایک مقام، جہاں پوپ کبھی کبھی رہتا تھا۔ جرمن شہنشاہ ہنری چہارم سے پوپ کا اختلاف ہوا تو پوپ نے اپنے بڑے بڑے مذہبی حربے شہنشاہ کے خلاف استعمال کیے۔ آخر اسے مجبوراً پوپ کے سامنے جھکنا پڑا اور کینوسا پہنچ کر اس نے ذلت اٹھائی اور پوپ سے معافی لی۔

اس سے کوئی نہ کوئی ضمانت لے ہیں۔

بنیادی طور پر جرمنی ٹیرف پالیسی آزاد تجارت کی تھی۔ جرمن سامان کے لیے صرف معمولی تحفظ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں مالی افراتفری کے بعد فولاد اور پارچات کے صنعتکاروں نے بسمارک پر دباؤ ڈالا کہ تحفظ کی پالیسی اختیار کی جائے، تاکہ وہ لوگ انگلستان کی مصنوعات سے مقابلہ کر سکیں۔ مزید برآں ایک زرعی بحران پیدا ہو گیا اور قدامت پسند آزاد تجارت کی حمایت کرنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے بھی مشرقی یورپ سے ارزاں غلے کے خلاف حفاظتی محاصل کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ۱۸۷۹ء میں بسمارک نے ہر قسم کی درآمد پر عام حفاظتی محصول منظور کرا لیا۔ اس مسئلے پر اس کے سابقہ حلیف یعنی لبرل الگ ہو گئے۔

لبرلوں کی طرف سے مطالبہ پیش ہو رہا تھا کہ انھیں آئینی ضمانتیں دی جائیں۔ ان ضمانتوں سے بچنے کی خاطر بسمارک نے رفتہ رفتہ تہذیب کے خلاف جنگ سے دست برداری اختیار کر لی۔ مرکزی کیتھولک پارٹی حفاظتی پالیسی کی حامی تھی۔ مزید براں فرانس میں مذہبی طبقے کی طرف سے خطرہ کم ہو گیا۔ اور ۱۸۷۹ء میں جرمنی اور آسٹریا کے درمیان اتحاد استوار ہو گیا۔ یوں کلیسا پر حملے کے اسباب باقی نہ رہے اور بسمارک نے مرکزی کیتھولک پارٹی اور قدامت پسندوں کی حمایت حاصل کر لی۔ اب پارلیمنٹ کو رعایتیں دینے کی کوئی ضرورت نہ رہی اور جرمنی میں مصنوعات کی حفاظت کا دور شروع ہو گیا۔ اس سے صنعتوں کے نشو و ارتقا میں مزید تیزی اور عمدگی پیدا ہوئی، خصوصاً بھاری صنعتوں میں۔ سیاسی اعتبار سے قدامت پسند زراعت پیشہ پروٹسٹنٹوں کی قوت بڑھ گئی اور انھوں نے اکثر شہری ووٹ حاصل کر لیے، مگر بسمارک نے مرکزی پارٹی پر کبھی پورا بھروسہ نہ کیا اور برابر اس کوشش میں رہا کہ لبرلوں کو پکے قدامت پسند صنعت کار گروہ کی شکل دے دے اور وہ اس میں کامیاب ہوا۔

جب وہ کیتھولکوں کی مخالفت کم کر کے تحفظ کی پالیسی اختیار کر رہا تھا (۱۸۷۸ء۔۱۸۷۹ء) تو اس زمانے میں اس نے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے خلاف بھی اقدامات شروع کر دیے۔ لیبک نخت[۱] اور ببیل[۲] مارکس کے پیرو تھے۔ انھوں نے ۱۸۶۹ء میں اس پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۸۷۵ء میں لسال کے پیرووں کو ساتھ ملا کر پارٹی کی تعداد بڑھا لی۔ مارکس اس واقع پر سخت مایوس ہوا۔ کیونکہ لسال عدم تشدد کا داعی تھا۔ جرمنی کے سوشل ڈیموکریٹ اتنے انقلابی نہ تھے، جتنے وہ مارکسی اصطلاحات کے استعمال سے ظاہر ہوتے ہیں اور یقیناً وہ لسال کی طرح اس امر پر آمادہ تھے کہ موجودہ حکومت سے کسی نہ کسی طرح سمجھوتا کر لیں۔ بسمارک کے تاثر کے خلاف وہ مملکت کے لیے خطرے کا باعث نہ تھے، مگر انھیں اہل علم اور سابقہ لبرلوں میں خاصی بڑی تعداد کی حمایت حاصل تھی اور ٹریڈ یونین میں بھی ان کے پیرو معتدبہ تھے۔ ۱۸۸۱ء میں انھوں نے پانچ لاکھ ووٹ حاصل کیے، جو تمام ووٹروں کا دس فی صد تھے۔

۱۔ Liebanecht

۲۔ Bebel

سوشل ڈیموکریٹ انقلاب کی بجائے مزدوروں کے حالات کی اصلاح پر تمام توجہات جمائے رکھنے کے لیے تیار تھے، مگر بسمارک کو ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کے دشمن کی ضرورت رہی تاکہ اس کا نام لے کر وہ اپنے حامیوں کو متحد رکھ سکے۔ نیز وہ "پیرس کمیون" سے سخت متنفر تھا اور سمجھتا تھا کہ جرمنی میں بھی ایسی کوئی نہ کوئی چیز پیدا ہو سکتی ہے۔ اس نے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی پر یہ الزام لگایا کہ اس کے آدمیوں نے دو مرتبہ ولیم اوّل کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس معاملے کو سبب بنا کر اس نے ۱۸۷۸ء میں انتخاب عام کا اعلان کیا۔ پارلیمنٹ سے ایک مسودۂ قانون منظور کرایا، جس کے مطابق سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو غیر آئینی قرار دیا۔ اس کے لیے جلسوں کی ممانعت ہو گئی اور اس کے اخبار بند کر دیے گئے۔ پولیس نے اشتراکی افراد کو ان کے مقام سکونت سے بھی نکال دیا۔ لبرلوں نے اپنے بیان کردہ اصول کو ترک کر کے اس قانون کی حمایت کی، لیکن بسمارک کو یہ اجازت نہ دی کہ اسے ایک مستقل ضابطہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اسے ہر دو یا تین سال کے بعد پارلیمنٹ سے اس کی تجدید کرانی پڑتی اور ۱۸۹۰ء میں اس کی علیحدگی تک یہی کیفیت رہی۔ بہ طور اوسط ہر سال ایک سو سے زیادہ افراد قانون کے مطابق قید کیے جاتے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے افراد کو پارلیمنٹ کے امیدوار بننے کی اجازت تھی اور جس زمانے میں وہ قانونی پابندیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے، ان کے ووٹروں کی تعداد بڑھ گئی۔ جس قانون کو وقت کے معیار کے مطابق متشددانہ قانون سازی کا ایک وحشیانہ کارنامہ قرار دیا جاتا تھا، وہ ان حملوں کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا، جو بیسویں صدی کے فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ سیاسی مخالفوں پر کرتے رہے۔ تاہم بسمارک کو احساس تھا کہ اشتراکیوں کی دراز دستیوں کو محض دبا دینے سے اصل مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ساتھ ساتھ مزدوروں کی فلاح کے لیے مثبت اقدامات کیے جائیں۔ چنانچہ صدی کے نویں عشرے میں حکومت نے مسودات قانون کا ایک سلسلہ پیش کیا، جو مزدوروں کی بہتری کے لیے تھا۔ ۱۸۸۳ء میں بیماری کے لیے جبری بیمے کا قانون منظور ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں حوادث کے خلاف ایک قانون بن گیا۔ بیماری کے متعلق بیمے کے لیے سرمایہ مزدوروں اور کارخانہ داروں دونوں سے فراہم کیا جاتا تھا اور حوادث کے بیمے کے لیے پورا سرمایہ کارخانہ دار مہیا کرتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں بڑھاپے اور عدم صلاحیت کار کے لیے بیمہ منظور ہوا۔ اس میں کارخانہ دار اور مزدور دونوں یکساں روپیہ دیتے تھے اور مملکت کی طرف سے بھی مزید مالی امداد دی جاتی تھی۔ پھر منافع بڑھ گئے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی ان اصلاحات میں شامل کر لیا گیا اور ان کے لیے مفت طبی خدمات کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ بسمارک کے عہدِ وزارت میں عمرانی تحفظ کے لیے جرمنی کے اندر جو نظام بروئے کار آیا، اس سے ابتدا میں تو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ووٹوں میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، لیکن مزدوروں کو ان کی خواہش کے مطابق بیشتر چیزیں مل گئیں۔ بسمارک نے یہ تمام قوانین اپنے سابق دشمنوں یعنی مرکزی کیتھولک پارٹی سے ممبروں کی حمایت سے منظور کرائے۔ لبرل ان کے خلاف تھے، جو بسمارک کے سابق حلیف تھے۔ وہ لوگ بڑے بڑے کاروباری آدمیوں کی پارٹی بنا رہے تھے اور انھیں آزادانہ کاروبار میں مداخلت کا خطرہ نظر آتا تھا۔

قیصر ولیم دوم

بسمارک کے حامی ولیم اوّل نے نوّے سال کی عمر میں وفات پائی (۱۸۸۸ء)۔ اس کے بیٹے فریڈرک سوم نے جو ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا، صرف تین مہینے حکومت کی۔ پھر فریڈرک کا بیٹا ولیم دوم شہنشاہ بنا، جو انتیس سال کا جوان تھا اور باپ اس کے برسرِ اقتدار آنے سے بہت خوفزدہ تھا، کیونکہ وہ ناپختہ، جذباتی اور خودبیں تھا۔ بسمارک کا پورا نظام مطلق العنان شاہ پروشیا کو جرمنوں کا شہنشاہ بنائے رکھنے کی حمایت پر مبنی تھا۔ ولیم اوّل نے بسمارک کو اجازت دی کہ اس کی طرف سے جو چاہے کرے۔ ولیم دوم اس کے لیے تیار نہ تھا، وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ سب کچھ خود کرے گا۔ بعد ازاں ولیم اور بسمارک کے درمیان جو کشمکش ہوئی، اس کا بنیادی سبب یہی عزم تھا۔ خاندان ہوہنزولان کے متعلق ہزاروں معلم اور یونیورسٹی کے پروفیسر لاکھوں طلبہ کو جو تلقین کرتے رہتے تھے، اس نے خاصی خوشامد و تملّق کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی، جس نے ولیم کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ ایک ہوشمند آدمی تھا اور جلد حقیقت پر پہنچ جاتا تھا، لیکن تفصیلات و جزئیات سے اسے نفرت تھی اور سلطنت کے معاملات پر ضرورت کے مطابق توجہ دینے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ ان لوگوں کے مشوروں پر کان دھرتا رہا، جو اصرار کرتے تھے کہ سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مشیروں میں سب سے بڑا اسٹوکر[1] تھا، جو لوتھری عقائد کا آدمی تھا اور دربار میں مذہبی پیشوائی کے عہدے پر مامور تھا۔ اسے سامیوں یعنی یہودیوں سے سخت عداوت تھی اور وہ دائیں بازو کے قدامت پسندوں کا لیڈر تھا۔

ولیم نے تخت نشین ہوتے ہی بلند آہنگی سے مزدوروں کے ساتھ ہمدردی کا اعلان کر دیا۔ جب اشتراکیوں کے خلاف قانون کی تجدید کا مسئلہ سامنے آیا تو شہنشاہ نے کہا کہ اس میں ترمیم کر لی جائے اور پولیس کو یہ حق حاصل نہ رہے کہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے آدمیوں کو ان کی اقامت گاہوں سے خارج کر سکے۔ بسمارک نے اس قانون کی مخالفت کی۔ اسے امید تھی کہ اشتراکیت پسند ڈیموکریٹ زیادتیاں کریں گے۔ اس طرح اسے موقع مل جائے گا کہ ان لوگوں کو مسلح قوت سے دبا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۰ء کے بعد اشتراکیوں کے خلاف کوئی قانون نہ رہا۔ اس کے بعد روس کے ساتھ تعلقات اور پالیسی وضع کرنے کے طریقِ کار سے متعلق شہنشاہ اور چانسلر کے درمیان مزید اختلاف پیدا ہوئے۔ آخر مارچ ۱۸۹۰ء میں ولیم نے حکم دے دیا کہ بسمارک مستعفی ہو جائے۔

بسمارک کے بعد ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑنے تک چار آدمیوں نے یکے بعد دیگرے وزارت کا عہدہ سنبھالا مگر[2] ان میں سے کوئی بھی قابلیت اور اثر و رسوخ میں بسمارک جیسا نہ تھا۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۴ء تک پوری مدت میں ولیم ثانی ہی مختارِ کل رہا۔ وہ بڑا سرگرم مگر غیر مستقل تھا۔ طمطراق اور رعب و داب کی نمائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا، لیکن اس نے اپنی دھمکیوں کو لباسِ عمل پہنانے کا حوصلہ کبھی نہ کیا۔ وہ مغلوب الجذبات، اگر ساتھ ہی متذبذب تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر ولیم کسی بھی ملک

---

۱ Stocker

کی حکمرانی کے لیے موزوں نہ تھا خصوصاً اس جرمنی کی حکومت کے لیے جو عسکریت پسند اور اعلیٰ پیمانے کا صنعت کار ملک تھا اور وہاں عمرانی کشاکشیں موجود تھیں اور سیاسی توازن ناپید تھا۔

داخلی کشاکشیں ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۴ء

پارٹیوں کے نظاموں میں جرمن معاشرے کی کشاکشیں منعکس تھیں۔ لبرل پارٹی میں بڑے بڑے کاروباری آدمی شامل تھے۔ پارلیمنٹ میں عموماً اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ نہ رہی۔ اگرچہ بہت سے صنعت کار ذاتی طور پر شہنشاہ سے گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ بڑے بڑے مالکان اراضی نے متحد ہو کر زرعی محاصل میں تخفیف کے خلاف سخت احتجاج کیا اور تخفیف ان بہت سے تجارتی معاہدوں میں شامل تھی، جو جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں کے درمیان ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۴ء میں منعقد ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں ان مالکان اراضی نے ایک زرعی لیگ منظم کر لی، جو قدامت پسندوں کی عام تجاویز کو منظور کرانے کا موجب ہوئی اور سیاسیات جرمنی میں اس نے بہت بڑی قوت حاصل کر لی۔ ۱۹۰۲ء میں ان مالکان اراضی نے از سر نو حفاظتی محاصل منظور کرا لیے۔ طبقۂ اوسط کے شہری خصوصاً تاجر یونکروں کے اقتدار کو ناپسند کرتے تھے۔ انھیں امید تھی کہ دستور کی اصلاح کرا لیں گے اور انھیں برطانوی دستور سے قریب تر لے آئیں گے۔ چونکہ انھیں پارلیمنٹ میں زیادہ نمائندگی حاصل نہ تھی، اس لیے وہ عموماً سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے تعاون کر لیتے تھے۔

ولیم کے عہد حکومت میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ووٹروں کی تعداد پندرہ لاکھ سے ساڑھے بیالیس لاکھ پر پہنچ گئی۔ ۱۹۱۴ء میں ملک کی ایک تہائی آبادی ان کی ہمنوا تھی۔ اشتراکیوں کے خلاف قانون ختم ہو گیا تو انھیں مداخلت کا کوئی اندیشہ نہ رہا۔ انھوں نے پیشہ وارانہ انجمنیں بنا لیں، اخبار جاری کر دیئے اور مزید عمرانی قوانین بنانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس پارٹی کے پیش نظر فوری انقلاب کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ اگرچہ انتہا پسندوں کو امید تھی کہ کوئی نہ کوئی انقلاب پیدا ہو گا خصوصاً ۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب کے بعد یہ امید زیادہ ترقی کر گئی تھی۔ اعتدال پسندوں کو سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان کوئی کشمکش جاری ہونے کی امید نہ تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر طبقۂ اوسط سے اتحاد کر کے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر لیں تو ممکن ہے، سوشل ڈیموکریٹ فوجی حکومت کا تختہ الٹ سکیں۔ انتہا پسندوں نے اس طریق کار کو نفرت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف وقت گزاری کی تدبیریں ہیں۔ شہنشاہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو کمزور کرنے کی غرض سے نئے عمرانی قوانین کی ناکامی پر سخت غصے میں آ گیا اور اس نے ۱۸۹۱ء میں نئے فوجی رنگروٹوں سے کہہ دیا، ممکن ہے کسی روز مجھے یہ حکم دینا پڑے کہ اپنے بھائیوں اور والدین کو گولیاں مار کر ختم کر دو۔

سوشل ڈیموکریٹک زیادہ قوت پکڑ گئے تو حکومت نے مرکزی کیتھولک پارٹی سے وابستگی بڑھا لی۔ پہلے ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان، پھر ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان، قدامت پسندوں اور مرکزی کیتھولک پارٹی کے درمیان اتحاد رہا اور اسے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل تھی۔ یہ اکثریت پارلیمنٹ کے لیے اختیارات میں اضافے کی خواہاں نہ تھی، مگر مرکزی کیتھولک پارٹی کا بایاں بازو وقتاً فوقتاً کہتا رہتا تھا کہ نظام میں زیادہ کشائش پیدا کی جائے اور کبھی کبھی محض تدبیر کی بنا پر وہ ڈیموکریٹک سوشل پارٹی سے

بھی مل جاتے تھے۔

اس اثنا میں فوجی، استعماری اور خارجہ پالیسی کے مسائل نے جرمنی کی داخلی سیاسیات میں پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ فوج کی تعداد سنہ ۱۸۹۲ء میں چار لاکھ اناسی ہزار تھی، سنہ ۱۹۱۳ء میں یہ تعداد آٹھ لاکھ ستر ہزار تک پہنچ گئی۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں امیر البحر ترپٹز[۱] وزیر بحریات بن گیا تو جرمنی نے پہلی مرتبہ بڑے بحری بیڑے کی تیاری شروع کر دی۔ شہنشاہ نے مسلسل جنگجویانہ اور ہنگامہ آرا بیانات دیے، جن میں کہا کہ جرمنی کا مستقبل سمندروں پر موقوف ہے۔ اس نے اور ترپٹز نے مل کر ایک بڑے بیڑے کا منصوبہ تیار کیا، تاکہ یہ اس بحری قوت کی جگہ لے لے، جو صرف ساحل اور تجارت کی حفاظت کے لیے قائم کی گئی تھی۔ بیڑے کی صدا جزوا" اس لیے بھی لگائی گئی تھی کہ وسعت پذیر فولادی مصنوعات کے لیے نئی منڈیاں مہیا کی جائیں۔ ایک "جمعیت بحریہ[۲]" بنائی گئی، جو بہ ظاہر ایک نجی تنظیم تھی، مگر حکومت سے اسے مسلسل گہرا تعلق رہا۔ اس کے نئے بیڑے کے لیے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں ایک معمولی بحری قانون منظور ہوا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں دوسرے قانون کے ذریعے سے بیڑے کی قوت دگنی کر دی گئی۔ مگر فوج اور بیڑا عالمی جنگ کے لیے صرف نمایاں ذریعے تھے۔ جس ملک کو بسمارک نے سیر چشم قرار دیا تھا، وہ سیر چشم نہ رہا۔ ایک استعماری انجمن جرمنی میں بہت کامیاب ہوئی۔ اس نے پہلے مشرق بعید میں، پھر افریقہ میں مختلف زمینوں پر قبضہ کر لیا، اگرچہ بجٹ پر زیادہ بوجھ پڑتا رہا، کیونکہ نوآبادیاں کبھی فائدہ رساں نہ ہوئیں اور اگرچہ پے در پے افسوسناک واقعات کا انکشاف ہوتا رہا، کیونکہ جرمن استعماری نظم و نسق میں بڑی سختی اور تشدد سے کام لیتے تھے۔ جرمنی کی توسیع کے حامیوں نے برلین اور بغداد ریلوے کا منصوبہ بنایا، تاکہ مشرق قریب میں پہنچ جائیں اور وہ فتح و تسخیر کے لیے زیادہ سے زیادہ بلند صدائیں لگاتے رہے۔

ولیم نے بحریات اور مستعمرات کے سلسلے میں جو مسلک اختیار کیا، اس سے برطانیہ کے ساتھ جرمنی کے تعلقات تلخ ہو گئے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں شہنشاہ نے خود بوئروں کے صدر کروگر[۳] کو ایک برقی پیغام بھیجا جس میں مبارک باد دی کہ اس نے جیمسن کا حملہ روک دیا۔ (اس کی تفصیل آگے آتی ہے) اور یہ اشارہ بھی کر دیا کہ جرمنی اس معاملے میں برطانیہ کے خلاف بوئروں کی حمایت کے لیے تیار ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں شہنشاہ نے لندن کے ایک اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" کو انٹرویو دیا جس میں عجیب و غریب بے احتیاطی سے برطانیہ کے ساتھ دوستی کا اظہار کیا، ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ اہل برطانیہ ناشکر گزار ہیں۔ انھوں نے اعتراف نہیں کیا کہ جو فوجی تدبیریں میں نے خفیہ خفیہ انھیں بھیجی تھیں، انھیں کی بنا پر وہ بوئروں کی جنگ میں کامیاب ہوئے۔ یہ دعویٰ صحیح نہ تھا۔ ساتھ ہی ولیم نے یہ کہا کہ جرمنی کا نیا بیڑا دراصل جاپان کے خلاف بنایا گیا ہے۔

"ڈیلی ٹیلیگراف" کے انٹرویو نے خود جرمنی میں بھی ولیم کے خلاف احتجاج کا ایک طوفان بپا کر دیا اور شہنشاہ کو عذر خواہی کرنی

---

[۱] Tirpitz

[۲] Nayy League

[۳] Kruger

پڑی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ایسی کوئی بات نہ کہے گا۔ اس واقعے سے اس فرد کی خطرناک غیر متقل مزاجی آشکارا ہے، جو ایک زبردست عسکریت پسند مملکت میں تمام اختیارات کا مالک و مختار تھا۔ جرمن جس دقیانوسی نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے، اس کے خلاف نیز حکومت کی خارجی بلند آہنگی اور داخلی بے مصلحتی کے خلاف احتجاج نے یہ شکل اختیار کی کہ ۱۹۱۲ء میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو بے اندازہ ووٹ ملے۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں جرمن فوج کے ایک افسر نے السّاس کے ایک قصبے ساورنے[۱] (زیبرن) میں ایک لنگڑے کفش دوز کو تلوار سے زخمی کر دیا۔ اہلِ قصبہ نے جرمنوں کے تکبر اور وحشت کے خلاف احتجاج کیا تو جرمن فوج کے کماندار نے قصبے کے باشندوں کو خلافِ قانون گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس واقعے کے خلاف خود جرمنوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد نے سخت غصّے کا اظہار کیا اور وہ لوگ اپنی فوج کے بے ضبط و ذلت خیز طریقے پر بہت ناراض تھے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے دو سو ترانوے ووٹوں کی تائید اور چوّن ووٹوں کی مخالفت سے حکومت کے خلاف مذمّت کی قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کے سلسلے میں مرکزی کیتھولک پارٹی بھی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اور لبرلوں کی ہمنوا بن گئی۔ اس سے بھی دلچسپ تر واقعہ یہ ہے کہ ملزم افسر کو فوجی عدالت میں بری کر دیا گیا اور ولیم نے اس افسر کو اعزازی نشان عطا کیا۔ ساورنے کے واقعے نے ثابت کر دیا کہ اُس وقت تک بھی جرمن عوام اپنے پروشیائی آقاؤں کی چیرہ دستیوں پر حد درجہ غیر مطمئن تھے، مگر ساتھ ہی یہ ثابت ہو گیا کہ رائے عام کی صریح مخالفت بھی ان آقاؤں ــــ شہنشاہ، جاگیرداروں اور فوج ــــ پر قطعاً کوئی اثر نہیں رکھتی۔

ل Saverne (Zabern)

پینتسواں باب

ہیبسبرگ خاندان کی بادشاہی

(ا)

سنہ ۱۸۵۰ء - سنہ ۱۹۱۴ء

سلطنت کی وضع و ہیئت

ہیبسبرگوں کی عجیب غریب سلطنت کو فرسودہ، بودا، مختلف الاجناس اور ایسی چیز قرار دیا جاتا ہے، جس کا اصل عہد مدت ہوئی گزر چکا تھا۔ اس کی ناہلی، تنگ خیالی، حماقت اور عہد حاضر سے تطابق میں ناکامی پر بہت نفرت و حقارت کا اظہار کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ الزامات بڑی حد تک درست ہیں، مگر ماضی قریب میں اس سلطنت کے محو ہو جانے پر ماتم کی صدائیں بلند کی گئی ہیں اور انیسویں صدی کے ایک چیک محب وطن کے اس مشہور تبصرے کو حسرت و افسوس کے ساتھ دہرایا گیا ہے کہ اگر یہ سلطنت موجود نہ ہوتی تو اسے پیدا کر لینا ضروری تھا۔ آرزوؤں اور تمناؤں کا یہ اظہار رجعت پسندوں، بادشاہی کے حامیوں اور مذہبی طبقے کی طرف سے ہوا۔ وہ لوگ ایک ایسے ماضی کا ماتم کرتے رہے، جو بحالی کی حدود سے بہت دور نکل چکا تھا۔ ٹیٹو کے یوگوسلافیہ، نیز رومانیہ، پولینڈ اور ہنگری کی عوامی جمہوریتوں کے بوڑھے آدمیوں سے ایسی صدائیں سنی جا سکتی ہیں۔ یہ لوگ ایک ایسے نظام حکومت کو آرزوؤں اور حسرتوں سے یاد کر رہے ہیں، جسے عہد جوانی میں وہ ظالم اور بے انصاف قرار دیتے رہے۔ غالباً یہ جذبات ہیبسبرگوں کی مدح و ستائش میں نہیں، بلکہ کمیونسٹوں پر الزام تراشی کے لیے صرف ہو رہے ہیں، جو اب ہیبسبرگوں کے سابق علاقوں کے بڑے حصے پر حکمران ہیں یا ان قومی اور فاشسٹ حکومتوں کی مذمت مقصود ہے، جو کمیونسٹوں کی کامیابی سے پیشتر وہاں قائم تھی۔ بہرحال یہ امر واقعی دل کو صدمہ پہنچاتا ہے کہ جاگیرداری کا وہ مجموعہ، جس پر ہیبسبرگ خاندان حکمران تھا، صرف ایک نسل پیشتر منتشر ہوا۔ یہ سوچنا بھی دل شکنی کا باعث ہے کہ قومی نفرتوں اور رقابتوں کا وہ مسئلہ، جو ہیبسبرگوں کی سلطنت کے لیے وجہ مصیبت بنا اور آخر اسے تباہ کر دیا آج بھی ترمیم شدہ شکل میں موجود ہے۔ اس سے لوگوں کو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں اور جنگ کا خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔

۱۸۴۸ء سے ۱۹۱۴ء تک شہنشاہ فرانسس جوزف ہیبسبرگ تخت کی زینت بنا رہا۔ وہ بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اسے فرائض کا گہرا احساس تھا۔ وہ دفتر میں بیٹھ کر سخت محنت کرتا۔ دن بھر گھنٹوں سلطنت کے متعلق کاغذات پڑھتا اور ان پر دستخط ثبت کرتا رہتا۔ مگر اس میں نہ کوئی حرارت تھی اور نہ تخیل۔ ایسی کتابوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، جن میں مروجہ مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ اخباروں سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ صرف ان درباری آداب کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتا تھا، جو ہیبسبرگوں کے لیے مقرر ہو چکے تھے۔ قدیم اوضاع پر شدت سے قائم رہا۔ سخت قدامت پسند تھا۔ قدیم ہیبسبرگوں کے انداز میں اسے خود غرض قرار دینا چاہیے۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ کوئی وزیر اس کے لیے سودمند نہیں رہا تو اس کی برطرفی میں کبھی تامل نہ کرتا۔ وہ بڑا پرہیزگار تھا۔ شکار کا اسے بہت شوق تھا۔ محض سن رسیدگی کی بنا پر اس کے لیے وفاداری کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، لیکن اعتراف کر لینا چاہیے کہ بہ لحاظ سے وہ کند ذہن تھا۔ پرنس شوارزن برگ کے سوا، جو ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان وزیر اعظم رہا۔ فرانسس جوزف نے مدت العمر میں کبھی کسی کو وزیر اعظم مقرر نہ کیا۔ وہ آپ اپنا وزیر اعظم تھا اور پالیسی کے تمام فیصلے خود ہی کرتا۔ اس کے تمام فیصلے وقت گزر جانے کے بعد ہوتے اور جو کچھ دے دینا لازم ہوتا اس سے بہت کم دیتا۔

سیاسی تجربات ۱۸۵۹ء ـ ۱۸۶۷ء

ہیبسبرگ خاندان کی تاریخ کو ۱۸۴۸ء سے ۱۹۱۴ء تک غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور خط تقسیم ۱۸۶۷ء میں کھچا، جب سلطنت آسٹریا اور ہنگری کی دوگونہ بادشاہی بنی۔ ۱۸۶۷ء سے پیشتر کا عشرہ ردِ عمل کا عشرہ تھا۔ یہ ۱۸۵۹ء میں ختم ہوا، جب پیدماں اور فرانس سے جنگ ہوئی۔ پھر آٹھ سال (۱۸۵۹ء ــ ۱۸۶۷ء) کو سیاسی تجربات کے سال کہنا چاہیے۔ ان میں پروشیا سے جنگ ہوئی (۱۸۶۶ء)۔ ۱۸۴۸ء ــ ۱۸۴۹ء کی انقلابی تحریکات کو بہ زور دبانے کے بعد دس سال کے دور کو عموماً "عہد باخ۱؎" کہا جاتا ہے، کیونکہ جس وزیر داخلہ کے عہد میں تشدد ہوا، اس کا نام باخ تھا۔ اب سلطنت کے تمام حصے پہلی مرتبہ متحد ہوئے اور جرمن بولنے والے افسر وی آنا سے پوری سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔ میگیار، چیک اور اطالوی ہی نہیں، بلکہ کروٹ اور رومانوی بھی ـــ جنھوں نے میگیاروں سے نفرت کے باعث انقلابات کے دبانے میں وی آنا کو امداد دی تھی ـــ سب ایک مطلق العنان نظام کے تابع آ گئے۔ ایک کروٹ نے ایک میگیار سے کہا:

"تمھیں جو کچھ سزا میں ملا، وہی ہم نے خدمت کے معاوضے میں پایا۔"

۱۸۵۵ء میں مملکت نے کیتھولک کلیسا سے ایک میثاق قائم کر لیا، جس کے مطابق مذہبی طبقوں کو تعلیم اور دوسرے دائروں میں زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہو گیا جوزف دوم کی اصلاحات کے بعد انھیں یہ اثر و رسوخ حاصل نہیں رہا تھا۔

۱؎ Bach System

باخ نے داخلی پالیسی میں تشدد کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے لیے ضرورت کے مطابق فوج اور پولیس بہم پہنچانے میں خرچ بڑھ گیا اور مملکت مقروض ہو گئی۔ اس نے ریلوں اور صنعت پر روپیہ خرچ کرنے کی بجائے نظام باخ کی تقویت میں روپیہ خرچ کیا۔ ان مصارف کا نتیجہ یہ نکلا کہ آسٹریا پروشیا کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا۔ پھر کریمیا کی جنگ چھڑ گئی۔ نکولس اوّل زار روس نے ہنگری کی بغاوت فرو کرنے میں آسٹریا کو امداد دی تھی۔ اب اس امداد کا بدلا اتارنے کا موقع آیا تو آسٹریا نے ناشکرے پن سے دنیا کو متحیر کر دیا۔ فرانسس جوزف نے روسیوں کو نہ صرف امداد ہی نہ دی، بلکہ ڈینیوبی ریاستوں پر (جنھیں آج کل رومانیہ کہتے ہیں) حملے کا خطرہ پیدا کیے رکھا۔ ۱۸۵۷ء میں آسٹریا کو سخت مالی بحران سے سابقہ پڑا۔ یہ ایک حد تک فوج کو طویل مدت کے لیے برسرِ جنگ رکھنے کا نتیجہ تھا۔

۱۸۵۹ء میں آسٹریا نے فرانسیسیوں اور اطالویوں سے شکستیں کھائیں۔ لمبارڈی کا علاقہ چھن گیا۔ ساتھ ہی میلان جیسے بڑے شہر سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس وقت نظام باخ کا خاتمہ ہوا۔ جنگ کا خطرہ بدستور قائم رہا۔ سلطنت کی مختلف قوموں خصوصاً میگیاروں کو بے چینی کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس طرح ان کی فوجیں ناقابلِ اعتماد ہو جاتیں۔ متعدد حل تلاش کیے گئے اور ان پر عمل ہوا۔ کوشش یہ تھی کہ ایسا انتظام کر لیا جائے، جو داخلی اور خارجی کشیدگیوں میں استوار رہے اور سلطنت کی حیثیت کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے، فرانسس جوزف نے عوام سے استصواب کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس نے پہلے امرا کے مشورے پر کان دھرا، جو ڈھیلے ڈھالے وفاق کے حامی تھے۔ پھر نوکر شاہی سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ مرکزیت کا سلسلہ زیادہ سے زیادہ کڑا رکھنا چاہیے۔

پہلا دستوری تغیر ۱۸۶۰ء میں ہوا، جسے "منشور اکتوبر"؎ کہتے ہیں۔ اس کے مطابق ایک مرکزی قانون ساز مجلس بلائی گئی، جس کے لیے قرار پایا کہ سلطنت میں جتنی صوبائی مجلسیں ہیں (اور وہ امرا پر مشتمل تھیں)، وہ مندوبین بھیجیں اور مرکزی مجلس فوجی و اقتصادی مسائل طے کرے۔ باقی تمام معاملات صوبائی مجلسوں پر چھوڑ دیے گئے۔ یہ انتظام سلطنت کے نہایت اہم غیر جرمن صوبے یعنی ہنگری کو مطمئن نہ کر سکا۔ بڑے بڑے دولتمندوں کو چھوڑ کر میگیار غیر مطمئن تھے اور وہ داخلی خود مختاری کے لیے بدستور مطالبہ کرتے رہے، جو انھوں نے پہلے پہل ۱۸۴۸ء میں کیا تھا۔ انہوں نے محاصل کے لیے ووٹ دینے سے بھی انکار کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ فوجی بھرتی کی منظوری نہ دیں گے۔ فرانسس جوزف کو ہرگز پسند نہ تھا کہ باخ نے تمام صوبوں کے لیے جو یکساں نظام قائم کر دیا تھا، اس میں کوئی خلل پیدا ہو، اگرچہ وہ نظام باخ کی شدتوں میں تخفیف کے لیے تیار تھا۔ اس نے میگیاروں کے لیے خاص سلوک کی خواہش ٹھکرا دی۔ اس اثنا میں اس کا بھروسا امرا پر رہا۔ اسے امید تھی کہ امرا آزاد خیالی کو دبائے رکھیں گے۔

اس کے برعکس آسٹریا کے جرمن لبرل اور نوکر شاہی کے کارفرما محسوس کر رہے تھے کہ منشور اکتوبر میں میگیاروں کو زیادہ

؎ October Diploma

حقوق دے دیئے گئے ہیں۔ انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ امراء کے لیے سلطنت کے ٹکڑے کیے جا رہے ہیں، کیونکہ امراء ہی صوبائی مجالس پر مسلّط تھے۔ ۱۸۶۱ء میں نیا دستور تجویز ہُوا، جسے "فروری کی شاہی سند"[۱] قرار دیا گیا۔ یہ دستور جرمن لبرلوں اور نوکرشاہی کارفرماؤں کے نظریات کے عین مطابق تھا۔ اس میں مرکزیت پر زیادہ زور دیا گیا۔ اب شہنشاہ کا انحصار لبرلوں پر ہو گیا۔ ان کے افکار وہی تھے، جو جرمنوں کی اکثریت کے افکار تھے اور ان کی مخالفت بسمارک نے کی تھی۔ منشور اکتوبر میں جو حقوق صوبائی مجلسوں یا پارلیمنٹوں کے لیے محفوظ رکھے گئے تھے، ان میں سے بھی اکثر امپیریل پارلیمنٹ نے سنبھال لیے۔ صوبائی پارلیمنٹوں کا منصب صرف یہ رہ گیا کہ امپیریل پارلیمنٹ کے لیے مندوب نامزد کر دیا کریں، اگرچہ آگے چل کر ان پارلیمنٹوں کو مقامی انتظامی فرائض سونپ دیئے گئے۔

ان صوبائی پارلیمنٹوں کا انتخاب چار طبقے کرتے تھے، اوّل بڑے مالکانِ اراضی، دوم شہری ایوانہائے تجارت، سوم شہری باشندے، چہارم کسان۔ آخری دو طبقوں کے لیے ضروری تھا کہ خاص درجے کے محاصل ادا کریں۔ ۱۸۵۰ء کے پروشیائی دستور کی طرح یہ آسٹروی دستور بھی شدید تفریق و امتیاز پر مبنی تھا اور اس میں کسانوں کو حقوق رائے دہی سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مزید برآں بوہیمیا جیسے صوبے میں، جہاں شہری لوگ زیادہ تر جرمن اور دیہاتی لوگ زیادہ تر چیک تھے، اس دستور نے دولت مندوں اور جرمنوں کو فائدہ پہنچایا۔ تاہم یہ ۱۹۰۷ء تک قائم رہا۔ یہ جرمنوں کے لیے سازگار اور چیک آبادی کے لیے نقصان رساں تھا۔

میگیاروں نے طبعاً اس دوسرے حل کی مخالفت پہلے سے بھی بڑھ کر کی اور اس میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ ہنگری میں مطلق العنان حکومت قائم کر دی گئی۔ وی آنا میں جرمنوں اور لبرلوں نے اس پر خوشیاں منائیں۔ چیک اور پروشیائی بھی آگے چل کر مرکزی پارلیمنٹ سے دستکش ہو گئے اور اس میں صرف جرمن باقی رہ گئے۔ اس پر پریشان ہو کر شہنشاہ نے یہ نیا دستور بھی معرضِ تعطل میں ڈال دیا۔ اب اس نے میگیاروں سے بات چیت شروع کی۔ میگیاروں کی نمائندگی فرانسس ڈیاک[۲] نے کی، جو بڑا ہوشیار، مگر اعتدال پسند تھا۔ یہ گفت و شنید پروشیا کے ساتھ جنگ کے باعث (۱۸۶۶ء) رک گئی۔ آسٹریا نے سادووا میں شکست کھائی۔ وہ جرمنی سے نکل گیا۔ وینس کے نکل جانے سے پورا ہیپسبرگ نظام معرضِ خطر میں نظر آ رہا تھا۔ فرانسس جوزف نے پھر میگیاروں سے گفت و شنید شروع کی۔ اب اندراسی[۳] نام ایک بڑے میگیار امیر نے گفت و شنید میں ہاتھ بٹایا۔ نیز بوسٹ[۴] مدد دیتا رہا، جو آسٹریا کا وزیرِ خارجہ بن گیا تھا۔ بوسٹ اپنے آپ کو "سرکاری دھوبن" قرار دیتا تھا،

۱۔ February Patent

۲۔ Francis Deak

۳۔ Andrassy

۴۔ Beust

جس کا کام یہ تھا کہ جو گندے کپڑے صدیوں سے جمع ہو رہے تھے، انھیں دھو دھا کر صاف کر دے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک فارمولا تیار ہوا، جس کے مطابق ہیپسبرگوں کی سلطنت پر پہلی عالمی جنگ تک حکمرانی کا سلسلہ جاری رہا اور اسی کے مطابق وہ سلطنت محفوظ رہی۔

دوگونہ بادشاہی ۱۸۶۷ء

یہی مشہور مفاہمت تھی، جس سے آسٹریا ہنگری کی دوگونہ بادشاہی وجود میں آئی۔ ہنگری کے لیے ۱۸۴۸ء کا دستور بحال کر دیا گیا اور پوری سلطنت اشتراک کی بنیادوں پر از سرِ نو منظم ہوئی۔ آسٹریا اور ہنگری شہنشاہ کی ذات میں متحد ہو گئے۔ شہنشاہ کے لیے ضروری تھا کہ مذہباً کیتھولک اور نسلاً ہیپسبرگ کے خاندان کا جائز وارث ہو۔ بوڈاپسٹ میں ایک خاص تقریب کا انتظام کیا گیا اور اس میں شہنشاہ کو ہنگری کا تاج پیش کر دیا گیا۔ خارجہ پالیسی، فوجی معاملات اور مالیات کے لیے دونوں مملکتوں کے وزیر مشترک رکھے گئے۔ انھیں شہنشاہ نامزد کرتا۔ دونوں کے درمیان کسٹمز یونین (کمرکی اتحاد) قائم ہو گئی، جس کی تجدید ہر دس سال کے بعد ہوتی رہی۔ یہ بھی دونوں کے درمیان اتحاد کا ایک رشتہ بن گئی۔ ہر دس سال کے بعد طے ہو جاتا کہ دونوں کو کتنا مشترکہ خرچ برداشت کرنا چاہیے۔ ایک خاص جماعت بنا دی گئی، جس میں ساٹھ رکن آسٹریا کے تھے اور ساٹھ ہنگری کے۔ اس جماعت کے اجلاس باری باری ویآنا اور بوڈاپسٹ میں منعقد ہوتے اور یہی مشترکہ بجٹ کا فیصلہ کرتی۔ پھر دونوں ملکوں کی مشترکہ پارلیمنٹ میں یہ بجٹ منظور کرایا جاتا اور شہنشاہ اس پر دستخط کر دیتا۔ اس جماعت کو تینوں مشترکہ وزیروں پر نگرانی کا اختیار بھی حاصل تھا اور جب چاہتی، وزیروں سے ان کے کاموں کا جائزہ لے لیتی۔ عملاً اس جماعت کے اجلاس شاذ ہی منعقد ہوتے اور پالیسی کے معاملات پر اس سے کبھی کوئی مشورہ نہ لیا گیا۔ یہ نظام ہنگری کے لیے مفید تھا۔ اس کی آبادی سلطنت میں چالیس فی صد تھی، مگر مصارف میں اس سے صرف ایک تہائی حصہ لیا جاتا۔ ہر دس سال کے بعد مصارف کی مقدار اور کسٹمز یونین پر نظرِ ثانی کا فیصلہ ہوتا تو مشترکہ غور و فکر لازم ہو جاتا اور کوئی نہ کوئی نیا بحران پیدا ہو جاتا۔

اس پہلو کو چھوڑ کر ہنگری اور آسٹریا کی مملکتیں الگ الگ تھیں۔ ہنگری کا بادشاہ ہونے کی حیثیت سے فرانسس جوزف وزرائے کابینہ، پروفیسر، بشپ، انتظامی محکمے کے افسر اور دوسرے عہدہ دار مقرر کرتا۔ سال میں کم از کم ایک مرتبہ ہنگری کی پارلیمنٹ کا اجلاس ضرور بلایا جاتا۔ اس میں ایک ایوانِ بالا تھا، جس میں موروثی امراد شریک ہوتے اور ایک ایوانِ زیریں، جس کا انتخاب نہایت پُرپیچ طریق پر ہوتا، اس کے لیے ووٹروں کے پچاس سے اوپر نمونے تھے، لیکن رائے دہی کے لیے قومیت اور اقتصادی حیثیت کے جو معیار مقرر کیے گئے تھے، ان کی وجہ سے ایوانِ زیریں بالکل غیر جمہوری بن گیا تھا۔ رائے دینے والوں کی تعداد آبادی کے چھٹے حصے سے آگے کبھی نہ بڑھتی۔ آسٹریا کی پارلیمنٹ باقی رہی اور اسی طرح ۱۸۶۱ء کی سندِ شاہی کے مطابق سترہ صوبوں کی پارلیمنٹیں بھی بہ دستور قائم رہیں۔ ۱۸۶۷ء کے نئے آسٹروی دستور کے مطابق شہنشاہ کی حیثیت ایک حد تک آئینی بادشاہوں کی سی تھی، صرف ایک بنیادی فرق تھا، یعنی شہنشاہ بطور خود بھی قانون

جا سکتا تھا؛ اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ اختیارات تمیزی حاصل تھے۔

آسٹریا ہنگری کا دوگونہ نظام صرف یورپ ہی میں نہیں، تاریخ میں یگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ اس نظام کی وجہ سے مملکت کے دونوں حصوں کے معاملات پر الگ الگ غور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن حد درجہ اہم اور پُرپیچ مسئلہ دونوں میں یکساں رہا۔ یعنی قومی اقلیتوں کا مسئلہ، جنھیں کبھی داخلی خودمختاری نہ ملی۔ ان میں سے بعض اقلیتیں (چیک، پول اور روتھینی) زیادہ آسٹریا میں تھیں۔ دوسری اقلیتوں (سلوواک اور رومانی) کی بڑی تعداد ہنگری میں مقیم تھی۔ باقی اقلیتیں (کروٹ، سرب، سلووین یہ سب جنوبی سلافی تھے) دونوں مملکتوں میں رہتی تھیں۔ ان کے نشوونما، تعداد اور قومی شعور کے درجے مختلف تھے۔ ان میں سے بعض ان ہم قوموں کے زیر اثر تھیں، جو آسٹریا ہنگری سے باہر رہے تھے۔

۱۸۶۷ء کے آسٹری دستور کے مطابق فیصلہ ہو گیا تھا کہ تمام قوموں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور ہر ایک کو تعلیم، نظم و نسق اور شہری زندگی میں اپنی زبان استعمال کرنے کا حق دے دیا گیا تھا۔ ہنگریوں نے بھی ۱۸۶۸ء میں کوسوتھ اور ۱۸۴۸ء کے انتہاپسند محبان وطن کی جارحانہ حب وطنی سے (کم از کم رسمی طور پر) دست برداری اختیار کر لی تھی اور کتاب آئین میں یہ قانون درج ہو چکا تھا کہ تمام اقلیتوں کو سرکاری معاملات میں ان کی اپنی درسگاہیں ہوں گی، مگر عملاً نہ آسٹریوں نے قوانین کا کوئی احترام کیا اور نہ ہنگریوں نے۔ مختلف قومیتوں کے لیے مختلف درجوں کا امتیاز جاری رہا اور بعض پر سختیاں بھی ہوئیں۔ چونکہ قومیتوں کا مسئلہ آسٹریا اور ہنگری کے درمیان مشترک تھا اور اسی وجہ سے یہ دوگونہ بادشاہی اختتام کو پہنچی، لہٰذا اس کا جائزہ تفصیلاً لے لینا چاہیے۔

چیک

۱۸۶۷ء کے بعد چیکوں نے، جو قومیت کے احساس میں بہت بڑھے ہوئے تھے، محسوس کیا کہ انھیں بھی ویسی ہی مفاہمت کا حق ہے، جیسی میگیاروں نے حاصل کر لی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ سینٹ وینسلاس[1] (متوفی ۹۲۹ء) کے تاج کی زمینوں (جن سے ان کی مراد بوہیمیا، موراویا اور آسٹری سلیشیا کے صوبے تھے) کو ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جن کا دعویٰ میگیاروں نے سینٹ سٹیفن[2] (۹۹۹ء ـ ۱۰۳۸ء) کے تاج کی زمینوں کے لیے کامیابی سے کیا۔ یہ دلیل تاریخی اعتبار سے غیر محکم تھی۔ نیز چیکوں کو وہ قوت کبھی حاصل نہ ہوئی اور وہ موقع کبھی نہ ملا، جو میگیاروں کو آسٹریوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے مل گیا تھا۔ مفاہمت کے بعد بعض چیک لیڈر روس پہنچے اور انھوں نے روسی اخبار نویسوں کے اس پروپیگنڈے کی پُرجوش ستائش کی، جو کہتے تھے کہ تمام سلافی قوموں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ سلافیوں کے اس اتحاد کو انھوں نے حکومت وی آنا پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک حربہ بنا لیا۔ چیک نمائندوں نے بھی آسٹری پارلیمنٹ سے اس امید پر مقاطعہ کر لیا کہ فرانسس جوزف

---

۱ St Wenceslaus

۲ St. Stephen

اسی طرح پراگ میں بوہیمیا کا بادشاہ بننے پر راضی ہو جائے گا، جس طرح بوڈاپسٹ میں وہ ہنگری کا بادشاہ بننے پر راضی ہو چکا تھا۔

سنہ ۱۸۷۱ء میں شہنشاہ نے بوہیمیا میں تاجپوشی کی پیشکش کی۔ بوہیمیا کی پارلیمنٹ نے ـــــ جس میں سے تمام جرمن بحالت غیظ و غضب الگ ہو گئے تھے ـــــ ایسی تجاویز تیار کر لیں، جن کے مطابق دوگونہ بادشاہی سہ گونہ بن جاتی اور ویسے ہی انتظامات کر لیے جاتے، جیسے میگیاروں کے سلسلے میں کر لیے گئے تھے، مگر آسٹریا اور بوہیمیا کے جرمنوں کا غیظ و غضب اور میگیار لیڈروں کی مخالفت آڑے آئی جنھوں نے پیشگوئی کی کہ اس طرح افراتفری پھیل جائے گی۔ ساتھ ہی جنوبی آسٹریا میں سلافیوں نے بغاوت کر دی۔ اس وجہ سے فرانسس جوزف کی رائے بدل گئی۔ اس نے وہ وزیر برطرف کر دیئے، جو چیکوں کی پیش کش کے حامی تھے اور معاملہ ختم ہو گیا۔ چیکوں کے قوم پرور لیڈروں کو اس سے سخت مایوسی ہوئی اور وہ پرامن مزاحمت پر نئے سرے سے آمادہ ہو گئے۔

سنہ ۱۸۷۹ء میں چیک، سند وب دی آنا کی پارلیمنٹ میں شامل ہوئے۔ اس وقت تک ان میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ ایک گروہ اعتدال پسند چیکوں کا تھا اور دوسرا انتہا پسند چیکوں کا۔ "اعتدال پسند چیک" امراء اور مذہبی طبقے کی سرپرستی میں خود مختاری چاہتے تھے۔ "انتہا پسند چیک" زیادہ پُرجوش تھے۔ وہ جمہوری اصول اور آزاد نظریات کے حامی تھے۔ چاہتے تھے کہ آسٹریا کی خارجہ پالیسی کا رجحان فرانسیسیوں اور روسیوں کی طرف ہو۔ جرمنوں کی مخالفت کے باوجود چیکوں نے ثقافتی اور سیاسی فائدے حاصل کر لیے۔ مثلاً یہ کہ چیکوں کی سرزمینوں میں جتنے سرکاری افسر اور جج ہیں وہ تمام سرکاری کاروبار اور مقدمات کی کارروائیاں درخواست گزاروں کی زبان میں کریں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے جرمن کارکنان انتظامیہ کو چیکوں کی زبان سیکھنی پڑتی۔ بہت سے چیک افسر جرمن زبان جانتے تھے۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ انتظامیہ میں چیکوں کی تعداد بڑھ گئی اور تجربہ کار چیک افسروں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔

انیسویں صدی کے نویں عشرے میں بوہیمیا کے اندر چیکوں اور جرمنوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی۔ جرمنوں نے بوہیمیا کی پارلیمنٹ کا کچھ مدت کے لیے مقاطعہ جاری رکھا۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں دی آنا کی وزارت اور اعتدال پسند چیکوں کے درمیان بوہیمیا کے انتظامی معاملات کے متعلق عارضی مفاہمت ہو گئی۔ اس میں چیکوں اور جرمنوں، دونوں کے نقطۂ نگاہ پیش نظر تھے، مگر آئندہ انتخابات میں انتہا پسند چیکوں نے بڑی اکثریت حاصل کر لی اور جب انتظامی تقسیم کا مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو انھوں نے پارلیمنٹ کے اندر ہنگامہ بپا کر دیا۔ حکومت نے تشدد شروع کر دیا اور پراگ میں حالت محاصرہ پیدا ہو گئی۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں دی آنا کی نئی وزارت کو چیکوں کے ووٹ کی ضرورت پڑی تو محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ زبان کے متعلق قوانین کو وسعت دے کر فیصلہ کر دیا گیا کہ جو سرکاری ملازم سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد چیکوں کی سرزمینوں میں مقرر ہوں، ان کے لیے دو زبانیں جاننا ضروری ہو گا۔ ان نئی مراعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنوں نے پارلیمنٹ میں ہنگامہ بپا کر دیا۔ ڈوال کی نوبت آئی۔ اخباروں

میں سخت مضامین لکھے گئے۔ سیاہی کی دواتیں ایک دوسرے پر پھینکی گئیں اور سیٹیاں بجائی گئیں۔ ویانا کی پارلیمنٹ میں بھی غل غپاڑا شروع ہوا تو حکومت مستعفی ہو گئی۔ پراگ میں پھر ایک دفعہ مارشل لا لگا دیا گیا۔ انتہا پسند چیکوں نے روس اور سلافی اتحاد کے نعرے لگائے، بلکہ یہ صدا بھی بلند ہوئی کہ تمام سلاطین کو مل کر جرمنوں سے آخری فیصلہ کر لینا چاہیے۔ جرمن انتہا پسندوں نے اس پر مضطرب ہو کر پراگ کو مغربی ماسکو قرار دے دیا۔ مفاہمت کی تمام تدبیریں ناکام رہیں۔ بیسویں صدی کے موڑ پر چیکوں کے متعلق اعتدال پسندی محو ہونے لگی۔ جرمن اور چیک انتہا پسند ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور ہنگامے کے پیکر بن گئے۔ کسی پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد نہ ہو سکتا اور آسٹروی حکومت کا کاروبار شاہی فرامین کے مطابق چلتا رہا۔

طویل ایجی ٹیشن اور روس میں دستوریت کی ظاہری کامیابی سے متاثر ہو کر فرانسس جوزف نے بھی معیار رائے کی اصلاح کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۰۷ء میں طبقہ بندی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آسٹروی سرزمین کے تمام مردوں کو حق رائے مل گیا اور وہ اپنی قومیت کے مندوبوں کو ووٹ دے سکتے تھے۔ نئی پارلیمنٹ کے لیے پانچ سو سولہ مندوب رکھے گئے۔ ان میں سے دو سو تینتیس جرمن اور ایک سو سات چیک تھے (باقی مندوب دوسری قوموں میں سے تھے)۔ دو سو تینتیس اور ایک سو سات کا تناسب جرمنوں اور چیکوں کے اعداد آبادی کے عین مطابق تھا۔ نئے نظام کے مطابق انتخابات ہوئے تو انتہا پسند چیکوں کی حیثیت گر گئی اور ظاہر ہو گیا کہ عوام عمرانی مسائل کا خیال بھی اتنا ہی رکھتے ہیں، جتنا قومی مسائل کا۔

۱۹۱۳ء میں بوہیمیا کی پارلیمنٹ ایک فوری اقدام کی بنا پر توڑ دی گئی۔ ۱۹۱۴ء میں آسٹروی پارلیمنٹ کے چیک مندوبین نے قومی کاروبار میں مزاحمت پیدا کر دی۔ یوں لڑائی شروع ہوئی، اُس وقت بوہیمیا اور آسٹریا دونوں کی پارلیمنٹیں ختم تھیں۔ شہنشاہ اور ان کے وزیر بطور خود حکومت کا کاروبار چلاتے تھے۔ عام پارلیمانی کاروبار میں خلل کے بہت سے وجوہ میں غالباً بڑی وجہ یہ تھی کہ چیک صوبوں کو خود مختاری نہ دی گئی، جس کے لیے وہ ۱۸۶۷ء سے مطالبے کر رہے تھے۔ اکثر چیک نہیں چاہتے تھے کہ سلطنت سے منقطع ہوں اور اپنی جداگانہ حکومت بنا لیں۔ بینش[1] بھی ـــ جس نے آگے چل کر چیکوسلواکیہ کی جمہوریت کی بنیاد رکھی ـــ یہی کہتا تھا کہ چیکوں کے مطالبات ہیپسبرگ بادشاہی کے اندر کسی نہ کسی صورت میں پورے کیے جا سکتے تھے۔ وہ آسٹروی آبادی کا تینتیس فی صد تھے اور بے اطمینانی کا سرچشمہ بنے رہے۔

سیاسی معاملات سے قطع نظر چیکوں نے سلطنت میں خوشحالی پائی تھی۔ اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے وہ آسٹریا اور ہنگری دونوں مملکتوں میں تمام دوسرے سلافی گروہوں کے مقابلے میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ ۱۹۰۰ء تک سکوڈا[2] کا نہایت مشہور کارخانۂ اسلحہ سلطنت میں سب سے بڑا کارخانہ بن چکا تھا اور جرمنی کے کارخانۂ کرپس[3] کا حریف سمجھا جاتا تھا۔ پھر چینی اور

---

1. Benes
2. Skoda
3. Krupps

وسطی اور مشرقی یورپ کی اقوام کے علاقے



شیشے کا سامان، فیتے اور شراب، کھانڈ اور سیاحوں کی آؤ بھگت کی بدولت چیکوں کا طبقۂ اوسط بہت دولت مند بن گیا تھا اور چیک دستکاروں نے خاص شہرت حاصل کر لی تھی، البتہ مزدوروں کی حالت خراب تھی۔ چیک قوم میں سے جو لوگ سوشل ڈیموکریٹ تھے، وہ کمزور ہو گئے، کیونکہ انھوں نے جرمن ہمنواؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے انکار کر دیا۔ چیکوں کی خاصی تعداد نقل وطن کر کے ریاستہائے متحدہ امریکہ چلی گئی۔ دوسرے چیک قصبوں میں جمع ہو گئے۔ اس طرح جن قصبوں میں جرمنوں کی آبادی زیادہ تھی، ان میں چیکوں کی آبادی زیادہ ہو گئی۔

چیکوں کی قومیت کو فروغ دینے کے کئی عوامل تھے، مثلاً چیک زبان کے اخبار، محبان وطن چیکوں کی انجمنیں، درسگاہیں اور میلے میں سب سے بڑھ کر شہرت "سکولز"[1] (عقاب) نے پائی۔ یہ جسمانی تربیت کی ایک انجمن تھی۔ اس میں قومی رجحانات پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ پراگ کی قدیم یونیورسٹی میں جو چیک فضلاء پروفیسر تھے، ان میں سے ٹامس مساریک[2] نے بہت شہرت پائی۔ وہ فلسفے کا پروفیسر تھا۔ سلافی ثقافت کا مطالعہ کرتا رہا اور مغربی طور طریقوں سے اسے بڑی محبت تھی اور ایک امریکی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طلبہ پر گہرا اثر ڈالا۔ سیاسیات میں وہ جمہوریت کا پرجوش حامی تھا۔ جو لوگ تاریخ کا ذوق رکھتے تھے، انھوں نے چیکوں کے پرانے بہادرانہ کارناموں کو از سر نو مرتب کر دیا۔ شاعروں، ناول نگاروں اور موسیقاروں نے چیکوں کی پرانی تاریخ کو عوام کے روبرو بڑے شاندار انداز میں پیش کیا۔ اگرچہ وہ لوگ قومی خودمختاری سے محروم تھے اور جرمنوں کے تعصب کا شکار رہے، مگر انھیں مظلوم اقلیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی اپنی زبان اور آسٹروی اقتدار کے ماتحت نشوونما و ارتقاء کی پوری آزادی حاصل تھی۔ پولستانی اور روتھینی آسٹریا کی تمام اقلیتوں میں سے اول سب سے بڑھ کر مطمئن تھے۔ ان کی بڑی تعداد گلیشیا میں رہتی تھی۔ وہاں وہ بڑے بڑے مالکان اراضی تھے اور عموماً کسانوں پر سختیاں کرتے رہے، خصوصاً پسماندہ روتھینیوں (یوکرینیوں) پر۔ اگرچہ چیکوں کی طرح گلیشیا کے پولستانیوں نے بھی میگیاروں کے نمونے کی صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا تھا اور چیکوں کی طرح ان کا مطالبہ بھی ٹھکرا دیا گیا، تاہم انھیں اتنے حقوق حاصل تھے کہ یورپ بھر میں پولستانیوں کا ایک ہی مطمئن طبقہ تھا اور وہ گلیشیا کے پولستانی تھے۔ ان کے اپنے سکول تھے۔ انتظامیہ اور عدلیہ میں پولستانی زبان استعمال ہوتی تھی۔ مالی انتظامات بھی ان کے لیے سازگار تھے۔ ۱۸۷۱ء کے بعد وی آنا میں گلیشیا کے لیے ایک خاص وزارت قائم کر دی گئی۔

گلیشیا کے پولستانیوں سے جو فیاضانہ سلوک ہوتا تھا، اس کے مقابلے میں پروشیا اور روسی پولینڈ کے پولستانیوں کو سخت وحشت کا ہدف بننا پڑا، اس لیے ہر مقام کے پولستانیوں کے نزدیک آسٹروی گلیشیا ان کی قومی زندگی اور ثقافت کا مرکز بن گیا۔

---

[1] Sokols

[2] Masaryk

دوسرے مقامات کے ظلم وجور سے تنگ آکر پولستانی کراکو[1] اور لیمبرگ[2] کے شہروں میں پناہ لیتے رہے، جہاں بڑی شاندار پولستانی یونیورسٹیاں تھیں۔ امیر گھرانے بڑی شان وشوکت کی زندگیاں بسر کرتے تھے اور انھیں صوبائی نظم ونسق میں تاج کی خدمت انجام دینے کے سیاسی مواقع حاصل تھے۔ یونیورسٹیوں نے پولستانیوں کی نسلوں کو ایسی تربیت دی کہ جب پولینڈ آزاد ہوا تو وہ نئے ملک کی خدمت کے لیے تیار ہو گئے۔ پولستانی ادب اور پولستانی تاریخ کو فروغ حاصل ہوا۔ صنعت وحرفت کی بھی ابتدا ہو گئی، اگرچہ رفتار سست تھی۔ پٹرول کی صنعت نے بھی امید افزا حیثیت حاصل کر لی۔ صرف روتھینیوں اور یہودیوں کو امتیاز کا نشانہ بننا پڑا اور مشکلات پیش آتی رہیں۔

پولستانیوں نے روتھینیوں کو گلیشیا کی پارلیمنٹ سے حذف کر دیا اور مدتوں تک امپیریل پارلیمنٹ سے باز رکھا۔ وہ لوگ خود بھی دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ قدیم روتھینیوں کا تھا، جو روس کی طرف مائل تھے۔ ان کے برعکس نوجوانوں کا گروہ تھا، جنھیں یوکرینی قوم پرست کہنا چاہیے۔ وہ بڑے سخت تھے۔ پولستانیوں اور روسیوں دونوں سے یکساں نفرت کرتے تھے۔ انھیں امید تھی کہ آسٹروی بادشاہی کے ماتحت خودمختاری کا درجہ مل جائے گا۔ ۱۹۰۷ء میں نیا قانونِ رائے منظور ہوا تو روتھینیا کے ستائیس مندوب وی آنا کی پارلیمنٹ میں شامل ہوئے۔ یہ سب کے سب پولستانیوں کے خلاف تھے اور ان میں سے بائیس پانچ کی مخالفت کر رہے تھے، جو روس کی طرفداری کا دم بھرتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں ایک یوکرینی گلیشیا نے پولستانی گورنر کو قتل کر دیا۔ یہ واقعۂ قتل پولستانی پولیس کی وحشت کے ایک خوفناک کارنامے کا نتیجہ تھا۔ غرض پولستانی اقلیت آسٹریا کی آبادی کا اٹھارہ فی صد حصہ تھی۔ وہ لوگ اطمینان سے رہتے تھے۔ تاج کے وفادار تھے۔ روتھینی کاشتکاروں پر بڑی سختیاں کرتے تھے۔ انھیں روس سے نفرت تھی اور چیکوں کے برعکس سلافی اتحاد میں بھی ان کے لیے کوئی رغبت نہ تھی۔ لہٰذا ایک آزاد پولینڈ میں انھوں نے کبھی زیادہ دلچسپی نہ لی۔

آسٹریا کی دوسری اقلیتیں

آسٹریا کی دوسری اقلیتوں میں سے اطالویوں اور جنوبی سلافیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ۱۹۱۰ء میں اطالوی پوری آبادی میں تین فی صد سے بھی کم تھے۔ جنوبی سلافی تقریباً ساڑھے چار فی صد، سرب اور کروٹ بھی تین فی صد سے کم تھے۔ جنوبی ٹائیرول[3] اور اسٹریا[4] کے اطالویوں کو تعداد کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور ان کا مرکز ٹریسٹ کی بندرگاہ تھی۔ اہمیت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ سرحد پار اٹلی کی بادشاہی قائم تھی۔ وہ سب اٹلی میں شامل ہو جانے کے آرزومند تھے اور ان کی سرزمینیں اٹلی کے ان حصوں میں شمار ہوتی تھیں جنھیں واپس مل جانا چاہیئے تھا، مگر نہ ملیں۔ اگرچہ اطالوی حکومت ان لوگوں کے پروپیگنڈے کو روکنے کی کوشش کرتی رہی، مگر وی آنا اور روما

---

[1] Cracow
[2] Lemberg
[3] Tyrol
[4] Istria

کے درمیان تعلقات اس وقت تک کشیدہ رہے، جب تک ۱۸۸۲ء میں "اتحاد سہ گانہ"[1] قائم نہ ہوگیا۔ اس کے بعد بھی اطالویوں کا مطالبہ آسٹریا اور اٹلی کے درمیان کشیدگی کا باعث بنا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑی تو اس وقت اطالوی سرکاری ملازمتوں سے محروم تھے۔ مارشل لا اور شدید احتساب اطالوی خطوں پر قائم تھا۔ تمام اقلیتوں میں سے اطالوی ہی تھے، جو مستقل طور پر ہیپسبرگ بادشاہی سے باہر نکل جانے کے زیادہ خواہاں ثابت ہوئے۔

خاص آسٹریا میں جنوبی سلافی باشندے سب سے بڑھ کر مطمئن تھے۔ وہ چھ صدیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اکثر جرمن یا اطالوی ہمسایوں سے انھیں مخالفت رہتی اور ان کے مطالبے عموماً مقامی حیثیت کے ہوتے، مثلاً یہ کہ گراز[2] یونیورسٹی میں لیکچر دیئے جائیں تو جنوبی سلافیوں کی زبان استعمال ہو۔ آسٹریا میں کروٹوں کی تعداد کم تھی اور وہ زیادہ تر ڈلمیشیا میں رہتے تھے۔ وہ اپنے اُن ہم قوموں کے مقابلے میں کم غیر مطمئن تھے، جو ہنگری میں رہتے تھے۔ آسٹریا میں صربوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ وہ بھی ہنگری اور بوسنیا کے صربوں کے مقابلے میں ایک حد تک مطمئن تھے، تاہم آسٹروی صرب اور کروٹ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض سلطنت کے اندر خود اختیاری کو ترجیح دیتے تھے۔ بعض کی نظر دور مستقبل پر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جنوبی سلافوں کی ایک مستقل حکومت قائم کی جائے (یوگوسلافیہ، جس کا وہ ایک حصّہ ہوں)

ہنگری میں اقلیتیں
سلواک، رومانی اور جنوبی سلاف

ہنگری میں اقلیتوں کا مسئلہ زیادہ نازک صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ پُرجوش اور نافہم میگیاروں کی روش دوسرے قومی گروہوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ بُری ہوتی گئی اور کوتاہ اندیش تقریربازوں کا زور دیکھ کر اعتدال پسندانہ مشورے کم ہوتے گئے۔ جو سلواک، رومانی، صرب اور کروٹ خاص ہنگری میں رہتے تھے، وہ بُری طرح میگیاریت کی پالیسی کے نشانے بنے۔ کروٹ کروشیا میں بھی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، جو اُن کا صوبہ تھا اور جہاں انھیں خاص دستوری درجہ حاصل تھا۔ میگیاروں کا اصل مقصد یہ تھا کہ تمام قومیتوں کی اصل حیثیت ختم کر کے انھیں میگیار بنا لیا جائے۔ اس غرض سے انھوں نے زبان کا حربہ استعمال کیا۔

یہ سمجھنا غالباً مشکل ہے کہ جنوبی یورپ کے پسماندہ کسانوں کو اپنی زبانوں سے کتنی گہری وابستگی تھی۔ وہ اقتصادی مواقع اور بعض اوقات مذہبی آزادی بھی کھو چکے تھے۔ اُنیسویں صدی میں انھیں یہ احساس ہوا کہ زبان ان کا نہایت قیمتی خزانہ ہے اور ہنگری کے صوبہ ٹرینسلوینیا[3] میں یہی چیز ان کی آبادی کا آخری نشان تھی۔ میگیار کروشیا کو خارج کرتے ہوئے ہنگری میں صرف

---

[1] Triple Alliance، اس سے مراد ہے۔ اٹلی، آسٹریا ہنگری اور جرمنی کا اتحاد۔

[2] Graz

[3] Transylvania

بچپن فی صد تھے۔ انھیں بھی اپنی زبان سے بے پناہ عقیدت تھی، جو ایک ایشیائی زبان تھی اور جرمن، سلافی یا رومانی زبانوں سے اسے کوئی علاقہ نہ تھا۔ انھوں نے چاہا کہ اپنی زبان کو جبراً محکوم اقوام کی روزانہ زندگی کا جزو بنا دیں، خصوصاً تعلیم میں۔ چنانچہ ہر سکول میں، جسے حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی، لازم تھا کہ تعلیم کنڈر گارٹن سے یونیورسٹی تک میگیاری زبان میں ہو۔ ڈاک، تار اور ریلوے میں بھی یہی زبان استعمال ہوتی تھی۔

سلواک ہنگری کی آبادی میں گیارہ فی صد تھے۔ انھیں غالباً زیادہ سے زیادہ میگیاری بنا لیا گیا تھا۔ وہ غریب کسان تھے۔ جو لوگ کوئی اچھی حیثیت پیدا کرنا چاہتے، وہ میگیاری زبان کو اپنا لیتے۔ کوسوت خود پیدائشی سلواک تھا اور میگیاریت پر اصرار میں وہ کسی کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ۱۸۷۵ء میں میگیاروں نے سلواکیوں کی ایک ثقافتی انجمن توڑ دی، جو مفاہمت سے پیشتر بنائی گئی تھی اور بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں سلواک زبان کے لیے کوئی پروفیسر رکھنے کی اجازت نہ دی وقت گزرتا گیا۔ چند سلواک ان چیکوں سے قریب تر ہوگئے، جو آسٹریا میں رہتے تھے اور بہت ترقی یافتہ تھے۔ مساریک خود جزواً سلواک تھے۔ جو خیالات کے اعتبار سے عموماً لبرل اور مذہباً پروٹسٹنٹ تھے۔ کیتھولک اور قدامت پسند سلواک صدی کے آخر تک ایک مذہبی پیشوا پادری ہلنکا[1] کو اپنا لیڈر مانے بیٹھے رہے، جو چاہتا تھا کہ سلواکوں کو چیکوں کے بغیر خود اختیاری حکومت مل جائے۔ ۱۹۱۸ء میں چیکوسلواکیہ کی جمہوریت قائم ہوگئی۔ اس وقت سے چیکوں کی مخالفت شروع کر دی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد یہ تحریک ہٹلر کی حامی بن گئی۔ اگرچہ بہت سے سلواکوں نے میگیاری زبان سیکھ لی تھی اور وہ ہر لحاظ سے میگیار بن گئے، مگر باقی سلواکوں کے قومی نصب العین پر جمے رہے۔ ان میں اس بنا پر اختلاف پیدا ہوگیا کہ سلواکوں کا نصب العین کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کرنا چاہیے۔

جو رومانوی ٹرینسلوینیا میں رہتے تھے، ۱۹۱۰ء میں وہ ہنگری کی آبادی کا ساڑھے سولہ فی صد حصہ تھے اور ٹرینسلوینیا میں انھیں اکثریت حاصل تھی۔ میگیاروں نے انھیں صدیوں تک دبائے رکھا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنا آرتھوڈکس مذہب تسلیم کرایا۔ ان میں سے اکثر بہتر سلوک کی امید پر "یونی ایٹ"[2] بن گئے، یعنی رومہ کی برتری قبول کرلی، مگر طریق عبادت اپنا رکھا۔ رومانی زبان کے استعمال کو روکنے کے لیے عجیب و غریب قوانین کا ایک سلسلہ منظور کیا گیا، تاہم رومانی دوسری قوموں میں جذب نہ ہوئے۔ شکایات کی تلافی کے لیے اکثر وی آنا پر نظریں جمائے رہے، جو مفاہمت سے پیشتر میگیاروں کے خلاف امداد کا سرچشمہ بنا رہا تھا، مگر اب اس نے میگیاروں کو آزادی دے دی تھی۔ ان رومانیوں کو امید تھی کہ ٹرینسلوینیا اسی طرح خود مختار ہو جائے گا، جس طرح زمانہ ماضی میں تھا، چنانچہ ۱۸۶۸ء میں انھوں نے ہنگری قومیتوں کا لبرل قانون جاری کرانے

---

[1] Hlinka

[2] Uniates ، اس سے مراد یونانی کلیسا کے وہ لوگ ہیں، جو پوپ کی برتری تسلیم کریں، مگر طریق عبادت اپنا قائم رکھیں۔

کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ دوسری زبانوں اور کلیساؤں کی طرح اُن کی زبان اور ان کے کلیسا کو بھی تسلیم کرلیا جائے۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے ایک درخواست دی آنا بھیجی، جو ان نکات پر مشتمل تھی۔ ساتھ ہی لکھا کہ ان کے ساتھ مفتوح لوگوں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ ان کی درخواست کھولے اور پڑھے بغیر واپس کردی گئی۔ جب انھوں نے اس درخواست کا ترجمہ کرکے بیرونی اخباروں میں شائع کردیا تو ان کے لیڈروں پر مقدمے چلائے گئے اور انھیں قید کی سزائیں دی گئیں۔ چنانچہ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ٹرینسلوینیا میں رہنے والے رومانیوں نے امداد کے لیے دی آنا کی طرف نہیں، بلکہ جنوب اور مشرق کی طرف دیکھنا شروع کردیا، یعنی ان کی نظریں کوہستان کارپیتھین کے پار رومانیہ پر جم گئیں، جہاں ان کے ہم قوموں کی ایک مستقل بادشاہی تھی اور وہ ٹرینسلوینیا کا الحاق چاہتے تھے۔ گویا رومانیہ کے باشندے ٹرینسلوینیا کے متعلق وہی جذبات رکھتے تھے، جو اٹلی کے بازیافتہ حصوں کے متعلق اطالوی قوم پرستوں کے تھے۔

میگیاروں کی حکومت کے ماتحت بعض صرب اور کروٹ ہنگری میں اور بعض کروشیا میں رہتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں ہنگری کے کروٹوں اور صربوں کی تعداد چھ لاکھ تھی، جن میں سے دو تہائی صرب تھے۔ وہ جنوبی اور مغربی سرحدی علاقوں میں یکجا رہتے تھے۔ گویا ان علاقوں کے باشندے تھے، جو ترکوں کے خلاف ہیپسبرگوں کی فوجی سرحد میں تھے۔ ۱۸۶۹ء میں انھیں میگیاروں کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ اس پر وہ سخت ناراض ہوئے، خصوصاً صربوں کو ہنگری کے نظم و نسق سے نفرت تھی۔ وہ اپنی خودمختار حکومت سرویا (صربیا) کی طرف دیکھ رہے تھے، جو جنوبی سمت واقع تھی۔ انھیں میگیاروں کی پالیسی کا ویسا خطرہ نہ تھا، جیسا سلواکوں اور رومانیوں کو تھا۔ ہنگری میں رہنے والے صربوں کے اپنے اخبار تھے اور ۱۸۹۰ء کے بعد انھوں نے اپنی ایک خفیہ انجمن بنالی تھی، مگر ہنگری کے اتحاد کے لیے بدرجہا بڑا خطرہ کروشیا نے پیدا کیا۔

چھتیسواں باب

ہیپسبرگ خاندان کی بادشاہی

(۲)

۱۸۵۰ء - ۱۹۱۴ء

کروشیا اگرچہ کروٹ گیارھویں صدی سے تاج ہنگری کے ساتھ تھے، لیکن نپولین کے زیر تصرف ان میں زبردست قومی روح پیدا ہو گئی۔ ۱۸۴۹ء میں میگیار باغیوں کے خلاف وہ بادشاہی کے ساتھ ہو کر لڑ چکے تھے۔ بہ ایں ہمہ فرانسس جوزف نے (میگیاروں سے) مفاہمت کے سلسلے میں انھیں پھر میگیاروں ہی کے حوالے کر دیا۔ اس پر کروٹ قوم پروروں کو سخت مایوسی ہوئی۔ انھیں مشہور رومن کیتھولک بشپ سٹروس میئر[1] کی سرگروگی میں سلطنت کے اندر داخلی اعتبار سے خود مختار کروشیا اور ڈلمیشیا کی امید تھی، جو آئندہ کے لیے تمام جنوبی سلافیوں کو اپنی طرف کھینچنے کا مرکز بن جائے گا۔ بشپ سٹروس میئر بڑا دانشمند، دور اندیش، فاضل اور آزاد خیال آدمی تھا۔ اعتدال پسند میگیاروں نے دیاک کی زیر قیادت ۱۸۶۸ء میں ہنگری اور کروشیا کے درمیان مفاہمت کرا دی۔

اس مفاہمت کے مطابق تمام فوجی اور اقتصادی معاملات ایک خاص وزیر کے حوالے ہو گئے، جو بوڈاپسٹ میں رہتا تھا اور اسے کروشیا کے معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ کروٹوں کا مرکز "زغرب[2]" تھا، مگر بوڈاپسٹ میں کروٹوں کے معاملات زیر بحث آتے تو کروٹوں کی پارلیمنٹ کے نمائندے بوڈاپسٹ پہنچ جاتے۔ ان اجلاسوں میں کروٹ نمائندوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی زبان استعمال کریں! اور جو علاقائی فوج کروشیا میں رکھی جاتی تھی وہ بھی کروٹوں ہی کی زبان استعمال کرتی۔ ان کے تعلیمی نظام، کلیساؤں، عدالتوں اور پولیس میں بھی انھیں کی زبان ضروری قرار پائی۔ لیکن محاصل کا فیصلہ بوڈاپسٹ میں ہوتا اور بوڈاپسٹ ہی کے کارندے محاصل فراہم کرتے۔ اگرچہ ہنگری کی تمام اقلیتوں میں سے کروٹوں کی حالت بدرجہا بہتر تھی، مگر یہ مفاہمت انھیں مطمئن نہ کر سکی۔

دائیں بازو کی پارٹی ـــــ جو ہمارے زمانے میں کروٹوں کی انتہا پسندی کی نمائندہ بن گئی ـــــ کروٹوں کے لیے کامل

---

[1] Strossmayer

[2] Zagreb

داخلی خود مختاری کی خواہاں تھی۔ وہ صربوں اور جنوبی سلافیوں میں سے دوسرے غیر کیتھولکوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی، جنھیں سٹروس میئر اپنی طرف کھینچ لینے کا متوقع تھا۔ فیوم[1] کی بندرگاہ نے کشمکش کا ایک اور سامان پیدا کر دیا۔ یہ بندرگاہ ہنگریوں نے اصل مفاہمت کی غلط تعبیر سے قبضے میں لے لی تھی۔ فیوم کی بندرگاہ کو میگیاروں نے آسٹریا کی ہمسایہ بندرگاہ ٹریسٹ کا حریف بنا دیا۔ کروٹ برابر سمجھتے رہے کہ فیوم ان کی بندرگاہ ہے، جو اُن سے چھین لی گئی ہے

کیتھولک کروٹیا میں صربوں کی آرتھوڈکس اقلیت موجود تھی (پوری آبادی میں ان کا تناسب ایک چوتھائی سے زیادہ تھا۔ اس اقلیت نے جو کروٹوں ہی کی زبان بولتی تھی اور نسلاً بھی ان سے ممتاز نہ تھی، مزید مصائب پیدا کر دیئے۔ یہ اقلیت جداگانہ گرجوں میں عبادت کرتی تھی، اس لیے اسے مذہبی امتیاز کا ہدف بننا پڑا۔ اُنیسویں صدی کے اختتام پر بیس سال ہنگریوں کا مقرر کیا ہوا گورنر بڑی ہوشیاری سے صربوں اور کروٹوں کے درمیان عداوت پیدا کرتا رہا۔ وہ عموماً صربوں کو مقامی دفتروں میں ملازم رکھ لیتا۔ صرف وہی کروٹ اس کی حمایت کرتے، جو میگیاروں کی زبان اختیار کر چکے تھے۔ یہ بڑے بڑے مالکان اراضی یا سرکاری افسر تھے، لیکن انتہا پسند کروٹ قوم پرور لیڈر قید ہوتے رہے۔ کروٹوں اور صربوں کے درمیان ہنگاموں کے باعث بار بار بدنظمی پیدا ہوتی رہی۔ ۱۹۰۰ء کے قریب ستیپاں رادیخ[2] نے کسان پارٹی کی بنیاد رکھی۔ یہ پارٹی ہنگری سے تعلقات منقطع کر لینے کی حامی تھی کہ کسانوں کو عمرانی آزادی مل جائے اور میگیاری وضع کی بڑی بڑی زمینداریاں ختم ہو جائیں۔

۱۹۰۳ء کے قریب صرب اور کروٹ ہنگری کی حکمرانی کے خلاف تعاون کرنے لگے اور ڈلمیشیا میں سلافی پروپیگنڈا پھیل گیا۔ پراگ نے جنوبی سلافیوں کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ بہت سے صرب اور کروٹ طالب علم پراگ کی یونیورسٹی میں تعلیم پاتے تھے، وہ سب مساریک کے جمہوری اور قوم پرورانہ نظریات سے متاثر ہو کر آتے۔ فیوم میں قراردادیں منظور ہوئیں (۱۹۰۵ء)، جن میں کروٹوں نے وی آنا سے مطالبہ کیا کہ ڈلمیشیا انھیں دے دیا جائے اور انتخابی نظام کی اصلاح کی جائے۔ ساتھ ہی واضح کر دیا کہ ہنگری سے جو مفاہمت ۱۸۶۸ء میں ہوئی تھی، اس پر وہ خلوص سے قائم رہیں گے۔ صربوں نے کروٹوں کے ان مطالبات کی تائید کی، اگرچہ بعض صرب خود مختار سرویا سے الحاق کے آرزومند تھے اور بعض کروٹ کامل آزادی چاہتے تھے۔

۱۹۰۷ء میں ریلوے کے ملازمین کا قانون بنا، جس کے مطابق فیصلہ ہو گیا کہ تمام ریلوے کارکنوں کو میگیاری زبان بولنی چاہیے۔ یہ قانون حد درجہ غیر ہر دلعزیز تھا۔ اس نے اعتدال پسندوں کی تمام امیدوں کا خون کر دیا۔ کروٹوں نے ہنگری کے

---

[1] Fuime بحیرہ ایڈریاٹک میں ڈلمیشیا کی مشہور بندرگاہ، جو ٹریسٹ کے پاس جنوب میں ہے۔

[2] Stepan Radieh.

سامان کا مقاطعہ کیا اور ان کی پارلیمنٹ نے نئے گورنر کے ساتھ تعاون سے انکار کر دیا، جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک بطور خود کام کرتا رہا۔ ۱۹۰۹ء میں اس نے پچاس کے قریب کروٹ اور صرب گرفتار کر لیے اور ان پر الزام عائد کیا کہ وہ کروشیا اور بوسنیا کو سردیا سے ملا دینے کے لیے سازش کر رہے ہیں۔ اس کے لیے جو شہادتیں پیش کی گئیں، وہ مضحکہ خیز حد تک ناکافی تھیں۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں، انھوں نے ہائیکورٹ میں اپیل کر کے فیصلہ منسوخ کرا لیا۔ زغرب کے ان مقدمات نے سلافی اخباروں کو دوگونہ بادشاہی کی پالیسی مذموم قرار دینے کا بڑا اچھا موقع پیدا کر دیا۔

اسی سال (۱۹۰۹ء) آسٹریا کے ایک مشہور مورخ فرائیڈ جنگ[1] نے وی آنا کے اخباروں میں ایک بیان شائع کر دیا، جس کا مفاد یہ تھا کہ کروٹوں اور صربوں کے جو سیاستدان کروشیا میں موجود ہیں، وہ سردیا کے صرب سیاستدانوں سے مل کر سازش کر رہے ہیں۔ آخر فرائیڈ جنگ اس اقبال پر مجبور ہوا کہ جن دستاویزوں کی بنا پر ـــــ یہ غالباً وی آنا کی وزارت خارجہ نے مہیا کی تھیں ـــ اس نے یہ الزام عائد کیا تھا، وہ جعلی ہیں۔ زغرب کے مقدمات اور فرائیڈ جنگ کی الزام تراشی سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوگونہ بادشاہی اپنے وفادار جنوبی سلافی باشندوں کے سلسلے میں بھی کتنے بُرے طریقے پر کام کر رہی ہے اور یہ سب کچھ بوسنیا کے ایک صرب کے ہاتھوں فرانسس فرڈیننڈ کے قتل سے صرف پانچ سال پہلے پیش آیا۔ یہی واقعہ قتل عالمی جنگ کا باعث بنا۔

اگرچہ ۱۹۱۰ء میں وعدہ کر لیا گیا تھا کہ ریلوے ملازمین کا قانون منسوخ کر دیا جائے گا، مگر یہ وعدہ پورا نہ کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں بوسنیا کے ایک طالب علم نے، جو زغرب میں تعلیم پا رہا تھا، کروشیا کے ہنگری گورنر کو قتل کرنے کی سازش کی۔ یہ طالبعلم ایک خفیہ انجمن کا ممبر تھا، جو خود مختار سردیا کے مرکز حکومت بلغراد میں منظم ہوئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ سردیا کے حدود بڑھا لیے جائیں۔ اس میں بوسنیا اور کروشیا بھی شامل کر لیے جائیں۔ سردیا کے اخباروں نے اس طالب علم کو کھلم کھلا ہیرو بنانے کی کوشش کی۔ ۱۹۱۳ء میں نئے لبرل گورنر پر گولی چلی۔ ۱۹۱۴ء میں پھر ایسا ہی واقعہ بوسنیا کے ایک باشندے کے ہاتھوں پیش آیا۔ یہ اُس جرم کی نہایت خوف انگیز مشق تھی، جو ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو پیش آیا، یعنی بوسنیا کے ایک طالب علم نے ایک ہیبسبرگ ناظم کو بندوق کا نشانہ بنایا اور جنوبی سلافیوں کی قوم پروری اس اقدام کی محرک تھی۔ جُرم کا مقام کروشیا کے بجائے بوسنیا تھا، اور اس کا ہدف وہ شخص تھا، جسے بہت بڑی اہمیت حاصل تھی یعنی شہنشاہی تاج و تخت کا وارث۔ یہی جرم تھا جو محض داخلی بحران تک محدود نہ رہا، بلکہ عالمی جنگ کا موجب بن گیا۔

بوسنیا، ہرزیگونیا

ہمیں دوگونہ بادشاہی میں قومی اقلیتوں کا جائزہ بوسنیا ہرزیگونیا[2] کے بیان سے مکمل کر دینا چاہیے، جن کی حیثیت خاص تھی۔ صدی کے آٹھویں عشرے میں یہ دونوں صوبے سلطنتِ عثمانیہ کا حصّہ

---

[1] Friedjung

[2] Bosnia Herzegovina

تھے اور چار سو سال سے عثمانیوں کے ماتحت چلے آتے تھے۔ اگرچہ نسلی نقطۂ نگاہ سے یہ کاملاً جنوبی سلافیوں کے صوبے سمجھے جاتے تھے، مگر ۱۸۷۹ء میں ان صوبوں کے اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان، پانچ لاکھ مسیحی جن کا تعلق آرتھوڈکس کلیسا سے تھا، ڈیڑھ لاکھ کیتھولک اور تھوڑے سے یہودی بھی تھے۔ ترکوں کے عہدِ حکومت میں جو شخص اسلام قبول کر لیتا، اسے اقتصادی فوائد حاصل ہوتے۔ انیسویں صدی تک آرتھوڈکس مسیحیوں کی زیادہ تر آبادی کاشتکاری میں مصروف تھی۔ وہ مسلمان مالکانِ اراضی کی جاگیرات میں کام کرتے اور سرحد پار سرویا پر اُن کی نظریں جمی ہوئی تھیں اور وہ سمجھتے تھے کہ سرویا ہی انھیں آزاد کرائے گا۔ بعض کیتھولکوں نے سٹروس میئر کی درسگاہ میں تعلیم پائی تھی اور ان کا رجحان اس طرف ہو گیا تھا کہ جنوبی سلافیوں کی مملکت میں جذب ہو جائیں، مگر کوئی بھی ہیبسبرگ بادشاہی میں — جیسی وہ اس وقت تھی — نہیں رہنا چاہتا تھا۔

۱۸۷۵ء میں ہرزیگوینا کے اندر بغاوت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تمام بلقانی سلافیوں نے ترکوں پر حملہ کر دیا، پھر روس و ترکی کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ ترکوں کے خلاف جنگ میں روس کی شرکت سے پیشتر آسٹریا اور روس کے خارجہ وزیروں نے ان دو صوبوں کی آئندہ حیثیت کے متعلق باہم اتفاق کر لیا تھا، مگر آگے چل کر اس اتفاق کے متعلق ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ۱۸۷۸ء میں برلن کے اندر کانگرس ہوئی۔ اس میں آسٹریوں نے صوبوں پر قبضے کا حق حاصل کر لیا، لیکن ان کے الحاق کا حق انھیں نہ ملا۔

۱۸۷۸ء سے ۱۹۰۸ء تک آسٹروی فوجیں بوسنیا اور ہرزیگوینا پر قابض رہیں۔ ان صوبوں نے پہلے پہل ہیبسبرگ خاندان کی فوجوں کے خلاف سختی سے مزاحمت کی۔ معمولی جنگ کے بعد فوجیں قابض ہو گئیں۔ اس پوری مدت میں ترک برتری کا اعتراف کیا جاتا رہا، مگر اصلاً ان صوبوں پر وی آنا سے حکومت ہوتی تھی، اگرچہ یہ آسٹریا یا ہنگری کا حصہ نہ تھے۔ انھیں آسٹریا ہنگری کے مشترک وزیر مال کی تحویل میں دے دیا گیا تھا وہ ان وزیروں میں سے ایک تھا، جو آسٹریا اور ہنگری کے درمیان مشترک تھے۔ ان میں صرف شہنشاہ قانون نافذ کر سکتا تھا۔ وہاں ایک مقامی فوجی گورنر مقرر کر دیا گیا تھا، جس کے ساتھ ایک ملکی ناظم متعین ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں پھر بغاوت ہوئی۔ بعد ازاں بیرن کیلے[۲] — جو ایک میگیار اور مشترک وزیر مالیات تھا — ۱۹۰۳ء تک بوسنیا اور ہرزیگوینا کی حکومت کا کاروبار چلاتا رہا۔ اس نے ریل کی پٹڑیاں بچھوائیں، سڑکیں بنوائیں، آبی گزرگاہیں تعمیر کرائیں، مقامی مصنوعات کی سرپرستی کی، تعلیم کا ایک عمدہ نظام جاری کیا، زرعی اور طبی انتظامات کی اصلاح کی۔ اس کے ماتحت جو آدمی انتظام پر مامور تھے، وہ بڑے قابل تھے، تاہم کیلے کو ایک غیر ملکی سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس سے نفرت کی جاتی تھی۔ غرض آسٹروی شہنشاہی بڑی فوج ان صوبوں میں رکھے بغیر ان پر قابض نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر متصرفین نے بڑے بڑے مسلمان مالکانِ اراضی

۱؎ اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ ان نام نہاد مہذب یورپی مملکتوں نے ترکوں کے خلاف کس بیدردی اور سنگدلی سے بار بار باہم سازشیں کیں۔

۲؎ Baron Kallay

کی لوٹ مار اور آرتھوڈکس مسیحیوں کی حصہ داری قائم رکھی۔ یہ دونوں گروہ زمانۂ قدیم کے اصول کے مطابق زمینوں کا انتظام کرتے رہے اور ان کے نفرت انگیز عمرانی نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔

بوسنیا کے آرتھوڈکس صربوں میں بے چینی کی جو آگ لگی ہوئی تھی، اسے سرویا کے پروپیگنڈے سے ہوا دی جاتی رہی۔ محبِ وطن صربوں کا فیصلہ یہ تھا کہ کلاں تر سرویا کی تعمیر کے سلسلے میں آسٹریا کو ان پر قبضہ کر لینے کی اجازت دے دی۔ بہر حال جب تک قبضہ الحاق کی صورت اختیار نہ کرتا، صربوں کو امید تھی کہ یہ صوبے انھیں مل جائیں گے۔ انھوں نے ان صوبوں کے اندر کارندوں اور سازشیوں کا طوفان بپا کر دیا۔ مسلمانوں سے ہیبسبرگ حکمرانوں کا برتاؤ اچھا تھا، مگر وہ ترکوں کی حکومت کے خاتمے پر کبھی راضی نہ ہوئے اور کیتھولکوں کو امید تھی کہ وہ کروشیا میں شامل ہو جائیں گے۔

یوں یہ صوبے مسلسل ایک خطرہ بنے رہے اور برابر اندیشہ لگا رہا کہ کسی وقت یہاں ایسا دھماکا ہو گا، جس سے سلطنت متزلزل ہو جائے گی۔ وی آنا میں دوراندیش مبصروں کا اصرار تھا کہ جنوبی سلافیوں کے مسئلے کا کوئی حل نکال لیا جائے، جو ٹریل ازمیئر[۱] کے حل سے ملتا جلتا ہو، یعنی ڈلمشیا، کروشیا، بوسنیا، ہرزیگووینا کو ملا کر فرانسس جوزف کے ماتحت جنوبی سلافیوں کی بادشاہی قائم کر دی جائے اور اسے وہی درجہ حاصل ہو، جو ہنگری کو حاصل تھا، یعنی دو گونہ بادشاہی سہ گونہ بن جائے۔ جو لوگ اس حل کی وکالت کر رہے تھے، انھیں "آزمائشی"[۱] قرار دیا گیا۔ میگیاروں نے ان کی سخت مخالفت کی۔

۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب سے آسٹریا کے منچلے وزیر خارجہ اہرن تھل[۲] کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں ان صوبوں کی حیثیت بھی تبدیل نہ ہو جائے۔ اہرن تھل روس سے ایک خفیہ مفاہمت کر چکا تھا۔ اس کے بل پر اکتوبر ۱۹۰۸ء میں سلطنت کے اندر شامل کر لیے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ ان کے لیے جداگانہ پارلیمنٹ بنا دی جائے گی۔ اس حرکت نے یورپ میں ایک بڑا بحران پیدا کر دیا (تفصیل آگے آئے گی) جس سے عالمی جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا، مگر طوفان ٹل گیا، البتہ اس سے سرویا پر گہرے زخم لگے۔ صرب چاہتے تھے کہ صوبے انھیں مل جائیں۔ اب اس آرزو کی تکمیل میں مستقل رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ سرویا کی تذلیل، روس کی مایوسی اور جرمنی و آسٹریا ہنگری کے اتحاد نے ۱۹۱۴ء کے حادثۂ عظیمہ کے لیے میدان ہموار کر دیا۔ اگر کوئی شخص دوران جنگ میں دو گونہ بادشاہی کی کمزوری اور جنگ کے بعد اس کے انحلال کا سب سے بڑا راز معلوم کرنا چاہے تو یہ ہو گا کہ بوسنیا کی آبادی غیر مطمئن تھی۔ آسٹریا کے چیکوں اور اطالویوں کی بے اطمینانی نے اس میں اضافہ کر دیا۔ پھر ہنگری کے سلواکوں، رومانیوں، کروٹوں اور جنوبی سلافیوں کے دوسرے گروہوں کا اضطراب شامل ہو گیا۔ مگر اقلیتوں کا مسئلہ کتنا ہی نازک سمجھ لیا جائے، وہ پورا جواب مہیا نہیں کرتا۔ اب ضروری ہے کہ ہم آسٹروی، جرمن اور ہنگری اکثریتوں کے معاملات پر، ان کے جداگانہ معاملات پر اور ایک دوسرے سے نازک تعلقات پر بھی اختصاراً غور کر لیں۔ صرف اسی وقت ہم پر واضح ہو گا کہ دو حکمران گروہ

---

۱ Trialists

۲ Aehrenthal

وقتی تدبیروں سے کام لیتے رہے۔ وہی تدبیریں ان کی انفرادی اور مشترک جراحت کا موجب بنیں۔

آسٹروی معاشرہ اور سیاسیات ۱۸۶۷ء — ۱۹۱۴ء

آسٹریا اور ہنگری کے درمیان مفاہمت کے ابتدائی دور سے آسٹروی لبرل قدامت پسند پادریوں سے لڑتے رہے۔ ان لبرلوں نے سول میرج کو قانونی حیثیت دے دی۔ مذہبی تعلیم کے سوا پوری تعلیم کو سیکولر بنا لیا۔ ۱۸۷۰ء میں پوپ کی معصومیت کے اعلان کے بعد ۱۸۵۵ء کا میثاق منسوخ کر دیا اور کلیسائی املاک پر محاصل عائد کر دیئے۔ (۱۸۷۳ء) یہ تمام قوانین جرمنوں کی تہذیبی ثقافت کا آسٹروی مثنیٰ تھے، مگر ان کی حیثیت معمولی تھی۔ آسٹریا کی نوّے فی صد آبادی کیتھولک عقیدے کی تھی اور وہ ویٹیکن کے متعلق پروٹسٹنٹ پروشیا کے شبہات میں ہمخیال نہ تھی۔ ۱۸۷۳ء میں مالی بحران پیدا ہوا تو لبرل بے وقعت ہو گئے۔ اسی زمانے میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ مشتبہ اور نا استوار نئی کمپنیوں کو اجازت نامے دینے کے لیے رشوتیں قبول کرتے رہے۔ اسی وقت سے آسٹریا میں یہودیوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا ہوئی، کیونکہ بعض یہودی رشوتوں کے معاملے میں ملوث تھے اور انھیں بہ آسانی قربانی کا بکرا بنایا جا سکتا تھا۔ بادشاہی کے ابتدائی دور میں اقتصادی ترقی ہوئی تو مزدوروں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ جب بحرانی دور آیا تو اشتراکیت کی طرف رجحان ہو گیا۔ اشتراکیت کے حامیوں میں مارکسی بھی تھے اور اعتدال پسند بھی۔

آسٹروی امرا کے قبضے میں بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ وہ اپنی جاگیروں پر خود مختار بادشاہوں کی حیثیت میں حکم چلاتے۔ ان کے اوضاع و اطوار اچھے تھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مسائل سے انھیں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی دولت بود و ماند کے طمطراق اور قمار بازی میں لٹاتے رہے۔ کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ جو اعلیٰ حقوق انھیں حاصل ہیں، ان کے ساتھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ بہ ایں ہمہ قوم کی سیاسی قیادت بڑی حد تک انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کی جاگیروں کی وسعت کے باعث کسانوں کی ملکیتیں بہت معمولی رہ گئی تھیں۔ اس وجہ سے وہ کسان بھی امرا کی جاگیروں میں کچھ وقت کے لیے کام کرنے پر مجبور تھے، جن کے پاس زمینیں تھیں۔ کسانوں کا معیار معیشت اور معیار زندگی بہت پست تھا۔ کسانوں پر پادری اپنا پورا اثر و رسوخ ان آقاؤں کی تابعیت اور شاہی خاندان کی وفاداری کے لیے استعمال کرتے رہے اور وہ لوگ اپنی تقدیر پر قانع ہو گئے تھے۔

شہروں میں رہنے والا طبقۂ اوسط، نیز کاروباری آدمی مغربی یورپ کے حالات سے پوری طرح آشنا تھے۔ وہ بعد میں بروئے کار آئے اور آسٹریا میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں سے جو زیادہ دولتمند تھے، انھوں نے امرا کے طریق حیات کی نقالی شروع کر دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دولت کے بل پر وہ امرا کے طلسمی حلقے میں شامل ہو جائیں گے۔ دوسروں نے مختلف پیشے اختیار کر لیے۔ ان پیشوں میں پہلے ہی لوگوں کی کثرت تھی اور تنخواہیں بہت کم تھیں۔ اہل علم کی بیروزگاری سیاسی اعتبار سے انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔

بورژوا میں بہت سے یہودی بھی شامل تھے۔ آسٹریا کی پوری آبادی میں یہودیوں کا تناسب پانچ فی صد تھا (چند کے سوا)، وہ امرا میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ کسان یا پادری یا فوجی افسر یا نوکر شاہی کا جزو نہیں بن سکتے تھے۔ وہ صرف تجارت یا کسی

پیشے یا فنون میں حصّہ لینے پر مجبور تھے، جہاں انھوں نے اکثر کامیابی حاصل کی اور ممتاز درجے پر پہنچ گئے۔ جب ہم جنگ سے پیشتر کی "وی آنائی" زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو ہماری مراد ایک ایسے معاشرے کی زندگی ہوتی ہے، جو بڑی حد تک یا جزواً یہودی تھی۔ اس زندگی سے مراد اس کی جاذبیت، طمطراق، تہذیب، موسیقی، اس کے چائے خانے، سائنس اور طب کے لیے اس کی اعلیٰ شہرت ہے۔ یہودیوں کے بالائی طبقۂ اوسط میں تبدیلِ مذہب یا ذات باہر شادی اور دوسروں میں ضم ہوجانے کی مثالیں شاذ نہ تھیں۔

یہودیوں کے خلاف نفرت کی آگ اس لیے تیز ہوتی رہی کہ مشرقی یورپ کے خطّوں سے غریب یہودیوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، جہاں ظلم وجور نے انھیں خستہ حال اور اکھڑ بنا دیا تھا۔ آسٹریا کے غیر یہودی اس پر بہت بگڑے ہوئے تھے، مگر ہمیں یہودیوں سے اکثر امراء کی عمرانی نفرت ——— جو کم تر شانِ امارت کا ایک کرشمہ تھی ——— اور نچلے درجے کے طبقۂ اوسط ——— جو معمولی دکانداری کے دائرے میں یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا ——— کی سخت سیاسی نفرت کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ پادری بھی یہودیوں کے سخت خلاف تھے۔ اس کا ایک سبب تو مذہبی تعصب تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ طبقۂ اوسط کے یہودی سیاسیات میں عموماً آزاد خیال تھے اور پادریوں کے لیے یہ آزاد خیالی سازگار نہ تھی۔ چھوٹے طبقے کے پادریوں نے، جنھیں طبقۂ اوسط میں خطیبوں کی حیثیت حاصل تھی، اس سلسلے میں سبقت کی۔ یہودیوں کے خلاف نفرت کا سلسلہ بڑھا تو انھوں نے (صیہونیت یعنی فلسطین میں یہودیوں کی ایک ریاست قائم کرنے کی تجویز) کی تحریک جاری کردی۔ یہ تحریک دوگونہ بادشاہی ہی میں پیدا ہوئی۔

جس عمرانی نظام میں فشار و کشاکش کے یہ اسباب مضمر تھے، اس میں قومی اقلیتوں کے مسائل نے مزید پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ آخر انیسویں صدی کے اواخر میں آسٹروی جرمنوں کے اندر دو اہم سیاسی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اوّل جرمنیت کا اتحاد، دوم مسیحی اشتراکیت۔ نویں عشرے کے اوائل میں اعتدال پسند آسٹروی جرمن بھی چاہتے تھے کہ آسٹریا کی سلافی سرزمینیں حکومت ہنگری کے حوالے کردیں۔ باقی جو خالص جرمن رہ جائیں، انھیں اقتصادی اعتبار سے جرمنی کے ساتھ ملا دیا جائے۔ جرمن اتحاد کے حامی زیادہ اتحاد پسند اور زیادہ متشدد تھے۔ وہ ہیپسبرگ خاندان کے بھی مخالف تھے اور کیتھولک کلیسا سے بھی انھیں نفرت تھی۔ انھوں نے ایک پُرشور و شغب تحریک جاری کی، جس کا نعرہ تھا "رومہ سے دور ہو جاؤ۔" ان کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ آسٹریا پروٹسٹنٹ بن کر جرمنی سے سیاسی اتحاد کرلے۔ یہ لوگ یہودیوں اور سلافیوں دونوں کے سخت خلاف تھے۔ وہ بسمارک اور وولن[1] کے بڑے قدردان تھے، مگر بسمارک نے ان کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ان کا لیڈر شونرر[2] خود کیتھولک مذہب چھوڑ کر پروٹسٹنٹ بنا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں وہ اسی ضلع سے پارلیمنٹ کا ممبر چنا گیا، جس میں بعدازاں ایڈولف ہٹلر پیدا ہوا جب

---

[1] Wolan

[2] Schonerer

کبھی آسٹروی حکومت کی طرف سے چیکوں کو مراعات دینے کی کوئی کوشش کی جاتی، شونرر اور اس کے پیرو ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے، لیکن جرمن اتحاد کے حامی ایک شور مچانے والی اقلیت سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکے۔

ان کے برعکس مسیحی اشتراکی آسٹریا کی نہایت اہم سیاسی پارٹی بن گئے۔ وہ پکے کیتھولک اور ہیپسبرگوں کے مخلص وفادار تھے۔ برابر کوشش کرتے رہے کہ ایسے عمرانی قوانین بن جائیں، جو کسانوں اور چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والوں کے لیے مفید ہوں۔ اس وجہ سے یہ لوگ ان کی طرف کھچے چلے جا رہے تھے۔ نیز مسیحی اشتراکی بڑے بڑے کارخانہ داروں کے مخالف تھے۔ یہودیوں سے انھیں بھی سخت عداوت تھی۔ ابتدا میں پادری مسیحی اشتراکیت کی قدر و قیمت کے متعلق متشکک تھے، لیکن آگے چل کر انھوں نے یہ تحریک اپنا لی اور دیہات میں بطورِ خاص ووٹروں کو اس پارٹی کے لیے ووٹ دینے پر آمادہ کر لیا۔ مسیحی اشتراکیوں میں سے انتہائی شہرت کارل لیوگر[1] نے پائی، جو ۱۸۹۵ء کے بعد وی آنا کا میئر رہا۔ دار الحکومت کا زیرین طبقۂ اوسط اس کی انتہائی قدر کرتا تھا۔ لیوگر سالہا سال تک شہری آسائشوں اور سہولتوں یعنی پارکوں اور کھیلوں کے میدانوں کو عوام کی ملکیت قرار دیتا رہا۔ اسی نے یہ تحریک جاری کی تھی کہ سکولوں میں پڑھنے والوں کے لیے دودھ مفت مہیا کیا جائے اور ایسی ہی دوسری فلاحی تحریکوں کی بھی سرپرستی کی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے ہر وقت کہتا رہتا تھا کہ یہودیوں، مارکسی اشتراکیوں اور میگیاروں سے نفرت کرو۔ ہٹلر نے ۱۹۱۰ء میں لیوگر کی وفات کا جلوس دیکھا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا مدبر قرار دیا۔ جرمن نازیت کے اصول کو موجودہ صدی میں سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ہیپسبرگ بادشاہی کے عمرانی اور نسلی نظام کو نہ سمجھ لیا جائے، جس میں ہٹلر نے پرورش پائی، خصوصاً ان اصول کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے، جو اتحادِ جرمنیت اور مسیحی اشتراکیت کے لیے جذب و کشش کا باعث بنے۔

جرمنوں کے اتحاد اور مسیحی اشتراکیت کے خلاف آسٹریا میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد ۱۸۸۸ء میں رکھی گئی۔ اس کے پروگرام میں مارکسیت کی جھلک تھی۔ یہ پارٹی چاہتی تھی کہ حکومت وسائلِ پیداوار کی مالک بن جائے اور سیاسی تحریکات قومیت کی بنا پر نہیں، بلکہ طبقات کی بنا پر منظم ہوں، لیکن یہ سوشل ڈیموکریٹ انقلاب نہ تھے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ تمام بالغوں کو حقِ رائے مل جائے۔ تعلیم سیکولر ہو، فلاحی قانون منظور کرائے جائیں اور مزدوروں سے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لیا جائے۔ ان لوگوں کی عنانِ قیادت اہلِ علم لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جن میں یہودیوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ مزدوروں کی روزافزوں تعداد ان کے ساتھ ہو رہی تھی۔ انھیں کی وجہ سے ۱۹۰۷ء میں معیارِ رائے وسیع ہوا اور فوراً بعد پارلیمنٹ میں ان کی نشستیں بارہ سے ستاسی تک پہنچ گئیں۔

قومیت کے مسئلے پر ڈیموکریٹک لیڈروں کی پختہ رائے یہ تھی کہ جمہوری وفاقیت کے اصول پر اصلاح کی جائے۔ ہر قوم

---

[1] Lueger

کو اس کے علاقے میں معاملات کا مختار بنا دیا جائے۔ جہاں آبادی مخلوط ہو، وہاں اقلیتوں کی حفاظت کی جائے اور مرکزی پارلیمنٹ مشترکہ مفاد کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ جس مملکت میں متعدد قومیں شامل تھیں، وہاں سب کے لیے ثقافتی خود اختیاری کی تجویز نہ ناقابل عمل تھی اور نہ اسے مارکسی انداز کی تجویز قرار دیا جا سکتا تھا۔ سوویٹ روس نے آگے چل کر اس کی عملی حیثیت کو درست ثابت کر دیا۔ وہاں جب ایسے ہی مسائل سے سابقہ پڑا تو آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے افکار ہی کی پیروی کی گئی۔ آٹو باؤئر[1] مارکسیت کا حامی تھا۔ اس نے سلطنت میں قومی کشاکش کو طبقاتی جنگ کا مظہر قرار دینے کی کوشش کی، لیکن ایک اور سوشل ڈیموکریٹ کارل رینر[2] غالباً کسی جمہوریت کے قیام کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا۔ ۱۹۱۹ء میں آسٹروی جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اس کا چانسلر بن گیا۔ ۱۹۴۵ء میں اس جمہوریت نے دوبارہ جنم لیا تو پھر بھی کارل رینر ہی اس کا چانسلر بنا۔ وہ "دوگونہ بادشاہی" کا حامی تھا اور اس کی رائے یہ تھی کہ قومیتوں سے کلیساؤں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ تمام شہریوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے لیے جس کلیسا کو چاہیں اختیار کر لیں۔ ان کے اپنے سکول ہوں گے اور جب کسی معاملے پر ان میں اختلاف پیدا ہوا تو ثالثوں کی ایک اعلیٰ عدالت اس کا فیصلہ کر دے گی۔ اگر یہ معقول اور خالص عملی نظریات اختیار کر لیے جاتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ بادشاہی محفوظ نہ رہتی، مگر ہوا یہ کہ آسٹریا کے حکمران جرمن گروہ کی سیاسی کشاکش نے ناقابل برداشت ضعف پیدا کر دیا۔

ہنگری کا معاشرہ اور سیاسیات
۱۸۶۷ء — ۱۹۱۴ء

ہنگری میں عمرانی نظام کسی قدر مختلف تھا۔ بڑے بڑے مالکان اراضی ہنگری کی نصف زمین سنبھالے بیٹھے تھے۔ لاکھوں ایکڑ زمین ایک ایک جاگیردار کے پاس تھی۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ وہ خاندان کے وفادار تھے۔ کاشتکاروں سے بعض اوقات مہربانی کا برتاؤ کرتے اور اپنے سے نیچے ہر آدمی کو حقیر سمجھتے۔ ان میں سے اکثر ہوشمند اور نیک و بد کی تمیز رکھتے تھے، مگر فی الجملہ آسٹروی مالکان اراضی کی طرح اور بے دماغ تھے، مگر ہنگری میں دیہاتی شرفاء کا طبقہ بہت بڑا تھا۔ ان لوگوں کے پاس زمینیں تھوڑی تھیں۔ عمرانی اعتبار سے وہ قدرے پست سمجھے جاتے تھے مگر مختلف گروہ کی حیثیت میں ان کا سیاسی اثر بہت بڑھا ہوا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں زرعی غلام آزاد ہو گئے۔ پھر زرعی حالات کی غیر یقینی کے دور آئے۔ اس زمانے میں دیہاتی شرفاء نے سرکاری ملازمتیں اختیار کر لیں یا مختلف پیشے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ کسانوں کے لیے کئی مصیبتیں تھیں۔ ان کے پاس زمینیں تھوڑی تھیں۔ تعلیم ناکافی تھی۔ کھیتی باڑی کے طریقے پرانے تھے اور معیار معیشت بہت پست تھا۔

میگیار زیادہ تر دیہات میں رہتے تھے، شہر صدیوں سے جرمنوں اور یہودیوں ہی کے مرکز تھے، لیکن انیسویں صدی کے دوران میں میگیار بھی شرفاء اور کسانوں کی حیثیت میں شہروں کے اندر پہنچنے لگے۔ اس زمانے میں یہودیوں کی آبادی بہت

---

[1] Bauer

[2] Renner

بڑھ گئی۔ کیونکہ شمال اور مشرق کی طرف سے یہودی نقل وطن کرکے آ گئے۔ ہنگری میں بہت سے یہودیوں نے مذہب تبدیل کرلیا۔ وہ میگیاری معاشرے میں جذب ہوگئے اور جذبات و روش میں زبردست میگیار بن گئے۔ جب ان کے پاس خاصی دولت جمع ہوگئی تو زمینیں خریدلیں، خطابات حاصل کرلیے اور شرفا میں داخل ہوگئے۔ اس پر بھی انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا خصوصاً شہر کے غریبوں اور مضافات میں، جہاں وہ سودی کاروبار کرتے تھے یا شراب خانے کھول رکھتے تھے۔ یہی دو پیشے تھے جن کی وجہ سے کسان مقروض بنتے۔ اگرچہ ہنگری میں بھی یہودیوں کی مخالفت کا جذبہ موجود تھا، مگر وہاں زیادہ آدمی اس کے حامی نہ بن سکے اور آسٹریا کے برابر اس نے اہم سیاسی تحریک کی حیثیت حاصل نہ کی۔

اس عمرانی مخروطی مینار کی تہہ میں شہروں کے صنعتی مزدوروں کا چھوٹا طبقہ تھا (اس کی تعداد بیس فی صد سے زیادہ نہ تھی)۔ یہ لوگ زیادہ تر پارچہ بافی اور آٹے کے کارخانوں میں ملازم تھے۔ اجرتیں کم تھیں۔ رہنے سہنے کے حالات نہایت دردناک تھے۔ یہ حالات مغربی ملکوں کے بجائے روس سے زیادہ مشابہ تھے اگرچہ صدی کے اواخر میں زیادہ سے زیادہ فلاحی قوانین منظور ہوئے، مگر یہ لوگ اپنی کمزوری اور فقدانِ شعور کے باعث منظم ہوکر مؤثر حیثیت اختیار نہ کرسکے۔

اگرچہ آسٹریا کی طرح ہنگری میں بھی کلیسا بے حد طاقتور اور دولت مند تھا، مگر ہنگری میں کیتھولکوں کی آبادی نوّے فی صد کے بجائے صرف ساٹھ فی صد تھی۔ ہنگری کے بعض دولت مند خاندان اور بہت سے شرفاء اصلاحِ کنیسہ کے بعد دوبارہ کیتھولک مذہب اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ کیلون کے بنے رہے۔ لاکھوں جرمن، خصوصاً ٹرینسلوینیا میں لوتھر کے پیرو تھے۔ ٹرینسلوینیا میں ایسے میگیار بھی تھے، جو تثلیث چھوڑ کر توحید اختیار کرچکے تھے۔ پادریوں کو ہنگری میں کبھی وہ اقتدار حاصل نہ ہوا، جو آسٹریا میں تھا۔ لہٰذا کیتھولک کلیسا وہاں بڑا سیاسی اثر پیدا نہ کرسکا۔

عمرانی اور مذہبی نظام مختلف ہونے کے باعث ہنگری میں ویسی زبردست پارٹیاں نہ بن سکیں۔ جیسی آسٹریا میں سوشل ڈیموکریٹک یا مسیحی اشتراکیوں کی پارٹی تھی۔ آسٹریا میں ۱۹۰۷ء سے پیشتر بھی معیارِ رائے خاصا وسیع تھا، بعد ازاں تمام بالغوں کو حقِ رائے مل گیا۔ اس کے برعکس ہنگری میں ۱۸۷۴ء کا قانون کبھی تبدیل نہ ہوا۔ اس کے مطابق صرف چھ فی صد آبادی کو رائے دینے کا حق تھا۔ نیز میگیاروں کے تمام طبقے ہنگری کی قومی اقلیتوں کو زیرِ اثر رکھنے پر متحد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ داخلی، سیاسی یا عمرانی مسائل ہنگری میں سیاسی پارٹیوں کی تنظیم میں زیادہ اہم حیثیت اختیار نہ کرسکے۔ میگیاروں کے نزدیک اصل مسئلہ، جو سیاسی اختلافات کا باعث بنا رہا، یہ تھا کہ ہنگری کو "دوگونہ بادشاہی" میں کیا حیثیت حاصل ہو۔

جو لوگ آسٹریا اور ہنگری کی مفاہمت کے مخالف تھے، ابتدائی دور میں ان کے دو گروہ تھے۔ اوّل کوسوتھ کے حامی، جو کامل آزادی چاہتے تھے، دوم ذرا اعتدال پسند، جو بادشاہی کے اندر ہنگری کی حیثیت بہتر بنانے کے آرزومند تھے اور چاہتے تھے کہ ہنگری کو اپنی فوج، سفارتی ملازمتوں اور مالیات پر ضبط و نظم حاصل ہوجائے۔ آسٹریا کے ساتھ رشتہ صرف شہنشاہ کی ذات تک محدود رہے۔ ان لوگوں کو "شیر" (Tiger) کہا جاتا تھا۔ جب دیاک خدمتِ عامہ کے دائرے

سے نکل گیا تو "شیروں" میں سے ایک، کولومان تسزا[1] نے مفاہمت کی مخالفت ترک کردی اور اس کی حمایت میں دیاک کے پیروؤں سے مل گیا۔ ۱۸۷۵ء میں وہ برسرِ اقتدار آیا۔ آئندہ پندرہ سال تک ہنگری کا وزیرِ اعظم رہا۔ اس کے بعد "شیر" اور پیرانِ دیاک برابر ہنگری میں برسرِ اقتدار رہے اور انتخابات میں ہیر پھیر کر کے انھوں نے اپنا اقتدار قائم رکھا۔ صرف ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک کا دور مستثنیٰ ہے۔ یہ لوگ لبرل کہلاتے تھے۔ معیارِ رائے اور زرعی اصلاحات یا اقلیتوں سے برتاؤ کی اصلاح کی جو بھی تحریک اٹھتی، اس کی مخالفت کرتے۔ کوسوت کے پیرو بدستور مفاہمت کے خلاف رہے۔

۱۸۹۰ء کے آس پاس ایک آسٹروی جرنیل نے ان آسٹروی افسروں کی قبروں پر پھولوں کے ہار چڑھائے۔ جو ۱۸۴۸ء کے انقلابِ ہنگری میں مارے گئے تھے۔ اس پر کوشوت کے پیرووں نے زیادہ شدت سے خالص قومی فوج قائم کر لینے پر زور دیا۔ اگرچہ اس وقت ہنگری کی فوجیں ان کے اپنے افسروں کی کمان میں تھیں۔ کوشوت کے پیرووں نے خصوصیت سے یہ مطالبہ کیا کہ ہنگری فوجوں میں جو حکم دیئے جاتے ہیں، وہ میگیاری زبان میں ہوں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انتہا پسند میگیاروں کی روش کا کیا حال تھا۔ تسزا نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اٹھاسی سال کے بوڑھے کوشوت کو، جو اس وقت جلاوطن تھا، مگر زندہ تھا، ہنگری کی اعزازی شہریت دی جائے یا نہ دی جائے۔ اس پر تسزا مستعفی ہو کر گھر جا بیٹھا۔

کوشوت کی وفات (۱۸۹۴ء) کے بعد اس کے پیرووں کی قوت بڑھ گئی اور اس کا بیٹا پارٹی کی قیادت کے لیے واپس آگیا۔ اس نے تاج کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا مگر برابر آزادی کا مطالبہ کرتا رہا۔ ۱۸۹۶ء میں میگیاروں کے ہنگری پہنچنے کی یک ہزار سالہ یادگار منائی گئی اور آسٹریا سے آئندہ دہ سالہ (۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۷ء) اقتصادی انتظامات کے متعلق بحثیں ہوئیں۔ ان سے کوشوت کے پیرووں کو بڑی مدد ملی۔ چنانچہ انھوں نے آسٹروی سامان کا مقاطعہ شروع کر دیا اور چھوٹے چھوٹے معاملات کو بھی آسٹریا کے خلاف پروپگنڈے کا موضوع بناتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں فیصلہ ہوا کہ مشترکہ فوج میں ہنگری کی تعداد بڑھا دی جائے، کیونکہ اس کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ کوشوتیوں اور دوسرے قوم پرستوں نے پھر یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ ہنگری کی فوجوں میں کمانداری کے لیے میگیاری زبان استعمال کی جائے اور انھیں اجازت دی جائے کہ ہنگری کا پرچم ساتھ رکھیں۔ وزارت نے یہ مطالبہ رد کر دیا تو کوشوتیوں نے شور و غل مچایا اور ہنگری کی پارلیمنٹ کو مؤثر طریق پر معطل کر دیا۔

چونکہ شہنشاہ نے دباؤ کے روبرو جھکنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے علیٰحدگی کے حامی میگیاروں اور حکومت کے درمیان کشاکش تیز تر ہو گئی۔ کولومان، تسزا کا بیٹا ۱۹۰۳ء میں وزیرِ اعظم ہوا۔ اس نے مخالفت کے بڑھتے ہوئے طوفان میں مفاہمت

---

[1] Coloman Tisza

پر عمل جاری رکھا۔ جب اس نے سرکاری کام کی تکمیل کے لیے بحثوں پر پابندی لگانی چاہیے تو مخالفوں نے ایوان پارلیمنٹ تباہ کر دیا۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے نئے انتخابات کرائے، مگر اس کے خلاف مختلف پارٹیوں نے اتحاد کر لیا تھا، جن میں کوشوتی بھی شامل تھے۔ سٹیفن نے شکست کھائی اور کوشوتیوں نے اکثریت حاصل کر لی۔ جب فرانسس جوزف نے نئی اکثریت کے مطالبے کو ٹھکرا دیا اور ایک وفادار جرنیل کو وزیر اعظم بنا دیا تو کوشوتیوں نے فوجی ڈکٹیٹر شپ کے نعرے لگائے اور پارلیمنٹ میں ناروے کی ستائش کی، جس نے سویڈن سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ساتھ ہی محبانِ وطن سے کہا کہ نہ ٹیکس ادا کرو۔ نہ فوجی خدمت انجام دو۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کشاکش "دوگونہ بادشاہی" کے حامیوں اور علیحدگی کے داعیوں کے درمیان تھی۔ اس کا سلسلہ میگیاروں کے صرف حکمران طبقے تک محدود تھا۔ آبادی کے بڑے حصے کے جذبات و ضروریات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ فرانسس جوزف نے کشاکش کو نرم کرنے کے لیے دھمکی دے دی، کہ میں ہنگری میں عام بالغوں کا حق رائے جاری کر دوں گا۔ آسٹریا کے متعلق بھی اس کا یہی ارادہ تھا۔ اس طرح غیر مطمئن اقلیتوں کے لیے دروازے کھل جاتے اور عمرانی و اقتصادی تغیرات کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ اس دھمکی نے مخالفین کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ (۱۹۰۶ء)، چنانچہ ضروری اقتصادی اور فوجی قوانین منظور ہوئے۔ انھیں حق مل گیا کہ خود معیار رائے پر نظر ثانی کر لیں۔ یہ کام وہ ملتوی رکھنا چاہتے تھے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء میں ہنگری کے لیے جداگانہ بینک پر نیا بحران پیدا ہو گیا۔ فرانسس جوزف اس وقت تک جداگانہ بینک کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ جب تک معیار رائے کی اصلاح نہ ہو جاتی۔

۱۹۱۰ء میں سٹیفن تسزا نے لبرل پارٹی کو از سر نو زندہ کر لیا۔ اب اس کا نام "قومی خدمت کی پارٹی" رکھا۔ رشوتیں دے کر اور مختلف لوگوں کو ڈرا دھمکا کر انتخاب میں کامیابی حاصل کر لی۔ اسے تشویش تھی کہ روس سے لڑائی شروع ہو جائے گی، اور یقین تھا کہ آسٹریا اور جرمنی ہی ہنگری کے حقیقی رفیق ہوں گے، لہٰذا علیحدگی پسندوں کے مطالبات نظر انداز کر دیئے۔ جو دس سال سے ملک میں ہنگامے کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ہنگری کو کوئی بینک نہ ملا۔ فوج بھی الگ نہ ہوئی۔ معیار رائے میں بھی کوئی خاص اصلاح نہ کی گئی۔ کوشوتیوں کو زبردستی پارلیمنٹ سے نکال دیا گیا۔ مختلف لوگوں کی زبان بندی کر دی گئی۔ تسزا کوشوتی لیڈروں سے لڑنے میں مصروف تھا، جب یکایک اطلاع ملی کہ تاج و تخت کا وارث قتل کر دیا گیا۔

۳۷
سینتیسواں باب

روس

(۱)

سنہ ۱۸۲۵ء - سنہ ۱۹۱۴ء

سلطنت کی حیثیت و نوعیت

مشرقی یورپی سلطنتوں میں تیسری اور سب سے بڑی سلطنت نے ان سیاسی اور عمرانی ترقیات تک پہنچنے میں بمقابلہ یورپ کے دوسرے حصوں کے بہت زیادہ وقت لیا۔ مثلاً روس میں کوئی پارلیمنٹ نہ تھی۔ سنہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد ایک پارلیمنٹ بنی۔ اُس وقت بھی زاروں کو موقع حاصل تھا کہ اس نمائندہ مجلس کو کمزور کر کے اپنے زیر اثر رکھیں۔ زرعی غلامی سنہ ۱۸۶۱ء تک ناسد نہ ہوئی اور کسانوں کے آزاد ہونے سے زرعی مسائل پیچیدہ تر ہو گئے۔ صدی کے ساتویں عشرے نیز سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۰۴ء میں اصلاحات ہوئیں۔ یہ سب باہر کسی فوجی شکست کا نتیجہ تھیں اور عدو درجہ ناگزیر ہو گئی تھیں۔ الگزانڈر دوم (سنہ ۱۸۵۵ء - سنہ ۱۸۸۱ء) کی اصلاحات، جنگ کریمیا (سنہ ۱۸۵۴ء - سنہ ۱۸۵۶ء) میں روس کی شکست کا نتیجہ تھیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء کا انقلاب جنگ روس و جاپان (سنہ ۱۹۰۴ء - سنہ ۱۹۰۵ء) میں روس کی شکست کے باعث ممکن ہوا۔ انیسویں صدی کے بیشتر حصے اور بیسویں صدی کے اوائل میں روسی زار اصلاحات کے باوجود انھیں مطلق العنان اختیارات کے مدعی رہے، جو پیٹر اعظم اور اس کے پیشروؤں کو حاصل تھے۔ گویا روسیوں کو طویل ردّ عمل کا تجربہ ہوا جس میں نکولس اوّل کا پورا دور حکومت (سنہ ۱۸۲۵ء - سنہ ۱۸۵۵ء) نیز سنہ ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۹۰۴ء تک کا ایک لمبا دور جس میں الگزانڈر دوم کے آخری پندرہ سال (سنہ ۱۸۶۶ء - سنہ ۱۸۸۱ء) الگزانڈر سوم کا پورا عہد حکومت (سنہ ۱۸۸۱ء - سنہ ۱۸۹۴ء) اور آخری زار نکولس دوم کے ابتدائی دس سال (سنہ ۱۸۹۴ء - سنہ ۱۹۱۷ء) شامل ہیں۔

وقت کی رفتار سے تطابق میں ناکامی اور مطلق العنانی جاری رکھنے کی مسلسل کوشش نے روس کے اندر غیر معمولی بے اطمینانی پیدا کر دی۔ صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے میں اہل علم کی امیدیں ختم ہو گئیں۔ پھر ان کی جگہ چھٹے اور ساتویں عشرے میں ان لوگوں نے لے لی، جو عمرانی تغیر کے مخالف تھے۔ اسی زمانے میں اولوالعزم انقلابی اور دہشت خیز پیدا ہوئے اور یہ سلسلہ

بعد میں بھی جاری رہا۔ اگرچہ مارکسی افکار سے روسی متعارف تھے، اور ۱۸۹۶ء کے بعد مارکسیوں کی سیاسی جماعتیں موجود تھیں، لیکن روسی انقلابیوں میں نہ ان کی تعداد زیادہ تھی، نہ انھیں زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ مقامی غیر مارکسی انقلابی جماعتیں مدت تک قتل اور تشدد کے دوسرے واقعات کا ارتکاب کرتی رہیں۔ ان سے نظامِ حکومت پر رعشہ طاری ہوا اور بڑے بڑے روسی گروہوں کی امداد حاصل کر لی۔ لینن نے روسی اصول میں ترمیم کر کے انھیں روسی فضا کے مطابق بنا دیا۔ اس کے بعد بالشویکوں کے لیے ایک اہم عطرہ بن جانے کا موقع پیدا ہوا۔ لینن کے اعلیٰ تدبر، حسنِ تدبیر اور کمالِ ہمت کا نتیجہ تھا کہ بالشویک اقلیت ہونے کے باوجود ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں برسرِ اقتدار آ گئے۔ یہ انقلاب بھی عالمی جنگ میں روسیوں کے شدید نقصانات کے باعث ممکن ہوا۔ بالشویکوں کی کامیابی میں کوئی بھی چیز ناگزیر نہ تھی۔

اگرچہ سنسر قائم تھا اور تشدد کی فضا موجود تھی، تاہم انیسویں صدی کے اندر روس میں حیرت انگیز ادبی کتابیں شائع ہوئیں۔ شاعروں، ناول نگاروں اور ڈراما نویسوں نے ایسی کتابیں مرتب کیں۔ جو دنیا کی بہترین تصانیف میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ روس کے ادبی احیاء کی توجیہہ پیش کرنا آسان نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے برف کے بہت بڑے تودے پر ثعلب مصری کے کسی پودے میں یکایک بہار آ جائے اور وہ لہلہا اٹھے۔ روسیوں کی ادبی صلاحیتیں مدت سے محوِ خواب تھیں۔ وہ اٹھیں تو غیر معمولی قوت و حسن کا مظاہرہ کیا

حکومت کی کوشش یہ تھی کہ سولھویں صدی کے نمونے قائم رہیں۔ تاہم روس میں انیسویں اور بیسویں صدی کی فنکاری کا بھی گہرا اثر پڑا۔ نئے وسائلِ ثروت کو ترقی دی گئی۔ ریل کی پٹڑیاں ہزاروں میلوں میں بچھ گئیں۔ کارخانے قائم ہو گئے۔ ان میں بھاری اور ملکی دونوں صنعتوں کے کارخانے تھے۔ مزدوروں کا ایک نیا طبقہ یورپ کے دوسرے مقامات کی طرح روسی شہروں میں بھی جمع ہو گیا، مگر ان کے رہنے سہنے اور کام کرنے کے حالات تمام دوسرے ملکوں کے مقابلے میں حد درجہ خراب تھے۔ مقامی روسی داعیانِ انقلاب کی نظریں کسانوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کام کے لیے کوئی میدان مل جائے اور کسانوں کے مسائل تمام دوسرے مسائل سے زیادہ توجہ طلب تھے، مگر مارکسیوں نے اپنے پیر و مرشد کی تعلیمات کے مطابق نئے پرولتاریوں سے اپنے حامی پیدا کیے اور انھیں کے مسائل پر توجہ مرتکز کیے رکھی، مگر تنظیم میں عنانِ قیادت اہلِ علم و نظر کے صرف ایک چھوٹے سے طبقے تک محدود رکھی۔

نکولس اوّل ۱۸۲۵ء — ۱۸۵۵ء

نکولس اوّل دسمبری انقلاب کی بدنظمی کے دوران میں تخت نشین ہوا تھا۔ خود اس نے تمسخر آمیز انداز میں کہا تھا کہ "میرے عہدِ حکومت کی ابتدا خوب حالات میں ہوئی ہے۔" اسے انقلابیوں کے محرکات سے ایسی گہری دلچسپی تھی کہ خود مجلسِ تحقیقات کی صدارت کرتا رہا۔ ان کی تحریک کے ایک ایک پہلو پر نظر ڈالی اور خود ہی سزائیں تجویز کیں۔ ان میں سے جن لوگوں نے اقبالی بیانات دیئے تھے، ان سے اہلِ روس کی رائے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ روسی اور غیر روسی لبرلوں

نے نکولس کو تمام زاروں سے بڑھ کر مذمت کا ہدف ٹھہرایا ہے۔ اس کی ایسی تصویر پیش کی ہے، گویا وہ ایک بھیانک مطلق العنان تھا۔ یقیناً وہ مطلق العنان اور رجعت پسند تھا۔ اسے فوجی معاملات سے زیادہ دلچسپی تھی، لیکن وہ ایسا بے پناہ مستبد نہ تھا، جیسا کہ اسے پیش کیا گیا۔

نکولس نے سلطنت کے لیے سخت محنت کی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ شاہی الفاظ مقدس ہیں۔ اگرچہ اسے دستوروں سے نفرت تھی، مگر وہ اس لبرل دستور کی عزت کرتا تھا، جو اس کے بھائی الگزانڈر نے پولستانیوں کے لیے منظور کیا تھا، یہاں تک کہ خود پولستانیوں نے بغاوت کی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جو مطلق العنان قوت مجھے حاصل ہے، وہ خدا کی عطا کی ہوئی ہے۔ طبعاً ایسا آدمی انقلاب کے خیال سے بھی متنفر ہوگا۔ وہ بیرونِ ملک میٹرنخ کے نظام سے تعاون کے لیے تیار تھا۔ ملک کے اندر اصلاحات اور تبدیلیوں پر آمادہ تھا، لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ مطلق العنانی کے اساسی ادارے پر کوئی اثر پڑے۔ اگرچہ اسے زرعی غلاموں کے مضر خطرات پر اضطراب تھا، مگر وہ اس میں بھی کوئی بڑی اصلاح کرنے سے خائف تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا، اگر مراعات دے دی گئیں تو اس سے انقلاب کسانوں کے اندر پھیلے گا۔ نکولس کا اصل انحصار امراء پر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ لوگ میری پولیس کے افسر ہیں۔

نکولس کی حکومت اس حد تک شخصی تھی کہ خود اس کے معتمد روسی حکومت میں سب سے بڑھ کر اہم ذریعہ کار بن گئے۔ اس نے بہت سے نئے صیغے قائم کر دیئے۔ انھیں میں رسوائے عالم تیسرا صیغہ بھی تھا، جو سیاسی نگرانی سے متعلق تھا اور جس نے بہت جلد پھیل کر روسیوں کی سیاسی زندگی کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ زار کے محکمۂ انتظامیہ۔ نتیجہ یہ نہ ہوا کہ قدیم نظام حکومت کی کوئی چیز منسوخ کرنی پڑی ہو، البتہ نوکرشاہی کے کاروبار میں خاصا خلل پیدا ہوا۔ کاغذی کارستانی بہت بڑھ گئی اور نااہلی کے باعث بے انصافیوں کا دائرہ بہت پھیل گیا۔ روسی قوانین کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۶۴۹ء میں مرتب ہوا تھا، لیکن یہ ترتیب نہ صحیح اصول پر ہوئی تھی اور نہ اس میں دورِ حاضر کے اصول و مبادی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔

تعلیمی دائرے میں نکولس فنی درسگاہوں کی اصلاح کے حق میں تھا، مگر اسے اس بات پر پریشانی تھی کہ ممکن ہے اس طرح فتنہ انگیز غیر ملکی افکار روسی یونیورسٹیوں میں پہنچ جائیں۔ یورپ میں ۱۸۴۸ء کے انقلابات کے بعد نکولس کے رجعت پسند وزیر تعلیم اوواروف[1] نے سینٹ پیٹرز برگ کی یونیورسٹی میں فلسفے کا مطالعہ روک دیا، کیونکہ اس کے نزدیک اس موضوع کی اقتصادی حیثیت ثابت نہیں ہوئی اور اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اوواروف نے نکولس کی پالیسی تین لفظوں میں جمع کر دی۔ مطلق العنانی، آرتھوڈکسی اور قومیت، یعنی شہنشاہ کے لامحدود اختیارات، روسی کلیسا کا تقدس اور ایسے مسلک سے تمسک جو روس کے قومی کردار کے عین مطابق ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا نظام قائم

---

۱ Uvarov

ہوگیا، جس کی باگ ڈور پولیس کے ہاتھ میں تھی۔ پورا احتساب قائم تھا اور دہشت انگیزی سے کام لیا جاتا تھا، تاہم یہ سب کچھ بیسویں صدی کی مطلق العنانی کے برابر سرگرم واصلح نہ تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نکولس نے ۱۸۳۰ء میں پولستانی بغاوت فرو کردی۔ پھر ۱۸۴۹ء میں ہنگری پسر گوں کو واپس دلانے کے لیے فوجی مداخلت کی۔ وہ حکمرانوں کی خاندانی دوستی کا قائل تھا۔ پروشیا اور آسٹریا کے ساتھ اتحاد پر اسے پورا بھروسا تھا۔ یہ خیال نہ تھا کہ بادشاہوں کے درمیان دوستی کے بجائے متصادم قومی مفادات پیش نظر رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ اس طرح وہ اندازہ نہ کرسکا کہ جرمنی کے اتحاد میں مزاحمت کی کوشش کی گئی تو پروشیا اس کی مخالفت کریگا اور جنوبی و مشرقی یورپ میں خود آسٹریا کا مفاد روسی مفاد سے متصادم ہے۔ وہ اپنے مجوزہ نظام کی کمزوریوں کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور تباہی خیز جنگ کریمیا سے سابقہ پڑا۔

جنگ کریمیا

پیشرو روسی لیڈروں کی طرح نکولس کو بھی یقین تھا کہ عثمانی سلطنت درہم برہم ہونے والی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ سلطان کی آرتھوڈکس مسیحی رعایا کی حفاظت کرے، نیز اہم اقتصادی مفاد پیش نظر تھا۔ جنوب میں روس کے بہت بڑے علاقوں میں گیہوں پیدا ہوتے تھے۔ اُن علاقوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جارہی تھی اور بحیرۂ اسود میں آڈیسہ کی بندرگاہ غلے کی تجارت کا بہت بڑا مرکز بن گئی تھی۔ نکولس کو امید تھی کہ بلقان میں روسی حلقۂ اثر قائم ہو جائے گا، بلکہ وہ استنبول پر بھی قبضے کا متوقع تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے ۱۸۲۰ء کی درمیانی جنگ میں دخل دیا، جب گورنر محمد علی پاشا نے ۱۸۳۲ء میں عثمانی سلطان کے خلاف بغاوت کی اور استنبول خطرے میں پڑ گیا تو نکولس نے ایک روسی فوج وہاں اتار دی۔ اس طرح سلطان کے مرکز حکومت کو بچانے کا اعزاز حاصل کرلیا۔

۱۸۳۳ء میں ترکوں نے روس کے ساتھ انکیار سکلاسی[1] کا معاہدہ کیا۔ اس طرح روس کی خدمت کا بدلا دے دیا۔ نکولس نے سلطنتِ عثمانیہ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ترکوں نے اقرار کرلیا کہ دوسری قوموں کے جنگی جہازوں کو آبنائے باسفورس اور درہ دانیال میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ دنیا کے ایک ایسے علاقے میں جو برطانیہ کے سامراجی اور تجارتی نظام کے لیے حد درجہ ضروری تھا، روس کو از روئے معاہدہ بہت بلند حیثیت حاصل ہوگئی، لہٰذا برطانیہ نے اپنی تدبیریں اس حیثیت کے ختم کرنے پر وقف کردیں۔ ۱۸۳۹ء میں محمد علی پاشا نے پھر بغاوت کی۔ برطانیہ نے اپنے بیڑے سے کام لے کر اس بغاوت کا خاتمہ کردیا اور محمد علی کو روس کی بری فوجوں تک پہنچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ۱۸۴۱ء میں ترکی کے علاقوں کی حفاظت کے لیے تمام دوسری اہم یورپی سلطنتیں روس کے ساتھ شامل ہوگئیں۔ یوں روس کی وہ مستثنیٰ حیثیت باقی نہ رہی، جو اس نے انکیار سکلاسی کے معاہدے سے حاصل کرلی تھی۔

---

[1] Unkiar Skelessi

نکولس نے آئندہ بارہ سال (۱۸۴۱ء — ۱۸۵۳ء) برطانیہ کے ساتھ مفاہمت کی کوشش جاری رکھی کہ اگر سلطنت عثمانیہ درہم برہم ہو تو اس کے علاقوں کا کیا انتظام کیا جائے۔ برطانیہ کو سلطنت عثمانیہ کے جلد درہم برہم ہونے کا خیال نہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ روس کو سلطنت کی بربادی قریب ترلانے سے روکے رکھے۔ غرض برطانیہ اور روس میں غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ ۱۸۵۳ء تک ایسی حالت پیدا ہو چکی تھی کہ زار غلطی سے سمجھ رہا تھا، برطانیہ ترکی میں روسی اقتدار کی مخالفت نہ کرے گا اور برطانیہ غلطی سے سمجھ رہا تھا کہ زار مشورہ کیے بغیر ترکی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے گا۔

پھر ایک اور جھگڑا پیدا ہو گیا کہ آیا فلسطین کے مسیحی مقامات مقدسہ میں خاص مذہبی فرائض ادا کرنے کا حق رومن کیتھولکوں کو ہے، جن کا سرپرست نپولین سوم تھا یا آرتھوڈکس مسیحیوں کو ہے۔ جن کا پشتیبان روس بن گیا تھا۔ فلسطین اس وقت تک سلطنت عثمانیہ کا حصّہ تھا۔ یہ نہایت معمولی سا جھگڑا جنگ کریمیا کا فوری سبب بن گیا۔ مگر اصل سبب زار کا یہ عزم تھا کہ روس کو جو مخصوص حیثیت معاہدۂ انکیار سکلاسی کے مطابق حاصل ہوئی تھی، وہ بحال ہو جائے۔ برطانیہ اسے پورا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ نکولس نے اپنی مستثنیٰ حیثیت کے مطالبے کے ساتھ یہ مطالبہ بھی شامل کر دیا کہ ترک مقامات کا جھگڑا خوش اسلوبی کے ساتھ طے کرلیں۔ جھگڑا طے کیا جا سکتا تھا، مگر روس کو مستثنیٰ حیثیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ نکولس نے اپنے مطالبے بزور پورے کرانے کے لیے ڈینیوبی امارتوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے حالات بہت بگڑ گئے۔ مہینوں تک پُرپیچ سفارتی بات چیت ہوتی رہی اور تمام طاقتوں نے پوری کوشش کی کہ کوئی ایسا موزوں فارمولا مل جائے جس سے جنگ رک جائے۔ لیکن جنگ کی طرف رجحان تیزی سے بڑھتا گیا۔

جنگ کریمیا زیادہ تر سیبسٹوپول[1] کے بڑے روسی بحری مرکز کے محاصرے ہی تک محدود رہی۔ البتہ برطانیہ کے ایک چھوٹے سے سوار دستے نے جو حملہ کیا، وہ شہرۂ آفاق ہونے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اسی طرح فلارنس نائٹنگل نے بیمار اور مجروح سپاہیوں کی زندگی بچانے کے لیے جو سرگرم کوششیں کیں (اور یہ کوششیں بہ لحاظ نوعیت اوّلین تھیں)، انھیں بھی عالمگیر ناموری حاصل ہے۔ فریقین نے جو فوجی کارروائیاں کیں، ان کا انتظام اچھا نہ تھا۔ آخر روسی حوالگی پر مجبور ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں پیریس کے اندر صلح کا معاہدہ ہوا، جس کے مطابق روس کو بحیرۂ اسود میں قلعہ بندیوں اور بیڑے کے قیام کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسی اپنے سواحل کی حفاظت کرنے یا تجارتی جہازوں کو محفوظ رکھنے کے بھی قابل نہ رہے۔ چنانچہ روس کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم مقصد یہ ہو گیا کہ معاہدے میں سے بحیرۂ اسود کی دفعات تبدیل کرائے۔ روس نے جنگ ہی میں شکست نہ کھائی، بلکہ پروشیا نے بھی اس کی مدد نہ کی اور آسٹریا کی روش معاندانہ رہی۔ نکولس اپنی پالیسی کی کامل ناکامی کا مشاہدہ کرنے کے لیے زندہ نہ رہا۔ دورانِ جنگ ہی میں مر گیا اور ۱۸۵۵ء میں اس کا بیٹا الگزانڈر

---

[1] Sebastopol

دوم (۱۸۵۵ء ــــ ۱۸۸۱ء) تخت نشین ہوا۔

الگزانڈر دوم اور اصلاحات

اُس وقت تک روس کی آبادی کا معتدبہ حصہ اصلاحات کا حامی بن چکا تھا۔ یہ ملک کے اندر تشدد اور بیرونِ ملک شکستوں کے طویل دور کا نتیجہ تھا۔ مزید براں انیسویں صدی کے اوائل میں جو اقتصادی صورتِ حال پیدا ہوئی، اس سے زرعی غلامی کا نظام کم منفعت بخش رہ گیا تھا۔ جنوب میں زمین زرخیز تھی اور فصلیں غلہ فروخت کرنے کے لیے بوئی جاتی تھیں۔ وہاں زرعی غلام ہفتے میں عموماً تین دن آقا کے لیے کام کرتے تھے اور بعض اوقات زیادہ۔ شمال میں زمین کم زرخیز تھی اور ضرورت سے زیادہ جنسیں پیدا نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہاں یہ صورت تھی کہ زرعی غلام آقا کے لیے کام نہ کرتے، بلکہ سالانہ نقد روپیہ دے دیتے۔ اس کے لیے وہ گھر میں چھوٹا موٹا کام کرتے یا شہروں میں کسی کارخانے کے اندر مزدور بن جاتے یا چھوٹی موٹی دکان کھول لیتے۔ غالباً ۱۸۵۵ء تک روس کے ایک چوتھائی زرعی غلام کام کی جگہ مالکوں کو نقد روپیہ ادا کرتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شمال یا جنوب میں زرعی غلام کھیتی باڑی کے لیے کوئی سرگرم کارکن نہ تھے۔ جوں جوں صنعتیں ترقی کرتی گئیں، کارخانہ داروں کو تجربہ ہوتا گیا کہ زرعی غلاموں کی جگہ مزدوروں سے کام لینا زیادہ فائدہ مند ہے، لیکن مزدور کمیاب تھے اور بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے روزی کا سامان ضروری تھا۔ بہت سی جاگیریں سلطنت کے پاس گرو پڑ گئیں، کیونکہ ان کا انتظام اچھا نہ تھا۔ اور مالکانِ جاگیرات حد درجہ فضول خرچ تھے۔ اس وجہ سے زرعی غلام زیادہ فائدہ رساں نہ رہے۔

یہ حقیقت روسی مالکانِ اراضی پر بخوبی آشکارا نہ تھی۔ انھیں مبہم طریق پر صرف اتنا علم تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ خرابی پیدا ہو چکی ہے۔ وہ حالات بدستور قائم رکھنا چاہتے تھے اور ایک طبقے کی حیثیت میں زرعی غلاموں کی آزادی کو مشکل کا صحیح حل نہیں سمجھتے تھے۔ اُدھر زرعی غلاموں میں بےچینی بڑھ رہی تھی اور وہ بار بار بڑی تعداد میں بغاوت کر رہے تھے۔ اہلِ علم وسیع پیمانے پر زرعی غلامی کی تنسیخ کے قائل ہو چکے تھے۔ الگزانڈر دوم بھی باپ کے برابر قدامت پسند تھا تاہم اس نے اصلاحات کا ارادہ کر لیا اور زرعی کمیشنوں نے حالات کا مطالعہ کر کے ارکانِ حکومت کے پاس روداد یں پیش کیں۔ آخر آزادی کا قانون بن گیا اور ۱۸۶۱ء کے اوائل میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کے مطابق کہہ دیا گیا کہ زرعی غلام آزاد ہیں۔ کسانوں کی نئی انتظامی تحریک کے اصول وضع کر دیے گئے اور خرید اراضی کے قاعدے بنا دیے گئے۔ مقامی حالات کے پیشِ نظر تقریباً ہر صوبے میں مختلف طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ ہمیں تمام تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ سرکاری زمینوں اور جاگیروں کے کسان آزاد کر دیے گئے اور ہر کسان کو رہنے کا مکان اور تھوڑا سا ٹکڑا زمین کا ہر کسان کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ زمین اتنی ہی تھی، جتنی کسان کا خاندان ماضی میں کاشت کرتا تھا۔ زمین کی مالک دیہاتی پنچایت بنا دی گئی جسے اختیار حاصل تھا کہ اسے وقتاً فوقتاً مختلف گھرانوں میں از سرِ نو تقسیم کرتی رہے۔ حکومت نے یہ زمین مالکوں سے خریدی۔ کسانوں کے لیے لازم

قرار دیا گیا کہ انچاس سال میں قسط وار اس کی قیمت حکومت کو ادا کر دیں۔ مالکانِ اراضی کے پاس صرف اتنی ہی زمینیں رہ گئیں، جتنی وہ اپنے کاشتکاروں کے ذریعے سے کاشت کراتے تھے۔

جس ضابطے کے مطابق چار کروڑ انسان آزاد ہوئے تھے، اسے تاریخ کا سب سے بڑا واحد ضابطہ قرار دیا جاتا ہے۔ یقیناً اس سے کسانوں کے شرف اور عزتِ نفس کو بے حد اخلاقی تحریک ملی، لیکن مشکلات بھی خاصی تشویش افزا تھیں۔ کسان کے لیے لازم تھا کہ جو زمین اسے دی گئی ہے اسے قبول کرے، اور چونکہ پورا کنبہ محاصل اور قیمت زمین ادا کرنے کا ذمہ دار تھا، اس لیے ادھر ادھر آجا نہیں سکتا تھا۔ پنچایتوں نے مالکوں کی جگہیں لے لیں اور مختلف مقامی حالات نے انتظامات میں مشکلات پیدا کیں۔ مزید براں کسانوں کو عموماً کم زمینیں ملیں اور قیمت زیادہ رکھی گئی۔ پھر انھیں جنگلات اور چراگاہوں کے لیے کوئی ٹکڑا نہ ملا۔ تصفیہ بڑی کشادہ دلی سے کیا گیا اگرچہ اس سے اصل مسائل حل نہ ہوئے اور اگرچہ اس کے ناکافی ہونے کے باعث ایک زرعی بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی۔

پہلے مالکانِ اراضی کو جاگیروں میں عدالت اور پولیس کے اختیارات حاصل تھے وہ ختم ہوئے تو پورے مقامی انتظامیہ میں اصلاح کرنی پڑی۔ ۱۸۶۴ء میں ایک قانون کے ذریعے سے صوبائی اور اضلاعی مجلسیں بنائی گئیں، جنھیں زیمیزتوو[1] کہتے تھے۔ ان کے لیے پُرپیچ انتخابی نظام رکھا گیا جس کے تحت ووٹروں کو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ تاہم ان مجلسوں میں کسانوں کو خاصی نمائندگی مل گئی۔ یہ مجلسیں مقامی مالیات، تعلیم، طبی نگرانی، سائنٹیفک زراعت، سڑکوں کی درستی اور ایسے ہی دوسرے اقتصادی و عمرانی معاملات کا انتظام کرتی تھیں۔ بعض حالات میں ان مجلسوں کو بالکل ابتدا سے سب کچھ کرنا پڑا اور انھوں نے بڑی ترقی کی۔ پرائمری سکول قائم کر دیے۔ انتظاماتِ حفظانِ صحت میں اصلاح کی۔ شہریوں کے ہر طبقے کے لیے درسگاہیں قائم ہو گئیں اور لاکھوں روسیوں کو احساس ہو گیا کہ یہ اقدام مرکزی پارلیمنٹ یا دوما[2] کے قیام پر منتج ہو گا۔ اگرچہ لوگوں نے حکومت پر بہت زور دیا، مگر پارلیمنٹ منظور نہ ہوئی، جزواً اس لیے کہ ۱۸۶۶ء میں زار پر پہلا قاتلانہ حملہ ہوا تو حکومت اصلاحات سے منہ موڑ کر تشدد پر اتر آئی۔

اس سے پیشتر بہت سے اقدامات ہو چکے تھے۔ شہروں میں بلدی مجلسیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان کے فرائض ویسے ہی تھے، جیسے دیہات میں زیمیزتوووں کے تھے۔ روس کے عدالتی نظام اور قانونی عمل کی اصلاح کی گئی، جن میں جابجا بے انصافیاں موجود تھیں۔ پہلی مرتبہ جیوریوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ مقدموں پر بحثیں برسرِعام ہوتیں۔ تمام طبقے قانون کی نظروں میں مساوی بنا دیے گئے۔ عدالتوں کے نظام کو کاملاً درست کر دیا گیا۔ احتساب میں سختی قائم نہ رہی۔ نئے مدارس کی

---

[1] Zemsivos

[2] Ouma

حوصلہ افزائی ہوئی۔ نکولس نے یونیورسٹی پر جو پابندیاں عائد کی تھیں، وہ ختم کردی گئیں۔ فوجی خدمت کے دقیانوسی اور وحشیانہ نظام کو دورِ حاضر کے اصول پر لے آئے اور اس کی سختیاں گھٹا دی گئیں۔

یہ حیرت انگیز کام تھوڑی سی مدت میں پورے ہو گئے۔ ۱۸۶۶ء میں الگزانڈر دوم پر انقلابیوں نے حملہ کیا۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۱ء میں اسے مار ڈالا گیا۔ اس واقعے کو ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کرنا ناممکن ہے۔ جب تک نکولس اور الگزانڈر کے ماتحت روسیوں کی ذہنی زندگی کا جائزہ نہ لیا جائے۔

روسیوں کی ذہنی زندگی

نکولس کے ابتدائی عہد میں روسی پروفیسر اور طلبہ جرمن فلسفیوں کے زیرِ اثر فنون، فلسفے اور مذہب پر سرگرم بحثیں کر رہے تھے۔ یونیورسٹیوں کے دائرے سے باہر بھی اہلِ علم نے یہ بحثیں شروع کر دیں۔ یہ پہلا گروہ ہے، جسے اہلِ علم و نظر قرار دیا گیا اور یہ ہر اعتبار سے ایک روسی طبقہ تھا۔ صدی کے چوتھے عشرے میں انھوں نے دنیا میں روس کے مقام پر بحث شروع کر دی، خصوصاً اس نقطۂ نگاہ سے کہ مغرب کے ساتھ حقیقی تاریخی تعلق کی نوعیت کیا ہے اور آئندہ اس کے لیے مناسب طریقِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ انھیں بحثوں سے دو دبستانِ فکر پیدا ہو گئے، جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایک حامیانِ مغرب کا دبستان[1]، دوسرا اسلافیوں سے دوستی کا دبستان[2]۔

حامیانِ مغرب نے اپنا نقطۂ نگاہ ایک مشہور دستاویز میں پیش کیا، جو "فلسفیانہ مکتوب"[3] کے نام سے مشہور ہوئی اور ۱۹۲۶ء میں چھپی، اگرچہ اس سے پیشتر لکھی گئی تھی۔ چادالیف[4] اس کا مصنف تھا۔ اس نے بیزنطینی مسیحیت اور روسی ارتقاء پر تاتاری حملے کے نقصان رساں اثرات کا ماتم کیا اور اعلان کر دیا کہ روس نے دنیا کی ترقی میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اس نے کہا کہ پیٹرِ اعظم مستحق مبارکباد ہے، جس نے روس کو مغربیت کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ یہ قدم صحیح سمت اٹھایا گیا تھا۔ اس کے نزدیک رومی کلیسا بہت سی ایسی چیزوں کا سرچشمہ تھا، جن سے مغرب کو بڑے فائدے پہنچے اور روس ان فائدوں سے محروم رہا۔ نکولس اوّل نے چادالیف کے لیے دیوانگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا اور حکم دے دیا کہ اسے گھر میں نظر بند رکھا جائے اور ایک ڈاکٹر روزانہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہے، مگر حقارت اور احتساب کے باوجود حامیانِ مغرب خاموش نہ رہے۔ وہ برابر اعلان کرتے گئے کہ روسی معاشرہ اصلاً مغرب جیسا ہے، لیکن تاریخ نے اس کے پورے نشو و ارتقاء میں تاخیر پیدا کر دی۔ اب روس کے لیے ضروری ہے کہ اس تاخیر کی تلافی کر لے۔ مطلب یہ تھا کہ روس مطلق العنانی کے

۱۔ Westerners

۲۔ Slavophiles

۳۔ Philosophical Letter

۴۔ Chaadaff

دورسے ابھرے، مغرب کی طرح پارلیمانی حکومت اور دستوری بادشاہی کا راستہ اختیار کرلے۔

حامیانِ مغرب کے مخالفوں یعنی سلافی قوموں سے دوستی کے حامیوں نے پُرزور دلیلیں دیں کہ روس کی اپنی قومی روح ہے جس طرح ہرڈر نے جرمنوں کی قومی روح دریافت کی تھی۔ روس مغرب سے بالکل مختلف ہے۔ سلافیوں کا آرتھوڈکس مذہب مغرب کے کیتھولک مذہب کے خلاف اور قانونی پیچیدگیوں اور تنگ نظریوں سے بالکل پاک ہے۔ اس میں استواری زیادہ ہے۔ پاکیزہ جذبات زیادہ ہیں۔ اس کا دائرۂ فکر و نظر زیادہ وسیع ہے۔ سلافیوں سے دوستی کے حامی پیٹر کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، کیونکہ اس نے روس کو غلط راستے پر لگا یا وہ کہتے تھے کہ مغرب کی نقل نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔ روس کے بالائی طبقوں کا فرض ہے کہ یورپی طور طریقے چھوڑ دیں اور سادہ روسی کسانوں سے سبق حاصل کریں، جو دیہاتی پنچایتوں میں خالص روسی اصول کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک مغربی یورپ شہری اور سرمایہ پرست تھا۔ روس دیہاتی اور زرعی تھا۔ مغربی یورپ مادیت کا شکار ہو چکا تھا، لیکن روس گہری روحانیت سے معمور تھا۔ حامیانِ مغرب کی طرح سلافی اقوام کی دوستی کے داعی بھی قومی مذہب کو خاص اساسی اہمیت دیتے تھے اور انھوں نے اسی کو اپنے دلائل کی بنیاد بنا رکھا تھا، مگر وہ لوگ مذہب کی ستائش میں سرگرم تھے اور مغربیت کے حامی اسے بُرا بھلا کہتے تھے۔ حامیانِ مغرب کے نقطۂ نگاہ میں جمہوری اور دستوری سیاسی مقاصد مضمر تھے، دوسرا گروہ دستوریت اور جمہوریت کا مخالف تھا۔

یہ جان لینا حد درجہ ضروری ہے کہ سلافیت کے حامیوں نے نکولس اوّل کے قومی اصول کو نہیں اپنایا تھا اور نہ وہ اس کے نظام حکومت کے حامی تھے۔ وہ مبالغہ آمیز قوم پرست نہ تھے، جو آگے چل کر نمودار ہوئے وہ استبداد کے سخت مخالف تھے۔ نکولس اوّل کے پورے نوکرشاہی نظام کی ویسی ہی مذمت کرتے تھے، جیسی حامیانِ مغرب کی زبانوں پر جاری تھی۔ سلافیت کے حامی چاہتے تھے کہ کوئی ایسی نیا نظم، سرپرستانہ اور ہمدرد بادشاہی وجود میں آجائے، جیسی ان کے تصور کے مطابق پیٹر سے پیشتر موجود تھی اور وہ مغربی وضع کی دستوری حکومت نہیں چاہتے تھے۔ مرکزی پارلیمنٹ کے بجائے ان کی نظر میں دورِ جاگیرداری کی مجلس پر جمی ہوئی تھیں، جو ماسکو میں قائم تھی یعنی "زیمسکی سبوڑ"[1] اور ایسے ہی دوسرے اداروں کے خواہاں تھے، جو پیٹر سے پیشتر کے زاروں نے قائم کر رکھے تھے۔ ان میں سے انتہا پسند وہ لباس پہن کر بازاروں میں پھرتے تھے، جسے پیٹر نے خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ اکثر اہلِ علم دونوں مخالف گروہوں کے درمیان رائیں بدلتے رہتے تھے اور ان میں سے کم تر نے کسی ایک گروہ کے پورے افکار اختیار کیے۔

مثلاً الگزانڈر ہرزن[2] (۱۸۱۲ء — ۱۸۷۰ء) نے حامیانِ مغرب کی حیثیت میں علمی دور کی ابتدا کی اور وہ

---

[1] Zemski Sobor [2] Herzen

فرانسیسی ثقافت کا سرگرم حامی تھا ۔ وہ ایک امیر کا ناجائز بیٹا تھا ۔ باپ کے گھر میں تربیت پائی ۔ بڑا دلربا، خوش سیرت اور حد درجہ ذکی آدمی تھا ۔ اکثر روسیوں کی طرح وہ مغربی معاشرے کا پورا رازداں نہ تھا اور صرف اس خیال پر خوش تھا کہ اس معاشرے کا نظام بوسیدہ ہو چکا ہے اور اس کا درہم برہم ہو جانا مقدر ہے ۔ ۱۸۴۸ء میں اس کے اندر انقلاب ہوا، جو ناکام رہا ۔ یہ سب کچھ اس نے آنکھوں سے دیکھا ۔ یقین ہو گیا کہ جو کچھ دیکھا درست ہے ، اس کے بعد وہ انقلابی اشتراکی بن گیا ۔ یہ بھی یقین ہو گیا کہ حامیانِ مغرب کا نظریہ غلط ہے ۔ روس کس طرح تھوڑے سے وقت میں ارتقاء کی وہ تمام منزلیں طے کریگا ، جو مغرب نے صدیوں میں طے کیں اور روس کوئی حصّہ نہ لے سکا ۔ جو تجربے مغرب کو ہوئے ، روس ان سے بالکل محروم رہا ۔ اس بنا پر ہرزن سلافیت کا حامی بن گیا ۔ انقلابی کی حیثیت میں اس کی دعوت یہ تھی کہ تمام موجودہ ادارے تباہ کر دیئے جائیں اور سلافیت کے حامی کی حیثیت میں اس کی نظر روس پر جمی ہوئی تھی ۔ اس سلسلے میں وہ کسانوں کی پنچایت یعنی "میر[1]" کو ایک خاص روسی ادارہ سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ پورا یورپ یہی ادارہ اختیار کرے ۔ ہرزن ایک ذی اثر داعی بن گیا ۔ اس نے لندن سے روسی زبان کا ایک اخبار جاری کیا ۔ جو روسی اہلِ علم میں وسیع پیمانے پر پڑھا جاتا تھا ۔ نکولس کے عہد میں جو ذہنی جوش و خروش موجود تھا ، اس کی بہترین تصویر غالباً ہرزن کے خود نوشتہ سوانح میں محفوظ ہے ۔

میکائیل بکونن[2] (سنہ ۱۸۱۴ء ۔ سنہ ۱۸۷۶ء) بھی تقریباً انھیں نتائج پر پہنچا ، جن پر ہرزن اسی زمانے میں پہنچا تھا ، لیکن بکونن زیادہ عملی انارکسٹ تھا ۔ اسے تشدد سے محبت تھی اور وہ امن پسند اہلِ قلم تھا ۔ انقلابات میں حصّہ لینا اس کے لیے انتہائی مسرت کا باعث تھا ۔ اور وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں بارہا قید ہوا اور رہائی پائی ۔ وہ ایک بہت بڑے انقلاب کا منتظر تھا جو پراگ سے ماسکو تک پھیل جانے والا تھا ۔ پھر باقی یورپ اس کی موجوں کے تلاطم کا ہدف بنتا ۔ اس کے بعد ایک سخت گیر ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جاتی ۔ اس کے سوا مستقبل کے متعلق اس کے خیالات سراسر مبہم تھے ۔ دہریت اس کے پروگرام کا بنیادی حصّہ تھی ۔ مارکسیوں کی طرح وہ اسے وقتی اور اتفاقی جزو نہیں سمجھتا تھا ۔ بکونن مدت تک باہر بیٹھا ہوا روسی انتہا پسندوں پر خاصا اثر ڈالتا رہا ۔

۱؎

۲؎ Bakunin

اڑتیسواں باب

روس

(۲)

سنہ ۱۸۲۵ء ۔ سنہ ۱۹۱۴ء

نہلزم اصولِ قبضۂ جمہور اور دہشت پسندی

صدی کے ساتویں عشرے میں، خصوصاً زرعی غلاموں کی آزادی کے بعد روسی اصحابِ علم و نظر میں یورپ کے دوسرے ہمسروں کی طرح پیشروؤں کی رومانیت پسندی کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ انھیں مثالیت پسندی، مذہب، ماوراء الطبیعیات کے باب میں شبہات پیدا ہوئے اور انھوں نے فن معاشرہ کے متعلق نہایت تنگ نظرانہ افادیت پسندی کا نظریہ اختیار کرلیا۔ جیسا کہ ان میں سے ایک نوجوان نے یہاں تک کہہ دیا کہ دورِ احیاء علوم کے بڑے بڑے مصوروں نے مریم عذرا کی جتنی تصویریں بنائیں، میرے نزدیک ان سے جوتے کا ایک جوڑا زیادہ قیمتی ہے۔ ہر فن کا کوئی عمرانی مقصد ہونا چاہیے اور جن رابطوں نے افراد کو معاشرے کے ساتھ سختی سے باندھ رکھا ہے، انھیں توڑ دینا چاہیے۔ یہ ماں باپ کی بزرگی، شادی کے بندھن، مراسم کا استبداد سب چیزیں ہیچ ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نہلسٹ کا نام جلد سے جلد رواج پا گیا یعنی وہ لوگ جو کسی چیز پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ ایک مشہور ناول نگار ترجی نیو[1] نے اپنے ناول "باپ اور بیٹے"[2] کے ہیرو بیزاروف[3] میں نہلسٹ کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کر دیا ہے۔ بیزاروف سخت گستاخ، ہر شے سے متنفر، حد درجہ ضدی اور سرکش ہے۔ اسی کو نوجوان اہلِ علم کے نزدیک مسلّمہ مراسم کے خلاف بغاوت کا پیکر سمجھا جاتا ہے، لیکن اصلاً نہلزم[4] کوئی سیاسی تحریک نہ تھی۔ بہت سے نہلسٹ ایسے تھے، جنھیں سیاسیات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ اپنے والدین سے کہتے کہ یہ سارا اخلاقی نظام ختم کر دو اور جس روسی کی عمر پچیس سال سے اوپر ہو جائے، اسے جہنم رسید کر دو۔ والدین یہ سنتے تو سراپا حیرت بن جاتے۔ اس بات پر نہلسٹ خوش ہوتے۔

۱؎ Turgenev ۲؎ Fathers and Sons

۳؎ Bazarov ۴؎ Nihilism

ساتویں عشرے میں بہت سے نوجوان روسی طالب علم سوئٹزرلینڈ گئے۔ وہاں کے قدامت پسند بورژوا کو یہ دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی کہ مرد بال لمبے رکھتے اور لڑکیاں بال ترشوا دیتیں اور ان کی روش صد درجہ گستاخانہ ہوتی۔ بلند آواز سے بات کرتے۔ روسی انقلابی کی پہلی طنزیہ تصویر وہی ہے، جو سوئٹزرلینڈ کے باشندوں نے نہلسٹوں کو پیش نظر رکھ کر کھینچی تھی اور اس وقت تک نہلسٹوں نے سیاسی انقلاب سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ان کی روش سے ہرزن کے دل کو بھی سخت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ سنہ ۱۸۷۰ء میں مرا۔ اس وقت تک علمی قیادت اس سے چھن چکی تھی۔ بکونن نہلسٹوں کو خوب سمجھتا تھا۔ جو سوئٹزرلینڈ میں قیام پذیر رہے، ان پر بکونن نے خوب اثر ڈالا۔ انھیں روس واپس بھیج دیا کہ جاؤ اور کسانوں کو فوری انقلاب کی دعوت دو۔

سوئٹزرلینڈ میں دو اور روسی انقلابی مفکر موجود تھے، یعنی لَوروف[1] اور تکاچیف[2]۔ لَوروف (سنہ ۱۸۲۳ء۔ سنہ ۱۹۰۰ء) اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دیتا تھا کہ اہل علم ہونے کے باعث تم پر روسی کسانوں کے بہت سے حقوق ہیں۔ انھی کسانوں کی محنت سے پشت ہا پشت تک تمہارے آباؤ اجداد راحت و شادمانی کی زندگی بسر کرتے رہے اور تمھیں تعلیم دلانے کے قابل ہوئے۔ لَوروف معاملات کے سمجھانے میں بکونن سے زیادہ حقیقت پسند تھا اور روسی کسانوں کے متعلق اس کے اندازے زیادہ صحیح تھے۔ اس نے نہلسٹوں کو سمجھایا کہ اپنی تعلیم مکمل کرو۔ روس واپس جاؤ۔ کسانوں میں پہنچ جاؤ۔ انھیں تعلیم دو اور ایک فوری عوامی انقلاب کے لیے ان میں پروپیگنڈا کرو۔ اس کے برعکس تکاچیف (سنہ ۱۸۴۶ء۔ سنہ ۱۸۹۶ء) یہ تعلیم دیتا تھا کہ کسان عوام سے کسی انقلاب کی توقع ہی نہیں ہو سکتی۔ انقلاب ایک حد درجہ منظم اور انقلابیوں میں سے ایک چھوٹی سی جماعت کے ذریعے سے ہوگا، جو اختیارات پر قابض ہو جائے گی۔ تکاچیف زندگی میں تو کچھ زیادہ مؤثر نہ بن سکا، مگر آخری دور میں لینن کے خیالات پر اس نے گہرا اثر ڈالا اور زیادہ اہم بن گیا۔

ایسے معلموں، خصوصاً بکونن اور لَوروف کے زیر اثر روسی نہلزم نے ایک نئی تحریک کی شکل اختیار کر لی، جسے "قبضۂ جمہور"[3] کہا جاتا ہے۔ نوجوان مردوں اور عورتوں نے مثالیت پسندی کے جوش میں روس واپس جانے اور کسانوں کے درمیان زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں حکومت نے ایک فرمان کے ذریعے سے ان سب کو واپس بلایا تو معلوم ہوا کہ وطن میں ایک متوازی تحریک جاری ہو چکی تھی۔ تقریباً تین ہزار نوجوانوں نے دیہات میں مدرسگاہوں، سرائے داروں اور دستور منیجروں کی خدمات سنبھال لی تھیں۔ بعض نے انقلابی افکار پھیلائے، بعض محض مجلسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مگر

---

[1] Lavrov
[2] Tkachev
[3] Populism ، اس تحریک کا مطلب یہ تھا کہ تمام چیزیں جمہور کے قبضے میں آ جائیں۔

جلد ہی کسانوں کے متعلق رومانیت پسندانہ تصورات ختم ہو گئے۔ ان نوجوانوں کو قطعاً معلوم نہ تھا کہ کسانوں کی طرح لباس کیونکر پہنیں اور ان کے انداز کے مطابق بات چیت کیونکر کریں۔ کسانوں کے دل میں ان کی گفتگو سن کر شبہات پیدا ہوتے اور وہ سرکاری افسروں کے پاس ان کی شکائتیں کر دیتے۔ چنانچہ "قبضۂ جمہور" کے داعی ہر جگہ نمایاں ہو گئے اور پولیس با آسانی ان کا سراغ لگا لیتی اور انھیں گرفتار کر لیتی۔ آٹھویں عشرے میں دو بڑے مقدمے چلے، جن میں پہلی مرتبہ عوام کو اس نئی جمہوری تحریک کے متعلق علم ہوا۔ مقدمات کے بعد "قبضۂ جمہور" کے جو حامی بچ رہے تھے، انھوں نے فیصلہ کیا کہ ایک زبردست انقلابی تنظیم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں ایک انجمن بنی، جس کا نام تھا "زمین[1] اور آزادی" ساتھ ہی روسی انقلابی تحریک کا عہد کودکی ختم ہو گیا۔

انقلابیوں کو الگزانڈر دوم کے عطائے اصلاحات سے تقویت پہنچی۔ بے چینی بڑھ چکی تھی کہ کسی کو یقین نہ تھا، کوئی روسی حکومت اتنی تیزی سے اصلاحات نافذ کر سکتی جو انتہا پسندوں کے لیے باعثِ اطمینان ہوتیں۔ وہ عزم کر بیٹھے تھے کہ نظام حکومت کا تختہ تشدد کے ذریعے سے الٹ دیں اور تدریجی و جزوی اصلاحات سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ روسی اشتراکیت، جان سٹوارٹ مل اور مغربی مثالیت پسندوں، مثلاً فوریا اور رابرٹ رووِن کی تحریرات سے فائدہ اٹھا رہی تھی اور مارکس کا اثر اس پر زیادہ نہیں پڑا تھا۔ بعض اعتبارات سے یہ سلافیت کی طرف راغب تھی۔ یہ شہری نہ تھی، دیہاتی تھی۔ اس کا رجحان ارتقائی نہیں، انقلابی تھا۔ یہ عوامی سیاسی جماعت نہ تھی، بلکہ سازش تھی۔ اس کے ارکان روپوش رہتے اور انہوں نے سازشی نفسیات میں کمال پیدا کر لیا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ بزور روا معاشرے کا تختہ الٹ دیں۔ یہ تحریک زیادہ انتہا پسندانہ ہوتی گئی۔ ۱۸۷۹ء میں ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ جو لوگ سمجھتے تھے کہ دہشت کو حربے کے طور پر استعمال کرنا ضروری ہے، وہ دوسروں سے الگ ہو گئے اور انہوں نے ایک نئے گروہ کی بنیاد رکھی، جس کا نام تھا "ارادۂ[2] جمہور" جو لوگ دہشت انگیزی کے خلاف تھے، انہوں نے اپنی جماعت کا نام رکھا "افتراق[3] سیاہ"

"ارادۂ جمہور" کے ارکان خود زار الگزانڈر دوم کے پیچھے پڑ گئے۔ اس پر گولی چلائی گئی، مگر خطا گئی۔ جس راستے سے اس کی ٹرین گزر رہی تھی، اس کے نیچے سرنگ لگائی، لیکن غلط ڈبہ اڑ گیا۔ شاہی محل میں ایوان طعام کے نیچے سرنگ لگا کر ڈائنامیٹ بچھا دیا گیا، مگر زار اس رات تاخیر سے کھانے کی میز پر پہنچا اور بچ گیا۔ اس کی جگہ گیارہ ملازم اڑ گئے۔ جس بازار سے زار سیر کے لیے گزرتا تھا، اس میں پنیر کی ایک دکان کرایے پر لے لی۔ اندر سے سرنگ لگا کر گزرگاہ کے

---

[1] : Land and Liberty

[2] Peoples Will

[3] Black Partition

نیچے تک پہنچادی، مگر زار اس راستے سے گزرا ہی نہیں۔ آخر اسے مارچ ۱۸۸۱ء میں ایک معمولی دستی بم سے مارا گیا اور قاتل بھی اسی بم سے اڑ گیا۔ مدورجہ المناک واقعہ یہ ہے کہ الگزانڈر دوم نے اسی روز ایک دستاویز پر دستخط کیے تھے، جس کا مدعا یہ تھا کہ ایک مشاورتی مجلس بلائی جائے۔ ہر شخص کو امید تھی کہ نئی دستوری اصلاحات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس کے جانشین رجعت پسند الیگزانڈر سوم (۱۸۸۱ء — ۱۸۹۴ء) نے مذکورہ دستاویز کی توثیق سے انکار کر دیا اور روس جبر و تشدد کے نئے طوفان کے تھپیڑے کھاتا رہا۔ دہشت پسندوں کو گرفتار کر کے سزائیں دی گئیں اور ان کی تنظیم درہم برہم کر ڈالی گئی۔ اگرچہ وہ وقتاً فوقتاً انتہائی عوامی حمایت کے بلند بانگ دعوے کرتے رہے، مگر وہ مٹھی بھر لوگوں سے زیادہ نہ تھے اور ان کی تحریک ناکام رہی۔

الگزانڈر دوم کی خارجہ پالیسی خارجہ پالیسی میں الگزانڈر کا ریکارڈ غیر متوازن ہے۔ ۱۸۶۳ء میں روسیوں نے پولستانی بغاوت کامیابی سے فرو کر دی۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و پرشیا نے موقع بہم پہنچادیا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے بحیرۂ اسود کے متعلق معاہدۂ پیرس کی تمام دفعات ختم کر دیں اور یکطرفہ اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ ان کی پابندی نہ کریں گے۔ یہ غیر آئینی فعل تھا، مگر یورپی طاقتوں نے بادل نخواستہ اسے منظور کر لیا۔ یہ بداخلاقی کی ایک اور مثال تھی، جسے بسمارک نے بین الاقوامی معاملات میں رواج دیا تھا۔

۱۸۷۷ء میں روسیوں نے بوسنیا، ہرزیگوینا اور بلغاریہ کے باغی بلقانی مسیحیوں کی طرفداری میں ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ ۱۸۷۸ء میں سان اسٹیفانو[1] کے مقام پر معاہدہ ہوا۔ روس نے تمام سابقہ معاہدوں کے خلاف ایک بڑی بلغاری ریاست شکست خوردہ ترکوں سے آزاد کرالی۔ روسی پالیسی کے کارفرماؤں کو امید تھی کہ اس ریاست کو ایک مفید بلقانی کارندہ بنا لیا جائے گا۔ لیکن اسی سال برلین میں طاقتوں کی ایک کانگرس منعقد ہوئی جس میں سان اسٹیفانو کا تختہ الٹ دیا گیا۔ وہاں یہ قرار پایا کہ بلغاریہ کے صرف ایک تہائی حصے کو خود اختیاری حقوق دیے جا سکتے ہیں۔ مزید ایک تہائی نے الگ خود اختیاری حقوق حاصل کر لیے۔ بلغاریہ کا جو حصہ باقی رہ گیا، وہ ترکوں کو واپس مل گیا۔ روسی رائے عامہ نے سخت غم و غصہ کا اظہار کیا کہ طاقتوں نے روس کو جنگ میں حاصل کیے ہوئے فوائد سے محروم کر دیا ہے۔ ان لوگوں کے درمیان تلخی بطور خاص تیز تھی، جو تمام سلافی گروہوں کو ایک وفاق میں متحد کر دینا چاہتے تھے۔ انھیں پان سلافی کہا جاتا تھا، مگر انھیں سلافیت کے حامیوں سے الگ سمجھنا چاہیے۔

ایشیا میں نکولس اوّل کے ماتحت چینی علاقے کے اندر تصرفات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا (یعنی وادی دریائے آمور میں) اسے ۱۸۶۰ء کے معاہدے سے حاصل کر لیا گیا۔ بحرالکاہل کے ساحلی علاقے پر روس نے جو نوآبادیاں قائم

---

[1] Stefans

کی تھیں، وہ ترقی پذیر رہیں۔ وسط ایشیا میں مختلف ترک خانوں کی امارتیں فتح کر لی گئیں اور تاج کو زیادہ زرخیز زمینیں مل گئیں، مگر یہ پیش قدمی ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد کی طرف تھی، اس وجہ سے روس ایک ایسے خطے میں پہنچ گیا جس سے برطانیہ کا خاص مفاد وابستہ تھا۔ یوں برطانیہ میں رائے عامہ کے لیے اشتعال کا سامان پیدا ہوا۔

ردِّ عمل (۱۸۸۱ء — ۱۹۰۴ء)

الگزانڈر سوم کا عہد اور اس کے بیٹے نکولس دوم کے ابتدائی دس سال ۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۴ء ربع صدی کا ایک ایسا دور ہے جس میں پالیسی مستقل رہی۔ دونوں زاروں کو لبرلزم سے نفرت تھی اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ جو کچھ دیا جا چکا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ الگزانڈر سوم کے ماتحت ایک کسان بینک بن گیا تھا۔ اس نے کسانوں کے زرِ ملکیت کی ادائی میں آسانی پیدا کر دی۔ مزدوروں کے لیے چند قوانین بسمارک کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے۔ اس سے کام کاج کی حالت کسی قدر بہتر ہو گئی۔ مثلاً عورتوں کے لیے کام کے گھنٹے کم کر دیئے گئے۔ ان کے مقابلے میں ایک خاص بینک قائم ہوا، جو افلاس زدہ امراء کو روپیہ قرض دیتا۔ احتساب ازسرِ نو شدت سے جاری کر دیا گیا۔ الگزانڈر دوم نے دیہات میں ایسے جج مقرر کیے تھے جن کا انتخاب ہوتا۔ ان کی جگہ اوپر سے جج مقرر ہونے لگے۔ شہری مجلسوں اور دیہاتی پنچایتوں کے لیے انتخاب زیادہ سخت کر دیا گیا۔ اب اقلیت والی قوموں پر زبردست جبر شروع ہوا۔ پالیسی یہ تھی کہ انھیں "روسی" بنا لیا جائے۔ یہ نکولس کے قومیت والے فارمولے کے عین مطابق تھی۔ فنی، پولستانی، یوکرینی، ارمنی اور یہودی سب اس امتیاز کا ہدف بنے۔ جبر و تشدد کا دائرہ بہت وسیع تھا، مثلاً فن لینڈ کے باشندوں کے اپنے ادارے موجود تھے، وہ ختم کر دیئے گئے اور یہودیوں کو حکومت کی سرپرستی میں قتل کر دیا۔ نکولس دوم نے تخت نشین ہوتے ہی کہا کہ کسی تغیر کی امید رکھنا ایک بے معنی خواب ہو گا۔

اسی زمانے میں روسی ریلوں کا جال جا بجا بچھ گیا، جو زیادہ تر حکومت کے روپے سے تعمیر ہوئیں اور حکومت ہی ان کی مالک تھی۔ ڈونٹس میں کوئلے کی کانوں کے اندر پہلی مرتبہ کام شروع ہوا۔ باکو کے چشموں سے تیل نکلنے لگا۔ فولاد اور کپاس کی مقدار بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۹۲ء میں وِٹّے[ل] نام ایک شخص وزیرِ مال بنا، جس نے ریلیں بنانے میں دولت حاصل کی۔ آئندہ بارہ سال روز افزوں اقتصادی ترقی کا ذمہ دار بنا رہا۔ اس نے سائبیریا میں ریل بنوائی۔ روس کے لیے طلائی معیار قائم کر دیا۔ خارجی سرمایہ روس کے اندر کھنچا، خصوصاً فرانس سے۔ اس طرح بجٹ متوازن ہو گیا اور دیسی شراب پر حکومت کی اجارہ داری جزوًا قائم کر لی گئی۔ ریلوں کا جال ۱۸۹۴ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیان دگنا ہو گیا۔ ان کی وجہ سے فولاد کی صنعت کو تحریک ملی۔ شہری مزدوروں کی تعداد بڑھ گئی۔ کام کاج کے سخت برے حالات کے خلاف بار بار ہڑتالیں ہوئیں۔ چنانچہ ان حالات کی درستی کے لیے قانون منظور کیے گئے، مگر انھیں نافذ کرنا مشکل تھا۔

ل Witte

ان حالات میں بہت سے نوجوان انقلابی اب مارکس کی سائنٹیفک اشتراکیت کی طرف متوجہ ہوئے، یعنی انھوں نے طبقاتی کشمکش کی دعوت دی، اور پیش گوئی کردی کہ سرمایہ داری کا زوال ناگزیر ہے۔ اہل علم کا ایک چھوٹا سا خفیہ گروہ سنٹ پیٹرزبرگ میں منظم ہوا (۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۵ء) اس نے فیصلہ کیا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے طبقاتی نظام کے مخالفوں سے اتحاد کرلینا چاہیے۔ ان میں لینن بھی شامل تھا۔ یہ ایک سرگرم نوجوان عملی آدمی تھا جس کا تعلق طبقۂ اوسط کے بالائی حصے سے تھا اور اس کا بھائی الگزانڈر سوم پر قاتلانہ حملے کی کوشش میں پھانسی پا چکا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں اس گروہ نے دوسروں سے مل کر سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بنائی، جس نے سنہ ۱۹۰۱ء میں اپنا اخبار جاری کر لیا۔ اس پارٹی میں تنظیم کے متعلق جھگڑے پیدا ہو گئے۔ جھگڑوں کی بنیاد یہ تھی کہ آیا پارٹی ایک مرکزی نظام کے ماتحت کام کرے یا تمام مقامی گروہ اپنے اپنے مقاصد کے پیش نظر جد وجہد جاری رکھیں۔ بکونن اور تکاچیف کی روش کے مطابق سٹیفن کو اصرار تھا کہ پورا گروہ ناظموں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ماتحت کام کرے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں لندن اور برسلز کے اندر پارٹی کے اجلاس ہوئے۔ اکثریت نے لینن کے حق میں رائے دی۔ اس کے بعد لینن کے گروہ کو بالشویک کہنے لگے، یعنی اکثریت والی پارٹی۔ اقلیت والے گروہ کو منشویک[۱] کہتے تھے، جو پارٹی کی ڈھیلی ڈھالی جمہوری تنظیم کا قائل تھا۔ دونوں گروہ سوشل ڈیموکریٹ رہے (ایس، ڈی[۲]، ایس) اور اسی نام سے وہ معروف تھے۔

اس اثناء میں غیر مارکسی انقلابیوں نے، جو جماعت "ارادۂ جمہور" کے وارث تھے، ایک سیاسی پارٹی منظم کرلی۔ یہ لوگ عمرانی انقلابی[۳] تھے اور انھوں نے اپنا خفیہ اخبار جاری کر لیا تھا۔ سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کی دلچسپیوں کا مرکز مارکسیوں کی حیثیت میں تقریباً شہری مزدوروں تک محدود تھا۔ ان کے برعکس عمرانی انقلابیوں کی توجہ حامیانِ قبضۂ جمہور کی حیثیت میں کسانوں پر تھی۔ ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ زمین از سرِ نو تقسیم ہو۔ مگر انھوں نے دہشت پسندانہ طریقے بدستور رکھے۔ انھوں نے کابینہ کے متعدد وزراء کو قتل کر دیا۔ ان کا نعرہ یہ تھا: "ہم اصلاحات نہیں چاہتے، صرف "اصلاح" چاہتے ہیں"

ایک تیسری سیاسی پارٹی اعتدال پسندوں اور لبرلوں کی تھی۔ انھوں نے سوشل ڈیموکریٹ یا انقلابی جماعت کی طرح کوئی نئی حکومت اختیار نہیں کی تھی، بلکہ اس میں زیادہ تر وہ لوگ تھے، جو اصلاحی مجلسوں میں مدت تک کام کر چکے تھے یا اہل علم تھے، جنھیں حکومت کی تشدد آمیز پالیسی پر سخت غصہ تھا۔ ان کی خواہش صرف یہ تھی کہ مفت جبری تعلیم اور زرعی اصلاحات جیسی تدابیر کی ضرورت ہے حکومت نے نادانی سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں، نیز دہشت پسندوں یا انتہا پسند مارکسیوں کے درمیان کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعتدال پسند بھی رفتہ رفتہ خفیہ طور پر منظم ہو گئے اور ایک خفیہ اخبار جاری کر لیا۔

۱۔ Mensilevik

۲۔ SDS

۳۔ Social Revolutionarie

جس میں روس کے لیے دستور اور پارلیمنٹ کا پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں انھیں عموماً کاڈٹ[1] کہنے لگے۔ کیونکہ دستوری ڈیمو کریٹک پارٹی کا نام روسی زبان میں لکھا جائے تو اس کے ابتدائی حروف کے، ڈی[2] بنتے ہیں۔ حکومت کو اعتدال اور انتہا پسند مخالفوں کی سیاسی سرگرمیوں سے اسطہ پڑا تو اس نے مزید سختی شروع کر دی اور ۱۹۰۳ء تک حکومت کی رائے یہ ہو چکی تھی کہ ملک کو متحد کرنے کے لیے ایک مختصر سی فاتحانہ جنگ کی ضرورت ہے۔

جنگ روس و جاپان

سائبیریا میں سے ریل بن جانے کے بعد روسیوں کے دل میں یہ خواہش موجزن ہوئی کہ چینی علاقے میں سے ہوتے ہوئے منچوریا پہنچ جائیں۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ جاپان نے ۱۸۹۵ء میں روس کو شکست دے دی اور چینی سرزمین میں قدم جمانا چاہے تو روس نے اسے روک دیا۔ پھر اس خدمت کے معاوضے میں چین سے کہا کہ چینی علاقے میں سے نئی ریل بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ ۱۸۹۶ء میں روس نے پورٹ آرتھر پر قبضہ کر لیا۔ یہی بندرگاہ تھی جس پر پہلے جاپان کو قدم جمانے سے روکا گیا تھا۔ کوریا میں جاپان کے ساتھ مزید کشمکش شروع ہو گئی، کیونکہ روس و جاپان دونوں کے مفاد کوریا میں ٹکراتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں چین کے اندر بوکسروں[3] کی بغاوت ہوئی۔ دوسری بعض قوموں نے اپنی فوجیں واپس بلا لیں، مگر روسی قوموں نے اپنی فوجیں قائم رکھیں اگرچہ انھوں نے انھیں رفتہ رفتہ ہٹا لینے کا وعدہ کیا تھا مگر ایسا نہ کیا۔ کیونکہ اس وقت روس کی خارجہ پالیسی بعض ایسے مشتبہ آدمیوں کے ہاتھ میں تھی، جنھوں نے کوریا کے اندر لکڑی کے لیے مراعات حاصل کر رکھی تھیں اور وہ جاپان سے جنگ کے خواہاں تھے۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ روس میں جنگ کے حامی گروہ نے غلبہ حاصل کر لیا ہے تو جاپانیوں نے کسی انتباہ کے بغیر روسی بیڑے کے مختلف حصوں پر حملہ کر دیا، جو پورٹ آرتھر میں ٹھہرا ہوا تھا (فروری ۱۹۰۴ء)۔ یوں جنگ روس و جاپان شروع ہو گئی۔ اگرچہ محاذ جنگ روس کے خاص مرکزوں سے بہت دور تھا اور اچانک روسیوں پر حملہ ہوا تھا، تاہم انھوں نے خشکی پر جنگ کا سلسلہ استوار رکھا، لیکن ان کا بیڑا، جو پورے یورپ کا چکر لگاتا ہوا بحر ہند میں سے ہو کر بحرالکاہل میں پہنچا تھا، سوشیما[4] (۲۷ مئی ۱۹۰۵ء) کی جنگ میں جاپانیوں کے ہاتھ فیصلہ کن شکست کھا گیا۔ روسی عوام کے نزدیک جنگ ایک پُراسرار اور دور افتادہ سیاسی طالع آزمائی تھی، جس میں وہ کوئی حصہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ بہت سے اہل علم نظر

---

۱ Kadet

۲ KD

۳ Boxer Rebellion چین میں جو لوگ ۱۹۰۰ء کے آس پاس غیر ملکیوں کو وطن سے خارج کر دینے پر تلے بیٹھے تھے، انھیں بوکسر کہا جاتا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں انھوں نے پیکنگ پر حملہ کیا اور غیر ملکی سفارت خانوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔

۴ Soshima

اس کے مخالف تھے۔ عمرانی انقلابیوں اور سوشل ڈیموکریٹوں کو قوی امید تھی کہ روس شکست کھا جائے گا اور اس طرح حکومت کی وضعیت متزلزل ہو جائے گی۔ ملک کے اندر بڑھتی ہوئی بے چینی سے حکومت کے دل میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ عین اس موقع پر جاپانی پہلے ہی اس امر کے خواہاں تھے۔ روسی حکومت سے امریکہ کے صدر تھیوڈور روزویلٹ نے اپنی ثالثی منوالی۔

وٹ ایک کاروباری آدمی تھا۔ وہ پہلے ہی سے جنگ کا مخالف تھا۔ اسی کو روس کا نمائندہ بنا کر پورٹسمتھ (نیو ہیمپشائر، امریکہ) بھیجا گیا۔ وہاں اس نے روس کے لیے عمدہ شرطیں بھی حاصل کر لیں اور امریکہ کی رائے عامہ پر بھی نہایت خوشگوار اثر ڈالا۔ یہ رائے عامہ پہلے جاپانیوں کی حامی تھی اور روسیوں کو وحشی مطلق العنان یا بم پھینکنے والے انقلابی سمجھا جاتا تھا۔ معاہدۂ پورٹسمتھ کے مطابق مندرجۂ ذیل شرطیں طے ہوئیں۔

۱۔ کوریا پر جاپان کے حق تحفظ کا اعتراف

۲۔ پورٹ آرتھر اور جزائر سکھالین کے شمالی[1] حصہ کا الحاق جاپان سے۔

۳۔ شمالی بحرالکاہل میں جاپان کے لیے ماہی گیری کے حقوق کا اعتراف

۴۔ منچوریا کو خالی کر دینے کا وعدہ

مشرق بعید کی قوت ہونے کے اعتبار سے روس کے وقار پر کوئی گہرا زخم نہ لگا یا وہ شکست یا معاہدے سے ہمیشہ کے لیے بے دست و پا نہ ہوا، لیکن ایشیا میں اس شکست کا اثر یہ پڑا کہ روس کی توجہ پھر یورپ کی طرف ہو گئی، جہاں ڈپلومیسی اور بحران کی رفتار تیز تر نظر آتی تھی اور سب ملک عالمی جنگ کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

۱۹۰۵ کا انقلاب

جنگ روس و جاپان کا نہایت اہم فوری اثر روس کے اندر داخلی اصلاحات کی شکل میں پڑا۔ ابھی معاملہ چل ہی رہا تھا کہ روس کا رجعت پسند وزیر داخلہ پلہوے[2] عمرانی انقلابیوں کے ایک بم سے جولائی ۱۹۰۴ء میں مارا گیا۔ اس کا جانشین ایک اعتدال پسند شخص تھا۔ اضلاعی مجلسوں کے ممبروں نے، جو آگے چل کر کاڈٹ مشہور ہوئے، ان حالات سے حوصلہ پا کر روس بھر میں دعوتیں کیں، جن میں ایک قومی مرکزی نمائندہ مجلس کے انعقاد کے لیے قراردادیں منظور ہوئیں۔ اگرچہ یہ مجلس منعقد کرنے کی اجازت نہ دی گئی، تاہم اس سے دستور یعنی بنیادی شہری حقوق، طبقات اور اقلیتوں کی مساوات، اضلاعی مجالس کے ذمہ داریوں میں توسیع وغیرہ معاملات

---

[1] (مترجم) یہ صحیح نہیں۔ سکھالین کا نصف جنوبی حصہ جاپان کو دیا گیا تھا، نہ کہ شمالی حصہ۔ غالباً یہ اتفاقی فروگذاشت ہے۔

[2] Plehve

سب پر آشکارا ہو گئے اور سب نے ان کی تائید کی۔ زار نے ایک مبہم بیان شائع کیا جس سے تغیر کی ہر امید ماند پڑ گئی اور حکومت نے آزادانہ بحث و نظر پر پابندی کے لیے تدابیر اختیار کریں۔

عجیب امر یہ ہے کہ حکومت کے ایک کارندے نے، جو پولیس میں ملازم تھا، انقلاب کے لیے پہلا شعلہ بھڑکایا۔ اس کارندے کو پیٹرز برگ کے کارخانوں میں متعین کیا گیا تھا، تاکہ سوشل ڈیموکریٹوں کو مزدوروں کی تنظیم سے روکے اور اس تنظیم کی جگہ اپنی طرف سے ایک یونین قائم کرے۔ اس نے مزدوروں کا ایک پُرامن جلوس منظم کیا اور ان سے کہا کہ درخواست لے کر زار کی بارگاہ میں پیش ہوں۔ درخواست میں عرض کیا جائے کہ مزدوروں سے آٹھ گھنٹے روزانہ کام لیا جائے۔ ایک قومی مجلس بنائی جائے۔ شہری حقوق دیے جائیں، مزدوروں کو ہڑتال کا حق حاصل ہو۔ ایسے ہی اور اعتدال پسندانہ مطالبات پیش کیے گئے تھے۔ جب مزدوروں نے درخواست دینے کی کوشش کی تو نکولس شہر چھوڑ کر چلا گیا اور فوج کو حکم دے دیا کہ پرامن مظاہرین پر گولی چلائی جائے، جن میں سے بعض وفاداری کے نشان کے طور پر خود اس کی تصویریں ساتھ اٹھائے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ اتوار (۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء) کو پیش آیا۔ تقریباً ایک ہزار مزدور مارے گئے، لہٰذا اسے "سرخ اتوار" یعنی خونیں یکشنبہ کہتے ہیں۔ اس قتل عام نے شہری مزدوروں کو انقلابی بنا دیا۔ ہڑتالوں پر ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ اعتدال پسند مخالفین بھی انتہا پسندوں سے مل گئے۔ یونیورسٹی کے طلبا اور پروفیسروں نے بھی انھی اصلاحات کا مطالبہ کیا، جو وحشی نگاہ بم پھینکنے والے کر رہے تھے۔

بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر ابتدا میں حکومت کی رائے یہ تھی کہ ایک مشاورتی مجلس بلا لی جائے، جسے قانون سازی کا کوئی حق نہ ہو، نیز اس میں مغربی پارلیمنٹوں کا نہیں بلکہ قدیم روسی پنچایتوں کا نمونہ پیش نظر رکھا جائے، ایک نمائندہ قومی مجلس ہونا چاہیے۔ کم حوصلہ، مذبذب اور نافہم نکولس دوم اپنے رجعت پسند مشیروں کی باتیں سنتا رہا اور یہ تجویز ختم ہو گئی۔ بار بار کی مایوسی اور تاخیر کے زیر اثر مظاہرے اور ہنگامے ۱۹۰۵ء کے موسم گرما میں برابر پیش آتے رہے۔ اکتوبر میں اہل مطبع نے بھی ہڑتال کر دی۔ کوئی اخبار نہ چھپ سکا اور اہل مطبع نے سوشل ڈیموکریٹوں کی امداد سے پہلی سوویٹ یعنی مزدوروں کی مجلس بنائی۔ جب ریل کے مزدور بھی ہڑتال میں شامل ہو گئے تو ماسکو اور پیٹرز برگ کے درمیان مخابرت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جو سوویٹ سینٹ پیٹرز برگ میں بنی تھی اس کے متعلق لینن نے اعلان کر دیا کہ یہ نہ تو مزدوروں کی پارلیمنٹ ہے، نہ پرولتاری خود مختاری کی تنظیم ہے، بلکہ ایک جنگی تنظیم ہے، جس کے پیش نظر خاص مقاصد ہیں۔

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ بالشویک سویٹ کو مسلح بغاوت کے متعلق اپنے پروگرام کے سلسلے میں محض ایک آلۂ کار سمجھتے تھے، تاکہ اس طرح عارضی حکومت کریں اور ریاست جمہور کا اعلان کر سکیں۔ ساتھ ہی دستور ساز مجلس بُلا لی جائے۔ یہ پروگرام، جو ۱۹۰۵ء کے انتہا پسند انقلابیوں نے پیش کیا تھا، ان نہایت اعتدال پسند لبرلوں کے پروگرام سے نسبتاً بہت کم مختلف ہے، جو بادشاہی قائم رکھنا چاہتے تھے اور تشدد کے بجائے صرف دباؤ اور افہام و تفہیم سے مقاصد حاصل

کرنے کے خواہاں تھے۔ اس وقت انقلاب سے پیشتر بورژوائی جمہوریت کے مرحلے سے گزرنا ضروری ہے، لہٰذا بورژوائی انقلاب کو ہر ممکن امداد دینے کے لیے تیار تھے۔

اب وِٹ نے نکولس کو بتا دیا کہ دو صورتیں ہیں، اوّل یہ کہ فوجی ڈکٹیٹرشپ عائد کر دی جائے اور مخالفت کو بزورِ قوت توڑ دیا جائے۔ دوسری یہ کہ حقیقی قانون ساز مجلس بلائی اور قوانین پر ویٹو کا اختیار محفوظ رکھا جائے۔ آخر زار نے آخری صورت قبول کی اور اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ایک منشور شائع کیا، جس میں تمام شہری حقوق کی بحالی کا وعدہ کر لیا۔ یہ اعلان بھی کر دیا کہ عام بالغوں کے حق رائے سے ایک قانون ساز مجلس یا دوما منتخب ہو گی۔ غرض اکتوبر کے مشہور منشور کے مطابق مطلق العنانی ختم ہو گئی، کیونکہ دوما کو قانون سازی میں زار پر ترجیح حاصل تھی۔

لیکن اکتوبر کا منشور بھی ہمہ گیر تصدیق حاصل نہ کر سکا اور انقلاب فوراً ختم نہ ہوا۔ دائیں بازو کی پارٹیوں میں سے ایک پارٹی کا نام "روسی عوام کا اتحاد" تھا، جس کی سرپرستی حکومت کر رہی تھی۔ اس نے منشور کے خلاف مظاہرہ کیا۔ مطلق العنان زار سے غیر فانی وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے ایک فوج منظم کر لی، جس کے مختلف دستوں کا نام "یوزہائے سیاہ" تھا،[1] یعنی نہایت گھناونا کام انجام دینے والے سو سو کے دستے۔ ان لوگوں نے منشور کے شائع ہوتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر تین ہزار یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جو فوجیں مشرق بعید سے آئیں وہ حکومت کی وفادار ثابت ہوئیں۔ اس طرح ۱۹۰۵ء کی سوویٹوں میں ۱۹۱۷ء کی سوویٹوں کے برعکس صرف مزدور شامل تھے، سپاہی شامل نہ تھے۔ باقی رہیں بائیں بازو کی پارٹیاں تو غیر مطمئن بالشویکوں اور عمرانی انقلابیوں نے تشدد آمیز انقلاب برپا کرنے کی متعدد کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ حکومت نے ان کے لیڈر گرفتار کر لیے اور ماسکو کے بازاروں میں کئی دن کی لڑائی کے بعد انھیں دبا دیا۔ (دسمبر ۱۹۰۵ء)۔ مرکزی پارٹی لبرلوں کی تھی۔ وہ منشور پر بہت خوش ہوئے اور اصرار کیا کہ اسے اعتدال پسندوں کے پروگرام کے لیے اتحاد کا مرکز بنا لینا چاہیئے۔ یہ لوگ "اکتوبری"[2] کہلائے، کیونکہ یہ اکتوبر میں شائع ہونے والے منشور کے حامی تھے۔ دوسرے گروہ مثلاً کاڈٹ چاہتے تھے کہ مزید اصلاحات کے لیے آئینی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ مگر ۱۹۰۶ء کے افتتاح تک انقلاب کی حقیقی آگ بجھ چکی تھی۔

دوما ۱۹۰۶ء۔۱۹۱۴ء

دوما کے لیے معیار رائے عام تھا، لیکن یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ رائے دینے والے لوگ اپنے اپنے حلقے میں ایک انتخابی کالج بنا لیں۔ ان کالجوں کی طرف سے چار سو بارہ مندوبین چن لیے جائیں۔ اگرچہ عمرانی انقلابیوں اور سوشل ڈیموکریٹوں نے انتخابات کا مقاطعہ کیا، کیونکہ وہ بالواسطہ انتخابی نظام پر مطمئن نہ تھے، مگر ان میں سے خاصی بڑی تعداد منتخب ہو گئی۔ دوما میں کاڈٹ سب سے بڑی پارٹی تھی۔ حکومت کی توقع کے خلاف کسانوں کے ووٹ

ل۱ Black Hundreds

ل۲ Octoberists

قدامت پسندوں کے لیے نہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کے برلوں کے لیے ڈالے گئے، مگر دوما کے پہلے اجلاس سے پیشتر ہی اس کے اختیارات وٹ نے محدود کر دیئے تھے۔ اس نے فرانس سے قرضے کی بہت بڑی رقم حاصل کرلی، جس کے باعث حکومت مالی اعتبار سے دوما کی محتاج نہ رہی۔ پھر اس نے اساسی قوانین کا ایک مجموعہ شائع کر دیا، جس کے متعلق بتا دیا کہ دوما ان میں ترمیم کی مجاز نہ ہوگی۔ تاج کو بدستور حق حاصل رہے گا کہ جنگ اور خارجہ پالیسی اپنے ہاتھ میں رکھے۔ وزیرِ مال قرضوں اور سکوں پر ضبط و نظم قائم رکھے گا۔ زار نے اپنے مشورہ کے لیے جو مجلس بنا رکھی تھی (اور وہ مجلس مملکت کہلاتی تھی) اس میں پادریوں، امراء، اضلاعی مجلسوں، یونیورسٹیوں اور ایوانِ تجارت کے نمائندے شامل کرکے نئی صورت دے دی گئی۔ یہ ایوانِ بالا تھا، جسے دوما کے مساوی قانون سازی کے حقوق حاصل تھے اور وہ دوما کے مقابلے میں نیا بجٹ بھی پیش کر سکتا تھا اور حکومت دوما کا بجٹ نظر انداز کرتے ہوئے ایوانِ بالا کا بجٹ اختیار کر سکتی تھی۔ سب سے آخر میں یہ کہ زار اپنی مرضی کے مطابق دوما کو توڑ دینے کا مجاز تھا اور جب دوما کا اجلاس نہیں ہوتا تھا تو زار بطورِ خود قانون جاری کر سکتا تھا، جنھیں دوما بعد میں منظور کر لیتی۔ دوما کا پہلا اجلاس مئی اور جولائی ۱۹۰۶ء کے درمیان ہوا۔ اسے "دومائے خشمِ عوام"[1] کہتے ہیں، کیونکہ اس نے زار کے سامنے شکایات کی ایک فہرست پیش کی اور زمین کے متعلق انتہائی اصلاحات کا مطالبہ پیش کر دیا۔ مثلاً یہ کہ کسانوں کو تمام سرکاری اور کلیسائی زمینوں کے علاوہ ان زمینوں کا بھی کچھ حصہ دے دیا جائے، جو نجی قبضے میں ہیں۔ حکومت نے املاک پر اس تصرف کی منظوری سے صاف انکار کر دیا اور تھوڑے سے پارلیمانی ہیر پھیر کے بعد دوما کو توڑ دیا گیا۔ کاڈٹ پارٹی کے ممبروں کا دعویٰ یہ تھا کہ دوما کا توڑا جانا خلافِ دستور ہے، حالانکہ یہ رائے صحیح نہ تھی۔ وہ سرحد پار فن لینڈ میں چلے گئے اور وہاں سے اعلان کر دیا کہ روسی عوام کو نہ تو ٹیکس ادا کرنے چاہئیں، نہ فوجی خدمت کا حکم ماننا چاہیئے، جب تک دوما کو بحال نہ کر دیا جائے۔ اس اعلان کے مرتب کرنے والوں پر مقدمے چلے اور انھیں نمائندگی کے نااہل قرار دے دیا گیا۔ اس طرح دوما کی آئندہ مجلسیں کاڈٹ پارٹی کے قابل اعتدال پسندوں کی خدمات سے محروم ہوگئیں۔ پہلی دوما کی تنسیخ سے ایک ایسا وزیرِ اعظم برسرِ اقتدار آیا، جو بڑا ہوشیار اور قدامت پسند تھا یعنی پیٹر سٹولی پن۔[2] وہ ۱۹۱۱ء تک وزیرِ اعظم رہا، اسی سال قتل ہوگیا۔ وٹ اور سٹولی پن دونوں زاروں کے آخری عہد کے دو ممتاز مدبر تھے۔ سٹولی پن نے بہت سے زرعی قوانین منظور کرلئے، جن کے مطابق کسان پنچایتوں سے آزاد ہوگئے۔ جو کسان اپنی زمین کا ٹکڑا الگ کرا لینا چاہتا، وہ درخواست دے دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ دوسرے کنبوں کو جو ٹکڑے دیئے گئے تھے، وہ سب اکٹھے ہو جاتے اور ہر ایک کو ایک ایک ٹکڑا مل جاتا۔ اس پروگرام کے مطابق سٹولی پن ان روسی کسانوں کو ہمت و جفاکشی پر آمادہ کر رہا تھا، جو چھوٹے کاشتکاروں کی حیثیت میں کامیابی حاصل کرنے کا عزم رکھتے تھے۔

---

[1] Domao Popalar Indignation

[2] Stolypin

اسے امید تھی کہ اس طرح روس میں کسانوں کی ایک ذمہ دار اور قدامت پسند جماعت تیار کر لے گا۔ اس پروگرام سے اس کا جو مدعا تھا، اس میں خاصی کامیابی ہوئی۔ اندازہ کیا گیا کہ سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۱۷ء کے درمیان یورپی روس کے ایک چوتھائی کسان گھرانے (تقریباً نوے لاکھ) پنچایتوں سے آزاد ہو گئے۔ صرف جنگ اور انقلاب کے باعث یہ عمل جاری نہ رہ سکا۔ لینن اور دوسرے لوگ، جو انقلاب کے داعی تھے۔ سٹولی پن کی زرعی اصلاحات کے متعلق گہرا شبہ اور خوف رکھتے تھے انھیں اندیشہ تھا کہ کسانوں کی شکائتیں دور ہو جائیں گی اور یہ بھی جانتے تھے کہ کسانوں کے بغیر روس میں کوئی انقلاب کامیاب نہ ہو سکے گا

زرعی پروگرام کے ساتھ ساتھ سٹولی پن نے دہشت پسندوں اور دوسرے انقلابیوں کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھی۔ اسے غیر آئینی طریق پر عمل پیرا ہونے میں بھی تامل نہ تھا، بشرطیکہ اس طرح اس کا مقصد پورا ہو جاتا۔ دوسری دوما کے لیے انتخابات ہوئے تو اس نے مداخلت کی ہر ممکن کوشش کی۔ بہ ایں ہمہ عمرانی انقلابی اور سوشل ڈیموکریٹ خاصی تعداد میں کامیاب ہوئے اور دوما (مارچ — جون سنہ ۱۹۰۷ء) حکومت کے ساتھ مل کر کام نہ کر سکی۔ اسے توڑ دیا گیا، کیونکہ اس نے سوشل ڈیموکریٹ مندوبین کی پارلیمانی حفاظت کا ضابطہ معطل نہ کیا اور سٹولی پن اس ضابطے کو معطل کرا کے سوشل ڈیموکریٹوں کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔

دوسری دوما کی تنسیخ کے بعد حکومت نے انتخابی قوانین بدل دیئے۔ یہ امر بالکل خلافِ قانون تھا۔ یعنی کسانوں اور اقلیتوں کے نمائندوں کی تعداد گھٹا دی اور شرفا کے نمائندوں کی تعداد بڑھا دی۔ اس طرح حکومت کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ تیسری (سنہ ۱۹۰۷ء — سنہ ۱۹۱۲ء) اور چوتھی (سنہ ۱۹۱۲ء — سنہ ۱۹۱۷ء) نے اپنی طبعی میعاد پوری کی۔ یہ دونوں غیر نمائندہ تھیں اور ان کے اختیارات محدود تھے۔ بہ ایں ہمہ یہ قومی مجلسیں تھیں۔ ان کے اجلاسوں میں بائیں بازو کی باتیں بھی سُنی جاتی تھیں اور وہ لوگ بھی دوسروں کی طرح وزیروں سے باز پرس کر سکتے تھے۔ دوما کی وجہ سے کسانوں اور مزدوروں کی حالت بہتر ہوئی۔ عالمی جنگ قریب تر آتی گئی تو قومی دفاع کو تقویت پہنچانے میں مدد دی۔ دوما کی طرف سے جو کمیشن مقرر ہوتے تھے۔ وہ ایک ایک وزیر کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ یہ بہت مفید ثابت ہوئے اور ان سے دفاترِ حکومت کی صلاحیتِ کار میں اضافہ ہو گیا۔ تیسری دوما کے دوران میں مختلف گروہوں کو روسی بنانے کا سلسلہ زور شور سے جاری رہا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اہل فنلینڈ کے رہے سہے حقوق بھی زائل ہو گئے۔

چوتھی دوما کے ماتحت حکومت رجعت پسندی کی طرف مائل ہو گئی، کیونکہ سٹولی پن مر چکا تھا۔ بائیں بازو کے لوگوں نے پھر انقلاب کے لیے تنظیمات شروع کر دیں۔ انھوں نے یونینیں بنا کر کام کرنے کا آغاز کیا۔ امداد باہمی کے اصول اختیار کیے۔ شام کے وقت مزدوروں کو تعلیم دینے کا انتظام کر لیا۔ اسی طرح مزدوروں کی دوسری انجمنوں کا جال بچھا دیا گیا۔ پولیس کا بھی ایک وسیع جال موجود تھا، جو قدم قدم پر بائیں بازو کے لوگوں سے باز پرس کرتا۔ اس اثناء میں شاہی خاندان ایک خطرناک مقام پر پہنچ گیا، کیونکہ حد درجہ مذہبی اور خود رائے ملکہ ایک نیم دیوانے، سراپا شر، گندے، جاہل اور اقتدار کے بھوکے راہب کے زیر اثر چلی گئی جو سائبیریا کا باشندہ تھا۔ یہ راسپوٹین[1] تھا، جسے کوئی پُراسرار صلاحیت حاصل تھی۔ غالباً وہ ہپنوٹزم جانتا تھا۔ ولیعہد

---

[1] Rasputin

تاج و تخت ایک مرض میں مبتلا تھا، جس میں خون جاری ہو جاتا تھا۔ راسپوٹین یہ خون بند کر دیتا۔ ملکہ کو نکولس دوم پر بے حد اثر حاصل تھا، اس لیے راسپوٹین روس کا حقیقی فرمانروا بن گیا۔ شاہی خاندان کے وفادار حامیوں کو اس پر بے حد صدمہ ہوا اور بیسویں صدی کی ایک وسیع سلطنت کے معاملات کو عقلمندی سے جاری رکھنے کے لیے بھی یہ امر نقصان کا باعث بنا۔ جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو روس ایک بہت بڑے بحران کے تلاطم میں پہنچ چکا تھا، جو حکومت کی رجعت پسندانہ پالیسی، راسپوٹین کے اثر اور وفادار دوما کے غیظ و غضب کا نتیجہ تھا۔

نتیجہ

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، تینوں مشرقی یورپی سلطنتوں کے لیے پارلیمانی حکومت مقابلتاً اجنبی تھی۔ شاہ پروشیا نے بسمارک کی مدد سے اپنے غیر معمولی فوجی نظام سے کام لے کر جرمنی کو فتح کر لیا اور متحد کر دیا۔ اس نے تمام آسٹروی جرمنوں پر پروشیائی نظام مطلق العنانی نافذ کر دیا۔ اور اس امر کی بھی کوئی پروا نہ کی کہ کوئی کمزور اور تابع پارلیمنٹ بنا دی جائے۔ اس کا انحصار فوج اور یونکروں پر تھا۔ ہیپسبرگ شہنشاہ نے ۱۹۰۷ء کے بعد ایک آسٹروی پارلیمنٹ بنا دی تھی، جو رائے عامہ کی بنا پر منتخب ہوئی تھی اور شہنشاہ میگیاروں کے جذبۂ علیحدگی کو روکنے کے لیے بالغوں کا حق رائے جاری کر دینے کی دھمکی دے دیتا۔ زار جنگوں میں شکستیں کھا چکنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں ایک ترمیم شدہ دستور منظور کرنے پر آمادہ ہوئے، مگر وہ اپنی مرکزی قانون ساز مجلس سے برابر کام لیتے رہے اور سیاسیات میں برابر وہی مقتدر رہے۔

تاہم ان تینوں ملکوں میں پہلی مرتبہ دورِ حاضر کی سیاسی پارٹیاں اصول کے اردگرد منظم ہوئیں۔ مغربی ممالک کی طرح حکومتیں پارٹیوں یا پارٹیوں کی کوالیشنوں سے تعاون کرتی رہیں اور انھیں مخالفت سے سابقہ پڑتا رہا۔ ہر پارٹی کے موقف مقاصد کا فیصلہ زیادہ تر جائے پیدائش کے خاص حالات کی بنا پر ہوتا، لیکن ان میں بعض چیزیں مشترک تھیں۔ اگرچہ روسیوں کے کسی گروہ کو جرمنوں کے کیتھولک مرکز سے مشابہ قرار نہیں دیا جا سکتا، تاہم آسٹریا کے مسیحی اشتراکی ان سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جرمن لبرلوں، آسٹروی لبرلوں، روسی کاڈٹوں یا "اکتوبریوں" کو سرسری طور پر یکساں سمجھ لینا ممکن ہے۔ یہی کیفیت جرمنوں کے اتحاد اور سلافیوں کے اتحاد کے داعیوں کی تھی۔ سوشل ڈیموکریٹ تینوں ملکوں (یعنی جرمنی، آسٹریا، روس) میں مارکسی تھے۔ مگر جرمنی اور آسٹریا و ہنگری میں وہ چنداں انقلابی نہیں رہے تھے اور روس میں زیادہ سے زیادہ انقلابی بنتے گئے۔

تینوں ملکوں کے اندر اس دور میں نمایاں اقتصادی خوشحالی آئی، پھر وقتاً فوقتاً کسان پیدا ہوتا رہا۔ صنعتی انقلاب وہاں متاخر آیا، لیکن اس کا اثر بہت شدید تھا۔ صدی کے موڑ پر جرمنی اتنی ترقی کر چکا تھا کہ فولاد کی صنعت میں وہ انگلستان سے بازی لے گیا تھا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعد دنیا میں دوسرا درجہ اسی کا تھا۔ آسٹریا ہنگری وسائل اور دستکاری میں جرمنی سے بہت پیچھے تھے، مگر وہاں بھی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ روس میں وسائل حمل و نقل اور صنعت کو خاص ترقی حاصل ہوئی۔

بایں ہمہ تینوں ملکوں میں جاگیردار امراء اپنی تعداد سے کہیں بڑھ کر سیاسی اثر کے حامل بنے رہے۔ ہر جگہ شہری مزدوروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا، جسے پورے حقوق حاصل نہ تھے۔ اس نے اہلِ علم کو مارکسی سیاسی گروہ بنانے کی ترغیب دی۔ یہ کہا کہ

طبقاتی جنگ کی دعوت دی جائے اور حکومت کا تختہ تشدد کے ذریعے سے الٹنے کے بجائے صرف حالات کی فوری اصلاح پر زور دیا جائے۔ صرف روس اس سے مستثنیٰ ہے۔ تمام یورپی ملکوں میں سے روس آخری ملک تھا جہاں ۱۸۶۱ء میں زرعی غلام آزاد ہوئے اور زرعی تجربات، نیز بچینی کا نیا دور شروع ہوا۔ جرمنی میں صدی کے آٹھویں عشرے تک تحفظ اصل مسئلہ تھا۔ آسٹریا ہنگری میں کسان چپ چاپ تکلیف اٹھاتے رہے۔

تینوں ملکوں میں اقلیتوں کے مسائل موجود تھے، البتہ ان کی نزاکت کے درجے مختلف تھے۔ جرمنی میں پولستانیوں پر سختیاں کی گئیں۔ ۱۸۷۱ء کے بعد الساس اور لورین کے باشندوں پر بھی سختیاں ہوئیں، اگرچہ ان کا درجہ زیادہ تیز نہ تھا۔ روس میں اہل فنلینڈ، اہل پولینڈ، اہل یوکرین اور اہل آرمینیا پر زیادہ سے زیادہ ظلم ہوتے رہے، مگر صرف آسٹریا و ہنگری میں اقلیتوں کا مسئلہ مہلک ثابت ہوا۔ آسٹریا میں جرمن سلافیوں کے خلاف تھے اور میگیار ہنگری میں غیر میگیاریوں سے بُرا سلوک کر رہے تھے۔ اس طرح وفادار رعایا کی ہمدردیاں ختم ہو گئیں اور مملکت کو اندر سے تباہ کرنے کا سامان پیدا ہو گیا۔ تینوں ملکوں میں یہودیوں نے خاص مسئلہ پیدا کر دیا اور ان سے مختلف درجوں میں امتیاز و تشدد کا برتاؤ ہوتا رہا۔

جرمنی میں حالات ایسے پیدا ہو گئے، جن کی وجہ سے حکومت نے پہلے کیتھولک کلیسا پر حملہ کیا۔ پھر کیتھولکوں اور حکومت کے درمیان اتحاد ہو گیا۔ ہیپسبرگ بادشاہی میں بھی پادریوں کے خلاف رَو اٹھی، لیکن یہ بہت ہلکی تھی اور آبادی پر کلیسا کا اثر قائم رہا اور سیاسیات پر بھی کلیسا نے زبردست اثر ڈالا۔ روس میں آرتھوڈکس کلیسا نے عوام کے ثقافتی نشو و ارتقاء کے لیے حقیقتاً کچھ نہ کیا۔ اہل علم کے ایک گروہ نے اس پر حملہ کرتے ہوئے قرار دیا کہ یہی کلیسا روس کی تمام مشکلات کا سرچشمہ ہے۔ دوسرا گروہ برابر کہتا رہا کہ آرتھوڈکس کلیسا روس کی قوت کا حقیقی سرچشمہ اور اس کے قومی محاسن کا منبع ہے۔

یوں وقت کے دھارے کی بڑی لہریں جرمنوں، آسٹریوں اور روسیوں پر غیر مساوی قوت میں بہتی رہیں۔ قومیت، مادیت، اکثریت، سامراج، کلیسائیت، دستوریت، ملکیت اراضی اور اشتراکیت سب کا تجربہ تمام ملکوں نے مختلف درجات میں کیا۔ ہر ملک نے مجلسی و عمرانی دباؤ کا جو جواب دیا، وہ اس کے اپنے مخصوص ماضی اور اپنے مخصوص کردار کا نتیجہ تھا۔

ذہنی انقلاب

انتالیسواں باب

ڈارونیت

اصل انواع اور انتخاب طبعی

لندن میں تاریخ طبعی پر ایک جلد شائع ہوئی (۱۸۵۹ء)، جس کا آغاز ایک حقیقی سائنسدان کے محتاط انداز میں یوں ہوا تھا۔

"جب میں ایک طبیعی کی حیثیت میں ملک معظم کے جہاز بیگل[1] پر تھا تو میں بعض حقائق سے بہت متاثر ہوا، جو جنوبی امریکہ کے نامی اجسام کی تقسیم اور اس براعظم کے موجودہ گزشتہ نامی اجسام کے ارضیاتی روابط میں پائے گئے۔ یہ حقائق پیش نظر مجلّہ کے آخری ابواب میں ملیں گے۔ ان سے اصل انواع پر کچھ روشنی پڑتی ہے، جسے ہمارے سب سے بڑے فلسفیوں میں سے ایک نے سرالاسرار قرار دیا ہے۔ میں وطن لوٹا تو ۱۸۳۷ء میں مجھے خیال آیا کہ اگر وہ تمام حقائق صابرانہ سعی و کوشش سے فراہم کر لیے جائیں اور ان پر غور کیا جائے، جن کا اثر اس حقیقت پر پڑتا ہے تو ممکن ہے، حل کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ پانچ سال تک اس موضوع پر کام کرنے کے دوران میں میں قیاس آرائی کرتا رہا اور بعض مختصر نوٹ تیار کر لیے۔ ۱۸۴۴ء میں ان حقائق کو پھیلا کر نتائج کی شکل میں مرتب کر لیا، جو مجھے اغلب معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت سے اب تک میں برابر اسی موضوع پر غور و تحقیق میں مصروف رہا۔ امید ہے کہ ان شخصی تفصیلات کو بہ نظر عفو دیکھا جائے گا۔ میں نے یہ اس لیے پیش کیں کہ واضح ہو جائے، کسی فیصلے پر پہنچنے میں میں نے عجلت نہیں کی[2]۔"

ڈارون نے اصل انواع اور انتخاب طبعی[3] میں اس طرح انکسار و احتیاط کے ساتھ ایک ایسی کتاب عوام کے سامنے پیش کی،

---

[1] Beagle

[2] چارلس ڈارون کی کتاب اصل انواع، تمہید

[3] The Origin of Species by Means of Natural Selection

جس نے تاریخ فکر و نظر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ بعض دوسرے اہم انقلابات کی طرح ڈارونیت کوئی بجلی نہ تھی جو آسمان پر سے اچانک آ گری ہو۔ ڈارون کی اس کتاب کے سلسلے میں تیاری کی ایک لمبی مدت گزر چکی تھی، جس میں صرف ڈارون ہی نے نہیں، بلکہ اس کے پیشروؤں اور سائنٹیفک غور و تحقیق کے سلسلے میں اس کے رفیقوں نے بھی بہت بڑا کام انجام دیا۔ اس چھان بین کو پہلے تاریخ طبعی کا نام دیا جاتا تھا، آج کل حیاتیات کہا جاتا ہے۔ ڈارون نے جو کام انجام دیا، اس سے وہ نتائج نکلے، جن کی اہمیت حیاتیات کے دائرے سے بدرجہا زیادہ وسیع تھی۔ غالباً انقلاب کی اصطلاح اگرچہ مختلف اعتبارات سے درست ہے، مگر یہ ڈارون کے کام کو پیش کرنے کا غالباً بہترین طریقہ نہیں۔ زیادہ اچھا یہ ہے کہ اسے ایک محدّب شیشہ قرار دے دیا جائے، جس میں روشن کرنوں کا ایک وسیع سلسلہ جمع ہو گیا تھا۔

ڈارون خود ماہر حیاتیات تھا۔ وہ اپنے کام کو چھان بین اور غور و تحقیق سمجھتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ معلوم کیا جائے، مختلف نامی جسم کیونکر اس منزل پر پہنچے، جس پر یہ اب موجود ہیں۔ زندگی ہی میں اس کے افکار کو سیاسیات، اقتصادیات، مذہب اور انسانی سرگرمیوں کے پورے پیچ در پیچ نظام پر پھیلایا گیا، مطابق بنایا گیا اور اکثر ان میں مبالغے سے بھی کام لیا گیا۔ کائنات کے متعلق پوری انسانی روش کے سلسلے میں اسے اپنے سائنٹیفک کام کے مضمرات کا احساس تھا، لیکن وہ آخر تک اپنے خاص موضوع یعنی حیاتیات پر قائم رہا اور ڈارونیت کو زندوں کے لیے ایک عقیدہ بنانے کا کام ٹی۔ ایچ ہکسلے[1] اور ہربرٹ سپنسر جیسے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ کارل مارکس نے ایک مرتبہ کہا تھا:- "میں مارکسی نہیں" اس طرح ڈارون بھی کہہ سکتا تھا:- "میں ڈارونی نہیں"۔

ہمیں غور و فکر کی ابتدا حیاتیات میں ڈارون کے اپنے افکار سے کرنی چاہیے۔ وہ بڑا محتاط اور با اصول مبصر تھا۔ اس کے سامنے حقائق کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا، مگر وہ کسی ایسے قانون اور ایسے نظریے کی تلاش میں رہا۔ جو ان تمام حقائق میں ارتباط پیدا کر سکے۔ اس کے سامنے جو حقائق تھے وہ روئے زمین پر نامی زندگی کے ہزارہا سال کا طویل ریکارڈ تھے۔ سر چارلس لائل[2] جیسے ماہرین ارضیات اور معدومیات کے دوسرے ماہروں نے اس ریکارڈ کی بنا پر پودوں اور جانوروں یا انواع کی ہزاروں مختلف شکلوں کے ظہور، نشو و ارتقا، اور بعض اوقات مدّت کے حقائق ثابت کر دیئے تھے۔ نامی زندگی کے ماضی کے متعلق اہل مغرب کے عام مسلمہ نظریے کے ایک اہم حصے کی تردید کر دی تھی۔ بائیبل کی کتاب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے کہ زندگی کی تمام شکلیں تقریباً چھ ہزار سال پیشتر خالق نے ایک ہفتے کے اندر اندر پیدا کر دیں اور اس مذہبی تصریح میں یہ بھی واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ تمام موجودہ انسان اور حیوان ہر نوع کے ایک جوڑے سے پیدا ہوئے، جنھیں حضرت نوحؑ نے ایک عالمگیر طوفان کے دوران میں اپنی کشتی کے اندر محفوظ کر لیا تھا اور یہ طوفان تخلیق عالم سے کچھ مدت بعد آیا۔

---

[1] Huxley

[2] Lyel

ڈارون ہرگز پہلا شخص نہ تھا جس نے تاریخی اور سائنٹیفک ریکارڈ، نیز بائیبل کی مسلّمہ توضیح کے درمیان نقص معلوم کیا۔ ووڈ خو بید کے اہل علم بھی ان حقائق کی بنا پر بائیبل کی توضیح ترک کر دینے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض اس حد تک آگے نکل گئے تھے کہ انھوں نے سمجھ لیا تھا، یہاں عمل ارتقاء کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا جس میں کسی خدا یا شخصی مسیحی خدا کا کوئی ہاتھ نہ تھا، بلکہ صرف قوائے فطری یا مناسب فطرت کے پردوں کے مطابق "گھڑی ساز خدا" کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا، لیکن وہ کوئی تسلی بخش تشریح نہ کر سکے کہ فطرت یا "گھڑی ساز خدا" نے یہ کام کیونکر انجام دیا۔ ان کے پیش نظر کوئی نظریہ نہ تھا، جس سے پتا چل سکتا کہ نامی جسم کیونکر ارتقاء پذیر ہوئے۔ ڈارون نے دنیا کو ایک نظریہ دے دیا۔

ڈارون کے نظریات

ڈارون کو ایک سراغ ملتھس کی کتاب میں ملا۔ آبادی پر ملتھس نے جو مقالہ لکھا تھا، اس میں بتایا تھا کہ نامی جسم، جن میں انسان بھی شامل ہے، بڑھتے اور ترقی کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک ایسا مقام آجاتا تھا، جس میں سب کے لیے ضرورت کے مطابق غذا مہیا نہیں ہو سکتی تھی۔ غذا کے لیے مقابلہ شروع ہو جاتا تو بعض کو پوری غذا نہ ملتی اور وہ مر جاتے۔ بس یہی نکتہ تھا، جسے ڈارون نے جہد للبقاء[۱] سے تعبیر کیا۔ پھر اس کے سامنے یہ سوال آیا کہ کس بنا پر بعض کے باقی رہنے اور بعض کے ختم ہو جانے کا معاملہ فیصل ہوتا ہے۔ بہ ظاہر زندہ رہنے والے غذا کی زیادہ مقدار، زیادہ اچھی پناہ گاہ اور رہنے سہنے کے زیادہ اچھے حالات سے مستفید ہوتے ہیں۔ اگر یہ سب لوگ یکساں حالت میں تھے (اور زندہ رہے) ماوراء الفطرت ہستی کی کارفرمائی سے الگ رہتے ہوئے صرف ایک ہی توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی واقعہ تھا۔ مختلف نامی جسموں کے اختلافات پیدائش کے وقت بھی نمایاں رہتے ہیں۔ مثلاً سورنی کے ایک جھول میں مضبوط و توانا بچے بھی ہو سکتے ہیں اور کمزور بھی۔ اگر کوئی رحمدل اس کمزور کی حفاظت کرنا چاہے تو ماں کا دودھ پینے کے دوران میں زیادہ توانا بھائی اسے دھکا دے کر ایک طرف کر سکتے ہیں۔ جب ایسے حالات وحشیانہ حالت میں پیش آئیں، جہاں آزادانہ مقابلہ ہو رہا ہو وہاں کمزور کا مر جانا یقینی ہے۔ گویا جہد للبقاء میں کمزور نااہل ثابت ہوتا ہے۔

ڈارون کا دوسرا کلیدی نکتہ وہ ہے، جسے اس نے بقائے اصلح سے تعبیر کیا۔ جو جسم نامی غذا اور پناہ گاہ حاصل کر لینے کے زیادہ اوصاف سے بہرہ مند ہے وہ یقیناً ایسے بچے پیدا کرے گا جو ان تمام سازگار حالات کے وارث ہوں گے۔ کچھ نہ کچھ اختلاف بھی ہوتا رہتا ہے، جو ابتدا میں معمولی ہوتا ہے، لیکن نسلاً بعد نسل جمع ہوتے ہوتے خاصا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ طویل مدت گزر جانے کے بعد ایک ایسا جسم نامی وجود میں آجاتا ہے جو دور افتادہ مورث اعلیٰ سے اتنا مختلف ہوتا ہے کہ ہم اسے ایک نئی نوع قرار دے سکتے ہیں۔ نئی انواع ارتقاء پاتی رہتی ہیں اور اس ارتقاء میں انتخاب طبعی[۳] کا عمل جاری رہا۔ انسان نے پودوں اور جانوروں

---

۱ Struggle for Existence

۲ Survival of the Fittest

۳ Natural Selection

کی پرورش میں اس عمل سے سوچ سمجھ کے ساتھ فائدہ اٹھایا ہے اور مصنوعی انتخاب سے وہ اس عمل کی رفتار اور سمت و جہت کو تقویت پہنچاتا رہا ہے۔ اس طرح اس نے بہترین جنسیں پیدا کر لیں، لیکن انسان کا یہ عمل تو صرف ان پودوں اور جانوروں تک محدود ہے، جو اس کے نزدیک پالتو ہیں اور انسان کا یہ دور ارضیاتی وقت کا ایک نہایت مختصر حصہ ہے۔ پھر انسان نے نسبتاً صرف چند انواع کی پرورش کی۔ انتخاب طبعی تو روزِ ازل سے ایک کارفرما قوت چلا آتا ہے اور انسان کے لیے بھی جسم نامی کی حیثیت میں انتخاب طبعی ہی کارفرما رہا۔ خود انسان کے لیے بھی ابھی اپنی نوع کو اسی طریق پہ تربیت دینا ہے، جس طریق پر وہ پالتو جانوروں اور پودوں کو تقویت دیتا ہے۔

ڈارون کہتا ہے کہ ایک ہی نوع کے افراد میں پیدائش کے وقت جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ اتفاقی ہیں اور عموماً وراثت کے ذریعے سے منتقل ہو سکتے ہیں۔ اس کا عقیدہ یہ نہ تھا —— اور یہ نکتہ بے حد اہم ہے —— کہ انفرادی جسم نامیہ کے تغیرات اس کی زندگی میں بچوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں —— اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ گویا ڈارونیت خصائص اکتسابی میں وراثت تسلیم نہیں کرتی، یعنی جس انسان کی ٹانگ کاٹ دی گئی ہے، اس کے بچے ایک ایک ٹانگ والے پیدا نہ ہوں گے۔ تجربہ کرنے والوں نے تجربہ گاہوں میں چوہوں کی دُمیں کاٹ دیں، لیکن اب بھی لمبی دم والے چوہے پیدا ہوتے ہیں۔

اصل انواع کی اشاعت پر تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے، لیکن آج بھی ماہر حیاتیات کی حیثیت میں ڈارون کے اکثر اصول مسلّم ہیں۔ بعد میں جو غور و تحقیق ہوئی، اس سے واضح ہوا کہ عمل ارتقاء میں جو اہم تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ بہت چھوٹے چھوٹے نہیں، جن پر ڈارون زور دیتا رہا، بلکہ بہت بڑے اور شاذ ہوتے ہیں، جنہیں تحولات فجائی کہتے ہیں۔ ڈارون کا عقیدہ تھا کہ جس چیز کو ہم انتخاب جنسی کہتے ہیں —— یعنی کسی اصلح فرد کا اپنی زوجیت کے لیے جنس مخالف کے اصلح فرد کو اپنی طرف راغب کر لینا اور اصلح بچے پیدا کر لینا —— انتخاب طبعی میں ایک اہم عامل ہے۔ اگرچہ آج کل کے ماہرین جنسیات انتخاب جنسی کو بالکل نظرانداز نہیں کیے بیٹھے، تاہم ان میں سے اکثر ڈارون کی تعبیر کو قبول نہیں کرتے۔ میراث کے حقیقی نظام کو ڈارون سے کہیں بہتر جانتے ہیں۔ یہ آسٹریا کے ایک گریگور مینڈل[1] کی محنت کا نتیجہ ہے، جو اس نے انیسویں صدی کے اواخر میں کی۔

ڈارون نے جو کام کیا اور خاص حیاتیات کے دائرے سے باہر اس کے دبستان نے جو اثر ڈالا، اس پر متوجہ ہونے سے پیشتر ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ سادہ ماہر حیاتیات کی حیثیت میں بھی ڈارون کے کام میں اہم چیزیں موجود ہیں، جن سے نقطۂ ارتقاء میں ایک مقصدیت پیدا ہوتی ہے یا کم از کم اس کی قدر و قیمت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ ڈارون اور اس کے پیرووں نے ارتقاء کے طویل عمل پر نظر رکھتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ ارضیاتی وقت میں بھی نیچے سے اوپر کی طرف لے جانے کا رجحان غالب رہا، یعنی سادہ اور ایک خلیے والے اجسام پُرپیچ اور متعدد خلیوں کے اجسام بن گئے، مثلاً دودھ پلانے والے جانور اور یہی سلسلہ ترقی کرتے کرتے

---

[1] Gregor Mundol

انسان تک پہنچ گیا، جواب تک سلسلۂ ارتقاء کا سدرۃ المنتہیٰ معلوم ہوتا ہے۔ انھیں یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ بہت سے اجسام زیادہ پُر تکلف شکلیں اختیار کر گئے، جو ماحول کے لیے غیر موزوں تھیں۔ چنانچہ ان انواع کو ناکامی سے سابقہ پڑا اور وہ معدوم ہو گئیں، مثلاً ڈینوسار[1] اور ڈوڈو[2]۔ انھیں یہ بھی علم ہے کہ ارتقاء کوئی سادہ عمل نہیں رہا۔ اس میں ترقی اور انحطاط دونوں کے مرحلے پیش آتے رہے۔ سائنس دان ہونے کی حیثیت میں انہوں نے مقصدیت یا غائیت[3] کے ہر تصور کو بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھنے کی تربیت پائی ہے، لیکن جب ان کے نظریات کا اطلاق حیاتیات کے دائرے سے باہر ہوتا ہے تو وہ کائنات کے بالکل مختلف نظریہ ہائے غائیت میں ایک عنصر بن جاتے ہیں۔ ان میں سے اصلح محض اس لیے سب سے بہتر ثابت ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہا۔

مذہب پر اثر

اصل انواع کا پہلا ایڈیشن اگرچہ صرف چند ہزار چھپا تھا، لیکن تمام نسخے ایک ہی دن میں فروخت ہو گئے۔ جس کتاب کے متعلق ڈارون کی رائے تھی کہ یہ صرف تاریخ طبعی کے عالموں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے، وہ سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ثابت ہوئی۔ دنیا بھر کے اخباروں اور رسالوں میں اس پر تبصرے لکھے گئے۔ اس پر توجہ کی بڑی وجہ یقیناً یہ تھی کہ کتاب میں آرتھوڈکس مسیحیوں کے لیے ایک چیلنج موجود تھا جس شے کو کارنل[4] یونیورسٹی کے صدر انڈریوڈی وہائٹ[5] نے الٰہیات سے سائنس کی جنگ قرار دیا، ڈارونیت اس کا صرف ایک پہلو تھی، لیکن ڈارون کی کتاب نے کتاب پیدائش کے بیان تخلیق کی صحت سے انکار کا کوئی انوکھا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔ علمائے طبیعات ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے جو کچھ شائع کر رہے تھے، اس میں اس امکان سے صاف انکار کیا گیا تھا کہ زمین صرف چھ ہزار سال پرانی ہے۔ ہر نوع کی تخلیق خاص خدا کی طرف سے ہونے کا انکار ڈارون سے پیشتر بھی ہو چکا تھا، مگر ڈارون کی کتاب نے اپنی ہر دلعزیزی کی بنا پر ان لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی، جو انجیل میں بیان کردہ ہر چیز کی صحت کے معتقد تھے۔

ڈارون اس وجہ سے بھی توجہ کا مرکز بن گیا کہ اس نے عام دنیاداروں کے سامنے ایک عمل (ارتقاء) اور ایک علت (انتخاب طبعی) مہیا کر دیئے۔ اس سے پیشتر محض مبہم مادہ پرستانہ تصورات رائج تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈارون نے اس دلیل پر کاری ضرب لگائی، جو وکٹوریہ کے زمانے میں بہت عام اور ہر دلعزیز تھی، یعنی یہ کہ دنیا میں جتنے وجود ہیں، وہ خدا کی کارسازی کی ناقابل تردید شہادتیں پیش کرتے ہیں، مثلاً علمائے الٰہیات کہتے تھے کہ انسانی آنکھ کی باریکیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جب تک مان نہ لیا جائے کہ یہ خدا کی خاص تخلیق تھی۔ ڈارون نے ثابت کر دیا کہ یہ تو انتخاب طبعی کے لاکھوں سال کے عمل کا نتیجہ ہے جس کی

ف۱ dinosaur — زمانہ قدیم کے بڑے ہولناک جانور جواب معدوم ہو چکے ہیں۔

ف۲ Dodo — ماریشس کے اندر ایک بہت بڑا پرندہ زمانہ قدیم میں تھا، اب معدوم ہو چکا ہے۔

ف۳ teleology

ف۴ Cornell

ف۵ Adrew D White

بنا پر بعض رنگوں کے مختلف سرے "اتفاقیہ" دوسروں کے مقابلے میں روشنی کے لیے زیادہ حساس بن گیا۔

اس قسم کے ردِ عمل کا بہترین اظہار اصل انواع پر ایک امریکی تبصرہ نگار فرانسس بوون نے کیا، جو ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفے اور اقتصادیات کا پروفیسر تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

"مسٹر ڈارون صاف صاف اور تقریباً نفرت سے علت العلل کے پورے عقیدے کی تردید کرتا ہے۔ اُسے پوری حیوانی و نامی دنیا میں کہیں کوئی منصوبہ اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ نفیس ترین اور پیچیدہ ترین تطابقات میں بھی کوئی منصوبہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ آنکھ دیکھنے کے لیے تخلیق نہیں ہوئی۔ کان سننے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ باقی رہا یہ امر کہ وہ آئے دیکھنے اور سننے کا کام انجام دیتے ہیں تو اس کی تفصیل اس نظریے کے مطابق یہ ہے کہ اتفاقی اور بے مقصد تغیر کی بنا پر کسی ایک حیوان یا دوسرے جانور نے، جو بہت نچلی سطح پر تھا۔ ولادت کے ساتھ ہی ایک مبہم سی حس باصرہ پیدا کرلی۔ یہی ابتدائی دور کی آنکھ تھی۔ یعنی ایک رگِ باصرہ، جس پر رنگ چڑھا ہوا تھا، اس میں اور کوئی مشینری نہ تھی۔ یہی اتفاقی تغیر پشت بہ پشت منتقل ہوتا رہا اور اس وجہ سے اس جانور کو ہم جنسوں پر خاص فوقیت حاصل ہوگئی، یہاں تک کہ وہ جانور محفوظ ہوگئے، باقی مٹ گئے۔ اسی طرح پھر مدت دراز کے بعد پے در پے اتفاقی تغیرات پیش آتے رہے۔ جو تغیرات اصل شے میں اصلاح کے موجب تھے، وہ محفوظ رکھے گئے جن میں اصلاح کا کوئی جوہر نہ تھا، وہ محو ہوگئے۔ اگر یہ سلسلہ لاکھوں سال تک جاری رہے اور ہر سال مختلف قسموں کے لاکھوں افراد پیدا ہوں تو کیا ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک زندہ آئینہ بصیرت معرضِ وجود میں آجائے گا، جو شیشے سے اتنا ہی برتر ہوگا، جتنے خالق کے کام انسان سے برتر ہیں۔"

اسی تبصرے میں بوون نے وہ نکتہ چینی بھی کی (جو اکثر اور حد درجہ نامناسب طریق پر دہرائی جاتی رہی) کہ ڈارون نے بندر کو انسان کا بھائی بنا دیا ہے۔ ڈارون نے بعد ازاں "ہبوطِ انسانی" نام ایک کتاب لکھی، اس میں بڑے اہتمام سے ایک نکتہ واضح کر دیا کہ حیوانِ ناطق یعنی انسان بندروں یا بن مانسوں کی کسی موجودہ نسل سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ کسی ایسے مشترک مورثِ اعلیٰ سے پیدا ہوا، جو ماضی بعید میں کبھی موجود تھا اور ہم اب تک اس ارتقا کے خطوط متعین نہیں کر سکے۔

بہ ایں ہمہ اصل انواع کی بنا پر ایک نہایت پُرجوش دینی بحث شروع ہوگئی۔ انجیل میں بیان کردہ حقائق کو ماننے والے پروٹسٹنٹ

ا؎ North American Review

۲؎ Descent of Man ڈارون کی دوسری کتاب

اور کیتھولک کتاب پیدائش کے بیان پر قائم رہے۔ انھوں نے ڈارون اور اس کی تصانیف کو ملعون قرار دیا۔ مگر آگے چل کر کیتھولک کلیسا اور بہت سی پروٹسٹنٹ جماعتوں نے ڈارونیت کے متعلق غیر جانبدارانہ روش اختیار کرلی، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک حیاتیاتی نظریہ ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ درست ہو اور ضروری نہیں کہ نادرست ہو۔ مسیحیوں کی بہت بڑی اکثریت نے چپ چاپ یا کھلم کھلا کتاب پیدائش میں اس حد تک ترمیم منظور کرلی کہ سائنسدان کے بتائے ہوئے وقت سے مطابقت پیدا ہو جائے۔ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ خدا نے، جو علت العلل ہے، اپنی مشیت کے مطابق اس دنیا میں نامی اجسام کے ارتقاء کا بندوبست کردیا۔ سوچ سمجھ والے آدمیوں پر واضح ہو چکا تھا کہ ڈارون یا کوئی دوسرا سائنسدان کچھ بھی پیش کردے، وہ وجود باری تعالیٰ جیسے مسائل کے متعلق کوئی قطعی اور حتمی جواب نہ ہوگا۔ ان پر یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ آج جس طرح خدا کی نظر چڑیا پر ہے، یقیناً وہ ایک زمانے میں ڈینوسار پر بھی ہوگی۔ مسیحی ڈارون کے پیرو بھی ہو سکتے ہیں اور لاکھوں اس وقت ہیں۔

عمرانی اور اقتصادی روش پر اثر

مذہبی بحث بیسویں صدی کے آغاز تک ختم ہو چکی تھی۔ زیادہ اہم معاملہ یہ تھا کہ انسان نے ڈارون کے بنیادی تصورات سے۔۔۔ یا کم از کم اس کے نہایت عمدہ طریق پر تراشے ہوئے جملوں سے اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کی بحثوں میں کیا کام لیا۔ عمرانی ڈارونیت ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں حیاتیات سے عمرانی علوم اور انسانی روابط تک تمام افکار آجاتے ہیں اور افراد و افکار کا ایک وسیع سلسلہ اس میں شامل ہے۔

عمرانی اور سیاسی مفکروں نے ڈارون سے جو مرکزی خیال لیا، وہ مقابلہ تھا۔ اس نے پہلے سے ان کے فکر و نظر میں مرکزیت حاصل کرلی تھی، لیکن ڈارون نے علوم طبعی کے خاص وقار سے انھیں تقویت پہنچادی۔ انسانوں میں بھی جہد للبقاء موجود ہے۔ وہ دوسرے نامی جسموں کے مقابلے میں جد وجہد کرتے رہے اور اس میں کامیاب ہوگئے۔ یہ سائنس اور فنکاری کی برکت تھی۔ کم از کم دوسرے جسموں پر قابو پانے کے لیے ان کے پاس سروسامان نیا نہ تھا۔ ان جسموں میں وہ خوردبینی اجسام یا جرثومے (جرم) بھی شامل ہیں، جنھیں فرانسیسی لوئی پاسٹر[۱] اور اس کے ہمعصر سائنسدان دریافت کرنے لگے تھے۔ ڈارون کے عمرانی پیروؤں کے لیے زیادہ اہم امر یہ تھا کہ انسانی افراد کے درمیان بھی جہد للبقاء جاری تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر کے مفکروں کی بہت بڑی اکثریت نے انسانی جد وجہد کی تعبیریوں کی کہ یہ جد وجہد معاش کے لیے یعنی روپے کے لیے تھی۔ اس سلسلے میں جن تغیرات کو زیر غور لایا گیا۔ وہ اقتصادی مقابلے میں کامیابی کا باعث ہوئے تھے یعنی وہ تغیرات، جو موجدوں، کاروبار کی تنظیم کرنے والوں، سیاسی، فنی اور پیشہ ور لیڈروں نے پیدا کیے۔ ڈارون نے تاریخ طبعی کے سلسلے میں جو کام انجام دیا تھا، اس سے ماہرین اقتصادیات کے اس نظریے کو تقویت پہنچی کہ افراد کے معاملات میں مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔

رسمی اقتصادیات نے ڈارون سے چنداں فائدہ نہ اٹھایا اور اسے زیادہ ضرورت بھی نہ تھی۔ کلاسیکی ماہرین اقتصادیات

۱؎ Louis Pasteur

عدم مداخلت کے دلائل کو آخری حد پر پہنچا چکے تھے۔ بہ حیثیت عمومی صدی کے باقی حصے میں ماہرینِ اقتصادیات کی کوشش یہ رہی کہ افراد کے درمیان اصول مقابلہ کی شدت میں کسی حد تک ملایمت پیدا کر لی، مگر مغربی طبقۂ اوسط کے تمام کامیاب افراد نے ڈاروِن کو اپنا لیا۔ اس طبقے کی طرف سے جو تصورات پیش ہو رہے تھے ـــــ یعنی کائنات میں شدید محنت، کفایت شعاری، عقل و فہم، اعانتِ نفس کا صلہ ملتا ہے۔ کاہلی، ضیاعِ وقت، حماقت اور دوسروں کی خیرات پر بھروسے کی پاداش بھگتنی پڑتی ہے ـــــ ڈاروِن نے سائنٹیفک نظریے پر ان تصورات کی توثیق کر دی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت کے طبقۂ اوسط کے نزدیک ڈاروِن نے اس تصور کی بھی توثیق کر دی تھی کہ غریب اس لیے غریب رہے، وہ نااہل تھے اور زندہ رہنے کے لیے موزوں نہ تھے۔ ڈاروِن کے اصول کی بنا پر ایک اور تصور درست مان لیا گیا، یعنی غریبوں کی امداد کے لیے امیروں یا متوسط درجے کے خوشحال لوگوں سے روپیہ لینا بالکل بیکار ہے۔ اسی طرح نجی خیرات بھی درست نہیں۔ یہ طریقہ فطرت کے خلاف ہے اور اسے عملِ ارتقاء کو الٹنے کی دل ہلا دینے والی کوشش قرار دینا چاہیے۔ اگر ایک آدمی اپنی شکم پُری کے لیے کافی غذا مہیا نہیں کر سکتا تو کہا جاتا تھا کہ اسے مر جانا چاہیے۔ پست درجے کے اجسام، جو غذا حاصل کرنے کے ناقابل ہیں، یقیناً مر جاتے ہیں۔ اس سے انواع کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر (سنہ ۱۸۲۰ء ـــ سنہ ۱۹۰۳ء) برطانیہ کا ایک پُرجوش حامی ارتقاء تھا۔ اس نے پورے مسئلے کو بڑی صفائی سے پیش کر دیا۔ وہ کہتا ہے:-

"باقی رہا انسان تو دوسری فروتر مخلوق کی طرح جس قانون کی مطابقت میں انواع کی حفاظت ہوتی ہے، یہ ہے کہ بالغوں میں جو افراد احوال و ظروفِ حیات سے بہترین مطابقت پیدا کر لیتے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر فروغ پائیں گے اور جن افراد میں حالاتِ حیات سے مطابقت کی صلاحیت کم ہے، ان کی ترقی بھی کم رہے گی ...... پوری فطرت میں ایک سخت نظم کی کارفرمائی ہے، جو اکثر ایک حد تک بے رحم ظاہر ہوتا ہے، مگر ممکن ہے، وہ بہت رحیم ہو..... انسانوں کو حماقت سے پناہ دینے کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا احمقوں سے لبریز ہو جائے گی۔"[1]

امریکہ کے ماہرِ اجتماعیات ڈبلیو سمنر[2] (سنہ ۱۸۴۰ء ـــ سنہ ۱۹۱۰ء) جس کا تعلق ییل یونیورسٹی سے تھا ـــ نے ڈاروِنیت اور نجی املاک کو ان اصحابِ املاک کے احساسات کے مطابق مرتبط کر دیا، جو مغرب میں ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ وہ لکھتا ہے:-

---

[1] ہربرٹ سپنسر کی کتاب "اصول اخلاق" (Principles......of Ethics) حصہ ۲۵۰ ص ۱۴۹

" " " " (Autobiography) جلد دوم صفحہ ۵

[2] Sumner

"نجی املاک بھی معاشرے کا ایک پہلو ہیں، جو جہد للبقاء کے طبعی حالات کے مطابق منظم ہوا۔ ان سے بھی انسانوں کے درمیان نامساوات پیدا ہوتی ہے۔ جہد للبقاء فطرت کے خلاف جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم فطرت کے خسیس سے اپنی ضروریات کی تسکین کا سامان چھینیں، مگر ہمارے ہم جنس بھی اس حقیر رسد میں ہمارا مقابلہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا مقابلہ قانونِ فطرت ہے۔ فطرت کا ملا غیر جانبدار ہے۔ وہ اُسی کے آگے جھکتی ہے، جو زیادہ سے زیادہ سرگرمی اور عمل سے اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ اصلح افراد کو انعام واکرام سے شاد کام کرتی ہے۔ نوع اور قسم کی کوئی مصلحت اس کے سامنے موجود نہیں۔ اگر عام آزادی کو اور انسان فطرت سے اپنے کام کے متناسب لیں گے۔ ان کا لینا اور اس سے مستفید ہونا بھی اپنے وجود اور کام کے مطابق ہوگا۔ یہ فطرت کا نظام ہے۔ اگر ہم اسے پسند نہیں کرتے اور اس میں ترمیم کے خواہاں ہیں تو صرف ایک صورت ہے، جس سے ہم کام لے سکتے ہیں اور وہ یہ کہ بہتر سے لیں اور بدتر کو دیں۔ ہم ان لوگوں کو پاداش سے محفوظ کر دیں گے، جنھوں نے کامیابی حاصل نہ کی اور یہ پاداش ان لوگوں پر ڈال دیں گے، جو کامیاب رہے، یعنی ہم ان لوگوں سے انعام واکرام لے لیں گے، جنھوں نے بہتر کام کیا اور انھیں دے دیں گے جن کا کام بدتر تھا۔ اس طرح ہم نامساواتوں میں یقیناً کمی کر دیں گے اور غیر اصلح افراد کو زندہ رکھنے کا سرو سامان بہم پہنچا دیں گے۔ یہ کام اسی صورت سے انجام پائے گا کہ ہم آزادی کو تباہ کر دیں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے سامنے دو راستے ہیں، تیسرا کوئی نہیں۔ اوّل آزادی، نامساوات اور بقائے اصلح کا راستہ، دوم آزادی سے محرومی، مساوات اور بقائے غیر اصلح کا راستہ۔ پہلے راستے پر چلیں تو معاشرہ ترقی کرے گا اور اس کے بہترین ممبروں کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسرا راستہ اختیار کریں تو معاشرہ نیچے کی طرف جائے گا اور اس کے بدترین ممبروں کی امداد ہوگی۔"[1]

ہربرٹ سپنسر بھی کبھی برداشت نہ کر سکتا کہ بے روزگار لوگ اور ان کے کنبے بھوکے مر جائیں۔ مملکت سے اس کی نفرت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس میں مقامی حکومت اور قومی حکومت دونوں شامل تھیں۔ وہ اس کے بھی خلاف تھا کہ لوگوں سے شہروں میں جبراً گندے پانی کی نالیاں بنوائی جائیں، لیکن ہربرٹ سپنسر بھی انسانوں میں جہد للبقاء کی ایسی صورت گوارا نہ کر سکا جس میں جنگل کی بے رحم آزادی ہوتی، جس کے متعلق ٹینیسن نے کہا تھا۔ "سرخ دانتوں اور پنجوں والی فطرت" وہ حکومت کی طرف سے

---

[1] (Social Statistics Sumner Today by Maurice Danie) ص ۷۲-۷۳

ہر ایسے نظام کے خلاف تھا، جسے ہم آج کل عمرانی تحفظ کہتے ہیں، لیکن جو کام حکومت نہیں کر سکتی، وہ اخلاقی اعتبار سے استوار لوگ بہ طور خیرات کریں گے۔ دولت مند اور خوشحال لوگ خود بخود غریبوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے، مگر اتنا نہیں کہ ان کی عادتیں بگڑ جائیں، اتنا نہیں کہ ارتقاء کے منصوبے درہم برہم ہو جائیں، یعنی یہ موقع نہ آنے دیں گے کہ غریب خوشحال ہوں، ان کی نسل بڑھے، البتہ انھیں بھوک اور سردی سے اس حد تک بچائے رکھیں گے کہ مرنے نہ پائیں۔

سپنسر نے اپنی کتاب "اصولِ اخلاق" میں لکھا کہ جن جذبات کو مسیحیت اور دوسرے اعلیٰ مذاہب نے ترقی دی۔ مثلاً لطف و مدارات، بیدردی سے نفرت، محبّت، یہ سب قوانین کائنات کے عین مطابق ہیں اور ارتقاء میں جمع ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کا استیصال شیروں کا قانون ہو سکتا ہے، انسانوں کا نہیں۔ حقیقت میں سپنسر اور عمرانیات میں ڈارون کے بہت سے دوسرے پیروؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ مخلصانہ اخلاقی جذبات، جو انسانوں کو خیرات پر آمادہ کرتے ہیں۔ عملیہ ارتقاء کے اعلیٰ ترین نتائج ہیں اور جس معاشرے میں ایسے مخلص اصحاب کی کثرت ہو، اسے یقیناً بقا کے لیے اصلح سمجھنا چاہیے۔

اصلاحِ نسل

عمرانیات میں ڈارون کے پیرو ایک مشکل سے دوچار ہو گئے۔ ڈارون نے یہ واضح کر دیا تھا کہ بعض انواع میں اور کسی خاص نوع کے اندر جہد للبقاء مسلسل جاری رہتی ہے اور یہ قانونِ کائنات ہے، مگر انسانی تاریخ اور انسانی احساسات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں کو بھوک سے مرتے بے اعتنائی سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس معمے کا ایک حل سپنسر نے پیش کر دیا تھا، یعنی جد و جہد قدرے نرم اور ملائم کر دی جائے۔ جو لوگ قابل ہیں، انھیں الگ کر دیا جائے اور تباہ نہ ہونے دیا جائے۔ جن لوگوں کا یہ عقیدہ تھا، ان میں سے اکثر نے اصلاح نسل کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کے نزدیک اصل سوال غیر اصلح کو حذف کرنے کا نہیں، بلکہ اصلح کی تخلیق کے لیے زبردست حوصلہ افزائی کا تھا۔ ڈارون نے اپنی کتاب "اصل انواع" کا آغاز ہی اس مسئلے سے کیا تھا، کہ انسانوں نے پودوں اور جانوروں کی تربیت میں مصنوعی انتخاب سے کام لے کر غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ مذکورہ بالا لوگوں نے سوچا کہ انسانوں کے تعلق میں بھی یہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ چونکہ نظریہ ڈارون کے مطابق اکتسابی اوصاف، خصائصِ میراث میں منتقل نہیں ہوتے، لہٰذا سمجھ لیا گیا کہ خواہ کتنی ہی تدبیریں اختیار کر لی جائیں، عمرانی ماحول میں کتنا ہی رد و بدل کر لیا جائے اور اداروں کی ترتیب میں کتنی ہی تبدیلیاں ہو جائیں، انسان نہیں بدلیں گے۔ اس لیے نسل انسانی کی مستقل اصلاح کا ایک ہی ذریعہ رہ گیا کہ اصلح کا رشتہ اصلح سے جوڑا جائے۔

اصلاحِ نسل کے حامی وہ ایک غلطی کر گئے۔ بےشک پودوں اور جانوروں کو پالتو بنا لیا گیا۔ مگر انھیں یہ یاد نہ رہا کہ انسان اب تک وحشی حیوان ہے۔ انسان جب اپنے جوڑے کا انتخاب کرتا ہے تو مختلف محرکات سے متاثر ہوتا ہے اور عمرانیات کے ماہر انھیں ابھی پوری طرح سمجھ نہیں سکے، لیکن کوئی کامل الفن مربیِ انسانیت بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس فرد کا رشتہ کس فرد سے کرنا چاہیے۔ اب تک اصلاح نسل کے حامی اپنے پروگرام کے کسی مثبت پہلو میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے اس کے برعکس انھوں نے بار بار زور دیا کہ لوگ غیر اصلح، احمق، کمزور دماغ، دیوانے بچے پیدا کرنے سے روکے جائیں۔ ضرورت محسوس ہو تو ان کا جوہر

جنسیت ختم کردیا جائے۔ بعض امریکی ریاستوں نے ایسے قانون منظور کیے ہیں، مگر بہت ہی کم افراد ان کے دائرے میں آئے اور اس سے انسانوں کے جسمانی ارتقاء کی رفتار پر چنداں اثر نہیں پڑ سکتا۔ مزید براں اصلاح نسل کے حامیوں نے بہت سے مسیحیوں کو برانگیختہ کردیا ہے۔ ان مسیحیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کو جس طرح پیدا کردیا ہے، اس میں ردّ و بدل کی کوشش غلط ہے۔

نسلی برتری

عمرانیت میں ڈارون کے پیروؤں کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ افراد میں جہد للبقاء اتنی نہیں، جتنی افراد کے منظم گروہوں میں ہوتی ہے، جب وہ قبیلوں یا نسلوں یا قومی مملکتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا جہد و کشمکش انگریز افراد کی نہیں، بلکہ ایک وحدت جسے انگلستان یا برطانیۂ عظمیٰ کہتے ہیں اور اس کے حریفوں کے درمیان ہے یعنی انسانوں کے درمیان یہ کشمکش افراد کی حیاتیات سے بلند تر ہوکر گروہوں کی سیاسیات میں پہنچ گئی اور انیسویں صدی کے لیے گروہ کا مطلب تھا قومی مملکت یا ایک نسل یا اقوام کی قومی سلطنتیں، جنھیں ایک بلاک کی شکل میں منظم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً نارڈی[1] یا لاطینی یا زیادہ وسیع پیمانے پر کاکیشیائی یا رنگدار قوموں —— زرد، گندمی یا سیاہ —— کے مقابلے میں سفید فام اقوام۔ جس گروہ نے دوسرے گروہ کو جنگ میں شکست دی، اس نے نمایاں کردیا کہ فاتح مفتوح کے مقابلے میں اصلح ہے اور اسے حق حاصل ہے —— بلکہ ارتقائی اصطلاحات میں اس کا فرض ہے —— کہ مفتوح گروہ کو حذف کردے، اس کی زمینوں پر قابض ہوجائے اور وہاں اپنی قوم کے اصلح افراد کو بسائے۔ مشہور انگریز سامراجی سیسل روڈز[2] کا عقیدہ تھا کہ جس دنیا میں صرف اینگلو سیکسن قوم کے افراد آباد ہوں گے، وہ یقیناً بہترین دنیا ہوگی۔

برگزیدہ قوم کا نظریہ ڈارون کے زمانے میں نیا نہ تھا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں منظم مملکتوں کے درمیان جو مقابلہ شروع ہوا اور ہمارے زمانے تک قائم رہا، اس میں ڈارون کے کام نے مقابلے کی خاص شکلوں کے سلسلے میں نہایت اہم عنصر کا کام دیا، اگرچہ خود ڈارون کا مدعا کبھی یہ نہ تھا۔ ڈارونیت بہت متاخر آئی۔ اس سے پیشتر عدم مداخلت کا فلسفہ جاری تھا اور انسانوں کے درمیان جہد للبقاء کا تصور بنیادی طور پر اقتصادی کشمکش کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم ڈارونیت سے ان منظم گروہوں کے درمیان کشمکش کو تقویت پہنچی، جنھیں ہم مملکتیں کہتے ہیں۔

جن خاص گروہوں کو خاص سیاسی لحاظ سے برگزیدگانِ ارتقاء ہونے کا فائدہ پہنچنے والا تھا، وہ ان افراد کی ہمدردیوں، مقصدوں اور حقیقی شہریت کے اعتبار سے مختلف تھے، جو آخری ارتقائی فتح کے سروسامان فراہم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ برطانیہ، جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ، لاطینی، سلافی، نارڈی، سفید فام، بلکہ تمام مسیحی حقیقی برگزیدگانِ ارتقاء قرار دے دیئے گئے۔ جو اہلِ قلم اس

---

[1] Nordic ایک فرنگی نسل جس کے افراد کا قد لمبا اور رنگ گورا ہوتا ہے۔ یہ سکنڈے نیویا اور شمالی برطانیہ میں آباد ہیں۔

[2] Cecil Rhodes

قسم کے سیاسی ارتقاء کی دعوت دیتے رہے، ان میں سے اکثر نے فرض کر لیا تھا کہ انسانوں کا ہر خاص گروہ اصلاً بعض جسمانی اور نسل میں مشترک ہے۔ یہی اوصاف اس گروہ کو برتری کا حقدار بناتے ہیں اور یہ اوصاف کسی دوسرے گروہ کی طرف منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ ان میں سے اکثر اہلِ قلم نسلی برتری کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حیوانِ ناطق مختلف انواع کی شکل سے ارتقاء پا چکا ہے۔ ان کے نزدیک سیاہ فام انسان خلقی کہتری کا نشان تھا۔ گویا سیاہ فام لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ ڈینوسار کی پیروی کرتے ہوئے معدوم ہو جائیں۔ ارتقاء نے ان کی یہ تقدیر واضح کر دی۔

ان مصنفوں نے بہت سے درمیانی مراحل بھی تجویز کر دیے تھے۔ بعض اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ اس کام کی دعوت دیتے رہے۔ جسے ہمارے زمانے میں نسل کشی سے تعبیر کیا گیا، یعنی پست اور مفتوح نسل کا ہمہ گیر قتل۔ اس کے لیے ہمیں ہٹلر کا انتظار کرنا پڑا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ پست قومیں بہر حال مر جائیں گی اور وہ اس کام کے لیے تیار تھے کہ ایسی قوموں کو اعلیٰ اقوام کی تابعیت میں دے دیں، تاکہ یہ لوگ اپنے آقاؤں کے لیے پانی لانے اور لکڑی جمع کرنے کا کام انجام دیتے رہیں۔ جن لوگوں نے عمرانیات میں ڈارون کی پیروی کی، ان میں سے بعض نے ذات کی نئی تنظیم کے لیے نظریات مدون کیے جسے "برگزیدگی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اعلیٰ وادنی کے درمیان امتیاز، نسل یا موجودہ ملکی تنظیمات کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ یہ امتیاز پوری انسانی نسل کے ایک حصے کے درمیان تھا۔ اصلح لوگ کسی ایک نسل تک محدود نہ تھے، تاہم حیاتیاتی میراث کے سخت گیر ہاتھ نے انھیں نمایاں کر دیا تھا۔ وہ آقاؤں کا گروہ تھے یعنی برگزیدہ یا برتر انسان اور انھیں ہر جگہ اوسط درجے کے کند ذہن انسانوں کے خلاف متحد رہنا چاہیے۔ مشہور جرمن مصنف فریڈرک نیٹشے[1] ـــــ جس نے برتر انسان کی اصطلاح کو رواج دیا ـــــ بڑا دقیقہ سنج، نکتہ رس اور مشکل مفکر تھا۔ اسے ڈارون سے نفرت تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ انگریز قلم کا مزدور ہے۔ بایں ہمہ نیٹشے نے نیم تعلیم یافتہ آدمیوں کے درمیان ـــــ جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس کے مدّاح تھے ـــــ نسلی برتری اور برگزیدگی کے مقاصد کو تقویت پہنچائی (تفصیلات آگے آئیں گی) نظریات کے ارتقاء کے مطابق بعض گروہوں کی برتری صرف یورپ تک محدود نہ تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف آیئے۔ وہاں سفید فام لوگوں کی سیاہ فام لوگوں پر خلقی اور ناقابلِ تبدیل برتری جزوِ ایمان تھی۔ شمالی ریاستوں کے اکثر اور جنوبی ریاستوں کے تمام سفید فام لوگوں کا عقیدہ یہی تھا۔ بشریات و حیاتیات میں ڈارون کے پیرؤں نے اس عقیدے کو مزید تقویت پہنچائی۔ مثلاً ایک تصوّر یہ تھا کہ جن لوگوں کے بال قدرے بھورے ہوں، نیز ان میں بعض دوسرے نمایاں اوصاف موجود ہوں ـــــ مثلاً سر اور قد کی طوالت ـــــ وہ لوگ ایک بڑی جمہوریت میں شہریت کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں تارکینِ وطن کے لیے جو قانون بنا، اس میں یہی اوصاف پیشِ نظر رکھے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی و مغربی یورپ سے تارکینِ وطن کی آمد کا خیر مقدم کیا گیا اور جنوبی و مشرقی یورپ سے آنے والوں کی بالتصریح

---

[1] Friedrich Nietzsche

حوصلہ شکنی کی گئی۔ امریکہ کے مصنف میڈیسن گرانٹ[1] کی کتاب " بڑی نسل کی رحلت "[2] ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ نارڈی ــــ لمبے قد، لمبوترے سر، بھورے رنگ کے بالوں والے شمالی یورپ کے لوگ ــــ سپاہیوں، بحرپیماؤں، طالع آزماؤں، مکشفوں، سب سے بڑھ کر حکمرانوں، منتظموں اور امیروں کی ایک نسل تھے۔ گرانٹ لکھتا ہے:۔

" روحانی و اخلاقی اوصاف اور جسمانی خصائص کے درمیان ربط ضبط کے دلچسپ موضوع کو ختم کرنے سے پیشتر ہمیں یہ بتا دینا چاہیے کہ یہ اثرات دورِ حاضر کے شعور پر اس درجہ پختگی سے مرتسم ہیں، جنھیں کوئی ناول نویس یا ڈرامانگار اپنے ہیرو کا نقشہ تیار کرتے وقت نظرانداز نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ ہیرو کو طویل قامت سنہرے بالوں والا، دیانت کیش اور ایک حد تک سادہ لوح نوجوان کی حیثیت میں پیش کرے گا اور اس کا دشمن یا مدِمقابل ہمیشہ پست قامت، سیاہ فام اور حد درجہ چالاک انسان ہوگا، البتہ اس کا اخلاق اچھا نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کیلٹی افسانوں، یونانی و رومی نیز ازمنۂ وسطیٰ کے رومانوں میں شہزادوں اور شہزادیوں کو ہمیشہ خوش شکل بنا کر پیش کیا گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب یہ افسانے تشکیل پا رہے تھے تو زیادہ تر لوگ گندم گوں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوش گِلی حسن کی مترادف ہے۔ زمانہ قدیم کے مشجروں میں سنہرے بالوں والے امیر کو گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے اور گھوڑے کی باگ سیاہ بالوں والے شخص نے پکڑ رکھی ہے۔

" تمام اولمپیائی دیوتاؤں کے بال سنہرے تھے اور کسی یونانی ہنرمند کے لیے زہرہ کو گندم گوں بنا کر پیش کرنے کا تصور مشکل ہے۔ کلیساؤں میں جو تصویریں بنائی گئیں، ان میں فرشتوں کے بال سنہرے تھے، البتہ عالم اسفل میں رہنے والے لوگوں کو گہرے گندمی رنگ میں پیش کیا جاتا تھا۔ جب پوپ گریگوری نے سیکسن بچوں کو رومہ کے بازار بردہ فروشی میں دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھا۔ " یہ اینگل[3] نہیں، اینجل یعنی فرشتے ہیں۔

" (حضرت) مسیح کو صلیب دیئے جانے کی تصویر بنانے والا کوئی ہنرمند نجات دہندہ

---

[1] Madison Grant [2] The Passing of the Great Race

[3] Angel بمعنی فرشتہ۔ پوپ نے بچے دیکھ کر پوچھا تھا، یہ کون ہیں؟ جواب دیا:۔ اینگلز یعنی ان کا تعلق اینگلز قوم یعنی انگریزوں سے ہے۔ اس نے کہا:۔ اینگلز نہیں، فرشتے ہیں۔

کے سنہرے بالوں کے مقابلے میں دو چوروں کو گندم گوں پیش کرنے میں قطعاً تامل
نہ کرے گا۔ یہ محض کوئی رسمی چیز نہیں، بلکہ اس قسم کی نیم درست روایات سے ہمارے
خداوند کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جسمانی و اخلاقی اوصاف ناردی یا یونانی تھے۔[1]

گرانٹ کی کتاب کے نام سے ایک اضطراب نمایاں ہے، جو عمرانیت میں ڈاروِن کے زیادہ سے زیادہ پختہ پیرووں کے یہاں بھی سطح سے زیادہ نیچے نہیں۔ گرانٹ کو خوف تھا کہ اس کی "بڑی نسل" کو ارتقاء میں سب سے اونچا درجہ حاصل تھا، مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ زندہ نہ رہ سکی۔ پست تر نسلیں زیادہ تیزی سے تربیت پا رہی تھیں۔ جمہوری مساوات بہترین کے سر اڑا رہی تھی اور بدترین کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی، گویا اس معاملے میں ارتقاء کا عمل الٹا چل رہا تھا۔ اس نسل نے ترقی کے بجائے تنزل کیا۔ دوسرے سائنٹفک جبریت پسندوں یعنی مارکسیوں کی طرح عمرانیت میں ڈاروِن کے پیرووں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ نیک نہاد لوگوں کو قلم اور زبان سے کام لے کر عمل مقصد کو تقویت پہنچانا چاہیے اور اسے صحیح راہ پر رکھنا چاہیے۔

نئی تاریخی جبریت

نیوٹنی سائنس کی طرح ڈاروِنی سائنس نے بھی خیر و شر اور حق و باطل کے بڑے بڑے مسائل کا کوئی حقیقی جواب نہ دیا، نہ یہ بتایا کہ انسانی زندگی کا مفاد کیا ہے۔ جب سے اس دنیا میں تاریخی دستاویزوں کا وجود ہوا، لوگ برابر یہی سوال کرتے رہے اور ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی گئی۔ ڈاروِنی سائنس نیز طبعیات، کیمیا اور انیسویں صدی میں فروغ پانے والے دوسرے علوم نے پورا ڈھانچہ بدل دیا، جس میں یہ سوالات کیے جا رہے تھے۔ غلطی نہ کرنی چاہیے، روایتی مسیحیت، نیز دوسرے بہت سے الہامی مذاہب جس طرح نیوٹن کے بعد زندہ رہے تھے، اسی طرح ڈاروِن کے بعد بھی زندہ رہے۔ اکثر آدمیوں کا ایمان خدا یا خداؤں پر قائم رہا اور یہی ایمان ان کی رہبری کرتا رہا۔ اس دنیا میں، نیز موت کے بعد دوسری دنیا میں ان کی زندگیوں کو بامطلب اور قابل قدر بناتا رہا۔ ان پر وہ قوانین اثر انداز نہ ہو سکے، جو تجربہ گاہوں کے اندر یا منظم مشاہدات سے دریافت کیے گئے، لیکن جب تعلیم عام ہوئی، خصوصاً مغربی یورپ میں تو اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ ایسا خدا یا بہت سے خدا کوئی وجود نہیں رکھتے۔ سائنس اور عقل سلیم کی مادی کائنات ان قوانین یا یکسانیوں پر چل رہی ہے، جنھیں انسان کسی نہ کسی وقت ضرور پوری طرح سمجھ لیں گے۔ اب انھیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا آغاز ہوا ہے۔ کائنات کے اس مادی نظریے کے اثرات ہر جگہ پڑے، البتہ الہامی مذاہب کے پکے اور زبردست پیرو اس سے مستثنیٰ رہے۔ کم از کم اس میں شبہہ نہیں کہ ان لوگوں نے خدائی کارفرمائی کا دائرہ ضرور محدود کر لیا۔

ڈاروِن اور دوسرے بہت سے سائنسدانوں نے مورخوں، فلسفیوں اور اہل علم سے مل کر کائنات کے بارے میں انسانوں کے نقطۂ نگاہ کے اندر بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ نیوٹن کی کائنات کو ساکن اور ڈاروِن کی کائنات کو متحرک قرار دینا اصل مسئلے کو

۱؎ گرانٹ کی کتاب ص ۲۲۹ - ۲۳۰

غیر مناسب حد تک سادہ بنا دیتا ہے، لیکن یہ تعمیم حقیقت سے قریب تر پہنچنے کا ایک سرسری مرقع ضرور ہے۔ اٹھارھویں صدی کے دورِ تنویر میں اہلِ علم یقیناً کائنات کے متعلق ایسا نقطۂ نگاہ پیدا کر رہے تھے کہ یہ ارتقاء پذیر ہے اور ترقی کر رہی ہے۔ اگرچہ بعد کے رومانیت پسند نقادوں نے اس کا ٹھیک ٹھیک اعتراف نہ کیا۔ مگر کنڈورسٹ جیسے فلسفی کی تصنیف سے جس حد تک اندازہ ہو سکتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے پاس اس تغیر کے طریقے کے متعلق کوئی معقول توجیہہ نہ تھی۔ ڈاروِن نے تاریخ طبعی کے لیے یہ توجیہہ مہیا کر دی۔ رومانیت پسند مؤرخوں اور دوسرے دائروں میں ان کے ہمسر کارکنوں نے اس توجیہہ کا انتظام انسانی تاریخ کے لیے کر دیا۔

آج ہم فکر و نظر کی اسی فضا میں ہیں، جس کا انتظام انیسویں صدی کے آواخر میں ہوا تھا۔ ہمارا عقیدہ کم و بیش اب بھی یہی ہے، جسے "تاریخیت" کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ نظریہ واصول ہے کہ تاریخ کی رفتار وسیع ترین شکل میں ایک باقاعدہ انکشافِ حقیقت ہے، اگرچہ پریشاں کن ہے۔ جو کچھ اب تک موجود ہے، اس کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا تھا اور جو کچھ آئندہ آئے گا، اس کا فیصلہ بھی پہلے ہی سے ہو جائے گا۔ اس نظریے پر بڑے سے بڑا عقیدہ رکھنے والا بھی اس اعتراف پر مجبور ہے کہ وہ ماضی کے پورے عملیے کو سمجھ نہیں سکا، لہٰذا نہ وہ حال کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے اور نہ آئندہ کے متعلق ٹھیک ٹھیک پیشگوئی کر سکتا ہے۔ اصل کلید ماضی ہی میں تھی، جس سے حال پیدا ہوا، جس طرح شاہ بلوط کے بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے۔

مسیحی اور عبرانی تقویم کے مطابق زمین کی عمر چھ ہزار سال تھی۔ ڈاروِن نے صرف نامی زندگی کی عمر لاکھوں سال تک پہنچا دی، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخیت — خصوصاً وقت کی وسعت کے متعلق ڈاروِن کے خاص زور سے تقویت پا کر — تیز تغیر کے متعلق قدامت پسندانہ مخالفت کی تصدیق کرے گی یا کم از کم اس سست رو کائنات کے باب میں انسانوں کے اندر ایک خاص قسم کی تسلیم و حوالگی پیدا کر دے گی۔ چنانچہ بعض انسانوں کو یہی کیفیت پیش آئی۔ ڈاروِن کے پوتے سر چارلس گیلٹن ڈاروِن[۱] نے ۱۹۵۳ء میں ایک کتاب شائع کی، جس کا نام تھا "آئندہ دس لاکھ سال"[۲]۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ عام عقیدے کے مطابق ایک نوع کے ارتقاء کے لیے تقریباً دس لاکھ سال درکار ہیں۔ لہٰذا مزید دس لاکھ سال گزرنے چاہئیں، تاکہ ارتقائی عمل انسان سے بہتر مخلوق پیدا کر سکے۔ گویا سمجھ لینا چاہیئے کہ آئندہ دس لاکھ سال کے لیے ہماری تاریخ کا انداز وہی رہے گا، جو گزشتہ چند ہزار سال میں رہا یعنی جنگیں ہوں گی، انقلاب آئیں گے، وبائیں پھیلیں گی۔ ہزاروں مصر، ہزاروں رومہ، ہزاروں برطانیہ اور ہزاروں امریکہ ابھریں گے اور گمنامی کے سمندر میں ناپید ہو جائیں گے۔

بایں ہمہ انیسویں صدی میں اکثر لوگوں کے نزدیک تاریخیت کی نوعیت مختلف رہی۔ تاریخ نے مضطرب اور پُر امید انسانوں کو یقین دلایا کہ انھیں کائنات کے اسرار پر پورا قابو حاصل ہو چکا ہے اور وہ سمجھ چکے ہیں کہ تاریخ کی قوتیں ہمیں کس طرف لے جا رہی ہیں۔

۱؎ Galton Darwin

۲؎ The Next Million Years

غلط رو پیشرو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا یہ لوگ عملیۂ تاریخ کی مزاحمت کے بجائے اسے تقویّت پہنچا سکتے ہیں۔ تاریخی جبریت پر اس ایمان کی اس کلاسیکی مثال مارکسیت پیش کر رہی ہے، مگر قومیت، نسلی برتری اور بہت سی دوسری چیزوں نے بھی اس سے غذا حاصل کی۔ فنکاری میں تیزی سے جو غیر معمولی اصلاحات ہوئیں، ان سے یہ نظریہ مزید قوی ہُوا کہ اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں بھی تیزی پیدا کی جا سکتی ہے۔ گویا ارتقاء نے انجیلی اور مثالی عقائد کی رفتار بڑھا دی، حالانکہ منطقی اعتبار سے یہ رفتار کم ہو جانی چاہیے تھی۔

چالیسواں باب

ادبیّات وفنون

عہدِ وکٹوریہ

انیسویں صدی کے آخری دور کے ادبیات وفنون سے متعلق کوئی تعمیم خالی از خطرہ نہ ہوگی، مگر یہ دور بڑی حد تک عہدِ وکٹوریہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں اسلوب کی وہ نفاست وشستگی نہیں ملتی، جو پریکلیز کے ایتھنز یا دورِ احیاءِ علوم کے اٹلی اور عہدِ ایلزبتھ کے انگلستان میں ملتی ہے۔ ہم عہدِ وکٹوریہ کے کسی ایوانِ ملاقات کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ یہاں ماڈ[1] یا میلانی[2] نام کوئی لڑکی بالیاں اور گھیرے والا سایا پہنے بیٹھی ہے۔ گوناگوں چیزیں اور نوادر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ پلش کے پردے لٹک رہے ہیں۔ لینڈ سیئر[3] کی تصویریں دیواروں پر آویزاں ہیں اور وہ ٹینی سن یا لونگ فیلو یا ہائین[4] کی کتاب پڑھ رہی ہے یا پیانو پر لسٹ[5] کا کوئی گیت بجا رہی ہے، لیکن ایوان ملاقات سے باہر بھی صرف کسانوں، مزدوروں اور کاروباری آدمیوں ہی کی زندگی میں نہیں، بلکہ فن اور ادب میں بھی بہت کچھ ہو رہا تھا۔ ماڈ یا میلانی ڈکنس یا بلزاک[6] بھی پڑھ سکتی تھی، لیکن یہ مصنف ایوانِ ملاقات کے لیے موزوں نہ تھے۔ نہ تھوریو[7]، میلول[8]، زولا[9] اور ڈاس ٹوسکی[10] موزوں تھے اور یہ یقینی امر ہے کہ مارکس کی کتاب کبھی نہیں پڑھ سکتی تھی۔

انیسویں صدی کے نصفِ آخر کی رسمی ثقافت کے متعلق بیان کا محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ کہا جائے، اس میں وسیع تنوّع ہے اور اس کی حیثیت بڑی حد تک انتخابی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس رسمی ثقافت کا بڑا حصّہ —— مغربی تاریخ میں پیشتر کے بجائے زیادہ وضاحت سے —— ان مردوں اور عورتوں نے پیدا کیا تھا، جو اپنے زمانے کے اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے متقدر طبقے میں طبقۂ اوسط کے ذوق وشرب کے خلاف بغاوت کیے بیٹھے تھے۔ اگر ماڈ اور میلانی

---

[1] Maud
[2] Melanie
[3] Landseet
[4] Heine
[5] Liszt
[6] Balzac
[7] Thoreau
[8] Melville
[9] Zola
[10] Dostoeveski

بہت ترقی یافتہ نوجوان عورتیں نہ ہوتیں تو وہ کبھی اس چیز کو پسند نہ کر سکتیں، جسے ہم ایک سو سال بعد عہدِ وکٹوریہ کے ادب و فنون میں اہم سمجھ کر منتخب کر سکتے ہیں۔ اگر وہ طبقۂ اوسط کی عام عورتیں ہوتیں تو جذباتی ناول پڑھتیں، جنھیں عبرانی مؤرخوں کے سوا بالکل بھلا دیا گیا ہے اور وہ اس ثقافت میں زندگی بسر کرتیں، جس کے لیے تحقیراً عہدِ وکٹوریہ کی اصطلاح وضع کی گئی اور اب تک اسے موزوں سمجھا جاتا ہے۔

ان لڑکیوں کے باپ اور بھائی اکثر صنعت و تجارت میں اس درجہ منہمک تھے کہ ان کے پاس ادب و فنون پر توجہ کے لیے فرصت ہی نہ تھی۔ یہ دونوں چیزیں انھوں نے عورتوں کے لیے چھوڑ رکھی تھیں۔ اگر انھیں اپنے دائرے سے باہر کسی شے سے علاقہ تھا تو سیاسی اور عمرانی مسائل تھے یا اپنے طبقے کی مادی بہبود کا مسئلہ تھا۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اعتراف کیا جائے، وہ مزدوروں کے طبقے کی بہبود بھی چاہتے تھے، لیکن طبقۂ اوسط میں سے اکثر کا احساس یہ تھا کہ مزدوروں کا درجۂ معیشت آہستہ آہستہ آزاد نظام سرمایہ داری ہی کے ماتحت بلند کیا جا سکتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ کلیسا اور حکومت کو مل کر قانون کے ذریعے سے، نیز خالص پیورٹینی وضع کے مذہب کے ذریعے سے اس ضبطِ نفس کے فقدان کو روکنا چاہیے۔ جو طبقۂ اوسط کے ان لوگوں کو اپنے سے فروتر آدمیوں میں نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک عدم مداخلت کی وکٹوریائی پالیسی خالص اقتصادی مسئلہ تھی۔ اخلاقیات میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ منظم اداروں کو عوام کے معاملات میں دخل دے کر انھیں مدہوشی، کاہلی اور بے لگام بود و ماند سے روکنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ عوام ان چیزوں کی طرف راغب ہیں۔

حقیقت پسندانہ ناول

ہمیں مغرب میں طبقۂ اوسط کے ان لیڈروں سے نظر ہٹا لینی چاہیے، جنھیں انگریز نقاد میتھیو آرنلڈ نے زیادہ سختی سے کام لیتے ہوئے "فلسطی"[1] قرار دیا اور وقت کی رسمی ثقافت کی بعض پرپیچ لہروں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ انیسویں صدی کا آخری دور ادبی اعتبار سے ناول کا بہت بڑا دور تھا۔ اس دور کے ناولوں کو صدی کے ابتدائی دور کی رومانیت پسندی کے مقابلے میں حقیقت پسندانہ سمجھا جاتا ہے، لیکن دورِ حاضر کے مغرب کی متوالی نسلوں کی ثقافتی روش کے درمیان اس تقابل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت پسند نمایاں طور پر رومانیت پسندوں ہی کے اخلاف تھے۔ ۱۸۳۰ء کے رومانیت پسند وقت کی مکروہ دنیا سے بھاگ کر ازمنۂ وسطیٰ کی مثالی دنیا میں پناہ لیتے تھے۔ جب ناٹوں کا عروج تھا اور دھوئیں اگلنے والے کارخانے موجود نہ تھے یا وہ امریکہ کے اصل باشندوں کی رزمی داستانیں لکھتے تھے، یقیناً اس اعتبار سے وہ ۱۸۶۰ء کے حقیقت پسندوں سے بہت مختلف نظر آتے تھے، جو کارخانوں والے قصبوں کے مرد و زن کے حالات حیرت و نفرت سے بیان کرتے تھے یا بڑے بڑے شہروں کے غلیظ محلوں کے نقشے کھینچتے تھے یا مضافات کے کسان مزدوروں کی بے کیف زندگی کے حالات بیان کرتے تھے۔ اگر صحیح تفصیلات پر گہری

---

[1] Philistines ایک جابر قوم جو فلسطین کے جنوبی المشرقی گوشے میں آباد تھی اور مدت تک یہودیوں کو ستاتی رہی، آخر حضرت داؤد نے اس قوم سے نجات دلائی۔ یہاں مراد ہے دشمن۔

نظر ڈالی جائے اور مرد و زن کی تصویریں اصل صورت میں کھینچنے کی کوشش پر نظر رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈکنز، ہیوگو جیسے رومانیت پسند ناول نویس کی تصانیف بھی بڑی حد تک حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ یقیناً حقیقت پسندوں اور رومانیت پسندوں کے درمیان ۱۸۵۰ء کے آس پاس کوئی انقطاعی خط نہ کھینچا گیا۔

ڈکنس اور بلزاک بھی اسی زمانے میں لکھ رہے تھے، جسے رومانیت پسندانہ کہا جاتا ہے۔ دونوں مبالغے میں مزہ لیتے ہیں۔ دونوں انتہائی بے تکلفی سے الفاظ کا سیل غیر منظم طریق پر بہاتے ہیں۔ دونوں غیر حقیقی شدت کا اثر پیدا کرتے ہیں۔ یہ سب یقیناً رومانیت پسندی کے اوصاف ہیں، لیکن دونوں اپنے وقت کی دنیا میں سراپا منہمک ہیں اور مختلف اعتبارات سے دونوں حقیقت پسند ہیں۔ اس کے برعکس انیسویں صدی کے اواخر کے ممتاز فرانسیسی حقیقت پسند فلوبر[1] (۱۸۲۱ء سے ۱۸۸۰ء) نے اپنا ایک ناول سلمبو[2] کے نام سے لکھا، جس کا تعلق قدیم زمانے کے قرطاجنہ سے ہے اور انتہائی صحت کی کوشش کے باوجود اسے حقیقی قرطاجنہ سے کوئی گہرا تعلق نہیں۔ اس کا شاہکار مادام بواری[3] ہے، جس میں چھوٹے سے قصبے کے ایک ڈاکٹر کی بیوی کی رومانی آرزوؤں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس میں فلوبر نے اپنی ہیروئن کے متعلق دوگونہ احساسات کا اظہار کیا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے کہا کہ میں خود مادام بواری ہوں۔ فلوبر کو سرمایہ داروں کی دنیا (جس کے متعلق وہ لکھتا ہے) سے بھی اتنی ہی نفرت تھی، جتنی پیشتر کی نسل کے فرانسیسی مصنفوں سے تھی۔

بہ ایں ہمہ انیسویں صدی کے نصف اوّل اور نصف آخر کی تحریرات میں ایک فرق ہے۔ حقیقت پسندوں نے مثالی اور دور افتادہ کے رومانی تعاقب سے دست برداری اختیار کرلی اور اپنی زندگیوں میں سے موضوع اختیار کرنے لگے۔ انھوں نے انتہا پسندی کی ہنگامہ آرائیوں سے عموماً کنارہ کشی اختیار کیے رکھی اور ساکن تر عام زندگی پر توجہ مرتکز کردی۔ انھوں نے صحیح الفاظ کے انتخاب سے زیادہ اعتنا کیا، یعنی وہ الفاظ، جو تجربے کی کیفیت پیش کرسکیں اور جذبات کی صحیح تصویر اتار سکیں۔ بے تعلق ہنگامہ آرائی چھوڑ دی۔ انگریز مصنف ٹرالپ اور روسی ترجینیف ہمارے لیے حقیقت پسندوں کی اچھی مثالیں بن سکتے ہیں۔ ٹرالپ[4] (۱۸۱۵ء سے ۱۸۸۲ء) نے عہد وکٹوریہ کے پادریوں، سیاستدانوں اور دیہاتی شرفاء کے متعلق درجنوں ناول لکھے، جن میں انگریزی آداب کا خاص خیال رکھا۔ کبھی اپنی آواز یا اپنا اسلوب بلند نہ کیا، تاہم جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا۔ اسے بخوبی ذہن نشین کردیا۔ دلوں میں ہمدردی پیدا کی اور تحریر میں ایک موزوں و معتدل طنز سے کام لیتا رہا۔ ترجینیف[5] (۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۳ء) نے اپنے ہمسروں کے متعلق کلاسیکی ضبط سے سب کچھ لکھا۔ وہ بڑی سبک روی سے سلافی

---

1. Flaubert
2. Salammbo
3. Madame Bovary
4. Trollohe
5. Tergenev

روح کی گہرائیوں تک پہنچا۔ ولیم ڈین ہاویلز[1] (۱۸۳۷ء — ۱۹۲۰ء) کا نام بھی لے سکتے ہیں، جس نے "ظہور سیلاس لیپہم"[2] اور دوسرے ناول لکھ کر امریکی منظر میں حقیقت پسندی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

فطرت پسندانہ ناول:۔ زولا

ہاویلز دور آخر کے بعض نقادوں کو اس طبقے کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے طنزاً عامیانہ روایت کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ اس پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ زندگی کے زیادہ ناخوشگوار حقائق چھوڑ دیتا ہے اور نہ ہی صنعتی تحریر کی خامیوں کو ذرا نرم کرکے پیش کرتا ہے۔ بیسویں صدی قریب آئی تو حقیقت پسندوں کو ایک باغی نسل سے سابقہ پڑ گیا، جو انھیں ضرورت کے مطابق حقیقت پسند نہیں سمجھتی۔ یہ دبستان سب سے پہلے فرانس میں پیدا ہوا، جہاں انھوں نے اپنے لیے فطرت پسند کا لقب مناسب سمجھا۔ ان کا لیڈر امیل زولا تھا (۱۸۴۰ء — ۱۹۰۲ء)۔ اس کی تحریرات سے سائنٹیفک انقلاب کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے، جو ڈارون کی وجہ سے برپا ہوا۔ زولا حقیقت پسندوں کے اس مسلک پر قانع نہ تھا کہ گرد و پیش کی زندگی کے حالات پوری صحت سے پیش کر دیئے جائیں۔ وہ چاہتا تھا کہ فنکار روایتی اخلاقی اور جمالیاتی اثر بھی جابجا حسب ضرورت پیدا کرتا رہے۔

زولا کے نزدیک سائنٹیفک تعلیم کا ایک حربہ تھا۔ ڈارون نے تاریخ طبعی کے لیے جو کچھ کیا تھا، زولا کی خواہش تھی کہ وہی معاشرے اور انسانوں کے باہمی تعلقات کے لیے کر دکھائے۔ وہ یہ بھی دکھاتا تھا کہ انسان باہمہ گر مشابہ ہیں بلکہ یہ بھی واضح کرتا تھا کہ وہ موجودہ حالت پر کیونکر پہنچے اور آئندہ ان کی حیثیت کیا ہوگی۔ اس نے دوسری سلطنت یعنی نپولین سوم کی سلطنت کے ماتحت ایک خاندان کے متعلق ناولوں کا ایک سلسلہ لکھا، جس کا نام روگون ماکار[3] تھا۔ وہ اس سلسلے کو ایک خاندان کی تاریخ طبعی قرار دیتا رہا۔ اپنے مشہور منشور میں اس نے تجرباتی ناول کی پُرجوش حمایت کی۔ وہ لکھتا ہے:۔

> "تجرباتی ناول صدی کے سائنٹیفک ارتقاء کا ایک نتیجہ ہے۔ اس سے طبعیات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ خود طبعیات، کیمیا اور طب کا سہارا لیتی ہے۔ تجرباتی ناول میں مجرد اور ماورائے فطرت انسان کے مطالعے کے بجائے طبعی انسان کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جس پر قوانین طبعیات و کیمیا کی حکمرانی ہے اور جو گرد و پیش کے اثرات سے ترمیم پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے سائنٹفک عہد کا ادب ہے۔ کلاسیکی اور رومانی ادب کا تعلق کلامی اور الٰہیاتی دور سے تھا"[4]

---

1. Dean Howells
2. Rise of Silas Lapham
3. Rougon Macquar
4. تجرباتی ناول مصنفہ بلی ایم شرمن بیانز ولا ص ۲۳

جس حد تک ہمارے نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے، زولا کے ناول اُس مقصد تک پہنچ نہ سکے، جو اس نے پیشِ نظر رکھ لیا تھا۔ ان سے لوئی نپولین کے فرانس کی کیفیت بھی معلوم نہیں ہوتی، چہ جائیکہ ہمارے زمانے کے فرانس کی کیفیت معلوم ہو سکے۔ ان ناولوں سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ عمرانی ماحول میراث پر کس طرح کارفرما ہوتا ہے اور کیونکر آدمیوں کو اس صورت پر پہنچاتا ہے، جس پر وہ پہنچ جاتے ہیں۔ یقیناً وہ ناول تجرباتی نہ تھے، یعنی کارگاہ میں نہیں لکھے گئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مختلف بیماریوں کے نشیب و فراز کا تفصیلی مرقع تھے۔ اور ان میں جزواً زولا کی طبی تربیت کا اثر نمایاں تھا، جو یقیناً زیادہ پختہ نہ تھی۔ ان میں اسی کے سیاسی اور اخلاقی موقف کا عکس ہے یعنی ایک اچھے فرانسیسی جمہوریت پرور کا۔ آگے چل کر اس نے دریفس کی حمایت میں قلم اٹھایا اور وہ پادریوں کا مخالف مادیت پرست اور انتہا پسند بن گیا۔ ان ناولوں میں مرکزی حیثیت زندگی کے خوشگوار پہلو کو ہے۔ زولا کے ناولوں میں عہدِ وکٹوریہ کے رسمی مصنفوں کا مذاق اڑایا گیا، جن کے نزدیک زولا کی کامیابی کا راز صرف یہ تھا کہ وہ بیسواؤں کے قصے لکھتا تھا اور ان نقادوں سے ہمنوائی میں احتراز مشکل ہے، جن کی رائے یہ تھی کہ زولا بیلچے کو بیلچہ نہیں کہتا تھا، بلکہ خونی بیلچہ کہتا تھا۔

زولا کی تصانیف سے انیسویں صدی کے آخری دور ہی کے ادب کا ایک رجحان ظاہر نہیں ہوتا، جسے اُن دنوں بڑی فوقیت حاصل تھی، بلکہ ادب کی دوسری شکلوں کا رجحان بھی یہی تھا۔ اس وقت کا ادب اس وقت ہی کا نہیں، بلکہ بڑی حد تک بیسویں صدی کا ادب بھی نمایاں حیثیت میں بے چینی اور بے اطمینانی کا ادب ہے۔ گویا وہ حالات کی موجودہ صورت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سقراط سے اب تک تمام بڑے مفکر اپنے عہد کو برابر غیر موزوں اور بے ترتیب کہتے رہے۔ انھوں نے خرابیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ ہم جنسوں کو تلقین کی کہ طور طریقوں کی اصلاح کرو، لیکن ایسے دور بھی آئے، جن میں اہلِ علم مقابلتاً صورتِ حال پر مطمئن رہے، مثلاً لاطینی ادب کا دور لوی سے ورجل تک یا لوئی چہار دہم کا دور۔ پھر ایسے دور آئے، جن میں اہلِ علم احوال و ظروف پر سخت رنجیدہ تھے، تاہم وہ امید و اعتماد کے ساتھ لکھتے رہے اور انھیں یقین تھا کہ بہتر حالات میں امیر ہو جائیں گے۔ مثلاً اٹھارہویں صدی کا دورِ تنویر۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ رومانی تحریک کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ انیسویں صدی کے نصفِ ثانی میں کم از کم ممتاز مصنفوں کی تحریرات میں تاریکی کی جھلک پیدا ہو چکی تھی، جو آج تک قائم ہے۔ موجودہ دور کے مغربی ادب میں محض یہی رجحان نہیں رہا، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تاریکی کو توڑنے والی کوئی چیز نہیں آئی۔ بائیں بازو کے مصنفین خصوصاً اشتراکی اپنے عقیدے کے مطابق یہ لکھتے رہے کہ انسانیت یقیناً ایک بہتر معاشرے کی شکل اختیار کر لے گی۔

قنوطیت اور احتجاج کا ادب

انسان کی طبعی نیکی کے متعلق اٹھارہویں صدی میں جو عقیدہ پیدا ہوا تھا، قنوطیوں میں اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ فطرت اور فطری کا جو مفہوم نہ صرف اٹھارہویں صدی، بلکہ انیسویں صدی کے اوائل میں لیا جاتا تھا، زولائی تحریرات میں ان کا وہ مفہوم نہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فطرت کے متعلق بہ ظاہر یہ تصور تھا کہ یہ انسانوں کو حریص، خود غرض، جھگڑالو اور کند ذہن بناتی ہے۔ ان میں جنسی تعلقات کے متعلق گوناگوں

بے قاعدگیاں پیدا کرتی ہے، جو دوسرے بُرے اوصاف کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات ــــ جیسا کہ انگریز ناول نویس ٹامس ہارڈی (سنہ ۱۸۴۰ء ــ سنہ ۱۹۲۸ء) میں ــــ یہ قنوطیت نجی زندگیوں کے مختلف واقعات کی بنا پر ایک بڑے عالمی طنز کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس میں تسکین کا ایک پہلو موجود ہوتا ہے، لیکن یہ مصنفین زیادہ تر عام آدمیوں کی بیدردیوں، حماقتوں اور دیوانگیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

فرانس میں دی موپساں[۱] (سنہ ۱۸۵۰ء ــ سنہ ۱۸۹۳ء) مختصر افسانوں کا یگانہ استاد تھا۔ وہ اپنے استاد فلوور کی طرح عام زندگی کے طربیوں اور المیوں کے متعلق کبھی کبھی سادہ سے انداز میں لکھتا، لیکن اس کی تصانیف میں المیوں یا کم از کم طنزیات کو غلبہ حاصل ہے۔ روس میں چیخوف[۲] (سنہ ۱۸۶۰ء ــ سنہ ۱۹۰۴ء) نے طب کی تربیت حاصل کی تھی، لیکن اس نے اپنے منثور ڈراموں اور مختصر کہانیوں میں یہ بتایا کہ زندگی کس طرح ہم سب کے لیے اس کا سامان بنی ہوئی ہے۔ ناروے میں ابسن[۳] (سنہ ۱۸۲۶ء ــ سنہ ۱۹۰۶ء)، فرانس میں بریو[۴] (سنہ ۱۸۵۸ء ــ سنہ ۱۹۳۳ء) اور انگلستان میں جارج برنارڈ شا (سنہ ۱۸۵۶ء ــ سنہ ۱۹۵۰ء)، سب نے انیسویں صدی کے آخری دور کے ڈرامے کی تشکیل میں حصہ لیا اور اسے اجتماعی مسائل کا ڈراما بنا دیا۔ مسئلہ بعض اوقات وسیع اخلاقی اور سیاسی ہوتا ــــ جیسے ابسن کے ڈرامے "دشمن قوم"[۵]، یا شا کے ڈرامے "انسان اور برتر انسان"[۶] میں ــــ لیکن اکثر مسائل کا تعلق انسان کی نجی خصوصاً جنسی زندگی کی احمقانہ پیچیدگیوں سے ہوتا۔ ابسن نے اپنے ڈرامے "گڑیا کا گھر"[۷] میں ہیروئن کو گڑیا کے گھر کی اُس فضا سے بغاوت پر آمادہ کر لیا، جو شوہر نے اس کے لیے پیدا کر دی تھی۔ پھر اس نے ایک ڈراما "غول"[۸] لکھا، جس میں معاصروں کا مذاق اس بنا پر اڑایا کہ انھوں نے آتشک کے مسائل سٹیج پر پہنچا دیئے۔

برنارڈ شا نے اجتماعی مسائل کو ڈراموں میں لانے کی پر زور حمایت کی اور کہا کہ وقت کے ڈراموں کے لیے یہی شکل موزوں ہے۔ شا کو بظاہر امید تھی کہ لوگ حقیقت کے مقابلے کے لیے آمادہ ہیں۔ یہاں ہم فرانسیسی ڈراما نگار کے بریو کے ایک انگریزی ترجمے کی تمہید کا اقتباس پیش کرتے ہیں، جو شا نے لکھی۔ بریو بھی اپنے ڈرامے "نقصان رسیدہ سامان"[۹] میں آتشک کا مسئلہ سٹیج پر لے آیا تھا۔ شا لکھتا ہے:-

"محض حادثے کی روایت ہی دورِ حاضر کے مطالعۂ حیات کے لیے ناسازگار

---

۱ De Maupassant

۲ Chekhov

۳ Ibsen

۴ Brieux

۵ Enemy of the People

۶ Man and Superman

۷ Doll's House

۸ Ghosts

۹ Damaged Goods

نہیں، انجام کی روایت، خوشگوار یا ناخوشگوار بھی یکساں غیر عملی ہے۔ جب ڈراما نگار واقعات و حوادث کو چھوڑ دیتا ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنا موضوع بنا لیتا ہے تو وہ ایسے ڈرامے شروع کر دیتا ہے جن کا کوئی انجام نہ ہو۔ ایسے ڈراموں میں پردہ گرنے سے پہلے ہیرو نہ قتل ہوتا ہے، نہ اس کی شادی ہو جاتی ہے ——————

—————— یہ ڈراما اس وقت تک چلتا رہتا ہے، جب تک ناظرین پیش کردہ زندگی سے سیر ہو کر کوئی اخلاقی سبق اخذ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ تھیئٹر سے جانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں یا اس کے آخری حصے کو بیچ میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

" جس ڈراما نگار نے فرانس کے سامنے ایسا ڈراما پیش کیا، جو یہ تمام شرطیں پوری کرتا تھا، وہ بریو تھا۔ وہ سائنٹیفک تھا اور زولا کی طرح بااصول و استوار تھا اور اس میں افسردگی کا خفیف سا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس نے دہشت انگیز واقعات پر مولیار سے زیادہ انحصار نہ کیا اور اس کا مزاج بالکل متوازن تھا۔ عام دستور یہ تھا کہ خواہ مخواہ ناگہانی حوادث پیدا کیے جاتے تھے۔ بریو نے یہ طریقہ بالکل ترک کر دیا۔ آپ بریو کا کوئی کھیل دیکھیں، کبھی اس احساس کے ساتھ نہیں اٹھیں گے کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے یا ڈرامہ نگار نے آپ کے لیے مسئلہ حل کر دیا ہے اور نہ آپ اس طرح خوش خوش، مطمئن اور ایسے انداز میں آسودہ خاطر جاتے ہیں جسے مسٹر والکلے[1] نے یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کے ٹائمز میں طربیہ کا حقیقی معیار قرار دیا، بلکہ آپ ایسی حالت میں باہر نکلیں گے کہ دل اطمینان و شگفتگی سے عاری ہوگا۔ اصل معاملے میں آپ الجھے ہوئے ہوں گے اور آپ کو، نیز ہر شخص کو بہ طور خود حل کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ اسی صورت میں تہذیب و تمدن آپ کے احساس شرافت کے لیے قابل برداشت ہو سکتے ہیں[2]"

مغرب کے ادب میں اجتماعی مسائل کے متعلق ڈرامے، ناول اور مختصر افسانے عام ہو گئے۔ یہی کیفیت تیزی سے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پھیل گئی، جہاں روشن فکر نوجوان پرانی طرز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سٹیفن کرین[3] اور تھیوڈور ڈرائزر[4] جنگ کے کاروبار اور محبت کے تلخ حقائق اپنے ناولوں میں بروئے کار لا رہے تھے۔ فطرتیت کی

---

[1] Walkley

[2] بریو کے تین ڈرامے

[3] Stephen Crane

[4] Theodore Drieiser

انتہا پسندی کو ریاست ہائے متحدہ میں ذرا دیر کے بعد فروغ ملا اور یہ کام ہمارے زمانے میں پورا ہوا۔ وہ بھی جنوب میں، جو میگنولیا اور گلاب کی سرزمین ہے۔ وہاں فاکنر[۱] کالڈویل[۲] اور ان کے بہت سے پیرووں نے یہ کام انجام دیا۔

حقیقت پسند یا فطرت پرست تصانیف میں سے اکثر طبقۂ اوسط کے خلاف ہیں، اگرچہ سمجھ لیا جائے کہ ان میں مارکسیت کا کوئی اثر نہیں۔ بےشک بورژوا وہ فلسطی نہیں رہا تھا، جسے رومانیت پرست ناپسند کرتے تھے۔ نہ وہ پیورٹینوں سے ملتا جلتا تھا، نہ روشنی اور اچھائی کا دشمن تھا۔ بہ ایں ہمہ وہ لٹیرا صنعتکار، جنگجو قوم پرست، اپنے بچوں کو تحکمانہ ڈرانے دھمکانے والا، بےذوقی سے سب کچھ سمیٹ لینے والا، جنسی اخلاق کے دوگونہ معیار پر ریاکارانہ عمل پیرا اور خدا جانے کیا کچھ تھا۔ یہ کام فلوبر نے شروع کیا اور اس کی ابتدا ایک ناتمام ناول سے ہوئی، جس کے ہیرو دو سرمایہ دار ہیں۔ وہ دنیا بھر کی بیہودگیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، آخر اپنی تعلیم و تربیت میں مضحکہ خیز طریق پر ناکام رہتے ہیں۔ انگلستان میں سیموئل بٹلر (۱۸۳۵ء — ۱۹۰۲ء) نے اس نمونے کی ابتدا کی، پھر آزادانہ اس کی پیروی ہوتی رہی۔ شاکو خامیوں کا خلاصہ پیش کرنے کے لیے ایک سادہ سی تعبیر مل گئی، یعنی طبقۂ اوسط کا اخلاق۔ ابسن نے اپنی کتاب "دشمنِ دوم" کا نام طنزاً رکھا، عوام خود اپنے دشمن ہیں۔ وہ لیڈر نہیں جس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوں، حالانکہ وہ سب کے لیے بہتر چیزیں فراہم کرنے کا خواہاں ہے۔

جہاں مصنّفین میں تلخی پیدا نہیں ہوئی، وہاں بھی اصل معاملہ نیک و بد کے توازن کا ہے۔ زندگی میں یہ چیزیں متوازن ہوتی ہیں، لیکن طبقۂ اوسط میں اچھے نمونے نہیں ملتے۔ انگریز ناول نویسوں میں سے ایچ جی ویلز، گالزوردی[۳] اور آرنلڈ بینٹ[۴]، فرانسیسی ناول نویسوں میں سے اناطول فرانس[۵] اور زاروں کے روس کے اکثر مصنّفین کو طبقۂ اوسط میں کچھ نہ کچھ برائیاں ضرور مل جاتی ہیں۔ اس نبتۂ لطف آمیز اور نسبتاً معروضی طبقۂ اوسط پر حملے کا خلاصہ ہمیں ایک امریکی مصنّف میں مل جاتا ہے، جس نے بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں کتابیں تصنیف کیں۔ بہ اعتبارِ سنین یہ کتابیں ہمارے پیش نظر دور سے متاخر لکھی گئیں۔ سنکلیر لیوس[۶] کی کتابیں "شاہراہ کبیر"[۷] اور "بیبٹ"[۸] حقیقت پسندانہ ہیں، نہ کہ فطرت پسندانہ۔ جارج بیبٹ یقیناً ایک ہیرو ہے اور اس نے ہزاروں امریکی اہلِ علم کے لیے ایک مرقع پیش کر دیا کہ مادی تمدّن میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ سنکلیر لیوس کے ناول لاکھوں کی تعداد میں بکے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جارج بیبٹ نے خود بھی اپنے طریق زندگی پر

---

۱ Faulkner
۲ Caldwell
۳ Galsworthy
۴ Bennett
۵ Anatole France
۶ Sinclair Lewis
۷ Main Street
۸ Babbitt

طنزیہ فقرے مزے لے لے کر پڑھے ہوں گے۔ جن مصنفوں کے متعلق ہم نے بحث کی ہے، چونکہ ان کی تصانیف بہت زیادہ بکیں، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغرب میں طبقۂ اوسط کا خاصا حصہ اپنی کوتاہیوں کے خلاف برسرِ بغاوت تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض لاریب اپنے آپ کو اس رنگ میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے جس رنگ میں دوسرے انھیں دیکھتے تھے۔

سنہ ۱۸۵۰ء اور پہلی عالمی جنگ کے سالِ آغاز یعنی سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان جو کچھ ادبیات میں لکھا گیا، وہ سارے کا سارا نفرت یا احتجاج پر مشتمل نہ تھا۔ ماڈیا میلانی سے ہم نے بیان کی ابتدا کی تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس ان کی بیٹیاں معیاری رسمی ناول، تاریخی افسانے، وقت گزاری کی کتابیں اور سچی محبت کی داستانیں پڑھ سکتی تھیں۔ ایسے مصنف بھی انھیں مل سکتے تھے۔ جنھیں اگرچہ یہ یقین نہ تھا کہ موجودہ دنیا بہترین دنیا ہے تو کم از کم یہ یقین ضرور تھا کہ انگریزوں کا طبقۂ اوسط بہترین طبقہ ہے۔ انھیں مصنفوں میں ایک کپلنگ[1] بھی تھا۔ بہرحال وہ لڑکیاں فرح بخش اور لذت آور افسانے بھی پڑھ سکتی ہیں۔ ساتھ ساتھ زندگی کے سنجیدہ کاروبار میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔

شعر و سخن

بہت کم افراد تھے، جنھوں نے شعر و سخن کو زولا کے انداز میں فطرت پسندانہ بنانے کی کوشش کی اور انیسویں صدی کا آخری دور ایسا بھی نہیں تھا جس میں کوئی رزمیہ داستان یا بڑی فلسفیانہ نظم فروغ پا سکتی، جیسی ورڈزورتھ کی نظم "تمہید"[2] تھی۔ شعرا نے نظم میں ڈرامے لکھنے کی کوشش کی، مگر یہ ڈرامے دارالمطالعہ میں بیٹھ کر پڑھے جا سکتے تھے، انھیں اسٹیج پر نہیں دکھایا جا سکتا تھا۔ ٹینی سن عہدِ وکٹوریہ کا بہترین رسمی شاعر تھا۔ اس نے اپنی رزمیہ نظم "مناظرِ شاہ"[3] میں شاہ آرتھر کے دربار کے متعلق افسانے نظم کیے ہیں۔ اس نے فلسفیانہ نظمیں بھی لکھیں، مثلاً "یادبود"[4] متعدد ڈرامے بھی لکھے، لیکن اسے غالباً سب سے بڑھ کر کامیابی چھوٹی چھوٹی غزلیہ نظموں میں ہوئی۔

انگلستان میں ٹینی سن، امریکہ میں لونگ فیلو اور اس کے رفیق، جو نیو انگلینڈ میں تھے، فرانس میں وکٹر ہیوگو نے ایسی نظمیں لکھیں، جنھیں انیسویں صدی میں پسند کیا گیا اور بہت پڑھا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان شاعروں کا کلام بچے بچے کی زبان پر پہنچ گیا۔ ظاہری وضع و ہیئت میں ان کی نظمیں ابتدائی دور کی رومانی تحریک کے اوضاع سے مختلف ہیں اور ان کے موضوع محبت، موت، فطرت، حبِ وطن، آرزو ہیں۔ یہی تغزل کے دائمی سرچشمے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی سطح سے نیچے اتر کر سیاسیات میں بھی پہنچ جاتے تھے، مثلاً وھیٹیر[5] کی وہ نظمیں، جو غلامی کے خلاف لکھی گئیں اور جیمز رسل لوول[6] کی وہ نظمیں، جو خانہ جنگی کی بحرانی حالت پر ینکیوں کی زبان میں لکھی گئیں۔ میتھو آرنلڈ، آرتھر ہیو کلاف[7] بلکہ ٹینی سن میں بھی رومانی بحران کے متعلق بہت سی نظمیں ہیں،

۱؎ Kipling　۲؎ Prelude　۳؎ Idyls of the King

۴؎ In Memoriam　۵؎ Whittier

۶؎ Lowell　۷؎ Hugh Clough

جو سائنٹیفک دور میں مسیحی ایمان میں زوال آجانے کا نتیجہ ہیں۔ ٹامس[1] ہڈ نے ایک نظم "پیرہن کا گیت" کے زیر عنوان لکھی، جس میں صنعتی انقلاب کے خوفناک حالات بیان کیے گئے ہیں:۔

"انگلیاں تھک کر چور ہو گئیں
پپوٹے بھاری اور سرخ ہیں
ایک عورت غیر ساتر چیتھڑے لگائے بیٹھی ہے،
سوئی اور دھاگے سے کام کر رہی ہے۔
ٹانکے پر ٹانکا، ٹانکے پر ٹانکا، ٹانکے پر ٹانکا
افلاس، بھوک اور گرد و غبار میں اٹی ہوئی
بہ ایں ہمہ دردناک لے میں
وہ پیراہن کا گیت گا رہی ہے
کام، کام، کام
مرغ بانگ دے رہا ہے
اور کام، کام، کام
یہاں تک کہ تارے چھت میں سے چمکنے لگے
آہ اس سے لونڈی بن جانا بہتر ہے۔
یہ مسیحی کا کام نہیں ہو سکتا
کام، کام، کام
میری محنت کبھی ختم نہیں ہوتی
اور اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟ گھاس پھوس کا بستر
روٹی کا ایک ٹکڑا — اور چیتھڑے
بوسیدہ و فرسودہ چھت — اور برہنہ فرش —
ایک میز — ایک ٹوٹی ہوئی کرسی —
کوری دیوار، شکر ہے میرا سایہ ..... کبھی کبھی اس پر پڑ جاتا ہے[2]۔"

---

1. Thomas Hood
2. ٹامس ہڈ کی نظمیں ص ۱۴۷-۱۴۸

انھیں برسوں میں نظم نے وہ راستہ اختیار کیا، جو ہمارے زمانے تک پہنچ گیا۔ جب شاعر سخت مشکل نظمیں لکھتے ہیں اور ان کے ذاتی تجرباتی شعر مٹھی بھر لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ رومانیت پسند کے لیے شعر اس کی اپنی دنیا کا عکس تھے، لیکن ان لوگوں کو یہ امید نہ تھی کہ یہ محض نجی دنیا ہوگی، بلکہ اس کی وسعت کے قائل تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں فرانس کے اُن شاعروں نے جو پرناسی[۱] کہلائے، بہ طور خاص یہ کوشش کی کہ نظم ظاہری اعتبار سے کامل اور خوب آراستہ ہو، مگر صرف چند لوگ سمجھ سکیں۔ گویا وہ فن برائے فن کے قائل تھے۔ پھر ایک طبقہ تمثیلی شاعروں کا پیدا ہوا، مثلاً ملارمے[۲]، انھوں نے سخت مشکل نظموں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس میں حلقہ در حلقہ تمثیلات کی گرہیں کھول کر معانی تک پہنچا جاتا تھا اور سننے والے پر فوراً نظم کے معنی واضح نہیں ہوتے تھے۔ عجیب امر یہ ہے کہ بیسویں صدی کے شاعروں نے جب اپنے پیشروں کا رخ کیا تو وہ ٹینی سن، ہیوگو یا کپلنگ کے بجائے عہد وکٹوریہ کے ان شاعروں تک پہنچ گئے، جن کے نام بھی لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ مثلاً انگلستان کا جیرارڈ مینلے ہاپکنز[۳] اور امریکہ کا ایمیلی ڈکنسن[۴]۔

مصوری

جس طرح وکٹوریائی ادب عوامی اور رسمی تھا، مگر پست نہ تھا۔ وکٹر، ہیوگو اور ٹینی سن جیسے آدمیوں کی تحریرات اس کی نمائندگی کر رہی تھیں، اسی طرح مصوری بھی اُن فنکاروں کے ذریعے سے پیش ہو رہی تھی، جن کی تصویروں سے آج کل بہت سے نگارخانے مزین ہیں۔ مثلاً فرانس کے دبستان فونتین بلو کے مصور، انگلستان میں واٹس[۵]، برن جونز[۶] اور روسیٹی[۷] اور امریکہ میں اِنس[۸]، آگے چل کر ونسلو ہومر[۹] اور جان سنگر سارجنٹ[۱۰]۔ مغرب میں اور بھی بہت سے مصور تھے۔ فرانس میں ایک گروہ پیشرو جدت پسندوں کا تھا، جنھوں نے ان لوگوں کی تصویروں کا ذلت خیز نام دے دیا۔ حقیقت میں جن مصوروں کو یہ نام دیا گیا، وہ فنی اعتبار سے بڑے ماہر تھے۔ انھیں دور احیاء علوم سے مغربی مصوری کی ایک طویل روایت سے استفادے کا موقع ملا تھا۔ وہ غالباً حقیقت پسند تھے، لیکن زولا کے مفہوم کے مطابق فطرت پسند نہ تھے۔ انھوں نے صنعتی انقلاب کے جھگڑوں سے دامن پاک رکھا اور پیشرو جدت پسندوں کے مخالف گروہ کے نزدیک وہ فطرت میں حسن اور نظم و اسلوب میں امیرانہ ٹھاٹھ کے خواہاں تھے۔

جدت پسند مصوروں کا پہلا بڑا گروہ انیسویں صدی کے اواخر میں وہ تھا، جنھیں فرانسیسی اثر پرست کہتے تھے۔ انھوں

۱۔ Parnassians یہ فرانسیسی شعرا کا ایک گروہ تھا، جن کا مجموعہ کلام چھپا تو اس کے نام میں یونان کے مشہور پہاڑ پرناسس کا نام شامل تھا، اس لیے پورے گروہ کو پرناسی کہنے لگے۔

۲۔ Mallarme

۳۔ Gerard Manley Hoppkins

۴۔ Emily Dickinson

۵۔ Watts

۶۔ Burne-Jones

۷۔ Rossetti

۸۔ Innes

۹۔ Winslow Homer

۱۰۔ Singer Sargent

نے اپنے الگ نگار خانے قائم کر لیے تھے، کیونکہ ارباب فن انھیں ساتھ ملانے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن اب ان کی تصاویر کلاسیکی بن گئی ہیں۔ اثر پرستوں کا گروہ بھی سائنس اور آرٹ دونوں سے مستفید ہوا، لیکن زیادہ پُرپیچ طریقے پر۔ اس طرح نہیں جس طرح تحریک فطرتیت افسانوں میں آئی۔ ان کی رائے تھی کہ سائنس نے ہمیں جو کچھ بتایا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسے ہم حقیقی دنیا کہتے ہیں، وہ نہیں، جو ہماری آنکھ کو اوّل نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اشیا کی اصل صورت وہ نہیں، جو ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ اصل پرست گروہ ارباب فن کی کیمرے جیسی آنکھ پر قانع نہ تھے۔ علمائے طبیعیات نے انھیں بتایا کہ نور کوئی بسیط شے نہیں، بلکہ مرکب شے ہے، جسے آنکھ فطرت کے منشوری انعکاسات سے ترتیب دیتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ نور کا تجزیہ کریں۔ پھر اسے پردے پر پھیلا دیں۔ چنانچہ وہ زیادہ تر مناظر کی تصویریں بناتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سبز، اودے دھبّے یا رنگین نقطے لگا لگا کر درخت، عمارتیں، پھول اور آسمان تیار کر لیتے تھے۔ ان کی تصویریں چند فٹ سے دیکھی جاتیں تو رنگ کا بے پیکر ملغوبا نظر آتیں، لیکن مناسب فاصلے سے دیکھی جاتیں تو ایسا منظر معلوم ہوتیں، جو سراپا نور میں غرق ہو۔

اثر پرستوں کے دبستاں کا بزرگ استاد کلاڈ مونا[1] تھا (سنہ ۱۸۴۰ء ـــــ ۱۹۲۶ء)۔ اس نے بے شمار تصویریں بنائیں۔ آج یہ تصویریں عام عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ وہ ایک ہی موضوع کی تصویریں بار بار بناتا تھا۔ خصوصاً رویئن کے گرجے، نیز اپنے باغ کے کنول والے چشمے کی تصویر۔ اس طرح وہ دکھاتا کہ دن کے مختلف حصّوں میں نور کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے ساتھ یہ مناظر بھی مختلف نظر آتے ہیں۔ نور نے دوسرے مصوّروں میں بھی خاصی دلچسپی پیدا کی، مثلاً انگلستان کا مصوّر ٹرنر[2] جسے بحری تصویروں میں درجۂ اختصاص حاصل تھا اور امریکہ کا انگلیسی مصوّر وسلر[3]، جو لندن کی کہر بھری فضا کے مناظر کی تصویریں تیار کرتا رہا۔ اسے اس بات پر بے حد شرم آتی تھی کہ وہ لوول (مساچوسٹس، امریکہ) میں پیدا ہوا۔

انیسویں صدی کے جس دبستانِ مصوّری کا نمائندہ فرانسیسی مصوّر ادوارڈ مانٹ[4] ہے (سنہ ۱۸۳۲ء ـــــ ۱۸۸۳ء) اس کی تصویروں میں حقیقت پسندی ناول جیسی تھی، تجرباتی نہ تھی۔ یہ حقیقت پسندی دراصل موضوع کی تھی۔ مانا کے شہکاروں میں سے میکسیکو کے شہنشاہ میکسملین کے قتل کی تصویر ہے جو بدنصیبی سے نپولین سوم کی سامراجی حرص کا شکار ہوا۔ مانا نے عام لوگوں کی بھی بہت سی تصویریں چھوڑی ہیں۔ وسط صدی کی بہترین تصویروں کے بلاک اور نقشے بنا لیے اور چھاپے کے ذریعے سب کے لیے مہیا کر دی گئیں۔ اس دائرے میں بھی فرانسیسی ہی سب سے بالا رہے اور ان میں بلند ترین درجہ دومیا[5] اور فورین[6] کا ہے۔

۱؎ Claude Monet — ۲؎ Turner

۳؎ Whistler — ۴؎ Manet

۵؎ Daumier — ۶؎ Forain

صدی کے آواخر میں جدت پسندوں کا گروہ دوسری تکنیک کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے بیان کرنا اثر پرستی سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا شخص فرانسیسی مصور سیزان[1] ہے (۱۸۳۹ء — ۱۹۰۶ء)۔ اس کے نزدیک اثر پرستوں نے شکل و صورت کا احساس زائل کر دیا تھا۔ وہ ابعادِ ثلاثہ کی دنیا سے الگ ہو گئے تھے، لہٰذا اس نے چاہا کہ وہ دوبارہ ان چیزوں کی طرف لوٹ آئیں۔ اس سلسلے میں اس نے کلاسیکی طریقہ پسند نہ کیا، جو ارباب فن نے اطالویوں سے حاصل کیا تھا، بلکہ نیا طریقہ اختیار کیا، یعنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے دھبوں یا قطعات کی آزمائش سے وہ ایسی صورت پیدا کر لیتا، جو حقیقت پسندی کے قریب ہوتی، سیزان، نیز اس کے دو ہمعصروں — ولندیزی وان گوگ[2] اور فرانسیسی گوگن[3] — کی تصویریں پہلے لغو، ذاتی اور ایک بے سود تجربہ سمجھی جاتی تھیں، اب عجائب خانوں میں انھیں ہر دلعزیز مانا جاتا ہے اور ان کی بے شمار نقلیں تیار ہو چکی ہیں۔

دوسرے فنون

انیسویں صدی سنگتراشی اور مجسمہ طرازی کے لیے کوئی بڑا دور نہ تھی۔ جس دور نے صنعتی فنون میں کمال حاصل کیا تھا، اس نے بہ کثرت یادگاری مجسمے پیدا کیے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت امریکہ کے مجسمہ آزادی کو حاصل ہے، جو نیویارک کی بندرگاہ میں نصب ہے۔ یہ فرانس کے مجسمہ تراش بارتھولڈی[4] کا کارنامہ ہے اور تیسری جمہوریت نے اسے جمہوریۂ امریکہ کو بہ طور تحفہ دیا تھا، مگر مدبروں اور جنگجوؤں کے جو مجسمے مغربی دنیا کے مقاماتِ عامہ کے لیے باعثِ زینت بنے ہوئے ہیں، وہ حقیقت کے ایسے پیکر ہیں کہ انھیں انسان سمجھنا مشکل ہے۔ مجسمہ طرازی اصلاً امرائی فن معلوم ہوتا ہے تاکہ قصروں اور وسیع باغوں کی آرائش کا سامان مہیا کرے۔ انیسویں صدی میں شہری زندگی کے اندر اس سے استفادے کی بہترین مثالیں — یا کم سے کم بُری — پیرس میں ملتی ہیں، خصوصاً "محرابِ فتح" کی آرائش میں، جو نپولین اوّل کی عظیم القدر فوج کی مفاخر یادگار ہے یا نئے اوپیرا اور بہت سی دوسری عمارتوں میں۔ صدی کے آخر میں روڈن[5] اور میلول[6] جیسے فرانسیسیوں نے وقت کے رسمی معیاروں سے الگ ہونا شروع کیا۔ چنانچہ انھوں نے مردوں اور عورتوں کے ناک نقشے اور ڈیل ڈول میں زیادہ سادگی اور قوت پیدا کر لی۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس دور میں زمانۂ قدیم اور دورِ احیائے علوم کے مجسموں کی نقلیں زیادہ عام اور کم خرچ ہو گئیں اور عہد وکٹوریہ کے یورپ اور سمندر پار کے بہت سے ایوان ہائے ملاقات زہرہ کے پلاسٹری اور برنجی عطارد کے مجسموں پر نازاں تھے۔ عجائب خانوں میں بھی پلاسٹر کے بہت سے مجسمے پہنچ گئے۔ اس طرح زمانۂ قدیم کے عظیم القدر فنی کارناموں سے عوام کو براہ راست متفیض

---

[1] Cezanne — [2] Von Gogh

[3] GANGUIN — [4] Bartholdi

[5] Rodin — [6] Maillol

ہونے کا موقع مل گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی فنونِ ماضی کے متعلق بہت زیادہ واقف ہوگئی اور اس عہد کا ذوق و مشرب زیادہ انتخابی و استخراجی ہوگیا۔ یقیناً یہ انتخابیت تعمیرات میں زیادہ نمایاں ہوئی۔ دنیا کے ہر حصے میں لوگوں نے ہر نمونے کی عمارتیں بنالیں، مثلاً چینی پیگوڈا، مصری اہرام، یونانی معبد، خصوصاً امریکہ میں گاتھوں کے انداز کی یونیورسٹیاں۔ امریکہ میں عمارتوں کے لیے نمونے تجویز کیے جانے لگے مثلاً بینکوں کی عمارتوں میں یونان و روما کے طریق تعمیر کو مقدم سمجھا گیا، خصوصاً بینکوں کے رد کاروں میں کلیساؤں اور یونیورسٹیوں میں گاتھی نمونہ استعمال ہوا۔ سرکاری عمارتیں دورِ احیائے علوم کے نمونے پر بننے لگیں جس میں مروجہ ذوق کے مطابق ترمیم کرلی گئی۔ اس کی مثال پیرس کی درسگاہ فنونِ لطیفہ میں مل سکتی ہے۔ مختلف شہریوں نے اپنے مکانوں کے لیے وہ نمونے پسند کیے، جو انھیں خوشگوار نظر آئے۔ البتہ اپنے اپنے علاقوں کے مطابق ان میں ترمیم کرلی گئی۔ مختلف ماہرینِ فن نے ایک تاریخی نمونہ سامنے رکھا، لیکن اپنے خاص انداز کے مطابق اپنالیا۔ امریکی ماہر تعمیرات رچرڈسن نے رومی طرزِ تعمیر کو زندہ کیا۔ اس کی محرابیں گول تھیں اور اس میں پائیداری زیادہ تھی، لیکن اسے خاص اپنا نمونہ بنالیا۔ اسے دیکھنا چاہیں تو بوسٹن کے ٹرینیٹی[۱] چرچ (کلیسائے تثلیث) میں دیکھ لیں۔

انیسویں صدی کے ملے جلے اندازِ تعمیر میں دو نمونے زیادہ نمایاں ہیں، ایک جس سے سرکاری عمارتوں میں کام لیا گیا، کا تعلق بنیادی طور پر دورِ احیائے علوم سے تھا۔ اس نمونے میں رد کار مثلث نما رکھے جاتے تھے، بالاخانے کے برآمدے بنائے جاتے تھے۔ بعض اوقات گنبد بھی تعمیر کردیئے جاتے تھے۔ آرائشی پٹی اور دوسری زینتوں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ یہ نمونہ ہر قوم میں تھوڑا بہت بدلتا رہا۔ فرانسیسی سرکاری عمارتیں فنونِ لطیفہ کے زیر اثر ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے تورین[۲] کا ایک شاطو[۳]۔ جرمن عمارتوں میں ازمنۂ وسطیٰ کا اثر نمایاں تھا۔ برطانیہ کی عمارتیں زیادہ سادہ تھیں اور ان میں مشہور اطالوی ماہر تعمیرات پیلاڈیو[۴] کا انداز ملحوظ رہتا تھا۔ نیویارک اور بوسٹن میں انھیں عمارتوں کی زیادہ نقل کی گئی۔ دوسرا نمونہ ذاتی مکانوں کا تھا، جس نے یورپ میں "ولا" (بنگلا) کی شکل اختیار کرلی اور امریکہ میں ان عمارتوں نے فروغ پایا، جنھیں مینشن (بڑی عمارت یا حویلی) کہنا چاہیے۔ یہ عمارتیں کامیاب کاروباری آدمیوں نے ایلم سٹریٹ[۵] میں بنوائیں۔ امریکہ میں یہ نمونہ ۱۸۷۰ء کے بعد زیادہ رائج ہوا، جسے عموماً جنرل گرانٹ کا عہد کہا جاتا ہے۔ یہ

---

۱ Trinity

۲ Touraine

۳ Chaten

۴ Palladio

۵ Elm Street

بڑی بڑی بنی ہوتی تھیں، کیونکہ کنبے عموماً وسیع ہوتے۔ گھریلو ملازم سستے مل جاتے اور بہ کثرت مقرر کر لیے جاتے۔ عمارتوں کا خرچ نسبتاً کم تھا۔ ان کی چھتیں بہت بلند ہوتیں، کیونکہ بورژوا نہیں چاہتے تھے کہ ان کے مکانوں میں کوئی چیز ماضی کے عہد کاشتکاری کی نیچی چھت والے مکانوں کی یاد تازہ کرے۔ آج یہ عمارتیں اپنی چوڑائی کے اعتبار سے زیادہ بلند معلوم ہوتی ہیں اور ان میں چھوٹی چھوٹی برجیوں اور گوناگوں آرائشوں کے باعث ان کے خط قائم نہیں رہ سکے، لیکن ان میں آسائش کی بہترین چیزیں موجود تھیں۔ قصبوں میں بھی یہ عمارتیں بہت وسیع ہوتیں۔ ان میں گیس کی روشنی ہوتی۔ غسل خانے میں پانی کا انتظام بہت عمدہ طریق پر کیا جاتا۔ موسم سرما کے لیے عمارت کو گرم رکھنے کا انتظام ہوتا اور پانی بھی گرم ملتا۔ اہل یورپ ان آسائشوں سے بعد میں مستفید ہو۔

مجسمہ تراشی کی طرح تعمیرات میں بھی حقیقی جدتوں کا آغاز صدی کے آخیر میں ہوا۔ اب مکانوں کے ڈھانچے میں فولاد استعمال ہونے لگا۔ اس وجہ سے گاتھی طرز تعمیر میں جو حد بندیاں تھیں، وہ سب ختم ہو گئیں اور عمارتوں کو خواہش کے مطابق زیادہ سے زیادہ بلند بنانا ممکن ہو گیا۔ یہی زمانہ ہے جس میں فلک بوس عمارتیں بنیں اور اس قسم کی پہلی عمارت شکاگو میں بنائی گئی (۱۸۸۵ء)۔ یہ بیمے کی عمارت تھی۔ اگرچہ آگے چل کر ان فلک نما مبورتوں میں گاتھی طرز کے برج بننے لگے اور آرائشیں بہت زیادہ ہو گئیں۔ لیکن عام رجحان سادگی ہی کی طرف تھا۔ بیسویں صدی آگے بڑھی تو ساتھ ساتھ تعمیر میں سادگی بھی ترقی کرتی گئی۔ فولادی ڈھانچوں سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آخری دور کی زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش عمارتوں کا اصل مقصد حسن و جمال نہ تھا، مگر حسن و جمال پیدا ہوتا رہا۔ اس زمانے میں جو بڑے بڑے پل بنے، وہ حسین زیبا بھی تھے اور کارآمد بھی۔ مثلاً سکاٹ لینڈ میں فرتھ آف فورتھ[1] کا پل، نیز بروکلن[2] کا پل (نیویارک)۔

گھر کے ساز و سامان گھریلو آرائشوں اور لباس کے اعتبار سے عہد وکٹوریہ اب حد درجہ عجیب غریب اور حد درجہ بدوضع معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ امر قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ لوگ سنہ ۱۸۷۰ء کے بعد کی عجیب و غریب چیزیں اسی طرح جمع کریں گے، جس طرح وہ پیشتر کے دور کی چیزیں جمع کر رہے ہیں۔ مثلاً پرانی چیزوں میں سے گھوڑوں کے بالوں سے بنے ہوئے صوفے اور سنگ مرمر کی میزیں آج کل زیادہ بک رہی ہیں، مگر یہ چیزیں حد درجہ وزنی تھیں اور کمرے بہت تاریک ہوتے تھے، کیونکہ کھڑکیوں کی روشنی بھاری پردوں کی وجہ سے مدہم پڑ جاتی تھی۔ پھر سامان آبنوس یا اخروٹ کی لکڑی کا ہوتا تھا۔ داخلی آرائشوں میں ہمارا ذوق عہد وکٹوریہ سے مختلف ہے، کیونکہ ہمارے معاشرے میں گھریلو ملازم بہت کم رکھے جاتے ہیں اور ان کی تنخواہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ عہد وکٹوریہ میں پرانی چینی یا دوسرے نوادر میں سے گرد و غبار جھاڑنے کے لیے جتنی رقم صرف ہوتی ہے، آج کل کی منتظمۂ خانہ داری اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

۱؎ Firth of Forth

۲؎ Brooklyn

موسیقی

صرف ایک فن اب تک بحث میں نہیں آیا، یعنی موسیقی۔ انیسویں صدی میں فن موسیقی کے اندر قیادت فرانس سے جرمنی کی طرف منتقل ہو گئی۔ رچرڈ ویگنر[1]، برہمس[2] اور رچرڈ سٹراس[3] اس موسیقی میں بہت بلند نام ہیں۔ یہ غیر معمولی درجے تک جرمن ہیں، مگر انھیں اجارہ دار نہیں سمجھا جا سکتا۔ روسیوں میں سے موسورگسکی[4]، رمسکی کورساکوف[5]، شائیکوفسکی[6] اور ان کے رفقاء نے جو موسیقی مدون کی وہ آج ہماری میراث کا ایک حصہ ہے۔ ورڈی[7] اور دوسرے اطالویوں نے جو تمثیلیں لکھیں وہ بلند ذوق آدمیوں کے نزدیک زیادہ رسمی حیثیت رکھتی ہیں، تاہم ان سے بھی دنیا کے مختلف حصّوں میں لطف اٹھایا جاتا ہے۔ کلاڈ ڈبوسی[8] جیسے فرانسیسیوں نے ویگنر کے نغمات بلند کرنے کے بجائے ایچ پیچ پر زیادہ توجہ کی۔ بہ ایں ہمہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا موسیقار ویگنر ہی ہے (۱۸۱۳ء سے ۱۸۸۳ء)۔

ویگنر نے تمثیل کو ڈرامے کا اعلیٰ ترین مظہر بنانے کی کوشش کی۔ وہ موسیقی اور عمل کے درمیان حقیقی اور ڈرامائی انداز میں امتزاج کے لیے کوشاں تھا۔ اس غرض سے اس نے رزمیہ موضوع چنے، جو ٹیوٹانی افسانوں پر مبنی تھے۔ اس کی ہر دلعزیزی کو بعض اوقات اس وجہ سے نقصان پہنچتا رہا کہ اس کی موسیقی میں عہد وکٹوریہ کی سی سنگینی ہے۔ اس کی تمثیلیں زیادہ غیر معمولی طریق پر لمبی ہوتی ہیں اور شور بہت مچتا ہے۔ نیٹشے نے ایک دفعہ ٹھیک کہا تھا کہ ویگنر کی موسیقی سے پسینہ ٹپکتا ہے۔

فنون پر نظر بازگشت

جو کچھ ہم نے کہا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخری دور کے ادب و فنون میں ہر قسم کی لہریں شامل تھیں، جو مختلف ملکوں کے اختلافات سے حرکت میں آئیں۔ نیز مختلف عمرانی طبقوں کے اختلافات ان پر اثر انداز ہوتے رہے۔ ان میں ایک عوامی ثقافت بھی تھی، یعنی سادہ طریق پر قصّہ گوئی کا فن اور تصویر، جو ویسی ہی کہانی بیان کرے۔ یہ عوامی فن غالباً زیادہ جذباتی تھا۔ اس میں انسانی راحت کا زیادہ سامان تھا اور ازمنہ وسطیٰ کے عوامی فن کے مقابلے میں اس کے اندر طنز کم تھا اور یہ زیادہ ارضی تھا۔ ایک ثقافت رسمی بھی تھی، جسے بحیثیت مجموعی حقیقت پسندانہ یا مادہ پرستانہ کہنا چاہیے، اگرچہ یہ ثقافت بھی موجودہ تلخ دنیا سے بہتر دنیا کی طرف بھاگنے کی رومانی کوشش سے خالی نہ تھی۔ رسمی فن اور ادب میں سب سے بڑھ کر انتخابیت سے کام لیا گیا، یعنی ماضی سے آزادانہ مختلف چیزیں مستعار لے لی گئیں، لہٰذا اس کے متعلق خاص طرز یا اسلوب کی اصطلاح استعمال کرنا مشکل ہے۔

---

۱ Wagner | ۲ Brahams | ۳ Strauss

۴ Moussorgsky | ۵ Rimsky Korsa | ۶ Tschaikovsky

۷ Verdi | ۸ Debussy

غالباً ہم اسے طبقۂ اوسط کی ثقافت کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس میں زیادہ تر بورژوائی زندگیوں سے تعلق ہے۔ نیز اس سے سنجیدگی، محنت و مشقت کے لیے جذبہ، حصولِ معاش سے گہرا تعلق، رسمی اخلاق اور پھوہڑپنی نمود و نمائش پائی جاتی ہے۔ اور یہی چیزیں طبقۂ اوسط سے عموماً وابستہ کی جاتی ہیں، لیکن اس نے ایسا فن اور ادب بھی پیدا کیا کہ موجودہ اشیاء کے خلاف احتجاج بھی نمایاں ہے۔ اس میں ٹرولپ کے ہلکے طنز سے نیٹشے کی سخت بیزاری تک ہر چیز پائی جاتی ہے۔ نیز اس میں ہر قسم کی اخلاقی اور سیاسی جھلکیاں موجود ہیں۔ مثلاً مارکسیت، اشتراکیت، اکھراٹیکس، آزاد محبت، حقوقِ خواتین، تجدیدی مسیحیت اور اٹھارہویں صدی کی تومیت۔ اس کے دائرے کا نہایت عمدہ خلاصہ دو مثالی داستانوں میں پیش کیا جا سکتا ہے، جو اپنے وقت میں بہت رواج پا چکی تھیں اور حیاتِ کاملہ کے متعلق میں ان کے افکار متضاد تھے۔ امریکہ کے ایک مصنف ایڈورڈ بلامی[۱] نے "نگاہِ بازگشت[۲]" کے نام سے ایک داستان لکھی (سنہ ۱۸۸۸ء)، جس میں بتایا کہ مشین نے سب کے لیے زندگی مکمل کر دی ہے۔ بلامی نے مبہم طریق پر ریڈیو کا تصور بھی پیدا کر لیا، کیونکہ اس کا ہیرو اپنے کمرے میں ایک بٹن دبا کر دلکش نغمے سن لیتا تھا۔ ایک انگریز مصنف ولیم موریس[۳] نے "خبر، مگر کہیں سے نہیں[۴]" کے نام سے ایک داستان لکھی (سنہ ۱۸۹۰ء)۔ اس میں بتایا کہ انسانوں نے تمام مکروہ مشینیں توڑ پھوڑ ڈالیں اور ازمنۂ وسطیٰ کی زندگی اختیار کر لی، جو موریس کے نزدیک حقیقی راحت و آسائش کی زندگی تھی۔

---

۱ Bellaimy

۲ Looking Backward

۳ Morris

۴ News from Now here

فلسفہ

تصوّریت و حقیقت

انیسویں صدی کے آخری دور میں جو فن و ادب پیدا ہوا، اس میں دنیا کے متعلق انسانی روش کے تقریباً تمام پہلو آشکارا ہوئے۔ رسمی فلسفے اور عام تعلیم یافتہ لوگوں کے کم رسمی نظریہ ہائے حیات میں بھی بہت تنوع تھا۔ ہم نے ادب و فن میں جتنے مختلف دبستان دیکھے، اتنے ہی ماورائے طبعیات اور اخلاقیات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ فلسفے کا دبستانِ تصوّریت موجودہ شکل میں جرمنی کے کانٹ اور ہیگل کے ساتھ پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یہ دبستان اپنے مولد کے اندر فروغ پاتا رہا۔ آکسفورڈ کے دبستان سے ٹی، ایچ گرین[1]، بریڈلے[2] اور بسنکوسے[3] امریکی فلسفی جوشیا رائس[4] بھی اس کے پیرو بن گئے، بلکہ یہ لاطینی ممالک میں بھی پہنچ گیا۔ اس کے مقابلے میں جو دبستان فلسفہ پیدا ہوا۔ اسے اب حقیقت بینی کا نام دیا گیا۔ یہ بھی کم از کم تصوّریت کے برابر ضرور پھیلا، تاہم دورِ حاضر کی حقیقت بینی اس افلاطون وضع کی حقیقت بینی سے بہت مختلف تھی، جو ازمنۂ وسطیٰ کے کلاسیکی فلسفیوں نے اختیار کی تھی۔ دورِ حاضر کی حقیقت بینی کی جڑیں اٹھارھویں صدی کے فلسفیوں کی سائنٹیفک عقلیت پسندی میں پہنچی ہوئی ہیں۔

امریکی فلسفی ولیم جیمز (۱۸۴۲ء — ۱۹۱۰ء) نے تصوّریت اور حقیقت بینی کے اس انتہائی تضاد کو واضح کرنے کے لیے، جو مغرب کی فلسفی روایت میں عام تھا، دو اصطلاحیں وضع کیں۔ اس نے لکھا کہ انسان طبعاً "نرم دل" اور "سخت دل" ہوتے ہیں۔ یا تو سخت دل کی بنا پر انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ حواس کے ذریعے سے جس دنیا کا انھیں علم ہوتا ہے، وہی حقیقی دنیا ہے یا نرم دل کی بنا پر انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ جس دنیا کے متعلق انھیں حواس کے ذریعے سے علم ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی درجے میں ایک فریب یا التباس ہے یا کم از کم نامکمل و متبدّل ہے، لہٰذا اسے اس حقیقی دنیا کی غیر حقیقی نقل یا عکس قرار دینا چاہیے، جو ہمارے ذہنوں یا ذہنِ باری تعالیٰ میں موجود ہے۔

---

۱ Green
۲ Bradley
۳ Bosanquet
۴ Josiah Royce

چونکہ انیسویں صدی کا آخری دور زبردست مادی ترقی کا دور تھا اور اسے عالم حواس سے گہرا تعلق تھا، لہٰذا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی سخت دل لوگوں کو نرم دل لوگوں پر فوقیت حاصل رہی، لیکن رسمی فلسفے میں حقیقت حال یہ نہ تھی، کیونکہ نرم دل لوگ تعداد میں بھی زیادہ تھے اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں زیادہ سرگرم بھی تھے۔ غالباً عام اور جوہرِ غور و فکر سے خالی شخص سخت دل لوگوں کی طرف مائل ہوگا اور کسی وجہ سے نہیں تو صرف اس وجہ سے کہ عقل عامہ اسے عالم حواس یا دنیا سے مادہ کے وجود کی طرف راغب کرے گی، مگر اس نقطے پر قابل اعتماد اعداد موجود نہیں اور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اہلِ مغرب کے نظریۂ عالم میں مسیحیت بھی ایک ایسا سہارا پیدا کرتی ہے جس سے مفر کی گنجائش نہیں، لہٰذا عقل عامہ بھی نرم دل کی دنیا کو "روح رواں" اور عالم عقبیٰ کے تصورات سے کاملاً الگ نہیں کرسکتی۔

بہ ایں ہمہ انیسویں صدی کے دورِ آخر کے رسمی فکر میں بعض مشترک تسمیے موجود ہیں، یہاں بھی ڈارونیت اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہی۔ اس دور کے فکر میں ایک تاریخی اور ارتقائی قالب موجود تھا، جسے نرم دل آدمی بھی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ جو لوگ تصوریت کے معتقد ہیں، وہ ہیگل کی پیروی میں یہ عقیدہ لیے بیٹھے تھے کہ حواس کی اس دنیا کے ہنگامہ و تغیرات سے بالاتر وجود مطلق کی ایک دنیا ہے، جو کامل و اکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، لیکن ان کا یہ بھی یقین تھا کہ یہ ناقص و نامکمل دنیا دوسری دنیا کی طرف کھچی چلی جارہی ہے۔ وہ ترقی کر رہی ہے، بڑھ رہی ہے، ارتقا پارہی ہے، اگرچہ وہ اس کے طریقوں کو سمجھنے کے پوری طرح قابل نہ تھے۔ ساتھ ہی انیسویں صدی کے حقیقت بیں کا عقیدہ بھی یہ نہ تھا کہ اس کی عقل بہتر زندگی کے لیے کوئی واضح ریاضیاتی فارمولا مہیا کرسکتی ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ ہر چیز ترقی پذیر ہے اور انسانی تدبیریں جو کچھ بناتی ہیں، انھیں بھی فطرت کے پُراسرار طریقِ نشو و ارتقا پیش نظر رکھنا چاہیے۔

کیشِ ارادہ

اس دور کے فکر میں ایک اور آہنگ بھی ہے، جو پہلے سے ملی ہوئی ہے، یعنی اس میں ارادے پر بہت زور دیا گیا۔ ارادے سے مقصود وہ قوّتِ حیات ہے، جو جہد للبقاء کو ممکن بناتی ہے۔ یہ لفظ یعنی ارادہ ہر جگہ نمایاں ہے، حتّٰی کہ کتابوں کے ناموں میں بھی اس کا ذکر آتا ہے، مثلاً شوپن ہار[1] کی کتاب "دنیا بہ صورت ارادہ و فکر[2]"، نیٹشے کی کتاب "ارادۂ قدرت[3]"، ولیم جیمز کی کتاب "ارادۂ اعتقاد[4]"۔ بعض اوقات یہ لفظ منثور شکل میں بھی استعمال ہوا، مثلاً ہنری برگساں کا "تخلیقی ارتقاء[5]" اور برنارڈ شا کی "قوّتِ حیات[6]"۔ فرانس کا فلسفی جارج سورل[7] اکتسابی اشتراکیت کا حامی اور انارکی کا داعی تھا۔ اس نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے، نیز جرمنی کے فلاسفر ہنس ویہنگر[8] نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

---

۱ Schopen Hauer ۲ World as will and Idea ۳ Will to Power

۴ Will to Believe ۵ Creative Evolution ۶ Life Force

۷ Sorel ۸ Hans Valhinger

آخری دو مفکروں کے نزدیک صواب و خطا کے بڑے بڑے خیالات اور مجرّدات محض دنیا کو سمجھنے کے لیے انسانی ذہن کی کوششیں ہی نہیں، بلکہ دنیا کا تجرباتی بیان پیش نظر رکھا جائے تو یہ دونوں غلط ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری خواہشوں، ارادوں اور مرتفع اعمال کے رہنما ہیں۔ گویا یہ افسانے ہیں، خرافاتی کہانیاں ہیں، بہ ایں ہمہ حقیقت ہیں۔

ولیم جیمز کے نظریۂ عملیّت کے متعلق موصوف کے بعض نقّادوں نے کہا کہ جہاں ایک مرتبہ کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ہوتی ہی چلی جاتی ہے، حالانکہ یہ رائے سراسر نامناسب تھی، مگر نظریۂ عملیت بھی دراصل ارادے ہی کے فلسفوں میں سے ایک ہے۔ جیمز خود ایک اعتبار سے سخت دل تھا۔ اس کے نزدیک حقیقت مطلق نہیں، جیسا کہ اصحاب تصوّریت سمجھے بیٹھے ہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ حقیقت کوئی یقینی اور معیّن شے نہیں، حقیقت وہ ہے، جو انسانوں کے لیے کار آمد ہے۔ سچائی وہ ہے، جو ہم یقین کرنا چاہتے ہیں۔

جب جیمز نے مان لیا، جو چیز ہم چاہتے ہیں، ضروری نہیں، وہ عملی ہو اور ضروری نہیں کہ ہماری تمام خواہشیں پوری ہوں تو وہ سمجھتا تھا کہ اس طریق فکر و نظر کے بدیہی خطرے سے محفوظ ہو گیا۔ اگر میرا عزم اعتقاد کہتا ہے کہ میں تین سو فٹ کی جست لگا سکتا ہوں تو تجربہ اور عملی معیار ثابت کر دے گا کہ یہ ممکن نہیں، مگر جیمز کے اکثر نقّادوں کے نزدیک وہ موضوعیت سے محفوظ نہیں ہوا۔ یعنی اس نے حقیقت اور سچائی کو موضوعی اور انفرادی بنا کر اپنے آپ کو بچایا نہیں۔ ان نقّادوں کے نزدیک نظریۂ عملیّت روایتی اقدار کو کھا جانے والا ایک خطرناک نظریّہ ہے۔ اس سے یا تو انسان کسی معمولی کامیابی کو مبالغہ آمیز شکل دے دیتا ہے یا کسی شے پر محض اعتقادی کی خاطر مہمل اعتقاد پر کاربند رہتا ہے۔

جیمز کا تعلق بہ حیثیّت عمومی اس گروہ سے ہے، جو آلۂ فکر پر اعتماد نہیں رکھتا۔ کم از کم استدلالی نقطۂ نگاہ اور رسمی منطقی نقطۂ نگاہ سے۔ یہاں اس کی آخری کتابوں میں سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

"تمام فلسفے محض مفروضات ہیں۔ ہماری جذباتی اور منطقی صلاحیتیں ان مفروضات کی طرف ہمیں لے جاتی ہیں اور آخری ارتباط کے موقع پر صحیح ترین مفروضہ ان لوگوں کا سمجھا جائے گا، جن کی صلاحیتوں میں بہ حیثیّت عمومی پیش بینی کی بہترین قوّت ہے[1]"

عقل کے خلاف بغاوت

انیسویں صدی کے دور آخر کو ہم ایک وسیع ندی کہہ لیں تو کشش ارادہ ہمیں اس کی سب سے بڑی لہر پر پہنچا دے گا، یعنی عقل کے خلاف جس بغاوت کی ابتدا رومانیت پسندوں نے صدی کے اوائل میں کی تھی، وہ بہت تیز ہو گئی۔ ہم اسے ایک ایسی تحریک قرار دے سکتے ہیں، جو عقل کے صریح مخالف تھی۔ جو بے عقلی یا حقیقتہً تحریک ضد تعقل تھی۔ یہ آخری اصطلاح بھی ایک حد تک غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے، کیونکہ اس سے

---

[1] ولیم جیمز کی کتاب Essays in . . . Radical . . . Empiricism (انتہا پسندانہ تجربیت پر مقالے)

معلوم ہوتا ہے، تحریک کی حیثیت سلبی تھی، حالانکہ یہ تحریک ایک ایجابی پہلو رکھتی تھی، لہٰذا اس کی بہترین تعبیر یہی ہے کہ اسے عقل بر انداز تحریک کہا جائے۔

احتیاطاً ایک اور بات کہہ دینی چاہیے۔ یہی تحریک دراصل دورِ حاضر کی مطلق العنانی کی اصل و اساس ہے، خصوصاً فاشسٹوں اور نازیوں کی مطلق العنانی کی۔ لیکن اسے مطلق العنانی کے مترادف نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ زیادہ وسیع ہے اور اس اصطلاح میں بہت کچھ شامل ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے، اگر کوئی فرد مخالفِ عقل لہر سے متاثر ہوا ہو اور اگر بالکل آرتھوڈکس، جمہوری اور انفرادیت پسند نہیں تو کم از کم بے تعصب رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مارکسی مطلق العنانی کا پیرو ہو اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دورِ حاضر کی خلافِ عقل چیزوں میں سے بہت کچھ رد کر دے۔

اس مخالفِ عقل تحریک کی بنیادی حیثیت، جس کے لیے یہ رومانی تحریک کی حد درجہ ممنون ہے، یہ ہے کہ اس نے عام انسان کو طبعاً عقلی وجود مان لینے کا وہ شیوہ رد کر دیا، جو دورِ تنویر میں عام تھا۔ تحریک مخالفت عقل اس اعتبار سے سلبی تحریک ہے کہ یہ تنویر کو بھی رد کرتی ہے، لیکن اس کا ایک ایجابی پہلو بھی ہے اور عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنی حقیقی اپنی پُر پیچ فطرت کو سمجھ لیں اور مان لیں یعنی یہ مان لیں کہ ان کی بے عقلی اور اُن قوتوں پر انحصار، جو ان کی دسترس سے باہر ہیں تو وہ ایسی ثروت مند زندگی پر پہنچ سکتے ہیں، جسے عقلیت پسندوں کے منصوبے حاصل نہیں کر سکتے۔ بایں ہمہ یہ خلافِ عقل تحریک بھی عقلی انقلاب کا ایک حصہ ہے۔ مخالفِ عقل کو بھی اپنے خیالات ہم جنسوں تک پہنچانے کے لیے اپنا ذہن استعمال کرنا پڑتا ہے۔ وہ گریز، الفاظ اور فکر کی عقلیت سے وابستہ ہے۔

شستہ عقلیت پسند

سرسری طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عقلیت کے مخالف دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور باہم پیوستہ ہیں۔ ایک کو اعتدال پسند کہنا چاہیے اور دوسرے کو انتہا پسند۔ اعتدال پسند مخالفینِ عقلیت کی کوشش دراصل یہ ہی کہ انسانی عقلیت کے متعلق اٹھارہویں صدی کے جتنے معتقدات ہیں، ان میں سے جو کچھ بھی بچایا جاسکے، بچا لیا جائے۔ یہی روش دورِ حاضر کے ماہرین علم النفس کی ہے۔ فرائڈ اور ولیم جیمز سے تمام علمائے نفسیات کی یہی کوشش رہی ہے۔ یہ لوگ انسانی عقل کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بتاتے چلتے ہیں کہ یہ عقل کن مشکلات میں کام پر مجبور رہی ہے۔ عقل انسانی کے لیے حد بندیاں ہیں؛ مثلاً وجدانات کی پابندیاں ہیں، حیوانیت کی حیاتیاتی تعبیرات کی پابندیاں ہیں، جن پر علمائے ارتقا زور دیتے رہے۔ روایات و مراسم کی عمرانی وراثت کی پابندیاں ہیں، جنھیں مورخین اور ویڈنڈبرگ کے ہم مشرب زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتے رہے۔

جان لاک کے ایک استعارے سے کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اعتدال پسند مخالفینِ عقل انسانی عقل کو ایک جھلملاتی ہوئی شمع قرار دیتے ہیں، یہ نہیں مانتے کہ یہ کوئی بُراق عالمی روشنی ہے، جیسا کہ کنڈروسٹ جیسے فلسفیوں کا عقیدہ تھا، مگر اعتدال پسند مخالفینِ عقل اس شمع کو بجھانا نہیں چاہتے، بلکہ اسے روشن رکھنا چاہتے ہیں اور ان کی

خواہش ہے کہ اس کی روشنی رفتہ رفتہ ترقی کرتی جائے ۔ یہ عملیہ علمائے ارتقا کی رائے کے عین مطابق ہے ۔ جسے اعتدال پسند طویل اور سست رفتار قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس رفتار کو تیز کرنے کے لیے جو بڑے بڑے منصوبے بنائے جاتے ہیں ، وہ اس کے لیے اعانت کا سامان ہونے کے بجائے رکاوٹ بن جائیں گے ۔ گویا ان اعتدال پسندوں کو عقل کے مخالف نہیں سمجھنا چاہیے ، بلکہ ایسے لوگ ہیں ، جن کی آنکھیں حقائق کے متعلق کھل گئیں اور جنھیں ہم شستہ عقلیت پسند کہہ سکتے ہیں ۔

اس شستہ عقلیت پسندی کی ایک واضح مثال ہمیں گریہم ویلس[1] (۱۸۵۸ء سے ۱۹۳۲ء) سے ملتی ہے ، جو سیاسی و عمرانی مسائل پر لکھنے والا ایک انگریز تھا ۔ مثال نہایت اچھی ہے ، کیونکہ ویلس برطانوی لیبر پارٹی کا ممبر تھا ، یعنی ان تمام امیدوں میں حصہ دار تھا ، جو اٹھارھویں صدی کے جمہوریت پروروں نے تمام انسانوں کے دلوں میں پیدا کر دی تھیں ۔ اس نے ۱۹۰۸ء میں ایک کتاب بہ عنوان " انسانی فطرت سیاسیات میں[2] " لکھی ۔ اس کتاب میں اس نے لندن کاؤنٹی کونسل کے لیے امیدواری کے سلسلے میں عملی سیاسیات کے ذاتی تجربے پیش کیے تھے ۔ اسے اس عقیدے میں پرورش ملی تھی ، جو اٹھارھویں صدی کی میراث کی ایک خصوصیت تھا ، یعنی اگر انسانوں کو سیاسی معاملات کے متعلق مناسب طریق پر تعلیم دی جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ عقلی تقاضے کیا ہیں اور وہ ان امیدواروں اور قوانین کے حق میں رائے دیں گے ، جن میں اُن کا ذاتی فائدہ ہے ۔ یہی طرزِ عمل مشترک فائدے کے مطابق ہوگا ، لیکن اپنے ووٹوں کے لیے سرگرمی سے کام کرتے وقت ویلس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انسان بہت سے غیر عقلی الفاظ و اعمال سے متاثر ہوتے ہیں اور انسانی عقل پر اعتماد رکھنے والوں کو اس صورتِ حال کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا ۔ غرض اسے معلوم ہوا کہ امیدوار کو ووٹ لینے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ بچوں کو بوسے دے ، ماؤں کی خوشامد کرے اور اُن معاملات پر بہ خوشی بات چیت کرتا جائے ، جنھیں لندن کے انتظامی معاملات سے کوئی بھی تعلق نہ ہو ۔

یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

> " فلسفۂ اجتماع پر بحث کرنے والوں نے برابر ہماری خاطر نشاں کیا ہے کہ اگر معقول کی جگہ غیر معقول رکھ دیا ہے تو اس سے ہیجان اور تعداد پر کتنا اثر پڑے گا ۔ ہر وہ سبب ، جو ایک انسان کو پوری توجہ دینے سے روکتا ہے ، حد درجہ غیر عقلی نتیجے کی فضا پیدا کر سکتا ہے ۔ میں چھوٹی چھوٹی سب کمیٹیوں کے جلسوں میں شریک رہا ہوں اور اس طریقے پر غور کرتا رہا ہوں ، جس سے کام ہے کر کمیٹی کا صحیح ذوق رکھنے والے دو آدمیوں میں سے کوئی ایک اپنے رفیقوں پر کس طرح ضبط و نظم قائم رکھ سکتا ہے ۔ یہ عمل اکثر سہ پہر کے آخری حصے میں زیادہ کامیاب ہوتا تھا ، جب ممبر تھک جاتے تھے اور جب تیزی کے ساتھ بولنے والے

---

[1] Graham Wallus

[2] Human Nature in Politics

> کسی شخص سے غیر متعارف تفصیلات سن کران ممبروں پر تحیر کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اگر ایسے موقع پر کوئی عامل اپنی معلومات کے بہاؤ کو ذرا تیز کر دیتا اور اسی مفروضے پر زور دیتا کہ امید ہے، اس کی ہر بات سمجھی جا رہی ہوگی تو یقیناً وہ اپنے بعض رفیقوں پر ایسی حالت طاری کر دے گا جیسی مشی فی النوم میں طاری ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بات بہ آسانی منوا لے گا اور ایسی بات بھی کہ نجی درسگاہوں کی بڑی تعداد کا مستقل قیام پبلک سکولوں کی تعداد فی الفور بڑھا دے گا۔"[1]

ویلس کی کتاب بیسویں صدی کے وسط میں امریکی سیاستدانوں یا اشتہار بازوں یا پولیٹیکل سائنس کے پروفیسروں کو کوئی نئی چیز نہیں سکھا سکتی، لیکن نصف صدی پیشتر یہ اچھے برطانوی انتہا پسندوں کے لیے ایک انقلابی کتاب تھی، جو افادیت پسندوں اور فیبیائی اشتراکیوں کے اعلیٰ عقلیت پسندانہ افکار میں تربیت پا چکے تھے۔ ویلس اپنی کتاب کے خیر مقدم سے گھبرا گیا اور اسے خیال پیدا ہوا کہ غالباً اس کتاب میں قدامت پسندانہ وضع مخالفینِ عقل کی زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عقل کی شمع گل کر دے، لہٰذا اس نے ایک اور کتاب لکھی، جس کا نام تھا "بڑا معاشرہ"[2] (۱۹۱۴ء)۔ اس کتاب میں اس نے فکر کی طرف سے مدافعت کی :-

> "ہمارے پورے تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسے جیسے عمرانی تنظیم کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، محض خوف یا محبت یا شادمانی یا عادت کی وجدانی رہنمائی زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ بنتی جاتی ہے۔ اس سے محض یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ انسان میں اپنے اعمال کا زیادہ سے زیادہ شعور پیدا ہوتا جاتا ہے اور نتائج قبل از وقت بھانپ لینے کی عادت زیادہ پختہ ہوتی جاتی ہے، بلکہ فکر کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے اور انسان چاہتا ہے کہ عادی مفکر کی طرح اپنی توجہ ایک مسئلے پر طویل مدت تک مرتکز کیے رکھے اور انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے مبرا علم حاصل کر سکے۔"[3]

انتہا پسند مخالفینِ عقل

اس گروہ کے برعکس مخالفینِ عقل کا دوسرا گروہ یہ چاہتا ہے کہ انسانی عقل کی شمع گل کر دے۔ ان لوگوں کے نزدیک عقل محض کمزور ہی نہیں، بلکہ بری ہے۔ ان کے نزدیک ارتقاء کے حامیوں نے سخت غلطی کی اور ایک غیر مناسب موڑ پر مڑ گئے، جہاں سے ان کا پیچھے لوٹنا لازم ہے، تاکہ وجدان، جذبے اور ایمان کی زیادہ محکم زندگی پر پہنچ جائیں۔ انگریز ناول نویس ٹامس ہارڈی نے اصل موقف خوب واضح کیا، جب کہا کہ فکر جسمانی بیماری ہے۔ نازیوں کی

---

[1] ویلس کی کتاب "انسانی فطرت سیاسیات میں" ص ۱۱۰

[2] The Great Society

[3] ویلس کی کتاب "بڑا معاشرہ" ص ۱۸۲

تحریک بھی عقلیت کی انتہاپسندانہ مخالفت کا ایک زیادہ نشہ آور جرعہ تھی۔ خود ہٹلر عقل کو انحطاط پذیر فرانس کی ایجاد قرار دے کر اس سے دور بھاگتا تھا۔ اسے امید تھی کہ نیک نہاد جرمن اپنے خون، اپنی قدیم قومی میراث کی بنا پر غور و فکر کریں گے۔ دورِ حاضر کے فن کی بعض بے سروپا تحریکات کی تہہ میں بھی یہی عقلیت کی مخالفت کا انتہائی جذبہ کارفرما تھا۔ اسی لیے وہ لوگ چاہتے تھے کہ تمام قاعدوں سے آزاد ہو جائیں۔ نہ فن کی کوئی گرفت رہے، نہ ہم آہنگی، نہ منظر۔ موسیقی دل سے لکھی اور مرتب کی جائے۔ تصویریں دل سے پرزے پرزے کی جائیں اور بے معنی شکلوں کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔

ان انتہاپسندوں کی رگیں رومانی تحریک میں پہنچی ہوئی ہیں، جس میں دماغ کے بجائے دل پر زور دیا گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ باسی منطق کے بجائے تازہ وجدان پر زور دیتے ہیں۔ ایک تتلی کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ستاروں کی دعوت کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ مخالفین عقلیت گوئٹے کے وارث ہیں، جس نے لکھا:۔

"تمام نظریات پر خزاں طاری ہے صرف زندگی کا شجر زریں ہرا بھرا ہے۔"

وہ ورڈز ورتھ سے پیدا ہوئے، جس نے لکھا:۔

"موسم بہار کے جنگل سے ایک تاثر تمہیں انسان کے متعلق زیادہ سکھا سکتا ہے۔
اخلاقی بدی اور خوبی کے متعلق تعلیم دے سکتا ہے۔ دنیا بھر کے خردمند یہ کام انجام نہیں دے سکے۔
.... علم و ہنر قطعاً درکار نہیں۔
ان بنجر دفتروں کو بند کر دو
باہر نکلو، ایسا دل اپنے ہمراہ لے لو
جو چیزوں پر نظر رکھتا ہے اور ان سے تاثرات قبول کرتا ہے۔"

بیالیسواں باب

نفسیات

تمہید

افکار حاضر کے مؤرخ کے نزدیک زیادہ سہولت اس میں ہے کہ خاص دور کے اندر زندگی کے متعلق روش کے مختلف مظاہر کو ایک طبعی سائنس کے تابع لے آتا ہے، جسے وقت پر ہمہ گیر وقار حاصل تھا۔ یہی سائنس ہر دلعزیز ہو کر ایوان ہائے ملاقات، لیکچروں کے پلیٹ فارموں، اخباروں اور درسگاہوں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی کیفیت اٹھارہویں صدی میں نیوٹن کی تھی۔ انسان کائنات پر نیوٹن کی وسیع عالمی مشین کے انداز میں نظر ڈالتے تھے۔ یہی کیفیت انیسویں صدی میں ڈارون سے پیشتر اور چند عشرے "اصل انواع" کی اشاعت (۱۸۵۶ء) کے بعد تاریخ طبعی یا حیاتیات کو حاصل رہی۔ اب انسان کائنات پر نظر ڈالتے تھے تو اس حیثیت میں نہیں کہ یہ کوئی مشین ہے، جو خود بخود ایک ایسے دائرے میں چل رہی ہے، جو وقت و زمان سے بالا بالا ہے اور انسانوں کے لیے لازم ہے کہ اس سے توافق کریں، بلکہ وہ اسے ایک وسیع جسم سمجھتے تھے، جس کے بے شمار اعضا تھے۔ تمام اعضا بڑھ رہے تھے۔ تمام ایسے انداز میں ارتقا پا رہے تھے، جس کی کوئی تعین نہیں ہوئی تھی۔ پھر انیسویں صدی کے آخر میں ایک اور سائنس نے خاص وقار حاصل کیا۔ یہ ایسا سائنس ہے جسے اکثر سائنسدان اب تک سائنس ماننے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ اسے اب تک ریاضیاتی انداز میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نفسیات کا سائنس ہے، جس میں ہماری معاصرانہ مخالفت عقل بالکل ٹھیک سماتی ہے۔

افکار عمومی میں علوم کی اس خونریز کا سلسلہ کسی دور کی گفتگو یا صحیفہ نگاری کی اصطلاحات میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے خطوط، اخبار اور ناولوں میں نیوٹن، عالمی قوائے جاذبہ و دافعہ عالمی مشین کی طرف مسلسل اشارے ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں فرانسیسی فلسفی فوریا نے ایک سیاسی و عمرانی کشش قائم کر دی اور دعویٰ کیا کہ میں عمرانی سائنس کا نیوٹن ہوں۔ اسی طرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ جن لوگوں نے انیسویں صدی کے آخر میں عمرانیات کے اندر ڈارون کے اصول کی پیروی کی، وہ برابر جہد للبقا اور بقائے اصلح کی اصطلاحات سے کام لیتے رہتے تھے اور یقیناً بیسویں صدی میں بہت سے الفاظ و مصطلحات زبانوں پر رائج ہیں، جو علمائے نفسیات کی کارگاہ یا ماہرین تجزیۂ نفس کے صوفے سے حاصل

کیے گئے، مثلاً عملِ اضطراری، سربلندی روح، احساس کمتری گرہ اوڈیپس[1] اور دوسری بہت سی اصطلاحات، جو عام بول چال میں استعمال ہو رہی ہیں۔ لہٰذا مخالف عقل کی معتدل اور انتہائی دونوں شکلوں کے متعلق تفصیلی بیان کا آغاز علم النفس سے ہوتا ہے، جس کے لیے یہ دونوں شکلیں ممنون ہیں۔

پاولوف

روسی عالم نفسیات پاولوف[2] کا بنیادی کارنامہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے افتتاح پر انجام پایا۔ اسی سے ہمیں مشروط عمل اضطراری کی متعارف اصطلاح ملی۔ پاولوف کے کتے بھی اتنے مشہور ہیں، جتنے کسی کارگاہ کے جانوروں کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس نے مختلف اشاروں پر کتوں کو لگایا، مثلاً گھنٹی بجا کر انھیں کھلاتا پلاتا رہا۔ جب وہ خوب عادی ہو گئے تو گھنٹی بجتے ہی اس کے کتوں کے منہ میں پانی بھر آتا، کیونکہ اس وقت انھیں غذا کی امید ہوتی تھی۔ طبعی — یعنی جس میں تربیت کو کوئی دخل نہ ہو — طور پر کتوں کے منہ میں پانی اس وقت آئے گا، جب خوراک ان کے سامنے رکھ دی جائے۔ پاولوف نے اس سلسلے میں ایک اور تجربہ کیا۔ مثلاً وہ گھنٹی بجاتا اور کوئی ایسی چیز کتوں کے سامنے رکھ دیتا، جو خوشبو یا مالیت کے اعتبار سے غذا جیسی نہ ہوتی، پھر بھی ان کے منہ میں پانی بھر آتا۔ اس طرح واضح شہادت مل گئی کہ خاص حالات یا خاص تربیت سے ان جانوروں کو خود بخود انھیں حرکات پر آمادہ کر دیتے ہیں، جو طبعاً جانوروں میں ایسے حالات پر پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مشروط اضطراری اعمال مثلاً کسی خاص اشارے پر منہ میں پانی بھر آنا بالکل طبعی اضطراری اعمال تھے۔ جیسے جانور کے سامنے گوشت رکھ دیا جائے تو اس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

پاولوف کے تجربات نے عمرانی سائنس داں کے لیے اہم نتیجے پیدا کر دیئے۔ اس سے اٹھارہویں صدی کے تصورات کی توثیق ہو گئی۔ مثلاً ماحول تربیت اور تعلیم کی قوت۔ مطلب یہ کہ ماحول میں رد و بدل سے خاص جسموں میں نئے محرکات پیدا کیے جا سکتے ہیں — مگر — اور یہ اٹھارہویں صدی کی رجائیت کے لیے ایک شدید ضرب تھی — ایک مرتبہ ایسی تربیت دے دی جائے تو نتائج جسم میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں، گویا یہ ماحول سے پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ وراثت میں ملے تھے اور ان میں مزید تغیر بہت مشکل، بلکہ بعض حالتوں میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ پاولوف نے اپنے بعض کتوں کو یہ تربیت دے چکنے کے بعد اشاروں میں خلط ملط کی کوشش کی، مثلاً جس اشارے پر انھیں ہمیشہ غذا ملتی تھی، وہ کر دیا جاتا، مگر غذا نہ دی جاتی۔ اس طرح کتوں پر حیرانی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہوتی۔ اس طرح وہ ایسی علامتیں پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا، جیسی انسانوں کو عصبی امراض میں لاحق ہو جاتی ہیں۔

---

[1] Oedipus Complex یونانی افسانے کے مطابق یہ شاہ تھیبز کا بیٹا تھا، مگر شاہ کو بتایا گیا تھا کہ بیٹا اس کی جان لے گا، لہٰذا اسے باہر پھینک دیا گیا۔ وہ جوان ہوا اور بے خبری میں باپ کو مار کر ماں سے شادی کر لی۔ جب حقیقت اس پر واضح ہوئی تو اس نے اپنی آنکھیں نکال لیں اور اندھا ہو کر سرگرداں پھرتا رہا۔ لغت میں اس سے مقصود وہ نفسی کیفیت ہے، جس کے مطابق لڑکی کو باپ کی طرف اور لڑکے کو ماں کی طرف جنسی میلان ہوتا ہے۔

[2] Pavlov

محتاط عمرانی سائنسدان پادلوف کے مشروط اضطراری اعمال کو سوچے سمجھے بغیر انسانی روش پر استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ یہ فرض نہیں کرتا کہ مثلاً ورمانٹ[1] کا کوئی شخص ری پبلکن امیدوار کو ووٹ دیتے وقت اسی طرح عمل کرتا ہے، جس طرح مختاد گھنٹی بجنے پر کتے کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ ورمانٹ میں کسی ری پبلکن کو ووٹ دینا بھی ہر اعتبار سے مشروط اضطراری عمل نہیں، مگر محتاط سائنسدان ایسے تصورات پر قائم رہے گا کہ مشروط اضطراری اعمال سے انسانوں کے معتاد اعمال پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ جو لوگ عقل کے دشمن ہیں، ان کے لیے پادلوف کے تجربات اس حقیقت کا مزید مظاہرہ ہیں کہ ہماری روش کا بیشتر حصہ دراصل معین نہیں یا یہ کہہ لیجیے کہ وہ زیادہ تر ان حرکتوں کے تابع ہے، جن کا مرکز دماغ ہے۔

فرائڈ

عقل کی مخالفت کو ایک اور بڑے عالم نفسیات سگمنڈ فرائڈ[2] (۱۸۷۳ء — ۱۹۳۹ء) سے تقویت پہنچی۔ فرائڈ طبیب تھا جس نے انیسویں صدی کے آخری دور کی طبی روایت کے مطابق ویٓانا میں تربیت پائی۔ ابتدا ہی سے دماغی و ذہنی بیماریاں اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن گئیں اور اس سلسلے میں اسے بعض ایسے بیمار ملے، جن میں حقیقی بدنی اختلال کی علامتیں موجود تھیں، لیکن ان کے لیے کوئی بدیہی بدنی سبب نہیں مل سکتا تھا۔ وہ پیرس میں کچھ مدت تک ایک فرانسیسی طبیب چارکو[3] کے ماتحت کام سیکھتا رہا، جو ایسے مریضوں کا علاج ہپنوٹزم کے ذریعے سے کرتا تھا۔ فرائڈ بھی کچھ مدت تک اسی طریقے سے کام لیتا رہا، مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنا طریقہ اختیار کر لیا، جسے تجزیۂ نفسی کہا جاتا ہے۔ اس تجزیے میں بیمار کو ایک سوفے پر لٹا دیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ طفلی کے ابتدائی دور، بلکہ اس سے بھی پیشتر کے متعلق جو کچھ اسے یاد آتا ہے، بیان کرتا جائے۔ ایسے متعدد تجربوں کے بعد تجزیہ کرنے والے کو امید ہو سکتی ہے کہ اصل بیماری کا سراغ پا لے۔

اگر فرائڈ اسی طریق معالجہ پر اکتفا کر لیتا تو ہم میں سے صرف چند آدمیوں تک اس کا نام پہنچ سکتا، مگر اس نے اکتفا کرنے کے بجائے اپنے تجربات سے نفسیات کا ایک نظام تیار کر لیا، جس سے صرف دماغی طب اور علم النفس ہی پر گہرا اثر نہ پڑا، بلکہ انسانی روابط کے متعلق ہمارے بعض بنیادی تصورات بھی اس سے متاثر ہوئے۔ فرائڈ محرکات و میلانات کے ایک مجموعے سے ابتدا کرتا ہے، جن کے ساتھ ہر انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ محرکات و میلانات جن کا نام پہلے اس نے "لبیڈو"[4] پھر "اِڈ"[5] رکھا، اپنی تسکین چاہتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عمل میں رونما ہو جائیں۔ بچے میں یہ محرکات کشمکش کا باعث نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اس کے اعمال میں باشعور قلب کی طرف سے کسی پابندی کے بغیر نمایاں ہوتے رہتے ہیں، البتہ اس کے والدین یا انا کی طرف

---

[1] Vermont امریکہ کی ایک ریاست
[2] Sigmund Freud
[3] Charcot
[4] Libido
[5] Id

سے رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور یہیں سے معصیت کا آغاز ہوتا ہے۔ ان رکاوٹوں کے باعث بچے میں مایوسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ بالیدگی پاتا ہے اور اس کے قلب و ذہن خاص شکل اختیار کرتے ہیں تو اس میں یہ شعور موجود ہوتا ہے کہ جن بعض چیزوں کے کرنے کا وہ خواہاں ہے، انھیں آس پاس کے لوگ جن پر اس کا انحصار ہے، قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان میلانات کو دبانے لگتا ہے۔

بیرونی دنیا کے متعلق شعور پیدا ہونے کے ساتھ ہی بچہ نفس کے ایک اور حصے کو تربیت دے لیتا ہے۔ جسے فرائڈ نے پہلے "محتسب" کا نام دیا، مگر آگے چل کر اسے دو مرحلوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو "انا"[۲] اور دوسرے کو "برتر انا"[۳] قرار دیا۔ "انا" فرد کا نجی محتسب[۱] ہے، یعنی اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ بعض محرکات و میلانات، جنھیں فرائڈ اصولِ حقیقت قرار دیتا ہے، کامیاب نہیں ہو سکے۔ "برتر انا" ویسی ہی شے ہے، جسے عام بول چال میں ضمیر کہتے ہیں، یعنی فرد کا یہ شعور کہ وہ ایک عمرانی نظام کا جز ہے، جس میں بعض اعمال شائستہ اور بعض ناشائستہ ہیں۔

اب ان میلانات و محرکات ــــ اور اعمال انا کے بعض مراحل ــــ فرائڈ کے نزدیک ایک بہت بڑا سرچشمہ ہیں، جس سے فرد عام حالات میں آگاہ نہیں ہوتا، یعنی یہ اس کے لاشعور کا حصّہ ہیں (پاولوف کے مشروط اضطراری اعمال بھی لاشعور ہی کا حصّہ ہیں)۔ جو فرد ذہنی اعتبار سے تندرست ہے، اس کے زیادہ سے زیادہ میلانات کامیاب ہوئے، اس وجہ سے وہ مطمئن ہو گیا، تاہم تندرست سے تندرست انسان کو بھی اپنے میلانات و محرکات کا خاصا بڑا حصہ دبانا پڑتا ہے۔ یہی کامیاب دباؤ ہے، جسے فرائڈ کے پیرو روحانی برتری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، یعنی ان کا خیال یہ ہے کہ تندرست افراد ان میلانات کے لیے جنھیں "انا" اور "برتر انا" یا دونوں کے مشترکہ عمل نے دبا دیا۔ انھیں کوئی نیا اور عمرانی اعتبار سے مصدقہ مخرج یا مظہر مل گیا۔ مثلاً اگر کسی شخص کے جنسی روابط اس کے دائرے میں مُہرِ تصدیق حاصل نہ کر سکے تو اس نے شعر لکھ کر یا موسیقی مدون کر کے ان کی تسکین کا سامان بہم پہنچا لیا یا وہ مذہبی عبادات میں مصروف ہو گیا یا ورزش شروع کر دی۔

جو لوگ ذہنی اعتبار سے بیمار ہیں، ان کے متعلق فرائڈ کی رائے یہ ہے کہ ان کے میلانات و محرکات دبائے گئے اور انھیں لاشعور میں دھکیل دیا گیا۔ ان کے لیے کوئی موزوں مخرج نہ مل سکا یا روحانی برتری کے ذریعے سے انھوں نے کوئی اور شکل اختیار نہ کی۔ چنانچہ وہ بدستور زحمت کا باعث بنے رہتے ہیں، تاکہ انھیں کوئی مخرج مل جائے۔ وہ میلانات ہر قسم کے غیر طبعی مخارج کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہی بیماری کی گوناگوں علامتیں بن جاتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی عصبی بیماریوں اور وحشتوں کی شکل میں ظہور کرتے ہیں۔ ان میں صرف ایک چیز مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو بروئے کار لانے میں ناکام رہے۔ عصبی

---

۱ Censor　　۲ Ego

۳ Super Ego

مریض وہی ہوتا ہے، جس کے محرّکات و میلان کی تسکین نہ ہوئی ہو۔ جب تسکینِ محرّکات کی ناکامی مکمل ہو جاتی ہے تو فرد دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے، چنانچہ اس کی باقی زندگی ایک کاملاً بے حقیقت نجی دنیا میں بسر ہوتی ہے۔

فرائڈ خصوصاً ابتدائی دور میں یہ رائے رکھتا تھا کہ محرّکات و میلانات تماماً یا قریب قریب تماماً فطری اعتبار سے جنسی ہوتے ہیں۔ اس نے چھوٹے بچوں میں بھی جنسی محرکات پائے اور اس انکشاف سے اس کے معاصرین بہت ناراض ہوئے۔ پھر ایک قدم آگے بڑھا کر اس نے ان میلانات و محرکات کے لیے ایک نقشۂ اوقات تیار کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جنسی محرکات سب سے پہلے اشتہائے شفوی کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں، جو ماں کی چھاتیاں چوسنے سے متعلق ہے۔ پھر یہ اشتہائے مقعدی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جب بچہ چھ سال سے بارہ سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے تو فرائڈ کے نزدیک یہ اشتہا اکثر افراد میں سکون پا جاتی ہے۔ جب بلوغ کا دور آتا ہے تو پھر یہ اشتہا طبعاً جنسی اشتہا بنتی ہے۔ مزید براں بچہ اس نشو و ارتقاء کے دوران میں بعض مراحل پر والدین میں سے اپنی ضد کی طرف جنسی کشش محسوس کرتا ہے، یعنی بیٹا ماں کے لیے، جیسا کہ گرہ روڈیپس میں بیان کیا گیا ہے اور بیٹی باپ کے لیے، جسے گرہ[1] "الیکٹرا" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مغربی معاشرہ جنسیت کے ان ابتدائی مظاہر کو ترچھی نظروں سے دیکھتا ہے۔ مثلاً مائیں فرائڈ کے عہد میں بچوں کو انگوٹھا چوسنے کے عمل سے بار بار روکتی تھیں، کیونکہ فرائڈ کی اصطلاح میں یہ عمل بدیہی طور پر اشتہائے شفوی کی ایک بے ضرر شکل تھی۔ بچوں کی جنسیت کی دوسری شکلیں زیادہ سختی سے دبائی جاتی ہیں۔ اس طرح بچے اور بعد میں اطفال اپنی جنسیت کو دبانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عصبی مریضوں میں فرائڈ کے نزدیک مشکلات کا سب سے بڑا سرچشمہ یہی جنسی محرکات کا دبانا ہے۔ جب وہ جوان ہوتا ہے تو جنسی تعلقات کی طبعی صورت سے استفادہ اسے مشکل نظر آتا ہے، چنانچہ وہ شفوی یا مقعدی اشتہا کے ابتدائی مراحل کی طرف لوٹ جاتا ہے یا جلق اور ہمجنسوں کے ساتھ روابط میں پناہ لیتا ہے۔ چونکہ جنسیت کے یہ تمام بے قاعدہ مظاہر ہمارے معاشرے میں سخت مذموم قرار دیئے جاتے ہیں تو جو افراد لاشعوری کے عالم میں اس طرف کھچے چلے جاتے ہیں، یا تو انھیں دباتے ہیں یا ان کے مرتکب ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو سخت مجرم سمجھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کے اعصاب پر نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔

فرائڈ کے معالجات کا انحصار اس عقیدے پر تھا کہ اگر کوئی عصبی مریض سمجھ لے کہ کیوں اس نے خاص وقت میں وہ کام کیا، جو اس سے ہو گیا تو وہ اپنے لیے مناسب تطابق کا انتظام کرے گا اور طبعی زندگی پر پہنچ جائے گا۔ یہاں فرائڈ نے اٹھارہویں صدی

---

[1] Electra Complex یونانی اساطیر میں اگامیمنون کی بیٹی۔ باپ کو اس کی بیوی یعنی الیکٹرا کی سوتیلی ماں نے قتل کر دیا تھا۔ الیکٹرا نے اس قتل کا بدلہ لینے کے لیے بھائی کو امداد دی۔ مشہور یونانی ڈرامانگاروں نے ان واقعات پر تین اہم المیہ ڈرامے لکھے ہیں۔

کی روایت عقل سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ فرد کو سمجھانے یا اس کے سامنے دلیلیں پیش کرنے یا اس کی غلط روش جتانے اور نامعقول قرار دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ عقل براہ راست لاشعور تک نہیں پہنچ سکتی اور لاشعور ہی اصل میں مصیبت کا سرچشمہ ہے۔ تجزیۂ نفسی کے طویل اور سست رفتار عمل ہی سے فرد روز بروز مثبت تفصیلات کے لیے دورِ طفلی کی یادداشتیں تازہ کر سکتا ہے۔ اگر تجزیہ کرنے والا سن کر شعور کے اس بہاؤ میں سے وہ خاص تفصیلات چن لے، جو خفیہ دباؤ کی طرف رہنمائی کر سکیں اور اس رکاوٹ تک پہنچ سکے، جو عصبی بیماری کا باعث بنی تو علاج کی یہی ایک صورت ہے۔ فرائڈ نے بیمار کے خوابوں کو خاص اہمیت دی۔ وہ کہتا تھا کہ خواب پوری تفصیل سے تجزیہ کرنے والے کو سنانے چاہئیں، کیونکہ اس کے نزدیک خوابوں میں لاشعور یا تو انا کے ضبط سے بالکل باہر نکل جاتا ہے یا اس پر جزوی ضبط قائم رہتا ہے۔ جب بیمار اپنی شعوری زندگی کی سطح سے نیچے پہنچ جائے گا اور اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت تک کی لاشعوری زندگی میں کیا خرابی پیدا ہوئی تو وہ اپنا علاج خود کر لے گا۔

فرائڈیت کے مضمرات

فرائڈ کے کام کے وسیع مضمرات اور مخالفتِ عقلی کے دھارے میں اس کے حصے کے متعلق ہمارے نزدیک اہم امر اوّلاً یہ تصوّر ہے کہ لاشعوری محرّکات و میلانات یعنی بے خیال و بے عقل چیزیں ہماری زندگی میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ عام غور و فکر پیروانِ فرائڈ کے نزدیک ہماری بقا کا ایک نہایت چھوٹا حصہ ہے۔ اب ہم پھر اس پرانے استعارے پر پہنچ گئے ہیں کہ عقل ایک جھلملاتی ہوئی شمع ہے یا ایک اور فرسودہ استعارہ لے لیجیے، یعنی عقل اس تودۂ برف کا ایک مختصر حصہ ہے، جو پانی کے اوپر ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ، جو پانی میں ڈوبا ہوا ہے، وہ لاشعور ہے۔ ہمارے شعوری غور و فکر کا بھی بیشتر حصہ وہ ہے، جسے علمائے نفسیات عقلی تنظیم قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ غور و فکر، جو شعور کی بنا پر شروع نہ ہوا ہو بلکہ ہماری لاشعوری خواہشات کی بنا پر شروع ہوا ہو۔ اگر ہم بچے کی طبعی نیکی اور معصومیت کے متعلق پرانے عقیدے کا مقابلہ بچے کے متعلق فرائڈ کے نظریے سے کریں — جسے وہ غیر عمرانی یا عمرانیت کے خلاف محرکات کا ایک مجموعہ قرار دیتا ہے یا کہتا ہے کہ یہ ایسا چھوڑا ہوا وحشی ہے، جسے رام نہیں کیا گیا — تو ہم اٹھارھویں صدی کی عقلیت اور فرائڈ کے علم النفس کے درمیان تفاوت سے بڑی حد تک آگاہ ہو جائیں گے۔

دوسرا اور اہم نکتہ یہ ہے — کہ فرائڈ کے پیرو بھی انسانی عقل کی شمع بجھانا نہیں چاہتے۔ وہ عقل کے مخالف ضرور ہیں، مگر انتہا پسند نہیں، اعتدال پسند ہیں، گویا وہ شائستہ عقلیت پسند ہیں۔ ان کا پورا نظامِ معالجہ ایسے تصور پر مبنی ہے، جس کی جڑیں مسیحیت، نیز اٹھارھویں صدی میں پہنچی ہوئی ہیں، یعنی تم حقیقت جان لوگے اور حقیقت تمہیں آزادی دلا دے گی۔ پیروانِ فرائڈ کے نزدیک حقیقت آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ اس کے متعلق روش کے چند سادہ قواعد اخذ نہیں کیے جا سکتے ہیں، جنھیں تمام انسان معقول اور خیر پسند ہونے کی حیثیت میں انفرادی اور اجتماعی راحت کے لیے رہنما بنا سکیں۔ اس حقیقت کا تعین بہت مشکل ہے اور اس پر طویل و شاقہ محنت کے بعد ہی پہنچنا ممکن ہے۔ اکثر اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے اور انھیں ہر قسم کی نامطابقتوں اور دل شکنیوں پر قناعت کرنی پڑے گی۔ فرائڈ کے پیرو دراصل قنوطی ہیں، جنھیں بشریت کے

کمال پہ کوئی اعتقاد نہیں، مگر ساتھ ہی وہ مثالیت پسند ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ زمین پر انسانی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ اگرچہ وہ کامل و بے عیب نہ بن سکے۔

تینتالیسواں باب

سیاسی اور عمرانی افکار

تمہید جن علمائے نفسیات نے فرائڈ کا نظام بہ حیثیت مجموعی مسترد کر دیا، وہ بھی اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کے جوشِ عمل میں وجدان، جذبے، محرک، تقاضے، یعنی کوئی نہ کوئی ایسی شے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جسے ہم خلافِ عقل نہیں تو غیر عقلی کہہ سکتے ہیں۔ یہ عقلیت کی مخالفت متعدد طریقوں پر سیاسی اور عمرانی فکر میں در آئی۔ اس سلسلے میں مخالفینِ عقل کے دو گروہوں، انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں فرق ملحوظ رکھنا حد درجہ ضروری ہے۔

عقل کے بہت سے انتہا پسند مخالف شدّت سے جمہوریت کے خلاف ہو گئے۔ ان کا احساس جمہوریت کے متعلق یہ تھا کہ یہ انسانوں کی حقیقت کے باب میں ایک غلط اور جھوٹے اندازے پر موقوف ہے۔ دوسرے لفظوں میں جمہوریت پسند کا عقیدہ اساسًا یہ ہوتا ہے کہ عام انسان غلط روایات، غلط عادات اور غلط تعصّبات کے بوجھ سے آزاد ہو سکتا ہے۔ یعنی جب اصل حقائق اس کے سامنے آجائیں گے تو وہ اپنے ہم جنسوں سے آزادانہ بحث و تمحیص کے بعد فیصلوں کا ایک سلسلہ مرتّب کر سکے گا، جسے قوانین و ضوابط میں شامل کر لیا جائے گا اور ان کے تحت انسان راحت کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ لیکن اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ انسان فطرتًا حق و انصاف کے اہل نہیں یا غور و بحث میں وہ جذبات سے الگ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ تعلیم کا کوئی نظام روایات، عادات اور تعصّبات کے بارے انسانوں کے ذہن و قلب کو نجات نہیں دلا سکتا، دوسرے لفظوں میں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ انسان فطرۃً غیر عاقل ہے تو یقینًا جمہوریت کے متعلق آپ کو اپنے تصوّرات میں یا تو وسیع پیمانے پر ترمیم کرنی پڑے گی یا انھیں ردّ کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

عقل کے انتہا پسند مخالفین نے جمہوریت کے تصوّرات رد کر دیئے۔ جرمن فلسفی نیٹشے نے زیادہ تر کتابیں انیسویں صدی کے نویں عشرے میں لکھیں۔ اس دور میں اسے ایسے ہی سیاسی مفکّروں کا ایک نمونہ قرار دینا چاہیے۔ نیٹشے عمومًا چھوٹے چھوٹے حکیمانہ جملوں میں لکھنے کا عادی تھا، جنھیں ایک ترتیب میں لانا مشکل ہے۔ اکثر وہ جملے متناقض ہوتے تھے، لیکن اس کے فکر کا مرکزی خط امرائیت کے ایک نئے تصوّر کی طرف مائل تھا یعنی برتر انسان کی طرف، جسے جرمن زبان میں اس نے اوبرمنش (Uebermensch) کہا۔ نیٹشے کے پیرو ۱۹۱۴ء سے پیشتر کے دو عشروں

میں مغرب کے اندر بہت زیادہ تھے۔ انھیں اصرار تھا کہ اس سے نیٹشے کی مراد ایک نئی روحانی امرائیت ہے۔ گویا نیٹشے کے "برتر آدمی" عامیانہ مادّیت اور طبقۂ اوسط کی حُبِ قومیت سے بالاتر ہوں گے۔ وہ لوگ حسن و خوبی کی مجاہدانہ زندگی کے لیے ایثار و فداکاری میں افلاطونیت اور مسیحیت سے بھی بڑھے ہوئے ہوں گے۔ نیٹشے کے مخالفین کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ نیٹشے ناردی برتری کا ایک ادر مبلّغ ہے اور اس کے "برتر آدمی" ـــــ جیساکہ اس نے خود ایک مشہور عبارت میں انھیں سنہرے بالوں والے حیوان قرار دیا ہے ـــــ اکثر یورپ کے لیے خوف و دہشت کا باعث بنے رہے۔ یقیناً اس کے بعض جرمن پیرووں نے اس کی عبارتوں کو عام معنی میں لے لیا اور سمجھا کہ موجودہ جرمن ہی اس کے "برتر آدمی" ہیں۔

بہرحال نیٹشے جمہوریت کا کھلا دشمن تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ اپنے مولود اشتراکیت سے دوسرے درجے پر ہے۔ اس کا مدّعا ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا ہے، جس میں ضعیف و ناتواں وجود غیر منصفانہ اور غیر طبعی حیثیت میں طاقتوروں اور تواناؤں پر حکم چلائیں۔ یہاں اس کے حکیمانہ جملے پیش کیے جاتے ہیں، جن سے قاری خود اندازہ کر سکتا ہے

"جمہوّریت تمام بڑے انسانوں اور بہترین معاشروں پر بے اعتقادی کا نشان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کے مساوی ہے، گویا اصلاً ہم سب ایک گلہ اور بھیڑ ہیں۔"

"میں اشتراکیت کا مخالف ہوں، کیونکہ یہ اپنے خیال کے مطابق معصومانہ طریق پر خیر، سچائی، حسن و جمال اور مساوی حقوق کے خواب دیکھ رہی ہے (انارکی کا مقصد بھی یہی ہے، مگر وہ وحشیانہ طریق پر یہ مقصد پورا کرنا چاہتی ہے۔)

"میں پارلیمانی حکومت اور اخباروں کے اقتدار کا مخالف ہوں، کیونکہ یہی وہ ذریعے ہیں، جن سے کام لے کر مویشی آقا بن جاتے ہیں ...."

- -

"اب اجتماعی حیوانیت کا نمونہ یورپ میں زیادہ سے زیادہ پھیل رہا ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس کے خلاف نمونے کو عملاً مصنوعی طریق پر اور پوری طرح تربیت دی جائے اور اس کے محاسن کو رواج دینے کی کوشش عمل میں آئے؟ اگر کوئی شخص نمودار ہو جائے، جو اس سے فائدہ اٹھا سکے تو کیا جمہوریت کی تحریک کو سب سے اعلیٰ مرتبہ ایک نصب العین، ایک راہ نجات، ایک وجہ جواز نہیں مل جائے گی، یہاں تک کہ ـــــ اس کی نئی اور نہایت اہم پیداوار یعنی غلامی (یورپی جمہوریت کا انجام یہی ہو سکتا ہے) ـــــ سپر جیسی روحِ اعلیٰ حکمرانِ نوع بھی وجود میں آ جائے، جو اس نوع پر قائم و استوار ہو جائے، اسے

> تھامے رکھے اور اس کے ذریعے سے سب کو رفعت دے دے؟ یہ نئی نسل ان چیزوں پر پہنچ جائے گی، جو اب تک ناممکن سمجھی جاتی تھیں۔ اس کا نقطۂ نگاہ بہت وسیع ہوگا اور روئے زمین پر جو کام ضروری ہے، اس کا وہ ذمہ اٹھا لے گی۔[1]

گویا نیٹشے کو امید تھی کہ مویشی کا ریوڑ یعنی غلام اور عوام اپنی بے بنیاد مادیت کے باوجود حقیقی آقاؤں اور نئے روشن خیال مطلق العنانوں کا اعتراف کر لیں گے۔

موسکا اور پاریٹو

اٹلی کے دو مصنف گائیٹانو موسکا[2] (۱۸۵۸ء ـــــ ۱۹۴۱ء) اور ولفریڈو پاریٹو[3] (۱۸۴۸ء ـــ ۱۹۲۳ء) نے سیاسی مفکروں اور اخلاقی معلموں کی حیثیت میں جو کچھ کیا وہ زیادہ تر زمینی اور کمتر آسمانی معلوم ہوتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ ان کے کام پر ہم وطن میکیاولی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ان نئے میکیاولیوں نے اپنی زندگیاں اپنے عہد کی جمہوریت کے حقیقت پسندانہ مطالعے کے لیے وقف کر دیں۔ ان میں مخالفین عقل کا رجحان واضح تھا، اس اعتبار سے کہ وہ مانتے تھے، جمہوریت بحث و تمحیص کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلانے میں عملاً مانع نہیں ہوئی، حالانکہ اٹھارہویں صدی کے فلسفیوں کو یہی امید تھی۔ موسکا کی سب سے بڑی تصنیف کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے، جس کا نام ہے "حکمران طبقہ"[4]۔ اس کا خاص مضمون یہ ہے کہ جمہوریت میں بھی دراصل اکثریت کی حکومت نہیں ہوتی۔ ہمیشہ نسبتاً ایک چھوٹا سا سیاسی طبقہ اصل فیصلے کرتا ہے اور باقی لوگ چپ چاپ ان کے فیصلوں کی تصدیق کر دیتے ہیں، لہٰذا سیاسیات کے سائنٹیفک مطالعے کا موضوع یہ ہونا چاہیے کہ حکمران طبقہ کیونکر بنتا ہے، کیونکر قائم رہتا ہے اور کس طریق پر یہ محکوموں کی ہمنوائی حاصل کرتا ہے؟ موسکا بڑے مزے لے لے کر عملی سیاسیات کے ہتھکنڈوں، ریتوں اور تدبیروں کا ذکر کرتا ہے، جن سے کام لے کر حکمران طبقہ پارلیمانی جمہوریت میں اپنا اقتدار قائم رکھتا ہے۔ اس کو تشویش ہے کہ جمہوریتوں میں کسی نہ کسی نوع کی اجتماعیت کا رجحان بڑھ رہا ہے اور وہ اشتراکیت کی مساوات افروز حالت کی طرف جا رہی ہے، لیکن اس کے پاس کسی نئی منتخب جماعت یا نئی وضع کی حکومت کا کوئی فارمولا نہیں۔

پاریٹو کی تصانیف سے یہ پتا چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری دور میں مخالفین عقلیت کی جو ملی جلی روش جمہوریت کی طرف تھی، اس کی کیفیت کیا تھی۔ وہ بھی دراصل اٹھارہویں صدی کے عقلیت پسندوں کی طرح حد درجہ انفرادیت مآب معاشرے کے خواب میں حصہ دار ہیں، لیکن دوسرے دائرے میں فرائڈ کی طرح وہ بھی عام آدمیوں کی غیر عاقلانہ حیثیت

---

[1] نیٹشے کی کتاب ارادۂ قدرت

[2] Gaetano Mosea

[3] Vilfrede Pareto

[4] The Ruling Class

کے نمایاں ہونے پر پریشان ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ انسان کا رُجحان انفرادیت کے تنوّع اور ثروت مندی کے خلاف ہے۔ پاریٹو کو بعض اعتبارات سے ایک ایسا لبرل قرار دینا چاہیے، جس کی آنکھوں سے پردہ اٹھ چکا ہو۔ اب وہ باہر نکلنے کے لیے کوشاں ہے، مگر کوئی سادہ سا فارمولا قبول کرنے پر راضی نہیں، جس طرح نیٹشے نے "برتر انسان" کا فارمولا قبول کرلیا یا فاشسٹوں کی طرح قیادت کا اصول مان لیا۔ وہ منظم مسیحی معاشرے کے ان تصورات کی طرف بھی نہیں جانا چاہتا تھا جو ازمنۂ وسطیٰ میں رائج تھے۔

پاریٹو نے ایک اجتماعی فلسفی کی حیثیت سے اپنی کتاب "ذہن و معاشرہ"[1] میں زیادہ تر اس معاملے سے سروکار رکھا کہ انسانی اعمال میں سے عقلی اور غیر عقلی الگ الگ ہو جائیں۔ پاریٹو کو ان اعمال سے دلچسپی ہے، جو کسی نہ کسی قسم کی اشاریت، رسمیت اور الفاظ میں بیان کیے گئے ہوں۔ موسم سرما میں اونی جرابیں خریدنا بھی ایک ایسا ہی فعل ہے۔ اگر یہ جرابیں عمداً اس لیے خریدی جائیں کہ اچھی جرابیں خریدار کو اتنی قیمت میں مل جائیں، جتنی وہ ادا کر سکتا ہے تو یہ فعل فاعل کا مفاد پیش نظر رکھتے ہوئے عقلی ہے، لیکن اگر یہ جرابیں قیمت کا لحاظ رکھے بغیر صرف اس لیے خریدی جائیں کہ خریدار انگلستان سے محبت رکھتا ہے اور انگلستان سے آئی ہوئی جرابیں اس لیے خریدتا ہے کہ اپنی بساط کے مطابق انگلستان کی مدد کرے تو یقیناً اس فعل کی حیثیت کچھ اور ہے۔ عالم اقتصاد کو قیمتوں کے اعداد میں ایسی چیزیں نظر انداز کرنی پڑتی ہیں۔ یہ چیز پاریٹو کے مطالعے کا اصل موضوع ہے۔

پاریٹو عمرانی اعمال کے ایک حصے کو اشتقاقات[2] قرار دیتا ہے۔ یہ ان چیزوں سے ملتے جلتے ہیں جنھیں ہم توجیہات کہتے ہیں۔ یہ توجیہات یا ہمارے مذہب سے متعلقہ رسمی اعمال، حُبّ وطن یا ہر قسم کے گروہوں سے متعلق ہمارے احساسات ہیں۔ مثلاً پاریٹو کے نزدیک دعا ایک اشتقاق ہے۔ وہ اپنے عہد کے دوسرے لوگوں کی طرح ایک مادّیت پرست تھا اور اصلاً مسیحیت سے اسے دشمنی تھی، اگرچہ وہ اسے عمرانی اتحاد کے ذریعے کی حیثیت میں اچھا سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بارش کے لیے دعا کرنا ایک غیر عاقلانہ یا خلاف عقل فعل ہے کیونکہ موسم شناسوں نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ بارش مادی اسباب کی بنا پر ہوتی ہے، جو دعا کی دسترس سے باہر ہے۔ یہ اشتقاقات انسانی کی عمرانی زندگی میں ایک عامل کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں، لیکن یہ انسانوں کو کسی عمرانی عمل پر آمادہ نہیں کرتے۔

معاشرے میں جو چیزیں انسانوں کو متحرک اور ایک دوسرے سے وابستہ رکھتی ہیں، پاریٹو نے ان کے لیے "تبقایا"[3] کی اصطلاح تجویز کی، یعنی نسبتاً دائم و استوار جذبات کا اظہار۔ ان اظہارات کو اشتقاقات سے الگ رکھنا چاہیے، کیونکہ اشتقاقات

---

[1] The Mind and Society

[2] Derivations

[3] Residues

ہیں جلد سے جلد بہت وسیع تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ لادین یونانی ملاّح سفر پر روانگی سے پیشتر سمندر کے دیوتا پوسیڈون[1] کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ جب یونانیوں نے مسیحیت اختیار کر لی تو چند سو سال بعد ان کے ملاّح لنگر اٹھانے سے پہلے دعائیں مانگتے تھے، بتّیاں جلاتے تھے اور مریم عذرا کے لیے منتیں مانتے تھے۔ پوسیڈون اور مریم عذرا سے جو کچھ سرزد ہوتا تھا، اس کی توضیح اشتقاقات کہلاتی ہے۔ ان میں اختلاف ہے۔ مریم عذرا کا معتقد یہ سمجھتا ہے کہ اس کا پیشرو لادینی سخت غلطی پر تھا۔ اہم اور مشکل کام شروع کرتے وقت آسمانی امداد کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ چند رسمیں بجا لاتے تھے اور سمجھا جاتا تھا کہ اس طرح آسمانی امداد و راحت حاصل ہو گئی۔ انھیں چیزوں کو ہم "بقایا" کہتے ہیں۔ دونوں طبقوں کے ملاحوں کے لیے "بقایا" تقریباً یکساں تھے۔ لادینیوں اور مسیحیوں کی عمرانی اور نفسیاتی ضرورتیں یکساں تھیں وہ ان کی تسکین کا سامان بھی بڑی حد تک ایک ہی طریق پر بہم پہنچاتے تھے، البتہ جو کچھ وہ کر رہے تھے، ان کی توجیہات بہت مختلف تھیں۔

پاریٹو کے نزدیک "بقایا" کی دو قسمیں ہیں اور انھیں سے اس کے فلسفۂ تاریخ کی ترتیب میں مدد ملی۔ ان میں پہلی قسم وہ ہے، جسے "مجموعہ ہائے مستقل[2]" قرار دینا چاہیے، یعنی ان انسانوں میں نمایاں ہونے والے جذبات، جو محکم ضبط و نظم، باقاعدہ طور طریقوں، روایات و عادات میں مشابہ ہوں، مثلاً اہل سپارٹا۔ دوسری قسم ان "بقایا" کی ہے، جنھیں "جذبۂ ترکیب[3]" قرار دینا چاہیے۔ یعنی ان انسانوں میں نمایاں ہونے والے جذبات جو جدّت اور نچلے پن کو پسند کرنے میں کام کرنے کے نئے ڈھنگ نکالتے ہیں، پرانی اور فرسودہ چیزوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں، جنھیں ضبط و نظم سے نفرت ہوتی ہے اور وہ بہ آسانی ہراساں نہیں ہوتے، مثلاً اہل ایتھنز۔ بہت سے افراد کے معاشروں میں انسان "بقایا" کی کسی نہ کسی قسم سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ برتری حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی سے معاشرے کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ تاریخ کے اکثر فلسفیوں کی طرح پاریٹو پر بھی یہ حقیقت واضح نہ ہوئی کہ کیونکر ایک قدامت پسند معاشرہ دوسرے معاشرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس میں "مجموعہ ہائے مستقل" رکھنے والے "بقایا" کو فوقیت حاصل ہو، تاہم اسے لٹکن کی حرکت کا تصور تھا، یعنی تھیسس اور اینٹی تھیسس کی کشمکش۔

پاریٹو کے نزدیک مغرب میں انیسویں صدی ایک ایسا معاشرہ پیش کر رہی تھی، جس میں "جذبۂ ترکیب" کے "بقایا" سب سے بڑھ کر کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ ان افراد کے درمیان مقابلے کی صدی تھی، جو نئے افکار، ایجادات اور منچلے پن سے لبریز تھے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ پرانے طریقے بُرے ہیں اور ہر قربانی پر جدّت کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ ایسا معاشرہ تھا، جو توازن کھو چکا تھا۔ ناگزیر تھا کہ یہ دوسری قسم کے "بقایا" کی طرف متوجہ ہوتا یعنی "مجموعہ ہائے مستقل" کی طرف۔ دوسرے لفظوں

---

[1] Poseidon

[2] Persistent Aggregates

[3] Instinct of Comlunotion

میں ایسا معاشرہ بنتا جس میں مقابلہ کم ہوتا اور تحفظ زیادہ۔ آزادی کے مقابلے میں ضبط و نظم کو ترجیح ہوتی اور تنوع کے بجائے یکسانی کو زیادہ اہمیت دی جاتی۔ اس کے لیے اس راستے پر چلنا لازم تھا جس میں ہر ہر بیسویں صدی میں چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

پاریٹو کا آخری عام تصور معاشرے میں توازن کا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ توازن کم از کم مغربی معاشرے میں مسلسل اختلال پذیر ہوتا رہتا ہے، مگر ایک طبعی اصلاحی قوت کے بل پر ساتھ ہی قائم ہو جاتا ہے۔ کوئی عمرانی طبیب یا منصوبہ بند اسے زائل نہیں کر سکتا۔ پاریٹو کے نزدیک یہ امکان کاملاً خارج از بحث نہیں کہ انسان کہیں کہیں عمرانی انتظامات کو ایسے طریق پر تبدیل کر لیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں۔ وہی حقیقت بن جائے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ زور اسی بات پر دیتا ہے کہ انسانی روش میں بہ حیثیت مجموعی تغیر کو انسانی افکار و مقاصد کے تغیر سے الگ رکھنا چاہیے۔ انسان جو کچھ ہے، ہے اور ہماری مغربی ثقافت میں "جذبۂ ترکیب" کے پھیلاؤ کے باعث انسانی مفاد کے متعدد دائروں میں لازماً تغیر ہوگا۔ فیشن اور تمام تجارتی متعلقات صرف تغیر کی خاطر متغیر ہو گئے، لیکن پاریٹو کے نزدیک انسانی روش کی بعض سطحیں ایسی ہیں جن میں تغیر کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے، اتنی دھیمی کہ اسے ارضیات و ارتقا کے تغیر جیسی قرار دے لینا چاہیے۔

انسانی روش کی یہی سطح، جہاں تغیر کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے، اصلاً "بقایا" کی سطح ہے۔ پاریٹو کے نزدیک ہنرمند سیاسی لیڈر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ "اشتقاقات" کے ہیر پھیر سے وہ بعض "بقایا" کو اضافی حیثیت میں غیر متحرک اور بعض کو زیادہ سے زیادہ متحرک بنا دے۔ وہ نہ نئے "بقایا" پیدا کر سکتا ہے، نہ پرانے بقایا کو ہمیشہ کے لیے تباہی کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ مثلاً وہ گوشت کے سرکاری معائنے کا مؤثر انتظام کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے لوگوں سے محض شہری ذمہ داری کے احساس کے لیے اپیل نہیں کرنی پڑے گی۔ اٹھارھویں صدی کی وضع کی محض عقلی دلیلوں پر انحصار نہیں کرنا ہوگا، بلکہ وہ پروپیگنڈے سے بھی کام لے گا۔ ردی کتابیں لکھوائے گا، جیسے امریکی مصنف اپٹن سنکلیئر[1] نے اپنا ناول "جنگل"[2] میں گودیوں کی بدحالیوں کا انکشاف کیا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہ خوف محسوس کریں گے کہ اگر انھوں نے گوشت پر حکومت کی نگرانی منظور نہ کی تو انھیں غلیظ گوشت ملے گا اور وہ مسموم غذا کا شکار ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ آج کل اشتہار بازی کرتے ہیں، وہ پاریٹو کے پیرو ہیں، اگرچہ انھیں علم نہیں۔

پاریٹو کے نزدیک دانشمند لیڈر بیکن کے مشہور مقولے — فطرت کو اپنے زیرِ حکم نہیں لایا جا سکتا، جب تک خود اس کے زیرِ حکم نہ ہو جائیں — کو یوں پڑھے گا کہ انسانی فطرت کی پیروی کیے بغیر اس پر حکم نہیں چلایا جا سکتا۔ ہمیں یہ امید نہ

---

[1] Upton Sinclair

[2] The Jungle

رکھنی چاہیے کہ انسان ہمیشہ بے غرض، حساس، خیر و بہبود کے فدا کار، مہربان اور دانشمند ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ ہر ادارہ، ہر قانون، ہر دستور، ہر معاہدہ یا ہر میثاق انھیں ایسا بنا دے گا، مگر پاریٹو اس سے کس قدر آگے بڑھ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ منصوبہ بندی صرف محدود اور مثبت اغراض کے سوا خطرناک ہوتی ہے۔ محض یہی ممکن نہیں کہ ایک بڑا اور وسیع آمیزی تغیر وہ نتائج پیدا نہ کر سکے، جو منصوبہ بند کے پیش نظر تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے غیر متوقع اور ناخوشگوار نتائج پیدا ہوں۔ خیال ہوتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دستور میں اٹھارہویں ترمیم کے نتائج کو پاریٹو غالباً للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ یہ ترمیم ریاستوں میں مسکرات کے امتناع کا مقصد پورا نہ کر سکی، بلکہ شراب کی ناجائز خرید و فروخت میں اضافہ کر دیا۔ پاریٹو کی رائے تھی کہ جب تک عمرانی طلوع کے متعلق ہماری معلومات زیادہ نہ ہو جائیں، بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس شے پر اعتماد کیا جائے، جسے نئے نئے اہلِ علم متکبرانہ طریق پر انسانی فطرت کا غیر عقلی پہلو کہتے اور مذمت کرتے ہیں۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ نسل انسانی کی فطری عادات ارتقائی معیاروں کے مطابق بھی مصلحین کی لغو منطق کے مقابلے میں بقا کے لیے زیادہ مفید ہیں۔

سیاسی افکار پر تبصرہ

پاریٹو شائستہ عقلیت پسند بننے کے لیے کوشاں رہا۔ اگرچہ فاشسٹوں نے اس کی تصانیف کو غلط طریق پر استعمال کیا، مگر وہ شائستہ عقلیت پسندوں ہی میں شمار ہونے کا مستحق ہے۔ وہ اصلاً انیسویں صدی کا ایک لبرل تھا، جسے ہمارے زمانے کی بڑی بڑی جنگوں والی دنیا میں اضطراب رہا۔ ایسی دنیا، جس میں عہدِ وکٹوریہ کی شائستگیاں آہستہ آہستہ زائل ہو رہی تھیں، لیکن جب کہ ہم گریہم والس میں دیکھ چکے ہیں، بہت سے مفکر، جن کی ہمدردی جمہوری نظام کے اقدار سے تھی، پاریٹو سے زیادہ روشن فکر تھے، تاہم ان پر بھی انسان کی طبعی نیکی اور معقولیت کے متعلق مخالفینِ عقلیت کے شکوک کا اثر پڑا۔ جان سٹوارٹ مل انیسویں صدی کے وسط میں اکثریت کے استبداد کے متعلق پریشان تھا۔ والٹر بیج ہاٹ ایک لبرل انگریز تھا، جس پر ڈارون کا بہت اثر پڑا۔ اس نے اپنی کتاب "طبعیات و سیاسیات" (۱۸۷۲ء) میں بتایا کہ عادت و روایت کی جمع شدہ قوت کتنی زبردست ہوتی ہے، جسے اس نے "عادت کا کیک" قرار دیا۔ ساتھ ہی بتایا کہ انسانوں کو معقول عمل پر راضی کرنا کتنا مشکل ہے۔ صدی کے آخر تک مغرب کے لبرل زندگی کے متعلق اپنی روش پر نظرِ ثانی کے مسئلے سے دوچار تھے، کیونکہ عادات، مراسم اور تعصبات کا آہنی جال سامنے آ چکا تھا اور ان کے لیے لازم تھا کہ اپنی روش اس کے مطابق بنائیں۔

۱۹۱۴ء میں ہمارے عہد کے عمرانی رجحانات کا سلسلہ قائم ہو رہا تھا۔ ایک رجحان یہ تھا جسے انقلابی برگزیدگی کہنا چاہیے، یعنی جس اقلیت کے پاس کوئی فارمولا ہو، وہ اختیارات پر قبضہ کر لے اور چند خداداد صلاحیت والے لوگ معاشرے کو درست کر دیں، جس کے لیے اس وجہ سے بدامنی کا خطرہ لاحق ہوا کہ فیصلوں کا انحصار سروں کی گنتی پر تھا۔ ان فارمولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، کیونکہ انیسویں صدی کا آخری دور تعمیرات کی طرح سیاسی اور اخلاقی افکار میں

بھی انتخابیت پہ عامل تھا۔ بعض نے نسل کو برگزیدگی کا نشان بنایا اور دعوت دیتے رہے کہ صرف ان کی برگزیدہ نسل دنیا پر حکمرانی کرے گی۔ دوسروں نے "طبقے" کو برگزیدگی کا نشان بنایا اور پرولتاریوں کی ڈکٹیٹری کے حصول کی کوشش کی۔ مارکسی اشتراکیت نے لینن کے ہاتھوں میں برگزیدگی کے جو مضمرات پیدا کر لیے، وہ اس تندخواور انسانوں سے غیر صابرانہ نفرت کرنے والے کارل مارکس کی تصنیف میں زیادہ چھپے ہوئے نہ تھے۔ اُن کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایک سوچ سمجھ والی اقلیت اختیارات پر قبضہ کرنے اور کم از کم کچھ مدت کے لیے مطلق العنان حکومت جاری رکھے۔ بعض بالکل نئی برگزیدگی کا خواب دیکھتے رہے مثلاً نیٹشے کا "برتر انسان"، جو مذہب کی ایک نئی قسم سے پیدا ہوگا۔ بعض نے اصلاح نسل کو برگزیدگی کا نیا معیار بنانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک نئی برگزیدہ نسل کی پرورش ممکن ہے، مگر اعتراف کرنا چاہیے کہ طبعی علوم کا نام لینے کے باوجود یہ گروہ سب سے بڑھ کر غیر عملی ثابت ہُوا۔

دوسرا رُجحان برگزیدگی کی نرم تر شکل کی طرف ہے، یعنی وہ جمہوری اقدار کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کرنے کے لیے کوشاں رہا۔ بہ حیثیت مجموعی فیبیائی انگریز اور برِ اعظم کے اشتراکی اسی طبقے میں آتے ہیں۔ ان تحریکات کے لیڈر متشددانہ انقلاب کے قائل نہیں۔ وہ اختیارات پر قابض نہیں ہونا چاہتے، بلکہ تدریج پر اعتقاد رکھتے ہیں اور سروں کی گنتی کو بھی بنیادی جمہوری معاملہ سمجھ کر گوارا کر رہے ہیں۔ تاہم ان میں عوام کی سیاسی صلاحیت کے متعلق شک کا ایک زبردست شائبہ ضرور موجود ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ شہری جمہوریت دورِ حاضر کی مملکت کے لاکھوں انسانوں تک توسیع پائے۔ انھیں امید ہے کہ لاکھوں انسانوں کو ایسے قانون ساز منتخب کرنے پر راضی کیا جا سکتا ہے، جو دانشمند منصوبہ بندوں کی باتوں پر کان دھریں گے، جنھوں نے عمرانی علوم کا مطالعہ کیا ہے اور ایسے نئے ادارے تجویز کر سکتے ہیں، جن سے انسانی زندگی بہت اچھا بہتر صورت اختیار کرے گی۔ بہرحال خود منصوبہ بند بھی اس چیز کو ٹھکرائیں گے نہیں، جو مخالفینِ عقل نے انھیں عام انسانوں کی غیر عاقلانہ حیثیت کے متعلق سکھائی ہے۔ وہ ان چیزوں سے پورا فائدہ اٹھائیں گے، جو عملی سیاستدان، اشتہار باز اور انسانوں سے کام لینے والے ہنرمند پیشہ وروں سے سیکھی ہیں۔ وہ میکیاولی کی پیروی کریں گے، لیکن اس پیروی سے پاکیزہ تر طریق پر کام لیں گے۔

تیسرا رجحان یہ ہے کہ جو چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، یا کم از کم جو موجود ہے، اسے محفوظ رکھا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے۔ یعنی جمہوری کوشش سے مساوات پیدا کی جائے اور اقتصادی و عمرانی زندگی میں حکومت کی مداخلت سے کام لیا جائے تاکہ سب کے لیے تحفظ کے انتظام کو تقویت پہنچے۔ اس طریقے کی پیروی پارٹیو جیسے آدمیوں نے کی اور یہی طریقہ امریکہ کے مشہور عالم اجتماعیات ولیم گراہم سمنر[1] نے اختیار کیا۔ یہی طریقہ انگریز فلسفی ہربرٹ سپنسر اور مغرب کے بہت

---

[1] Sumner

سے آدمیوں کا تھا۔ انھیں ناواجب طریق پر قدامت پسند نہیں کہا جاتا، کیونکہ وہ قائم شدہ نظام کو بہ حیثیت عمومی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کوئی رسمی اور غیر فلسفی قدامت پسند نہیں، جو ہر تغیر کی مخالفت کریں۔ ان کا ایک قطعی فلسفہ ہے۔ وقت کی روح نے ان پر گہرا اثر ڈالا وہ اس مخالفت عقل سے متاثر ہوئے، جس کا خاکہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ ان کا بنیادی موقف یہ ہے کہ فکر کو انسانی معاشرے کے لیے اندھا دھند استعمال کرنے پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اس طرح وہ برک پر اور مغرب کے فلسفی قدامت پسندوں پر پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن وہ اپنے عہد کی پیداوار تھے، خصوصاً اشتراکیت کے متعلق مثبت خطرات میں ان میں سے اکثر ترقی کے معتقد ہیں اور مادی فراوانی، امن اور صنعتی معاشرے کو غنیمت سمجھتے ہیں، البتہ ان کا عقیدہ ہے کہ موجودہ طبقۂ اوسط، کاروباری دنیا کے موجودہ لیڈر، وکٹوریائی عادات واخلاق کا موجودہ حال بہ حیثیت عمومی ترقی کے اجزاء کا بہترین ضامن ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں منصوبہ بندوں اور منصوبہ بندیوں سے ڈر ہے، خصوصاً ان لوگوں سے جنھیں سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ انھیں حکومت پر اعتماد نہیں۔ اصلاً وہ لوگ ڈاروِن کے اچھے پیرو ہیں، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ عملی ارتقاء متقابل افراد کی جہد للبقاء پر منحصر ہے۔ انھیں اس جہد کے قابل بنانے کے لیے منظم انسانی کوششوں سے بیش از بیش آزاد رہنا چاہیے۔ وہ جانتے ہیں کہ ارتقاء کی رفتار تیز نہیں کی جا سکتی اور اسے تیز کرنے کی کوششیں خواہ کتنی ہی نیک نیتی پر مبنی ہوں، رکاوٹ کا باعث بن جائیں گی۔ کیونکہ اس طرح انسانی تنوع اور اختراع پر پابندی عائد ہو جائے گی۔

آج بھی ہم میں ان لوگوں کے ہم نوا موجود ہیں، لیکن اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ آج تک ایسی کوئی چیز پیدا نہ کر سکے جو "مستقبل کی لہر" بن سکے۔ ہربرٹ سپنسر سمجھتا تھا کہ شہروں میں بدرؤں کا جبری انتظام حکومت کی طرف سے فرد کے جائز حق میں مداخلت ہے اور فرد کو تپ محرقہ کے خلاف بھی بطور خود ہی جد وجہد جاری رکھنی چاہیے۔ اگر وہ انیسویں صدی کے اواخر کے بجائے بیسویں صدی ہی کے وسط میں ہمارے درمیان ہوتا تو یقیناً بدرجہا زیادہ اضطراب و ناآسودگی کا ہدف بنا رہتا۔

انیسویں صدی کا سامراج

چوالیسواں باب

سامراج پر عام نظر

تمہید

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ تعریف کے لیے زیادہ سے زیادہ پرانی مثال تلاش کی جائے، لیکن سامراج کے لفظ کے لیے ۱۸۸۱ء سے پیشتر کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔ اس میں سامراج کی تعریف یوں کی گئی ہے: "روحِ سلطنت کا اصول، جن چیزوں کو سامراج کے مفاد قرار دیا جاتا ہے، ان کی وکالت" بہرحال لفظ نیا ہے، مگر اس کا مفہوم بہت پرانا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب ہی سے ہمیں ایسے منظم انسانی گروہوں کا علم ہو چکا ہے، جو دوسروں کی سرزمینوں میں پہنچتے تھے اور اصل باشندوں کو باہر نکال دیتے تھے یا ان کا استیصال کر دیتے تھے یا انھیں محکوم بنا لیتے تھے۔ یورپ یا زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ مغرب کی جو توسیع انیسویں صدی کے اواخر میں اوجِ کمال کو پہنچی، اس کی ابتدا پندرھویں صدی میں ہو گئی تھی۔

نیا اور پرانا سامراج

اصطلاح سامراج کے سلسلے میں ہمیں اپنا احساسِ تناسب نہ کھونا چاہیے، یعنی یہ نہ فرض کر لینا چاہیے (جیسا کہ دورِ حاضر کے اکثر ماہروں نے فرض کر لیا) کہ یہ تحریک سراسر نئی تھی، اس کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ یا یہ بالتخصیص سراپا خیر یا بالتخصیص سراپا شر تھی۔ تاہم مغربی اقوام کے سامراج میں انیسویں صدی کے اندر بعض اہم نئے عناصر تھے، جیسا کہ خود لفظ (امپیریلزم) کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں "ازم" ایک عقیدہ یا ایک مجموعۂ اصول ہے، جسے انسان بالقصد اور دانستہ زندگی کا رہنما بنا لیتے ہیں۔ دورِ حاضر کے آغاز میں یورپی گروہ مختلف محرکات کے تحت باہر جاتے رہے۔ انھیں شاذ ہی حکومت کی پالیسی سے براہِ راست کوئی تعلق تھا اور شاذ ہی لوگوں میں ان کے متعلق زیادہ وسیع پیمانے پر بحث و تمحیص ہوتی تھی۔ اس کے برعکس انیسویں صدی کا سامراج تقریباً ہر ملک میں سیاسی زندگی کا ایک بڑا حصہ تھا۔ اس کے مقاصد، وسائل و ذرائع اور وکیل موجود تھے، جو سب کے علم کے مطابق سیاسیات سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک تقریباً پورے مغربی یورپ، وسطی یورپ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور یورپی ثقافت کی تمام بیرونی چوکیوں میں خواندگی کا تناسب بہت بلند ہو گیا تھا اور لوگ باہم وسیع پیمانے پر کھلم کھلا بحثیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں امپیریلزم (سامراج) نے لبرلزم (آزاد خیالی)، کنسرویٹزم (قدامت پسندی)

نیشنلزم (قوم پرستی)، سوشلزم (اشتراکیت) اور ایسے ہی دوسرے "ازموں" میں جگہ حاصل کرلی اور یہ (سامراج) بھی بحث عام کا موضوع بن گیا۔ سامراج کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل پر ہم آگے چل کر غور کریں گے۔

ایک اور بدیہی چیز پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء) کے افتتاح پر نمایاں ہوئی۔ مغربی سامراج کی توسیع علاقائی اعتبار سے سیارۂ ارض کے جغرافیے کی آخری حد پر پہنچ چکی تھی۔ سامراج کی شکلوں کا سلسلہ خاصا وسیع تھا۔ براہ راست الحاق سے دائرہ ہائے اثر تک اس کے مختلف درجے تھے۔ ان درجات کے اعتبار سے پورا کرۂ ارض مغربی ضبط و نظم یا مغربی اثر کے تحت آچکا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر جو حصے باقی رہ گئے تھے، وہ وہی بنجر اور بے آباد حصے تھے، جو قطب جنوبی کے ارد گرد واقع تھے اور ممتاز قومیں ان خطوں کی اکتشاف و تقسیم میں مصروف تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں برطانیہ نے رسمی اعلان کر دیا کہ فاک لینڈ[1] ہمارے زیر اثر ہے اور اس میں بعض وہ جزیرے بھی شامل تھے۔ جو جنوبی امریکہ کے جنوبی گوشے سے آگے واقع تھے۔ یہ فانے کی شکل کا ایک حصہ تھے، جو اسی درجے اور بیس درجے مغربی طول البلد کے درمیان قطب جنوبی تک جاتا تھا۔ دوسری قومیں بھی اپنے دعاوی پیش کر رہی تھیں۔ ناروے کے مکتشف امنڈسن[2] نے اپنے ملک کا پرچم ۱۶۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو خود قطب جنوبی پر جا لہرایا۔ ایک مہینہ بعد ایک انگریز یعنی سکاٹ بھی قطب جنوبی پر پہنچ گیا، لیکن وہ اور اس کے ساتھی سفر مراجعت میں مر گئے۔ آسٹریلیائی، فرانسیسی، جرمن، اور جنتینی اور امریکی بھی رسمی اور غیر رسمی دعوے کر رہے تھے۔ قطب جنوبی انسانی بود و باش کے لیے کوئی موزوں مقام نہ تھا، مگر وہ کرۂ ارض کا ایک حصہ تھا اور خیال تھا کہ ممکن ہے، اس میں معدنی دولت موجود ہو۔

اقتصادی پہلو

اقتصادی پہلو تیسرا نکتہ تھا، جس کی واضح تعبیر انیسویں صدی کے سامراج کو اس کی ابتدائی شکلوں سے ممتاز کرتی تھی۔ بلاشبہ اقتصادی محرکات علاقائی توسیع کی تمام شکلوں میں دور ماقبل تاریخ سے کارفرما رہے ہیں۔ ہسپانیہ اور پرتگال نے بالکل ابتدائی دور میں جس توسیع پر زور دیا تھا، صاف معلوم ہے کہ وہ سونے چاندی اور دوسرے منافع کے لیے تھے، مگر انیسویں صدی اختتام کے قریب پہنچی تو سامراجی طاقتوں نے نئے اقتصادی محرکات کا ثبوت دینا شروع کیا۔ جو انگریز لبرل سامراج کے مخالف تھے ۔۔۔ مثلاً جے، ای ہوبسن[3]، جس کی کتاب "سامراج[4]" ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی ۔۔۔ اس شکل کو پرانی شکلوں سے بالکل الگ سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے اس کے لیے ایک حد درجہ سادہ اور یگانہ توجیہہ اختیار کرلی، جو تحریک کے پس پردہ پرپیچ محرکات کے خلاف تھی۔ روز الکسمبرگ[5] نے مارکسیوں کے لیے اس اختلاف کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ لینن نے اس میں مزید تغیر پیدا کر دیا، خصوصاً اپنی کتاب "سامراج سرمایہ داری[6]

---

[1] Falkland

[2] Amundsen

[3] Hobson

[4] Imperialism

[5] Rosa Luxemberg

[6] Imperialism as the Latest Stage of Capitalism



جنوبی امریکا سنہ ۱۹۱۴ء
(متنازعہ علاقے ۱۹۱۴ء (ان علاقوں میں ۱۹۴۲ء کے مطابق حدیں)
دار الخلافے
کارٹاگینا
کاراکاس
وینیزویلا
کولمبیا
بوگوٹا
ایکواڈور
کوئیٹو
گوایاکوئل
لیما
کالاؤ
جارج ٹاؤن
پیراماریبو
گیانا
برطانوی
ولندیزی
فرانسیسی
ڈیولز آئلینڈ
دریائے اورینوکو
دریائے نیگرو
دریائے امیزن
ماناوس
دریائے پیورس
بالیم
(پارا)
نٹال
ریسیفے
(پرنا بوکو)
بولیویا
لاپاز
اریکا
ٹاسنا
انٹوفاگاسٹا
پیراگوئے
اسنشن
دریائے پارانا
ریوڈی جینرو
سانٹوس
پورٹو الیگرے
یوراگوئے
مونٹی ویڈیو
ریوڈی لاپلاٹا
بونس آئرس
ارجنٹینا
کارڈوبا
ٹوکومین
مینڈوزا
والپیریزو
سانٹیاگو
چلی
باہیا بلانکا
جزیرۂ فاکلینڈ
(برطانوی)
آبنائے میجیلن
پنٹا ایریناس
کیپ ہارن
میل
۸۰۰
کریبیین امریکا کے نقشے میں مندرجہ رقبہ
شوراشیہ ہیٹی
صوبجات متحدہ وسطی امریکہ
گیاناس
سلطنت برازیل
پیراگوئے
بولیویا
یوراگوئے
چلی
وفاق ارجنٹائن
لاطینی امریکہ
جنگہائے آزادی کے بعد
۲۰۰۰

کے آخری مرحلے کی حیثیت میں (۱۹۱۵ء)۔

سامراج کے ان اقتصادی نقادوں کے نزدیک پرانے ملکوں کے سرمایہ دار اور صنعت کار انیسویں صدی میں یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ جتنی چیزیں پیدا کرتے ہیں، انھیں ملک کے اندر فروخت نہیں کر سکتے، مگر وہ چونکہ سرمایہ دار تھے، اس لیے کم سود، کم منافع اور اپنے لوگوں میں طبقۂ بالا کو کم روپیہ دے کر مشکلات حل کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور وہ مزدوروں کو زیادہ اجرتیں، زیادہ پنشن اور بونس کی زیادہ رقمیں ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی دولت میں دوسروں کو حصہ دار بنا کر ان کی قوتِ خرید بڑھانے اور سب کو چیزیں بہم پہنچانے کے بجائے غیر مغربی دنیا پر توجہ کی۔ بیرونی منڈیوں کی تلاش میں مصروف ہو گئے اور یہ مناسب سمجھا کہ ماتحت قوموں سے ناجائز فائدے اٹھائیں۔ سرمایہ داری کے نظام کو تقویت پہنچانے کے لیے اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مغرب کی صنعت کار طاقتوں کے درمیان زمین اور اقوام کے لیے مقابلہ شروع ہو گیا، جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ لینن نے اس ضرورت پر زور دیا کہ سرمایے سے کام لیا جائے، جو تیزی کے ساتھ جمع ہو رہا تھا اور نئی منڈیوں کی ضرورت پر زور نہ دیا جائے۔ اس کی رائے کے مطابق بڑے بڑے بینکروں نے سیاستدانوں کو نئے الحاقات کی تلاش پر آمادہ کر دیا۔ یہی تلاش تھی، جسے لینن نے سرمایہ داری کا آخری ناگزیر مرحلہ قرار دیا تھا۔

کسی شخص نے انیسویں صدی کی توسیع کے مسائل کا مطالعہ نہیں کیا تھا کہ واضح ہو جاتا، اقتصادی وجاہ بھی ان لوگوں کے محرکات میں شامل تھے، جو اس توسیع کے ذمہ دار تھے۔ مارکسیوں کے مخالف امریکیوں نے غیر مشتبہ طور پر ثابت کر دیا کہ امریکہ میں سرمایہ اعلیٰ اجرتوں کے باوجود محفوظ رہا اور مصنوعات کی خریداری بھی عام رہی۔ اس کے برعکس یورپ میں سرمایہ داری کی حیثیت نسبتاً متزلزل ہے کیونکہ یورپ کے کاروباری آدمی مزدوروں کو صنعت کی پوری پیداوار میں سے زیادہ حصہ دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ مزید براں امریکہ اور یورپ میں ممتاز صنعتکار طاقتیں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں زیادہ بھاری محاصل کے روز افزوں مطالبے کا تجربہ کر رہی تھیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی میں، بلکہ آزاد تجارت کے حامی برطانیہ میں بھی صنعتکار چاہتے تھے کہ غیر ملکی صنعتوں کے خلاف تحفظ کی پالیسی اختیار کی جائے۔ یہ نئے تجارتی نظریہ زر کا نیا دور تھا، جس میں کولبرٹ اور دوسروں کے پرانے نظریۂ زر کے اصول تازہ کیے جا رہے تھے۔ نئے تجارتی نظریۂ زر کی تدبیروں میں بھی تحفظاتی محاصل اور نوآبادیاں شامل ہو گئیں۔ بالکل یہی کیفیت پرانے تجارتی نظریۂ زر کے سلسلے میں پیش آئی تھیں۔

غرض ہوبسن، ہلکسمبرگ اور لینن کی دلیل میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہے، لیکن سب کچھ یہی نہیں۔ معاہدات نپولین اور ۱۹۱۴ء کی جنگ کے درمیان جو صدی گزری، اس میں مغربی دنیا کی سرگرمیاں باقی دنیا میں پہنچتی رہیں، ایسی ہی سرگرمیوں کا انفجار دورِ احیائے علوم میں ہوا تھا تاہم ان کی توجیہہ کسی ایک سلسلۂ علل سے نہیں کی جا سکتی، جیسا کہ اقتصادی تعبیر

کی بنا پر اسے واضح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان سرگرمیوں میں قوم پرستانہ احساس کی خودداری بھی شامل تھی۔ حکمرانوں کی خواہش، نیز محکوموں میں سے سیاستاً بیدار اکثریت کی خواہش بھی یہ تھی کہ ایک سلطنت پیدا کی جائے، کیونکہ برطانیہ یا فرانس یا پرتگال کی سلطنتیں موجود ہیں۔ ساتھ ہی فوجی اور بحری رقابتوں اور مختلف ممالک کی مخصوص سیاسیات کا جمع شدہ دباؤ بھی پڑتا رہا اور جو مملکتیں کرۂ ارض میں اپنا اقتدار پھیلا رہی تھیں۔ ان کی ابتدائی رقابتیں بھی اس سلسلے میں کارفرما تھیں۔ پھر فلسفیوں نے ترقی کے جو نظریے مدوّن کیے تھے، وہ بھی ساتھ ساتھ عمل پیرا رہے، مثلاً اقوام کے درمیان مقابلے کے ذریعے سے انتقاء کا جادو، جس میں زیادہ اصلح ہی بہ ظاہر اصلح پر حکمرانی کا حقدار تھا۔ ساتھ ہی یہ یقین بھی شامل تھا، جو بالکل دیانت داری پر مبنی تھا کہ مغرب کم خوش نصیب قوموں تک تہذیب کا اعلیٰ اخلاقی تحفہ پہنچائے۔ اس یقین کی بنا پر اکثر داخلی و خارجی حقائق کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لی جاتیں۔ اسی وجہ سے اکثر دیسی باشندوں اور مد مقابل مغربیوں کے تعلق میں بے پروائی کی روش اختیار کر لی جاتی۔ بہت سے مشنریوں —— مسیحی اور سیکولر —— میں بھی یہ پُرجوش اور ہمدردانہ خواہش موجود تھی کہ روئے زمین کے تمام لوگوں کے لیے زندگی بہتر بنائی جائے۔

نقلِ وطن

مغرب نے انیسویں صدی میں جو توسیع کی، اس کے محرکات کے سلسلے میں عمومی غور و فکر بھی ضروری ہے۔ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ یہ کس حد تک حد درجہ بڑھی ہوئی آبادی کے علاقوں سے باہر نکل جانے کی کوشش تھی، یعنی آیا اصل تحریک یہی نہ تھی کہ وطن میں جگہ کم تھی، اس لیے باہر نکلنا ناگزیر ہو گیا اور ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ماقبل تاریخ عہد اور عہد ماضی میں بھی آبادیاں اسی بنا پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہیں۔ یقیناً یہ معاملہ بھی پیش آیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۸۰۰ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان چھ کروڑ افراد ایک برّاعظم سے نکل کر دوسرے میں پہنچے۔ ان میں سے تین کروڑ ساٹھ لاکھ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں آئے۔ بعض اس لیے آئے کہ وطن میں انھیں ستایا جا رہا تھا۔ اور ان پر سختیاں کی جا رہی تھیں۔ بعض اس لیے آئے کہ وہ تبدیلی یا طالع آزمائی کے خواہاں تھے۔ بعض اس لیے نکلے کہ ان کے لیے ساسوں کے ساتھ گزارہ مشکل تھا۔ بہ ایں ہمہ اس نقلِ وطن میں ایک جزو یہ بھی تھا کہ لوگوں کو پہلے مقامات پر اقتصادی مواقع نظر نہیں آئے تھے۔

اتنے آدمیوں کا ترکِ وطن کر کے ریاستہائے متحدہ میں پہنچ جانا اور اپنے اصلی وطن کی سامراجی طالع آزمائی سے باہر نکل جانا ظاہر کرتا ہے کہ مغرب کی یہ نقل و حرکت عام سامراج سے مختلف سمجھنی چاہیے۔ تارکینِ وطن زیادہ تر ان آبادیوں میں پہنچے، جو یورپیوں کی بہت بڑی آبادی کی کفیل بن سکتی تھیں اور ان نوآبادیوں میں نہ گئے، جن کا مقصد محض فائدہ اٹھانا تھا، مثلاً ہندوستان یا افریقہ۔ وہ لوگ کینیڈا، جنوبی امریکہ کے مختلف ممالک، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، سائبیریا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پہنچے، لیکن وہ بڑے علاقے، جن میں سفید فام لوگ رہنا چاہتے تھے انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں پوری طرح آباد نہیں ہوئے تھے تو کم از کم بڑی طاقتوں کے سیاسی ضبط و نظم میں ضرور آ چکے تھے

اور جنگ میں تباہی خیز شکست کے بغیر ان سے بڑی طاقتوں کو محروم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انیسویں صدی میں سامراجی طاقتوں کی کشمکش گاہ بالقوۃ وہ نو آبادیاں تھیں، جن سے من مانے طریق پر فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ تمام گرم یا نیم گرم علاقے تھے، جہاں پہلے ہی آبادی زیادہ تھی، مثلاً مصر اور ہند چینی یا ان میں درمیانے درجے کی آبادی تھی۔ مثلاً افریقہ اور فلپینز۔ ان علاقوں میں سفید فام لوگ حقیقی آباد کاروں کی حیثیت میں مقیم نہ ہوئے۔ انہوں نے دیسی باشندوں کو باہر نہ نکالا، جیسے ریاستہائے متحدہ میں سے اکثر میں نکالا جا چکا تھا۔ سفید فام لوگ ان علاقوں میں سرکاری نظم و نسق کے ذمہ دار بن گئے یا انہوں نے بڑے بڑے علاقوں میں باغات یا کھیتی باڑی کا انتظام کر لیا یا درآمد برآمد کی تجارت شروع کر دی یا معلم اور مشنری بن گئے۔ گویا ان کی حیثیت حکمران طبقے کی تھی، مگر دیسی آبادی اپنی جگہ قائم رہی، بلکہ ۱۸۱۵ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان تعداد میں بڑھ گئی۔

متعلقہ طاقتیں

مقابلہ کرنے والی سلطنتوں کے درمیان رقابتیں ان عشروں میں تیز ہوئیں، جو ۱۸۷۰ء کے بعد شروع ہوئے۔ جرمنی اور اٹلی کے متفرق حصوں میں نیا نیا اتحاد ہوا تھا اور ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ یہ دونوں ملک بھی میدان مقابلہ میں اتر آئے۔ جغرافیائی اکتشافات نے آخری بڑے علاقوں کے دروازے کھول دیئے، جو نسبتاً کم معروف تھے، یعنی افریقہ۔ اقتصادی تعبیر کے حامی کہیں گے کہ بڑی طاقتوں کے صنعتی نظام زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور انھیں درآمد کے لیے ارزاں خام مال نیز برآمد کے لیے ارزاں مصنوعات باہر بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کے درمیان سرمایہ دارانہ مقابلہ تیز تر ہو گیا۔

۱۸۷۰ء دو دوروں کے درمیان ایک مناسب حدِّ فاصل ہے۔ ایک دور وہ جسے سامراج کا زیادہ سرگرم دور قرار دینا چاہیے۔ یہ ۱۸۷۰ء سے پہلے تھا۔ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۷۰ء تک سامراج میں جزواً تنزل ہوا، کیونکہ ہسپانیہ کی بیشتر امریکی نو آبادیوں نے آزادی حاصل کر لی اور برطانیہ نے وہ ابتدائی قدم اٹھائے جن کے بعد کینیڈا عملاً آزاد ہو گیا۔ اسی دور میں فرانسیسی الجزائر میں قدم جما لیے اور برطانیہ نے ہندوستان میں اپنے مقبوضات وسیع کر لیے۔ ۱۸۷۰ء کا خطِ مستقیم سامراج کی تاریخ میں کوئی قطعی خطِ فاصل نہیں، بلکہ سمجھنا چاہیے، تحریک موجود تھی اور اس میں تیزی آ گئی۔

انیسویں صدی کے سامراج میں کامیاب عناصر — یعنی وہ عناصر، جنھوں نے نئی زمینوں پر قبضہ کیا۔ برطانیہ عظمیٰ — جس کی سلطنت ۱۸۱۵ء میں بھی خاصی وسیع تھی — فرانس، جرمنی، اٹلی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ تھے۔ چھوٹے سے بلجیئم نے بھی، جو ۱۸۱۵ء میں ایک نئی قوم تھی، گرم افریقہ میں بہت بڑا علاقہ حاصل کر لیا یعنی کانگو، جس کا رقبہ نو لاکھ مربع میل تھا۔ اس کے مقابلہ میں خود بلجیئم کا رقبہ کل گیارہ ہزار سات سو پچھتر میل تھا۔ روس نے سمندر پار کسی توسیع میں حصہ نہ لیا، بلکہ زار روس کی حکومت نے شمالی امریکہ میں اپنا وسیع اور صد درجہ کم آباد علاقہ یعنی الاسکا ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا (۱۸۶۷ء) البتہ اس نے کوہستان یورال کے مشرق میں وسیع پیمانے پر آباد کاری کی سرگرم کوششیں شروع کر دیں اور وہ وسط ایشیا، نیز مشرق بعید — ایران، ہندوستان، چین — کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگا۔ پرانی سلطنتوں میں سے ایک یعنی، ہالینڈ وقت گزارتی رہی، پرتگال نے برازیل کھو دیا اور وہ ۱۸۲۲ء میں آزاد ہو گیا، مگر پرتگیز افریقی ساحل پر اپنی پرانی نو آبادیوں سے اندرون ملک کی طرف بہت آگے بڑھ گئے۔ ۱۸۹۸ء میں امریکہ اور ہسپانیہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو ہسپانوی سلطنت کے باقیات نقشے سے بالکل مٹا دیئے گئے۔ کیوبا اور فلپینز کے زرخیز جزیرے اس کے قبضے سے نکل گئے۔

عمل توسیع میں توسیع دوست قوموں کے درمیان مختلف قسم کے مقابلے جاری رہے۔ ان میں اقتصادی مقابلے بھی ہوتے تھے اور زد و کشت کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ انیسویں صدی کی تقریباً ساری بڑی بین الاقوامی کشمکش کا تعلق یورپ سے باہر سامراجی رقابتوں سے تھا، صرف پروشیا اور آسٹریا، نیز پروشیا اور فرانس کی جنگیں مستثنیٰ ہیں۔ جرمنی اور اٹلی کے اتحاد کے سلسلے میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں بھی سمندر پار کی سرزمینوں کے لیے کشمکش کی کوئی نہ کوئی شق موجود تھی۔ سامراج کے لیے مقابلہ ایک پُرپیچ داستان ہے، جو انیسویں صدی کے بین الاقوامی تار و پود میں بنی گئی۔ اب ہم اختصاراً یورپی طاقتوں کے درمیان رقابتوں کے بڑے بڑے علاقوں کا ذکر کریں گے، پھر اس صدی میں بڑی بڑی سلطنتوں کی نشو و نما کا خلاصہ پیش کر دیں گے۔

متعلقہ علاقے

منرو کے اصول نے امریکہ کے دونوں براعظموں کو کسی بیرونی طاقت کے حقیقی الحاق سے محفوظ رکھا جیسے جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی قوت بڑھتی گئی، یورپی طاقتیں منرو کے اصول کا زیادہ سے زیادہ احترام کرتی گئیں۔ یہی کیفیت برطانوی بحری قوت کی تھی۔ ۱۹۱۴ء کے مصیبت خیز سال تک برطانیہ اور امریکہ کے درمیان منڈیوں کے لیے، نیز جنوبی امریکہ میں سرمایہ کاری کے مختلف دائروں کے لیے مقابلہ تیز تر ہوتا گیا۔ اور یہ مقابلہ بھی اُن بہت سے عوامل میں سے ایک تھا، جن کی وجہ سے ان طاقتوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ انیسویں صدی میں کوئی مملکت اتنی طاقتور نہ تھی کہ برطانیہ سے اس کی پرانی نوآبادیاں چھین لیتی، اس لیے آبادکاری کی نوآبادیوں اور استفادے کی نوآبادیوں میں برطانیہ کے مسائل صرف برطانوی نظام تک محدود رہے۔ اگرچہ یہ بین الاقوامی مسائل نہ تھے، تاہم جنگ سے پیشتر کے عشرے میں روس اور جرمنی بعض اوقات ان میں مداخلت کا خطرہ پیدا کرتے رہے۔

سامراجی رقابت اور مداخلت کا ایک بڑا دائرہ مشرق قریب یا مشرق اوسط تھا۔ یہ مختلف سرزمینوں کا ایک وسیع حلقہ تھا، جو مختلف درجوں میں ترکی نظم و ضبط کے ماتحت تھا، نیز اس میں ایران شامل تھا۔ پیشتر کے ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح بلقان اور آبنائیں انیسویں صدی کی ڈپلومیسی کی تاریخ میں بہت بڑے مسئلے بنے رہے۔ پورا مسئلۂ مشرقیہ، جیسا عموماً اسے قرار دیا جاتا ہے، اس مسئلے کے گرد گھوم رہا تھا کہ ان قدیم سرزمینوں کے متعلق کیا کیا جائے، جن کی آبادیاں فی الجملہ اسلامی تھیں۔ انیسویں صدی کے مغربی معیاروں کے مطابق یہ سرزمینیں پسماندہ تھیں۔ بارش کا اوسط بہت کم تھا اور جو زمینیں کھیتی باڑی کے قابل تھیں، ان کی قوت صدیوں کے قدیم طریقِ زراعت میں ختم ہو چکی تھی۔ ان کے طبعی وسائل بھی بہت معمولی تھے، کیونکہ آج جو شے ان کی سب سے بڑی دولت سمجھی جاتی ہے، یعنی تیل، اس کے متعلق یا تو علم ہی نہ تھا، یا بیسویں صدی تک اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مشرق قریب کے متعلق انگلستان، فرانس اور روس کے درمیان انیسویں صدی کے اوائل ہی میں معرکۂ تسابق بپا تھا۔ آگے چل کر اٹلی اور جرمنی بھی اس میں شامل ہو گئے۔

افریقہ بھی سامراجی رقابت کا ایک قابلِ دید منظر پیش کر رہا تھا۔ ۱۸۱۵ء میں افریقہ کے اندر نہ یورپی آباد تھے، نہ اس کے قلب کی پوری چھان بین ہوئی تھی، البتہ شمالی افریقہ کی سرزمینوں کا سب کو علم تھا۔ جو برائے نام ترکی کے ماتحت تھیں۔ پھر انتہائے جنوب میں راس امید پر ولندیزوں کی ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ جسے ۱۸۱۵ء میں برطانیہ نے سنبھال

لیا۔ علاوہ بریں پرتگیزوں، ہسپانویوں، فرانسیسیوں اور برطانویوں کے "کارخانوں" یا تجارتی کوٹھیوں کا ایک سلسلہ قدیم پرتگیزی اکتشافات کے ساتھ ساتھ قائم تھا اور یہ اکتشافات پندرھویں صدی میں ہو چکے تھے۔ افریقہ میں حبشی نسلیں آباد تھیں، جو مدت سے بردہ فروشی کی مصیبتوں کا شکار تھیں اور ان کا معیار معیشت اکثر زمانۂ قدیم کے قبائلیوں کا سا تھا۔ صدی کے وسط تک بہت سے علاقوں میں بردہ فروشی موقوف ہو چکی تھی اور اکتشافات کا سلسلہ سرگرمی سے جاری تھا۔ پھر صدی کے نصف آخر میں بڑی طاقتوں ـــ برطانیہ، فرانس اور جرمنی ـــ نے پرتگال، اٹلی اور بلجیئم کو ساتھ لے کر بڑی بڑی علاقائی وحدتوں میں اپنے اپنے پرچم لہرا دیئے اور تقریباً پورا براعظم ان میں تقسیم ہو گیا۔ صرف جمہوریہ لائبیریا مستثنیٰ تھی، جو چھوٹی سی تھی۔ اس جمہوریت کی بنیاد ان امریکیوں نے رکھی تھی جو غلامی کے سخت خلاف تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس جمہوریت میں امریکہ کے آزاد شدہ حبشی غلام آباد ہوں، اگرچہ بہت کم وہاں گئے۔ دوسرا آزاد علاقہ ابی سینیا کا تھا، جسے اب حبشہ کہتے ہیں۔ یہ پہاڑی اور پسماندہ اندرونی علاقہ تھا۔ ابی سینیا پر اٹلی کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ ابتدا میں یہ بمشکل اٹلی کی دست برد سے بچا۔ ۱۸۹۶ء میں ابی سینیا کی فوج نے اپنے شہنشاہ مینالک[لہ] کے زیر سرکردگی اور فرانسیسیوں کی امداد سے اطالوی فوج کو بمقام عدوہ شکست دی۔ یوں اس ملک کی آزادی کو اس وقت تک مہلت مل گئی، جب تک اطالویوں نے مسولینی کے عہد میں دوبارہ ابی سینیا کے خلاف قدم نہ اٹھایا۔

مشرق بعید بھی سامراجی رقابتوں کی ایک بڑی معرکہ گاہ تھا۔ یورپی طاقتوں نے پرانی نوآبادیوں پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا اور جنوبی و مشرقی ایشیا میں نئے علاقے حاصل کر لیے، یعنی برما، ہند چینی، ملایا، نیز آسٹریلیا اور براعظم ایشیا کے درمیان جزیروں کا ایک وسیع جھنڈ، مگر قدیم اور اعلیٰ درجے کی متمدن چینی سلطنت نہ تو افریقہ کی طرح تقسیم ہوئی اور نہ اس کا الحاق براہ راست عمل میں آیا۔ وہاں کی آبادی بھی حد درجہ گھنی تھی، تاہم سیاسی یا صنعتی اعتبار سے چین اتنا منظم نہ تھا کہ یورپی مداخلت کا مقابلہ کر سکتا اور صدی کے آخر تک یہ بھی برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس کے درمیان عملاً تقسیم ہو گیا۔ ہر طاقت نے معاہدوں کے ذریعے سے بندرگاہوں میں قیام کی اجازت لے لی تھی۔ ان بندرگاہوں میں سے یہ طاقتیں خاصے بڑے علاقے پر اقتدار قائم کیے ہوئے تھیں، جسے بنیادی حیثیت میں اقتصادی سمجھنا چاہیے۔ یورپی طاقتوں کی رقابت کے علاوہ جس شے نے چین کی کمزوری کے لیے توڑ مہیا کیا اور اس پرانی مملکت کو آزاد قوموں کی فہرست میں شامل رکھا، وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نوخیز قوت تھی، جس کی پالیسی یہ تھی کہ چین کے ساتھ آزاد تجارت کا سلسلہ انتہائی امکانی حد تک جاری رکھا جائے، مگر اس کی آزادی محفوظ رکھی جائے۔

جاپان دو صدی تک ـــ سترھویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک ـــ باقی دنیا سے الگ تھلگ

لہ Menelek

رہا۔ اس باہم پیوستہ جزائری سلطنت کے دروازے غیر ملکیوں کے لیے اس زمانے میں بند رہے۔ جب یورپی طاقتیں رفتہ رفتہ چین پر اپنی گرفت مستحکم کر رہی تھیں ۱۸۵۳ء میں امریکہ کے بحری افسر پیری نے جاپانیوں کو اپنی بندرگاہیں بیرونی تجارت کے لیے کھول دینے پر راضی کر لیا۔ جاپان نے مغربی طور طریقے اختیار کر لیے، خصوصاً اقتصادیات میں۔ اس طرح وہ انیسویں صدی کے اواخر میں نہ صرف اپنی آزادی ہی بحال رکھ سکا، بلکہ اس نے براعظم ایشیا میں سامراجی توسیع کے لیے پیش قدمی شروع کر دی۔

پینتالیسواں باب

سلطنت برطانیہ

تمہید اب ہمیں ملک بہ ملک سامراج کی کیفیت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ انیسویں صدی کے برطانیہ نے وسیع علاقے قبضے میں رکھے، جو سفید فام لوگوں کی آبادکاری کے لیے موزوں تھے۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اور جنوبی افریقہ۔ اور برطانوی تارکینِ وطن کی امداد سے ان کی نشو و ترقی کا انتظام کرلیا۔ اس حصے میں برطانیہ کے صرف افریقی اور ایشیائی سامراجی مقبوضات کا مفصل ذکر کیا جائے گا۔ کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں خود اختیاری حکومت کے نشو و ارتقا پر باب کے اواخر میں بحث زیادہ مناسب ہوگی، جہاں ہم انیسویں صدی کے سامراج کے نتائج کا جائزہ لیں گے۔

جنوبی افریقہ ۱۸۱۵ء میں برطانیہ نے نیدرلینڈز سے راس امید کی نوآبادی حاصل کی تھی۔ یہ افریقہ کے جنوبی گوشے میں واقع تھی۔ یہاں تھوڑے سے ولندیز اور تھوڑے سے فرانسیسی ہیوگو ناٹ (پروٹسٹنٹ) آبادکار رہتے تھے۔ اگرچہ بارش کا اوسط کم تھا، لیکن یہ جگہ اہلِ یورپ کی بود و باش کے لیے موزوں تھی۔ برطانوی وہاں داخل ہوئے تو پرانے آبادکار، جو لندیزی بولی میں بوئر[1] کہلاتے تھے، زیادہ سے زیادہ غیر مطمئن ہو گئے۔ برطانیہ نے انگریزی زبان کو واحد سرکاری زبان بنا دیا۔ ۱۸۳۳ء میں پوری سلطنت برطانیہ کے اندر غلامی موقوف کردی۔ لندن کی حکومت نے سیاہ فام دیسی آبادی کی حفاظت کے لیے قدم اٹھایا اور ایسی ہی دوسری تدبیریں اختیار کیں۔ جن کا تعلق عہدِ وکٹوریہ کی لبرلزم سے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوئر اور بھی بھڑک اٹھے۔ یہ لوگ لفظاً لفظاً مسیحی اصول کے پابند تھے اور ان کے نزدیک غلامی خدا کی طرف سے مقرر ہو چکی تھی اور وہ لبرلزم کو شیطانی فعل تصور کرتے تھے۔ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان کوئی دس ہزار بوئر شمالی جانب کی سرزمینوں میں منتقل ہو گئے۔ یہ مہاجرت کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، جو جنوبی افریقہ کے معاصر قومی احساسات کی تاریخ میں اس سے بھی بہادرانہ معلوم ہوتا تھا، جتنا امریکی روایات میں

---

[1] Boer

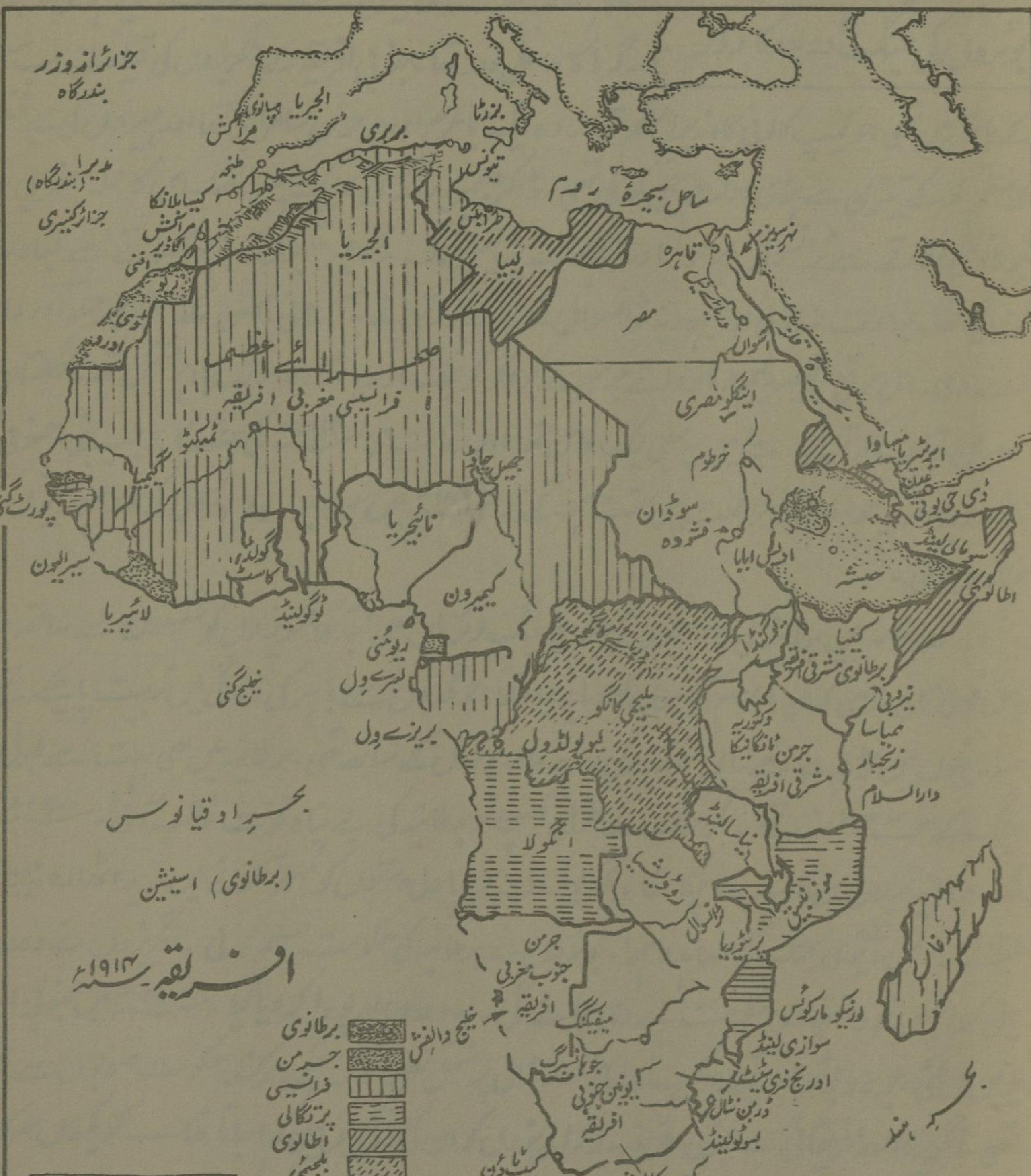
ان مہاجرین کا نظر آتا ہے جو گھوڑا گاڑی کی قطاروں سے مغرب کی طرف جاتے تھے، جن پر پردے تنے ہوتے تھے۔ بوئروں، انگریزوں اور دیسی زولوؤں کے درمیان سہ گونہ کشمکش جاری رہی۔ پھر بوئروں نے جنوبی افریقہ میں دو ایسی ریاستیں قائم کریں، جو عملاً آزاد تھیں، اوّل ٹرانسوال، دوم اورنج فری سٹیٹ[1]۔ یہ ریاستیں ملک کے اندرونی حصے میں واقع تھیں۔ علاقہ چراگاہوں کے لیے بڑا موزوں تھا اور وہاں وسیع پیمانے پر زراعت نہیں ہو سکتی تھی۔ آبادی کم تھی، لہٰذا ایک زمانے تک بیرونی دنیا نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

جنوبی افریقہ کے انگریزوں نے ان ریاستوں کو دیکھ لیا تھا اور ان میں سے اکثر چاہتے تھے کہ یہ سلطنت میں شامل ہو جائیں، چنانچہ کیپ کالونی[2] سے کام کرتے ہوئے انھوں نے بحرِ ہند کے ساتھ ساتھ مشرقی جانب ایک اور برطانوی صوبہ پیدا کر لیا جو نٹال[3] کے نام سے مشہور ہوا۔ کوئی ایک سو سال میں کیپ کالونی اور نٹال نے خود اختیاری کے حقوق حاصل کر لیے، جو دوسری برطانوی نوآبادیاں یعنی کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ حاصل کر رہی تھیں۔ ان میں اصلی باشندوں کی آبادی انگریزوں اور باقی ماندہ بوئروں کی آبادی سے بہت زیادہ تھی۔ برطانوی جنوبی افریقہ کے لیڈروں کی خواہش یہ تھی کہ بوئروں کی جمہوریتیں بھی برطانوی پرچم کے نیچے آ جائیں۔ لیکن خود برطانیہ میں ٹوریوں اور لبرلوں کا اقتدار بار بار بدل رہا تھا۔ لہٰذا سامراجی توسیع کی پالیسی بھی بدلتی رہی۔ ٹوری توسیع چاہتے تھے، لبرلوں کی پالیسی یہ تھی کہ نوآبادیوں کو ان کے حال پر چھوڑیں۔ ۱۸۵۲ء میں ایک کنونشن کے مطابق جو سینڈ ریور[4] کنونشن کہلاتی ہے، برطانیہ نے ٹرانسوال کی آزادی تسلیم کر لی، مگر ۱۸۷۷ء میں اس پالیسی کو بدل کر ٹرانسوال کا الحاق کر لیا۔ مدعا یہ تھا کہ پورے جنوبی افریقہ کا ایک وفاق تاجِ برطانیہ کے ماتحت قائم کر لیا جائے۔ ۱۸۸۰ء میں بوئروں نے بغاوت کر دی۔ اس وقت گلیڈسٹون برسرِ اقتدار تھا اور وہ لبرل تھا۔ اس نے اپنی پارٹی کے اصول کی پابندی کرتے ہوئے ۱۸۸۱ء میں بمقام پریٹوریا[5] بوئروں سے ایک معاہدہ کر لیا، جس کے مطابق ٹرانسوال کی خود مختاری تسلیم کر لی گئی، مگر یہ خود مختاری برطانیہ کے زیرِ سیادت تھی۔

انگریز خود بوئروں کی جمہوریت کے مغرب میں نیم صحرائی علاقے کے اندر پہنچ رہے تھے، جب بوئروں کی جمہوریتوں میں سونے اور ہیروں کی دریافت نے گلیڈسٹون کا کیا ہوا پورا کام ختم کر دیا۔ یہ جمہوریتیں غریب نہ رہیں اور یہ بھی نہیں تھا کہ محض الگ تھلگ چراگاہیں ہوں۔ ان میں دولت کے بہت بڑے سرچشمے مل گئے تھے اور ان کی طرف ایسے آبادکار کھچے چلے آ رہے تھے، جن کی حیثیت بالکل مختلف تھی۔ ٹرانسوال کے علاقے میں جو خطہ جوہینزبرگ[6]

---

[1] Orange Free State
[2] Cape Colony
[3]
[4] Sand River
[5] Pretoria
[6] Johannesburg



افریقہ سنہ ۱۹۱۴ء
جزائر مدیرا
بندرگاہ
جزائر کنیری
الجیریا ہسپانوی
مراکش
بربری
طنجہ
کیسابلانکا
مراکش
اگاڈیر
افنی
ریو
اوڈی
اورو
الجیریا
تیونس
سرڈینیا
طرابلس
لبیا
ساحل بحیرۂ روم
قاہرہ
نہر سویز
مصر
اسوان
اینگلو مصری
خرطوم
سوڈان
فشوده
ادیس ابابا
حبشہ
اریٹریا مساوا
عدن
ڈی جی بوتی
صومالی لینڈ
اطالوی
صحرائے اعظم
فرانسیسی مغربی افریقہ
ٹمبکٹو
گیمبیا
پورٹ گنی
سیرالیون
لائبیریا
گولڈ کاسٹ
ٹوگولینڈ
نائجیریا
جھیل چاڈ
کیمرون
ریو منی
لبرے ول
خلیج گنی
بریزے ول
لیوپولڈ ول
بلجیمی کانگو
یوگنڈا
کینیا
برطانوی مشرقی افریقہ
نیروبی
ممباسا
زنجبار
دارالسلام
وکٹوریہ
جرمن ٹانگانیکا
جرمن مشرقی افریقہ
نیاسالینڈ
روڈیشیا
انگولا
بحر اوقیانوس
(برطانوی) اسینشن
جرمن
جنوب مغربی
افریقہ
خلیج والفش
میفیکنگ
جوہانسبرگ
ٹرانسوال
پریٹوریا
لورنکو مارکوئس
سوازی لینڈ
اورنج فری سٹیٹ
یونین جنوبی افریقہ
ڈربن نٹال
بسوٹولینڈ
کیپ ٹاؤن
کیپ کالونی
بحر ہند
برطانوی
جرمن
فرانسیسی
پرتگالی
اطالوی
بلجیمی
میل
۱۰۰۰

کے آس پاس تھا اور رینڈ[1] کے نام سے مشہور تھا، ایک درجن قوموں کے طالع آزماؤں سے بھر گیا۔ ان سب کی نظریں برطانیہ پر جمی ہوئی تھیں، تاکہ انھیں قدامت پسند بوئروں سے محفوظ رکھے۔ بوئروں کے نزدیک یہ سب لوگ غیر ملکی تھے جنھیں قابل برداشت نہیں سمجھا جاتا تھا۔

بوئروں کی جنگ اور بعد کا دور

۲۹ دسمبر ۱۸۹۵ء کو جیمسن[2] کے حملے سے جنگ ناگزیر ہوگئی۔ جنوبی افریقہ میں یہ گرما گرم وسطی دور تھا۔ جنوبی افریقہ کے انگریزوں کی قیادت اب سیسل روڈس کے ہاتھ میں تھی جو کیپ کالونی کا وزیر اعظم تھا۔ وہ ایک باعزم اور پرجوش سامراجی تھا اور ہیروں کی بے نظم تجارت کو منظم کر کے تیزی سے بڑی دولت جمع کر لی تھی۔ ڈاکٹر جیمسن روڈس کا ایک پیرو تھا۔ اس کا حملہ مغربی جانب کے برطانوی علاقے سے ٹرانسوال پر ہوا اور پہلے سے جوہانسبرگ کے غیر ملکیوں کو باہم سمجھوتے سے بغاوت پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ بغاوت نہ ہوئی اور جمہوریہ ٹرانسوال کے صدر کروگر[3] نے بہ آسانی جیمسن کے مٹھی بھر حملہ آوروں کو شکست دے دی۔ اس موقع پر قیصر ولیم فرمانروائے جرمنی نے کروگر کو ایک تار دیا تھا، جو مبارک باد پر مشتمل تھا۔ انگلستان و جرمنی کے درمیان رقابت کو ترقی دینے میں یہ بھی ایک عامل تھا اور رقابت ہی ۱۹۱۴ء کی جنگ کا موجب بنی۔ جنوبی افریقہ پر اس تار کا فوری اثر یہ ہوا کہ بوئر مزاحمت میں سخت ہو گئے۔ ۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور بوئروں کی دو جمہوریتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

دور حاضر میں برطانیہ کی تمام جنگوں کی طرح جنگ بوئر میں بھی ابتداءً انگریزوں کو شکستوں سے سابقہ پڑا۔ ان کے پاس فوج کافی نہ تھی کہ ان باعزم آدمیوں کو دبایا جا سکتا جو گھروں سے باہر کی زندگی میں تربیت پا چکے تھے اور اپنی سرزمینوں میں لڑ رہے تھے۔ اہل مغرب کی رائے عامہ بوئروں کے ساتھ تھی۔ برطانیہ میں بھی بہت سے لبرل اور مزدور جنگ کے سخت مخالف تھے۔ مگر جنگ نے طول کھینچا تو برطانیہ کی بے پناہ قوت غالب آئی۔ ۱۹۰۰ء کے وسط تک برطانیہ میدان میں کامیاب ہو چکا تھا، مگر بوئروں کے چھاپہ مار دستوں کو مسخر کرنے میں مزید اٹھارہ مہینے صرف ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں ویری نجنگ[4] کا معاہدہ ہوا۔ بوئروں نے برطانیہ کی حکومت تسلیم کر لی۔ انگریزوں نے وعدہ کر لیا کہ آگے چل کر انھیں خود اختیاری حکومت دے دی جائے گی۔ یہ وعدہ جلد پورا کر دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں جنوبی افریقہ کی وفاقی یونین بن گئی جو دو بوئر جمہوریتوں، کیپ کالونی اور نٹال پر مشتمل تھی۔ اس میں مرکزی حکومت صوبوں سے زیادہ قوی تھی۔ انگریزی اور افریقائی — جنوبی افریقہ کے ولندیزیوں کو ان کی بولی میں یہی کہا جاتا تھا — کو یکساں سرکاری زبانیں

۱۔ Rand

۲۔ Jameson

۳۔ Kruger

تسلیم کر لیا گیا۔

عالمی جنگ کے آغاز پر جنوبی افریقہ برطانیہ کا ڈومینین تھا، جسے داخلی خودمختاری حاصل تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ انگریزوں اور بوئروں نے اپنا طویل جھگڑا ختم کر لیا ہے اور وہ مغرب کی ایک نئی بیرونی چوکی کے قیام میں تعاون کے لیے تیار ہیں، لیکن اس وقت بھی خطرناک نشان موجود تھے۔ بوئروں پر انگریزیت کا رنگ نہیں چڑھا تھا اور وہ اس وقت تک بھی اساساً شرکائے سلطنت کے مخالف تھے۔ یہ دونوں یورپی عنصر مل کر بھی غیر یورپی آبادی کے مقابلے میں کم تھے۔ غیر یورپی آبادی میں سیاہ فام دیسی باشندے، مشرقی ہندوستانی (جو ترکِ وطن کر کے خصوصیت سے نٹال میں آباد ہوئے تھے) اور دوسرے مِلی جُلی نسل کے افراد تھے۔ یونین قائم ہو جانے کے بعد بھی جو خوشگوار دور شروع ہوا، اس میں موجودہ پریشانیوں کے عناصر جنوبی افریقہ میں نظر آ رہے تھے۔

مصر

افریقہ کے دوسرے سرے پر برطانیہ نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مصر کو فرانسیسیوں سے لے لیا، جو برائے نام زوال پذیر عثمانی سلطنت کی ایک باجگزار مملکت تھا۔ فرانسیسی اثر وہاں اٹھارہویں صدی ہی میں خاصا بڑھ گیا تھا، نپولین کی مہم نے اس میں اضافہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانسیسیوں کا ثقافتی و تہذیبی اثر آج تک مصر کے بالائی طبقے اور اہل علم و نظر میں باقی ہے۔ فرانسیسیوں کی نگرانی میں ایک نجی کمپنی بنی تھی، جس کے زیرِ نگرانی نہر سویز ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان تیار ہوئی۔ بحیرۂ روم، بحیرۂ قلزم سے مل گیا۔ اس طرح یورپ سے ہندوستان اور مشرق بعید کا راستہ ہزاروں میل کم ہو گیا۔ برطانیہ فرانسیسی سرپرستی میں اس نہر کی تعمیر کا سخت مخالف رہا تھا، مگر اب یہ نہر مکمل ہو چکی تھی، اسے برطانوی سلطنت کے رشتۂ حیات میں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

چنانچہ برطانیہ نے مصر کو سنبھال لیا، ساتھ ہی نہر اس کے پاس آ گئی۔ یہ کام رفتہ رفتہ نہایت خوش اسلوبی سے پورا ہوا۔ جب نازک موقعے آتے رہے تو قوت کے استعمال کی دھمکی دی جاتی رہی، لیکن قوت وسیع پیمانے پر کبھی استعمال نہ کی گئی۔ اس سلسلے میں فیصلہ کن قدم یہ تھا کہ حکومت برطانیہ نے ڈزرائیلی کی سرکردگی میں سویز کمپنی کے ایک لاکھ چھہتر ہزار حصے خرید لیے۔ یہ حصے خدیو مصر کو کمپنی کے منصوبے پر راضی ہو جانے اور تعمیر نہر میں تعاون کرنے کی قیمت کے طور پر دیئے گئے تھے۔ خدیو بڑا مسرف اور کوتاہ اندیش شخص تھا۔ ۱۸۷۵ء تک وہ یورپی ساہوکاروں کے قبضے میں جکڑا گیا اور یہ حصے اس نے اچھی قیمت پر فروخت کر دیئے۔ یوں نہر سویز کے سب سے زیادہ حصے برطانیہ کے قبضے میں آ گئے۔

پہلی عالمی جنگ کے آغاز تک برطانیہ مصر پر قوتِ برترہ کی حیثیت میں حکمران رہا۔ بیشک خدیو اور اس کی حکومت موجود تھے اور کاغذات میں مصر کو ایک جداگانہ مملکت دکھایا جاتا تھا، مگر ایک برطانوی ریذیڈنٹ پورا ضبط و نظم

قائم رکھنے کے لیے موجود تھا، خصوصاً معاملاتِ خارجہ میں ایک برطانوی نظام کا نام عام اصطلاح میں پروٹیکٹوریٹ (زیرِ حمایت) تھا، جس میں مصر کو دورِ حاضر کے نظم و نسق پر لانے کے لیے بہت کچھ کیا گیا۔ تاہم مصر کے عوام کا معیارِ معیشت یورپی عوام کے پیمانے کے مطابق نہ بڑھا۔ دریائے نیل پر بہ مقام اسوان ایک بڑا بند ۱۹۰۲ء میں مکمل ہوا۔ یہ امورِ عامہ کے ان کارناموں میں سے پہلا تھا، جس نے ملک کی مجموعی صلاحیتِ پیداوار میں اضافہ کیا۔ صحتِ عامہ سدھر گئی، شرحِ اموات گھٹ گئی اور طبقۂ اوسط کی تعداد و خوشحالی بڑھ گئی۔ دورِ حاضر کے پیمانے پر لانے کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وسیع خواندگی کی ابتدا ہو گئی اور اس تعلیم یافتہ طبقے میں اضافہ ہو گیا، جو تحریر و تقریر کے ذریعے سے معاش حاصل کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ برطانیہ سے نفرت کرنے لگے اور قوم پرستی کی تحریک بڑھتی گئی، جس کا نعرہ یہ تھا کہ "مصر اہلِ مصر کے لیے ہے"۔ ہمیں اس طبقے سے آئندہ بھی سابقہ پڑے گا۔

باقی برطانوی افریقہ

جنوبی افریقہ اور مصر کے درمیان برطانیہ نے انیسویں صدی میں افریقہ کے اور بھی بڑے بڑے ٹکڑے ہتھیا لیے، یہاں تک کہ آخر میں برِ اعظم کا سب سے بڑا حصہ برطانیہ ہی کے قبضے میں آیا۔ افریقہ کا پورا رقبہ ایک کروڑ دس لاکھ مربع میل تھا۔ اس میں سے چالیس لاکھ مربع میل برطانیہ کی تحویل میں آیا، مگر آبادی کے اعداد پر نظر ڈالی جائے تو برِ اعظم کے دس کروڑ باشندوں میں سے چھ کروڑ دس لاکھ برطانیہ کے ماتحت تھے۔ ان مقبوضات کی فہرست تیار کرنا بے کیف اور ناقابلِ فہم ہو گا۔ انیسویں صدی کی کوئی بھی اٹلس سامنے رکھ لی جائے تو ان تمام مقبوضات پر سرخ رنگ پھرا ہوا نظر آئے گا اور اواخر عہدِ وکٹوریہ میں ڈاک کے ایک خاص ٹکٹ پر بھی یہ نقشہ چھاپا گیا تھا۔ ان نو آبادیوں کی ایک اچھی مثال نائیجیریا ہے، جہاں عظیم الشان انگریز ناظم سر فریڈرک (بعد ازاں لارڈ) لگارڈ[۱] نے افریقہ کے منطقہ حارہ میں نو آبادیوں کی حکومت کا ایک خاص برطانوی نظام مدون کر لیا، جو "بالواسطہ حکمرانی" کے نام سے مشہور ہوا۔

مغربی افریقہ کی ابتدائی نو آبادیوں میں سے نائیجیریا کی نو آبادی اور زیرِ حمایت علاقہ ۱۹۱۴ء میں اکٹھے کیے گئے۔ یہ سب علاقے دریائے نائیجیریا کے آس پاس تھے۔ یونانی اس دریا کے صرف شمالی حصے سے مبہم طریق پر آگاہ تھے، جو صحرا کے کنارے واقع تھا اور ان کا عقیدہ بظاہر یہ تھا کہ یہ دریائے نیل میں گرتا ہے، حالانکہ یہ خلیج گنی کے مقام پر اوقیانوس میں گرتا ہے۔ شمالی نائیجیریا پر فولانی نسل کے مسلمان امیر حکمران تھے، جن کی تہذیب و ثقافت محکوم حبشیوں سے برتر و اعلیٰ تھی۔ جنوبی نائیجیریا میں بہت سے بُت پرست قبائل آباد تھے، جن پر اکثر بردہ فروشوں کی یورشیں ہوتی رہیں۔ برطانیہ نے پہلے فولانی حکمرانوں کو قوت سے مسخر کیا۔ یہ عمل انیسویں صدی میں پایۂ تکمیل

---

۱ Logard

کو پہنچا۔

پھر انھوں نے ایک فرانسیسی مدبر کے قول کے مطابق نظام نہیں ایک طریقہ استعمال کیا، جسے آگے چل کر بالواسطہ حکمرانی" کہنے لگے، یعنی امیروں اور رئیسوں کی ان کی جداگانہ حکومتوں کو قائم رکھا گیا۔ داخلی رزم و پیکار کی ممانعت کردی گئی۔ غلامی موقوف ہوگئی اور ایسے ہی دوسرے قوانین اوپر سے نافذ کر دیئے گئے۔ ایک برطانوی ریزیڈنٹ تمام ممتاز رئیسوں کی حکمرانی کا نگران تھا۔ اس کے ماتحت اضلاع میں ریزیڈنٹ (آگے چل کر کمشنر) مقرر تھے، جو مقامی علاقوں کے کام کی دیکھ بھال کرتے، تاہم دیسی قانون، دیسی مذہب، دیسی روایات پوری احتیاط سے بحال رکھی گئیں، البتہ وہ چیزیں بدلنی پڑیں، جو مغربی معیار نظم و نسق کے صریح خلاف تھیں۔ برطانوی افسروں کی تعداد ہمیشہ کم رہی۔ لگارڈ نے ۱۹۰۳ء میں شکایت کی کہ میرے پاس ہر چار لاکھ دیسی باشندوں کے لیے بالاوسط ایک انگریز منتظم ہے، تاہم ان مٹھی بھر سامراجی افسروں نے امن قائم رکھا۔ آہستہ آہستہ — اور بعض بے صبر مثالیت پسندوں کے نقطۂ نگاہ سے بہت آہستہ آہستہ ریلیں اور سڑکیں بن گئیں۔ زراعت کی اصلاح ہوئی۔ تجارت اور تعلیم پھیلنے لگیں۔ یہ چیزیں مغربی تمدن کی خارجی علامتیں تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پہلے افریقی حبشی طلبہ برطانوی یونیورسٹیوں میں پہنچنے لگے۔

غور کیا جائے تو حکمرانی کا یہ طریقہ دیسی باشندوں کے لیے مغربی تہذیب کے اعلیٰ مادی و روحانی فوائد مہیا کر دیتا اور صدیوں سے وہ جس طریق پر نشو و ترقی پاتے رہے تھے، اس پر کوئی ضرب نہ لگتی، یعنی انھیں خواہ مخواہ یورپی بنانے کی کوشش نہ کی جاتی۔ عملی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹۱۴ء تک مادی ترقی نمایاں حیثیت اختیار کر گئی۔ قدیم طور طریقوں کی جگہ دورِ حاضر کے طور طریقے کہیں کہیں بروے کار آگئے۔ پڑھے لکھے حبشی اپنے لاکھوں ہم جنسوں سے لیاقت و قابلیت میں بہت آگے نکل گئے۔ لگارڈ کا کارنامہ یقیناً بڑا تھا۔ اس نے ایک کتاب مرتب کی تھی، جس کا نام تھا، "برطانوی افریقہ میں دوگونہ انقلاب"[1]۔ اس میں سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اقتباس اس روح کو سامنے لاتا ہے، جو اس کے طریق کار میں محرک رہی، خصوصاً اس سے مسیحی مشنریوں کے الزام کی حقیقت واضح ہوتی ہے، جو کہتے تھے کہ اس نے ہماری سرگرمیوں پر ناواجب پابندیاں عائد کر دیں:-

> "بشپ ٹگویل[2] نے مغربی افریقہ میں مدت تک بڑی سرگرمی سے کام کیا، مگر اس کی سرگرمیاں ساحلی علاقے اور اس سے ملے ہوئے اندرونی علاقے تک محدود رہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "بالواسطہ حکمرانی" دراصل براہِ راست حکمرانی ہے، البتہ

---

[1] The Dual Mandate in British Tropical Africa

[2] Tugwell

اس میں بالواسطہ وسائل سے کام لیا جاتا ہے۔ امیر کی حیثیت اور اس کا مشاہرہ محفوظ ہے۔ اس کی حکومت کو برطانوی اقتدار کی پشتیبانی سے مطلق العنان بنا دیا گیا ہے۔ لوگ اس کے یا حکومت برطانیہ کے غلام بن گئے ہیں۔ یوں ان کی زندگی اختراع یا خواہش ترقی ـــــ ذہنی، عمرانی، اخلاقی، مذہبی یا سیاسی ـــــ سے عاری ہو چکی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ امیر حکومت مقرر کرتی ہے۔ وہ ریذیڈنٹ کا آلۂ کار ہے اور مسیح کا نام نہیں لینا چاہیے، مبادا اس مہمل نظام کا تختہ الٹ جائے...... بشپ ٹگویل نادانستہ معاملے کے ایک پہلو کی نامکمل تصویر پیش کرتا ہے، جس پر میں بحث کر چکا ہوں۔ یقیناً یہ امر اضطراب و پریشانی کا باعث تھا کہ حکومت برطانیہ دیسی حکمرانی اور دیسی عدالتوں کے اقتدار کی حمایت کرتی ہوئی کسی نہ کسی حد تک بعض نامناسب چیزوں کی ذمہ داری قبول کرے گی، جنھیں ضبط و نظم میں لانے کے لیے اس کے پاس بہت کم برطانوی افسر موجود ہیں۔ کسی ایسی تنظیم کو تہس نہس کرنا جس پر، کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، ایک ایسی حماقت ہوگی، جس کا ارتکاب کوئی ہوشمند منتظم نہیں کر سکتا۔ پھر نظام ایسا، جس پر صدیوں سے رضامندی کی مہر لگی ہوئی ہو، لوگ اسے مانتے ہوئے ہوں اور اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی نظام پیدا نہ کیا جائے، بلکہ ہمیں اسلامی طریقوں یا مقامی قوانین و مراسم کے متعلق صحیح علم نہ ہو۔ عجلت سے احتراز کی ضرورت اور یہ علم کہ اصلاح وہی مؤثر ہو سکتی ہے، جسے دیسی باشندوں کا تعاون حاصل ہو اور اس میں تدریج پیش نظر رکھی جائے۔ ان حالات میں ہماری ذمہ داری زیادہ سے زیادہ گراں بار بنا دی تھی یہ نتیجہ نکالنا کہ ہمیں حقیقت کا احساس نہ تھا یا ہم نے اسے ایک معمولی چیز سمجھا، دراصل شمالی نائیجیریا کی ابتدائی حکومت کے محکمہ نظم و نسق سے صریح بے انصافی ہے....

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

"اس برطانوی حکومت کی جگہ، جس میں رئیس حکومت کے محض کارندے ہیں، برطانیہ کے ضبط و نظم اور رہنمائی میں ایک دیسی نظام حکومت ـــــ خواہ وہ ترقی یافتہ گروہ ہوں یا پسماندہ ـــــ کا اصل مقصد تعلیمی ہے۔ پسماندہ قبائل میں رئیسوں کو یہ سیکھنا ہے کہ اقتدار کیونکر قائم رکھا جاتا ہے اور کیونکر اس سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر ذمہ داری کا ایک سلسلہ قائم کر دیا جائے، جو دیہات تک جا پہنچے۔ ترقی یافتہ

قبیلوں میں مدعا یہ ہے کہ تعلیم پھیلے، جنگلات کی حفاظت ہو۔ حفظانِ صحت کے انتظامات بہتر ہو جائیں۔ بیماریاں رُک جائیں۔ رفاہی کام ترقی کریں۔ کوشش دونوں جگہ یہی ہوگی کہ قومیت کا زوال روکا جائے۔ سب کچھ مقامی اصول کے مطابق ہو۔ یہ اصول ذہن نشین کر دیئے کہ حکمران کا اصل وظیفہ عوام کی بہبود ہے، نہ کہ ذاتی عیش و راحت کے لیے ان سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔

سب سے آخر میں یہ کہ حکومت و رعایا دونوں میں ترقی اور زندگی سے دلچسپی کا جذبہ پیدا کرنا[1]

دوسرے برطانوی دائرے

امریکی براعظموں میں برطانیہ نے بحیرۂ کریبیا کے اندر اپنی نوآبادیاں قائم رکھیں، — جو برمودا[2] اور بہاماز[3] کے علاوہ برطانوی ہنڈوراس[4] اور برطانوی گائنا میں تھیں۔ ان علاقوں کو بھی خود اختیاری حکومت کے کچھ حقوق مختلف قانون ساز مجالس کے ذریعے سے دے دیئے گئے، اگرچہ انھیں کینیڈا اور آسٹریلیا کے نمونوں کی کامل خود اختیاری حکومت نہ مل سکی۔ یہ علاقے منطقۂ حارہ میں واقع تھے یا نیم گرم تھے۔ وہاں کھیتی باڑی کرانے والا طبقہ نسبتہً چھوٹا تھا۔ حبشیوں یا ملے جُلے طبقات زیریں کی تعداد زیادہ تھی کہ ان مزرعوں میں زیادہ تر گنا پیدا ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں معتدل خطوں کے اندر چقندر کی کاشت شروع ہوگئی، جس سے چینی بنائی جاتی تھی۔ نیز ان خطوں کی آبادی بہت بڑھ گئی، جس کے لیے وسائل ناکافی تھے۔ ۱۹۱۴ء تک برطانیہ کا جو علاقہ غرب الہند میں واقع تھا، وہ ایک اہم مسئلہ بن چکا تھا۔

بحرالکاہل اور جنوبی و مشرقی ایشیا میں برطانیہ نے انیسویں صدی کے اندر اپنے سلطنت کے نقشے پر نئے سرخ نشانوں کا اضافہ کرلیا، خصوصاً ملایا میں اس نے ربڑ اور ٹین کی صنعتوں کو بڑی ترقی دی اور پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ دونوں چیزیں برطانیہ کے اقتصادیات میں بڑے عامل بن گئیں۔ برطانیہ نے مغربی تجارت کے لئے چین کے دروازے کھولنے میں بھی اہم کردار ادا کیا، یعنی معاہدے کے مطابق مختلف بندرگاہوں میں مراعات حاصل کرلی گئیں اور حلقہ ہائے اثر قائم کرلیے گئے۔ چین غیر ملکیوں سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ برطانیہ نے اس خواہش کو ناکام بنانے بڑا قدم اٹھایا۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے وہ جنگ کی، جسے عداوۃً مگر غیر منصفانہ طریق پر نہیں، "جنگِ افیون" کہا گیا۔ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ چین افیون کی تجارت پر ضبط و نظم قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس میں برطانی تاجروں کا بڑا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں معاہدہ نانکنگ کے مطابق ہانگ کانگ حاصل کرلیا۔ نیز پانچ بندرگاہیں تجارت کے لیے کھلوالیں، جن میں کانٹن اور شنگھائی بھی شامل تھیں۔

---

[1] نگارڈ کی کتاب ص ۲۲۳-۲۲۴، ۲۲۸-۲۲۹

[2] Bermuda

[3] Bahamas

[4] Honduras

صدی کے آخر تک برطانیہ کا حصہ چین کی تجارت میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہانگ کانگ پر اسے براہ راست تصرف حاصل تھا، پھر وہ شنگھائی کی بین الاقوامی بندرگاہ سے بھی پورا فائدہ اٹھاتا تھا اور وہ دائی ہے وائی[1] کے بحری مرکز کا اجارہ بھی لے لیا تھا۔ یہ پورٹ آرتھر کا بدلا تھا جس کا اجارہ روسیوں کو مل گیا تھا۔

ہندوستان:۔ سیاسی تنظیم چین کے اندر برطانیہ بہر حال اُن بڑی طاقتوں میں سے ایک تھا، جو اس گھنی آبادی کے ملک میں سلطنت کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ ہندوستان میں برطانیہ نے ۱۷۶۳ء میں فرانس پر فتح حاصل کی، جس کی توثیق ۱۸۱۵ء کی فتح میں ہوگئی اور اسے ایشیا کے اس برصغیر پر کامل اقتدار حاصل ہو گیا۔ فرانسیسیوں اور پرتگیزوں کے جو چھوٹے چھوٹے علاقے رہ گئے تھے، ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ہندوستان سمندر کے پار برطانوی مقبوضات میں سب سے زیادہ دولتمند تھا۔ یہ سلطنت کا مرکز اور نشان تھا، جیساکہ ڈزرائیل نے ۱۸۷۶ء میں ملکۂ وکٹوریہ کے لیے قیصرۂ ہند کا اعلان کرتے وقت سمجھا تھا۔

۱۷۶۳ء میں بھی ہندوستان ایک بڑا اور آزاد ملک تھا، مگر یورپی مفہوم کے مطابق ایک قوم نہ تھا۔ یہ نسلوں اور مذہبوں کا ایک وسیع مجموعہ تھا، جس میں حد درجہ پڑھے لکھے اور فلسفی برہمنوں سے حد درجہ قدیم قبائلی تک ــــ جو ابھی حجری عہد سے بھی باہر نہیں نکلے تھے ــــ شامل تھے۔ انیسویں صدی شروع ہوئی تو برطانوی ضبط و نظم کے دو طریقے بروئے کار آگئے۔ نہایت زرخیز اور آباد خطے، جو کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے شہروں کے ارد گرد واقع تھے، نیز پنجاب براہ راست برطانوی حکومت کے ماتحت تھے[2]۔ برطانوی حکومت نے براہ راست ان کا الحاق نہ کیا، بلکہ پہلے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جائداد کے طور پر زیر انتظام رہے۔ یہ ایک کمپنی تھی، جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شاہی فرمان کی بنا پر تجارت اور حکومت کا کام چلاتی رہی۔ اس کمپنی کی رہنمائی دورِ عروج میں کلائو اور وارن ہیسٹنگز جیسے سلطنت گر کرتے رہے۔ انھوں نے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا اور مقتدر قوت کی حیثیت میں وہ معاہدے کرتے رہے۔ ہیسٹنگز کے خلاف شدید جرائم اور غلط روش کی بنا پر اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مشہور مقدمہ چلا، لیکن جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا، انگریز اس پر قابض رہے۔

انیسویں صدی میں کمپنی کو اکثر علمائے اقتصادیات اور سیاسی مفکرین ایک ایسی نامناسب چیز سمجھتے تھے، جو دل کے لیے اذیت رساں تھی، لہٰذا لندن کی مرکزی حکومت کی وزارت ہند نے رفتہ رفتہ برطانوی ہند کا نظم و نسق اور حقیقی اقتدار خود سنبھال لیا۔ کمپنی کا تجارتی اجارہ مدت سے ختم کیا جا رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں دیسی سپاہیوں کی فوج نے بغاوت

---

[1] Wei-hai-wei

[2] (مترجم) پنجاب پر ۱۸۴۹ء میں برطانیہ کا قبضہ ہوا، یعنی انیسویں صدی کے وسط میں، اسے انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی مقبوضہ قرار دینا غلط ہے۔

کی۔ بڑی بڑی بغاوتوں کی طرح یہ بغاوت بھی متعدد اسباب کا نتیجہ تھی۔ بنیادی سبب یہ تھا کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری قوموں کے سپاہیوں کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ برطانوی طور طریقے ان پر نافذ کیے جا رہے ہیں اور خود ان کے طور طریقے تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اس کی تہ میں چپ چاپ پروپیگنڈا جاری تھا۔ مسلمان سپاہیوں کو بتایا گیا کہ رنفیلڈ رائفل کے جن کارتوسوں کو دانتوں سے توڑنا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ ان پر سؤر کی چربی لگی ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک سؤر حرام تھا۔ ہندو سپاہیوں کو بتایا گیا کہ یہ کارتوس گائے کی چربی سے ملائم کیے جاتے ہیں۔ انھیں گائے کی چربی سے سخت احتراز تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی جانور کی چربی ضرور استعمال کی جاتی تھی۔ یہ برطانوی حکمرانوں کی بے حسی کی ایک عمدہ شہادت ہے[1]۔ سپاہیوں کی بغاوت دبا دی گئی، لیکن اس سے پیشتر بہت سے یورپی قتل ہوئے اور برطانیہ کو سخت فوجی کوشش کرنی پڑی۔ یہی بغاوت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے کا باعث بن گئی۔ ۱۸۵۸ء میں تاج برطانیہ نے کمپنی کے مقبوضات سنبھال لیے اور اس کے واجبات بھی قبول کر لیے۔ ساتھ ہی اعلان ہو گیا کہ اب ہندوستان میں نئے الحاق کی ضرورت نہیں۔

باقی ہندوستان —— بہ اعتبار رقبہ تقریباً ایک تہائی اور بہ اعتبار آبادی $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{5}$ —— کو جاگیردارانہ یا دیسی ریاستیں کہنے لگے یہ برائے نام رؤسا کے ماتحت رہیں۔ ان میں حیدرآباد یا گائکواڑ بڑودہ جیسے حد درجہ دولت مند فرمانروا بھی تھے اور معمولی قسم کے مقامی رئیس بھی۔ دیسی ریاستوں میں کاروبار حکومت برطانوی ریزیڈنٹوں کے زیر نگرانی تھا۔ اس کی حیثیت ایسے ہی نظام کی تھی جس کا ذکر نائیجیریا میں ہم کر چکے ہیں۔ وزارت ہند نے جانشینی کے معاملات میں دخل دیتے وقت کبھی تامل نہ کیا۔ رؤسا کے بعض افعال روک دیئے گئے۔ بعض اوقات ضروری سمجھا گیا تو تھوڑی مدت کے لیے انتظام خود سنبھال لیا۔ دیسی ریاستوں نے ہندوستان کی مفصل تاریخ میں بڑے دلچسپ پہلو پیدا کیے، مگر ہندوستان کے تعلق میں بالواسطہ اور بلا واسطہ حکمرانی کا امتیاز عملاً کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

ہندوستان: شرق و غرب کا ملاپ

ہندوستان میں ۱۷۶۳ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیانی سال اس شے کا ایک لطف انگیز ریکارڈ پیش کرتے ہیں، جسے فلسفۂ تاریخ کا ماہر آرنلڈ ٹائنبی تمدنوں کے درمیان ربط ضبط قرار دیتا ہے۔ جو شخص مغرب اور باقی دنیا کے درمیان تعلقات کے بڑے معاصر مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے —— یا واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ سفید فام اور سیاہ فام لوگوں کے درمیان تعلقات کو ٹھیک

---

[1] اب ثابت ہو چکا ہے کہ ان کارتوسوں کے لیے سؤر اور گائے دونوں کی چربی استعمال ہوتی تھی۔ اگرچہ چربی لگانے والوں کا مقصد کسی کا مذہب بگاڑنا نہ تھا، تاہم انگریز افسروں کی بے حسی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔

ٹھیک ذہن نشین کرنا چاہتا ہے ـــــ اس کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ ہندوستان کے برصغیر میں شرق وغرب کے درمیان اس بڑے ملاپ کے متعلق جو کچھ بھی مل سکے اس کا مطالعہ کرے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بہت سے مادی پہلوؤں کا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ "سٹیٹسمین" کے سالنامے میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۶۴ء میں ہندوستان کی آبادی تقریباً تیرہ کروڑ ساٹھ لاکھ اور ۱۹۰۴ء کے اختتام پر یہ آبادی تیس کروڑ پر پہنچ گئی[1]۔ بیشک آخری اعداد میں برما اور بعض دوسرے علاقوں کی آبادی شامل ہے، جو پہلے اعداد میں شامل نہ تھی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے اندر ہندوستان کی آبادی نے نمایاں ترقی کی۔ ۱۹۰۱ء میں پندرہ کروڑ کی آبادی میں سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ مرد کوئی نہ کوئی زبان پڑھ سکتے تھے۔ دس میں سے ایک نوشت وخواند کا اہل تھا۔ یقیناً مغربی معیار کے مطابق خواندگی کی یہ شرح بہت پست ہے، لیکن معاصر ایشیائی معیار کے مطابق یہ شرح خاصی بلند ہے[2]۔ ہندوستانی معاشرے کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کی خواندگی کا تناسب بہت کم تھا یعنی ڈیڑھ سو میں سے صرف ایک عورت پڑھ لکھ سکتی تھی[3]۔

اس قسم کے اعداد وافر مقدار میں موجود ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اندر پہلی عالمی جنگ کے آغاز پر ہزاروں میل ریل کی سڑکیں اور تار برقی کی لائنیں موجود تھیں۔ یونیورسٹیاں بن گئی تھیں، جن میں دیسی اقلیت کو بہ زبان انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہسپتال اور کارخانے موجود تھے۔ بڑی بڑی بندرگاہیں تھیں، جن میں ہر وقت سامان اور سواریاں چڑھتی اترتی رہتی تھیں، لیکن پوری آبادی کا تناسب پیش نظر رکھا جائے تو ہندوستان کو یہ فوائد اس درجے پر حاصل نہ تھے، جو غریب سے غریب یورپی ملکوں کو حاصل تھے۔ اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف حکمران دیسی طبقہ تھا، جو حد درجہ امیر تھا، دوسری طرف کسانوں کا وسیع طبقہ تھا، جو اسی درجے پر زندگی بسر کرتا تھا، جس پر اس کے اجداد بسر کرتے رہے تھے، یعنی بمشکل قوتِ لایموت حاصل کر سکتا تھا۔ طبقۂ اوسط ابھی پیدا ہو رہا تھا اور یہ کیفیت ان تمام غیر یورپی سرزمینوں میں موجود تھی، جن میں یورپی دخیل ہو چکے تھے۔ تجارت، انجینئری اور صنعت میں عہدوں کے لیے اتنے امیدوار نہ تھے، جتنے اس طبقے کے لیے نظر آتے تھے۔

---

[1] (مترجم) آبادی کی یہ افزائش برطانوی حکمرانی کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ طبعی افزائش کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۶۴ء میں دنیا بھر کی آبادی ایک ارب بھی نہ تھی، آج تین ارب کے قریب ہے۔ یہ دنیا میں برطانوی حکمرانی کا نتیجہ نہیں۔ خود برطانیہ کی آبادی ۱۸۶۴ء میں اتنی نہ تھی جتنی ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔

[2] (مترجم) خواندگی کا یہ تناسب انگریزوں کے ماتحت تھا اور یہ انگریزی حکمرانی کا نتیجہ تھا۔ اس سے پیشتر ہر خطے، ہر علاقے، اور ہر مقام پر تعلیم کے لیے اوقاف یا جاگیریں یا معافیاں موجود تھیں جن کی وجہ سے ملک بھر میں خواندگی اعلیٰ پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔ انگریزوں نے یہ اوقاف اور معافیاں چھین لیں۔ پورا سابقہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے جو نظام تعلیم جاری کیا (باقی اگلے صفحہ پر)

برطانوی حکومت کے ماتحت ڈیڑھ صدی میں ہندوستان کی مجموعی دولت یقیناً بڑھی اور ۱۹۱۴ء میں یہ دولت بمقابلہ ۱۷۲۳ء آبادی کے زیادہ وسیع رقبے کے اندر پھیل چکی تھی۔ صرف وہ علاقے مستثنیٰ تھے، جو قدیم زمانے کی حالت پر قائم تھے۔ ہندوستان سے براہ راست دولت کے برطانیہ جانے کی مقدار نسبتاً گھٹتی گئی۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے جن انگریزوں کو "نباب[1]" کہا جاتا تھا، وہ ہندوستان میں دولت جمع کرتے، پھر واپس وطن پہنچ کر مزے اڑاتے۔ بعض اوقات انگلستان میں انہیں "امیر" کا منصب مل جاتا تھا، لیکن یہ صورت حال انیسویں صدی میں ختم ہو چکی تھی۔ انگلستان و ہندوستان کے اقتصادی تعلقات زیادہ سے زیادہ تجارتی شکل اختیار کرتے گئے۔ یہ تعلقات ویسے ہی تھے، جیسے صنعتی اور مالی اعتبار سے ترقی یافتہ برطانوی معاشرے اور ہندوستان کے معاشرے میں ہونے چاہییں تھے، جو صرف خام جنسیں پیدا کرتا تھا۔ اس تجارت میں ہندوستان کے باشندے زیادہ سے زیادہ حصہ لیتے رہے، اگرچہ ان کی حیثیت دلالوں کی سی تھی۔ صدی کے اواخر میں دیسی صنعتیں (خصوصاً پارچہ بافی کی صنعت) فروغ پذیر ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر برطانوی سرمایہ لگایا گیا تھا۔

اس صدی کے دوران میں انگریزوں کی خاصی بڑی تعداد جو لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی — ہندوستانی اقتصادیات کے سہارے گزارہ کر رہی تھی۔ ان میں سے بعض نجی کاروبار کرتے تھے۔ زیادہ بڑی تعداد فوجی اور ملکی کارکنوں کی تھی۔ آخری طبقے کا تعلق مشہور ہندوستانی سول سروس سے تھا، جو ملکی انتظام کی ذمہ دار تھی، لیکن دیسی باشندے بھی بڑی ذمہ داری کے عہدے حاصل کرنے لگے تھے اور ان میں وہ عہدے بھی شامل تھے، جن کا تعلق پالیسی بنانے سے تھا۔

ہندوستان کے انگریز حکمران طبقے کے متعلق ایک اہم حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے۔ یہ لوگ اس طرح ہندوستان میں آباد نہ ہوئے، جس طرح انگریز اور سکاٹ دورِ حاضر کے اوائل میں آئرلینڈ جا کر آباد ہو گئے تھے۔ برطانیہ — یہاں انگلستان نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ سکاٹوں نے سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرح ہندوستان میں اہم کردار ادا کیا — کو ہمیشہ "گھر" سمجھا جاتا رہا، یعنی وہ مقام، جہاں انسان زندگی کے آخری دن گزارتا ہے۔ اگرچہ بیٹے باپوں کی جگہ ہندوستانی فوج اور سول سروس میں عہدے حاصل کرتے رہے، بلکہ کاروبار میں بھی حصہ لیتے رہے، لیکن یہ صاحب لوگ ہندوستان کی زندگی کا پوری طرح جزو نہ بنے۔ مادی فضا کی جگہ غالباً روحانی فضا — بڑی رکاوٹ تھی۔ یہاں مدراس کے ایک انگریز کا خط پیش کیا جاتا ہے، جو ۱۸۳۷ء میں لکھا گیا۔

(بقیہ صفحہ ۵۴۷) وہ صرف سرکاری ملازمتوں کے مطابق تھا اور اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے، جو ملازمتوں کے خواہاں تھے۔

[3] اس بحث کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ اصل اعداد محل نظر ہیں۔ مردم شماری کا کوئی افسر عددوں کی شرح خواندگی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ (سلسلہ حوالہ ۵۴۷ ختم)

[1] Nabole یہ ایک کتاب ہے، جو ابتدائی دور کے انگریزوں کی نوابی زندگی کے متعلق ایک انگریز نے لکھی تھی۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اکثر انگریز عورتیں دیسیوں کے عجیب غریب طور طریقوں سے کس قدر کم دلچسپی رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان طور طریقوں کی عادی ہو چکی ہیں، بلکہ جو کچھ ان کے گرد و پیش ہو رہا تھا، اس پر پہلے بھی ان کی توجہ زیادہ نہ تھی، جتنی اب ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ اپنے ابتدائی تاثرات بھول چکی ہیں، مگر اس سے میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اپنی مشرقیت کی تازگی کے دوران میں جو کچھ دیکھ سکتا ہوں، دیکھ لوں، یعنی اس میں افسردگی اور بیدلی پیدا ہونے سے پہلے پہلے سب کچھ جان لوں۔ آخر افسردگی اور بیدلی ضرور پیدا ہوگی۔

میں نے ایک انگریز عورت سے پوچھا کہ آپ جب سے ہندوستان آئیں ملک اور باشندوں کے متعلق کیا کچھ دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا:۔ خدا کا شکر ہے، کچھ بھی نہیں دیکھا۔ مجھے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور معلوم کرنا بھی نہیں چاہتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان کے متعلق جتنا کم دیکھوں اور جانوں، اتنا ہی بہتر ہوگا۔[1]"

دیسی باشندے بھی مشرق و مغرب کے درمیان خلا اتنا بڑا سمجھتے ہیں، جسے پاٹنا ممکن نہیں۔ ایک اور انگریز عورت نے ۱۹۱۳ء میں لکھا:۔

"میں نے گھر آتے ہوئے ایک دیسی کو کوئلوں کی آگ پر کھانا پکاتے دیکھا، میں پاس سے گزری تو اس نے برتن سے تمام چیزیں نکال کر باہر پھینک دیں۔ میں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ آپ کا سایہ میرے برتن پر پڑ گیا تھا اور چیزیں ناپاک ہو گئیں۔[2]"

تاہم ہندوستان کی زندگی کی اقتصادی بنیاد بلند کرنا بڑی حد تک انگریزوں کا کام تھا۔ وہ عموماً بڑے تکبر اور بے حسی کا اظہار کرتے تھے، اور دیسی باشندوں سے تعلق میں سفید فام لوگوں کے طریقِ عمل کا بدترین نمونہ ثابت ہوتے تھے مگر اصولاً وہ بڑے لبرل تھے۔ دل سے چاہتے تھے کہ ان لوگوں کی حالت بہتر ہو جائے، جو ان کی تحویل میں ہیں۔ یہ ایسے آدمی تھے، جو دیسیوں کو سمجھنے کے لیے مخلصانہ طریق پر کوشاں تھے۔ ان لوگوں کے کام کا مرقع مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہو سکتا ہے۔ یہ ایک سپاس نامہ تھا، جو مقامی باشندوں نے انگریز کلکٹر کی رخصت کے وقت اس کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا:۔

---

[1] بلٹن برلٹون کی مرتبہ کتاب The Sahibs (صاحب لوگ) ص ۲۲۵

[2] ایضاً۔

" جن جن ذاتوں کے لوگ اس کے پاس پہنچتے تھے ان کی شکایات کی تلافی ہو جاتی تھی۔ نہ ذات پات کا کوئی امتیاز تھا نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ وہ غریبوں کا ہاتھ پکڑ لیتا تو انھیں دولت مند بنا دیتا۔ عوام اس کے زیرِ حفاظت خوش تھے اور راحت سے بستر پر سوتے تھے۔ جب وہ باغ کی نگرانی کرتا تو ہر باغبان اپنا فرض خوش اسلوبی سے انجام دیتا۔ باغ کے تمام درخت تر و تازہ اور پھولتے پھلتے نظر آتے۔ اس کا انصاف اس کمال پر پہنچا ہوا تھا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے اور وہ عموماً بکری کے بچے کو شیر کے منہ سے چھڑا لیتا۔ اس ملک میں ایسی کسی منصف حکومت سے آگاہ نہیں، جو انگریزوں جیسی ہو۔ افسوس ہمارا سرپرست ہمیں چھوڑ گیا تو ہم بیوہ کی طرح غیر مطمئن رہیں گے۔ ہم اسی طرح روئیں گے، جس طرح ماں اور باپ کے مرنے پر روتے ہیں۔ اے خدا ہم پر رحم فرما اور اسے ہمارے سروں پر قائم رکھ۔"[۱]

---

[۱] ایضاً ص ۲۲۳-۲۲۴ (مترجم) یہ پوری تحریر کسی مقدم یا نمبردار یا پٹیل یا کسی چھوٹے عہدے دار کی تیار کرائی ہوئی ہے۔ ایسی تحریروں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا اور ان کا نقل کرنا ایک ایسا فعل ہے جو کسی ذمہ دار مورخ سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

چھیالیسواں باب

دوسری سلطنتیں

فرانسیسی سلطنت : ۔ شمالی افریقہ

برطانیہ نے دوسری صد سالہ جنگ میں جو فتح حاصل کی، اس کا آخری اور سب سے شاندار واقعہ ۱۸۱۵ء میں نپولین کی شکست ہے، جس نے فرانس کو اس کی سابقہ سلطنت کے اکثر حصوں سے محروم کر دیا۔ صرف غیر معروف سے اجزاء باقی رہ گئے۔ تاہم انیسویں صدی میں ایک نئی سامراجی سلطنت قائم کر لی، جو رقبے میں صرف برطانیہ سے دوسرے درجے پر تھی۔ اگرچہ فرانس کی حکومت میں اکثر انقلابی تبدیلیاں پیش آئیں، لیکن اس کی سامراجی پالیسی اس پیمانے پر جاری رہی کہ ۱۸۳۴ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان کوئی پینتیس لاکھ مربع میل علاقے زیر جھنڈے کے تحت آ گئے اور آبادی کی تعداد پانچ کروڑ تھی۔ تقریباً سب لوگ غیر یورپی تھے۔ رقبے کے اعداد ایک حد تک غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پندرہ لاکھ مربع میل علاقہ صحرائے اعظم پر مشتمل ہے، جہاں اصلاً کوئی بھی آبادی نہیں۔

اس دوسری فرانسیسی سامراجی سلطنت کا بہت کم حصہ یورپی آبادکاری کے لیے موزوں تھا۔ اس میں سے فرانسیسی شمالی افریقہ ہی کو بڑی حد تک مستثنیٰ سمجھا جا سکتا ہے، جس میں ٹیونس، الجزائر اور مراکش شامل تھے۔ افریقیہ اور ماری ٹانیا[1] کے صوبوں کی حیثیت میں یہ علاقے رومی سلطنت کے زرخیز حصے تھے۔ جب سے فرانس نے ان پر قبضہ کیا، وہ مادی خوشحالی کے زیادہ اونچے درجے پر پہنچ گئے، جو تقریباً اٹھارہ سو سال سے انھیں حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان سرزمینوں کی آب و ہوا بحیرۂ روم کی مخصوص آب و ہوا ہے اور ان میں زیادہ تر بربر اور عرب آباد ہیں، جن کا مذہب اسلام ہے اگرچہ مجموعی دیسی آبادی حکومت فرانس کے ماتحت خاصی بڑھ گئی ہے، مگر ساتھ ساتھ دس لاکھ سے زیادہ یورپی آبادکار بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے اکثریت فرانسیسیوں کی تھی، مگر اطالویوں اور ہسپانویوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ ان آبادکاروں نے دیسی باشندوں سے بھی زمین لے لی، اگرچہ ساتھ ساتھ آبپاشی کے منصوبوں اور دوسری اصلاحات سے قابل کاشت رقبے میں اضافہ کر دیا۔

---

[1] Mauratenia ماری ٹانیا پورے مراکش اور اس کے جنوبی ساحلی علاقے کو کہتے تھے جس طرح افریقیہ اس علاقے کو کہتے تھے، جو مصر سے مراکش تک پھیلا ہوا تھا۔ اسلام کے ابتدائی زمانے تک یہ نام رائج تھے پھر پورے براعظم کا نام افریقہ پڑ گیا۔

شمالی افریقہ میں فرانسیسی قوت کے نشو و ارتقا کی واقعاتی تاریخ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ۱۸۲۴ء میں فرانسیسیوں نے الجزائری قزاقوں کے خلاف تعزیری مہموں کے سلسلے میں قدمگاہ حاصل کی۔ یہی قزاق تھے، جو طرابلسی ہم مشربوں کے ساتھ مل کر جہازوں پر چھاپا مارتے تھے اور ۱۸۰۱ء میں ان کے خلاف ریاستہائے متحدہ امریکہ کو جنگ کرنی پڑی۔ پھر فرانسیسی الجزائر میں اپنا اقتدار بڑھاتے رہے۔ اسی طرح پورے الجزائر پر قبضہ کرلیا۔ پھر مشرقی جانب ٹیونس کو اپنی حمایت میں لے لیا (۱۸۸۱ء کے بعد) اور موجودہ صدی کے اوائل میں مغربی جانب مراکش میں بھی یہی صورت پیدا کرلی۔ برطانیہ نے فرانس کو مصر سے بے تعلقی کے بدلے میں مراکش کے اندر ہر کاروائی کی آزادی دے دی۔

الجزائر اور ٹیونس میں فرانسیسیوں نے اہل یورپ کی آبادکاری پر بہ طور خاص آمادہ کرلیا، مگر اس امر کا خیال رکھا کہ دیسی آبادی میں مخالفت پیدا نہ ہو۔ اس پالیسی کو "طریق جذب" قرار دیا، جو برطانیہ کی بالواسطہ حکمرانی نیز "دور رہو" کی پالیسی سے مختلف تھی۔ فرانسیسیوں کو امید تھی کہ اسی طرح اہل افریقہ کو اپنے تمدن میں جذب کرلیں گے۔ اسی طرح انھیں اٹھارہویں صدی کے دور تنویر کے عمدہ تربیت یافتہ اور اس جمہوریت کے اچھے شہری بنالیں گے، جو ۱۷۸۹ء کے اصول پر قائم ہوئی تھی۔ اس طرح انھیں دس کروڑ فرانسیسیوں کی ایک سلطنت پیدا کرلینے کی توقع تھی، جس میں سے نصف لوگ سمندر پار رہتے تھے اور دیسی باشندوں کے وسیع ذخیرے سے عساکر جمہوریت مرتب کرلینے کے خواہاں تھے۔

فوجی اعتبار سے جذب کی پالیسی ایک حد تک فرانسیسیوں کی خواہش کے مطابق چلی، تاہم جذب بہ حیثیت عمومی مشکل ثابت ہوا اور اس میں صرف جزوی کامیابی حاصل ہوسکی۔ فرانسیسیوں کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ اپنی ثقافت پھیلاتے جائیں، اور انھوں نے دیسی حکمران طبقوں کو حیرت انگیز حد تک اپنے اندر جذب کرلیا۔ تیسری جمہوریت کے تحت انھوں نے الجزائر کو سیاسی اعتبار سے فرانس کا حصہ بنالیا اور اس کے تین صوبے بنا دیے، ساتھ ہی ایوان مندوبین میں الجزائری نمائندے شامل کرلیے، البتہ حق رائے صرف ان دیسی باشندوں کو ملا، جو یورپی وضع قطع اختیار کرچکے تھے۔ یورپی آبادکار بھی حق رائے سے مستفید ہوئے، مگر دوسری غیر یورپی استعماری دنیا کی طرح یہاں بھی زبردست قومی تحریکیں اٹھیں جنھوں نے کامل علیحدگی کو اپنا نصب العین بنالیا[1]۔

مراکش میں بھی قومی تحریک نمودار ہوئی، اگرچہ وہاں فرانسیسیوں نے کسی حد تک مختلف طریقہ اختیار کیا۔ انھوں

---

[1] (مترجم) ظاہر ہے کہ یہ تحریکیں آزادی کے لیے اٹھیں اور فرانس نے لیپ پوت کی جو کوشش کی تھی، اس کا تعلق صرف محدود حلقے تک تھا اور الجزائر کو جزو فرانس بنانا بھی ایک سامراجی چال تھی اور اب الجزائر کاملاً آزاد ہوچکا ہے۔

نے ملک کو فرانسیسی کاروباری آدمیوں اور بین الاقوامی سیاحوں کے لیے کھول دیا۔ اس میں جزواً کامیابی ہوئی اور ترک جذب کا اعتراف کیے بغیر وہ طریقہ اختیار کرلیا، جو برطانیہ کے بالواسطہ طریق حکمرانی سے ملتا جلتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک قابل مستعمراتی ناظم مارشل لیوتی[1] نے پرشورش مراکش کی تنظیم شروع کی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ بعض کلیدی مرکزوں میں دیسی باشندوں کے ساتھ محکم عملی روابط قائم کرکے باقی مراکش کو چھوڑ دیا اور امید یہ رکھی کہ قیام امن کا یہ طریقہ اسی طرح پورے مراکش میں پھیل جائے گا، جس طرح تیل پانی کی سطح پر پھیل جاتا ہے۔ سلطان اور اس کے جاگیردار نائب اپنے پرانے طور طریقوں کے مطابق قائم رکھے گئے۔[2]

فرانسیسی استوائی افریقہ

۱۸۱۵ء میں برطانیہ نے مغربی افریقہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی چوکیاں، جو دریائے سینیگال کے دہانے پر واقع تھیں، فرانس کے حوالے کردیں۔ ساتھ ہی جزیرہ مڈغاسکر اسے دے دیا، جو افریقہ کے مشرقی ساحل سے ہٹا ہوا واقع تھا اور سترھویں صدی میں فرانس کو وہاں معمولی سی قدمگاہ ملی تھی۔ ۱۹۱۴ء تک فرانس افریقہ کی تقسیم میں بہت کامیاب رہا۔ غالباً اس کا اصل راز یہ تھا کہ برطانیہ جرمنی کی توسیع کے بجائے فرانسیسی توسیع کو ترجیح دیتا تھا، خصوصاً ۱۸۷۰ء کے بعد۔ غرض ۱۹۱۴ء تک فرانس کے زیر تصرف تین کروڑ نوے لاکھ مربع میل افریقہ میں تھے اور اتنی ہی اس کی اپنی آبادی تھی۔

شمالی افریقہ کے سوا یہ پوری آبادی حبشیوں پر مشتمل تھی، جن کی مادی ثقافت اساساً حجری دور سے آگے نہیں بڑھی تھی اور جن پر نہ اسلام کا کوئی پرتو پڑا تھا، نہ مسیحیت کا۔ صرف بعض ساحلی شہروں کو چھوڑ کر، جہاں انتظام اور کاروبار اعلیٰ پیمانے پر پہنچا ہوا تھا، فرانس نے ۱۹۱۴ء تک ان وسیع علاقوں کے جذب یعنی مغربی رنگ میں رنگنے کے لیے کوئی کامیاب قدم نہیں اٹھایا تھا۔ انھوں نے مشترکہ کمپنیاں بناکر افریقی سرزمینوں کے اقتصادی نشوونما کی جتنی کوششیں کیں، سب بُری طرح ناکام رہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ فرانس نے ان افریقی نوآبادیوں پر اتنی رقمیں خرچ کیں، جتنی اسے حاصل نہ ہوسکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انیسویں صدی میں سامراج کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاتی رہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ نوآبادیاں مادر وطن کے لیے مالی اعتبار سے بے سود ہیں اور فرانس کی افریقی نوآبادیوں کو اس سلسلے کی ایک عمدہ مثال سمجھا جاتا تھا۔ ایک ماہر اقتصادیات ــــ یہ ایک انگریز تھا اور بظاہر ان چیزوں سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، جن سے فرانسیسی متاثر ہوتے تھے ــــ ۱۸۹۲ء میں اس نتیجے پر پہنچا کہ نوآبادیوں کے ساتھ تجارت سے فرانس کو سولہ کروڑ فرینک نفع

---

[1] Lyautey

[2] مراکش مدت ہوئی آزادی حاصل کرچکا ہے۔

ہوا اور ان نوآبادیوں پر کل خرچ ستّرہ کروڑ چالیس لاکھ فرینک تھا۔ ۱۹۱۵ء کے لیے اس کا پیش کردہ اندازہ اور بھی حوصلہ شکن تھا۔[1] لیکن یہ اعداد بڑی طاقتوں کو سامراجی کوششوں سے باز نہ رکھ سکے۔ بظاہر تاریخ کی اقتصادی تعبیر اپنی سادہ شکل میں ــــ یہ تصور کہ سیاسی شخصیتیں اقتصادی نفع و نقصان کے بہی کھاتے کے مطابق چلتی ہیں ــــ انیسویں صدی کے سامراج کے سلسلے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اگرچہ فرانس کی استوائی افریقہ والی نوآبادیاں ۱۹۱۴ء تک مادی حالات کے اعتبار سے بھی دورِ حاضر کے پیمانے پر نہ لائی جا سکیں، تاہم ہر جگہ نئے انتظامات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جہاں کہیں ترنگا جھنڈا پہنچا، ساتھ ہی طب، حفظانِ صحت، دورِ حاضر کے وسائل حمل و نقل، صنعت، زراعت اور رسمی تعلیم دیسی باشندوں کے کم از کم ایک طبقے تک ضرور پہنچ گئے۔ جذب کی پالیسی کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے فرانسیسی انگریزوں کے خلاف یہ دعویٰ ضرور کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی نسلی تعصب نہیں اور سیاہ فام لوگوں کے مساوی برتاؤ کے لیے ہم تیار ہیں۔ یہ فرق اس انگریز مصنف نے بھی واضح کیا ہے، جس کے اعداد ہم ابھی پیش کر چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے!

"بیشک یہ درست ہے کہ فرانسیسی بھی دیسی باشندوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں آزادی دے دیتے ہیں کہ جو چاہیں، پیدا کریں، حقیقتہً فرانسیسی انگریزوں کے مقابلے میں دیسی باشندوں کے ساتھ اچھے رفیق کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انگریز زیادہ تر الگ تھلگ رہتے ہیں۔ مگر یہ زیادہ جمہوری جذبہ دیسی باشندوں میں زیادہ اعتماد پیدا نہیں کر سکا۔ سبب خواہ کچھ ہو، مگر انگریز دیسیوں میں زیادہ اعتماد پیدا کر سکا ہے اور اسی سے اس نظام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس پر وہ کاربند ہوا۔"[2]

اگرچہ فرانسیسیوں کا دعویٰ رواداری ایک حد تک درست ہے، لیکن عمل قول کے مطابق ثابت نہیں ہوا۔ فرانسیسیوں نے افریقہ میں حبشیوں سے شادی نہیں کی۔ نسلی مساوات کا یہ واضح ترین معیار ہے۔ اگرچہ حبشی کتنے ہی تعلیم یافتہ ہوں، مگر وہ فوجی یا ملکی سرگرمیوں میں سفید فام فرانسیسیوں پر شاذ ہی حاکم مقرر کیے گئے ہوں گے۔ فرانس کے اندر اور افریقہ میں جب حبشی ایک مرتبہ پوری طرح زیرِ اقتدار آ گئے تو فرانسیسیوں نے حبشیوں کے فنون اور عوامی طور طریقوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ طریقہ اس پالیسی سے ملتا جلتا تھا، جو لگارڈ نے نائیجیریا میں اختیار کی تھی۔ انگریز بھی خصوصاً ماضی قریب میں جذب کی پالیسی کی طرف راغب ہوئے۔ جو افریقی حبشی برطانوی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں، وہ محض عمدہ انگریزی لب و لہجہ کے علاوہ بھی

---

[1] فرانس کی سامراجی طالع آزمائی، ص ۱۲۲۔

[2] فرانس کی سامراجی طالع آزمائی، ص ۱۹۳۔

زیادہ برطانویت ساتھ لے جاتے ہیں، لیکن برطانوی اور فرانسیسی پالیسیوں میں تفاوت مکمل نہیں۔

فرانسیسی ایشیا

ایشیا میں فرانسیسیوں نے انیسویں صدی کے اندر وہ علاقے لے لیے، جنھیں فرانسیسی ہند چینی کہا گیا۔ ان میں دو خطے ایسے تھے، جہاں بکثرت چاول پیدا ہوتے تھے۔ ایک شمال میں ہنوئی کے اردگرد، دوسرا جنوب میں سیگون کے اردگرد۔ یہاں وہ لوگ آباد تھے جو تمدنی اور ایک حد تک نسلی اعتبار سے چینیوں کے ساتھ وابستہ تھے اور ان حصوں میں وہ لوگ بھی رہتے تھے، جو پہاڑوں اور جنگلوں سے ڈھنپے ہوئے علاقوں میں رہتے تھے۔ ان کا تمدن بالکل قدیم زمانے کا تھا۔ یہاں فرانسیسیوں کو ویسا ہی تجربہ ہوا، جیسا جنوبی و مشرقی ایشیا میں دوسرے سامراجی تجربے ہو چکے تھے۔ اگرچہ اینگلو سیکسن لوگوں نے یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ فرانسیسیوں کی روش ہند چینی میں بہت بُری تھی، یہاں تک کہ وہ جاوا میں ولندیزوں اور ملایا میں انگریزوں کی روش سے بھی بدتر تھی۔ یہاں بھی مادی ترقی ہوئی، اگرچہ رفتار سست تھی اور اگرچہ عوام کے افلاس کا بنیادی مسئلہ لاینحل رہا۔ تعلیم یافتہ دیسی باشندوں میں — جنھیں اپنے تصور کے مطابق دفاتر سے کم منصب ملے تھے اور استحقاق سے کم اختیار حاصل ہوا تھا — قومی تحریکیں پیدا ہوئیں، جن کی قوت سال بہ سال بڑھتی رہی۔ فرانس نے بھی ہند چینی کے مرکز سے چین پر ضبط و نظم کی کشمکش میں حصہ لیا۔ فرانس کا حلقہ اثر جنوبی چین تک تھا، خصوصاً صوبۂ یونن[۱] میں، جو ہند چینی سے متصل ہے۔ ۱۸۹۸ء میں فرانس کو معمول کے مطابق ایک بندرگاہ مع مراعات کا اجارہ ننانوے سال کے لیے مل گیا، یعنی خلیج کوانگ چو[۲] میں۔

جرمن

دوسری طاقتوں کے استعماری تصرفات کا صرف اختصاراً ذکر کیا جائے گا۔ جرمنی اور اٹلی سامراجی کشمکش میں بہت بعد شامل ہوئے، کیونکہ ان کا قومی اتحاد بعد میں ہوا۔ تاہم وہ بڑی طاقتیں تھیں اور انھوں نے بھی نوآبادیاں لے لیں، جو معزز حیثیت پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ جرمنی کے پاس ۱۹۱۴ء میں استوائی اور نیم استوائی افریقہ میں تین بڑے علاقے تھے — کامرونز، جرمن جنوبی و مغربی افریقہ اور جرمن مشرقی افریقہ۔ ایک چھوٹا سا علاقہ ٹوگولینڈ کا تھا، جو دس لاکھ مربع میل کے لگ بھگ تھا۔ افریقہ میں جرمنوں کا کارنامہ دوسری یورپی طاقتوں سے مختلف نہ تھا۔ اخلاقی یا اقتصادی اعتبار سے وہ نہ بہتر تھا، نہ بدتر۔ بحرالکاہل میں جرمنی نے بعض چھوٹے چھوٹے جزیرے لے لیے اور ایک بڑا علاقہ جزیرہ نیوگنی میں حاصل کر لیا۔ چین کی تقسیم میں بھی جرمنی نے حصہ لینے کی کوشش کی۔ اسے ننانوے سال کا اجارہ خلیج کیاؤ چاؤ[۳] میں ملا۔

۱؎ Yunan

۲؎ Kwangchau Bay

۳؎ Kiaochow

جرمنوں نے نوآبادیوں کے لیے جو کوشش کی، وہ بڑی منظم تھی۔ ایک گروہ اس غرض سے قائم ہوگیا تھا جس نے دورِ حاضر کے پروپیگنڈے کی تمام ضروری چیزیں پیدا کرلی تھیں۔ بسمارک کو نوآبادیوں کے وقار کا چنداں خیال نہ تھا، لیکن آخر اسے بھی افریقی طالع آزمائی پر راضی ہونا پڑا۔ اس کے جانشینوں نے قدم آگے بڑھا لیا۔ ولیم دوم کے جرمنی کو سامراجی توسیع کے نہایت خطرناک دائروں میں قدم رکھنا پڑا، یعنی مشرق قریب۔ پہلی عالمی جنگ کے آغاز پر جرمن برلین سے بغداد تک ریلوے لائن کا منصوبہ پورا کر رہے تھے اور ترکوں کی سرپرستی میں برطانیہ کی جگہ جرمنوں نے لے لی تھی۔

اٹلی اور بلجیم

اٹلی بڑی طاقتوں میں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ اسے افریقہ کی تقسیم میں بھی بہت کم حصہ ملا۔ اٹلی کی نگاہیں ٹیونس پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے فرانس نے سنبھال لیا۔ پھر اٹلی نے بڑی سامراجی کوشش ان افریقی سرزمینوں میں کی، جو بحیرۂ قلزم کے جنوبی سرے پر واقع تھیں، مگر وہاں ۱۸۹۶ء میں اہلِ حبشہ کے مینیلک نے زیرِ سرکردگی اطالویوں کو شکستِ فاش دی۔ لہٰذا اٹلی کو ایریٹریا اور سومالی لینڈ کے چند ہزار مربع میل صحرائی علاقے پر قناعت کرنی پڑی۔ پھر طرابلس پر قبضہ کرلیا جو برائے نام ترکوں کے ماتحت تھا لیکن اٹلی کی انھیں کوششوں کے ماتحت ۱۹۱۲ء میں ترکی اور اٹلی کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ دراصل یہی پہلی عالمی جنگ کا آغاز تھا۔ اطالویوں کے پاس بہت کم علاقے تھے، اس لیے ان کی کامیابی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

بلجیم خود بہت چھوٹا تھا۔ شاہ لیوپولڈ دوم (۱۸۶۵ء – ۱۹۰۹ء) نے طالع آزمائی سے کام لے کر استوائی افریقہ میں ایک وسیع رقبہ حاصل کرلیا۔ اس منصوبے کی ابتدا کانگو فری سٹیٹ سے ہوئی اور ابتدا میں یورپی تہذیبی مشن امداد باہمی کے اصول پر افریقہ میں بھیجنے کے نہایت ولولہ انگیز مقاصد بیان کیے گئے۔ ان سب کا انجام یہ ہوا کہ ۱۹۰۸ء میں کانگو کو بلجیم کی نوآبادی بنا لیا گیا۔ انیسویں صدی میں ہر طرف سے لعن طعن شروع ہوئی کہ کانگو میں جبراً مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے اور دیسی باشندوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس طرح دنیا کی توجہ لیوپولڈ کے تجربے کی طرف منعطف ہوئی اور لبرلوں کو سامراج کی مخالفت کے لیے ایک اور دلیل مل گئی، لیکن اہلِ بلجیم نے کانگو پر قبضہ قائم رکھا،[1] اگرچہ لیوپولڈ کی پالیسی تبدیل کرلی گئی۔

امریکہ

امریکہ بھی صدی کے اواخر میں بڑی طاقتوں کے ساتھ شامل ہوگیا اور اس نے سمندر پار علاقے لے لیے۔ اس سے بے شمار امریکیوں کو غصہ اور رنج ہوا، بعض لوگ خوش بھی ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیہ سے اس کی مختصر سی جنگ ہوئی۔ اس کا فوری سبب یہ ہوا کہ ہوانا[2] (کیوبا) کی بندرگاہ میں امریکی جنگی جہاز مین[3] پر اسرار طریق پر غرق ہوگیا۔ امریکہ

---

[1] (مترجم) اب کانگو آزاد ہوچکا ہے۔

[2] Havana

[3] Maine

جنگ میں کامیاب ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برِ اعظم امریکہ میں ہسپانوی سلطنت کے جو باقیات رہ گئے تھے، یعنی بحیرۂ کریبیا کا جزیرہ، کیوبا اور جزیرہ پورٹوریکو[1]، وہ امریکہ کے قبضے میں آ گئے۔ ساتھ ہی مجمع الجزائر فلپینز امریکہ نے لے لیا، جو ساحلِ ایشیا سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ اس اثناء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے بحرالکاہل میں ہوائی (۱۸۹۸ء) اور جزائر ساموآ[2] کا ایک حصہ (۱۸۹۹ء) لے لیا۔ پھر ۱۹۰۲ء میں امریکہ نے پاناما میں انقلاب کی حمایت کی، جو اس وقت کولمبیا کا حصہ تھا اور نئی جمہوریت کی آزادی کا یقین دلا دیا، البتہ مجوزہ نہر پاناما کا علاقہ امریکہ نے اپنے قبضے میں رکھا۔

امریکہ نے کیوبا چھوڑ دیا اور وہاں آزاد جمہوریت قائم ہو گئی، البتہ اس کی صورت ایسی ہی تھی جس سے غیر ملکیوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا امریکہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔ باقی علاقے امریکہ نے کچھ مدت کے لیے اپنے پاس رکھے۔ فلپینز میں وہاں کے اصل باشندوں کی مسلح بغاوت بہ زور فرو کرنی پڑی، جو فوری آزادی کے طلبگار تھے۔ امریکہ میں جو لوگ سامراج کے مخالف تھے، انھوں نے اس غیر مناسب انتظام کو ختم کر دینے کی کوشش کی، کیونکہ امریکی دستور کے مطابق اقتدار حاصل کیے بغیر کسی سرزمین کو ماتحت نہیں رکھا جا سکتا تھا، لیکن سپریم کورٹ نے فیصلہ کر دیا کہ امریکہ مختلف علاقے ریاستہائے متحدہ میں شامل کیے بغیر زیرِ اثر رکھ سکتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد امریکہ نے فلپینز کے اصل باشندوں کو آزادی کے لیے تربیت دینی شروع کی لیکن یہ ریاستہائے متحدہ کی سلطنت تھی اور نقشے پر ان علاقوں کو بھی امریکی مقبوضات ہی ظاہر کیا جاتا تھا۔

جاپان

عالمی جنگ سے پیشتر کے دس سال میں ایک اور سلطنت بن رہی تھی۔ یہ واحد سلطنت تھی، جو غیر یورپی قوم نے پیدا کی یعنی جاپانیوں نے۔ جاپانیوں کے لیے سامراج کا راستہ ریاستہائے متحدہ کے ایک بحری بیڑے نے صاف کیا۔ جس کا کماندار کموڈر میتھیو پیری[3] تھا۔ وہ خلیج ٹوکیو میں پہنچ گیا (۱۸۵۳ء) اور دھمکی دی کہ اگر جاپانیوں نے مغربیوں کے ساتھ تجارت کی اجازت نہ دی تو قوت استعمال کی جائے گی۔ اس طرح وہ علیحدگی ختم ہوئی، جو جاپان نے دو سو سال سے اختیار کر رکھی تھی۔ ساتھ ہی جاپان نے تیزی سے دورِ حاضر کی طاقت بن جانے کے لیے تگ و دو شروع کر دی، لیکن پیری کے اقدام سے جو نتائج برآمد ہوئے، ان کے متعلق زیادہ مبالغہ آمیزی سے کام نہ لینا چاہیئے۔ ۱۸۵۳ء سے پیشتر جاپان کی علیحدگی مکمل نہ تھی اور اس کے بعد دورِ حاضر کے مغربی طریقے کاملاً اختیار نہ کیے گئے۔ علیحدگی کے دوران میں بھی جاپان نے مغربی نشو و ارتقاء سے گہری دلچسپی قائم رکھی تھی، خصوصاً فنکاری میں اور مغرب سے کتابوں کی درآمد بھی جاری رہی۔ اس کا واسطہ ولندیزوں کا وہ تجارتی مرکز تھا، جو ناگاساکی میں جاپان کی اجازت سے قائم ہوا تھا۔

---

1. Portirico
2. Samoan Islands
3. Mathew Perry

زیادہ اہم امر یہ تھا کہ ۱۸۵۳ء میں جاپان کا سیاسی و اقتصادی ڈھانچہ ردّ و بدل کا محتاج ہو چکا تھا۔ جاگیردارانہ وضع کے تھوڑے سے آدمی ملک پر حکمران تھے۔ مگر حکومت کی بے اثری، جمع محاصل پر تصرف اور اقتصادی بدحالی کے باعث یہ نظام بہت غیر ہر دلعزیز تھا۔ بے چینی بڑھ رہی تھی، خصوصاً دو اہم عمرانی طبقوں میں ایک شہروں کے تاجر اور دستکار، جن کا تعلق طبقۂ اوسط سے تھا۔ اگرچہ جاپان میں صنعتی انقلاب نہ ہوا، لیکن ملک میں بڑے بڑے شہر بن گئے تھے، خصوصاً ٹوکیو جس کا نام اس وقت یدو[1] یا ایڈو تھا۔ طبقۂ اوسط کے یہ شہری اپنی روز افزوں اقتصادی قوت کے مطابق سیاسی حقوق چاہتے تھے یعنی ان کی کیفیت وہی تھی، جو ۱۷۸۹ء کے انقلاب سے پیشتر فرانسیسی بورژوا کی تھی۔ دوسرے غیر مطمئن طبقے کو یورپ کے غریب شرفاء اور کمتر درجے کے امیروں سے مشابہ قرار دینا چاہیے۔ یہ سموراے[2] یا جاگیردار کہلاتے تھے — یہ ابتداء میں جنگجو تھے۔ اب افلاس ان کے سر پر منڈلا رہا تھا اور سیاسی اعتبار سے یہ گرے جا رہے تھے۔ سمورائے کو شہری آبادیوں کے بڑھنے سے خوف تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح زراعت اور مالکان اراضی کا روایتی اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ ان میں سے اکثر اس امر پر بھی ناراض تھے کہ زیادہ بڑے امیر اور مالکان اراضی انھیں اقتدار کے عہدوں سے بڑی حد تک باہر رکھ رہے ہیں۔ کسی بیرونی مغربی ثمر سے کہیں بڑھ کر اس عمرانی دباؤ نے جاپان کو دورِ حاضر کی وضع اختیار کر لینے پر مجبور کر دیا۔

اقتصادی اعتبار سے صورت حال تیزی کے ساتھ بدل گئی۔ ۱۹۱۴ء تک جاپان اکثر کسی ترقی یافتہ مغربی ملک سے مشابہ تھا۔ وہاں ریل کی سڑکیں بن گئی تھیں۔ تجارتی جہازوں کے بیڑے موجود تھے۔ پارچہ بافی کی صنعت ترقی کر گئی تھی۔ بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی کاروباری فرمیں وجود میں آ گئی تھیں۔ اگرچہ جاپان کے پاس اکثر خام مال کی رسد کم تھی، تاہم اس نے صنعت کاری میں حیرت انگیز ترقی کی۔ اسے بہت سے اہم فوائد حاصل تھے۔ نقشے پر ایک نظر ڈال لی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایشیا کے تعلق میں جاپان کو جغرافیائی اعتبار سے وہی حیثیت حاصل تھی، جو یورپ کے تعلق میں برطانوی جزائر کو حاصل تھی۔ جاپان کو بھی برآمد کے لیے قریب ہی برّاعظم پر منڈیاں مل گئیں اور جو کچھ اسے حاصل ہوتا رہا اس سے درآمد کی قیمت ادا کی جاتی تھی۔ جاپان کا طبقۂ اوسط بڑا حوصلہ مند تھا۔ سمورائے میں سے بھی اس میں خاصے آدمی شامل ہو گئے۔ اس طرح کاروبار میں اس کے لیے رہنمائی کا اچھا بندوبست ہو گیا۔ کسانوں سے ارزاں مزدور بہ کثرت مل سکتے تھے۔ یہ لوگ بڑے اطاعت گزار تھے۔ جو لوگ اپنے کھیتوں سے باہر نکل کر مزدوری کرتے تھے، ان کا درجۂ بود و ماند بڑا پست تھا۔ وہ کارخانوں میں زیادہ دیر تک اور زیادہ سخت محنت کرنے کے لیے تیار تھے۔ مغربیوں کو ان کی اجرت بہت کم معلوم ہوتی تھی۔

---

[1] Yedo or Edo

[2] Samurai

سیاسی اعتبار سے جاپان کے اندر انیسویں صدی کے آواخر میں بہ ظاہر ایک بڑا انقلاب ہوا اور وہاں کی حکومت مغربی اصول پر آگئی، مگر حقیقتاً یہ کوئی بڑا انقلاب نہ تھا، جیسا کہ معلوم ہوتا تھا۔ یقیناً ایک انقلاب ہوا جس کی ابتدا ۱۸۶۸ء سے ہوئی۔ غیر مطمئن عناصر کے دباؤ نے پرانے جاگیرداری نظام کو درہم برہم کر ڈالا۔ ساتھ ہی وقار و اقتدار شہنشاہ کے قبضے میں چلا گیا۔ مدت سے لوگ اس منصب کو بڑی حد تک فراموش کر چکے تھے اور بادشاہوں کو بالکل ایک بیکار عنصر سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں شہنشاہ نے اپنی رعایا کو ایک دستور عنایت کیا جس میں پارلیمنٹ کے دو ایوان رکھے، ایک ایوانِ امراء اور دوسرا ایوان مندوبین۔

لیکن ان تغیرات کے بانی جمہوریت پرور نہ تھے۔ وہ طبقۂ امراء اور اقتدار دوست نوجوان سمورائے تھے، جن کی پشتیبانی کاروباری دنیا کے حلیف کر رہے تھے۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ جاپان کو اپنی مرضی کے مطابق بنا کر دم لیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی حکومت عدیدہ کی جگہ نئی حکومت عدیدہ نے لے لی یعنی امراء کا ایک چھوٹا سا گروہ شہنشاہ اور مملکت پر حاوی تھا۔ ۱۸۸۹ء کے دستور نے سلطنت جرمنی کے دستور کی طرح صرف بظاہر آزاد پارلیمانی حکومت کا انتظام کیا۔ وزارت پارلیمنٹ کے روبرو نہیں، شہنشاہ کے روبرو جوابدہ تھی۔ گویا وہ مقتدر امراء کی مرضی کے مطابق چلتی تھی۔ پارلیمنٹ بھی شاذ ہی نمائندہ تھی۔ ایوان زیریں کے ممبروں کے لیے ووٹ دینے کا حق بہت محدود رکھا گیا تھا۔ اس میں طبقۂ اوسط شامل تھا۔ لیکن کسان اور صنعتی مزدور شامل نہ تھے۔ جاپانی احوال و ظروف کے متعلق ایک انگریز ماہر سر جارج سینسم[1] نے ٹھیک کہا تھا کہ جاپان کو "مغربی چیزیں" قبول کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی، مگر "مغربی افکار" سے کام لیتے وقت بڑی مشکلات سے سابقہ پڑا۔

مغرب سے سلطنت کا خیال لے لینے میں جاپانیوں کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ جاپان کی آبادی زیادہ تھی اور برابر بڑھ رہی تھی۔ وہاں قابل کاشت زمین کم تھی۔ طبعی وسائل بہت محدود تھے۔ ان حالات میں ایک اقتدار جو اور اقتصادی اعتبار سے پھیلتی ہوئی مملکت کی پالیسی بنانے والوں کو سامراج طبعاً بہت موزوں معلوم ہوا۔ ۱۸۶۸ء کے انقلاب کے بعد جاپانیوں نے بہت جلد دورِ حاضر کی بری اور بحری فوج تیار کر لی۔ ان کا پہلا ہدف چین تھا۔ جسے ۱۸۹۴-۹۵ء کی جنگ چین و جاپان میں شکست دی گئی۔ اس جنگ میں جاپان نے چین سے دو علاقے لے لیے، ایک جزیرہ فارموسا، دوسرا برّاعظم ایشیا کا ایک ٹکڑا کوریا کے الحاق کا ابتدائی مرقع تھا۔ ادھر روس بھی کوریا پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس رقابت کا نتیجہ جاپان و روس کی جنگ کی شکل میں سامنے آیا۔ (۱۹۰۴-۵ء)۔ اس میں بھی جاپان نے بڑی فتح حاصل کی اور کوریا میں اسے پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں کوریا کو جاپان کا جزو بنا لیا گیا۔ چین کے صوبۂ منچوریا میں خاص مراعات لے لی گئیں اور

---

[1] Sansom

روس نے جزیرہ سکھالین کا نصف حصہ جنوبی جاپان کو دے دیا۔ سکھالین جاپان کے شمال میں تھا۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک سلطنت جاپان تیزی سے اقتصادی نشو و ارتقاء میں مصروف تھی جس کے ذمہ دار جزائر کے تارکین وطن تھے۔ فارموسا اور کوریا کے باشندوں میں نئے آقاؤں نے سختی کا برتاؤ کیا تو مشرق بعید میں بعد کی مشکلات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ اسی طرح جاپان نے چین کو ہتھیا لینے کا ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شاندار کامیابیاں پے در پے ہو چکی تھیں، انھوں نے جاپانیوں کے سر میں غرور کی ہوا بھر دی۔

سینتالیسواں باب

سامراج پر مباحثہ

تمہید

انیسویں صدی میں مغربی یورپ کے تمام ممالک کے اندر رائے عامہ کو وسیع آزادی حاصل تھی اور پارلیمانی حکومت کی کوئی نہ کوئی وضع ضرور موجود تھی، جہاں تمام مسائل پر بحث وتمحیص ہوتی تھی، یہاں تک کہ جرمنی جیسی بادشاہی حکومتیں بھی مستثنیٰ نہ تھیں، لہٰذا جس توسیع کو ہم سامراج قرار دیتے ہیں، اس کے دفاع کے لیے پورا اہتمام کرنا پڑتا تھا، کیونکہ اس پر پورے اہتمام سے اعتراضات کیے جاتے تھے۔ اعتراض و دفاع دونوں ہمارے عہد کی ذہنی تاریخ کا اہم حصہ ہیں، کیونکہ یہ بحث اب تک بھی جاری ہے، حالانکہ ہم بیسویں صدی کے وسط میں پہنچ گئے ہیں اور حالات بالکل بدل گئے۔

عمرانی ڈارونیت پر مبنی دلائل

ان میں سے دفاع کے لیے ایک مرکزی دلیل وہ ہے، جو عمرانی ڈارونیت سے اخذ کی گئی۔ دلیل یہ تھی کہ اہل یورپ خود یورپ میں، نیز نوآبادیوں میں غیر یورپیوں پر جنگی غلبہ حاصل کر سکے۔ محض اسی حقیقت سے واضح ہو گیا کہ ارتقاء اور پیشرفت کے نقطۂ نگاہ سے وہ غیر یورپیوں کے مقابلے میں تباعئے اصلح کے اصول پر بہتر اترتے ہیں۔ دائمی مقابلہ وہ قیمت ہے، جو جینے کے لیے، ہر فرد کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس دلیل کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ سفید فام لوگ غیر سفید فام لوگوں کے مقابلے میں انسانیت کے بہتر نمونے ہیں اور خود سفید فام لوگوں میں سے اینگلوسیکسن (یا لکھنے والے کے اصل ونسب کے مطابق جرمن یا سلافی یا لاطینی) دوسرے سفید فام لوگوں سے بہتر ہیں۔

یہاں ایک برطانوی سامراجی کے بیان سے (جو ۱۸۹۹ء میں دیا گیا) ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے اور اسے انتہائی وضع کا بیان نہ سمجھنا چاہیے:

> "تمام دوسرے اجسام کی طرح حکومتوں کو بھی زبردست بیرونی قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس جدوجہد کے مختلف مرحلے ہیں، مثلاً تجارت، آبادکاری، علاقائی توسیع کے لیے رقابت اور جنگ بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس جدوجہد میں کمزوری کا مطلب

شکست ہے۔ اب صحت مند زندگی، قوت یا اثر کے بنیادی عناصر فوج اور طاقت ہیں اس سے مراد ایسی مادی قوت ہے، جو مزاحمت کو کچل کر رکھ دے یا عزم، کردار اور عقل و دانش کی قوت ہونی چاہیئے، جو دوسروں پر قطعی برتری کا اثر پیدا کرے اور وہ اس کے سامنے جھک جائیں۔ تاریخ ایسی کسی حکومت سے آشنا نہیں، جس نے قوت کے ان عناصر کا مظاہرہ کیے بغیر فتح حاصل کر لی ہو زبردست فوجی قوت اور بلند پایہ قیادت ہر اس حکومت کے لیے ناگزیر ہیں، جو ممتاز درجہ حاصل کرنے کی آرزومند ہے......

"قومی عزائم کا زبردست اور صحت مند جذبہ منطق کی بنا پر صرف ان لوگوں کے سامنے حق بجانب ثابت کیا جا سکتا ہے، جنھیں تم سے ہمدردی ہو۔ اس میں موجودہ و آئندہ دونوں قسم کے عدد شامل ہیں۔ غالباً ہر فرد اس امر سے اتفاق کرے گا کہ ایک انگریز جس نظر سے دنیا اور زندگی کو دیکھتا ہے، وہ ماؤری[1] یا ہاٹنٹاٹ[2] کی نظر سے بہتر ہے اور اگر انگلستان اپنا بہتر اور برتر نقطۂ نگاہ ان وحشیوں پر عائد کر دے تو نظری اعتبار سے کسی کو بھی اعتراض نہ ہو گا، لیکن یہ معاملہ بہت آگے جاتا ہے، مثلاً انگریز کو سویڈن یا بلجیم کے باشندے سے اصولی اور اساسی اختلاف ہے۔ انگریز سمجھتا ہے کہ وہ نفاست و عمدگی کے زیادہ کامل معیار کا نمائندہ ہے۔ ہاں جو قومیں ذہن و دماغ اور جذبات کے اعتبار سے ہمارے قریب تر ہیں، مثلاً جرمن اور سکنڈے نیویائی، ہم انھیں ویسا اچھا نہیں سمجھتے جیسا اپنے کو سمجھتے ہیں اور یہ حقیقت ہماری اور ان کی نمایاں خصوصیات کے تقابل سے واضح ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہماری قومیں بھی ویسے ہی بن جانے کے لیے حریص ہوتیں جیسے وہ ہیں۔ ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ان کے بہترین اوصاف اخذ کر لیں، پھر اپنے اوصاف ان میں شامل کر دیں۔ اس طرح جو مرکب تیار ہو گا، وہ یقیناً سب پر فائق و برتر ہو گا۔

"ایک آزاد قوم ہی کا خاصہ ہے کہ وہ ایسے احساسات سے بہرہ مند ہوتی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ ایسے احساسات کو کسی خاص معاملے میں حق بجانب کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے تو یہ فیصلہ صرف تاریخ کر سکتی ہے۔ تاہم لازم ہے کہ اولین مقام کا ہر مدعی اپنی پوری

---

[1] Maoris نیوزی لینڈ کے مقامی باشندے جن کا تعلق پولینیشیا کی نسل سے ہے۔ [2] Hottentot جنوبی افریقہ کے قدیم باشندے۔

قوت اثباتِ حق کے لیے پیش کرے۔ بین الاقوامی کشمکش بلکہ جنگ کے لیے یہی ایک اخلاقی وجہِ جواز ہے۔ یہ چیز انسانی قلوب و اذہان پر طاری رہے گی؛ یہاں تک کہ دائمی عالمی امن کا مسئلہ حل ہو جائے یا تمام بین الاقوامی اختلافات ثالثی سے طے کرائے جائیں، چونکہ انصاف کا کوئی مسلمہ معیار موجود نہیں، اس لیے مہذب و متمدن اور غیر مہذب و غیر متمدن نسلوں کے درمیان ربط و تعلق کے معاملے میں خصوصیت سے مشکل پیش آئے گی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ سفید فام اور غیر سفید فام انسان کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ کسی ایسے آئندہ زمانے میں پٹ جائے اور ہم اس زمانے کا ابھی اندازہ کر لیں؟ کیا اس میں کوئی شبہہ ہو سکتا ہے کہ سفید فام انسان اپنا علمی تہذیب و تمدن کو سیاہ فام نسلوں پر عاید کرتا جائے گا اور اسے عاید کرتے رہنا چاہیے؟ بڑے بڑے یورپی ملکوں کے درمیان دوسرے برّاعظموں کے اندر اپنے اثر و رسوخ کی توسیع کے سلسلے میں جو رقابت پائی جاتی ہے، اس کا عقیدہ طبعاً یہ ہونا چاہیے کہ ماتحت نسلوں میں حکومت کا اعلیٰ ترین نمونہ حکمرانوں کے برتر اوصاف و خصائص کی بدولت بروئے کار آجائے۔“

سیسل روڈس جیسے سامراجی نے جو کچھ لکھا اور کہا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا جو انجام کار عمل ارتقا کی بنا پر پوری کی پوری انگلو سیکسن اقوام سے بھر جائے گی۔ ان اقوام کی نسل سنہ ۱۹۰۰ء کے آباء و اجداد سے زیادہ اصلاح یافتہ ہوگی۔ گھٹیا درجے کی قومیں ختم ہو جائیں گی یا ماری جائیں گی، لیکن یہ تو بڑے دور افتادہ تصورات تھے۔ یہ بات فوراً ذہن میں نہیں آ سکتی تھی کہ کینٹ[۲] کے سرخ فام کاشتکار دریائے کانگو کے کناروں پر بڑے بڑے فارم لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اس نقطے پر پہنچ کر سامراجی اصول میں اتنی تبدیلی کر لی گئی تھی کہ منطقہ ہائے حارہ میں سفید فام لوگ اپنی برتری کی بنا پر سیاہ فام لوگوں کی زندگیوں میں نظم و خوشحالی پیدا کریں گے اور وہ تہذیب و تمدن کے آئینوں کی حیثیت میں یورپ کی آسائشوں اور راحتوں سے کنارہ کش ہو کر گرم ملکوں پر حکمرانی کریں گے اور اس سلسلے میں راحت و آسائش سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے۔ بعض سامراجیوں کا خیال تھا کہ گرم ملکوں پر سفید فام لوگوں کا راج لامتناہی مدت تک قائم رہے گا، کیونکہ ان کے نزدیک سیاہ فام لوگوں میں قیادت کا فرض انجام دینے اور اخلاقی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کی صلاحیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[۱] رل گرے کی کتاب Hubal Hurley Studea a... anarialist Ke ص ۵۵-۵۸

[۲] KENT انگلستان کا ایک حصہ

سفید فام اقوام کی ذمہ داری

دوسرے یورپی سامراجیوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ اگرچہ آج غیر سفید فام اقوام اپنے معاملات کا انتظام نہیں سنبھال سکتیں، لیکن آگے چل کر وہ اس قابل ہو جائیں گی کہ اپنا بوجھ خود اٹھالیں۔ بہ حالت موجودہ اور خاصی لمبی مدت کے لیے لازم ہے کہ سفید فام لوگ انھیں موقع پر تعلیم و تربیت دیں اور کسی وقت —— وقت کی طوالت لازماً جائزہ لینے والے کے مزاج و طبیعت پر موقوف تھی —— یہ غیر سفید فام لوگ وہ تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں گے، جو بہ حالت موجودہ سفید فام لوگوں کی تحویل میں رہنی چاہییں۔ گویا یہ ذمہ داریاں ملکیت کی نہ تھیں، بلکہ صرف تولیت (ٹرسٹی شپ) کی تھیں۔ کپلنگ نے اپنی ایک مشہور نظم میں سفید فام انسانوں کا معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا:-

"سفید فام اقوام کی ذمہ داری سنبھال لو۔
اپنے بہترین تربیت کردہ آدمی باہر بھیجو۔
اپنے بیٹوں کو جلاوطنی کے پابند بناؤ
تاکہ تمہارے اسیروں کی ضرورتیں پوری کریں۔
بھاری لباس پہن کر
پریشان حال، اور وحشی لوگوں پر پہرے دیں۔
وہ لوگ جو ابھی تمہارے قبضے میں آئے ہیں آزردہ و افسردہ لوگ
نیم شیطان اور نیم طفلک
سفید فام لوگوں کی ذمہ داری سنبھال لو۔"

"صبر سے اس کے واجبات پورے کرو
وحشت کا خطرہ نہ رکھو
فخر کی نمود کا انسداد کرو
صاف اور سادہ تقریروں کے ذریعے سے
ایک ایک بات کی وضاحت سو سو مرتبہ کرو۔
دوسروں کا فائدہ ڈھونڈھو
اور دوسروں کی بہتری کے لیے کام کرو۔
سفید فام لوگوں کا بوجھ سنبھال لو"

"دورِ امن کی وحشیانہ جنگیں لڑو
قحط کا دہانہ بند کرو۔
بیماریوں کو روک دو
اور جب تمہارا مقصد تکمیل کے قریب پہنچ جائے۔
تو یاد رکھو، یہ سب کچھ دوسروں کے لیے کیا گیا
دیکھو کاہلی اور کافرانہ حماقت پر نظر رکھو
یہ تمہاری تمام امیدیں برباد نہ کر دے[1]۔"

یہ تولیت کا استدلال سامراج کے دفاع میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز ثابت ہوا خصوصاً اینگلو سکسن اقوام کے درمیان۔ اہلِ مغرب میں سے چند لوگ عمرانی ڈارونیت کے اصول کو خام ترین شکل میں بھی قبول کر لینے پر تیار تھے۔ جرمنی میں بھی ایسے لوگ موجود تھے، حالانکہ وہاں نسلیت بہت ہر دلعزیز تھی۔ اصول یہ تھا کہ اصلح لوگ غیر اصلح لوگوں کو مار کر اپنی اصلحیت کا ثبوت دیں۔ جو لبرل سامراج کے مخالف تھے، ان کے نزدیک تولیت کی دلیل سب سے بڑھ کر رنج افزا تھی۔ مثلاً ہوبسن شکایت کرتا ہے کہ عمرانی ڈارونیت کا اصول اخلاقی اور مذہبی باریکیوں کے ایک پُرپیچ تانے بانے پر مبنی ہے اور ہم سامراجی مسیحیت یا تہذیب تمدن کے مشن کی بلند سطح پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں ہم دوسروں کو اچھی حکومت کے طور طریقے اور محنت کا وقار و اعزاز سکھاتے ہیں۔

تاہم جو مؤرخ انسانی فطرت کی پیچیدگیوں سے آگاہ تھے، وہ یہی سمجھتے تھے کہ سامراج کے حق میں یہ اخلاقی دلیلیں عدم اخلاص پر مبنی ہیں۔ بہت سے یورپی لوگ، جو نو آبادیوں میں رہتے تھے، یا ان سے باہر تھے، دل میں یقین کیے بیٹھے تھے کہ ہمارا معاملہ تولیت تک محدود ہے اور اسی کے لیے انہوں نے تہہ دل سے کام جاری رکھا۔ انیسویں صدی کے اندر مغرب کے دائرۂ اثر کی جو توسیع ہوئی، اس میں مسیحی مشنری بھی ایک زبردست عامل ہے۔ کینیتھ لیٹوریٹ[2] نے تبلیغ مسیحیت کی جو مفصل اور طویل تاریخ مرتب کی ہے، اس کی ایک آخری جلد بھی ہے، جس کا نام ہے "عظیم صدی[3]"۔ اس میں انیسویں صدی کے حالات بتائے گئے ہیں۔ مسیحیت کی رسمی تبلیغ اسی صدی کے اندر ہوئی، جسے مادیت کی صدی کہا جاتا ہے۔ پیشتر ایسی تبلیغ کبھی نہیں ہوئی تھی۔

---

[1] کپلنگ کی نظمیں (۱۸۸۶ء — ۱۹۳۲ء) ص ۳۲۰ - ۳۲۱ -

[2] Kenneth Latoarette

[3] The Great Century

سیاہ فام لوگوں کو مسیحی بنانے کا سلسلہ کس حد تک کامل و مکمل تھا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ جہاں ثقافت بالکل ابتدائی حالت میں تھی، وہاں قبیلوں کے قبیلے مسیحی ہو گئے، تاہم انھوں نے اپنے بہت سے پرانے طور طریقے قائم رکھے، جو کفر کے زمانے سے ان میں رائج چلے آتے تھے۔ ہندوستان، چین، جاپان اور دوسرے قدیم متمدن ممالک میں پہلے مذہب خاصی جڑ پکڑ چکے تھے، وہاں مسیحیت کو چنداں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بہر حال مسیحیت اکثریت کا مذہب نہ بن سکی، تاہم مشنوں کے سرگرم کام کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی لوگوں میں سے بعض مخلص افراد بروئے کار آ گئے۔ جنھیں تکمیل تعلیم کے لیے یورپ یا امریکہ بھیجا گیا۔ پروفیسر لیٹوریٹ نے بڑے انکسار سے، لیکن کامل امید کے ساتھ انیسویں صدی کے مشنری طریق کا خلاصہ یوں پیش کیا ہے:-

"مسیحیت نے غیر یورپی اقوام کے درمیان پہنچ کر جو اثر پیدا کیا، وہ بہت زیادہ وسیع ہے اور گرجوں کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا...... سیکڑوں زبانوں کو پہلی مرتبہ رسم الخط ملے۔ بائبل کا ترجمہ کُلاً یا جزواً ان زبانوں میں کیا گیا۔ مسیحیت کے متعلق دوسری کتابیں تیار کی گئیں۔ مغربی نمونے کی درسگاہیں جا بجا کھل گئیں۔ یہ درسگاہیں اس تعلیم کا پیش خیمہ تھیں، جس نے آگے چل کر استعماری یا مقامی اور آزاد حکومتوں نے اپنے ہاں بطورِ نظام اختیار کر لیا۔ یتیم خانے قائم ہوئے، جن میں ہزاروں بچوں نے پرورش پائی۔ اگر یہ موجود نہ ہوتے تو وہ بچے تباہ ہو جاتے۔ قحط زدہ علاقوں کی امداد کا انتظام کیا گیا۔ زراعت اور جنگلات میں اصلاحات ہوئیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ قحط یا تو بالکل ختم ہو جائیں یا ان کے نقصانات زیادہ سے زیادہ گھٹ جائیں۔ جا بجا ہسپتال بن گئے۔ ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ طب اور تیمار داری کے لیے علوم اور طور طریقے ہر جگہ جاری ہو جائیں، جو مغرب میں بہت زیادہ ترقی کر چکے تھے۔ حفظانِ صحت کی تعلیم شروع ہو گئی۔ عورتوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں[1]۔ یہ سب کچھ اور اس سے بھی زیادہ ان مشنری مردوں اور عورتوں کے ذریعے سے انجام پایا، جن کی تعداد دو اڑھائی لاکھ سے کبھی نہ بڑھی اور جو اکثر اس سے بہت کم رہی اور یہ لوگ

---

[1] (مترجم) اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مشنریوں نے بھی قابلِ قدر کام انجام دیا، خصوصاً امریکی مشنریوں نے اور آج بھی ان کا یہ اعتبار قائم ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ سب کچھ انھیں نے انجام دیا۔ دوسرے گروہوں نے جو کچھ کیا وہ منظم طریق پر سامنے نہ آ سکا جس طرح مشنریوں کا کام سامنے آ گیا۔ پھر مثلاً پاک و ہند میں جو وسائل سابقہ حکومتوں نے تعلیمی اور رفاہی کاموں کے لیے وقف کر دیئے تھے، انگریز ان پر قابض ہو گئے۔ اس وجہ سے سابقہ ادارے بھی باقی نہ رہے اور محکوموں کو قلتِ وسائل کے باوجود نئے سرے سے انتظامات کرنے پڑے۔

سب ایک ملک میں کام نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ تھوڑے تھوڑے کرۂ ارض کی نصف سے زیادہ سرزمینوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عالم انسانیت کی نصف آبادی کی ذمہ داری انھوں نے اٹھا رکھی تھی۔

"مزید براں مسیحی ضمیر نے غیر سفید اقوام سے ناجائز استفادہ کے خلاف جنگ کی اور مقتدر قومیں ایسے استغاثے کرتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات ترجمانی کا حق مشنریوں نے ادا کیا اور زیادہ تر وہ مسیحی سرگرم عمل رہے، جو مشنری نہ تھے۔ انھیں لوگوں کی کوششوں سے افیون کی پیداوار اور فروخت پر پابندی کے لیے صدا بلند ہوتی رہی اور یہی لوگ افیون سے پیدا ہونے والی دوسری چیزوں کو رکوانے میں مصروف رہے۔ انھی کی وجہ سے حبشیوں کی غلامی منسوخ ہوئی۔ ان لوگوں نے بیگار کی مخالفت ہر شکل میں کی۔ جو سلطنت زیادہ تر اقوام اور وسیع ترین حلقے میں پھیلی ہوئی تھی، وہ سلطنت برطانیہ تھی۔ انیسویں صدی میں جو برطانوی افسر نو آبادیوں یا محکوم علاقوں میں پہنچے، وہ اٹھارھویں صدی کے افسروں سے یقیناً بہتر تھے۔ ممکن ہے بعض افسر آج بھی اپنے آپ کو نسلی اور ثقافتی اعتبار سے برتر سمجھتے ہوں اور محکوموں کا ذکر تحقیر سے کریں۔ مثلاً کہیں یہ لوگ فرد تر حیثیت کے ہیں اور قانون سے ناآشنا ہیں، کپلنگ کے الفاظ میں نیم وحشی اور نیم طفلک قرار دیں، تاہم ہر افسر ان محکوموں کے لیے خلوص و دیانت سے خدمات انجام دینا آخر سمجھتا ہے...... یہ اصلاح کم از کم جزواً انجیلی بیداری کا نتیجہ ہے اور اسی وجہ سے مسیحیوں کی زندگی کی عام سطح بلند ہوئی۔[1]"

دفاعی دلیل

آخر میں یہ کہہ دینا چاہیے کہ سنہ ۱۹۰۰ء کا سامراجی فلسفہ صرف سفید فام لوگوں کی برتری ہی کے احساس پر مبنی نہ تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن تمام تہذیبوں اور تمدنوں سے بڑھ کر اضطراب افزا ہے۔ بعض مقررین سامراج کو اصلاً دفاعی سمجھتے تھے۔ سفید فام لوگ اس صعوبت خیز دنیا میں بہت کم تھے۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ منظم ہو کر رہیں اور غیر سفید فام لوگوں کو اپنے قبضے میں رکھیں۔ اس زمانے میں گفتگو ہوتی تھی کہ زرد فام نسل کی طرف سے سخت خطرہ ہے اور سفید فام لوگ خودکشی کر لیں گے۔ روڈس کپلنگ اور تھیوڈر روزویلٹ جیسے معتمد علیہ سامراجیوں کی تقریریں اور تحریریں خوف اور بے چینی کا عجیب و غریب امتزاج تھیں۔ ان سے واضح ہوتا تھا کہ سفید فام لوگ بہترین تو ہیں لیکن اتنے اچھے

---

[1] مسٹیوریٹ کی کتاب A History of Christianity (تاریخ مسیحیت) ص ۱۱۳۵ — ۱۱۳۶۔

ہیں کہ اس دنیا کی آغوش زیادہ تعداد میں ان کی پرورش نہیں کر سکتی۔

مخالفین استعمار کے دلائل

سامراج یا استعمار کے مخالفوں نے بھی بہت سی دلیلیں تیار کر لیں۔ عمرانی ڈارونیت کے حامیوں کے خلاف ان کی دلیل یہ تھی کہ جہد للبقاء کا اطلاق بھی نباتات وحیوانات کی طرح انسانی گروہوں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں نے مرو یا مار دو کے خام طور طریقوں کو چھوڑ کر ثقافتی عمدگی کے لیے بلند تر رقابت شروع کی، تاکہ ان کے معاشروں کے درمیان بہتر جد وجہد جاری رہے۔ ہر گروہ اور ہر نسل کو کچھ نہ کچھ عام تہذیب تمدن کے لیے پیش کرنا ہے اور کسی گروہ کو دانستہ برباد کرنا یا دبانا دوسروں میں ضعف وانحطاط پیدا کرتا ہے۔ اس طرح انسانی افراد کے درمیان ارتقاء کا عمل حقیقۃً رک جاتا ہے۔ سامراج کے مخالفین اقتصادی دلیل کو بڑی وضاحت سے بروئے کار لائے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے وہ بڑی سرگرمی سے کام کرتے تاکہ بتا سکیں ـــــ خصوصاً افریقہ میں ـــ نو آبادیاں فائدے کا موجب نہیں اور سامراجی لوگ اہل وطن کے ذاتی مفاد سے جو اپیلیں کرتے ہیں، وہ سراسر دھوکا اور فریب ہیں اور پروپیگنڈا کرنے والوں کی بد دیانتی ہے، جو وطن کی ایک چھوٹی سی اقلیت کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں اور جو نو آبادیوں میں ذاتی طور پر سامراجی طالع آزمائیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس نقطے سے سامراج کے مخالفین دوسرے نقطے پر پہنچ گئے، یعنی جو لوگ نو آبادیوں کی توسیع کے قائل ہیں۔ وہ دراصل عوام کو قومی کارناموں کے بے سروپا فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ عام آدمی یہی چاہتا ہے کہ اس کا ملک دنیا کی اٹلس (کتاب نقشہ جات) میں سامراجی طاقت کی حیثیت میں بہت نمایاں رہے۔ اسے یہ پسند تھا کہ برطانیہ ایک ایسی سلطنت کا مالک ہے، جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ اگر وہ فرانسیسی ہوتا تو سمجھتا کہ فرانس اب بھی بہت بڑی قوت ہے اور تہذیب وتمدن کا فرض پورا کر رہا ہے، اگر وہ اطالوی ہوتا تو سمجھتا کہ اٹلی بھی ایک قوم ہے اور اس نے بھی ایک قوم کے سے طور طریقے اختیار کر رکھے، لیکن سامراج کے مخالفین بحیثیت عمومی اس روش کے خلاف طنز وتضحیک کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے، جسے وہ غیر معقول سمجھتے تھے۔ رہا ان کا یہ عقیدہ کہ انسانی عمل معقولیت پر مبنی کہنا چاہیے اور اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد کا فائدہ پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ اس عقیدے نے انھیں لبرلوں کے راستے پر لگا دیا۔

سامراجیوں کی مخالفت کا عقیدہ اتنا زبردست تھا کہ ـــــ اردگرد سلطنتوں کی تعمیر کے باوجود ـــــ برطانیہ میں ایک مکتبۂ فکر پیدا ہو گیا، جو آزاد اقتصادیات سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اس تسلی بخش یقین پر پہنچ گیا کہ سامراج کا عملاً قائم رہنا غیر ممکن ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جو نو آبادیاں آج ہمارے ساتھ ہیں، یہ بہر حال کسی نہ کسی وقت مادر وطن سے منقطع ہو جائیں گے، جیسے پختہ پھل درخت سے ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ وہ کہتے تھے، پھر کون سی وجہ ہے کہ افریقہ یا چین میں مزید قدمگاہیں لینے کے بیکار عمل سے احتراز نہ کر لیا جائے، کیوں سلطنت سے دست بردار ہو کر اس واقعے کو جلد سے جلد پورا نہ کر دیا جائے جو بہر حال پیش آنے والا ہے۔

مخالفین استعمار کے دلائل سے عام مغربی لوگوں کے ذہن وقلب میں جو چیز پیوست ہوئی، وہ ایک اضطراب افزا شعور تھا کہ سامراجی توسیع جمہوریت کے مسلمہ عزائم سے مطابقت نہیں رکھتی، خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ احساس بہت پھیل گیا کہ سامراج اور استعمار حریت و مساوات کے منافی ہیں۔ اگرچہ سامراجی تولیت کے اصول سے زیادہ سے زیادہ دیانت دار سمجھ لیے جائیں۔ امریکہ نے ۱۸۹۸ء میں ایک سلطنت حاصل کی تھی، اس پر سامراج کے مخالفوں میں سے مختلف گروہوں نے شدید احتجاج کیے اور حکومت کو بطورِ خاص وعدہ کرنا پڑا کہ جب لوگ اپنا انتظام سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے تو انھیں آزادی دے دی جائے گی۔ اہلِ امریکہ کی طرف سے استعمار کی یہ مخالفت خصوصاً اس حالت میں کہ خود امریکی حکومت اس پر کاربند تھی، بیسویں صدی کے وسطیٰ دنیا کے احوال وظروف کا ایک اہم عامل ہے، اس پر ہم آئندہ ابواب میں متوجہ ہوں گے۔

اڑتالیسواں باب

سامراج کے نتائج

عمومی نتائج

یورپی ملکوں کی جو توسیع طویل مدت تک جاری رہی اور اس کا سلسلہ ۱۹۱۴ء تک آتا ہے، یہاں اس کے عام نتائج خلاصۃً پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ سب سے پہلا اور سب سے بڑھ کر نمایاں نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی میں تقریباً پورا کرۂ ارض اس عمل سے اثر پذیر ہوا جس کی ابتدا واسکو ڈی گاما اور کولمبس سے ہوئی تھی، بلکہ کہنا چاہیے، ایک اعتبار سے یہ سلسلہ صلیبی جنگوں میں شروع ہو چکا تھا، کیونکہ اصل معاملہ مغربی افراد، ان کے مال اسباب اور افکار کی توسیع کا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، بیسویں صدی کے اوائل میں کوئی شائقِ اکتشاف بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتا تو وہ قطب جنوبی کے بے آباد اور تاریک براعظم میں پہنچ جاتا، لیکن ابھی تک ایسے مقامات باقی ہیں، جن کے باب میں تفصیلات پوری طرح معلوم نہیں ہو سکیں۔ یہ مقامات وسط ایشیا میں بھی ہیں، دریائے ایمزن کے طاس میں بھی، بلکہ لیبریڈور اور ایلاسکا میں بھی بعض علاقوں کی تفصیلات دریافت نہیں ہوئیں۔ ایسے بہت سے علاقے بھی ہیں، جنھیں ناقابل نفوذ جزیرے سمجھنا چاہیے، اور وہاں لوگ صدیوں سے ایک ہی ڈھرّے پر زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ دورِ حاضر کی مغربی ثقافت سے انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر غیر مغربی اقوام میں مغربی افکار و مقاصد کے نفوذ کے درجات بھی مختلف ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی نفوذ کا یہ درجہ اس سے کم گہرا ہے، جتنا انیسویں صدی کے مغربی سامراجی یقین کیے بیٹھے تھے۔ بہ ایں ہمہ سفید فام ۱۹۱۴ء تک ہر جگہ پہنچے ہوئے تھے اور سفید فام مکتشفین جہاں بھی جاتے تھے، ٹین کے کنستر انھیں مل جاتے تھے اور یہ مغرب کا ایسا نشان تھا جس سے دنیا کا کوئی بھی حصہ خالی نہیں رہا تھا۔

دوم یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یورپ کی توسیع کے ساتھ نسل انسانی کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۸۰۰ء کے آس پاس تک آبادی کے جو اعداد ملتے تھے، وہ ہر اعتبار سے درست نہیں سمجھے جا سکتے تھے، خصوصاً یورپ اور ریاستہائے متحدہ کے باہر تو کوئی بھی عدد ہر لحاظ سے قابل اعتماد نہ تھا، مگر انھیں بنیادی طور پر ایسا نہیں سمجھا جا سکتا، جو غلط نتائج پر لے جائے۔ ۱۸۰۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان دنیا کی آبادی دگنی ہو گئی۔ ۱۸۰۰ء میں یہ آبادی تقریباً اسی کروڑ تھی۔ ۱۹۰۰ء میں ایک ارب ساٹھ کروڑ پر پہنچ گئی۔ اس اضافے میں سفید فام یورپیوں کا بہت بڑا حصہ ہے، لیکن ایشیا اور دوسرے مقامات

کے غیر سفید فام لوگوں میں بھی اضافہ ہوا[1]۔ ہم انسانی آبادی میں اضافے کو پوری طرح سمجھتے نہیں کہ دعویٰ کر دیں۔ یورپ کی توسیع سے انیسویں صدی کے اندر غیر یورپی لوگوں کی تعداد بڑھ گئی، تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ اہلِ یورپ نے دنیا کے بہت سے خطوں میں امن و نظم کی درستی کا انتظام کیا۔ اسی طرح مادّی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ حفظانِ صحت کے ارباب میں ترقی ہوئی۔ یہ تمام عوامل آبادی میں اضافے کے موجب ہے[2]۔ آسٹریلیا کے سیاہ فام دیسی باشندوں اور شمالی امریکہ کے سرخ فام انڈینوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے یورپی توسیع عموماً غیر یورپی آبادی کے جسمانی استیصال کا ذریعہ نہیں بنی۔

ہم کسی تحفظ کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء تک تمام ملکوں کے دیسی باشندے سفید فام لوگوں کی برتری کا دعویٰ ٹھکرانے لگے تھے۔ مشرقِ قریب اور ایشیا جو مہذّب اور مدّت سے قائم شدہ قومیں موجود تھیں، ان کے تعلیم یافتہ طبقات میں قومیّت کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ انھوں نے مغرب سے اجتماعی شعور کی وہ خاص شکل لے لی، جو علاقائی سیاسی اکائیوں سے وابستہ ہے اور کم از کم اصولاً ان اکائیوں کے تمام افراد اس میں حصہ دار نہیں ہوتے۔ یورپ سے باہر یہ قومیّت بالکل نئی چیز تھی اور آج یہ ہمارے نزدیک بہت اہم ہے، کیونکہ یہ بڑھتی اور ترقی پاتی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ جاپان کے اندر سب سے بڑھ کر نمایاں تھی۔ علاوہ بریں چین یا مصر و ہندوستان جیسے ترقی یافتہ استعماری ملکوں میں بھی اس کے آثار ملتے تھے۔

یہ نیا مظہر سفید فام اقوام یا ان میں سے کسی خاص قوم کی دشمنی کے مترادف نہ تھا۔ یہ ایک منظم سیاسی عقیدے یا دورِ حاضر کی اصطلاح میں حُبِّ وطن کا کرشمہ تھا۔ مصری، ہندوستانی اور چینی محبّانِ وطن طبعاً سب سے پہلے یورپی سامراجی آقاؤں سے نجات حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی روش وہی تھی، جو ہر جگہ مظلوم قومی گروہوں کی تھی اور ایسے گروہ یورپ میں بھی موجود تھے۔ وہ لوگ بڑے ذی حس تھے۔ خیالی اور حقیقی دونوں قسم کی شکائتیں پیش کرتے رہتے تھے۔ وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی قومی خصوصیّت کو بڑھا کر زیادہ سے زیادہ شاندار بناتے رہتے تھے۔ اپنے آقاؤں کے مدّاح بھی تھے، اُن سے نفرت بھی کرتے تھے اور اُن کی ترقی پر انھیں رشک بھی تھا۔ مزید براں یہ کہ وہ اس نئے اصول کے مطابق منظّم ہوئے، جو مغرب سے لیا گیا تھا۔ یہ ایسا اصول تھا، جو آگے چل کر مغرب سے حاصل کردہ تمام چیزوں کے مقابلے میں ان کی روایتی ثقافتوں کے لیے سب سے بڑھ

---

[1] (مترجم) دنیا کی آبادی تدریجاً بڑھتی رہی۔ ساتھ ساتھ افزائش کے تناسب میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں سفید فام لوگوں کی کسی چیز کا کوئی اثر نہیں۔

[2] سفید فام لوگوں نے افریقہ یا ایشیا کے مختلف حصوں میں مقامی آبادیوں کے لیے درحقیقت کچھ بھی نہ کیا۔ شہروں میں جو انتظامات کیے، وہ بھی خاصے ناقص تھے۔ یورپ میں یقیناً ان انتظامات سے عوام کو فائدہ پہنچا ہوگا۔ ہمارے ہاں نیز دوسرے خطوں میں تو اب تک بھی حفظانِ صحت یا طبّی امداد کے وسائل قابلِ توجہ نہیں رہے حالانکہ گزشتہ پندرہ سولہ سال سے بہت کچھ ہوا ہے۔

کرتباہ کن تھا۔ ایسے جمہوریت نہیں تو مساوات اور ہمواری کا اصول قرار دینا چاہیے۔ یہ روح قومیت کے سیکولر مذہب میں مضمر ہے۔ نظری اعتبار سے قومیت پیشے، عمرانی طبقے، بلکہ ذات پات کی حدبندیوں کو بھی پھاند جاتی۔ مصر کا کسان فلاح کہلاتا ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ بھی ویسا ہی مصری ہونے کا دعویٰ کرسکتا تھا، جیسا کوئی جاگیردار پاشا، بلکہ وہ پاشا سے بہتر تھا کیونکہ اس پر یورپی ثقافت کی فضا کا کوئی مضر اثر نہیں پڑا تھا۔

چہارم۔ سامراج کے مخالفوں نے جو تاریک اقتصادی نتیجے پیش کیے تھے، ان کے باوجود انیسویں صدی کے اندر یورپی نسلوں کی دولت و ثروت میں سمندر پار توسیع سے اضافہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ، جرمنی، بلجیم اور آئرلینڈ جیسے گھنی آبادی کے ملکوں میں معیارِ معیشت اس وقت تک قائم ہی نہیں رکھا جاسکتا تھا، جب تک سمندر پار سے خام جنسیں نہ پہنچتیں۔ نظری اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ جنسیں اس حالت میں بھی یورپ پہنچتی رہتیں، اگر سمندر پار کے آزاد ملکوں سے آزاد تجارت کا سلسلہ جاری رکھا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان جنسوں کا ایک حصہ یقیناً سامراجی توسیع کا نتیجہ تھا۔

پنجم۔ سامراجی رقابتیں بڑی بڑی یورپی طاقتوں کے درمیان عام رقابتوں پر مستزاد ہوگئیں۔ خصوصاً سنہ ۱۸۷۰ء کے بعد اور سنہ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ جن پیچ در پیچ اسباب کا نتیجہ تھی، ان میں رقابتیں ایک بہت بڑا عامل بن گئیں۔ بہرحال انگلستان و جرمنی کی رقابت کے متعلق یہ دعویٰ درست ہے اور اس رقابت میں فرانس و جرمنی یا آسٹریا و روس کی طرح کوئی خالص یورپی روایت پس منظر کا کام نہیں دے رہی تھی۔ سنہ ۱۸۷۰ء کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش کے بڑے عوامل میں سے ایک سامراجی علاقوں کے لیے رقابت بھی تھی۔ اس سے منڈیوں کے لیے رقابت کا ظہور ہوا، یعنی ان نیم سامراجی خطوں میں، جیسا جنوبی امریکہ تھا۔

نوآبادیاں

انیسویں صدی میں یورپی توسیع کے متعلق ہمارا بیان زیادہ تر ان علاقوں تک محدود رہا، جو استفادے کی غرض سے محکوم بنا لیے گئے یا انھیں حمایت میں لے لیا گیا یا اہل یورپ نے ان میں حلقہ ہائے اثر قائم کر لیے۔ یہ بیان مکمل نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ توسیع کا ایک نمایاں پہلو وہ بھی ہے، جس میں یورپی لوگ نئے علاقوں کے اندر آباد ہوئے اور ان کی آبادی کا درجہ اتنا وسیع تھا کہ کولمبس کے بعد تین صدیوں میں بھی ویسی آبادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء سے پیشتر شمالی و جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور سائبیریا میں یورپی نسل کے لوگ بہت تھوڑے تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں آٹھ کروڑ کے قریب لوگ یورپی نسل کے تھے۔

جن خطوں میں یہ لوگ آباد ہوئے ان میں پیشتر آبادیاں بہت کم تھیں۔ آسٹریلیا تقریباً خالی تھا اور دریائے ریوگرینڈی[1]

---

[1] Riogrande

ـــ یہ دریا میکسیکو اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے درمیان حد ہے۔

کے شمال میں دیسی انڈین امریکی آبادی دس لاکھ سے شاید ہی زیادہ ہوگی۔ یورپی آبادکاروں نے ان قدیم باشندوں پر بہت فوقیت حاصل کرلی۔ تسمانیا آسٹریلیا کے جنوب میں ایک بہت بڑا جزیرہ ہے۔ یہاں کی دیسی آبادی بالکل ختم کردی گئی اور ویسی ہی کیفیت آسٹریلیا میں پیش آئی۔ ریاستہائے متحدہ میں سرخ فام انڈین اتنے کم کر دیئے گئے تھے کہ انیسویں صدی کے بہت سے امریکیوں نے مغرب کے بے آباد علاقوں کے سوا کبھی کوئی سرخ فام انڈین دیکھا ہی نہ تھا۔

مگر لاطینی امریکہ کے اکثر حصوں میں دیسی آبادی نہ محض ختم ہی نہ کی گئی بلکہ قائم رہی۔ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے جو طبقہ بالائی کہلاتا تھا وہ ان یورپیوں پر مشتمل تھا، جو امریکہ میں پیدا ہوئے۔ یورپی، انڈین اور حبشی آبادیوں کے میل جول سے جو نسل پیدا ہوئی، عمرانی اعتبار سے وہ پست طبقہ کہلاتی تھی۔ جنوبی امریکہ کے جنوب میں —— یعنی ارجنٹائن اور چلی میں —— ویسے ہی حالات پیش آئے، جیسے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بیسویں صدی کی یہ قومیں تقریباً پوری کی پوری یورپی نسل سے ہیں۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کیوں امریکہ کی بعض مملکتیں زیادہ مغربیت مآب ہیں اور بعض کم۔

امریکہ میں یورپ کی توسیع کے ساتھ ساتھ افریقہ کی توسیع بھی ہوئی۔ سنہ ۱۸۵۰ء تک ممتاز یورپی طاقتیں غلاموں کی تجارت پر ضبط و نظم قائم کرچکی تھیں، لیکن جو حبشی پیشتر کی صدیوں میں اس تجارت کے ذریعے سے امریکہ پہنچ چکے تھے، تعداد میں بڑھتے رہے۔ اگرچہ نسلی امتیاز کے موانع موجود تھے —— سب سے بڑھ کر ریاستہائے متحدہ میں —— مگر حبشیوں کی افزائش پر کوئی اثر نہ پڑا۔ مثلاً سنہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس نوّے لاکھ حبشی صرف ریاست ہائے متحدہ میں موجود تھے۔

کینیڈا: بغاوت کا پس منظر

ریاستہائے متحدہ میں آبادی کی غیر معمولی افزائش سے قطع نظر انیسویں صدی کے اندر اہل یورپ کی سمندر پار نقل و حرکت کا نہایت اہم پہلو وہ ہے، جسے آج کل دولت مشترکۂ برطانیہ کہتے ہیں یا محض دولت مشترکہ۔ یقیناً یہ دعویٰ ٹھیک نہیں کہ برطانیہ نے امریکی انقلاب سے سبق حاصل کیا۔ کینیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ کے سلسلے میں عقلمندی سے کام لیتے ہوئے جارج سوم اور لارڈ نارتھ کی پالیسی ترک کردی، لیکن فارمولا اساساً درست ہے۔ استعمار کی نئی قسم کے تجربے کے لیے پہلی کارگاہ کینیڈا ہی تھی۔

شمالی امریکہ کی جن تیرہ نوآبادیوں نے بغاوت کی تھی، وہ چودھویں کو ساتھ ملانے کی خواہاں تھیں اور کینیڈا کو ساتھ ملانے کے لیے کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہیں رکھا تھا، لیکن اسباب کا ایک ایسا سلسلہ پیدا ہوا جس کی بنا پر ۱۷۸۳ء کے معاہدہ صلح میں کینیڈا کو انگریزوں کے پاس چھوڑ دینا پڑا۔ کوبیک میں جو فرانسیسی رہتے تھے، انھیں نئی پروٹسٹنٹ قوت پر بے اعتمادی تھی، جو ان کے جنوب میں نشوونما پا رہی تھی (امریکہ)۔ امریکی باغیوں کو خود ریاستہائے متحدہ میں برطانوی قوت کے مقابلے کے لیے خاصی قوت دکھنی پڑی۔ امریکہ کے فرانسیسی حلیف نئے ملک کو مضبوط و مستحکم نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ آگے چل کر ریاستہائے متحدہ ۱۸۱۲ء کی جنگ میں ناکام رہی اور ۱۷۸۳ء کا فیصلہ اُلٹ دیا گیا۔

امریکہ کے جو باشندے انگلستان کے وفادار تھے، وہ ۱۷۸۳ء سے پیشتر ہی آہستہ آہستہ کینیڈا پہنچنے لگے۔ ان کی بڑی تعداد نیو برنزویک[1] میں آباد ہوئی، جسے ۱۷۸۴ء میں نووا اسکوشیا[2] سے الگ کر دیا گیا تھا۔ نیز وہ بالائی کینیڈا میں توطن پذیر ہوئے، جسے آگے چل کر صوبہ اونٹیریو[3] کا نام دیا گیا۔ یہ وفادار اور ان کے اخلاف مخلص سلطنت کے وفاداروں کی حیثیت میں منظم ہوئے اور یہی لوگ انیسویں صدی میں کینیڈا کے اندر قومیت کے نشو و ارتقا کے بڑی حد تک ذمہ دار تھے، لیکن ریاستہائے متحدہ سے ان کی دشمنی ۱۸۱۲ء کے بعد جنگ کی صورت میں رونما نہ ہوئی، اگرچہ آج بھی وہ دشمنی کاملاً محو نہیں ہو سکی۔ ابتدا میں بالائی کینیڈا ـــ جس میں زیادہ تر انگریز آباد تھے ـــ زیریں کینیڈا ـــ یعنی کوبیک، جس میں زیادہ فرانسیسی آباد تھے ـــ نیز نووا اسکوشیا، نیو برنزوک اور پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ[4] کے بحری صوبے الگ الگ برطانوی نوآبادیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ بالکل یہی صورت ابتدا میں تیرہ امریکی نوآبادیوں کی تھی۔ ہر ایک کا نظام حکومت پرانی امریکی وضع کا تھا، یعنی ایک وفادار گورنر تاج کی طرف سے مقرر ہو جاتا۔ وہ خود ایک مجلس شوریٰ نامزد کر لیتا اور ایک منتخب مجلس ہوتی، جس کے نمائندے عام بالغوں کے حق رائے کے مطابق چنے جاتے۔ یہ انتظامات انیسویں صدی کے اوائل میں جاری رہے کیونکہ مغربی کینیڈا میں آبادکاری شروع ہو رہی تھی۔ علاوہ بریں تمام صوبوں میں ترقیات کا سلسلہ سرگرمی سے جاری تھا اور ۱۸۱۲ء کی جنگ میں ان تمام نوآبادیوں کو ریاست ہائے متحدہ کے خلاف یکجا رکھنے کا تقاضا یہی تھا، لیکن جو صورت حال پیشتر کی صدی میں تیرہ ریاستوں کے اندر رونما ہو چکی تھی، وہی یہاں پیش آئی، یعنی نوآبادیوں کی مجلسوں اور شاہی حکومت کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ ۱۸۳۷ء میں زیریں اور بالائی کینیڈا کے اندر بغاوت پھوٹ پڑی۔ میکینزی[5] اور پیپنیو[6] جیسے عوامی لیڈروں نے گورنر اور اس کے معاونوں کے خلاف صف بندی اختیار کر لی۔ ان لوگوں کے سامنے وہی دستوری اور مالی شکایات تھیں، جو ساٹھ سال پیشتر تیرہ نوآبادیوں کی طرف سے پیش ہو چکی تھیں۔

ڈرہم کی روداد اور درجۂ مستعمرات

۱۸۳۷ء کی بغاوت فوجی اعتبار سے حد درجہ مضحکہ خیز ثابت ہوئی۔ اغلب یہ ہے کہ دونوں صوبوں میں رائے عامہ باغیوں کے خلاف تھی۔ غالباً یہ خوف بھی تھا کہ اگر امریکی انقلاب کی پوری پیروی کی گئی تو ریاستہائے متحدہ کینیڈا کو ہڑپ کر لیں گی۔ حکومت برطانیہ کی آنکھیں کھل گئیں، اس نے ارل ڈرہم[7] کو شمالی امریکہ کے تمام برطانوی صوبوں کا اعلیٰ گورنر بنا کر بھیج دیا۔ وہ نوجوان

---

۱ New Brunzwic　　۲ Novasc otia　　۳ Ontario

۴ Prince Edward Island　　۵ Macae nzie

۶ Papineau　　۷ Durham

امیر تھا۔ زیادہ تر وہگ پارٹی سے وابستہ رہ چکا تھا اور اس کے رجحانات افادیت پسندی کی طرف تھے۔ اسے احساس ہوگیا کہ لندن کی حکومت اس کی مناسب حمایت کے لیے تیار نہیں، لہٰذا ایک سال سے بھی کم مدت کے اندر اس نے استعفاء دے دیا، مگر واپسی پر ۱۸۳۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے اندر جو مشہور روداد پیش کی، وہ مستعمرات کی ساخت کے سلسلے میں نئی برطانوی پالیسی کا سنگِ بنیاد بن گئی۔ یہ ایک دستوری دستاویز ہے۔ جیسے ڈرہم کے مداح بعض اوقات میگنا کارٹا کے ساتھ رکھتے تھے۔

اس روداد میں بالائی اور زیریں کینیڈا کو متحد کر کے ایک ذمہ دار حکومت قائم کر دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ یعنی تجویز یہ تھی کہ صوبوں اور یونین دونوں کے لیے رائے عامہ سے نمائندہ مجلسیں چنی جائیں۔ یہ قرارداد اب تک اہم مانی جاتی ہے۔ ڈرہم فرانس کی ہر چیز سے بے پرواہی اختیار کر لینے کی انگریزی خصوصیت سے بہرہ مند تھا اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ زیریں کینیڈا کے فرانسیسیوں کو سمجھ نہ سکا، تاہم وہ اپنے اصول پر پختگی سے قائم رہا اور کینیڈا کے ان فرانسیسی کیتھولکوں کے لیے بھی ذمہ دار حکومت کی تجویز پیش کر دی۔ وہ لکھتا ہے:-

"ہم نے زیریں کینیڈا کی آئندہ حکومت کے لیے جو تجویزیں پیش کی ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے.... کہ اس صوبے کی حکومت بالکل مطلق العنانی کے اصول پر جاری رکھی جائے یا اس کا انتظام برطانوی اقلیت کے حوالے کر دیا جائے۔ تجویز یہ ہے کہ یا تو قانون سازی کا پورا اختیار گورنر کی تحویل میں دے دیا جائے اور اس کے ساتھ ایک مجلس ہو، جو برطانوی جماعت کے اکابر پر مشتمل ہو یا نمائندگی کا کوئی ایسا منصوبہ تیار کر لیا جائے، جس کے مطابق اقلیت...... اکثریت کو معاملات کے انتظام میں رائے دینے سے محروم رکھ سکے۔"

"شمالی امریکہ کے کسی حصے میں مطلق العنان حکومت قائم کرنے کا سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اس سے ریاستہائے متحدہ میں اس قوت کے خلاف احساس پیدا ہوگا، جسے اس قسم کے ناپسندیدہ ذرائع سے قائم رکھنے کی کوشش کی جائے گی، لیکن میں زیریں کینیڈا میں اپنی حکومت کی پالیسی کے ساتھ ریاستہائے متحدہ کی موجودہ ہمدردی کو برقرار رکھنا حد درجہ ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہوگا کہ یہ احساس ایک حصے کے متعلق پیدا کیا جائے اور جو اصول ارد گرد کے صوبوں میں رائج ہوگا، وہی یہاں رائج ہونا چاہیے۔ اس رائے کا اثر پوری فرانسیسی آبادی پر بہت پڑے گا۔ ان میں یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ حکومت ہمارے خلاف ہے اور وہ یقیناً مخالفت کریں گے۔ اس سے خود انگریزوں میں بھی بڑی بے اطمینانی پیدا ہوگی۔ وہ اب بھی حکومت کے خلاف ناراضی کا احساس رکھتے ہیں۔

ممکن ہے تھوڑے عرصے کے لیے وہ ایسے نظام کو برداشت کریں، جس سے انھیں فرانسیسیوں پر فوقیت حاصل ہو جائے لیکن اگر وہ کسی ایسی حکومت کو زیادہ مدّت کے لیے قبول کرلیں جس میں انھیں کوئی رائے دینے کا حق نہ ہو تو میں سمجھوں گا کہ میں نے ان کی سیرت و احساسات کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ ان میں جو رقابت ہے، وہ معتمد علیہ افراد میں سے چند کو منتخب کر کے ختم نہیں کی جاسکتی۔ یہ جان لینا آسان نہیں کہ معتمد علیہ کون ہے اور میری رائے ہے کہ کسی ذی اثر آدمی کو حقیقی اثر سے محروم کر دینے کا زیادہ سے زیادہ یقینی ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اسے عوام کی رائے کے بغیر ان کا نمائندہ مان لیا جائے۔۔۔۔۔

"لیکن مطلق العنان وضع کی حکومت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس کی حیثیت بداہتہً عارضی ہوتی ہے اور یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ چند سال ایسی حکومت کے ماتحت گزارنے کے بعد لوگوں میں اپنے انتظامات سنبھال لینے کی اہلیت خود بخود پیدا ہو جائے گی بلکہ اس کے برعکس یہ ادارہ عارضی ہونے کے باعث استواری سے محروم ہوگا، حالانکہ بدنظمی کے زمانے میں شورائی حکومت کی ایک لازمی شرط ہے۔ یہ یقین کرنے کے تمام وجوہ موجود ہیں کہ بظاہر غیر ذمہ دار حکومت سب سے بڑھ کر کمزور ثابت ہوگی۔ اس حکومت کا ہر فعل نہ صرف نوآبادی میں، بلکہ انگلستان میں بھی زیر بحث لایا جائے گا اور اس سلسلے میں نامکمل و غلط اطلاعات سے کام لیا جائے گا اور اسے سمجھے بغیر ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ جو لوگ ان چیزوں پر انگریزی اور دستوری تصورات کے ذریعے سے غور کریں گے یا جنھیں ملک کے اندر نامناسب مقاصد کو ترقی دینے کی امید ہوگی، وہ سب سے بڑھ کر شور مچائیں گے اور ہمیشہ اس کی مخالفت کریں گے۔ یہ نتائج بالکل ناگزیر ہیں۔[1]

ڈرہم نے جو سفارشیں کی تھیں، وہ برطانیہ کے عام انداز کے مطابق جزواً جزواً اور رفتہ رفتہ عمل میں آئیں۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں برطانیہ نے قانون اتحاد منظور کیا۔ یہ پہلا قدم تھا۔ اگرچہ اس کے ذریعے سے بالائی اور زیریں کینیڈا متحد ہو گئے، لیکن ذمہ داری کے اہم معاملات کے متعلق حد بندی نہ کی گئی۔ مثلاً اگر ذمہ داران کو قانون ساز مجلس میں شکست ہو جائے تو وہ استعفاء دیں گے یا نہیں۔ تقریباً دس سال بعد لارڈ ایلجن کی گورنری کے زمانے میں یہ اصول عملاً قائم کر دیا گیا، جو کبھی واپس نہ لیا گیا۔ دوسرے قدم میں بھی غیر معمولی عجلت سے کام نہ لیا گیا۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں برطانوی شمالی امریکہ کے اتحاد کا قانون منظور ہوا۔ اس

۱؎ سر ریجینلڈ کوپ لینڈ (The Durhem Report (Coupland) ص ۱۵۵-۱۵۷

سے نیوفاونڈلینڈ کے سوا شمالی امریکہ کے تمام صوبے متفق ہوگئے۔ نیوفاونڈلینڈ قدیم ترین آبادی تھی۔ اس کے رجحانات علیحدگی اس درجہ سخت تھے کہ ۱۹۴۹ء تک وہ کینیڈا کے ساتھ شامل نہ ہوا۔ ۱۸۶۷ء کے قانون کے مطابق کینیڈا کو ڈومینین بنا دیا گیا۔ اونٹیریو، کوبیک اور ساحلی صوبے بھی اس میں شامل کر دیئے گئے۔ یہ انتظام بھی کر دیا گیا کہ مغربی جانب کے علاقوں میں آبادی کے ساتھ ساتھ جو صوبے بنتے جائیں گے، وہ اسی طرح ڈومینین میں شامل ہوتے جائیں گے، جس طرح ریاستہائے متحدہ میں مغربی ریاستیں شامل ہوتی گئیں۔ لیکن کینیڈا میں سابقہ حیثیت کی کئی چیزیں باقی تھیں، مثلاً خطابات، جن میں سے نائٹ ہڈ کے لیے "سر" ضروری تھا اور یہ سراسر غیر جمہوری خطاب تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ کینیڈا کے عدلیہ سے کوئی اپیل ویسٹ منسٹری کی پریوی کونسل کے پاس چلی جاتی۔ پھر بین الاقوامی معاملات، مسلح افواج، حق علیحدگی وغیرہ کے متعلق برطانیہ اور کینیڈا کے درمیان غیر منفصل تھے اور ۱۹۳۱ء کے ضابطۂ ویسٹ منسٹر تک جاری رہے۔

درجۂ مستعمرات میں توسیع

تاہم انیسویں صدی میں برطانوی دولت مشترکہ اصولاً پختگی سے قائم ہوگئی۔ یہ عمل سب سے پہلے کینیڈا میں تکمیل کو پہنچا۔ اسی سے دوسری انگریزی نوآبادیوں میں کام لیا گیا۔ نظر ہمیشہ عوامی معاملات پر رہی، لیکن پیش آنے والے ہر قسم کے حالات میں پختہ منطقی بنیادیں استوار کر لی گئیں (عام خیال یہ ہے کہ انگریز افکار یا منطقی پروگرام کی پیروی نہیں کرتے۔ یہ خیال کتنا ہی تسلی بخش ہو، لیکن یہ غلط افسانہ ہے، جو کچھ مدت سے ان کے متعلق تیار کر لیا گیا ہے) بہرحال درجۂ مستعمرات میں توسیع ڈرہم کی روداد اور اس کے افادیت پسندانہ لبرل نظریات پر مبنی تھی۔

آسٹریلیا کے صوبوں کی اصل و نسل مشترک برطانوی تھی اور وہ بہت کم مدت سے جداگانہ علاقائی وحدتیں رہی تھیں۔ ان میں سب سے پرانا صوبہ نیو ساؤتھ ویلز تھا جس کی ابتدا ۱۷۸۸ء میں ہوئی، لیکن ان صوبوں کے درمیان مقامی اختلافات پیدا ہوگئے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی اپنی ریل کی سڑکوں کے لیے بھی جداگانہ چوڑائیاں اختیار کیں۔ ۱۸۵۰ء میں آسٹریلیائی نوآبادیوں کی حکومت کا قانون[1] منظور ہوا۔ اس طرح ان کی خودمختاری کا آغاز ہوا، لیکن نیو ساؤتھ ویلز[2]، وکٹوریا[3]، کوئینزلینڈ اور دوسرے صوبوں کا دفاعی اتحاد اس وقت تک بروئے کار نہ آسکا، جب تک دولت مشترکہ آسٹریلیا کی بنیاد نہ پڑی۔ دولت مشترکہ کے دستور میں امریکی مثال کا اثر واضح ہے، جس میں ایک سینٹ کا انتظام کیا گیا اور سینٹ کے لیے چھ دولتوں کے نمائندوں کی تعداد یکساں رکھی گئی۔ ایک ایوان مندوبین تجویز ہوا جس کی نمائندگی

---

[1] Australian Colonies Government Act

[2] New South Wales

[3] Victoria

آبادی پر مبنی تھی۔ ایک سپریم کورٹ بنا دیا گیا، جسے امریکہ کی عدالتی نظرِ ثانی والے ادارے سے مشابہ سمجھنا چاہیے، مگر آسٹریلیا اور دوسری برطانوی مستعمرات میں پارلیمانی نظام اور ایک ایگزیکٹو (وزیرِ اعظم اور کابینہ) جسے قانون ساز مجلس ووٹوں سے برطرف کر سکے، قائم رکھا گیا۔ امریکہ کا صدارتی نظام عمداً مسترد کر دیا گیا۔

کینیڈا کی طرح آسٹریلیا بھی ۱۸۰۰ء میں ایک حامی ملک تھا اور کینیڈا کی طرح یہاں بھی آہستہ آہستہ تارکینِ وطن پہنچتے رہے، جو زیادہ تر انگریز تھے۔ غالباً ریاستہائے متحدہ کے اعلیٰ انتظامات اور ترکِ وطن کر کے جانے والے اہلِ یورپ کے لیے زیادہ کشش کے باعث برطانوی مستعمرات کے نشو و ارتقا کی رفتار سست رہی، لیکن یہ عمل اگرچہ سست تھا، مگر استقلال سے جاری رہا اور ۱۹۱۴ء تک عام نو آبادیاں، جن میں نیوزی لینڈ کے خاموش جزیرے بھی شامل تھے ـــــ اور جو روایتہً سب سے بڑھ کر انگریزی نو آبادی تھی ـــــ خوشحال جمہوری معاشرے تھیں، جو آہستہ آہستہ طبعی صورتِ حال پر آ رہی تھیں۔ ان کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے، لیکن ہم اسے یہاں چھیڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح ایک اور موضوع بھی بڑا مسحور کن اور دانش افروز ہے ـــــ افسوس کہ اس پر اب تک پوری توجہ نہیں ہوئی ـــــ یعنی ریاستہائے متحدہ اور ان نئے ملکوں کی منضبط حیثیتوں میں مشابہت و عدم مشابہت کا مسئلہ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب "سرحدات" سے پیدا ہوئے۔

برطانوی دولتِ مشترکہ میں اقلیتوں کا مسئلہ

زیادہ تر مستعمرات میں اقلیتوں کا مسئلہ موجود تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان میں سب سے بڑھ کر نازک مسئلہ جنوبی افریقہ کی یونین میں پیش آیا، جسے ۱۹۱۰ء میں درجۂ مستعمرات ملا۔ دوسری مستعمرات میں حقیقتہً یورپی ہی آباد ہوئے، لیکن جنوبی افریقہ میں غیر یورپی آبادی یورپیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی، پھر جنوبی افریقہ کے یورپی بھی باہم بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ولندیز اور ہوجینات آباد کاروں کے اخلاف کو خفیف سی اکثریت حاصل تھی۔ وہ ولندیزی بولی بولتے تھے اور انگریزی بولنے والے لوگوں کو اگرچہ اقلیت حاصل تھی، لیکن ان کی آبادی بھی زیادہ تھی۔

کینیڈا میں صرف چند ہزار فرانسیسی آباد کاروں کی حیثیت میں پہنچے، لیکن یہ گروہ ۱۹۰۱ء تک پندرہ لاکھ کے قریب ہو گیا تھا، اگرچہ کوبیک سے اکثر لوگ نیو انگلینڈ کے صنعتی قصبوں میں منتقل ہو گئے۔ کوبیک کے صوبے میں اقتدار انھیں لوگوں کو حاصل تھا، جو فرانسیسی تھے اور وہ اونٹیریو، نیز نئے مغربی صوبوں میں پھیل رہے تھے۔ انھیں خود اختیاری کا ایک خاصا درجہ حاصل تھا، کیونکہ ابتدائی اتحاد میں طے کر دیا گیا تھا کہ فرانسیسی کو انگریزی کے برابر درجہ حاصل ہوگا اور انھیں خاص حقوق بھی دے دیئے گئے تھے، مثلاً خزانۂ عامہ سے کیتھولک سکولوں کے لیے امدادیں، جن میں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی۔ بہ حیثیت عمومی کینیڈا کا تجربہ دو گروہوں کے وفاق کے سلسلے میں خاصا حوصلہ افزا تھا، حالانکہ یہ وفاق دونوں گروہوں کے درمیان تھا، جو زبان اور مذہب کے اعتبار سے مختلف تھے اور یہ تجربہ ان لوگوں کے لیے بطورِ خاص حوصلہ افزا تھا، جو قومیت کی حدوں سے بالا رہنا چاہتے تھے۔ حالانکہ گرد و پیش قومی احساسات

نے تازیانے لگا لگا کر معاملہ ۱۹۱۴ء میں انفجار پر پہنچا دیا تھا۔ ہم آگے چل کر کینیڈا کے اس تجربے کے متعلق مزید غور کریں گے۔
نیوزی لینڈ میں چند لاکھ ماؤری موجود تھے۔ یہ قبیلہ پولینیشیائی باشندوں سے ملتا جلتا تھا، جو بحرالکاہل کے وسطی جزیروں میں رہتے تھے۔ انیسویں صدی میں پولینیشیائی لوگ اہلِ یورپ کی ترکتازوں کا دفاع کامیابی سے نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ مقابلے میں محو ہوتے رہے، حتیٰ کہ ہوائی میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ ماؤریوں کی تعداد زیادہ تھی اور ان کے پاس جگہ بھی زیادہ تھی۔ وہ یورپیوں کے خلاف اسی طرح لڑے، جس طرح میدانوں اور پہاڑوں کے انڈین امریکیوں سے لڑتے تھے۔ آخر انھوں نے شکست کھائی اور ۱۸۷۰ء میں دوسری ماؤری جنگ کے اختتام پر انھوں نے پیش آمدہ حالت قبول کر لی۔ زمینیں بھی چھینیں اور محو ہو جانے کا خطرہ بھی سامنے آ گیا، تاہم انھیں نیوزی لینڈ کی پارلیمنٹ میں چار نمائندے بھیجنے کا حق مل گیا اور وہ اُتنے ذلت خیز برتاؤ کے ہدف نہ بنے جس کے ہدف اس وقت تک امریکہ کے انڈین بنے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک یہ واضح ہو گیا کہ تمام پولینیشیائی گروہوں میں سے صرف ماؤری تھے، جن کی تعداد میں تخفیف کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وہ نیوزی لینڈ کے اندر کوئی ایسی اقلیت نہ تھے، جس سے آگے چل کر خطرہ پیدا ہو سکتا اور اس سرزمین میں عمرانی تحفظ کے لیے حد درجہ ترقی یافتہ قوانین دنیا کے لیے جاذبِ نظر بن چکے تھے۔

برطانوی دولتِ مشترکہ پر تبصرہ

انیسویں صدی میں امریکیوں نے مغرب کی طرف اور روسیوں نے مشرق کی طرف پیش قدمی کر کے لاکھوں میل رقبہ آبادکاری کے لیے محفوظ کر لیا۔ اگرچہ دونوں جگہ خصوصاً امریکہ میں "عملِ سرحد" قومی کردار پر اہم اثر ڈالنے والا تھا، لیکن اس نے آبادکاروں کی آزادی کے متعلق بڑے مسئلے پیدا نہ کیے، جن کا فوری حل ضروری ہوتا۔ انگریز نوآبادیوں کے لیے ہزاروں میل سمندر پار چلے گئے، لیکن انھیں جلد معلوم ہو گیا کہ یہ نوآبادیاں اس طرح کے برتاؤ کی متحمل نہیں ہو سکتیں، جو سنہ ۱۲۵ء سے رومیت کے طور پر چلا آتا تھا، یعنی یہ ممکن نہ تھا کہ انھیں مادرِ وطن کی دور افتادہ چوکیاں سمجھ لیا جاتا اور کوئی سیاسی خود اختیاری نہ دی جاتی، بلکہ تجارتی نظریۂ زر کے اقتصادیات میں محض کڑیاں سمجھا جاتا۔ نہ یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ مادرِ وطن کے علاقے میں اضافہ ہیں، کیونکہ بیچ میں وسیع سمندر حائل تھے۔ ان کی حیثیت سائبیریا یا مغربی امریکہ کی نہ تھی۔ ۱۹۱۴ء تک انگریزوں نے اپنے وطن میں اور سمندر پار نوآبادیوں کے شہریوں نے باہم ایسا سیاسی سمجھوتا کر لیا تھا، جس کی کوئی مثال تاریخ انسانی کے مختصر سے دور میں نہیں ملتی۔ اسے ساتویں صدی قبل مسیح کے یونانی استعمار سے ایک خفیف سی مناسبت ہے۔ جو یونانی ملک چھوڑ کر باہر جاتے تھے وہ اپنی آزادی اور شہریت بھی ساتھ لے جاتے تھے اور کئی سرزمینوں میں نئی ریاستیں قائم کر لیتے تھے۔ اگرچہ نئی ریاستیں ابتدائی حُبِ وطن قائم رکھتی تھیں تو اس حالت میں اپنے آپ کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بالکل آزاد سمجھتی تھیں۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ۱۹۱۴ء تک کاملاً خود مختار تھے۔ وہ اس بات کے بھی مجاز تھے کہ برطانیہ سے آنے والے مال پر محصول وصول کریں اور انھوں نے وصول کیا۔ انھوں نے اپنی فوجیں تیار کر لی تھیں اور ان کی اپنی داخلی پولیس تھی۔ یہی سیادت کے واضح ترین اوصاف ہیں، بلکہ

وہ سوچنے لگے تھے کہ آیا وہ سیادت کے دوسرے واضح وصف کے مالک ہیں یا نہیں، یعنی اپنے خارجی تعلقات کا انتظام وہ خود کریں۔ ان کے سفیر ہر جگہ موجود ہوں۔ ان کی فوج بجائے خود ذمہ دار ہو۔ مثلاً کیا کینیڈا کسی ایسے ملک سے صلح رکھ سکتا ہے، جس سے برطانیہ برسرِ جنگ ہو؟

۱۹۱۴ء میں امتحانی دور آگیا۔ تمام نوآبادیوں نے جرمنی اور اس کے حلیفوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ سب سے بڑھ کر مشتبہ معاملہ جنوبی افریقہ کا تھا، لیکن وہ بھی اس قیصر کے خلاف جنگ میں شریک ہوا، جس نے کروگر کے نام تار بھیجا تھا۔ ہمیں یہ صاف صاف بیان کر دینا چاہیے کہ بوئر زمین کے بھوکے تھے۔ ان کی نظریں افریقہ کی جرمن نوآبادیوں پر جمی ہوئی تھیں اور سب سے بڑھ کر اس خالی نوآبادی پر، جسے جنوبی و مغربی جرمن افریقہ کہتے تھے۔ یہ نوآبادی افریقی یونین سے متصل تھی۔ ہر نوآبادی کی حکومت نے رسمی طور پر اعلان جنگ کیا، جیسے آزاد ملک کرتے ہیں، لیکن یہ ظاہر تھا کہ حقیقۃً کینیڈا اور برطانیہ کے درمیان تعلقات زیادہ گہرے ہیں۔ یونانی میسلیا یا سسلی کے سائرا کیوز اور یونان کے درمیان تعلقات اتنے قریبی نہ تھے۔ نوآبادیوں نے اپنے جداگانہ ادارے قائم نہیں کر لیے تھے۔ ابھی وہ پکے ہوئے پھل کی طرح درخت سے نہیں گرے تھے۔ برطانیہ اور نوآبادیوں کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت واضح نہ تھی اور اعتراف کر لینا چاہیے کہ آج بھی پوری طرح واضح نہیں، مگر یہ ربط و تعلق موجود ہے اور ہم اس پر اس وقت متوجہ ہوں گے، جب اپنے عہد کے سامراج پر بحث کریں گے۔

پہلی عالمی جنگ

۴۹

انچاسواں باب

پہلی عالمی جنگ کے اسباب

(۱)

تمہید ۲۸ رجون ۱۹۱۴ء کو آرچ ڈیوک فرانسس فرڈیننڈ ہیپسبرگ ولیعہد تخت آسٹریا، ہنگری اور اس کی بیوی سراجیوو کے ایک بازار میں قتل کر دیئے گئے، جو نئے الحاق شدہ صوبے بوسنیا کا مرکز حکومت تھا (اس کا الحاق ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا) قاتل کا نام پرنسپ[1] تھا، جو سرویا کا ایک قوم پرست تھا۔ بوسینا پر مدت سے سرویوں کی نظر تھی اور صوبے کے بہت سے باشندے چاہتے تھے کہ سرویا سے الحاق ہو جائے۔ آسٹریا اور ہنگری کی حکومت نے سرودی قوم پرستوں کے عزائم سے چوکس ہو کر قتل کے واقعے سے فائدہ اٹھایا اور سرویا کو سخت الٹی میٹم بھیج دیا۔ سرویا نے الٹی میٹم سراسر ٹھکرا دیا۔ اس پر ۱۸ رجولائی کو آسٹریا نے سرویا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں جنگ عام میں شامل ہو گئیں۔ وسطی یورپ کی طاقتیں (آسٹریا، ہنگری اور جرمنی) اتحادیوں (سرویا روس، فرانس اور برطانیہ) کے خلاف تھیں۔ پرنسپ کے ریوالور نے آخر تقریباً ایک کروڑ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جنگوں کا نام عموماً اس وقت رکھا جاتا ہے۔ جب وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی ایک واقعہ یا اطوار سامنے رکھ لیا جاتا ہے۔ جس سے عوام پر خاص اثر پڑا ہو۔ بعض اوقات جغرافیائی عرصۂ پیکار پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اطالوی جنگیں۔ بعض اوقات کسی جنگ کی میعاد سے نام اخذ کر لیا جاتا ہے، مثلاً اسی سالہ جنگ بعض اوقات کسی علت کی بنا پر نام رکھ دیا جاتا ہے، مثلاً ہسپانوی جانشینی کی جنگ۔ بعض اوقات کسی حکمران کے نام سے جنگیں موسوم ہو جاتی ہیں، مثلاً محاربات نپولین۔ مگر پیشہ ور مؤرخ جنگوں کے نام کی بحث میں شاذ ہی پڑتے ہیں، ورنہ ۱۹-۱۹۱۴ء کی جنگ کو ہم پہلی عالمی جنگ یا عالمی جنگ نمبرا نہ کہتے۔ اس کتاب کے خوانندگان کرام جانتے ہیں کہ پیشتر بھی عام جنگیں لڑی گئیں، سمندر میں بھی اور خشکی پر بھی۔ بعض پرانی دنیا کے بیشتر حصوں میں ہوئیں اور نئی دنیا میں بھی، لہٰذا بداہتہً وہ بھی عالمی جنگیں تھیں۔ خوانندگان کرام

---

[1] Princip

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کی جنگوں میں سے کوئی ایک عالمی جنگ نمبر ا کہلانے کی زیادہ مستحق تھی، لیکن ان معاملات میں عملِ اعانت ہی اصل عامل ہے۔ جو جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی، وہ شرکاء کے نزدیک جنگِ عظیم تھی، لیکن ہماری نسل نے اسے پہلی عالمی جنگ قرار دیا، کیونکہ ۱۹۳۹ء میں ایک اور عالمی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

یہ پہلی جنگ عام تھی جس میں انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کے بعد عالمی نظام مملکت کے زیادہ تر ارکان شریک ہوئے۔ جو صدی گزری، اس میں بھی جنگیں ہوئیں، لیکن وہ صرف دو فریقوں کی جنگیں تھیں، مثلاً ۱۸۷۰ء میں فرانس و پروشیا کی جنگ۔ ۶۵-۱۸۶۱ء میں شمالی و جنوبی امریکی ریاستوں کی خونریز جنگ اور باغی مقامی باشندوں کے خلاف استعماری جنگوں کا پورا سلسلہ۔ ۱۸۵۳ء میں کریمیا کی جنگ چھڑی جس میں ایک طرف روس تھا، دوسری طرف برطانیہ، فرانس، ترکی اور پیڈماں۔ اسے بھی پھیلنے سے روکنے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ یہ چھوٹے سے جزیرہ نمائے کریمیا میں مقامی لڑائیوں تک محدود رہی۔ اگر کوئی ماہر عددیات ہر جنگ کے سلسلے میں اعداد فراہم کرے، جن میں بڑی بڑی طاقتوں کی باہمی جنگیں بھی ہوں، انقلابی ہنگامے بھی اور سرکش قبائل کے خلاف تادیبی مہمیں بھی — جیسے امریکہ میں بعض دیسی قبائل کے خلاف مہمیں بھیجنی پڑیں — یوں ۱۸۱۵ء سے ۱۹۱۴ء تک ان سب کے اعداد و فراہم کر لیے جائیں تو وہ سب بڑی پُرامن معلوم ہوں گی۔ یہ لڑائیاں رائے عامہ پر ویسا اثر پیدا نہ کر سکیں، جیسا ہمہ گیر جنگوں یا عالمی جنگوں نے پیدا کیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے سلسلے میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر لوگوں کے نزدیک ایسی جنگ بالکل غیر ممکن تھی۔ یہ لوگ بڑے لبرل تھے اور ان نازک واقعات سے ظاہر ہو گا کہ جنگ عامہ بعض اوقات کتنی قریب ہوتی ہے، لیکن وہ لوگ امید و توقع کے ساتھ بین الاقوامی امن اور تعاون کی تحریکوں سے وابستہ رہے، مثلاً صلیب احمر، مزدوروں کی بین الاقوامی تحریک، ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنسیں، جو اگرچہ تحدید اسلحہ کا اعلان کردہ مقصد پورا نہ کر سکیں، تاہم بین الاقوامی جھگڑوں میں ثالثی کے لیے انھوں نے ایک ٹریبونل بنا دیا یعنی عالمی عدالت۔

نورمن اینجل نام ایک انگریز نے ۱۹۰۹ء میں ایک کتاب لکھی تھی، "وہمِ عظیم"[۱]۔ اس میں برسوں کی ذہنی حالت کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اینجل کا نظریہ یہ تھا کہ جنگ فاتح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، کیونکہ دنیا کی نئی پُرپیچ اقتصادی زندگی کا سلسلہ جنگِ عالم سے ایسی بری طرح درہم برہم ہو جائے گا کہ فاتح اور مفتوح دونوں جنگ کے بعد غریب تر نظر آئیں گے۔ اینجل کو انسانی عقل پر پورا بھروسا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اگر ہر شخص کو احساس ہو جائے، اس کا ملک جنگ میں ہار جائے گا تو جنگ کبھی شروع نہ ہو گی۔ جن لوگوں کو اینجل کے نظریے سے اختلاف تھا اور جو سمجھتے تھے کہ جنگ عام ضرور چھڑے گی، انھیں یہ یقین تھا کہ یہ بہت جلد ختم ہو جائے گی کیونکہ اس سے مغربی معاشرے کے پورے نظام کا درہم برہم ہو جانا بالکل واضح

۱۔ The Great Illusion

نظر آتا تھا۔

تاہم پہلی جنگ خاصی طویل خونریز اور تباہ کن تھی۔ اس کے آغاز کا خلاصہ دوران جنگ کے تیز ہنگاموں کے باعث بہت بڑھ گیا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ جنگ کے بعد صلح و امن کے صحیح فیصلے میں صریح ناکامی ہوئی۔ موجودہ صدی کے تیسرے عشرے میں اسباب جنگ کے متعلق ایک حد درجہ غیر معمولی بحث چھڑ گئی۔ یہ بحث صرف پیشہ ور مورخوں تک محدود نہ تھی۔ یہ اخباروں میں بھی جاری رہی۔ پلیٹ فارموں سے تقریریں بھی ہوئیں اور وہ تمام وسیلے اس بحث میں استعمال ہوئے، جن کا تعلق رائے عامہ سے ہے۔ بحث کا زیادہ تر مقصد یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء کے معاہدۂ ورسائی کے فیصلے پر نظر ثانی کر لی جائے جس میں فاتح اتحادیوں نے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے لیے جرمنی اور آسٹریا ہنگری کو مجرم قرار دیا تھا۔ شکست خوردہ جرمنوں کو صلح میں سزا دی گئی۔ وہ بدیہی وجوہ کی بنا پر اپنے آپ کو جنگ کے معاملے میں بے گناہ قرار دینے کے لیے ساعی تھے، مگر برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں بھی رائے عامہ کے ایک حصے کا رجحان نظر ثانی کی تحریک کے حق میں تھا۔ یہ معاملہ اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ بعض امریکی مورخوں نے مختلف جرائم فاتحین اور مفتوحین کے ذمے لگا دیئے تھے اور کیفیت ایسی تھی، جیسے مدرسے کا استاد طلبہ کو اعزاز اور بے اعزازی کے سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔

آج ہم اس معاملے میں ویسے با اعتماد نہیں۔ مزید غور و تحقیق سے جنگ کی مجرمیت کا مسئلہ تاریخی سلسلۂ ارباب کے مسئلے میں گم ہو جاتا ہے اور خود تاریخی المیہ بن جاتا ہے۔ ہم انگریز مصنف جارج میریڈتھ[1] کے ہمزبان ہو کر کہہ سکتے ہیں:

"زندگی کے المیے میں کسی شیطان کی ضرورت نہیں، جذبات ہی سازش کا تار و پود تیار کرتے ہیں۔ ہم اپنے نفس کی برائی کے باعث نقصان اٹھاتے ہیں۔"

کوئی طاقت یا طاقتوں کا کوئی گروہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کا ذمہ دار نہ تھا۔ اس کے اسباب مغربی تہذیب و تمدن کے نظام ملک داری کی تاریخ میں گہرے چلے گئے اور ۱۸۷۰ء سے اس تہذیب و تمدن کی تاریخ میں نمایاں ہیں۔ فرانسس فرڈینڈ کے قتل کی ڈرامائی تاریخ (۲۸ جون ۱۹۱۴ء) دراصل بعید اسباب و عوامل اور قریب اسباب و عوامل کے درمیان حد فاصل ہے۔

توازنِ قوی میں تغیر بعید اسباب و عوامل سے ایک بدیہی عامل، جس نے جنگ کو اغلب بنایا، جرمنی اور اٹلی کا اتحاد تھا۔ یہ دو نئی بڑی حکومتیں انیسویں صدی کے ساتویں اور آٹھویں عشرے میں بنیں اور ان کی وجہ سے یورپ کے نظام ملک داری میں توازن قوی، جو پہلے ہی نازک چلا آتا تھا، متغیر ہو گیا۔ آئندہ چالیس سال میں مدبروں کی کوششیں یہ رہیں کہ نظام کو متوازن کر لیا جائے اور نئی طاقتوں کے وجود و مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا جائے، لیکن یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ جو طاقتیں پہلے سے مختلف چیزیں سنبھالے بیٹھی تھیں۔ وہ کچھ بھی چھوڑنے

---

[1] George Meredith

کے لیے تیار نہ ہو سکتی تھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سے موجودہ یورپی یا مناسب تر یہ ہے کہ کہیں مغربی نظام ملک داری ازمنۂ وسطیٰ کی چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں سے مملکتوں کی صورت میں ارتقاء پذیر ہوا تو مملکتیں پھیلاؤ کی کوشش کرتی رہیں۔ انھوں نے دولت و ثروت، وقار و وقعت اور سب سے بڑھ کر علاقوں کی توسیع میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں قومی برتری کا اصول مسلّم ہو چکا تھا۔ سوئٹزرلینڈ اور سویڈن جیسی چھوٹی چھوٹی مملکتیں بھی ہڑپ نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اور یورپ میں نہایت کم علاقہ رہ گیا تھا، جس سے مختلف شاکی طاقتوں کو مطمئن کیا جا سکتا۔ جرمنی اور اٹلی کے اتحاد نے وہ علاقے ختم کر دیئے تھے، جنھیں ہمیشہ تلافیٔ مافات کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ صرف جنوبی و مشرقی یورپ میں بلقان کی زمینیں رہ گئی تھیں، جن کی مالک رو بہ زوال عثمانی سلطنت تھی۔ حریص طاقتیں انھیں علاقوں میں سے جو کچھ ممکن تھا لے سکتی تھیں لیکن وہاں بھی قومی احساس ترقی پر تھا۔ رومانیا، سرویا، بلغاریہ، یونان کی ریاستیں بن گئی تھیں اور نگاہیں بلقان پر جمی ہوئی تھیں۔ بلقان پر قابض ہو کر یہ دونوں سلطنتیں ترکی اور مشرقِ قریب میں پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ جرمنی اور برطانیہ بھی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

یورپ سے باہر ایسے علاقے انیسویں صدی کے ربع آخر میں بھی موجود تھے، جنھیں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ ان علاقوں میں برّاعظم افریقہ، ایشیا اور اوشیانا کے کچھ حصے اور سب سے بڑھ کر کمزور سلطنتِ چین شامل تھی۔ پیشتر کے چالیس سال میں تقریباً وہ تمام بڑی طاقتیں، جنھوں نے ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں حصہ لیا، افریقہ اور ایشیا کے باقی ماندہ حصوں کے لیے مسابقت میں شریک ہو چکی تھیں۔ انھوں نے یا تو ان علاقوں کا الحاق پسند کیا، انھیں اپنی حمایت میں لے لیا یا وہاں حلقۂ اثر قائم کر لیا۔

اس اثناء میں یورپ کے اندر اور باہر رقابتوں سے متاثر ہو کر بڑی طاقتیں باہم اتحاد کے رشتے جوڑ رہی تھیں اور عہد نامے کر رہی تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں دو فریق موجود تھے، ایک اتحادِ ثلاثہ یعنی جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کا معاہدہ، دوسرا ائتلافِ ثلاثہ یعنی فرانس، برطانیہ اور روس کا عہد۔ بہت سے لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا، نظام اس درجہ سختی سے مرتب ہو چکا ہے کہ کسی کے لیے آزادی کی گنجائش نہیں رہی اور اب ہم عقل عاقبت بیں سے کام لے کر کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۰۰ء کے بعد کوئی بھی واقعہ جنگ کا باعث بن سکتا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ سراجیوو میں ولیعہد آسٹریا کا قتل اس کا موجب بن گیا۔

ایک انگریز صاحب علم لووس ڈکنسن[1] نے یورپی طاقتوں کے ہنگامے کو بالکل بجا "بین الاقوامی انارکی" قرار دیا ہے اور مثالوں پر مثالیں پیش کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کے ایک ہی ٹکڑے کے لیے دو آبادو طاقتیں خواہشمند تھیں تا کہ اُسے اپنے اندر شامل کر لیں یا وہاں اپنا حلقۂ اثر بنا لیں۔ فرانس اور برطانیہ دونوں مصر کے خواہاں تھے۔ فرانس اور جرمنی دونوں چاہتے تھے کہ مراکش ان کے ہاتھ آ جائے۔ روس اور آسٹریا و ہنگری دونوں بلقان پر ضبط و نظم قائم کر لینے کے خواہاں تھے۔ روس

---

[1] Lowes Dickinson

اور جاپان دونوں منچوریا مانگتے تھے ۔ بس ہر مقام کے لیے یہی کیفیت تھی ۔ مفاہمتیں ہوئیں، سرزمینیں اور حلقۂ اثر بٹے، لیکن اتنی چیزیں تھیں ہی نہیں کہ سب کو مطمئن کیا جا سکتا ۔

اس کشمکش میں "داراؤں" اور "ناداروں" کے درمیان بھی فرق کر لینا چاہیے ۔ "داراؤں" سے مراد وہ طاقتیں ہیں، جنھوں نے مال غنیمت سے پیٹ بھر لیے تھے اور "ناداروں" سے مراد وہ ہیں جو سابقہ مقابلے میں کوئی قابل ذکر چیزیں حاصل نہیں کر سکی تھیں ۔ "ناداروں" میں سب سے نمایاں حیثیت جرمنی اور اٹلی کی تھی ۔ یہ ملک اس وقت تک متحد نہیں ہوئے تھے، جب دوسری قومیں سمندر پار پھیل رہی تھیں اور یہ دونوں ملک ۱۸۷۰ء تک استعماری سلطنتیں نہیں بنے تھے ۔ انھیں صرف امریکہ اور اوشیانا کے بچے کھچے علاقوں پر قانع ہونا پڑا ۔ جن کے پاس کچھ نہیں تھا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں پیشدستی کرتے رہے ۔ جن کے پاس سب کچھ تھا ان کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجودہ حالات کے قیام کے لیے ساعی تھے "داراؤں" میں سے طاقتور برطانیہ بھی کچھ نہ کچھ لے لینے کا خواہاں تھا، جن کے لیے دوسرے دست طلب دراز کر رہے تھے ۔ یہی زمانہ ہے، جس میں جرمنی نے متحد ہو کر ترقی کی راہ میں قدم رکھا ۔ اس کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی ۔ اس کے صنعتی اقتصادیات اعلیٰ پیمانے پر پہنچ گئے ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر نظام میں کوئی زبردست تغیر ہوا تو اس سے جرمنی ہی کو زیادہ فائدہ پہنچے گا ۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ جرمنی حالات میں تبدیلی کا سب سے بڑھ کر خواہاں تھا اور برطانیہ، جو پہلے سے قائم شدہ دنیا کا لیڈر بنا بیٹھا تھا، جسے قوت اور وقار میں ممتاز حیثیت حاصل تھی، سابقہ حالت کی بحالی کا سب سے بڑا مدافع تھا، یعنی وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ قائم ہو چکا ہے، وہ بدستور باقی رہے ۔

رائے عامہ

ہم نے سرسری خاکے میں کچھ نام استعمال کیے، مثلاً برطانیہ یا جرمنی ۔ یہ محض دو نشان تھے، جیسا کہ نقشے پر رنگدار نشان قائم کر لیے جاتے ہیں اور وہ لاکھوں انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جن کی خواہشیں دوستوں کے اعمال میں شامل ہو جاتی ہیں اور ۱۹۱۴ء کی جنگ تک شامل ہوتی رہیں ۔ کوئی مملکت ایسی نہیں جس کے کروڑوں باشندے متفق ہوں ۔ ایسے جرمن موجود تھے، جو افریقہ یا کسی دوسری زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں لینا چاہتے تھے ۔ ایسے انگریز موجود تھے جو دنیا میں برطانیہ کے حاصل کردہ مقام پر قانع ہونے کے بجائے چاہتے تھے کہ اور کچھ مل جائے اور برطانیہ دنیا بھر کے لیے وہی حیثیت اختیار کرے، جو پہلی صدی مسیحی کی دنیائے بحیرۂ روم کے لیے رومہ کی تھی ۔ انھیں یہ بھی امید تھی کہ آخر ڈاروِن کے اصول کشمکش پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں کے سوا سب قومیں ختم ہو جائیں گی ۔ یورپ کے ہر حصے میں چند پختہ کار صلح پسند بھی موجود تھے ۔ وہ عزم کیے بیٹھے تھے کہ ہر حال میں لڑائی سے انکار کر دیں ۔ ان کا فیصلہ تھا کہ اگر لڑائی چھڑ جائے تو اعلان کر دیں ۔ کہ ہمارے ضمیر اس پر مطمئن نہیں ۔ ہمیں صرف جنگ اور اس کے واقعات ہی پر نظر نہ رکھنی چاہیئے ۔ یہ سب کچھ ہر قوم کے ان چند افراد کا کام تھا، جو اقتدار کے مالک تھے یا پیشہ ور سپاہیوں کا کام تھا یا شرارت پسند سفیروں اور مدبروں کا ۔ تمام ملکوں کی حیثیت منشور مثلثی کی ہے، جہاں جنگجوؤں سے صلح جو یوں

تک ہر رائے اور فکر کے آدمی موجود ہیں۔

بایں ہمہ جنگ چھڑتے ہی ہر شریک جنگ قوم کی رائے عامہ حکومت کی حمایت کرتی ہی۔ ۱۹۱۴ء میں بعض لوگ اس یقین کے ساتھ جنگ کے لیے نکلے تھے کہ یہ واقعی فائدہ رساں ہے۔ یہاں ایک نوجوان جرمن کا بیان درج کیا جاتا ہے، جو جولائی ۱۹۱۴ء میں آخری ٹرین پر سوار ہو کر سوئٹزرلینڈ سے نکلا۔

"ایک کبیرالسن آدمی ہمارے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ اس نے یوں باتیں شروع کر دیں، گویا ہمارا بے تکلف دوست ہے۔ اس نے اپنے ہوٹل کے بل کی پشت پر یورپی فوجوں کی تعداد لکھ رکھی تھی اور موازنہ کر لیا تھا کہ کیا صورت پیش آسکتی ہے۔ اس نے دونوں گروہوں کے اعداد جمع کر لیے تھے اور میری والدہ کو یقین دلایا تھا کہ جرمن افواج کے اعلیٰ اوصاف روسیوں کی عددی برتری کی تلافی کر دیں گے۔ کیونکہ اس جنگ میں صرف اعلیٰ اوصاف ہی کی بنا پر آخری فیصلہ ہوگا۔ جرمنی کے اوصاف یورپ بھر میں بہترین تھے۔ وہ یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکا تھا، اس لیے جانتا تھا کہ نوجوان اس کشمکش کے لیے تیار ہیں اور ان کے سینے مقاصد و عزائم سے لبریز ہیں۔ وہ آخری ساعت آگئی تھی جس میں ہماری قوم کو اپنا بڑا عالمی مشن شروع کرنا تھا۔ وہ خود گزشتہ چند سال کی مادیت کے باعث مایوسی کے عالم میں تھا، خصوصاً نچلے طبقوں کی مادیت کے باعث مگر آخر زندگی نے ایک مثالی امتیاز حاصل کر لیا۔ انسانیت کے اعلیٰ محاسن — وفاداری، حبِ وطن، ایک مقصد و نصب العین کے لیے جان دے دینے کا جذبہ — کو جرمنی میں آخری پناہ گاہ مل گئی۔ یہ محاسن آج تجارت اور دکانداری پر برتری حاصل کر رہے ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے نور کی ایک ضوفشانی ہے، جس سے دنیا کی فضا صاف ہو جائے گی پھر ایک نئی جرمن قوم پیدا ہوگی جس کی فاتحیت دنیا کو ابتذال، تباہی خیز مادیت، مغربی جمہوریت اور جھوٹی انسان پروری سے بچالے گی پھر انسان ایک نئی دنیا دیکھیں گے، جس کے امن و نظم اور ہدایت و رہنمائی کی ذمہ دار امراء کی ایک نسل ہوگی، جو زوال و انحطاط کا ہر نشان مٹا دیں گے اور عالم انسانیت کو دوبارہ دائمی مقاصد کی ان بلندیوں پر پہنچا دیں گے، جو آج بالکل ویران اور سنسان نظر آتی ہیں۔ جو حد درجہ کمزور ہیں، انھیں راستے میں تباہ ہو جانا چاہیئے۔ یہ جنگ انسانیت کے دامن سے تمام ناپاکیاں دھو ڈالے گی"[1]

---

[1] ارنسٹ گلاشر Class of 1902 Glaesers) ص ۱۷۱ - ۱۷۲

یہ جنگ تھی جس میں بینڈ بجتے رہے اور لوگ گاتے رہے۔ اسی سے مختلف قسم کے گیت پیدا ہوئے، جن کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں ارباب عقل و فکر نے احتجاج کا ذخیرہ فراہم کیا۔ اگرچہ یہ عام لوگوں کے لیے بہت مصیبت خیز ثابت ہوئی۔ بہ ایں ہمہ جو لوگ اس میں شامل رہے، وہ اسے ایک بڑا کارنامہ بلکہ جہاد قرار دیتے رہے۔ لہٰذا ہمیں توازنِ قوی کے بے رنگ تجربات سے قدم آگے بڑھا کر دیکھنا چاہیے کہ عالم لوگ اور اچھے شہری ان واقعات سے متعلق کیا احساس رکھتے تھے جو جنگ کو قریب تر لانے کے باعث تھے۔

جرمنوں کے عزائم

سنہ ۱۹۱۴ء میں اکثر جرمنوں کو بہ صمیم قلب یقین تھا کہ ان کے ملک کو زیر آفتاب مناسب مقام نہیں دیا گیا اور یہ حریف طاقتوں، خصوصاً برطانیہ کی خود غرضی کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ انھیں یقین تھا کہ سنہ ۱۸۷۰ء سے یہ طاقتیں جرمنی کو نیچا رکھنے کے لیے متحد ہوتی رہیں۔ ان کا عزم تھا کہ جرمنی کو کوئی نو آبادی نہ لینے دیں، اسے غریب رکھیں، کسی منڈی میں گھسنے نہ دیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود جرمنی نے افریقہ میں دو بڑے ٹکڑے حاصل کر لیے، اوّل جنوبی و مغربی جرمن افریقہ، دوم جرمن مشرقی افریقہ۔ ان کے علاوہ بعض اور ٹکڑے افریقہ اور روشیانا میں لے لیے۔ جانتے تھے کہ جرمنی کو بھی دوسری بڑی طاقتوں کے ساتھ چین میں قدمگاہ حاصل ہو چکی ہے اور وہ ترکی میں سب سے زیادہ با اثر قوت بن گئی ہے۔ اس طرح اس نے برطانیہ کی روایتی جگہ لے لی ہے۔ جانتے تھے کہ جرمنی کو ہر مقام پر ایک بہت بڑی طاقت مانا جاتا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ جو استعماری سلطنت جرمنی نے حاصل کی تھی، اس کے رقبے اور آبادی کو جس طور بھی چاہو، جمع کر لو، وہ برطانیہ سے بہت کم رہتی ہے۔ فرانس سے بھی کم تھی، جسے جرمنوں نے ۱۸۷۰ء میں بری طرح شکست دی تھی اور جسے وہ ایک زوال پذیر قوم سمجھتے تھے۔ جب کبھی جرمنی مشرق قریب، یا چین یا شمالی افریقہ میں قدم بڑھاتا، برطانیہ اور فرانس کی طرف سے مزاحمت شروع ہو جاتی۔ چنانچہ بہت سے جرمنوں نے مختلف انجمنوں کی رکنیت قبول کر لی، تاکہ اپنے مقاصد پورے کر سکیں۔ ایک بحری جمعیت بن گئی جس کا مدعا یہ تھا کہ بحری طاقت کے لیے سرمایہ اور آدمی فراہم کیے جائیں تاکہ جرمنی کی طاقت انگلستان کے برابر ہو جائے۔ ایک استعماری لیگ بن گئی تاکہ ایسے آدمی فراہم کیے جا سکیں جنھیں نو آبادیوں میں بھیجا جائے اور ایسے نئے علاقے حاصل کیے جائیں۔ بیرونی دنیا میں جرمن ثقافت کی ترقی کے لیے انجمنیں بن گئیں۔ ایک انجمن اس غرض سے بنی کہ جو جرمن ملک چھوڑ کر امریکہ یا دنیا کے دوسرے حصوں میں چلے گئے، انھیں جرمنی کا وفادار رکھا جائے۔ ان جرمنوں کو یقین تھا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا مقصد بہت اچھا ہے، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ دشمنوں نے جرمنی کے گرد جو حصار قائم کر لیا ہے، اسے توڑا جائے۔

اس سلسلے میں جرمنوں کی رہنمائی نوجوان قیصر ولیم دوم نے کی۔ جو ۱۸۸۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ سراجیوو کے واقعۂ قتل کے بعد جو پانچ سرگرم ہفتے گزرے، ان میں قیصر نے وقت کی رائے عامہ کے خلاف جنگ شروع کرانے

کے لیے نہیں، بلکہ روکنے کے لیے انتہائی کوشش کی تھی اور یہ رائے ان لوگوں کی تھی، جو ورسائی کے فیصلے کو بدلوانا چاہتے تھے۔ تاہم قیصر کو جزواً بھی جنگ کے اسباب سے پاک نہیں سمجھا جا سکتا۔ ۱۸۸۸ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان جو فیصلہ کن مدت گزری، قیصر وطنی توسیع کا جارح لیڈر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی قوم کو عظمت وشان کی بلندیوں پر لے جائے۔ وہ پالیسی بنانے والا نہ تھا، بلکہ اس کی حیثیت محض کٹ پتلی کی تھی، تاہم اس نے توسیع پسندوں کے لیے رضامند اور مؤثر کٹ پتلی کا کام دیا۔

جرمن عزائم اور جرمن خطرات نے برطانیہ میں شدید نفرت پیدا کر دی۔ اس نفرت میں حسد اور اک گونہ احساس کمتری بھی شامل تھا۔ یہ نفرت انگریزوں کے بالائی طبقے میں زیادہ تھی، جو ترشے ترشائے رہتے تھے۔ بغیر کوشش کے انھیں برتری حاصل ہو گئی تھی اور تقدیر ان پر مہربان تھی۔ بہت سے جرمن سیاح اس امر کے شاکی رہے کہ مثلاً اٹلی کے کسی ہوٹل میں انھیں ایک انگریز سیاح کے مقابلے میں کمتر درجہ ملا، حالانکہ یہ محض ایک اتفاقی واقعہ ہوگا۔ وہ وطن واپس جاتے تو غیظ وغضب کے پیکر بنے ہوئے ہوتے۔ کہتے ہیں، کہ جرمنوں کو زیرِ آفتاب مناسب مقام نہیں دیا جاتا۔ جنگ سے پیشتر جرمن بحریات میں افسر کھانا کھاتے تو ایک جام صحت پیا جاتا، جس کا نام تھا "یوم"۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اس سے مراد جرمنی اور انگلستان کے درمیان جنگ کا دن ہے۔ یہ تمام احساسات اس مشہور نظم میں جمع کر دیئے گئے، جو جرمن شاعر ارنسٹ لساور[1] نے "ترانۂ نفرت" کے نام سے لکھی:-

"دنیا بھر کے لوگوں کو تنخواہ دار بنا لو
اپنے دمدموں کو سونے کی سلاخوں سے آراستہ کر لو
سمندروں کی سطح پر قطار در قطار جہاز کھڑے کر دو۔
تم سوچتے خوب ہو، مگر پوری طرح نہیں سوچتے۔
فرانسیسی اور روسی قابل توجہ نہیں۔
ضرب کے بدلے میں ضرب اور گولی کے بدلے میں گولی۔
ہم برنج اور فولاد سے لڑ رہے ہیں
جو وقت آ رہا ہے، اس میں امن کی مہر لگے گی۔
ہم نفرت کرتے رہیں گے، پائدار نفرت
ہم نفرت کبھی نہ چھوڑیں گے
سمندر میں نفرت، زمین پر نفرت

---

[1] Lissauer

فکر و نظر کی نفرت، ہاتھ کی نفرت
ہتھوڑے کی نفرت اور تاج کی نفرت
ساٹھ کروڑ انسانوں کی نفرت، جن کا گلا گھونٹا جا رہا ہے
ہم ایک ہو کر محبت کرتے ہیں، ایک ہو کر نفرت کرتے ہیں۔
ہمارا ایک دشمن ہے، صرف ایک[1]۔"

برطانوی عزائم چند ہی انگریز تھے، جنھوں نے اس نفرت کا جواب نفرت سے دیا۔ وہ بہ ہر حال تمام قوموں پر فائق و برتر تھے۔ لیکن جیسے جیسے سال گزرتے گئے برطانیہ اور جرمنی کے درمیان بحری مسابقت جاری رہی۔ پے در پے جرمن اور انگریز سیاست مدار معاملات کے متعلق ایک دوسرے کے خلاف نقطۂ نگاہ اختیار کرتے رہے اور جرمنی کا ہر قسم کا سامان یورپ، شمالی و جنوبی افریقہ اور ایشیا میں انگریزی سامان سے کم تر قیمت پر فروخت ہوتا رہا۔ انگریزوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ان بد وضع جرمنوں کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ مزید برآں انھیں خوشحالی و قیادت کی وضعیت کے متعلق تشویش پیدا ہو گئی تھی، جو انھیں حاصل تھی۔ ہندوستان انگریزوں کا سب سے بڑا مقبوضہ تھا۔ صاف واضح ہو گیا کہ وہاں دیسی باشندوں کو خود اختیاری حکومت کے باب میں وسیع مراعات دیئے بغیر چارہ نہ ہو گا۔ پاس ہی آئرلینڈ کا مسئلہ حد درجہ نازک صورت اختیار کر گیا تھا۔ السٹر ہوم اوّل کے خلاف ہتھیار سنبھالے کھڑا تھا۔ انگریزوں کو اپنے قدیم صنعتی کارخانوں کے بارے میں بھی تشویش تھی جن میں اتنا اچھا، عمدہ اور ارزاں سامان تیار کرنا مشکل تھا، جتنا جرمن تیار کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ بیرونی ملکوں میں اپنی تاجرانہ صلاحیت کی ناکامی پر نکتہ چینی کرنے لگے اور افسوس ہوا کہ وہ کیوں اپنی حالت پر مطمئن بیٹھے رہے۔

بہت سے انگریز اپنے آپ کو اچھے لبرل اور بین الاقوامی روابط کے حامی سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ امن اور بین الاقوامی زندگی کے شائستہ اوصاف محفوظ رہیں۔ بہت سے انتہا پسند نیز لیبر پارٹی کے ممبر صلح و امن کا حلف اٹھائے بیٹھے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑی تو دنیا پر واضح ہو گیا کہ ان تمام لوگوں نے کس طرح حق و راستی اور برطانیہ کو مترادف قرار دے لیا۔ باقی رہے قدامت پسند تو وہ دوسرے ملکوں کے قدامت پسندوں کی طرح خالص قوم پرست تھے۔ برطانیہ میں ان کی قوم پرستی سلطنت سے وابستہ تھی۔ وہ سفینۂ لوگوں کی ذمہ داری کے تمام نشان قائم رکھنا چاہتے تھے، جو جرمنوں کے نزدیک ناقابل برداشت تھے۔

دوسرے شرکائے جنگ جمہوری انگلستان کی طرح جمہوری فرانس میں بھی بین الاقوامی سیاسیات کے متعلق عوام کی مختلف رائیں تھیں۔ انتہا پسند اشتراکی صلح و امن کے حامی تھے۔ ان کا تصوّر یہ تھا کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو دنیا بھر کے مزدور ہڑتال کر دیں گے۔ ان میں سے جو اعتدال پسند تھے، وہ بھی جارحانہ حبِّ وطن کے خلاف تھے۔

---

[1] انگلستان کے خلاف ترانۂ نفرت

لیکن جو لوگ فرانس کے معاملات خارجہ کا انتظام کر رہے تھے، نیز زیادہ تر عوام جنگِ عظیم کے آغاز تک شکست خوردگی کی تلخ حُبّ الوطنی سے معمور تھے۔ فرانسیسیوں کو سنہ ۱۸۷۰ء کی شکست کا انتقام مطلوب تھا۔ وہ الساس و لورین واپس لینا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۸۷۰ء سے جو مجسمہ پلیس دالاکنکورد[1] (پیرس) سٹراس بورگ[2] کی نمائندگی کر رہا تھا، اس پر سیاہی پھیر دی گئی تھی۔ گرمجوش محبانِ وطن، وطن پرستانہ انجمنوں کے ناظم، وطن پرست اخباروں کے ایڈیٹر سب میں انتقام کا جذبہ حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۰۰ء کے ابتدائی عشرے میں بہت سے مبصروں کو خیال ہو گیا تھا کہ نئی نسل انتقام کے جذبے سے محروم ہو رہی ہے اور فرانسیسیوں نے سنہ ۱۸۷۰ء کا فیصلہ قبول کر لیا ہے، لیکن فرانسیسی سیاست مداروں نے جرمنی کے خلاف اتحاد کا نظام نہ صرف قائم رکھا، بلکہ اسے تقویت پہنچائی۔ جولائی سنہ ۱۹۱۴ء کے ہنگامہ آرا ہفتوں میں واضح ہو رہا تھا کہ فرانس جنگ کے لیے تیار ہے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اس پرجوشِ مسرت کے پرانے نظاروں کا اعادہ کیا گیا:۔

"اس مدت میں پیرس پہ دباؤ بڑھ رہا تھا۔ حُبِ وطن کے زیر دست محاسن، جو انسانوں کے دماغوں کی تہہ میں موجود تھے پھوٹ نکلے اور عام بازاروں اور شاہراہوں میں بہنے لگے۔ پیرس کے بازاروں میں ایک صدا گونج رہی تھی:۔ "برلین چلو، برلین چلو۔۔۔۔۔ فوج کے دستے گزرے اور ہر بندوق پھول کی مستحق سمجھی گئی اور ہر سپاہی بوسے کا حقدار مانا گیا۔ سپاہیوں کو دیکھتے ہی عورتیں پگھل جاتیں اور اُن کے دل لباسوں میں سما نہ سکتے۔ اُن کے دل میں محبت کے ہزاروں واجبات اُبھرتے۔ وہ مسلح نوجوانوں میں اپنے لب کا ہنات کے فخر کے ساتھ تقسیم کرتیں۔ پھولوں کی سی اخوت پُرخلوص دوستی اور عالمی معصومیت ہر مخلوق پر طاری تھی۔ شرد نر کا تصور درمیان سے اٹھ گیا[3]۔" وہ سب یا تو معصوم بچے تھے یا معصوم فرشتے۔

"چند روز کے لیے فرانس نے روئے زمین پر بہشت کی صورت اختیار کر لی تھی[4]۔"

---

[1] Place de la Concorde پیرس کا مشہور چوک، جہاں تمام شہروں کی نمائندگی کے مجسمے رکھے گئے ہیں اور جو پیرس کے نہایت خوبصورت مقاموں میں سے ایک ہے۔ ([2]) .... Strasburg (Lemal) سٹراس بورگ الساس و لورین کا مرکز تھا، چونکہ یہ جرمنی کے ہاتھ چلا گیا تھا، اس لیے اس کے مجسمے پر سیاہی پھیر دی گئی تاکہ لوگوں میں انتقام کا جذبہ مشتعل ہوتا رہے۔ ([3]) فرانسیسی میں شر کو لامال .... (lemal) کہتے ہیں اور نر کو لامیل Lemale ۔ یہ دونوں چیزیں ناپید ہو گئی تھیں نہ شر کو شر سمجھا جاتا تھا۔ نہ نر کو نر۔

[4] جوزف ڈیٹیل .... (Joseph Deteil) .... ؛ وا پوئلس .... (de Poilus) ص ۲۸ - ۲۹

دوسرے بڑے جنگجو ملکوں میں بھی عوام نے حکومت کے فیصلوں کی تائید کی۔ روسی قوم پرستی کے جذبات سے لبریز تھے۔ انھیں یقین تھا کہ خدا اور حق ان کی طرف ہے۔ اطالویوں کو جنگ میں یہ موقع نظر آتا تھا کہ وہ تمام علاقے حاصل کر لیں گے، جو محبانِ وطن کے نزدیک اٹلی کے لاینفک اجزا تھے، بلکہ انھیں ہیپسبرگ بادشاہی سے مزید علاقے لینے کا امکان نظر آتا تھا۔ آسٹریا اور ہنگری میں محکوم قوموں کی وفاداری پر بھروسا ممکن نہ تھا، لیکن آسٹریا کے متقدر جرمنوں اور ہنگری کے میگیاروں نے جنگ کا خیر مقدم کیا، کیونکہ انھیں مفسد سلافیوں کو ہمیشہ کے لیے راہ راست پر لے آنے کا موقع نظر آتا تھا۔

پچاسواں باب

پہلی عالمی جنگ کے اسباب

(۲)

عہدِ بسمارک ۱۸۷۱ء ــــ ۱۸۹۰ء

سراجیو جانے والے راستے کی ابتدا ۱۸۷۱ء میں معاہدہ فرینکفرٹ سے ہوئی، جس کے مطابق فرانس الساس اور لورین نئی جرمن سلطنت کے حوالے کر دینے پر مجبور ہوا۔ پھر یہ راستہ سیدھا بھی نہ تھا۔ اس میں بہت سے موڑ اور پھیر تھے۔ چند ہی مورّخ یہ ماننے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں کہ معاہدے نے ۱۹۱۴ء کے واقعات ناگزیر بنا دیئے تھے۔ ہم راستے کی ایک ایک منزل کا نشان نہیں دے سکتے، لیکن اس کا عام نقشہ تو پیشِ نظر رکھ لینا چاہیے۔

تقریباً بیس سال تک بسمارک اس راستے کا منتظم رہا۔ اس کے متعلق حق و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اعتراف کیا جائے، بیس سال کی آخری مدّت وزارت میں اس نے صلح کے لیے کوشش جاری رکھی اور صلح ہو گئی۔ نئی سلطنت (سلطنت جرمنی) میں ایسے طاقتور عناصر موجود تھے، جو فرانس سے ایسی فیاضانہ صلح کرنے کے لیے تیار نہ تھے، جیسی ۱۸۶۶ء میں آسٹریا سے کی گئی تھی۔ بہ ایں ہمہ بسمارک نے پوری کوشش کی کہ فرانس کو جو زخم لگ چکا تھا، وہ مندمل ہو جائے۔ فرانس نے شمالی افریقہ میں ٹیونس لے لیا۔ (۱۸۸۱ء) بسمارک نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اگرچہ اس پر اطالوی ناراض ہو گئے، کیونکہ وہ بھی ٹیونس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، لیکن بسمارک کو خوف تھا کہ فرانس ضرور بدلہ لے گا۔ چنانچہ اس نے سیاسی اعتبار سے فرانس کو الگ تھلگ کر دینے کی کوشش کی اور جرمنی سے کئی ایسے معاہدے کر لیے، جن سے فرانس باہر رہا۔ بسمارک کہتا تھا کہ جرمنی کا پیٹ بھر چکا ہے، اب اسے یورپ میں کسی نئی چیز کی ضرورت نہیں۔ وہ روس اور آسٹریا دونوں سے خوشگوار تعلقات کا خواہاں تھا، مگر ان دونوں طاقتوں کے لیے باہم خوشگوار تعلقات قائم رکھنا مشکل تھا۔ دونوں بلقان میں زیادہ سے زیادہ اقتدار چاہتی تھیں۔ بسمارک کو یہ کام بہت مشکل نظر آتا تھا۔

ترکی کے ساتھ جنگ (۷۸-۱۸۷۷ء) کے نتیجے میں روسی تھوڑی مدّت کے لیے کامیاب ہو گئے اور انھوں نے بلغاریۂ کلاں کی سلطنت قائم کرا لی۔ یہ ایک ایسی سلطنت تھی جس کی بدولت روس کا اثر قسطنطنیہ کے دروازوں

تک پہنچ گیا۔ برطانیہ اور آسٹریا ہنگری دونوں روسی طاقت کے اس اضافے پر نارضامند تھے۔ بسمارک نے برلین میں یورپی نمائندوں کی ایک کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کرلیا (۱۸۷۸ء) اس میں روسیوں کے حاصل کردہ فوائد میں خاصی تخفیف ہوگئی۔ اس نئی مفاہمت پر روس اور آسٹریا ہنگری دونوں غیر مطمئن تھے۔ بہ ایں ہمہ بسمارک نے بہت جلد آسٹریا ہنگری کے ساتھ دفاعی اتحاد کا بنیادی پتھر رکھ دیا (۱۸۷۹ء)۔ یہ اتحاد ۱۹۱۸ء تک قائم رہا۔ ساتھ ہی ایک خفیہ معاہدہ کرانے میں کامیاب ہوگیا، جسے تین شہنشاہوں کی لیگ قرار دیا جاتا تھا۔ اس معاہدے نے جرمنی، روس اور آسٹریا کو اکٹھا کردیا۔ تینوں طاقتوں کا فیصلہ تھا کہ اگر معاملات کا تعلق ترکی کے ساتھ ہو تو تینوں اکٹھے رہیں گے۔ اگر ان میں سے کسی کی لڑائی چوتھی طاقت سے چھڑ جائے اور وہ طاقت ترکی نہ ہو تو باقی دو دوستانہ غیر جانبداری قائم رکھیں گے۔ ساتھ ہی فرانس نے ٹیونس لے لیا تھا تو اس پر اطالوی بگڑ گئے تھے۔ بسمارک نے بڑی چالاکی سے اٹلی کی ناراضی کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا، یعنی جرمنی آسٹریا و ہنگری اور اٹلی کے درمیان اتحاد کرا دیا۔ یہ اتحاد فرانس کے خلاف تھا۔ یہ ۱۸۸۲ء کا معاہدہ تھا جو عموماً "اتحادِ ثلاثہ" کہلاتا ہے۔ اس کی بارہا تجدید ہوئی اور یہ ۱۹۱۴ء تک کم از کم کاغذ پر باقی تھا۔

اس طرح چالوں کے ایک سلسلے کے ذریعے سے بسمارک نے صدی کے نویں عشرے میں ناپائدار توازن قائم رکھا! اسے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ روس بلقان میں آسٹریا کے منصوبوں سے گھبرا کر جرمنی کا ساتھ چھوڑے گا اور فرانس کا حلیف بن جائے گا۔ فرانس اس وقت بھی بہت بڑی طاقت تھا اور اس کے لیے بسمارک نے انقطاع کا جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس سے بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں روس نے تین شہنشاہوں کے میثاق کی تجدید سے انکار کر دیا۔ لیکن بسمارک نے ایک خفیہ معاہدہ روس اور جرمنی کے درمیان کرا دیا۔ اس طرح وقتی طور پر تعلقات کا انقطاع روک لیا، جسے "دوبارہ[۱] یقین دہانی کا معاہدہ" کہتے ہیں۔ اس کے مطابق دونوں نے عہد کرلیا کہ اگر کسی فریق کو تیسری طاقت سے لڑنا پڑا تو دوسرا فریق غیر جانبدار رہے گا، لیکن اگر جرمنی نے فرانس کے خلاف جارحانہ جنگ کی یا روس نے آسٹریا کے خلاف جارحانہ قدم اٹھایا تو غیر جانبداری باقی نہ رہے گی۔ روسی قوم پروروں نے آسٹریا اور جرمنی کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھا۔ بسمارک نے ۱۸۸۸ء میں روس کے انتباہ کے لیے آسٹریا اور جرمنی کا عہد نامہ شائع کردیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ "اتحادِ ثلاثہ" کی بڑی بڑی شرطیں غیر رسمی طریق پر شائع کر دی جائیں۔

ائتلافِ ثلاثہ

۱۸۹۰ء میں نوجوان جرمن شہنشاہ ولیم ثانی نے بسمارک کو برطرف کر دیا۔ شہنشاہ کے مشیروں سے بیرن فان[۲] ہالسٹین کی سرکردگی میں شہنشاہ کو اس امر پر راضی کرلیا کہ روس کے ساتھ دوبارہ یقین دہانی

---

[۱] Reinsurance Treaty

[۲] Baron Von Holstein

کے معاہدے کی تجدید نہ کی جائے، حالانکہ روس تجدید کا خواہاں تھا۔ کچھ مدت بعد وہ صورتِ حال پیدا ہوگئی، جسے روکنے کے لیے بسمارک نے انتہائی کوششیں کی تھیں، یعنی روس اور فرانس کے درمیان طویل مذاکرات ہوتے رہے۔ آخر ۱۸۹۴ء میں دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا، جس سے فرانس کی علیحدگی ختم ہوئی۔ یہ معاہدہ سراسر دفاعی تھا، جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر جرمنی یا آسٹریا نے روس اور فرانس میں سے کسی ایک کے خلاف جارحانہ اقدام کیا تو ایک دوسرے کی امداد کی جائے گی۔ ساتھ ہی دونوں ملکوں کے فوجی افسروں نے فوجی مفاہمت کا انتظام کرلیا۔ "اتحادِ ثلاثہ" کے خلاف فرانس و روس کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔ انگلستان بدستور الگ تھلگ رہا۔

معاہدہ ہائے اتحاد کے سلسلے میں اگلی بڑی منزل وہ تھی، جس میں برطانیہ بھی وسطی یورپ کی طاقتوں کے خلاف شامل ہوگیا۔ برطانیہ مدت تک یورپی معاملات سے الگ تھلگ رہا تھا۔ وہ کسی رسمی اتحاد کے لیے تیار نہ تھا، اگرچہ سفارتی جال کے دائرے سے باہر نہ تھا۔ صدی کے آخری عشرے میں اس کے وزیرِ اعظم لارڈ سالسبری نے فرمایا کہ برطانیہ کی پالیسی شاندار علیحدگی کی پالیسی ہے، لیکن قیصر ولیم کی تخت نشینی کے بعد بیس سال کے اندر اندر برطانیہ کو جاپان سے رسمی معاہدہ کرنا پڑا۔ ساتھ ہی فرانس اور روس سے مفاہمت ہوگئی۔ جس بڑی چیز نے برطانیہ کو ان سرگرمیوں پر آمادہ کیا، وہ جرمنی سے بحری مسابقت تھی، جس کے باعث جرمنی اور برطانیہ کے تعلقات تیزی سے بگڑے۔ یہ بگاڑ رسمی سفارتی تعلقات کی سطح کے بجائے رائے عامہ کی سطح پر زیادہ نمایاں تھا۔

بڑھتی ہوئی عداوت کی ایک اچھی مثبت مثال کروگر کے نام قیصر ولیم دوم کا تار تھا، جو ۱۸۹۶ء میں بھیجا گیا۔ اس میں قیصر نے ٹرانسوال کی بوئر جمہوریت کے صدر کروگر کو جیمسن کے حملے کی شکست پر مبارک باد دی تھی۔ ممکن ہے، قیصر اور اس کے حاشیہ نشینوں کو امید ہو کہ حکومتِ برطانیہ اس حرکت کو ایک مہذب اور جائز سفارتی تہدید سمجھیں اور تار کو پیشِ نظر رکھ کر کہیں کہ اگر اس کا انتظام قرار واقعی نہ کیا گیا تو حکومتِ جرمنی اس قدر تکلیف و پریشانی کا باعث بنی رہے گی۔ برطانوی جرائد میں اس تار کو ناقابلِ برداشت توہین قرار دیا گیا۔ جرمنی کے اخباروں نے بھی برطانیہ کے غیظ و غضب کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ یہاں "سیٹرڈے ریویو"[١] سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک قدامت پسند اور مقتدر اخبار تھا۔ اقتباس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ حالات کیا صورت اختیار کر رہے تھے:

"صرف جرمن شہنشاہ ہی برطانیۂ عظمیٰ کی قوت سے ناواقف نہیں" ٹائمز نے پیر کو انگلستان میں بسنے والے ایک جرمن کا خط چھاپا تھا، جس میں بتایا تھا کہ جرمنی انگلستان سے اتحاد پیدا نہ کرسکا، اس لیے اس سے نفرت پیدا ہوگئی۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ

---

١ Saturday Review

اس وقت یورپ ایک چھاؤنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر لڑائی کی نوبت آئی تو انگلستان اپنی بلند حیثیت اور دولت و ثروت کے باوجود دوسرے درجے کی طاقت ثابت ہوگا، کیونکہ اس کے پاس سپاہی بھی زیادہ تعداد میں نہیں اور ایک بڑی جنگ کے لیے کافی سازو سامان بھی نہیں، لہذا ہمیں بتایا گیا ہے کہ انگلستان کے خلاف براعظم میں بڑھتی ہوئی نفرت کے ساتھ، اس کے متعلق حقارت کا احساس پیدا ہوگیا ہے، مگر انگلستان میں بسنے والا یہ جرمن خود اپنی تردید کر رہا ہے۔ اگر انگلستان دوسرے درجے کی طاقت ہے تو جرمنی کو اسے اپنا حلیف نہ بنا سکنے پر اتنی ناراضی کیوں ہے؟ جرمنی ہسپانیہ کے خلاف غصے کی آگ نہیں اگلتا۔ ظاہر ہے کہ ہسپانیہ "اتحادِ ثلاثہ" میں شامل نہیں ہوا۔ قیصر نے پرتگیزوں کو ہتک آمیز پیغامات نہیں بھیجے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمنی کے فوجی کبر اور برطانوی تجارت، نیز برطانوی سلطنت کے خلاف تجارت پیشہ جرمنوں کے حسد نے اسے یہ سمجھنے کی طرف راغب کر دیا کہ انگلستان دوسرے درجے کی طاقت ہے، لیکن دل میں وہ اصل حقیقت کو خوب سمجھتا ہے۔ اس پر آشکارا ہے کہ محاربات نپولین کے اختتام کے بجائے آج انگلستان کو یورپ میں ثالث کی بہتر حیثیت حاصل ہے۔ اگر وہ "اتحادِ ثلاثہ" میں شامل ہو جائے تو یہ اتحاد ناقابل شکست ہو جائے گا اور اگر وہ روس و فرانس کا ساتھی بن جائے گا تو براعظم میں جرمنی کی برتری موت کے گھاٹ اتر جائے گی۔[1]

اس اقتباس میں کپلنگ کی بعض نظمیں شامل کر لیجیے، جو ۱۹۰۲ء میں کہی گئی تھیں۔ موقع یہ تھا کہ جرمنی نے وینزویلا سے قرضہ وصول کرنے کے لیے برطانوی اور جرمن بیڑے کے مشترک مظاہرے کی تجویز پیش کی تھی:۔

"عالم انسانیت کے نام پر جھنڈوں کے نیچے،
جو سمندروں پر استعمال ہوتے ہیں،
کیا کوئی رویہ انہیں مل سکتا تھا
کہ تم نے ان سے ہاتھ جا ملائے؟

....

صلح کا منظر سامنے ہے ــــ مثلاً سمندروں سے نکل کر

---

[1] سیٹرڈے ریویو بابت ۱۱ جنوری ۱۸۹۶ء ص ۲۷۔

نصف دنیا کا چکر کاٹو ـــــ
فریب خوردہ ملاحوں کے ساتھ
نئے سرے سے اتحاد کرو
گاتھ سے اور بے شرم "ہن" سے[1]

یعنی سنہ ۱۹۰۲ء میں جرمنوں کو "ہن" کا لقب دے دیا گیا تھا اور یہی لفظ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں اتحادی پروپیگنڈا کرنے والوں نے جرمنوں کے خلاف استعمال کیا۔

جرمنی کا نہیں روس کا خوف تھا، جس نے برطانیہ کو رسمی علیحدگی ختم کر دینے پر آمادہ کیا اور سنہ ۱۹۰۲ء میں جاپان سے معاہدہ ہوا۔ جاپان اور روس کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے باعث فرانس و انگلستان کے درمیان بھی تیزی سے مذاکرے شروع ہو گئے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں دونوں ملکوں کے درمیان جو مفاہمت ہوئی۔ اس کے مطابق فرانس نے انگلستان کو مصر میں اور انگلستان نے فرانس کو مراکش میں ہر ممکن آزادی دے دی۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں دونوں کے درمیان جو اختلافات چلے آئے تھے، ان کا بھی تصفیہ کر لیا گیا۔ خاص طور پر اہم امر یہ ہے کہ فرانس و انگلستان دونوں کے لیے بین الاقوامی معاملات میں تعاون کی بنیاد رکھی گئی۔ صرف چھ سال پیشتر فرانس کا ایک دستہ دریائے نیل کی بالائی آبادی میں فشودا[2] کے مقام پر انگلستانی دستے سے دوبدو ہوا تھا تو استعماری رقابت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ فشودا کے واقعے نے فرانس میں اتنا ہی غیظ و غضب پیدا کر دیا تھا، جتنا دو سال پیشتر کروگر کے تار سے جرمن اور برطانوی اخباروں میں پیدا ہوا تھا، لیکن فشودا کے زخم اتنے گہرے نہ تھے، جتنے کروگر کے تار کے تھے۔ معاصر جوائد رائے عامہ کی فضا کے ہمیشہ صحیح رہنما ثابت نہیں ہوتے۔

دو فریقوں میں گٹھ جوڑ کا آخری مرحلہ سنہ ۱۹۰۷ء میں پیش آیا، جب روس جاپان کے ہاتھوں شکست کھا کر زیادہ حقیقت شناس بن چکا تھا اور اس نے فرانس کی حوصلہ افزائی سے برطانیہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ دونوں ملکوں نے اُن خطوں میں ایک دوسرے کے لیے مراعات منظور کر لیں، جہاں ان کے درمیان استعماری رقابت بپا تھی، یعنی ایران، افغانستان اور تبت[3]۔ برطانیہ نے آبناؤں کے متعلق بھی روس کی خواہش کے سلسلے میں کسی حد تک رعایت منظور کر لی تھی[4]۔ یہ معاہدہ

---

[1] کپلنگ کی نظمیں ص ۲۸۰-۲۸۱   [2] Fashoda

[3] اس سے یورپی سامراجیوں کی حقیقی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باہمی رقابت خصوصاً اسلامی ملکوں میں حلقہ ہائے اثر قائم کرنے کے متعلق تھی۔ جب پورا سامراج معرضِ خطر میں نظر آیا تو بہ آسانی فیصلہ کر لیا۔   [4] یہاں بھی صرف ذاتی مفاد کی حفاظت کی غرض سے برطانیہ نے اس کے لیے ایک ایسی رعایت منظور کی جس کا تعلق برطانیہ سے کوئی نہ تھا، اس سے صرف دولت عثمانیہ کے مفاد پر ضرب لگتی تھی۔

دو قوموں کے درمیان کسی پُرخلوص ہمدردی پر مبنی نہ تھا، کیونکہ انگریز مدت سے روسیوں کے مخالف چلے آتے تھے اور یہ مدت ایک صدی سے بھی زائد ہو چکی تھی۔ بہ ایں ہمہ "اتحادِ ثلاثہ" کے خلاف "ائتلافِ ثلاثہ" کا انتظام ہو گیا۔

بحران کے دس سال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء

۱۹۱۴ء سے پیشتر آخری دس سال کی مدت مقامی جنگوں اور بحرانوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سے کوئی بھی واقعہ عالمی جنگ کا موجب بن سکتا تھا۔ سب سے پہلے قیصر کی طرف سے ایک ڈرامائی ایما ہوا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں رسمی طریق پر طنجہ (مراکش) گیا، تاکہ دنیا کو بتائے، جرمن انگلستان و فرانس کے اس معاہدے کو قبول نہیں کریں گے، جس میں مراکش فرانس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ فرانس و برطانیہ کے درمیان مفاہمت اور زیادہ مستحکم ہو گئی، کیونکہ برطانیہ نے فرانس کو صاف صاف بتا دیا کہ ان کی پوری حمایت کی جائے گی۔ اگرچہ فرانس کا وزیرِ خارجہ ڈلکاسی[1] جرمنوں کے متعلق پالیسی کا سرگرم حامی تھا، مگر اسے وزارت سے نکال دیا گیا۔ اس جزوی کامیابی سے بھی جرمنوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ فرانس کی رائے عامہ ملک کے داخلی معاملات میں اس مداخلت پر بہت بھڑک اٹھی۔ آخر جزیرۃ الخضرا[2] (ہسپانیہ) میں ایک عام بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی تائید فرانسیسی کر رہے تھے۔ انھوں نے مراکش کو فرانس کی حمایت میں دے دینے کے منصوبے مکمل کر لیے۔ جزیرۃ الخضرا میں امریکی سفراء نے فرانس کی حمایت کی۔ یوں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی علیحدگی کی پالیسی سے باہر نکل رہی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں سراجیو کی طرف فیصلہ کُن رُخ ہو گیا۔ چند سال سے آسٹروی بلقان میں بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ وہ جنوبی جانب بحیرۂ ایجہ میں اپنا اثر بڑھا رہے تھے۔ یورپی ترکی ریلوں اور مقدونیہ (یورپی ترکی کا ایک صوبہ) کے مسائل پر انھوں نے پُرپیچ گفت و شنید جاری رکھی۔ مقدونیہ ایسا صوبہ تھا، جہاں آبادی کا اختلاف سب سے زیادہ ہوا تھا اور آپس میں ربط و ضبط کی کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ یونانی، سرویِ اور بلغاری تمام قومیں وہاں جمع تھیں، لہٰذا سب نے اس علاقے پر قبضہ جمانے کے لیے منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں آسٹریا نے یکایک بوسنیا اور ہرزیگووینا کے قدیم ترکی صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ان پر وہ ۱۸۷۸ء سے قابض چلا آتا تھا۔ اس فیصلہ کُن آسٹروی اقدام نے سرویوں کو چراغ پا کر دیا، کیونکہ وہ بوسنیا کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ روسی بھی اس پر خفا ہو گئے اور بہت کم روسی تھے، جنھیں علم تھا کہ ان کا سفیر ازوولسکی[3] آسٹروی وزیر اہرنتھل[4] سے ستمبر ۱۹۰۸ء میں بوسنیا اور ہرزیگووینا کے الحاق سے متعلق معاہدہ کر چکا تھا۔ اس کے بدلے میں یہ عہد لیا تھا کہ روس کے جنگی

---

[1] Delcassi

[2] Algeciras یہ ہسپانوی لفظ الجزیرہ کی تخریب ہے۔ اس سے مقصود وہ جزیرہ ہے، جسے اندلس کے عرب جزیرۃ الخضرا کہتے ہیں۔

[3] Izvolski

[4] Aehrental

جہازوں کو آبناؤں سے گزارنے کے لیے روس کی حمایت کی جائے گی۔ آسٹریا نے تو بوسنیا اور ہرزیگوینا لے لیے، لیکن روس کو آبناؤں کے استعمال کا حق نہ ملا۔ روس کے افتخار پر یہ گہرا زخم تھا۔

اب یورپ کے حواشی پر جنگ چھڑ گئی۔ اطالویوں نے ۱۹۱۱ء میں فوجیں طرابلس بھیج دیں، جو شمالی افریقہ کا غریب ترین حصہ تھا، لیکن یہی ایک حصہ تھا جو ترکوں سے کسی یورپی قوم نے نہیں چھینا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ کے شعلے بلقان پہنچ گئے۔ قوم پرست انقلابیوں نے جنھیں نوجوان ترک کہا جاتا تھا، ۱۹۰۸ء میں سلطان کے خلاف کامیاب بغاوت کی۔ اگرچہ نوجوان ترکوں کی تحریک کو جمہوری تحریک قرار نہیں دیا جا سکتا، مگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کے مرد بیمار میں انحطاط کا جو عمل مدت سے جاری ہے، اسے روکا جائے۔ اس سے ان طاقتوں پر سراسیمگی طاری ہو گئی، جو انحطاط سے فائدہ اٹھانے کی امیدوار تھیں۔ ایسا نظر آ رہا تھا کہ جو لوگ ترکی کو باہم تقسیم کر لینا چاہتے تھے، انھیں جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے۔ اس عجلت میں دنیا ۱۹۱۴ء کی جنگ کا جولاں کدہ بن گئی۔ بلقان کی جنگیں اس کے ابتدائی مراحل تھیں۔

پہلی بلقانی جنگ ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ اس میں بلغاریہ، سرویا اور یونان نے ترکوں کو شکست دی اور یورپی ترکی کے بڑے حصے کو باہم تقسیم کرنا شروع کیا، لیکن یہاں آسٹریا بیچ میں آ دھمکا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ سرویا کو کوئی ایسا علاقہ نہیں دیا جائے گا، جو اسے بحیرۂ ایڈریاٹک میں داخلے کا موقع دے سکے۔ ساتھ ہی فاتح باہم لڑ پڑے۔ ۱۹۱۳ء میں دوسری بلقانی جنگ شروع ہو گئی، جس میں یونانی اور سروی رومانویوں سے مل گئے اور ترکوں نے بلغاریہ کو شکست دے دی، یوں ترکی کو چھنے ہوئے یورپی علاقے سے کچھ حصہ واپس مل گیا، لیکن بلقانی طاقتوں کے درمیان بے یقینی کی حالت طاری تھی اور تلخی بڑھی ہوئی تھی، جب فرانس فرڈیننڈ قتل کر دیا گیا۔

آخری بحران جولائی - اگست ۱۹۱۴ء

پہلی عالمی جنگ کے قریبی اسباب کے متعلق جو مطبوعہ حالات مل سکتے ہیں، لاکھوں الفاظ پر مشتمل ہیں۔ ان میں چھ ہفتوں کے وہ حالات بھی شامل ہیں، جو واقعۂ قتل اور ۴۔ اگست ۱۹۱۴ء کو برطانیہ کی طرف سے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ پر ختم ہوتے ہیں۔ جنگ کے نتیجے میں ہوہنزولرن، ہیپسبرگ اور رومانوف کے شہنشاہی خاندان ختم ہو گئے اور ان کے خفیہ کاغذات جلد منظرِ عام پر آ گئے۔ ان کی جگہ طبعی حکومتیں اتنی تیزی سے نہ بن سکیں۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جنگی جرم کے مسئلے پر جو بحث شروع ہوئی، اس کے ضمن میں برطانیہ، فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بھی اپنے خفیہ کاغذات حیرت انگیز حد تک شائع کر دیئے ـــــ ہفتوں تک دستاویزوں اور تاروں کا سلسلہ گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے جاری رہا یہی ہفتے ہیں، جن میں پیغامات مسلسل ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور صورتِ حال غیر معمولی حد تک پریشان کن ہو رہی تھی۔ تین ہفتے ہیں جن بھی پیشہ ور مدبروں اور سیاست مداروں پر مشتعل اخباروں ـــــ اور کہہ دینا چاہیے کہ عموماً غیر ذمہ دار ـــــ نے دباؤ ڈالا اور جنگ چھیڑے بغیر بحران پر قابو پا لینے کے لیے مجبور کیا۔ وہ ناکام رہے، لیکن انصاف کا تقاضا

یہی ہے کہ ہم کم از کم اس حد تک ضرور جائیں، جس حد تک امریکی مورخ سڈنی فے[1] گیا، جس کی کتاب "عالمی جنگ کے مبادی"[2] (۱۹۲۸ء) جرائم جنگ پر نظر ثانی کرانے والوں کے نقطہ نگاہ سے حد درجہ منصفانہ اور متوازن ہے۔ وہ کہتا ہے:-

" طاقتوں میں سے کوئی بھی یورپی جنگ کی خواہاں نہ تھی۔ ان کے حکمرانوں اور وزیروں میں سے چند کے سوا سب کو اندازہ تھا کہ جنگ نہایت خوفناک ہوگی، جس کے سیاسی نتائج قطعاً یقینی نہ تھے، لیکن اس میں جانی نقصان، اقتصادی نتائج اور عام مصائب بے حد درجہ ہولناک ہونے والے تھے۔

یہ پاشیچ[3] (سرویا)، برشٹولڈ[4] (آسٹریا)، بیتھمان[5] (جرمنی)، سازونوف[6] (روس) پائنکار[7] (فرانس)، سان جیولیانو[8] (اٹلی) اور سر ایڈورڈ گرے[9] (برطانیہ) کے تعلق میں کم وبیش درست ہے، لیکن ان میں سے کوئی یہاں تک کہ سر ایڈورڈ گرے بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ سیاسی نتائج اتنے وسیع اور دوسرے اثرات اتنے ہولناک ہوں گے، جتنے کہ ہوئے۔"[10]

یہ سیاست مدار اور مدبر اس لیے جنگ میں کھچے چلے آئے کہ تقریباً سب کو یقین تھا، متبادل راستہ جنگ سے بھی خوفناک تر ہوگا، یعنی ان کی قوموں کو شکست یا بے عزتی سے سابقہ پڑے گا۔ آسٹریا کو بالکل بجا طور پر یقین تھا (اگرچہ کوئی مثبت ثبوت موجود نہ تھا) کہ حکومت سرویا کو قاتل پرنسپ کی سازش کا پہلے سے علم تھا اور اس کا فرض تھا کہ پہلے سے اطلاع دے دیتی۔ اس لیے، نیز سرویوں کی ہنگامہ آرائی کو روکنے کے لیے اس نے فرانس فرڈیننڈ کے قتل کے بعد سخت مطالبات پیش کیے اور آسٹریا وہنگری کے خلاف سرویوں کی ہنگامہ آرائی مدت سے جاری تھی، لیکن مطالبات پیش کرنے سے قبل جرمن حلیف سے مشورہ کر لیا، جس نے بتا دیا کہ سرویا کے متعلق جو پالیسی اختیار کی جائے گی، جرمنی اس کی مدد کرے گا۔ جرمنی کا جواب اب ایک سادہ چیک پر دستخط کر کے دے دینے کی شہرت پا چکا ہے، جس میں آسٹریا کو حق دے دیا گیا تھا کہ اس پر جو چاہے لکھ دے۔

---

1. Sidney Fay
2. Origines of the World War
3. Pashiten وزیر خارجہ سرویا
4. Berchtold وزیر خارجہ آسٹریا
5. Bethman وزیر خارجہ جرمنی، جو چانسلر بھی تھا
6. Sazonov وزیر خارجہ روس
7. Poincare وزیر خارجہ فرانس
8. San Giuliano وزیر خارجہ اٹلی
9. Edward Gre وزیر خارجہ برطانیہ
10. فے کی کتاب جلد دوم ص ۵۴۷

یوں حوصلہ پاکر حکومت آسٹریا نے ۲۳ جنوری کو سرویا کے نام الٹی میٹم بھیج دیا، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اڑتالیس گھنٹے کے اندر جواب دیا جائے۔ اس الٹی میٹم میں متعدد جداگانہ مطالبات بھی شامل تھے، بلکہ اس امر پر بھی اصرار کیا گیا تھا کہ حکومت سرویا اور اس کا پروپیگنڈا کرنے والے اب اور آئندہ ہیپسبرگ علاقوں اور آبادیوں سے الگ رہیں۔ سرویا نے اکثر مطالبے کم از کم اصولاً تسلیم کر لیے۔ صرف دو مطالبے ٹھکرائے، جن کے مطابق آسٹریا کی پولیس یا فوج کے آدمیوں کو پرنسپ کی سازش کی چھان بین میں سرویا کے ساتھ شرکت کا موقع مل جاتا۔ غالباً سرویا کو یقین تھا کہ روس بھی ایک سادہ چیک اس کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہے اور اگر الٹی میٹم کے جزوی ردے سے جنگ چھڑی تو روس سرویا کی امداد کرے گا۔ لہٰذا سرویا کا جواب ویسا دیانتدارانہ نہ تھا، جیسا جولائی سنہ ۱۹۱۴ء میں سمجھا گیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آسٹریا کا الٹی میٹم دانستہ ایسے الفاظ میں تیار کیا گیا تھا کہ حکومت سرویا اسے قبول نہ کر سکے اور سرویا کا جواب ایسا تھا کہ اس میں مزید غور و خوض کی بنیاد استوار ہو گئی تھی۔ چونکہ سرویا نے الٹی میٹم من حیث الکل منظور نہ کیا، اس لیے آسٹریا نے ۲۸ جولائی کو جنگ کا اعلان کر دیا۔ یورپی کانفرنس کی جو تجویز برطانوی وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرے نے پیش کی تھی وہ اس لیے رد کر دی گئی کہ قومی عزت کے منافی تھی۔

اس وقت جرمن سیاست مداروں نے ولیم دوم کی تائید سے جرمنی کے فوجی کارفرماؤں کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے حلیف آسٹریا کو روکنے کی کوشش کی۔ ولیم کو سادہ چیک دے دینے کی ذمہ داری سے بری قرار دینا غیر ممکن ہے۔ اسی سے آسٹریا کا حوصلہ بڑھا۔ شاید جرمنی کا منصوبہ ہی یہ تھا کہ یہ سب کچھ پیش آئے، لیکن اب جرمنوں نے چیک کو منسوخ کرنے کی یقینی کوشش کی اور جنگ کو پھیلنے سے روکنے میں کوئی دقیقہ وسعی اٹھا نہ رکھا گیا۔ روس کے اندر تمام فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو چکی تھی۔ قیصر نے ۲۹ جولائی کو زار نکولس دوم کے نام ایک شخصی تار بھیجا، جس میں بتایا کہ جرمنی آسٹریا کو صلح پر آمادہ کرے گا۔ بظاہر اس تار سے روس نے نقل و حرکت کے احکام میں ترمیم کر لی اور صرف جزوی نقل و حرکت کا حکم قائم رکھا۔ ساتھ ہی کہا کہ ۳۰ جولائی کو آسٹریا اور روس میں براہ راست گفتگو شروع ہو جائے۔ چند لمحوں کے لیے نظر آ رہا تھا کہ بحران پر قابو پا لیا گیا۔

مگر روس جیسے ملک میں فوجی نقل و حرکت سہل نہ تھی۔ مختلف مقامات بہت دور واقع تھے۔ حمل و نقل کے وسائل اچھے نہ تھے۔ پھر نوکر شاہی کا سلسلہ اپنی جگہ قائم تھا اور روسی فوجیوں کو اندیشہ تھا کہ دشمن ان پر اچانک حملہ کر دیں گے۔ غرض آخری لمحے پر روس نے پھر عام نقل و حرکت کا حکم دے دیا۔ جرمنی نے معاً اصرار کیا کہ روس میں ہر فوجی نقل و حرکت روک دی جائے اور جب یہ نقل و حرکت جاری تھی تو ۳۱ جولائی کو ۴ بجے بعد سہ پہر خود بھی نقل و حرکت کا حکم دے دیا اور اسی دن ۷ بجے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس روسی حلیف کا ساتھ دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اب بظاہر اسے بھی حملے کا خطرہ پیدا ہوا اور تین بج کر پچپن منٹ بعد سہ پہر وہاں بھی لام بندی شروع ہو گئی۔ ۳ اگست کو جرمنی نے فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

برطانیہ اس وقت تک متذبذب تھا۔ اگرچہ فرانس کے ساتھ مفاہمت آئینی اعتبار سے دونوں قوموں کی یکجائی لازم



یورپ اور مشرق اوسط ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء
اتحادی اور ان کی مددگار طاقتیں
محوری طاقتیں اور ان کے حلیف
غیر جانبدار ملک
سیاسی حدود
آسٹریا اور ہنگری کی درمیانی سرحد
× مقامات جنگ
میل
۵۰۰
مغربی محاذ پہلی عالمی جنگ
یہ علاقہ تفصیلاً دائیں جانب کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے
بحر اوقیانوس
بحیرۂ شمالی
× جنگ جٹلینڈ
ناروے
سویڈن
برطانیۂ عظمیٰ
آئرلینڈ
سینٹ پیٹرزبرگ
ماسکو
سمالنسک
روس
برلن
جرمنی
وارسا
پولینڈ
برسٹ لٹووسک
کیف
پیرس
فرانس
بورڈو
میڈرڈ
لوزان
میلان
جینوا
آسٹریا ہنگری
بوڈاپسٹ
بلگریڈ
بخارسٹ
بحیرۂ اسود
صوفیا
بلغاریہ
قسطنطنیہ
باسفورس
گیلی پولی
دردانیال
سلطنت عثمانیہ
کارس
بحیرۂ خزر
فارس
بغداد
دریائے فرات
خلیج فارس
عرب
بیت المقدس
قاہرہ
مصر
قبرص
کریٹ
بحیرۂ روم
یونان
ایتھنز
اٹلی
روم
کارسیکا
سارڈینیا
سسلی
مالٹا
تیونس
لیبیا
الجزائر
جبرالٹر
دریائے ٹیگس
انگلستان
لندن
بلجیم
فرانس

قرار نہیں دیتی تھی، لیکن فرانس و برطانیہ کے جنگی محکموں نے دفاعی تدابیر میں گہرا تعاون قائم کر لیا تھا۔ غالباً اس وقت برطانیہ بہرحال شریک جنگ نہ ہوتا، لیکن جنگ میں اس کی شرکت کا باعث یہ تھا کہ جرمنی نے بلجیم کی غیر جانبداری کی خلاف ورزی کی، حالانکہ برطانیہ اور پروشیا سنہ ۱۸۳۹ء میں دوسری طاقتوں کے خلاف مل کر خلاف ورزی کی ضمانت دے چکے تھے۔ جرمنی کے فوجی کارفرما پختہ ارادہ کیے بیٹھے تھے کہ مغرب میں فیصلہ کن اقدام کر کے فرانس کو جنگ میں کامل شکست دے دیں، پھر روس کے مقابلے میں پہنچ جائیں، جس کی فوجی مشینری آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنوں نے ایک گوشے سے گزرتے ہوئے حملہ ضروری سمجھا۔ شمالی و مشرقی فرانس میں اعلیٰ پیمانے پر قلعہ بندیاں موجود تھیں اور علاقہ کوہستانی تھا۔ وہاں سے حملہ مشکل تھا۔ ۲۔ اگست کو جرمنوں نے حکومت بلجیم سے کہا کہ ہم آپ کے علاقے میں سے گزرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ صلح میں آپ کی علاقائی حدبندی محفوظ رکھی جائے گی۔

بلجیم نے یہ مطالبہ ٹھکرا دیا اور غیر جانبداری کی محافظ طاقتوں سے امداد کی اپیل کی۔ برطانوی کابینہ میں دو آدمی صلح کے حامی تھے، انھوں نے سر ایڈورڈ گرے کی سخت مخالفت کی، لیکن گرے اپنے فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہا اور ۴۔ اگست کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جرمنی کے چانسلر بیتھمان ہالویگ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس کی زبان سے اچانک یہ لفظ نکلے کہ برطانیہ ردّی کاغذ کے ایک ٹکڑے کے لیے شریک جنگ ہوا ہے گویا سنہ ۱۸۳۹ء کے جس معاہدے کے ذریعے سے بلجیم کو غیر جانبداری کی حفاظت کا یقین دلایا گیا تھا وہ ردّی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ یہ ناخوشگوار الفاظ دنیا بھر کے اخباروں میں پہنچ گئے اور ان سے نہ صرف برطانوی رائے عامہ ہی جنگ کے حق میں ہو گئی بلکہ یہی الفاظ تمام دوسرے عوامل سے بڑھ کر جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کے مؤید بنے۔

دوسری طاقتوں کا اشتراک

۶۔ اگست کو آسٹریا نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ گویا اٹلی کے سوا "ائتلاف ثلاثہ" اور "اتحاد ثلاثہ" کے تمام ارکان لڑائی میں شامل ہو گئے۔ اٹلی کبھی آسٹریا کا مخلص حلیف نہ تھا، کیونکہ وہ بعض علاقے آسٹریا سے لینا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے "اتحادِ ثلاثہ" کا پابند نہ سمجھتے ہوئے غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ یوں ایک طرف جرمنی اور آسٹریا و ہنگری تھے، دوسری طرف فرانس اور برطانیہ۔ جاپان اواخر اگست میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہوا۔ ترکی نے نومبر سنہ ۱۹۱۴ء میں آسٹریا اور جرمنی کی رفاقت اختیار کر لی۔ پھر اتحادیوں نے خفیہ معاہدوں کے ذریعے سے اٹلی کو بہت سی زمینیں دے دینے کا وعدہ کر لیا (جن کی تفصیل آگے آئے گی) چنانچہ اٹلی مئی سنہ ۱۹۱۵ء میں اتحادیوں کا ساتھی بن گیا۔

سنہ ۱۹۱۶ء کے موسم سرما میں جنگ کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس وقت جرمنوں نے برطانیہ پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی کوشش کی، اس کا ذریعہ صرف ایک تھا یعنی آبدوزوں سے کام لے کر برطانیہ کو غذائی سامان اور خام مال سے محروم کرنا، جو سمندر پار سے پہنچ رہا تھا اور اس کے بغیر اہل برطانیہ بھوک کے مر جاتے۔ اس لامحدود آبدوزی جنگ کا مطلب

یہ تھا کہ امریکہ کے جہاز بھی غرق کر دیئے جاتے، کیونکہ اہل امریکہ بین الاقوامی قانون کے عین مطابق انگلستان اور فرانس کے لیے ضروری سامان لا رہے تھے۔ ۶۔ اپریل ۱۹۱۷ء کو ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے بڑی طاقتوں کے ساتھ شریک ہوگئیں۔ جن امریکیوں کو اس وقت اور آج حکومت امریکہ کی اس روش سے **اختلاف** تھا، وہ اعلان کر چکے ہیں کہ حکومت امریکہ کو چند شریروں نے پھندے میں پھانس لیا۔ یہ لوگ انگلستان یا فرانس کے جذباتی محب تھے یا وہ بینکر (ساہوکار)، جنھوں نے صدر ولسن سے اتفاق کر لیا کہ دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ رکھنا ضروری ہوگیا۔ اتحادی سیاست مداروں اور رشوت خور یورپیوں کے منصوبے بھی اس سلسلے میں کارفرما ہے، لیکن یہ امر بحث طلب ہے کہ اگر جرمنی لامحدود آبدوزی جنگ شروع نہ کرتا تو آیا حکومت امریکہ جنگ میں شامل ہوتی۔ چونکہ وسطی اور جنوبی امریکہ کی بہت سی مملکتوں نے جمہوریۂ امریکہ کی پیروی کی تھی، اس لیے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک ساٹھ سے زیادہ مملکتوں نے جنگ کا اعلان کیا یا سیاسی تعلقات توڑے۔ ظاہر ہے کہ یہ عالمی جنگ تھی۔

اکاونواں باب

سرگزشتِ جنگ

(۱)

تمہید

جنگ آئی تو اس نے ثابت کر دیا کہ نورمن اینجل جیسے پیشگو وہ معاملوں میں غلطی پر تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ جنگ ہوئی تو جانی اور مادی نقصان بے حد و نہایت ہوگا، لیکن یہ جنگ تھوڑی مدت میں ختم نہ ہوئی اور اگرچہ اس سے مغربی معاشرے کو بہ حیثیت مجموعی سخت نقصان پہنچا۔ اور اس نقصان کا ہم اب تک بھی صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ تاہم نقصان ایسا نہ تھا کہ معاشرے کی برداشت سے باہر ہو جاتا۔ کم از کم اس میں شبہہ نہیں کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد بھی مغربی معاشرہ زندہ رہا[1]۔

محاربین کے وسائل

سنہ ۱۹۱۴ء میں قومیں ایک دوسری کے خلاف صف آرا ہوئیں تو اتحادیوں کو مجموعی آبادی اور وسائل میں زبردست برتری حاصل تھی۔ جرمنی، آسٹریا و ہنگری اور ترکی کی آبادیاں پندرہ کروڑ سے زیادہ نہ تھیں۔ برطانیہ، فرانس، روس اور اٹلی کی آبادیاں کم از کم سوا ارب تھیں۔ مزید براں سمندر پار ان کے مقبوضات تھے، جن میں ہندوستان بھی ساڑھے تیس کروڑ آبادی کے ساتھ شامل تھا۔ گویا اتحادیوں کی آبادیاں بہت زیادہ تھیں۔ جس حد تک مادی وسائل کا تعلق ہے، وسطی یورپ کی طاقتوں، خصوصاً جرمن صنعتیں بڑے قابلِ تحسین طریق پر منظم ہو چکی تھیں اور اتنا کوئلہ اور لوہا تھا کہ طویل مدت کے لیے جنگ جاری رکھی جا سکتی تھی، مگر اس دائرے میں بھی اعداد نمایاں طور پر اتحادیوں کے حق میں تھے۔ پھر ایک پہلو اور بھی ہے، یعنی اگرچہ جرمن آبدوزوں اور حملہ آوروں نے ابتدائی دور میں سمندر پار کے وسائل حمل و نقل میں خلل پیدا کر دیا، لیکن اتحادی بہ حیثیت مجموعی سمندر پار سے خوراک اور ضرورت کی دوسری چیزیں حاصل کرتے رہے۔ جب سنہ ۱۹۱۷ء میں شکست خوردہ روس انقلاب کا ہدف بن گیا اور اس سے امداد کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اتحادیوں کو جمہوریہ امریکہ کے

---

[1] بیشک زندہ رہا، مگر برطانیہ اور فرانس اور دوسری بڑی بڑی طاقتوں کی سلطنتوں کا فیصلہ اسی جنگ نے کیا، جس کے بعد ایک ایک کر کے علاقے چھننے لگے، یہاں تک کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد وہ ملک پہلی حالت پر چلے گئے۔

وسیع وسائل مل گئے۔

فی الجملہ امریکی خانہ جنگی کی طرح جس فریق کے پاس آدمی اور مادی وسائل زیادہ تھے، اس نے دشمن کو تھکا دیا اور جنگ میں فتح حاصل کر لی، مگر واضح رہنا چاہیے کہ مجموعی آبادیوں اور مادی وسائل کے اعداد کا نقشہ پیش نظر رکھ کر جو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنگ غیر مساوی تھی تو یہ صحیح نہیں۔ امریکی خانہ جنگی کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں کمزور فریق نے اہم کامیابیاں حاصل کر لیں، بلکہ بعض نازک مواقع پر آخری کامیابی بھی اسی کو حاصل ہوتی نظر آتی تھی۔ نومبر ۱۹۱۵ء کے معرکے سے چند مہینے پیشتر تک اتحادیوں کو آخری کامیابی کا یقین نہیں ہوا تھا۔

جرمنی اور آسٹریا کو ایک جغرافیائی فائدہ یہ تھا کہ دونوں ملک پہلو بہ پہلو واقع تھے اور ان کے تمام وسائل حمل و نقل دونوں ملکوں کے اندر اندر تھے، اس لیے وہ ایک خطرناک محاذ سے فوجیں جلد از جلد دوسرے خطرناک محاذ پر پہنچا سکتے تھے۔ اگرچہ جرمنوں اور آسٹریوں کے درمیان ہر معاملے میں اتفاق رائے نہ تھا، لیکن وہ ایک زبان بولتے تھے اور مدت سے متحد چلے آتے تھے۔ جرمنی کو اس اشتراک میں مقتدر حیثیت حاصل تھی اور آخری فیصلے اسی کے فوجی کارفرماؤں کے ہاتھ میں تھے۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جرمنی دشمنوں کے مقابلے میں جنگ کے لیے ہمہ تن تیار تھا۔ اس کی جنگی مشینری اعلیٰ پیمانے پر منظم تھی۔ اس کے پاس گولے بارود کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ اس کی صنعت کو فی الفور جنگی مقاصد کے مطابق لایا جا سکتا تھا۔ اس کے تمام منصوبے مکمل تھے۔ باشندے جنگ کی حمایت کے لیے متحد تھے اور انھیں یہ بڑا نفسیاتی فائدہ تھا کہ جارحانہ اقدامات خود انھوں نے کیے اور جنگ دشمنوں کے ملکوں میں پہنچا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی قابل ذکر لڑائی جرمنوں کی سرزمین پر نہ ہوئی۔ جنگ ختم ہو گئی اور بعد کی تاریخ کے لیے اہم نتائج پیچھے چھوڑ گئی۔ جرمن فوج بدستور قائم تھی اور جرمنی کی زمین پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔

اس کے برعکس روس از روئے جغرافیہ مغربی اتحادیوں سے منقطع تھا۔ بحیرہ بالٹک پر جرمنوں کو ضبط و نظم حاصل تھا۔ آبنائیں ترکوں کے قبضے میں تھیں۔ اس وجہ سے روس اور اتحادیوں کے درمیان ربط و ضبط میں شدید مشکلات پیش آئیں۔ انھیں طویل چکر کاٹ کر یا تو بحیرۂ منجمد شمالی میں سے آرک اینجل[1] جانا پڑتا تھا یا بحر الکاہل میں سے ہوتے ہوئے ولاڈی واسٹک[2] کا مشکل راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اتحادیوں کے لیے مشرقی اور مغربی محاذوں کے درمیان فوجی نقل و حرکت سیاسی اعتبار سے ممکن بھی ہوتی تو فوجی اعتبار سے بالکل غیر ممکن تھی، مگر یہ نقل و حرکت سیاسی اعتبار سے بھی ممکن نہ تھی اور یہ اتحادیوں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

روس، برطانیہ اور فرانس ماضی قریب میں دوست بنے تھے اور ان کے درمیان اتحاد کے رشتے استوار نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی مستقل و ممتاز قومیت تھی۔ اور ہر قومیت کو دوسری سے کشمکش کے کئی سبب موجود تھے۔ وہ ایک زبان نہیں بولتے تھے اور ان کے درمیان تعاون کی کوئی طویل روایت موجود نہ تھی۔ فرانس اور انگلستان میں جمہوری حکومتیں

---

[1] Archangel

[2] Vladivostosk

قائم تھیں۔ اگرچہ دونوں ملکوں کے باشندے ۱۹۱۴ء میں قومی مقصد پر مضبوطی سے قائم تھے، لیکن انھیں پختہ مرکزیت، آب سیاسی اور فوجی ضبط و نظم کی عادت نہ تھی جو جنگ کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ باقی رہا متحدہ فوجی منصوبہ بندی اور جنگی نظم و نسق کا معاملہ تو یہ روس اور مغربی اتحادیوں کے درمیان کبھی طے نہ ہوا۔ خود برطانیہ، فرانس اور جمہوریۂ امریکہ کے درمیان بھی مغربی محاذ پر یہ اتحاد اس وقت بروئے کار آیا، جب ۱۹۱۸ء میں فرانسیسی جرنیل فوش[1] کو سپہ سالار اعظم بنایا گیا اور اس وقت بھی یہ اتحاد نامکمل ہی تھا، مکمل نہ تھا۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ تینوں بڑی اتحادی طاقتوں میں سے ۱۹۱۴ء میں صرف فرانس بری فوج کے واسطے تیار تھا اور اس کے پاس خاصی فوج تھی، تاہم اس کی آبادی صرف تین کروڑ نوے لاکھ تھی، اس مقابلے میں جرمنی کی آبادی ساڑھے چھ کروڑ تھی، یعنی آدمیوں کے اعتبار سے فرانس اتحادیوں میں کمزور ترین تھا۔ برطانیہ بحری لحاظ سے تیار تھا۔ اس کی بحری قوت ایک بیش بہا اثاثہ تھی، لیکن یہ بحری قوت جرمن بحری فوج کے خلاف استعمال نہیں کی جاسکتی تھی۔ روس نے عام فوجی بھرتی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی فوج بہ لحاظ تعداد بہت زیادہ تھی، لیکن اس کی فوج کو وسیع فاصلے طے کرنے پڑتے تھے۔ ریلوے کا نظام ناکافی تھا۔ بھاری صنعتوں کا نشو و ارتقاء بہت کم ہوا تھا اور فوج کی ہمت جاپانیوں کے ہاتھوں ماضی قریب میں شکست کھا جانے کے باعث متزلزل ہو رہی تھی۔ ایک آفت یہ آئی تھی کہ ماضی قریب ہی میں ناکام انقلاب کے باعث لوگوں کے حوصلے افسردہ ہو چکے تھے۔ فوجی اور سیاسی دونوں تنظیمیں نااہلی اور رشوت خوری کے باعث مختل ہو رہی تھیں۔

مغربی محاذ - جرمنوں کا جارحانہ اقدام ۱۹۱۴ء جرمنوں کے پاس پہلے سے ایک جنگی منصوبہ تیار تھا جو شلیفن[2] منصوبہ کہلاتا تھا۔ انھوں نے اس پر فی الفور عمل کیا۔ اس منصوبے کا مفاد یہ تھا کہ انتہائی تیزی سے بہت بڑی فوج کے ساتھ پیرس پر پیشقدمی کی جائے اور اس کا جنوبی محور الساس و لورین ہو، جہاں فرانس نے زبردست بری استحکامات کر رکھے تھے۔ گویا جرمنوں کا مدعا یہ تھا کہ ان کی فوج کا جنوبی بایاں بازو (میسرہ) مقابلے کی بڑی جرمن فوج کو ادھر ادھر نہ ہونے دے۔ میمنہ انتہائی تیزی سے آگے بڑھے۔ جرمنوں کے میمنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھنا اس لیے ضروری تھا کہ فرانس کو مشرقی جانب سے براہ راست حملے کی امید تھی اور یہ خیال نہ تھا کہ یہ حملہ بلجیم میں سے گزرتے ہوئے کیا جائے گا۔ یہی سبب تھا کہ فرانس کے دفاعی استحکامات شمالی جانب بہت معمولی تھے اور وہاں آدمی بھی کم تھے، مشرقی جانب بہت زیادہ تھے۔ مغرب میں جرمنی کی اس حرکت نے فرانس کو تیزی کے ساتھ معطل کر دیا۔ اس اثناء میں روس کے خلاف نسبتاً کمزور جرمن فوجیں بھیجی گئیں، کیونکہ روسی فوجیں بہت آہستہ آہستہ آگے

---

[1] Foch

[2] Schlieffen

بڑھ رہی تھیں۔ فرانس کو شکست دے کر جرمن پوری قوت سے روس کے مقابلے میں پہنچ سکتے تھے اور اس پر کاری ضرب لگا سکتے تھے۔ صرف انگریز باقی رہ جاتے، ان کا معاملہ آگے چل کر دیکھ لیا جاتا۔

جرمنوں کا یہ منصوبہ تقریباً کامیاب ہو گیا، مگر دو وجہ سے اس میں ناکامی ہوئی اور مختلف تدبیری عوامل اس کے موجب بنے۔ مغرب میں فرانسیسیوں نے بلجیم اور برطانیہ کی مدد سے جرمنوں کو راستے میں روک لیا اور انھیں پیرس نہ پہنچنے دیا۔ اس سے بھی زیادہ اہم امر یہ ہے کہ اتحادی فوجیں تباہ نہ ہو سکیں۔ مشرق میں روسی کمزوری کے باوجود اتنے آگے بڑھ آئے اور توقع کے خلاف جلد آگے آ گئے، کہ جرمنی کے فوجی کار فرماؤں کو ہراس زدہ ہو کر مغرب سے کچھ فوجیں ہٹانی پڑیں اور انھیں مشرقی محاذ پر بھیج دیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس جرمن سپہ سالار یعنی مولٹکے[1] نے یہ بہت بڑا فیصلہ کیا کہ فالتو فوجیں روسی محاذ پر بھیج دی جائیں وہ روسیوں کی پیشقدمی سے ہراس زدہ نہ تھا، بلکہ سمجھتا تھا، مغربی محاذ پر تمام معاملات خوش اسلوبی سے جاری ہیں اور ادھر توقع کے مطابق کامیابی حاصل کر لینا یقینی ہے، اگرچہ یہ رائے غلط تھی۔ غرض ۲۵ اگست کو مولٹکے نے چھ جرمن فوجیں مغربی محاذ سے الگ کر لیں اور ان میں سے دو کو روسی محاذ پر لے گیا۔ وہاں وہ بروقت نہ پہنچیں، کیونکہ بحرانی حالت گزر چکی تھی اور روسی تباہی خیز شکست کھا چکے تھے۔

مولٹکے کا فیصلہ اواخر اگست میں غیر معقول معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ بلجیم کی فوجوں نے جرمنوں کو لیج[2] میں کچھ مدت کے لیے روکے رکھا تھا اور ایک چھوٹی مگر کار داں برطانوی فوج اس اثنا میں اتحادی محاذ کے میمنے پر جا ٹھہری تھی، مگر جرمنوں کی پیشقدمی جاری رہی اور پیرس کے لیے اتنا خطرہ پیدا ہو چکا تھا کہ حکومت شہر چھوڑ کر بورڈو[3] چلی گئی۔ پھر ستمبر کے پہلے ہفتے میں جرمنوں کے معاملات میں کچھ اختلال پیدا ہوا۔ وہ اس تیزی سے بڑھے تھے کہ ان کے مختلف حصوں میں ربط و ضبط قائم نہ رہ سکا۔ انتہائی دائیں بازو پر فان کلک[4] کی پہلی جرمن فوج تھی۔ اس کے بائیں جانب فان بیولو[5] کی دوسری فوج تھی۔ ان دونوں کے درمیان ربط و ضبط قائم نہ رہا۔ فان کلک ربط ضبط قائم کرنے کے سلسلے میں تقریباً نوّے درجے کا چکر کاٹ گیا اور منصوبے کے بالکل برعکس جنوبی و مشرقی سمت گھوم گیا۔ اس طرح پیرس کو نرغے میں لے لینے کے بجائے اس سے دور ہٹ گیا۔ اس اثنا میں فرانسیسی کمانڈر جوفرے[6] نے تیزی سے نئی فرانسیسی فوج مرتب کر کے پیرس کے اردگرد جما دی۔ یہ فوج اب فان کلک کے بازو پر ضربیں لگانے لگی اور اس کے لیے بچاؤ کا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہاں فرانس کی اس فوج کا افسانوی واقعہ پیش آیا جو پیرس کے مضافات سے ٹیکسیوں میں سوار ہو کر جنگ کے لیے دریائے مارن[7] پر پہنچی تھی۔ یہ چند ہزار سپاہی جنگ

---

۱ Moltke　۲ Liege　۳ Bordeux

۴ Von Kluck　۵ Von Bulow

۶ Joffrey　۷ Marne

کی تقدیر کا فیصلہ تو نہیں کر سکتے تھے، تاہم ان سے یہ ضرور ظاہر ہو گیا کہ نئی تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں اور اتحادی فوجوں کے گرتے ہوئے حوصلے کو پائداری و استواری بخشی جا سکتی ہے۔

اوائل ستمبر ۱۹۱۴ء کی اس جنگ کی تفصیلات، جسے تاریخ میں مارنے کی پہلی جنگ کہا جاتا ہے، حد درجہ پُرپیچ ہیں، لیکن نتیجہ واضح ہے۔ پیرس کے فوجی گورنر گیلی اینی[1] کے اصرار پر جوفرے نے حملے کا عام حکم دے دیا۔ جنگ کی افراتفری میں فان کلک اور فان بیولو کی فوجوں کے درمیان فاصلہ چنداں کم نہ ہوا۔ جرمنی کے فوجی کارفرما حالات کی روداد سن کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے عارضی طور پر مراجعت کا فیصلہ کر لیا۔ جرمن فوجیں پیچھے ہٹیں، فرانسیسی اور انگریز ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ جرمنی کی پیشقدمی ۲۔ اگست سے مسلسل جاری چلی آتی تھی۔ وہ رک گئی۔ آئندہ چند ہفتوں میں متقابل فوجوں کے درمیان وہ مسابقت برپا رہی، جسے رودبار کے لیے مسابقت قرار دیا جاتا ہے۔ جرمن اس کوشش میں تھے کہ اتحادیوں کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے رودبار کی بندرگاہوں تک پہنچ جائیں اور اس طرح وہ مختصر بحری راستہ بند کر دیں، جہاں سے انگریزی امداد پہنچ سکتی تھی۔ جرمن اس میں بھی ناکام رہے اور یورپی جنگ کے دوران میں کیلے اور بولون کی بندرگاہوں کے علاوہ بلجیم کا جنوبی و مغربی گوشہ بھی اتحادیوں کے قبضے میں رہا۔ یہ بہت بڑا فوجی فائدہ تھا۔

۱۹۱۴ء کے موسمِ خزاں میں مغربی محاذ پر استواری پیدا ہو گئی۔ رودبار اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد (نزد بال) کے درمیان تین سو اسی میل کے رقبے میں سپاہی ایک دوسرے کے بالمقابل ایک خط بنائے کھڑے تھے۔ اس خط میں جا بجا موڑ بھی تھے۔ دونوں فریقوں نے خندقیں کھود لی تھیں اور سرسری استحکامات کا ایک سلسلہ قائم کر لیا تھا۔ ان استحکامات کا مرکزی پہلو یہ تھا کہ دونوں طرف متوازی خندقوں کا ایک سلسلہ قائم کر لیا گیا تھا۔ یہ خندقیں اتنی گہری تھیں کہ آدمی ان میں کھڑا بھی ہو جاتا تو کسی کو نظر نہ آتا۔ وقت گزرتا گیا تو ان خندقوں کی خاصی اصلاح کر لی گئی۔ ان میں دمدمے اور مورچے بنا لیے گئے۔ کلدار توپوں کے لیے مناسب مرکز تیار ہو گئے، اور ان تک پہنچنے کے لیے راستوں کا ایک زبردست جال پھیلا دیا گیا، جن میں جا بجا مستحکم مقامات بھی تھے۔ یوں پورا محاذ وسیع استحکامات کا ایک سلسلہ بن گیا۔ ہزاروں مقامی جھڑپوں کے باعث چار سال میں کہیں کہیں خندقیں آگے پیچھے ہوئیں اور بعض مقامات پر دونوں جانب ان کا سلسلہ ٹوٹ بھی گیا، مگر بحیثیت عمومی خط قائم رہا اور مغربی محاذ پر لڑائی غیر معمولی حد تک تنگ دائرے میں ہوتی رہی۔

آخری فیصلہ مغربی محاذ ہی پر ہوا، لیکن اور بھی بہت سے محاذ تھے۔ ان میں سے بعض کو وہ لوگ تحقیراً ضمنی نمائشیں قرار دیتے رہے، جو چاہتے تھے کہ مرکزی حیثیت صرف مغربی محاذ کو دینی چاہیے، لیکن اب ہم تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر محاذ نے آخری نتیجے کے فیصلے میں کردار ادا کیا۔ چونکہ جرمنوں کے پاس آدمی اور وسائل کم تھے اور ضمنی نمائشوں

---

[1] Gallieni

میں انھیں اپنی قوتیں منتشر کرنی پڑیں، پھر ان کے آسٹروی ترکی اور بلقانی اتحادیوں کو امداد کی ضرورت پڑتی رہی۔ یہ تمام معاملات ان کی شکست میں بڑے عامل بن گئے۔ توضیح کے پیشِ نظر ہم دوسرے محاذوں پر الگ الگ بحث کریں گے، مگر یہ بھولنا نہ چاہیے کہ محاربین کے لیے جنگ عام تھی اور دور افتادہ میدان ہائے جنگ ایک دوسرے پر موقوف تھے۔ ہر ایک کے حالات نے دوسرے کے حالات پر اثر ڈالا۔

مشرقی محاذ مشرقی محاذ، جس میں روسیوں کو جرمنوں اور آسٹرویوں دونوں سے سابقہ پڑا، ضمنی نمائش کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ طرفین کے لاکھوں آدمی اس محاذ پر مصروفِ کارزار تھے اور اگر روسی فوجیں ۱۹۱۷ء کے آخر تک مقابلے پر جمی نہ رہتیں تو اتحادیوں کے لیے مغرب میں جرمنوں اور آسٹرویوں کی تازہ دم فوجوں کے مقابلے میں ٹھہرنا ممکن نہ رہتا اور وہ یقیناً فرانس اور اٹلی میں بڑی کمک نہ پہنچا سکتے تھے۔ مشرق میں بمقابلۂ مغرب جنگ زیادہ تر نقل و حرکت پر موقوف رہی، لیکن اس محاذ پر بھی تعطّل کے خاصے طویل موقعے پیش آئے، خصوصاً موسمِ سرما میں، جب مقابل فوجیں عارضی استحکامات بنا کر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی رہتیں۔

روسیوں نے جنگ کی ابتدا بڑے اچھے طریقے پر کی۔ آسٹریا کا ایک حصہ گلیشیا (جو اٹھارہویں صدی میں پولینڈ کی تقسیم سے آسٹریا کے ہاتھ آیا تھا) آگے بڑھا ہوا تھا۔ روسیوں نے اس میں زیادہ تر فوجیں بھیج دیں اور وہ آسٹرویوں کو پیچھے دھکیلتے دھکیلتے لیمبرگ[۱] کے قریب پہنچ گئے، جہاں تیل کے وسیع ذخیرے موجود تھے۔ ستمبر ۱۹۱۴ء کے اواخر تک وہ ان دروں کے شمالی حصّے میں آ گئے تھے جو کارپیتھین کوہستان میں سے ہوتے ہوئے ہنگری میں پہنچے تھے۔ جرمنوں کے خلاف بھی مشرقی پروشیا میں ایک بڑھا ہوا حصّہ روسیوں کا ہدف تھا، جسے مشرقی اور جنوبی سمت سے روسی علاقوں نے گھیر رکھا تھا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں روسیوں نے گمبینن[۲] جنگ میں کامیابی حاصل کی اور جرمن اتنے سراسیمہ ہوئے کہ انھیں اپنے مشرقی محاذ کی فوج کو از سرِ نو منظم کرنا ضروری معلوم ہوا، چنانچہ فان لوڈن ڈارف[۳] نے اپنے اعلیٰ کماندان ہنڈن برگ[۴] کی سرکردگی میں اور ایک بلند پایہ معاون فان ہافمین[۵] کی امداد سے دونوں روسی فوجوں کے خلاف کامیاب کارروائی شروع کی، جو جرمنوں کو نرغے میں لے لینے کے لیے کوشاں تھیں۔ اواخرِ اگست میں جرمنوں نے ٹینن برگ[۶] کے مقام پر روسیوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ روسی فوجوں کے سالارِ اعظم سیمسونوف[۷] نے خودکشی کر لی۔ اوائل ستمبر میں جرمنوں نے روسیوں کو ماسورین[۸] جھیلوں پر ایک اور

---

۱ Lemberg
۲ Gumbinnen
۳ Ludandroff
۴ Hindenburg
۵ Hoffman
۶ Tannenburg
۷ Samsonov
۸ Masurian Lakes

فیصلہ کن شکست دی۔ اس طرح مشرقی پروشیا روسیوں سے پاک ہوگیا۔

اب جنوب میں جرمنوں کا حلیف آسٹریا شدید دباؤ کے تحت امداد کے لیے چیخ پکار کر رہا تھا اور مغربی محاذ پر بھی فوجوں کی سخت ضرورت تھی۔ ہنڈنبرگ اور اس کے معاونوں کے پاس جو فوج اور سامان تھا، اس سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے پولینڈ میں چند شدید لڑائیاں کر کے آسٹریوں پر دباؤ کم کر دیا۔ ۱۹۱۴ء کے آواخر تک آسٹری گلیشیا میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ جرمن مشرقی پروشیا اور پولینڈ کے مرکزوں سے مشرقی جانب پیش قدمی کر سکتے تھے۔ مئی اور جولائی ۱۹۱۵ء میں وسطی یورپ کی طاقتوں نے دو مشترکہ جارحانہ اقدام کیے اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ روسیوں پر شدید نقصانات کی ایسی ضربیں لگائیں، جن سے وہ سنبھل نہ سکے۔ ۱۹۱۵ء کے آواخر میں خط جنگ (یعنی مشرقی محاذ پر) ان کے پاس سے گزرتا ہوا روس کے ان صوبوں میں چلا جاتا تھا، جو بالٹک کے کنارے واقع تھے اور اس کا مشرقی سرا گلیشیا میں ٹارنوپول[۱] اور زرنووٹز[۲] پر تھا۔

۱۹۱۶ء میں روسیوں نے نئے سالار اعظم جنرل بروسی لوف[۳] کی سرکردگی میں آسٹریوں کے خلاف نیا جارحانہ اقدام شروع کیا۔ انھیں اپنی فوجوں کے حوصلے کی بحالی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ ان کے اتحادی زور دے رہے تھے کہ اطالویوں کی مدد کے لیے کوئی قدم اٹھایا جائے، جنھیں ٹریٹ کے خطے میں آسٹریوں نے سخت خطرے میں ڈال دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بروسی لوف نے پوری تیاری کے بغیر جلد حملہ شروع کر دیا۔ ابتدا میں اسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ بعض مقامات پر آسٹری اسی میل پیچھے ہٹ گئے اور بہت سے قیدی روسیوں کے ہاتھ لگے، لیکن جرمن دوبارہ آسٹریوں کی امداد کے لیے پہنچ گئے۔ انہوں نے مغربی محاذ سے تازہ دم فوجیں بھیج کر بروسی لوف کی پیشقدمی روک دی اور وہ کوئی فیصلہ کن فتح حاصل نہ کر سکا۔

یہی شکست تھی، جس سے روسی انقلاب پیدا ہوا اور اس کی ابتدا اوائل مارچ ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ یہ بغاوت ابھی زوروں پر نہیں آئی تھی اور نومبر ۱۹۱۷ء میں بالشویکوں کے انقلاب سے پیشتر بروسی لوف نے ایک آخری جارحانہ اقدام کیا، لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکا اور بالشویکوں کے لیے راستہ صاف ہوگیا، جو صلح کر لینے کا وعدہ پورا کر دینے کے لیے تیار تھے۔ روس ۱۹۱۷ء کے آخر تک جنگ سے باہر نکل گیا۔ وسطی یورپ کی طاقتوں نے اسے بریسٹ لٹووسک[۴] کے غیر معمولی تخریبی معاہدے پر دستخط کے لیے مجبور کر دیا (مارچ ۱۹۱۸ء)۔ اس معاہدے کے مطابق پورا پولینڈ، کنارہ بالٹک کے تمام صوبے، پورا یوکرین، فن لینڈ، نیز قفقاز کے بعض خطے چھوڑنے پڑے۔ قفقاز کے خطے ترکی کے حوالے ہو گئے، ان علاقوں

۱۔ Tarnopole

۲۔ Czernowitz

۳۔ Brusilov

۴۔ Brest-Litovsk

میں سے زیادہ عارضی طور پر آسٹریا اور جرمنی کے ماتحت آ گئے۔

اطالوی محاذ

اپریل ۱۹۱۵ء میں اٹلی نے برطانیہ فرانس اور روس کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا، یعنی معاہدۂ لندن۔ اس کے مطابق اطالویوں سے وعدہ کر لیا گیا کہ ٹرینٹ[1] اور ٹریسٹ[2] کے ارد گرد وہ علاقے اٹلی کو دے دیئے جائیں گے، جن کا وہ مدت سے طلبگار تھا اور یہ وعدہ صلح کے آخری تصفیے میں خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ بحیرۂ ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر اہم علاقے بھی اٹلی کو دے دینے کا وعدہ کر لیا گیا، جو آج کل یوگوسلافیہ کا حصہ ہیں۔ چونکہ سربیا اتحادیوں کا حلیف تھا اور اسے بھی یہ علاقے دے دینے کا وعدہ کر لیا گیا تھا لہٰذا یہ وعدہ چنداں متقل نہ تھا۔ اس سے اتحادیوں کو کچھ فائدہ نہ ہوا، کیونکہ اٹلی بہ حیثیت مجموعی ایک فوجی بار ہی ثابت ہوا، اس سے حاصل کچھ نہ ہوا۔ لیکن دورِ حاضر کا نظام ملک داری ایسا ہے کہ جنگ کے دباؤ میں لوگ طاقتور دشمن کے خلاف نئے حلیف حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے وعدے کر لیتے ہیں۔

مئی ۱۹۱۵ء میں اطالویوں نے آسٹریا وہنگری کے خلاف جنگ کا رسمی اعلان کیا (جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان اگست ۱۹۱۶ء تک نہ ہوا) چنانچہ آسٹروی اور اطالوی سرحد پر ایڈریاٹک کے انتہائی گوشے میں ایک نیا محاذ جنگ پیدا ہو گیا۔ یہ علاقہ سراسر کوہستانی تھا، اور کوئی مؤثر اقدام وہاں نہیں ہو سکتا تھا اور اصل محاذ دریائے اسونزو[3] کے ساتھ ساتھ تقریباً ساٹھ میل تک محدود رہا۔ دو سال تک خونریز، مگر فیصلہ کن کارروائیاں دریا کے ساتھ ساتھ جاری رہیں۔ اس وجہ سے کئی لاکھ آسٹروی فوجیں وہاں موجود رہیں۔ ۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں روس شکست کھا گیا تو اٹلی پر ایک ایسی ضرب لگی، جس میں اس کا خاتمہ ہو جانا قریب نظر آتا تھا۔ جرمنوں نے پھر اس سلسلے میں قوت معرکہ کا انتظام کیا۔ اب موڈن ڈارف کماندار اعظم تھا، اس نے چھ ڈویژن جرمن فوج دریائے سونزو کے محاذ پر بھیج دی۔ جرمنوں اور آسٹرویوں کی مشترکہ فوج کیپوریٹو[4] سے نکلی اور اطالویوں کو وینس کے میدانوں سے بھی آگے دھکیل دیا۔ اطالویوں کی یہ مراجعت کھلی ہوئی شکست تھی۔ چنانچہ فرانس اور برطانیہ نے عجلت میں فوجیں ایلپس سے گزار کر بھیجیں، لیکن آسٹرویوں اور جرمنوں کو جس وجہ سے رکنا پڑا، یہ تھی کہ موجودہ زمانے کے جنگی حالات میں تیزی سے پیشقدمی کرنے والی فوجوں کو سامان بہم نہیں پہنچایا جا سکتا۔ آخر اطالوی دریائے پیاوے[5] کے خط پر رکے، گویا وہ پو[6] کے قریب پہنچ گئے۔

---

[1] Trent
[2] Triste
[3] Isonzo
[4] Caporetto
[5] Piave
[6] Po

باونواں باب

سرگزشتِ جنگ

(۲)

بلقانی اور ترکی محاذ

جنگ کے آغاز ہی میں سردیا کی وجہ سے یقین تھا کہ بلقان میں ایک محاذ قائم ہو جائے گا۔ آسٹریا اس محاذ پر بھی ناکام رہے۔ اگرچہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں انھوں نے سردیا کے دارالحکومت بلغراد پر قبضہ کر لیا، لیکن وہ بعد میں نکالے گئے۔ بلغاریا کو دونوں فریق ساتھ ملانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر وہ ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں وسطی یورپ کی طاقتوں سے مل گیا۔ جرمنوں نے فوجیں بھی بھیج دیں اور فان میکینسن[۱] نام ایک سالار بھی بھیج دیا۔ اسی نے سرویوں کو آخری شکست دی۔ ان کی فوج کے بچے کھچے اجزا، جزیرہ کارفو[۲] میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہوئے، جو غیر جانبدار یونان کا مملوکہ تھا۔ بلقان پر یہ ضرب لگی تو اس کے جواب میں اتحادیوں نے چار ڈویژن فوج یونان کے شہر سالونیکا[۳] میں اتار دی تھی، اور مقدونیہ میں ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ خود یونانی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کا رئیس شاہ کنسٹنٹائن تھا، جو دل سے وسطی یورپ کی طاقتوں کا ہمدرد تھا، مگر فی الوقت یونان کی غیر جانبداری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا گروہ اتحادیوں کا حامی تھا۔ اس کی سرکردگی وینزیلاس[۴] کر رہا تھا، جو ایک قابل اور پرانا سیاستدان تھا۔ اگرچہ اتحادیوں نے یونانی غیر جانبداری کے رسمی تصورات کی کچھ پروا نہ کی، مگر وینزیلاس جون ۱۹۱۷ء تک برسرِ اقتدار نہ آ سکا۔ جب اتحادیوں نے کنسٹنٹائن پر دباؤ ڈالا اور وہ اپنے بیٹے الگزانڈر کے حق میں دستبردار ہوا تو وینزیلاس کو مختاری کا موقع ملا۔

رومانیا کو روسی اپنے ساتھ ملانے کے لیے طرح طرح کے جھکمے دے رہے تھے۔ آخر اگست ۱۹۱۶ء میں وہ اس شرط پر اتحادیوں کا طرفدار بنا کہ آسٹریا ہنگری سے وسیع علاقے چھین کر اس کے حوالے کیے جائیں گے۔ جنگ میں شرکت کے لیے یہ موقع حد درجہ ناساز گار تھا۔ جرمنوں کی امداد کے باعث آسٹریا کی قوت خاصی بڑھ چکی تھی۔ اس نے رومانیا کو پامال

۱۔ Mckensan
۲۔ Corfu
۳۔ Saloniki
۴۔ Venizelos

کر ڈالا اور جنوری ۱۹۱۷ء میں رومانیا کا وہ حصہ آسٹریا کے قبضے میں چلا گیا، جہاں تیل کے قیمتی چشمے تھے۔ جرمنوں نے مارچ ۱۹۱۸ء میں بریسٹ لٹووسٹ کے معاہدے کے ذریعے سے روس کے ساتھ جداگانہ سمجھوتہ کر لیا تو رومانویوں کو خاصا علاقہ بلغاریا کے حوالے کرنا پڑا اور تیل کے چشموں والا علاقہ نوّے سال کے لیے جرمنوں کو ٹھیکے پر دے دیا گیا۔

اگرچہ یونان رسمی طور پر شریک جنگ ہو گیا تھا۔ مگر مقدونیہ کے محاذ پر ۱۹۱۸ء کے موسم گرما تک افسردگی ہی طاری رہی۔ جب امریکی فوجیں تیزی سے فرانس پہنچنے لگیں تو اتحادیوں کے جنگی لیڈروں نے فیصلہ کیا کہ اب سالونیکا کے محاذ پر زیادہ بڑی قوت جمع کی جا سکتی ہے۔ اس سے بڑا فائدہ پہنچا، کیونکہ فرانسیسی جرنیل فرانشے دسپرے[1] کی سرکردگی میں اتحادی فوجوں نے اس محاذ پر دشمن کو کامل شکست دی۔ فرانسیسیوں، برطانویوں، سرویوں اور یونانیوں نے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء کو بڑی پیشقدمی بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساتھ ساتھ سرحد بلغاریہ تک شروع کر دی، چنانچہ ۳ ستمبر کو بلغاریہ نے جداگانہ متارکہ کر لیا اور اوائل نومبر میں اتحادی فوجیں متعدد مقامات پر ڈینیوب کو عبور کر گئی تھیں۔ ۱۱ نومبر کو مغربی محاذ پر متارکے کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت تک فرانس کا سہ رنگا جھنڈا اور اس کے ساتھ دوسری قوموں کے جھنڈے وی آنا تک بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس پیشقدمی نے نپولین کے عہد کی یاد تازہ کر دی اور فرانسیسیوں کو یہ خیال ہو گیا کہ وہ برّ اعظم یورپ میں مقتدر ترین قوم ہیں، حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد تھا۔

"ضمنی نمائشوں میں سب سے زیادہ دلچسپ نمائش وہ تھی، جس نے دوسری عالمی جنگ پر بھی گہرے اثرات ڈالے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی شریک جنگ ہوا۔ مغربی محاذ پر فرانسیسی تنہا جرمنوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ برطانیہ کے فوجی اور سیاسی لیڈروں نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ کی قوت سے بحیرۂ ایجہ کے حلقے میں کوئی بحری یا برّی کارروائی شروع کرنا مناسب ہوگا۔ اس طرح وی آنا اور برلین کی طرف خشکی کے راستے پیشقدمی کا بھی امکان تھا اور جرمنی و آسٹریا کو ایسے کسی حملے کی توقع نہ تھی۔ ونسٹن چرچل ناظمِ اعلیٰ (فسٹ لارڈ) تھا، اسی نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا، چنانچہ اس پر عمل کا فیصلہ ہو گیا۔ حملے کے لیے درہ دانیال کو چن لیا گیا۔ یہ ان دو آبناؤں میں سے مغربی تھی، جو بحیرہ اسود کو بحیرہ ایجہ سے جدا کرتی ہیں۔ اگر اتحادی یہاں فتح حاصل کر لیتے تو انھیں ایک فائدہ یہ تھا کہ بحیرۂ اسود کے راستے روس سے روابط قائم کر سکتے تھے۔

مارچ ۱۹۱۵ء میں برطانوی اور فرانسیسی بیڑے نے بزور آبناؤں سے گزرنے کی کوشش کی، مگر متعدد جہاز برقی سرنگوں سے ٹکرا کر ڈوب گئے تو یہ کوشش ترک کر دی گئی۔ بعد ازاں برطانیہ، آسٹریلیا — نیوزی لینڈ اور فرانس کی فوجیں درۂ دانیال کے یورپی اور ایشیائی دونوں ساحلوں (گیلی پولی) پر جابجا اتاری گئیں۔ وہاں ترکوں نے سخت مزاحمت کی۔ ایک ماتحت افسر مصطفیٰ کمال نے اس موقع پر مزاحمت میں درجۂ امتیاز حاصل کر لیا۔ آخر اتحادیوں کو کوشش ترک کرنی پڑی۔ روس دورانِ جنگ میں آبناؤں کے باعث اندر بند رہا۔ چرچل برابر سمجھتا رہا کہ درۂ دانیال کا منصوبہ اصل منصوبے کی حیثیت

---

[1] Franchet d' Esperey

میں ناکام نہیں ہوا، بلکہ اسے پورا کرنے کے لیے جس عزم کی ضرورت تھی، اس سے کام نہ لیا گیا۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکیوں کی فوجی رائے کے خلاف پھر اپنا یہ پرانا منصوبہ تازہ کر لیا اور اسے ایکسس کے نرم و نازک پیٹ میں چھرا گھونپنے کے مترادف قرار دیا۔

مشرق قریب اور نو آبادیاں

دنیا میں جتنے بھی محاذ تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ نو آبادیاں صاف ہو جائیں، یعنی جرمن سلطنت کے جو حصے سمندر پار تھے، نیز ترکی سلطنت کے دور افتادہ حصے مسخر ہو جائیں۔ ترکوں کو جرمنوں نے خوب تربیت دے دی تھی اور بعض اوقات ان کی افواج میں ماہر جرمن افسر موجود ہوتے تھے، اس لیے انھوں نے قدم قدم پر مزاحمت کی۔ عراق میں برطانوی جرنیل ٹاونشینڈ ہندوستان سے فوج لے کر ۱۹۱۵ء میں بصرہ اترا اور وادی دجلہ و فرات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ ترکوں نے اپریل ۱۹۱۶ء میں اسے حوالگی پر مجبور کر دیا، لیکن وہ نہر سویز پر قبضہ نہ کر سکے، نہ روسی آرمینیا میں زیادہ آگے بڑھ سکے۔ مزید براں برطانیہ نے ترکی حکمرانوں کے خلاف عربوں کی ناراضی سے فائدہ اٹھایا[1]۔ صحرائی علاقے میں کئی مہمیں جاری ہوئیں، جن میں کرنل ٹی۔ ای۔ لارنس نے نمایاں حصہ لیا۔ وہ عربوں کے مزاج اور حالات سے خوب واقف تھا۔ ۱۹۱۷ء کے آخر تک انگریز بغداد اور یروشلم پر قابض ہو چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں فلسطین کے اندر برطانیہ کا جارحانہ اقدام اس قدر کامیاب ہوا کہ ۳۰ ستمبر کو ترکوں نے متارکہ کر لیا اور وہ جنگ سے باہر نکل گئے۔

یہ لڑائیاں ان سرزمینوں میں لڑی گئیں، جو مغربی تہذیب کے گہوارے رہ چکی تھیں اور دنیائے حاضر کی تاریخ و ساخت میں انھیں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انھیں سرزمینوں سے آزاد عرب قومیں اٹھیں (شام، لبنان، عراق، اردن، دولت عربیہ سعودیہ، مصر) وہیں یہودیوں کی قومی حکومت قائم ہوئی، جس کی بنا پر مذکورہ بالا ریاستوں سے عرب حکومتوں کو سخت دشمنی ہوئی۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور کے ذریعے سے برطانیہ نے یہودیوں کے لیے فلسطین کے اندر ایک قومی وطن بنانے کا وعدہ کیا۔ اس وعدے نے ۱۹۲۲ء میں حکمداری کی شکل اختیار کی اور برطانیہ کے زیر حمایت ایک حکومت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔

اگرچہ جرمن نو آبادیاں برطانوی بحری طاقت کے باعث جرمنی سے منقطع ہو چکی تھیں، تاہم انھوں نے بڑی مستعدی سے جنگ کی۔ جرمن مشرقی افریقہ میں جرمنوں نے بڑی دانشمندی سے لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع کیا کہ ۱۹۱۸ء میں یوم متارکہ تک ان کی خاصی بڑی قوت نو آبادی میں موجود تھی، مگر باقی حصوں میں نہ ان کے پاس اچھے مرکز تھے، نہ زیادہ

---

[1] یہاں ایک حقیقت واضح کر دینی چاہیے اور وہ یہ کہ نہ تمام عرب ترکوں کے خلاف تھے اور جنھیں اختلاف تھا، وہ سب بھی نہیں چاہتے تھے کہ ترکوں کو نقصان پہنچے اور اتحادی فائدہ اٹھائیں۔ زیادہ تر مخالفانہ سرگرمیاں شریف حسین اور اس کے خاندان تک محدود رہیں۔

فوجیں نہیں، لہٰذا ۱۹۱۴ء کے آخر تک برطانیہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، فرانس اور جاپانی سمندر پار جرمنی مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے۔

بحری جنگ اب ہم نہایت اہم محاذ پر پہنچ گئے ہیں، یعنی سمندر میں جنگ پر۔ بہ حیثیت عمومی برطانیہ کی بحری قوت فیصلہ کن عنصر ثابت ہوئی اور اسے فرانسیسی، اطالوی اور امریکی بحری قوتوں کے ذریعے سے تقویت حاصل ہو چکی تھی۔ سمندروں پر اتحادیوں کا قبضہ تھا، اس لیے وہ باقی دنیا کے وسائل بہ اطمینان لا سکے اور معمولی سے نقصان کے ساتھ برطانوی اور امریکی فوجیں فیصلہ کن مغربی محاذ پر پہنچا سکے۔ اسی بحری قوت کی بدولت جرمنی اور اس کے حلیف سمندر پار کے وسائل سے محروم ہو گئے اور یہ معاملہ بھی بڑا اہم ہے۔ متحدہ جہازوں کی ناکہ بندی نے رفتہ رفتہ جرمنی کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی فوجوں کے لیے محض سامانِ جنگ ہی محدود نہ رہا بلکہ شہری آبادی کے لیے غذا بھی پوری بہم نہ پہنچائی جا سکی۔ ۱۹۱۸ء کے آواخر میں جرمن قلت غذا کے باعث پریشان حال تھے۔ آخری وقت تک جنگ جاری رکھنے کے بجائے حوالگی پر آمادگی میں ایک اہم عامل یہ بھی تھا۔

تاہم اتحادیوں کے لیے بحری جنگ سہل نہ تھی۔ جرمنوں نے بہت سی آبدوزیں بنالی تھیں اور یہ آبدوزیں ویسی ہی خطرناک ثابت ہوئیں، جیسے بعض برطانوی ہراس انگیز پیشین گوئیاں کر چکے تھے۔ جب جرمنوں نے آبدوزوں کی لامحدود جنگ جاری کر دی تو ان تجارتی جہازوں کو سخت نقصان پہنچا، جو برطانیہ کی زندگی کے لیے عدد درجہ ضروری تھے۔ ۱۹۱۷ء کے آخر تک جرمنوں نے برطانیہ کے اسی لاکھ ٹن کے جہاز غرق کر دیئے تھے۔ ان میں زیادہ تر آبدوزوں ہی نے غرق کیے۔ ۱۹۱۷ء میں ایک موقع ایسا بھی آ گیا تھا۔ جب برطانیہ کے پاس صرف ایک مہینے کی غذائی جنس رہ گئی تھی۔ امریکیوں اور اتحادیوں کی مشترکہ تدبیروں کے ذریعے سے آبدوزوں کے خطرے پر قابو پایا گیا، مثلاً ہر تجارتی بیڑے کے ساتھ حفاظتی جنگی جہاز بھیجے جاتے۔ سمندر کی گہرائی میں گولے پھینکے جاتے، جن کی وجہ سے آبدوزوں کے لیے خطرہ بہت بڑھ گیا۔ ایسے تیز رفتار چھوٹے چھوٹے جہاز تیار کر لیے گئے، جو آبدوزوں کا تعاقب کرتے، لیکن اگر جرمن بری جنگوں کا سلسلہ روک کر اپنی پوری قوت آبدوزیں بنانے میں لگا دیتے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں (اور دوبارہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں) کیا حالت پیش آتی۔ یہ انھوں نے پہلی عالمی جنگ میں کیا، نہ دوسری میں۔

جرمنی نے ۱۸۹۰ء کے بعد سے جو جنگی جہاز تیار کر لیے تھے ــــ انھیں جہازوں کے باعث انگلستان و جرمنی کے درمیان عداوت بڑھی تھی ــــ انھوں نے جنگ میں کوئی فیصلہ کن حصہ نہ لیا۔ بلاشبہ بعض حملہ آور جہازوں نے جنگ کے پہلے سال میں خاصا نقصان پہنچایا، لیکن ان کے لیے سمندروں میں پھرنے کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی۔ البتہ ایک مرتبہ بڑے جرمن بیڑے نے برطانیہ کے لیے خاصا خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ جٹلینڈ کی جنگ تھی، جس کی کیفیت بحری مورخ بار بار پیش کرتے رہے۔ یہ جنگ ۳۱ مئی اور یکم جون ۱۹۱۶ء کو بحیرۂ شمالی کے اندر لڑی گئی اور اس میں جرمنوں کے مقابلے پر انگریزوں کے دُگنے جہاز

ڈوبے اور دنیا پر آشکارا ہو گیا کہ جرمنی کی بحری قوت کتنی اچھی تھی، مگر جب برطانیہ کے بڑے جہاز مقابلہ پر پہنچے تو جرمن امیر البحر شیئر[1] بندرگاہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا، کیونکہ وہ بڑے جہازوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ غرض جٹلینڈ کی جنگ میں چال کے اعتبار سے جرمن کامیاب رہے، مگر عمومی حیثیت میں برطانیہ کو کامیابی حاصل ہوئی، کیونکہ پھر جرمن بحری قوت نے کبھی برطانیہ کے لیے کوئی ہراس پیدا نہ کیا اور یورپی سمندروں پر تسلط برطانیہ ہی کے قبضے میں رہا۔ جنگ کے خاتمے پر جرمن بحریات کے کارفرماؤں نے بیڑے کو الگ رکھنے کے لیے ایک زبردست کوشش کی، لیکن جرمن ملاحوں نے جہاز باہر نہ نکلنے دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں ملاحوں کی بغاوت نے جرمنی کے انقلاب کو فیصلہ کن مہمیز لگائی اور ۱۹۱۸ء کے نتائج کا راستہ ہموار ہوا۔

مغربی محاذ:- اتحادیوں کی فتح

اسی جنگ میں فضائی لڑائیوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جرمنوں نے ہوا سے ہلکی مشینیں تیار کر لی تھیں جنھیں زیپلن[2] کہتے تھے۔ ان ہوائی جہازوں نے ۱۷-۱۹۱۶ء میں کئی مرتبہ لندن پر حملے کیے۔ دونوں فریقوں نے آس پاس کے قصبوں پر بم گرائے، لیکن مجموعی نقصان بہت معمولی تھا اور اس سے آخری نتیجے پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے سے دیکھ بھال کا کام بہت عمدہ طریق سے لیا گیا، خصوصاً توپوں کے مقامات معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اگرچہ اس زمانے میں ہوائی جہاز زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے، بایں ہمہ انھوں نے آبدوزوں کا پتا لگانے میں بھی بڑا مفید کام کیا۔ جنگی طیاروں کی مشینری میں خاصی اصلاح ہو گئی اور ان فضائی قوتوں کے نشو و ارتقا کی بنیاد رکھی گئی جن سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہازوں نے جنگ کے چار سال میں اتنی ترقی کی کہ ۱۹۰۳ء سے (جب رائٹ[3] بھائیوں نے پہلی مرتبہ کٹی ہاک[4] میں پرواز کی تھی) ۱۹۱۴ء تک نہیں ہوئی تھی۔

اگرچہ جنگ کا فیصلہ ہوائی قوت کی بنا پر نہ ہوا، لیکن جنگ کا ایک نیا طریقہ نکل آیا اور اس میں خاصی ترقی ہوئی خصوصاً مغربی محاذ پر۔ کلدار توپوں، بار بار گولیاں چلانے والی رائفلوں اور تیزی سے آتشباری کرنے والی توپوں نے ہوائی جہازوں کی رہنمائی میں ایسی مہلک آتشباری کی کہ کسی بھی فریق کے لیے وسیع محاذ پر خندقوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ جنگ مارنے[5] کے بعد دو مرتبہ دونوں فریقوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، مگر اتنا جانی نقصان اٹھایا کہ پہلے اس کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔

تعطل کو دو نئے حربوں نے تقریباً ختم کر دیا۔ ان میں سے پہلا حربہ زہریلی گیس کا تھا جسے جرمنوں نے اکتوبر ۱۹۱۴ء کے اندر پھٹنے والے گولوں میں استعمال کیا، مگر نتیجہ مایوس کن رہا۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں جرمنوں نے نلکیوں کے ذریعے

---

(۱) Ceheer

(۲) Zeppelin یہ جرمنی کا ایک موجد تھا جس کے ایجاد کردہ ہوائی جہاز زیپلن کہلاتے تھے۔

(۳) Wrights یہ دو امریکی بھائی تھے جنھوں نے سب سے پہلے اپنی تیار کردہ مشین میں کامیاب پرواز کی۔

(۴) Kittyhawk امریکہ کا ایک مقام جہاں پہلی مرتبہ ہوائی جہاز اڑایا گیا۔

(۵) Marne اس سے مراد ہے دریائے مارنے کی جنگ

سے کلورین گیس چھوڑی۔ فرانسیسی فوج پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ پانچ میل چوڑے محاذ پر اس کا نظم درہم برہم ہوگیا اور یہ محاذ کاملاً بلا مداخلت چھوڑ دیا گیا، لیکن جرمن آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب اس گیس کا اثر ختم ہوگیا۔ تو پھر یہ خلا پُر کر لیا گیا۔ اس اثناء میں ماہروں نے گیس کے مقابلے کے لیے ایک نقاب تیار کر لیا، جو دونوں جانب ہر سپاہی کے سامان کا ایک جزو بن گیا۔ پھر معاملہ حملے اور دفاع پر موقوف رہ گیا۔

دوسرا نیا حربہ وہ تھا، جس سے کامیابی قریب تر آگئی۔ یہ ٹینک تھا، یعنی ایک مسلّح بری جنگی جہاز، جس کا ابتدائی نقشہ دورِ احیاءِ علوم میں لیونارڈو ڈونسی[1] کے نادر دماغ نے تیار کر لیا تھا، لیکن ڈونسی کا ٹینک اس لیے محض ایک خاکا رہ گیا کہ اس میں حرکت کی قوت نہ تھی۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں اندرونی قوت سے چلنے والا انجن تیار ہوگیا۔ اس نے وہ کام انجام دیا جو گھوڑے انجام نہیں دے سکتے تھے۔ ٹینک برطانوی ایجاد تھا اور ابتدا ہی سے اس کی سرپرستی ونسٹن چرچل کرتا رہا، مگر یہ نیا حربہ پوری طرح ارتقاء پذیر نہیں ہوا تھا اور اسے میدانِ جنگ میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک بہت کم ٹینک بنے تھے اور ان کے میکانکی تجربے بھی پوری طرح نہیں ہوئے تھے۔ یہ پہلے پہل ۱۹۱۶ء کے اقدام سوم[2] میں استعمال ہوا۔ صرف نو ٹینک تھے جنھوں نے برطانوی پیادہ فوج کے ساتھ ساتھ جرمنوں کے دفاعی خط سے گزرتے ہوئے فاتحانہ رو فلرس[3] پر قبضہ کر لیا۔ اگر ٹینک چند مہینے مزید استعمال نہ کیے جاتے اور احتیاط سے غور و فکر اور دیکھ بھال کے بعد ان سے کام لیا جاتا تو یہ وسیع محاذ پر جرمنوں کی فوجی لائنیں توڑ ڈالتے۔ جرمنوں نے جلد سے جلد ٹینک بنانے کا خیال لے لیا اور خود خاصی تعداد میں یہ حربہ تیار کر لیا۔

جرمنوں نے بھی ایک نیا حربہ تیار کیا، جس سے دنیا متحیّر رہ گئی، مگر وہ جنگ پر کوئی خاص اثر نہ ڈال سکا۔ یہ ایک توپ تھی، جس کی زد بہت طویل تھی۔ اس نے جرمنوں کے قریب ترین خط سے پیرس پر گولہ باری شروع کی۔ درمیانی فاصلہ پچھتر میل سے کم نہ تھا۔ اہلِ پیرس متحیّر رہ گئے اور ابتدا میں انھیں گولہ باری کا راز معلوم نہ ہو سکا۔ کیونکہ دشمن کا کوئی جہاز نظر نہیں آیا تھا۔ اتحادی سپاہیوں نے اس توپ کا نام "بگ برتھا"[4] رکھا مگر یہ معمولی آزار رسانی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

آخر سالہا سال گزر جانے پر مغرب میں حملے کی تدبیریں اختیار کی گئیں جن سے دفاعی تعطّل کا سلسلہ ختم ہوا۔ اس سلسلے میں ایک چیز یہ تھی کہ توپیں بڑی احتیاط سے مناسب مقامات پر نصب کر کے دُور دُور تک مسلسل گولے برسائے جاتے، جس سے ایک خاص حصے کے دفاعی استحکامات درہم برہم ہو جاتے اور دشمن سامنے کی خندقیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر ٹینک آگے بڑھتے اور پیچھے پیچھے پیادہ فوج چلتی یا فوج آگے ہوتی اور ٹینک اس کی حفاظت کے لیے پیچھے پیچھے چلتے۔ اس اثنا میں توپیں اگلی خندقوں پر مسلسل گولہ باری شروع کر دیتیں اس طرح ترقی کی رفتار یقیناً سست رہتی اور ۱۹۱۸ء تک وسیع

---

[1] Leonardo da Vinci

[2] Somme

[3] Flers

[4] Big Bertha



یورپ کا "مردِ بیمار" سنہ ۱۶۸۳ء - سنہ ۱۹۱۴ء
سلطنتِ عثمانیہ، سنہ ۱۶۸۳ء
سلطنتِ عثمانیہ، سنہ ۱۹۱۴ء
بحرِ اوقیانوس
پولینڈ
جرمنی
فرانس
آسٹریا
وائنا
بوڈاپسٹ
ہنگری
رومانیہ
بخارسٹ
بلغاریہ
صوفیہ
بوسنیا
سرویا
البانیہ
یونان
ایتھنز
کریٹ
قسطنطنیہ
بحیرۂ اسود
سباسٹاپول
روسٹوف
بسرابیا
باطوم
کارس
آرمینیا
ترکیہ
اناطولیہ
قبرص
شام
دمشق
بیروت
فلسطین
بیت المقدس
پورٹ سعید
اسکندریہ
قاہرہ
مصر
نہر سویز
عرب
مدینہ منورہ
مکہ معظمہ
بصرہ
بغداد
موصل
فارس
خلیج فارس
بحیرۂ خزر
دریائے وولگا
دریائے نیپر
دریائے ڈینیوب
ہسپانیہ
مراکش
الجزائر
تیونس
طرابلس
لیبیا
سارڈینیا
کارسیکا
سسلی
مالٹا
اٹلی
ہرزیگووینا
کارفو
ڈوڈیکانیز
بلقانی سرحدیں
برلن کانگرس کے بعد ۱۸۷۸ء
پہلی عالمی جنگ سے ذرا قبل ۱۹۱۴ء
سلطنتِ عثمانیہ
مونٹی نیگرو
میل
۵۰۰

پیمانے پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس اثنا میں روسی جنگ سے باہر جا چکے تھے اور جرمنوں نے اتحادیوں کی صفیں توڑ کر آگے نکلنے کی کوشش کی جو کامیابی کے قریب پہنچ گئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو الگ الگ کر دیں۔ جب جرمنوں کی یہ کوشش موسمِ گرما میں ناکام ہو گئی تو مارشل فوش نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ فرانس، امریکہ کی فوجیں اور اٹلی خزاں میں جرمن خطوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھیں اور کھلے میدان میں آزادیٔ عمل حاصل کر چکی تھیں، جب جرمنوں نے حوالگی کا اعلان کر دیا۔

جنگی محاذوں پر فریقین کی ہمت

خندقوں کی چار سالہ جنگ میں صف بندیاں بہت قریب تھیں اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں جو تباہی ہوئی، اس کی مثال ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ میں نہیں ملتی۔ فرانس میں بعض مقامات پر زمین کا بالائی حصہ کاملاً اڑا دیا گیا اور اس کی جگہ بنجر علاقہ رہ گیا، جو آج بھی نظر آ سکتا ہے، لیکن یہ جنگ نہ یگانہ تھی، نہ بے مثال تھی اور نہ پیشتر کی جنگوں سے مختلف تھی، جیسا کہ جوشیلے مضمون نگاروں نے وقت پر اسے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس جنگ نے عظیم الشان فوجی جرنیل بھی پیدا کیے اور ایسے جرنیل بھی، جن پر فوجی ناکامیوں کا الزام رکھ دیا گیا، یعنی ایسے جرنیل بھی تھے جنھوں نے کامیابی حاصل کی اور ایسے بھی جو ناکام رہے۔ امریکہ کی خانہ جنگی میں بھی اسی قسم کی حالت پیش آئی تھی۔ شکست خوردہ جرمنوں کے پاس ایسے جرنیل تھے، جن کی انتہائی ستائش کی گئی تھی، مثلاً ہوڈن ڈارف، میکنسن، ہافمین۔ روزانہ بہادروں کی جنگجوئی کا سلسلہ جاری رہا، بلکہ فضائی جنگوں نے اس کے لیے مزید موقع پیدا کر دیا، جہاں یکہ تاز ہوابازوں نے ہوائی جہازوں کے ذریعے سے انفرادی لڑائیاں کیں۔ یہ لوگ مشینوں کے عہد کے "رولاں[1]" ثابت ہوئے۔ بہت سے بَرّی اور بحری محاذوں میں زمانۂ سابق کے حقائق بدستور قائم رہے۔ لارنس نے عرب میں جو کارنامے انجام دیئے، وہ سر والٹر سکاٹ کی روایت یا محبِ وطن انگریزوں کے نزدیک ہومر کی روایت کے لیے باعثِ ننگ نہ تھے۔

تاہم یہ جنگ ــــ خصوصیت سے مغربی محاذ پر ــــ اکثر کو محض خون اور کیچڑ کا ایک غیر بہادرانہ کابوس نظر آتی تھی۔ حساس نوجوان اہلِ علم، جنھیں پیشتر جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا، زندہ رہے اور انھوں نے اپنے تلخ تجربات قلم بند کیے ــــ مثلاً فرانسیسی مصنف باربسے[2] کا ناول "زیرِ آتش باری[3]" میں یا جرمن مصنف ریمارق[4] کی کتاب "مغربی محاذ پر کامل سکوت[5]" ــــ پھر سیگ فرائڈ سیسون[6] اور ولفریڈ اوون[7] کی نظمیں، مگر ادبیات کے اس ذخیرے کو اُن لاکھوں سپاہیوں کے احساسات کا قابلِ اعتماد مرقع قرار نہیں دیا جا سکتا، جو اہلِ علم نہ تھے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ انھوں نے چار سال تک استقامت دکھائی اور اس

۱؎ Roland مشہور فرانسیسی ہیرو

۲؎ Barbusse

۳؎ Under Fire

۴؎ Remarque

۵؎ All Quiet on the Western Front

۶؎ Siegefried Sassoon

۷؎ Wilfred Owen

مدت میں زیادہ تر جنگ کی بے کیفیاں، بے آرامیاں، اور مختصر سا خطرہ ان کی حب وطن کے لیے وجہ آزمائش بنا رہا اور آخر ان کے منچلے پن کا احساس خود بخود کند ہو گیا۔

یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جو کسی انتہا پسند اور تلخ وش اہل علم کی کتاب سے نہیں اور نہ اس کا تعلق مغربی محاذ سے ہے۔ انگریز مورخ جان میسفیلڈ[1] نے ایک کتاب گیلی پولی کے نام سے لکھی تھی، جہاں اس نے درۂ دانیال کی مہم میں شرکت کی تھی۔

"خوانندۂ کتاب کو چاہیئے کہ وہ اپنے ذہن میں کسی ایسی ناہموار اور ڈھلوان زمین کے تین میل لمبے علاقے کا تصور قائم کرلے..... اسے چاہیے کہ سمجھ لے، وہ خود اور اس کے دوستوں کی ایک فوج اس ڈھلوان پر پیشقدمی کرتی ہوئی چوٹی پر پہنچنا چاہتی ہے۔ چونکہ یہ فوج تین میل لمبی قطار میں آگے بڑھے گی، اس لیے اسے صرف آس پاس کے لوگوں کی پیشقدمی کا اندازہ ہو گا۔ زمین میں جو بلندیاں اور گہرائیاں ہیں، اُن کی وجہ سے دوسرے اسے نظر نہ آئیں گے۔ بڑھنے سے پیشتر اسے پہاڑی سلسلے پر خوب نظر ڈال لینی چاہیے، جو صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے اور گرم سورج کی شعاعیں ان پر پڑ رہی ہیں۔ یہی ان کا منصب العین ہے۔ اس پر صنوبر کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے، جو تین سو گز کے فاصلے پر ہو گا۔ آس پاس کھیت نظر آتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ لے کہ پہاڑی پر کوئی انسان موجود نہیں، صرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں کہیں کہیں یا زمین ہے اور چند بکھری ہوئی عمارتیں ہیں..... اسے یہ خیال بھی کر لینا چاہیے کہ وہ سخت تھکا ہوا ہے اور ایسی تکان کا تجربہ اسے زندگی بھر کبھی نہیں ہوا۔ ساتھ ہی وہ اتنا غلیظ ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پیاس سے حلق خشک ہے۔ دل مضطرب ہے۔ آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہے اور جوؤں سے سر بھرا ہوا ہے۔ یہ خیال بھی کرے کہ گیارہ دن اور گیارہ رات میں وہ چند منٹ سے زیادہ نہیں سویا اور جب تک جاگتا رہا، جان بچانے کے لیے لڑتا رہا۔ اکثر رات کی تاریکی میں تند خو دشمن کے ساتھ دست بدست لڑنا پڑتا۔ اس لڑائی کے بعد خود ہی زمین میں گڑھا کھود کر بیٹھ جانا پڑتا۔ پھر مسلسل تین یا چار میل تک ایسی جگہ چلنا پڑتا، جہاں کوئی سڑک نہ تھی، تاکہ آتش باری کے طوفان میں بھاری صندوق اٹھا کر لے آئے۔ یہ بھی سوچ لے کہ گیارہ روز کی اس مدت میں ایک لمحہ بھی نہیں آیا، جب اس کے کان میں توپوں کے گرجنے کی

---

[1] John masefield

آواز نہ آئی ہو اور بیداری یا خواب کی حالت میں آتش باری مسلسل ہوتی رہی۔ اور توپیں اس درجہ خوفناک تھیں کہ ان سے گولے نکلتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کھوپڑی کی ہڈی اور بھیجے کے درمیان شدید دھچکے کا نشانہ ٹھونک دیا۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس پوری مدت میں ایک لمحے کے لیے بھی ایسی موت کے خطرے سے کلاً یا جزواً آزاد نہ ہوا، جو حد درجہ ناگہانی اور حد درجہ وحشت خیز تھی اور اس مدت میں وہ ساعت بہ ساعت اپنے دوستوں کے ٹکڑے اطراف میں دوڑتے ہوئے دیکھتا تھا یا ان کے اعضا کٹتے تھے یا وہ ڈوبتے تھے یا وہ پاگل ہو جاتے تھے یا اُن کے چہرے گھونپے جاتے تھے یا کوئی غیر مرئی دشمن انھیں ختم کر دیتا تھا یا رات کی تاریکی میں ان پر بم آپڑتے تھے یا گوشت کے ڈبوں میں ڈائنامیٹ بھر کر ان پر پھینکے جاتے تھے، یہاں تک کہ خون ان کے کپڑوں پر یا چہروں پر جم جاتا اور دیکھنے والے پر آشکارا ہو جاتا کہ چند لمحوں میں اس قطار کے اور آدمی ختم ہو جائیں گے اور صرف چند باقی رہ جائیں گے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے باقی رہ جائیں گے اور کیا کام انجام دیں گے۔ خود اسے یقین ہو کہ زندگی ختم ہو گئی۔ آخری مرتبہ اس نے کھا پی لیا، بات چیت کر لی اور جس سے محبت تھی محبت کر چکا۔ چند منٹ میں وہ بھی آتشباری کی نذر ہو جائے گا یا کسی جھاڑی میں اٹک جائے گا۔ خون اس کے جسم سے بہہ رہا ہو گا یا اس کا چہرہ اڑ چکا ہو گا۔ ٹانگ یا بازو ٹوٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ ہل نہیں سکے گا مگر زندہ ہو گا۔ مکھیاں بھی زخموں سے ہٹا نہ سکے گا۔ بارش سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے گا اور جگہ ایسی ہو گی جہاں کوئی اسے پا نہ سکے گا، اس کی امداد نہ کر سکے گا۔ ایسی جگہ نہ پہنچ سکے گا، جہاں وہ مر سکے اور اس کی جگہ صرف چند چیتھڑے باقی رہ جائیں اور شناخت کا صرف ایک نشان اس کی ہڈیوں پر رہ جائے گا، جو ہوا میں لہرا رہا ہو گا۔[1]

داخلی محاذ

یہ سپاہی اور ملاح پیشہ ور نہ تھے، بلکہ شہری تھے، جنھیں غیر مصافی کنبوں سے اٹھا کر عسکریت کے طور طریقوں میں لگا دیا گیا، جن کے وہ عادی نہ تھے، لیکن محاذِ جنگ کے عقب میں سامان جنگ تیار کرنے والے مرکزوں کے اندر بھی مختلف قسم کی تکلیفیں عائد تھیں، مثلاً غذائی جنسوں کی راتب بندی ضروری ہو گئی تھی۔ عام روزانہ زندگی پر طرح طرح کی پابندیاں لگ گئی تھیں، جو مسلسل جنگی پروپیگنڈے کی وجہ سے لازم ہو گئی تھیں، لیکن انھوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا، اگرچہ ١٩١٧ء میں فرانس کے اندر خاصی نازک حالت پیدا ہو گئی تھی۔ جنرل نویل[2] کے ماتحت جارحانہ اقدام کی خونریز ناکامی

---

[1] مینسفیلڈ کی کتاب گیلی پولی، ص ٩٦-٩٩

[2] Nivelle

کے بعد فوجیوں اور غیر مصافی آبادی میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ سیاستدانوں نے اس آگ کو ہوا دی اور فرانسیسی حوصلہ مندی شکست کے قریب پہنچ گئی۔ جرمنی میں بھی ابتری ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کے متارکے کا موجب بنی۔ اگرچہ اس کے اسباب خاصے پُرپیچ تھے، مگر بظاہر یہ حوصلے اور ہمت کی عام ناکامی نظر آتی تھی۔ یہ ایک نفسیاتی شکست تھی، جو ناقابل برداشت روحانی اور مادّی مجبوریوں کا نتیجہ تھی۔

جرمن اس وقت تک بھی انفرادی حقوق اور آزاد تجارتی نظریۂ زر کے متعلق انیسویں صدی کے افکار سے متأثر تھے اور وہ انھیں اپنے معاشرے کو جنگِ کُل کے تقاضوں کے متعلق جلد منظم نہ کر سکے۔ وہ غذائی جنسوں کی مناسب اور منصفانہ تقسیم کا قطعی انتظام نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۸ء میں شہری آبادی کے مختلف طبقے قلت غذا کا ہدف بن گئے۔ پھر مالیات اور جنگی سامان کی تیاری کا انتظام اس اعلیٰ پیمانے پر نہ ہو سکا، جس کی توقع دنیا کو جرمنوں سے تھی۔ راتب بندی، پیداوار پر شدید ضبط و نظم، قیمتوں پر ضبط و نظم، مفتوحہ ممالک کے وسائل سے منظم استفادہ، یہ اور اس قسم کی بہت سی تدبیریں جرمنوں نے اختیار کیں، لیکن ان کے لیے وہ احتیاط، قطعیت اور پہلے سے طویل تیاری کا ایسا مرقع پیش نہ کر سکے، جیسا انھوں نے ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ میں پیش کیا۔

جو ملک جنگ میں شریک تھے۔ (مغربی جمہوریتیں اور وسطی یورپ کی مطلق العنان طاقتیں) وہ زود یا بہ دیر زمانہ جنگ کی اقتصادی منصوبہ بندی کے لیے سخت تدبیریں اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ آج زیادہ اجتماعی اقتصادیات اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہیں۔ ہر جگہ جنگ نمودار ہوئی اور امریکی صدر میڈیسن[1] کے قول کے مطابق جنگ ہی انتظامیہ کے اختیارات میں توسیع کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جرمنی فوجی خدمت عام ہو گئی۔ برطانیہ کو ہمیشہ فخر رہا کہ وہ انفرادی حقوق کا زبردست حامی ہے، لیکن دفاع سلطنت کے قانون کے[2] ذریعے سے، جسے "ڈورا"[3] کہنے لگے، ان مقدس انفرادی حقوق میں بہت کمی کر دی گئی، حالانکہ اس سے بیشتر ہر شخص کو سب کچھ کرنے اور کہنے کا حق حاصل تھا، بشرطیکہ اس سے دشمن کو امداد یا راحت نہ پہنچے۔ امریکہ میں بھی ہر قسم کے آدمی واشنگٹن پہنچ گئے اور انھوں نے پہلی مرتبہ حکومت کے لیے کام شروع کیا۔ انھوں نے بہت بڑی مرکزی حکومت بنائی، جس نے اقتصادیات کو ایسے طریق پر منظم کیا کہ وہ پہلے کبھی اس طریق پر منظم نہیں ہوئے تھے۔ تمام محاربین جنگی پروپیگنڈے یا جیسا کہ آئندہ جنگ میں اسے تعبیر کیا گیا، نفسیاتی جنگ میں مصروف تھے۔ اتحادیوں نے سامان پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس میں امریکہ کا حصہ اگر فیصلہ کن نہیں تو سب سے بڑھا ہوا ضرور تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مادی وسائل میں اتحادیوں کو وسطی یورپ کی طاقتوں پر بالقوّۃ فوقیت حاصل تھی۔ اس فوقیت سے انھوں نے پورا عملی فائدہ اٹھایا۔ اگر جرمن اس وقت جنگ سے دست بردار نہ ہوتے، جب وہ ہوئے اور اتحادی زبردست جارحانہ اقدام کرتے، جس کا منصوبہ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار کے لیے تیار کر لیا گیا تھا، تو یقیناً

---

[1] Madison

[2] Defence of the realm act

[3] یہ مخفف ہے "Dora"

جرمن مغلوب ہو جاتے۔ اتحادیوں کو ساز و سامانِ جنگ تیار کرنے میں دیر لگی، خصوصاً فرانسیسی ابتدائی ہفتوں ہی میں اتنا نقصان اٹھا چکے تھے کہ وہ اپاہج ہو گئے اور ان کے زیادہ تر صنعتی مرکز شمال اور شمال مشرق میں تھے۔ برطانیہ نے سنہ ۱۹۱۴ء کے ابتدائی چند مہینوں میں غلط نعرے لگا کر اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کی۔ غلطیاں بھی ہوئیں، رکاوٹیں بھی پیش آئیں۔ ایسے تجربے کیے گئے، جو ابتداءً ناکام رہے، کیونکہ ان میں عجلت ہوتی گئی۔ مثلاً ٹینکوں کے معاملے میں۔ ابتداءً اتحادی ساز و سامان کی تیاری اور فوجی منصوبوں میں ہم رائے نہ تھے اور جنگ کے اواخر تک بھی تمام جنگی وسائل اس طرح یکجا نہیں ہوئے تھے، جس طرح دوسری جنگ میں ہوئے۔ بہ ایں ہمہ سنہ ۱۹۱۷ء کے آخر تک اتحادیوں کی جنگی مشین کو پورا بلکہ بعض حالتوں میں ضرورت سے زیادہ سامان مل گیا۔

پروپیگنڈے کا اثر

اتحادیوں نے پروپیگنڈے کی جنگ میں بھی بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ وہ غیر جانبدار دنیا کو عموماً، مغربی تہذیب و تمدن کے غیر جانبداروں — جمہوریۂ امریکہ، لاطینی امریکہ، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، ناروے، سویڈن اور ہسپانیہ — کو یقین دلا دینا چاہتے تھے کہ اتحادی حق کے لیے لڑ رہے ہیں اور وسطی یورپ کی طاقتیں غلطی پر ہیں۔ اس میں پوری کامیابی تو نہ ہوئی، کیونکہ مذکورۂ بالا ملکوں میں لوگوں کی خاصی بڑی تعداد آخر تک جرمنی کی حمایت میں رہی اور ہسپانیہ بحیثیت مجموعی جرمنوں کا حامی تھا، مگر غیر جانبدار مغرب کی اکثریت کو یقین ہو چکا تھا کہ اتحادی راستی پر ہیں۔ اس عقیدے کو ابتدا ہی سے اس لیے تقویت پہنچی کہ برطانیہ اور فرانس روایتی لبرلزم کے لیے مشہور تھے۔ جرمن اور آسٹروی سلطنتیں مطلق العنان اتحادی پروپیگنڈے کے لیے پریشانی کا باعث بنی رہی۔ اس عقیدے کو زیادہ تقویت سنہ ۱۹۱۴ء کے بحران میں حاصل ہوئی، کیونکہ آسٹرویوں نے سردیوں کے مقابلے میں بے پروائی برتی اور بیتھمین ہالوگ (جرمن چانسلر) نے برطانیہ کی طرف سے بلجیم کی غیر جانبداری کی حمایت کے متعلق کہا تھا کہ برطانیہ ردی کاغذ کے ٹکڑے کے لیے لڑ رہا ہے۔ اتحادی پروپیگنڈے نے اتحادیوں کے متعلق راستی کے احساس کو تقویت پہنچائی۔ یہ پروپیگنڈا ایک طرفہ اور ناواجب تھا، خصوصاً اس اعتبار سے کہ جرمنوں پر بلجیم میں خوفناک ظلم و ستم کے الزام لگائے گئے۔ یقیناً جرمنوں نے مفتوحہ قوموں پر فوجی ضبط و نظم کے سخت قوانین نافذ کیے۔ مگر انھوں نے کوئی غیر معمولی چیز نہ کی اور جو کچھ کیا ہر جنگ میں وہی ہوتا ہے۔ اتحادی پروپیگنڈے نے جنگ کا سلسلہ بھی کچھ کا کچھ بنا دیا۔ یہی ظاہر کرتے رہے کہ جرمنی اور آسٹریا جنگ شروع کرنے کے ذمہ دار ہیں اور پوٹسڈم کے جتھے نے پہلے سے سب کچھ تیار کر رکھا تھا۔ سردی، فرانسیسی، روسی اور انگریز قولاً یا فعلاً جنگ شروع کرنے کے متعلق بالکل بے گناہ تھے۔ جنگ کے بعد اس پروپیگنڈے کے ناواجب ہونے کے باب میں سخت دکھ ہوا اور یہ مطالبہ شروع ہو گیا کہ جنگ شروع کرنے کے سلسلے میں جرمنی خصوصیت سے بے گناہ تھا۔

غالباً جنگ کے زمانے میں پروپیگنڈے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی ہمت پر ضرب لگائی جائے۔ غیر جانبداروں کو ہموار بنایا جائے۔ اپنے اہلِ ملک کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس معاملے میں دونوں فریق خاصے کامیاب

رہے اور جو لوگ رائے عامہ کے رہنما تھے، وہ اپنے اہل ملک کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہم سچائی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ فرانس اور اٹلی میں شکست خوردہ ذہنیت کے آدمی بھی موجود تھے، مگر وہ جنگی مساعی کو درہم برہم نہ کر سکے۔ فرانس برطانیہ اور امریکہ، نیز جرمنی اور آسٹریا میں مقالہ نگار، مبلغ اور معلم قومی مقصد کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے وعظ و نصیحت اور حوصلہ افزائی کے طومار تیار کر دیئے۔ برطانیہ میں کپلنگ اپنا خاص کام کر رہا تھا!

"ہمارے پاس جو کچھ ہے اور ہم جو کچھ ہیں
ہمارے بچوں کی تقدیر جو کچھ ہے
ان سب کو لے کر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ
کیونکہ ہن دروازے پر کھڑا ہے۔
ہماری دنیا ختم ہو چکی
ہڑ دنگے پن سے اس کا تختہ الٹ دیا گیا
آج اس میں سے کچھ باقی نہیں رہا
صرف فولاد اور آگ اور پتھر

....

کوئی سہل امید یا جھوٹ
ہمیں مقصد کے قریب نہ لا سکے گا۔
بلکہ فولادی قربانی ضروری ہے
جسم کی، ارادے کی اور روح کی۔
ہم سب کے لیے صرف ایک کام ہے
سب کو ایک زندگی کی قربانی دینی ہے
اگر آزادی جاتی ہے تو کیا باقی رہتا ہے؟
اگر انگلستان زندہ ہے تو کون مرتا ہے؟"[1]

صرف زاروں کے روس میں شکست خوردگی کا پروپیگنڈہ کامیاب ہوا، حالانکہ وہاں جنگ حبّ وطن کے احساس سے شروع ہوئی تھی۔ اس پروپیگنڈے کو ناکامیوں اور تکلیفوں نے تقویت پہنچائی۔ آخر نومبر ۱۹۱۷ء میں بالشویکی انقلاب

---

[1] کپلنگ کی نظمیں ص ۳۲۶ - ۳۲۷

کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

سیاسی اثرات روس کے سوا چار سال کی جنگ میں کہیں سیاسی نظام کا بڑا تغیر واقع نہ ہوا۔ وسطی یورپ کی طاقتوں نے آخری وقت تک نامکمل ذمہ دار پارلیمانی حکومت قائم رکھی اور پارلیمنٹیں بہ حیثیت مجموعی معقولیت کی حد تک فرمانبردار تھیں۔ جنگ کے زمانے میں انتظامیہ کا اقتدار بہت ترقی کر گیا تاہم فرانس، برطانیہ اور امریکہ نے جمہوری ادارے قائم رکھے۔ امریکہ کے اندر ۱۹۱۶ء کا انتخاب صدارت بڑے نازک دور میں پیش آیا تھا۔ یہ امریکہ کے شریک جنگ ہونے سے فوراً پیشتر کا واقعہ ہے۔ اس میں وڈرو ولسن نے تھوڑے سے ووٹوں کے ساتھ کامیابی حاصل کی، جو پہلے سے صدر چلا آتا تھا۔

برطانیہ اور فرانس کے اندر جنگ کے دوران میں دو زبردست آدمی جمہوری اصول کے ذریعے سے برسرِ کار آئے — لائڈ جارج[1] اور کلیمنشو[2] — جنھوں نے بڑی سرگرمی سے جنگ جاری رکھی اور آج بھی وہ تاریخ کے نزدیک بڑے قومی ہیرو ہیں، اگرچہ جنگ کے بعد افراتفری کے دوران ان کی شہرت ماند پڑ گئی۔

برطانیہ کا لبرل لیڈر ایسکوئتھ[3] بڑا ہوشیار تھا، مگر وہ فیصلہ جلد نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ حالات پر قابو نہ پا سکا، اگرچہ مئی ۱۹۱۵ء میں کوالیشن کے ذریعے سے اس نے اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کر لیا تھا۔ اسی سال دسمبر میں ایک اور لبرل لیڈر لائڈ جارج نے ایسکوئتھ کی جگہ لے لی۔ لائڈ جارج ہی برطانیہ کے عمرانی بیمے کا بانی تھا۔ وہ جنگی سامان تیار کرنے کی تنظیم کا شاندار اہل ثابت ہوا۔ اسی کے ماتحت کوالیشن کام کرتی رہی اور جنگ کے دوران میں وہ ایسا لیڈر بنا رہا جس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا۔ صلح کی گفتگو میں ہم پھر لائڈ جارج سے ملیں گے۔ ساتھ ہی اس کے فرانسیسی مثنیٰ کلیمنشو سے ملاقات ہو گی۔ کلیمنشو کو دوست دشمن یکساں "شیر" کہتے تھے۔ وہ ۱۹۱۷ء میں برسرِ اقتدار آیا۔ جب شکست خوردگی کے باعث فرانس کی داخلی اور فوجی قوت دونوں خطرے میں پڑی ہوئی تھیں۔ کلیمنشو نے بڑے عزم سے جنگی مساعی کا رشتۂ تنظیم سنبھال لیا اور جو سیاستدان نارضامند تھے، انھیں قطعیت سے باہر نکال دیا اور زمانۂ امن کے حقوقِ انسانی کی کوئی پروا نہ کی۔ پیشتر کے جیکوبنوں کا یہی دستور تھا۔

---

[1] Lloyd George
[2] Clemenceau
[3] Asquith

تیرپنواں باب

صلح کے معاہدے

(۱)

تمہید

محارب فریق جس طرح پیشتر ویسٹ فیلیا میں (۱۶۴۸ء)، یوٹریکٹ میں (۱۷۱۳ء) اور وی آنا میں (۱۸۱۵ء) جمع ہوئے تھے، اسی طرح پہلی عالمی جنگ کے بعد بھی صلح نامے تیار کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ اس مرتبہ ان کا اجتماع پیرس میں یا کہنا چاہیئے، پیرس کے ایک نواحی مقام میں ہوا۔ وہ جرمنوں کے متعلق تصفیے کے لیے ورسائی میں بیٹھے، آسٹریوں کے تصفیے کے لیے سان جرمن میں بلغاریوں کے تصفیے کے لیے نیولی[1] میں، اہل ہنگری کے تصفیے کے لیے گرانڈ ٹریئنان[2] (ورسائی کا باغ) میں اور ترکوں کے تصفیے کے لیے سیوارٹے[3] میں جمع ہوئے۔ لیکن صلح کے یہ اجلاس ایک موقع پر بھی اس دنیا میں نہ ہوئے، جو واقعی صلح سے شاد کام ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے واقعات کے خاص اثرات ہوتے ہیں۔ مقامی کشمکش اور فسادات پیش آتے ہیں، گویا ایک بڑی بیماری کا دور گزر جانے کے بعد چھوٹی چھوٹی بیماریاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ۱۹۱۸ء-۱۹ء کے اثرات مابعد خصوصیت سے بہت زیادہ اور حد درجہ تشویش افزا تھے اور ان سے صلح کے اجلاسوں کا پورا کام متاثر ہوتا رہا، لہٰذا حقیقی صلحناموں پر غور وخوض سے پیشتر ہمیں ان واقعات کا ذکر اختصار سے کردینا چاہیے، جنھیں ہم نے اثر مابعد قرار دیا۔

عالمی جنگ کے اثرات مابعد

سب سے زیادہ تکلیف دہ حالت روس کی تھی۔ وہاں خانہ جنگی کا دور دورہ تھا اور باہر سے حملہ ہوگیا تھا۔ جب جرمنوں کو ان خطوں سے باہر نکلنا پڑا، جو انھوں نے بریسٹ لٹوسک کے معاہدے میں حاصل کیے تھے تو اتحادیوں نے روس کے حواشی پر جابجا فوجی دستے بھیج دیے۔ مثلاً بحیرۂ اسود میں اور شمالی جانب بحیرۂ ابیض میں اور بحر الکاہل میں (تفصیلات آگے آتی ہیں)۔ اتحادی اس وقت تک بھی یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ اگر روس میں بادشاہی بحال نہیں ہوسکتی تو کم از کم معتدل انداز کی جمہوریت قائم ہوجائے۔ انھیں بالشویکوں کی آخری کامیابی سے

---

[1] Neuilly پیرس کا ایک حصہ

[2] Grand Trianon

[3] Sevres فرانس کا ایک قصبہ جو دریائے سین پر واقع ہے۔

شدید تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ بالشوزم مغربی جانب پھیلنے کے امکانات بڑھ جائیں گے ۔ اس وجہ سے ورسائی میں تناؤ شدید تر ہوگیا ۔ لائڈ جارج اور کلیمنشو انتہائی قدامت پسندانہ نقطۂ نگاہ کے ترجمان تھے ۔ ان کے نقطۂ نگاہ کی توثیق ہوگئی ۔

یقیناً بالشوزم مغربی جانب پھیل رہی تھی ۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں جرمنی کے اندر جو انقلاب ہوا تھا ، وہ اشتراکیوں ہی کی سرپرستی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا ۔ ۱۹۱۸-۱۹ء کے موسم سرما میں کمیونسٹوں کے ہنگامے بپا ہوتے رہے اور بویریا میں سوویٹ جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا (اپریل ۱۹۱۹ء) ۔ جرمنی کی نئی جمہوری حکومت نے کمیونسٹوں کے ہنگامے فرو کیے ، لیکن یہ ہنگامے فوج کے نیچے کچھ اجزا سے التجائیں کر کر کے فرو کرائے گئے اور ان اجزا کے افسر جمہوریت کے سخت دشمن تھے ۔ ۱۹۱۸ء کے موسم خزاں میں آسٹریا و ہنگری کی سلطنت پر شکست و ریخت کا عمل جاری ہوا اور اس کی جگہ متعدد ریاستوں نے لے لی ۔ مثلاً چیکوسلواکیہ ، آسٹریا ، ہنگری ، یوگوسلافیا ، رومانیا ، یہ تمام دولتیں ہیپسبرگوں ہی کے مملوکہ علاقوں میں سے کلًّا یا جزواً بنائی گئی تھیں ۔ ان میں گوناگوں عمرانی اور اقتصادی مشکلات کا دور دورہ تھا ۔ ہنگری میں بیلاکن[1] نے اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کو متحد کر کے اقتدار حاصل کر لیا ۔ وہ ماسکو میں لینن کے ساتھ کام کر چکا تھا ۔ پھر اس نے اشتراکی رفیقوں کو چلتا کیا اور کمیونسٹوں کی ڈکٹیٹری قائم کر دی (یہ واقعات ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں پیش آئے ۔ یہ حقیقت بخوبی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جن ہتھکنڈوں سے ہم متعارف ہیں ، وہ کس طرح ابتدائی دور ہی میں اختیار کیے جا چکے تھے) اگست میں رومانیا کی فوج نے ہنگری پر حملہ کر دیا اور بیلاکن فرار پر مجبور ہو گیا ۔ سب سے آخر میں یہ کہ تمام جرمن علاقوں میں سابق سپاہیوں کے گروہ دوڑ دھوپ میں مصروف تھے ۔ وہ ہر جگہ مشکلات پیدا کرتے اور جرمن جمہوریت کا تختہ الٹ دینے کی دھمکیاں دیتے (تفصیلات آگے آئیں گی) ۔

مشرق قریب میں اتحادیوں کو بدتر مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ۔ یونان کو بڑی مشکل سے گھسیٹ کر جنگ میں شامل کیا گیا تھا اب وہاں ترکوں کے خلاف زور شور سے نعرے لگ رہے تھے ۔ قوم پرست یونانیوں کے ذہن میں بیزنطینی سلطنت کی بحالی کے لیے پرانی امیدیں تازہ ہو چکی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ یونان ہی آبناؤں پر آمر و حاکم ہو جائے ۔ اس کی فوجیں اتحادیوں کی حوصلہ افزائی سے سمرنا (ازمیر) میں اتر پڑیں (موسم بہار ۱۹۱۹ء) اور انھوں نے سکندر اعظم کا راستہ اختیار کر لیا ۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کو ترکی سلطنت کے مختلف علاقوں کا ضبط و نظم سپرد کیا گیا تھا ۔ انھیں اپنی نئی عرب رعایا کے زیر نگرانی گروہوں سے کشمکش پیش آ گئی ۔ یہودی اعلانِ بالفور کے مطابق فلسطین میں قومی وطن کے قیام پر زور دے رہے تھے اور عرب یہودیوں کی مخالفت کر رہے تھے ۔

ہندوستان میں بھی جنگ کے اثرات مابعد بہت خراب تھے ۔ ۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا نے عالمی وبا کی شکل اختیار کر لی ۔ (حفظان صحت کے اکثر ماہرین کا یقین ہے کہ اس وبا میں عالمی جنگ سے زیادہ آدمی مرے) یہ وبا ہندوستان کے لیے

---

[1] Bela Kum

بطورِ خاص تباہی خیز تھی۔ ہندوستانیوں نے پیشہ ور سپاہیوں کی حیثیت میں اتحادیوں کی طرف سے خوب جنگ کی تھی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی سمجھتے تھے کہ ان کا ملک خود اختیاری حکومت کے قابل ہو گیا ہے۔ ۱۹-۱۹۱۸ء کے فسادات نے اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے قتلِ عام کی شکل اختیار کی جس میں ایک انگریز جرنیل نے قدیم طور طریقوں سے کام لیتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو غیر مسلح ہجوم پر آتش باری کا حکم دے دیا۔ اس میں کم و بیش ایک ہزار چھ سو افراد مقتول و مجروح ہوئے۔ اس واقع نے دنیا بھر کی رائے عامہ میں تہلکہ بپا کر دیا۔ اتحادی پہلے ہی ہر مقام کے لبرلوں کے نزدیک اعتراضات کے موجب بنے ہوئے تھے۔ امرت سر کے واقع نے ان کی مجرمیت میں اضافہ کر دیا اور ہندوستان متحدہ طریق پر برطانیہ کے خلاف ہو گیا۔ چین میں روس کی گرفت کمزور ہو چکی تھی۔ جاپانیوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمالی چین کے اندر اپنے پرانے عزائم از سرِ نو اختیار کر لیے اور امریکہ سے جو فوجیں ولاڈیمی واسٹک (سائبیریا) بھیجی گئی تھیں (تفصیلات آئندہ باب میں دیکھیے) انھیں بالشویکوں کی مخالفت کے بجائے زیادہ تر جاپانیوں کی مخالفت کرنی پڑی۔

غرض دنیا میں افراتفری اور بدنظمی بپا تھی، جب چھوٹے بڑے اور متوسط درجے کے اتحادی صلح ناموں کے فیصلے کے لیے پیرس میں جمع ہوئے تھے۔ صلح کرنے والوں کے سامنے جو مسائل درپیش تھے، ان کی حیثیت عالمگیر عقدوں کی تھی جن میں سے اکثر لاینحل تھے۔ اس کی مثال یوں پیش کی جاتی ہے کہ بحیرۂ ایڈریاٹک کی بندرگاہ فیوم کا مطالبہ اٹلی اور یوگوسلافی دونوں کر رہے تھے۔ کوئی بھی فیصلہ صادر کیا جاتا، اس سے بڑے گروہ قطعاً مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ چھوٹے گروہوں کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں رائے عامہ ایک ایسی دنیا کی معتقد ہو گئی تھی، جو امن و انصاف کی بنا پر خوش دلی اور راحت کی زندگی بسر کرے۔ عالمی جنگ اس لیے کی گئی تھی کہ دنیا جمہوریت کے لیے محفوظ ہو جائے، یعنی اس جنگ کا مدعا یہ تھا کہ آئندہ کے لیے جنگ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ اس جنگ کی بدولت جمہوریۂ امریکہ کا صدر ولسن برسرِ کار آ گیا تھا جسے عالمِ انسانیت کی امیدوں کو انتہائی خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی صلاحیت حاصل تھی اور جس نے متارکے کے بعد پیرس کا سفر اختیار کیا تو دنیا اسے عالمِ انسانیت کا نجات دہندہ اور امید گاہ سمجھتی تھی۔

آزاد خیالی کے یہ خوشگوار خواب اور یہ حوصلہ افزا توقعات ہی انسانوں کے قلوب میں جاگزیں نہ تھیں۔ تمام انسان ولسن کی فکر و نظر سے بہرہ مند نہ تھے۔ ایسے آدمی بھی موجود تھے جو خود غرض اور تنگ نظر تھے۔ حقائق صاف صاف ان کے سامنے آ چکے تھے۔ وہ جنگ کے حامی اور پیشہ ور سیاست مدار تھے۔ انھوں نے بیک وقت اطالویوں اور رومانویوں سے متضاد وعدے کر رکھے تھے اور ہر قسم کے انعامات اور تطابقات کے منصوبے تیار کر لیے تھے۔ ان سے بھی بڑھ کر یہ کہ عام مرد و زن کا اطمینان ضروری تھا، جو یقیناً صلح و امن اور حفاظت کے خواہاں تھے، مگر خاص ہی قومی عظمت و شان کی آرزو بھی تھی۔ یہ بھی چاہتے تھے کہ شریر

جرمنوں کو ضرور سزا دی جائے، جنھوں نے چار سال تک انھیں جہنم میں مبتلا رکھا۔ غرض ہزاروں متصادم امیدیں اور متصادم خوف موجود تھے۔ یہ تمام چیزیں گوشت پوست کے زندہ انسانوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں محض مجرد چیزیں نہ تھیں، جو مطبوعہ شکل میں سامنے آتی ہیں۔

چودہ نکات

۱۹۱۸ء میں ان تمام خوشگوار امیدوں نے ایک شخص اور ایک بیان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وڈرو ولسن نے ۸ر جنوری ۱۹۱۸ء کو امریکی کانگرس کے روبرو تقریر کرتے ہوئے مشہور چودہ نکات کا اعلان کیا تھا، جنھیں تمام اتحادی ممالک نیز دشمن ممالک نے آئندہ صلح کا مستقل پلیٹ فارم قرار دے لیا تھا۔ نکات یہ تھے!

"۱۔ صلح کے تمام میثاق کھلم کھلا اور آشکارا کیے جائیں گے۔ ان کا فیصلہ آشکارا ہوگا۔ ان کے بعد کسی قسم کی نجی بین الاقوامی مفاہمت نہ ہو سکے گی، بلکہ ڈپلومیسی کا پورا کاروبار صاف، صریح اور آشکارا طریق پر جاری رہے گا۔

۲۔ علاقائی پانیوں سے باہر تمام قوموں کو سمندروں میں جہازرانی کی آزادی حالتِ صلح و جنگ کے اندر یکساں حاصل رہے گی، البتہ مختلف سمندر بین الاقوامی عمل کے ذریعے سے بین الاقوامی میثاقوں کے نفاذ کے لیے بند کیے جا سکیں گے۔

۳۔ تا بہ حدِ امکان تمام اقتصادی موانع ہٹا دیئے جائیں گے اور صلح پر راضی ہونے اور اس کے قیام سے تعاون کرنے والی اقوام کے درمیان مساوی تجارتی حالت پیدا کر دی جائے گی۔

۴۔ اس امر کی مناسب ضمانتیں دی اور لی جائیں گی کہ قومی اسلحہ میں حد درجہ تخفیف ہو جائے گی اور صرف اتنی فوج باقی رہے گی، جو داخلی حفاظت کے لیے ناگزیر ہو۔

۵۔ استعماری دعاوی کا فیصلہ بالکل آزادانہ، صاف دلانہ اور غیر جانبدارانہ طریق پر ہو جائے گا اور اس اصول کی پوری پابندی کی جائے گی کہ برتری کے مسائل کا تصفیہ کرنے کے لیے متعلقہ آبادیوں کے مفاد کو بھی حکومتوں کے منصفانہ دعاوی کے روبرو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

۶۔ روس کے تمام علاقے خالی کر دیئے جائیں گے اور اس کے متعلق تمام مسائل کا فیصلہ دنیا کی تمام قوموں کے بہترین اور آزادانہ تعاون کے ساتھ کیا جائے گا اور اسے اپنے سیاسی نشو و ارتقاء اور قومی پالیسی کے متعلق آزادانہ فیصلے کا پورا موقع حاصل ہوگا جس میں نہ کسی کی طرف سے مانع پیدا کیا جا سکے گا، نہ اس پر کوئی دباؤ ڈالا جا سکے گا اور یقین

دلایا جاتا ہے کہ آزاد قوموں کے معاشرے میں اس کا پرخلوص خیر مقدم کیا جائے گا۔ اپنے اداروں کے چننے کا وہ خود مجاز ہوگا۔ خیر مقدم سے بھی بڑھ کر اسے ہر قسم کی امداد دی جائے گی جس کا وہ ضرورت مند اور خواہاں ہو۔ ہمسایہ قوموں کی طرف سے آئندہ مہینوں میں روس کے ساتھ برتاؤ ان کی خیر سگالی کا سب سے بڑا معیار ہوگا۔ انھیں چاہیے کہ ذاتی مفاد کو اس کی ضرورتوں سے الگ رکھیں اور اس کے ساتھ دانشمندانہ و بے غرضانہ ہمدردی کا اظہار کریں۔

۷۔ پوری دنیا اس امر سے اتفاق کرے گی کہ بلجیم کا تخلیہ اور بحالی لازم ہے۔ اس کی سیادت و برتری پر کوئی پابندی عائد کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ اسے دوسری آزاد قوموں کے برابر اس برتری سے استفادے کا موقع حاصل رہنا چاہیے۔ بلجیم کے معاملے سے بڑھ کر کوئی معاملہ قوموں کے درمیان ان قوانین پر اعتماد کی بحالی کا موجب نہیں ہو سکتا جو انھوں نے باہمی تعلقات کے ضبط و نظم کے لیے جاری کر رکھے ہیں۔ اگر اس زخم پر مرہم نہ رکھا گیا تو بین الاقوامی قانون کا پورا ڈھانچہ اور اس کا جواز ہمیشہ کے لیے مجروح رہے گا۔

۸۔ فرانس کے تمام علاقوں کا تخلیہ ہو جانا چاہیے۔ جن علاقوں پر حملہ ہوا، وہ اسے واپس مل جانے چاہئیں۔ ۱۸۷۱ء میں پروشیا نے السا س و لورین کے معاملے میں فرانس پر ظلم کیا تھا، جس نے تقریباً پچاس سال دنیا کا امن معرض اختلال میں رکھا۔ اب اس ظلم کی تلافی ہو جانی چاہیے، تاکہ سب کے مفاد کے مطابق امن پھر ایک مرتبہ بحال ہو جائے۔

۹۔ اٹلی کی سرحدات کا تصفیہ واضح طور پر قومیت کے مسلمہ اصول کے مطابق ہونا چاہیے۔

۱۰۔ آسٹریا اور ہنگری کی قوموں کو، جن کا مقام ہم قوموں کے درمیان محفوظ و متیقن رکھنا چاہتے ہیں، خود اختیاری نشو و ارتقا کا زیادہ سے زیادہ موقع حاصل رہنا چاہیے۔

۱۱۔ رومانیا، سرویا اور مانٹی نیگرو کا تخلیہ ضروری ہے۔ متصرف علاقے بحال کر دیئے جائیں۔ سرویا کے لیے سمندر تک آزاد اور محفوظ گزر گاہ مل جانی چاہیے۔ بلقان کی مختلف ریاستوں کے درمیان تعلقات کا تصفیہ وفاداری اور قومیت کے تاریخی خطوط کے مطابق دوستانہ مشوروں کی بنا پر ہونا چاہیے اور مختلف بلقانی ریاستوں کی سیاسی و اقتصادی آزادی اور علاقائی اتحاد کی ضمانت بین الاقوامی طریق پر دے دینی چاہیے۔

۱۲- موجودہ سلطنت عثمانیہ کے ترکی حصوں کی سیادت محفوظ رہنے کا یقین دلا دینا چاہیے، مگر اور جو قومیں ترکی حکومت کے ماتحت ہیں، انھیں غیر مشتبہ تحفظ حیات کا یقین دلا دینا چاہیے نیز یہ کہ وہ خود اختیاری نشوو ارتقاء کے مواقع سے بالکل بلا آزار فائدہ اٹھا سکیں گے۔ درۂ دانیال ہمیشہ تمام قوموں کے جہازوں اور تجارت کے لیے بین الاقوامی ضمانتوں کے ماتحت کھلا رہے گا۔

۱۳- پولینڈ کی ایک آزاد مملکت بنائی جائے گی، جس میں وہ تمام علاقے شامل ہوں گے، جہاں بلا نزاع پولستانی آباد ہیں، ان کے لیے بھی سمندر تک آزاد و محفوظ گزر گاہ کا انتظام کیا جائے گا، نیز ان کی سیاسی و اقتصادی آزادی اور علاقائی اتحاد کی ضمانت بین الاقوامی میثاق کے ذریعے سے دی جانی چاہیے۔

۱۴- قوموں کی ایک عام انجمن خاص میثاقوں کے ذریعے سے اس غرض کے لیے بنائی جائے کہ وہ تمام چھوٹی بڑی مملکتوں کی سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کی ضمانتیں دے دے[1]۔"

چودھواں نکتہ یعنی جمعیت اقوام کی تجویز ولسن کو بہ طور خاص عزیز تھی۔

سوال یہ ہے کہ ان چودہ نکات نے جرمنوں کی آزادی جنگ میں کیا کردار ادا کیا؟ تو یہ ایک نازک سوال ہے اور اس پر موافق و مخالف بہت بحثیں ہو چکی ہیں۔ ۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جرمن حکومت بیڈن[2] کے آزاد خیال پرنس میکس[3] کی سرکردگی میں قائم ہوئی۔ یہ حکومت اس جرمن انقلاب کا پیش خیمہ تھی جو چند ہفتے بعد برپا ہوا۔ پرنس میکس کی حکومت نے اپنی طرف سے اور آسٹریا کی حلیف کی طرف سے چودہ نکات قبول کر لیے اور ولسن کے ساتھ بات چیت شروع کر دی، لیکن ولسن نے اوائل نومبر کے حقیقی انقلاب تک گفتگو معرض التوا میں رکھی۔ نومبر میں واقعات تیزی سے پیش آنے لگے۔ اتحادیوں نے ۵ نومبر کو چودہ نکات گفت و شنید کے لیے بنیاد مان لیے تھے، ساتھ ہی چند ذہنی تحفظات سے کام لیا تھا، لیکن یہ یقینی ہے کہ جرمنوں کی رائے عامہ اور دنیا بھر کے آزاد خیال لوگوں کے نزدیک اتحادیوں نے چودہ نکات کے مطابق صلح کا فیصلہ کر لیا تھا۔

متضاد امیدیں اور وعدے

جو امیدیں اور وعدے چودہ نکات کی ضد اور نقیض تھے، وہ کسی ایک دستاویز میں واضح طریق پر شامل نہیں کیے گئے تھے۔ ہم انھیں تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی :-

---

۱؎ Woodrow Wilson, War and Peace جلد اوّل ص ۱۵۹-۱۶۱

۲؎ Baden

۳؎ Prince Max

۱۔ وہ ڈپلومیٹک وعدے، جو اتحادی پیشتر کر چکے تھے۔

۲۔ وہ فوری اور وسیع امیدیں، جنھیں اتحادیوں کے پروپیگنڈے نے ہوا دی اور بعض اتحادی مدبروں نے آخری وقت میں ان کی توثیق کر دی۔

۳۔ سب سے بڑھ کر دشوار وہ عادات و روایات تھیں، جو مدت سے قائم چلی آتی تھیں اور جو تمام چھوٹی بڑی قوموں کے نمایاں رجحانات و مسالک کا جزو بن چکی تھیں۔

پہلی قسم یعنی ڈپلومیٹک وعدوں میں سب سے بڑھ کر مشکل وہ وعدہ تھا جس سے ولسن ابتدا میں کچھ مدت تک آگاہ ہی نہ تھا۔ اس سے مراد وہ متضاد و متناقص وعدہ تھا، جو ہیبسبرگ خاندان کے علاقوں کے تصفیے کے لیے ائتلاف ثلاثہ نے بہ شمول روس سرویا اور اٹلی سے کیا تھا۔ ایسے ہی دوسرے وعدے تھے خصوصاً بلقان کے متعلق، جن کا تصفیہ بہت مشکل تھا۔ دوسری قسم میں وہ وعدے تھے، جو اس یقین کی بنا پر کر لیے گئے کہ برطانیہ اور فرانس کے نزدیک جرمنی کو جرم جنگ کے سلسلے میں پوری سزا ملنی چاہیے تھی یعنی وہ جنگ کا پورا خرچ بطور تاوان ادا کرے۔ جنگی مجرموں کو سزائیں دی جائیں۔ وہ دوبارہ جارحانہ اقدام کے قابل نہ رہے۔ مبہم طریق پر سمجھ لیا گیا کہ یہ باتیں سب کے لیے بہت اچھی ہوں گی۔ لائڈ جارج ہمیشہ ابن الوقت رہا۔ اس نے متارکے سے حاصل شدہ نفسیاتی برتری سے فائدہ اٹھایا اور برطانیہ میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۱۸ء کا مشہور "خاکی انتخاب" تھا، جسے یہ نام سپاہیوں کی وردی کی بنا پر دیا گیا۔ یہی انتخاب تھا جس میں سب سے پہلے عورتوں کو حق رائے ملا۔ انتخاب میں بہت بڑی اکثریت اس کولیشن (متحدہ حکومت) کو حاصل ہوئی، جس کا رئیس لائڈ جارج تھا۔ انتخابات کے دوران میں دو جملے اکثر ووٹروں کے لیے باعث کشش رہے۔ اوّل یہ کہ جرمنی کی نارنگی کو اس طرح نچوڑنا چاہیے کہ نہ محض پورا پانی نکل آئے، بلکہ اس کے بیج بھی تڑخ جائیں اور برطانیہ کو ایسی سرزمین بنا دینا چاہیے، جو بہادروں اور جوانمردوں کے رہنے کے لائق ہو۔

آخری اور تیسری قسم میں مختلف قوموں کے وہ تعصبات شامل تھے، جن کی جڑیں گہری جا چکی تھیں۔ فرانسیسیوں کا جذبہ یہ تھا کہ جرمنوں سے انتقام لیا جائے اور یورپ میں فرانس کی برتری بحال کر دی جائے۔ اطالوی محبان وطن کا جذبہ یہ تھا کہ اٹلی کے جن علاقوں کا وہ مطالبہ کر رہے تھے، وہ انھیں مل جائیں۔ انگریز یہ چاہتے تھے کہ عہد وکٹوریہ کی راحت و آسائش اور اقتصادی قیادت ان کے ہاتھ آ جائے اور جرمنوں کے تجارتی مقابلے کے لیے وہ خوب مسلح ہوں۔ وسطی یورپ کی نئی دولتوں کے قومی عزائم الگ تھے، جو طویل مایوسی و افسردگی کے بعد آزاد قوموں کی صف میں آئی تھیں۔ خود امریکیوں کی قدیم اور مستقل روایت کم اہم نہ تھی۔ وہ الگ تھلگ رہنے کے حامی تھے۔ چاہتے تھے کہ یورپ کے معاہدوں اور الجھنوں سے آزاد رہیں اور اپنے طریقے پر کام کرتے جائیں۔ وقت کے بہت سے آزاد خیال لوگوں کا احساس یہ تھا کہ یہ تمام میلانات نازیبا اور رجعت پسندانہ تھے، لیکن یہ بالکل طبعی تھے اور ان کی جڑیں عادت و روایت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ دراصل یہ سخت ترین

قوتیں تھیں، جن کے باعث چودہ نکات ورسائی کے اندر بہت پیچھے پھینک دیئے گئے۔

صلح سازی کا عمل

مجلس صلح ۱۸۔جنوری ۱۹۱۹ء کو پیرس میں رسماً منعقد ہوئی۔ تقریباً تیس قوموں نے اس کے لیے نمائندے بھیجے، جو وسطی یورپ کی طاقتوں کے خلاف جنگ میں الجھی رہی تھیں۔ روس کی نمائندگی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شکست خوردہ قوموں نے ان مذاکرات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ انھیں صرف آخری شرطیں بتا دی گئیں اور کہہ دیا گیا کہ ان پر دستخط کردو۔ جرمنوں کو خصوصیت سے شرطوں پر جرح و تنقید کا کوئی موقع نہ دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد جرمنی کے نشر کنندوں نے اس صلح کے لیے ایک لفظ تجویز کر لیا، یعنی یہ صلح نہ تھی، بلکہ اسے جبری اور عائد کردہ صلح قرار دینا چاہیے۔ جرمنوں کو طبعاً اس پر سخت غصہ آیا کہ اتحادیوں نے ان کی نئی اور پُرخلوص جمہوریت کے ساتھ بھی مذاکرہ پسند نہ کیا۔ اسی غصے نے ہٹلر کے ظہور میں سب سے بڑا کردار ادا کیا۔

اگرچہ مغربی دنیا کے چند آزاد خیال لوگوں کی آنکھیں محض اسی واقعے سے کھل گئی تھیں کہ شکست خوردہ قوموں کو مجلس صلح سے باہر رکھا گیا، بایں ہمہ اس مجلس کا ابتدائی کام خوش اسلوبی سے شروع ہوا۔ یورپ میں ولسن کا خیر مقدم انتہائی جوش و خروش سے کیا گیا۔ لوگ ہر جگہ کابوس سے نجات پانے پر خوشیاں منا رہے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ چودہ نکات ہی کی بنا پر صلح ہو جائے گی اور آئندہ کے لیے قوموں کی مجوزہ انجمن بن جائے گی۔ وہاں پارلیمانی آزادی سے مسائل پر بحث ہو گی اور فوجوں کا بے پناہ خرچ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ ولسن کے امید افزا کلمات اخباروں اور جلسہ گاہوں میں دہرائے گئے اور سب سے بڑھ کر جوش و خروش کے ساتھ کھلے میثاقوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ اکثر آزاد خیالوں کے نزدیک ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ صلح ایسے انداز میں ہو گی جیسے تمام چھوٹی بڑی قوموں کے نمائندے بیٹھ جائیں۔ سب بر سرِ عام اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کریں گے۔ آخری فیصلے اکثریت کے ووٹوں سے کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں نہ کوئی خاص گروہ ہو گا، نہ کمرہ دھوئیں سے بھرا جائے گا، نہ سازشوں کے لیے عقبی سیڑھیاں ہوں گی۔

ان آزاد خیالوں کے تمام تصورات باطل ثابت ہوئے، کیونکہ مجلس صلح بہت جلد صدیوں پیشتر کے نمونے پر پہنچ گئی۔ حقیقی مذاکرات سے چھوٹی قوموں کو باہر رکھا گیا۔ فاتح طاقتوں کے بڑے بڑے مدبر مجلس کے کاروبار کا پورا فیصلہ نجی گفت و شنید کے ذریعے سے کر لیتے۔ تمام معاملات چار بڑے آدمیوں کے ہاتھ میں تھے، اوّل ولسن، دوم لائڈ جارج، سوم کلیمنشو، چہارم آرلینڈو[1] (اصلاً سب کچھ تین بڑوں کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ اٹلی اتنا قوی نہ تھا کہ اپنے نمائندے آرلینڈو کی رائے دوسروں پر عائد کرا سکتا اور آرلینڈو خود بھی اپنے رفیقوں کے مقابلے میں حد درجہ کم امتیازی کردار کا آدمی تھا) تمام فیصلے روایتی ڈپلومیسی کے مطابق کیے گئے۔ ایک دوسرے پر دباؤ بھی ڈالے گئے۔ ایک دوسرے کے ساتھ فریب ہی کے لیے سازشیں بھی ہوئیں۔

---

[1] Orlando

مفاہمتیں بھی عمل میں آئیں اور وہ سب کچھ ہوا، جو لیڈر پرائیوٹ صحبتوں میں کرتے رہتے ہیں۔ رائے عامہ محض بالواسطہ دریافت کی گئی، کیونکہ ہر مدبر یہی کہتا تھا کہ قوم کی اکثریت اس کی حمایت کر رہی ہے۔ ولسن اس میں بھی ناکام رہا۔ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں کسی نہ کسی نکتے پر وہ اپنی قوم کی حمایت بھی کھو بیٹھا۔

عوام میں سے جن لوگوں کو امیدیں تھیں، وہ باطل ثابت ہوئیں کیونکہ پیرس کی مجلس صلح نے وہی راستہ اختیار کر لیا تھا، جس پر ایک سو سال پیشتر وی آنا کی مجلس صلح چلی تھی، لیکن محض وہی لوگ مایوس ہوئے، چھوٹی اور متوسط درجے کی طاقتوں کے پیشہ ور سیاست مداروں کو غالباً امید نہ تھی کہ ان سے مساوی درجے کا سلوک کیا جائے گا، تاہم انھیں مجلس کے حقیقی کام سے بالکل باہر رکھا گیا تو انھیں سخت دکھ ہوا اور ان کے اہل وطن میں سخت غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ بڑی طاقتوں کے تمام نمائندے اپنے ساتھ ماہروں، اقتصادی فاضلوں، سیاسی سائنسدانوں، مورخوں اور مختلف دائروں میں کام کرنے والے افراد کا ایک بڑا عملہ لائے تھے۔ یہ قابل نوجوان سمجھتے تھے کہ انھیں اپنے اکابر کے مقابلے میں انسانی مسائل حل کرنے کا بہتر طریقہ معلوم ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اصل کام وہی انجام دیں گے اور اہم فیصلے انھیں کی رائے کے مطابق کیے جائیں گے۔ انھوں نے روداد وں پر روداد یں مرتب کر دیں، جن میں سے بعض مشتبہ واسطوں سے کلیمنشو یا لائڈ جارج یا ولسن تک پہنچیں، مگر وہ لوگ پالیسی وضع نہ کر سکے۔ نوجوان ماہروں کی مایوسی بہت سخت تھی اور عرصے تک قائم رہی۔ اس میں سے اکثر نے صاف صاف بتا دیا کہ مجلس صلح کے کام کو خراب کرنے کے ذمہ دار وہی ہیں۔

ان میں سے ایک انگریز عالم اقتصادیات جان مینارڈ کینیز[۱] تھا جس نے بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے میں اپنی حکومت پر اتنا گہرا اثر ڈالا، جو ۱۹۱۹ء میں نہیں ڈال سکا تھا، لیکن اس نے کتاب لکھ کر فوری بدلا لے لیا۔ جس کا نام تھا "صلح کے اقتصادی نتائج[۲]" کینیز کے نزدیک صلح، صلح قرطاجنہ کی مانند تھی، یعنی جرمنی کو برباد کرنے کی کوشش اسی طرح کی گئی جس طرح رومہ نے قرطاجنہ کو برباد کیا تھا، مگر جرمنی یورپ کا ایک لاینفک جزو تھا، اسے اقتصادی طور پر کمزور کر کے برباد کرنے کی کوشش کا انجام یہ ہوگا کہ خود یورپ کو بھی لازماً نقصان پہنچے گا۔ اتحادیوں نے جرمنی سے تاوان کا جو مطالبہ کیا تھا اسے وہ پورا نہ کر سکے گا۔ وسطی یورپ کی نئی حکومتیں اپنے اردگرد محاصل کی دیواریں کھڑی کر رہی تھیں اور ورسائی میں یورپ کو متحد رکھنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ بہرحال کینیز کی کتاب ورسائی کے مخالف آزاد خیالوں کے نزدیک "بائیبل" کی صورت اختیار کر گئی۔ محض اس لیے نہیں کہ اس کے اقتصادی دلائل بہت مستحکم تھے، اس لیے بھی کہ کینیز نے اس میں چار بڑوں کی تصویریں ایسے انداز میں پیش کر دی تھیں، جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ کلیمنشو کے متعلق اس نے لکھا:

۱۔ John Meynard Keynes

۲۔ The Economic Consequences of Peace


یورپ اور مشرق اوسط
پہلی عالمی جنگ کے بعد
---- ۱۹۱۴ء کی سرحدیں ـــ ۱۹۲۶ء کی سرحدیں
ـــــ جو علاقہ چھوٹ گیا ـــــ
جرمنی سے آسٹریا ہنگری سے روس سے بلغاریہ سے
ترکی سے جن علاقوں سے فوجیں ہٹوا دی گئیں۔ (رائن اور آبنائے)
اتحادی فوجی قبضے کا منطقہ (رائن لینڈ)
میل ۵۰۰
بحیرہ اوقیانوس
شمالی آئرلینڈ
آئرش فری اسٹیٹ
برطانیہ عظمیٰ
بحیرہ شمالی
ناروے
سویڈن
فن لینڈ
جھیل لاڈوگا
لینن گراڈ
اسٹونیا
لٹویا
لتھوانیا
بحیرہ بالٹک
کوپن ہیگن
ڈنمارک
شلیسوگ
نیدرلینڈ
مشرقی پروشیا
وارسا
پولینڈ
برلن
جرمنی
پراگ
رائن
روہر
بلجیم
لکسمبرگ
پیرس
السیس لورین
فرانس
بورڈو
ہسپانیہ
میڈرڈ
جزیرہ بلیری
ہسپانوی مراکش
مراکش
الجزائر
تیونسیا
لیبیا
کارسیکا
سارڈینیا
روم
اطالیہ
سسلی
مالٹا
بحیرہ
کریٹ
آسٹریا
ویانا
بوڈاپسٹ
رومانیہ
بخارسٹ
دریائے ڈینیوب
بلغاریہ
صوفیا
یونان
ایتھنز
قسطنطنیہ
باسفورس
دردانیال
سمرنا
انقرہ
ترکیہ
بحیرہ اسود
ماسکو
یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک
(روس)
دریائے والگا
دریائے ڈان
رستوف
کارس
ایران
بغداد
عراق
بصرہ
خلیج فارس
شام
لبنان
بیروت
قبرص
فلسطین
شرق اردن
نہر سویز
قاہرہ
مصر
عرب

"فرانس کے متعلق کلیمنشو کا احساس وہی تھا، جو ایتھنز کے متعلق پیریکلز کا تھا۔ یعنی وہ فرانس کی یگانہ قدر و قیمت کا قائل تھا۔ اس کے سوا اسے کسی چیز سے سروکار نہ تھا، مگر اس کا نظریۂ سیاست بسمارک کا تھا۔ اسے صرف ایک وہم تھا، یعنی فرانس اور وہ پورے عالم انسانیت سے ناامید تھا جس میں فرانسیسی بھی شامل تھے اور اس کے ہمکار و رفیق بھی۔[1]"

"رئیس جمہوریۂ امریکہ نہ کوئی بہت بڑا آدمی تھا اور نہ پیغمبر، بلکہ وہ فلسفی بھی نہ تھا، البتہ اس کے ارادے بڑے فیاضانہ تھے۔ ساتھ ہی کمزوریاں تھیں، جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں۔ اسے وہ اعلیٰ ذہنی فکری سروسامان میسر نہ تھا، جو اُن پرپیچ اور خطرناک سحرکاروں کے مقابلے کے لیے ناگزیر تھا جنھیں قوتوں اور شخصیتوں کے خوفناک تصادم نے داد و ستد کی تیزبازی میں کامیاب کارفرماؤں کی سربلندی عطا کر دی تھی۔ اس بازی کا ولسن کو قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا......

"لیکن اگر صدر جمہوریۂ امریکہ ایک فلسفی بادشاہ نہ تھا تو وہ کیا تھا؟ بہر حال وہ ایسا آدمی ضرور تھا، جس نے زندگی کا بڑا حصہ ایک یونیورسٹی میں صرف کیا تھا۔ وہ کاروباری آدمی یا معمولی حزبی سیاستدان نہ تھا۔ ایسا آدمی تھا، جو قوت شخصیت اور اہمیت کا حامل تھا، مگر اس کے خُلق و مزاج کے بارے میں کیا سمجھا جائے۔

"اس کا سراغ ملتے ہی ہر چیز روشن ہو گئی۔ صدر جمہوریۂ امریکہ کی حیثیت ایک غیر متعلد پادری یا ایک پریسبیٹر کی تھی۔ اس کا اسلوب فکر اور اس کا خُلق و مزاج اصلاً مذہبی تھے، نہ کہ ذہنی و فکری اور فکر و احساس و اظہار تینوں کی اچھائیاں اور خامیاں اس کے ساتھ شامل تھیں۔[2]"

لائڈ جارج کے تعلق میں ولسن کے متعلق کینیز نے لکھا:۔

"اس قسم کے آدمی کے لیے لائڈ جارج کی غیر مشتبہ اور گرد و پیش کے ہر آدمی کے لیے والہانہ حساسیت کے مقابلے میں کامیابی کی کیا صورت تھی؟ برطانوی وزیر اعظم اپنے رفیقوں پر چھ یا سات حواس سے نظر رکھتا تھا، جو عام آدمیوں کو میسر نہیں ہوتے۔ وہ آدمیوں کے کردار، محرک، لاشعوری جذبے کا صحیح اندازہ کر لیتا۔ مختلف

---

[1] کینیز کی کتاب ص ۳۲ [2] ایضاً ص ۳۹، ۴۱-۴۲

اشخاص بطور خود جو کچھ سوچتے اور ان میں سے ہر ایک جو کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا لائڈ جارج اسے بھی بھانپ لیتا۔ پھر وہ اشراقی وجدان سے ایسی دلیل یا التجا پیش کرتا، جو سابق مقرر کے ذاتی تفاخر یا کمزوری یا خود غرضی کے عین مطابق ہوتی۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں غریب صدر جمہوریہ اس مجلس کے اندر صرف آنکھ مچولی کھیلتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی آدمی اس ایوان میں قدم رکھتا اور وزیر اعظم برطانیہ کے کمال فن کا پہلے ہی سے قتیل فن شکار نہ ہو جاتا۔ دنیائے قدیم شرارت میں بے پناہ تھی۔ دنیائے قدیم کا قلب پتھر کا تھا، جس پر بڑے بڑے بہادروں کی تیز تلواریں بھی کند ہو جاتیں، مگر یہ اندھا اور بہرا ڈان کوگسٹ ایک ایسے میخانے میں داخل ہو رہا تھا، جہاں تیز اور درخشاں تلواریں حریف کے ہاتھوں میں تھیں[1]۔"

ولسن اور اس کے ماہرین آہستہ آہستہ تنگ آ کر سخت تر شرائط صلح قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جرمنی کے خلاف تاوان کا مسودہ طویل ہو گیا۔ پولینڈ، اٹلی اور جاپان نے بھی ایسے علاقوں کے مطالبات پیش کر دیئے، جن کے وہ حقدار نہ تھے۔ فاتحوں نے رفتہ رفتہ کھلم کھلا یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ ویسی ہی روش اختیار کرنا چاہتے ہیں، جیسی فاتح عموماً اختیار کرتے ہیں۔ ولسن نے درجنوں معاملات پر سر تسلیم خم کر دیا یا مفاہمت کر لی۔ پھر اتحادیوں میں ضعیف ترین کے خلاف سختی سے جم جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کہا کہ اطالویوں کو بحیرۂ ایڈریاٹک کی بندرگاہ (فیوم) نہیں دی جائے گی، جو ایک مرتبہ ہنگری کی واحد بندرگاہ رہ چکی تھی۔ اطالوی پاس کی بندرگاہ ٹریسٹ اور ٹرینٹو لے سکتے ہیں، جہاں وہ جرمنوں یا سلافی بولنے والی اقلیتوں پر حکمرانی کر سکتے ہیں اور بعض علاقوں میں ان کی اکثریتیں تھیں۔ مگر فیوم انہیں نہیں دیا جا سکتا۔ اطالوی نمائندے غصے میں مجلس سے باہر نکل گئے، لیکن ولسن اپنی بات پر قائم رہا، چنانچہ فیوم کا فیصلہ صلح میں نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۴ء میں یوگو سلافیہ کے ساتھ صلح کے ذریعے سے فیوم اٹلی کو ملا اور اس کے بدلے میں سوسک[2] یوگو سلافیہ کو دے دیا گیا۔ سوسک فیوم کے پاس ہی تھا اور اس سے یوگو سلافیہ کی ضرورتیں بخوبی پوری ہوتی تھیں۔

لیکن ولسن نے نئی بین الاقوامی تنظیم کی تجویز منظور کرا لی، جو خوشتر دنیا کے لیے اس کے تمام منصوبوں کی بنیاد و اساس تھی۔ جمعیت اقوام کا میثاق معاہدۂ ورسائی کا لازمی جزو تھا۔ جمعیت حقیقی معنی میں فوق الملل انجمن نہ تھی، بلکہ ایک مستقل شورائی نظام تھی، جو فاتحین اور چند غیر جانبدار ملکوں پر مشتمل تھی۔ آگے چل کر جرمنوں اور روسیوں کے لیے اس میں شامل ہونے کا دروازہ کھلا رکھا گیا، مگر ۲۰-۱۹۱۹ء میں ولسن کی جمعیت اقوام ویسی ہی معلوم ہوتی تھی، جیسا میٹرنخ اور کیسلری کا پرانا

---

[1] کینس کی کتاب ص ۴۱

[2] Susak

کانگریسی نظام ۱۸۱۵ء میں تھا۔ یقیناً اس جمعیت کے لیے وہ قربانی ضروری نہ تھی، جو ولسن نے کی۔ جمعیت کی اسمبلی (مجلس عام) تھی، جس میں ہر رکن ملک کو ایک ووٹ حاصل تھا اور ایک کونسل تھی، جس میں پانچ بڑی طاقتوں — فرانس، اٹلی، جمہوریۂ امریکہ، برطانیہ اور جاپان — کو دوامی نشستیں حاصل تھیں۔ باقی چار نشستیں شامل مملکتوں میں سے تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے مخصوص رکھی گئی تھیں۔ یہ نشستیں اسمبلی میں انتخاب کے ذریعے سے پُر ہوتی تھیں۔ ایک مستقل سیکرٹری ایٹ قائم کی گئی جس کا مرکز جنیوا تجویز ہوا۔ یہ سیکرٹری ایٹ جمعیت کے معاملات کا انتظام کرتی، جمعیت کے عمل سے (جس کا جائزہ آئندہ لیا جائے گا) واضح ہو جائے گا کہ یہ آزاد خیالوں کی امیدیں پوری نہ کر سکی۔ اس کے ذریعے سے اسلحہ میں تخفیف نہ ہوئی، نہ اس کی صلح پرور مشینری جارحانہ اقدامات کو روک سکی۔ بڑی بڑی طاقتیں اپنے معمولات پر قائم رہیں اور جمعیت سے صرف وہ پالیسی منوائی جاتی، جسے حالات کے اعتبار سے ضروری سمجھا جاتا۔ یہ کام مختلف مملکتوں کے رئیس پورا کرتے، نہ کہ ڈپلومیٹ۔

چوّنواں باب

صُلح کے مُعاہدے

(۲)

علاقائی تصفیے

پیرس میں جو مشغولیتیں درپیش تھیں، ان میں مرکزی حیثیت علاقائی تغیرات کو حاصل تھی۔ اس معاملے میں ذمہ داران صلح و امن محض فاتح اتحادیوں ہی کے دعاوی سے دوچار نہ تھے، بلکہ نئی قومیں بھی مختلف علاقوں کے دعوے لے کر آ گئی تھیں، جو آسٹریا، روس اور ترکی کی سلطنتوں کے انحلال سے پیدا ہوئی تھیں۔ ذمہ داران صلح کے لیے ان لوگوں کی دائمی جوع الارض کی تسکین لازم تھی، جو مختلف قوموں کے کاروبار چلا رہے تھے۔ ساتھ ہی ضروری تھا کہ قوموں کے حق خود اختیاری کا وہ اصول نہ ٹوٹے، جو ولسن کے چودہ نکات میں شامل تھا۔ وسطی یورپ کی قوموں کے سلسلے میں اس اصول کا اطلاق یقیناً مشکلات کا باعث تھا، کیونکہ ان قوموں کے مختلف گروہوں کی زبانیں مختلف تھیں۔ ساتھ ہی ان میں قومی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ پھر جگہ جگہ ایسی اقلیتیں موجود تھیں جو سب سے بالکل الگ تھلگ تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں ایسی قوموں کی تعداد بڑھ گئی، جو اپنے معاملات کی ذمہ دار خود تھیں۔ بعض اصحاب سمجھتے تھے کہ قوم پرستی معرضِ زوال میں ہے، مگر اب قوم پرستی کی آگ کو اتنی ہوا ملی کہ ایک درجن کے قریب نئی مملکتیں وجود میں آ گئیں۔

فرانس کو الساس و لورین جرمنی سے واپس مل گئے۔ کلیمنشو کو امید تھی کہ وہ جرمنی کے مختصر سے علاقے یعنی طاس صار[1] پر بھی قبضہ کرے گا، جہاں کوئلے کی قیمتی کانیں واقع تھیں۔ کلیمنشو کا خیال تھا کہ دوران جنگ میں کوئلے کی فرانسیسی کانوں پر جرمنوں کے ہاتھوں جو تباہی نازل ہوئی، اس کا معاوضہ مل جائے گا، نیز دریائے رہائن کے مغربی جانب جرمنی سے کچھ علاقہ لے لیا جائے گا اس طرح فرانس کی حفاظت کا سلسلہ زیادہ مستحکم ہو جائے گا اور آگے چل کر ایک جمہوریت رہائن لینڈ کے نام سے بنا دی جائے گی، جو فرانس کے اشاروں پر چلے گی۔ ولسن اور لائڈ جارج نے اس تجویز کی مخالفت کی، چنانچہ یہ پوری نہ ہو سکی، البتہ پندرہ سال کے لیے سیار کو جرمنی سے الگ کر لیا گیا اور جمعیت اقوام کو اس کی نگرانی

---

[1] Saar Basin

سونپ دی گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پندرہ سال کے بعد رائے عامہ لی جائے گی اور اس کے مطابق سار کے مستقبل کا فیصلہ کردیا جائے گا۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ سار سے جتنا کوئلہ نکلے گا وہ فرانس کے حوالے ہوتا رہے گا۔ رہائن لینڈ کا علاقہ بدستور جمہوریۂ جرمنی کا حصہ رہا، اگرچہ وہاں فوجی استحکامات ختم کر دیے گئے اور کچھ مدت تک اتحادی فوجیں اس پر قابض رہیں۔

بلجیم کو بعض چھوٹے چھوٹے قصبے دے دیئے گئے۔ جو جرمنی کی سرحد پر واقع تھے۔ اٹلی کو ٹرینٹ اور ٹریسٹ دے دیئے گئے۔ یہ خاص فیاضی کا کارنامہ تھا، کیونکہ اس طرح ہزاروں جرمن اور سلافی اٹلی کی نئی سرحدوں کے اندر آ گئے۔ پولینڈ کی خودمختار حیثیت کو ۱۷۹۵ء میں ختم کیا گیا تھا، اب اسے بحال کر دیا اور وہ تمام علاقے اس کے حوالے کر دیئے گئے، جو اٹھارھویں صدی سے پیشتر اس کے قبضے میں تھے۔ ان علاقوں میں جرمنوں اور دوسرے غیر پولستانی لوگوں کی اہم اقلیتیں موجود تھیں۔ پرانی ہیپسبرگ سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ جرمن بولنے والے علاقے کے قلب میں آسٹر دی جمہوریت قائم کر دی گئی، لیکن یہ جمہوریت لنگڑی تھی اور بتا دیا گیا کہ وہ جرمنی کے ساتھ شامل نہ ہو سکے گی۔ میگیار بولنے والے علاقوں کے قلب میں ایک چھوٹی سی حکومت ہنگری کی قائم کر دی گئی۔ بوہیمیا[1] اور موراویا[2] کے جن علاقوں میں چیک آباد تھے، ان کے ساتھ سلوواکیا شامل ہو گیا۔ مشرقی جانب روتھینیا[3] کے علاقے بھی اسی میں شامل ہو گئے۔ یوں چیکوسلواکیا کی نئی مملکت وجود میں آئی۔ جمہوریت شمال مغرب میں ان پہاڑوں تک پہنچ گئی، جو بوہیمیا کو جرمنی سے الگ کرتے تھے، لیکن طبعی سرحد کے مشرقی جانب یعنی چیکوسلواکیا کی طرف بہت سے سوڈٹین[4] جرمن آباد تھے۔ چنانچہ اس نئی جمہوریت کو ابتدا ہی سے بہت بڑی اور غیر مطمئن سوڈٹین اقلیت کے مسئلے سے سابقہ پڑ گیا۔

ایک اور نئی دولت یوگوسلافیا کی تھی۔ اصلاً یہ سرویوں، کروٹوں اور سلونوں کی بادشاہی تھی، لیکن جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، قبل از جنگ سرویا کے علاقے میں بہت توسیع ہو گئی تھی تاکہ ہیپسبرگ سلطنت کے جنوبی سلافی علاقے بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ رومانیا کو بھی آسٹریا و ہنگری کی شکست و ریخت سے خاصا فائدہ پہنچا۔ مثلاً اسے اہل ہنگری کا سابقہ علاقہ ٹرانسلوانیا[5] مل گیا۔ ساتھ ہی روس سے بسربیا[6] کا علاقہ مل گیا، کیونکہ بالشویک اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ یوں رومانیا کا علاقہ پہلے سے دگنا ہو گیا۔ جزیرہ نمائے بلقان کے جنوب میں یونان کو پورا تھریس[7] ترکی اور بلغاریا سے چھین کر دے دیا گیا۔

---

[3] Ruthenia — [2] Moravia — [1] Bohemia

[5] Transylvania — [4] Sudeten Germans

[7] Thrace — [6] Bessarabia

زاروں کی سابقہ سلطنت کے علاقوں میں سے پولینڈ کے علاوہ جرمن بحیرۂ بالٹک کی جمہوریتوں یعنی ایسٹونیا[1]، لیٹویا[2] اور لتھوانیا[3] پر بھی قابض تھے۔ یہ جمہوریتیں بھی بحال رکھی گئیں۔ یوں یورپ کا فیصلہ ہو چکا۔ تو باقی علاقوں کے تصفیے کے لیے استصواب رائے عامہ کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آیا مشرقی پروشیا اور سائیلیشیا[4] کے خاص حصے پولینڈ کے حوالے ہوں یا جرمنی کے پاس رہیں۔ نئی پولستانی مملکت کو بحیرۂ بالٹک تک راستہ دے دیا گیا تھا۔ یہ راستہ پولستانی گزرگاہ[5] کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ زمین کا ایک تنگ خطہ تھا، جو کسی زمانے میں پولستانی تھا اور جرمنوں کے مشہور شہر اور بندرگاہ ڈانزگ[6] پر ختم ہوتا تھا۔ پول ڈانزگ کے طلبگار تھے۔ اتحادیوں نے مفاہمت کی صورت یہ نکالی کہ ڈانزگ کو آزاد شہر قرار دے دیا۔ پولستانیوں کو اس شہر سے تجارت کا حق مل گیا، مگر مصیبت یہ تھی کہ پولستانی گزرگاہ کے باعث مشرقی پروشیا جرمنی سے منقطع ہو گیا تھا اور جرمنوں کے لیے لازم تھا کہ اس علاقے میں سے گزریں تو بند ٹرینوں میں گزریں۔

یورپ سے باہر مشرق قریب کے مسائل حد درجہ نازک تھے۔ معاہدہ سیورے کے مطابق ترکوں کے لیے یورپ میں صرف قسطنطنیہ اور ارد گرد کا تھوڑا سا علاقہ چھوڑا گیا تھا۔ ایشیا میں ان کا وطن اناطولیہ باقی رکھا گیا۔ حجاز، نیز عرب کے دوسرے صحرائی علاقوں کو جن میں مختلف قبائلی رؤسا حکمران تھے، خود مختار مان لیا گیا۔ یہ علاقے آج کل حکومت عربیہ سعودیہ کہلاتے ہیں۔ یہ نام وہاں کے حکمران خاندان کے نام پر رکھا گیا۔ عراق اور فلسطین میں حکمداریاں قائم ہو گئیں۔ (اس اصطلاح کی تشریح ہم بہت جلد کریں گے) یہ دونوں برطانیہ کے حوالے کر دیئے گئے۔ شام و لبنان کو فرانس کی حکمداری میں دے دیا گیا۔ یونانیوں کے لیے فیصلہ ہوا کہ وہ سمرنا اور آس پاس کے علاقوں پر پانچ سال تک قابض رہیں۔ پھر ان کے متعلق استصواب رائے عامہ کیا جائے۔ مگر معاہدہ سیورے پر قطعاً عمل نہ ہوا، اگرچہ سلطان ترکی نے اس پر باقاعدہ دستخط کر دیے۔ اناطولیہ میں فوجی افسروں کے ایک گروہ نے مصطفیٰ کمال کی قیادت میں حکومت قسطنطنیہ کے خلاف بغاوت کی اور ترکوں میں نئی قومی زندگی کی روح پیدا کر دی۔ چنانچہ ترکوں نے یونانی فوج کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا اور ایک جمہوری حکومت کی بنیاد رکھ دی، جس کا مرکز قسطنطنیہ نہیں، بلکہ انقرہ قرار پایا، جو اناطولیہ کے قلب میں واقع تھا۔ اس کی حکومت کے ساتھ اتحادی ۱۹۲۳ء میں معاہدۂ لوزان کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ نئے صلح نامے کے مطابق سمرنا کا علاقہ نیز مشرقی تھریس یونانیوں سے واپس لے کر ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یعنی یہ معاہدہ معاہدۂ سیورے کے مقابلے میں ترکوں کے لیے بہت فائدہ مند تھا۔

حکمداریاں

شکست خوردہ طاقتوں کے جو علاقے سمندر پار واقع تھے، ان پر براہ راست قبضہ کر لینا جیسا ۱۷۱۳ء، ۱۷۶۳ء اور ۱۸۱۵ء میں کیا گیا ۱۹۱۹ء میں ممکن نہیں رہا تھا۔ یورپ اور امریکہ میں آزاد خیال اصحاب اس

---

[1] Estonia [2] Latvia [3] Lithuania

[4] Silesia [5] Pollish Coridar [6] Danzig

درجہ خفا تھے کہ ان کی خفگی کی آگ بھڑکنے کے قریب پہنچ گئی تھی اور خود ولسن براہ راست الحاق کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا، لہٰذا حکمداری کا نظام تجویز ہوا، جس کا مطلب یہ تھا کہ خاص خاص علاقے پر جمعیت اقوام کسی خاص طاقت کو ضبط و نظم سپرد کر دیتی اور وقتاً فوقتاً معائنہ کرتی رہتی کہ آیا حکمداری کی شرطیں پوری کی جا رہی ہیں، اس نظام کے مجوزوں کی خواہش یہ تھی کہ اس طرح نو آباد باشندوں کو تعلیم و تربیت دی جائے، ان کی حالت بہتر بنائی جائے، انھیں خود اختیاری جمہوری طور طریقوں سے آشنا سا کیا جائے، یہاں تک کہ وہ آزادی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسی نظام کے مطابق جرمنی کے سابق سمندر پار علاقے اور سلطنت عثمانیہ کے غیر ترکی حصے تقسیم کیے گئے۔ جرمنی کے افریقی مقبوضات میں سے مشرقی افریقہ (جو آج کل ٹانگانیکا کہلاتا ہے) برطانیہ کے حوالے ہوا۔ جنوبی و مغربی افریقہ جنوبی افریقہ کی یونین کو سونپ دیا گیا۔ کامرون[1] اور ٹوگولینڈ[2] برطانیہ اور فرانس میں تقسیم کر دیے گئے۔ بحرالکاہل میں نیوگنی کا جو حصہ جرمنوں کے قبضے میں تھا، وہ آسٹریلیا کو، مغربی ساموا[3] نیوزی لینڈ کو، کیرولین[4]، مارشل[5] اور میریانا[6] کے مجمع الجزائر جاپان کو دے دیے گئے۔ مشرق قریب میں شام و لبنان فرانس نے لے لیے، فلسطین و عراق برطانیہ کے قبضے میں چلے گئے۔

حکمداری کا نظام الحاق کی پردہ داری کے لیے تجویز کیا گیا، گویا رجعت پسند شر نے ترقی پذیر خیر کو ریاکارانہ خراج ادا کیا تھا۔ کلیمنشو جیسے فرد کے لیے صورت حال غالباً یہی تھی۔ جاپانیوں نے کھلم کھلا جزائر بحرالکاہل کو سلطنت کا جزو بنا لیا اور انھیں مستحکم کر لیا کہ پورا فعل نظام حکمداری کے سراسر خلاف تھا، لیکن اکثر لوگوں کے نزدیک، جنھوں نے حکمداریوں کا تصور پیش کیا تھا، اس نظام کا مقصد وہی تھا، جس کا اعلان کیا گیا، یعنی قومیت کی تربیت و پرورش اور حکمدار طاقتوں نے اکثر متعلقہ علاقوں میں ویسے ہی انتظامات کیے کہ یہ آگے چل کر آزاد ہو جائیں[7]۔

جرمنی تعزیر کے شکنجے میں

علاقوں کے رد و بدل کے بعد مجلس صلح کے لیے سب سے بڑھ کر اہم کام تاوان کا تھا، جو آسٹریا، ہنگری، بلغاریا، ترکی اور جرمنی پر عائد کیا گیا تھا۔ ان میں سے صرف جرمنی کے تاوان نے دنیا کے امن و اقتصادیات میں زیادہ عرصہ تک خلل ڈالے رکھا۔ کم از کم کاغذی عمل کی حد تک لائڈ جارج اپنے اس وعدہ پر قائم رہا کہ جرمنی کی نارنگی کو خوب نچوڑا جائے گا۔ جرمنوں سے یہ اور وعدہ لیا گیا کہ دوران جنگ میں غیر مصافی آبادی

---

[1] Cameroons

[2] Togoland

[3] Samoa

[4] Caroline

[5] Marshal

[6] Mariana

[7] یہ اشارہ کس علاقے کی طرف ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن مشرق قریب میں شام نے کئی مرتبہ آتش و خون کا غسل قبول کیا، پھر بھی اس وقت تک فرانس کی حکمداری سے نجات نہ ملی، جب تک دوسری عالمی جنگ سے فرانس کی قوت تباہ نہ ہو گئی (بقیہ اگلے صفحہ کے حاشیئے پر)

کو جو نقصان پہنچ چکا ہے، اس کی تلافی کریں گے اور ۱۹۲۱ء تک پانچ بلین[1] ڈالر سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔ پھر ان کے سامنے آخری مالی مطالبہ پیش کیا جائے گا اور باقی رقم تیس سال میں ادا ہو جانی چاہیئے۔ ورسائی میں رقم کا تعین کوئی نہ کیا گیا، کیونکہ اتحادی کسی ایک رقم پر مطمئن نہیں ہو سکے تھے، مگر مجموعی رقم ایسی تھی جس کا حساب عام اعداد کی بنا پر مشکل تھا۔ یہ امر ابتدا ہی سے واضح تھا کہ تاوان کی ادائی سامان کی شکل میں ہوگی۔ اگر جرمنی اتنا خوشحال تھا کہ وہ تاوان کی رقمیں ادا کر سکتا تو اسے ایسا کمزور اور منقسم نہیں مانا جا سکتا تھا، جیسا کلیمنشو اور اس کے ہم خیال اسے بنا دینا چاہتے تھے، لہٰذا ابتدا ہی سے حقیقت پسند لوگ — لائڈ جارج اور کلیمنشو مستقبل کے متعلق بالکل متناقض امیدیں قائم کیے بیٹھے تھے۔ معاہدۂ ورسائی میں یہ فیصلہ بھی ہو گیا تھا کہ جرمنی اپنے بہت سے تجارتی جہاز اتحادیوں کے حوالے کر دے گا، نیز فرانس، اٹلی اور بلجیم کو دس سال تک کوئلے کے وسیع ذخیرے بہم پہنچاتا رہے گا۔ علاوہ بریں معاہدے کی دفعات کے ایک وسیع سلسلے میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ جرمنی کو خشکی تری اور فضا میں زیادہ سے زیادہ غیر مسلح کر دیا جائے۔ چنانچہ جرمن فوج کی تعداد ایک لاکھ مقرر کر دی گئی اور مغربی سرحدی علاقہ، جو رھائن کے مشرق میں پچاس کلومیٹر (تقریباً تیس میل) کے اندر پھیلا ہوا تھا، ہر قسم کے استحکامات سے پاک کر دیا گیا۔ وہاں نہ کوئی سپاہی رکھا جا سکتا تھا، نہ کسی حفاظتی اور دفاعی استحکام کی اجازت تھی۔ اتحادیوں کو یہ حق دے دیا گیا تھا کہ ان کی متصرف افواج رھائن کے بائیں کنارے پر پندرہ سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک قابض رہیں۔ جرمنی کو آبدوزوں اور جنگی طیاروں کی کامل ممانعت کر دی گئی اور اس کی بحریات میں عام جہازوں کی تعداد بھی محدود رکھی گئی۔

سب سے آخر میں معاہدۂ ورسائی کی دفعہ ۲۳۱ تھی، جو کم اہم نہ تھی۔ اس کے مطابق جرمنی کو یہ تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا گیا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع کرنے کی پوری ذمہ داری وسطی یورپ کی طاقتوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں وہ دفعہ درج کی جاتی ہے، جو تاریخ کے ایک وسیع ذخیرے کی ترتیب کا باعث بنی:-

"متحدہ حکومتیں اور ان کی ہمنوا حکومتیں اعلان کرتی ہیں اور جرمنی تسلیم کرتا ہے کہ اتحادیوں، اور ان کے ہمنواؤں نیز ان کے ہم قوموں، کو جنگ کے نتیجے میں جو نقصان اٹھانا پڑا،

(بقیہ صفحۂ سابق) فلسطین میں برطانیہ نے یہودیوں کو جمع کر کے ایک ایسی صورت پیدا کر دی کہ جب تک اسرائیل کا وجود باقی ہے، عرب امن و اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے۔ فرانس و برطانیہ کی یہ بغتیں کس سے مخفی ہیں۔ (مترجم)

[1] بلین (Billion) اس کے دو مفہوم ہیں۔ انگریزی حساب کے مطابق بلین دس کھرب کا ہوتا ہے۔ امریکہ اور فرانس کے حساب کے مطابق صرف ایک ارب کا۔ معلوم نہیں، یہاں مصنفین کی مراد کیا ہے۔ بظاہر امریکی حساب ہی ان کے پیش نظر ہو گا۔

اس کی ذمہ داری جرمنی اور اس کے حلیفوں پر عائد ہوتی ہے۔ جرمنی اور اس کے حلیفوں ہی کے جارحانہ اقدام نے دوسروں کو جنگ پر مجبور کیا۔[1]"

تصفیوں کا جائزہ

جرمنوں کے نزدیک معاہدہ ورسائی یقیناً حد درجہ سخت اور ذلت خیز تھا، یعنی یہ معاہدہ اس سے جبراً منوایا گیا۔ یہی سب سے بڑی قومی شکایت تھی، جسے ہٹلر نے انتہائی چالاکی سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس زمانے نیز بعد کے زمانے کے آزاد خیالوں اور کینیز کے نزدیک یہ معاہدہ غیر محکم اور انتقامی تھا اور تاوان کی پالیسی خلاف فکر و عقل ہونے کے باعث اس معاہدے کو سخت تباہی خیز سمجھنا چاہیے۔ ہمارے زمانے میں، جو گرم و سرد جنگوں کا زمانہ ہے، ورسائی کا معاہدہ دل میں ایک حسرت پیدا کرتا ہے۔ کم از کم یہ ایک تصفیہ ضرور تھا اور ایسا تصفیہ، جو بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے بہترین لمحات میں بین الاقوامی روابط کی تدریجی اصلاح کے لیے ایک بنیاد معلوم ہوتا تھا۔

اس کے ذریعے سے جس جمعیت الاقوام کی بنیاد رکھی گئی، اس میں یہ جوہر نظر آتا تھا کہ بین الاقوامی مدبروں کی نئی نسل اس کے ذریعے سے قوموں کی پرانی رقابتوں میں تخفیف کر سکے گی۔ تاوان کی رقمیں زیادہ معقول بنائی جا سکتی تھیں اور بنائی گئیں۔ نئی مملکتیں قومی شعور پر مبنی تھیں، جو کم و بیش ایک سو سال سے نشو و ارتقاء پا رہا تھا۔ اگرچہ نقطہ باز لوگ یورپ کی تقسیم در تقسیم پر احتجاج کرتے ہیں کہ زیادہ کمزور اور غیر مطمئن چھوٹی چھوٹی مملکتیں (جیسی بلقانی ریاستیں تھیں) تخلیق کر دی گئیں، لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ مختلف اقوام —— مثلاً چیکوں، پولستانیوں، بحیرۂ بالٹک کے لوگوں اور جنوبی سلافیوں —— کے لیے آزادی یا کم از کم داخلی خود مختاری سے انکار مشکل تھا۔ یقیناً جرمنی سے فیاضانہ سلوک نہ ہوا، مگر اسے یورپ کے نقشے سے محو نہیں کیا گیا تھا، جس طرح اٹھارہویں صدی میں پولینڈ کو محو کیا جا چکا تھا۔ اسے گرا کر دنیا میں دوسرے درجے کی مملکت بھی نہیں بنایا گیا تھا۔ وہ اوّل درجے کی طاقت رہی، جیسا کہ اس نے بہت جلد ثابت کر دیا۔ مغربی ملکداری کا موجودہ نظام پندرھویں صدی کی اطالوی جنگوں سے شروع ہوا۔ اس کے تحت تصفیوں کا ایک طویل سلسلہ چلا آتا ہے۔ انھیں پیش نظر رکھا جائے تو آج معاہدۂ ورسائی نہ تو بدترین معلوم ہوتا ہے، نہ بہترین۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ٹھیک ٹھیک مفاہمت کا صلح نامہ تھا۔

بہرحال امریکیوں کے نزدیک یہ قابل برداشت نہ تھا، کیونکہ وہ بین الاقوامی مفاہمتوں کی شدید ضرورتوں کے عادی نہ تھے، لیکن یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ امریکی صرف اپنی مثالیت پسندی کے باعث افسردہ خاطر ہو کر اس تصفیے سے الگ ہو گئے، جو ناخوشگوار حقائق سے لبریز تھا۔ امریکیوں نے معاہدۂ ورسائی کی توثیق سے انکار کر دیا اور دوسرے بڑے اجتماعی فیصلوں کی طرح یہ بھی گوناگوں قوتوں کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا۔ سیاسیات نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا، کیونکہ نومبر ۱۹۱۸ء میں امریکی کانگرس کے لیے جو انتخابات ہوئے، ان میں ری پبلکن پارٹی نے سینٹ اور ایوانِ مندوبین میں اکثریت حاصل کر لی تھی۔ صدارت پر ولسن ہی

---

[1] فے کی کتاب عالمی جنگ کے مبادی جلد اوّل ص ۸

فائز رہا، جو ڈیموکریٹ تھا اور ولسن نے ری پبلکنوں کے لیے کوئی رعایت روا نہ رکھی۔ نہ تو پیرس جاتے وقت وہ ڈیموکریٹوں اور ریپبلکنوں، دونوں کے نمائندے ساتھ لے گیا اور نہ اس نے معاہدے میں کوئی ایسی ترمیم قبول کی جس کے بعد یہ ریپبلکنوں کے لیے اطمینان بخش ہو جاتا، لہٰذا سینیٹ نے اس معاہدے کی تصدیق سے انکار کر دیا۔

جو لوگ قیاس آرائی کے شائق ہیں کہ اگر معاہدہ منظور ہو جاتا تو تاریخ کی رفتار کیا ہوتی، ان کے لیے مشق کا موقع موجود ہے۔ مثلاً اگر ولسن اپنے چند ذی اثر ریپبلکن بھی لے جاتا، اگر وہ پیرس نہ جاتا اور وطن ہی میں ٹھہرا رہتا، ساتھ ہی ڈیموکریٹوں اور ریپبلکنوں کا مشترکہ وفد پیرس بھیج دیتا اگر وہ مفاہمت پر آمادہ ہوتا اور بہت پہلے خوش طبعی سے وہ تحفظات منظور کر لیتا، جو سینیٹ کے ریپبلکن ممبروں نے جمعیت اقوام کے لیے تجویز کیے تھے، یعنی اگر وہ وڈرو ولسن نہ ہوتا تو جمہوریۂ امریکہ جمعیت میں شامل ہو جاتی اور معاہدے پر دستخط کر دیتی۔ آخر کانگرس کی ایک مشترکہ قرارداد کے مطابق جرمنی کے ساتھ صلح کر لی گئی اور صدر ہارڈنگ[1] نے ۱۹۲۱ء میں اس پر دستخط کر دیئے۔

اگر ولسن کی جگہ زیادہ لچکدار اور سیاست فہم امریکی صدر ہوتا تو بہت مشکل تھا کہ وہ سینیٹ سے ایک اور معاہدے کی توثیق حاصل کر لیتا۔ تجویز یہ تھی کہ فرانس، برطانیہ اور جمہوریۂ امریکہ کے درمیان ایک دفاعی اتحاد ہو جائے۔ ولسن کو یہ تجویز اس لیے قبول کرنی پڑی کہ اس نے ایک جداگانہ جمہوریۂ رہائن لینڈ کے قیام اور سار کے الحاق کی فرانسیسی تجاویز منظور نہیں کی تھیں۔ یوں جمہوریۂ امریکہ الگ ہو گئی۔ برطانیہ نے جرمنی کے خلاف صرف فرانس سے اتحاد منظور نہ کیا۔ فرانس بدستور ذاتی حفاظت کے لیے کوشاں تھا۔ چنانچہ اس نے جرمنی کے جنوب اور مشرق کی نئی قوموں — پولینڈ، یوگوسلافیہ، چیکوسلواکیہ، اور رومانیا (آخری تین مملکتوں نے باہم اتحاد کر لیا تھا، جو چھوٹی طاقتوں کا "ائتلاف ثلاثہ" کہلاتا تھا) — سے معاہدوں کا ایک سلسلہ استوار کر لیا۔

گویا اس صلح سے فرانس کو یورپ میں برتری تو یقیناً حاصل ہو گئی، مگر یہ برتری اطمینان بخش نہ تھی، کیونکہ اس کا انحصار اوّل جرمنی کو غیر مسلح رکھنے اور اقتصادی اعتبار سے کمزور کرتے رہنے پر تھا۔ دوم روس کی مسلسل علیحدگی (یعنی سیاسیات یورپ سے) پر سوم نئے اتحادیوں کی حمایت پر جو بہرحال غیر یقینی اور متزلزل تھی۔

مزید برآں فرانس خود جنگ میں جانی و مالی نقصانات کے باعث بہت کمزور ہو چکا تھا اور اس کا منصب قیادت ایک بے حقیقت شے رہ گیا تھا۔ البتہ انگریز فرانس کے اس ادعائے قیادت سے ضرور مضطرب ہو گئے تھے، کیونکہ ان کے دل میں اس ملک کی سابقہ رقابتوں کی یاد تازہ تھی۔

درحقیقت جرمنی ہی یورپ کی سب سے بڑی قوت تھی۔ اس نے پہلے براعظم یورپ و دنیا بھر میں اقتدار حاصل کر لینے کے

---

[1] Harding

لیے جو دوڑ شروع کر رکھی تھی، اس میں تھوڑی دیر کے لیے التوا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے نہیں رکی تھی۔ جرمنی کی کوشش یہ تھی کہ برطانیہ اور امریکہ کو علیحدگی و کنارہ کشی کی پالیسی کے ترک پر آمادہ کرے، جو ان دونوں طاقتوں نے ۱۹۱۹ء کے اس مجوزہ نظام کی برہمی پر اختیار کر لی تھی جو پیرس میں تیار ہوا تھا۔

کمیونسٹ روس

سنہ ۱۹۱۷ء - سنہ ۱۹۴۱ء

پچپنواں باب

مارچ ۱۹۱۷ء کا انقلاب

تمہید

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو ایڈالف ہٹلر کی جرمن فوجیں روسی حلیف کی سرحدوں میں داخل ہوئیں اور ماسکو نیز روس کے بڑے صنعتی مرکزوں اور زرخیز زرعی مرکزوں کی طرف تیزی سے پیشقدمی شروع کر دی۔ جس روس پر ہنگری حملہ آور ہوا، وہ اس روس جیسا نہ تھا، جہاں ایک سو انتیس سال پیشتر نپولین کی "فوجِ عظیم" داخل ہوئی تھی۔ وہ اس روس جیسا نہ تھا، جس کے لاکھوں سپاہی پہلی جنگ عظیم میں ولیم دوم، قیصر جرمنی اور اس کے ہیبسبرگ حلیف کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ یہ زاروں کا روس نہ تھا، بلکہ ۱۹۱۷ء سے بالشویکوں کا روس چلا آتا تھا، مگر بہر حال یہ روس تھا۔

زاروں کے ساتھ امرا اور سرمایہ داروں کے طبقے بھی ۱۹۱۷ء کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد تباہ ہو چکے تھے اور پادریوں کے طبقے کو بھی تقریباً ویسا ہی نقصان پہنچا تھا۔ متشدد مارکسی انقلابیوں کے ایک چھوٹے سے سازشی گروہ نے جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ پختگی سے وابستہ تھے، اختیارات پر قبضہ کر لیا تھا، اور آئندہ چوبیس سال تک روس کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے انتہائی کوششوں میں مصروف رہے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر اس عجیب و غریب روسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جنھیں اہل علم کہا جاتا تھا اور انھوں نے اپنے آپ کو صنعتی مزدوروں کے نمائندے بنا لیا۔ اس کے بعد وسیع تغیرات پیدا کیے، خصوصاً ۱۹۲۸ء کے بعد۔ صنعت و حرفت نے جبریت کے تحت انتہائی وسعت اختیار کر لی اور آبادی کا جو حصہ اس دائرے میں مصروف کار ہوا، اس کا تناسب تقریباً پچاس فی صد پر پہنچ گیا۔ اسی تناسب سے کھیتی باڑی میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد گھٹ گئی۔

کسان ۱۸۶۱ء تک غلامی کا ہدف بنے رہے تھے۔ پھر ۱۹۰۶ء تک ان پر جماعتی حکم مسلط رہا، جس نے ان کا جوہر جدت تباہ کر دیا۔ سٹولی پن[۱] نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور وہ آزاد کسان بن گئے۔ بالشویکوں کا دور آیا تو ان کے لیے نیا اور دردناک دباؤ پیدا ہو گیا۔ زراعت اجتماعی بنا دی گئی اور کسان کے دل میں زمین کو ذاتی جائداد بنا لینے کی جو آرزو پشتہا پشت سے چلی آتی تھی، اسے سختی سے دبا دیا گیا۔

۱؎ Stolypin وزیرِ اعظم روس

یہ حیرت انگیز عمرانی اور اقتصادی تغیرات داخلی کشمکش کے بغیر عمل میں نہ آسکے۔ حکومت کے اندر ذاتی رقابتیں، سازشیں، جوابی سازشیں، جھوٹی سازشیں اور سازشوں کے الزامات جاری رہے، پھر بار بار مخالفوں کو ختم کر دینے کی تدبیریں اختیار کی گئیں اور یہ تدبیریں اوپر سے نیچے تک بار بار اختیار کی جاتی رہیں۔ بالشویکوں نے جس دم گھٹنے والی سازشی فضا میں طویل مدت بسر کی تھی اور وہ اختیارات پر قبضہ کرنے کے لیے پس پردہ تیاریاں کرتے رہے تھے، وہی سازشی فضا اب اقتدار کے مرکزوں پر بھی حاوی ہوگئی۔ حکومت کی مشینری پر قبضہ کرنے کی غرض سے ذاتی رقابتوں کے لیے ویسے ہی پردے تیار کیے گئے، جیسے بیز نطینی مذہبی گروہوں نے تیار کر لیے تھے۔ یعنی کہا یہ جاتا تھا کہ فلاں فلاں نے لینن اور مارکس کی مقدس تحریرات کے بعض نکتوں سے اختلاف کیا ہے۔ ان کشمکشوں کا فوری اثر حکومت کے مسلک کی تجویز و ترتیب پر پڑا۔ کمیونسٹ پارٹی، خفیہ پولیس اور فوج ایک دوسری سے وابستگی پیدا کر کے ڈکٹیٹر کی زبان کے مطابق حکومت کا کاروبار چلاتی رہیں۔ ڈکٹیٹر یعنی سٹالین نے جو اقتدار پیدا کیا تھا، وہ زیادہ تر کمیونسٹ پارٹی کے سکرٹری کی حیثیت کے بے پروایانہ استعمال کا نتیجہ تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی خارجہ پالیسی پر ایک مختصر سا دور ایسا آیا تھا، جس میں نظریاتی مصلحتوں کو وقتاً فوقتاً قومی مفاد پر بظاہر ترجیح دی گئی۔ پھر یہ پالیسی روائتی روسی مقاصد کے لیے وقف ہوگئی۔ ساتھ ہی یہ مقصد پیش نظر رکھ لیا گیا کہ دنیا بھر میں انقلاب پیدا کرنے کو تقویت پہنچائی جائے۔ روس سے باہر روسی مقاصد کی پیشبرد کے لیے بالشویک لیڈروں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ آگیا تھا جو زاروں کو کبھی نصیب نہ ہوا۔ یہ کمیونسٹ انٹرنیشنل (بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی) کومن ٹرن[1] تھی، یعنی دنیا کے مختلف ممالک میں کمیونسٹ پارٹیوں کا وفاق۔ ان پارٹیوں کو خالص کمیونسٹ مقاصد کے بجائے خالص روسی مقاصد کی تقویت کے لیے استعمال کیا گیا۔

بعض اوقات روس کے قومی مقاصد کی پردہ داری پوری طرح نہ ہوسکی، لہٰذا کسی نہ کسی کمیونسٹ پارٹی کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں، تاہم بہ حیثیت مجموعی روسی بالشویکوں کے کارناموں کی درخشانی نے ماسکو کو دنیا بھر کے انقلابی دارالحکومت کا درجہ دے دیا، جس کے مقاصد و مسالک کے متعلق چون و چرا کی گنجائش نہ تھی، بلکہ ان تمام ملکوں کے کمیونسٹوں کا — جہاں انقلاب نہیں ہوا تھا اور کمیونسٹ برسرکار نہیں آئے تھے — فرض تھا کہ انھیں قبول کریں اور ان کے مطابق عمل پیرا رہیں۔ صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے کے اندر بین الاقوامی سیاسیات میں دباؤ اور کشاکش کے سلسلے تبدیل ہوتے رہے، اسی لیے "کومن ٹرن" کے مسلک میں بھی اکثر حیرت انگیز طریق پہ تبدیلیاں آتی رہیں، تاہم اس نے روس کی وزارت خارجہ کے مقاصد سے مطابقت ہمیشہ جاری رکھی۔ بیرونی دنیا کے کمیونسٹوں کی اکثریت اسی موقف پر چپ چاپ قائم رہی اور وہ اکثر ضرورت کے وقت بلند آہنگی سے ان چیزوں کی مخالفت کر دیتے، جن کا اعلان ایک دن پیشتر کر چکے تھے۔

---

1. Comuntern

جو تغیرات سوویٹ دور کے پہلے چوبیس سال میں ہوئے، اگرچہ وہ بہت وسیع تھے، لیکن نئے روسی نظام اور پرانے روسی نظام میں ضبط و تسلسل چھپا نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۱ء کا ڈکٹیٹر عوام کے نزدیک بہت محترم تھا اور اس کے متعلق پیروؤں کی طرف سے روز افزوں عالیشان دعوے کیے جاتے تھے، لیکن وہ اپنے مطلق اقتدار میں ۱۹۱۷ء کے زار سے مختلف نہ تھا۔ ۱۹۴۱ء کا عام روسی نئے نظام کے تحت انتہائی تکلیفیں اٹھا چکنے کے باوجود حد درجہ محب وطن رہا اور وہ اس حکومت کے ماتحت بھی ملک کے لیے ہر قربانی پر آمادہ تھا جس سے اسے نفرت تھی۔ ۱۹۴۱ء کا کسان بدستور زمین کا آرزو مند تھا۔ مزدور بدستور اقتصادی ترقی اور عمرانی حفاظت کے لیے کوشاں تھا۔ نوکر شاہی کے ارکان، فرموں کے ناظم، اہل علم و دانش، فنکار سب حکومت کی خدمت میں مصروف تھے۔ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے ایک نئے برگزیدہ طبقے کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس نے پرانے طبقۂ امراء کی جگہ لے لی تھی، لیکن وہ اس سے مختلف نہ تھا۔ پولیس خوفناک آئیون[1] پیٹر اعظم اور نکولس اول کے عہد سے بدرجہا زیادہ مستعد و کارگر بن گئی تھی، مگر وہ ۱۹۴۱ء میں اصلاً مختلف نہ تھی۔ تمام شہریوں پر یکساں اس کا ضبط و نظم قائم تھا اور اصل نظام کے ممتاز ارکان بھی اس سے خائف و ہراساں زدہ تھے۔

سٹالن کی کمیونزم نے ایک مذہب کا سر و سامان بہم پہنچا لیا تھا۔ اس کی بھی مقدس کتابیں تھیں۔ اس میں بھی کفر و الحاد کے فتوے صادر ہوتے تھے۔ اس کی بھی زیارت گاہیں تھیں اور اس کی بھی اعتقادی مناقشتیں تھیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ پرانی روسی آرتھوڈکسی نے ۱۹۴۱ء تک کسی نئی آرتھوڈکسی کے لیے جگہ خالی نہیں کی تھی، بلکہ اس میں تھوڑی سی ترمیم ہو گئی تھی۔ روسی قوم پرستی بھی زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ بروئے کار آتی رہی، یہاں تک کہ ہٹلر سے جنگ شروع ہوئی تو حکومت نے روایتی بہادروں اور جوانمردوں کے مشرب کی حوصلہ افزائی کی، بلکہ خوفناک آئیون کو بھی عظمت و شان کی مسند پر بٹھایا گیا اور وہ جاگیرداری کے دور کا نشان نہ رہا، بلکہ روس کی (قومی) روح کا نشان بن گیا۔ ابتدا میں انقلابیوں نے روسی شادی، خانہ داری کی زندگی اور تعلیم کے متعلق مسلّمہ معیاروں سے انحراف کیا تھا، لیکن ۱۹۴۱ء تک یہ تمام انحرافات رسمی سرمایہ دارانہ مسلک کی خاطر ترک کر دیئے گئے۔ سوویٹ اقتدار کے پہلے چوبیس سال (۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۱ء) اب ہمارا موضوع ہیں۔ ہم ان تمام وسیع تغیرات کو قدرے تفصیل سے بیان کریں گے، جن کا خلاصہ اس تمہید میں پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ نئے روس کی باریک تہہ کے نیچے وہی پرانا روس از سر نو زندہ ہو گیا۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کا پس منظر

اگرچہ روس ۱۹۱۴ء میں داخلی بحرانوں کا جولانگہ بنا ہوا تھا، لیکن عالمی جنگ کے آغاز کا خیر مقدم قومی حب وطن کے مظاہروں سے کیا گیا۔ دوما یعنی روسی پارلیمنٹ نے جنگ کی تائید کی اور صلیب احمر کی تنظیم کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ بائیں بازو کی جماعتوں یعنی انتہا پسند

---

[1] Ivan, the terrible روس کا ایک ظالم زار

زرعی اشتراکی انقلابیوں اور مارکسی اشتراکی جمہوریت پسندوں نے جنگی قرضوں کے لیے ووٹ دینے سے تو احتراز کیا، مگر قومی دفاع کے لیے ہر قسم کی خدمات پیش کر دیں۔ ۱۹۱۷ء تک ڈیڑھ کروڑ روسی فوج میں بھرتی ہو چکے تھے۔ جنگی نقصانات ابتداء ہی سے بےحد درجہ زیادہ تھے۔ مثلاً جنگ کے پہلے سال میں روسی مقتولین و مجروحین کی تعداد اڑتیس لاکھ سے کم نہ تھی۔ داخلی انتظامات میں نکمّہ چینی سامانِ جنگ کی ناکافی بہم رسانی سے شروع ہوئی اور ۱۹۱۵ء کے وسط تک مرکزی اور بائیں بازو کے گروہ کے ارکان متبدل اصلاحات کے لیے زور دے رہے تھے، مثلاً یہ کہ قلیل التعداد قوموں کے خلاف امتیازات ختم کئے جائیں اور مقامی مجلسوں کے اختیارات بڑھائے جائیں۔ ملکہ الگزنڈرا نے ایسی تمام تدابیر کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا اور اپنے کمزور شوہر نکولس دوم پر زور ڈالتی رہی کہ مطلق العنانی کے ساتھ حکمرانی کا سلسلہ جاری رکھو۔ جب نکولس دوم نے خود میدانِ جنگ میں فوجوں کی کمان سنبھال لی اور دوما کو توڑ دیا (موسم خزاں ۱۹۱۵ء) تو ملکہ تمام ملکی انتظامی معاملات میں ہمہ گیر اقتدار کی مالک بن گئی۔ ملکہ کی برتری کا مطلب یہ تھا کہ اس کے خاص منظورِ نظر راسپٹن[1] کو ہمہ گیر اقتدار مل گیا۔ وہ ایک اخلاق باختہ طالع آزما تھا۔

ملکہ اور راسپٹن اقتدار کے مالک بنے تو مشتبہ روش کے طالع آزماؤں کی ایک جماعت نے، جو بلیک میل کرنے والوں اور ناجائز فائدہ اٹھانے والوں پر مشتمل تھی، عہدوں کی خرید و فروخت شروع کر دی۔ فوج میں اس کے متعلق سٹے کا بازار گرم ہو گیا اور یہ لوگ اپنے پٹھوؤں کو وزیر بنانے لگے۔ یوں دردناک حالات کا ایک سلسلہ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء میں ملک کے اندر ابتری، افراتفری، ہڑتالیں اور شکست خوردگی بڑھتی گئی۔ جنگی محاذوں پر فوجیں آہستہ آہستہ خون بہا بہا کر ختم ہو رہی تھیں۔ قدامت پسند بھی راسپٹن کی کھلم کھلا مذمت کرنے لگے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں اسے زہر دے کر متعدد مرتبہ گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ آخر ایک برف پوش ندی میں ڈبو دیا گیا۔ یہ سب کچھ ایک شام سازشیوں کے ایک گروہ نے کیا۔ جس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ اگرچہ اعتدال پسندوں نے پارلیمنٹ میں بار بار انتباہات کیے کہ خود حکومت ذمہ دار وزارت نہ بنا کر انقلاب کے سامان پیدا کر رہی ہے اور حالات الجھتے جا رہے ہیں، لیکن زار نے کوئی توجہ نہ کی۔ شاہی خاندان کے رشتہ داروں اور دوما کے ارکان نے بطور خود زار کے لیے تخت سے دستبرداری کی سازشیں شروع کر دیں۔ غرض ۱۹۱۷ء کے ابتدائی مہینوں میں تمام حالات انقلاب کے لیے سازگار ہو چکے تھے، مگر انقلابی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔

مارچ ۱۹۱۷ء کا انقلاب

۸ مارچ کو مرکزِ حکومت میں ہڑتالیں اور روٹی کے متعلق ہنگامے شروع ہو گئے۔ چار روز کے بعد رومانوف خاندان کی حکمرانی پر جو ۱۶۱۳ء سے جاری تھی، تقدیر کی آخری

---

[1] Rasputin

مہر لگ گئی ، لیکن ۱۹۱۷ء کا یہ انقلاب ایسا تھا ، جس کا کوئی لیڈر نہ تھا ۔ یہ کسی کی تحریک سے نہیں ، بلکہ خود بخود پیدا ہوا اور اس کے کارفرماؤں کے نام بھی نہیں بتائے جا سکتے ۔ اشتراکی انقلابی ، نیز سوشل ڈیموکریٹوں میں بالشویک اور منشویک ان واقعات پر بالکل متحیر رہ گئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بالشویک لیڈر اس زمانے میں وطن سے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے یا اسیر ہو کر سائبیریا میں پہنچے ہوئے تھے ۔ زار کا تختہ الٹنے میں سب سے بڑا اور فیصلہ کن عامل یہ تھا کہ پیٹروگراڈ (پیٹرزبرگ کا نیا روسی نام) کی فوج نے بے وفائی سے کام لیا ۔ انتظامی خرابیوں کے باعث مرکز حکومت میں غذائی مقدار بہت کم رہ گئی ، اگرچہ لوگوں کو واقعی بھوک سے سابقہ نہیں پڑا تھا ۔ جب زار نے حکم دیا کہ ہڑتال کرنے والے مزدوروں پر گولی چلائی جائے تو صرف چند افراد نے یہ حکم مانا اور ۱۲ ۔ مارچ کو اس حکم کے خلاف فوج ہڑتالیوں میں شامل ہو گئی ۔ ذخیرۂ اسلحہ کے دروازے توڑ دیے گئے ۔ پولیس کا تعاقب شروع ہو گیا ، جو آناً فاناً منظر عام سے غائب ہو گئی ۔ دوما یعنی روسی پارلیمنٹ حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں باغی فوج اور مزدوروں سے پیچھے رہ گئی ۔ زار اس سلسلے میں دوما کے برابر بھی نہ رہ سکا ۔ ۱۴ ۔ مارچ تک زار نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک ذمہ دار وزارت قائم کر دے ، لیکن اس کا وقت گزر چکا تھا ۔ کابینہ غائب ہو چکی تھی ۔ فوجوں کو بغاوت فرو کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ منتشر ہو گئیں اور خود باغیوں کا ساتھ دینے لگیں ۔

مزدوروں اور سپاہیوں کی ایک سوویٹ بنائی گئی ۔ وہی نمونہ پیش نظر رکھا گیا ، جو ۱۹۰۵ء میں مزدوروں کی سوویٹ بناتے وقت اختیار کیا گیا تھا ۔ فرق صرف یہ ہوا کہ پہلی سوویٹ صرف مزدوروں پر مشتمل تھی ۔ موجودہ سوویٹ میں مزدوروں کے علاوہ سپاہی بھی شامل تھے ۔ اس سوویٹ نے مزدوروں کی ملیشیا بھرتی کرنے کا کام شروع کر دیا ۔ ساتھ ہی غذا کی بہم رسانی کے لیے ایک کمیشن بنا دیا گیا اور اخبارات جاری کر دیے گئے ۔ اس سوویٹ کی ہیئت منتظمہ پندرہ افراد پر مشتمل تھی انھیں لوگوں نے انقلاب کے سلسلے میں پالیسی وضع کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا ۔ اس کا صدر مقام دوما کے پاس ہی تھا ۔ اسے توڑ دینے کا حکم صادر ہو گیا تھا ، مگر اس کا اجلاس بدستور جاری رہا ۔ سوویٹ لیڈروں میں سے جو لوگ کارل مارکس کے پیرو تھے ، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اب بھی پہلے سرمایہ داروں میں انقلاب ہونا چاہیے ، اور وہ سوویٹ کو ہیئت مقتدرہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے ۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ایک عارضی حکومت بن جانی چاہیے ، جس میں وہ خود شامل نہیں ہو سکتے تھے ، لیکن اس حکومت کو محدود امداد دینے کے لیے تیار تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی خدمات دوما کی خدمت میں پیش کر دیں اور اس سے درخواست کی کہ قیادت کا منصب سنبھال لے ، بلکہ محدود رائے دہی سے ایک محدود مجلس منتخب کر دی گئی اور سوویٹ نے اسی مجلس کو انقلاب کی سیادت سونپ دی ۔

سوویٹ اور دوما کی ایک کمیٹی میں گفت و شنید ہوئی اور ایک عارضی حکومت معرض وجود میں آ گئی ۔ اگرچہ سوویٹ اور دوما کے عمرانی اور اقتصادی مقاصد میں وسیع اختلاف تھا ، لیکن دونوں نے سیاسی حقوق فی الفور بحال کر دینے پر

اتفاق کرلیا۔ ایک دستور ساز مجلس بلائی گئی۔ وہی مجلس روس کے لیے دستور تیار کرکے مستقبل کی حکومت کی وضع ہیئت کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ عارضی حکومت زیادہ تر دستوری ڈیموکریٹوں پر مشتمل تھی۔ بعض دوسرے اعتدال پسند گروہ بھی اس میں شامل تھے۔ اس کا رئیس پرنس لووف[1] تھا، جو مقامی مجالس کی یونین، نیز صلیب احمر کا صدر تھا۔ اس میں سوویٹ کا صرف ایک انتہا پسند ممبر شامل تھا، یعنی الگزانڈر کیرنسکی[2] وزیر عدلیہ، جو مزدوروں کا ایک قابل وکیل اور دوما کا رکن تھا۔ اس نے عہدہ قبول کرلیا۔ اگرچہ قرارداد یہ تھی کہ سوویٹ کا کوئی رکن عہدہ قبول نہ کرے گا۔

خاندانی حکومت کو بچانے کی ناکام کوششیں کی گئیں، مثلاً زار کے بھائی کو تخت پر بٹھا دینے کا فیصلہ ہوا۔ آخر زار نکولس تاج و تخت سے دست بردار ہوگیا۔ اس کے بھائی نے بدیں وجہ تاج و تخت قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ عام لوگوں میں شاہی خاندان کے خلاف سخت نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ سوویٹ کے دباؤ کے ماتحت عارضی حکومت نے زار نکولس دوم اور زارینہ کو گرفتار کرلیا (۲۰۔ مارچ ۱۹۱۷ء)۔ یوں دوما نے انقلابیوں کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اگر دوما زار کے فرمان کے مطابق منتشر ہو جاتی اور تمام ارکان گھروں میں جا بیٹھتے تو اغلب تھا کہ شہنشاہی کو بعض وسیع مراعات دے کر محفوظ رکھا جا سکتا، لیکن اب اعتدال پسند مصلحین اقتدار کے حامل بنے ہوئے تھے اور مارچ سے اکتوبر ۱۹۱۷ء تک روس کے لیے تکالیف و مصائب کا دور شروع ہوگیا۔

عارضی حکومت

عارضی حکومت کو عموماً بالکل ناکام سمجھا جاتا ہے۔ اگر آخری نتائج پیش نظر رکھے جائیں۔ تو یہ نظریہ غالباً حق بجانب معلوم ہوتا ہے، مگر تاریخ کی طرف سے فیصلے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ وہ خوفناک مشکلات بھی سامنے رکھی جائیں، جن سے عارضی حکومت دوچار تھی۔ یہ مشکلات وقتی اور مخصوص نہ تھیں، بلکہ عام اور دیرینہ تھیں۔ روسی اعتدال پسندوں کو اختیار و اقتدار کے استعمال کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اُن کے اور طبقۂ زیریں کے درمیان ایک وسیع ثقافتی خلیج حائل تھی۔ انھیں حکمرانی کا موقع اس وقت ملا، جب ایک خوفناک جنگ چھڑی ہوئی تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ایک طرف ہمیں جنگ جاری رکھنی چاہیے، دوسری طرف وسیع اور بے نظم روسی سلطنت کی از سر نو تنظیم جمہوری اصول پر کرنی چاہیے۔

مزید براں سوویٹ کے قبضے میں قوت کے بہت سے حربے موجود تھے، لیکن وہ کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ مرکز حکومت کے مزدور اور سپاہی سوویٹ کے حامی تھے۔ عارضی حکومت نے صوبوں کے جو نئے گورنر مقرر کیے تھے، ان کے لیے مقامی کسانوں کی چنی ہوئی مجلسوں کے سلسلے میں افہام و تفہیم سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ جو لوگ آج عارضی حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ عموماً اس امر کی مذمت کرتے رہتے ہیں کہ وہ انقلابی مخالفوں کو دبانے میں ناکام

---

[1] Lvov   [2] Kerensky

رہی، مگر وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ عارضی حکومت کے قبضے میں دباؤ کے وسائل نہ تھے۔ مثلاً پیٹرو گراڈ کی فوج سوویٹ سے معاملات طے کر لینے کے بعد نہ موقوف کی جا سکتی تھی اور نہ اس سے ہتھیار لیے جا سکتے تھے۔ سوویٹ نے عارضی حکومت کو جو امداد دی، اسے ویسی ہی امداد قرار دیا جاتا ہے۔ جیسی جلّاد پھانسی دیئے جانے والے آدمی کے گلے میں پھندا ڈال کر دیتا ہے۔

عارضی حکومت کے سامنے دو بڑے خاص مسئلے تھے، اوّل جنگ کا اجرا، دوم زرعی بے چینی کا ازالہ۔ کسان زمین کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ کسی تاخیر کے روادار نہ تھے۔ عارضی حکومت ذمہ دار لبرلوں پر مشتمل تھی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور کوئی بات قانون کے خلاف نہ ہونی چاہیے۔ سوویٹ نے اس اثنا میں ان فوجوں کا نظم درہم برہم کر ڈالا، جو جنگی محاذوں پر لڑ رہی تھیں، یعنی اعلان کر دیا کہ سپاہیوں کے حقوق محفوظ ہونے چاہئیں۔ ساتھ ہی سپاہیوں پر افسروں کا اقتدار عملاً ختم ہو گیا۔ اگرچہ سوویٹ نے عارضی حکومت کے لیے جنگ جاری رکھنا زیادہ سے زیادہ مشکل بنا دیا، لیکن وہ جداگانہ صلح کی حامی نہ تھی۔ سوویٹ کے بالشویک ارکان بھی، جو جلاوطنی سے واپس آنے شروع ہو گئے تھے، صرف اس امر کے حامی تھے کہ روس صلح عام کی گفت و شنید میں شریک ہو۔ انھیں امید تھی کہ گفت و شنید فوراً شروع ہو جائے گی۔

چھپنواں باب ۵۶

لینن اور بالشوزم

لینن

جلاوطنی سے جو بالشویک واپس آئے، ان میں سے اہم ترین لینن تھا۔ اس کا اصل نام ولاڈی میر ایلیچ الیانوف[1] تھا، لیکن وہ اپنی تحریرات میں قلمی نام لینن استعمال کرتا تھا اور بعض اوقات لینن سے پیشتر حرف این (ن) لگا دیتا، جو روسی زبان میں گمنام کا مخفف ہے۔ اس طرح وہ خوانندگان مضامین پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ فرضی نام استعمال کر رہا ہے۔ اس حرف این (ن) سے غلط فہمی پیدا ہوئی، جو اب تک وسیع حلقے میں پھیلی ہوئی ہے یعنی سمجھا جاتا ہے کہ لینن کے نام کا پہلا حصہ نکولائی (نکولس) تھا۔ وہ ایک صوبائی افسر کا بیٹا تھا اور انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں انقلابی بنا۔ سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے ابتدائی دور میں اس نے سب سے بڑا کردار ادا کیا، کیونکہ وہ پارٹی کے بالشویک بازو (اکثریت والے بازو) کا لیڈر تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے لیے باہر سے روس واپس آیا تھا، مگر ۱۹۰۸ء میں پھر جلاوطنی پر مجبور ہو گیا اور ۱۹۱۷ء تک باہر ہی رہا۔

جب سے مارچ کے انقلاب کی خبریں سوئٹزرلینڈ میں پہنچیں تو اس نے وطن واپس جانے کے لیے انتہائی کوششیں شروع کر دیں۔ آخر سوئٹزرلینڈ کے سوشل ڈیموکریٹوں کے ذریعے سے جرمنی کے فوجی کارفرماؤں کے ساتھ ربط ضبط پیدا کیا۔ انھیں احساس تھا کہ اگر لینن روس پہنچ جائے گا تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، کیونکہ وہ جرمنی کے خلاف روس کی جنگی کوششوں میں انتشار پیدا کر دے گا۔ اس مصلحت کے پیش نظر جرمن فوجیوں نے لینن کو ریل کے ایک بند ڈبے میں سوئٹزرلینڈ سے جرمنی کے راستے بالٹک کے صوبوں میں پہنچا دیا۔ وہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو یعنی انقلاب مارچ سے تقریباً ایک مہینہ بعد پیٹروگراڈ میں فنلینڈ نام سٹیشن پر اترا۔

بہت سے روسی سوشل ڈیموکریٹ عرصے سے سمجھے بیٹھے تھے کہ اشتراکی انقلاب اور اشتراکی معاشرے کے قیام سے پیشتر سرمایہ داروں کی پارلیمانی جمہوریت کا قیام ضروری ہے۔ اسی لیے وہ روس کے اندر ایک سرمایہ دار معاشرے

---

[1] Vladimir Ilyich Ulianov

کی تشکیل کے لیے امداد دینے پر آمادہ ہو گئے تھے، اگرچہ اُن کے دل میں سخت شبہات تھے کہ شاید سرمایہ داروں کی حکومت بھی ویسی ہی بُری ہو جیسی زاروں اور بڑے مالکانِ اراضی کی حکومت تھی یا ممکن ہے، عوام کو فریب دے کر نئے نظام کے قبول پر راضی کر لیا جائے۔ بہر حال وہ ایک جمہوریت کے قیام کے حامی تھے، جو رائے عامہ پر مبنی ہو، ساتھ ہی سمجھتے تھے کہ اپنے آئندہ اقتدار کے لیے کامل سیاسی آزادی بہر حال ناگزیر ہے۔ مارکس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ صنعتی مزدوروں ہی کا طبقہ انقلاب کا مناسب وسیلہ ہے، مگر لینن کو شروع ہی میں یقین ہو گیا تھا کہ روس میں پرولتار یا آبادی کا صرف ایک حصہ ہیں، لہٰذا سوشلسٹوں کو دوسرے حریف تیار کرنے چاہییں۔ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے وقت اس نے یہ تلقین شروع کر دی تھی کہ بالشویکوں اور اشتراکی انقلابیوں کے درمیان محدود اتحاد ہو جانا چاہیے اور حسنِ تدبیر کا تقاضا یہی ہے۔ اشتراکی انقلابیوں ہی کو کسانوں کی پوری امداد حاصل تھی۔ ساتھ ہی اس کا فیصلہ یہ تھا کہ جب اصل مقصد پورا ہو جائے تو سوشل ڈیموکریٹوں کا فرض ہو گا کہ اپنے حلیفوں پر یورش کر دیں اور انھیں تباہ کر ڈالیں۔ اس طرح اشتراکیت کامیابی کی منزل پر پہنچ گئی۔

ایک فرد کی ڈکٹیٹری

لینن نے ۱۹۰۵ء میں رائے عامہ پر مبنی ایک سرمایہ دارانہ جمہوریت کی دعوت دی۔ کسانوں اور پرولتاریوں کی ایک انقلابی ڈیموکریٹک ڈکٹیٹری فوراً قائم کر دینی چاہیے۔ آگے چل کر کہا کہ یہ تصور ہمیں متناقض معلوم ہوتا ہے، یقیناً اس کے مبہم ہونے میں کلام نہیں، لیکن اکثر بالشویکوں نے لینن کا یہ نظریہ اختیار نہ کیا۔ اپنے مینشویک (اقلیت والے) ساتھیوں کی طرح بالشویکوں کا عقیدہ یہی تھا کہ سرمایہ داروں کے انقلاب اور پارلیمانی جمہوریت کے بغیر اصل انقلاب کے ابتدائی مراحل طے نہیں ہو سکتے۔

مگر لینن کو یقین تھا کہ عوام انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ (اس کا احساس یہ تھا کہ عوام میں صرف ٹریڈ یونینوں کا سا احساس پیدا کیا جا سکتا ہے)، چنانچہ وہ بالشویک پارٹی کی ڈکٹیٹری مزدوروں پر قائم کر دینے کا حامی تھا۔ چونکہ وہ بالشویک پارٹی کے عام مزدوروں پر اعتماد کا قائل نہ تھا، لہٰذا وہ پارٹی کے اندر ایک چھوٹے سے منتخب گروہ کی ڈکٹیٹری چاہتا تھا۔ ادھر وہ اپنے آرا کے سوا کسی دوسرے شخص کے آرا کو شایانِ اعتماد قرار نہیں دیتا تھا، لہٰذا اس کی خواہش یہ تھی کہ یہ منتخب گروہ خود اس کی ڈکٹیٹری قبول کرے، اگرچہ اس نے واضح طور پر اس خواہش کا اظہار کبھی نہ کیا۔ مستقبل کے ایک اور روسی لیڈر (لیون ٹروٹسکی)[1] نے، جو درخشاں علمی جوہروں کا حامل تھا، ابتدا ہی میں سب کو متنبہ کر دیا تھا کہ لینن کی رائے کے مطابق ایک فرد کی ڈکٹیٹری ضروری ہے۔

ٹروٹسکی کی طرف سے حمایت

ٹروٹسکی نے اپنی رائے ظاہر کر دی، لیکن یہ نہ مینشویکوں کی رائے تھی، نہ بالشویکوں کی۔ وہ کہتا تھا، روس میں بورژوا اتنے کمزور ہیں کہ انھیں اور اشتراکی انقلابیوں کو مزدور

[1] Leon Trotsky

ایک تحریک کے اجزا قرار دے سکتے ہیں۔ اس کا احساس تھا اگر پرولتاریا انقلاب میں بورژوا کو مدد دیں گے تو مزدور فوراً قوت واقتدار حاصل کریں گے۔ ساتھ ہی صنعت وحرفت قومی بنالی جائے گی۔ زراعت اجتماعی طریق پر شروع ہو جائے گی۔ اگرچہ خانہ جنگی کا بھی اندیشہ ہوگا اور بیرونی مداخلت کا بھی، تاہم روسی پرولتاریا کے ساتھ دوسرے ملکوں کے پرولتاریا شامل ہو جائیں گے اور دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح انقلاب بپا ہو جائیں گے۔ ٹروٹسکی نے تجزیہ کر کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ کہا، آخری نکتے کے سوا حالات کی رفتار نے اسے بالکل درست ثابت کر دیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک خود لینن وقتاً فوقتاً ٹروٹسکی کی رائے مانتا رہا، ساتھ ہی انتباہ کرتا رہا کہ اس طرح سیاسی جمہوریت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

غرض ہر لیڈر ایسے نظریات پیش کر رہا تھا، جن سے دوسروں کو ڈکٹیٹری کی بو آتی تھی اور ہر فرد کا احساس یہ تھا کہ خود اس کے آرا زیادہ جمہوری ہیں۔ دراصل ہر فرد متنبہ کرنے میں حق بجانب تھا۔ ۱۹۱۷ء میں ٹروٹسکی نے پارٹی کی تنظیم کے سلسلے میں لینن کی رائے قبول کر لی، جس میں ڈکٹیٹری مضمر تھی۔ لینن نے ٹروٹسکی کا یہ عقیدہ قبول کر لیا کہ پرولتاریا ہر جگہ فی الفور قوت حاصل کر لے گا اور ایک اقلیت ڈکٹیٹری کے اختیارات کی مالک بن جائے گی۔

سٹولی پن سے خطرہ

لینن ۱۹۰۵ء کی ناکامی سے سخت مایوس ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس لیے مایوس ہوا کہ سٹولی پن میں زرعی اصلاحات شروع کر دی تھیں اور ان سے خود انقلاب کو خطرہ درپیش تھا۔ ۱۹۱۴ء میں یورپ کی انقلابی جماعتوں نے حکومت کا ساتھ دیا اور جنگ کی تائید کی تو لینن پر انتہائی مایوسی طاری ہوئی۔ اس کے نزدیک یہ اس امر کی دلیل تھی کہ دوسری اشتراکی بین الاقوامی انجمن ختم ہو گئی اور سوشل ڈیموکریٹ جنگ کو بورژوا اور سامراجی ماننے میں ناکام رہے، حالانکہ لینن کو یہ ایسی ہی نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس نے صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ روسی سوشل ڈیموکریٹوں کے لیے اعتراف شکست کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ لینن کی سب سے بڑی صلاحیت یہ نہ تھی کہ وہ کسی جدید فکر ونظر کا حامل تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک ہنرور مدبر تھا۔ ایک خاص موقع اور محل میں سیاسی اعتبار سے جو کچھ ممکن ہوتا، اس کا اندازہ ٹھیک ٹھیک کر لیتا، اس کے بعد قمار بازی سے کبھی نہ کتراتا چنانچہ اپریل ۱۹۱۷ء میں واپس پہنچنے سے پیشتر ہی بعض مشکلات کا جائزہ لے لیا تھا، جو عارضی حکومت کو درپیش تھیں۔ اور دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ عوام پورے معاملات پر قابو پا سکتے ہیں۔ روس پہنچتے ہی اس نے عالمی انقلاب کا خیر مقدم کیا! اعلان کر دیا کہ سامراج، جو سرمایہ داری کا آخری مرحلہ تھا، ختم ہونے کے قریب ہے۔ بالشویک اور منشویک جو کچھ پہلے کہہ چکے تھے، اسے نظر انداز کرتے ہوئے لینن نے مطالبہ کیا کہ تمام اختیارات فوراً سوویٹوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس کی تقریریں سوشل ڈیموکریٹوں کو دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی تھیں۔

اپریل ۱۹۱۷ء کا مطالبہ

لینن کے سوا کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ سوویٹیں، جن کی تنظیم خاصی ڈھیلی ڈھالی

تھی، ملکی حکومت کا کاروبار چلا سکتی ہیں۔ یا جنگ خود سرمایہ داروں کی دنیا کو افراتفری کی منزل میں پہنچا دے گی۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں لینن نے مطالبہ کیا کہ عارضی حکومت ختم کر دی جائے، سوویٹوں کی جمہوریت قائم ہو جائے، بلکہ یہ بھی کہا کہ تمام جاگیریں ضبط کر لی جائیں۔ زمین کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ فوج، سرکاری افسروں اور پولیس کو موقوف کر دیا جائے۔ یہ مطالبے عوام کی وقتی طبیعت کے عین مطابق تھے۔ عارضی حکومت احتیاط اور حسن نیت سے قانون کے مطابق جو اصلاحات کرنا چاہتی تھی، انھیں کوئی نظر اٹھا کر دیکھنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ لینن ادعا و تحکم سے کام لے کر ہر مفاہمت کے خلاف آگ اگل رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ حقیقت وہی ہے، جو وہ پیش کر رہا ہے۔ اس طرح اس نے بالشویکوں میں جوش و حمیت کی روح بھر دی اور انھیں حقیقتاً ایک انقلابی جماعت بنا دیا، جو اختیارات پر قابض ہونے کے لیے صرف موقع کی منتظر تھی۔

نومبر کا انقلاب نومبر میں بالشویک برسر اقتدار آ گئے۔ مارچ سے نومبر ۱۹۱۷ء تک کی مدت کو مختلف دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مارچ اور جولائی کا درمیانی دور، جس میں انقلاب کی جڑیں مستحکم ہوئیں۔ جولائی سے ستمبر تک کا دور، جسے کمزور ردِّ عمل کا دور کہنا چاہیے۔ پھر ستمبر سے نومبر کے ہنگامے تک انقلابی لہروں کا نیا تموج و تلاطم۔ پہلے دور میں حکومت ایک بحران سے دوچار رہی، کیونکہ وزیر چاہتے تھے، روسیوں کے جنگی مقاصد میں آبناؤں کا الحاق بھی شامل رکھا جائے اور سوویٹ کی خواہش یہ تھی کہ صلح الحاق و تاوان کے بغیر کی جائے۔ اس بحرانی دور میں کیرنسکی، ایک با اقتدار لیڈر بن گیا، وہی وزیر جنگ تھا۔ وہ اس حقیقت کا اندازہ نہ کر سکا کہ فوجوں کی حوصلہ مندی بحال رکھنا ممکن نہیں رہا، سپاہی بالشویکوں کے پروپیگنڈے کے زیر اثر منتشر ہو رہے تھے۔ یکم جولائی کو ایک نئے جارحانہ اقدام کا حکم دیا گیا تھا، وہ ناکام رہا، کیونکہ سپاہیوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ منتشر ہو گئے اور جلد سے جلد اپنے اپنے دیہات میں پہنچے، تاکہ زمینوں پر قبضہ کر لیں۔ یوکرین والے علیحدگی کے خواہاں تھے۔ اس وجہ سے بھی سرکاری افسروں کو بڑی مشکلات پیش آئیں۔ بعض امور پر ٹراٹسکی نے اس دور میں بھرتی اور تنظیم کے لیے بے پناہ محنت کی اور سوویٹوں میں تدریجاً بالشویکوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جون ۱۹۱۷ء میں سوویٹوں کی ایک کانگرس پیٹرو گراڈ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں بالشویک دس فی صد سے بھی کم تھے، لیکن جب بالشویکوں نے صلح، روٹی اور آزادی کے نعرے لگائے تو ان کے حامی ہر جگہ سب پر غالب آ گئے۔

عارضی حکومت جن فوجوں نے بالشویکوں کے نعرے قبول کر لیے تھے، ان کی مسلح بغاوت بھی پیٹرو گراڈ کی سوویٹ کو حصول اقتدار پر راضی نہ کر سکی اور اس نے اقتدار حاصل نہ کیا۔ عوام شور مچا رہے تھے۔ سوویٹ نے دو ہفتے بعد اس مسئلے پر بحث شروع کی اور قرار پایا کہ اس اثنا میں عارضی حکومت قائم رکھی جائے۔ ایک رجمنٹ، جو سوویٹ کی وفادار تھی، مزدوروں کے خلاف اس کی حفاظت کرتی رہی۔ حکومت نے اعلان کر دیا کہ لینن جرمنوں کا کارندہ

ہے۔ اس کے حامی متذبذب ہو گئے اور اس کے اخبار پراودا[۱] (حق) کے دفتر پر چھاپہ مارا گیا۔ لینن کو گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہونا پڑا۔ یہ وسط جولائی کا واقعہ ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے خلاف گولیاں بھی چلیں اور کھلم کھلا اقدامات بھی ہوئے، لیکن انقلابی طور طریقوں کی پابندی نہ کی گئی۔ اختیارات پر اس لیے قبضہ نہ کیا گیا کہ لینن کا احساس تھا، صوبوں میں بالشویکوں کو پوری حمایت حاصل نہیں۔

کیرنسکی اور کارنیلاف

اب کیرنسکی وزیر اعظم بن گیا۔ حکومت نے اہل یوکرین کے متعلق سخت روش اختیار کر لی لیکن وہ زمین یا صلح کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ نہ کر سکی، جو عوام کے لیے باعثِ اطمینان ہوتا۔ کیرنسکی نے جنرل کارنیلاف[۲] کو فوجوں کا کمانڈر اعظم بنا دیا۔ وہی تمام قدامت پسندوں کی امید گاہ بن گیا۔ اگست میں اس نے ایک زبردست اقدام کا فیصلہ کیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ سوویٹ کو ختم کر دیا جائے۔ عارضی حکومت کے متعلق کارنیلاف کی روش غیر یقینی تھی، لیکن اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو غالباً زیادہ انتہا پسند عناصر کو حکومت سے نکال باہر کرتا۔ اقدام ناکام رہا۔ کیونکہ ریلوں اور تار برقی کے مزدوروں نے کارنیلاف کی نقل و حرکت میں خلل ڈال دیا اور فوجوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بالشویکوں نے یہ نعرہ اختیار کر لیا: "ہم کارنیلاف کے خلاف لڑیں گے، لیکن کیرنسکی کی حمایت نہیں کریں گے"، ساتھ ہی وہ پیٹرو گراڈ کی حفاظت کے لیے تیاریوں میں مصروف ہو گئے، حالانکہ یہ چیز غیر ضروری ثابت ہوئی۔ ۱۴ ستمبر تک کارنیلاف گرفتار ہو گیا اور پورا معاملہ خونریزی کے بغیر ہی اختتام کو پہنچ گیا۔ دائیں بازو کی طرف سے خطرے نے بالشویکوں کو بڑی امداد پہنچائی۔ اب پہلی مرتبہ پیٹرو گراڈ اور ماسکو کی سوویٹوں میں بھی بالشویکوں کے آراد و مقاصد کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

کارنیلاف کے واقعے نے فوج میں ہمہ گیر بغاوت پیدا کر دی۔ اب تشدد کے واقعات بہ کثرت پیش آنے لگے۔ کسانوں نے زمینوں کا لگان دینے سے انکار کر دیا۔ اپنے جانور مالکانِ اراضی کے مرغزاروں میں چرانے لگے اور اکثر مالکوں کے بنگلوں کو آگ لگا دیتے اور مالکوں کو مار ڈالتے۔ اسی طرح سپاہیوں نے نافرمانی کے بعد افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ منظم اور قانونی اصلاحات سے کوئی متاثر نہ ہوا تھا۔ کسانوں کو یہ سمجھایا نہیں جا سکتا تھا کہ امراء کے پاس جو زمینیں ہیں، وہ کسانوں کی زمینوں کے مقابلے میں ایک ربع سے کسی قدر زیادہ ہیں، اور اگر افراتفری سے کام رک گیا تو ترقی رک جائے گی۔ مضافات میں بدامنی تیز ہوتی گئی اور بالشویک شہری سوویٹوں پر گرفت مضبوط کرتے گئے۔

بغاوت

لینن ۲۰ اکتوبر کو پھر پیٹرو گراڈ پہنچ گیا۔ اس کے بعد جلد ہی بالشویکوں کو ایک فوجی انقلابی کمیٹی پر اقتدار حاصل ہو گیا، جو ابتدا میں جرمنوں سے پیٹرو گراڈ کو بچانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس وقت جرمن بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اب اس کمیٹی کو ٹروٹسکی کی رہنمائی میں نئے سرے سے منظم کر دیا گیا تھا اور وہ انقلابی سپاہ پر کارفرما کی حیثیت میں مسلط کر دی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے اپنے نائب مرکزِ حکومت کے تمام فوجی دستوں میں بھیج دیئے۔

---

[۱] Pravda

[۲] Kornilov

اور انھوں نے عارضی حکومت کے مقررہ افسروں کی جگہ لے لی۔ ساتھ ہی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ انقلابی نظم کی حفاظت کریں اور حکومت کے جوابی انقلاب کو روکیں۔ نیز اعلان کر دیا کہ وہی احکام صحیح اور بجا سمجھے جائیں گے، جن پر اربابِ اختیار کے دستخط ثبت کیے جائیں گے۔ ۶ نومبر سے عظیم الشان مظاہروں اور بڑے بڑے جلسہ ہائے عام میں ٹروٹسکی نے تقریریں شروع کر دیں۔ ۷ نومبر کو بغاوت شروع ہو گئی۔

پیٹرو گراڈ

پیٹرو گراڈ میں انقلاب کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ وہاں بہت کم خونریزی ہوئی۔ کیرنسکی ایک موٹر میں بیٹھ کر امریکی سفارت خانے کے اندر پہنچ گیا۔ فوجی انقلابی کمیٹی نے پیٹرو گراڈ سوویٹ کی کارندہ بن کر تمام اختیارات سنبھال لیے۔ بالشویکوں نے سوویٹوں کی دوسری کانگرس کا اجلاس بلا لیا۔ مینشویک اور دائیں بازو کے اشتراکی انقلابی اجلاس سے باہر نکل گئے۔ ٹروٹسکی نے کہا کہ یہ وہ گندہ مواد ہے، جسے تاریخ کے غلیظ گڑھے میں بہا دیا جائے گا۔ بائیں بازو کے اشتراکی انقلابیوں سے تعاون کرتے ہوئے زمین کے متعلق ان کا پروگرام اختیار کر لیا گیا۔ لینن نے مالکانِ اراضی کے تمام حقوقِ ملکیت ختم کر دیئے۔ اس طرح جو زمین حاصل ہوئی، وہ زمین کے متعلق مقامی کمیٹیوں اور کسان مندوبین کے سوویٹوں کے سپرد کر دی گئی۔ اگرچہ لینن کو چھوٹی چھوٹی انفرادی ملکیتوں کا نظام پسند نہ تھا، جو اس کے احکام کی بدولت نافذ ہُوا، لیکن وہ اس نفسیاتی فائدے کا صحیح اندازہ نہ کر سکا تھا جو اشتراکی انقلابیوں کا پروگرام اختیار کر کے اسے حاصل ہو سکتا تھا۔ اُس نے اصرار کیا کہ صلح فوراً کر لی جائے۔ نہ کسی علاقے کا الحاق عمل میں آئے اور نہ کسی سے کوئی تاوان لیا جائے۔ جرمنی، فرانس اور انگلستان کے مزدوروں سے اس نے اپیل کی کہ اس مطالبے کی تائید کی جائے۔ آخر ایک کابینہ منتخب کر لی گئی، جس کا نام "عوامی ناظروں کی مجلس[1]" رکھا گیا۔ لینن صدر منتخب ہوا، ٹروٹسکی کو وزیرِ خارجہ بنا دیا گیا۔

جوزف سٹالن

بالشویکوں نے ایک نوجوان گرجستانی کو، جس کا نام جوزف سٹالن[2] تھا، قومیتوں کا ناظر مقرر کیا۔ وہ کسی زمانے میں بینکوں پر کامیاب ڈاکے مار مار کر شہرت حاصل کر چکا تھا اور اسی کی بدولت پارٹی کے خزانے میں روپیہ آتا تھا، لیکن اس نے اور کوئی خاص کام انجام نہیں دیا تھا۔ لینن کے زیرِ تربیت سٹالن بھی اقلیتوں کے مسئلے پر ایک سند بن گیا تھا۔ اس نے اس موضوع پر ۱۹۱۳ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ لینن نے اس موضوع پر آسٹر دی سوشل ڈیموکریٹوں کی تحریرات کا مطالعہ کیا تھا اور وہ انھیں پسند نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہ لوگ اقلیتوں کو صرف ثقافتی آزادی دینا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس لینن یہ چاہتا تھا کہ روسی سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے اور وہ ہر قوم کو اس کے دائرے میں علیحدگی کا حق نیز اقتصادی خود مختاری دے دینا چاہتا تھا۔ عجیب امر یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء کے بعد ہیپسبرگ سلطنت کی قوموں

---

[1] Council of Peoples' Commissars

[2] Joseph Stalin

سے علیحدگی کا حق حاصل کر لیا اور روسی سلطنت کی قوموں کے لیے سٹالن نے صرف ثقافتی خود مختاری کا آسٹرو ی اصول استعمال کیا اور سیاسی اعتبار سے انھیں مرکزی حکومت کے تابع رکھا۔

نئی حکومت کا اقتدار پیٹروگراڈ سے باہر انقلاب کی رفتار سست رہی۔ ماسکو کے بازاروں میں ایک ہفتے تک بالشویکوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان جنگ ہوتی رہی۔ دوسرے مقامات پر جہاں جہاں کارخانے قائم تھے، معاملہ تیزی سے سرانجام پا گیا اور غیر صنعتی مرکزوں میں عموماً تاخیر ہوئی۔ سائبیریا کا بڑا حصہ اور وسطی ایشیا مرکز سے مل گئے، لیکن تفلس، جو گرجستان کا دارالحکومت تھا، مینشویکوں کے قبضے میں چلا گیا اور وہاں دستور ساز مجلس بلائی گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ جنگ جاری رہے گی۔ بالشویکوں کو تیزی اور آسانی سے کامیابی حاصل ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ صوبائی فوجیں جنگ کے خلاف تھیں اور وہ خوشی خوشی مزدوروں کی ہمنوا بن گئیں۔ مقامی انقلابی فوجی کمیٹیوں کے مرکز جابجا قائم کر دیے گئے اور وہاں نئی مقامی سوویٹوں کے لیے انتخاب عمل میں آئے۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ابتدا میں افراتفری پھیلی، مگر بہت جلد معمولی مزاحمت ختم ہو گئی اور نئی حکومت کا اقتدار ہر مقام پر قائم ہو گیا۔ مخالفت کے بڑے مرکزوں میں سے ایک موہیلیف[1] تھا، جو ماسکو کے مغرب میں واقع تھا، وہاں فوج کا کافی حصہ مقیم تھا۔ دوسرا مقام کیف[2] تھا، جو مغربی یوکرین میں واقع تھا۔ علیحدگی پسند یوکرینیوں نے وہاں اپنی جمہوریت قائم کر لی تھی۔ تیسرا مرکز ڈان کے کاسکوں کا علاقہ تھا۔ بعض اور مقام بھی تھے۔ رفتہ رفتہ راستوف[3] (جو دریائے ڈان پر تھا نزد بحیرۂ ایزوف[4] یعنی کریمیا) مزاحمت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ کارنیلاف اور دوسرے جرنیل دوما کے ممتاز مدبروں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

انقلاب میں ابتدائی کامیابی کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ روس کی آبادی بالشوزم کی قائل ہو گئی تھی۔ عوام کے ذہن و فکر کا مبصرانہ اندازہ کرتے ہوئے لینن نے بالشویکوں کے لیے ایسے نعرے تجویز کر دیے تھے، جو عوام کو ساتھ ملانے کے لیے بہت موزوں تھے، اگرچہ ان میں سے بعض نعرے خود بالشویکوں کے حقیقی نظریات کے مطابق نہ تھے۔ آگے چل کر خود معلوم ہو جائے گا کہ روسی عوام بالشویکوں کے سخت خلاف تھے، مگر بالشویک کامیاب ہو چکے تھے۔ اب اخباروں کی آزادی اور اسی قسم کے دوسرے حقوق کے متعلق جمہوری امیدوں کے لیے مایوسی مقدر ہو چکی تھی۔ انتظامی محکمے کے قابل کارکن ناپید تھے۔ نئی حکومت کو مسلسل بحرانی فضا میں مدت تک تشویش کا شکار ہونا پڑا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں بائیں بازو کے اشتراکی انقلابیوں سے ایک سمجھوتا ہو گیا اور ان میں سے تین نمائندے حکومت میں شامل کر لیے گئے۔ جرمنوں کے ساتھ صلح کے لیے گفت و شنید

---

[1] Mogilev　　[2] Kiev

[3] Rostov

[4] Azov　اس کا اصل نام بحیرۂ کریمیا تھا۔

شروع ہوگئی۔ انقلاب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ لینن برسراقتدار آگیا تھا۔

پروگرام کا خاکہ

اس کے پروگرام کا خاکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کر دیا گیا ہے:

"فوری مدعا یہ تھا کہ سوویٹ جمہوریت قائم کر دی جائے، جو پرولتاریا اور کسانوں کے غریب طبقے پر مبنی ہو۔ پولیس، فوج اور نوکر شاہی کو منسوخ کر دیا جائے۔ اقتصادی دائرے میں لینن کے اصول کا تقاضا یہ تھا کہ مختلف فرموں کے انتظامی عملوں کی جگہ صنعتی کارکنوں کا ایک مرکزیت مآب نظام ضبط و نظم قائم کر دیا جائے۔ تنخواہوں میں اتنی تخفیف ہو جائے کہ نامساوات کا احساس برائے نام رہ جائے۔ یہ کامل مساوات کی طرف پہلا قدم تھا۔ زراعت کے سلسلے میں لینن کی تجویز یہ تھی کہ بڑی بڑی جاگیروں میں مشترکہ کھیتی باڑی کا انتظام کر دیا جائے۔ باقی زمینوں کی تقسیم کا معاملہ مقامی آبادی پر چھوڑ دیا جائے۔ ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ جس حد تک ممکن ہو، روس کی زرعی زمینوں میں چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کا سلسلہ جاری نہ ہونے پائے۔ بین الاقوامی دائرے میں اسے امید تھی کہ روس میں انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی پورے یورپ میں اشتراکی انقلاب کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی پرولتاریا روس کے مصیبت زدہ کارکنوں کی امداد کے لیے میدان میں آجائے گا۔ ان میں سے تقریباً ہر امید اور ہر توقع کو مایوسی سے سابقہ پڑا۔" [۱]

دستور ساز مجلس

یہ امر دلچسپی کا موجب ہونا چاہیے کہ اب بالشویکوں نے دستور ساز مجلس کے لیے انتخابات کی اجازت دے دی۔ لینن کے نزدیک جمہوری ووٹوں سے چنی ہوئی پارلیمنٹ کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اسے وہ سوویٹ سے فروتر سمجھتا تھا، لیکن اسے غالباً انتخابات کرانے کے لیے مجبور ہونا پڑا، کیونکہ وہ اس معاملے میں عارضی حکومت کو بار بار ہدف تعریض بنا چکا تھا۔ چنانچہ روسیوں کو پہلی اور آخری مرتبہ بالغوں کے حق رائے کے تحت کامل آزادی کے ساتھ انتخاب کا موقع ملا۔ بالشویکوں کو اس انتخاب میں تقریباً ایک چوتھائی ووٹ ملے۔ لینن نے بھی ان اعداد کو درست قرار دیا۔ دوسری اشتراکی جماعتوں نے کوئی باسٹھ فی صد ووٹ حاصل کیے۔ ان میں سب سے بڑی جماعت اشتراکی انقلابیوں کی تھی۔ جیسا کہ امید تھی، بالشویکوں کو زیادہ سے زیادہ ووٹ شہروں، خصوصاً ماسکو اور پیٹروگراڈ میں ملے۔ اشتراکی انقلابیوں کے زیادہ ووٹ دیہاتی حلقوں کے تھے۔

---

[۱] Barington Moore Junior کی کتاب سوویٹ پالیٹکس (Soviet Polities) صفحہ ۵۷-۵۸

اکثریت سے اعراض

لینن نے مخالفوں کے ووٹوں کی اکثریت سے اعراض کر لیا اور وہ اس پہلو پر اصرار کرتا رہا کہ زیادہ ترقی یافتہ عناصر کے ووٹ اسے ملے ہیں۔ یہ محض اس کی رائے تھی کہ جن لوگوں نے بالشویکوں کو دوسری جماعتوں کے مقابلے میں ووٹ دیئے، وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اس نے دستور ساز مجلس کو صرف ایک اجلاس منعقد کرنے کی اجازت دی تھی ۱۸/ جنوری ۱۹۱۸ء کو۔ اگلے روز اس نے ایک حکم خاص کے ذریعے سے مجلس موقوف کر دی اور مسلح دستے بھیج دیئے تاکہ دوبارہ اجلاس منعقد نہ ہو سکے۔ اس پر بالشویکوں کی مخالف اکثریت کو سخت غصہ آیا، کیونکہ لینن کا یہ فعل رائے عامہ کے خلاف صریح جبر تھا، لیکن اس پر عوام میں کوئی ہنگامہ پیدا نہ ہوا، لہٰذا مجلس کے نمائندے خودبخود منتشر ہو گئے۔ عوام کے خاموش رہنے کی جزوی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھیں جن معاملات سے دلچسپی تھی، یعنی صلح اور زمین، ان کے متعلق بالشویک فیصلے صادر کر چکے تھے۔ جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ روسی عوام میں کوئی جمہوری پارلیمانی روایت موجود نہ تھی۔

اگرچہ اہلِ علم اور آزاد خیال لوگ عوامی مجلس کے لیے سالہا سال سے مطالبے پیش کر رہے تھے، مگر روس میں کوئی بڑا طبقۂ اوسط موجود نہ تھا، نہ تعلیم عام تھی، نہ بحث مباحثہ کی کوئی روایت موجود تھی، نہ انفرادی حقوق کے لیے وہ احترام پایا جاتا تھا، جو دستوریت کا ایک لاینفک جزو مانا جاتا ہے۔ تاہم یہ فیصلہ یقیناً مناسب نہ ہو گا کہ ۱۹۱۷-۱۸ء میں روس کے اندر دستوری حکومت کے لیے کامیابی کا کوئی امکان موجود نہ تھا۔ کیا دستور ساز مجلس کا مقصد یہ تھا کہ اجنبی تصورِ حکومت کا پودا ایک ایسے خطے میں لگانے کی کوشش کی جائے، جہاں وہ پرورش نہیں پا سکتا تھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ ایک بلند پایہ تجربہ تھا، جو پختہ اصول پر مبنی نہ تھا، مگر اس لیے ناکام رہا کہ ایک بحرانی دور میں بروئے کار آیا۔ باقی رہی یہ حقیقت کہ لینن نے دستور ساز مجلس کو وہ وظیفہ ادا کرنے سے بندوقوں کے بل پر روک دیا، جو عوام کی رضا نے اس کے حوالے کیا تھا تو اس سے مندرجہ بالا سوال کا جواب نہیں ملتا۔

ستانوواں باب

جنگی کمیونزم اور نئی اقتصادی پالیسی

(ا)

جنگی کمیونزم

سوویٹ کی تاریخ کا پہلا دور سنہ ۱۹۱۷ء کے اختتام سے شروع ہوا اور سنہ ۱۹۲۰ء کے اختتام پر پورا ہوگیا۔ اسے عموماً جنگی کمیونزم یا فوجی کمیونزم کا دور کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس دور کے اہم پہلوؤں کا فیصلہ فوجی وقائع کی بنا پر ہوا۔ خانہ جنگی جاری رہی۔ غیر ملکی طاقتوں نے روس کی سرزمین میں مداخلت کی۔ بہ ایں ہمہ یہ اصطلاح ایک حد تک غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ یہ دور جنگ جوئی کا بھی تھا اور "جنگی کمیونزم" کا بھی۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے اوائل میں پارٹی کا نام بالشویک کے بجائے کمیونسٹ رکھ دیا گیا۔ ساتھ ہی مرکز حکومت پیٹروگراڈ سے ماسکو میں منتقل کر دیا گیا۔ پیٹروگراڈ روس کے مغربی حاشیے پر واقع تھا اور اس کا محلِ وقوع محفوظ نہ تھا۔ اس کے برعکس ماسکو ملک کے قلب میں واقع تھا۔

روس میں کامیابی نے بالشویکوں کے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔ انھیں پختہ یقین تھا کہ عالمگیر انقلاب شروع ہونے والا ہے۔ اس کے شعلے سب سے پہلے جرمنی میں بھڑکیں گے، پھر برطانیہ میں پہنچ جائیں گے اور جمہوریۂ امریکہ بھی اس سے محفوظ نہ رہے گی۔ خیال یہ تھا کہ آئندہ تین سے پانچ سال تک کی مدت میں یہ عالمی ہنگامہ آرائی شروع ہو جائے گی۔ اس عقیدے نے بالشویکوں کو مجبور کر دیا کہ تیزی کے ساتھ روس میں اشتراکی مملکت تیار کریں اور بین الاقوامی معاملات پر صرف سرسری نظر رکھیں، کیونکہ انھیں امید تھی، سرمایہ دار مملکتوں کے ساتھ ان کے روابط محض عارضی ہوں گے۔ اگرچہ اس دور میں روسی حکومت کی سرگرمیوں کو معذرت آمیز انداز میں صرف وقتی تدبیریں قرار دیا گیا، لیکن یہ دعویٰ صرف جزواً درست تھا۔ اس دور میں جو بہت سے فیصلے فوجی دباؤ کے تحت کیے گئے، ان سے توقع تھی کہ ایک نئے معاشرے کی تعمیر میں کار آمد ہوں گے۔

ایک اعلیٰ اقتصادی مجلس بنائی گئی جو صنعتوں کو تدریجاً قومی بنانے کی رہنمائی کر رہی تھی۔ سب سے پہلے چینی اور پیٹرول کی صنعتیں قومی بنائی گئیں۔ جون سنہ ۱۹۱۸ء میں بہت سی صنعتوں کو قومی بنا دیا گیا۔ ان میں کانیں، خام دھاتوں کی صفائی اور پارچہ بافی بھی شامل تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک ہر وہ کارخانہ جس میں دس سے زیادہ کارکن کام کرتے تھے۔ (اگر کارخانہ موٹر کی

قوت سے چلتا تھا تو پانچ سے زیادہ کارکنوں کا وجود شرط تھا)، حکومت نے سنبھال لیے۔ حکومت نے جنس بہ جنس مبادلے کا ایک نظام تیار کر دیا، جس نے آزاد تجارت کی جگہ لے لی۔ داخلی تجارت خلاف قانون قرار پائی، صرف سرکاری محکمۂ نظارتِ غذائی چیزوں کی خرید و فروخت کر سکتا تھا۔ حکومت نے جنسوں کی پیداوار اور تقسیم اپنے قبضے میں لے لی تو روپیہ ناپید ہو گیا۔ حکومت نے بینک خود سنبھال لیے۔ زاروں کے عہد کا غیر ملکی قرضہ منسوخ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پوری کی پوری بچت محو ہو گئی۔ ایک حکم خاص کے ذریعے سے کلیسا اور دولت کو الگ الگ کر دیا گیا۔ جج عہدوں سے ہٹا دیئے گئے اور ان کی جگہ مقامی سوویٹوں کے مقرر کردہ آدمیوں نے لے لی۔

حکومت نے کسانوں کو من مانے اور شدید مطالبات کا ہدف بنا لیا۔ غریب کسانوں کو ان لوگوں کے خلاف ابھار دیا گیا، جن کی حالت قدرے بہتر تھی اور انھیں کولاک[1] کہتے تھے۔ بھوکے آدمیوں کی یونین ان آدمیوں کے خلاف بن گئی، جو کھاتے پیتے تھے۔ حکومت نے دانستہ دیہات میں طبقاتی نفرت کا بیج بویا اور اطرافِ ملک میں خانہ جنگی کو تقویت پہنچائی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ مغربی یورپ کے معیاروں کے مطابق روسی کولاک بھی حد درجہ غریب ہوتے تھے۔ ایک حکم کے ذریعے سے پہلی مرتبہ خفیہ پولیس قائم کی گئی جسے چیکا[2] کہتے تھے۔ یہ حکم دسمبر ۱۹۱۷ء میں یعنی انقلاب سے چند ہفتے بعد جاری ہوا۔ بیرونی طاقتوں کی طرف سے روس میں مداخلت بہت بعد شروع ہوئی۔ خانہ جنگی میں دہشت انگیزی سب سے بڑا حربہ بن گئی۔

کمیونسٹ حکومت کا کاروبار جاری ہونے سے پیشتر صلح ضروری تھی، کیونکہ فوج عملاً ختم ہو چکی تھی۔ روس، جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے نمائندوں کے درمیان گفت و شنید ۱۹۱۸ء میں بھی جاری رہی۔ روسیوں کو امید تھی کہ جرمنی میں انقلاب بپا ہو جائے گا۔ جرمن وسیع علاقوں کے الحاق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ روسیوں کی طرف سے ماننے میں تاخیر ہوئی تو انھوں نے مطالبات بڑھا دیئے۔ آخر ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو روسیوں نے بریسٹ لٹوسک کے معاہدے پر دستخط کر دیئے، جس کے مطابق وہ پورے یوکرین، صوبجات بالٹک، فنلینڈ اور بعض قفقازی علاقوں سے محروم ہو گئے۔ اس معاہدے کے مطابق روس کی ایک تہائی آبادی، اسی فی صد لوہا اور نوے فی صد کوئلہ چھن گیا۔ بہت سے کمیونسٹ اس معاہدے کو ماننے کے بجائے استعفے دے کر الگ ہو گئے۔ بائیں بازو کے اشتراکی انقلابیوں نے حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جرمنوں نے یوکرین اور کریمیا کو پامال کر ڈالا اور بڑے بڑے زمینداروں کی مطلق العنان حکومت وہاں قائم کر دی، جس کے خلاف کمیونسٹ شور و غل بپا کرتے رہے۔ بالشویکوں کے مخالف روسیوں نے جرمنوں کی مدد سے فنلینڈ میں انتہا پسندوں کو ختم کر دیا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ بریسٹ لٹوسک کا معاہدہ کتنا ہی خراب ہوتا، مگر بالشویک اس پر دستخط کرنے سے کیوں کر باز رہ سکتے تھے؟

---

[1] Kulak

[2] Cheka

خانہ جنگی

معاہدۂ بریسٹ لٹوسک کے بعد چند مہینوں میں بدنظمی اور بڑھ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ بار بار حکومت کی طرف سے مطالبے پیش ہو رہے تھے اور طبقاتی کشمکش جاری تھی۔ آخر اس کشمکش نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی۔ دورانِ جنگ میں روس کے اندر چیک باشندوں اور ہیپسبرگ فوجوں سے الگ ہونے والوں کا ایک جیش مرتب ہوا تھا۔ جب روس جنگ سے دستکش ہو گیا تو فیصلہ کر لیا گیا کہ چیکوں کے جیش کو ریل میں سوار کر کے سائبیریا کے راستے بحرالکاہل کے ساحل پر پہنچا دیا جائے۔ وہاں سے وہ جہاز میں سوار ہو کر نہر پانامہ میں سے ہوتے ہوئے اوقیانوس کو عبور کر کے فرانس پہنچ جائیں تاکہ وہاں جرمنوں کے خلاف لڑ سکیں۔ ریل کے ذریعے سے یہ جیش سائبیریا میں سے گزر رہا تھا کہ وہاں اسے ہنگری کے اسیرانِ جنگ سے سابقہ پڑ گیا۔ دونوں گروہوں میں کشمکش شروع ہوئی اور ہنگری کا ایک قیدی مارا گیا۔ اس معمولی سے واقعے نے، جو ہیپسبرگ سلطنت کی دو حریف قوموں میں سائبیریا کے ایک ریلوے سٹیشن پر پیش آیا، روس میں خانہ جنگی کی آگ مشتعل کر دی۔ جب سوویٹ حکومت نے چیکوں کے خلاف (جن کی تعداد پینتیس ہزار سے کم نہ تھی) تادیبی کارروائی کی کوشش کی تو انھوں نے مغربی سائبیریا کے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ مقامی سوویٹیں مقابلے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اشتراکی انقلابیوں کی ہمدردی چیکوں کے ساتھ تھی چنانچہ جابجا مقامی فوجیں مرتب ہو گئیں، جو بالشویکوں کے خلاف تھیں۔ ان میں سے ایک فوج نے غالباً زار کو چھڑا لینے کی دھمکی دی تو ایک مقامی سوویٹ نے جولائی ۱۹۱۸ء میں زار اور اس کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا فیصلہ کر لیا تاکہ دشمن انھیں چھڑا نہ لے جائیں۔ چنانچہ زار کے پورے خاندان کو قتل کر دیا۔

جون ۱۹۱۸ء کے اواخر میں اتحادیوں نے معاملاتِ روس میں مداخلت کا فیصلہ کیا اور وہ مخالفین بالشویک کے حامی بن گئے۔ جنگ سے روس کی کنارہ کشی اتحادیوں کے لیے سخت ضرب ثابت ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرق میں جرمنوں کے خلاف نیا محاذ ازسرِنو پیدا کر دیں۔ سوویٹ روس یا اس کے حامی مؤرخوں نے اس مداخلت کو بالشوزم کے خلاف سرمایہ داری کا جہاد قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ "جہاد" کوئی محرک قوت نہیں بن سکتا تھا۔ مزید برآں اتحادی مدت سے برسرِ جنگ چلے آتے تھے اور ان کے عوام جنگ سے تنگ آ چکے تھے، لہٰذا اگر وہ دنیا کی تمام سرمایہ دار قوموں میں انقلاب بپا کرنے کے لیے کمیونسٹوں کی کوشش کو ناپسند کرتے تھے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

سائبیریا کی ریل کا آخری سٹیشن ولاڈی واسٹک تھا، جو مشرقی سرے پر واقع تھا۔ چیکوں نے جون ۱۹۱۸ء میں وہاں کی مقامی سوویٹ کا تختہ الٹ دیا اور اگست ۱۹۱۸ء کے اوائل میں برطانوی، فرانسیسی، جاپانی اور امریکی فوجیں وہاں اتار دی گئیں۔ امریکیوں کے ذمے یہ فرض عائد ہوا تھا کہ ولاڈی واسٹک پر قبضہ کر لیں اور چیکوں کے عقب میں ریلوے کی حفاظت کرتے رہیں۔ اتحادیوں میں سے صرف جاپانی زیادہ وسیع علاقوں کے لیے کوشاں تھے۔ بہرحال سائبیریا میں بالشویکوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اشتراکی انقلابیوں نے سوویٹوں کو ہٹا کر سابقہ مقامی مجلس بحال کر دی

اور دستور ساز مجلس کو تمام اختیارات کا حامل قرار دے دیا۔ سائبیریا کے تین مختلف مرکزوں میں بالشویکوں کے خلاف مختلف حیثیتوں کی تین حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اگست ۱۹۱۸ء میں ایک چھوٹی سی برطانوی اور امریکی فوج بحیرۂ ابیض کی روسی بندرگاہ آرک اینجل میں اتری۔ ایک اشتراکی انقلابی نے پیٹر دگراڈ کی خفیہ پولیس کے رئیس کو قتل کر دیا اور خود لینن بھی زخمی ہوا۔

اب بالشویکوں نے بھی تیزی سے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ ٹروٹسکی نے وزیر جنگ کی حیثیت میں جبری فوجی بھرتی کا قانون جاری کر دیا اور خوشامد نیز جوابی کارروائیوں کی تہدیدات سے عہدِ زار کے چالیس ہزار افسروں کی خدمات حاصل کر لیں۔ جو سرخ فوج ٹروٹسکی نے تیار کی وہ ۱۹۲۰ء میں تیس لاکھ سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اس فوج نے کازان[1] اور سامرا[2] واقع دریائے والگا پر قبضہ کر لیا (موسم خزاں ۱۹۱۸ء)۔ یوں معلوم ہونے لگا کہ جو طوفان بالشویکی مملکت کو اپنی آغوش میں لے لینے والا تھا، اس کی موجوں کا رُخ عارضی طور پر پلٹ گیا۔

جب مغربی محاذ پر جرمنوں کی قوت درہم برہم ہوئی تو بالشویکوں نے بریسٹ لٹوسک کا معاہدہ منسوخ کر دیا اور انھوں نے یوکرین کے مختلف حصوں میں پیشقدمی شروع کر دی، جہاں جنرل ڈینیکن[3] کی فوج جو بالشویکوں کے مخالف روسیوں پر مشتمل تھی اور راسٹوف (ساحل ڈان) سے چلی تھی، جنوبی جانب قفقاز کی طرف بڑھی۔ اسے فرانسیسی اور برطانوی امداد مل گئی۔ دوسری فوج امیرالبحر کولچک[4] کی تھی، جس نے مغربی سائبیریا میں اومسک[5] کے مقام پر اشتراکی انقلابیوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور کولچک بالکل مطلق العنان حکمران بن گیا۔ تیسری فوج جنرل یوڈینچ[6] کی تھی۔ اس میں سابق جرمنی فوجوں کے بہت سے افراد بھی شامل تھے۔ یہ بحیرۂ بالٹک کے خطے میں کارفرما تھی اور مغربی جانب سے پیٹروگراڈ کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اتحادی بالشویکوں سے بات چیت پر راضی نہ تھے۔ اس اثنا میں بیلاکُن نے ہنگری میں ایک کامیاب سرخ اقدام کا انتظام کرایا، جس سے صاف واضح ہو رہا تھا کہ انقلاب کا دائرہ وسیع تر ہو جائے گا۔

۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں بالشویکوں نے کولچک کو شکست دے دی اور موسم سرما میں دوبارہ اومسک پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۰ء میں کولچک گرفتار ہوا اور اسے موت کی سزا دے دی گئی۔ بالشویکوں نے یوکرین کو بھی مسخر کر لیا تھا، مگر خود ان کی فوجوں میں بغاوت اور بدنظمی پھوٹ پڑی۔ اس وجہ سے وہ اپنی پوزیشن مستحکم نہ کر سکے۔ انھیں امید تھی کہ یوکرین میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھیں گے اور ہنگری میں بیلاکن سے سلسلۂ ربط و ضبط قائم کریں گے، لیکن ان کی فوجوں میں بغاوت کے بعد مقامی باغی اٹھ کھڑے ہوئے، جن میں سے بعض نے قدیم یوکرینی روایت کے مطابق سامیت کے خلاف تعصب کے مظاہرے

---

[1] Kazan
[2] Samara
[3] Denikin
[4] Kolchak
[5] Omsk
[6] Yudinich

کیے۔ دوسرے لوگ انارکسٹ تھے، انھیں زرعی اصلاحات سے ہمدردی تھی اور وہ بالشویکوں اور ان کے مخالف روسیوں دونوں سے لڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے سبز پوش کا نام تجویز کیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں ڈینیکن نے کیف پر قبضہ کر لیا اور شمال کی جانب پیش قدمی شروع کر دی، یہاں تک کہ وہ ماسکو سے صرف اڑھائی سو میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ مگر اس کا موقف اس وجہ سے کمزور ہو گیا کہ اوّل وہ جہاں جہاں گیا، نہایت متشدد نظامِ حکومت قائم کیا، دوم وہ کولچک کو اپنا اعلیٰ افسر قرار دیتا تھا، سوم اس کا فوجی نظم و نسق ہرگز اچھا نہ تھا اور خود اسے اپنے ایک افسر بیرن رینگل[1] سے دشمنی تھی۔ یوڈینچ بڑھتے بڑھتے پیٹروگراڈ کے حواشی میں پہنچ گیا، لیکن سنہ ۱۸۱۹ء کے اواخر تک سرخ پوش بالشویکوں نے سفید پوش روسیوں کے ہر خطرے کو شکست دے دی تھی، البتہ رینگل نے اپنی فوج کریمیا میں محفوظ رکھی۔ اب ٹروٹسکی نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ بھی فوج میں بھرتی ہو جائیں، تاکہ تباہ شدہ ملک کی تعمیرِ نو کا کام انجام دیا جا سکے۔ چنانچہ مزدوروں کے جیش مرتّب کر لیے گئے لیکن ترمیم و اصلاح کا کام مدت تک مؤخر رہا۔

بہر حال سفید پوش روسیوں کی شکست کے بعد بھی سرخ پوش بالشویکوں کو سنہ ۱۹۲۰ء میں پولستانیوں سے لڑنا پڑا، جنھیں توقع تھی کہ یوکرین میں ایک آزاد حکومت کے قیام سے روس کو کمزور کیا جا سکے گا۔ ابتدا میں بالشویکوں کو مراجعت کرنی پڑی، پھر وہ اس تیزی سے آگے بڑھے کہ پولینڈ کے دارالحکومت وارسا پر ان کا قبضہ ہونے والا تھا۔ وہاں سے انھیں اس لیے پیچھے ہٹ جانا پڑا کہ فرانس کا جرنیل ویگاں[2] پولستانیوں کی امداد کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا۔ سرخ پوش بالشویک چاہتے تھے کہ جلد سے جلد سفید پوش روسیوں کا خطرہ ختم کر دیں۔ انھیں برابر یقین ہو چکا تھا کہ پولینڈ میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے پولینڈ سے صلح کر لی۔ اس معاہدے کے مطابق پولستانیوں کو سفید روس اور مغربی یوکرین میں خاصا بڑا علاقہ مل گیا۔ اس خطے میں پولستانی آباد نہ تھے، مگر یہ اٹھارہویں صدی کی تقسیمات تک پولینڈ ہی کے زیرِ اثر تھا۔ نیز یہ علاقہ خطِّ کرزن[3] سے بہت آگے مشرقی جانب تھا۔ "خطِ کرزن" ہی صحیح قومی حد تھی، جو برطانیہ کے وزیرِ خارجہ لارڈ کرزن نے قائم کروی تھی۔ اس کے بعد سرخ پوش بالشویک رینگل کی طرف متوجہ ہوئے، جو کریمیا سے باہر نکلا تھا اور متصرفہ علاقے میں اس نے ایک معتدل حکومت قائم کر لی تھی۔ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء میں اسے تخلیے پر مجبور کر دیا گیا۔ فرانسیسی بیڑے کی امداد بھی اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی۔ ساتھ ہی سفید پوش روسیوں کی تحریک ختم ہو گئی، جو انھوں نے بالشویکوں کے خلاف شروع کی تھی۔

---

[1] Baron Wrangel

[2] Weygand

[3] Curzon Line

جوابی انقلاب کی ناکامی کے اسباب

سرخ پوشوں کی کامیابی اور سفید پوشوں کی ناکامی کے متعدد عوامل ہیں، مثلاً سفید پوش کسی سیاسی پروگرام پر اکٹھے نہ ہو سکے، البتہ وہ سب بالشویکوں کا تختہ الٹنے پر متفق تھے۔ انھوں نے عدم پیش بینی کی پالیسی اختیار کی جس کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ روس میں سرکاری ڈھانچے کا فیصلہ آگے چل کر کوئی دستور ساز مجلس طے کرے گی، خود انھیں طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ زار کے سرگرم حامی بھی اور اشتراکی انقلابی بھی۔ روس کے لیے مناسب راہِ عمل کے متعلق ان میں اتنا شدید اختلاف تھا کہ انھوں نے ان نازک مسائل پر بحث بھی ملتوی کر دی تھی۔

پھر ان کی سرگرمیوں کے مرکز جغرافیائی اعتبار سے روس کے حواشی پر واقع تھے۔ مثلاً سائبیریا میں، کریمیا اور یوکرین میں، قفقاز اور صوبجات بالٹک میں، مگر سفید پوش روسی غیر روسی اقلیتوں سے کوئی مزاحمت نہ کر سکے، جو ان خطوں میں آباد تھیں۔ یوں انھوں نے یوکرینیوں اور دوسرے لوگوں کے شدید جذبۂ علیٰحدگی سے بے اعتنائی اختیار کی۔ اس کے برعکس بالشویک عارضی طور پر ان کی دلجوئی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ سفید پوش روسی برابر یہ نعرے لگاتے رہے۔ "روس ایک ملک ہے، اس میں کوئی تقسیم گوارا نہیں کی جا سکتی۔" اس طرح وہ ان لوگوں کی امداد کھو بیٹھے جو اُن کی حمایت میں خاصی سرگرمی دکھا سکتے تھے۔ اس اثنا میں موقع پرست لینن ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت میں برابر کہہ رہا تھا: "اچھا علیٰحدگی چاہتے ہو تو خوشی سے علیٰحدہ ہو جاؤ۔" بےشک یہ قمار بازی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن لینن کو یقین تھا کہ یوکرینیوں اور تمام دوسرے لوگوں کے لیے روس کی طرف مراجعت کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

نیز سفید پوش روسی کسانوں کی حمایت حاصل نہ کر سکے۔ بالشویک زمینوں کی تقسیم کے متعلق جو فیصلے صادر کر چکے تھے، سفید پوش کم از کم نظری اعتبار سے ان کی تصدیق کر سکتے تھے۔ لیکن جہاں انھیں اقتدار حاصل ہوا، انھوں نے بڑے بڑے مالکانِ اراضی کی زمینیں واپس دے دیں اور بالشویکوں کی تقسیم کالعدم کر دی۔ دورانِ جنگ میں کسان دونوں فریقوں سے بیزار رہے۔ انارکسٹ گروہ اسی وجہ سے بروئے کار آئے، خصوصاً جنوبی حصوں میں۔ یہ بھی واضح رہے کہ سفید پوش روسیوں کے پاس بالشویکوں کے برابر جنگی قوت نہ تھی۔ ان کی فوجیں تعداد میں کم تھیں اور سامانِ جنگ وہی ملتا تھا، جو زار کی فوجوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ بالشویکوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی مختلف فوجوں میں اتحاد تھا اور کماندار بڑے قابل تھے۔ ساتھ ہی ریلوں کا پورا نظام ان کے ضبط و نظم میں تھا اور وہ جب چاہتے، تیزی کے ساتھ ایک محاذ سے فوجیں دوسرے محاذ پر منتقل کر سکتے تھے۔ سفید پوش روسی حواشی پر سرگرم عمل تھے اور کم از کم چار بڑے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ ریلوے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

سب سے آخر میں یہ کہ سفید پوش روسیوں کو اتحادیوں کی طرف سے جو امداد ملی، وہ غیر مؤثر اور ناکافی تھی، بلکہ اس سے سفید پوش روسیوں کے مقاصد کو نقصان پہنچ سکتا تھا، کیونکہ سرخ پوش بالشویک کہہ سکتے تھے: "ہم ملک کے قومی

محافظ ہیں اور ہمارے مخالفین غیر ملکیوں کے کارندے ہیں۔" وہ وقت گزر گیا۔ اب اس پر نظر بازگشت ڈالتے ہیں تو اس کی روشنی میں یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اتحادیوں کو بالشویکوں کے خلاف پوری فوجی امداد دینی چاہیے تھی یا اگر یہ ممکن نہ تھا (اغلب یہی ہے، کیونکہ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر ان کی فوجوں کی حالت اچھی نہیں رہی تھی) تو بہتر ہوتا کہ وہ روس سے باہر رہتے اور خانہ جنگی کے خاتمے کا انتظار کرتے۔ اب تک بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگرچہ سرخ پوشش بالشویکوں نے خانہ جنگی میں کامیابی حاصل کر لی مگر اتحادیوں کی مخالفت نے انھیں روس کے اندرونی معاملات میں اس طرح الجھائے رکھا کہ وہ دوسرے ملکوں میں کامیاب انقلاب کی سرپرستی نہ کر سکے۔ اس نظریے کو ایک حد تک حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔

اٹھاونواں باب

جنگی کمیونزم اور نئی اقتصادی پالیسی

(۲)

نئی اقتصادی پالیسی

روس ۱۹۱۴ء سے جنگوں اور بحرانوں کا شکار چلا آتا تھا۔ ۱۹۲۱ء کے اوائل میں خانہ جنگی ختم ہوئی تو قحط شروع ہو چکا تھا اور حفظانِ صحت کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ کنبوں کے رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ انسانوں پر ظلم و جور ہو رہے تھے۔ طبقاتی نفرت اس وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی تھی کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صنعت و حرفت کا یہ حال تھا کہ پیداوار جنگ سے پیشتر کے مقابلے میں صرف ½ رہ گئی تھی اور زرعی پیداوار میں بھی کم از کم تیس فی صد کی کمی آ گئی تھی۔ پھر اس پیداوار کی تقسیم کا انتظام شکست کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کمیونسٹ نظام حکومت سب سے بڑی آزمائش سے دوچار معلوم ہوتا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اہلِ روس کی حمایت کھو بیٹھے ہیں۔ ۱۹۲۱ء کے اوائل میں انارکسٹ کسانوں کی بغاوت وسیع پیمانے پر پھوٹی اور ۱۹۲۲ء کے وسط تک باقی رہی۔ لینن نے کہا تھا اس بغاوت نے مجھے اس درجہ خوفزدہ کر دیا ہے کہ تمام سفید پوش روسیوں کی مزاحمت سے میں اتنا نہیں ڈرا تھا۔ پالیسی میں تبدیلی کے متعلق فیصلہ کن عنصر کرونسٹاٹ[1] نزد پیٹروگراڈ کے بحری مرکز کی بغاوت تھی (مارچ ۱۹۲۱ء) پیشتر کرونسٹاٹ بالشوزم کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اب اسی مقام سے سرکش انارکسٹوں کی تحریک جاری ہوئی، جس کا مطالبہ یہ تھا کہ کمیونسٹوں کے بغیر بالغوں کے عین حق رائے کے مطابق سوویٹوں کا انتخاب ہو۔ ووٹ خفیہ پڑیں۔ تقریر و اجتماع کی آزادی ہو۔ سیاسی قیدیوں کو آزاد کیا جائے۔ حکومت کی طرف سے جبری مطالبہ منسوخ کیا جائے۔ صرف آخری دفعہ، نیز پہلی دفعہ کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ پروگرام وہی تھا، جو زاروں کے روس میں تمام آزاد خیال طبقوں اور اشتراکیوں کا پروگرام سمجھا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرونسٹاٹ کی تحریک نے اکثر روسی کارکنوں اور دہقانوں کے جذبات کا اظہار کر دیا تھا۔ حکومت صلح پسند نہ ہوتی تو قطعاً خونریزی نہ ہوتی، لیکن ٹروٹسکی نے باغیوں کے خلاف جنگ کی اور سخت خونریزی کے بعد

[1] Kronstadt

انھیں شکست دی۔

یہی واقعہ "نئی اقتصادی پالیسی"[1] اختیار کرنے کا موجب ہوا، لیکن تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تعمیرِ نو کا تقاضا یہی ہو گیا تھا اور یہ تعمیر اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کم از کم عارضی طور پر انتہائی کمیونزم کو ترک نہ کیا جاتا۔ لینن خود کہہ چکا تھا کہ اشتراکی نظام پیدا کرنے کی کوششیں قبل از وقت ہیں۔ پھر کسانوں کا اطمینان حد درجہ ضروری تھا اور یہ بھی لازم تھا کہ آئندہ کسی بڑی بغاوت کا امکان نہ رہے۔ سب سے آخر میں یہ کہ جس عالمی انقلاب کی توقع تھی، وہ بروئے کار نہ آیا اور روسی تعمیرِ نو میں امداد کے لیے سرمایہ دار ملکوں کے وسائل کی اشد ضرورت تھی۔ اب غیر ملکی سرمایہ داروں کو مراعات دی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ نئی اقتصادی پالیسی اختیار کرتے ہی انگلستان و روس کے درمیان تجارتی معاہدہ ہو گیا۔ بیرونی ملکوں میں نئی اقتصادی پالیسی کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ کہا گیا کہ روسی انقلاب اسی طرح طبعی حالت پر آ رہا ہے، جس طرح فرانس کے انقلاب میں نوتھرمیڈور شہ (۲۷ جولائی ۱۷۹۴ء) کے واقعے سے طبعی رفتار پر آیا تھا اور دورِ وحشت و دہشت ختم ہوا تھا۔

پہلے حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ کسانوں کے پاس صرف گزارے کے لیے تھوڑی سی پیداوار چھوڑ دیتی، باقی سب جبراً لے لیتی۔ نئی اقتصادی پالیسی کے مطابق یہ جبری مطالبہ ختم کر دیا گیا۔ تاہم کسان کو بھاری ٹیکس جنس کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسے اجازت دے دی گئی کہ باقی اپنی مرضی کے مطابق فروخت کرے اور روپیہ پاس رکھے۔ یوں نجی تجارت کی آزادی مل گئی اور مقامی خرید و فروخت کا حق بحال ہو گیا۔ کسان چاہتا تو اپنی فالتو جنس حکومت کے ہاتھ بیچ دیتا، چاہتا تو یہ جنس کسی نجی گاہک کے حوالے کر دیتا۔ گویا کسانوں کی زراعت اصولی اعتبار سے سرمایہ دارانہ بن گئی۔ کیونکہ نفع کا محرک دوبارہ بروئے کار آ گیا۔ لینن نے سٹولی پن کی پیروی کرتے ہوئے کسانوں کے لیے زمین کا حق اجارہ دوامی کر دیا۔ اس پورے نظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ کولاک دولتمند ہو گئے اور غریب کسان بے زمین مزدور رہ گئے، جو اجرت لے کر زمینوں پر کام کرتے تھے۔

نئی اقتصادی پالیسی کے مطابق دوسرے دائروں میں جنھیں لینن انتہائی بلندیاں قرار دیتا تھا، حکومت کا اقتدار قائم رہا، مثلاً بھاری صنعتوں، بینکنگ، وسائل حمل و نقل اور بیرونی تجارت میں۔ داخلی تجارت اور ملکی صنعت میں افراد کو از سرِ نو کاروبار شروع کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اسے اقتصادیات کا نجی سرمایہ دار حلقہ قرار دے دیا گیا، جس میں مزدوروں کو ان کی محنت کے مطابق اجرت دے دی جاتی تھی اور کارخانوں کے ناظم اپنی پیداوار کا کچھ حصہ خام مال سے تبدیل کر لیتے تھے۔

---

[1] New Economic Policy جسے مخففاً NEP کہتے تھے۔

لینن نے خود نئی اقتصادی پالیسی کو سرمایہ داری کی طرف جزوی رجوع یا مراجعت قرار دیا اور کمیونسٹوں کو تاکید کی کہ انھیں اچھے کاروباری بننا چاہیئے، لیکن نئی اقتصادی پالیسی محض ایک عارضی تدبیر کے طور پر اختیار کی گئی تھی۔ لینن کو یقین تھا، روسی کسان دو عشروں کے اندر اندر اس حقیقت کے قائل ہو جائیں گے کہ مِل جل کر کھیتی باڑی کرنا زیادہ اچھے نتیجے پیدا کرتا ہے۔ لینن یہ بھی کہتا تھا کہ حکومت کی مداخلت میں عارضی ڈھیل سے صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو جائے گا اور روسیوں کو انتظامی معاملات میں مفید سبق مل جائے گا۔

یقیناً اس سے اقتصادی بحالی کا مقصد پورا ہو گیا۔ ۲۷-۱۹۲۶ء تک صنعتی پیداوار جنگ سے پیشتر کی سطح پر پہنچ گئی، اگرچہ زرعی پیداوار اس کے برابر ترقی نہ کر سکی، لیکن ممتاز کمیونسٹوں کو نئی اقتصادی پالیسی سے سخت اختلاف تھا۔ انھیں بے حد صدمہ پہنچا کہ جن اصول و عقائد پر وہ مدت العمر قائم رہے، اب وہ الٹ دیے گئے۔ ۱۹۲۴ء تک نجی کاروبار میں چالیس فی صد حصہ روس کی داخلی تجارت کا تھا، لیکن پیداوار کے ان اعداد میں کمی ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے نئی اقتصادی پالیسی کے مہیا کیے ہوئے مواقع سے فائدہ اٹھایا انھیں نئی اقتصادی پالیسی کے آدمی کہا گیا۔ مخالف افسر انھیں مختلف طریقوں سے تنگ کرتے، مثلاً ان کا نفع محدود رکھنے کی کوشش کرتے، ان پر بھاری ٹیکس لگا دیتے، سٹے کا الزام لگا کر انھیں عدالتوں میں کھینچے پھرتے۔ نئی اقتصادی پالیسی کے آدمی کی زندگی اگرچہ خاصی اچھی تھی، لیکن اسے ہمیشہ ہراساں زدہ رکھا جاتا اور وہ نوکر شاہی کے چنگل سے محفوظ رہنے کے لیے سرگرم کوششیں برابر جاری رکھتا۔ کولاکوں کو بھی یہی تجربہ ہوا۔ گویا حکومت اقتصادی وجوہ کی بنا پر نجی کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی، ساتھ ساتھ سیاسی وجوہ کی بنا پر حوصلہ شکنی کرتی جاتی۔

کمیونسٹ پارٹی کے اندر ایک گروہ نجی طبقے کے اضافے اور نئی اقتصادی پالیسی میں توسیع کا حامی تھا۔ اس کی رائے تھی کہ یہ اشتراکی نصب العین کی طرف ایک نیا راستہ ہے۔ یہی لوگ تھے، جنھیں دائیں بازو کے منحرفین کہا گیا۔ ان کے مخالفین مراعات کا خاتمہ چاہتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ نئی اقتصادی پالیسی کے آدمیوں اور کولاکوں کو ختم کیا جائے۔ وطن میں مارکس کے اصول از سرِ نو رائج کیے جائیں اور بیرونی دنیا میں انقلاب کے مقاصد کو تقویت پہنچائی جائے، جسے وہ اشتراکی جارحانہ اقدام قرار دیتے تھے۔ یہ لوگ بائیں جانب کے منحرفین قرار پائے۔ انھیں میں ٹروٹسکی شامل تھا۔ مرکز میں وہ لوگ تھے، جو دونوں کو ہدفِ اعتراض بناتے تھے۔ دائیں بازو کو اس لیے کہ اس نے کمیونزم کو ترک کر دیا، بائیں بازو کو اس لیے کہ ان کی وجہ سے مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد میں خلل پیدا ہوتا تھا۔

اقتدار کے لیے کشمکش سٹالن اور ٹروٹسکی

موجودہ صدی کے تیسرے عشرے میں صرف نئی اقتصادی پالیسی ہی کا مسئلہ نہ تھا جو کمیونسٹ لیڈروں کے لیے باعثِ تشویش بنا رہا۔ لینن پر ۱۹۲۲ء میں دو مرتبہ بیماری کا حملہ ہوا، تیسرا حملہ ۱۹۲۳ء میں ہوا اور اس نے جنوری ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ زندگی کے آخری دو سال

کے اندر وہ انتظامی امور میں کم سے کم حصہ لے سکا نہیں۔ اقتصادی پالیسی کی بحث اور بعض دوسرے منازعات میں لینن کی جانشینی کا مسئلہ بھی شامل ہو گیا۔ گویا ہر کمیونسٹ لیڈر مختلف مسائل کے جواب میں صرف حالات ہی نہیں، بلکہ اس امر پر بھی نظر رکھتا کہ کس قسم کا جواب سیاسی اعتبار سے اس کے لیے مفید ہوگا۔ مثلاً یہ مسئلے کہ صنعت و حرفت کو کن اصول پر منظم کیا جائے؟ منظم مزدوروں کا حصہ اس میں کیا ہو؟ سرمایہ دار دنیا کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رکھے جائیں؟ اس کشمکش میں کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جوزف سٹالن ۱۹۲۸ء میں کامیاب ہوا۔

۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۸ء کی درمیانی مدت، خصوصاً لینن کی وفات کے بعد کے دور میں سٹالن اور ٹروٹسکی کے درمیان اقتدار کے لیے جانبازانہ جنگ جاری رہی۔ لینن کو اس کشاکش کا اندازہ ہو چکا تھا اور اسے بڑی تشویش تھی۔ اس کا احساس یہ تھا کہ ٹروٹسکی زیادہ قابل ہے۔ ساتھ ہی اندیشہ تھا کہ اس میں خود اعتمادی ضرورت سے زیادہ ہے اور اس میں بطور خود فیصلے کر لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ سٹالن نے پارٹی کے سکرٹری کی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ اختیارات سنبھال لیے ہیں، مگر اس کے متعلق یہ اندیشہ تھا کہ اختیارات استعمال کرنے کا اسے سلیقہ نہیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سٹالن نے ہدایات کے خلاف گرجستان کی مینشویک جمہوریت کو تباہ کر دیا ہے اور اس کے لیڈروں سے سمجھوتا نہیں کیا تو وہ اتنا خفا ہوا کہ وصیت نامہ میں لکھ دیا: "سٹالن بڑا خود رائے ہے اور میرے پیروؤں کو چاہیے کہ اسے معتمد عام کے عہدے سے الگ کر دیں۔" وفات کے وقت لینن نے سٹالن پر سخت نکتہ چینی شائع کر دی۔ اس سے تعلقات توڑ لیے اور اسے بالکل الگ کر دینے کے لیے تیار تھا۔ ٹروٹسکی کا یہ الزام کہ سٹالن نے لینن کو زہر دیا، کسی شہادت پر مبنی نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ لینن کی موت کے باعث سٹالن کا مقام و منصب محفوظ رہا۔ آگے چل کر اس نے دعوےٰ کیا کہ لینن نے خود مجھے وارث بنایا تھا، قطعاً نادرست تھا، بلکہ آخری وقت میں اسے لینن کا اعتماد بھی حاصل نہ تھا۔

اس پوری مدت میں ٹروٹسکی بار بار تجویزیں پیش کرتا کہ صنعت و حرفت کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کا انتظامی عملہ ہونا چاہیے اور اسی قسم کی ضرورت اقتصادی منصوبہ بندی کے لیے ہے۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے کام لے کر حکومت عمرانی تغیرات پر ضبط و نظم قائم رکھ سکتی اور ان کی نگرانی کر سکتی ہے۔ ٹروٹسکی کی رائے تھی کہ کھیتی باڑی مشینوں کے ذریعے سے ہونی چاہیے۔ دیہات میں تعاون کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کسانوں کی انفرادیت کمزور کر دینی چاہیے۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کر دی تھی کہ کھیتی باڑی مشترکہ رکھی جائے، کسانوں کے گروہ مشترکہ حیثیت میں اس کے اندر حصہ دار ہوں۔ ٹروٹسکی کا اقتدار گھٹتا گیا تو وہ کمیونسٹ افراد کے حق انتقاد حکومت کا حامی بن گیا۔ جب کبھی سٹالن اور اس کے دوسرے طاقتور دشمنوں کے مسلک کا ذکر آتا تو ٹروٹسکی انھیں انحطاط پذیر نوکر شاہی قرار دیتا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دوسرے ملکوں میں انقلاب برپا کر کے ہی روس کا اشتراکی انقلاب مناسب مقاصد پورے کر سکتا ہے۔ اگر ترقی یافتہ مغربی ممالک کی صنعتی پیداوار اور فنی صلاحیتیں کمیونزم کے قبضے میں آ جائیں تو روس اپنے اشتراکی انقلاب کو پایۂ تکمیل پر پہنچا سکے گا۔ یہ

وہی مشہور نظریہ ہے کہ اشتراکیت کسی ایک ملک کی سرحدوں کے اندر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یا تو دنیا بھر میں انقلاب بپا ہونا چاہیے یا سمجھ لینا چاہیے کہ روسی اشتراکیت کے لیے بھی ناگزیر ناکامی مقدر ہے۔

جو لوگ ٹروٹسکی کے مخالف تھے، وہ بائیں بازو کے منحرفین کہلاتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا ترجمان نکولائی بخارن[1] تھا۔ یہ کبھی ان ذمہ دار انتظامی عہدوں پر فائز نہیں ہوا تھا جن پر لینن یا ٹروٹسکی یا سٹالن فائز رہے اور اکثر بڑے مسائل پر وہ رائیں بدلتا رہا، لیکن زیر غور مدت میں بخارن ایک مستقل راہ عمل پر قائم رہا۔ وہ پراودا کا ایڈیٹر تھا۔ اس لیے حد درجہ ذی اثر مانا جاتا تھا۔ وہ نئی اقتصادی پالیسی کا زبردست حامی تھا۔ مارکس نے طبقاتی کشمکش کے متعلق جو سخت نظریہ پیش کیا تھا بخارن اسے ایسے دلائل سے نرم کرتا رہا کہ پرولتاریائی حکومت کے قبضے میں سرمایے کے اعلیٰ ذخیرے ہیں اور سرمایہ ہی کامیابی کا ذریعہ ہے، لہٰذا اشتراکیت ضرور کامیاب ہوگی۔ یہ نظریہ مغربی یورپ کے سوشل ڈیموکریٹوں کی تدریجی پیشقدمی سے ملتا جلتا ہے۔ بخارن کی رائے ہرگز یہ نہ تھی کہ تیزی سے صنعت وحرفت کو ترقی دینے کا عظیم الشان پروگرام بنا لیا جائے۔ وہ تعاون کے حق میں تھا، لیکن اجتماعیت کے خلاف تھا۔ خارجی معاملات میں وہ ان غیر کمیونسٹ گروہوں سے تعاون کے لیے مضطرب تھا، جو روس کے حق میں مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے پوری کوشش کی کہ چین میں روس چیانگ کائی شک[2] سے اور جرمنی میں سوشل ڈیموکریٹوں سے تعاون کرے۔

سٹالین نے اقتدار حاصل کرنے کے دوران میں بخارن کے دلائل سے فائدہ اٹھایا تاکہ ٹروٹسکی کی حیثیت پر ضرب لگے اور اسے حذف کیا جا سکے۔ جب دیکھا کہ بخارن کا طرز عمل جزواً ناکام ہو رہا ہے تو سٹالن نے ٹروٹسکی کی بہت سی تجویزیں اختیار کر لیں، اور بخارن کو حذف کر دیا۔ سٹالن کے جدید افکار اسی دوران میں ارتقاء پذیر ہوئے۔ وہ بنیادی طور پر نہ اہل علم میں سے تھا اور نہ نظریہ بازی کی اس میں کوئی صلاحیت تھی۔ جماعت کی تنظیم میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس نے بعض نظریے اس خیال سے اختیار کیے کہ وہ مفید و کارآمد معلوم ہوتے تھے۔ جزواً اس لیے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کے لیے اپنی راہ عمل کا خاکہ تیار کر رہا تھا۔ اس نے صنعت وحرفت میں تیزی سے ترقی کی حمایت کی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس سلسلے میں غیر معمولی طریق پر گراں سرمایے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۲۷ء کے اختتام پر اس نے کسانوں کے متعلق اپنا ابتدائی موقف یکایک ترک کر دیا اور کھلم کھلا اجتماعی کھیتی باڑی کی سرپرستی اختیار کر لی۔ اس تبدیلی رائے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ زرعی پیداوار صنعتی ترقی کے قدم بہ قدم نہیں جا رہی تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ درمیانی کمی پوری کرنے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ صنعت وحرفت کی طرح زراعت کا انتظام بھی وسیع پیمانے پر متحدہ سعی و کوشش سے کیا جائے۔

ٹروٹسکی کہتا تھا کہ اشتراکیت ایک ملک میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب سٹالن یہ دیتا تھا کہ ایک آزاد اشتراکی

---

[1] Nikolai Bukharin

[2] Chiang Kai Shek

مملکت قائم رہ سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ دنیا بھر میں انقلاب پیدا کر دینے کا نصب العین ترک کر دیا جائے، جیسا کہ اکثر سمجھا گیا۔ سٹالن کی رائے ہمیشہ یہ رہی کہ اشتراکی مملکت (روس) کو دنیا کے ہر حصے میں کمیونسٹوں کے لیے تحریک امداد کے مرکز کی حیثیت میں قائم رہنا چاہیئے۔ روس ان کے لیے اعانت کا انتظام کرے گا اور وہ روس کے لیے پشتیبانی کا سامان ہوں گے، مگر اس کے نزدیک درمیانی دور میں یعنی دوسرے مقامات میں کمیونسٹوں کی کامیابی سے پیشتر روس کے لیے ایک اشتراکی مملکت کی حیثیت میں زندہ رہنا ممکن ہے، بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ کمیونسٹ بنتا جائے گا۔ بین الاقوامی روابط میں سٹالن کے اس نظریے کے مطابق سوویٹ یونین سرمایہ دار ملکوں کے پہلو بہ پہلو پرامن بقا کی پالیسی بھی اختیار کر سکتی تھی، جب یہ زیادہ مفید معلوم ہوتی اور دوسرے مقامات پر کمیونسٹ انقلاب کو جنگجویانہ امداد بھی دے سکتی تھی، جب اس سے زیادہ نفع حاصل ہو جاتا۔ سٹالن نے ایک ملک کے اندر اشتراکیت کا نعرہ لگا کر اُن عام روسی کمیونسٹوں کو بھی مطمئن کر دیا، جو دوسرے ممالک میں انقلاب بپا نہ ہونے کے باعث مایوس تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ نئے معاشرے کا مرکز مغربی ممالک نہیں، روس ہوگا۔ سٹالن کے اس نظریے میں ٹروٹسکی کے زیادہ آفاقی اور مغربی نظریات کے بجائے روسی قوم پرستی منعکس تھی۔

سٹالن کی کامیابی

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جن مختلف نظریات کو روسیوں سے منوانے کی کوشش کی جائے گی ان کے تجزیے سے واضح ہو سکتا ہے کہ کمیونسٹ لیڈروں کے روبرو کون کون سے متبادل راستے تھے، لیکن اس سے یہ واضح نہیں ہو سکتا کہ سٹالن کیونکر کامیاب ہوا۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے ہمیں نظریات اور سیاسی پلیٹ فارموں کی دنیا سے نکل کر عملی اور سیاسی اقتدار کے دائرے میں پہنچنا چاہیے۔ خانہ جنگی کے اختتام پر سٹالن قومیتوں کا ناظر تھا۔ اس منصب پر فائز رہ کر اس نے نئی سوویٹ جمہوریت کے چودہ ہزار باشندوں میں سے ساڑھے چھ کروڑ کے معاملات کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایشیائیوں کی تقدیر کا مناسب انتظام کر دیا، کیونکہ وہ خود ایشیائی تھا اور ان کی ذہنیت کو خوب سمجھتا تھا۔ وہاں جو مقامی بالشویک لیڈر تھے، اس کے خاص آدمی بن گئے۔ جہاں ایسی صورت پیدا نہ ہو سکی وہاں اس نے سختی اور تشدد سے کام لے کر مخالفت ختم کر دی۔ اس کے وطن گرجستان میں یہی صورت پیش آئی۔ اگرچہ وہ گرجستانی تھا، مگر اپنے آپ کو روسی قوم پرستی میں ضم کر دیا، تاکہ ایک مرکزیت مآب بالشویک مملکت بروئے کار آ سکے۔

سٹالن ہی تھا جس کی تحویل میں نئی ایشیائی جمہوریتوں کی تخلیق تھی۔ ان جمہوریتوں کو بظاہر لوکل سیلف گورنمنٹ، اقتصادی و تعلیمی اصلاحات کے پروگراموں، مقامی زبانوں اور ثقافتوں کے نشوو ارتقاء کا حق حاصل تھا۔ وہی تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں تحریک پیش کی تھی کہ جمہوریتوں کے وفاق کے بجائے اس کا نام "اشتراکی سوویٹ جمہوریتوں کی یونین"[ل] رکھا جائے۔ اس یونین میں ماسکو کو جنگ، خارجہ پالیسی، تجارت اور حمل و نقل کے پورے اختیارات حاصل تھے اور ماسکو ہی مالیات،

ل Union of Soviet Socialist Republics جس کا مخفف یو ایس ایس آر ہے۔

اقتصادیات، خوراک اور مزدوروں سے ربط ضبط قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ اقوام کی ایک کونسل بنا دی گئی تھی جس میں ہر قومی گروہ کے مساوی مندوبین شامل تھے۔ یہ کونسل اعلیٰ سوویٹ کے ساتھ ملا کر دوسرا ایوان بنے گی۔ یہی مرکزی تنظیمی مجلس ہوگی، جو عوامی ناظروں کی کونسل یعنی وزارت یا حکومت مقرر کرے گی۔ اس دستوری اصلاح کو سٹالن اتنا ہی بڑا کارنامہ قرار دیتا تھا، جتنا بڑا کارنامہ ٹروٹسکی نے خانہ جنگی کے دوران میں فوجی تنظیم کے لیے انجام دیا تھا۔

سٹالن کی تحویل میں مزدوروں اور کسانوں کی تفتیش کا محکمہ بھی تھا۔ یہاں اس کا اصل کام یہ تھا کہ سول سروس کی ہر شاخ سے نااہلی اور رشوت خوری کو دور کرے اور ملازمین کی ایک نئی جماعت تیار کرے۔ اس کے آدمی حکومت کے تمام محکموں میں آزادانہ پھرتے تھے۔ وہ تغیرات کی تفتیش کرتے، ہدایتیں دیتے، جہاں جہاں ضرورت ہوتی، نکتہ چینی کرتے۔ لینن نے یہ محکمہ اس غرض کے لیے بنایا تھا کہ نظم و نسق خرابیوں سے پاک ہو جائے، لیکن ناواقفی اور روایت کے فقدان کے باعث زاروں ہی نہیں بلکہ بالشویکوں کے دور میں بھی سول سروس نااہل اور رشوت خور ہی رہی۔ یہ کیفیت سٹالن کی تفتیش کے زمانے میں بھی باقی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ زار کے بہت سے ملازمین بالشویکوں کے ماتحت بھی ملازم بن گئے۔ اگرچہ تفتیش کا محکمہ وہ کام انجام نہ دے سکا، جس کے لیے یہ قائم کیا گیا تھا، لیکن اس نے ایک اور کام انجام دے دیا، یعنی اس طرح سٹالن کو حکومت کی مشینری پر ضبط و نظم حاصل ہوگیا۔ لینن نے وفات سے پیشتر تفتیش کے محکمے میں سٹالن کے کام کی مذمت کی تھی، لیکن اس وقت تک معاملہ بہت آگے جا چکا تھا۔

سٹالن سیاسی بورڈ کا بھی رکن تھا۔ پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کا یہ ایک چھوٹا سا گروہ تھا جسے مرکزی کمیٹی منتخب کرتی تھی۔ خانہ جنگی کے دوران میں صرف پانچ آدمی اس بورڈ کے ممبر رہے۔ یہاں سٹالن کا کام یہ تھا کہ پارٹی کے روزانہ انتظامات پر نظر رکھے۔ وہی تنہا مستقل نمائندہ تھا، جو سیاسی بورڈ اور اورگ بیورو[1] کے درمیان واسطے کا کام دیتا تھا۔ اورگ بیورو ہی پارٹی کے مختلف افراد کو مختلف فرائض کے لیے کارخانوں، دفتروں اور فوجی دستوں میں مقرر کرتا۔ ان عہدوں کے علاوہ سٹالن ۱۹۲۲ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جنرل سیکرٹری بن گیا۔ اس حیثیت میں اس کا کام یہ تھا کہ سیاسی بورڈ کے اجلاسوں کے لیے ایجنڈا تیار کرے۔ جو نکات زیرِ بحث آئیں، ان سے متعلقہ دستاویزیں پیش کرتا رہے اور جو فیصلے ہوں، انھیں متعلقہ ماتحت اداروں تک پہنچاتا رہے۔ پارٹی کی تمام ملازمتوں پر اسے ضبط و نظم حاصل تھا۔ اسی کے ذریعے سے نئے آدمی مقرر ہوتے تھے یا پہلے ملازموں کو ترقیاں ملتی تھیں یا ان کا تنزل ہوتا تھا۔ اس کا ایک کام یہ بھی تھا کہ مقامی تجارتی یونینیں، تعاونی انجمنیں اور فوجی دستے ان کمیونسٹوں کے ماتحت رہیں، جو خود اس کے سامنے جوابدہ ہوں۔ صنعت و حرفت کے تمام منتظمین اور پارٹی کے دوسرے ارکان کے کارناموں اور وفاداری کی مثلیں اسی کے پاس رہتی تھیں۔

۱؎ Orgbureau

۱۹۲۱ء میں ضبط و نظم کے لیے ایک مرکزی کمیشن بنا دیا گیا، جو پارٹی کے مختلف ارکان کو غیر تسلی بخش روش کی بنا پر خارج کر سکتا تھا۔ سٹالن اس کمیشن اور مرکزی کمیٹی کے درمیان بھی واسطہ بن گیا تھا۔ چنانچہ اسی کے ذریعے سے ارکان کا اخراج ہوتا رہا تاکہ پارٹی ہر غلط عنصر سے پاک رہے

ایک ایسی مرکزیت مآب مملکت میں، جس کا پورا کاروبار ایک پارٹی کی تحویل میں تھا، سٹالن جیسے آدمی کے لیے اتنے کلیدی مناصب پر فائز ہونا اقتدار کی کشمکش میں انتہائی فائدے کا موجب تھا، لیکن مملکت نئی تھی، مناصب چنداں نمایاں نہ تھے۔ وزارت جنگ کے مقابلے میں جس پر ٹروٹسکی فائز تھا، باقی منصب بہت معمولی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر سٹالن کی عام روش عموماً مصالحانہ تھی۔ لہٰذا اس کی کامیابی کا امکان، اس وقت سامنے آیا، جب اسے رد کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ سیاسی بیورو کے اندر اس نے تین ہم رائے آدمیوں کی ایک مجلس بنا لی تھی، جن میں سے ایک وہ خود تھا، دو مرے دو بھی ممتاز بالشویک لیڈر تھے؛ ایک زنوویف[1]، جو عوامی تقریروں میں بڑا مشتاق تھا، دوسرا کامینیف[2]، جسے مارکس کے نظریات میں مہارت تامہ کا درجہ حاصل تھا۔ زنوویف پیٹروگراڈ کی سوویٹ کا صدر نیز بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کا صدر تھا۔ کامینیف لینن کا نائب اور ماسکو کی سوویٹ کا صدر تھا۔ تینوں ٹروٹسکی کے مقابلے میں قدیم بالشویک تھے۔ ٹروٹسکی خاصے عرصے تک مینشویک رہا اور وہ رائے میں آزاد تھا۔

سٹالن، زنوویف اور کامینیف کے اجتماع کو توڑنا ممکن نہ تھا۔ ان کے خلاف جتنی حقیقی یا خیالی سازشیں کی گئیں، وہ سب خفیہ پولیس کے ذریعے سے انھوں نے دبا دیں۔ ٹروٹسکی کی طرف سے اصلاح کے جو مطالبات پیش ہوئے، ان کی تینوں نے مزاحمت کی۔ وہ اصلاحات عمل میں آ جاتیں تو پارٹی ایک حد تک جمہوری اصول پر آ جاتی۔ ٹروٹسکی کی حیثیت مستحکم ہو جاتی اور سٹالن کمزور ہو جاتا۔ ان تینوں نے لینن کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر لینن کے طور طریقوں اور مقاصد کی اشاعت کا سلسلہ جاری کر دیا۔ لینن کی وفات کے بعد یہ سلسلہ بدستور سرگرمی سے جاری رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹروٹسکی کی طرف سے تبدیلی کی جو بھی تجویز پیش ہوتی، وہ لینن سے قلت عقیدت کے باعث ایک غیر مناسب چیز سمجھی جاتی۔ ٹروٹسکی کے پیرووں کو انھوں نے ملک سے باہر ملازمتیں دے دے کر منتشر کر دیا۔ لینن کا وصیت نامہ شائع نہ ہونے دیا، تاکہ پارٹی کے عام ممبروں کو سٹالن کے متعلق لینن کے شبہات کا علم نہ ہو سکے۔ ٹروٹسکی نے لینن کے خلاف سابق میں جو بیانات دیئے تھے، وہ سب شائع کر دیئے، بلکہ ٹروٹسکی کی نوشتہ تاریخ پر بھی نظر ثانی میں تامل نہ کیا، تاکہ اس کی حیثیت گر جائے۔ انھیں یقین تھا کہ ٹروٹسکی ایک مخلص کمیونسٹ ہے اور وہ بالشویکوں کے مخالف گروہوں

---

[1] Zinovev

[2] Kamnev

کو کبھی اپنے گرد جمع نہ کرے گا، جیسے پرانے بالشویک، اشتراکی انقلابی یا نئی اقتصادی پالیسی کے آدمی تھے۔

۱۹۲۵ء کے اوائل میں سٹالن اور اس کے حلیفوں نے ٹروٹسکی کو مجبور کر دیا کہ وزارت جنگ سے مستعفی ہو جائے۔ اس کے بعد تین آدمیوں کا اتحاد بھی ٹوٹ گیا۔ سٹالن نے بخارن اور سیاسی بیورو کے دوسرے ارکان سے اتحاد کر لیا، جنھیں بیورو میں دایاں بازو سمجھا جاتا تھا اور اس میں ان آدمیوں کا تقرر کرنے لگا جو اس کے پیرو تھے۔ اس نے جو اقتدار فراہم کر لیا تھا، اس سے کام لے کر اپنے سابقہ حلیفوں کو پالیسی کے مسائل پر شکست دے دی۔ ۱۹۲۶ء میں ان لوگوں نے ٹروٹسکی کے ساتھ اتحاد کرنے کی کوشش کی، جس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس وقت سٹالن نے زنوویف کو یہ الزام لگا کر سیاسی بیورو سے نکال دیا کہ وہ فوج سے سازباز کر رہا ہے۔ اس کے بعد ٹروٹسکی بیورو سے نکالا گیا اور زنوویف کو بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کی صدارت سے الگ کر دیا گیا۔

۱۹۲۷ء میں انگلستان اور چین میں سٹالن کی خارجہ پالیسی کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا اور مخالفین نے کھلم کھلا احتجاجات کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین پارٹی سے خارج کر دیے گئے۔ ٹروٹسکی نے اپنے نظریات سے ہٹنا گوارا نہ کیا، چنانچہ اسے سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ اس طویل جلاوطنی کی پہلی منزل تھی، جس میں وہ سائبیریا سے ترکی، پھر ناروے اور آخر میں میکسیکو چلا گیا۔ وہیں ۱۹۴۰ء میں ایک قاتل نے برف توڑنے والے آلے سے اسے قتل کر دیا۔ باقی لوگ اپنے نظریات سے دست بردار ہو گئے اور انھیں زندگی کی نئی مہلت مل گئی۔ سٹالن کی کامیابی ہر اعتبار سے مکمل اور غیر مشتبہ تھی۔

انسٹھواں باب

سٹالن کی برتری

روس کے بین الاقوامی معاملات

۱۹۲۸ء ۔ ۱۹۴۱ء

(۱)

تمہید

کمیونسٹ پارٹی کانگرس نے دسمبر ۱۹۲۷ء میں ٹروٹسکی کو باہر نکال دیا۔ نئی اقتصادی پالیسی ختم کردی اور اعلان ہوگیا کہ اشتراکیوں کا نیا جارحانہ اقدام ۱۹۲۸ء میں شروع ہوگا۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان تیرہ سال کی مدت میں روس کی داخلی زندگی کے اندر ایسے تغیرات ہوئے، جو تقریباً ناقابلِ یقین نظر آتے ہیں۔ مثلاً اجتماعی زراعت شروع ہوگئی۔ صنعت و حرفت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ جبری مزدوری سے کام لیا گیا۔ بار بار پارٹی کو مخالف عناصر سے پاک کرنے کے سلسلے میں سیاسی مخالفت کی بیخ کنی کردی گئی۔ ایک پارٹی کی مملکت کے لیے پوری مشینری تیار کرلی گئی اور عمرانی و ذہنی زندگی کے تقریباً ہر دائرے میں بورژوائی معیار از سرِنو قائم کردیئے گئے۔

اجتماعی زراعت

۱۹۲۸ء میں کسان شہروں کو اتنی مقدار میں غلّہ نہ دے سکے جس کی ضرورت تھی۔ اس سے واضح ہوگیا کہ ۱۹۱۷ء میں زمین کی تقسیم کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور نئی اقتصادی پالیسی میں جو مراعات دی گئی تھیں، ان میں کتنے خطرے مضمر تھے۔ چھوٹی چھوٹی انفرادی ملکیت والے کھیتوں میں اتنی پیداوار ہو بھی نہیں سکتی تھی، جو شہری آبادی کی شکم پُری کرسکتی۔ چنانچہ مزدوروں کے لیے غذائی جنسوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ کولاک مزید مراعات کے طلبگار تھے۔ غلّہ ذخیرہ کرلیا گیا تھا۔ سٹالن اکثر مفصلات میں طبقاتی کشمکش کی آگ کو ہوا دینے کے خلاف اظہارِ رائے کرچکا تھا اور یہ بھی کہہ چکا تھا کہ تیزی سے یا وسیع پیمانے پر اجتماعی زراعت نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت نے جو اقتصادی منصوبہ پیش کیا، اس میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۳۳ء تک زیادہ سے زیادہ بیس فی صد روسی کھیتوں میں اجتماعی زراعت کا سلسلہ شروع ہوگا، لیکن ۱۹۲۹ء میں سٹالن نے فوراً عام اجتماعی

زراعت کا حکم دے دیا۔ کولاکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا اور روس میں انفرادی کاشتکاری ختم کر دی گئی۔

حکومت کے پاس نہ روپیہ تھا اور نہ اتنی ساکھ تھی کہ غذائی جنسوں کی درآمد کی جا سکے، مزید براں حکومت کی مشینری کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ کسانوں سے چھپائی ہوئی فصلیں باہر نکلوا سکیں۔ لہٰذا حکومت نے چھوٹے کسانوں کو اپنا طرفدار بنا لیا۔ قرار یہ پایا کہ اگر چھوٹے کسانوں کی امداد سے کولاکوں کی جنسوں کا سراغ مل سکے تو انھیں (چھوٹے کسانوں کو) اجتماعی زراعت میں شامل کر لیا جائے گا اور اس زراعت میں کولاکوں کی زمینیں اور آلات کشاورزی بھی شامل ہو گئے۔

اغلب یہ ہے کہ بہت سے چھوٹے کسانوں (نجی ملکیت والے کسانوں سے بیس فی صد یا پچاس لاکھ گھرانوں) نے اس موقع کا خیر مقدم کیا۔ ابتدا میں حوصلہ افزا روداد میں ملیں تو سٹالن آخری قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء کے اواخر میں اس نے اعلان کر دیا کہ کولاکوں کو ایک طبقے کی حیثیت میں ختم کر دیا جائے گا۔ ان کے گھرانے بیس لاکھ ہوں گے اور پوری تعداد ایک کروڑ سمجھنی چاہیے۔ ان کی تمام املاک پر قبضہ کر لیا گیا اور ان کے لیے نئی اجتماعی زراعت میں شرکت ممنوع قرار دی گئی۔ چونکہ ان کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے اجتماعی زراعت نے ایک کابوس کی شکل اختیار کر لی۔

اب کسانوں کو کلدار توپوں کے ذریعے سے حکم ماننے پر مجبور کر دیا گیا۔ کولاک جلاوطن کر دیئے گیے، انھیں بیگار یوں کے کیمپوں میں یا سائبیریا کے بنجر خطوں میں بھیج دیا گیا۔ کسانوں نے اجتماعی زراعت کے خلاف بغاوت کی، فصلیں جلا دیں، ہل توڑ دیئے اور اپنے مویشی حکومت کے حوالے کرنے کے بجائے مار ڈالے۔ چنانچہ روس کے نصف گھوڑے، پینتالیس فی صد مویشی اور دو تہائی بھیڑ بکریاں اس موقع پر ذبح ہو گئیں۔ روسی مویشیوں کے اس نقصان کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی، جو اجتماعی زراعت کے موقع پر انھیں پہنچا تھا۔ زمین غیر مزروعہ پڑی رہی اور آئندہ چند سال میں جو قحط پڑا، اس میں لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء میں سٹالن کو احساس ہوا کہ اس نے خوفناک غلطیاں کیں۔ پھر ایک بیان دیا جس میں سارا الزام مقامی افسروں پر عائد کر دیا، جو پروگرام کو جلد سے جلد جاری کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ چند ماہ پیشتر کے اپنے احکام کی تنسیخ سے وہ اس نفرت کا ہدف نہ بنا، جو صرف اس کے خلاف پیدا ہوتی۔ بہت سے روسی کسان معمول کے مطابق اپنا غصہ ان لوگوں پر نکال لیتے تھے، جو ان کے سامنے تھے، یعنی مقامی افسر اور اس مربی کو ہر الزام سے مبرا سمجھنے کے لیے تیار رہتے تھے، جو دارالحکومت میں مقیم تھا۔

اس خوفناک سال میں پچاس فی صد روسی زمینیں تیزی سے اجتماعی زراعت کے لیے وقف ہو گئیں۔ آئندہ تین سال کے اندر اس مقدار میں صرف دس فی صد کا اضافہ ہوا۔ گویا سنہ ۱۹۳۳ء تک ساٹھ فی صد زمینوں میں اجتماعی زراعت شروع ہوئی تھی۔ بعد میں یہ تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۹ء میں چھیانوے فی صد روسی زمینیں اجتماعی زراعت کے تابع آ چکی تھیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں گویا اڑھائی لاکھ اجتماعی گروہ تھے، جو نوے کروڑ ایکڑ زمین میں کھیتی باڑی کرتے تھے اور ایک کروڑ نوے لاکھ خاندانوں کے لیے قوتِ لایموت فراہم کرتے تھے، مگر جو زیادتیاں ابتدا میں ہوئی تھیں، ان کا اعادہ

کبھی نہ کیا گیا۔

۱۹۳۰ء کے بعد اجتماعی زراعت کے ابتدائی قواعد میں ہی ترمیمیں ہو گئیں۔ ابتدا میں اجتماعی زراعت کے دو بڑے نمونے تھے، اوّل "سوخوز"[1] یعنی سوویٹ فارم۔ یہ اصل میں اجتماعی زراعت نہ تھی، بلکہ سرکاری زمینوں پر سرکاری اور اُجرت پر کام کرنے والے مزدور کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔ یہ سب حکومت کے ملازم تھے۔ دوسرے کو "کل خوز"[2] کہتے تھے۔ یہی صحیح اجتماعی زراعت کا نمونہ تھا۔ "سوخوز" کا مدعا یہ تھا کہ حکومت ان میں غور و تحقیق اور زراعت کے نشو و نما کی تدبیروں کے عملی نمونے پیش کرتی رہے۔ یہ فارم رقبے میں بہت وسیع تھے۔ سٹالن نے صدی کے چوتھے عشرے میں انھیں ختم کر دیا، کیونکہ حکم دے دیا: "جو چار کروڑ ایکڑ زمین ان کے لیے الگ کی گئی تھی، وہ سب "کل خوزوں" میں تقسیم کر دی جائے۔" ۱۹۴۱ء تک "سوخوزوں" کے پاس برائے نام رقبے رہ گئے۔

ابتدا میں "کل خوزوں" کے بھی دو نمونے تھے، اوّل کل خوز اشتمالی، جن میں تمام ارکان بلا استثنا تمام چیزوں کے مالک ہوتے تھے، دوم کل خوز آرٹل[3] یعنی تعاونی کل خوز، جن میں "نجی" جائداد کا بھی ایک حصہ ارکان کو شامل رکھنے کی اجازت تھی۔ سٹالن نے چوتھے عشرے میں نظام کے اندر ترمیمات کر دیں تو تعاونی کل خوز تعداد میں بہت زیادہ بڑھ گئے۔ ان فارموں میں ہر کنبہ مکان، کچھ مویشی اور معمولی آلات کا مالک ہوتا ہے ان چیزوں کے متعلق ہر مالک اپنے جانشینوں کو وصیت کر سکتا ہے لیکن زیادہ تر کام ان زمینوں پر کیا جاتا ہے، جن میں کھیتی باڑی مشترکہ ہوتی ہے۔ ہر اجتماعی فارم کا اپنا انتظامی بورڈ ہوتا ہے، جو حکومت کے روبرو جوابدہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی بورڈ کے ذریعے سے کسانوں کے کام کی نگرانی کی جاتی ہے۔ انھیں مختلف دستوں میں منظم کر لیا جاتا ہے۔ ہر دستے کا ایک رئیس ہوتا ہے۔ جس طرح کارخانوں کو کام کی اجرت دی جاتی ہے، اسی طرح کسان اپنے کام کے مطابق معاوضہ پاتے ہیں۔ کام کے اندازے کے لیے کارکردگی کے دن کا پیمانہ مقرر ہے۔ کسی فارم کے انتظامات میں ایک دن کا کام مزدوروں کے تین دن کے کام کے برابر ہوتا ہے، لیکن کھیتی میں سے نلائی کی جائے تو کسان کو صرف نصف یوم کی مزدوری ملتی ہے۔

ہر "کل خوز" کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقررہ نرخ پر جنس کی مقررہ مقدار حکومت کے حوالے کرے اور ایسی جنس کی مقدار اتنی رکھی جاتی ہے، جس سے شہری آبادی کا گزارہ ہو سکے، خصوصاً اُن مزدوروں کا جو معیاری صنعتوں میں کام کرتے ہیں، نیز روسی فوج کا۔ کل خوز غلّے کے علاوہ حکومت کو ٹیکس بھی ادا کرتا ہے، جو مقامی تعمیرات اور تعلیم میں صرف کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ادا کر کے جو بچ رہے، کسان اسے صارفین کے ہاتھ براہ راست فروخت کر

---

۱ Sovkhoz

۲ Kolkhoz

۳ Kolkhoz Artel

سکتا ہے۔ اس میں کسی دلال یا واسطے کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن نجی طور پر جنس خرید کر دوسرے کے ہاتھ بیچنا سٹا ہے، اس کے لیے سزا مقرر ہے۔ ۱۹۳۴ء کے بعد حکومت کم از کم دو تہائی مالیہ ان جنسوں کو دوبارہ بازار میں فروخت کر کے حاصل کرتی ہے، جو کل خوزوں سے کم قیمت پر حاصل کی گئی تھیں۔ حکومت کے اس نفع کو مقررہ کاروبار کا ٹیکس قرار دیا جاتا ہے۔

حکومت کل خوزوں کا ضبط و نظم رکھتی ہے اور انھیں امداد دیتی ہے۔ مثلاً جگہ جگہ ٹریکٹروں کے مرکز بنے ہوئے ہیں، جہاں مکانیکی آلات موجود رہتے ہیں۔ "کل خوز" اپنے ٹریکٹر نہیں خرید سکتے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ مرکزوں سے ٹریکٹر کرایے پر لیں اور ان کے لیے جو فیس ادا کرنی پڑتی ہے وہ فصل کے بیس فیصد حصے تک جا سکتی ہے۔ یہ ادارے سیاسی نگرانی کے اہم مرکز ہیں اور ان میں ایسے آدمی رکھے جاتے ہیں، جو حکومت کے کارندے ہوتے ہیں۔ وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کسے ٹریکٹر دیے جائیں اور کتنی تعداد میں دیے جائیں۔ اس طرح انھیں "کل خوزوں" کی کامیابی پر براہ راست اثر ڈالنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ تمام کل خوزوں کے منتظموں کے لیے لازم ہے کہ ان کی خیرسگالی کا خاص خیال رکھیں۔

بالعموم اجتماعی زراعت کا مدعا یہ تھا کہ صنعتی مزدوروں کے لیے غذائی جنسیں حاصل کرنا زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے اور انھیں اصول پر زراعت منظم کی جائے۔ صنعتی مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور یہ لوگ کسانوں ہی میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔ اجتماعی زراعت کا نتیجہ یقیناً یہ ہوا کہ حکومت کو غذائی جنسیں زیادہ مقدار میں ملنے لگیں اور حکومت کے لیے ان کی بہم رسانی زیادہ آسان ہو گئی۔ اور کسان خاصی تعداد میں کھیتی باڑی سے فارغ ہو کر صنعت میں لگ گئے۔ لیکن یہ بھی یقینی معلوم ہوتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اضافہ زیادہ نہ ہوا، بلکہ اکثر حالات میں فی یونٹ پیداوار کم ہو گئی۔

صنعت و حرفت کی ترقی

زراعت کی ترقی کے ساتھ صنعت و حرفت کی ترقی کا بھی گہرا تعلق تھا۔ یہاں بھی سٹالن نے صنعتکاری کے بڑے بڑے ماہروں کے عالیشان منصوبے نفرت سے ٹھکرا دیے اور ۱۹۲۷ء میں یہ تجویز پیش کی کہ ہر سال صنعتی پیداوار میں پندرہ فی صد کا اضافہ ہوتا رہے۔ جس طرح اس نے زراعت میں اجتماعیت کے لیے اچانک انتہائی سرگرم کوششیں شروع کر دی تھیں، اسی طرح صنعت کے لیے بھی یکایک جبری مزدوری کا سلسلہ جاری کر دیا، اگرچہ ابتدا میں وہ تدریج سے کام لینے کا خواہاں تھا۔

۱۹۲۸ء سے پنجسالہ منصوبوں کا دور شروع ہوا۔ ہر نئے پنجسالہ دور میں سابق دور کی ترقیات سے بدرجہا زیادہ اور وسیع ترقیات کو نصب العین بنا دیا جاتا۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں سٹالن نے صنعت و حرفت کے لیے بہت زیادہ رقمیں بہ طور سرمایہ فراہم کر لیں اور جون ۱۹۳۰ء میں اعلان کر دیا کہ سال رواں کے اندر اندر صنعتی پیداوار میں پچاس فی صد اضافہ ضرور ہو جانا چاہیے۔ اس تناسب پر پہنچنا بالکل ممکن نہ تھا اور سٹالن نے خواہ مخواہ ایک خیالی سا عدد متعین کر دیا تھا۔

پہلا پنجسالہ منصوبہ ۱۹۲۸ء میں شروع ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۳۲ء تک لوہا پینتیس لاکھ ٹن سالانہ سے بڑھ کر ایک کروڑ سالانہ پہنچ جانا چاہیے۔ ۱۹۳۲ء شروع ہوا تو سٹالن نے یکایک ایک کروڑ ستر لاکھ ٹن کا مطالبہ پیش کر دیا۔ یقیناً یہ مقدار پوری نہ ہوئی، لیکن سٹالن کے مطالبے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ روس کو ایک زرعی ملک کی بجائے صنعتی ملک بنا دینے کے لیے کس سرگرمی سے کوشاں تھا۔

اس تیز ترقی کے لیے ایک وجہ یہ تھی کہ اجتماعی زراعت کو سرگرمی سے اعلیٰ پیمانے پر پہنچایا جا رہا تھا۔ اور ایسی کھیتی باڑی کے لیے مشینری کی ضرورت کا سٹالن کو پورا احساس تھا تاہم ۱۹۲۸ء کے اواخر تک روس میں کل ساٹھ ہزار ٹریکٹر تھے ۱۹۲۹ء تک سٹالن نے تیس ہزار ٹریکٹر جمع کر لیے تھے، مگر یہ تعداد ضرورت کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ لازم تھا کہ لاکھوں مشینیں تیار کی جائیں اور انھیں چلانے کے لیے پٹرول مہیا کیا جاتا۔ چونکہ ملک کے دیہاتی علاقوں میں بجلی پہنچانا ضروری تھا اور اس کے لیے بجلی کے ہزاروں مرکز درکار تھے اور لاکھوں کروڑوں کو یہ سکھانا ضروری تھا کہ مشینوں سے زراعت میں کیونکر کام لیا جاتا ہے، مگر نہ تو ایسی تعلیم دینے والے لوگ موجود تھے اور نہ اتنے کارخانے تھے کہ ضرورت کے مطابق مشینیں تیار کر سکیں۔ خام مال کی پیداوار ناکافی تھی اور اس سے کام لینے والی مشینیں موجود نہ تھیں۔

ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی ایک وجہ جزواً مارکس کے اصول میں مضمر تھی۔ روس میں پرولتاریا تقریباً ناپید تھا۔ پرولتاری انقلاب برپا کر کے مارکس کی تمام پیشگوئیوں کی مخالفت کی جا چکی تھی۔ اگرچہ کمیونسٹ ابتدا میں سیاسی کامیابی حاصل کر چکے تھے، مگر سٹالن کو احساس تھا کہ سرمایہ داری کی جڑیں روس کے اندر کمیونزم کے مقابلے میں زیادہ مستحکم و استوار ہیں اور یہ صورت حال اس وقت تک لازماً جاری رہے گی، جب تک چھوٹے چھوٹے کسان ملک کے اندر موجود رہیں گے۔ کمیونسٹوں کو افسوس تھا کہ دنیا بھر کے پرولتاری امید قائم کیے بیٹھے ہیں کہ روس کو صنعتی ملک بنا لیا جائے گا۔ ساتھ ہی کمیونسٹ عزم کیے بیٹھے تھے کہ اپنی تائید و حمایت کے لیے ایک زبردست روسی پرولتاریوں کا گروہ قائم کر لیں، جو سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ مزید براں سٹالن عزم کیے بیٹھا تھا کہ روس کو ہر اعتبار سے کفیل بالذات بنا دے اور اس کے سوا ایک ملک کے اندر اشتراکیت کا نظریہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تہہ میں ایک اور محرک بھی تھا، جو مارکس کے اصول سے کم قوی نہ تھا یعنی روسی قوم پرستی۔

اس محرک کی قوت کا اندازہ ایک تقریر سے ہو سکتا ہے جو سٹالن نے ۱۹۳۱ء میں کی۔

"پیشقدمی میں ذرا بھی ڈھیل راہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پیچھے رہ جائیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں وہ شکست کھا جاتے ہیں۔ ہم شکست نہیں کھانا چاہتے۔ نہیں، ہم کبھی اس کے روادار نہیں ہو سکتے ...... پرانا روس ..... صرف اپنی پسماندگی کے باعث بار بار شکست کھاتا رہا۔ اسے تاتاری خوانین نے شکست دی۔ ترک بیں لارڈوں نے شکست دی۔ پولینڈ اور لتھونیا کے امراء نے شکست دی۔ انگریز اور فرانسیسی سرمایہ داروں نے

شکست دی۔ جاپانیوں نے شکست دی۔ گویا سب نے اسے ہرایا، صرف اس لیے کہ وہ پسماندہ تھا۔ فوجی اعتبار سے پسماندہ تھا۔ ثقافتی اعتبار سے پسماندہ تھا۔ سیاسی، صنعتی اور زرعی اعتبار سے پسماندہ تھا۔ اسے اس لیے شکست دی جاتی رہی کہ یہ دشمنوں کے لیے مفید تھی اور ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہ تھا...... ہم ترقی یافتہ ملکوں سے پچاس بلکہ ایک سو سال پیچھے ہیں۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ اپنی پسماندگی کی تلافی دس سال کے اندر اندر کرلیں۔ یا تو ہمیں تلافی کرلینی چاہیے یا دشمن ہمیں کچل کر رکھ دیں گے[1]

اس اقتباس کے پیشِ نظر تاریخ کے متعلق کچھ بھی سمجھا جائے (اور اس میں روس کی فاتحانہ جنگوں کا ذکر بالکل حذف کر دیا گیا ہے)۔ اس سے ظاہر ہے کہ روس کے قومی مفاد کی جو تعبیر سٹالن نے کی، اس کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ ممکن ترقی لازم تھی اور یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ دس سال بعد جرمنوں نے حملہ کیا۔ سٹالن اس کے متعلق ٹھیک ٹھیک پیشگوئی تو نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسے احساس ضرور تھا۔

سٹالن کا احساس یہ بھی تھا کہ اسے صنعت وحرفت کے ناظموں پر برابر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالتے رہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو سامان جس مقدار میں مطلوب ہے، وہ تیار ہوتا رہے گا۔ جس طرح زراعت کے دائرے میں کامیابی کے لیے اس پر اک گونہ دیوانگی سی طاری ہوگئی تھی، وہی کیفیت صنعت وحرفت کے دائرے میں پیش آئی۔ کوئلے اور لوہے میں ۱۹۳۰ء کے اندر پچاس فی صد اضافے کے بجائے صرف چھ سے دس فی صد تک اضافہ ہوا۔ پہلے پنجسالہ منصوبے میں جو نصب العین رکھے گئے تھے، وہ یقیناً پورے نہ ہوئے اگرچہ ان کے پورے ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ فوراً دوسرا منصوبہ منصوبہ کمیشن نے تیار کر لیا۔ اس پر عمل شروع ہو گیا اور یہ ۱۹۳۷ء میں ختم ہوا۔ تیسرے منصوبے میں ہٹلر کے حملے کے باعث خلل پیدا ہو گیا۔ ہر مرتبہ زیادہ سے زیادہ زور بھاری صنعتوں یعنی فولاد، بجلی کی قوت، سیمنٹ، کوئلے اور تیل پر دیا جاتا۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان فولاد کی پیداوار ساڑھے چار گنا اور بجلی کی قوت آٹھ گنا ہوگئی۔ سیمنٹ دگنا بننے لگا۔ کوئلے کی تعداد چوگنی ہوگئی۔ تیل تگنے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اسی قسم کی ترقی دواؤں اور مشینوں میں ہوئی۔ ریلوے میں بہت اضافہ ہو گیا اور نئی گاڑیاں بن جانے سے سامان لے جانے کی استعداد چار گنا ہوگئی۔

۱۹۴۰ء تک روس کی صنعت وحرفت جرمنی کے قریب جا پہنچی تھی، اگرچہ روسیوں کی صلاحیت کار اور روسی معیار خاصا پست تھا۔ باقی یورپ نے جو کام پچیس سال میں انجام دیا، روس نے وہ کام تقریباً بارہ سال میں پورا کر دیا۔ مختلف کارکنوں کے اعلیٰ کارنامے وسیع پیمانے پر شائع کر کر کے لوگوں میں جوش پیدا کیا گیا۔ ایسے کارکنوں کو سٹاخانووائٹ[2] کہا جاتا

---

[1] آئزک ڈیوٹ شا Isac Deutsher کی کتاب Stalin ص ۳۲۸

[2] Stakhanovite

تھا۔ یہ اصلاً کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے ایک شخص کا نام تھا جس نے کوئلے کی پیداوار میں اعلیٰ معیار قائم کر دیا تھا۔ ایسے لوگوں کو گراں قدر انعام دیئے جاتے تھے اور دوسرے لوگوں سے اپیلیں کی جاتی تھیں کہ اس اشتراکی مقابلے میں بہادر مزدوروں یعنی سٹاخانو وائٹوں کی پیروی کی جائے۔

یہ سب کچھ خوفناک مشقتیں اٹھا کر پورا کیا گیا، لیکن چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ اکثر مزدوروں اور کارکنوں میں ویسا ہی جوش پایا جاتا تھا، جیسا میدانِ جنگ کے اندر سپاہیوں میں ہوتا ہے۔ یقیناً ان کی حیثیت میدانِ جنگ کے سپاہیوں کی سی تھی۔ اکثر تجربہ کار کارکن قیمتی مشینوں کو خراب کر دیتے یا تباہ کر ڈالتے اور انھیں الگ کرنا پڑتا۔ پیداوار کا نصب العین ایسا رکھا جاتا کہ کارخانے کے ناظم ناممکن معیاروں کو پورا کرنے کی سرگرم کوششوں میں مشینری کو نقصان پہنچا دیتے۔ مختلف مسائل لامتناہی بنے ہوئے تھے، مثلاً مشینوں کی درستی یا پرانی مشینوں کی جگہ نئی مشینیں لگانے کا معاملہ خام مال کی فراہمی اور صرف میں توازن قائم رکھنے کا مسئلہ۔ ان کے علاوہ نئے مرکزوں میں مزدوروں کے لیے مکانوں کا مسئلہ تھا۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ تمام کارخانوں کو منتقل کر کے یورال اور سائبیریا کے علاقوں میں پہنچا دیا جائے۔ ان لامتناہی مسائل کے سلسلے میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ ایک امریکی چشم دید شاہد کا اندازہ ہے کہ صرف آہن سازی کی جنگ میں اتنے آدمی مقتول و مجروح ہوئے جتنے مارنے کی جنگ میں ہوئے تھے۔

جس حد تک نظم و نسق کا تعلق ہے، روسی اقتصادیات کی ذمہ دار خود حکومت ہے۔ حکومت کی طرف سے منصوبہ بندی کے لیے جو کمیشن مقرر ہے (جسے گوسپلین[۱] کہتے ہیں)، وہ پنجسالہ منصوبہ تیار کرتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ہر کارخانے کے انتظامی عملہ کی نگرانی کرتا ہے۔ سرکاری بینک (جسے گوس بنک[۲] کہتے ہیں) سرمایے کا انتظام کرتا ہے۔ ایک اقتصادی مجلس مختلف ایجنسیوں کے کام کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کا جزوی اندازہ بھی کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بے حد و نہایت ہیں۔ اس کے مختلف شعبے ہیں، مثلاً دھاتوں کی صفائی اور کیمیا کے شعبے (لوہا، فولاد، دوسری دھاتیں، دوائیں، ربڑ، الکحل)، دفاعی شعبہ (ہوابازی، اسلحہ، گولی بارود، ٹینک، جہاز)، مشینری کا شعبہ (بھاری مشینیں، متوسط درجے کی مشینیں، مشینوں کے پرزے، برقی صنعت)، ایندھن اور قوت کا شعبہ (کوئلہ یا تیل، برقی قوت) زراعت اور فراہمی جنس کا شعبہ، نیز صارفین کا سامان (غلہ، گوشت، دودھ، مکھن، پنیر، مچھلی، کپڑا اور ملکی صنعت و حرفت) مثلاً لوہے اور فولاد کے سلسلے میں پیداوار کے لیے مختلف ٹرسٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی کانیں ہیں۔ اپنے کارخانے ہیں، جن میں دھاتیں صاف کی جاتی ہیں اور ان سے مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ متحدہ طریق پر کام کرنے والے گروہ ہیں، جیسا یورال میں میگنیٹوگورسک[۳] کے مقام پر کام کر رہا ہے۔

۱؎ Gospian

۲؎ Gosbank

۳؎ Magnitogorsk

ہر کارخانے میں دوسرے اجتماعی مرکزوں کی طرح ناظم کا فرض ہے کہ مقررہ مصارف کے اندر رہتے ہوئے مقررہ مقدار میں چیزیں تیار کرادے۔ پیداوار کے نصب العین کے متعلق اس سے مشورہ کیا جاتا ہے اور اسے اپنے عملہ کے انتخاب، مزدوروں کی تعیناتی اور خام مال کے متعلق خاصے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ پورا حساب حکومت کے روبرو پیش کرے اور حکومت ہی خام مال کی قیمت مقرر کرتی ہے، جس کا ادا کرنا ناظم کے ذمہ ہوتا ہے۔

عمرانی اثر

اقتصادی پروگرام کے عمرانی اثرات ڈرامائی تھے۔ شہری آبادی ۱۹۲۶ء میں اٹھارہ فی صد تھی ۱۹۴۰ء میں تینتیس فی صد پر پہنچ گئی۔ جن شہروں کی آبادی پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان تھی، ان کی تعداد دگنی اور جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی، ان کی تعداد چوگنی ہوگئی۔ بہت بڑے بڑے شہر مثلاً ماسکو اور لینن گراڈ (جس شہر کا نام پہلے پیٹرز برگ، پھر پیٹروگراڈ رکھا گیا تھا۔ لینن کے بعد اس کا نام لینن گراڈ رکھ دیا گیا) تقریباً دگنے ہوگئے۔ چھوٹے شہروں میں سے صرف ایک مثال لے لیجیے۔ سائبیریا کے ایک شہر الما آتا[1] کی آبادی ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان پینتالیس ہزار ہوگئی۔ گویا پرانے عمرانی نقشے میں انتہائی تغیر واقع ہوگیا۔

نئی اقتصادی پالیسی کے دور میں ہر شخص کو اپنے لیے کام منتخب کر لینے کی آزادی تھی۔ یہ آزادی ختم ہوگئی۔ مختلف صنعتی کارخانے کولخوزوں کے ساتھ مزدوروں کے متعلق معاہدے کر لیتے، ان کے مطابق کولخوز مجبور ہو جاتے کہ مزدوروں کی مقررہ تعداد کھیتوں سے کارخانوں میں بھیجیں۔ اکثر لوگوں کو مرضی کے خلاف بھیجا جاتا تھا۔ جن کسانوں نے اجتماعی زراعت کی مخالفت کی تھی، انھیں پکڑ کر مزدوروں کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ پرانے بالشویکوں کا تصور یہ تھا کہ قید میں قیدیوں کو ازسرنو تعلیم دینی چاہیے۔ یہ تصور ختم ہوگیا اور اس کی جگہ غلام مزدوروں کا تصور بروئے کار آگیا۔ کارخانوں میں پیشہ ور انجمنیں (ٹریڈ یونین) حکومت ہی کا آلۂ کار بن گئیں۔ یونینوں کا اصل کام یہ ہے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو۔ کام انتہائی صلاحیت سے کیا جائے۔ مزدوروں کو غیر حاضری اور کام میں سستی سے باز رکھا جائے۔ انھیں ہڑتال کی اجازت نہیں اور وہ انتظامی عملہ سے جھگڑا نہیں کر سکتیں۔ البتہ انھیں یہ حق حاصل ہے کہ عمرانی بیمے کے قوانین پر عمل کریں اور گفت و شنید سے مزدوروں کے لیے رہنے سہنے کے بہتر انتظامات کرائیں۔

گویا سوویٹ روس میں بڑے بڑے زمینداروں کا خاص حقوق والا طبقہ تو انقلاب کے وقت کمزور تھا اور ختم ہوگیا۔ صنعتی تجارتی اور مالی بورژوا کا جو طبقہ انقلاب کے وقت بروئے کار آرہا تھا، اسے نئی اقتصادی پالیسی کے لیے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں اسے تباہ کر دیا گیا۔ پرانے اہل علم میں سے اکثر انقلاب کے حامی تھے، مگر وہ سٹالن کی ڈکٹیٹری پر راضی نہ ہو سکے۔ ملک چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ انقلاب کے بعد روس میں سے کوئی پندرہ لاکھ افراد باہر جا چکے تھے۔ ان میں

---

[1] Alma Ata

سے نہایت کم ناہ روس کے رشتہ دار تھے، حالانکہ اہلِ مغرب کا تصور اس کے برعکس ہے۔ ان میں سے جو لوگ ملک کے اندر رہے، وہ نئے اہلِ علم کے ہم خیال بننے پر مجبور ہو گئے۔ سٹالن اہلِ علم کو بہت اہم طبقہ قرار دیتا ہے۔ ان سب کو مجبور کر دیا گیا کہ سٹالن کا نیا عقیدہ قبول کریں اور بیرونی دنیا میں دلچسپی لینے سے باز رہیں۔ ان اہلِ علم سے یہ توقع قائم کر لی گئی کہ وہ تکنیکی پیشقدمی پر توجہ کریں گے۔

اگرچہ ان عمرانی تغیرات کا اثر یہی ہوتا کہ تمام طبقے برابر ہو جاتے، مگر سٹالن مساوات کے پرانے بالشویک اصول کے خلاف تھا۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ ہر شخص سے صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو ضرورت کے مطابق چیزیں دی جائیں۔ یہ اصول چھوڑ کر نیا اصول اختیار کیا گیا یعنی ہر شخص سے صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق اُجرت دی جائے۔ لینن نے حکومت کے کسی بھی رکن کو ہنرمند مزدوروں سے زیادہ تنخواہ دینے کی اجازت نہیں دی تھی۔ سٹالن نے اس کی جگہ نیا نظام جاری کیا جس میں مختلف افراد کے لیے ترغیبات اور محرکات موجود تھے۔ نوکر شاہی کی ایک چھوٹی سی اقلیت، ہنرمند مزدور، کارخانوں کے ملازم اور کولخوزوں کے کامیاب سرپنچ غیر ہنرمند مزدوروں اور کسانوں کی بہت بڑی اکثریت کے مقابلے میں گرانقدر تنخواہیں لیتے تھے۔ ان لوگوں میں اہلِ قلم، فنکاروں، موسیقاروں وغیرہ کا اضافہ ہو گیا، جو اپنی صلاحیتیں بالشویک نظام کی تقویت کے لیے وقف کر دینے پر آمادہ تھے۔ یہ لوگ نیا منتخب طبقہ بن گئے۔ ان کے درمیان اور محنت کش عوام کے درمیان وسیع اقتصادی و عمرانی خلیج حائل ہو گئی۔ ایسے نظام کو تقویت پہنچانا ان کے ذاتی مفاد کا تقاضا تھا، کیونکہ وہ سب کچھ اسی نظام سے حاصل کرتے تھے۔ یہ نہ ہوتا تو وہ کچھ بھی نہ ہوتے۔

جو لوگ سوویٹ نظام کا پروپیگنڈا کرتے ہیں، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ عارضی حالت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوویٹ یونین کا موجودہ معاشرہ اشتراکی ہے۔ کیمونزم کے نصب العین کی طرف پیشقدمی جاری ہے، مگر ابھی اس تک پہنچ نہیں سکے۔ مارکس کی پیشگوئی یہ تھی کہ حکومت بالکل ختم ہو جائے گی اور اس کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کی جگہ سٹالن نے ایک ایسی حکومت کا نظام قائم کر دیا جس کا اقتدار بے پناہ ہے۔ اسی طرح مارکس کی مساوات کے بجائے ذات پات کا ایک نیا نظام جاری ہو گیا۔ پیداوار کے وسائل سوویٹ یونین میں عوام کی ملکیت ہیں۔ مارکس کا اصرار یہی تھا، لیکن حکومت کا اقتدار خاص حقوق والے نئے طبقے کا ظہور، کروڑوں انسانوں پر جبر و ظلم اور انقلاب کے بعد قوت کا بے پناہ استعمال سب سٹالن کی پیش کردہ چیزیں ہیں۔

ساٹھواں باب

سٹالن کی برتری ـ روس کے بین الاقوامی معاملات

۱۹۲۸ء ـ ۱۹۴۱ء

(۲)

غیر مطلوب عناصر کے خلاف مقدمات

سٹالن کے پروگرام کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے کے سلسلے میں مخالفت سے بھی سابقہ پڑا۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے بحرانی دور میں ـــــ جب صنعتی نصب العینوں کی تکمیل نہیں ہو رہی تھی اور اطراف ملک میں قحط کا دور دورہ تھا ـــــ نظام حکومت کے اندر اور باہر بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ افسروں کے چھوٹے سے حلقے نے ایک یادداشت لوگوں کے پاس بھیجی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ سٹالن کو جنرل سکریٹری کے عہدے سے معزول کر دیا جائے اور پارٹی کو ایسا کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ سٹالن نے ان لوگوں پر سازش کا الزام عائد کر کے انھیں قید کر دیا اور ایک ممتاز بالشویک نے خودکشی کر لی۔ بالعموم یقین کیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں خود سٹالن کی بیوی نے شوہر کو بُرا بھلا کہا، کیونکہ دہشت پھیلی ہوئی تھی اور خود اس خاتون نے بھی خودکشی کر لی ـــــ اور بتایا گیا ہے کہ صرف ایک لمحے کے لیے سٹالن کے اعتماد نفس میں تزلزل پیدا ہوا اور اس نے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی، مگر سیاسی بیورو میں سے کوئی بھی استعفے کی منظوری کا حوصلہ نہ کر سکا اور یہ لمحہ تیزی سے گزر گیا۔ جو لوگ اس کے دشمن سمجھے جاتے تھے، ان کے خلاف حملوں نے وہ شکل اختیار کر لی، جسے پارٹی کے غیر مطلوب عناصر سے پاک کر دینا قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا اور تھوڑے وقفوں کے ساتھ ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔

غیر مطلوب عناصر سے پارٹی کو پاک رکھنے کے یہ واقعات سوویٹ تاریخ کا نہایت پراسرار باب ہیں۔ ان واقعات کو بعض اوقات انقلاب فرانس کے دور دہشت و وحشت سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے، جب انقلاب

نے خود اپنے بچّوں کو نگلنا شروع کر دیا تھا۔ مگر فرانس میں دورِ دہشت و وحشت تو انقلاب کے بعد بڑی تیزی سے نمودار ہو گیا تھا اور روس میں یہ واقعات انقلاب سے سترہ سال بعد شروع ہوئے۔ مخالف ارکان کا تنزل عمل میں آیا۔ انھیں پارٹی سے نکالا گیا، بلکہ جلاوطن بھی کر دیا گیا، مثلاً ٹروٹسکی کو، لیکن کسی کو موت کی سزا نہ دی گئی۔ یہ قابلِ یقین کہانی مشہور ہے کہ بالشویک لیڈروں نے ابتدا ہی میں باہم اتفاق کر لیا تھا، وہ ایک دوسرے کو موت کی سزا دینے کا سلسلہ شروع نہیں کریں گے، لیکن جب روس میں دورِ دہشت شروع ہوا تو فرانس کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہولناک تھا۔ پھر روبس پیئر کے برعکس سٹالن زندہ رہا۔

ٹروٹسکی نے جلاوطنی کی حالت میں بھی سٹالن کے خلاف ایک جریدے میں حملے جاری رکھے جس کا نام تھا "حزبِ مخالف کا بلیٹن"[1]۔ وہ بڑا ہوشیار اور دوراندیش تھا اور اس نے سٹالن کے خلاف بعض سخت الزامات ثابت کر دیئے اور اس کے مقالات سوویٹ افسر بڑی احتیاط سے پڑھتے تھے۔ مگر کمیونسٹوں کے پرانے گروہ نے سٹالن کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اگرچہ وہ اس سے نفرت کرتے ہوں، لیکن ایک نوجوان گروہ کو یقین ہو گیا کہ سٹالن نے لینن کا پروگرام ترک کر دیا ہے۔ وہ زیادہ بےچین معلوم ہوتے تھے اور انھیں سازش کے لیے پرانی تحریکِ دہشت کے بہادروں کا نمونہ مل گیا، جنھوں نے زار الگزانڈر دوم کو قتل کیا تھا۔ وہ سٹالن اور روس کے بھیڑوں کے خلاف دہشت انگیزی کے بھی حربے استعمال کرنے پر آمادہ تھے۔ خود سیاسی بیورو کے اندر بھی جو لوگ سٹالن کے وفادار تھے، وہ اس کے ظلم و جور پر مضطرب ہو گئے اور اصرار کیا کہ دباؤ ہلکا کر دیا جائے۔ لینن گراڈ کے حاکم سرجیکیروف[2] نے اس سلسلے میں سبقت کی۔

بعض اوقات سٹالن اصرار پر جھک جانے کے لیے تیار ہو جاتا، چنانچہ جون ۱۹۳۲ء میں اس نے حکم دے دیا کہ باغی کولاکوں سے زیادہ نرم برتاؤ کیا جائے۔ سیاسی پولیس کے اختیارات بھی گھٹا دیئے، مگر بعض موقعوں پر اس نے بالکل الٹی روش اختیار کی۔ مثلاً ایک حکم جاری کر دیا کہ اگر کسی خاندان کا کوئی فرد غداری کا مرتکب ہو گا تو پورے خاندان کو غداری کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ بہ حیثیت عمومی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء کے درمیان تناؤ کم ہو گیا۔ کیروف نے پارٹی کی ایک کانفرنس میں نرمی اور ملائمت کے نئے دور کا اعلان کر دیا۔ حزبِ مخالف کے سابق لیڈروں کو زیادہ آزاد دستور کی ترتیب میں امداد کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ ان میں بخارن بھی شامل تھا۔

یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کو کیروف لینن گراڈ میں ایک نوجوان دہشت پسند کمیونسٹ کے ہاتھوں مارا گیا۔ اگرچہ اس

---

[1] The Bulletin of the Opposition

[2] Sergei Kirov

کہانی کی توثیق نہیں ہو سکتی کہ اس قتل کا منصوبہ خود سٹالن نے تیار کیا تھا، تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ اب سٹالن حزبِ مخالف پر ضرب لگانے کا عزم کر چکا تھا۔ قاتل کو موت کی سزا دی گئی۔ زنوویف اور کامینیف پر بھی شرکتِ جرم کا الزام لگا تھا، انھیں قید کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ان سے جبری اقبال کرایا گیا کہ انھوں نے سرمایہ داری کی بحالی کے لیے سازش کی تھی بساتھ ساتھ نئے جمہوری دستور کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہا۔ سٹالن اب اور زیادہ مطلق العنان ہو گیا۔ اس نے پرانے بالشویکوں کو ختم کرنے کا فیصلہ اسی پختگی سے کر لیا، جس سے خوفناک آئیون نے پرانے امراء کو برباد کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء اور اوائل ۱۹۳۶ء میں وقفہ رہا۔ سٹالن اس دور کے متعلق کہتا تھا کہ زندگی زیادہ خوشگوار ہو گئی ہے۔ پھر دورِ دہشت شروع ہو گیا۔

سرکاری کہانی یہ ہے کہ ٹروٹسکی نے ملک سے باہر جو مخالفانہ پروپیگنڈا کیا تھا، اس کی وجہ سے کیروف مارا گیا اور سٹالن کے قتل کے لیے سازشیں کی گئیں۔ سیاسی مقدمات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلا مقدمہ (۱۹۳۶ء) زنوویف کامینیف اور چودہ دوسرے افراد کے خلاف تھے۔ انھوں نے جرائم کا اقبال کر لیا اور انھیں موت کی سزا مل گئی۔ دوسرا مقدمہ (۱۹۳۷ء) سترہ ممتاز بالشویکوں کے خلاف تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہمیں ٹروٹسکی نیز جرمنی اور جاپان کی خفیہ پولیس کے درمیان سازش کا علم تھا جس کے مطابق روسی علاقہ جرمنی اور جاپان کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ بھی موت کی سزا پا گئے۔ پھر (جون ۱۹۳۷ء میں) روسی فوج کے اعلیٰ کمانداروں کی خفیہ علیحدگی کا دور شروع ہوا جن پر ایک غیر دوست اجنبی قوت (جرمنی) کے ساتھ تخریبی سازش کا الزام تھا۔ یہ اعلیٰ کماندار بھی اس اعلان کے ساتھ موت کی سزا پا گئے کہ انھوں نے اپنے جرموں کا اقرار کر لیا تھا۔ آخری مقدمہ مارچ ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ اس میں اکیس ممتاز بالشویک ملزم قرار دیئے گئے تھے، جن میں بخارن بھی شامل تھا۔ انھوں نے بھی ایسے ہی جرائم کا اقبال کر لیا اور انھیں موت کی سزا دے دی گئی۔

یہ کھلے اور خفیہ مقدمے (فوجی کمانداروں کے خلاف) غیر مطلوب عناصر سے نجات پانے کی وسعت کا محض دھندلا سا تصور پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لینن کے سیاسی بیورو کا ہر رکن —— بہ استثناء سٹالن و ٹروٹسکی —— یا تو مارا گیا یا اس نے موت کی سزا سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔ امورِ خارجہ کے دو نائب وزیر، ڈپلومیٹک کور کے اکثر سفیر، کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اکہتر ارکان میں سے پچاس، وہ تمام فوجی جج جو ملزم کمانداروں کے مقدمات کی سماعت کے لیے مقرر ہوئے تھے، خفیہ پولیس کے دو رئیس، جو سابقہ مقدمے چلانے میں ممتاز کردار ادا کر چکے تھے، تمام غیر روسی سوویٹ جمہوریتوں کے وزرائے اعظم اور بڑے بڑے افسر سب مارے گئے یا ناپید ہو گئے۔ جو لوگ ناپید ہو گئے، ان کی فہرست سامنے رکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے اور چوتھے عشرے میں یہ لوگ پارٹی اور حکومت کے زیادہ سے زیادہ اعلیٰ افسر تھے۔ حقیقتہً ہزاروں کو موت کی سزا دی گئی اور باقی لوگ اس طرح ناپید ہوئے کہ ان کا

کوئی سراغ نہ مل سکا۔ کھلے مقدمے صرف ان لوگوں پر چلائے گئے، جو مجرم تھے یا نہ تھے، مگر اقبال جرم کے لیے تیار ہو گئے۔ باقی سب لوگوں کو خفیہ طریق پر ختم کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو موت کی سزا دی گئی، اگرچہ ظاہر ہے کہ ان میں سے اکثر سٹالن کے مخالف تھے، مگر جو الزامات ان کے خلاف عائد کیے گئے وہ یقیناً درست نہ تھے۔ اگر وہ درست ہوتے تو جس سازش میں سٹالن کے سوا اکثر لوگ شریک تھے، وہ تہا کیروف کے قتل سے بدرجہا وسیع تر کارنامے انجام دیتی۔ یہ حد درجہ غیر اغلب ہے کہ بلند پایہ کمیونسٹوں میں سے کسی نے ہٹلر کے ساتھ ساز باز کیا، اگرچہ ان میں سے کسی کو سٹالن کے ساتھ کوئی انس نہ تھا۔ جن لوگوں نے اقبال جرم کیا، ان میں سے بعض کو یقیناً احساس ہوگا کہ وہ کمیونزم کے مقاصد سے خاص وفاداری کا اظہار کر رہے ہیں، اگرچہ وہ اظہار کتنا ہی غیر مناسب تھا اور اگرچہ معلوم تھا کہ وہ سٹالن کی سوویٹ حکومت کے لیے قربانی کر رہے ہیں۔ بعض کو یقیناً امید تھی کہ اس طرح ان کے کنبے محفوظ ہو جائیں گے یا وہ خود بھی محفوظ رہیں گے، کیونکہ چند لیڈروں کو اس لیے موت کی سزا نہ دی گئی کہ دوسرے لوگ حوصلہ پا کر اقبال جرم کے لیے تیار ہو جائیں۔ اکثر کو امید ہو گی کہ اقبال جرم کے یہ واقعات اس درجہ مضحکہ خیز ہیں کہ کوئی بھی انھیں درست تسلیم نہ کرے گا۔

سٹالن کی خواہش بظاہر یہ تھی کہ آئندہ کے لیے سازشوں کے تمام امکانات برباد کر ڈالے۔ چنانچہ اس نے ہر اس شخص کے خلاف الزامات عائد کر دیئے، جو کسی نہ کسی وقت اس نظام حکومت کا رکن بن سکتا تھا، جو سٹالن کے بعد بروئے کار آنے والا تھا۔ اس کے عمل کی ایک جزوی توجیہہ یہ بھی ہے کہ اسے یقین تھا، جرمنی سے جنگ ناگزیر ہے اور وہ اس کے مقابلے کے لیے اپنے سوا کسی پر اعتماد نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ ہنرکے اتنے خوفناک واقعات پیش آئے، لیکن حکومت میں کوئی خلل پیدا نہ ہوا۔ نوکر شاہی کے نئے کارکن پرانے کارکنوں کی جگہ لینے کے لیے میسر آ گئے۔ سٹالن کے زیر نگرانی تربیت پانے والے افسر زیادہ پڑھے لکھے ہوں، مگر قابل ضرور تھے۔ یقیناً وہ گنوار تھے اور مغربی دنیا کے متعلق انھیں کوئی تجربہ نہ تھا، لیکن اب تمام عہدوں پر وہی مامور ہو گئے۔

ایک گروہ کی مطلق العنان حکومت

غیر مطلوب عناصر کو حذف کر دینے کے لیے مقدمات جاری ہی تھے کہ سٹالن نے نئے دستور کا اعلان کر دیا، جسے دنیا کا سب سے بڑھ کر جمہوری دستور قرار دیا گیا۔ اس میں کسی بھی شخص کو حق رائے سے محروم نہ کیا گیا، حالانکہ پیشتر پادریوں، سابقہ طبقہ امراء اور بورژوا کو محروم کر دیا گیا تھا۔ شہری حقوق میں توسیع کر دی گئی۔ لیکن یہ سب چیزیں کاغذات پر بھی محض ایک دھوکا اور فریب نظر آتی تھیں، کیونکہ دستور میں یہ دفعہ شامل کر دی گئی تھی کہ ان تمام حقوق کو محنت کشوں کے مفاد کے پیش نظر بدلا جا سکتا ہے۔ محض یہ حقیقت کہ بالشویک روس کی حکومت ایک پارٹی کی حکومت ہے، جس کی بنا پر انتخابات کو محض یک آہنگی کا اظہار بنا لیا جاتا ہے، بصرف کمیونسٹ پارٹی ہی کی شاخیں اعلیٰ سوویٹ کے لیے امیدوار نامزد کرنے کی حقدار ہیں، یعنی ٹریڈ یونینیں، تعاونی انجمنیں، نوجوانوں کے گروہ اور ثقافتی انجمنیں۔ ان سب پر کمیونسٹ پارٹی کو پورا اقتدار حاصل ہے۔ پارٹی ہی امیدوار چنتی ہے اور ہر منصب کے

لیے صرف ایک امیدوار ووٹروں کے روبرو پیش کر دیتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی ہی کو سوویٹوں پر اقتدار حاصل ہے۔ وہی پہلے نظام پر قابض ہے۔ اسی کی بنا پر سرکاری نظام چل رہا ہے۔

ہر شہری ایک مقامی شاخ کے پاس پارٹی کا رکن بن سکتا ہے۔ ایک سال کی آزمائش کے بعد مقامی شاخ اس کی درخواست پر ووٹ دیتی ہے۔ کمیونسٹ بچوں کی تنظیمیں نوجوانوں کے گروہوں کے لیے ممبر بھیجتی ہیں اور نوجوان کمیونسٹ پارٹی کے لیے ممبر چنتے ہیں۔ پارٹی کی تنظیم کی دو بنیادیں ہیں، علاقے اور پیشے۔ ان دونوں کی اساس کارخانے، زراعتی فارم اور سرکاری دفتر ہیں۔ ان سب کو مقامی، دیہاتی یا شہری یونٹوں میں اکٹھا کر دیا گیا ہے پھر یونٹوں کی علاقائی کانفرنسیں ہیں۔ پارٹی کی مختلف شاخیں آل پارٹی یونین کے ممبر چنتی ہیں۔ کانگریس میں سے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر لیے جاتے ہیں یہی مرکزی کمیٹی نظری اعتبار سے پالیسی بنانے کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ اگرچہ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیان پارٹی کی کسی کانگریس کا کوئی اجلاس نہ ہوا۔ مرکزی کمیٹی میں سے سیاسی بیورو کے رکن لے لیے جاتے ہیں۔ پارٹی کی ہر شاخ کے ساتھ پروپیگنڈے کے لیے تنظیمات موجود ہیں۔ ایسے ادارے موجود ہیں جو فوج کے لیے تنظیم و تعلیم اور سیاسی تربیت کا کام انجام دیتے ہیں۔ پارٹی کو حکومت پر پورا اقتدار حاصل ہے۔ گویا حکومت رسماً ان امور کو لباسِ عمل پہنا دیتی ہے جن کا فیصلہ پارٹی کرتی ہے۔ مثلاً پنجسالہ منصوبے پارٹی کے پروگرام تھے اور حکومت کی طرف سے انھیں اختیار ہی نہیں کیا گیا تھا کہ ان پر عمل شروع ہو گیا۔

حکومت کا اعلیٰ ترین ادارہ سپریم سوویٹ ہے۔ اس کے دو ایوان ہیں۔ اوّل یونین کی سوویٹ، جو آبادی پر مبنی ہے، دوم قوموں کی سوویٹ، جو قومی انتظامی تقسیمات کے مطابق چنی جاتی ہے۔ نظری اعتبار سے سپریم سوویٹ کی میعاد چار سال ہے۔ یہ خود زیادہ کام انجام نہیں دیتی، بلکہ پریزیڈیم لہ مقرر کر دیتی ہے۔ جو شورائے عالیہ کے اجلاسوں کے درمیان پیش نظر کام کے متعلق احکام جاری کرتی ہے۔ مجلس وزراء بھی پریزیڈیم ہی کی طرف سے مقرر ہوتی ہے۔ سپریم سوویٹ یا پریزیڈیم کے بجائے یہ کابینہ قانون سازی کا کام زیادہ تر انجام دیتا ہے۔ گویا یہی روسی حکومت کی سٹیٹ قانون ساز ہے اور یہی ہیئت تنفیذیہ۔ مجلس وزراء کی صدارت، نیز سیاسی بیورو کی صدارت اور کمیونسٹ پارٹی کی معتمدی عامہ (جنرل سیکریٹری شپ)، یہ تمام عہدے سٹالن کے قبضے میں تھے۔ ان کے علاوہ وہ وزیرِ دفاع اور مجلس دفاع (جو دورانِ جنگ میں ملک کے نظم و نسق کی ذمہ دار تھی) کا رئیس نیز سالار اعظم تھا۔

۱۹۲۴ء میں سٹالن کی دستوری اصلاح نے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ نیا اتحاد جماہیر شورائیہ اشتراکیہ (سوویٹ سوشلسٹ جمہوریتوں کی یونین) عمل میں آیا تھا اور اس میں بڑی بڑی روسی جمہوریتوں ـــ یوکرین، سفید روس، گرجستان، ارمنستان،

لہ اس کا مطلب ہے وہ اعلیٰ جماعت، جسے تمام احکام کی تنفیذ کا حق حاصل ہو یعنی ہیئت تنفیذیہ۔

آذربائیجان اور زمین وسط ایشیا کی شورائی جمہوریتوں ۔۔۔ ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکستان ۔۔۔ کا وفاق قائم ہوا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں قاز اور کرغزوں کی جمہوریتیں اس وفاق میں شامل ہوئیں۔ اس طرح یونین کی جمہوریتیں گیارہ پر پہنچ گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں اوّل بحیرۂ بالٹک کی جمہوریتوں کا الحاق کر لیا گیا۔ ساتھ ہی فنلینڈ اور رومانیہ سے کچھ علاقے لے لیے گئے۔ چنانچہ پانچ مزید جمہوریتیں بن گئیں ۔۔۔ لتھوانیا، لیٹویا، ایسٹونیا، کریلیا[1] اور مالڈیویا ۔۔۔ سولہ جمہوریتوں کی اسی یونین میں روسی آبادی ہے، جو بہ شمول سائبیریا گیارہ کروڑ چالیس لاکھ ہے، یوکرین (آبادی چار کروڑ) کریلیا تک شامل ہے، جس کی آبادی آٹھ لاکھ ہے۔ روسی جمہوریت میں پندرہ جمہوریتیں شامل ہیں، جو داخلی اعتبار سے خود مختار ہیں۔ ان میں اور بھی بہت سی ضمنی تقسیمات ہیں۔

اتحاد کی ان سولہ جمہوریتوں اور داخلی اعتبار سے خود مختار انیس جمہوریتوں کی حکومت کا نمونہ وہی ہے، جو سوویٹ جمہوریت کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر جمہوریت کی سپریم سوویٹ کا ایوان ایک ہے، دو نہیں۔ ان میں قوموں کے ایوان کا کوئی وجود نہیں۔ حال میں بہت سی شکایات سنی گئیں کہ روسی وطن پرستی کس کس طریق سے اقلیت والی جمہوریتوں کی سرکاری پالیسی میں سرایت کر گئی۔ اگرچہ زاروں کے اس سوویٹ جانشین نے سب کو روسیت کے رنگ میں رنگ دینے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے اور یہ خطرہ موجود ہے، لیکن عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پیشتر پالیسی کا اصل مقصد یہ نہ تھا کہ قومیتوں کو روسیت کے رنگ میں رنگا جائے، بلکہ انھیں کمیونزم کے رنگ میں رنگا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر پارٹی نے قومیتوں کے لیے مقامی ثقافت کو زندہ کرنے، قدیم روایات کا سراغ لگانے اور اپنی زبان استعمال کرنے کی نہ صرف اجازت دے دی بلکہ حوصلہ افزائی کی۔ سوویٹ روس کے دوسرے ثقافتی مظاہر کی طرح قومی ثقافتوں کا معاملہ بھی خاص "آراستگی" کا نتیجہ تھا۔ سوویٹ یا کمیونزم کے خلاف کوئی چیز نہ اخباروں میں چھپ سکتی تھی، نہ فنون میں بروئے کار آسکتی تھی۔ بہ ایں ہمہ ہر فنی کوشش کی پوری نگرانی کی جاتی تھی اور ضروری تھا کہ وہ نظامِ حکومت کی مثبت خدمت انجام دے۔ ایسے حالات میں ثقافتی خود مختاری کی قدر و قیمت جو ہو سکتی ہے وہ کسی تصریح کی محتاج نہیں۔

اگرچہ سٹالن کے دستور نے ہر جمہوریت کو علیحدگی کا حق دے دیا تھا، لیکن اس دفعہ کی حیثیت سراسر نمائشی ہے۔ ہر جمہوری حکومت کے مقابلے میں مرکزی حکومت بہت زیادہ طاقتور ہے۔ اگرچہ ۱۹۴۴ء میں تمام جمہوریتوں کے لیے ایک ایک محکمۂ امور خارجہ قائم کر دیا گیا تھا، لیکن اس ترمیم کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ انھیں اس نہایت اہم دائرے میں آزادی دے دی جائے۔ حقیقتہً یہ طریقہ اس غرض سے اختیار کیا گیا تھا کہ یوکرین اور سفید روس کو انجمن اقوام متحدہ میں نمائندگی مل جائے۔ انجمن اقوام متحدہ میں ان دو جمہوریتوں کے نمائندوں نے ہمیشہ فالتو سوویٹ نمائندوں کا وظیفہ ادا کیا ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ یوکرین کی طرف سے جو نمائندہ انجمن اقوام متحدہ میں گیا تھا، وہ یوکرینی بھی نہ تھا، بلکہ روسی تھا جو دورِ

---

[1] Karelia

انقلاب کے خود مختار یوکرین میں سوویٹ کی طرف سے سفیر تھا۔

روسی تھرمیڈور؟

۱۹۳۴ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان غیر مطلوب عناصر کے اخراج کے علاوہ سٹالن کی ایک پارٹی والی حکومت نے نشو و ارتقاء پایا۔ یہی دور ہے جس میں بہت سے انقلابات کے بالغ نظر مبصروں کے نزدیک حقیقی روسی تھرمیڈور کا آغاز ہوا۔ اسے نئی اقتصادی پالیسی سے الگ ایک چیز سمجھنا چاہیے۔ تھرمیڈور کی اصطلاح سے مقصود ایک ایسا دور ہے جس میں انقلاب کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور داعیانہ حرارت کی جگہ طبیعت پر ایک متوازن خواہش طاری ہو جاتی ہے۔ انقلابِ فرانس میں بھی تبدیلی کا آغاز روبس پیئر اور جیکوبن نظام کے خاتمے اور ڈائرکٹری کے ظہور سے ہوا۔ یہ مختلف حکومت تھی جس کے مقاصد، پالیسی اور افراد مختلف تھے۔ پھر اس کی جگہ نپولین کی ڈکٹیٹری نے لے لی۔ سوویٹ روس میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ سٹالن برابر برسرِ اقتدار رہا۔ وہ صرف روسی روبس پیئر ہی نہ تھا، بلکہ اس نے ڈائرکٹری اور نپولین کے وظیفے بھی ادا کیے۔ اگر ہم یہ موازنہ قبول کر لیں تو کہنا چاہیے کہ روسی تھرمیڈور دراصل ایک خود ساختہ شے تھی۔ اس میں نہ تو نظام کو زیادہ آزاد بنا دینے کا خیال تھا اور نہ ضبط و نظم میں کسی قسم کی نرمی پیدا ہوئی تھی، لیکن یہ موازنہ غالباً پورے کا پورا درست نہیں، کیونکہ سٹالن کمزور ڈائرکٹری کے بجائے نپولین سے زیادہ مشابہ تھا۔

بہر حال چوتھے عشرے کے اواخر میں بہت سے انقلابی افکار کاملاً ترک کر دیئے گئے۔ ادھر غیر مطلوب عناصر سے پارٹی کو پاک کیا گیا اور نیا دستور جاری ہوا، ادھر روٹی کا راشن اٹھا دیا گیا۔ کلخوز کی تنظیم بدل کر ہر کسان کو گھر کا مالک بننے کی اجازت دے دی گئی۔ کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں، سائنسدانوں، انجینئروں اور فوجی آدمیوں کو نئے تمغے اور نئے خطابات دیئے گئے۔ فوج میں زاروں کے زمانے کی طرح افسروں اور سپاہیوں کے درمیان امتیاز بحال کر دیا گیا اور پہلی مرتبہ مارشلوں کا نام زبانوں پر آیا۔ غرض سیاسی نظم و ضبط میں تو کوئی ڈھیل نہ ہوئی، مگر سٹالن نے عوام کی روزانہ زندگی میں نرمی اور سہولت پیدا کر دی اور بطورِ خاص قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا، جب دہشت کا زور تھا۔ معیارِ معیشت بلند ہو گیا۔ صارفین کے سامان کی پیداوار بڑھ گئی۔ کارکنوں کو دعوت دی گئی کہ جو کچھ انھوں نے کمایا ہے، اسے عیش و راحت پر صرف کریں، جس کا انتظام پہلے کوئی نہ تھا۔

اسی زمانے میں حکومت نے روس کے ماضی پر از سرِ نو توجہ کی۔ کمیونسٹوں کی معیاری تعلیم یہ چلی آتی تھی کہ پرولتاریہ کا کوئی وطن نہیں۔ چنانچہ روس کا نام تک چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب سرکاری روسی اخبار یہ دعوت دینے لگے کہ ہر فرد کو اپنے ملک سے محبت رکھنی چاہیے۔ زاروں کے عہد میں جو مشاہیر گزر چکے تھے، ان کی مدح و ستائش شروع ہوئی۔ الگزانڈر نیوسکی[1] نے ٹیوٹانی ریمیسوں کو شکست دی تھی۔ ڈمٹری ڈانسکوئی[2] نے تاتاریوں کو باہر نکالا تھا۔ ان کے علاوہ

---

[1] Alexander Nevsky

[2] Dmitry Donskoi

پیٹر اعظم کی ستائش شروع ہوئی۔ کیٹوزف[1] کی تعریفیں ہونے لگیں جس نے نپولین کو شکست دی تھی۔ بلکہ خوفناک آئیون کو بھی سر پر چڑھا دیا گیا۔ زار الگزانڈر دوم کی مذمت اس لیے کی جاتی تھی کہ اس نے زرعی غلاموں سے فریب کیا تھا۔ اب اس کی بھی تعریف ہونے لگی اور کہا گیا کہ اس نے غلاموں کو آزادی دی تھی۔ اسی طرح انیسویں صدی کے اہل علم کی شہرت بھی ازسرنو بحال ہو گئی۔ روسی قوم پرستی کی طرف یہ عود دوسری عالمی جنگ کے دوران میں کمال پر پہنچ گیا جب مارکس کا بین الاقوامی گیت ترک کر کے قومی گیت اختیار کر لیا گیا اور حکومت کے پروپیگنڈے کی وسیع مشین نے قوم پرستی کی ہر صدا پورے زور شور سے لگائی۔

پرانے بالشویکوں نے عائلی زندگی کی بھی مذمت کی تھی اور اسے پرانے نظام کا سہارا قرار دیا تھا۔ ان کی وجہ سے شادی کرنا مشکل ہو گیا اور طلاق دینا بہت سہل بن گیا۔ ساتھ ہی انھوں نے جائز و ناجائز اولاد کا امتیاز ختم کر دیا۔ آزاد جنسی تعلقات اور اسقاط کی حوصلہ افزائی کی۔ سٹالن نے شادیوں کا تقدس بحال کیا۔ ناجائز تعلقات قائم کرنے والوں کو سخت برا بتایا اور طلاق خاصی مشکل بنا دی۔ ساتھ ہی کہا کہ عائلی زندگی کی حفاظت مملکت کے لیے حد درجہ ضروری ہے۔ بچوں کو تلقین کی کہ وہ والدین کے اطاعت گزار رہیں۔ یقیناً اس تبدیلی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ عائلی زندگی کی مذمت کے باعث شرح پیدائش گھٹ گئی تھی اور نوجوانوں میں بداخلاقی زیادہ ہو گئی تھی، مگر یہ تبدیلی اس لیے بھی ہوئی کہ انتہا پسندی ترک کی جا رہی تھی۔

ابتدائی دور کے بالشویکوں نے مدارس کا نظام تباہ کر دیا تھا۔ بچوں سے کہہ دیا کہ گھروں پر پڑھنے لکھنے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ امتحانوں کی ضرورت ہے، بلکہ طلبا کو مدارس کے انتظام میں اساتذہ کا شریک بنا دیا۔ چنانچہ مدارس میں حاضری کم ہو گئی۔ نوجوان پڑھنے کے بجائے انقلابی کلبوں میں مصروف ہو گئے۔ اساتذہ کی تربیت سے غفلت برتی گئی، یونیورسٹیوں کا نظام بگڑ گیا، کیونکہ سولہ سال کی عمر کا ہر فرد اپنا نام رجسٹر میں درج کرا سکتا تھا۔ ڈگریاں منسوخ کر دی گئیں۔ باقی علوم و فنون کو چھوڑ کر صرف ٹیکنیکل تربیت پر زور دیا گیا۔ نئی اقتصادی پالیسی کے تحت یہ افراتفری کسی حد تک کم ہوئی اور خواندگی میں اضافے کے بنیادی مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ یہ اصلاح بھی چنداں فائدہ مند ثابت نہ ہوئی کیونکہ عام مدارس کی نصابی کتابیں ختم کر کے تعلیم کے لیے خاص نظام مقرر کر دیا گیا جس میں مزدوروں کے مسائل اور مارکس کے نظریات پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اساتذہ کے لیے اس سے زیادہ کوئی کام نہ تھا کہ کتابوں کے مختلف حصے طلبہ کو رٹا دیں، پھر ان سے سوالات کر لیں تاکہ اندازہ ہو جائے، انھیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے خود یونیورسٹی پر قبضہ کر لیا۔ تعلیم کے مختلف شعبے اپنے خیال کے مطابق ناپسندیدہ تعلیمات سے پاک کر دیے گئے۔

---

[1] Kutuzov

طلبہ کو مجبور کیا کہ ہر تین ہفتوں میں سے ایک ہفتہ کارخانوں کے اندر صرف کریں۔ اس طریقے سے نہ طلبہ کو فائدہ پہنچا، نہ یونیورسٹیوں کو۔ صنعتی پیداوار میں بھی اس طرح شاید ہی اضافہ ہوا ہو۔

جب ردِ عمل شروع ہوا تو توقع کے مطابق اس نظام میں بھی وسیع تغیر ہو گیا۔ اساتذہ کی تربیت کے انتظامات اچھے ہو گئے۔ ان کی تنخواہیں بڑھا دی گئیں۔ سرکاری ملازمت میں ان کی درجہ بندی بھی کر دی گئی۔ انقلاب سے پیشتر یونیورسٹیوں میں داخلے اور ڈگریوں کا جو نظام تھا، وہ بحال کر دیا گیا۔ اس طرح مدارس میں پیشتر کا نظام بحال ہو گیا۔ امتحانات بھی ہونے لگے اور طلبہ سکول کے بعد گھروں میں بھی مطالعہ اور مشق کرنے لگے۔ بچوں پر ضبط و نظم از سر نو عائد کر دیا گیا۔ سیاسی تعلیم پر زور گھٹا دیا گیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترک تعلیم ترک کر دی گئی۔ ثانوی مدارس میں تعلیم پانے والوں کے لیے فیس ضروری قرار دی گئی۔ اس وجہ سے صرف وہی بچے تعلیم پا سکتے تھے، جو خاص حقوق والے نئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے یا وہ بچے جو غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر سرکاری وظیفے حاصل کر لیتے تھے۔ عام لوگوں کے بچوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا حصول مشکل ہو گیا۔ اگر سوویٹ حکومت کے اعداد درست سمجھے جائیں تو خواندگی کا تناسب نوّے فیصد پر پہنچ گیا۔

تعلیمی اصلاحات کے باعث روسیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کتابوں، تھیٹروں، عجائب خانوں اور کتب خانوں سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو گئی۔ روزانہ اخباروں اور دوسرے جریدوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اس میں بھی شبہہ نہیں کہ حکومت سائنس اور علوم کے لیے جس احترام کا اظہار کر رہی ہے، وہ خلوص پر مبنی معلوم ہوتا ہے، مگر اس کی روش محدود حد تک نفع جویانہ اور عموماً نارواداںہ ہے۔ تمام ثقافتی سرگرمیوں کا اندازہ اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ ان سے مملکت کو کیا مثبت فائدہ حاصل ہوگا۔ تعلیم ایک خاص نظام تک محدود ہو گئی۔ افکار کے کسی ایسے مجموعے کی اجازت نہیں دی جاتی، جو کمیونزم کا حریف بن سکے، کیونکہ ان افکار کے ترجمانوں کو حکومت خاموش کرا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے سوویٹ نظام زار نکولس اوّل کے نظام حکومت سے بھی زیادہ مطلق العنان اور مستبدانہ ہے۔

نکولس اوّل کے ماتحت محکمۂ احتساب ہر صاحبِ قلم کو بعض چیزیں کہنے سے روک دیتا تھا، مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ گویا احتساب کی حیثیت سلبی تھی، ایجابی نہ تھی اور اس میں شخصی آزادی کے لیے کچھ نہ کچھ گنجائش موجود تھی۔ لہٰذا اس دور میں روسی ادب کی بعض اہم ترین کتابیں مدوّن ہوئیں۔ اس کے برعکس سوویٹ کے محکمۂ احتساب نے ایجابی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ وہ تمام فنکاروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ نئے نظام کی مدح و ستائش برابر کرتے رہیں، اور اپنی صلاحیتوں کو اس نظام کے محاسن کی نشر و اشاعت کے لیے وقف رکھیں۔ گویا پارٹی کا معاملہ ثقافت کے تمام دائروں تک پہنچ گیا ہے، یہاں تک کہ موسیقی بھی مستثنیٰ نہیں۔ قابل موسیقاروں کو بڑی عاجزی سے معافی مانگنی پڑتی ہے کہ وہ کمیونسٹ نغمہ اور آہنگ پیش نہیں کر سکے۔ ایک غنائی شاعرہ پہلے بہت محترم مانی جاتی تھی۔ ۱۹۴۶ء

میں اسے سخت تادیب کی گئی، کیونکہ اس نے ایسی نظمیں لکھی تھیں، جن میں اپنی تنہائی کا ذکر تھا۔ گویا حکومت کی رائے یہ تھی کہ سوویٹ روس میں کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ تخلیقی فنکار کو روز بروز یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آیا اس کی کوششیں سٹالن کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گی یا اسے سائبیریا میں مزدوروں کے کسی کیمپ میں جانے کی سزا مل جائے گی۔

یہی کیفیت سائنسدانوں اور دوسرے اہل علم کی ہے۔ طبیعیات اور تناسل و توالد جیسے علوم میں فلسفیانہ مفروضات کے سوا چارہ نہیں، مگر سوویٹ ماہرین حیاتیات کو اس لیے سزا دی گئی کہ انھوں نے مغرب کے معیاری سائنٹیفک اصول قبول کر لیے۔ اس طرح ایسی نئی نژاد پیدا کر لینے کے بارے میں شبہات کا موقع دے دیا، جو حیاتیات کے اعتبار سے بالکل نئی وضع کی ہو حالانکہ سوویٹ کے سائنسدان زور شور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ممکن ہے۔ الفاظ کی اصل اور ابتدائی لسانی نشو و ارتقاء کے طلبہ بھی ہدفِ عتاب بنے۔ تاریخ نگار اور عمرانیات کے ماہرین خصوصیت سے ایسے راستے پر گامزن ہیں، جو خطرے سے خالی نہیں۔

سب سے آخر میں روسی تھرمیڈور نے مذہب کے متعلق روایتی کمیونسٹ موقف میں ترمیم کی، یقیناً یہ ترمیم بادلِ ناخواستہ ہوئی۔ ابتدائی دور کے بالشویک جنگجویانہ دہریت کے قائل تھے۔ انھوں نے بشپوں اور پادریوں کو جیلوں میں ڈال دیا اور بعض اوقات موت کی سزائیں بھی دے دیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے سرپرست تھے، جو دہریت پر مبنی ہو اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کا حامی ہو۔ اس روش کی تہہ میں مارکس کے اس معیاری احساس سے کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھائی گئی کہ مذہب عوام کے لیے افیون ہے۔ روس میں آرتھوڈکس کلیسا ہمیشہ زاروں کے لیے ایک سہارا بنا رہا اور اس نے ملک کی علمی ترقی روکے رکھی، لیکن مذہب پر سالہا سال کے حملے بھی لوگوں سے آرتھوڈکسی کا استیصال نہ کر سکے۔ ۱۹۳۷ء میں ہٹلر نے برلین کے اندر ایک روسی کلیسا تعمیر کرایا اور ہر موقع پر آرتھوڈکس کلیسا کے متعلق تلطف آمیز تقریریں کرتا۔ یہ حالت دیکھ کر سٹالن نے بھی مذہبی دائرے میں نقل و حرکت ضروری سمجھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ مسیحیت نے زمانۂ ماضی میں روسی ترقی کے لیے خاصا کام کیا ہے، لہٰذا حکومت مذہب کے خلاف پروپیگنڈا ختم کرتی ہے اور اس نے اپنے دہری معاشرے کو کلیسا کی بحالی میں معاون بنا دیا۔ گرجوں میں جانا دوبارہ عزت کا موجب بن گیا، اگرچہ یہ مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ مذہب کا اعلان کرتے پھریں۔ جب جنگ شروع ہوئی تو کلیسا کے ممتاز عہدہ داروں نے اپنی حکومت کی حمایت کی۔ اگرچہ ہٹلر یوکرینی پادریوں میں سے ایک خاص تعداد اپنے ساتھ ملا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۹۴۳ء میں سٹالن نے بڑے بڑے مذہبی عہدہ داروں سے ملاقات کی۔ کلیسائی جائدادوں پر ٹیکس کم کر دیئے گئے۔ بپتسمہ منانے کی ممانعت تھی یہ ممانعت ہٹا دی گئی۔ ایک نیا بطریق اعظم مقرر ہوا، جس کی فرمانبرداری پر حکومت کو بھروسا تھا۔

ان تمام تغیرات کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے، ان کا مقصد دوگونہ تھا۔ جزواً یہ اس لیے ضروری قرار پائے

کہ عوام کی وفاداری ایک ایسے دور میں استوار رہے، جب پارٹی مختلف غیر مطلوب عناصر سے پاک کی جا رہی تھی اور اس میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی، مگر یہ اس لیے بھی ضروری سمجھے گئے کہ ملک کو جرمنی کی طرف سے متوقع حملے کے لیے مستحکم کیا جائے۔ قدیم اور عوام پسندانہ اوضاع و افکار کی طرف رجوع کا درجہ کچھ بھی ہو، اس میں نمایاں حصہ حکومت نے لیا اور سٹالن نے کسی بھی دور میں قومی زندگی کے تمام دائروں پر اپنا پختہ ضبط و نظم بحال رکھنے میں ایک لمحے کے لیے بھی کوتاہی نہ کی۔

اکتیسواں باب

سوویٹ روس کی خارجہ پالیسی

سنہ ۱۹۱۸ء - سنہ ۱۹۴۱ء

وزارت خارجہ اور کومن ٹرن
سنہ ۱۹۱۸ء - سنہ ۱۹۲۸ء

جنگجویانہ کمیونزم کے دور میں بالشویکوں کو اپنے اس پختہ عقیدے پر غور و فکر کا موقع ملا کہ عالمی انقلاب مستقبل قریب میں برپا ہو جائے گا۔ بویریا اور ہنگری میں کمیونسٹوں نے جو حکومتیں قائم کی تھیں، وہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکیں۔ ہر جگہ اعتدال پسند گروہ کامیاب ہوئے۔ خانہ جنگی اختتام کے قریب پہنچی تو لینن اور اس کے پیرووں کو احساس ہوا کہ تباہ حال روس کی تعمیر نو کے لیے سرمایہ دار دنیا سے روابط پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس وقت وزارت خارجہ میں دو قابل فرد موجود تھے، اوّل چچرن[1]، جو ایک فاضل امیر تھا مگر بالشویک بن گیا، دوم لٹوینوف[2]، جو بڑا ہوشیار اور قابل فرد تھا اور چچرن کا معاونِ اوّل تھا۔ یہ دو اور ان کا عملہ اسی طرح سوویٹ حکومت کے ڈپلومیٹ بن گئے، جس طرح دوسری حکومتوں میں ڈپلومیٹ ہوتے ہیں۔

تاہم دنیا بھر میں انقلاب کا خیال ترک نہیں کیا گیا تھا۔ لینن نے سنہ ۱۹۱۹ء میں "تھرڈ انٹرنیشنل[3]" (تیسری بین الاقوامی انجمن) قائم کی، جو آگے چل کر کومن ٹرن کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس نے (کومن ٹرن نے) ایک بیان شائع کیا، جو کمیونسٹوں کا نیا منشور بن گیا۔ اس میں دنیا بھر کے کمیونسٹوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ سرمایہ داری کے آدم خور بورژوا کے خلاف متحد ہو جائیں۔ زنوویف کو کومن ٹرن کا کاروبار سونپ دیا گیا اور اس کے معاونینِ خاص بھی روسی تھے۔ بلغاریہ، ناروے، اٹلی اور ہسپانیہ کے مزدوروں، اشتراکیوں اور انارکسٹوں کی پارٹیوں نے نئی انجمن سے تعلق پیدا کر لیا، اگرچہ

---

[1] Chicherin

[2] Litvinov

[3] Third International

بہت سے مایوس ہو کر الگ ہو گئے۔ کیونکہ بالشویکوں نے روس میں ڈکٹیٹری قائم کر لی تھی اور وہ سب کچھ خفیہ پولیس اور فوج کے بل پر کر رہے تھے۔ بہ ایں ہمہ کومن ٹرن وزارتِ خارجہ کے پہلو بہ پہلو کارفرما رہی اور آئندہ چند سال میں اکثر اس کے اور وزارتِ خارجہ کے درمیان اختلاف ہوتا رہا۔ اس دو رنگی نے روس کی خارجہ پالیسی کو ایک یگانہ حیثیت دے دی۔ کومن ٹرن کے قیام نے بیرونی ملکوں میں شبہات پیدا کر دیئے اور سرمایہ دار مملکتیں نئے روس کو تسلیم کرنے میں بھی متوقف ہو گئیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں وزارتِ خارجہ نے انگلستان سے ایک تجارتی معاہدہ کیا۔ یہ نئی اقتصادی پالیسی کے دور کی ابتداء تھی۔ اس معاہدے میں روس سے اقرار لیا گیا تھا کہ وہ سلطنتِ برطانیہ کی اقوام کو کسی بھی ذریعے سے برانگیختہ نہ کرے گا۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان تجارت از سر نو جاری ہو گئی۔ پھر ایسے ہی معاہدے روس، پولینڈ، ریاستہائے بالٹک، سکنڈے نیویا، جرمنی اور اٹلی سے کیے گئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں روسیوں کو ایک بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس (منعقدہ جنیوا) میں بھی مدعو کیا گیا۔ برطانیہ اور فرانس کو یقین ہو چکا تھا کہ نئی اقتصادی پالیسی دراصل سرمایہ داری کی طرف مدد ہے اور دونوں ملکوں نے روس میں سرمایہ لگانے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا اور اسے یورپ کی بعد از جنگ اقتصادی تعمیرِ نو کے پروگرام کا جزو بنا لیا تھا۔ روسیوں نے اس منصوبے کو رد کر دیا اور شکست خوردہ جرمنی سے ایک معاہدہ کر لیا، جسے معاہدۂ ریپالو[1] کہا گیا (اپریل سنہ ۱۹۲۲ء)۔ اس کے رو سے روس نے تاوان کے تمام دعاوی ترک کر دیئے۔ جرمنی نے آمادگی ظاہر کی کہ روس نے مختلف صنعتوں اور کاروبار کو قومی بنا لینے کا جو فیصلہ کیا ہے، اسے قبول کر لے۔ دوسری طاقتیں، خصوصاً فرانس اس اعتراف کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ انھوں نے جنگ سے پیشتر روس میں سرمایہ کی بہت بڑی مقدار لگا رکھی تھی۔ معاہدۂ ریپالو کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی علیحدگی ختم ہو گئی اور بالشویکوں کے لیے جرمنوں کے ٹیکنیکل علم سے فائدہ اٹھانے کا موقع نکل آیا۔ چنانچہ روسیوں نے جرمنوں کو اجازت دی کہ اسلحہ اور ہوائی جہازوں کے کارخانے معاہدۂ ورسائی کے خلاف روسی سرزمین میں بنا لیں اور انھیں خود چلائیں۔

فرانس کے ساتھ روس کا ایک جھگڑا آبناؤں کی بین الاقوامی باقاعدگی کے متعلق چلا آتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں بہ مقام لوزان روس اس جھگڑے میں ہار گیا اور افغانستان کے معاملے پر برطانیہ سے کشمکش کا ایک نیا سبب پیدا ہو گیا، مگر سنہ ۱۹۲۴ء میں برطانیہ نے سوویٹ حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ ٹروٹسکی نے کہا تھا کہ مزدوروں کا لیڈر رامزے میکڈانلڈ[2] ایک مسیحی مینشویک ہے اور اس کا ملک بھونروں سے بھرا پڑا ہے۔ اس انتقاد سے واضح ہوتا ہے کہ باقی دنیا سے ربط ضبط قائم کرنے میں روس کے لیے کیا مشکلات تھیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں آگے چل کر ایک تحریر انگلستان میں شائع ہوئی جسے "مکتوب زن[illegible]ن" قرار دیا گیا۔

---

[1] Treaty of Rapallo

[2] Ramsay Mac Donald

اس کا مدعا یہ تھا کہ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کو انقلاب کی تکنیک کا درس دیا جائے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مکتوب حقیقی تھا یا جعلی، لیکن برطانوی ووٹروں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ قدامت پسند حکومت برسرِ اقتدار آ گئی اور اس نے روس کے ساتھ معاہدوں کی مذمت کر دی۔ ۱۹۲۷ء میں ایک روسی فرم کے دفاتر پر چھاپا مارا گیا، جو لندن میں کاروبار کر رہی تھی۔ وہاں سے مزید شہادت ملی کہ انگلستان میں کمیونسٹوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت حکومت نے روس سے تعلقات تقریباً توڑ لیے۔ ٹریڈ یونینوں کی ایک مجلس کمیونسٹوں نے بنائی تھی اور وہ انگریزوں اور روسیوں پر مشتمل تھی۔ جب روسیوں نے ۱۹۲۶ء کی ہڑتال میں برطانویوں کے اعتدال پر نکتہ چینی کی تو مذکورہ بالا مجلس بھی درہم برہم ہو گئی۔ اس دور میں سوویٹ روس کے اندر جمہوریۂ امریکہ کا کوئی سفارت خانہ نہ تھا۔ اور اس نے ۱۹۳۳ء تک روس کو تسلیم نہ کیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۷ء کے دور میں کومن ٹرن کو مسلسل ناکامیاں ہوئیں۔ پہلے لیگھارن[1] میں ایک کانفرنس ہوئی (۱۹۲۱ء) جس میں روسی کارکن بائیں بازو کے اطالوی لیڈروں کو اپنا ہمنوا نہ رکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ سال مسولینی اعلیٰ پیمانے پر کامیاب ہوا۔ پھر روسی کمیونسٹ بلغاریہ کے اندر فاشسٹ گروہ نے کامیابی حاصل کر لی۔ اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ وہ جرمنی میں بھی ناکام ہوئے جہاں انقلاب ۱۹۲۳ء میں برپا ہونے والا تھا، کیونکہ فرانسیسیوں نے روہر پر قبضہ کر لیا تھا (ان واقعات کی تفصیل کے لیے آئندہ ابواب ملاحظہ ہوں) لینن کی وفات کے بعد سٹالن اور ٹروٹسکی کے درمیان جو کشمکش شروع ہوئی اس کا اثر دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں پر بھی پڑا اور کومن ٹرن کی ہوا بُری طرح اکھڑی۔

روسیوں نے پولینڈ میں پلسدسکی[2] کو ڈکٹیٹر بننے میں امداد دی تھی (۱۹۲۶ء)، مگر وہ کامیابی حاصل کرتے ہی روسیوں کے خلاف ہو گیا، گویا پولینڈ میں بھی روسی ناکام رہے۔ "اسلامی ممالک" اور نوآبادیوں میں ناکامی ہی سے سابقہ پڑا۔ سب سے بڑی ناکامی چین میں ہوئی جہاں ۱۹۲۳ء میں چین کے انقلابی قومی لیڈر سنیٹ سین[3] نے کمیونسٹوں سے مشورہ لینے پر آمادگی ظاہر کی تھی اور کومن ٹرن نے اپنا بہترین آدمی اس کے پاس بھیج دیا، یعنی بوروڈن[4]۔ بوروڈن نے سیاسی پارٹی (کومن تانگ[5]) کی تنظیم نو میں سنیٹ سین کا ہاتھ بٹایا اور اس میں کمیونسٹ داخل کر لیے۔ اگرچہ اس طرح قومی پارٹی کے وہ حامی الگ ہو گئے، جن کا تعلق دائیں بازو سے تھا۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں سنیٹ سین نے وفات پائی۔ اس کے ہمزلف چیانگ کائی شک نے حکومت کے خلاف ایک فوری اقدام کیا اور کمیونسٹوں کو گرفتار کرنے لگا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ اگر اس موقع پر سٹالن چیانگ سے تعلقات توڑ لیتا اور چینی کمیونسٹوں کے انقلاب کی حمایت کرتا رہتا تو چین میں اسے کامیابی حاصل ہو جاتی۔ ٹروٹسکی نے پورے حالات کا تجزیہ کر کے یہ راستہ بتا دیا تھا، لیکن سٹالن نے خود تجزیہ کیا اور اس نظریے پر پہنچ گیا، جسے بالشویکوں نے لینن کی مراجعت

۱؎ Leghorn ۲؎ Pilsudski

۳؎ Sun-Yat-Sen ۴؎ Borodin ۵؎ Kuomintang

روس (اپریل ۱۹۱۷ء) کے وقت سے نہیں اپنایا تھا، یعنی یہ نظریہ کہ اشتراکی انقلاب سے پیشتر بورژوا کا انقلاب ضروری ہے اور کمیونسٹوں کے لیے چین میں یہی ممکن ہے کہ چینی کو امداد دے کر انقلاب کرائیں اور یہی انھیں کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چیانگ نے چینی کمیونسٹوں کو کئی مرتبہ موت کے گھاٹ اتارا۔ یوں سٹالن اور روس کا وقار کم ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سٹالن نے کومن ٹرن کو کبھی عالمی انقلاب کا موثر حربہ نہیں سمجھا۔ جب تمام اختیارات اس کے قبضے میں آگئے تو وہ اسے ترک نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ اس طرح اس پر نکتہ چینی ہوتی۔ نیز وہ چاہتا تھا کہ دوسرے ملکوں کے متعلق کمیونسٹوں کے ان جذبات میں نرمی پیدا ہوجائے جو ٹروٹسکی اور اس کے ہم خیال پیش کر رہے تھے، پھر ان جذبات کو ختم کردیا جائے۔ لہٰذا اس نے کومن ٹرن کے لیے بھی وہی تکنیک استعمال کی، جسے پارٹی کے سلسلے میں استعمال کرچکا تھا۔ چنانچہ اس نے روسی مندوبین کے ذریعے سے اس پر پورا قابو پالیا۔ یہ وفد سیاسی بیورو کے سامنے جوابدہ تھا۔ اور چونکہ یہ اس ملک کا نمائندہ تھا، جہاں انقلاب کامیاب ہوچکا تھا، لہٰذا اسے بڑا وقار حاصل تھا۔ پھر بار بار کومن ٹرن کے ذریعے سے سٹالن کے دشمنوں کی مذمت کرائی گئی۔ ٹروٹسکی اور بائیں بازو کی ۱۹۲۷ء میں، بخارن اور دائیں بازو کی ۱۹۲۸ء میں۔ بعد ازاں کومن ٹرن اور وزارت خارجہ کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔

سٹالن اور مغرب
۱۹۲۸ء – ۱۹۳۹ء

سٹالن نے وطن میں نئے اشتراکی جارحانہ اقدام کا انتظام کیا تو ساتھ ہی کومن ٹرن کو جنگجویانہ انقلابی سرگرمی میں از سر نو مصروف کردیا۔ مغربی ملکوں میں جو لوگ سوشل ڈیموکریٹ کہلاتے تھے، انھیں اشتراکی فاشسٹ قرار دے کر ان کی مذمت شروع کردی گئی اور کہا گیا کہ وہ کمیونزم کے نہایت خطرناک دشمن ہیں۔ ساتھ ہی اعلان کردیا گیا کہ کمیونسٹ خود ہر جگہ انقلاب پیدا کریں گے، مگر خود سٹالن کو اس قسم کے انقلاب کا امکان بہت کم نظر آتا تھا۔ سٹالن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس نے پہلے پنجسالہ منصوبے کے دوران میں کہا تھا:- "دس اچھے غیر ملکی کمیونسٹوں کے بجائے ایک سوویٹ ٹریکٹر زیادہ قیمتی ہے۔" اس سے سٹالن کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت بخوبی ہوجاتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ روسی قوم پرستی اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی اور باقی دنیا کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

بیرونی کمیونسٹوں کی روش میں حقیقی دلچسپی سے بے اعتنائی اور دوسرے ملکوں میں جو قوتیں کارفرما تھیں، ان کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکامی ہی جرمنی کے اندر ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کی کامیابی کا ذریعہ بنی (تفصیلات کے لیے آئندہ ابواب ملاحظہ فرمائیں)۔ کومن ٹرن نے جرمنی کے کمیونسٹوں کو بتادیا تھا کہ نازی نہیں بلکہ سوشل ڈیموکریٹ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ انھوں نے بازاروں میں نازیوں سے جنگ کی، مگر ریشتاغ (جرمن پارلیمنٹ) میں وہ نازیوں کے حلیف بن گئے۔ انھیں یقین تھا کہ نازیوں کی کامیابی کے بعد بہت جلد کمیونسٹوں کا انقلاب بپا ہوجائے گا۔ غرض ہٹلر برسر اقتدار آگیا تو روسیوں نے جرمنی کے ساتھ جارحانہ اقدام سے احتراز کے متعلق معاہدے کی تجدید کرلی۔

آگے بڑھ کر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہٹلر کمیونسٹوں کو ختم کر دینے کے متعلق جو کچھ کہتا رہا تھا، اس پر عمل پیرائی کا پختہ ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ اس سے کمیونسٹوں کو سخت دھچکا لگا۔ ساتھ ہی خوف پیدا ہوا کہ خود سوویٹ روس کے لیے خطرہ بر روئے کار آگیا ہے۔ چنانچہ جلد ہی سٹالن نے اجتماعی حفاظت کے متعلق روسی پالیسی میں ترمیم کرلی۔ سٹالن چاہتا تھا کہ ہٹلر کے ساتھ مل کر ریاستہائے بالٹک کی حفاظت کا عہد کرے۔ ہٹلر نے قبول نہ کیا تو روس جمعیتِ اقوام میں شامل ہو گیا (ستمبر ۱۹۳۴ء)۔ اس وقت سے سوویٹ روس کا نمائندہ لٹوینوف عالمی اسلحہ میں تخفیف اور دوسروں پر حملہ آوروں کی تعزیر کا زبردست حامی بن گیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد روسیوں نے مشرقی لوکارنو کے نام سے ایک حفاظتی معاہدے کے لیے گفت و شنید شروع کر دی، تاکہ ویسا ہی عہد نامہ ایک اور ہو جائے، جو مغربی یورپ کی طاقتوں نے لوکارنو میں کیا تھا (۱۹۲۵ء) (اس کی تفصیلات بھی آگے آئیں گی)، اگرچہ مشرق میں لوکارنو جیسا کوئی نظام قائم نہ کیا جا سکا، کیونکہ پولینڈ اور جرمنی سوویٹ روس کے خلاف تھے۔ روس نے ۱۹۳۵ء میں فرانس اور چیکوسلواکیہ سے معاہدے کر لیے، جن کا مدعا یہ تھا کہ اگر کسی طرف سے جارحانہ اقدام ہو تو ایک دوسرے کی امداد کے لیے جمعیتِ اقوام کی دفعات کے مطابق باہم مشورے کر لیں، البتہ یہ ضروری ہوگا کہ لیگ جارحانہ اقدام کی توثیق کر دے۔ اگر چیکوں کے خلاف جارحانہ اقدام ہوتا تو روس کی طرف سے چیکوسلواکیہ کو اسی صورت میں امداد دی جاتی جب فرانس اپنے واجبات پہلے ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا، کیونکہ چیکوں کے ساتھ اس کا معاہدہ بہت پہلے سے چلا آرہا تھا۔

سوویٹ روس کی خارجہ پالیسی میں تغیر کے باعث کومن ٹرن نے بھی اپنا طریقہ تبدیل کر لیا۔ ۱۹۳۵ء میں سوشل ڈیموکریٹوں کو جانی دشمن قرار دیا گیا تھا، اب فاشسٹ خطرے کے خلاف ان سے گرمجوشی کے ساتھ اتحاد کر لیا گیا۔ کمیونسٹوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے ساتھ مل کر فاشسٹوں کے خلاف عوامی محاذ بنالیں گے اور ہر اس شخص کا خیر مقدم کریں گے جو اس اصول پر متفق ہوگا، اگرچہ وہ دوسرے معاملات میں کتنا ہی قدامت پسند ہو۔ انقلابی پروپیگنڈے اور سرمایہ داری کے خلاف ہنگامہ آرائی میں ملائمت پیدا کر لی گئی۔ تمام ملکوں کے کمیونسٹ دفاعی میزانیوں کے لیے پرجوش بحثیں کرنے لگے، حالانکہ اس سے پیشتر کمیونسٹ دفاعی میزانیوں کو درہم برہم کر دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ بلغاری کمیونسٹ جارجی ڈمیٹروف[1] ریشتاغ میں آگ لگانے کے مقدمے کا ہیرو تھا (تفصیل آگے آتی ہے) اور وہ فاشسٹوں کے خلاف حوصلے اور ہوشمندی کا ایک نشان سمجھا گیا۔ اسے کومن ٹرن کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ سوویٹ یونین کے اندر عوامی محاذ کی تدبیر آرائی غیر مطلوب عناصر کے اخراج سے بے تعلق نہ تھی، کیونکہ دائیں بازو کے منحرفین فاشسٹ مملکتوں سے مفاہمت کے لیے مضطرب تھے اور بائیں بازو کے منحرفین بدستور عالمی انقلاب کے لیے کوشاں تھے۔

---

[1] Georgi Dimitrov

یہی زمانہ ہے جس میں عوامی محاذ کی حکومتیں فرانس اور ہسپانیہ کے اندر برسرکار آئیں ۔ یہی زمانہ ہے جس میں مغرب کے بہت سے نوجوان مردوں اور عورتوں نے خوشگوار امیدوں کے ساتھ کمیونسٹوں کو ہٹلر کے خطرے کے خلاف اپنے حقیقی بھائی قرار دے لیا۔ انھیں سوویٹ یونین کے متعلق بہت کم علم تھا ۔ بہرحال عوامی محاذ کی تدبیر مغربیوں کے نزدیک کتنی ہی مؤثر ہوتی، لیکن پارٹی کو غیر متعلق عناصر سے پاک کرنے کے متعلق روس کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا اس سے مغربی حکومتوں کی آنکھیں کھل گئیں ۔ جو مملکت اپنے اعلیٰ ملکی اور فوجی عہدہ داروں کی بیخ کنی اس جرم کی بنا پر کر رہی تھی کہ انھوں نے دشمن سے ساز باز کیا، وہ مملکت قابلِ کشش حلیف نہیں بن سکتی تھی ۔ جو لوگ پارٹی کے افراد کے خلاف الزامات کو درست مانتے تھے، وہ سوویٹ روس سے اتحاد کی قدر و قیمت مشتبہ سمجھتے تھے ۔ جن کے نزدیک یہ الزامات نادرست تھے، وہ سٹالن پر کیونکر بھروسا کر سکتے تھے ۔ خود سٹالن سمجھتا تھا کہ مغربی مملکتیں ہٹلر اور مسولینی کو مطمئن کرنے کی فکر میں ہیں، لہٰذا مغرب کے متعلق اس کا اعتقاد متزلزل ہو گیا ۔

روس اور مغربی یورپیوں کے بلاک میں سے ہر ایک نے سمجھ لیا کہ دوسرے فریق کا اصل مقصد یہ ہے، جب ہٹلر کی طرف سے پوری قوت کے ساتھ حملہ ہو تو اس سے اپنے آپ کو بچائے اور سیل کا رُخ دوسرے فریق کی طرف پھیر دے ۔ اس میں کسی کو بھی شبہہ نہ تھا کہ ہٹلر حملے کے لیے تُلا بیٹھا ہے ۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اس نے نورمبرگ میں تقریر کرتے ہوئے پھر ایک مرتبہ واضح کر دیا :-

> " اگر کوہستان یورال مجھے مل جائے، جہاں خام مال کے بے اندازہ خزانے ہیں ۔ اگر سائبیریا میرے ہاتھ آ جائے، جس کے جنگل بہت وسیع ہیں ۔ اگر یوکرین مجھے مل جائے، جہاں گندم کے کھیت بے حد و نہایت ہیں تو جرمنی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے زیرِ قیادت نعمتوں میں تیرتا رہیگا[۱] "

مغرب کے لیے اس امید کے خاصے وجوہ تھے کہ حملہ روس کے خلاف ہو گا ۔ سٹالن عزم کیے بیٹھا تھا کہ اس سے اپنے آپ کو بچائے ۔

سوویٹ یونین نے ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں مداخلت کی، جو سٹالن کے حقیقی موقف کا ایک دلچسپ مظاہرہ ہے ۔ جنرل فرانسسکو فرانکو نے ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کے خلاف ۱۹۳۶ء میں فوجی بغاوت کی اور بہت جلد اسے مسولینی اور ہٹلر کی طرف سے امداد مل گئی ۔ روسی اس خانہ جنگی میں مداخلت پر قطعاً راضی نہ تھے ۔ وہ مضطرب تھے کہ مغربی طاقتوں کے سوبڑ اپنے احترام کو گزند نہ پہنچے دیں، مگر انھیں احساس ہو گیا کہ اگر ہسپانوی جمہوریت کو امداد نہ دی جائے گی تو وہ دنیا کی حمایت کھو بیٹھیں گے ۔ ان کی حمایت بہت تاخیر سے شروع ہوئی اور ضرورت سے بہت کم تھی ۔ انھوں نے زیادہ تر

---

[۱] ہٹلر کی کتاب "میرا نیا نظام" (My New Order) ص ۴۰۰ ۔

پولیس کے کارندے بھیج دیئے تھے، جو ہسپانوی انارکسٹوں اور ٹراٹسکی کے پیرووں سے لڑتے رہے۔ روسیوں کو امید تھی کہ مغربی طاقتیں مداخلت کریں گی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مغربی طاقتوں نے مداخلت کی تو وہ ہٹلر کے خلاف دوسرے محاذوں پر بھی جنگ جاری رکھیں گے، مگر ہسپانیہ کے مقابلے میں مغربی طاقتوں کی غیر جانبداری نے سٹالن کو یقین دلادیا کہ مغربیوں کے ساتھ اتحاد پر بھروسا نہ کرنا چاہیے۔

ایک اور اہم عامل یہ تھا کہ مغربی طاقتیں ہٹلر کو مطمئن کرنے پر تُلی بیٹھی تھیں۔ اس روش نے برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی کے درمیان معاہدۂ میونخ میں درجۂ کمال حاصل کیا (ستمبر ۱۹۳۸ء) روسی نقطۂ نگاہ سے معاہدۂ میونخ کے مطابق ہٹلر کو چیکوسلواکیا کے جو علاقے دیئے گئے تھے، اس کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ہٹلر کا رُخ مشرق کی طرف پھیرا جائے۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ فرانس نے چیکوسلواکیا کو کوئی امداد نہ دی، لہٰذا روس اور چیکوسلواکیا کے معاہدے میں امداد کے لیے جو دفعہ موجود تھی۔ اس پر عمل کی نوبت ہی نہ آئی، کیونکہ فرانس الگ تھلگ رہا۔ اگر فرانس چیکوسلواکیا کی امداد کے لیے قدم بڑھاتا تو سٹالن بظاہر چیکوں کی حمایت کے لیے تیار تھا۔ جب فرانس تیار نہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے اس نے فیصلہ کر لیا کہ کیوں نہ ہٹلر کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی جائے۔ یوں ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان سٹالن اور مغربی ممالک میں کوئی حقیقی اتحاد نہ ہو سکا۔

جب برطانیہ اور فرانس پر واضح ہوا کہ ہٹلر کو مطمئن کرنے کی پالیسی ناکام رہی تو انہوں نے بادل نخواستہ روس کے ساتھ زیادہ پختہ اتحاد کی کوشش کی۔ مارچ ۱۹۳۹ء سے اگست ۱۹۳۹ء تک سٹالن نے مغربی ممالک سے بھی گفتگو جاری رکھی۔ ساتھ ساتھ جرمنوں سے بھی بات چیت کرتا رہا۔ ابتدا میں یہ بات چیت صرف تجارتی معاہدے کے لیے شروع ہوئی تھی۔ برطانوی اور فرانسیسی وفد ماسکو پہنچے تو ان میں بلند پایہ مدبرین شامل نہ تھے، جو روسیوں کے دل میں اعتماد پیدا کر سکتے۔ مزید براں مغربی طاقتیں وہ علاقے سٹالن کے حوالے کر دینے پر آمادہ نہ ہوئیں، جو اس کے نزدیک جرمنی کے خلاف دمدمے کا کام دے سکتے تھے یعنی فنلینڈ اور بالٹک کی جمہوریتیں —— ایسٹونیا، لیٹویا اور لتھوانیا ——

جرمن اس امر کے زیادہ سے زیادہ خواہاں تھے کہ حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو جائے۔ اس خواہش نے سٹالن کے لیے موقع پیدا کر دیا کہ روس کو جنگ سے محفوظ کرے۔ مئی ۱۹۳۹ء میں لٹوینیف کو وزارت خارجہ سے الگ کر دیا گیا، کیونکہ وہ یہودی تھا اور جرمنوں کے ساتھ گفت و شنید کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس کی جگہ مالوتوف[1] مقرر ہو گیا۔ مالوتوف نے اواخر اگست ۱۹۳۹ء میں ہٹلر سے معاہدہ کر لیا۔ دونوں طاقتوں نے عہد کر لیا کہ جنگ کی صورت میں وہ ایک

---

[1] Molotov

دوسرے کے متعلق غیر جانبدار رہیں گے۔ ایک خفیہ عہد بھی ہوا تھا، جس میں جرمنی اور روس نے پولینڈ کو باہم تقسیم کر لینے کا فیصلہ کیا تھا، جس پر ہٹلر حملہ کرنے والا تھا۔ بدترین حالات میں بھی اس معاہدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی طرف سے حملے کی صورت میں روس کی سرحد مغربی جانب کسی قدر آگے ہوتی۔ روسیوں نے معاہدے کی اقتصادی دفعات کی لفظاً لفظاً پابندی کی، لیکن جرمن ایسا نہ کر سکے۔ ہٹلر اور سٹالن کا معاہدہ شائع ہوتے ہی دنیا بھر کے کمیونسٹوں کا خطِ عمل اچانک تبدیل ہو گیا۔ اس سے پیشتر وہ عوامی محاذ کے سرگرم داعی رہے تھے۔ اب پھر حیرت زدہ کمیونسٹوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ لبرلوں اور سوشل ڈیموکریٹوں کو اپنے دشمن قرار دیں۔ چند روز بعد ہٹلر نے پولینڈ کے خلاف جو جنگ شروع کی، اسے کمیونسٹوں نے سامراجی جنگ قرار دیا، جس میں فریقین کے درمیان کوئی فرق نہ تھا اور کمیونسٹوں سے کہا گیا کہ انھیں کسی کا ساتھ نہ دینا چاہیے۔

سٹالن اور دوسری عالمی جنگ

سٹالن نے ہٹلر کی مزاحمت کے سلسلے میں پولینڈ کی فوجی قوت کے متعلق مبالغہ آمیز اندازہ کر رکھا تھا، لہٰذا جنگ کے ابتدائی ہفتوں کے متعلق اس کے تصورات نادرست ثابت ہوئے۔ پولینڈ کا سلسلہ ابتدا ہی میں کاملاً درہم برہم ہو گیا اور سٹالن کو پولینڈ کے مشرقی حصے میں اقدام کرنا پڑا۔ مغربی محاذوں پر جنگ سرد پڑی ہوئی تھی، اس سے سٹالن بہت پریشان ہوا۔ اسے غالباً خوف تھا کہ پولینڈ کے فیصلے کے بعد ہٹلر خود اس پر حملہ کر دے گا۔ یہ واقعہ یقیناً پیش آتا، بشرطیکہ فرانس اور انگلستان ہٹلر سے صلح کر لیتے۔ جس کے لیے اس نے بڑی کوشش کی۔ جنگ سرد پڑی ہوئی تھی، سٹالن نے دسمبر ۱۹۳۹ء میں فنلینڈ پر حملہ کر دیا، کیونکہ فنلینڈ نے ریاستہائے بالٹک کے خلاف سٹالن کو اہم جنگی مرکز استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس حملے پر مغربی ممالک میں روس کے خلاف ایک طوفان بپا ہو گیا۔ فرانس اور برطانیہ دونوں نے رضاکاروں کی فوجیں بھرتی کرنے کی اجازت دے دی اور اہل فنلینڈ کی حمایت میں روسی نشانوں پر ہوائی حملوں کی تجویزیں سوچیں۔ جمعیت اقوام نے روس کو رکنیت سے خارج کر دیا۔ اگرچہ کئی مرتبہ روسیوں کو ہزیمتیں اٹھانی پڑیں، مگر سنہ ۱۹۴۰ء کے موسم بہار تک فنلینڈ مسخر ہو چکا تھا۔ اس وقت تک مغربی ملکوں کے حلیف مظلوم فنیوں کے لیے مؤثر امداد کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے موسم بہار میں سٹالن کا دوسرا بڑا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ دوسرے بہت سے مبصروں کی طرح سٹالن کو امید تھی کہ فرانس خاصی مدت تک مزاحمت کرے گا اور یہ بھی یقین تھا کہ ہٹلر فرانس کو شکست بھی دے سکے گا تو اس وقت جرمنی خاصا کمزور ہو چکا ہو گا۔ اب جرمنی نے مغرب کے خلاف برق رفتار اقدامات شروع کر دیے اور برِاعظم یورپ پر جنگ ختم ہو گئی، صرف برطانیہ مقابلے پر رہ گیا (تفصیل آگے آتی ہے) سٹالن کو اپنی مغربی سرحدوں کی حفاظت کے متعلق اضطراب تھا۔ اس نے بے تکلف تینوں ریاستہائے بالٹک پر قبضہ کر لیا، پھر خاص انتظامات کے تحت استصواب رائے عامہ ہوا، جس میں لیٹویوں، ایسٹونیوں اور لتھوانیوں نے درخواست کی کہ انھیں سوویٹ یونین میں شامل کر لیا جائے۔

سٹالن نے جون سنہ ۱۹۴۰ء میں رومانیہ سے مطالبہ کیا کہ بیسربیا کا صوبہ روس کے حوالے کر دیا جائے، جو پہلی عالمی جنگ میں روس سے چھنا تھا اور سوویٹ روس نے اسے قبول نہ کیا تھا۔ ساتھ ہی شمالی بکووینا[1]، جو سابق میں ہیپسبرگوں کا علاقہ تھا، نہ کہ روسیوں کا، مگر اس میں یوکرینیوں کی خاصی آبادی تھی اور جنگی نقطۂ نگاہ سے اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی۔ ان علاقوں کے بعض حصے موجود سوویٹوں میں شامل کر لیے گئے۔ بعض حصوں کو ملا کر نئی سوویٹ مالڈیویا کے نام سے بنا دی گئی۔ جرمنوں کو یہ توقع تو تھی کہ روس بیسربیا پر قابض ہو جائے گا، مگر بکووینا کے متعلق کوئی خیال نہ تھا۔ انھوں نے اس تصرف کی اجازت دے دی اور اہل رومانیا سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ہٹلر سے کسی امداد کی امید نہ رکھی جائے۔ مشرقی یورپ میں سٹالن کے ساتھ ہٹلر کا تعاون یہاں تک قائم رہا۔ بیسربیا کے دوبارہ الحاق سے سوویٹ روس کو ڈینیوب کا دہانہ مل گیا اور وہ ایک اہم آبی شاہراہ پر ضبط و نظم قائم کرنے کے قابل ہو گیا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ روسی جنوبی و مشرقی یورپ میں بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ اس حصے میں جرمن روسیوں کو تنہا کارروائیوں کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

رومانوی علاقے پر روسیوں کے تصرف سے چند ہفتے بعد ہٹلر نے جنوبی و مشرقی یورپ میں اپنے مفاد کا اعلان کر دیا اور رومانیا کو مجبور کیا کہ وہ ایک علاقہ ہنگری کے حوالے کر دے (اگست سنہ ۱۹۴۰ء) اس کے بعد رومانیا کی نئی سرحدوں کے تحفظ کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان بالتصریح روس کے خلاف تھا۔ کچھ مدت بعد جرمن فوجیں فنلینڈ میں نمودار ہوئیں۔ ہٹلر نے وضاحت کر دی کہ ان کا مدعا صرف ناروے کی جرمن فوجوں کو کمک پہنچانا ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے موسم خزاں میں جرمن فوجیں رومانیا میں داخل ہو گئیں۔ اعلان یہ کیا گیا کہ رومانیا میں تیل کے چشموں کی حفاظت مقصود ہے، کیونکہ برطانیہ ان کی تخریب کے درپے ہے۔ روسی سرحدوں پر جرمنوں کی ان کارروائیوں نے سٹالن کو حد درجہ مضطرب کر دیا اور اس پر اضطراب پیدا ہونا طبعی تھا۔

اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا، گویا جنگ براہ راست بلقان تک پہنچ گئی۔ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء میں مالوٹوف برلین پہنچا تو ہٹلر نے چکاچوند پیدا کرنے کی غرض سے اس کے سامنے سوویٹ روس کے آئندہ حلقۂ اثر کی ایک عظیم الشان تصویر پیش کر دی، جو ایران، خلیج فارس، بحر ہند تک پہنچی ہوئی تھی، بلکہ ہندوستان بھی اس میں شامل تھا، لیکن یہ سب کچھ سلطنت برطانیہ کی تباہی پر موقوف تھا۔ جب کبھی ہٹلر یہ لذیذ طعمہ مالوٹوف کے سامنے پیش کرتا، مالوٹوف چپ چاپ جنوبی و مشرقی یورپ اور فنلینڈ کے متعلق بات چیت شروع کر دیتا اور کہتا کہ یہ حصے تمہارا روس کا حلقۂ اثر ہیں۔ اس پر جرمن تیار نہ تھے۔ بات چیت ناکام رہی تو ہٹلر نے روس پر حملے کے لیے تیاریوں کا حکم دے دیا۔

---

۱ Bukovina

۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں جرمنوں کو اطالویوں کی امداد کے لیے پہنچنا پڑا تاکہ انھیں یونانی مہم سے نجات دلائیں جو البانیا کی دلدل میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ چنانچہ اس غرض سے جرمن فوجیں بلغاریا میں داخل ہو گئیں، جسے روس اپنے دفاع کے لیے حد درجہ ضروری سمجھتا تھا۔ پھر جرمنوں نے یوگوسلافیا اور یونان پر تیزی سے فاتحانہ اقدام کیا (مارچ۔مئی ۱۹۴۱ء) اب جرمن تنہا بلقان پر حکمرانی کر رہا تھا۔ یوگوسلافیا اور یونان کی مزاحمت نے جرمنوں کے نظام اوقات میں کسی قدر تاخیر پیدا کر دی۔ آخر ہٹلر نے ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو روس پر حملہ کر دیا۔ سٹالن کو علم ہوگا کہ حملہ ہو رہا ہے۔ مغربی طاقتوں نے اسے پہلے سے متنبہ کر دیا تھا، لیکن وہ آخری وقت تک خوشگوار امیدوں میں الجھا رہا۔ حملے سے چند ہفتے پیشتر سٹالن نے فخراً اپنے آپ کو ایشیائی کہا اور ہٹلر کے حریف جاپان سے غیر جانبداری کا معاہدہ کر لیا۔ جاپان چین میں بُری طرح الجھا ہوا تھا اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ جمہوریہ امریکہ کے خلاف جنگ کرے۔ وہ بھی دو محاذوں پر جنگ سے اتنا ہی بچنا چاہتا تھا جتنا روس۔

نتیجہ

کارل مارکس نے روس کو حقیر سمجھا تھا اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا اور یہ دیکھتا کہ ایک پسماندہ زرعی سرزمین نے جس میں پرولتاریا کا کوئی وجود نہ تھا، یورپ میں تنہا کامیاب کمیونسٹ انقلاب بپا کر دیا تو دم بخود رہ جاتا۔ اگرچہ یہ دریافت کرنے کی کوشش میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہ جس سرزمین میں حالات کم سے کم ساز گار تھے، وہاں مارکسی انقلاب کیونکر کامیاب ہوا، تاہم اصل مسئلہ اتنا مشکل نہیں۔ اس کے دو ممکن حل صاف نظر آتے ہیں، یعنی یا تو مارکس کی رائے غلط تھی یا روس میں جو انقلاب بپا ہوا، وہ مارکسی انقلاب نہ تھا یا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جزواً دونوں درست تھے۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ مارکس اس انقلابی قوّت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا، جو روسی کسانوں میں موجود تھی، اگرچہ خوابیدہ تھی۔ اس نے ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ لہٰذا اسے کوئی خیال نہ ہو سکتا تھا کہ زاروں کا نظام کس درجہ ناکافی ہے۔ پہلی عالمی جنگ نے کتنے بڑے تناؤ پیدا کیے اور ۱۹۱۷ء کی عارضی حکومت کس قدر کمزور تھی۔ یہ بھی واضح ہے کہ بالشویکوں کو برسرِ اقتدار لانے کا ذمہ دار لینن تھا، جس نے کسانوں کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر لیا۔ پھر حالاتِ گرد و پیش کو وہ پوری طرح سمجھتا تھا اور ہر خطرہ قبول کر لینے پر آمادہ تھا۔ سب سے آخر میں وہ اس لحاظ سے حد درجہ خوش نصیب تھا کہ وہ صحیح وقت میں صحیح مقام پر پہنچ گیا اور اس کے پاس صحیح حربے موجود تھے۔

علاوہ بریں انقلاب کاملاً مارکسی نہ تھا۔ جب بالشویک برسرِ اقتدار آ گئے تو ناگزیر تھا کہ انھیں پے در پے جن حالات سے سابقہ پڑتا رہا، ان میں مارکس اور لینن کے نظریات میں بقدرِ ضرورت وہ ترمیم کرتے رہے۔ خانہ جنگی اور غیر ملکی مداخلت نے جو ابتری پیدا کی تھی، اس سے بچاؤ کے لیے نئی اقتصادی پالیسی نے موقع پیدا کر دیا اور سٹالن کے عہد میں وہ لوگ برسرِ کار آ گئے جو مارکس کے پیرو ہونے کے علاوہ روسی قوم پرست تھے اور اقتدار کے بھوکے تھے۔ ان کا صحیح اندازہ قبل از وقت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ مختلف محرکات کے تحت سٹالن نے روس کو دس سال کے اندر اندر نہایت تیزی سے اور وحشیانہ طریق پر آگے بڑھا دیا۔ اگرچہ اس کا نصب العین پورا نہ ہو سکا تاہم اس کے پروگرام نے ایک ایسی سلطنت پیدا کر دی، جو ہٹلر کی

جبر میں برداشت کرنے کے لیے بالکل بےسروسامان نہ تھی۔ اگرچہ عوام حکومت کے غلام تھے انھیں جبراً اکٹھا کر دیا گیا تھا اور قوت کے بل پر اکٹھا رکھا گیا تھا۔ پھر پارٹی کو غیر مطلوب عناصر سے پاک کر دیا گیا اور ان سب پر دہشت مسلط کر دی گئی۔ لاکھوں افراد مزدوروں کے کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور رہوئے تاہم روسیوں نے دوسری عالمی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ ہٹلر اور اس کے حلیفوں کو شکست دی۔ بےشک اس کام میں جمہوریہ امریکہ نے بھی بڑی حد تک امداد دی۔

باقی رہے یہ سوال کہ :-

۱۔ آیا سٹالن سے روسیوں کی وفاداری کا یہ نتیجہ تھا کہ حملہ آور جرمن ان سے اچھے برتاؤ میں ناکام رہے ؟

۲۔ ہٹلر جس کی پالیسی مختلف تھی، کامیاب ہو کر کس حد تک روسیوں کی حمایت حاصل کر سکتا تھا ؟

یہ سوال ایسے ہیں کہ ان پر یہاں بحث نہیں کی جا سکتی۔ روسیوں کا مقابلہ فاشسٹ حکومتوں — جرمنی، اٹلی، ہنگری رومانیا اور دوسری قوتیں جو محوریوں کے ساتھ تھیں — کی متحدہ قوت سے تھا۔ یہ متحدہ قوت کمیونزم کی کامل تباہی کا حلف اٹھائے بیٹھی تھی۔ اب ہمیں ان طاقتوں کی سرگزشت اور فاشسٹ نظریے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے یعنی وہ نظریہ جس کی پابند یہ طاقتیں تھیں۔

فاشزم کا ظہور و عروج

سنہ ۱۹۱۸ء - سنہ ۱۹۳۹ء

باسٹھواں[62] باب

فاشزم اور اٹلی

(۱)

تمہید اس باب میں ہم دونوں جنگوں کے درمیانی دور اور یورپ میں فاشزم کے ظہور پر بحث کریں گے۔ ۱۹۳۹ء تک دائیں بازو کی ایک پارٹی کی مطلق العنان حکومتیں اٹلی، جرمنی، ہسپانیہ اور مشرقی نیز جنوبی و مشرقی یورپ میں قائم ہو چکی تھیں، صرف روس مستثنیٰ تھا۔ جس طریق پر یہ حکومتیں برسراقتدار آئیں، وہ ملک بہ ملک حد درجہ مختلف تھا۔ جس طرح ان حکومتوں کے بعض خارجی خط و خال مختلف تھے۔ اوّل نظر میں فاشزم زیادہ پیچیدہ ہے کہ کمیونزم کے مقابلے میں اسے سمجھنا زیادہ مشکل ہے۔ کمیونزم ایک ایسا نظریہ ہے جس کا سراغ مارکس تک لگایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ لینن پر پہنچا۔ بعد ازاں اس نظریے کے حامیوں نے روس میں اسے عملی شکل دے دی۔ کمیونزم کے برعکس فاشزم کے لیے نظری نشوونما و ارتقاء کا ایسا کوئی سلسلہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حامی پہلے اس پر عمل پیرا ہوئے، پھر انھوں نے نظریے کے لیے غور و فکر شروع کر دیا اور وقتی ضرورت کے مطابق مختلف چیزیں تجویز کرتے رہے۔

فاشزم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ طبقاتِ نظم میں انقلاب تھا۔ براعظم یورپ میں سیاسی پارٹیاں مختلف عمرانی طبقات کے مفادات کی نمائندگی کرتی رہیں۔ یہ مفادات پارلیمانی مملکت میں تقریباً متوازن تھے تو ایک طویل اور غیر فیصلہ کن سیاسی کشمکش اکثر رونما ہوتی رہی۔ مثلاً ہم فرض کرتے ہیں کہ بائیں بازو کی طرف سے انقلاب کا خطرہ پیدا ہوا یا پیدا ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ متوسط طبقہ برسراقتدار آ گیا اور اس نے اپنی انتہا پسندی میں پناہ لے لی۔ یہی انتہا پسندی فاشزم کہلائی۔ دوسرے لفظوں میں قوم پرستی چند انتہا پسندانہ نعروں کے ساتھ عوام کی حمایت حاصل کرنے میں مصروف ہو گئی اور اس نے پراسرار لباس پہن لیا۔ ۱۹۲۲ء میں اٹلی کے اندر مسولینی کے برسراقتدار آنے پر اس فارمولے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی کے اندر ہٹلر اسی اصول کی بنا پر برسراقتدار آیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء میں ہسپانیہ کے اندر فرینکو نے اسی طرح اقتدار حاصل کیا۔ مشرقی یورپ کے دوسرے بہت سے ڈکٹیٹروں کی کیفیت بھی یہی ہے۔ لیکن فارمولا اس سے آگے نہیں جاتا۔ مختلف ممالک کے مختلف حالات کا مطالعہ کیا جائے تو فارمولے کی وضع و ہیئت اور معنویت متعین ہو

سکے گی۔

اقتصادی کساد بازاری نے بھی تقریباً ہر ڈکٹیٹر کو برسرِ اقتدار لانے میں خاص کردار ادا کیا۔ اٹلی میں جنگ کے بعد کساد بازاری پیدا ہوئی اور یہی کیفیت ۱۹۲۹ء میں نیز اس کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں پیدا ہوئی۔ ہمیں تمام مقامات پر فاشزم کے مظاہر میں بھی ایک خاص یکسانی معلوم ہوتی ہے، مثلاً خاص رنگ کی وردیاں، نجی فوجیں، عوام پر سحر طرازی، سلام کے خاص طریقے، جنگ کے خاص نعرے اور خاص تقریبات، قوموں کو پُراسرار طریق پر عظمت و سربلندی کی دعوت دینا اور فتوحات کے وسیع پروگرام۔ ڈکٹیٹر اپنے پروگراموں میں عموماً دارائی اور ناداری کا ذکر کرتے رہے اور ظاہر ہے کہ خود ان کی قومیں نادار اور مظلوم ہوتی تھیں۔

فاشزم جمہوریت، آزاد خیالی اور پارلیمانی اداروں کے خلاف بھی شدید نفرت کے مظاہرے کرتی رہتی، جس طرح کمیونزم کے خلاف زور شور سے ناپسندیدگی پر زور دیتی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ فاشزم بھی کمیونزم کی طرح دستوری طریق عمل سے نفرت میں کمیونزم کی ہمنوا تھی۔ وہ بھی انسانی افراد سے بے پروائی پر تلی بیٹھی تھی اور صرف مملکت کو سب پر برتر قرار دینے کے لیے اصرار کرتی رہی۔ دشمنوں پر اس نے سختیوں میں کبھی تامل نہ کیا، خواہ وہ حقیقی تھے یا خیالی۔ اس سلسلے میں ویسی ہی بیدردی سے کام لیا، جس کا نقشہ ہم سٹالن کے روس میں دیکھ چکے ہیں۔ احتساب، خفیہ پولیس، جبر و تشدد کے کیمپ، زود کوب کی حکمرانی، قانونی تحفظات کا خاتمہ، یہ تمام چیزیں فاشزم اور کمیونزم دونوں میں مشترک رہیں۔

جب مسولینی روم میں برسرِ اقتدار تھا تو سرکاری عمارتوں پر تمام وفادار اطالویوں کے لیے جابجا اشتہارات چسپاں کر دیئے گئے تھے، جن میں کہا گیا تھا: "یقین رکھو، لڑو اور حکم مانو۔" بظاہر مقصود تھا کہ اس قسم کے اشتہارات سے لوگوں میں ولولہ پیدا ہوگا، لیکن غور کیجیے کہ ان کا مطلب کیا تھا؟ "یقین رکھو" کا مطلب یہ تھا: مسولینی جو کہتا ہے، اسے درست سمجھو۔ "لڑو" کا مطلب یہ تھا کہ مسولینی اور اس کے ساتھیوں کی خاطر جنگ کرو۔ "حکم مانو" کا مطلب یہ تھا کہ مسولینی کا حکم مانو۔ یہ تعبیر پیشِ نظر رکھی جائے تو فارمولا مذہب اور انسانی شرافت کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور صرف نہلسٹوں کے عقیدے کا اظہار کرتا ہے، جو موقع پرستی کے سوا کسی چیز پر اعتقاد نہیں رکھتے، لیکن بہت سے لوگ، جو بہترین معاشرہ پیدا کرنے کے حامی تھے، اس فارمولے کے قائل ہو گئے اور یہ افراد پر اس ناقابل برداشت دباؤ کا نتیجہ تھا، جو دونوں جنگوں کی درمیانی مدت میں طرح طرح کے تناؤ سے پیدا ہوا۔

اٹلی اور فاشزم: پس منظر

اگرچہ اٹلی فاتح اتحادی جمعیت کا رکن تھا، لیکن اس نے پہلی عالمی جنگ دسی شکست پر ختم کی۔ اس کے ساڑھے چھ لاکھ آدمی مارے جا چکے تھے اور دس لاکھ زخمی ہو چکے تھے۔ جنگ کے فوراً بعد صنعت و حرفت میں افسردگی پیدا ہو گئی اور چند مہینوں کے اندر صنعتی مزدوروں میں سے دس فی صد کو روزگار سے محروم ہونا پڑا۔ چیزوں کی قیمتیں تیزی سے بڑھ گئیں اور اجرتیں بڑھتی ہوئی گرانی کا مقابلہ نہ کر

سکیں۔ مجروحین و مقتولین کے خاندانوں سے پنشنوں کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کے ایفاء میں بہت تاخیر ہو گئی۔ متواتر ہڑتالیں اور ہنگامے بپا ہونے لگے۔ بہت سے نوجوان فوجی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کے سامنے جنگ کے سوا کوئی پیشہ نہ تھا۔ بے روزگاری کے باعث بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافہ ہو گیا۔ جو لیڈر عوام کے سامنے درخشاں وعدے کر سکتے تھے، بے روزگار لوگ ان کے حامی بن گئے۔

غالباً حد درجہ اہم واقعہ یہ ہے کہ خود حکومت نے اطالویوں میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ دورانِ جنگ کے اتحادی اب وہ علاقے خود ہتھیا رہے ہیں، جن کا وعدہ شرکتِ جنگ کی بنا پر اٹلی سے کیا گیا تھا۔ حکومت کو امید تھی کہ اس طرح رائے عامہ انتہائی صورت اختیار کر لے گی اور اس سے صلح کی گفت و شنید پر اثر ڈالا جا سکے گا اگرچہ جو لوگ پیرس کی مجلسِ صلح میں کارفرماؤں کی حیثیت رکھتے تھے، وہ احتجاجات کے ان طوفانوں سے بالکل غیر متاثر رہے، جو اٹلی سے اٹھ رہے تھے، تاہم اٹلی کے باشندوں کو یقین ہو گیا کہ انھوں نے اپنا خون رائیگاں بہایا۔ جو علاقے ان سے چھینے گئے تھے، وہ ڈلمیشیا کے سلافی علاقے تھے، جو بحیرۂ ایڈریاٹک کے پار واقع تھے اور ان کے متعلق لندن میں اٹلی کے ساتھ خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ امریکی اس انتظام سے قطعاً متفق نہ تھے اور اب وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ اٹلی میں عوامی جذبات، خصوصاً فوج کے اندر، حکومت سے ہٹ کر کسی نہ کسی قسم کی انتہا پسندی کی جانب مائل ہو گئے۔

بعض اطالویوں نے ایک جنونی حالت میں گیبریل دا انزیو[۱] کی حمایت شروع کر دی۔ وہ ایک پست قامت اور کاملاً گنجا شاعر اور رومانی ناول نویس تھا، جس نے رضاکاروں کا ایک جتھا تیار کر دیا تھا۔ ان رضاکاروں نے فیوم پر قبضہ کر لیا۔ یہ بحیرۂ ایڈریاٹک کی ایک بندرگاہ تھا، جس کے متعلق کروٹوں اور اہلِ ہنگری کے درمیان مدت سے اختلاف چلا آ رہا تھا۔ دا انزیو نے وڈرو ولسن کی مذمت کی۔ صلح کو عفونت قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ انفرادی بہادرانہ کارناموں کا وقت آ گیا ہے۔ لندن کے خفیہ معاہدے کے مطابق بھی فیوم اٹلی کو دے دینے کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا، مگر دا انزیو نے سمجھ لیا کہ یہ اٹلی کو مل جانا چاہیے اور یہی امر اس کے نزدیک اقدام کو حق بجانب ثابت کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے فیوم میں اپنی حکومت قائم کر لی جو ۱۹۲۰ء کے اواخر تک قائم رہی۔

دا انزیو نے فیوم میں حکومت کا جو نظام بنایا تھا، وہ ازمنۂ وسطیٰ کی ایک خیالی جماعت کے نظام پر مبنی تھا، جس کا ذکر اٹلی کے ایک رومانی شاعر کاردوچی[۲] (۱۸۳۵ء۔ ۱۹۰۷ء) نے ایک نظم میں کیا تھا۔ دانزیو اس نظم کے حاکم کی پیروی کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ایوانِ بلدیہ کے شہ نشین میں نمودار ہوتا۔ عوام کے روبرو ایک ولولہ انگیز تقریر کرتا اور جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس پر متفقہ رضامندی کا مطالبہ کرتا۔ سامعین دایاں ہاتھ اٹھا کر اس کی تائید کرتے۔ کاردوچی

۱؎ Gabriele d' Annunzio

۲؎ Carducci

کی نظم میں ایسے ہی خیالی شہریوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان کا ایک نعرہ بھی تھا، جسے یک آہنگ ہو کر لگاتے، یعنی "آیا، آیا، آلالا"[1] دانزیو کے بعض پیرو سیاہ لباس پہنے ہوتے۔ جب دانزیو ان سے پوچھتا: "فیوم کس کا ہے؟" تو وہ بلند آواز سے کہتے: "ہمارا" اور جب پوچھتا: "اٹلی کس کا ہے؟" تو اس وقت بھی جواب میں "ہمارا" ہی کہا جاتا۔ اس نے طے کر رکھا تھا کہ اپنے پیرووں کو فیوم سے روما لے جائے، پھر دنیا کی فتح کے لیے نکل پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں صرف خنجر ہوں، کیونکہ وہ انھیں آتشبار ہتھیاروں پر ترجیح دیتے تھے۔ اس نے فیوم کے لیے ایک قانون اساسی بنا دیا، جس میں دانستہ ایک ایسے معاشرے کی تنظیم پیش نظر رکھی جو اس کے نزدیک ازمنۂ وسطیٰ کے گلڈوں اور فنکاروں کی انجمنوں کے لیے مایۂ افتخار تھی۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں اطالوی حکومت نے یوگوسلافیوں کے ساتھ معاہدۂ ایپالو کر لیا۔ اس کے مطابق فیوم کو آزاد شہر قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ اطالوی فوجوں نے دانزیو کو جبراً فیوم سے باہر نکالا اور اطالوی جھیلوں کے کنارے ایک بنگلے میں بٹھا دیا، لیکن اس نے قوت سے کام لینے کی جو تکنیک استعمال کی تھی، وہ اطالوی فاشزم کے بانی بینیٹو مسولینی کے لیے نمونہ بن گئی، یعنی شہ نشین سے عوام کو پرجوش انداز میں خطاب، ہاتھ سیدھا کر کے سلام، سیاہ وردی، یک آہنگ نعرے، فتوحات کی تدبیریں اور فیوم کے قانونِ اساسی کا اجتماعی منصوبہ۔

جنگ کے بعد پہلے چار سال میں مسولینی نے اٹلی میں ایک نئی سیاسی قوت پیدا کر دی اور اسے برسر اقتدار لے آیا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں شاہ وکٹر امانوئیل (سنہ ۱۹۰۰ء ـ سنہ ۱۹۴۷ء) نے مسولینی کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اُس وقت سے مسولینی تدریجاً ایک پارٹی کی مطلق العنان حکومت بنانے میں مصروف رہا، جس کا وہ واحد اور بے خلش حکمران تھا۔ اٹلی میں اس نے ہر مخالفت ختم کر دی۔ بیرونی امن کے لیے خطرہ بنا رہا۔ یہی حکومت جرمنی میں نازیوں کے لیے اور ہسپانیہ میں فرینکو کے پیرووں کے لیے ایک نمونہ بن گئی۔ ہیپسبرگ سلطنت اور سلطنت عثمانیہ کے بعد یورپ میں جتنی ریاستیں قائم ہوئیں، ان سب کی مطلق العنان حکومتوں نے یہی نمونہ پیشِ نظر رکھا۔ آگے چل کر مسولینی زیادہ تر اپنے پروپیگنڈے کی بنا پر ہٹلر سے اتحاد کے لیے مجبور ہوا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں یہی اتحاد اٹلی کے لیے دوسری عالمی جنگ میں شرکت کا موجب بنا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں اسی وجہ سے مسولینی کو ایک ذلت آمیز موت سے سابقہ پڑا۔ کمیونسٹوں نے اسے اور اس کی محبوبہ کو پہلو بہ پہلو الٹا پھانسی پر لٹکایا۔

جو حالات پیش آئے، انھیں ذہن نشین کرنے کے لیے اوّل یہ بتانا ضروری ہے کہ فاشزم کی بنیاد رکھنے سے پیشتر مسولینی کی زندگی کیونکر گزری۔ دوم اس نے کون سی تدبیریں اختیار کیں، جن کی بدولت وہ روما پہنچا۔ سوم اس

---

[1] Eya Eya Alala

کی قائم کردہ فاشسٹ مملکت کے نشو و ارتقار کی کیفیت دوسری عالمی جنگ میں شرکت تک پیش کرنی چاہیے۔ چہارم یہ بتانا چاہیے کہ اطالوی فاشزم کی تاریخ میں ابتدائی مفکروں کا مقام کیا تھا۔

مسولینی: ابتدائی زندگی

مسولینی وسط اٹلی کے صوبہ رومانا[1] میں پیدا ہوا (۱۸۸۳ء)، جو سیاسی انتہا پسندوں کے لیے خاصی شہرت کا حامل ہے اور وہ لوگ اپنے افکار ہمیشہ انتہائی شدت سے پیش کرتے ہیں۔ اس کا باپ ایک پرجوش اشتراکی تھا، جس نے بکونن[2] کے زیر اثر انارکسٹ کی زندگی شروع کی۔ مسولینی کی تعلیم و تربیت ابتدائی جماعتوں کے معلم کی حیثیت میں ہوئی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ پرجوش اشتراکی بن گیا۔ اس نے کچھ وقت ان اطالوی مزدوروں میں صرف کیا (۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء)، جو سوئٹزرلینڈ میں پہنچ گئے تھے وہاں مزدوروں میں ہنگامہ آرائی کرتا رہا۔ دو دفعہ اسے پولیس نے سوئٹزرلینڈ سے خارج کیا۔ پھر وہ اٹلی کے ایک سکول میں پڑھاتا رہا۔ (۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء)۔ بعد ازاں اشتراکی اخبار نویس اور مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت میں ٹرینٹ چلا گیا، جو آسٹریا کے قبضے میں تھا اور اطالوی اقلیت کا ایک اہم مرکز تھا۔ ۱۹۰۹ء میں وہاں سے بھی نکالا گیا۔ اٹلی واپس ہوا تو اسے اس لیے قید کر دیا گیا کہ وہ جنگ طرابلس کا مخالف تھا، جو ترکی کے خلاف لڑی جا رہی تھی (۱۹۱۱ء)۔ ۱۹۱۲ء میں وہ اٹلی کے نہایت مشہور اشتراکی اخبار "رونتی"[3] (اقدام) کا ایڈیٹر بن گیا۔

جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو مسولینی ابتدا میں سخت مخالفت کر رہا تھا کہ اٹلی شریک جنگ ہو، لیکن جلد ہی اس نے رائے تبدیل کر لی۔ پہلے اس نے متناسب غیر جانبداری کی حمایت کی، جس کا مدعا یہ تھا کہ اشتراکیوں کو آزادیٔ عمل حاصل رہے اور وہ چاہیں تو اٹلی کی شرکت جنگ کے حامی بن جائیں، بشرطیکہ یہ راہ عمل انھیں سازگار نظر آئے۔ جب اطالوی اشتراکیوں نے اس کی یہ رائے ٹھکرا دی تو اس نے رونتی کی ایڈیٹری سے استعفا دے دیا اور جلد ہی (نومبر ۱۹۱۴ء) میلان سے پہلا اخبار جاری کر دیا جس کا نام تھا "مردم اٹلی"[4]۔ اسی وقت سے اتحادیوں کی طرف سے اٹلی کی شرکت جنگ کے لیے وکالت شروع کر دی۔ اشتراکیوں نے اسے پارٹی سے نکال دیا۔

زندگی کے یہ سرسری حالات محض ظواہر پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء سے پیشتر مسولینی اشتراکی تھا اور بائیں بازو کا پرجوش حامی کہلاتا تھا۔ وہ متشددانہ اشتراکی انقلاب کا داعی اور نرم تر انقلابی اور اصلاحی اصول کا سخت مخالف تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ مختصر سی متحدہ اقلیت اختیارات پر قابض ہو کر ڈکٹیٹری قائم کر سکتی ہے۔ اسے نظام اکثریت سخت ناپسند تھا۔ وہ خود اس سے ہمیشہ گریزاں رہا۔ سپاہیوں کو تلقین کرتا رہتا تھا کہ فوج کی نوکری چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ اسے بادشاہی

---

۱ Romagna

۲ Bakunin

۳ Avanti جس کے معنی ہیں اقدام یعنی فارورڈ

۴ The People of Italy

سے بھی سخت نفرت تھی۔ اپنی تمام تحریرات میں یورپی تاجداروں، خصوصاً اٹلی کے خاندان سیورے کے خلاف سخت حملے کرتا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ دہریہ تھا۔ مزدوروں کو ہمیشہ تلقین کرتا کہ گرجے نہ جاؤ اور مسیحؑ کی تعلیمات کو حقیر سمجھتا تھا۔ بین الاقوامی انقلاب کی حیثیت میں وہ قوم پرستی کا مخالف تھا اور اطالوی پرچم کے متعلق کہتا رہتا تھا کہ ایک گندہ چیتھڑا ہے، جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر لہرائے جانے کے لائق ہے۔

لیکن آگے چل کر اس نے ان میں سے ایک ایک شے کی تردید کی اور فاشسٹوں کے رئیس کی حیثیت میں ان تمام چیزوں کے خلاف عمل پیرا رہا۔ مثلاً اس نے بالشوزم اور بائیں بازو کی تمام تحریکات کو مطاعن کا ہدف بنایا۔ بادشاہی اور کلیسا سے صلح کر لی۔ زبردست قوم پرست، ایک پراسرار محبِ وطن اور شدید اکثریت پسند بن گیا۔ جن نظریات کی حمایت وہ مدتوں انتہائی سرگرمی سے کرتا رہا تھا، ان سے برات ویسی حیرت انگیز نہ تھی، جیسی معلوم ہوتی ہے۔ ابتدا ہی سے مسولینی کو کسی پروگرام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی وہ صرف حکمرانی کا خواہاں تھا۔

موقع پرستی اس کا شیوہ تھا۔ وہ جب کبھی موقع کو اپنے لیے مفید تصور کرتا تھا تو کسی بھی مسئلے پر بے تکلف رائے بدل دیتا تھا۔ مثلاً جنگ کے بعد وہ فاشسٹ بن گیا تھا، مگر شروع میں عمرانی تبدیلی کے ایک انتہا پسندانہ پروگرام کا حامی بنا رہا، جو اشتراکیوں کے پروگرام سے بالکل مختلف نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں اطالوی مزدور کارخانوں میں بیٹھ گئے اور ہڑتال کر دی۔ اس طرح کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ مسولینی نے ان کے اقدام کی حمایت کی، لیکن ایک سال کے اندر اندر وہ اس ہڑتال کے خطرات بتا بتا کر طبقۂ اوسط کے ذہن نشین کر رہا تھا کہ صرف میں بالشوزم کے خلاف ایک دفاعی مورچہ ہوں، البتہ بعض معاملات میں وہ مستقل و استوار رہا۔ پارلیمنٹوں سے اسے ہمیشہ نفرت رہی اور تشدد کو ہمیشہ پسند کرتا رہا۔

اس کی روش میں سب سے پہلی اہم تبدیلی یہ تھی کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو وہ بے تعلقی سے کنارہ کش ہو کر شرکت کا حامی بن گیا۔ ممکن ہے، انقلابی اشتراکی ہونے کی حیثیت میں اس نے محسوس کر لیا ہو کہ صرف جنگ ہی اٹلی میں وہ حالات پیدا کر سکتی ہے۔ جو انقلاب کے لیے ضروری ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تشدد کے لیے پسندیدگی کا جو اظہار کر رہا تھا، وہ اشتراکی اصول پر غالب آ گیا اور وہ عمل کی حمایت صرف عمل کی غرض سے کرتا رہا۔ اشتراکی پارٹی سے اخراج کے بعد اس نے سرگرمی سے جنگ کی حمایت شروع کر دی۔ وہ نوجوانوں کے گروہوں کے سامنے تقریریں کرتا۔ انھیں فاشی[۱] (گروہ) کہتے۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی شریک جنگ ہوا تو اس سے تھوڑی مدت بعد مسولینی بھی جبری بھرتی میں آ گیا اور اسے محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ جنگی فنون کی مشق کر رہا تھا کہ اچانک ایک اطالوی گولہ اس کے قریب پھٹا جس سے بری طرح زخمی ہو گیا۔ چنانچہ

---

۱ Tasci

اس نے کئی مہینے ہسپتال میں گزارے۔ جب وہ تندرست ہو کر باہر نکلا تو اپنے اخبارات کی ادارت کرتا رہا، جو اشتراکی انقلابی نہیں رہا تھا، مگر انقلابی ضرور تھا اور اس میں جو مضامین چھپتے تھے، وہ انتہائی انقلابی اور انتہائی قوم پرستانہ پروپیگنڈے کا امتزاج ہوتے تھے۔

مسولینی کا اقتدار

مارچ ۱۹۱۹ء میں مسولینی نے جنگجوؤں کا پہلا گروہ تیار کیا۔ یہ گروہ بھی ویسا ہی تھا، جیسے اس سے پیشتر بن چکے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ڈلیشیا پر قبضہ کر لیا جائے۔ ان میں سے دانزیو کے گروہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں ایسا کوئی نشان موجود نہ تھا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں جنگجو فاشسٹ گروہ کا لیڈر اٹلی کا سب سے با اقتدار فرد بن جائیگا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے متشددانہ انقلاب کی ہر شق کے لیے دعوت دی۔ مثلاً یہ کہ زمین پر قبضہ کر لیا جائے۔ کارخانوں پر حملہ کر دیا جائے۔ سٹوروں کے جو منتظم زیادہ قیمتیں لیتے ہیں انھیں گولی مار دی جائے۔ کانوں اور وسائل حمل و نقل کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ ان فاتح سرمایہ داروں کے خلاف مفتوح پر دلتاری قوموں کو جنگ کرنی چاہیے، جو اٹلی کو ڈلیشیا کے الحاق سے روک رہے ہیں۔ اب اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ اشتراکیت حد درجہ قدامت پسندانہ ہے اور میری تحریک انقلاب کے خلاف نہیں، بلکہ ان لوگوں کی ہراول ہے، جو انقلاب کے لیے پکار رہے ہیں۔

تاہم اٹلی میں بالشویکوں کے نمونے کا انقلاب غیر ممکن نہیں تو غیر اغلب ضرور تھا۔ کسان انقلاب سے منزلوں دور تھے۔ انتہائی جنوبی حصے کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد زمینیں زیادہ تر انھیں کے قبضے میں تھیں۔ صنعتی مزدوروں کو علم تھا کہ انقلاب انھیں بھوکوں مار دے گا، اگرچہ وہ مختلف اوقات میں بے اطمینانی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ ملک اہم خام جنسیں درآمد کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اشتراکی پارٹی اعتدال پسندوں کے قبضے میں تھی اور ۱۹۱۹ء میں کیتھولکوں نے عوامی پارٹی[ا] کی بنیاد رکھی جس کا مدعا یہ تھا کہ نچلے طبقوں کے ووٹوں کے لیے اشتراکیوں کا مقابلہ کیا جائے۔

جنگ کے بعد فسادات شروع ہوئے تو کسانوں نے مالکان اراضی کی رضامندی حاصل کیے بغیر اٹلی کی ایک فی صد قابل کاشت زمین میں سے ½ پر قبضہ کر لیا۔ اشتراکی پارٹی اور مزدوروں کے عام وفاق کے لیڈروں نے انارکسٹوں اور انتہا پسند کمیونسٹوں کو ووٹوں سے ہرا دیا، جو چاہتے تھے کہ مزدوروں نے کارخانوں پر قبضہ کر لیا ہے تو اسے انقلاب کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ حکومت اس امر کا انتظار کرتی رہی کہ مزدور خود تھک کر کارخانے چھوڑ دیں۔ انھوں نے ایک مہینے کے اندر اندر (ستمبر ۱۹۲۰ء) یہی کیا، یعنی متصرفہ کارخانے چھوڑ کر گھروں میں جا بیٹھے۔ معاشرے کے ذی اثر طبقے حقیقی صورت حال کے متعلق جو تصور قائم کر لیتے ہیں، حقیقی صورت حال اس سے اکثر کم ہوتی ہے۔ اگرچہ انقلاب کا امکان

ا Popular Party

کم تھا، مگر اس کا خوف زیادہ تھا۔ سن ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں صنعتکاروں اور مالکانِ اراضی نے ٹیکسوں اور افراطِ زر کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور وہ بے حد آزردہ ہو گئے۔ دکاندار اور تاجر چاہتے تھے کہ بازاروں میں آئے دن جو بدامنی ہوتی رہتی ہے، وہ ختم ہو جائے۔ غذائی جنسوں کی قیمتوں میں باقاعدگی پیدا ہو جائے۔ اشتراکیوں اور کیتھولکوں نے اصولِ تعاون پر جو غذائی سٹور کھولے تھے، انھیں ختم کر دیا جائے۔ جب جنسوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں اور تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہ ہوا تو متعین آمدنیوں والے عام لوگوں اور پیشہ وروں نے بھی سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ پولیس مقامی فسادات کو روکتے روکتے تھک گئی۔ جو لوگ فوجوں سے سبکدوش ہو چکے تھے، ان کی بے عزتی انارکسٹوں اور کمیونسٹوں نے شروع کر دی۔ بار بار کہتے: "یہ ہے تمہارا جنگی ریکارڈ"۔ ان طعنوں نے ان کے دل میں حُبِّ وطن کی حرارت بڑھا دی۔

ان تمام گروہوں نے ان قوتوں کے خلاف ایکا کر لیا، جو بالشویکوں کو پسند نہیں کرتی تھیں اور سب نے طے کر لیا کہ بالشویکوں کے جس انقلاب کا خطرہ درپیش ہے، اسے روکنا ایمان کی دلیل ہے۔ فاشسٹوں اور اشتراکیوں کے درمیان جگہ جگہ اور بازاروں میں فسادات ہو چکے تو بالشویکوں کے مخالفوں نے مسولینی کی طرف نظریں اٹھائیں اور اسے اپنے مفاد کا مدافع قرار دیا۔ دانزیو نے شکست کھائی اور مسولینی تنہا اس کا وارث رہ گیا۔ جب کمیونسٹ سنہ ۱۹۲۱ء میں اشتراکی پارٹی سے الگ ہو گئے تو مسولینی کے خلاف بائیں بازو کی مخالفت کمزور پڑ گئی۔ فاشسٹوں کی تعداد مئی سنہ ۱۹۲۰ء میں تیس ہزار تھی، فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ اور اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء میں روما پر اقدام کے وقت تین لاکھ تھی۔ اب وہ غیر مطمئن اور بیکار نوجوانوں کے معمولی جتھے نہ تھے، جن کے دماغ مبہم انقلابی اور قوم پرستانہ افکار سے متاثر تھے۔ اب بڑے بڑے آدمیوں کے بیٹے اس نظام میں شامل ہونے لگے:

> "یہ لوگ اپنے مقاصد کے لیے فاشسٹ بنے تھے۔۔۔۔ اگر وہ لوگوں کو مزدوروں کے لباس میں دیکھتے تو ان پر پل پڑتے اور مارنا شروع کر دیتے۔ ان کی ذہنیت ویسی ہی تھی جیسی کمیونسٹوں کی۔ وہ ہر اس شخص کو مارتے یا قتل کر دیتے تھے جسے اچھا لباس پہنے ہوئے دیکھتے تھے۔ ایک نے لکھا کہ جنگ سے فائدہ اٹھانے والوں کے معروف اور لیڈروں جیسے چہرے دیکھے۔۔۔۔ اور ہم ان سے روپیہ لینے پر مجبور ہوئے، کیونکہ ہمیں روپے کی ضرورت تھی اور رشوت سے بدتر صورتِ حال ہمیں صاف نظر آ رہی تھی۔"[۱]

اٹلی کے آزاد خیال پارلیمانی لیڈر بھی بالشویکوں کے مخالفین کے خطرات میں شریک تھے۔ انھوں نے نظم بحال کرنے اور نئے انتخابات کرانے کے بجائے فاشسٹوں کی حمایت شروع کر دی، کیونکہ وہ بائیں بازو والوں کو مفید سبق دے رہے تھے۔

---

[۱] G. Salvemini کی کتاب The Fascist Dictatorship ص: ۶۷-۶۸

انھوں نے فوج کے کمان افسروں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ فاشسٹوں کو بندوقیں، فوجی ٹرک اور پٹرول دے دیں، بلکہ ان کے گروہوں کی کمانداری کے لیے فوجی افسر بھی متعین کر دیں۔ پولیس کو ہدایت کی کہ جب فاشسٹ کہیں ہنگامہ برپا کریں تو پولیس والوں کی نظریں دوسری طرف رہیں۔ مقامی ججوں پر زور ڈالا کہ فاشسٹوں کو رہا کر دیں۔ مسولینی کا اخبار فوجی سپاہیوں میں مفت تقسیم کیا جاتا تھا اور اسے ایک محبِ وطن اخبار سمجھا جاتا تھا۔

اب اشتراکیوں اور مسیحی ڈیموکریٹوں کے خلاف خوف و دہشت کی مہم شروع ہو گئی۔ فاشسٹوں کے دستے ٹرکوں میں بیٹھ کر اٹلی کے چکر لگانے لگے۔ وہ لیبر یونینوں کے دفتروں، اخباروں کے مرکزوں، مقامی اشتراکیوں کے مستقروں کو آگ لگا دیتے۔ مزدور لیڈروں کو زدو کوب کرتے، بلکہ بعض دفعات قتل بھی کر دیتے۔ جو سیاستدان فاشسٹوں کے خلاف تھے، ان سے بھی یہی سلوک ہوتا۔ فاشسٹوں نے باقاعدہ منتخب شدہ افسروں کو بھی استعفے پر مجبور کر دیا۔ پھر آتشزنی، زدو کوب اور کیسٹر آئیل (ارنڈی کا تیل) کے مخصوص حربے استعمال کیے گئے[1]۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ فاشسٹوں، ان کے مخالفوں، پولیس کے جوانوں اور بے گناہ تماشائیوں میں سے کم و بیش دو ہزار آدمی اکتوبر ۱۹۲۰ء اور اکتوبر ۱۹۲۲ء کے درمیان مارے گئے۔

روم پر اقدام

مئی ۱۹۲۱ء کے انتخابات میں مسولینی اور اس کے ساتھ چونتیس دوسرے فاشسٹ پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے۔ دس قوم پرست ممبروں نے فاشسٹوں سے سیاسی اتحاد کر لیا تھا۔ اب فاشسٹ تحریک کا زور شور اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے کم کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ مسولینی نے بادشاہی کی مخالفت ترک کر دی اور نومبر ۱۹۲۱ء سے فاشسٹ پارٹی ملک کی ایک عام سیاسی پارٹی بن گئی۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر ناگزیر تھی۔ حکومت کی آنکھیں کھلیں تو علاج مسالجے کا وقت گزر چکا تھا۔ فاشسٹوں کے خلاف خاص تدبیریں اختیار کرنے کی کوشش کی گئی، مگر فاشسٹ جتھے خاصے طاقتور تھے۔ پولیس ان سے مل جل کر کام کرنے کی عادی چلی آتی تھی۔ سیاستدانوں کو خبر ہی نہ تھی کہ ایک مسلح ہجوم مملکت میں اقتدار پر قابض ہو سکتا ہے۔ شاہی خاندان کے ارکان میں سے بادشاہ کا چچیرا بھائی آؤسٹا کا ڈیوک[2] فاشسٹوں کا ہمدرد بن گیا تھا اور فوج کے اکثر جرنیل نیز پوری قوم پرست پارٹی اور ممتاز صنعتکار بھی ان کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

۱۹۲۲ء کے موسم خزاں میں یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اگر فاشسٹوں نے روم پر اقدام کیا تو فوج مزاحمت نہیں کرے گی۔ اواخر اکتوبر میں وزارت نے مارشل لا کا اعلان کر دیا، مگر فوجی ارباب بست و کشاد نے فاشسٹوں کو ریلوے سٹیشنوں، ڈاک خانوں، تار گھروں، اخباروں کے دفتروں، سرکاری عمارتوں اور اسلحہ کے مرکزوں پر قبضے کی اجازت دے

---

[1] کیسٹر آئل یعنی ارنڈی کا تیل مخلتف لوگوں کو پلا دیتے تھے اور انھیں جلاب لگ جاتا تھا۔

[2] Duke of Aosta

دی۔ جب مارشل لا کا اعلان تصدیق کے لیے بادشاہ کے سامنے پیش ہُوا تو اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ اسے علم ہو چکا تھا، فوج فاشسٹوں سے جنگ نہیں کرے گی اور آدسٹا کا ڈیوک بہ صد خوشی اٹلی کا تاجدار بن جائے گا۔ بادشاہ نے مارشل لا کے اعلان سے انکار کیا تو اس سے فاشسٹوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اب انھوں نے رومہ پر اقدام شروع کر دیا۔ ٹرینوں پر جابجا قبضہ کر لیا گیا یا کرایہ دیئے بغیر سواریوں کا انتظام کر لیا گیا۔ بادشاہ نے مسولینی کو میلان میں رومہ آنے کے لیے تار بھیجا (۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء) تاکہ وہ وزارت بنائے۔ چنانچہ مسولینی ۳۰۔ اکتوبر کی صبح کو رومہ پہنچ گیا۔

فاشزم کی ابتدا ایک وطنی تحریک کی صورت میں ہوئی تھی، جو بالشویکوں کے خلاف تھی۔ پھر اس نے صنعتکاروں اور مالکانِ اراضی کی خدمت کے سلسلے میں مزدوروں کی مخالفت شروع کر دی۔ آخر فوجیوں کے ایک گروہ کے ساتھ پالیمانی حکومت سے ساز باز کر کے اقتدار حاصل کر لیا۔ وزارت سنبھالنے سے پیشتر مسولینی نے اعلان کیا:

> "ہمارا پروگرام بہت سادہ اور واضح ہے۔ ہم اٹلی پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارا پروگرام کیا ہے۔ یہاں بہت سے پروگرام موجود ہیں۔ اٹلی کی نجات کے لیے پروگراموں کی ضرورت نہیں، بلکہ آدمیوں اور قوتِ عزم کی ضرورت ہے[1]۔"

---

[1] H. Finer کی کتاب Mussolini's Italy

ترسٹھواں باب

فاشزم اور اٹلی

(۲)

فاشسٹ ڈکٹیٹری

اب مسولینی نے تدریجاً اپنی وزارت کو ڈکٹیٹری کی شکل دینے کی کوشش کی۔ وزارت بنانے سے ایک مہینہ بعد اس نے ۱۹۲۳ء کے آخر تک کے لیے ڈکٹیٹری کے اختیارات حاصل کر لیے۔ اگرچہ دستور نظری اعتبار سے قائم رہا، مگر مسولینی نے انتظامات اپنے ہاتھ میں لینے شروع کر دیے۔ اس نے دو لاکھ آدمیوں کی ایک فاشسٹ ملیشیا بنائی، جو براہ راست اس کی مطیع و فرمانبردار تھی۔ باقاعدہ فوج کی تعداد بڑھا دی اور تمام فوجیوں کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ شخصی وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ ڈکٹیٹری کے اختیارات کی میعاد ختم ہونے سے پیشتر اس نے پارلیمنٹ پر دباؤ ڈال کر ایک نیا انتخابی قانون منظور کرا لیا۔ اس قانون کا مدعا یہ تھا کہ جس سیاسی پارٹی کو عام انتخاب میں سب سے زیادہ ووٹ ملیں — مثلاً اگر ان ووٹوں کی تعداد کم از کم ایک چوتھائی ہو تو — پارلیمنٹ کی دو تہائی نشستیں اس کے حوالے ہونی چاہییں۔ باقی نشستیں تناسب کے مطابق تقسیم کر دی جائیں گی۔ اس قانون نے آئندہ کے لیے پارلیمنٹ میں فاشسٹوں کا اقتدار یقینی بنا دیا۔ اپریل ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں فاشسٹوں نے تمام ووٹوں کا پینسٹھ فی صد حصہ حاصل کر لیا، لیکن اس سلسلے میں دباؤ اور دہشت کا استعمال وسیع پیمانے پر کیا گیا۔ ساتھ ہی پہلی مرتبہ فاشسٹ وزارت مقرر ہوئی۔ اس اثنا میں مقامی نظم و نسق صوبے کے لیے فاشسٹ گورنروں اور نائب گورنروں کے تقرر سے مستحکم کر لیا گیا۔ ان افسروں نے فاشزم کے دشمنوں کے خلاف قتل اور قطع اعضاء کے وہی حربے استعمال کیے جو روم پر مسولینی کے اقدام سے پیشتر استعمال کیے گئے تھے۔

۱۹۲۴ء کے اوائل میں حزب مخالف کے لیڈر جیاکومو میٹی اوٹی[1] نے، جو اشتراکی تھا، ایک کتاب شائع کی، جس کا نام تھا: "فاشسٹ بے نقاب" اس نے تفصیل سے ظلم و جور کے وہ واقعات بیان کیے، جن سے فاشسٹوں نے

---

[1] Giacomo Matteotti

حصولِ اقتدار کے سلسلے میں کام لیا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی مزید انکشافات ہوں گے، یہاں تک کہ مسولینی کے وزیروں کی رشوت خوری بھی بے نقاب ہو جائے گی۔ ۱۰ر جون ۱۹۲۴ء کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ میٹی اوٹی کو قزاقوں کی طرح اٹھا کر باہر لے گئے اور قتل کر دیا۔ جرم کا سراغ لگایا گیا تو مسولینی کے قریبی ساتھیوں تک معاملہ پہنچا۔ اس سے اٹلی بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ تھوڑی مدت کے لیے معلوم ہو رہا تھا کہ مسولینی وزارت سے نکالا جائے گا، مگر اس نے ان لوگوں کو وزارت سے برطرف کر دیا، جو اس الزام میں ملوث تھے اور وعدہ کیا کہ وہ امن و نظم بحال کر دے گا۔ پھر مارچ ۱۹۲۶ء تک مجرموں کے خلاف مقدمہ ہی نہ چلنے دیا۔ مقدمہ چلا تو معمولی سزائیں دے کر قصہ ختم کر دیا گیا۔

عجیب امر یہ ہے کہ اس بحرانی حالت میں مسولینی کو حیرت انگیز طریق پر مدد ملی۔ یعنی مخالف ممبروں میں سے اکثر پارلیمنٹ چھوڑ گئے۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک میٹی اوٹی کے قتل کی گتھی سلجھائی نہ جائے گی اور حکومت ہر جرم سے پاک نہ ہوگی، ہم پارلیمنٹ میں نہیں بیٹھیں گے۔ ان کا خیال ہوگا کہ اس طرح مسولینی کے لیے حالات نازک بن جائیں گے، مگر عملاً ان کے چلے جانے سے مسولینی کا کام سہل ہو گیا۔ اس نے خود اعلان کر دیا کہ اس جرم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اخباروں پر شدید احتساب عائد ہو گیا اور حزبِ مخالف کو اجلاس منعقد کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اکثر ممبر پھر پارلیمنٹ میں نہ آئے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی نشستوں کے خالی ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

اگرچہ ۱۹۲۵ء میں میٹی اوٹی کے قتل سے پیدا شدہ بحرانی حالت قائم رہی، مگر مسولینی اپنی گرفت کو مستحکم بناتا گیا۔ قوانین کا ایک سلسلہ جاری ہوا جس کے ذریعے سے اخباروں پر ضبط و نظم زیادہ سخت کر دیا گیا۔ فری میسنوں جیسی خفیہ انجمنیں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ مسولینی کو ابتدا ہی سے ایسی انجمنیں پسند نہ تھیں۔ مرکزی حکومت کا ضبط و نظم تمام شہروں اور قصبوں تک وسیع ہو گیا۔ ان کے منتخب نمائندے اقتدار سے محروم کر دیئے گئے، ان کی جگہ روم سے نئے افسر پہنچ گئے۔ ان قوانین کو انتہائی فاشسٹ قوانین کہا جاتا ہے۔ جو لوگ فاشسٹ نظام کے مخالف تھے، انھیں گرفتار کر لیا اور بنجر جزیروں میں پہنچا دیا گیا۔ جو اطالوی جزیروں کے آس پاس واقع تھے۔ ۱۹۲۶ء کے اوائل میں مسولینی کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق فرمان جاری کر کے حکومت کا کاروبار چلائے۔ تین مرتبہ اس پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نیا قانون منظور کر لیا گیا، جس کے مطابق بادشاہ، ملکہ یا مسولینی کے خلاف اقدام کی سزا موت قرار پائی۔ اسی سال تمام مخالف پارٹیاں ختم کر دی گئیں اور اٹلی میں صرف فاشسٹ پارٹی آئینی سیاسی پارٹی رہ گئی۔

اطالوی مملکت اور فاشسٹ پارٹی کے درمیان اتحاد روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ مسولینی فاشسٹوں کا لیڈر بھی تھا اور مملکت کا رئیسِ اعظم بھی۔ ایک موقع پر اس کے پاس آٹھ وزارتوں کے قلمدان تھے۔ فاشسٹوں کی ایک مجلسِ کبیر[ل] نمائی

ل Fascist Grand Council

گئی جس کے تقریباً بائیس ممبر تھے اور یہ سب بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ انھیں مسولینی نے مقرر کیا تھا۔ نظم و نسق میں جو اہم عہدے مسولینی کے پاس نہ تھے، وہ مجلس کبیر کے ممبروں کو دے دیئے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں اس مجلس کو اہم دستوری فرائض سونپ دیئے گئے۔ مثلاً ایوان کے انتخاب کے لیے امیدواروں کی فہرستیں تیار کرنا، مسولینی کو مشورے دینا، دستور میں یا حکمران کی جانشینی میں تغیرات تجویز کرنا۔ مجلس کبیر حکومت کا تیسرا ایوان بن گئی۔ یہ پارلیمنٹ کے دو ایوانوں یعنی سینٹ اور ایوانِ عام سے بھی بالا تھی۔

اجتماعی مملکت

در حقیقت مسولینی کا ارادہ یہ تھا کہ مغرب کے پارلیمانی نظام کے اصول تبدیل کر دے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے مفاد مملکت کے ہم آہنگ ہونے چاہئیں اور انھیں ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے۔ البتہ مملکت کے مفاد کو برتری حاصل ہو گی۔ ہمارے نزدیک سیاسی نظام انفرادی حقوق پر مبنی ہے۔ مسولینی سمجھتا تھا کہ نمائندگی اقتصادی مفاد پر مبنی رہنی چاہیے اور اس کی خواہش یہ تھی کہ مختلف مفادوں کو اکتسابی اشتراکیت کی بنا پر منظم ہونا چاہیے۔ یہ خیال نیا نہ تھا۔ فرانس کا مشہور اکتسابی اشتراکی جارجز سوریل[1] اس انداز میں استدلال کر چکا تھا، لیکن سوریل طبقاتی جنگ کا قائل تھا اور حکومت میں کارکنوں کی جماعتیں قائم کرنے کا حامی تھا۔ مسولینی اطالیہ کے قوم پرست اکتسابی اشتراکی روسونی[2] کی پیروی کرتے ہوئے سرمایہ داری، طبقاتی تعاون، سامان تیار کرنے والوں اور مزدوروں کی جماعتوں کا قائل تھا۔

۱۹۲۵ء میں مالکوں نے فاشسٹ مزدوروں کی یونینیں تسلیم کر لیں اور انھیں مزدوری کے معاہدوں کے لیے گفت و شنید کا واحد حقدار مان لیا۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں حکومت نے سرکاری طور پر مال پیدا کرنے والوں اور کارکنوں کی جماعتیں چھ حالتوں میں تسلیم کر لیں یعنی زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، بحری اور ہوائی حمل و نقل، بری اور اندرون ملک کی آبی حمل و نقل اور بینکنگ۔ ساتھ ہی اہل علم کی جماعت بن گئی۔ اس طرح تیرہ جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ ہر جماعت گفت و شنید کے ذریعے سے معاہدے کر سکتی تھی اور اس کے اقتصادی دائرے میں جتنے لوگ کام کرتے تھے، خواہ وہ جماعت کے ممبر تھے یا نہیں تھے، وہ ان کے واجبات کی تشخیص کی حقدار تھی۔ ہڑتالیں اور کام کاج چھوڑ دینے کو ممنوع قرار دیا گیا۔ جب مزدوروں کی حالت میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تو مزدوروں کے لیے ایک منشور تیار ہوا، جو ۱۹۲۷ء میں جاری کیا گیا۔ اس کے مطابق انھیں بیمے اور دوسرے فوائد کی حفاظت کا یقین دلا دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ان جماعتوں کو ایک خاص وزارت کے تابع کر دیا گیا۔ مسولینی ہی کے پاس اس وزارت کا قلمدان رہا۔

۱۹۲۸ء میں پارلیمانی نمائندگی کا نظام فاشسٹوں کی اکتسابی اشتراکیت کے مطابق تبدیل کر دیا گیا۔ نئے ایوان مندوبین کے لیے (جس کے ممبروں کی تعداد چار سو کے بجائے پانچسو ساٹھ کر دی گئی) ایک نیا انتخابی قانون منظور ہوا۔ تیرہ

۱؎ Georges Sorel

۲؎ Rossoni

انتخابی جماعتوں کی قومی مجلسیں کُل آٹھ سو امیدوار نامزد کر سکتی تھیں۔ ہر جماعت کے لیے ایک تعداد مقرر تھی۔ ان میں سے نصف ممبر مالک تجویز کرتے تھے اور نصف کارکن۔ ثقافتی اور رفاہی اداروں کو دو سو سے زیادہ امیدوار نامزد کرنے کا اختیار تھا۔ جب ایک ہزار امیدواروں کی فہرست مکمل ہو جاتی تو فاشسٹوں کی مجلس کبیر یا تو ان سے چار سو نام چُن لیتی یا بعض کے نام کاٹ کر بطور خود نئے نام لکھ دیتی یا یہ فہرست رد کر کے اپنی طرف سے پوری نئی فہرست پیش کر دیتی۔ پھر ووٹروں کے سامنے یہ معاملہ یوں پیش کیا جاتا: "تم فاشسٹ مجلس کبیر کے چُنے ہوئے ممبروں کی فہرست قبول کرتے ہو یا نہیں؟" ووٹر پوری فہرست کے بارے میں "ہاں" یا "نہ" کا فیصلہ کرتے؛ لیکن وہ امیدواروں میں سے بعض کو چُننے اور بعض کو رد کر دینے کے حقدار نہ تھے۔ اگر اکثریت "ہاں" کہہ دیتی تو تمام امیدوار کامیاب سمجھے جاتے۔ اگر اکثریت کا فیصلہ برعکس ہوتا تو پورا عمل دہرایا جاتا۔ مختلف انتخابی جماعتوں کو بھی اختیار دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اصل فاشسٹ مجلس کبیر ہی کے ہاتھ میں تھا۔ انتخاب کی اس محدود شکل کے سلسلے میں تمام بالغوں کے لیے حق رائے منسوخ کر دیا گیا۔ ہر اس شخص کو ووٹر بنا دیا جاتا، جو کسی انتخابی جماعت کے لیے کچھ رقم دے دیتا یا اس کے واجبات ادا کر دیتا۔ عورتوں کو ووٹ کا حق نہ تھا۔ ۱۹۲۹ء میں اس نظام کے تحت انتخابات ہوئے تو پچاسی لاکھ انیس ہزار پانسو انسٹھ ووٹ مجلس کبیر کی فہرست کے حق میں تھے اور ایک لاکھ سینتیس ہزار سات سو اکسٹھ ووٹ خلاف تھے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان متعدد دستوری قدم اٹھائے گئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ انتخابی جماعتوں کو مرکزی حیثیت دے دی جائے۔ انتخابی جماعتوں اور حکومت کے نمائندوں کی ایک مجلس اشتراک تعاون بنا دی گئی، جسے تعاونی مجلس کہنا چاہیے۔ یہ انتخابی جماعتوں کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ کرتی، پیداوار بڑھانے میں مدد دیتی، فاشسٹوں کے تعاونی ادارے قائم کرتی جو اس وقت تک قائم نہیں ہوئے تھے۔ اس مجلس کے سات حصے تھے، جن کا تعلق انتخابی جماعت کے سات حلقوں سے تھا۔ ۱۹۳۱ء سے مجلس کے ہر حصے کو بجائے خود ایک کارپوریشن قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں اعلان کر دیا گیا کہ پورے نظام پر نظر ثانی کی جائے گی۔ ۱۹۳۴ء میں نئے انتخابات ہوئے (جن کے مطابق فاشسٹ مجلس کبیر کی فہرست کے امیدوار منظور کر لیے گئے۔) اس میں ایوان مندوبین کو ختم کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نئی انتخابی مجلس قائم کر دی گئی، جس کا اجلاس ۱۹۳۴ء کے موسم خزاں میں ہوا۔ اس مجلس کو کارپوریشنوں کی مرکزی مجلس بھی کہتے تھے۔ اس میں آٹھ سو چوبیس ممبر تھے، کیونکہ بائیس نئی طرز کی کارپوریشنیں قائم کر دی گئی تھیں اور ان کے نمائندے بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہر کارپوریشن میں فاشسٹ، مالکوں اور مزدوروں کے نمائندے شامل تھے۔

۱۹۳۸ء تک آخری قدم نہ اٹھایا گیا۔ اس وقت مرکزی ایوان مندوبین ختم ہوا اور اس کی جگہ کارپوریشنوں کی مرکزی کمیٹی نے لے لی، جسے فاشسٹوں اور کارپوریشنوں کا ایوان بھی کہا جاتا تھا۔ جو پارلیمانی نظام کاوور[1] نے قائم کیا تھا، اس

---

[1] Kavour

میں سے سینٹ کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ سینٹ برائے نام بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتا تھا، لیکن وہ مسولینی کے تابع تھا، جس کے لیے ایک موقع پر مسولینی نے بادشاہ کو مجبور کر کے چالیس فاشسٹ ممبر بیک وقت نامزد کرا لیے تھے۔ یہ نیا نظام، جسے اجتماعی مملکت قرار دیا گیا، دانھزیو کے ان افکار کا نتیجہ تھا، جن کا تعلق ازمنۂ وسطیٰ سے تھا۔ پھر مسولینی کی خواہش تھی کہ وہ نئے سیاسی اور اقتصادی ادارے پیدا کرے۔ کارپوریشنوں کی مرکزی کمیٹی اور اس کی جانشین جماعت یعنی فاشسٹوں اور کارپوریشنوں کا نظام اس غرض سے تجویز کیے گئے تھے کہ حکومت کو مشورے دیں، مزدوروں کے جھگڑے چکائیں اور پیداوار کی ترقی کے لیے منصوبے تجویز کریں اگرچہ فاشسٹوں سے ہمدردی رکھنے والوں نے اس نظام اور اس کے محاسن کی تشریح پر بڑی فصاحت صرف کی، لیکن یہ کارپوریشنیں ازمنۂ وسطیٰ کے گلڈوں کی ہمسر نہ بن سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اٹلی کی اقتصادی یا سیاسی زندگی کے سلسلے میں کبھی کوئی قابلِ ذکر کام نہ کیا۔ یہ دونوں چیزیں فاشسٹ نوکر شاہی کے زیرِ اثر رہیں۔ فاشسٹوں کے دوسرے داخلی مسالک صدی کے چوتھے عشرے میں فاشسٹوں کی اقتصادی منصوبہ بندی نمایاں ہوئی۔ حکومت کارخانے بنانے کے سلسلے میں اجازت نامے دیتی یا روکتی۔ زراعت کے تعلق میں ایک اجتماعی کوشش کی گئی۔ جس کا مدعا یہ تھا کہ اٹلی کو تقریباً کفیل بالذات بنا لیا جائے۔ اس کوشش کا خاص پہلو وہ ہے، جسے "جنگِ گندم"[1] کہا گیا یعنی اطالویوں کے درمیان گندم کی پیداوار کے لیے مقابلے ہوئے، انعام دیئے گئے۔ مسولینی خود ایسے موقعوں پر پہنچا۔ ۱۹۳۶ء میں سرکاری اعداد یہ تھے کہ گندم کی پیداوار اس درجے پر پہنچ چکی ہے، جس سے قوم کی طبعی ضرورت بانوے فی صد تک پوری ہو سکتی ہے۔ پھر دوسرے غلّوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی گئی حکومت نے بحری اور فضائی جہاز ران کمپنیوں کو مالی امداد دی۔ سیاحوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور اطالوی مصنوعات پر بھاری محاصل ادا کر دیئے گئے۔ دلدلیں خشک کی گئیں اور کھیتی باڑی کے لیے نئی زمینیں نکالی گئیں۔ موسمی بخار سے اموات کا سلسلہ کم ہو گیا۔ امورِ عامہ پر بے اندازہ رقمیں خرچ کی گئیں۔ پن بجلی کو خاصی ترقی دی گئی۔ ہزاروں امریکی سیاحوں نے بیان کیا کہ ٹرینیں وقت پر چلتی ہیں اور جو لوگ اٹلی کی سیاحت کر کے واپس آئے، وہ کہتے تھے، یقیناً مسولینی میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے، لیکن ضروری خام مال کے سلسلے میں اٹلی کی پسماندگی پر قابو نہ پایا جا سکا۔

مملکت فرد کی زندگی کے ہر موقع میں داخل ہونے لگی۔ اگرچہ اٹلی کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی اور کثیر تعداد میں لوگ ترکِ وطن کر کے باہر نکل جاتے۔ اس طرح آبادی کا دباؤ کم ہوتا رہتا۔ مسولینی نے ترکِ وطن کو جرم قرار دے دیا۔ اس نے لوگوں کو آمادہ کیا کہ شادیاں کرو۔ جتنے بڑے کنبے پیدا کر سکتے ہو، کر لو۔ ایسے کنبوں کے ٹیکس کم کر دیئے۔ ان کے لیے خاص قرضوں کا انتظام کر دیا گیا۔ بے بیاہے لوگوں پر ٹیکس لگا دیئے گئے۔ ناجائز اولاد کو قانوناً جائز اولاد کے مساوی

---

[1] Battle of Wheat

درجہ دے دیا گیا۔ مسولینی کو امید تھی کہ اس طرح فوج کی تعداد بڑھائی جا سکے گی اور اٹلی کے لیے باہر توسیع کے دعوے کو تقویت پہنچے گی۔ بچوں کو نوجوانوں کی مختلف تحریکات میں چھ سال کی عمر سے شامل کرنے لگے۔ یہی نوجوان آگے چل کر فاشسٹ پارٹی کے ممبر بننے والے تھے۔ درسگاہوں اور کتب خانوں کی کتابوں، یونیورسٹی کے پروفیسروں، تھیٹروں اور سینماؤں وغیرہ سب کو فاشسٹ پروپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ خفیہ پولیس نے جسے اووُرا[1] کہتے تھے، ہر مخالف تحریک کا سراغ لگایا اور اسے دبا دیا۔

۱۹۲۹ء میں مسولینی نے پاپائیت کے ساتھ معاہدہ کر لیا، جو معاہدۂ لاٹری[2] کہلاتا ہے۔ اس طرح رومی مسئلہ حل ہو گیا۔ اس معاہدے کے مطابق شہر ویٹیکان[3] کو خود مختار مملکت مان لیا گیا۔ اس طرح پوپ کا دنیوی اقتدار بحال ہو گیا، اگرچہ اس کے دائرے میں بہت کمی آگئی۔ کیتھولزم مملکت کا مذہب قرار پایا اور مسولینی نے پاپائیت کے خلاف پروپیگنڈے کو روکنے کا وعدہ کر لیا۔ کلیسا کے لیے اعانتی رقوم یا پادریوں کی تنخواہوں پر ٹیکس کا حق ترک کر دیا گیا اور ساڑھے دس کروڑ ڈالر پاپائیت کو اس نقصان کے معاوضے میں دیے، جو ۱۸۷۰ء میں پاپائی علاقوں پر قبضہ کرنے کے باعث اسے پہنچا تھا۔ پھر ایک میثاق کے ذریعے سے کلیسا اور مملکت کے درمیان روابط کا آخری فیصلہ ہو گیا۔ مذہبی شادیاں تسلیم کر لی گئیں اور مدارس میں مذہبی تعلیم جاری ہو گئی۔ کلیسا نے مان لیا کہ اس کے اخباروں یا رسالوں میں کوئی سیاسی بحث نہ ہوگی۔

اگرچہ کلیسائی افسروں میں سے خاصی تعداد فاشسٹ تحریک کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتی تھی، تاہم معاہدوں کے بعد مشکلات پیدا ہوئیں۔ پوپ پائس یازدہم (۱۹۲۲ء-۱۹۳۹ء) نے ایک اعلان کے ذریعے سے مسولینی کی اقتصادی پالیسی اور کارپوریشنوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس سے عمرانی نظام کی بہتری کے بجائے سیاسی مقاصد کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ مسولینی نے اس کے برعکس یہ الزام لگایا کہ کیتھولک کلب سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں اور انھیں توڑ دیا گیا۔ پوپ نے ان الزامات سے انکار کیا اور فاشسٹ پارٹی کے عمل کی مذمت کی، کیونکہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور وقت کی اجارہ دار بن گئی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں پوپ اور مسولینی کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا، جس کے مطابق کلب دوبارہ قائم ہو گئے۔

فاشسٹوں کی خارجہ پالیسی اور اس کے نتائج

چونکہ مسولینی کی خارجہ پالیسی ان بین الاقوامی رقابت کا ایک لاینفک جزو ہے۔ جو دوسری عالمی جنگ کا موجب ہوئی۔

۱؎ OVRA اطالوی زبان میں Vigilance Organization against Anti-Fascist Crimes کا مخفف ہے۔ ۲؎ Later n Treaty ۳؎ Vatican

لہٰذا ہم ایک آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ مسولینی کی انتہا پسندانہ قوم پرستی پریڈوں اور نمود و نمائش کے شوق اور اس کی عسکریت پسندی داخلی افکار اور کارناموں کے منطقی مظاہر تھے۔ وہ قدیم روما کی شان و عظمت زندہ کر دینے کا خواہاں تھا، لہٰذا اس نے بحیرۂ روم کے سلسلے میں منچلے پن کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے کہا کہ بحیرۂ روم ہمارا سمندر ہے۔ گویا وہ اپنے آپ کو قیصر کا وارث سمجھتا تھا۔ اس پالیسی کی ابتدا ۱۹۲۳ء میں کارفو[^1] کے واقعے سے ہوئی۔ پانچ اطالوی جمعیت اقوام کے لیے کام کر رہے تھے۔ جب وہ البانیا اور یونان کے درمیان ضلعی حد بندی میں مصروف تھے تو انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر مسولینی نے یونان کے جزیرۂ کارفو پر پہلے گولہ باری کی پھر اس پر قابض ہو گیا۔ جب یونانیوں نے جمعیت اقوام کے پاس اپیل کی تو مسولینی نے جمعیت کا حقِ مداخلت تسلیم نہ کیا اور دھمکی دے دی کہ میں اس بین الاقوامی انجمن کو چھوڑ جاؤں گا۔ برطانوی دباؤ کے تحت اس معاملے میں تصفیے کی صورت پیدا ہوئی۔ یونانیوں نے تاوان دینا منظور کر لیا اور مسولینی نے کارفو سے فوج ہٹا لی۔

اس پورے واقعے سے، جو فاشزم اور جمعیت اقوام کی تاریخ کے ابتدائی دور میں پیش آیا، ظاہر ہو گیا کہ فاشسٹوں کو کسی بین الاقوامی جماعت کے رشتوں میں جکڑا نہیں جا سکے گا۔ پھر مسولینی کی پالیسی نے اسے جنگِ ہسپانیہ اور البانیہ (جس پر صدی کے تیسرے عشرے میں اس کا اقتدار قائم رہا اور اپریل ۱۹۳۹ء میں وہ اس پر قابض ہو گیا) کی جنگوں میں الجھا دیا۔ وہ اپنے ہمسر فاشسٹ ہٹلر سے اتحاد پر مجبور ہوا اور فرانسیسیوں کے خلاف کارسیکا، ٹیونس، نیس اور سیوائے کے لیے اس نے بلند آہنگ دعوے پیش کر دیے۔ یوں اٹلی طبعی حلیفوں یعنی فرانس اور برطانیہ کی ہمدردی کھو بیٹھا۔ مسولینی کے عظیم القدر فاشسٹ نظریات نے پہلے اٹلی کو کفالت بالذات پر آمادہ کیا۔ اس نے اپنی بندرگاہیں نئے سرے سے تعمیر کر لیں۔ تجارتی بیڑے اور بحری قوت کا انتظام کر لیا، مگر انھی نظریات نے اٹلی کو ان طاقتوں سے علیحدہ کر دیا، جو اسے اس تباہی سے بچا سکتی تھیں۔ جدھر مسولینی اسے لیے جا رہا تھا۔

جرمنی کے ساتھ اتحاد داخلی معاملات میں فاشسٹوں کو نئے انحراف پر آمادہ کرنے کا ذمہ دار تھا، یعنی سامیوں کے خلاف پالیسی ۱۹۳۸ء میں اپنائی گئی، حالانکہ اس وقت صرف ستر ہزار یہودی تھے، جن میں سے اکثر مدت سے وہاں آباد چلے آتے تھے اور یہودیوں کا کوئی خاص مسئلہ موجود نہ تھا۔ اطالوی یہودی زبان اور جذبات کے اعتبار سے کامل اطالوی تھے۔ انھیں دوسرے اطالویوں سے اگر کوئی چیز الگ کرتی تھی تو وہ صرف مذہب تھا۔ اٹلی کے دوسرے غیر یہودی کی طرح بہت سے یہودی بھی فاشسٹ تحریک میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور بہت سے فاشسٹوں کے خلاف بھی تھے۔ ہٹلر نے جو نسلی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس کے لیے اٹلی میں کوئی خاص جذبہ موجود

---

[^1]: Carfu

نہ تھا، لیکن ہٹلر کے زیر اثر مسولینی نے یہودیوں کو فاشسٹ پارٹی سے خارج کر دیا اور انھیں درسگاہوں میں پڑھانے یا پڑھنے، غیر یہود سے شادی کرنے یا کاروبار کے نئے اجازت نامے لینے کی ممانعت کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کو اٹلی کی اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی زندگی سے باہر نکال دیا جائے۔

فاشزم کے پیشرو عمل میں فاشزم کے اس تجزیے سے ہمارے سامنے آخری سوال آتا ہے۔ یعنی ابتدائی مفکروں نے مسولینی کے نظام کی تخلیق میں کیا حصہ لیا؟ فاشزم کے پیشرووں کی حیثیت میں میکیاولی، ولیم جیمز، شوپن ہار اور دوسرے فلسفیوں کے نام اکثر لیے جاتے ہیں، مگر اغلب یہ ہے کہ مسولینی نے ان مصنفوں کی کتابیں صرف ان اعمال کو حق بہ جانب ثابت کرنے اور اپنے آپ کو مطمئن رکھنے کے لیے استعمال کیں۔ فاشزم کے بیان کردہ پیشرووں میں تین نام زیادہ نمایاں ہیں، یعنی نیٹشے، جارجز سورل اور پیریٹو[1] (مزید تفصیلات آئندہ آئیں گی) یہ تینوں عقلیت کے خلاف انیسویں صدی کے باغی تھے۔

نیٹشے مسیحیت اور جمہوریت کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے غیر معمولی عزم للقوت کے فوق الانسان کی جو تصویر پیش کی ہے، اس سے نیز عمل کے جذبے اور تصور کی برتری سے مسولینی پر گہرا اثر پڑا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ اشتراکی ہی تھا جب نیٹشے پر ایک مقالہ لکھا۔ جب وہ برسر اقتدار آیا تو نیٹشے کی بہن بھائی کے مسلک کو ہر دلعزیز بنانے والی جماعت کی رئیس تھی، جس نے نیٹشے کے بیشتر خیالات کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ نیٹشے کی بہن نے اعلان کر دیا کہ مسولینی ہی وہ فوق البشر وجود ہے جس کا ذکر میرے بھائی نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ یقیناً نیٹشے نے مسولینی کے اعمال کے لیے موزوں معقولیت پیدا کر دی، لیکن نیٹشے کو مملکت سے نفرت تھی، لہٰذا وہ کسی فوق البشر مسولینی کے لیے تائید کا روادار نہیں ہو سکتا تھا، جو اٹلی میں حکمرانی کا کام انجام دے رہا تھا۔

جارجز سورل (۱۸۴۷ء-۱۹۲۲ء) ایک فرانسیسی تھا جس نے انارکی اور اکتسابی اشتراکیت کی تشریح میں زندگی بسر کر دی۔ وہ ایک کتاب کا مصنف تھا، جس کا نام تھا "تشدد پر افکار"[2]۔ اسے طبقۂ اوسط سے نفرت تھی۔ پارلیمانی اشتراکیوں اور اعتدال پسندوں کی مذمت کرتا تھا، لہٰذا وہ ٹریڈ یونینوں کی طرف متوجہ ہوا اور انھی کو انقلابی روح کے سرچشمے سمجھتا تھا۔ اس نے عام ہڑتالوں کا نظریہ پیش کیا اور ہڑتالوں ہی کو انقلاب بپا کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ اسے امید تھی کہ جب عام ہڑتال ہو گی تو مزدوروں میں اعلیٰ جذبات کمال پر پہنچ جائیں گے۔ وہ سابقہ ہڑتالوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور فداکاری سے لیڈروں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اسے احساس تھا کہ

---

[1] Pareto

[2] Reflections on Violence

تشدد بے حد ضروری ہے، لیکن اسے نظام کے خلاف استعمال کرنا چاہیے نہ کہ افراد کے خلاف۔ یہاں سورل کا مقصد غالباً یہ تھا کہ افراد پر وحشیانہ تشدد سے لوگوں کو متنبہ کرے اور تشدد کو ایک اعلیٰ درجے کی روحانی حس قرار دے، لیکن ظاہر ہے کہ سیاسی اور عمرانی بحرانوں کے اوقات میں ایسے امتیازات پر عمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ بالشویکوں نے جو دہشت انگیزی کی، اسے دیکھ کر خود سورل کو بھی معترف ہونا پڑا۔

مسولینی کو سورل کی تصانیف سے گہری دلچسپی تھی اور ۱۹۰۹ء میں وہ سورل کی بیان کردہ کتاب پر تبصرہ کر چکا تھا، لیکن تشدد کے لیے سورل کی تعلیم کا محتاج نہ تھا۔ تشدد اس کے مولد، اس کے کنبے اور انقلابی اشتراکی نظریات کی روایت میں شامل تھا۔ اسی میں مسولینی نے پرورش پائی تھی۔

۱۹۱۰ء میں سورل اکتسابی اشتراکیت سے ہٹ کر ارتجاعی قوم پرستی کی طرف مائل ہو گیا جس کے نمائندے فرانس میں انتہائی دائیں بازو کے افراد یعنی شاہ پسند اور پادری تھے۔ آگے چل کر وہ مارکس اور لینن کا ہم خیال بن گیا۔ مگر ارتجاعی قوم پرستی سے عارضی دلچسپی ایک فال نیک تھی۔ اکتسابی اشتراکیت کے دوسرے انقلابی پیرو جن میں اطالوی بھی شامل تھے، ایسی ہی منزل سے گزرے۔ جو گروہ طبقۂ اوسط اور پارلیمنٹوں سے متنفر تھے اور ان کا بھروسا چھوٹی چھوٹی اقلیتوں یا منتخب جتھوں پر تھا۔ طبعاً ان میں اکثر چیزیں مشترک ہوں گی۔ ان گروہوں کو جوانمردوں کی ضرورت تھی، سخت اور زبردست فوق البشر آدمیوں کی۔ یوں قوم پرست اور انقلابی اکتسابی اشتراکیت کے پیرو بھی فاشزم کے پیشروؤں میں شامل تھے۔ اگرچہ مسولینی نے دائیں بازو کی طرف سورل کی حرکت کی سخت مذمت کی، لیکن آگے چل کر خود اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سورل محض علم و نظر کا آدمی تھا، مسولینی صاحب عمل تھا، لہٰذا اس نے اقتدار حاصل کر لیا۔

پیریٹو (۱۸۴۸ء ۔ ۱۹۲۳ء) ایک انجینئر اور ماہر بشریات تھا۔ اس نے حکومت میں "انسانوں کی اہمیت" پر زور دیا۔ وہ کہتا تھا کہ کسی حکمران کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے جذبات سے کام لینا چاہیے۔ کہانیوں اور افسانوں کے ذریعے سے جوش پیدا کرنا ضروری ہے۔ عقل و استدلال کے ذریعے سے یہ کام انجام نہیں پا سکتا۔ مگر یہ کوئی نئی چیز نہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ کامیاب سیاستدانوں کو وجدان اور تجربے کے ذریعے سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، اسے عقلی انداز میں پیش کر دیا گیا۔ پیریٹو کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ معاشروں پر منتخب آدمیوں کے ذریعے سے حکومت ہوتی ہے، جو طبعی حالات میں آہستہ آہستہ نئے آدمی نچلے طبقوں سے بھرتی کرتے رہتے ہیں، لیکن غیر طبعی حالات میں ایسے آدمی اقتدار سے محروم کیے جا سکتے ہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ بہت سے کمزور آدمی اقتدار اعلیٰ کے حامل ہوں اور بہت سے زبردست آدمی ان کی تابعیت میں کام کر رہے ہوں۔ مسولینی کو عالم جوانی ہی میں ان نظریات کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے منتخب افراد کا نظریہ اس دلیل کی حمایت میں استعمال کیا کہ پرولتاریا بورژوا کو باہر نکال دیں گے۔ آگے چل کر اس نے منتخب افراد کے نظریے کو فاشسٹ اصول

کی تائید میں استعمال کیا، مگر یہ تصوّر بھی فاشسٹوں کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ تقریباً ہر جگہ کے سیاستدان اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ پیریٹو نے معاشرت میں قوّت کے استعمال پر بھی بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بحرانی حالات میں وہ لوگ ضرور قوّت استعمال کرتے ہیں، جو قائم نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، یا جو اس کا تختہ الٹ دینے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اطالوی فاشزم کے ان نام نہاد پیشروؤں میں دانتزیو کو غالباً سب سے بڑھ کر اہمیت حاصل ہے۔ مسولینی دوسرے لوگوں سے آگاہ تھا اور ان سے کم و بیش متاثر ہوا، بلکہ اس نے ان لوگوں سے بھی اثر قبول کیا، جو کسی نہ کسی حد تک اس کے ہمنوا تھے اور نظریات میں اس سے اشتراک رکھتے تھے، لیکن اس کے نظام میں کسی ایک مفکر یا مفکروں کی جماعت کا پورا عکس موجود نہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں اس نے لینن کی مذمت میں ایک مقالہ لکھا تھا جس میں بڑی خوبی سے واضح کیا تھا کہ خود اس کا فاشسٹ نظام کیا ہے۔ اس میں سے یہاں اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اسے پڑھتے وقت لینن کی جگہ مسولینی کو رکھ لیجئے، روس کی جگہ اٹلی اور کمیونسٹ کی جگہ فاشسٹ۔ یوں آپ کو فاشزم کے متعلق صحیح کیفیت کا اندازہ ہو جائے گا:-

"روس ایک مملکت ہے..... جو برسرِ اقتدار آدمیوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے افراد اور گروہوں پر فولادی نظم عائد کر رکھا ہے۔ جب ضرورت محسوس کرتے ہیں، وہ رجعت اختیار کر لیتے ہیں..... لینن کے روس میں صرف ایک شخص کو اقتدار حاصل ہے، وہ خود لینن ہے۔ وہاں صرف ایک آزاد ہے اور وہ لینن ہے۔ وہاں صرف ایک رائے ہے اور وہ لینن کی رائے ہے۔ صرف ایک قانون ہے اور وہ لینن کا قانون ہے۔ ہر شخص کو یا تو سرِ تسلیم خم کر لینا چاہیے یا تباہ ہو جانا چاہیے..... روس... فرد کو نگل لیتا ہے اور اس کے اعضا توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ روس ہی فرد کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ زیردستوں سے محبّت رکھتے ہیں اہلِ پرشیا یا فولادی پنجے والی مملکت کے محب ہیں، ان کا نصب العین روس میں عملی صورت اختیار کر چکا ہے۔ سوویٹوں کی فوج بڑی خوفناک ہے۔ باقی رہی پولیس تو اسے رومانوف کے وقت کی خفیہ پولیس پر رشک کی کوئی وجہ نہیں۔ جو شخص مملکت کا نام لیتا ہے وہ لازماً فوج، پولیس، عدلیہ، اور نوکر شاہی کا نام لیتا ہے۔ روسی مملکت بھی بہرحال ایک مملکت ہے..... وہاں کی اقتصادی زندگی مملکت کے اصول پر منظم ہوئی ہے اور نوکر شاہیوں کی ایک زبردست فوج مرتب ہو گئی ہے۔ اس ہرم کی بنیاد میں بڑے

بڑے گروہ موجود ہیں۔ چوٹی پر صرف مٹھی بھر آدمی ہیں۔ وہاں ایسا پرولتاریا ہے، جو پرانے بورژوا نظاموں کی طرح حکم مانتا ہے، کام کرتا ہے، کم کھاتا ہے اور اپنے آپ کو قتل کراتا ہے..... روس میں پرولتاریا کی ڈکٹیٹری موجود ہے، لیکن اس سے پرولتاری کام نہیں لے رہے، بلکہ کمیونسٹ پارٹی کام لے رہی ہے۔ جو پوری آبادی میں سے بہت چھوٹی سی اقلیت کی نمائندہ ہے۔ حقیقتہً پارٹی کے صرف چند آدمی روس پر حکمران ہیں! ان کی جمہوریت..... حقیقی معنی میں مطلق العنانی ہے.... لینن ایک فنکار ہے، جس نے انسانوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے، جس طرح دوسرے فنکار سنگ مرمر اور دھاتوں کو خاص سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ مگر انسان پتھر سے زیادہ مستحکم اور لوہے کے مقابلے میں کم اثر پذیر ہیں۔ یہ کوئی شاہکار نہیں، فنکار ناکام ہو چکا ہے۔ یہ کام اس کی صلاحیتوں کے بس کا نہ تھا۱؎

۱؎ G. Megaro کی کتاب Mussolini in the Making ص ۳۲۵-۳۲۶

چونسٹھواں باب

جرمنی اور جمہوریۂ ویمر

۱۹۱۸ء ـ ۱۹۳۳ء

(ا)

تمہید جرمنی میں فاشزم کا ظہور اٹلی کے بعد ہوا اور وہاں ہٹلر نے آخر اتنا اقتدار حاصل کر لیا، جو مسولینی کے اقتدار سے بدرجہا زیادہ وسیع تھا۔ جرمنوں نے پہلی عالمی جنگ کے بعد جمہوریت کا جو تجربہ کیا، وہ پندرہ سال تک جاری رہا۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۸ء کو متارکہ ہوا، اس سے دو روز پیشتر اشتراکی ڈیموکریٹ جرمنی میں جمہوریت کے قیام کا اعلان کر چکے تھے۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۱۹ء کو اس جمہوریت نے ایک دستور منظور کیا، جو ویمر[1] کی قومی مجلس نے تیار کیا تھا، لہٰذا اس جمہوریت کو جمہوریہ ویمر کہنے لگے۔ ویمر کا دستور رسمی اعتبار سے کبھی ترک نہ کیا گیا، لیکن ۳۰ر جنوری ۱۹۳۳ء کو ایڈالف ہٹلر چانسلر بنا تو جرمنی میں عملاً ڈکٹیٹری قائم ہو گئی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عالمی جنگوں کے درمیان جرمنی کی تاریخ کے دو حصے کر لیے جائیں۔ پہلا حصہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۳ء تک، جو تین چھوٹے چھوٹے دوروں میں بٹا ہوا تھا:۔

۱۔ بائیں بازو اور دائیں بازو کی طرف سے سیاسی تہدیدات کا دور، جو ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۳ء کے اختتام تک رہا۔ اس میں اقتصادی ابتری بڑھتی گئی۔

۲۔ سیاسی استواری کا دور، جو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس میں معاہدۂ ورسائی کے تقاضے پورے کیے گئے اور بہ ظاہر اقتصادی خوشحالی نظر آتی تھی۔

۳۔ اقتصادی کساد اور دائیں بازو کی قوت میں اضافہ۔ یہ دور ۱۹۲۹ء کے اواخر سے جنوری ۱۹۳۳ء تک

---

[1] Weimer

رہا۔ جرمنی کی تاریخ کا دوسرا حصہ ہٹلر کے اقتدار سے شروع ہوتا ہے۔

شکست کے اثرات

جرمنوں کی بہت بڑی اکثریت کے نزدیک ۱۹۱۸ء کی شکست انتہائی حیرت کا باعث ہوئی۔ جنگ کے آخری برسوں میں سلطنت کے انتظامات کی باگ ڈور فوجی ارباب اختیار کے قبضے میں رہی تھی۔ انھوں نے جرمن عوام کو شکستوں سے بے خبر رکھا۔ جرمنی کی سرزمین پر کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں تھی اور تمام جرمن یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ فوجوں نے جن اجنبی علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وہاں مضبوطی سے جمی بیٹھی ہیں۔ یہ فوجیں محفوظ کی محفوظ وطن پہنچ گئیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اتحادیوں نے سخت غلطی کی۔ انھیں چاہیئے تھا کہ برلین پر پیشقدمی کرتے اور جرمنوں پر آشکارا کر دیتے کہ وہ شکست کھا چکے ہیں۔ جرمنوں کو ہمیشہ سے فوج کے احترام کا سبق دیا جاتا تھا۔ وہ اس حقیقت کو ذہن نشین ہی نہ کر سکے کہ ان کی فوجیں جنگ میں ہار چکی ہیں۔ مزید برآں اتحادیوں نے ولسن کے زیر قیادت جرمن فوجوں کے اعلیٰ کمانڈار سے گفت و شنید پسند نہ کی۔ فیلڈ مارشل فان ہنڈن برگ تمام فوجوں کا اعلیٰ کمانڈار تھا۔ اس سے کبھی یہ مطالبہ نہ کیا گیا کہ اپنی تلوار مارشل فوش کے حوالے کرے یا متارکے پر دستخط کر دے۔ یہ بدنامی سیاستدانوں کے ذمے عائد ہوئی۔ یوں اتحادیوں نے بلا قصد و ارادہ جرمن عسکریت سے بڑی رعایت کا برتاؤ کیا۔

متارکے پر دستخط کی سیاہی ابھی خشک نہ ہوئی تھی کہ جرمن سالاروں نے ہنڈن برگ کی رہنمائی میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ فوجوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ عوام یہی سننا چاہتے تھے اور یہ تلخ حقیقت کبھی منظر عام پر نہ آئی کہ لوڈنڈارف اور ہنڈن برگ نے متارکے پر اصرار کیا تھا، کیونکہ فوج میں لڑنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ تیار کر لیا گیا کہ غیر مصافی سیاستدانوں، لبرلوں، اشتراکیوں، کمیونسٹوں اور یہودیوں نے جرمنی کی پیٹھ میں چھرا بھونکا۔ یہ افسانہ دلوں میں جگہ پکڑتا گیا، یہاں تک کہ اکثر جرمنوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن گیا۔ سیاستدان خصوصاً وہ لوگ جن کے مفاد پرانے پروشیائی نظام سے وابستہ تھے، یعنی شاہ پسند بڑے بڑے زمیندار، صنعتکار اور عسکری یا کہنا چاہیے، دائیں بازو کے قوم پرست یہی افسانہ پھیلاتے رہے اور وہ جرمنی کے لیے جارحانہ اقدام پر عقیدہ رکھتے تھے۔ جب تک جمہوریۂ ویمر قائم رہی، یہ گروہ اس سے عداوت کا اظہار کرتے رہے۔ سیاسی مخالفت سے اس کا تختہ الٹنے کی سازشوں تک اس عداوت کے مختلف درجے تھے۔

اتحادیوں نے جرمنی میں امن و جمہوریت کے بدترین دشمنوں کے لیے سہولت کا راستہ پیدا کر دی تھی۔ اس پر یہ غلطی مستزاد ہوئی کہ معاہدۂ ورسائی میں جنگی جرم کی مشہور دفعہ شامل کر لی گئی۔ جو جرمن معاہدے پر دستخط کے لیے آئے تھے، انھیں ایک ایسی چیز کے اعتراف پر مجبور کیا گیا، جسے وہ درست نہیں سمجھتے تھے اور بعد کے مورخ اسے آسانی سے غلط ثابت کر سکتے تھے، یعنی یہ دفعہ کہ صرف جرمنی جنگ چھیڑنے کا ذمہ دار ہے۔ جنگی جرم کی دفعہ نے جرمن عوام کے لیے اعتراف شکست مشکل تر بنا دیا۔ وہ سابقہ نظام کی برائیوں پر متوجہ نہ ہو سکے۔ عسکریت پسندی کو ختم کر دینے پر آمادہ نہ ہوئے اور ایک زبردست جمہوریت پیدا کر دینے کا کام نہ سنبھال سکے۔ اس کے برعکس جرمن جنگی جرم سے انکار میں تمام صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔

ان دشمنوں سے انھیں نفرت پیدا ہوگئی جنھوں نے یہ الزام ان پر عائد کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اپنے عالی قدر جرنیلوں کو الگ کردیں۔ وہ موقع کے انتظار میں بیٹھ گئے، تاکہ قوت کے بل پر آشکارا کر سکیں، وہ حق بجانب تھے۔

جنگ کے بعد سیاسی جوڑ توڑ اور سرگرمیاں

یوں دائیں بازو کی اُن قوتوں کو استواری حاصل ہوئی جو جمہوریت کی مخالف تھیں۔ اس استواری کو مزید تقویت اس طرح پہنچی کہ بائیں بازو کی طرف سے خطرہ پیدا ہوگیا۔ جمہوریت قائم کرنے اور بدنظمی کو روکنے کی ذمہ داری "اشتراکی اکثریت" پر عائد ہوئی، جس میں اشتراکی ڈیموکریٹ اور دائیں بازو کے آزاد اشتراکی شامل تھے۔ ان سب کا قائد ایبرٹ[1] تھا، جس کا تعلق اشتراکی ڈیموکریٹ پارٹی سے تھا۔ اشتراکی ڈیموکریٹ اعتدال پسند تھے۔ مثلاً انھوں نے زرعی املاک پر کوئی حملہ نہ کیا۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کو اجازت دے دی کہ اپنی جاگیریں محفوظ رکھیں اور ساتھ ہی وہ عمرانی اور سیاسی حیثیت بھی محفوظ رکھیں، جو جاگیروں سے وابستہ تھی۔ یہ لوگ محض اصلاح چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے صنعتکاروں کے ساتھ معاہدہ کرلیا جس میں کام کے آٹھ گھنٹے کا فیصلہ ہوگیا اور جرمنی کی صنعت وحرفت کو قومی بنانے کے لیے کوئی زبردست تحریک شروع نہ کی گئی۔

البتہ اشتراکی ڈیموکریٹوں کے بائیں بازو کی طرف سے یہ اصرار جاری رہا کہ روسی نمونے کا پرولتاری انقلاب بپا کیا جائے۔ یہ آزاد اشتراکیوں کے بائیں بازو کا کام تھا اور ان کے ساتھ سپارٹاکس[2] کے پیرو شامل تھے۔ مزدوروں اور سپاہیوں کی مجلسوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا (جرمنی میں یہ مجلسیں روسی سوویٹوں کی مثنیٰ تھیں)۔ اس میں بائیں بازو کی کوشش یہ تھی کہ ان مجلسوں کو مستقل حیثیت دے دی جائے مگر شکست کھائی۔ ۱۹۱۸ء ــــ ۱۹۱۹ء کے موسم سرما میں بائیں بازو نے انقلاب بپا کرنے کی کوشش کی، لیکن ایبرٹ نے اسے روکنے کے لیے فوج بلالی۔ سالاروں نے محض باقاعدہ فوجی دستوں ہی سے کام نہ لیا، بلکہ رضاکاروں کے دستے بھی شامل تھے، جو نئے نئے بنے تھے۔ انھیں آزاد دستے کہا جاتا تھا۔ انھی دستوں نے پیشہ ور سپاہیوں کے فرائض بڑی حد تک ادا کیے، کیونکہ سپاہی جرمنی کی فوجی شکست پر بگڑے ہوئے تھے اور وہ جمہوریت کے سخت مخالف تھے۔

دسمبر ۱۹۱۸ء کی خونریزی کے بعد آزاد اشتراکیوں کے دائیں بازو کے لیے بھی حکومت میں رہنا ناممکن ہوگیا، جو مزدوروں کے خلاف سپاہیوں کو استعمال کر رہی تھی اور سپاہیوں کی قیادت پرانے سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ وہ حکومت سے الگ ہوگئے اور جمہوریت کی پوری ذمہ داری اشتراکی ڈیموکریٹوں پر آپڑی، جنھوں نے اپنے ایک آدمی نوسکی[3] کو وزارت جنگ میں مقرر کردیا۔ خانہ جنگی جاری رہی۔ سپارٹاکس کے حامیوں کو جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کا نام مل گیا۔ جنوری ۱۹۱۹ء

---

[1] Ebert

[2] Spartacus یہ قدیم روما میں غلاموں کی بغاوت کا لیڈر تھا

[3] Noske

میں انہوں نے ایک فوری اقدام کے ذریعے سے اختیارات پر قبضے کی کوشش کی، لیکن ایبرٹ، نوسکی اور فوجوں نے اسے ناکام بنا دیا۔ ایک ہزار کے قریب لوگ مجروح و مقتول ہو چکے تو امن بحال ہو گیا۔ اس کے بعد رسالے کے افسروں نے دو بڑے کمیونسٹ لیڈروں کو قتل کر دیا۔ اس اثنا میں بویریا کے اندر بدنظمی رونما ہوئی۔ یہ کیتھولک ملک تھا اور وہاں تھوڑے عرصے کے لیے سوویٹ جمہوریت بن گئی۔ مئی میں اس کا خاتمہ ہوا۔ بویریا کی آبادی کے طبقۂ اوسط میں بائیں بازو کے متعلق شدید خوف پیدا ہوا اور بویریا میں برابر یہ خوف قائم رہا۔ بویریا کے مقامی حکام جمہوریۂ ویمر کے دوران قیام میں برابر شاہ پسندوں، عسکریت پسندوں اور قوم پرستوں سے ساز باز کرتے رہے۔ بویریا ہی میں رضاکار دستوں نے قتل کے منصوبے تیار کیے اور وہیں سے ہٹلر کے سیاسی اقتدار کی ابتدا ہوئی۔

یوں جرمنی کے دائیں بازو کی قوتیں بظاہر جنگ میں کچلی جا چکی تھیں، لیکن اتحادیوں کی بدولت انھیں زیادہ قوی صورت میں زندگی کی نئی مہلت مل گئی، حالانکہ اتحادیوں ہی کو ان کی مخالفت میں سب سے آگے ہونا چاہیے تھا۔ اتحادیوں کے باعث پیٹھ میں چھرا بھونکنے کا افسانہ فروغ پذیر ہوا۔ انھیں نے جنگی جرم کی دفعہ پر اصرار کیا۔ اشتراکی ڈیموکریٹوں نے سالاروں سے اتحاد کر لیا۔ کمیونسٹوں اور ان کے حلیفوں کو دبا دیا۔ جرمنی میں اس وقت بھی فوج موجود تھی، جس کی عنانِ قیادت ایک قابل سالار فان سیکٹ[1] کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ یہ فوج ایک لاکھ افراد تک محدود تھی، مگر اس میں زیادہ تر وہ فوجی افسر شامل تھے، جو اعلیٰ درجے کی تربیت پا چکے تھے اور وہ اس قابل تھے کہ موقع پاتے ہی بدرجہا بڑی افواج کا نظم و نسق سنبھال لیں۔

نئے جرمنی کا سیاسی نظام صرف اشتراکی ڈیموکریٹوں —— انتہا پسند دائیں بازو اور انتہا پسند بائیں بازو والوں —— تک محدود نہ تھا۔ دورِ شہنشاہی کی جرمنی کی پرانی پارٹیاں نئے لیبل لگا کر از سرِ نو نمودار ہو گئی تھیں۔ پرانے لبرلوں کے دائیں بازو نے عوامی پارٹی کی شکل میں ظہور کیا۔ ان میں زیادہ اعتدال پسند صنعت کار بھی شامل تھے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ نجی جائداد محفوظ رہے اور اشتراکیت کی مخالفت کی جائے۔ گستاو سٹریسمان[2] اس پارٹی کا لیڈر تھا، جو جنگ کے زمانے میں حامیِ جنگ تھا، مگر جرمنی کی شکست نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ زمانۂ سابق کے ترقی پسندوں اور لبرلوں کے بائیں بازو نے جمہوری پارٹی بنا لی۔ یہ حقیقی جمہوریت پسند گروہ تھا جو طبقۂ اوسط پر مشتمل تھا۔ اس میں جرمنی کے اکثر ممتاز اہلِ علم شامل تھے۔ مرکزی کیتھولک پارٹی[3] بھی دوبارہ ابھر آئی۔ اس کا نام اور پروگرام غیر متبدل رہا۔ اس نے جمہوریت قبول کر لی۔ اشتراکیت رد کر دی، لیکن یہ بائیں بازو کے زیرِ اثر اشتراکی قوانین کا حامی تھا، البتہ زیادہ وسیع اصلاحات

---

[1] Von Seeckt

[2] Gustav Stresemann

نہیں چاہتا تھا۔ اشتراکی ڈیموکریٹ، مرکز اور عوامی پارٹی ان گروہوں کے نمائندے تھے، جو نئی حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے ہر کوشش پر آمادہ تھے، اگرچہ ان میں جوش و خروش زیادہ نہ تھا۔ سابق قدامت پسندوں میں سے دائیں بازو والے قوم پرستوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ ان میں غلبہ بڑے بڑے جاگیرداروں کو حاصل تھا۔ بعض بڑے بڑے صنعت کار نوکر شاہی کے اکثر افراد اور زیریں طبقۂ اوسط کا خاصا بڑا حصہ ان کا حامی تھا۔ انھیں امید تھی کہ اس طرح بادشاہی کا پرانا دور عود کر آئے گا، ان لوگوں نے جمہوریت قبول نہیں کی تھی۔

۱۹۱۹ء کا دستورِ ویمر

جب جرمنوں نے جنوری ۱۹۱۹ء میں قومی دستور ساز مجلس کے لیے ووٹ دیے تو جمہوریت کی حمایت کرنے والے ووٹ پچھتر فی صد سے زیادہ تھے (تفصیل ساتھ کے نقشے[1] سے واضح ہو جائے گی)، تنہا اشتراکی ڈیموکریٹوں نے چالیس فی صد ووٹ حاصل کر لیے تھے۔ دستور ساز مجلس کے اجلاس ویمر میں شروع ہوئے۔ ایبرٹ کو جرمنی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسی نے وہ حکومت بنائی، جس نے کئی مہینے کی تاخیر کے بعد بادلِ ناخواستہ معاہدۂ ورسائی پر دستخط کیے۔ پھر مجلس نے نیا دستور منظور کر لیا۔ نئی جرمنی بھی مختلف ریاستوں کا وفاق تھی، لیکن مرکزی حکومت کو پورے ملک کے لیے قانون بنانے کا وسیع اختیار حاصل تھا۔ جو وفاقی ریاست کسی دستوری دفعہ یا کسی قومی قانون کو نہ مانتی، اس کے خلاف صدر کو فوج تک استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔ وزارت ایوانِ زیریں (ریشتاغ یعنی پارلیمنٹ) کے روبرو جوابدہ تھی، جس کے انتخاب میں بیس سال سے زائد عمر کے تمام شہری حصہ لیتے تھے۔ عورتوں کو بھی یکساں ووٹ کا حق حاصل تھا۔

صدر کا انتخاب ہر سات سال کے بعد رائے عامہ سے ہوتا اور اسے وسیع اختیارات دے دیے گئے تھے، مثلاً معاہدوں کا انتظام، وزارتوں کا تقرر اور برطرفی، تمام افسروں کی علیحدگی، ریشتاغ کی موقوفی اور نئے انتخاب کا حکم۔ وہ تمام وسائل اختیار کر سکتا تھا، جو خطرے کے وقت نظمِ ملک کی بحالی کے لیے ضروری تھے، بلکہ اُن شہری حقوق کو بھی عارضی طور پر معطل کر سکتا، جو لوگوں کو ازروئے دستور حاصل تھے۔ البتہ ریشتاغ ایسے احکام منسوخ کر سکتی تھی۔ وزارت کے اندر چانسلر کو وزیر اعظم کے اختیارات حاصل تھے، نیز وہی منصوبہ بندی کی پالیسی کا ذمہ دار تھا۔ دستور میں عوام کو بھی قانون پیش کرنے کا حق تھا۔ ووٹروں کا ۱/۱۰ حصہ کوئی مسودہ پیش کر سکتا یا دستور میں ترمیم تجویز کر دیتا۔ اقتصادی اعتبار سے دستور میں یہ انتظام کر دیا گیا تھا کہ حکومت کاروبار کے جس حصے کو موزوں سمجھے، عوام کے لیے مشترک بنا دے، لیکن نجی جائداد اور حقِ وراثت محفوظ کر دیے گئے۔

دستور میں اور بھی ایسے تضاد موجود تھے، جن سے واضح ہوتا تھا کہ اشتراکی ڈیموکریٹوں اور طبقات اوسط کی پارٹیوں کے مفاد میں تناقض کی جھلک دستور میں بھی پہنچ گئی، لیکن اس کی کمزوری کے اصل مرکز دو تھے، اوّل صدر کے وسیع اختیارات، دوم متناسب نمائندگی کا انتظام۔ صدر کے اختیارات بڑھا دینے کا مطلب یہ تھا کہ ڈکٹیٹری کا حقیقی

---

[1] نقشہ صفحہ ۷۳۱ پر دیکھیے۔

نقشہ متعلقہ صفحہ۔ ۴۳

جرمنی کے انتخابات، مجلسِ ویمر اور ریشتاغ کے لیے ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۳ء

	جنوری ۱۹۱۹ء	جون ۱۹۲۰ء	مئی ۱۹۲۴ء	دسمبر ۱۹۲۴ء	مئی ۱۹۲۸ء	ستمبر ۱۹۳۰ء	جولائی ۱۹۳۲ء	نومبر ۱۹۳۲ء	مارچ ۱۹۳۳ء
کمیونسٹ	[۱]	۲	۶۲	۴۵	۵۴	۷۷	۸۹	۱۰۰	۸۱
انڈی پنڈنٹ سوشلسٹ (آزاد اشتراکی)	۲۲	۸۱	[۲]	۰	۰	۰	۰	۰	۰
سوشل ڈیموکریٹ (اشتراکی ڈیموکریٹ)	۱۶۳	۱۱۲	۱۰۰	۱۳۱	۱۵۲	۱۴۳	۱۳۳	۱۲۱	۱۲۵
ڈیموکریٹ	۷۴	۴۵	۲۸	۳۲	۲۵	۱۴	۴	۲	۵
سنٹر (مرکز)	۷۱	۶۸	۶۵	۶۹	۶۱	۶۸	۷۵	۷۰	۷۴
عوامی پارٹی (پیپلز پارٹی)	۲۲	۶۲	۴۴	۵۱	۴۵	۳۰	۷	۱۱	۲
قوم پرست (نیشنلسٹ)	۴۲	۶۶	۹۶	۱۰۳	۷۸	۴۱	۴۰	۵۱	۵۲
نازی	۰	۰	۳۸	۲۰	۱۲	۱۰۷	۲۳۰	۱۹۶	۲۸۸

[۱] کمیونسٹ پارٹی نے ویمر کی دستور ساز مجلس کے لیے انتخاب کا مقاطعہ کیا تھا۔

[۲] اس سال کے انتخابات اور آئندہ انتخابات میں انڈی پنڈنٹ سوشلسٹ سوشل ڈیموکریٹوں میں ضم ہو گئے۔

امکان پیدا ہوگیا تھا۔ تناسب نمائندگی کے مطابق ووٹ پارٹی کے پورے امیدواروں کو دیے جاتے تھے۔ یوں آزاد ووٹروں کو اپنے ووٹ الگ الگ استعمال کرنے سے روک دیا گیا تھا اور آزاد سیاستداں کوئی منصب حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ اس نظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کی تعداد بڑھ گئی۔

دائیں بازو اور بائیں بازو کی انتہا پسندی
سنہ ۱۹۲۰ء — سنہ ۱۹۲۲ء

سنہ ۱۹۲۰ء میں دائیں بازو کی طرف سے دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ جمہوریت کے لیے شدید خطرہ پیدا ہوگیا۔ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک گروہ نے، جس کی قیادت ضلع برلین کے فوجوں کے کمانڈر اور دوسرے افسر کر رہے تھے، ایک اقدام کیا، وہ لوگ چاہتے تھے کہ معاہدۂ صلح میں تخفیف اسلحہ کی جو دفعات تھیں، ان کے خلاف اہل فوج کی ناراضی کا مظاہرہ کریں اور انھیں امید تھی کہ مشرقی پروشیا کا ایک قدامت پسند افسر جس کا نام کیپ[1] تھا، برسر اقتدار آجائے گا۔ لوڈنڈارف اور رضاکار دستے اس تحریک کی اعانت کر رہے تھے۔ چنانچہ حکومت کئی روز تک برلین سے باہر رہی۔ ایبرٹ نے عام ہڑتال کا اعلان کر دیا جرمنی میں کاروبار بالکل معطل ہوگیا، اس طرح کیپ کا اقدام ناکام رہا۔ چونکہ پرانا بادشاہی دور کا عدالتی نظام قائم تھا، اس لیے کیپ کے اقدام میں جتنے آدمی گرفتار ہوئے تھے ان پر مقدمے چلائے گئے تو انھیں نہایت معمولی سزائیں دی گئیں۔ اس کے برعکس بائیں بازو کے آدمی عدالتوں کے روبرو پیش ہوئے تو انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔ کیپ کے اقدام کو کامیاب بنانے کے لیے بویریا میں دائیں بازو کی حکومت برسر اقتدار آگئی۔ اس حکومت نے آزاد دستوں کے لیڈروں کو پناہ دے دی۔ وہ روپوش ہوگئے۔ حکومت یہ کوششیں کر رہی تھی کہ ان کے دستے توڑ دیے جائیں۔

حکومت نے عام ہڑتال کا جو انتظام کیا تھا، اس سے یہ شاخسانہ پیدا ہوا کہ روہر میں کمیونسٹوں نے بغاوت کر دی۔ ان کے تعاقب میں جرمن فوجیں روہر پہنچ گئیں، حالانکہ معاہدۂ ورسائی کے مطابق روہر کو بالکل غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی فوج بھی پہنچ گئی اور مختصر سی مدت کے لیے روہر اور فرینکفرٹ پر قابض رہی (اپریل مئی سنہ ۱۹۲۰ء)۔ جون سنہ ۱۹۲۰ء میں جو انتخابات ہوئے ان میں ووٹروں نے انتہا پسندوں کی حمایت شروع کر دی۔ ڈیموکریٹ اور سوشل ڈیموکریٹ کے نمائندوں کی تعداد کم ہوگئی۔ دائیں بازو کے گروہوں میں سے قوم پرستوں اور عوامی پارٹی کو زیادہ ووٹ مل گئے اور بائیں بازو میں سے آزاد اشتراکیوں نے زیادہ نشستیں حاصل کرلیں۔ لیکن آخری گروہ میں تفرقہ پیدا ہوگیا۔ اس میں سے انتہا پسند کمیونسٹوں سے مل گئے اور اعتدال پسند سوشل ڈیموکریٹوں میں شامل ہوگئے۔

اپریل سنہ ۱۹۲۱ء میں اتحادیوں نے تاوان کا مطالبہ پیش کر دیا، جس کی مقدار ایک کھرب تیس ارب سنہری مارک تھی۔

---

[1] Kapp

اعتدال پسند چاہتے تھے کہ اس مطالبے کو بے تکلف ٹھکرا دیا جائے، لیکن دوسری پارٹیاں حقیقت پسندی سے کام لیتی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اتحادی فوراً حملہ کر دیں گے۔ آخر اعتدال پسندوں کو اس بارے میں ضروری فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی، جو یقیناً عوام میں مقبول نہیں ہو سکتا تھا اور وہ خود بھی اسے درست نہیں سمجھتے تھے۔ تعمیر نو کا وزیر والٹر[۱] ریتھینا ڈیموکریٹ اور ایک کامیاب صنعتکار تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر مطالبہ پورا کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تو اتحادیوں کو یقین ہو جائے گا، جرمنی ادائے واجبات میں مخلص ہے اور وہ آگے چل کر یقیناً مراعات دے دیں گے۔ ریتھینا ایک حد درجہ محب وطن جرمن تھا، مگر ساتھ ہی نسلاً یہودی تھا۔ اس وجہ سے قوم پرست خطیبوں نے فیصلے کو سامیت کے خلاف ایک زہر آلود حربہ بنا لیا۔

اعتدال پسندوں میں سے جو گروہ خفیہ دہشت انگیزی کے قائل تھے، انھوں نے قتل و خونریزی کی مہم شروع کر دی چنانچہ سب سے پہلے جو اہم فرد قتل ہوا (اگست ۱۹۲۱ء)، وہ میتھیاس آرزبرگر[۲] تھا۔ اس کا تعلق کیتھولکوں کی مرکزی پارٹی سے تھا اور اعتدال پسندوں میں اسے ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ متارکے پر دستخط کیے تھے۔ قاتل بویریا کے راستے بچ نکلے۔ جب ان میں سے ایک گرفتار ہوا تو عدالتوں نے اسے رہا کر دیا۔ اس کے بعد پھر جمعیت اقوام نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد بالائی سیلیشیا کے صوبے کا خاصا بڑا حصہ پولینڈ کے حوالے کر دیا۔ اس میں ثروت کے وسیع وسائل موجود تھے اور جرمنوں کی بھی خاصی بڑی تعداد وہاں آباد تھی۔ تمام جرمن اسے بجا طور پر اپنا علاقہ سمجھتے تھے۔ اس فیصلے پر اعتدال پسندوں کو اور غصہ آیا۔ چنانچہ اب ریتھینا ان کا ہدف بن گیا۔ پہلے اس کے خلاف اخباروں نے سیاسی نقطۂ نگاہ سے حملے شروع کر دیے۔ جون ۱۹۲۲ء میں وہ گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے قاتل پیٹھ میں چھرا بھونکنے کے نظریے پر پختہ اعتقاد رکھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ ایک یہودی کو قتل کر کے وہ جرمن فوج سے غداری کا کچھ نہ کچھ بدلا لے لیں گے۔

ہٹلر: ابتدائی زندگی

ارزبرگر اور ریتھینا کے قتل کی درمیانی مدت میں بویریا کے اندر دائیں بازو کی پارٹیوں کے ہنگامہ زار سے ایک نیا اور خطرناک عنصر ابھرا۔ یہ جرمن مزدوروں کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی تھی جس کی بنیاد ایڈالف ہٹلر نے رکھی تھی۔ ہٹلر چنگی کے ایک غیر معروف آسٹروی افسر کا بیٹا تھا جس کا سلسلۂ نسب مشتبہ سمجھا جاتا تھا۔ اس افسر کا نام شیکل گروبر[۳] تھا۔ ہٹلر ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا۔ شروع ہی میں باپ سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اس تلخی نے عمر بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ وی آنا کی درسگاہ فنون لطیفہ میں مصوری کی تعلیم پانا چاہتا تھا، مگر اسے داخلہ نہ ملا۔ چنانچہ وہ متفرق کام انجام دے کر گزارہ کرنے لگا۔ کبھی کبھار اپنی کوئی تصویر فروخت کر لیتا اور برابر احتیاج کا

---

۱ Walter Rathenan

۲ Matthias Erzberger

۳ Schicklgruber

شکار رہا۔ اسی زمانے میں یہودیوں کے خلاف اس کی نفرت کا آغاز ہوا۔ ہم جانتے ہیں کہ وی آنا کے طبقۂ اوسط کا زیریں حصہ اُس وقت میئر لیوگر[1] کی تقریریں سن سن کر اس کا فدائی بن چکا تھا اور ان تقریروں میں سامیوں کے خلاف بے تحاشا زہر اگلا جاتا۔ ہٹلر لیوگر کا بڑا مداح تھا۔ چونکہ کارل مارکس خود یہودی الاصل تھا اور وی آنا کے اکثر یہودی اشتراکی بن گئے تھے، اس لیے ہٹلر نے اشتراکیت کو یہودیوں سے وابستہ کر لیا اور دونوں کو ذاتی شکایات، نیز مصائبِ عالم کا ذمہ دار ٹھہرا لیا۔

انیسویں صدی کے نظریہ بازوں میں سے ——— جن میں جرمن بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی ——— اکثر کی تصانیف سے ہٹلر نے سامیت کے خلاف دلیلوں کے لیے ثبوت فراہم کر لیے۔ فرانس کے ایک امیر جوزف آرتھر دی گوبینو (۱۸۱۶ء – ۱۸۸۲ء) نے اپنی ایک کتاب بنام "انسانی نسلوں کی نامساوات[2] پر مقالہ" میں اس امر کی کوشش کی تھی کہ سامیت کے خلاف دورِ حاضر کے نظریے کے لیے ایک نیم سائنٹیفک بنیاد استوار کرے۔ اسی میں گوبینو نے سامی نسل اور آریاؤں کی برتری کے نظریات پیش کیے تھے۔ گوبینو سے اثر قبول کرنے والوں میں ایک رچرڈ ویگنر[3] بھی تھا، جو جرمنی کا ایک مشہور آہنگ ساز تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ صرف جرمنوں ہی میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے اور یہودی صرف غیر شایاں چیزوں کے نمائندے ہیں۔ لہٰذا انھیں روئے زمین سے محو کر دینا چاہیے۔ ویگنر کا داماد ایک انگریز ہاؤسٹن سٹیوارٹ چیمبرلین[4] (۱۸۵۵ء – ۱۹۲۷ء) تھا، جو جوزف چیمبرلین کا دور کا رشتہ دار تھا۔ اس نے ایک طویل اور پُرتکلف کتاب تصنیف کی جس کا نام: "انیسویں صدی[5] کی بنیادیں" تھا۔ یہ کتاب ۱۸۹۹ء میں جرمنی کے اندر شائع ہوئی۔ اس میں بھی جرمنوں کی برتری پر زور دیا گیا تھا اور یہودیوں کی مذمت کی گئی تھی۔ مثلاً ایک حصہ یہ ظاہر کرنے کے لیے وقف کر دیا کہ مسیح اصلاً یہودی نہ تھے۔ چیمبرلین کو جمہوری حکومت سے شدید اختلاف تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اسی طرح وہ سرمایہ داری کا بھی مخالف تھا۔ یوں ہٹلر کو ایک ایسا خوشگوار ملغوبہ تیار کر لینے کا موقع مل گیا، جو نسل، قومیت، مخالفت جمہوریت اور انتہا پسندی سے مرکب تھا۔ چیمبرلین کی تحریر سے بھی ہٹلر بہت متاثر ہوا اور چیمبرلین تحریک ہٹلر کی تاسیس کا خیر مقدم کرنے کے لیے زندہ رہا۔

باقی رہی جرمن قوم پرستی تو ہم اسے انتہائی شکل میں ہوہینزولرن خاندان کی جرمنی میں دیکھ چکے ہیں۔ اس کا زبردست داعی ہینرِش فان ٹریشکے[6] (۱۸۳۴ء – ۱۸۹۶ء) تھا۔ وہ ایک قابل مورخ اور یونیورسٹی کا ہر دلعزیز پروفیسر تھا۔ اس نے یہودیوں، اشتراکیوں، سرمایہ داروں اور آزاد خیال جمہوریت کے مخصوص انگریزی افکار کی یکساں مذمت کی۔ وہ

---

1. Mayor Lueger
2. Essay on the Inequality of Human Races
3. Wagner
4. Houston Stewart Chamberlain
5. The Foundations of the Nineteenth Century
6. Heinrich Von Treitschke

ایک ایسی جرمن مملکت کا داعی تھا، جو صرف اپنے مفاد کے لیے کار فرما ہو، کمزور اخلاقی اصول سے الگ رہے، قوت کو نصب العین بنا کر اس کے لیے وقف ہو جائے اور یہ قوت عسکری توسیع کے لیے استعمال کرے۔ نوجوان قوم پرستوں کی ایک پوری نسل ٹریشکے کے خیالات کی سرگرم حامی بن گئی۔ یہ لوگ جنگ میں شکست سے سخت مجروح ہوئے اور صدی کے دوسرے عشرے میں ہمہ تن تیار تھے کہ جرمنی کو اس اعلیٰ مقام پر بحال کرنے کے لیے ہر چیز قربان کر دیں، جو اُن کے نزدیک جرمنی کا مناسب مقام تھا۔

اگرچہ ہٹلر نے بیشتر کے قوم پرستوں اور نسلی برتری کے داعیوں سے بہت کچھ لیا، مگر اس نے انیسویں صدی کے ان افکار کو بیسویں صدی کے تقاضوں کے سانچے میں ڈھال لیا۔ ان قوم پرستوں اور نسلی برتری کے داعیوں کی کتابیں پڑھ کر اسے وی آنا سے نفرت پیدا ہو گئی، کیونکہ اس شہر کو وہ آفاقی سمجھتا تھا اور یقین کیے بیٹھا تھا کہ وہاں یہودیوں کو خاصا اقتدار حاصل ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں وہ میونخ چلا گیا۔ پھر فوج میں بھرتی ہو گیا (۱۹۱۴ء) اور کارپورل کی حیثیت میں لڑتا رہا۔ بہادری کے لیے اسے فولادی صلیب ملی، لیکن کمان افسر کے نزدیک وہ اتنا جوشیلا تھا کہ اسے کمیشن کے قابل نہ سمجھا گیا۔ جنگ کے بعد وہ میونخ واپس آ گیا۔ توقع کے مطابق اسے نئی جمہوریت اور بالشویکوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ رضاکار دستوں کو پسند کرتا تھا۔ بہرحال اس نے سیاستدان بننے کا فیصلہ کر لیا۔

نازی پارٹی کی ابتدا

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں حکومت نے بائیں بازو کے انقلاب کو دبا دیا۔ بویریا کے فوجی ارباب بست وکشاد رضاکار دستوں کے حامی تھے۔ لوڈنڈارف میونخ چلا گیا اور وہاں رجعت کا مرکز بن گیا۔ ہٹلر کو فوجوں کے لیے سیاسی تعلیم کے افسر کی حیثیت میں ملازم رکھ لیا گیا۔ اس کام کے دوران میں اسے ایک چھوٹا سا سیاسی گروہ ملا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جرمن مزدوروں کی پارٹی کہتے تھے۔ یہ لوگ قوم پرست اور عسکریت پسند تھے۔ ساتھ ہی نمائشی اشتراکیوں کی انتہا پسندی بھی ان میں بہت تھی۔ ہٹلر کو خیال ہوا کہ اس پارٹی میں عوام بہ کثرت شامل ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۹ء میں اس پارٹی کا ممبر بن گیا اور تھوڑی ہی مدت کے اندر اپنے تمام رفیقوں کے مقابلے میں بدرجہا قابل سیاستدان ثابت ہوا۔ اس نے وسیع پروپیگنڈے کی بنیادی ضرورت پر خاص زور دیا اور یہودیوں سے کہا کہ سب کو کُلاں جرمنی کی خاطر متحد ہو جانا چاہیے۔ وہ اس تحریک کا حامی تھا کہ یہودیوں کو سیاسی زندگی سے خارج کر دینا چاہیے۔ ساتھ ہی کہتا تھا کہ سب کو مملکت کی طرف سے روزگار کا یقین دلا دینا چاہیے۔ جن لوگوں نے جنگ میں فائدے اٹھائے ان کے فائدوں کی رقم ضبط کر لینا ضروری ہے۔ جتنے ٹرسٹ ہیں، ان سب کو قومی بنا دینا ضروری ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار کی حوصلہ افزائی لازمی ہے اور تمام کسانوں کے لیے زمینوں کا انتظام ہو جانا چاہیے۔ ہٹلر کے پروگرام کی اس بظاہر انتہا پسند حیثیت نے بہت سے لوگوں کو اس امر پر آمادہ کر دیا کہ اس تحریک میں روپیہ صرف کریں، حالانکہ بیشتر وہ ہمدرد ہونے کے باوجود روپیہ دینے میں متامل تھے۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل تک وہ سب کو بار بار یقین دلاتا رہا کہ میں صنعتی

سرمایے کا مخالف نہیں، صرف یہودیوں کے اس بین الاقوامی سرمایے کا مخالف ہوں، جو قرض لیا جاتا ہے۔ گویا اس نے صنعتوں کو قومی بنانے کا منصوبہ ترک کر دیا تھا۔

ہٹلر نہایت کامیاب خطیب تھا۔ اسے ایسا ملکہ عطا ہوا تھا کہ سامعین پر جادو کر دیتا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ پارٹی کا واحد لیڈر (فیوہرر) بن گیا۔ اسی سال اس نے "طوفانی فوج[1]" کی بنیاد رکھی جس سے اسے بڑی تقویت پہنچی۔ ان کا لباس خاکی رکھا گیا اور یہ لوگ زیادہ تر رضاکار فوجوں میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔ سواسٹیکا[2] ان کا نشان تھا۔ عام جلسوں میں یہ نگرانی کے فرائض انجام دیتے اور لیڈر کے لیے دوسری خدمات بجالاتے۔ کپتان رُوہم[3] ان کا کمانڈر تھا اور وہی بویریا میں ٹھہری ہوئی پیادہ فوج کے کمانڈر کا سیاسی مشیر تھا۔ اطالوی فاشسٹوں کی طرح جرمن نازیوں (نشنل کے لیے جرمن[4] لفظ کے پہلے چار حرف) کو اپنے فوجی ہمدردوں کے ذریعے سے سرکاری اسلحہ تک ناجائز رسائی کا موقع مل گیا۔ ہٹلر کے قریبی رفیقوں میں روہم کے علاوہ ایک ہرمان گوئرنگ[5] تھا جو دورانِ جنگ میں ہوا باز تھا اور اس نے بیس اتحادی طیارے نیچے گرائے تھے۔ صلح کے زمانے میں وہ اضطراب کا شکار ہوا اور "طوفانی فوج" کو عسکری رنگ دینے کے لیے مامور ہو گیا۔ دوسرا رفیق روڈالف ہیس[6] تھا، جو مصر میں پیدا ہوا۔ پھر فوج میں لفٹننٹ بن گیا۔ اور ہٹلر کا پرائیویٹ سکریٹری بن گیا۔ تیسرا رفیق الیفرڈ روزنبرگ[7] تھا جس کا تعلق بحیرۂ بالٹک کی ریاستوں کے جرمنوں سے تھا۔ وہ بالشویکوں اور یہودیوں کا سخت دشمن تھا۔ اسی کو پارٹی کے اخبار کا پہلا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔

ہٹلر اور اس کے نازی ۱۹۲۲ء میں نہایت معمولی سیاسی قوّت کے حامل تھے۔ اُسی زمانے میں اعتدال پسند پارٹیوں نے جمہوریت کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ ریتھنیا کے قتل کے بعد سٹریسمان کی عوامی پارٹی قوم پرستوں سے الگ ہو گئی، کیونکہ ان کے ہاتھ خون سے آلودہ ہو چکے تھے اور عوامی پارٹی نے مرکزی پارٹی اور ڈیموکریٹوں سے تعاون کر لیا۔ سیاسی حالات اتنے نازک تھے کہ ۱۹۲۵ء میں صدر کا انتخاب ملتوی کرنا پڑا۔

افراطِ زر ۱۹۲۲ء – ۱۹۲۳ء

دائیں بازو کی طرف سے جو خطرہ پیدا ہوا تھا، اس کے مقابلے کے لیے جتنی سیاسی چالیں چلی گئیں، وہ سب اس وجہ سے بے اثر رہیں کہ اقتصادی مسئلہ زیادہ سے زیادہ نازک صورت اختیار کرتا گیا۔ افراطِ زر نے اس کی نزاکت بہت بڑھا دی تھی جو ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء

۱؎ Storm Troops جسے جرمنی زبان میں Sturmabteilung کہتے تھے اور اس کا مخفف SA تھا۔

۲؎ Swastika

۳؎ Roehn ۴؎ Nazional ۵؎ Hermann Goering

۶؎ Rudolf Hess ۷؎ Rosenburg

ہیں ناشنیدہ حدوں پر پہنچ گئی۔ یہ ایک پُر پیچ اقتصادی مظہر ہے اور اس کے اسباب کی فہرست یا نوعیت بیان کر دینے سے حقیقی کہانی سامنے نہیں آ سکتی۔ ۱۹۲۱ء کے بعد جرمنی میں افراطِ زر کا سب سے بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ جرمن حکومت مصارفِ جنگ ادا کرنے کے لیے محاصل عائد کرنے میں ناکام رہی۔ شاہی نظام کو فتح کی امید تھی اور ساتھ ہی خیال تھا کہ شکست خوردہ فریقوں پر بھاری تاوان عائد کر کے جرمنی کے مصارف پورے کر لیے جائیں گے۔ چنانچہ محاصل کے ذریعے سے مصارفِ جنگ کا صرف چار فی صد حصہ ادا کیا گیا۔ شکست قریب آ پہنچی تو حکومت نے بینکوں سے بیش از بیش رقمیں قرض لے لیں۔ جب قرض ادا کرنے کی نوبت آئی تو حکومت نے نوٹوں کے ذریعے سے اس کا انتظام کیا، مگر ان نوٹوں کی پشت پر سونا موجود نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی، نئے نوٹ جاری کر دیے جاتے اور قیمتیں بڑھتی گئیں۔ قیمتوں کی افزائش کے ساتھ اجرتوں میں افزائش کا مطالبہ بھی پیش ہو گیا۔ اس کے لیے مزید نوٹوں کی ضرورت پڑی۔ بھاری ٹیکس لگا کر قوتِ خرید کم کرنے کے بجائے حکومت نے خریداروں کو اجازت دے دی کہ جس سامان کی رسد کم ہے، اسے خریدنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر رقم پیش کریں۔ اس طرح افراطِ زر کمال پر پہنچ گئی۔

افراطِ زر کی تقویت کے لیے اور بھی بہت سی قوتیں موجود تھیں۔ جرمنی میں سونا کم تھا اور حکومت کاغذی سکوں کی پشتیبانی کے لیے ضرورت کے مطابق سونا مہیا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بھی کئی اسباب تھے۔ چونکہ جرمنی کو دورانِ جنگ میں باہر سے ہر مال کی خرید کے لیے سونا دینا پڑتا تھا، لہٰذا رفتہ رفتہ سونا ختم ہو گیا۔ دولتمندوں نے بڑی بڑی رقمیں اس ڈر کے مارے ملک سے باہر بھیج دیں کہ ممکن ہے حکومت ادائے تاوان کے لیے ان پر قبضہ کر لے۔ خام جنسوں کی رسد کم تھی، صنعت و حرفت کا سلسلہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ ساکھ گھٹ گئی تھی۔ اتحادیوں کی جو فوجیں عارضی قبضے کی غرض سے جرمنی پہنچی تھیں، ان کے مصارف حکومتِ جرمنی کو پورے کرنے پڑتے تھے۔ تاوان کی ادائی ان سب کے علاوہ تھی۔ قوم پرست جرمن کہتے تھے کہ یہ مصارف خصوصاً تاوان افراطِ زر کا اصل سبب ہے۔ بلاشبہ تاوان نے بھی افراطِ زر کو تقویت پہنچائی، لیکن تنہا وہی افراط کا موجب نہ تھا۔ جو مجموعی رقم تاوان میں ادا کرنی پڑتی تھی، وہ ایسی نہ تھی کہ اس سے جرمنی کے سکے پر کوئی اثر پڑتا، البتہ افراطِ زر خاصے عرصے تک قائم رہی تو اثر ضرور پڑا۔ افراطِ زر کی ایک وجہ یہ تھی کہ صنعتکار ادائے تاوان سے بچنے کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ سکوں کی قیمت زیادہ سے زیادہ گر جائے تو وہ اپنے قرضوں سے سبکدوش ہو جائیں۔

مندرجہ ذیل نظام اوقات سے واضح ہو سکے گا کہ ۱۹۲۲ء کے اختتام پر حالات کس درجہ خراب تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو جرمن مارک کی عام قیمت ۴ء۲ فی ڈالر تھی۔ یہ گر کر ۸ء۴ پر پہنچ گئی۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں ڈالر کی قیمت پینتالیس مارک، دسمبر میں ایک سو ساٹھ مارک، ستمبر ۱۹۲۲ء میں تیرہ سو تین مارک اور ۱۹۲۲ء کے آخر میں سات ہزار مارک تھی۔ اس زمانے میں حکومت نے التجا کی کہ تاوان کی قسطیں ملتوی کی جائیں اور بیرونی ملکوں سے قرضہ دلایا جائے۔ فرانسیسی اس کے لیے تیار نہ تھے۔ جرمنوں نے ان کے جو علاقے برباد کیے تھے، ان کی تعمیر نو کے لیے وہ اربوں روپے صرف کر چکے تھے، لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ جرمن تاوان ضرور ادا کریں۔ اس کی ضمانت کے لیے فرانسیسیوں نے

روہر کے صنعتی علاقے کا مطالبہ کیا، جو جرمنوں کے لیے بے حد ضروری تھا۔ برطانیہ کی مخالفت کے باوجود فرانس نے ۱۹۲۳ء میں روہر پر قبضہ کر لیا، کیونکہ جرمن تاوان ادا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ فرانسیسی عزم کیے بیٹھے تھے کہ روہر کی کانوں اور کارخانوں سے اپنے فائدے کے لیے کام لیں گے۔ اس طرح جرمنوں کی طرف سے عدم ادائے تاوان کی تلافی ہو جائے گی۔

جرمن قوت کا مقابلہ قوت سے نہیں کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے اعلان کر دیا کہ روہر پر قبضہ ناجائز ہے۔ باشندوں کو حکم دے دیا کہ وہ پُرامن مزاحمت کریں یعنی کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے سے انکار کر دیں اور فرانسیسیوں کے حوالے کوئی سامان نہ کریں۔ روہر کے باشندوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب فرانسیسیوں نے جرمن پولیس اور مزدوروں کے خلاف تدبیریں اختیار کیں اور جب رضاکار جرمنوں نے فرانسیسیوں کے خلاف چھاپہ مار اقدامات کا فیصلہ کیا تو مقامی کشیدگی نہایت نازک صورت اختیار کر گئی۔ برلین میں حکومت کو خوف پیدا ہوا کہ یہ ممکن ہے، بحران جنگ کا موجب بن جائے، لہٰذا اس نے معاہدہ ورسائی کی مقررہ تعداد سے زیادہ فوجی دستے بھرتی کرنے کا حکم دے دیا۔

روہر پر فرانسیسی قبضے کا نمایاں نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن اقتصادیات کی ابتری میں اضافہ ہو گیا۔ اوّل پورا جرمنی اس ضروری سامان سے محروم ہو گیا، جو صرف متصرفہ علاقے سے حاصل ہو سکتا تھا، دوم روہر کے باشندے جرمن حکومت کے حسب ایما بیکار بیٹھ گئے اور حکومت کے سوا ان کے گزارے کا اور کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں نوٹوں کی مزید مقدار چھپتی رہی، حالانکہ یہ بیکار ہو گئے تھے۔ اب ڈالر کے مقابلے میں مارک کی مقدار ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے اربوں پر پہنچ گئی۔ دسمبر ۱۹۲۳ء میں یہ حد شمار سے باہر ہو چکی تھی۔

پینسٹھواں باب

جرمنی اور جمہوریۂ ویمر

سنہ ۱۹۱۸ء - سنہ ۱۹۳۳ء

(۲)

افراطِ زر کے نتائج

یہ لامتناہی رقمیں بے معنی ہیں، البتہ ان کے انفرادی اور اجتماعی نتائج پیشِ نظر رکھ لینے چاہییں۔ ایک طالب علم ایک روز یونیورسٹی میں پہنچا۔ اس کی جیب میں والد کی طرف سے ایک چیک تھا، جو سال بھر کی فیس، کمرے کے کرایے، خرچ خوراک اور تفریحات کے مصارف پر مشتمل تھا۔ جب وہ رات بھر کے بعد یونیورسٹی میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ جو چیک لے کر وہ چلا تھا، اس کی رقم صرف تھوڑے فاصلے کے لیے موٹر کے کرایے میں صرف ہو جائے گی۔ جن لوگوں نے زندگی بھر رقمیں بچائی تھیں کہ انھیں بڑھاپے میں سہولت رہے گی، وہ بالکل بیکار ہو گئیں۔ لوگ جیبیں مارک کے نوٹوں سے بھر کر نکلتے کہ بازار سے ایک روٹی خرید لیں جن کا گزارہ مقررہ آمدنی پر تھا، وہ بالکل تباہ ہو گئے۔ طبقۂ اوسط کی بچائی ہوئی رقمیں بالکل ختم ہو گئیں۔ جائدادوں کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ دو بھائیوں کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک کفایت شعار تھا، دوسرا فضول خرچ۔ والد نے دونوں کے لیے یکساں میراث چھوڑی تھی۔ کفایت شعار نے اپنے حصے کا روپیہ کسی کام میں لگا دیا، فضول خرچ نے ایک عمدہ شراب خانہ خرید لیا اور شراب پینے لگا۔ جب افراطِ زر کا دور آیا تو کفایت شعار کا پورا سرمایہ ایک مرتبہ بال ترشوانے کی اُجرت کے لیے بھی کفیل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر فضول خرچ کو جو خالی بوتلیں ملیں، وہ کھربوں مارک کی قیمت کی تھیں، لہٰذا فضول خرچ حد درجہ دولتمند بن گیا۔ ان حالات کا طبعی نتیجہ یہی تھا کہ سٹا عام ہو جاتا اور دور اندیش لوگوں نے سٹے میں بھاری جائدادیں پیدا کر لیں۔

جرمن مزدور کے لیے افراطِ زر بچت کے زوال کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس بچت تھی ہی نہیں البتہ اس کی قوتِ خرید اجرت کے مقابلے میں بہت گر گئی اور اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ ضروری چیزیں مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ مزدوروں کے کنبے بھوک اور سردی کا شکار ہو گئے۔ چونکہ مزدوروں کی یونینوں کی مالی حالت بھی گر گئی تھی، لہٰذا وہ

مزدوروں کی مدد بھی نہ کر سکیں۔ اور مزدوروں نے یونینوں کی ممبری چھوڑ دی۔ بڑے بڑے صنعتکاروں کو افراطِ زر سے فائدہ پہنچا۔ جزوًا اس طرح کہ مزدوروں کی یونینیں اپاہج ہوگئیں، جزوًا اس طرح کہ صنعتکاروں کا قرضہ ختم ہوگیا۔ انھیں موقع مل گیا کہ چھوٹے چھوٹے صنعتکاروں کو اپنے اندر جذب کر کے بڑے بڑے کاروبار قائم کریں۔

سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو افراطِ زر نے دائیں بازو اور بائیں بازو دونوں کے انتہا پسندوں کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اگرچہ طبقۂ اوسط گر کر پرولتاریا کی اقتصادی سطح پر پہنچ گیا تھا، لیکن اس کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی، جو طبقۂ اوسط کی ہوتی ہے۔ جرمنی میں ہر شخص کو درجے کا احساس بہت ہوتا ہے۔ لہٰذا طبقۂ اوسط کے لوگ مزدوروں کی انجمنوں — سوشل ڈیموکریٹوں یا کمیونسٹوں — میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ان اعتدال پسند پارٹیوں کا بھی ساتھ نہیں دے سکتے تھے، جو جمہوریت کی حامی تھیں، یعنی عوامی پارٹی، مرکزی پارٹی اور ڈیموکریٹ۔ اس صورتِ حال سے قوم پرستوں اور سب سے بڑھ کر ہٹلر کے نازیوں نے فائدہ اٹھایا۔ مزدوروں کو جن مشکلات سے سابقہ پڑا تھا، ان کی وجہ سے اکثر سوشل ڈیموکریٹوں سے کٹ کر کمیونسٹ بن گئے، لیکن سوویٹ روس نے جرمن پارٹی کے لیڈروں پر پابندی عائد کر رکھی تھی، اس لیے ۱۹۲۳ء کے موسمِ خزاں تک کوئی متحدہ انقلابی اقدام نہ کیا جا سکا، پھر حکومت نے شدید وسائل اختیار کر لیے اور کمیونسٹوں کی تنظیم اچھی نہ تھی، لہٰذا ان کی کوششیں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئیں۔

ملک پر بحرانی حالت طاری تھی۔ ۱۹۲۳ء کے موسمِ خزاں میں سٹریسمان نے بحیثیت چانسلر اعلان کیا کہ جرمنی میں اقتصادی بدنظمی کے باعث روہر کے اندر پُرامن مزاحمت جاری نہیں رکھی جا سکتی۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا کہ کام شروع کر دیا جائے اور تاوان کی قسمیں از سرِ نو ادا ہونے لگیں۔ جب دائیں بازو نے اس نئی پالیسی کو ٹھکرا دیا تو سیاسی مشکلات میں اضافہ ہوگیا۔ بویریا میں پروپیگنڈا کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اوائل نومبر ۱۹۲۳ء میں ہٹلر دائیں بازو کے ایک سیاسی جلسے میں پہنچا، جو میونخ کے بیئر ہال میں ہو رہا تھا اور اعلان کر دیا کہ قومی انقلاب شروع ہوگیا ہے، اس نے پستول دکھا کر دوسرے مقامی لیڈروں کو مجبور کیا کہ برلین پر اقدام میں معاونت کریں۔ وہ راضی ہوگئے لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ قومی حکومت نازیوں سے بات چیت کے لیے تیار ہے تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اگرچہ خود لوڈنڈارف میونخ میں نازی مظاہرین کے ساتھ ہوگیا، جس طرح ۱۹۲۰ء میں کیپ کے ساتھ ہو گیا تھا۔ فوج نے صرف چند واقعات جرح و قتل کے بعد مظاہرہ ناکام بنا دیا۔

لوڈنڈارف اور ہٹلر دونوں پر مقدمے چلے۔ ان کی کارروائیاں خاصی شہرت پا چکی ہیں اور انھیں ویمر کے عدالتی نظام کا ایک خاص نمونہ مانا جاتا ہے، جس کے مطابق دائیں بازو کے آدمیوں سے رعایت برتی جاتی تھی۔ ہٹلر کو اجازت دے دی گئی کہ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر اپنے افکار کے لیے پروپیگنڈا کر سکے۔ اگرچہ اس پر غداری کا مقدمہ چلا تھا، مگر کم از کم سزا دی گئی، یعنی صرف پانچ سال قید۔ حقیقۃً اس نے صرف آٹھ مہینے بڑی راحت و آسائش سے اسیری میں

بسر کیے۔ اسی زمانے میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مین کیمف"[1] (میری جدوجہد) کا بڑا حصہ مرتب کیا۔ جس نے نازیوں کے لیے کتابِ مقدس کی حیثیت حاصل کر لی۔ اگرچہ قانون کے مطابق لازم تھا کہ ہٹلر کو جلاوطن کیا جاتا، مگر یہ نہ کیا گیا۔ گوئرنگ بھاگ کر باہر چلا گیا۔ اسی زمانے میں وہ مخدرات کا عادی ہوا اور سنہ ۱۹۲۷ء تک جرمنی واپس نہ آیا۔ آتے ہی پھر نازیوں میں شامل ہو گیا۔

افراطِ زر کا خاتمہ
۱۹۲۳ء — ۱۹۲۴ء

کمیونسٹوں کے فسادات اور نازیوں کا اقدام دورِ افراطِ زر کے آخری حصے میں پیش آئے۔ ہٹلر کی کوشش سے کوئی دو ہفتے پیشتر حکومت نے ہنس لوتھر[2] وزیرِ مال اور ہیالمار شاخت[3] (بینکر اور ماہرِ مالیات) کو غیر معمولی مالی اختیارات دے دیے۔ پرانے کاغذی سکوں کی طباعت روک دی گئی۔ ایک نیا بینک کھولا گیا، جس کے ذریعے سے نئے مارک جاری ہوئے۔ ان کی قیمت وہی مقرر کر دی گئی، جو جنگ سے پیشتر تھی، یعنی فی ڈالر ۲ء۴ مارک۔ نئے سکے کی پشتیبانی کے لیے سونا موجود نہ تھا لیکن پورے جرمنی کی زرعی اور اقتصادی دولت کا ایک خیالی رہن نامہ لکھ دیا گیا۔ یہ ایک نفسیاتی اقدام تھا جس پر عوام نے اعتماد کیا۔ اس کے مطابق نیا مارک ایک ٹریلین (کھربوں) پرانے مارکوں کے برابر تھا۔ ساتھ ہی شدید کفایت شعاری کا سلسلہ حکومت کی ہر شاخ میں شروع ہو گیا۔ محاصل بڑھا دیے گئے۔ عوام نے سختی سے احتجاج کیا، لیکن یہ تدبیریں اس وقت تک جاری رہیں، جب تک طے کردہ نتائج نہ نکل آئے۔ اس سے بڑی مشکلات پیش آئیں۔ قیمتیں گر گئیں۔ زیادہ پھیلے ہوئے کاروبار درہم برہم ہو گئے۔ بے روزگاری تیزی سے بڑھ گئی۔ اُجرتیں معمولی رہیں۔ مزدوروں کو زیادہ گھنٹے کام کرنا پڑا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں اتحادیوں نے جرمنی میں بحران کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چارلس جی ڈاز[4] نام ایک امریکی ماہرِ مالیات نے منصوبہ تیار کیا، جو "ڈاز کا منصوبہ" کہلاتا ہے۔ ڈاز آگے چل کر کیلون کولج[5] کی صدارت میں نائب صدر کے عہدے پر مامور ہوا۔ اس منصوبے کے مطابق سفارش کی گئی کہ فرانسیسی روہر کا تخلیہ کر دیں۔ ایک خاص بینک قائم کر دیا جائے، جو تاوان کی رقمیں وصول کرے۔ پانچ سال کے لیے یہ رقمیں تدریجاً بڑھتی جائیں اور آٹھ لاکھ سنہری مارک کے بین الاقوامی قرضے کا انتظام کیا جائے تاکہ ابتدائی برسوں میں جرمن تاوان ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ قوم پرستوں نے ان تجاویز کے خلاف سخت اعتراض کیا۔ وہ کہتے تھے کہ اس منحوس منصوبے کے ذریعے سے جرمنی کو غیر ملکی آقاؤں کا غلام بنانا منظور ہے۔ مئی سنہ ۱۹۲۴ء سے ریشتاغ کے انتخابات ہوئے تو قوم پرستوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ نازیوں اور کمیونسٹوں

---

[1] Mien Kanpf

[2] Hans Luther

[3] Hjalmar Schacht

[4] Dawes

[5] Calvin Coolidge

نے بھی خاصی نشستیں حاصل کرلیں، البتہ اعتدال پسند پارٹیوں نے نقصان اٹھایا، لیکن مختلف پارٹیاں اکٹھی ہوگئیں اور اگست ۱۹۲۴ء میں ڈاز کا منصوبہ منظور کرلیا گیا۔ قوم پرستوں سے کہہ دیا گیا کہ انھیں بھی وزارت میں نمائندگی دے دی جائے گی۔ دسمبر میں نئے انتخابات ہوئے تو نازی اور کمیونسٹ دونوں کو نقصان ہوا۔ سوشل ڈیموکریٹ اور اعتدال پسند زیادہ نشستیں لے گئے۔ ۱۹۲۵ء کے اوائل میں مرکزی پارٹی، عوامی پارٹی اور قوم پرستوں نے متحدہ وزارت بنالی اور جرمنی پر حکمرانی شروع کردی۔ قوم پرستوں کا ایک بازو جس کی قیادت الیفرڈ ہیوجنبرگ[1] کررہا تھا، جمہوریت کے ساتھ تعاون کی مخالفت کی۔ اگرچہ جرمنی کا بڑا حصہ دائیں بازو کی طرف پلٹ آیا تھا مگر خارجہ پالیسی سٹریسمان ہی کے صلح پسند ہاتھوں میں رہی۔ نومبر ۱۹۲۳ء سے اکتوبر ۱۹۲۹ء تک وہی تمام حکومتوں میں وزیر خارجہ رہا۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں اس نے وفات پائی۔

داخلی بحالی کا دور ۱۹۲۴ء ــــ ۱۹۲۹ء

جمہوریۂ ویمر کو ان برسوں میں کم از کم تکلیفیں پیش آئیں، لہٰذا اقتصادی بحالی نے تیزی سے ترقی کی، یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں جرمنی کی صنعتی پیداوار ۱۹۱۳ء سے بڑھ گئی۔ جرمنی کے پاس ساز و سامان اعلیٰ درجے کا تھا۔ فنی کمالات میں اس کی ہمسری مشکل تھی۔ پھر اس نے امریکہ کے انداز میں وسیع پیمانے پر پیداوار کا طریقہ اختیار کرلیا اور اس کی صنعتی مشینری اعلیٰ پیمانے پر پہنچ گئی۔ اس صنعتی ترقی کے ساتھ قرضہ بھی بہت زیادہ لیا جانے لگا اور کسی قدر بے روزگاری بھی پیدا ہوئی۔ جرمنی کے صنعتی نظام کی چند خصوصیتیں تھیں، مثلاً بڑے بڑے ٹرسٹ تھے جن کے ذریعے سے کوئلہ اور لوہا کانوں سے نکالا جاتا تھا، پھر چیزیں تیار کرکے بازار میں پہنچائی جاتی تھیں۔ مختلف صنعتی ادارے مل جل کر چیزوں کی قیمتیں مقرر کرتے تھے اور آزادانہ کاروبار کرنے والوں کی انجمنیں بھی تھیں جو قیمت اور فروخت پر اپنے فائدے کے لیے ضبط و نظم قائم رکھتیں۔ زیادہ زور بھاری صنعت پر دیا جاتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلسل خوشحالی بڑا سامان جنگ تیار کرنے پر موقوف ہوگی۔

اس دور میں تاوان کی قسطیں پابندی سے ادا کی گئیں اور جرمنی کے اقتصادیات کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو روپیہ تاوان کی قسطوں میں جرمنی سے باہر جاتا تھا، اس سے زیادہ روپیہ باہر کے ملکوں سے جرمنی میں آتا تھا، خصوصاً ان امریکیوں کا روپیہ، جو صنعت میں سرمایہ لگا رہے تھے۔ غیر ملکی سرمایے پر انحصار ــــ جو کساد کے دور میں یقیناً نہ آتا ــــ نے جرمنی کی خوشحالی کو مصنوعی سا بنا دیا۔

۱۹۲۵ء میں صدر جمہوریہ ایبرٹ فوت ہوا اور نئے صدر کے انتخاب کا اعلان ہوا۔ تین امیدواروں کے درمیان

---

[1] Hugenberg

مقابلہ تھا۔ کیتھولکوں کی مرکزی پارٹی ڈیموکریٹ اور سوشل ڈیموکریٹ ولہلم مارکس[1] کے حامی تھے، جو مرکزی پارٹی کا لیڈر تھا۔ قوم پرست عوامی پارٹی اور دائیں بازو کے دوسرے افراد فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ کے حامی تھے جس کی عمر اس وقت ستتر سال کی تھی۔ کمیونسٹوں کا اپنا امیدوار تھا۔ اس طرح ہنڈنبرگ کے انتخاب کو تقویت پہنچی اور وہ ووٹوں کی قلیل مقدار سے کامیاب ہوگیا۔ بیرونی ملکوں میں اس واقعے سے مایوسی ہوئی کہ ایک ایسا شخص صدر منتخب کیا گیا جو شہنشاہی دور میں عسکریت پسند جرمنی سے قریبی وابستگی رکھتا تھا، لیکن سنہ ۱۹۳۰ء تک ہنڈنبرگ عین دستور کے مطابق عمل پیرا رہا، اگرچہ اس سے اکثر قوم پرستوں کو مایوسی ہوئی۔

اس دور کے داخلی معاملات نے بڑی گرم جوشی پیدا کی، لیکن ان کا فیصلہ جمہوری طریق پر ہوگیا، مثلاً ایک جمہوری پرچم کے ساتھ پرانا شہنشاہی پرچم بھی لہرایا جائے یا نہیں؟ آیا سابق شاہی خاندان کے افراد کی جائدادوں پر قبضہ کیا جائے یا نہیں اور آیا فوج غیر مصافی ضبط و نظم میں رکھی جائے یا نہیں؟ سنہ ۱۹۲۷ء میں مزدوروں نے بے روزگاری کے بیمے کا نیا نظام منظور کرالیا۔ جاگیرداروں نے ہنڈنبرگ کو مشرقی پروشیا میں ایک جاگیر بطور نذر دے دی، جس پر کسی زمانے میں اس کے اجداد قابض تھے۔ اس طرح وہ زمینوں کی اصلاحات کے ہر منصوبے کا مخالف ہوگیا، بلکہ ریشتاغ نے جاگیرداروں کے لیے سالانہ وسیع اعانتی رقوم منظور کیں۔ اس منصوبے کو مشرق کی امداد بھی کہتے تھے۔ یوں زمینداروں کے قرضے عام محصول گزاروں کے روپے سے ادا کیے گئے۔ سنہ ۱۹۲۸ء کے انتخابات میں سوشل ڈیموکریٹ برسراقتدار آگئے۔ قوم پرستوں اور نازیوں پر سخت ضرب لگی۔ بہر حال خوشحالی نے اعتدال پسندی کی حوصلہ افزائی کی اور جمہوریت کی حمایت شروع ہوگئی۔

خارجی ایفاء عہد
سنہ ۱۹۲۵ء - سنہ ۱۹۳۰ء

خارجی معاملات میں جمہوریۂ ویمر نے جرمنی کو اجتماعی حفاظت کے نظام میں رفتہ رفتہ شریک کرنا شروع کیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں جرمنی نے معاہدات لوکارنو[2] پر دستخط کیے اور فرانسیسی فوجیں رہائن لینڈ سے نکل گئیں۔ اس کی جگہ ایک غیر جانبدار حلقہ قائم کردیا گیا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری برطانیہ اور اٹلی نے لے لی۔ نیز جرمنی اور اس کے ہمسایوں کے درمیان جھگڑوں کے فیصلے کے لیے ثالثی کا ایک ادارہ قائم کردیا، لیکن ان معاہدوں کے ذریعے سے جرمنی کی مشرقی سرحد کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہوا، جو پولینڈ اور چیکوسلواکیا سے ملحق تھی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جرمنی کو جمعیت اقوام کا ممبر بنا لیا گیا اور اسے جمعیت کی کونسل میں ایک مستقل نشست دے دی گئی۔ اس طرح جرمنوں کو اتحادیوں کے برابر درجہ حاصل ہوگیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جرمنی

---

[1] Wilhelm Marx

[2] Locarno

نے کیلوگ اور بریاں کا میثاق[1] منظور کر لیا، جس میں جارحانہ جنگ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔

۱۹۲۹ء میں تاوان کا ایک نیا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کی ذمہ دار ایک مجلس تھی، جس کی صدارت اوون ڈی[2] ینگ نام ایک امریکی کو دی گئی تھی۔ یہ منصوبہ اسی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے مطابق اتحادیوں کے ابتدائی مطالبے میں معتدبہ کمی کر دی گئی۔ اس منصوبے کے مطابق قسطیں ادا کرنے کی شرحیں بھی ڈاز کے منصوبے سے کمتر رکھی گئیں اور جرمنوں کو فراہمی کا زیادہ موقع دے دیا گیا۔ جون ۱۹۳۰ء سے پیشتر اتحادیوں نے رھائن لینڈ خالی کر دیا تھا۔ گویا تخلیے کی شرط معاہدہ ورسائی کی مقررہ میعاد سے چار سال پیشتر پوری کر دی گئی۔ جرمنی کو جو فائدے پہنچائے گئے، وہ اگرچہ خاصے معقول تھے، لیکن ان کی تکمیل میں اتنی مشکلات پیش آئیں کہ ان کی اچھائی کے پہلو غائب ہو گئے۔ جرمن قوم پرست، نازی اور کمیونسٹ ان کے خلاف تھے، مگر جرمنی کی خارجہ پالیسی ایسے اصول پر قائم رہی کہ دنیا کو حسن نیت کا یقین دلایا جاتا رہا۔

کساد کا اثر: ۱۹۲۹ء — ۱۹۳۱ء

دورِ ایفاء کے آخری کارنامے سے پیشتر ہی کساد دستک دینے لگا تھا۔ خوشحالی اور اعتدال کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں بے روزگاری بڑھ گئی۔ اکتوبر میں امریکہ کا بازار سرد پڑ گیا اور جس غیر ملکی قرض پر خوشحالی زیادہ تر موقوف تھی، اس کے ملنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ تھوڑی مدت کے لیے جو قرضے دیئے گئے تھے ان کی تجدید نہ ہو سکی۔ باقی قرضے واپس لے لیے گئے۔ محاصل کی دیواریں غیر ملکی تجارت کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ بھوک اور احتیاج جرمنی میں پھر نمودار ہو گئی تھی۔

اگرچہ بیروزگاری کے بیمے نے مزدوروں کو ابتدائی دھچکے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، لیکن زیریں اوسط حال ہی ہیں تکلیفیں اٹھا کر افراطِ زر کی ضرب سے سنبھل رہا تھا، اس کے لیے افراط سے بچنے کا کوئی سہارا نہ تھا۔ اس طبقے کی پریشان حالی نے ہٹلر کو تقویت پہنچائی، جس کی حیثیت دورِ ایفاء میں بہت گر گئی تھی۔ بلاشبہہ اس دور میں بھی اسے ایسے پیرو مل گئے تھے، جو آگے چل کر اس کی تحریک میں اہم حیثیت حاصل کر گئے۔ پال جوزف گوئبلز[3] اخبار نویس تھا۔ اسے نشر و اشاعت کا کام سونپا گیا تھا۔ وہ عوامی نفسیات کا بڑا ماہر ثابت ہوا، ساتھ ہی وہ پُرتاثیر خطیب تھا۔ ہینرش ہملر[4] نرم اطوار، مگر بڑا بیدرد تھا۔ مرغیاں پالنا اس کا پیشہ تھا۔ اس نے منتخب سیاہ پوشوں کا نظم و نسق سنبھال

---

[1] Kellog Briand Pact — کیلوگ امریکی تھا اور بریاں فرانسیسی

[2] Owen d'Young

[3] Paul Joseph Goebbels

[4] Heinrich Himmler

لیا۔ یہ دفاعی فوج تھی۔ جسے "ایس ایس[1]" کہتے تھے۔ یہ بطور خصوصی اعزازات کے لیے بھرتی کی گئی تھی۔ ایس ایس کا درجہ ایس اے (طوفانی فوج) سے بلند تھا اور اس میں وہی لوگ بھرتی کیے جاتے تھے جو نسلاً خالص جرمن تھے۔ اسی سے وہ خفیہ پولیس وجود میں آئی، جو گسٹاپو[2] کہلائی۔ ہٹلر نے جوشم فان ربن ٹراپ[3] کو بھی ساتھ ملا لیا۔ یہ شمپین کا تاجر تھا۔ اسے جرمنی کے بالائی طبقے کے لیے پارٹی کی طرف سے سفیر بنا دیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں حکومت اس لیے شکست کھا گئی کہ بے روزگاری کے بیمے سے جو منافع ہوئے، ان کے متعلق اتفاق نہ ہو سکا۔ ہنڈنبرگ نے ہینرلش بروئیننگ[4] کو چانسلر بنایا، جو کیتھولکوں کی مرکزی پارٹی کا رکن تھا۔ بروئیننگ چاہتا تھا کہ پارلیمانوں کی حمایت جاری رکھے اور سٹریسمان نے ایفائے عہد کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس پر کاربند رہے۔ ان میں سے کوئی بھی کام اسے ممکن معلوم نہ ہوا۔ ہنڈنبرگ کی عمر اس وقت بیاسی سال کی ہو چکی تھی اور وہ جنرل کرٹ فان شلیشر[5] کے زیر اثر آ گیا تھا، جو ایک جاہ طلب آدمی تھا اور جوڑ توڑ کے ذریعے سے صدر جمہوریہ کا منظور نظر بن گیا تھا۔ ہنڈنبرگ چاہتا تھا کہ اپنی طرف سے احکام جاری کر کے حکومت کا کام چلائے۔ دستور کے مطابق اس کو نازک حالات میں ایسا اختیار حاصل تھا۔ ریشتاغ نے بروئیننگ کا اقتصادی پروگرام منظور نہ کیا۔ یوں ہنڈن برگ کو وہ موقع مل گیا جس کی اسے خواہش تھی۔ بروئیننگ نے بھی یہ صورت قبول کر لی، ایک حد تک اس لیے کہ اس کا احساس تھا، واقعی نازک حالت پیدا ہو چکی ہے، مگر ایک حد تک اس لیے بھی کہ وہ اپنے زبردست سیاسی حریفوں یعنی سوشل ڈیموکریٹوں کو برسر اقتدار آنے سے روکنے پر تلا بیٹھا تھا۔

صدر نے اپنے فرمان خاص سے بجٹ کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ جب ریشتاغ نے مطالبہ کیا کہ یہ فرمان منسوخ کیا جائے تو صدر نے ریشتاغ توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اس انتخابی مہم میں کمیونسٹوں اور نازیوں کے درمیان بازاروں کے اندر لڑائیاں ہوئیں۔ ووٹ گنے گئے (ستمبر ۱۹۳۰ء) تو ان دو انتہا پسند پارٹیوں کو بہت زیادہ ووٹ ملے اور اعتدال پسندوں کو نقصان پہنچا۔ ریشتاغ میں نازیوں کی نشستیں پہلے صرف بارہ تھیں۔ اب ایک سو سات ہو گئیں۔ کمیونسٹوں کی نمائندگی چون سے بڑھ کر ستتر پر پہنچ گئی۔ اب بروئیننگ کو ووٹروں کی خواہشات کے خلاف کام جاری رکھنا پڑا اور ہنڈن برگ کی حمایت سے اس نے مطلق العنان طریق پر فرمانروائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اب سوشل ڈیموکریٹوں کو یہ تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں نازی پارٹی نئی حکومت میں شریک نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے انھوں نے بروئیننگ کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ جب ریشتاغ کا اجلاس ہوا تو کمیونسٹوں اور نازیوں نے ایوان کے اندر

---

[1] جرمنی میں اس کا نام Schutzstaffel ہے۔ شٹز شافل ترشٹز اور شافل سے ایس ایس لے لیے گئے۔

[2] Gestapo

[3] Joachim von Ribbentrop

[4] Bruening

[5] Kurt von Schleicher

ہنگامہ بپا کر دیا، لیکن ووٹ دینے کا وقت آیا تو دونوں نے متحد ہو کر حکومت کے اختیار کردہ وسائل کے خلاف ووٹ دیئے۔ یہ وسائل صرف اس لیے منظور ہوئے کہ سوشل ڈیموکریٹوں نے برونٹنگ کی حمایت میں ووٹ دیئے۔ ۱۹۳۱ء میں برونینگ نے کوشش کی کہ آسٹریا اور جرمنی کے درمیان کسٹمز کی یونین بنا دی جائے تاکہ دونوں ملکوں کے محاصل میں یکسانی پیدا ہو جائے اور دونوں اپنی سیاسی برتری کو نقصان پہنچائے بغیر کساد کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا ایسا کوئی انتظام ان دونوں ملکوں کے درمیان کامیاب ہو سکتا تھا، درآں حالیکہ دونوں بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آسٹریا اور ہنگری کا سیاسی اتحاد دونوں کے لیے بدرجہا زیادہ باعث استحکام ثابت ہوتا۔ بہرحال اس پورے منصوبے نے اتحادیوں، خصوصاً فرانسیسیوں کے دل میں کلاں تر جرمنی کا کابوس پیدا کر دیا۔ بین الاقوامی عالمی عدالت نے اس منصوبے کو رد کر دیا۔ اس اثنا میں آسٹریا کے بڑے بینک کا دیوالہ نکل گیا۔ اگرچہ برطانیہ نے ۱۹۳۱ء میں آسٹریا کو قرضہ دیا تھا اور جمہوریہ امریکہ کے صدر ہربرٹ ہوور[1] نے جرمنی کی طرف سے تاوان کی ادائی ایک سال کے لیے روک دی تھی، مگر کساد شدید تر ہو گیا۔

جمہوریت خطرے میں
۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء

آسٹریا اور جرمنی کے درمیان کسٹمز کی یونین نہ ہو سکی تو برونٹنگ کی حکومت کے خلاف دائیں بازو کے سیاست دانوں نے کوالیشن بنا لی۔ اس میں نازی، قوم پرست، "فولادی خود والی"[2] تنظیمات، جاگیرداروں کی زرعی جمعیت، صنعتکار اور مختلف شاہی خاندانوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس کوالیشن کی پشت پر زبردست مالی وسائل موجود تھے اور اس کے مختلف اجزاء خصوصاً نازیوں کو عوام کی حمایت حاصل تھی۔ کوالیشن کو نجی فوجوں کی امداد بھی میسر تھی، مثلاً نازیوں کے طوفانی دستے، فولادی خود والی تنظیمات کے لوگ اور ایسی ہی دوسری نیم فوجی تنظیمات۔ چونکہ بائیں بازو والوں میں تفرقہ پڑا ہوا تھا، اس لیے کمیونسٹ ہی دائیں بازو کے سیاسی حلیف بن سکتے تھے۔ اب ان لوگوں کے لیے سیاسی کامیابی میں صرف ہنڈنبرگ کی شخصیت حائل تھی۔ ہنڈن برگ کو فوج پر کامل اقتدار حاصل تھا اور دستور وہمر کی بدولت وہ برونینگ کو برسر اقتدار رکھے ہوئے تھا، اگرچہ عوام اس کے سخت مخالف تھے۔

۱۹۳۲ء کے اوائل میں فرٹز تھائیسن جیسے عظیم القدر صنعتکار نے ہٹلر کو کوئلے اور فولاد کے تاجروں کے جلسے میں خطاب کے لیے بلایا تو کوالیشن کو مزید تقویت پہنچی۔ ہٹلر نے ان لوگوں کو بالشوزم کے خطرے سے متنبہ کیا، جمہوری حکومت کے اصول کی ہنسی اڑائی۔ تاجروں کو یقین دلایا کہ میرے دل میں نجی جائداد کا پورا احترام ہے۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر میں برسر اقتدار

---

[1] Hoover

[2] Steel Helmets کو جرمن زبان میں Stahlhelm کہتے ہیں۔

آیا تو آپ لوگوں کے نمائندے کی حیثیت میں کام کروں گا۔ اس طرح ان کی مالی امداد حاصل کرلی۔ اب ہٹلر کے پیرو پھر بیتاب تھے کہ نئے سرے سے اقدام کریں۔ انھیں یقین تھا کہ یہ اقدام کامیاب ہوگا، مگر ہٹلر نے انھیں روکے رکھا۔ اسے یقین تھا کہ نازی آئینی طریق پر اقتدار حاصل کریں گے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں صدر کا انتخاب ازسرنو ہونا تھا۔ بروئینگ نے ہنگامہ آرائی اور مصارف سے بچنے کے لیے یہ کوشش کی کہ ریشتاغ ہنڈنبرگ کی میعاد صدارت میں توسیع کردے۔ ہٹلر نے یہ تجویز ماننے سے انکار کردیا۔ چنانچہ مارچ میں انتخابات ہوئے اور ہٹلر نازیوں کی طرف سے امیدوار بن گیا۔ ہنڈنبرگ مرکزی پارٹی، سوشل ڈیموکریٹوں اور دوسری اعتدال پسند پارٹیوں کی طرف سے امیدوار بنا۔ قوم پرستوں نے فولادی خود والوں میں سے ایک شخص کو امیدوار کھڑا کر دیا۔ کمیونسٹوں کا اپنا امیدوار تھا۔ ہٹلر کو ایک کروڑ تیرہ لاکھ اڑتیس ہزار پانچ سو اکہتر ووٹ ملے اور ہنڈن برگ کو ایک کروڑ چھیاسی لاکھ اکسٹھ ہزار سات سو چھتیس۔ یہ ووٹ مطلوب اکثریت سے کسی قدر کم تھے۔ تکمیلی انتخابات میں قوم پرستوں نے ہٹلر کی حمایت کی اور اس کے ووٹ ایک کروڑ چونتیس لاکھ ہوگئے۔ اس کے مقابلے میں ہنڈنبرگ کے ووٹ ایک کروڑ ترانوے لاکھ ساٹھ ہزار تھے۔ غرض ۸۴ سالہ مارشل پھر صدر منتخب ہوگیا۔ اگرچہ وہ اعتدال پسندوں کی طرف سے امیدوار تھا، مگر اب وہ اعتدال پسند نہیں رہا تھا، بلکہ جاگیرداروں اور فوجیوں کا آلہ کار بن گیا تھا۔

حکومت نے حکم دے دیا کہ نازیوں کے طوفانی دستے اور دوسری نجی فوجیں توڑ دی جائیں، مگر یہ حکم نافذ نہ ہوا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں مقامی انتخابات ہوئے۔ ان میں نازیوں نے شاندار کامیابیاں حاصل کیں، خصوصاً پروشیا میں۔ بروئینگ نے کوشش کی تھی کرا دائے تاوان میں التوا کی مدت بڑھالے یا اسلحہ میں جرمنی کو فرانس کے برابر رکھنے کی اجازت حاصل کرلے۔ وہ دونوں کوششوں میں بروقت کامیاب نہ ہوسکا۔ اب شلیشر، بروئینگ کے خلاف جوڑ توڑ شروع کرچکا تھا۔ اس نے ہنڈنبرگ سے کہنا شروع کیا کہ بروئینگ سے استعفاء لیا جائے۔ چنانچہ ۲۹ مئی سنہ ۱۹۳۲ء کو بروئینگ چانسلری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی چانسلر صرف اس لیے عہدہ چھوڑنے پر مجبور ہوا کہ اسے صدر کا اعتماد حاصل نہیں رہا تھا۔ اس کی جگہ فرانز فان پاپن[1] چانسلر بنا۔ وہ ایک دولتمند کیتھولک امیر اور مرکزی پارٹی کے دائیں بازو کا رکن تھا۔ اس نے جو وزارت بنائی، وہ امراء پر مشتمل تھی۔ شلیشر، پاپن کا آدمی تھا یا کم ازکم شلیشر کا خیال یہی تھا۔

مرکزی پارٹی نے پاپن سے برات کا اظہار کیا، کیونکہ اسے کسی بھی سیاسی پارٹی یا گروہ کی حقیقی حمایت حاصل نہ تھی، البتہ نازی عارضی طور پر اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے، کیونکہ اس نے طوفانی دستوں کے متعلق امتناعی حکم واپس لینے کا اقرار کیا تھا۔ پاپن نے اس خیال سے نئے انتخابات کرائے کہ نازی انتہائی عروج پر پہنچ چکے ہیں اب

---

[1] Franz Von Papen

اُن کے ووٹوں میں تخفیف شروع ہو جائے گی۔ پھر ان کے دماغ درست ہو جائیں گے اور وہ حکومت سے پورا تعاون کرنے لگیں گے۔ خارجہ پالیسی میں جہاں برونیننگ ناکام رہا تھا، وہاں پاپن نے کامیابی حاصل کرلی، کیونکہ اتحادیوں نے ینگ کا منصوبہ ختم کردیا اور جرمنی سے کہا کہ تین ارب سنہری مارک یورپی تعمیرِ نو کے سرمایے میں دے دے۔ پہلے جرمنی کیلئے لازم تھا کہ سالہا سال تک تاوان ادا کرتا جائے۔ اب اسے ایسے تمام واجبات سے نجات حاصل ہوگئی، لیکن نازیوں نے انتخابی مقاصد کے پیشِ نظر اس فیصلے کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ یہ خراج ادا کرنے کا نیا میثاق ہے۔ چنانچہ انھوں نے انتخاب سے پیشتر ہی ایک مہم شروع کردی جس میں بہت سے آدمی قتل ہوئے۔

۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کے انتخابات میں نازیوں نے دو سو تیس نشستیں حاصل کریں اور وہ ریشتاغ میں تنہا سب سے بڑی پارٹی بن گئے۔ کمیونسٹوں نے بھی زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ یہ نشستیں سوشل ڈیموکریٹوں کو نقصان پہنچا کر حاصل کی گئیں۔ ڈیموکریٹ اور عوامی پارٹی کے نمائندے تقریباً ناپید ہو گئے۔ قوم پرستوں کو بھی نقصان پہنچا، البتہ مرکزی پارٹی نے زیادہ نشستیں حاصل کرلیں۔ پاپن کو نئی ریشتاغ سے بھی خاص حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اس نے نازیوں کو وزارت میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی، مگر نازیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیں چانسلر کا عہدہ دیا جائے۔ ہنڈنبرگ ملک کی باگ ڈور ہٹلر کے حوالے کرنے پر ہرگز آمادہ نہ تھا۔ اب پاپن نے یہ تدبیر سوچی کہ نئے انتخاب کرائے جائیں۔ اسے توقع تھی کہ بار بار کے انتخابات میں ہٹلر کی قوت گھٹتی جائے گی، یہاں تک کہ وہ چھوٹا عہدہ قبول کرکے حمایت پر آمادہ ہو جائے گا۔ صنعتکار ہٹلر کی حمایت کر رہے تھے۔ پاپن نے ان پر دباؤ ڈالا۔ اب نازیوں کا سرمایہ گھٹنے لگا اور ہٹلر سخت تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ ۶ نومبر ۱۹۳۲ء کے انتخاب میں پاپن کے نظریے کی محکمیت ثابت ہوگئی۔ نازیوں کی نشستیں دو سو تیس سے گھٹ کر ایک سو چھیانوے رہ گئیں۔ کمیونسٹوں نے بھی خاصی کامیابی حاصل کی اور پاپن کے لیے بھی تائید و حمایت کا خاصا بندوبست ہوگیا۔ اب نازی سخت پریشانی کی حالت میں تھے۔ گوئبلز نے اپنی ڈائری میں لکھا:-

"برلین کی جماعت سے مالی حالت کے متعلق روداد پہنچی جس سے سخت مایوسی ہوئی۔ قرضوں اور واجبات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور موجودہ شکست کے بعد کہیں سے معقول رقم حاصل کرنا بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے۔"[1]

ہٹلر کا حصولِ اقتدار ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء

اگر پاپن کو چالیں چلنے کا موقع دے دیا جاتا تو ہٹلر کو اقتدار سے روکنے کے امکانات موجود تھے، مگر پاپن نے رسماً اس لیے استعفا دے دیا کہ ریشتاغ میں اسے اکثریت کی حمایت پر بھروسا

---

[1] ولیم ہال پیرن (Halperin) کی کتاب Germany Tried Democracy ص ۵۱۱ - ۵۱۲

نہ تھا۔ عموماً سمجھا جاتا تھا کہ ہنڈنبرگ اسے دوبارہ مقرر کر دے گا، لیکن شلیشر کے دل میں پاپن سے حسد پیدا ہو گیا تھا اس نے دوبارہ تقرر کے خلاف جوڑ توڑ شروع کر دیئے۔ ہنڈن برگ کو شلیشر پر غصہ آیا اور پاپن کی علیحدگی کا اسے افسوس تھا۔ چنانچہ اس نے ۳ دسمبر ۱۹۳۲ء کو خود شلیشر پر دباؤ ڈالا کہ وہ چانسلر بن جائے۔ چنانچہ وہ چانسلر بن گیا، مگر اسے کسی فریق کی طرف سے سیاسی حمایت حاصل نہ تھی اور خود ہنڈنبرگ بھی اس کا حامی نہ رہا۔ شلیشر صرف آٹھ ہفتے برسر کار رہا، پھر ہٹلر چانسلر مقرر ہو گیا۔

شلیشر نے بڑی کامیابی یہ حاصل کی کہ پانچ طاقتوں نے اسلحہ میں جرمنی کے لیے مساوات کا اصول تسلیم کر لیا۔ ملک کے اندر اس نے بائیں بازو کے انتہا پسندوں کو چھوڑ کر تمام پارٹیوں سے اپیل کی کہ وہ اس کی امداد کریں، لیکن اس کوشش نے مزدوروں کے مخالف صنعتکاروں اور جاگیرداروں کو بھی اس سے الگ کر دیا۔ جاگیردار زمین کے متعلق تصفیے کے اس منصوبے کے بھی مخالف تھے، جسے مشرقی پروشیا میں شلیشر کی امداد حاصل تھی۔ پیچ در پیچ پاپن نے انتقام کے جوش میں شلیشر کے دشمنوں سے ساز باز کر لیا۔ جنوری ۱۹۳۳ء کے اوائل میں پاپن نے کولون[1] کے بینکر کرٹ فان شروڈر[2] کے مکان پر ہٹلر سے ملاقات کی۔ صنعتکار عارضی طور پر ہٹلر کی امداد سے دستکش ہو گئے تھے، اب انھوں نے نازی پارٹی کے تمام قرضے ادا کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ اب ہٹلر نے اپنے لیے چانسلری کے عہدے پر اصرار ترک کر دیا اور پاپن کو امید پیدا ہو گئی کہ ہٹلر کی امداد سے وہ دوبارہ برسر اقتدار آ جائے گا۔ ہنڈنبرگ نے بھی اس معاملے میں شرکت قبول کر لی۔ شلیشر چاہتا تھا کہ پہلے ہی اجلاس میں اسے ریشتاغ توڑ دینے کا اختیار مل جائے، کیونکہ ریشتاغ میں اسے حمایت کے لیے کافی ووٹ نہیں مل سکتے تھے۔ ہنڈنبرگ نے یہ رائے قبول نہ کی، چنانچہ ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو شلیشر کے لیے استعفا دے دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔

اب ہٹلر نے پردہ اٹھا دیا اور اپنے لیے چانسلر کے عہدے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ پاپن اس پر راضی ہو گیا، لیکن شرط یہ لگائی کہ ہٹلر پارلیمانی نظام کی پوری پوری پابندی کرے۔ پاپن کو نائب چانسلری کا عہدہ دیا گیا۔ اسے بدستور خیال تھا کہ حکومت میں اقتدار اسی کو حاصل ہو گا، کیونکہ گیارہ وزیروں میں سے نازی صرف تین تھے، لہٰذا اس نے ہنڈن برگ کو راضی کر لیا کہ ہٹلر کو چانسلر بنا دیا جائے، مگر ہٹلر کے متعلق پاپن کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اگرچہ ہٹلر نے ہنڈنبرگ کے روبرو حلف اٹھایا کہ وہ دستور قائم رکھے گا، مگر جمہوریۂ ویمر کی تقدیر پر اسی وقت آخری مہر لگ گئی جب ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔

۱؎ Cologne

۲؎ Kurt Von Schroeder

چھیاسٹھواں باب

جرمنی ہٹلر کی حکمرانی میں

۱۹۳۳ء - ۱۹۳۹ء

نازیوں کی ڈکٹیٹری

برسرِاقتدار آنے کے بعد ہٹلر نے ابتدائی ہفتے اس کوشش میں بسر کیے کہ اپنی چانسلری کو ڈکٹیٹری کی شکل کیونکر دے۔ اس نے ریشتاغ توڑ دی اور نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ انتخابی مہم کے دوران میں نازیوں نے مخالفوں کو تشدد اور تہدیدات کے ذریعے سے بے دست و پا کیا۔ انھیں ریڈیو پر تقریروں کا بھی موقع نہ دیا اور اخباروں سے بھی فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ بہ ایں ہمہ انتخابات میں نازیوں کی کامیابی یقینی نہ تھی۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء کو ریشتاغ کی عمارت میں آگ لگ گئی۔ یوں ہٹلر کو یہ بتانے کا خداداد موقع مل گیا کہ کمیونسٹ بدامنی کے ایسے ہی واقعات کے موجب بنے رہیں گے۔ ہنڈن برگ نے بحرانی حالت کے پیش نظر احکام جاری کر دیے، جن میں آزادیِ تحریر و تقریر معطل کر دی۔ یوں طوفانی فوجیوں کو سیاسی مخالفوں میں دہشت پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اب عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ریشتاغ میں آگ خود نازیوں نے لگائی تھی، مگر بعد میں مقدمہ چلا اور انھوں نے ایک ولندیزی کمیونسٹ کو جس کا نام وانڈرلب[1] تھا، ذمہ دار قرار دیا اور اسے موت کی سزا دے دی، حالانکہ وہ شخص بظاہر عارضۂ دماغی میں مبتلا تھا۔ دوسرے کمیونسٹ، خواہ وہ جرمن تھے یا بلغاری اور انھی میں بلغاری جارجی ڈمیٹروف بھی شامل تھا، بَری قرار پائے۔ ڈمیٹروف بعد ازاں کومن ٹرن کا صدر بن گیا۔

مہم میں ہر قسم کی بے قاعدگی کے باوجود نازی صرف چوالیس فی صد ووٹ حاصل کر سکے اور انھیں ریشتاغ میں دو سو اٹھاسی نشستیں ملیں۔ ہٹلر طوفانی فوجیوں کی مسلسل دھمکی دیتا رہتا تھا۔ اسی ذریعے سے اس نے ریشتاغ کو دبانے کی کوشش کی۔ سوشل ڈیموکریٹوں کے چورانوے ووٹوں کے سوا (کمیونسٹوں کو نشستوں پر بیٹھنے کی اجازت ہی نہ دی گئی) ریشتاغ کے ممبروں نے اختیاراتِ خصوصی کا قانون منظور کر لیا (۲۳ - مارچ ۱۹۳۳ء)۔ اس قانون کے مطابق حکومت کو ڈکٹیٹری کے اختیارات

---

[1] Vanderh Luble

مل گئے اور دستور معطل کر دیا گیا۔ ریشتاغ نے بعد ازاں ۱۹۳۷ء میں، پھر ۱۹۴۳ء میں اس قانون کی تجدید کر دی۔ یوں ہٹلر کو اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنے کا اختیار مل گیا اور کوئی قانون اس کی راہ میں حائل نہ تھا۔ اس نے ایک وزارت پروپیگنڈے کے لیے قائم کی جس پر گوئبلز کو مامور کیا۔ دستور ویمر کے ماتحت مختلف مملکتوں کی حکومتوں کو جو اختیارات حاصل تھے، وہ سب واپس لے لیے اور جرمنی کو ایک نئے وحدت مرکزیت مآب مملکت بنا دیا (اپریل ۱۹۳۳ء)۔ برلین سے گورنر مقرر کر کے بھیج دیے جاتے، جنھیں مختلف مملکتوں کی قانون ساز مجلسوں سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے۔ اگست ۱۹۳۴ء میں ہنڈن برگ نے وفات پائی، اس وقت اس کی عمر ستاسی سال کی تھی، ہٹلر نے چانسلر کے ساتھ صدر کے اختیارات بھی سنبھال لیے اور اپنے لیے "ڈیرفیوہرر"[1] (لیڈر) کا لقب پسند کیا۔ اس عمل کی تصدیق رائے عامہ نے کر دی جس میں ہٹلر کو اٹھاسی فی صد ووٹ ملے۔

جو سیاسی پارٹیاں ہٹلر کی مخالف تھیں، انھیں توڑ دیا گیا۔ کمیونسٹوں اور اشتراکیوں کو ممنوع قرار دیا گیا (مئی ۱۹۳۳ء)۔ قوم پرست خود بخود ختم ہو گئے (جون ۱۹۳۳ء)۔ کیتھولکوں کی پارٹیاں حکومت نے ختم کر دیں (جولائی ۱۹۳۳ء) یہی کیفیت شاہ پسند گروہوں کو پیش آئی (فروری ۱۹۳۴ء)۔ فولادی خود والوں کو نازی پارٹی میں شامل کر لیا گیا (جون ۱۹۳۳ء)۔ آخر ان کی مستقل حیثیت ہی باقی نہ رہی (نومبر ۱۹۳۵ء)۔ جولائی ۱۹۳۳ء میں اعلان کر دیا گیا کہ جرمنی کے اندر صرف ایک ہی جائز سیاسی پارٹی ہے اور وہ نازیوں کی ہے۔

نازیوں کو زیادہ فائدہ اس وجہ سے پہنچا کہ وہ پارلیمانی نظام کی سخت مذمت کرتے تھے اور اس سے بیزار تھے، کیونکہ اس میں ضبط و نظم کوئی نہ تھا۔ عوام اس پر خوش ہوئے کہ ریشتاغ کی ردّ و کد کے بجائے معاملات کی باگ ڈور ایک زبردست آدمی کے ہاتھ میں آگئی ہے، جو تمام ضروری کام جلد سے جلد پورے کرا لیتا ہے۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں جو انتخابات ہوئے، ان میں مخالف امیدوار موجود ہی نہ تھے اور بانوے فی صد ووٹ نازیوں کو ملے۔ چھ سو اکسٹھ کے ایوان میں صرف دو رکن ایسے تھے جن کا تعلق نازی پارٹی سے نہیں تھا۔ فاشسٹ اٹلی اور کمیونسٹ روس کی طرح نازیوں کی پارٹی کا بڑا حصہ بھی نوجوان ہی تھے۔ چنانچہ اس پارٹی کی زبردست علاقائی تنظیم پورے جرمنی پر چھا گئی۔

۱۹۳۴ء کا خونیں تصفیہ

اب خود نازی پارٹی کے اندر ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ اس کے ذمہ دار وہ لوگ تھے، جو یقین کیے بیٹھے تھے کہ ہٹلر واقعی عمرانی اور اقتصادی مسائل میں جو انتہا پسندانہ نقطۂ نگاہ پیش کر رہا ہے۔ وہ خلوص پر مبنی ہے۔ ان میں سے بہت سے نازی طوفانی فوج میں شامل تھے اور بیشتر کا تعلق زیریں طبقۂ اوسط سے تھا۔ انھیں اس امر پر بھی افسوس تھا کہ ہٹلر نے تنظیم سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ طوفانی دستوں ہی نے اسے اقتدار پر پہنچایا تھا، اب وہ اس کے لیے پریشانی کا سامان بن گئے تھے۔

---

[1] Der Fuehrer

۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو ہٹلر نے خونیں تصفیے کا حکم دیا اور خود اس میں شریک ہوا۔ اُس نے اس واقعے کو "طویل چھریوں کی رات" قرار دیا۔ روہم طوفانی فوج کا بانی اور لیڈر تھا، اسے گولی مار دی گئی اور خود ہٹلر کے اقبال کے مطابق تہتر دوسرے نازیوں کو یہی کیفیت پیش آئی۔ ان میں شلیشر اور اس کی بیوی بھی شامل تھے۔ پاپن گرفتار ہوا، لیکن بعدازاں اس نے ڈپلومیٹ کی حیثیت میں ہٹلر کی خدمت احسن طریق پر انجام دی۔ مقتولین کے متعلق دوسرے اندازے ایک ہزار تک پہنچتے ہیں۔ ان مظلوموں میں ممتاز کیتھولک اور کچھ جرنیل بھی شامل تھے۔ ان سب پر ہٹلر نے الزام لگایا کہ انھوں نے مجھے مار ڈالنے کی سازش کی تھی۔ بہرحال جون ۱۹۳۴ء کے بعد نازی پارٹی کے اندر یا باہر ہٹلر کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ رہا۔ سال بہ سال نورمبرگ میں پارٹی کا یوم منایا جاتا، جس میں شاندار طریق پر نازیوں کی طرف سے وفاداری کا اظہار ہوتا۔ ہٹلر ساعت بہ ساعت دوسروں کے خلاف زہر اگلتا تو زور شور سے اس کی تائید کی جاتی۔ جابجا سواستکا کے پرچم لہراتے اور فوجی بینڈ بجتا۔

نسلی برتری

خاص اختیارات کا قانون منظور ہو جانے سے چند روز بعد ہٹلر نے یہودیوں پر پہلی ضرب لگائی، جن کی مذمت وہ مدت سے کر رہا تھا۔ اس وقت جرمنی کی آبادی تقریباً چھ کروڑ تھی۔ ان میں سے یہودی ایک فی صد سے بھی کم تھے (چھ لاکھ سے بھی کسی قدر کم) ان میں وہ لوگ شامل نہ تھے، جو جزواً یہودی تھے۔ یہودی مختلف پیشوں اور فنون میں ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے اور جرمن ثقافت کے لیے انھوں نے شایان خدمات انجام دی تھیں۔ ان میں سے اکثر قوم کے اندر جذب ہو چکے تھے اور ان کے سینے گہری حُبّ وطن سے معمور تھے۔ اگر انھیں نازی پارٹی میں شرکت کی اجازت ہوتی تو غالباً اکثر نازی بن جاتے۔ سامیت کی مخالفت کے سوا وہ تقریباً ہر معاملے میں ہٹلر کی حمایت پر آمادہ تھے، لیکن ہٹلر نے سامیت کی مخالفت کا نظریہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھیں بیدردی سے خلاف کر دیا۔

چنانچہ یہودیوں کے پیشوں اور کاروبار کا مقاطعہ کیا گیا۔ صاف کہہ دیا گیا کہ انھیں کوئی عہدہ نہ دیا جائے (اپریل ۱۹۳۳ء)۔ صرف ان لوگوں کو عارضی طور پر مستثنیٰ رکھا گیا، جو پہلی عالمی جنگ میں زبردست خدمات انجام دے چکے تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۵ء کو نورمبرگ میں جو قوانین منظور ہوئے، ان میں ہر اس شخص کو یہودی قرار دے دیا گیا، جس کے دادا یا دادی میں سے کوئی ایک یہودی تھا۔ ایسے تمام لوگوں کو جرمن شہریت سے محروم کر دیا گیا۔ یہود و غیر یہود میں شادیاں ممنوع قرار پائیں، کیونکہ اس طرح نسل بگڑتی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہودی قومی پرچم نہ لہرائیں، نہ کچھ لکھیں، نہ شائع کریں، نہ سٹیج یا سینما کے پردے پر ایکٹ کریں، نہ تعلیمی اداروں میں پڑھائیں، نہ بینکوں میں کام کریں، نہ تصویروں کی نمائش یا گانے کی محفل کا انتظام کر سکیں، نہ ہسپتالوں میں کوئی خدمت انجام دیں، نہ سرکاری کارخانوں یا پیشہ ور مجلسوں میں داخل ہوں، نہ کتابیں یا قدیم نادر چیزیں بیچیں۔ انھیں خیرات اور بے روزگاری کے بیمے سے بھی محروم کر دیا گیا۔ جن یہودیوں نے عالمی جنگ میں جرمنی کے لیے جانیں دی تھیں، ان کے نام جنگی یادگاروں سے محو کر دیے گئے۔ بہت سے قصبات و دیہات میں سرکاری پروپیگنڈے کے زیر اثر یہودیوں کو حدود کے اندر رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔

نومبر ۱۹۳۸ء میں ایک یہودی لڑکا جس کی عمر سترہ سال تھی، والدین پر ظلم و جور سے اس قدر جوش میں آگیا کہ اس نے پیرس میں جرمن سفارت خانے کے ایک سیکرٹری کو گولی سے ہلاک کر دیا۔ دو روز بعد منظم جرمن ہجوم نے پورے ملک میں یہودیوں کی دکانوں کو بیدردی سے لوٹا۔ ان کے ہیکلوں کو آگ لگا دی یا ڈائنامیٹ سے اڑا دیا۔ پھر یہودیوں کے گھروں پر دھاوا بول دیا۔ ان غریبوں کو سخت زدو کوب کیا اور ان کا مال اسباب اٹھا لیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو حکومت نے یہودیوں کو مجبور کیا کہ نقصان رسیدہ املاک کی درستی کا انتظام کریں! اور ان پر بے اندازہ جرمانہ عائد کر دیا۔ ان کے نام بدلے گئے۔ مجبور کیا گیا کہ اپنے لباسوں پر حضرت داؤد کا زرد ستارہ لگائیں اور یہودی کسی جرمن انجمن کے رکن نہیں۔ جو یہودی جرمنی سے باہر نکل گئے، اگرچہ انھیں اپنی املاک عموماً چھوڑنی پڑیں، تاہم وہ خوش نصیب سمجھے گئے۔ جن تعزیری تدبیروں کا ذکر کیا جا چکا ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سی تدبیریں اختیار کی گئیں (مثلاً جو گائیں یہودیوں سے خریدی جائیں، وہ مختلف مقامات کے سانڈوں سے جفت نہ ہونے پائیں)۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کو مخصوص حلقوں میں بند کر دیا جائے اور وہ بھوکوں مریں۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے دوران میں انھیں گیس کی بھٹیوں میں بند کر کے بالکل ختم کر دیا گیا۔ جس امر نے اکثر ہراس زدہ مغربی مبصروں میں مایوسی پیدا کی، وہ یہ تھا کہ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور مہذب غیر یہودی جرمنوں نے اس ظلم و جور کے خلاف قابلِ ذکر تعداد میں کوئی صدا بلند نہ کی۔

نسلی برتری کے لیے جوش و خروش کے ایجابی پہلو کی طرح ایک سلبی پہلو بھی ہے۔ بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی شمالی نسل پر زور دیا گیا کہ وہ آغاز شباب میں باہم شادیاں کریں اور بہت سے بچے پیدا کر لیں۔ جرمن امومت کو مدح و ستائش کا مرجع بنا لیا گیا۔ نسل پاک صاف رکھنے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ جو جرمن کسی موروثی بیماری میں مبتلا تھے، ان کی حس جنسیت ختم کر دی گئی۔ عمدہ نسل پیدا کرنے کے لیے ایک مجلس بنا دی گئی جس میں ایک جج، ایک ڈاکٹر اور موروثی امراض کا ایک ماہر شامل تھے۔ یہ ہر فرد کے معاینے کے بعد فیصلہ صادر کرتے۔ اگرچہ بعض غیر جرمن حلقوں میں بھی اسے بڑا ترقی یافتہ عمرانی اقدام سمجھا گیا، مگر اس قانون کے مطابق مناسب عمل طبی اور قانونی پیشوں کی حالت پر موقوف تھا۔ جرمنی میں قانون اور طب دونوں چیزیں عطائیوں کے ہاتھ میں چلی گئیں، جن کے پاس سب سے بڑی دستاویز یہ بھی تھی کہ وہ پرجوش نازی تھے۔ جنگ کے دوران میں ان انسانوں پر ہولناک بیدردی کے تجربے کیے گئے، جنھیں نسلاً فروتر سمجھا جاتا تھا، مثلاً یہودی، پولستانی، دوسرے سلافی اور خانہ بدوش، مگر ان تجربوں سے کوئی خاص عملی فائدہ نہ ہوا۔ یہ تمام تجربے نازیوں کی عمدگیِ نسل کے متعلق گوناگوں قوانین کے نتیجے تھے۔

قانونی اور اقتصادی سیاسیات

ہٹلر نے جرمنی کا عدالتی نظام بالکل بدل دیا۔ روایتی قانونی اصول ترک کر دیے اور ان کی جگہ "عدالتِ عامہ" نافذ کر دی، گویا فرد کو کاملاً قوم کے تابع کر دیا۔ اس پراسرار نظریے کا مطلب عملاً یہ تھا کہ ہٹلر جو کچھ چاہتا، وہی جرمن قانون ہوتا۔ چنانچہ عوامی عدالتیں قائم کر

دی گئیں (مئی ۱۹۳۴ء) تاکہ غداری کے تمام مقدمات کی سماعت کریں اور غداری میں معمولی جرائم کی بھی ایک بہت بڑی تعداد شامل کرلی گئی، مثلاً ممنوع اخبار فروخت کرنا۔ ہٹلر ہی عوامی عدالتوں کے تمام جج مقرر کرتا۔ حکومت کے دشمنوں کے لیے خاص مرکز قائم کر دیئے گئے، جہاں انھیں قید رکھا جاتا یا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ان کے لیے اپیل کا کوئی حق نہ تھا، بلکہ وہ جوابدہی کے لیے حسب منشا وکیل بھی مقرر نہیں کر سکتے تھے اور انھی وکیلوں کو قبول کرلینے پر مجبور ہوتے، جو عدالت کے نزدیک مسلّم سمجھے جاتے۔ گسٹاپو (جیہیم سٹاٹس پولیزئی[1] یعنی مملکت کی خفیہ پولیس) پروشیا میں قائم ہوئی (اپریل ۱۹۳۳ء)۔ ایک سال بعد پورے جرمنی میں اس کی توسیع کردی گئی۔ اسے لوگوں کے نجی خط کھولنے، ٹیلیفون کی بات چیت سننے اور شہریوں پر جاسوسی کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔

پوری اقتصادی زندگی حکومت کے زیر اثر آگئی۔ زراعت میں نازیوں کا نصب العین یہ تھا کہ اس سلسلے میں جرمنی کو زیادہ سے زیادہ کفیل بالذات بنا دیا جائے۔ نیز وہ کسانوں پر سیاسی ضبط و نظم قائم رکھنا چاہتے تھے۔ جرمن جاگیرداروں کی پوری حفاظت کی گئی اور ان کی وسیع جاگیروں کو تقسیم کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں ایک خاص قانون بن گیا جس کے مطابق تین سو بارہ ایکڑ سے کم املاک کاملاً محفوظ کردی گئیں اور انھیں قرض کے لیے بھی نہ فروخت کیا جاسکتا تھا اور نہ قرق کرایا جاسکتا تھا۔ اس قانون نے چھوٹے کسانوں کو ہٹلر کے معاون بنا دیا، مگر حکومت ہی قطعۂ اراضی سے پیداوار کا فیصلہ کرتی اور اسی کی طرف سے جنسوں کی قیمتیں، اجرتیں اور پیداوار کی تقسیم کا خرچ مقرر ہوتا۔ بنجر زمینیں زیر کاشت لائی گئیں۔ شہریوں کو حکم دے دیا گیا کہ شیشے کے گھروں میں سبزیاں کاشت کریں۔ ہٹلر جو جنگی تیاریاں کر رہا تھا، یہ سب کچھ اسی کا حصہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء تک زراعت میں تراسی فی صد کفیل بالذات ہوگیا، گویا نازیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد آٹھ فی صد کا اضافہ ہوا۔ چربی اور قہوہ دو بڑی چیزیں تھیں، جن میں کمی باقی رہ گئی۔

صنعت و حرفت کے سلسلے میں سٹالن کی پیروی کی گئی۔ ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں پہلے چار سالہ منصوبے اور ۱۹۳۶ء میں دوسرے چار سالہ منصوبے کا اعلان کر دیا۔ پہلے منصوبے کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اقتصادی حالت بہتر ہو جائے اور بے روزگاری باقی نہ رہے۔ عورتوں اور مردوں کے لیے مزدوری کے کیمپ بنا دیئے گئے، جن سے بے روزگاری میں کمی ہوئی۔ اسی طرح اسلحہ کے لیے، نیز امور عامہ کے لیے ایک پروگرام بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء تک بے روزگاری ستر لاکھ سے گھٹ کر پندرہ لاکھ پر آگئی۔ دوسرے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے لیے تیاری کی جائے اور اگر جرمنی کی ناکابندی بھی ہو جائے تو اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔ خام مال کی پیداوار بہت بڑھا دی گئی اور سب سے پہلے اسلحہ کی تیاری اور دوسری جنگی صنعتوں کے لیے سرو سامان مہیا کیا گیا۔ مزدوروں کی تقسیم بھی انھی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔ قیمتوں اور غیر ملکی مبادلے

---

[1] Geheime Staats Polizie گسٹاپو انھی جرمن لفظوں کے ابتدائی حروف سے بنا ہے۔

پر ضبط و نظم قائم رکھا گیا اور گوئرنگ کی نگرانی میں دے دیئے گئے۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ السا س ولورین کے قیمتی ذخائر آہن سے جو نقصان پہنچا ہے ــــ جہاں سے جرمنی کا تین چوتھائی لوہا مہیا ہوتا تھا ــــ اس کی تلافی ہو جائے۔ اس سلسلے میں اُن کانوں سے بھی کام لیا گیا، جہاں سے معمولی درجے کا خام لوہا نکلتا تھا اور حکومت نے خود اس سلسلے میں گرانقدر مصارف برداشت کر لیے۔ مزید دو سال میں لوہے کی صنعت میں پچاس فی صد اضافہ ہو گیا۔ جرمن کے اعلیٰ سائنسدانوں کی خدمات حاصل کی گئیں، تاکہ دوسری قلیل المقدار جنسوں کی کمی پوری کریں اور ضرورت محسوس کریں تو ترکیبی جنسیں تیار کر لیں، اگرچہ ان پر کتنا ہی خرچ آئے۔ اس سلسلے میں خاص اہمیت پٹرول کو ہے، جو کوئلے سے نکالا گیا۔ اسی طرح ترکیبی ربڑ تیار کر لیا گیا۔ حکومت نے اس سلسلے میں شاہراہیں بھی بنائیں، جنھیں جنگ کے موقع پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

نازیوں نے ۱۹۳۳ء میں مزدوروں کی تمام یونینیں توڑ دیں۔ ۱۹۳۴ء میں ملازم رکھنے والوں کی انجمنوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ مزدوروں کی یونینوں کے بجائے مزدوروں کا ایک محاذ ڈاکٹر رابرٹ لے[1] کے ماتحت قائم کیا گیا۔ اس میں اُجرت پر کام کرنے والے تمام لوگ، تنخواہ دار، پیشہ ور اور ملازم رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ ہر کارخانے کی ایک الگ مجلس ہوتی تھی۔ اس میں سب کارکن شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ کارخانے کے مالک اور مقامی نازی پارٹی کے رئیس کی سفارش پر مقرر کیے جاتے تھے۔ یہی مجلس کارخانے کی اصلاح کے لیے سفارشیں کرتی تھی۔ پورے جرمنی کو تیرہ حصوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا۔ ہر حصے میں مزدوروں کا ایک امین (ٹرسٹی) مقرر ہوتا تھا، جو اُجرتوں کا فیصلہ کرتا، جھگڑے چکاتا، مالک یا کارکنوں میں سے جسے چاہتا، باہر نکال دیتا۔ نکالنے کے لیے شرط یہ تھی کہ اس کی وجہ سے مزدوروں کے محاذ کے کام کاج میں خلل پڑتا ہو۔ ایسے فیصلوں پر خاص عدالتیں نظرثانی کر سکتی تھیں۔ اگر مزدور پورے نظام کو خاموشی سے تسلیم کر لیتے تو انھیں روزگار کا یقین دلا دیا جاتا۔ مزدوروں کا پورا محاذ ایک لحاظ سے جاسوسی کا وسیع نظام تھا، جو کارخانوں میں نازیوں کے مخالف عناصر پر نظر رکھتا۔ ایسے لوگوں کی تنخواہیں گھٹا دی جاتیں، انھیں برطرف کر دیا جاتا یا جیلوں میں ڈال دیا جاتا۔ مزدوروں کے محاذ کے ساتھ ایک اور نظام تھا، جسے "تفریح کے ذریعے سے تقویت" کا نظام کہا جاتا تھا۔ یہ نظام جرمنی کے مزدوروں کو مختلف تفریحی مقامات یا سیاحوں کے مرکزوں پر بھیجتا اور مصارف خود ادا کرتا۔ اس کے ذریعے سے گانے کی محفلیں منعقد ہوتیں اور ایسی ہی دوسری تفریحات کا انتظام کیا جاتا۔

دوسرا چار سالہ منصوبہ عمل میں آیا تو کارکنوں پر واضح ہو گیا کہ ان کے لیے جنبش کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ ہر کارکن کے پاس ایک کتابچہ رہتا تھا، جس میں اس کی تعلیم و تربیت اور مناصب کی تفصیل درج ہوتی۔ وہ اُس وقت تک نیا کام شروع نہ کر سکتا، جب تک مملکت کی طرف سے اس کی موزونیت کا ہدایت نامہ جاری نہ ہو جاتا۔ ثانوی

---

[1] Ley

درسگاہوں کے تمام فارغ التحصیل طلبہ ملازم رکھنے والے حکام کے پاس اپنے نام رجسٹر کراتے۔ جو مرد و زن کام کاج کی عمر کو پہنچ جاتے، اُن سے جبراً کام لیا جا سکتا۔ جنگ سے پیشتر، زراعت، کان کنی اور بعض صنعتی کارخانوں کے مزدور اپنے اپنے کاموں میں جم گئے تھے۔ جس حد تک سرمایے کا تعلق ہے، بڑے بڑے سرمایہ دار جرمنی کی صنعتی تنظیم پر چھا گئے تھے۔ یہ نظام حکومت کی سرپرستی میں نفع بخش اجارہ داری کا نظام تھا۔ چونکہ مختلف ڈائرکٹر مختلف کارخانوں کے نگران تھے، اس وجہ سے نظام بہت سخت ہو گیا تھا، اگرچہ بظاہر ایسا نظر نہ آتا تھا۔ مثلاً اچھے صنعتکار ایک سو نظامتوں (ڈائرکٹریٹ) پر قابض تھے اور وہ بنیکوں کے صدر تھے۔ ساتھ ہی وہ سرکاری ملازم تھے۔ وزیر اقتصادیات ایک بہت بڑے اقتصادی مینار کی چوٹی پر بیٹھا تھا۔ وہی کارخانوں میں توسیع کی اجازت دیتا۔ درآمد و برآمد پر ضبط و نظم قائم رکھتا۔ قیمتیں مقرر کرتا۔ خام جنسیں دیتا اور ان کی ساخت کے مصارف کا فیصلہ کرتا۔

مذہب و ثقافت

نازیوں کے لیے ایک مسئلہ مسیحی کلیساؤں کا تھا جن میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں شامل تھے۔ ہٹلر کے پیروؤں میں جو لوگ انتہا پسند تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسیحیت سے پیشتر کا نظام اختیار کر لیا جائے اور ان دیوتاؤں کی پرستش کی جائے، جن کے گیت دیگزنے گائے۔ خود ہٹلر کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اعلان کیا تھا کہ میرا خدا صرف جرمنی ہے، لیکن منصب نے اس کے افکار میں سنجیدگی پیدا کر دی، کیونکہ جرمنی بہرحال مسیحی ملک تھا، اگرچہ اس مسیحیت کو محض برائے نام سمجھ لیا جائے۔ لوتھری کلیسا نے ۱۹۳۳ء میں ایک قومی مذہبی مجلس کی تنظیم کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ کلیسا کو حکومت کے اقتدار سے محفوظ رکھا جائے۔ نازیوں نے فوراً بشپ مقرر کر کے اس مجلس پر قبضہ کر لیا۔ انتہا پسند نازیوں کی کوشش یہ تھی کہ بائیبل کو پاک کیا جائے اور صلیب کو ترک کر دیا جائے۔ اس سے عوام میں بے چینی پیدا ہوئی۔ مخالفوں نے پادری مارٹن نیموئیلر[1] کی سرکردگی میں نازیوں کی دینداری پر اعتراض کیا اور ضبط و نظم کی کوششوں کو ناواجب قرار دیا، لیکن وہ ہٹلر کی وفاداری کا بھی اعلان کرتا رہا اور یہ بھی کہہ دیا کہ نازی نسلی برتری کا جو نظریہ پیش کر رہے ہیں، اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بہ ایں ہمہ اسے نازی مرکز میں بھیج دیا گیا، کیونکہ وہ لوتھری کلیسا پر اقتدار کی مزاحمت کر رہا تھا۔ جب جنگ چھڑی تو اس نے درخواست کی کہ مجھے کسی آبدوز کا کمانڈر بنا دیا جائے۔ جس تحریک کی اس نے قیادت کی تھی، وہ صرف پندرہ فی صدی پروٹسٹنٹ پادریوں سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ باقی سب لوگ ایک حرف شکایت زبان پر لائے بغیر سب کچھ مان گئے۔

جولائی ۱۹۳۳ء میں ہٹلر اور جرمنی کے کیتھولکوں کے درمیان ایک میثاق ہو گیا جس میں کیتھولکوں کو عبادت کی آزادی دے دی گئی اور یہ بھی اجازت مل گئی کہ اپنی درسگاہوں میں مذہبی تعلیم دیتے رہیں۔ انھیں نوجوانوں کے گروہ بنانے

---

[1] Niemoeller

اور دینیات کے پروفیسر مقرر کرنے کی بھی اجازت مل گئی، لیکن نازیوں نے یہ شرطیں پوری نہ کیں۔ مثلاً کیتھولکوں کے رسالوں کی اشاعت میں مداخلت کی۔ نوجوانوں کے گروہوں پہ سختیاں عمل میں آئیں۔ کیتھولک پادریوں کے متعلق اخباروں میں مضامین چھپے کہ وہ تاریک بین الملّی تحریک کے رکن ہیں۔ یوں ان کی ہتک کی جاتی رہی۔ خود کیتھولک کلیسا نے اُن تعلیمات کی مخالفت کی جو ہٹلر کے نوجوان گروہوں میں کیتھولک بچوں کو دی جاتی تھی۔ میونخ کے کارڈینل فال ہابر[1] نے ۱۹۳۳ء کے میثاق کی خلاف ورزی پر نازیوں کی مذمّت کی، مگر اس طرح کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ ۱۹۳۷ء میں پادریوں کی ایک بڑی تعداد گرفتار ہوئی اور ان کے خلاف مختلف بیان کردہ جرائم کے لیے مقدمے چلے اور ان میں سے اکثر کو تادیبی مرکزوں میں بھیجا گیا۔ پروٹسٹنٹوں نے نازیوں کے ایک قومی کلیسا کی کسی قدر مخالفت کی تھی اور کیتھولکوں کے بارے میں نازیوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو ایک مرتبہ بسمارک نے اختیار کیا تھا اور حقیقۃً ایک ثقافتی جہاد کا انتظام کیا۔ سوال یہ نہیں کہ لاکھوں کیتھولکوں نے، جن میں پادری اور عوام شامل تھے، تہ دل سے تائید نہ کی یا یہودیوں پر ظلم و جور کی مخالفت میں تامّل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیحیوں کے کسی بھی بڑے گروہ نے نازیوں کی نسلی برتری یا اکثریت کے خلاف قطعاً کوئی آواز نہ اٹھائی اور پادری بھی اس میں شامل تھے۔

نازیوں نے ربط ضبط کا عمل قومی زندگی کے ہر حصّے پر استعمال کیا۔ اس میں تعلیم اور فنون بھی شامل تھے۔ ایک مرتبہ ایک ممتاز نازی افسر نے کہا: "جب میں ثقافت کا لفظ سنتا ہوں تو میرا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھتا ہے" انتہا پسند نازیوں کے طریق عمل کی یہ ایک حقیقت نما اور نمایاں مثال ہے۔ ہٹلر کے اپنے فنی نظریّات حد درجہ سادہ تھے۔ اسے برہنگی پسند تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تصویر جتنی زیادہ ہوس انگیز اور وضع قطع میں جرمن ہو، اتنی ہی بہتر ہے اور وہ پوری قوم کو مذاق کے اسی سانچے میں ڈھال دینا چاہتا تھا۔ فن میں اکثر جدید اور تجرباتی رجحانات کو وہ غیر آریائی قرار دے کر ان کی مذمّت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ درسگاہوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، خصوصاً تاریخ، اس نقطۂ نگاہ سے نہیں پڑھائی جاسکتیں، جسے وہ آزاد خیالی کا مغالطہ قرار دیتا تھا، بلکہ طالب علم کو تاریخ نازیوں کے "نظریۂ خاک و خون" کے مطابق پڑھائی چاہیے۔ نازیوں کی نسلی برتری کا نظریّہ ان کے ذہن نشین کرنا چاہیے۔ بتانا چاہیے کہ جرمنی نے ماضی میں کتنے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ جسمانی تربیت اور عسکری روح کو تقویت پہنچانی چاہیے۔ نئے تعلیم کے نظام میں ہی قومی کونے کے بتقرّر ہیں۔ چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کی جرمنی کے بڑے بڑے شہنشاہ، فریڈرک اعظم اور بسمارک قومی مشاہیر کی صف میں شامل ہو گئے۔ یہ کام نازی پارٹی کے ایک ممبر ہورسٹ ویسل[2] نے انجام دیا، جو ایک عام کشمکش میں مارا گیا۔ (۱۹۳۰ء)۔ اسی نے نازیوں کا گیت مرتّب کیا تھا۔

۱؎ Faulhaber ۲؎ Horst Wessel

خارجہ پالیسی کی بنیادیں

ہٹلر کی خارجہ پالیسی پر ایک آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے، لیکن اس نے چونکہ داخلی پالیسی کو اسی طرح جنگی مقاصد کے مطابق بنایا اور عوام کی طرف سے اس کی حمایت کا انحصار زیادہ تر ان مقاصد پر مبنی تھا، جو اس کے بیرونی توسیع کے ذریعے سے جرمنی کے وقار کی بحالی کے لیے اس کے پیش نظر تھے۔ لہٰذا ان نظریات کا بھی کسی قدر جائزہ لے لینا چاہیے، جس پر اس کی پالیسی مبنی تھی۔ جرمنوں کی نسلی برتری کی بنا پر لازم تھا کہ ان تمام علاقوں کو جرمنی میں شامل کر لیا جائے، جہاں جرمن آباد تھے۔ ان میں آسٹریا، چیکوسلواکیا کی مغربی سرحد کے علاقے (سوڈیٹن لینڈ، ڈانزگ، پولستانی گزرگاہ (کاریڈور) اور بعض دوسرے مقامات شامل تھے۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ جرمنی کو زندہ رہنے کے لیے مکان ملنا چاہیے۔ اس کی بنا پر غیر جرمن علاقوں کو شامل کر لینا جائز قرار پایا، مثلاً باقی چیکوسلواکیا، پولینڈ، پورا جنوبی و مشرقی یورپ اور روس کے بڑے بڑے علاقے۔ ہٹلر کی رائے یہ تھی کہ جرمنوں کو جس جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اس کے حقدار ہیں، کیونکہ وہ نسلاً سب سے اونچے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے جگہ کا مسئلہ بیسویں صدی کے جرمن اہل علم نے پیدا کیا، جو ازمنۂ وسطیٰ کی مقدس رومی سلطنت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ ان کے نزدیک پہلی رائش[1] تھی پھر جنگ عظیم کے خاتمے پر ولیم دوم کی دوسری "رائش" ختم ہوئی۔ اب انھیں امید تھی کہ تمام پرانے علاقوں کو ساتھ ملا کر تیسری رائش قائم کر لیں گے۔ خواہ ان علاقوں میں کوئی قوم رہتی ہو ہٹلر نے نازی مملکت کو تیسری "رائش" قرار دیا تو اس کا مطلب یہی تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ یہ "رائش" ایک ہزار سال تک رہے گی۔ زندہ رہنے کیلئے مکان کے نظریے کی سائنٹفک بنیادیں سیاسی جغرافیے کے پروفیسروں نے فراہم کیں، جن میں سب سے ممتاز کارل ہاشوفر[2] تھا۔ وہ جغرافیے کا پروفیسر تھا، میجر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوا تھا اور ہٹلر کے گہرے دوست رڈالف ہیس کا استاد رہ چکا تھا۔ ان لوگوں نے نازیوں کے علاقائی عزائم کے لیے معقول محاذ مہیا کیا۔ ہاشوفر نے اعلان کر دیا کہ برطانیہ اور فرانس معرض زوال میں ہیں۔ چھوٹی طاقتوں کو حذف ہو جانا چاہیے (صرف سوئٹزرلینڈ اور ویٹیکان مستثنیٰ ہیں) جرمنی میں اعلیٰ درجے کی خالص نسل محفوظ ہے، لہٰذا قوت کا حامل اسی کو ہونا چاہیے۔ اسے پوری قوت سے توسیع کا انتظام کرنا چاہیے اور یوریشیا کے قلب پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ وہاں سے دنیا بھر پر حکومت کرنی چاہیے۔ مزید علاقوں کے لیے دعوے کی تائید میں ہٹلر اکثر کہا کرتا تھا کہ جرمنی میں آبادی حد سے زیادہ ہو گئی ہے، حالانکہ خود اس نے آبادی بڑھانے کے لیے سرگرم کوششیں کیں اور بڑے بڑے خاندانوں کو مالی امداد دیتا رہا۔ ہاشوفر کے دلائل کی طرح یہ دلیل بھی ہٹلر کے لیے ایک اور وجہ جواز بن گئی کہ جو کچھ چاہے، کرتا جائے۔

اب ہم جرمنی میں ایک ایسے دبستانِ فکر کا ذکر کرتے ہیں، جس سے عموماً تغافل برتا جاتا ہے۔ اس دبستانِ فکر

---

[1] Reich

[2] Hawshofer

کے جائزے سے ہم ہٹلر اور سٹالن کے درمیان ۱۹۳۹ء کے معاہدے اور ملک کے اندر ہٹلر کی کامیابی کو بہتر طریق پر سمجھ سکیں گے۔ ایک موقع پر یہ دبستان صرف روس کا حامی تھا۔ فوجی ارکان کا نظریہ یہ تھا کہ جرمنی کا مستقبل روس کے ساتھ اتحاد پر موقوف ہے۔ اس طرح روس کی لامتناہی آبادی کی قوت جرمنی کی صنعتی پیداوار اور فوجی ہنرمندی کے ساتھ مل کر عظیم فتوحات حاصل کر سکے گی۔ یہ نظریہ زاروں کے زمانے میں بھی جرمنی کی فوج میں خاصا رائج تھا۔ بالشویکوں کے انقلاب کے بعد بھی قائم رہا، خصوصاً معاہدۂ ریپالو کے بعد، جو جرمنی اور سوویٹ یونین کے درمیان ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا۔ خالص فوجی حلقوں سے باہر بسمارک کی روش بھی مغرب اور پولینڈ کے خلاف تھی اور وہ روس کے ساتھ دوستی کا حامی تھا، اگرچہ وہاں کوئی بھی نظامِ حکومت رائج ہو۔ اب روس بالشویکوں کے قبضے میں تھا اور وہ جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی کے حامی تھے۔ بہت سے جرمن قوم پرستوں نے اپنی قوم پرستی اور نئے روسی افکار میں مشترکہ مقام تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انھیں یہ کام اس لیے سہل معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ آزاد خیالی اور پارلیمانی نظام کے شدید مخالف چلے آتے تھے اور یہی کیفیت سٹالن کے پیرووں کی تھی۔ غرض جمہوریۂ ویمر کے دوران میں اور ہٹلر کی کامیابی کے بعد بھی انتہا پسند جرمن قوم پرستوں کی رائے یہی تھی اور وہ کمیونزم کے چنداں مخالف بھی نہ تھے۔ مزید برآں جرمنی کے پیروانِ مارکس میں شدید قوم پرستی کا احساس تھا اور وہ قوم پرستوں سے قریب تر آ گئے تھے۔ کمیونسٹوں کی رائے بھی یہی تھی۔ جمہوریۂ ویمر کے آخری دور میں لاکھوں ووٹر کبھی نازیوں اور کبھی کمیونسٹوں کے حامی بنتے رہے۔ یہ سب کچھ اسی احساس کا کرشمہ تھا۔

لیکن اس قسم کے نظریات کی مزاحمت سرکاری طور پر کمیونسٹ بھی کرتے رہے، جنھوں نے اپنے پیرووں میں قوم پرستی قرار ممنوع دے دی تھی اور قوم پرست بھی یہی کرتے رہے، جو حقیقتہً قدامت پسند تھے۔ ہٹلر نے قوم پرستی کو پرولتاری لباس میں پیش کیا اور اپنے پیرووں کو مسحور کر لیا۔ کمیونسٹ یا قوم پرست زیریں طبقۂ اوسط کی حمایت حاصل نہیں کر سکتے تھے، حالانکہ یہ نہایت ضروری تھی۔ ہٹلر کی نیشنل سوشلزم نے یہ کامیابی حاصل کر لی۔ یہ کامیابی بڑی حد تک لینن کے اس کمال پر موقوف ہے کہ اس نے قوم پرستی کو مارکس کی اصطلاحات میں پیش کیا، جو جرمنوں کے ذخیرۂ الفاظ کا لاینفک جزو بن چکی تھیں۔

ستڑسٹھواں باب

پارلیمانی نظام کی ناکامی

ہسپانیہ اور مشرقی یورپ (۱۹۱۸ء-۱۹۳۹ء)

(۱)

ہسپانیہ: پس منظر پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان اس کے پریشان کن دور میں صرف جرمنی اور اٹلی ہی کے اندر غیر جمہوری اور استبدادی حکومتیں بروئے کار نہ آئیں، بلکہ ہسپانیہ، نیز ہیبسبرگ سلطنت کی جانشین ریاستوں (بہ استثنائے چیکوسلواکیا) اور مشرقی و جنوبی یورپی بعض دوسری مملکتوں میں بھی یہی کیفیت رونما ہوئی۔ ہسپانیہ دوسرے یورپی ممالک سے بہت مختلف ہے اور اس کے سیاسیات اس درجہ پُرپیچ ہیں کہ غیر ملکی لوگ ان میں سے حد درجہ خطرناک اور گمراہ کن نتیجے پیدا کر سکتے ہیں۔ جو حالات ترقی کرتے کرتے فرینکو کی حکومت قائم کرنے کے موجب بنے، وہ اس وقت تک بے معنی رہیں گے، جب تک اس جغرافیائی، اقتصادی، ثقافتی اور عمرانی پس منظر کو سامنے نہ رکھ لیا جائے، جن میں وہ پیش آئے۔ ہسپانیہ میں شہر، گاؤں اور صوبے کے اندر مقامی احساس بہت زیادہ ہے۔ وقتاً فوقتاً بعض مشترک اسباب ہسپانوی عوام کو متحد کرتے رہے۔ سیاسی اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ علیحدگی کا جذبہ وہاں اکثر کارفرما رہتا ہے، خصوصاً کیٹیلونیا[1] اور باسک[2] کے صوبوں میں، جو شمالی جانب واقع ہیں۔

دوم مذہب نے قومی زندگی میں غیر معمولی طریق پر بہت بڑا کردار ادا کیا۔ مذہب ہی کی بدولت اہل ہسپانیہ ازمنۂ وسطیٰ میں مسلمانوں کے خلاف متحد ہوئے تھے اور مذہب ہی کی بدولت سولھویں اور سترھویں صدی میں پروٹسٹنٹوں کے خلاف متحد رہے، اگر انیسویں صدی کے اوائل میں ہسپانیہ کے کیتھولک کلیسا نے عوام کو اسی طرح آزاد خیالی کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جس طرح سابقہ دشمنوں کے خلاف استعمال کرتا رہا تھا اور عوامی مقاصد کی ہمنوائی اختیار نہ کی۔ یوں ہسپانیہ کے اکثر حصوں میں کلیسا بڑے بڑے مالکان اراضی کا رفیق بن گیا۔ اس وجہ سے مذہبی جمعیت

---

[2] Basque [1] Catalonia

وسیع پیمانے پر زائل ہوگئی۔ خود کیتھولکوں کی رودادوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے تک آبادی کا صرف معمولی سا حصہ باقی رہ گیا تھا، جو اجتماعی دعاؤں میں شامل ہوتا۔ ہسپانیہ کے زیریں طبقات نے اسی جذبے اور عقیدت سے دورِ حاضر کا کوئی نہ کوئی انقلابی نظریہ اختیار کر لیا جس جذبے اور عقیدت سے وہ کلیسا کے معاون رہے تھے۔

سوم، اگرچہ ہسپانیہ زراعت اور صنعتی خام مال میں اقتصادی اعتبار سے قریب قریب کفیل بالذات رہا، مگر وہاں کی زمین اچھی نہیں۔ زراعت کا نظام پسماندہ ہے اور دیہاتی حلقوں میں آبادی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ افلاس عام ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بے اطمینانی ہر جگہ موجود ہے۔ بایں ہمہ ہسپانیہ کے غریب طبقے اپنے لیے معیشت کے اعلیٰ معیار کی آرزو نہیں رکھتے، جیسی آرزو یہ ہے کہ بیرونی مداخلت سے وہ محفوظ رہیں۔ بہر حال افلاس پر قابو پانے کے لیے اہم اور بنیادی عامل مدت سے یہ سمجھا جا رہا کہ زرعی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ بڑی بڑی جاگیروں کو ختم کیا جائے اور امداد باہمی کے مطابق کھیتی باڑی کی کوئی شکل اختیار کی جائے۔

چہارم، جب اہلِ ہسپانیہ کی توجہ انقلابی نظریات کی طرف منعطف ہوئی تو زیادہ تر باکونن کے فوضوی عقائد اختیار کر لیے گئے۔ بعد ازاں سورل کی اکتسابی اشتراکیت میں بعض ایسے افکار انھیں نظر آئے، جو دل میں گھر کر گئے۔ گویا انارکزم (فوضویت) نے ہسپانیہ میں قدم جما لیے اور یہ کیفیت صرف ہسپانیہ میں پیش آئی۔ کیٹیلونیا کے صنعتی مزدور اور اندلس کے تباہ حال کسان انارکسٹ تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ مملکت پر قبضہ کر کے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے تباہ کر ڈالنا بہتر ہے۔ ہسپانیہ میں انارکزم کی تاریخ بڑی طویل ہے، لیکن دورِ عروج میں بھی اس کے معتقدوں کی تعداد دس اور پندرہ لاکھ کے درمیان ہوگی۔ یہ لوگ اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ انقلاب کی خواہش پیدا کر دی۔ یہ حکومت کے لیے وجہ ہراس بنے رہے، مگر اس کا تختہ نہ الٹ سکے اور ان کا مثبت کارنامہ صرف اس حد تک محدود رہا کہ ہڑتالیں کرا لیتے اور وقتاً فوقتاً اجرتیں بڑھا لیتے۔ یہ انارکزم معنویت کے اعتبار سے پیورٹین بھی اور کیتھولکوں کے سخت خلاف تھی۔ بالغ نظر مبصر اسے مسیحی الحاد سے مشابہ قرار دیتے تھے، جس نے "عہد نامۂ جدید" کی تعلیمات کو ظاہری صورت میں اختیار کر لیا۔ اس کے حامی کلیسا کے سخت خلاف ہو گئے اور ان میں وہی شدت پیدا ہو گئی، جو پہلے کلیسا کے حق میں ان کے لیے وجہ امتیاز تھی، کیونکہ انھیں احساس ہو چکا تھا کہ کلیسا ہی ان کی تباہی کا موجب ہے

چنانچہ ہسپانوی انقلابات میں گرجے جلائے گئے، پادری مارے گئے۔ یہ زیادہ تر انارکسٹوں کا کام تھا، جو تشدد کے بل پر ایسی صورت پیدا کر دینے کے خواہاں تھے، جس میں کسی پر برائے نام بھی جبر کا شائبہ باقی نہ رہے۔ انارکسٹوں میں بہت سے پیشہ ور مجرم بھی شامل تھے، جنھیں صرف تشدد اپنی طرف کھینچ لایا تھا۔

مگر ہسپانیہ میں انقلابی افکار صرف انارکسٹوں تک محدود نہ تھے۔ وہاں مارکسیوں کی اشتراکی پارٹی بھی موجود تھی، جس کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اس کی اپنی ٹریڈ یونینوں کا وفاق تھا، جو انارکسٹوں کے نظام کے متوازی تھا۔ اشتراکیوں

نے ابتدا میں قوت کیسٹل کے شہری مزدوروں یا معدنیات اور آہن سازی کے مرکز سے حاصل کی، جو شمال میں واقع تھے۔ جب ہسپانیہ میں جمہوریت قائم ہوئی (۱۹۳۱ء) تو اشتراکیوں کو دیہاتی حلقوں سے بھی بہت سے معاون مل گئے۔ ۱۹۳۴ء میں اشتراکیوں کی تعداد کوئی ساڑھے بارہ لاکھ تھی۔ یہ اشتراکی اعتدال پسند تھے، جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں کومن ٹرن سے الحاق منظور نہ کیا، مگر چند سال بعد دوسری بین الاقوامی انجمن از سرِ نو زندہ ہوئی تو اس میں شامل ہو گئے۔ جن لوگوں کو ان اشتراکیوں سے اختلاف تھا، انھوں نے چھوٹی سی کمیونسٹ پارٹی بنا لی۔ ان میں سے بھی چند لوگ ٹروٹسکی کی پیروی میں الگ ہو گئے۔ اہل کیٹیلونیا کی اپنی اشتراکی تنظیم تھی اور کلیسا بھی شمال میں مزدوروں کی اپنی یونینوں کا حامی تھا۔ وہاں اس نے بڑے بڑے زمینداروں کی ہمنوائی اختیار نہیں کی تھی۔ اشتراکیوں کا نظریہ یہ تھا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق سب کچھ ملنا چاہیے۔ یہ اصول کامیابی اور جائداد کے لیے ہسپانیہ کی روایتی بے اعتنائی کے عین مطابق تھا۔ حقیقت میں ہسپانیہ ایک ایسا ملک ہے، جس نے سرمایہ داری کا نظام یا صنعتی انقلاب کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی طرح پروٹسٹنٹوں کی اصلاحِ کلیسا بھی وہاں جڑ نہ پکڑ سکی۔

ڈان کارلس[1] کی حمایت کا نظریہ بھی دائیں بازو کے انتہا پسندوں کا نظریہ تھا۔ یہ بھی اس کی واضح مثال ہے کہ ہسپانیہ بیرونِ معاصر دنیا سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ تحریک انیسویں صدی میں کارلس کی حمایت کے لیے شروع ہوئی تھی، جو تختِ ہسپانیہ کا دعویدار تھا، لیکن موجودہ معاشرے سے کامل بے اعتنائی کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مذہبی تعزیر کا محکمہ بحال کر دیا جائے۔ ریل اور تار کو وہ حقیقتہً شیطان کی ایجادیں سمجھتا تھا اور کاپرنیکس کے نظریۂ کائنات کو رد کرتا تھا۔ طبقۂ زیریں میں اس کے بہت حامی موجود ہیں، خصوصاً نوآر[2] (شمال) کے باغی کسانوں میں۔

جمہوریۂ ہسپانیہ کی ابتدا

اس ملک پر ۱۹۲۳ء تک الفانسو[3] سیزدہم حکمران رہا۔ یہ دستوری حکمران تھا مگر اس کے دل میں مطلق العنانی کا خاص جذبہ تھا۔ اس کی حامی ایک ایسی حکومت تھی، جو انتخابی تھدیدات اور خرابیوں پر مبنی تھی۔ اس میں آزاد خیال اور قدامت پسند باری باری برسرِ کار آتے تھے۔ حقیقی اقتدار مقامی سیاسی لیڈروں کو حاصل تھا۔ ہسپانیہ نے پہلی عالمی جنگ میں کوئی حصّہ نہ لیا، اس لیے جنگ سے پیدا ہونے والے مصائب سے بڑی حد تک محفوظ رہا، لیکن دورانِ جنگ میں محاربین سے تجارت جاری رہی، اس وجہ سے ہسپانوی صنعت و حرفت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ دولتمندوں اور غریبوں میں کشمکش بڑھ گئی۔ مراکش میں فوج بغاوت کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ۱۹۲۱ء کی فوجی افتاد میں بہت سے ہسپانوی مارے گئے۔ دوسری طرف کیٹیلونیا کی علیحدگی حکومت کے لیے ہراس کا باعث ہوئی تھی۔

---

۱ Don Curlos

۲ Navarre

۳ Alfonso

یہ صورت حال تھی، جب جنرل پرائیمو دی رویرا[1] نے الفانسو کی منظوری سے ایک فوجی اقدام کیا (۱۹۲۳ء)۔ اس نے مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ اخباروں پر احتساب عائد ہو گیا، سیاسی مخالفوں پر تشدد ہوا۔ اس کی ڈکٹیٹری ۱۹۳۰ء تک قائم رہی، مگر ۱۹۲۶ء کے بعد ہر دلعزیزی کھو بیٹھی۔ اس کی کامیابی و ناکامی کے اسباب دنیا کے اقتصادی حالات کی روشنی میں ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ رویرا نے امور عامہ پر بے اندازہ روپیہ خرچ کیا۔ پھر کساد شروع ہو گیا، نیز اس نے دستور ساز مجلس اور سیاسی اصلاحات کے وعدے پورے نہ کیے، تاہم مراکش میں امن قائم کر دیا۔ اشتراکیوں کو بھی حکومت میں شامل کر لیا اور مزدوروں کے لیے مناسب قوانین اس امید پر منظور کرائے، کہ انارکسٹ کمزور ہو جائیں گے، لیکن اس کا انحصار زیادہ تر فوج اور بڑے بڑے زمینداروں پر تھا اور وہ زرعی اصلاحات جاری نہ کر سکا۔ اہل کیٹیلونیا بھی اس سے الگ ہو گئے اور اس کے تشدد آمیز اقدامات نے اسے طبقۂ اوسط کی حمایت سے بھی محروم کر دیا۔

رویرا کے استعفٰے اور وفات (۱۹۳۰ء) کے بعد الفانسو نے دستور بحال کر دیا۔ بلدیاتی انتخابات (اپریل ۱۹۳۱ء) کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت پسند کامیاب ہو گئے، جو شہروں کے زیریں طبقۂ اوسط، چھوٹے چھوٹے تاجروں، اہل علم، اساتذہ اور اخبار نویسوں کے نمائندے تھے۔ بادشاہ نے تاج و تخت سے دست برداری اختیار کیے بغیر ملک چھوڑ دیا۔ جون ۱۹۳۱ء میں دستور ساز اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے۔ ان میں جمہوریت پسندوں اور اشتراکیوں کو بھاری اکثریت حاصل ہو گئی اور نومبر میں دستور ساز مجلس نے بادشاہ کی واپسی ممنوع قرار دے دی اور اس کی جائداد ضبط کر لی۔ ہسپانیہ میں جمہوریت قائم ہو گئی۔ بادشاہی صرف پادریوں، فوج اور امرا کی نمائندگی کر رہی تھی، وہ ناکام رہی۔

دستور ساز اسمبلی نے آئندہ دسمبر میں نیا دستور منظور کر لیا۔ اس میں فیصلہ کر لیا گیا کہ پارلیمنٹ کا صرف ایک ایوان ہو گا۔ صدر جمہوریت کا انتخاب ایک ایسے انتخابی حلقے کے ذریعے سے ہو گا، جس میں پارلیمنٹ کے ممبر اور اتنی ہی تعداد میں رائے عامہ سے چنے ہوئے نمائندے شامل ہوں گے۔ وزارت پارلیمنٹ کے روبرو جوابدہ ہو گی۔ یہ حقیقت آشکارا تھی کہ فوج جب کبھی موقع پائے گی، جمہوریت کے خلاف سر اٹھائے گی۔ مذہبی حلقہ اور بڑے بڑے زمیندار فوج کی حمایت کریں گے۔ مزید براں اگرچہ جمہوریت کو اشتراکیوں کی عارضی حمایت حاصل تھی، مگر انارکسٹ رفاقت پر آمادہ نہ ہوئے، لہٰذا جمہوریت کو ابتدا ہی سے دائیں بازو اور بائیں بازو دونوں سے خطرہ تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ دونوں طرف کے انتہا پسندوں کے درمیان راہِ عمل اختیار کرے، ساتھ ساتھ جمہوریت پسند مرکز کو تقویت پہنچاتی جائے۔

جمہوریت کے لیے پریشانی کا دور
۱۹۲۳ء — ۱۹۳۶ء

جمہوریت کے لیے پہلا بحران اس وقت پیدا ہوا، جب ایک نیا دستوری ضابطہ زیر بحث آیا۔ اس میں کلیسا کی حیثیت متعین کی گئی تھی۔ مجلس نے اعتدال پسندوں

[1] Primode Pivera

کی تجویز ٹھکرا دی، جس کے مطابق کلیسا کو ایک خاص نظام کی حیثیت میں محفوظ رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ اسے اپنی درسگاہیں قائم کر لینے کی بھی اجازت تھی۔ ہسپانیہ کے اعلیٰ ترین مذہبی عہدہ دار نے جمہوریت کی مذمت کی تھی، مگر اکثر کیتھولکوں سے امید تھی کہ یہ تجویز ان کے لیے قابل قبول ہوگی۔ مجلس نے جو قرارداد منظور کی، اس کے مطابق کلیسائی درسگاہیں بند کر دی گئیں اور دو سال بعد وہ اعانتی رقوم بھی ختم کر دی گئیں، جو مملکت کی طرف سے کلیسا کو ملتی تھیں۔ اس سے تعلیم پر سخت ضرب لگی اور جمہوریت کے بہت سے حامی الگ ہو گئے۔ خصوصاً چھوٹے درجے کے پادری۔ پھر جمہوریت نے مختلف حلقوں کے لیے خود اختیاری کی تجویز منظور کر کے اہل کیٹیلونیا کے بڑے حصے کی حمایت حاصل کر لی، مگر وہ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھا سکی۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ کساد شروع ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے دیہاتی علاقوں میں بے روزگاروں کی تعداد بڑھ گئی اور بڑے بڑے زمینداروں نے زمینیں غیر مزروعہ چھوڑ دیں۔ مگر اس سلسلے میں ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمہوریت پسندوں اور اشتراکیوں کے درمیان ضبط شدہ جائداد کے آئندہ انتظامات کے متعلق اختلافات تھے۔ اشتراکی چاہتے تھے کہ پوری زمینیں اکٹھی رکھی جائیں اور اجتماعی حیثیت میں کھیتی باڑی کی جائے۔ جمہوریت پسندوں کی خواہش تھی کہ چھوٹی چھوٹی زمینداریاں قائم رہیں۔ سٹولی پن نے زاروں کے روس میں ایسے ہی سیاسی حالات کے تحت یہی طریقہ اختیار کیا تھا، مگر ہسپانیہ میں یہ طریقہ غالباً عملی نقطۂ نگاہ سے اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں جو زرعی قانون منظور ہوا، وہ کسی کو بھی مطمئن نہ کر سکا۔

انارکسٹوں نے بے اطمینانی کے اظہار کے لیے ایک بڑی بغاوت کا انتظام کر لیا (۱۹۳۳ء) حکومت نے بغاوت بزور دبا دی۔ جیل خانے بھر گئے۔ بے روزگاری اتنی ہی رہی، جتنی تھی۔ انارکسٹوں پر تشدد ہوا تو بائیں بازو کے زیادہ تر حامیوں نے جمہوریت کا ساتھ چھوڑ دیا اور دائیں بازو کی طرف سے اسے حمایت مل ہی نہ سکی۔ نومبر ۱۹۳۳ء کے انتخابات میں دائیں بازو کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور اس کی پارٹی پارلیمنٹ میں سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ اب حکومت کا رُخ دائیں بازو کی طرف ہو گیا اور پہلے اس نے جو قوانین منظور کیے تھے ـــ خصوصاً کلیسا اور مزدوروں کے متعلق ـــ وہ معطل پڑے رہے۔ کلیسا اور شاہ پسندوں نے ایک نوجوان کو، جس کا نام جل روبلز[1] تھا، اپنا لیڈر بنا لیا۔ وہ سخت فاشسٹ خیالات کا آدمی تھا اور آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر ڈالفس[2] (اس کا ذکر آگے آتا ہے) کا خاص مداح تھا۔

بائیں جانب کے اشتراکیوں میں سے کوئی بھی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کرتا تھا۔ اشتراکی اور زیادہ انقلابی بن گئے۔ اب انھوں نے ہسپانوی مزدوروں کی حمایت و وفاداری حاصل کرنے کے لیے انارکسٹوں سے شدید مقابلہ شروع کر دیا۔ ہڑتالیں پے درپے ہونے لگیں۔ جابجا فسادات ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں اشتراکیوں نے اس بنا پر عام ہڑتال کا اعلان

۱؎ Gil Robles

۲؎ Dollfuss

کردیا کہ ریبلز کے تین حامیوں کو حکومت میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ پہلے کیٹیلونیا نے اپنے صوبے کی مستقل جمہوریت قائم کرلی اور اسے داخلی خود مختاری سے بھی محروم کردیا گیا۔ شمالی جانب آستوریاس[1] کے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے بغاوت کا انتظام کیا۔ انارکسٹ اور اشتراکی دونوں ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ یہ بغاوت فرو کردی گئی، مگر اس میں تین ہزار سے زیادہ جانیں تلف ہوئیں۔ حکومت نے موروں (شمالی افریقہ کے مسلمان) سے ہسپانویوں کے خلاف کام لیا۔ اس پر شدید غم و غصّہ کا اظہار کیا گیا۔ موروں کو نئے وزیرِ جنگ جنرل فرانسسکو فرینکو نے بھیجا تھا۔

یوں عوام نے دائیں بازو کی حمایت چھوڑ دی۔ اب بائیں بازو نے آستوریاس کی بغاوت کے زیرِ اثر اور کومن ٹرن کے خطِّ عمل کی پیروی میں ایک عوامی محاذ فروری ۱۹۳۶ء کے انتخابات کے لیے بنالیا، جس میں تمام عناصر متحد ہوگئے۔ پہلی مرتبہ انارکسٹ اور اشتراکی انقلابی انتخابات میں شامل ہوئے اور انھوں نے اُن امیدواروں کے لیے ووٹ دیئے، جو جمہوریت پسندوں، اشتراکیوں، کمیونسٹوں اور خود انارکسٹوں نے مل کر تجویز کیے تھے۔ چنانچہ بائیں بازو کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ جو لوگ گزشتہ بغاوتوں میں ملوّث تھے، ان سب کے لیے معافی کا وعدہ کرلیا گیا تھا۔ کامیابی کے بعد ان لوگوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کیٹیلونیا کے لیے داخلی خود مختاری بحال کردی۔ زرعی اصلاحات شروع ہوئیں اور پادریوں کے خلاف قوانین منظور کیے گئے۔ ازانیا[2] صدر منتخب ہوا، جو اعتدالی جمہوریت پسند تھا۔

مگر اب بائیں بازو کے لیے اعتدال پسندی خارج از بحث تھی۔ عوامی محاذ صرف انتخابات کی غرض سے قائم ہوا تھا۔ بائیں بازو کے اشتراکیوں کا لیڈر لارگو کیبلیرو[3] تھا، جس نے ازانیا کے کابینہ میں شامل ہونے کے بجائے انقلاب کی صدائیں لگائیں۔ پراودا اخبار نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے نیا لینن قرار دے دیا۔ خود کیبلیرو نے ایسے طریقے اختیار کیے، گویا وہ اختیارات پر قابو پانے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا، لیکن وہ تہدید پر عمل نہ کرسکا، کیونکہ اس کی پشت پر کوئی طاقت نہ تھی۔ بائیں بازو کے انقلابیوں کے لیے حصولِ اقتدار کا راستہ اس وقت کھل سکتا تھا، جب دائیں بازو کی طرف سے کوئی فوجی اقدام ہوتا۔ حکومت اس اقدام کے خلاف لڑنے کے لیے مزدوروں میں ہتھیار بانٹ دیتی اور وہ کامیابی حاصل کرلیتے۔

بائیں بازو میں ہسپانیہ کے اندر سب سے پہلی مرتبہ کمیونسٹ پارٹی خاصی تعداد میں بروئے کار آئی (۱۹۳۶ء)۔ پرایمو ڈی ولیرا کی ڈکٹیٹری میں کمیونسٹ اس درجہ بے حقیقت تھے کہ ان کا اخبار بھی بند کرنے کی زحمت ضروری نہ سمجھی گئی، مگر آستوریاس کی بغاوت اور عوامی محاذ میں شرکت سے انھیں سیاسی قوّت حاصل ہوگئی، اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہ تھی (صرف

---

[1] Asturias

[2] Azanea

[3] Largo Cubarrero

تین ہزار ممبر تھے)۔ عجیب امر یہ ہے کہ وہ فوری مقاصد میں اشتراکیوں سے بھی زیادہ اعتدال پسند تھے، کیونکہ انھیں ضرورت محسوس ہوتی تھی، وہ خاصی لمبی مدّت تک عوامی محاذ کی حمایت کے بغیر اپنی قوت نہیں بڑھا سکیں گے۔

۱۹۳۶ء ہی میں دائیں بازو کے ساتھ پہلی مرتبہ فوجی پارٹی[1] نمودار ہوئی۔ یہ ایک پارٹی تھی، جس کی بنیاد پرائمو ڈی ویلرا کے بیٹے نے ۱۹۳۲ء میں رکھی تھی۔ پارٹی کا بانی اطالوی وضع کے ٹھیٹھ فاشسٹ اصول کا حامی تھا، یعنی تمام طبقوں اور پیشوں کو ایک نصب العین کے لیے ہم آہنگ رکھنا چاہتا تھا، مگر وہ زرعی اصلاحات اور دوسرے اشتراکی پروگراموں کا مخالف نہ تھا۔ اس پارٹی کا نشان تیروں کا ایک مٹھا تھا۔ اس کا نعرہ تھا کہ ہسپانیہ سب سے برتر و بالا ہے اور اس کا پروگرام یہ تھا کہ افریقہ میں قومی مقبوضات کی توسیع کی جائے، پرتگال پر قبضہ کر لیا جائے۔ جنوبی امریکہ میں ایک سلطنت تعمیر کی جائے۔ اس نے نوجوانوں کے گروہ منظم کر لیے اور ایک نجی فوج تیار ہو گئی۔ اگرچہ اس پارٹی کو ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں تھوڑے ووٹ ملے، مگر جل روبلز کے اکثر حامی عوامی محاذ کی کامیابی کے بعد اس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں اس پارٹی نے فوج، شاہ پسندوں، پادریوں اور کارلس کے حامیوں کی امداد سے جوابی انقلاب کے لیے ساز باز کیا۔ ہر شخص کو علم تھا کہ حکومت کے خلاف ایک اقدام ہونے والا ہے۔ جولائی میں یہ اقدام جنرل فرینکو کی فوجی قیادت میں ہوا۔

ہسپانوی خانہ جنگی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء

ہسپانوی خانہ جنگی (۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء) کی بین الاقوامی اہمیت یہ ہے کہ یہ اس کشمکش کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ تھا جس نے ترقی کرتے کرتے دوسری عالمی جنگ کی شکل اختیار کی۔ اس پر ایک آئندہ باب میں بحث ہو گی۔ جرمنی اور اٹلی کی امداد سے فرینکو کی فوجیں کامیابی کی طرف بڑھیں۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے جمہوریت پسندوں کے دو بڑے گڑھ مسخر کر لیے، اوّل میڈرڈ، دوم بارسلونا۔ دوران جنگ میں کمزور جمہوری حکومت کے وظائف مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی مجلسوں نے غصب کر لیے۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں کیبلیروں کے ماتحت عوامی محاذ کی حکومت بنی۔ فرینکو کی فوجوں نے نومبر میں اعلان کر دیا کہ فرینکو مملکت کا رئیس ہے۔ حکومت کے زیر اثر علاقوں میں دہشت کا دور دورہ تھا۔ ابتدا میں انارکسٹوں نے دہشت پھیلائی، مگر انھیں دبا دیا گیا، پھر پولیس نے دہشت پھیلا دی۔ یہ کمیونسٹوں کا کام تھا، جنھوں نے روس کی پشتیبانی سے بائیں بازو کی تمام حریف پارٹیوں کے خلاف بیدردی سے اقدامات کیے۔ فرینکو کی جانب سے بھی دہشت میں کوئی کسر باقی نہ رہی، کیونکہ ہر قسم کے آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، جو کسی نہ کسی صورت میں جمہوریت سے وابستہ تھے۔ فرینکو نے کامیابی حاصل کر لی تو جیل خانے قیدیوں سے بھر دیئے گئے اور جلّاد خاصے مصروف رہے۔

---

[1] Falange

فرینکو کی حکومت اپنے فاشسٹ سروسامان کے ساتھ واحد فاشسٹ حکومت تھی، جو دوسری عالمی جنگ کے بعد باقی رہی۔ خانہ جنگی کے بعد اس حکومت کا انحصار انہی طبقات کی حمایت پر تھا، جو ہسپانوی بادشاہی کے حامی چلے آتے تھے، یعنی بڑے بڑے زمیندار، فوج اور کلیسا۔ شہروں اور دیہات کے غریب یکساں اس کے خلاف تھے، مگر ایک اور خانہ جنگی کے خطرے نے انھیں عملی مخالفت سے روکے رکھا، کیونکہ پہلی خانہ جنگی میں تمام طبقوں کو شدید نقصان پہنچ چکا تھا

اٹھتیسواں باب

پارلیمانی نظام کی ناکامی

ہسپانیہ اور مشرقی یورپ (۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۹ء)

(۲)

مشرقی یورپ مشرقی یورپ کے اندر کسی نہ کسی شکل میں دائیں بازو کی کامیابی کا جزوی سبب یہ ہے کہ کوئی مستحکم پارلیمانی روایت موجود نہ تھی۔ جزوی سبب یہ ہے کہ رنجدہ اقتصادی مسائل کا کوئی حل دریافت نہ کیا جاسکا خصوصاً ۱۹۲۹ء کے بڑے عالمگیر کساد کے بعد۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالشوزم سے سب لوگ ڈرتے تھے اور یہ ڈر حقیقی حدود سے ہمیشہ متجاوز رہا۔ اگرچہ کوئی خاص خطرہ درپیش نہ تھا، مگر حق ناشناس لیڈر اپنے مقاصد کی خاطر اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہے۔ ان تمام عوامل کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان سب کے برابر ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسولینی اور ہٹلر کی کامیابیوں نے سب پر اچھا اثر پیدا کیا تھا۔ کم از کم ۱۹۳۵ء کے بعد دنیا میں ترقی کا راستہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک خاص وردی پہن لی جائے، انتہائی قوم پرستانہ نظریات کا اعلان کر دیا جائے، زور شور سے اپنے دعاوی پیش کیے جائیں، خواہ وہ کچھ ہی ہوں اور ہمسایوں کو اعصابی جنگ میں مبتلا رکھا جائے۔ ہمیشہ دھمکی دی جائے کہ یہ مقاصد بزور شمشیر پورے کیے جائیں گے۔

مگر ڈکٹیٹروں کی پیش کردہ سیاسی مثال ہی نہیں تھی، جس نے مشرقی اور جنوبی ومشرقی یورپ کی ناستوار حکومتوں کو ڈکٹیٹری کی طرف مائل کیا۔ کساد کے بعد جرمنی نے زبردست اقتصادی دباؤ ڈالا، کیونکہ اس کے صنعتی اقتصادیات انھی حکومتوں کے زرعی اقتصادیات پر مبنی تھے۔ یوں جرمنی ان ملکوں، خصوصاً بلقانی حلقے کی خارجہ تجارت میں سب سے اونچی حیثیت حاصل کر گیا۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ یہ عوامل کیونکر کارفرما ہوئے اور اس سلسلے میں تین ملکوں کے حالات پر غور کیا جائے گا، اول آسٹریا، دوم ہنگری، سوم یوگوسلافیا۔ پھر دوسرے مقامات کے حالات سرسری طور پر بیان کیے جائیں گے۔

آسٹریا پہلی عالمی جنگ کے بعد آسٹریا کا جو حصہ محفوظ و مستقل چھوڑ گیا تھا، وہ تقریباً پورے کا پورا جرمنوں

سے معمور تھا ۔ اسی لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً بیس لاکھ سابق شہنشاہی دارالحکومت وی آنا میں رہتے تھے۔ وی آنا مدت سے ایک وسیع اندرونی علاقے کے لیے تجارتی منڈی اور زرعی صوبوں کے لیے مصنوعات کی بہم رسانی کا مرکز تھا۔ اب یہ تمام سابقہ علاقوں سے منقطع ہوگیا اور ان سب نے منتقل حکومتوں کی حیثیت میں محاصل کی دیواریں کھڑی کرلیں ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان آسٹریا کے مالی انتظامات براہ راست جمعیت اقوام کی نگرانی میں رہے۔ جمعیت نے قرضہ دے کر تعمیر نو کا انتظام کیا اور اس طرح اک گونہ بحالی کی صورت پیدا ہوئی، مگر اقتصادی نجات کا صرف ایک راستہ معلوم ہوتا تھا — آسٹریا اور جرمنی کا اتحاد — جمہوریہ آسٹریا کی نمائندہ مجلس نے مارچ ۱۹۱۹ء میں اس کے لیے قرارداد منظور کی، لیکن اتحادیوں نے سیاسی وجوہ کی بنا پر معاہدۂ سان جرمین (ستمبر ۱۹۱۹ء) کے مطابق اس کی ممانعت کردی۔ یہ دو مسئلے، یعنی اقتصادی بقا اور جرمنی سے اتحاد بہت الجھ گئے، کیونکہ خود آسٹریا میں بنیادی سیاسی کشمکش زیادہ شدت اختیار کرچکی تھی۔ سوشل ڈیموکریٹ مسیحی اشتراکیوں کے خلاف تھے۔ سوشل ڈیموکریٹ تدریجی اصلاح کے خواہاں تھے، لیکن مارکس کے پیرو فوری اصلاحات چاہتے تھے اور ان کی پشتیبانی شہری کررہے تھے، خصوصاً وی آنا کے شہری۔ مسیحی اشتراکی قدامت پسند مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دیہاتی علاقوں میں انھیں وسیع حمایت حاصل تھی۔ شہروں کا زیریں طبقۂ اوسط بھی انھیں کے ساتھ تھا اور ان کے لیڈروں میں بہت سے پادری بھی شامل تھے۔

۱۹۲۰ء کے وسط میں دونوں حریف جماعتوں کی تعداد پارلیمنٹ میں تقریباً برابر تھی اور انھوں نے نجی فوجیں منظم کرلیں۔ مسیحی اشتراکیوں کی فوج کا نام "ہوم گارڈ[1]" اور سوشل ڈیموکریٹوں کی فوج کا نام "دفاعی لیگ[2]" تھا۔ جب سوشل ڈیموکریٹوں کی بلدیاتی حکومت نے وی آنا میں مزدوروں کے لیے مکانوں اور امداد کا انتظام کیا تو دونوں حریف جماعتوں میں کشمکش بڑھ گئی۔ مذکورہ بالا اعانتی انتظام کے سلسلے میں دولتمندوں پر ٹیکس لگائے گئے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اٹلی سے معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ مسولینی مسیحی اشتراکیوں کی حمایت کرنے لگا جن کا نقطۂ نگاہ زیادہ سے زیادہ فاشسٹ ہوتا گیا۔ جرمنی میں برونینگ نے کسٹمز کے اتحاد کی جو تجویز پیش کی تھی، وہ ناکام رہی اور وی آنا کے بینک کا دیوالا نکل گیا، اس لیے ۱۹۳۱ء میں کشیدگی بڑھ گئی اور اسی سال ستمبر میں مسیحی اشتراکیوں کی نجی فوج نے فاشسٹوں کی حیثیت میں پہلا فوجی اقدام کیا جو ناکام رہا۔ ۱۹۳۲ء میں کوششیں کی گئیں کہ ڈینیوبی مملکتوں کے اقتصادی تعاون کا ایک منصوبہ بن جائے — یہ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کا بدل تھا اور فرانس اسے پسند کرتا تھا — لیکن یہ کوششیں جرمنوں اور اطالویوں کی مخالفت کے باعث ناکام رہیں۔ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں ہٹلر برسراقتدار آیا تو بہت سے مسیحی اشتراکی کھلم کھلا نازی بن گئے۔

---

[1] Heimwehr

[2] Schutzbund

آسٹریا کا چانسلر انجل برٹ ڈالفس[1] تھا، جو مسیحی اشتراکی تھا، مگر نازیوں کو برابر روکنے میں کوشاں رہا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں اس نے پارلیمانی حکومت بھی معطل کر دی، گویا پارلیمانی جمہوریت ختم ہوگئی۔ سیاسی گروہوں کو ہدایت کر دی کہ وہ وردیاں نہ پہنیں اور نازی شورشیوں کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ جواب میں ہٹلر نے حکم دے دیا کہ جرمن سیاح آسٹریا نہ جائیں، جہاں روپیہ زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ یوں آسٹریویوں کی آمدنی کا سب سے نفع بخش ذریعہ برباد ہوگیا۔ نازیوں کی انگیخت پر بدامنی پیدا ہو رہی تھی، اس لیے ڈالفس نے نازی پارٹی کو خلافِ آئین قرار دے دیا۔ (جون ۱۹۳۳ء)۔ لیکن کشمکش کو ختم کرنے اور ہٹلر کے خلاف سوشل ڈیموکریٹوں سے اتحاد کر لینے کے بجائے ڈالفس نے انھیں بھی سرمشقِ تشدد بنایا۔ اس نے اپنی پارٹی "محاذِ وطن" کے سوا تمام پارٹیوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ "محاذِ وطن" میں نازیوں کے سوا دائیں بازو کی تمام پارٹیاں شامل تھیں۔ ڈالفس نے ساتھ ہی سوشل ڈیموکریٹوں کے صدر دفتر پر چھاپا مارا۔ یوں مزدوروں کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ پھر حکومتِ آسٹریا نے مزدوروں کے نئے مکانوں پر توپوں سے گولے برسائے جن میں سوشل ڈیموکریٹوں کے لیڈر پناہ گزین تھے (فروری ۱۹۳۴ء) سوشل ڈیموکریٹوں کی پارٹی درہم برہم ہوگئی، مگر ڈالفس مزدوروں کی اعانت سے بالکل محروم ہوگیا۔ مزدوروں نے متحد ہوکر حکومت کے خلاف "حزبِ مخالف" بنایا۔ اب ڈالفس ہٹلر کی طرف سے خطرے کی بنا پر اٹلی کو اپنا سہارا سمجھنے لگا۔ وہ خود فاشسٹ ڈکٹیٹر بن گیا۔ (۳۰ اپریل ۱۹۳۴ء) مگر جولائی میں نازیوں نے اسے قتل کر دیا۔ ہٹلر فوجی اقدام کا خواہاں تھا، مگر جنوبی سرحد پر اطالوی فوج کے اجتماع کے باعث ہٹلر کو اعلان کرنا پڑا کہ میرا ارادہ کبھی نہ تھا، فوجی اقدام کروں۔

ڈالفس کے جانشین ششنگ[2] نے وہی مسلک اختیار کیا، مگر مسولینی چاہتا تھا کہ بحیرۂ روم کے حلقے میں اطالوی تصرفات کے لیے ہٹلر کی امداد حاصل کرے، اس وجہ سے ششنگ کی وضعیت میں کمزوری آگئی۔ آسٹری چانسلر نے اب یہ منصوبہ تیار کیا کہ ہیپسبرگ خاندان کی بادشاہی بحال کر دے۔ اس نے فوجی قوت کی عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ فرانس اور روس کے اتحادیوں سے مفاہمت کی کوشش کی، تاکہ وہ اٹلی کی جگہ لے سکیں، مگر وہ جرمن اقدام کے باعث ناکام رہا۔ فروری اور مارچ ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے ششنگ پر دباؤ بڑھانا شروع کیا، چنانچہ اسے برشٹس گاڈن بلایا گیا، جہاں ہٹلر سے مشہور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فیوہرر نے آسٹریا میں نازیوں کے لیے خاص حقوق کا مطالبہ کیا اور وہ حاصل کر لیے۔ جب نازیوں نے بدامنی شروع کر دی تو ششنگ بیچارگی کی حالت میں مزدوروں کی طرف متوجہ ہوا کہ شاید وہ ہاتھ بٹائیں، مگر یہ کوشش بعد از وقت تھی

آخری حرکت، جس کی وجہ سے مسلح جرمنوں نے آسٹریا پر حملہ کیا، یہ تھی کہ ششنگ نے اعلان کر دیا تھا، رائے عامہ کے ذریعے سے آسٹریا کی آزادی کا مسئلہ طے کیا جائے گا۔ ہٹلر فوج لے کر پہنچ گیا۔ اس نے نازی کو چانسلر بنا دیا۔ ششنگ

---

[2] Schuschnigg

[1] Engelbert Dollfuss

کو قید کر دیا گیا۔ نازیوں کا نظام آسٹریا میں بھی رائج ہو گیا۔ "طوفانی فوجیوں" کو اجازت دے دی گئی کہ وہ ویانا کے بوڑھے یہودیوں سے بازاروں کے اطراف صاف کرائیں۔ اس اثناء میں اُن پر گالیوں اور مُکّوں کی بارش جاری رہی۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد پر رائے عامہ لی گئی۔ ۹۹،۷۵ ووٹ حق میں آئے۔ مسولینی کو ۱۹۳۸ء میں سر تسلیم خم کرنا پڑا، حالانکہ ۱۹۳۴ء میں اس نے جرمنی کے اقدام کی مخالفت کی تھی اور آسٹریا، جو ۱۹۳۰ء کے بعد سے برابر فاشسٹ ہوتا جا رہا تھا، نازی جرمنی کا ایک صوبہ بن گیا۔

ہنگری

ہنگری کے اندر دونوں جنگوں کے درمیانی دور میں سب سے اہم سیاسی مسئلہ معاہدات صلح پر نظر ثانی کا تھا، کیونکہ ان معاہدات کی وجہ سے میگیاروں کو ایسے علاقے چھوڑنے پڑے تھے جہاں سلافیوں اور رومانیوں کی اقلیتیں آباد تھیں۔ معاہدۂ ٹریانان[۱] (جون ۱۹۲۰ء) نے ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین آسٹریا کے حوالے کر دیا۔ ٹرانسلوینیا رومانیہ کو مل گیا۔ سلوواکیا چیکوسلوواکیا میں شامل ہو گیا۔ کروشیا، بیزو، وسرے سرب اور کروٹ علاقے یوگوسلافیا کے اجزا بن گئے۔ جو سیاح اس کے بعد بوڈاپسٹ جاتا رہا، وہ ہنگری میں اس بڑے بُت کے نظارے سے ضرور بہرہ اندوز ہوتا تھا، جو ہنگری نے شمال، مشرق، جنوب اور مغرب کی طرف چھنے ہوئے صوبوں کے ماتم میں بنایا تھا۔ ایک وسیع باغ میں بہت بڑا نقشہ پھلواڑیوں کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ جگہ جگہ مختلف رنگوں کے پھول لگا دیئے گئے تھے۔ یہ اس امر کی یاد تازہ کرتے تھے کہ ہنگری سے مختلف علاقے چھینے گئے، مگر میگیار بدستور اُن کے مدّعی ہیں۔ اب قومی اصول یہ بنا لیا گیا۔ "نیم نیم سوہا"[۲] یعنی نہیں، نہیں قطعاً نہیں۔ معاہدات پر نظر ثانی کے حامیوں نے جو پروپیگنڈا شروع کیا تھا، اس نے اُن حلقوں پر خاصا اثر ڈالا، جو ہنگری کے طبقۂ امراء سے ہمدردی رکھتے تھے، خصوصاً انگریزوں کے بالائی طبقے پر اثر خاصا تھا۔ یہ لوگ اپنی سیاسی روایات اور اپنے مہذب میگیار دوستوں (جو گھوڑے کے بالوں کا لباس پہنتے تھے) کی روایات میں کوئی خاص فرق نہیں سمجھتے تھے اور انھیں قطعاً علم نہ تھا کہ ہنگری نے اقلیتوں پر حکمرانی کا کیسا تاریک منظر پیش کیا ہے۔

ہنگری کے عوام معاہدے پر نظر ثانی کو مسئلہ بنانے سے بے پروا تھے حُبّ وطن کے مسائل پر ان کی روش برابر بے اعتنائی کی رہی۔ یہ امر صرف ان کے حکمرانوں یعنی بڑے بڑے جاگیرداروں اور امیروں ہی کو پریشان کرتا تھا۔ یہ غیر حقیقی اور بے سود مسئلہ ۱۹۲۰ء کے بعد ہنگری کی زندگی میں سب سے نمایاں رہا، کیونکہ امراء اور مالکان اراضی نے اپنی مقتدر حیثیت برقرار رکھی تھی۔ ہنگری مشرقی یورپ کے ان چند ملکوں میں سے تھا، جہاں دونوں جنگوں کے درمیان کوئی نمایاں زرعی اصلاح نہ ہوئی، بڑے بڑے جاگیرداروں کی وسیع جاگیریں اور شرفاء کے چھوٹے املاک جس حالت میں تھے ویسے ہی رہے۔ پارلیمانی حکومت کے مہین پردے کے پیچھے ایک مطلق العنان ڈکٹیٹری قدیم حکمران گروہوں کی طرف سے ملک

---

۲ Nem. Nem Soha

۱ Treaty of Trianon

کانظم ونسق چلا رہی تھی۔ نوکر شاہی کا ایک وسیع نظام اس ڈکٹیٹری کا معاون تھا اور یہ سال بہ سال زیادہ سے زیادہ فاشسٹ بنتی گئی۔ جنگ کے بعد فوراً جو مشکلات رونما ہوئیں، ان میں اتحادیوں نے دائیں بازو کے لیے کامیابی کا راستہ ہموار کر دیا، کیونکہ ہنگری کے اعتدال پسندوں کی کوششوں میں ہاتھ نہ بٹایا، جو ایک استوار جمہوری نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ اتحادیوں نے ایک ایسی بالشویک ڈکٹیٹری کو تھوڑی مدت کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی اجازت دے دی، جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اس کمیونسٹ حکومت کے خلاف جو ردِ عمل شروع ہوا، اس میں اعتدال و اصلاح کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی اور ہنگری میں فاشزم کامیاب ہو گیا۔

ہنگری میں اعتدال پسند حکومت کے لیے ایک مختصر سی فرصت (اگر اسے فرصت کہا جا سکے) ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو متارکے سے بارہ روز پیشتر شروع ہوئی، جب کاونٹ میکائیل کارولی[۱] وزیر اعظم بنا۔ اس وقت ہنگری نے آسٹریا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ کارولی نہایت دولتمند امرا میں سے تھا، مگر ساتھ ہی وہ مغربی وضع کی جمہوریت کا حامی تھا۔ وہ برابر اتحادیوں کا حامی رہا اور امریکی صدر ولسن کے افکار سے گہری دلبستگی تھی اگرچہ وہ اشتراکی نہ تھا تاہم اصلاحات کا خواہاں تھا۔ اس نے اپنے خلوص کا اظہار یوں کیا کہ اپنی پچاس ہزار ایکڑ زمین مملکت کے حوالے کر دی، تاکہ وہ کسانوں میں تقسیم کر دی جائے۔ ساتھ ہی زمین کی اصلاح کے لیے ایک قانون بنا دیا۔ اس نے قومی اقلیتوں میں مفاہمت کے لیے ہر ممکن کوشش کی، لیکن یہ گروہ میگیاروں پر اعتماد کے لیے تیار نہ تھے۔ اتحادی فوجوں کے فرانسیسی کمانڈر نے کارولی کی کوئی امداد نہ کی اور مطالبہ کیا کہ ہنگری کی فوجیں سلواکیا سے ہٹالی جائیں۔ کارولی نے مارچ ۱۹۱۹ء میں ٹرانسلوینیا کے چھن جانے پر بطورِ احتجاج استعفا دے دیا۔

بالشویکوں کی سرگرمیوں کی خبریں سن کر قومی جذبات اور بڑھتی ہوئی انتہاپسندی کو مہمیز لگی۔ یہ خبریں ہنگری کے وہ قیدی روس سے لائے تھے، جو جنگ کے بعد رہا ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بائیں بازو کی حکومت میں لینن کے کارندے بیلاکون کا اقتدار بڑھ گیا۔ یہ ہنگری کا ایک یہودی تھا۔ چنانچہ فوراً فرمان جاری ہوئے، جن میں انقلابی طریق پر مختلف ادارے قومی بنا لیے گئے اور سوویٹ جیسا ایک سیاسی نظام قائم ہو گیا، لیکن زرعی اصلاحات میں تاخیر ہوئی، اس لیے کسانوں کی ہمدردیاں زائل ہو گئیں۔ بالشویکوں نے مخالفت پر قابو پانے کے لیے اطراف ملک میں دہشت انگیزی سے کام لیا۔ اگر ہنگری اتنا ہی وسیع ہوتا، جتنا روس تھا یا اتحادیوں کے بڑے حلقۂ کار سے دور ہوتا تو بیلاکون کو تربیت یافتہ آدمیوں کی قلت کی تلافی کا موقع مل جاتا۔ روس میں اس قلت پر قابو پانے کے لیے لینن اور ٹروٹسکی کو بہترین طبعی جوہر بے دریغ صرف کرنے پڑے۔

لیکن اتحادی تلے بیٹھے تھے کہ ہنگری میں کوئی بالشویک حکومت قائم نہ ہونے دیں گے۔ اہلِ رومانیا نے حملہ کیا اور بیلاکن

---

[۱] Micheel Karolyi

کو باہر نکال دیا، چنانچہ ۱۹۱۹ء کے علاوہ ۱۹۲۰ء کے ایک حصے میں بھی وہ ہنگری پر قابض رہے اور جو کچھ لے جا سکتے تھے، اٹھا کر لے گئے۔ اس اثناء میں جوابی انقلابی حکومت قائم ہو چکی تھی، جو امیر البحر ہورتھی[1] کے تابع تھی۔ یہ بھی شرفاء میں سے تھا، مملکت کا نائب اور رئیس اعلیٰ بن گیا (یکم مارچ ۱۹۲۰ء)۔ فرانس ہورتھی کا سرپرست تھا اور یہ حکومت بوڈاپسٹ واپس آ گئی۔ گویا اب ہنگری کی ایک ایسی بادشاہی بن گئی، جس کا بادشاہ کوئی نہ تھا اور ہورتھی امیر البحر ضرور تھا، مگر اس کا بیڑا کوئی نہ تھا۔ ہیپسبرگ بادشاہ چارلس نے ہنگری کا تخت حاصل کرنے کے لیے دو کوششیں کیں، مگر وہ ناکام رہیں، کیونکہ ہمسایہ مملکتوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی۔ اہل ہنگری میں انقلاب کے خلاف جو ردّ عمل ہوا، اس سے بھی مخالفوں کے لیے سخت دہشت کا دور پیدا ہو گیا، جس کا رُخ زیادہ تر یہودیوں، میگیار مزدوروں اور کسانوں کے خلاف تھا۔

دس سال (۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء) تک کاؤنٹ بیتھلن وزیر اعظم رہا۔ گویا ملک کا حقیقی اقتدار اسی کے قبضے میں تھا۔ اس نے سارا کاروبار اس طرح چلایا، گویا ۱۹۱۴ء سے کوئی بھی چیز نہیں بدلی تھی۔ کسانوں کو حق رائے سے محروم کر دیا گیا، جیسے وہ ہمیشہ محروم رہے۔ سوشل ڈیموکریٹوں کو برداشت کر لیا گیا۔ جمعیت اقوام نے قرض اور تعمیر نو کے منصوبے (۱۹۲۳ء۔ ۱۹۲۶ء) کے ذریعے سے اقتصادی بحالی کے لیے امداد دی۔ پھر ۱۹۲۷ء میں اٹلی کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا، جس کی بنا پر ہنگری اور مسولینی میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ کساد اور ۱۹۳۱ء کے مالی بحران نے بیتھلن کو وزارت سے باہر نکال دیا۔ اس کی جگہ گومبوس[2] برسر اقتدار آیا، جو زبردست قوم پرست اور فاشسٹ خیالات کا آدمی تھا۔ وہ جرمنی اور اٹلی دونوں کا حامی تھا اور اس نے نازیوں جیسی تنظیم وہاں قائم ہونے کی اجازت دے دی۔ ان انجمنوں میں سے ایرو کراس[3] سب سے زبردست تھی۔ یہ دوسری عالمی جنگ کے تقریباً خاتمے تک برسر کار نہ آسکی، کیونکہ ہٹلر کو ہنگری سے جو کچھ لینا تھا، وہ اس انجمن کی امداد کے بغیر ہی لے چکا تھا۔

۱۹۳۰ء میں گومبوس فوت ہوا تو اس کے جانشین بھی ویسے ہی تھے۔ اطالویوں نے اہل ہنگری کے لیے ہتھیار بہم پہنچائے۔ ہٹلر نے معاہدوں پر نظر ثانی کے سلسلے میں ان کی حمایت کی جس طرح وہ جرمنوں کے سلسلے میں معاہدوں پر نظر ثانی کا حامی تھا۔ جب آسٹریا ہٹلر کے قبضے میں آ گیا اور مارچ ۱۹۳۹ء میں اس نے چیکوسلواکیا کو درہم برہم کر دیا تو ہنگری اس کے زیر اثر آ گیا۔ اہل ہنگری نے چیکوسلواکیا کا انتہائی مشرقی حصہ یعنی روتھینیا، نیز سلوواکیا کا ایک حصہ لے لیا۔ معاہدوں پر نظر ثانی کے سلسلے میں ہنگری نے ہٹلر کی پیروی کی، کیونکہ اسی کی وجہ سے نقشے از سر نو بن سکتے تھے۔ غرض جنگ شروع ہونے سے پہلے ہنگری جمعیت اقوام چھوڑ چکا تھا اور نازیوں کے انداز میں یہودیوں کے خلاف قوانین بنا چکا تھا، مگر ہٹلر کو رومانیا کی بھی ضرورت

۱؎ Horthy　　۲؎ Gombos　　۳؎ Arro Cross

تھی، لہٰذا وہ میگیاروں کو پورا ٹرنسلوینیا دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اہلِ ہنگری نے معاہدوں پر نظرِ ثانی کے سلسلے میں دونوں جنگوں کے درمیان جو پالیسی اختیار کی، اس کی قیمت یہ ادا کرنی پڑی کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ہنگری میں جو حکومت قائم ہوئی وہ سوویٹ روس کے زیرِ اقتدار تھی۔

یوگوسلافیا

سربوں، کروٹوں اور سلووِنوں کی نئی بادشاہی کا اعلان دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ یوں پہلی مرتبہ جنوبی سلاف، جو آسٹریا ہنگری کی رعایا تھے اور سردیا کی آزاد بادشاہی کے سلاف اکٹھے ہوئے۔ یہ مملکت علاقائی نقطۂ نگاہ سے بڑی حد تک مطمئن تھی۔ گویا یہاں معاہدے پر نظرِ ثانی کا کوئی سوال نہ تھا۔ تاہم اس کے سامنے حکومت کا ایک ایسا نظام پیدا کرنے کا نازک مسئلہ تھا، جو تمام قومی گروہوں کی آرزؤں کے لیے تسلی بخش ہو۔ اسی مسئلے پر جمہوریت ناکام رہی اور ڈکٹیٹری قائم ہو گئی۔ یہ ڈکٹیٹری فاشسٹ نمونے کی نہ تھی، لیکن جب جرمنی کی قوت بڑھی تو ملک کے اہم سیاست دانوں کو یقین ہو گیا کہ مستقبل ہٹلر کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ اُن کے رجحانات بھی اسی کے مطابق ہو گئے۔ آبادی میں سے عوام زیادہ تر کسان تھے۔ وہ آزادی کے شیدائی تھے، اگرچہ انھیں مغرب کے پارلیمانی طور طریقوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ جب موقع پاتے رہے، فاشزم کی مخالفت کرتے رہے اور اُن سیاست دانوں کو باہر نکالتے گئے، جو فاشزم سے اتحاد چاہتے تھے۔

اہلِ سردیا کے سیاسی عزائم نے جنگ شروع کرائی تھی۔ اُن کی تعداد کروٹوں اور سلووِنوں کی مشترکہ تعداد سے زیادہ تھی، یعنی ۱۹۳۱ء میں تقریباً ساٹھ لاکھ سرب تھے، ساڑھے تینتیس لاکھ کروٹ اور تقریباً دس لاکھ سلووِن۔ بہت سے سربیوں کا احساس یہ تھا کہ ہماری نئی بادشاہی کا نام کلاں تر سردیا ہونا چاہیے، جس کے خواب وہ مدت سے دیکھ رہے تھے اور جس پر سربی بادشاہ سردیا کے دارالحکومت بلغراد سے حکومت کرتا تھا۔ ان کا مذہب آرتھوڈکس تھا اور وہ سریلی ابجد[1] استعمال کرتے تھے۔ وہ خاصی مدت تک عثمانیوں کے زیرِ اقتدار رہے۔ پھر اس سے آزاد ہو گئے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ کروٹ ہیبسبرگوں کی بے ہمت رعایا ہیں اور انھیں اپنی خوش نصیبی پر ناز کرنا چاہیے کہ ہماری سلطنت میں شامل ہونے کا موقع مل گیا۔ کروٹوں کا مذہب رومن کیتھولک تھا اور ان میں لاطینی ابجد مروج تھی۔ وہ صدیوں تک جرمنوں اور میگیاروں کا مقابلہ کرتے رہے تھے اور اکثر کروٹوں کا احساس تھا کہ سرب اکھڑ مشرقی ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ نئی سلطنت میں ہمیں داخلی خود مختاری دے دیں۔ گویا یوگوسلافیا میں اختلافی مسئلے نے یہ صورت اختیار کی کہ آیا سربوں کے مقابلے کے مطابق مرکزیت مآب حکومت قائم ہونی چاہیے یا کروٹوں کے مطالبے کے مطابق وفاق قائم ہونا ضروری ہے۔ سلووِنوں کی تعداد کم تھی اور وہ زیادہ صلح جُو تھے۔ اکثر توازن قائم رکھنے کے لیے اپنے ووٹ استعمال کرتے تاکہ سیاسی مشینری چلتی رہے، مگر سربوں نے مطالبہ پیش کر دیا کہ دستوری معاملے میں ان کی رائے

---

[1] وہ ابجد جو پادریوں نے تیار کی تھی، روس، بلغاریا اور مشرقی یورپ میں رائج رہی۔

Cyrillic Alphabet

مانی جائے، اسی وجہ سے ڈکٹیٹرشپ کا دروازہ کھلا۔ کروٹوں کی بڑی تعداد الگ تھلگ ہو گئی۔ ان میں انتہاپسندی نے فروغ پایا۔ دوسری عالمی جنگ میں ملک کے دشمنوں کو فائدہ پہنچانے کے ذمہ دار وہی تھے اور اسی وجہ سے ملک مصائب میں مبتلا ہوا۔

کروٹوں نے اپنے دہقانی لیڈر رادیش[1] کے زیر سرکردگی ۱۹۲۰ء میں دستور ساز مجلس کا مقاطعہ کیا اور سربوں نے ایک ایسا دستور منظور کرا لیا جس کی حیثیت حد درجہ مرکزی تھی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد فریقین مفاہمت سے عموماً انکار کرتے رہے اگرچہ کبھی کبھی ان میں عارضی صلح بھی ہو جاتی تھی۔ مثلاً ۲۶-۱۹۲۵ء میں جو کابینہ بنا، رادیش اس میں شامل ہو گیا تھا۔ جون ۱۹۲۸ء میں سربوں کے ایک مندوب نے رادیش کو پارلیمنٹ کے اندر گولی مار کر ہلاک کر دیا اور بحرانی حالت پیدا ہو گئی۔ شاہ الیگزانڈر نے جنوری ۱۹۲۹ء میں مطلق العنانی کا اعلان کیا تو بحرانی حالت ختم ہوئی۔ الیگزانڈر نے قدیم صوبائی وفاداریوں کو ختم کر کے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ سرویا یا کروشیا کے نام سے کوئی علاقہ باقی نہیں رہے گا۔ ملک کے لیے نئے انتظامی حلقے قائم کیے جائیں گے، جن کے نام ان میں سے بہنے والے بڑے دریاؤں کے نام پر رکھے جائیں گے۔ پورے ملک کا نام یوگوسلافیا قرار پایا جس میں کروٹوں اور سربوں کا کوئی نشان نہ تھا۔ لیکن حکومت بہرحال سربی تھی اور کروٹ اس حقیقت کو بھول نہیں سکتے تھے۔ انتخابات حکومت نے خود کرائے اور تمام سیاسی پارٹیاں توڑ دیں۔ کروٹ لیڈروں نے خاصا وقت جیلوں میں گزارا اور بلقان کے اکثر جیلوں کی طرح یوگوسلافیا کے جیلوں میں بھی حد درجہ تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ الیگزانڈر نے مطلق العنانی کے دور میں کوئی نسلی قانون منظور نہ کیا۔ کسی سیاسی پارٹی کو پورے اختیارات نہ دیے، نہ کوئی فریق رنگین قمیصیں پہن سکتا تھا، نہ خاص ترانے گا سکتا تھا، غرض فاشسٹوں کے خاص طور طریقوں میں سے کسی کی بھی اجازت نہ دی گئی، مگر نظام حکومت واضح طور پر مطلق العنان اور غیر جمہوری تھا۔

ایک نتیجہ یہ نکلا کہ انتہاپسند کروٹ زیادہ قوت پکڑ گئے۔ وہ ہیبسبرگوں کے زمانے میں اپنے لیے الگ ملک کے خواستگار تھے۔ اب انھوں نے اپنے پروگرام میں دہشت انگیزی کو بھی شامل کر لیا۔ یوگوسلافیا کے بیرونی دشمن — اٹلی اور ہنگری — ان کی حمایت کر رہے تھے۔ انتہاپسند کروٹوں کو "استاشی[2]" (باغی) کہتے تھے اور ان کے لیڈر آنتی پاویلچ[3] کو مسولینی کی طرف سے مالی امداد مل رہی تھی۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں شاہ الیگزانڈر بہ مقام مارسائی (فرانس) مارا گیا۔ پاویلچ بھی اس کے قتل کی سازش میں شریک تھا۔ پھر شہزادہ پال (الیگزانڈر کا چچیرا بھائی) نائب السلطنت بنا۔ ڈکٹیٹری بدستور جاری رہی۔ جب بلقان میں جرمنوں کی اقتصادی قوت بڑھ گئی تو ممتاز سیاستدان جرمنی کے شیدائی بن گئے اور ایسی کوششیں بھی کی گئیں کہ یوگوسلافیا کی پالیسی محوری پالیسی کے عین مطابق ہو جائے، لیکن عوام کی طرف سے ان کوششوں کی سخت مخالفت ہوئی اور وہ کبھی آگے

---

۱ Radich

۲ Ustashi

۳ Ante Pavelich

نہ بڑھ سکی۔ ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں، جب یورپ کے اندر جنگ شروع ہونے والی تھی اکروٹوں کے ساتھ سمجھوتا ہو گیا اور کروشیا قائم کر دیا گیا، جو داخلی اعتبار سے خود مختار تھا، مگر اُس وقت کوئی خاص نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا، کیونکہ کروٹ اپنے صوبائی حدود کے متعلق غیر مطمئن تھے۔

۱۹۴۱ء میں یوگوسلافیوں نے جرمنوں کے حملے کا سخت مقابلہ کیا۔ افسوس کہ ان کے پاس ہٹلر کی فوجوں کو پیچھے ہٹا دینے کے لیے عسکری قوت موجود نہ تھی۔ جب جرمنوں اور اطالویوں نے ملک کو فتح کر کے اس کے ٹکڑے کیے تو کروشیا انتہا پسند کروٹ پاویلیچ کے حوالے کر دیا گیا، جو باغیوں کا سردار تھا۔ اس نے سربوں اور یہودیوں کے قتل عام کا سلسلہ بڑے خوفناک طریق پر جاری رکھا۔ جو بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے پاویلیچ کی فوجوں کے ہاتھ سے مارے گئے یا گوناگوں مصائب میں مبتلا ہوئے، انھیں یہ دکھ تھا کہ خود اُن کے کوتاہ اندیش سیاستدان کروٹوں کی داخلی خود مختاری کا مسئلہ حل نہ کر سکے اور یوگوسلافیا پُرامن نہ رہ سکا۔ اس وجہ سے انتہا پسندوں کو دہشت انگیزی کا موقع ملا۔

پولینڈ جن واقعات پر ہم غور کرتے رہے ہیں، وہ تفصیلات میں یگانہ حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی مشرقی یورپ میں اس قسم کے نشو و ارتقاء کی دلچسپ مثالیں مہیا کرتے ہیں۔ پولینڈ میں پلسڈسکی نے جمہوری حکومت کے خلاف فوجی اقدام کیا (۱۹۲۶ء) اور فوجی ڈکٹیٹری قائم کر دی، جو زیادہ سے زیادہ مطلق العنان بنتی رہی، خصوصاً کساد کے بعد۔ یہ فوجی اقدام زیادہ تر اس وجہ سے ممکن ہوا کہ لتھوانیوں اور دوسری اقلیتوں کو حکومت نے مراعات نہیں دی تھیں اور جو اقتصادی مسائل دورانِ جنگ یا دورانِ تصرف میں پیدا ہوئے تھے، ان کا کوئی حل تجویز نہ کیا گیا۔ جب جرمنی نے معاہدۂ تجارت توڑ دیا اور پولستان کی صنعت زغال میں بحرانی حالت پیدا ہوئی تو کشیدگی بہت بڑھ گئی۔ سیاسی پارٹیوں کے درمیان سخت نفرت پھیلی ہوئی تھی، اس وجہ سے پلسڈسکی کا کام بہت سہل ہو گیا۔ اس نے اقتدار حاصل کر لینے کے بعد بڑے بڑے مالکانِ اراضی اور صنعت کاروں کی طرف توجہ کی۔ اُن کی امداد، نیز ایک فوجی طبقے کی امداد کے بل پر اپنی حکومت مستحکم کر لی۔

رومانیا رومانیا میں سیاسی زندگی سخت خرابیوں کا شکار تھی۔ یہ عثمانیوں کے دور اور فری یونانیوں کی حکمرانی کی میراث تھی۔ اس وجہ سے پہلے پارلیمانی نظام معرضِ اختلال میں پڑا، کیونکہ برسرِ اقتدار پارٹی شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر انتخابات مرضی کے مطابق کراتی رہی۔ پھر سامیوں کے خلاف وسیع جوش پھیل گیا۔ رومانیا کی نازی پارٹی نے، جس کا نام "فولادی گارڈ"[1] تھا، اسی کو اپنا خاص پروگرام بنا لیا۔ یہ گارڈ ہنگری کی ایرو کراس سے مختلف نہ تھی۔ یونیورسٹی کے طلبہ اور بے روزگار اہلِ علم میں اسے بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ آخر میں کسان بھی اس کے شیدائی بن گئے۔ یہ لوگ سبز پوش

---

[1] Iron Guard

تھے۔ اپنی گردنوں میں جو تھیلے لٹکائے پھرتے تھے، ان میں رومانیا کی مٹی بھری ہوئی تھی۔ صدی کے تیسرے عشرے کے اوائل میں اعتدال پسند سیاست دانوں کے قتل سے ان کے پروگرام کی ابتدا ہوئی۔ پھر عالمگیر زرعی کساد شروع ہوا تو کسانوں کی بدحالی اور اقتصادی پریشانیوں کے باعث "فولادی گارڈ" اور دوسرے فاشسٹ گروہوں کو تقویت پہنچی۔ گارڈ کا اقدام روکنے کے لیے رومانیا کے بادشاہ کیرول[1] نے ۱۹۳۸ء میں اپنی ڈکٹیٹری قائم کر دی۔ گارڈ کے لیڈر بھاگتے ہوئے مارے گئے، تاہم رومانیا جرمنوں کے دباؤ سے بچ نہ سکا جب ہٹلر نے منظور کر لیا کہ روس بیسربیا اور شمالی بکووینا پر قبضہ کر لے اور شمالی ٹرانسلوینیا ہنگری کو دے دیا گیا (اگست ۱۹۴۰ء) تو کیرول ملک چھوڑ دینے پر مجبور ہو گیا اور ہٹلر کے پٹھو مارشل انٹونیسکو[2] نے "فولادی گارڈ" کی مدد سے نظامِ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ رومانیا کی سیاسیات میں امید کا صرف ایک سرچشمہ تھا اور وہ کسان پارٹی کا اصلاح پسند لیڈر مانیو[3] تھا، مگر اس نے دوسرے عشرے کے آخر میں اپنے حامیوں کو مایوس کر دیا، کیونکہ برسرِ اقتدار ہونے کے باوجود کسانوں کے لیے کچھ نہ کر سکا، حالانکہ اپنے آپ کو ان کا نمائندہ کہتا تھا۔

بلغاریا

بلغاریا ہمیشہ سے روس کا حامی رہا۔ دونوں عالمی جنگوں کے درمیان یہ خطرہ موجود تھا کہ وہاں کمیونزم آ جائے گا چنانچہ یہ امر مطلق العنانی کے خواہشمندوں کے لیے ایک جائز سبب بنا رہا۔ نیز ہنگری کی طرح بلغاریا بھی صلح کے معاہدوں پر نظرِ ثانی چاہتا تھا، کیونکہ وہ مقدونیہ کا علاقہ نہ لے سکا، جو صلح میں یونان اور یوگوسلافیا کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے نازک صورت اختیار کر گیا کہ بلغاریا میں ہزاروں مقدونوی پناہ گزین تھے، جو دہشت پسند انقلابی انجمنوں میں شمول کا رجحان رکھتے تھے۔ بلغاریا ایک ایسا ملک ہے، جہاں اقلیت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ نہ بڑے بڑے زمیندار ہیں، نہ امراء اور نہ بڑی بڑی صنعتیں ہیں۔ بایں ہمہ وہاں سیاسی تفرقے ان ملکوں سے بھی زیادہ شدت اختیار کر گئے، جہاں اقتصادی نامساوات موجود تھی۔ اس کی سیاسی زندگی میں غیر معمولی تیزی و تندی ہمیشہ نمایاں رہی۔ تیسرے عشرے کے اوائل میں ایک غیر معمولی سیاسی لیڈر بروئے کار آیا، جو زرعی اصلاحات کا حامی تھا۔ سٹیمبولسکی[4] ــــ جو کسانوں کی جمہوریت پر پختہ اعتقاد رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ بلغاریا اور یوگوسلافیا کے تعلقات اچھے رہیں۔ اس زمانے (۱۹۲۰ء ــ ۱۹۲۳ء) میں ملک کو عوامی حکومت کا اچھا موقع مل گیا، لیکن اس نے بھی مقدونوی دہشت پسندوں اور کمیونسٹوں کو روکنے کی کوشش کی تو اخباروں پر بھی پابندیاں لگائیں اور فکری آزادی میں بھی مداخلت کی۔ بڑی بڑی آمدنیوں پر ٹیکس لگانے کے باعث سرمایہ دار اس سے الگ ہو گئے۔ اور یوگوسلافیا سے صلح پسندی کے باعث فوج خفا ہو گئی۔

۱۹۲۳ء میں سٹیمبولسکی کو ہٹانے کے لیے ایک کامیاب سازش کی گئی۔ پھر وہ مارا گیا اور ملک میں ایک زبردست

۱؎ Cardol
۲؎ Antonescu
۳؎ Maniu
۴؎ Stambolusky

مطلق العنان حکومت قائم ہوگئی۔ اس وقت سے کمیونسٹوں کی سازشوں، مقدونوی دہشت پسندوں کے ہنگاموں اور بم پھٹنے کے واقعات سے ملک بدامنی کا شکار رہا۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد بادشاہ بورس کی شادی اٹلی میں ہوگئی اور مسولینی سے تعلقات کی صورت پیدا ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں ایک فوجی اقدام نے فوجی افسروں کے ایک گروہ کو اقتدار کا حامل بنا دیا۔ انھوں نے سیاسی پارٹیاں توڑ دیں اور اپنی ڈکٹیٹری کے لیے کوشاں رہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں شاہ بورس نے انھیں ختم کر دیا اور یوگوسلافیا کے بادشاہ الیگزانڈر، نیز رومانیا کے بادشاہ کیرول کی طرح اپنی ڈکٹیٹری قائم کرلی، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران میں بورس کی پراسرار موت تک قائم رہی۔

یونان

یونان میں دونوں عالمی جنگوں کے درمیان اصل مسئلہ یہ تھا کہ ملک میں جمہوریت قائم ہو یا بادشاہی اقتصادی مشکلات پر کیونکر قابو پایا جائے، جو ترکی سے ساڑھے بارہ لاکھ یونانیوں کے مبادلے کے باعث پیدا ہوگئی تھیں۔ آئینی مسئلے کے متعلق آبادی مذبذب رہی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں بادشاہی کے لیے ووٹ دیے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کے لیے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں پھر بادشاہی کے لیے ووٹ دیے۔ ہر مرتبہ بھاری اکثریت یا تو بادشاہی کے حق میں رہی یا جمہوریت کے حق میں۔ اقتصادی خلل کے باعث پناہ گزینوں اور مزدوروں میں کمیونزم کو تقویت پہنچی۔ یونان ہنگامہ آرائی کے لیے خاص شہرت کا حامل ہے۔ اس وجہ سے پارلیمانی حکومت کا باقاعدہ اجراء ناممکن رہا۔ دونوں جنگوں کے درمیانی دور میں جرنیلوں نے بار بار فوجی اقدام کیے۔ ان میں سے بعض جمہوریت پسند تھے، بعض شاہ پسند۔ سب کا رجحان کم و بیش مطلق العنانی کی طرف تھا، لیکن ان میں سے اکثر بے اثر ثابت ہوئے اور خصوصیت سے خونریز کوئی نہ تھا۔ ان میں سے آخری جرنیل جان میٹکساس[1] زیادہ فاشسٹ تھا۔ وہ اگست سنہ ۱۹۳۶ء میں ڈکٹیٹر بنا۔ اس نے سیاسی پارٹیاں توڑ دیں۔ احتساب قائم کر دیا۔ مخالفوں پر سختیاں کیں۔ امورِ عامہ کا ایک پروگرام شروع کیا اور باقی امور میں نازیوں کی پیروی کرتا رہا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں اٹلی نے البانیہ پر حملہ کیا تو میٹکساس نے مزاحمت کا حکم دیا۔ یہاں سے دوسری عالمی جنگ میں یونان کی بہادرانہ مزاحمت کا آغاز ہوا۔

فاشزم پر تبصرہ

مشرقی یورپ کی ان حکومتوں میں سے کوئی بھی حقیقی معنی میں فاشسٹ نہ تھی۔ اٹلی اور جرمنی کی حکومتیں کم از کم ابتدا میں خاصی عوامی حمایت پر مبنی تھیں، اگرچہ آگے چل کر یہ حمایت مصنوعی طریقوں سے کام لے کر قائم رکھی گئی۔ اس کے برعکس مشرقی یورپ کی ڈکٹیٹریاں، پولیس، نوکرشاہی اور فوج پر مبنی تھیں، نہ کہ عام کسانوں کی حمایت پر۔ مشرقی یورپ کے ہر سیاستدان کے لیے، خواہ اس کا تعلق کسی پارٹی سے ہوتا، انتخاب کے موقع پر رشوت دینا، ڈرانا دھمکانا اور فضول وعدے کر لینا، جنھیں پورا کرنے کا کوئی خیال نہ ہو، بالکل معمولی چیز تھا۔ بعض مغربی آزاد خیالوں نے کسانوں کی پارٹیوں کو امیدگاہ بنایا تھا، جیسے رادیش، مانیو اور اسٹیمبولسکی کی پارٹیاں، تو یہ امید سراب ثابت ہوئی، یا تو اس لیے کہ کسان لیڈروں نے

---

[1] Metaxas

اپنی پارٹیوں کو طبقۂ اوسط کے شہریوں کے حوالے کر دیا، جیسے راڈیش اور مانیو نے کیا یا دائیں بازو نے ان کی پارٹیاں تباہ کر ڈالیں، جیسے بلغاریا اور پولینڈ میں ہوا۔

یوں دائیں بازو کی خلافِ جمہوریت حکومتیں یورپ کے اندر اس دور میں پرورش پاتی رہیں، جو دونوں جنگوں کے درمیان تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتدال پسند پارلیمانی حکومتوں کے لیے کیا کیا مشکلات ہیں، جو پارلیمانی روایات سے محروم ہیں مطلب یہ نہیں کہ مغربی آزاد خیالی کی روایت برآمد نہیں کی جا سکتی، صرف اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ کوئی آزاد خیال کاغذی دستور اور آزاد خیال حق رائے اس امر کی ضمانت نہیں کہ مغربی اصول پر قائم شدہ حکومت استوار ہو گی۔ پہلی جنگ کے بعد کی اقتصادی بدحالی ختم ہوئی ہی تھی کہ کساد شروع ہو گیا۔ لوگ انتہا پسندی کی طرف مائل ہو گئے، خواہ وہ دایاں بازو تھا یا بایاں بازو۔ کمیونزم کے خوف اور دائیں بازو کے دلآویز قوم پرستانہ پروپیگنڈے نے اٹلی اور جرمنی میں فاشسٹوں کو کامیاب کیا۔ پھر ہر جگہ دایاں بازو کامیاب ہوا اور نئی عالمی جنگ ناگزیر ہو گئی۔

سواحلِ اوقیانوس کی جھڑپیں

(بیس سال کی صُلح کے دوران میں)

انہتروال باب

برطانیۂ عظمیٰ

(۱)

تمہید دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی دور میں سیاسیات کی بنیادی حقیقت ــــ یا ستم ظریفی ــــ یہ ہے کہ دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ کر دینا منظور تھا، مگر جو انتظامات کیے گئے، ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا جمہوریت کے لیے حد درجہ مصیبت خیز اور خطرناک بن گئی۔ جو لوگ خیالی دنیا میں رہتے تھے، مثلاً صدر ولسن، انھیں امید تھی کہ رومانوف، ہیبسبرگ اور ہوہینزولرن کی پرانی بادشاہیاں ختم ہو چکی ہیں اور اب خود بخود جمہوری حکومتوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہو جائے گا، لیکن ہم گزشتہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں کہ یورپ کا بیشتر حصہ یا تو ایک پارٹی کی مطلق العنان فرمانروائی میں چلا گیا یا جزوی طور پر ایسی اقتدار پسند حکومتیں برسرکار آئیں، جو آزاد جمہوریتوں کی دشمن تھیں۔ اٹلی بھی فاشسٹ بن گیا۔ حالانکہ معلوم ہو رہا تھا، وہاں برطانیہ کی طرح دستوری بادشاہی جمہوریت کو نشوونما دے رہی ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں صرف شمالی اوقیانوس کے سواحل کی قومیں اصلاً جمہوری رہ گئیں، یعنی برطانیہ، فرانس اور جمہوریۂ امریکہ۔

کمیونزم اور فاشزم کے ظہور ہی نے ان تین بڑی جمہوریتوں کے لیے بین الاقوامی روابط میں نازک مسائل پیدا کر دیے۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں بعض اوقات امید پیدا ہوتی رہی کہ یہ جمہوریتیں تمام مسائل پر قابو پالیں گی اور دنیا کو امن پسندی کی عادات پر واپس لے آئیں گی، لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد دنیا میں ایک کساد پیدا ہوا، جو ہر ملک پر چھا گیا۔ ساتھ ہی ہٹلر برسر اقتدار آ گیا۔ فاشسٹ ملکوں نے جارحانہ اقدامات کیے۔ جاپان نے مشرقِ بعید میں توسیع شروع کر دی۔ اس طرح بین الاقوامی فضا تیزی سے تاریک ہو گئی۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ء میں شروع ہو گئی۔ اس وقت واضح ہوا کہ ۱۹۱۹ء سے بیس سال تک جو امن قائم رہا، وہ زیادہ سے زیادہ متارکہ تھا، ایسا متارکہ جسے بین الاقوامی فتنہ انگیز بار بار توڑنے کی کوشش کرتے رہے۔

یقیناً دوسری عالمی جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری بڑی حد تک مطلق العنان جابروں پر ہے، مگر بیس سال کے متارکے میں حالات کو بگاڑنے کا ایک خاصا بڑا عامل یہ بھی تھا کہ امن پسند جمہوریتیں خود نسبتہً کمزور رہیں۔ صدی کے تیسرے عشرے میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ ایک مہلک داخلی مسائل میں منہمک ہو گئے۔ چوتھے عشرے کے اوائل میں کساد کے پیدا کردہ

بُحران کے باعث یہ انہماک اور بڑھ گیا۔ یہی وقت تھا، جب بین الاقوامی مسائل بھی اتنی ہی توجہ کے محتاج تھے۔ کساد کے باعث بین الاقوامی تجارت گھٹ رہی تھی۔ محاصل کی دیواریں اونچی اٹھ رہی تھیں۔ صلح کے امکانات رفتہ رفتہ کم ہو رہے تھے۔ جمہوریت کے دشمن تلواریں محض جھنجھنا ہی نہیں رہے تھے، بلکہ عَلَم بھی کر رہے تھے۔ جمہوریتوں کے سامنے دونوں قسم کے مسئلے یکساں اہم تھے۔ انھوں نے پہلے داخلی مسئلے پر توجہ کی۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ بین الاقوامی وضعیت تیزی سے جنگ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ دونوں قسم (داخلی اور خارجی) کے مسائل کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بے شمار طریقوں پر ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ ہم موجودہ جائزے میں ان وابستگیوں کے بعض پہلو اسی طرح نمایاں کریں گے، جس طرح کمیونسٹ اور فاشسٹ ملکوں کے داخلی اور خارجی طور طریقوں کے روابط واضح کر چکے ہیں۔ مگر بعض بڑے مسائل کو نمایاں کرنے کے لیے ہم قومی مسائل اور بین الاقوامی مسائل کو بعض اوقات الگ الگ کر لیں گے، تاکہ حقیقی زندگی کی پیچیدگیاں سادہ صورت میں سامنے آ جائیں۔ بسواحل اوقیانوس کی جمہوریتوں کو بست سالہ متارکے میں جو حالات پیش آئے، ان کے متعلق ہمارا جائزہ ہر جمہوریت کے اہم داخلی مسائل سے شروع ہوگا۔ ہمارے بیان کی ابتدا برطانیہ سے ہوتی ہے۔

برطانیہ اور مابعد جنگ کا کساد

برطانیہ کو پہلی عالمی جنگ میں براہ راست کوئی بڑا مادی نقصان نہ اٹھانا پڑا، البتہ جرمنوں نے زیپلن طیاروں کے ذریعے سے بم باری کی یا ساحلی علاقوں پر گولے برسائے گئے، لیکن برطانوی فوج کے ساڑھے سات لاکھ آدمی مارے گئے اور پندرہ لاکھ کے قریب زخمی ہوئے۔ سلطنت اور دولت مشترکہ کے مجموعی نقصانات تقریباً دس لاکھ مقتولین اور بیس لاکھ سے زیادہ مجروحین تھے۔ لیکن برطانیہ کے اقتصادی نقصانات بہت زیادہ تھے۔ کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس تباہ کن جنگ پر کس قدر روپیہ خرچ ہوا اور اگر یہی دولت اور قوت، دوسری صنعتوں میں صرف ہوتی تو نتیجہ کیا نکلتا۔

جنگ کے بعد قومی قرضہ ۱۹۱۴ء کے قرضے سے دس گنا ہو گیا۔ انگریزوں نے بیرونی ملکوں میں جو سرمایہ لگا رکھا تھا، اس کے منافع عہدِ وکٹوریہ کی خوشحالی کا خاص جزو تھے۔ وہ سرمایہ ختم ہو گیا۔ برطانیہ کے عظیم الشان تجارتی بیڑے سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ برطانوی حسابات کے توازن اور درآمد کے مصارف ادا کرنے کا اہم ذریعہ تھی۔ دشمن نے اس بیڑے کو نقصان پہنچایا۔ وہ ڈھانچا ہی ہزار ہنگاموں سے ماؤف ہو گیا، جس پر برطانیہ کی بین الاقوامی تجارت موقوف تھی۔ دنیا کے حالات افراتفری میں تھے، خصوصاً وسطی اور مشرقی یورپ میں، لہٰذا نقصان کی فوری تلافی ممکن نہ تھی۔ سب سے آخر میں یہ کہ برطانیہ اور فرانس کی جنگی مصنوعات میں اضافے کی غرض سے امریکہ و کینیڈا ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کے کارخانوں سے بھی کام لیا گیا تھا۔ اس طرح اُن کارخانوں کو بڑی تقویت پہنچی اور دورانِ امن میں وہ برطانیہ کے خاصے زبردست حریف بن گئے۔ صدی کے تیسرے عشرے میں فرانس کے نقصان رسیدہ صنعتی کارخانوں کو اعلیٰ پیمانے پر بحال کر دیا گیا۔ جرمنی کے کارخانے بھی بحال ہو رہے تھے اور انھیں امریکہ سے قرضے دیے جا رہے تھے، جس نے بڑی دولت جمع کر لی تھی۔ ان سب نے برطانیہ کا مقابلہ شروع کر دیا۔ جو جنگ سے پیشتر

برطانیہ کے لیے تشویشناک بنا ہوا تھا۔

غرض فاتح برطانیہ کو جنگ کے بعد اس بنیادی اقتصادی مشکل سے نازک تر صورت میں سابقہ پڑا، جس کا تجزیہ ہم اوپر کر آئے ہیں۔ زین وکٹوریہ کے زمانے میں دنیا کی کارگاہ سمجھی جاتی تھی، اب اس کی یہ حیثیت زائل ہو چکی تھی اور لاکھوں کارکنوں کے لیے زین میں مصروف ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مگر یہ مزدور اپنا معیارِ معیشت کم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جنگ سے پیشتر عمرانی تحفظ میں انھوں نے بڑے فائدے حاصل کیے تھے اور جنگ میں وہ اس لیے لڑے تھے کہ انھیں حالات کے بہتر ہو جانے کی امید تھی اور اس کا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء کے متارکے کے بعد جو انتخاب ہوا تھا، اسے عموماً "خاکی انتخاب" کہا جاتا ہے۔ اس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ برطانیہ کو ایسی سرزمین بنا دیا جائے گا، جو بہادروں کے لائق ہو۔ انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ شکست خوردہ دشمن سے جنگ کا پورا خرچ بطور تاوان وصول کیا جائے گا اور برطانیہ کو ترقی کا موقع مل جائے گا۔

یہ امید بہت جلد ناکام ہو گئی۔ تاوان میں کوئی بڑی رقم وصول نہ ہوئی اور ابتدا میں تھوڑے عرصے کی خوشحالی کے بعد جو اس امر کا نتیجہ تھی کہ باہر سے آرڈر ملتوی ہو گئے تھے اور وطن میں نیا کام مل گیا تھا — مشکلات بڑھنے لگیں۔ ۱۹۲۱ء میں بے روزگاروں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اسی سال حکومت برطانیہ کو بڑھتے ہوئے مصارفِ معیشت سے سابقہ پڑا۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو بے روزگاری کے سلسلے میں زیادہ رقمیں دینی پڑیں۔ یہ رقمیں، جنھیں "خیرات" کا ذلت خیز نام دیا گیا، دراصل غریبوں کی امداد کے لیے نہیں دی گئی تھیں، بلکہ روزگار کے بیمے کی پالیسی کا ایک حصہ تھیں اور لائڈ جارج نے جنگ سے پیشتر جو عمرانی قوانین منظور کرائے تھے، ان میں سے ایک روزگار کے بیمے کا قانون بھی تھا۔ بہرحال بے روزگاری وسیع پیمانے پر جاری رہی اور بعض نوجوان مزدور حصولِ معاش کے درجے تک پہنچ ہی نہ سکے۔ بے روزگاری کے بیمے کے سلسلے میں جو رقمیں دی جا رہی تھیں، وہ محکم بنیادوں پر قائم نہ رہ سکیں اور جو کچھ دیا جاتا رہا، وہ حقیقتاً غریبوں کی امداد ہی کی شکل اختیار کر گیا۔

تیسرے عشرے میں برطانیہ کو ایسی خوشحالی کا کوئی دور نصیب نہ ہوا، جیسی جمہوریہ امریکہ کو نصیب ہو چکی تھی اور اسے "کولج کی خوشحالی" کہا گیا۔ ہمیں مبالغے سے کام نہ لینا چاہیے کہ برطانیہ کا اقتصادی انحطاط مصیبت خیز نہ تھا۔ لندن، مانچسٹر اور لورپول جیسے شہر خالی نہیں ہو گئے تھے، اگرچہ بعض حصوں میں خاصا کساد موجود تھا۔ مثلاً جنوبی ویلز کے جن علاقوں سے کوئلہ نکلتا تھا وہاں انحطاط کا کوئی نشان نمودار نہ ہوا۔ جو صورتِ حال پیش آئی، اسے اضافی انحطاط ہی کہا جا سکتا ہے، یعنی جن اقتصادیات کو تیزی سے ترقی دی گئی تھی، ان کی رفتار مقابلتاً گھٹانی پڑی اور مزدوروں کو بڑھتے ہوئے معیارِ معیشت کا احساس ہوا۔ طبقۂ اوسط حسبِ دستور راحت طلبی کی طرف مائل تھا۔ برطانوی اقتصادیات سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ سب کی روایتی توقعات پوری ہو سکیں۔ پھر یہ بیسویں صدی تھی، جسے اخباروں، سنیماؤں اور ریڈیو کی صدی کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کو علم تھا کہ امریکہ میں موٹریں ہیں، ریڈیو ہیں، اور دوسری بہت سی چیزیں ہیں۔ وہ بھی ان تمام چیزوں کے خواہاں تھے۔

پارچات اور کوئلہ

برطانیہ اُس وقت ان بیماریوں میں مبتلا تھا، جو اقتصادی بڑھاپے میں نمایاں ہوتی ہیں، خصوصاً

اس دور میں، جہاں زبردست بین الاقوامی مقابلہ درپیش ہو۔ امریکی قارئین کو برطانیہ کی بدحالی کا بہتر اندازہ کرنے کے لیے نیوانگلینڈ میں پارچے کی صنعت پر توجہ کرنی چاہیے۔ نیوانگلینڈ کی پارچے کی صنعت انیسویں صدی کے اوائل میں خوب ترقی کر چکی تھی۔ اب اس کے کارکن یونینوں کی شکل میں منظم ہو چکے ہیں اور زیادہ اجرتیں لینے کا پختہ عزم کیے بیٹھے ہیں۔ نیوانگلینڈ کی ریاستیں مدت سے ایسے عمرانی اور سیاسی نشو و ارتقاء میں مصروف ہیں، جس کی وجہ سے وہاں قریب قریب فلاحی مملکت کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کرنے ضروری تھے۔ جنوبی ریاستوں میں یہ صورت حال موجود نہیں۔ پھر نیوانگلینڈ میں نہ خام روئی پیدا ہوتی ہے، نہ اُون، لہٰذا وہاں کی صنعت پارچہ بافی کا بیشتر حصہ جنوب کی طرف منتقل ہو گیا ہے، یعنی بالکل نئے حلقوں میں نئی مشینیں لگ گئی ہیں۔ مزدور زیادہ فرمانبردار ہیں۔ سرکاری اور مقامی ٹیکس نسبتاً کم ہیں۔ اسی طرح انگریزوں کی صنعت پارچہ بافی ہندوستان، امریکہ اور دنیا کے دوسرے بڑے حصوں کے نئے کارخانوں کا مقابلہ نہ کر سکی، خصوصاً ارزاں درجے کے پارچات کی ساخت میں، مگر مقابلہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ نیوانگلینڈ ریاستہائے متحدہ کا ایک حصہ ہے اور اسے ایسی دنیا میں آزاد تجارت کے ایک اہم حلقے کے اندر بازیابی کے پورے حقوق حاصل ہیں، جہاں تجارتی پابندیاں روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ برطانیہ کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں

صنعتِ زغال پہلی عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کی اقتصادی بدحالی کی زیادہ مثبت مثال پیش کرتی ہے۔ برطانیہ میں کوئلہ موجود تھا، لیکن اسے کانوں سے نکالنا مشکل بھی تھا اور اس پر خرچ بھی بہت زیادہ ہوتا تھا، کیونکہ جن کانوں سے کوئلہ آسانی کے ساتھ اور کم خرچ پر نکالا جا سکتا تھا، وہ ختم ہو گئیں۔ اس صنعت کی تنظیم اچھی نہ تھی۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی اور کم حیثیت کانیں نقصان اٹھا رہی تھیں۔ امریکہ اور براعظم یورپ کے دوسرے بہترین معیاروں کے مقابلے میں برطانیہ کی مشینری اور کوئلہ نکالنے کے طریقے پرانے تھے۔ فی کس پیداوار کم تھی۔ سب سے بڑھ کر مصیبت یہ پیش آئی کہ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں پوری صنعتی دنیا کے اندر کوئلے کے بجائے تیل اور پن بجلی میں بے حد ترقی ہو گئی۔ برطانیہ میں پٹرول موجود ہی نہ تھا۔ پن بجلی کی ترقی کے لیے بھی زیادہ امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ صرف کوئلہ باقی رہ گیا تھا، جو برطانیہ کی صنعتی قوت کی تاریخی بنیاد تھا اور اسے کانوں سے نکالنا پڑتا تھا۔ مزدور یونینوں کی شکل میں منظم ہو چکے تھے۔ وہ اپنی اجرتوں میں کوئی تخفیف منظور کرنے کو تیار نہ تھے۔ کارخانوں کے مالک اپنا کاروبار مسلسل نقصان پر جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب لیبر پارٹی کی طرف سے تجاویز پیش ہوئیں کہ دوران جنگ میں صنعتیں قومی بنا دی گئی تھیں، اب انھیں مستقل طور پر قومی رکھا جائے تو حکومت نے یہ تجاویز ٹھکرا دیں۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں ہڑتال ہوئی اور قوم کی توجہ اس نازک مسئلے پر جمی۔ جولائی میں ہڑتال ختم ہوئی، مگر اس شرط پر کہ حکومت بڑھی ہوئی اجرتوں کا خرچ پورا کرنے کے لیے صنعتکاروں کو مالی امداد دینے پر راضی ہو گئی۔

قدامت پسندوں کا پروگرام

متارکے کی بست سالہ مدت میں برطانیہ کے داخلی سیاسیات خاصی واضح طبقاتی بنیاد نظر آتے ہیں۔ قدامت پسندوں اور مزدور پارٹی کے درمیان جو کشمکش شروع ہوئی،

اس میں سب سے پہلے پرانی لبرل پارٹی پر ضرب لگی، جو اس طرح پس گئی کہ دو متصادم گروہوں کے درمیان محض بھوسی رہ گئی۔ قدامت پسندوں نے "خاکی انتخاب" میں بہت نشستیں حاصل کر لیں۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کوالیشن سے الگ ہو جائیں، جس کا رئیس لائڈ جارج لبرل تھا۔ پھر جو انتخابات ہوئے، ان میں قدامت پسند کامیاب ہو گئے اور لبرل دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ لائڈ جارج کے ساتھیوں کا تھا، دوسرا ایسکوئتھ کے ساتھیوں کا۔ ان کی نشستیں بہت کم ہو گئیں۔ مزدوروں نے ایک سو بائیس نشستیں حاصل کر لیں اور پہلی مرتبہ ملک معظم کی حکومت میں حزبِ مخالف بن گئے۔

قدامت پسندوں اور مزدوروں دونوں نے برطانیہ کی بنیادی مشکلات کا اندازہ کر لیا۔ دونوں کو پوری طرح علم ہو چکا تھا کہ بیسویں صدی کے برطانیہ کو زیادہ سے زیادہ سامان باہر بھیجنا چاہیے۔ نیز حمل و نقل، بیمے، بینکنگ اور سیاحی کے ذریعے سے روپیہ پیدا کرنا چاہیے۔ اہلِ برطانیہ کے لیے خوراک اور اس کے کارخانوں کے لیے خام مال حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی، مگر دونوں پارٹیوں میں اس امر پر اتفاق نہ تھا کہ یہ ضروری کام کیونکر انجام دیا جائے۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قدامت پسند چاہتے تھے، نجی صنعت و دولت قائم رہے۔ حکومت اور فنی ماہرین اسے کارآمد بنانے میں مدد دیں، لیکن امریکہ اور دوسرے ملکوں کے بھاری محاصل ان کے سدِّ راہ تھے۔ نیز ساری دنیا کے ملک اقتصادی اعتبار سے کفیل بالذات بننے کے لیے کوشاں تھے۔ جو وسیع علاقہ کمیونسٹ روس کے زیرِ اثر تھا، وہاں تجارتی مشکلات راستہ روکے ہوئے تھیں۔

دنیا کے تجارتی حالات نے زیادہ سے زیادہ قدامت پسندوں کو جوزف چیمبرلین کے پیش کردہ حل کا معتقد بنا دیا، یعنی غیر ملکی اسباب کے مقابلے کے لیے حفاظتی محصول عائد کیے جائیں۔ سلطنت اور دولت مشترکہ کو "سامراجی ترجیح" کے معاہدوں کے ذریعے سے ایک وسیع تجارتی حلقہ بنا لیا جائے، جہاں ہر قسم کا خام مال مہیا ہے۔ ان معاہدوں کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام نو آبادیوں اور ڈومینینوں میں جو خام مال ملتا ہے، اسے ترجیحاً برطانوی منڈیوں میں بھیجا جائے۔ اس کے بدلے میں برطانوی صنعتکار نو آبادیوں اور ڈومینینوں کی منڈیوں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کریں۔ کم از کم بہ اعتبارِ نظریہ یہ منصوبہ کام دے سکتا تھا، کیونکہ صدی کے تیسرے عشرے کی سلطنت اور دولتِ مشترکہ ــــ جس میں ربعِ مسکوں کی زمین اور آبادی کا ایک چوتھائی حصہ آ جاتا تھا ــــ کے طبعی وسائل بہت وسیع تھے اور برطانیہ کی حمایت کے لیے یہ وسائل اُسی طریق پر استعمال ہو سکتے تھے، جس طریق کا برطانیہ عادی تھا۔

لیکن اس میں مشکل یہ پیش آئی کہ سلطنت اور دولت مشترکہ کے اجزائے ترکیبی اپنے لیے کوئی ایسی صورت منظور کرنے کو تیار نہ تھے، جس میں وہ محض خام مال پیدا کرتے رہتے اور برطانیہ مصنوعات، نیز دوسرے ثروت آفریں وسائل کا حامل بنا رہتا۔ جو ڈومینین داخلی اعتبار سے خود مختار تھے، وہ جنگ میں وفاداری سے شریک رہے، مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہ تھے کہ پرانے تجارتی نظریۂ زر کے دور کی نو آبادیوں کی حیثیت اختیار کریں۔ جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا، وہ خود مختار قومیت کی طرف بڑھ رہے تھے اور اس قومیت کے ساتھ وہ اپنی مصنوعات کو ترقی دینے کے خواہشمند تھے۔ ہماری دنیا میں ترقیِ قومیت کا یہی مفہوم ہے۔ یہی کیفیت اس حصے کی تھی، جو بالقوہ سلطنت میں سب سے بڑھ کر ثروت مند تھا یعنی ہندوستان۔

سترّواں باب

برطانیۂ عظمیٰ

(۲)

لیبر پارٹی کا پروگرام

لیبر پارٹی کا حل یہ تھا کہ کلیدی صنعتوں کو قومی بنا لیا جائے، یعنی ان صنعتوں کو حکومت خرید لے اور سوویٹ روس کی طرح بلا معاوضہ قبضہ کر لینے کے بجائے نجی ملازموں کو مناسب معاوضہ دے دے۔ کلیدی صنعتیں وہ تھیں جو دسیع تنظیمات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوتی ہیں، مثلاً حمل و نقل، بجلی، کوئلہ، فولاد، پارچہ بافی، کٹلری، ظروف سازی، مشینوں کے پرزے۔ بہت سے مزدور صرف اس لیے صنعتوں کو قومی بنانا چاہتے تھے کہ اشتراکی ہونے کی حیثیت میں ان کی پرورش ایک خاص عقیدے میں ہوئی تھی، یعنی یہ کہ جو منافع، کرایہ اور سود نجی سرمایہ دار مالکوں کو دیا جاتا ہے، وہ بھی مزدوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ایک شکل ہے اور یہ ناجائز استفادہ ختم ہو جانا چاہیے بہت سے لیڈر اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ صنعتوں کو قومی بنا لینے کے بعد بھی یہ بنیادی سوال باقی رہے گا۔ اتنا سامان کیونکر باہر بیچا جائے جس سے اقتصادی مشینری چلتی رہے۔ کہا جاتا تھا کہ صنعتوں کو قومی بنا لینے کے بعد برطانوی صنعتیں زیادہ مقدار میں، بہت اور ارزاں سامان پیدا کریں گی۔ نقصان رساں مقابلہ ختم ہو جائے گا اور وہ نا اہل فرمیں باقی نہیں رہیں گی، جو صنعت زغال میں نمایاں ہوئیں۔ جو لوگ آج کل انتظامات اور فروخت کے کام پر لگے ہوئے ہیں، ان کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کمپنیوں کے حصہ دار اور دوسرے سرمایہ لگانے والے لوگ، جو کوئی کام نہیں، وہ سب چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔

مزید برآں مزدوروں کو یقین تھا کہ ایک مرتبہ اشتراکی اصول پر صنعتوں کو قومی بنانے کا انتظام ہو گیا تو برطانوی مزدوروں کی روش کام کے سلسلے میں بالکل تبدیل ہو جائے گی۔ انھیں احساس ہو جائے گا کہ اب وہ صنعتوں کے حقیقی مالک ہیں۔ وہ دل لگا کر کام کریں گے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑنے، کام چھوڑ دینے، یا ایسی دوسری حرکتیں کرنے سے باز رہیں گے۔ ساتھ ہی مصنوعات کی مقدار اتنی بڑھا دیں گے کہ برطانیہ اپنا مال تمام منڈیوں میں سب سے کم قیمت پر فروخت کر سکے۔ اس یقین کو تقویت یوں پہنچی کہ مزدور پارٹی نے آزاد تجارت کا عقیدہ لبرلوں سے لے لیا تھا اور انھیں امید تھی کہ بین الاقوامی روابط بہت جلد درست کر

یں گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور قدامت پسندوں کی پالیسی کے سخت مخالف تھے، یعنی وہ نہ حفاظتی محاصل چاہتے تھے اور نہ سامراجی توسیع۔

اس دور میں برطانیہ کے اندر جو تحریرات شائع ہوئیں، وہ ان اقتصادی مباحث سے لبریز ہیں، جو برطانیہ کو کساد سے باہر نکالنے کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔ سر ارنسٹ بین[1] ایک قدیم وضع کا انفرادیت دوست آدمی تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں، جس کا نام ہے "عصر ملائم[2]" لکھا:-

"نہایت اچھے انسانوں کے مجمع کو جو بے اندازہ نقصان پہنچا، وہ آج کل اُس اقتصادی بحران میں منعکس ہے، جو دنیا کے لیے وجۂ مصیبت بنا ہوا ہے۔ خدا کے بنائے ہوئے کروڑوں انسان، جو بہتر حکومت والی دنیا میں دوسروں کی خدمت کی آرزوؤں سے لبریز ہوتے، اب اتنے پست ہو گئے ہیں کہ وہ صرف لینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ طاقتور حکومتیں اپنے لوگوں کو یہ بتانے میں منہمک ہیں کہ انھیں زیادہ سے زیادہ مال ملنا چاہیے، گویا ہر شخص کو کم سے کم کام کرنا چاہیے۔ یہ ملایمت اور حفاظتِ نفس کا فلسفہ متعدی بیماری کی طرح پھیل رہا ہے۔ ہر سرکاری حکومت کا سب سے بڑا پیشہ فریب کاری ہے۔ غیر سرکاری چھوٹی چھوٹی حکومتیں، کمیٹیاں، ٹریڈ یونینیں اس سلسلے میں تقویت پہنچا رہی ہیں۔ کوئی آدمی اس وقت تک کام یا پیشہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں، جب تک اسے ہیئت حاکمہ کی طرف سے ایسا کرنے کی اجازت نہ مل جائے.... دنیا کو بدل دینے والے یہ نظریہ بانگ کہہ رہے ہیں کہ مقابلہ نہ ہونا چاہیے۔ عام سطح سے اٹھنے کی کوئی کوشش نہ ہو۔ بہتر طریق عمل اختیار کرنے کی کوئی خواہش نہ رہے۔ جس حد تک ان دیوانگیوں کو قبول کیا گیا ہے، اس حد تک تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ پارلیمنٹ کے سیکڑوں قوانین فطرت کی رفتار کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گواہی دے رہے ہیں۔

"تاہم انسان کی روح پر کوئی تبدیلی عائد نہیں کی جاسکتی اور نہ کی جاسکے گی۔ روح اور قلب میں جو تغیرات پیش آتے ہیں، وہ اچھے ہوں یا بُرے، بشریات کے ان آلوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس دنیا یا آنے والی دنیا کے اسرار پر قابو پا لینے کی خواہش ایک ایسی بخشش بہا برکت ہے، جو سیاسی قوت کے دائرے سے باہر ہے۔ اولاد کی خواہش،

---

[1] Sir Earnest Benn

[2] This Soft Age

کام اور تفریح کی تسکین، آگے بڑھنے کی آرزو، تجربے اور اکتشاف کی تمنا۔ یہ سب چیزیں بیکار ہیں۔ ان میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ نہ حکومت کے حقیقی مقاصد و عزائم میں کوئی تغیر ہے۔ آزادی کا ذکر اس سلسلے میں ہو ہی نہیں سکتا۔ تغیر کے متعلق جو گفتگو ہو رہی ہے، اس کا تعلق فہم کے مختلف درجات سے ہے، جو آزادی کے مفہوم اور حیثیت کے متعلق پے در پے آنے والی نسلوں میں موجود رہے ہے۔ جب حکومت کا نصب العین آزادی رہا تو زندگی بہتر ہو گئی، جب حکومت کا رُخ دوسری طرف ہوا، جیسا کہ حال میں ہوا ہے تو زندگی کی مشکلات بڑھ گئیں۔ اس بدلتی ہوئی دنیا کے نظریے میں جو غلطی ہے، اس کا سراغ لگایا جائے تو ہم اس جھوٹے نظریے پر پہنچ جاتے ہیں کہ انسانوں کو ایک مستبد کے ہاتھوں سے نکالنے کے بعد اسے تین کروڑ انتخابی مستبدوں کے حوالے کر دینا بہتر ہے۔"

"جمہوریت کو استبداد کی تباہی کا وسیلہ قرار دیا گیا تھا، نہ کہ اسے توسیع دینے کا اور جمہوریت اسی صورت میں بچ سکے گی جب یہ اپنے ابتدائی مقاصد کی طرف لوٹ آئے گی۔"[1]

لیکن اجتماعیت کے معتقد اپنی روش پر قائم رہے۔ یہاں اجتماعیت کے ایک بہت بڑے داعی اولاف سٹیپلڈن[2] میں سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس نے سائنٹیفک ناول لکھنے میں شہرت حاصل کی:۔

"مالی انعام ــــ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس دوسرے کے مزدوروں کو اپنی خدمت میں لانے کا ذریعۂ انعام میسّر ہو ــــ بالکل محدود رہنا چاہیے اور بغیر کسی محنت کے مالی منافع ــــ یعنی مشترکہ کمپنیوں میں سرمایہ لگا کر منافع کھانا ــــ بالکل محدود ہو جانا چاہیے اور آخر اسے بالکل ختم کر دینا چاہیے، مگر جس حد تک ممکن ہو، قومی اقتصادیات میں صریح تبدیلی سے خلل نہ آئے۔ شہری کو یقین دلا دینا چاہیے کہ اسے جو کچھ دیا جائے گا، وہ کم از کم اتنا ضرور ہو گا کہ اس کے لیے کافی ہو، نیز اسے آمادہ کرنا چاہیے کہ اگر وہ زیادہ ہنرمندی اور انہماک سے کام لے گا تو معاوضے میں اس کی اُجرت بڑھا دی جائے گی، مگر یہ توقع نہ دلانی چاہیے کہ وہ اپنی ہنرمندی یا حصہ داری میں سعی و جہد یا محض میراث کی خوش نصیبی سے بہت بڑی دولت جمع کرے گا۔ یہ تصور ہی سراسر ایک دھوکا ہے کہ آدمی کو وسیع مالی فوائد کی توقع دلا دی جائے تو وہ اپنے بہترین کمالات کی نمائش میں دریغ نہ کرے گا۔ یہ تصور اس دور کی

---

[1] ارنسٹ بین کی کتاب ص ۱۸۰ــــ ۱۸۲

[2] Olaf Stapledon

خصوصیت ہے، جو زندگی کے صرف اقتصادی پہلو میں منہمک ہے۔ وقار و قوت کے دوسرے اوضاع بھی یکساں مؤثر محرک بن سکتے ہیں۔

"اسے حسن تدبیر سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر شہری کو ایک حد تک دولت جمع کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ جو کچھ وہ بچائے، اسے مملکت کے قرضے میں لگا دینا چاہیے، تاکہ جوانی میں جو اس نے محنت کی، اس سے بڑھاپے میں فائدہ اٹھائے۔ یہ بھی عین مصلحت سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ تھوڑی سی مقدار اپنے بچوں کے حوالے کر دے، تاکہ وہ زندگی اچھے حالات میں شروع کر سکیں، لیکن یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے کہ لوگ زیادہ دولت جمع کریں یا میراث میں چھوڑیں۔ اس کے برعکس بیاہے جوڑے کو یقین ہونا چاہیے کہ جب وہ بڑھاپے کے باعث کام کے قابل نہ رہیں گے اور ان کے پاس کوئی اندوختہ بھی نہ ہوگا تو انھیں اپنے بچوں کے لیے بوجھ بنے بغیر معقول درجے کا آرام میسر رہے گا اور اگر وہ جوانی کی حالت میں فوت ہو گئے تو ان کے بچوں کی پوری دیکھ بھال کی جائے گی اور انھیں ہر قسم کی تربیت دی جائے گی۔"[1]

جنگ کے بعد کی سیاسیات

دونوں جنگوں کے درمیان بیس سال کی جو مدت گزری، اس میں قدامت پسند یا مزدور کبھی اپنے پورے پروگرام پر عمل نہ کر سکے۔ مزدوروں کو تھوڑی مدت کے لیے ۱۹۲۴ء میں، پھر ۱۹۲۹ء میں اقتدار ملا تھا۔ ان کا لیڈر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم تھا۔ پارلیمنٹ میں ان کی وضعیت ایسی محکم نہ تھی کہ صنعتوں کو قومی بنا سکتے۔ قدامت پسند سلطنت کے لیے اقتصادی کفالت بالذات کا جو درجہ حاصل کرنا چاہتے تھے، اس پر ہم آہنگ نہ تھے۔ پھر دولت مشترکہ کے ممالک کی نارضامندی نے انھیں اس سے آگے نہ بڑھنے دیا کہ بعض خاص معاملات میں برطانیہ کے لیے محدود ترجیحات منظور کرالی گئیں۔ ان کا فیصلہ ۱۹۳۲ء میں اٹاوہ کی اقتصادی کانفرنس نے کیا تھا۔

ان برسوں میں برطانوی پارٹیوں کے سیاسیات کی تہ میں طبقاتی تقسیم کارفرما تھی، یعنی حکومت کو اقتصادی معاملات میں کس حد تک مداخلت کا موقع دینا چاہیے۔ بایں ہمہ سطح پر برطانوی سیاسیات میں عہد وکٹوریہ کی پارلیمانی زندگی کی خوشگواریاں موجود تھیں۔ دارالعوام میں بیشک مزدوروں کے نمائندے اور دوسرے لوگ آگئے تھے، لیکن وہاں تقریریں آکسفورڈ ہی کے لب ولہجہ میں ہوتی تھیں اور یہ دنیا کا بہترین کلب تھا۔ ۱۹۲۶ء کے چند ہفتوں میں ٹریڈ یونینوں کے پچیس لاکھ ارکان نے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والوں کی خاطر ہڑتال کی۔ کوئلے والے پہلے ہی اپنی اجرتوں میں تخفیف پر احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کر چکے تھے۔ ہڑتال ناکام رہی، لیکن اس کے مختصر سے دور میں بنیادی برطانوی روش واضح ہو گئی۔ درمیانے اور بالائی طبقے میں سے ہزاروں

---

[1] سٹیپلٹن کی کتاب New Hope for Britain (برطانیہ کے لیے نئی امید) ص ۱۶۴ - ۱۷۵ -

آدمی رضاکارانہ وہ تمام خدمات انجام دینے کے لیے سامنے آ گئے، جو ملک کے بنیادی کاروبار کے لیے ضروری تھیں۔ پلائیمتھ میں ہڑتالیوں کی ایک ٹیم نے پولیس کی ٹیم سے فٹ بال کھیلا۔ اگرچہ مختلف طبقوں میں کشیدگی بڑھتی رہی، مگر انگریز بالعموم قانون کے پابند رہے اور جس طبقاتی کشمکش کا ذکر مارکس کے پیرو زور شور سے کرتے رہتے ہیں، وہ انگلستان میں کالا پارلیمانی نظم و ضبط کے زیر اثر آ گئی تھی۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں برطانیہ کو سیاسی اعتبار سے جمہوری بنانے کے لیے آخری قدم اٹھا لیا گیا اور کسی نے اس کا چنداں خیال بھی نہ کیا۔ اصل کام سنہ ۱۸۳۲ء میں شروع ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں "خاکی انتخاب" کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حکومت نے جو تھا اصلاحی مسودہ منظور کرا لیا۔ اس کے مطابق عام مردوں کے حق رائے سے تمام پرانی پابندیاں اڑا دی گئیں اور اکیس سال سے زائد عمر کے تمام مردوں کو حق رائے مل گیا۔ اس اثناء میں حقوق طلب عورتوں کی طرف سے ایک طویل اور شاندار مہم شروع ہو گئی۔ عورتوں کو حقوق ملنے کے لیے مظاہرے ہوئے، تقریریں کی گئیں، چنانچہ مسودۂ قانون میں عورتوں کو بھی ووٹ دے دیئے گئے، لیکن برطانوی احتیاط کا سلسلہ جاری رہا، یعنی عورتوں کے لیے ووٹ کا حق تیس سال کی عمر سے رکھا گیا۔ مقصود یہ تھا کہ اس طرح مرد ووٹروں کی تعداد عورتوں سے ہمیشہ زیادہ رہے گی۔ یہ امتیاز سراسر غیر معقول تھا، خصوصاً جمہوریۂ امریکہ میں تجربے سے ثابت ہو چکا تھا کہ عورتیں بھی سیاسی معاملات میں مردوں کی طرح مختلف الرائے ہوتی ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۸ء کے مسودۂ قانون میں عورت ووٹروں کے لیے بھی اکیس سال کی عمر مقرر کر دی گئی۔

اگرچہ خیرات، صنعتی کساد اور اقتصادی بدحالی کی دوسری علامتیں قائم رہیں، مگر تیسرے عشرے کے آواخر میں برطانیہ نے اقتصادی اعتبار سے ایک حد تک بہتر حالت پیدا کی۔ پھر بڑا کساد آ گیا، جس کی وجہ سے نیویارک کے صرافے میں بہت بڑا حادثہ پیش آیا جس کے اثرات دنیا بھر میں پھیل گئے۔ برطانیہ کمزور تو پہلے ہی تھا، یہ سب سے پہلے اس مصیبت کا شکار ہوا۔ میزانیے میں شدید خسارے کی صورت سامنے تھی، لیکن حکومت مزدوروں کی امداد اور دوسری عمرانی خدمات میں تخفیف پر آمادہ نہ ہوئی۔ آخر اگست سنہ ۱۹۳۱ء میں رامزے میکڈانلڈ کی دوسری حکومت مستعفی ہو گئی۔

پھر قدامت پسندوں، لبرلوں اور دائیں بازو کے مزدوروں نے میکڈانلڈ کی سرکردگی میں کوالیشن بنا لی۔ اس کوالیشن نے امدادی رقوم اور دوسری عمرانی خدمات میں تخفیف منظور کر لی، جس کے لیے سابقہ حکومت تیار نہیں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے اواخر میں کوالیشن حکومت نے ایک بہت بڑا قدم اٹھایا، جسے برطانیہ کی روایتی مالی قیادت اور معیار زر سے وابستگی کے پیش نظر مشکل سمجھا جاتا تھا، یعنی پونڈ کی قیمت گرنے دی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں آزاد تجارت کے خلاف پہلا قدم اٹھایا، یعنی حفاظتی محاصل منظور کر لیے۔ اسی سال جمہوریۂ امریکہ کے قرضوں کی ادائی میں التوا کر دیا۔ صرف معمولی طور پر چند رقمیں ادا کی گئیں، جنھیں امریکی کانگرس نے منظور نہ کیا۔ ان تدبیروں سے بے روزگاروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا، نہ برطانیہ کی اقتصادی مشکلات کی جڑ کٹی۔ لیکن کساد کی لہریں رک گئیں اور کوالیشن نے سنہ ۱۹۳۱ء نیز ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں کامیابیاں حاصل کیں۔

لیکن کوالیشن میں دراصل قدامت پسندوں کا غلبہ تھا اور ۱۹۳۵ء کے انتخابات کے بعد قدامت پسندوں کے لیڈر سٹینلے بالڈون نے وزارت عظمیٰ سنبھال لی۔ آہستہ آہستہ برطانوی اقتصادیات کساد کے بدترین دور سے باہر نکل گئے۔ بعض ماہرین اقتصادیات اس کا سبب یہ بتاسکتے ہیں کہ بالڈون نے بجٹ متوازن رکھنے کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مسولینی اور ہٹلر کے جارحانہ اقدامات برطانیہ کی خاص توجہ کے مستحق بن گئے تھے۔ اقتصادی مسئلہ اور عمرانی مسئلہ حل نہیں ہوا تھا، مگر ایک اور جنگ کے خطرے کے باعث ان مسئلوں کی اہمیت ماند پڑ گئی۔

مسئلہ آئرلینڈ کا حل

دونوں جنگوں کا درمیانی دور آئرلینڈ کے لیے بے حد اہم تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو السٹر میں ہوم رول کے خلاف جس بغاوت کا خطرہ پیدا ہوا تھا، وہ ٹل گیا، لیکن اہل آئرلینڈ دوران جنگ میں قابل اعتماد رفیق نہ تھے۔ آئرلینڈ کے قوم پرستوں کا ایک گروہ السٹر والوں کی عین ضد تھا، انھوں نے ۱۹۱۶ء میں جرمنوں سے امداد لی اور ڈبلن میں مسلح بغاوت کا انتظام کر لیا۔ برطانیہ نے یہ بغاوت، جسے عموماً ایسٹر کی بغاوت کہا جاتا تھا، بزور فرو کر دی، لیکن اہل آئرلینڈ میں سے خاصے آدمی مارے گئے، جنھیں سیاسی شہید قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ اپریل ۱۹۱۸ء تک جبری فوجی بھرتی کا قانون آئرلینڈ میں نافذ کرنے کی جرأت نہ کر سکی اور جب یہ قانون نافذ ہوا تو آئرلینڈ کے قوم پرستوں نے برطانوی پارلیمنٹ کا مقاطعہ کر دیا اور اس کے اجلاسوں میں شریک ہونا ترک کر دیا۔

آئرلینڈ کے لیے ہوم رول کا جو قانون ۱۹۱۴ء میں منظور کیا گیا تھا، وہ ۱۹۱۹ء میں وہاں کے قوم پرستوں کے نزدیک قابل اطمینان نہیں رہا تھا۔ جنگ سے پیشتر جو لوگ ہوم رول کے حامی تھے، وہ زیادہ انتہا پسند باغیوں سن فین[1] کے مقابلے میں بے اثر رہ گئے، جو کامل آزادی چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک کے زمانے میں فتنہ و فساد پھیلانے، گھات میں بیٹھنے، آگ لگانے اور چھاپہ مار جنگ کرنے کا ہنگامہ جاری رہا۔ آئرلینڈ والوں نے اپنی ایک پارلیمنٹ ڈل آئیرین[2] کے نام سے قائم کر لی تھی، جو غیر آئینی تھی۔ وہ اب زور شور سے انقلاب کے لیے تیار ہو گئے۔ انگریز طویل جنگ سے چور ہو چکے تھے اور وہ مزید قوت کے استعمال کے اہل نہیں رہے تھے۔ ان کے برعکس اہل آئرلینڈ خوب منظم تھے اور ان میں جنگ کے لیے پورا جوش و خروش موجود تھا۔

لیکن تشدد آمیز انقلاب کا فوری شاخسانہ یہ تھا کہ سن فین جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طبقہ اعتدال پسندوں کا تھا، جو اس امر کے لیے تیار تھے کہ سمجھوتا کر لیں اور السٹر کو جہاں پروٹسٹنٹ آباد تھے، برطانیہ کے قبضے میں چھوڑ دیں اور کیتھولک علاقوں کے لیے درجۂ نو آبادیات منظور کر لیں۔ ارتھر گریفتھ[3] اور میکائیل کالنز[4] اس طبقے کے لیڈر تھے۔ انتہا پسندوں کا رئیس

۱۔ Sin Fein. یہ آئرلینڈ کی اصل زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی ہیں "تنہا ہم"

۲۔ Dail Eireann. آئرلینڈ کی قومی پارلیمنٹ

۳۔ Griffith.

۴۔ Michael Collins

ایمن ڈی ویلرا[1] تھا۔ اگرچہ اس کا نام ہسپانوی تھا، مگر وہ آئرستانی تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ پورے جزیرے کو جمہوریت کی حیثیت میں کامل آزادی دے دی جائے۔ اعتدال پسندوں نے برطانیہ سے گفت و شنید کی اور ۱۹۲۱ء میں جنوبی آئرلینڈ کے چھبیس اضلاع کے لیے نوآبادیوں کا درجہ حاصل کر لیا اور اس کا نام آزاد حکومت آئرلینڈ[2] رکھا۔ اس کی اپنی پارلیمنٹ تھی اور داخلی اعتبار سے کاملاً خود مختار تھی۔ اس نے برطانوی تاج کو محض ایک نشان کے طور پر قبول کر لیا۔ السٹر کے چھ پروٹسٹنٹ اضلاع نے برطانیہ کے ساتھ پرانا رابطہ جاری رکھا اور اب برطانیہ کا نام "برطانیہ عظمیٰ اور شمالی آئرلینڈ کی متحدہ مملکت[3]" قرار پایا۔

ڈی ویلرا کو یہ سمجھوتا منظور نہ تھا اور نہ جمہوریت پسند اسے ماننے کے لیے تیار تھے۔ ساتھ ہی آئرلینڈ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، جس میں ایک فریق آزاد مملکت کے حامیوں کا تھا اور دوسرا جمہوریت پسندوں کا۔ آگ لگانے، گھات میں بیٹھنے اور قتل کرنے کا سلسلہ از سرِ نو جاری ہو گیا۔ آخر آئرلینڈ کے لوگ بھی تشدد کے ہنگاموں سے تنگ آ گئے۔ جب میکائیل کالنز ایک جمہوریت پسند کے ہاتھ سے مارا گیا (وہ ڈی ویلرا کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسند تھا) تو رائے عامہ کا رُخ انتہا پسندوں کی طرف سے پھر گیا۔ اس اثنا میں آزاد مملکت تدریجاً مستحکم تر ہوتی گئی۔ ۱۹۲۳ء میں جمعیت اقوام نے بھی اسے منظور کر لیا تو اس کی بین الاقوامی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ ڈی ویلرا پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے لیے تیار نہ ہوا، کیونکہ اسے شاہ برطانیہ کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ آخر اس کی رائے بدلی اور وہ ۱۹۲۷ء میں دوسرے جمہوریت پسندوں کے ساتھ قومی پارلیمنٹ میں شریک ہو گیا۔

اس وقت سے مفاہمت پسند اور غیر منطقی انگلستان کے طریق کی پیروی کرتے ہوئے آئرلینڈ کی آزاد حکومت نے بھی رفتہ رفتہ وہ سب کچھ مصالحت سے حاصل کر لیا جس کے لیے انتہا پسندوں نے قتل و آتش زنی کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ڈی ویلرا کی پارٹی نے پارلیمنٹ میں خاصی تعداد حاصل کر لی۔ ۱۹۳۳ء میں وہ اکثریت کی حامل بن گئی۔ پھر اس نے بادشاہ سے وفاداری کا حلف منسوخ کر دیا اور وہ تمام رشتے آہستہ آہستہ قطع کر دیے، جو آزاد مملکت کو انگلستان سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں کیتھولک آئرلینڈ برطانوی اقتدار سے اس قدر آزاد ہو چکا تھا کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو اس نے دنیا بھر میں غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۴۹ء میں آخری قدم اٹھایا گیا اور برطانیہ نے آئرلینڈ کی جمہوریت تسلیم کر لی۔ اب اسے پوری آزادی حاصل ہے، جو آزاد مملکت اور نوآبادیوں کے درجے سے یقیناً زیادہ مکمل ہے۔

برطانوی دولت مشترکۂ اقوام

دونوں جنگوں کی درمیانی مدت میں کسی دوسرے برطانوی علاقے نے یوں علیحدگی اختیار نہ کی۔ اس کے برعکس نوآبادیوں کی آزادی کا دستوری اعتراف کر لیا گیا

۱۔ Eamon de Valera

۲۔ The Irish Free State

۳۔ United Kingdom of Great Britain and Northern Island

اور وہ زیادہ محفوظ و وفادار ہو گئیں، اگرچہ اس طرح مرکزی برطانوی اقتدار کو کم از کم قانوناً ان کی خارجہ اور اقتصادی پالیسی پر تصرف کا حق نہ رہا جس امر کی ابتدا تقریباً ایک صدی پیشتر ڈرہم[1] رپورٹ سے شروع ہوئی، اس کا آخری حصہ ویسٹ منسٹر کا ضابطہ تھا (۱۹۳۱ء)۔ اس ضابطے کے ذریعے سے نو آبادیوں اور وطن عزیز کے درمیان تعلقات کی نئی کیفیت واضح ہوئی، جو پانچ سال پیشتر ایک کانفرنس میں طے ہوئی تھی۔ نو آبادیوں کی نئی حیثیت کے لیے نئی اصطلاحات وضع کی گئیں، یعنی قرار پایا کہ آئندہ انھیں سلطنت کے حصے نہیں سمجھا جائے گا بلکہ وہ اقوام کی برطانوی دولت مشترکہ کے ارکان ہوں گے ان نئے تعلقات کے مطابق برطانیہ کے لیے لازم تھا کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کے ساتھ بحری محاصل، تجارتی حالات، نقل وطن اور دوسرے معاملات کے متعلق اسی طرح بات کرے، جس طرح وہ دوسرے ممالک غیر سے بات چیت کرتا ہے۔ اگرچہ برطانیہ نے درمیانی بست سالہ مدت میں نو آبادیوں کے ساتھ خود کفیل اقتصادی اتحاد کا انتظام کر لیا تھا، تاہم ۱۹۱۴ء کی طرح ۱۹۳۹ء میں بھی تمام نو آبادیاں برطانیہ کی طرفداری میں شریک جنگ ہوئیں۔ انھوں نے خود یہ فیصلہ کیا، اگرچہ انھیں بھی آئرلینڈ کی طرح اپنی غیر جانبداری کے اعلان کا حق تھا۔

تخت سے دست برداری کا واقعہ صدی کے چوتھے عشرے میں ایک واقعہ پیش آیا، جو برطانیہ کے عمرانی اور سیاسی نشوو ارتقا کے اہم تر مگر کم ڈرامائی واقعات سے زیادہ جالب توجہ بنا۔ اس سے آخری شہادت مل گئی کہ تاج برطانیہ دراصل پارلیمنٹ کی تخلیق ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء میں تخت سے ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کا واقعہ ہے۔ اسی سال وہ تخت نشیں ہوا تھا۔ شہزادہ ویلز کی حیثیت میں ایڈورڈ کا دور بڑا طویل اور کامیاب تھا۔ وہ دنیا بھر کے مجامع میں پُرتاثیر طریق پر شریک ہوتا رہا تھا۔ پھر اسے ایک مطلقہ امریکی خاتون مسز والس سمپسن[2] سے محبت ہو گئی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اپنے عزیز اور رشتہ دار، وزراء اور اکثر انگریز اس شادی کے خلاف تھے۔ چنانچہ ایڈورڈ نے تخت اپنے بھائی کے حق میں چھوڑ دیا، جو شاہ جارج ششم بنا۔ بعض لوگ صرف اس لیے ایڈورڈ کی شادی کے خلاف تھے کہ وہ امریکہ کو ناپسند کرتے تھے (برطانیہ میں یہ ناپسندیدگی ہمیشہ نمایاں رہی، لیکن اس شدت اور گہرائی سے نہیں جس طرح امریکی برطانیہ کو ناپسند کرتے ہیں) مگر زیادہ تر مخالفت اس لیے ہوئی کہ ایک مطلقہ عورت تاج و تخت کے لائق نہیں اور ایک احساس یہ بھی تھا کہ مسز سمپسن ایسی خاتون ہے، جسے امریکی قہوہ خانوں اور ریستورانوں کا معاشرہ قرار دیتے ہیں، لہٰذا وہ رسمی وظائف ادا کرنے کے لیے موزوں نہیں، لیکن اس واقعے سے برطانیہ کی تاریخ پر کوئی بڑا اثر نہ پڑا۔

---

[1] Durham Report

[2] Wallis Simpson

فرانس

جنگ کا اثر

فرانس میں عالمی جنگ اور بعد از جنگ کی مشکلات نے کاروبار کے اندر جو سخت برہمی پیدا کی، وہ برطانیہ کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ جنگ میں بھی فرانس کو دوسرے محارب فریقوں سے زیادہ مادی و جانی نقصان پہنچا۔ بیس لاکھ فرانسیسی، جو عالم شباب میں تھے، یا تو مارے گئے یا اس طرح ان کے اعضا کٹے کہ طبعی زندگی کے قابل نہ رہے۔ فرانس کی آبادی تین کروڑ نوّے لاکھ تھی۔ شرح پیدائش پہلے ہی کم تھی۔ ظاہر ہے کہ اس انسانی نقصان نے فرانس کو بہ حیثیت مجموعی تہذیب و تمدّن کے تمام شعبوں میں کوئی خاص کام انجام دینے کے قابل نہ رکھا۔ جو لوگ سنہ ۱۹۱۴ء اور سنہ ۱۹۱۸ء کے درمیان مارے گئے، ان میں سے اکثر سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد مدبر، صنعتکار، سائنسدان اور فنکار بن جاتے۔ تین لاکھ مکان اور بیس ہزار کارخانے یا دکانیں تباہ ہو گئیں۔ وہاں کی اقتصادی تنظیم قدامت پسندانہ تھی۔ کام کی رفتار تیز نہ تھی۔ مشینری وسیع پیمانے پر موجود ہی نہ تھی۔ اس مادی نقصان کا اثر وہاں یقیناً طویل مدّت تک محسوس ہوتا رہا۔ نفسیاتی اعتبار سے فتح کا احساس چار سالہ جنگ کے وسیع نقصانات کی تلافی نہیں کر سکتا تھا۔

کلیمنشو کی قیادت میں فرانس نے اپنا نصب العین بنا لیا کہ اپنے قریبی دشمن جرمنی کو ہر اعتبار سے انتہائی حد تک اپاہج بنا دے۔ چنانچہ اس نے زیادہ سے زیادہ تاوان کی رقمیں وصول کرنی چاہیں۔ اقتصادی ماہروں نے ہر چند یقین دلایا کہ جرمنی یہ رقمیں ادا نہیں کر سکتا، مگر فرانس نے کچھ پروا نہ کی۔ پھر اس امر پر اصرار کیا کہ جرمنی اٹھ نہ سکے۔ بین الاقوامی اعتبار سے الگ تھلگ رہے اور جنگ کے مادی وسائل اسے میسّر نہ آ سکیں۔ فرانسیسی جرمنی کو غریب رکھنے اور موجودہ زمانے کے ضروری اقتصادی وسائل سے بے بہرہ بنانے میں تاوان سے دست بردار ہونے کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ ان امور کو ترجیح دیتے تھے، مگر دولت مند اور باحیثیت جرمنی کو دوبارہ جنگی کارخانے بنانے کا موقع دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ جنگ کے بعد جو دور آیا، اس میں فرانسیسی مدبّروں نے دونوں چیزوں پر عمل کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ناکام رہے۔ سب سے نازک دور جنوری سنہ ۱۹۲۳ء میں آیا، جب قدامت پسند پوائنکارے[1] وزیر اعظم تھا کیونکہ اسی سال فرانس

---

[1] Poincare

اور بلجیم کی فوجوں نے روہر پر قبضہ کر لیا، جو جرمنی کا خاص صنعتی علاقہ تھا۔ جرمنوں نے پُرامن مزاحمت کی۔ ۱۹۲۵ء تک واضح ہو گیا کہ فرانس کو اس قبضے سے کوئی فائدہ نہ پہنچا اور نئی فرانسیسی حکومت نے پوانکارہ کی پالیسی ناکام ہو جانے کے بعد فوجیں واپس بُلا لیں۔

اس اثنا میں خود فرانسیسی افراطِ زر کا شکار تھے۔ یہ مصیبت ایک حد تک اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ تباہ شدہ علاقوں کی تعمیرِ نو پر بہت روپیہ خرچ ہوا۔ اس خرچ نے حکومت کے مالی وسائل پر گہرا اثر ڈالا اور جرمنی سے تاوان کی جو قسطیں وصول ہو رہی تھیں، وہ اس خرچ کا صرف ایک حصہ پورا کر سکتی تھیں۔ افراطِ زر کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ مسلح فوج خرچ پر بحال رکھی جائے اور فرانسیسی فوجیں منتشر کرنے سے ڈرتے تھے۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ بین الاقوامی تجارت میں بدنظمی پیدا ہو گئی تھی اور دورانِ جنگ میں فرانسیسی حکومت کا قرضہ بہت بڑھ گیا تھا۔ تیسرے عشرے کے وسط تک فرینک کی قیمت گرتے گرتے دو سینٹ پر پہنچ گئی تھی، حالانکہ جنگ سے پیشتر یہ قیمت بیس سینٹ تھی۔ اس بحرانی حالت میں پوانکارہ سے دوبارہ اقتدار سنبھالنے کی درخواست کی گئی تاکہ فرینک کو محفوظ کیا جا سکے۔ ۱۹۲۶ء میں پوانکارہ نے ایک کولیشن وزارت بنائی، اسے قومی اتحاد کی وزارت کہتے تھے۔ پوانکارہ نے نئے ٹیکس لگائے۔ خرچ میں کفایت شعاری کے لیے سخت تدبیریں اختیار کیں۔ فرانسیسی فوجیں روہر سے واپس بلا لی گئیں تو رفتہ رفتہ بین الاقوامی تجارت کا سلسلہ بحال ہوا۔ اس طرح فرینک کی قیمت میں کمی رُک گئی اور ۱۹۲۸ء میں اس کی قیمت ۳٫۹۲ سینٹ ہو گئی۔

اگرچہ فرانسیسی افراطِ زر جرمنی کے مقابلے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی تھی، تاہم اس سے اقتصادی اور عمرانی حالات میں خاصی ابتری پیدا ہوئی۔ جن فرانسیسیوں نے حکومت کو بیس سینٹ فی فرینک کے حساب سے قرضہ دیا تھا، وہ اس کے ۴/۵ حصے سے محروم ہو گئے۔ اس سے دولت مندوں کے علاوہ اُن لوگوں پر خاصی ضرب لگی، جو چھوٹی رقمیں کاروبار میں لگائے رکھنے کے عادی تھے۔ اس سے عمرانی کشیدگی بھی پیدا ہوئی جو دونوں جنگوں کی درمیانی مدت میں فرانس کی داخلی تاریخ کا مرکزی موضوع رہی۔

عمرانی اور سیاسی کشیدگی

پہلی عالمی جنگ کے دوران میں اہلِ فرانس نے اس بڑی سیاسی اور عمرانی کشمکش کو عارضی طور پر بالائے طاق رکھ دیا تھا، جو ۱۷۸۹ء کے بڑے انقلاب سے انھیں میراث میں ملی تھی اور اس کا ازالہ نہیں کر سکے تھے۔ جنگ کے بعد سیاسی جماعتوں کا وہ مقدس اتحاد ٹوٹ گیا، جو دورانِ جنگ میں قائم رہا تھا اور پرانی کشمکش از سرِ نو شروع ہو گئی۔ اسے بعض اوقات "دو فرانسوں" کے درمیان کشمکش قرار دیا جاتا ہے۔ ایک بائیں بازو کا جمہوری فرانس، دوسرا دائیں بازو کا شاہ پسند یا فاشسٹ فرانس۔ اس کشمکش کو مارکسیوں کی تعبیرات کے مطابق غریبوں اور امیروں، سرمایہ داروں اور پرولتاریوں کے درمیان محض طبقاتی جنگ نہیں سمجھا جا سکتا، اگرچہ اصل کشمکش کا ایک جزو یہ بھی تھا۔ دائیں جانب زیادہ دولت مند طبقے تھے، جن میں سے اکثر پارلیمانی مملکت کے وجود ہی کو کھلم کھلا غلط

بتاتے تھے۔ قدامت پسند کسان، خصوصاً مغرب کے، نیز چھوٹے چھوٹے کاروباری آدمی اور معمولی سرمایہ لگانے والے لوگ دائیں بازو کے پشتیبان تھے۔ یہ لوگ "تیسری جمہوریت" کے خلاف نہ تھے، مگر عزم کیے بیٹھے تھے کہ "فلاحی مملکت" کے تعلق میں ضروری عمرانی اصلاحات میں توسیع نہ ہونے دیں۔ دائیں بازو کی اس مزاحمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس عمرانی تحفظ کے وسائل مہیا کرنے میں برطانیہ، جرمنی، سویڈن اور دوسری یورپی مملکتوں سے پیچھے رہ گیا۔

بائیں بازو پر "فلاحی مملکت" کے مجاہد، اشتراکی اور کمیونسٹ تھے۔ ان کی پشتیبانی انتہا پسند مزدور کر رہے تھے بہت سے سفید پوش، خصوصاً سرکاری ملازم اور اہلِ علم بھی انھیں میں شامل تھے۔ بائیں بازو کی قوت پر اس وجہ سے ضرب لگی کہ جنگ کے بعد کمیونسٹوں اور اشتراکیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کمیونسٹ ماسکو کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ اشتراکی اس کے خلاف تھے۔ ساتھ ہی "ٹریڈ یونین کی بڑی تنظیم"[1] میں خاصا اختلاف پیدا ہو گیا۔ پھر ایک پارٹی تھی جس کا نام غلطی سے انتہا پسند اشتراکی پارٹی رکھا گیا۔ اسے برائے نام ہی بائیں بازو میں شامل سمجھا جاتا تھا، اصلاً وہ سیاسی اعتبار سے درمیانے درجے میں تھی، یعنی نہیں چاہتی تھی کہ "فلاحی مملکت" کے لیے بڑے قدم اٹھائے جائیں۔ مدت سے یہی پارٹی تیسری جمہوریت کا سیاسی پشتہ مانی جاتی تھی۔ انتہا پسندوں کو جنوب کے کسانوں، سفید پوشوں اور چھوٹے چھوٹے پیشہ وروں میں خاصی ہردلعزیزی حاصل تھی۔

مذہبی مشکلات نے فرانسیسی سیاسیات میں مزید تلخی پیدا کر دی۔ بائیں بازو کے فرانسیسی، جن میں انتہا پسند اشتراکی بھی تھے، از روئے روایات پادریوں کے سخت خلاف تھے۔ جنگ کے بعد ان لوگوں نے عجلت سے کام لیتے ہوئے السا‌س میں پادریوں کے خلاف قوانین نافذ کرنے کی کوشش کی، حالانکہ السا‌س کیتھولکوں کا گڑھ تھا۔ یہ جرمنی کے تابع تھا، اس لیے مملکت و کلیسا کی علیحدگی کا اس پر کوئی اثر نہ پڑا، جو دریفس کے بحران میں جمہوریت پسندوں کی فتح کے بعد پورے فرانس میں نافذ کی گئی تھی۔ بہر حال حکومت کو السا‌س کے مسئلے، نیز پادریوں کے دوسرے مسائل پر مفاہمت کرنی پڑی۔ شدید عوامی بحث و تمحیص کے بعد ویٹیکن کے ساتھ سنہ ۱۹۲۱ء میں تعلقات دوبارہ قائم کر لیے گئے، سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ تعلقات توڑے گئے تھے۔ پوائنکارے روہر کے مقابلے میں ناکام رہا تو اس کے بعد دائیں بازو نے حکومت قائم کر لی۔ اس حکومت نے سنہ ۱۹۲۵ء میں پھر تعلقات توڑ لیے، مگر چند ماہ بعد خود بخود دوبارہ قائم کر لیے۔

تیسرے عشرے کے اواخر میں اقتصادی حالات سدھر گئے۔ فرینک کی نئی قیمت کے تعین اور معاہدات لوکارنو کے بعد خوشحالی بڑھ گئی تو معلوم ہونے لگا کہ تیسری جمہوریت داخلی مشکلات سے عہدہ برآ ہو رہی ہے۔ جو کساد سنہ ۱۹۲۹ء

---

[1] General Confederation of Labour

فرانسیسی میں (C.G.T.) Confederation Generale du Travail

میں دنیا بھر کے اندر شروع ہو گیا تھا، وہ فرانس میں ذرا متاخر پہنچا۔ ۱۹۳۰ء میں معلوم ہو رہا تھا کہ فرانسیسی اقتصادیات کے لیے اس بحران سے بہ عافیت گزر جانے کے امکانات امریکہ، برطانیہ یا جرمنی سے زیادہ ہیں، کیونکہ وہاں بھاری صنعت کوئی نہ تھی، لیکن فرانس کا انحصار بھی بین الاقوامی تجارت پر تھا، خصوصاً اس امر پر کہ عطریات، شرابیں اور برانڈی، نیز پیرس کے زنانہ پارچے اور عیش و راحت کی دوسری چیزیں بہ کثرت باہر جائیں۔ ۱۹۳۲ء میں کساد فرانس تک بھی پہنچ گیا اور حکومت شدید مشکلات میں مبتلا ہو گئی۔

سٹیوسکی کا قضیہ اور عوامی محاذ

سیاسی بحران فروری ۱۹۳۴ء میں کمال پر پہنچ گیا۔ یہ سٹیوسکی[1] کے قضیے کا نتیجہ تھا جو مالی اعتبار سے اتنا ہی شرمناک تھا، جتنا انیسویں صدی کے آخری عشرے کا پاناما والا واقعہ۔ سٹیوسکی ایک مشکوک دلّال تھا جس نے "تیسری جمہوریت" کے اہم آدمیوں سے ہر قسم کے روابط پیدا کر رکھے تھے۔ آخر وہ بیئون[2] کے بلدیاتی رہن خانے میں ایک عیارانہ دستاویز کے سلسلے میں پکڑا گیا۔ پوری تفصیلات کبھی بروئے کار نہ آئیں۔ سٹیوسکی نے دسمبر ۱۹۳۳ء میں خودکشی کر لی یا اسے قتل کر دیا گیا۔ اس سے پورے فرانس میں تہلکہ بپا ہو گیا۔ شاہ پسند جمہوری معاشرے کی آزادی سے مستفید تھے، وہ دباؤ ڈالنے کے لیے پوری طرح منظم ہو چکے تھے۔ بالائی طبقے کے نوجوانوں میں سے بھی انھیں رنگروٹ مل رہے تھے۔ انھوں نے دہشت انگیزی کا سلسلہ جاری کر دیا۔ وہ کمیونسٹوں اور دوسرے انتہا پسندوں کو موقع پا کر زدوکوب کرتے۔ جواب میں بھی تشدد استعمال ہوتا۔ فاشسٹ گروہ بھی موجود تھے، مثلاً "آتشیں صلیب[3]"۔ یہ گروہ فوج کے ایک سابق افسر کرنل ڈلاراق[4] نے منظم کیا تھا۔ سٹیوسکی کے قضیے کے بعد دائیں بازو کی طرف سے حکومت کے خلاف زبردست شورش شروع ہو گئی اور فروری ۱۹۳۴ء میں پیرس کے اندر شدید فسادات رونما ہوئے۔ بائیں بازو والوں نے تھوڑے عرصے کے لیے عام ہڑتال کر دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فرانس میں انقلاب بپا ہونے والا ہے۔

پھر ایک مرتبہ جمہوری قوتیں خطرے کی روک تھام کے لیے متحد ہو گئیں، جیسا کہ ڈریفس کے معاملے میں ہوا تھا اور جب بحران پر قابو پایا جا چکا تو فرانس کا رُخ پھر ایک مرتبہ بائیں جانب ہو گیا۔ فروری کے بحران پر تمام پارٹیوں کے اتحاد سے قابو پایا گیا۔ صرف شاہ پسند، اشتراکی اور کمیونسٹ باہر رہے، مگر فرینک کی قیمت پھر گرنے لگی اور قدامت پسند وزیر فلاندن[5] نے سرکاری مصارف کی تخفیف میں ویسی ہی کوشش کی جیسی دس سال پیشتر پوانکارے کے ماتحت کی جا چکی تھی۔ بائیں بازو کی قوتوں نے عوامی محاذ بنا لیا، جس میں انتہا پسند، اشتراکی اور کمیونسٹ شامل تھے۔ لیبر کنفیڈریشن (سی۔ جی۔ ٹی) اس کی حامی

---

[1] Stavisky

[2] Bayonne

[3] Fiery Cross فرانسیسی میں (Croix de Feu...)

[4] de la Rocque

[5] Flandin

تھی۔ اس کے کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں کے درمیان اختلاف عارضی طور پر ختم ہوچکا تھا۔ مئی ۱۹۳۶ء کے عام انتخابات میں کامیابی کے بعد عوامی محاذ نے وزارت بنائی۔ لیون بلوم[1]، جو اشتراکی تھا، وزیر اعظم بنا۔ عوامی محاذ اس حیثیت میں برسرِ اقتدار آیا، جیسے امریکہ میں کاروبار کے متعلق نئی روش اختیار کی گئی تھی۔ گویا عوامی محاذ کی پالیسی کو فرانس میں امریکہ کی نئی روش کا مترادف سمجھنا چاہیے۔ مزدور، سفید پوش، سرکاری ملازم، بہت سے کسان اور دکاندار اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ تخفیف کے کلاسیکی فارمولے فرانس کی بیماریوں کا علاج نہیں۔ وہ لوگ تخفیف کے گڑھ یعنی بینک آف فرانس پر براہِ راست حملہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس وقت تک ایک نجی ادارہ تھا اور عوام کا یہ یقین بالکل درست تھا کہ بینک آف فرانس "دوسو خاندانوں" کی تخلیق تھا جو فرانس کے اقتصادیات پر قابض تھے۔ عوام اس دولت کی زیادہ مساوی تقسیم کے خواہاں تھے، جو حکومت خرچ کررہی تھی، یعنی وہ ایک "فلاحی مملکت" کے طلبگار تھے۔

بائیں بازو کی کامیابی میں اور عوامل بھی شامل تھے۔ ہٹلر اور مسولینی برسرِ اقتدار آچکے تھے۔ مسولینی حبشہ میں کارروائیاں شروع کرچکا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی کو ازسرِنو مسلح کردینے کا آغاز کردیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں بہت سے فرانسیسیوں نے بائیں بازو کو اس لیے ووٹ دیئے کہ وہ اُن مفاہمتوں کے خلاف احتجاج کرسکیں، جو فرانسیسی مدبر ڈکٹیٹروں سے کررہے تھے۔ یہی دور تھا، جب روس کو جمعیّتِ اقوام میں شامل کیا گیا اور محسوس ہو رہا تھا کہ روس نازی جرمنی کے خلاف مغربی طاقتوں سے تعاون کی پالیسی پر چل رہا ہے، لہٰذا ماسکو نے فرانسیسی کمیونسٹوں پر دباؤ ڈالا کہ مسلسل مخالفت کی پرانی پالیسی چھوڑ دی جائے اور اس پالیسی نے بارہا ایوان مندوبین میں انھیں (کمیونسٹوں کو) شاہ پسندوں کے ساتھ ووٹوں پر مجبور کردیا نیز وہ اپنے مکروہ دشمنوں یعنی سوشلسٹوں سے تعاون کرتے رہے۔

فرانس کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ قوم عوامی محاذ کے حامیوں اور دشمنوں کے درمیان بٹی ہوئی تھی اور دونوں گروہ شدت سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ کاروباری طبقے اور کسان محاصل ادا کرنے میں دستور کے مطابق متامل تھے اور ان محاصل کے بغیر عمرانی سہولتوں کے مصارف ادا نہیں کیے جاسکتے تھے۔ اقتصادیات کے لیے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا کہ کم از کم مزدوروں سے کام لیا جائے۔ بلوم کی وزارت کے پیشِ نظر ایک عالیشان کام تھا، مثلاً یہ کہ مزدوروں سے ہفتے میں زیادہ سے زیادہ چالیس گھنٹے کام لیا جائے۔ بینک آف فرانس، ریلوں اور کارخانۂ اسلحہ کو جزواً قومی بنا لیا جائے۔ مزدوروں سے جھگڑے کی نوبت آئے تو جبری ثالثی کے ذریعے سے اس کا فیصلہ کرا لیا جائے۔ عمرانی فلاح کے دوسرے وسائل بھی اس پروگرام میں شامل تھے۔ بلوم نے اس پروگرام کے اکثر حصوں کے متعلق قوانین منظور کرا لیے، لیکن ان پر کامیابی سے عمل کا ہر دروازہ بند کرنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا گیا۔ کمیونسٹ تعاون کے لیے

---

[1] Leon Blum

تیار ہی نہ ہوے اور انھوں نے بلوم کی وزارت میں شامل ہونے سے ہی انکار کر دیا تھا، البتہ وہ پارلیمنٹ کے اندر مختلف ذریعے سے اس پر حملے کرتے رہتے تھے۔ کاروباری آدمی اس وجہ سے خوفزدہ ہو گئے کہ لیبر کنفیڈریشن (سی۔ جی۔ ٹی) کی رکنیت بہت بڑھ گئی تھی اور جون ۱۹۳۶ء میں فرانس کے صنعتی مزدوروں نے دھرنا دے کر بیٹھنے یا اندر جا کر کام نہ کرنے کا اقدام کر لیا تھا۔ یہ اس ڈرامائی حربے کا پہلا استعمال تھا، جسے امریکی موٹروں کے کارخانوں کے مزدوروں نے ۱۹۳۷ء میں اختیار کیا تھا۔

اس اثناء میں جرمنی، اٹلی اور ہسپانیہ کی جمہوریت دشمن حکومتوں نے نئی فتوحات حاصل کیں اور فرانس مجبور ہو گیا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کر کے اسلحہ تیار کرے، مگر سرمایہ تیزی کے ساتھ ملک سے باہر جا رہا تھا اور زردار طبقے اُن بڑے بڑے سرکاری قرضوں میں روپیہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، جس کے بغیر فرانس کی فوجوں کے لیے ضروری سرو سامان مہیا نہیں ہو سکتا تھا اور جنگ بالکل ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ آخر مارچ ۱۹۳۷ء میں بلوم رُک جانے پر مجبور ہو گیا۔ عوامی محاذ ٹوٹ گیا اور لیبر کنفیڈریشن کے لاکھوں نئے ممبر الگ ہو گئے۔ ساتھ ہی کمیونسٹوں اور ان کے مخالفوں میں از سر نو کشمکش شروع ہو گئی۔

منقسم فرانس

عوامی محاذ ٹوٹا تو ایک نیا دور شروع ہوا جس میں محکم واستوار وزارتیں قائم نہ ہو سکیں۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ انتہا پسند اشتراکی لیڈر دلادیا[1] نے فرانس کو روم و برلین کے محور کے خلاف فرانس کو برطانیہ کے ساتھ رکھا۔ تخفیف مصارف کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کیں۔ چالیس گھنٹے فی ہفتہ کام لینے کا پروگرام ترک کر دیا گیا۔ اس طرح فرانس کے اقتصادیات کو درہم برہم ہونے سے بچا لیا گیا، لیکن مزدوروں پر عوامی محاذ کی ناکامی کا بہت بُرا اثر پڑا۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں ایک عام ہڑتال ہونے والی تھی۔ ریل کے کارکنوں کو فوجی احکام کے تحت رکھ کر یہ ہڑتال روکی گئی۔ جن طبقوں کے پاس روپیہ اور املاک تھے، وہ اس بات پر بگڑ گئے کہ بلوم کو تجربہ کرنے کا موقع کیوں دیا گیا۔ ان میں سے اکثر کو یقین ہو چکا تھا کہ فرانس کی نجات ایک مطلق العنان حکومت پر موقوف ہے۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ "ہٹلر بلوم سے بہتر ہے۔" جس فرانس کو ۱۹۳۹ء میں جنگ سے سابقہ پڑا، وہ مادی ساز و سامان کے اعتبار سے صرف ناکافی حد تک تیار تھا۔ نفسیاتی اور روحانی اعتبار سے ملک منقسم تھا اور اہل ملک میں سے کسی کو پورا یقین نہ تھا کہ وہ لڑ رہے ہیں۔

فرانس کے ایک مؤرخ نے صدی کے چوتھے عشرے میں فرانسیسی روحیت کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا خلاصہ یوں پیش کیا۔

---

[1] Daladier

"جب کوئی بڑا آدمی اپنی قوت اور شخصیت کھو بیٹھتا ہے تو اسے ایک الم انگیز واقعہ سمجھا جاتا ہے، مگر جب کوئی قوم یقین و اعتماد کھو بیٹھتی ہے تو اسے ایک دردناک تباہی سمجھنا چاہیے۔ فرانس کے معاملے کی الم انگیزی کے سلسلے میں مجھے پیرس کے ایک دارالاقامہ کی میزبان کا قول یاد آگیا، جو سنہ ۱۹۳۷ء میں سنا تھا۔ قریب ہی ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لیے ایک پناہ گاہ بنائی گئی تھی۔ اس کے متعلق نوٹس دیکھ کر خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں جرمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں یہ پناہ گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ہماری پناہ گاہیں ناقص ثابت ہوں گی۔" وہ اس قوم کے فخر زمانہ کی آرزومند تھی، جس کی خاطر اس کے شوہر نے سنہ ۱۹۱۶ء میں اپنی جان قربان کی تھی۔ وہ اس قوم پر اعتماد رکھنا چاہتی تھی، جو اس کی پرورش اور غور و پرداخت کی ذمہ دار تھی، مگر اس کا اعتماد زائل ہو گیا تھا، ساتھ ہی اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ یہ سادہ سے الفاظ ایک بڑی قوم کی روحِ حیات کی ناکامی کا ڈرامائی ثبوت پیش کر رہے ہیں[1]۔"

---

[1] Modern France ص ۳۱۔

بہتروّاں باب

ریاستہائے متحدہ امریکہ

جنگ کا اثر

پہلی عالمی جنگ میں ریاستہائے متحدہ کے جانی اور مادی نقصانات برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ دشمن نے سازو سامانِ جنگ کے بعض کارخانوں میں تخریبی کارروائیاں ضرور کیں۔ ان کے سوا امریکہ کو براہِ راست کوئی مادی نقصان نہ اٹھانا پڑا۔ امریکہ کے مقتولین ایک لاکھ پندرہ ہزار اور مجروحین دو لاکھ چھ ہزار تھے۔ اس کے مقابلے میں فرانس کے مقتولین تیرہ لاکھ پچاسی ہزار اور مجروحین تیس لاکھ چوالیس ہزار تھے اور فرانس کی آبادی امریکہ کی ایک تہائی تھی۔ مزید براں خالص مادی نقطۂ نگاہ سے کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ کو جنگ سے فائدہ ہوا۔ اتحادیوں نے جنگی سازوسامان کے لیے آرڈر دے دیئے تھے، جن کی وجہ سے بھاری صنعتوں کو خصوصیت سے فائدہ پہنچا۔ جنگ ہی نے نیویارک کو مالیات کا ایک ایسا ترقی پذیر مرکز بنا دیا، جو کم از کم لندن کے برابر ضرور تھا۔ انیسویں صدی میں پاؤنڈ کی حکمرانی قائم رہی تھی، اب ڈالر نے اس حکمران کو تخت سے اتارنے کے لیے قدم اٹھالیا۔ اتحادیوں نے حکومتِ امریکہ سے قرضے لے لیے تھے۔ ان قرضوں پر ۱۹۳۳ء تک کسی قدر سود وصول ہوا۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ان قرضوں کے باعث صنعت و حرفت کو جو فائدہ ہوا، وہ اس نقصان سے بڑھا ہوا تھا، جو صدی کے چوتھے عشرے کے اوائل میں جنگی قرضوں کی منسوخی سے ہوا۔ گویا ریاستہائے متحدہ کو پہلی جنگ میں کوئی زخم نہ لگا۔ انھوں نے کامیابی حاصل کی اور خوشحالی سے شادکام ہوئیں۔

علیحدگی کا مسلک

تاہم بعض اعتبارات سے امریکہ کے اندر ۱۹۱۹ء میں، نیز اس کے بعد جنگ کے خلاف جو تنفر پیدا ہوا، وہ اتنا ہی نمایاں تھا، جتنا برطانیہ، فرانس اور شکست خوردہ جرمنی میں تھا۔ امریکہ میں اس تنفر نے علیحدگی کی شکل اختیار کی یعنی یہ کہ بین الاقوامی سیاسیات سے الگ تھلگ رہا جائے۔ لیکن یہ جذبۂ علیحدگی عام نہ تھا۔ اگرچہ آج کل عمرانی سیاستدانوں نے گوناگوں حالات معلوم کرنے کے بہترین نئے طریقے وضع کر لیے ہیں، لیکن دورِ حاضر کی بڑی بڑی مملکتوں میں "رائے عامہ" کی حیثیت و نوعیت کے متعلق بڑی حد تک بے یقینی کے امکانات موجود ہیں۔ یقیناً امریکہ کے اندر ۱۹۱۹ء میں اس مسئلے کی بابت گوناگوں رائے موجود تھی کہ امریکہ کو جمعیتِ اقوام کی رکنیت قبول کرنی چاہیے یا نہیں۔ مثلاً بعض گروہ کہتے تھے کہ ہر حالت میں شامل ہونا ضروری ہے، اور دوسرے

کہتے تھے کہ کسی بھی حالت میں شامل نہ ہونا چاہیے۔ ان کے بین بین بھی مختلف گروہوں کی رائیں تھیں۔

مؤرخین اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ کن اسباب و عوامل نے ۱۹۱۹ء میں امریکہ کو بین الاقوامی سیاسیات میں براہِ راست شرکت سے باز رکھا۔ بعض کا احساس ہے کہ لاکھوں انسانوں کی روش و تحریک کی بنا پر علیحدگی یقینی ہو گئی تھی۔ دوسرے سمجھتے ہیں کہ ذمہ دار اصحاب کے اقوال و اعمال میں خفیف سا تغیر آخری فیصلے کو تبدیل کر سکتا تھا اور امریکہ یقیناً جمعیتِ اقوام میں شامل ہو جاتا۔ اگر ڈیمو کریٹک پارٹی کا صدر ولسن سینٹ کے اندر ریپبلکن جماعت کے لیے (جو حزب مخالف تھی) چند رعایتوں کا انتظام کر دیتا یا سینٹ اور لاج[1] جیسے مخالفوں کے سامنے حسن تدبیر کی بنا پر خوشگوار الفاظ استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاتا تو سینٹ میں معاہدۂ ورسائی، جمعیتِ اقوام اور دوسرے معاملات کے لیے دو تہائی اکثریت حاصل کی جا سکتی تھی اور دستور کے رو سے معاہدوں کے لیے اتنی ہی اکثریت ضروری تھی یا اگر ریپبلکن جماعت کی طرف سے کوئی فردِ حسن تدبیر اور وقار سے کام لے کر خارجہ پالیسی میں دونوں پارٹیوں کے تصور کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتا تو صبر اور خیر سگالی کی بنا پر امریکہ کو جمعیتِ اقوام میں پہنچایا جا سکتا تھا، صرف معمولی سے تحفظات منظور کیے جاتے۔ جن لوگوں کی رائے یہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ "رائے عامہ" اس کام کو پورا کر دینے کے خلاف نہ تھی، جو ۱۹۱۷ء میں شروع ہوا تھا۔ صرف ایک شور مچانے والی اکثریت اور ضدی سینٹروں کا چھوٹا سا گروہ، جو برسرِ اقتدار تھا، ہم سے علیحدگی اختیار کر لینے کا خواہاں تھا۔

اس کے برعکس یہ بھی حقیقت ہے کہ نومبر ۱۹۱۸ء میں کانگریس کے ممبروں کا جو دو سالہ انتخاب ہُوا۔ اس میں ریپبلکن جماعت نے کامیابی حاصل کر لی (اس زمانے میں محاذِ جنگ سے اچھی خبریں آ رہی تھیں)۔ یہ اکثر لوگوں کے نزدیک اس حقیقت کا نشان تھا کہ ولسن کی معروف بین الاقوامی پالیسی کو ووٹروں کی اکثریت ناپسندیدہ سمجھنے لگی تھی۔ جن لوگوں کو ۱۹۱۸ء کے بعد کے واقعات یاد ہیں، وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ملک میں ایک عام لہر پہلی صورتِ حال پر لوٹ آنے کے لیے دوڑ گئی تھی۔ صدر ہارڈنگ نے یہی کہا تھا۔ بہت سے امریکیوں کا احساس تھا کہ جرمنوں کو شکست دینے کے لیے جو کچھ ضروری تھا، کر دیا گیا اور یورپی سیاسیات کی پیچیدگیوں میں الجھنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ امریکہ کی معصومیت اور فضیلت لدِب کی برائی اور موقع پرستی سے بری طرح آلودہ ہو جائے گی۔ امریکہ کا دستور یہی رہا کہ اس کے زبردست صدر جو پالیسی اختیار کرتے رہے، اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوتا رہا۔ چنانچہ ولسن نے پیرس میں جو کچھ کیا تھا، اسے بھی ایک غیر امریکی مستبد کا کام قرار دے کر منسوخ کر دیا گیا۔ مزید برآں مہینوں گفت و شنید جاری رہی اور فیصلہ نہ ہو سکا۔ اہلِ امریکہ بے صبر سے لوگ ہیں، انھوں نے سمجھ لیا کہ علیحدگی اختیار کر لینا ہی ان کے لیے بہترین طریقِ عمل ہے۔

---

[1] Lodge

معاہدۂ ورسائی جس کے ساتھ ولسن کی طرف سے جمعیت اقوام پر اصرار کیا گیا تھا، ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو سینٹ میں آخری مرتبہ ٹھکرا دیا گیا۔ چونکہ ولسن نے کانگرس اور سینٹ کی مشترکہ قرارداد کو (جو جرمنی کے ساتھ جداگانہ صلح پر مبنی تھی) ویٹو کے ذریعے روک دیا، اس لیے امریکہ از روئے قانون جولائی ۱۹۲۱ء تک جرمنی سے برسرِ جنگ رہا۔ پھر ہارڈنگ کی صدارت کے زمانے میں ویسی ہی ایک قرارداد منظور ہوئی جس نے حالتِ جنگ ختم کی۔ اس زمانے میں امریکہ کی علٰحدگی بعض اور مثبت تدابیر کی شکل میں بھی نمایاں ہوئی۔ مثلاً ۱۹۲۲ء میں فورڈنے میکمبر[۱] اور ۱۹۳۰ء میں سموٹ ہالے[۲] کی طرف سے جو بحری محاصل پیش ہوئے، ان کی وجہ سے پے در پے غیر ملکی سامان کے خلاف بہت زیادہ حفاظتی محاصل عائد کر دیئے گئے اور یوں اہلِ امریکہ کے اس عقیدے پر زور دیا گیا کہ وہاں کی اعلیٰ اجرتوں کو اجنبیوں کی ارزاں اجرتوں سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس دوران میں امریکہ نے برابر اصرار جاری رکھا کہ اتحادیوں کو جو قرضے دیئے گئے تھے، وہ ادا کیے جائیں۔ صدی کے تیسرے عشرے میں یہ اصرار برابر جاری رہا۔ یہ درست ہے کہ قرضے مفاہمتوں کے ایک سلسلے میں ادا کر دیئے گئے اور چونکہ اس معاملے کا گہرا تعلق جرمنی کے تاوان سے تھا، لہٰذا امریکہ نے برابر اصرار جاری رکھا کہ جرمنوں پر واجبات کا پیمانہ گھٹایا جائے، مگر کانگرس نے اس دلیل پر کوئی توجہ نہ کی، حالانکہ اکثر ماہرینِ اقتصادیات کے نزدیک یہ بڑی قوی تھی۔ یورپی قومیں قرضے اسی صورت میں ادا کر سکتی تھیں کہ اپنا مال امریکی منڈیوں میں بیچ کر ڈالر حاصل کر لیتیں اور امریکہ نے محاصل کی دیواریں کھڑی کر کے قرضوں کی ادائی ناممکن بنا دی تھی۔ کانگرس کے ممبروں نے بین الاقوامی قرضوں کی پیچیدگیوں کو صدر کولج کے سادہ سے جملے کی شکل دے دی، یعنی "انھوں نے ہم سے قرضہ لیا تھا، کیا اس میں کوئی شبہہ ہے؟"

صدی کے تیسرے عشرے میں غیر ملکیوں کے امریکہ آنے پر جو پابندیاں عائد کی گئیں، ان کی تہہ میں بھی علٰحدگی کی روح کارفرما تھی۔ پیشتر تقریباً تمام لوگ آزادانہ آسکتے تھے۔ اب یہ امریکی پالیسی منقلب کر دی گئی۔ ۱۹۲۴ء میں جو قانون بنا، اس میں ہر ملک کے لیے ایک سالانہ تعداد مقرر کر دی گئی، یعنی ۱۸۹۰ء میں ہر ملک کے جتنے باشندے امریکہ میں موجود تھے، ان کا دو فی صد آسکتے تھے۔ چونکہ مشرقی اور جنوبی یورپ سے لوگوں کی زیادہ بڑی تعداد ۱۸۹۰ء کے بعد آئی تھی، لہٰذا باہر سے لوگوں کے آنے کے لیے جس سال کو بنیاد مانا گیا، اس کے مطابق مشرقی و جنوبی یورپ سے تعداد محض برائے نام رہ گئی۔

بین الاقوامی قیادت کا راستہ

جس دور میں ریاستہائے متحدہ امریکہ مفروضہ علٰحدگی کی پالیسی پر کاربند تھیں، وہ بین الاقوامی سیاسیات سے کاملاً دستکش نہ ہوئیں، بلکہ وہ ایک آزاد و خود مختار حکومت کی حیثیت میں، جس نے کسی سے رسمی اتحاد نہیں کر رکھا تھا، اس طریق پر کاربند رہیں جو اکثر اہلِ امریکہ کے نزدیک

---

[۱] Fordney-Maccumber

[۲] Smoot Hawley

عام ملکی پالیسی تھی۔ لیکن اس پالیسی نے رفتہ رفتہ امریکہ کو اُن بڑی قوموں کے خلاف صف آرا کر دیا، جو دو عالمی جنگوں کے درمیانی دور میں خلل انگیزی کی طرف مائل رہیں۔ صدی کے چوتھے عشرے میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کے خلاف امریکہ کے فیصلے بالکل واضح ہو چکے تھے۔ لیکن اس سے پیشتر بھی امریکہ عمداً آمادۂ کار تھا۔ فرینکلن روز ویلٹ کی ڈیموکریٹک حکومت ۱۹۳۳ء میں برسرکار آئی۔ اس سے پیشتر بھی امریکہ ایسے اعلانات کر چکا تھا، اگرچہ وہ سخت دل متفکروں کو بالکل مبہم اور بے معنی نظر آئیں۔

۱۹۲۸ء میں ریپبلکن پارٹی کے وزیر کیلوگ[۱] نے بڑی یورپی طاقتوں کے سامنے ایک تجویز پیش کی جس کا مدعا یہ تھا کہ وہ جنگ سے دست برداری کا اعلان کریں۔ اسی قسم کی تجویزیں فرانس کے وزیر خارجہ بریاں نے پیش کیں۔ اگست ۱۹۲۸ء میں یہ تجاویز معاہدۂ پیرس کے نام سے منظور ہوئیں اور عموماً "کیلوگ بریاں میثاق" کے نام سے شہرت پائی۔ لبعد ازاں ستئس قوموں نے اس پر دستخط کر دیے۔ ان میں جمہوریۂ امریکہ بھی شامل تھی۔ آج کل دستور ہو گیا ہے کہ یہ میثاق بے معنی قرار دیا جائے اور اسے مہملیت کا شاہکار بتایا جائے، جیسے الگزانڈر اول، زار روس کا مقدس اتحاد مہمل تھا۔ یقیناً یہ درست ہے کہ اس سے دوسری عالمی جنگ رُک نہ سکی، لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس کے ذریعے سے جمہوریۂ امریکہ نے امنِ عالم سے اپنی وابستگی کا مثبت ثبوت پیش کر دیا۔

سینکڑوں طریقوں پر جمہوریۂ امریکہ نے دنیا بھر کی قیادت کے لیے داغ بیل ڈالی، آخر دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ اس رتبے پر پہنچ گئی۔ امریکہ کے کاروباری آدمی ہر جگہ موجود تھے۔ امریکی قرضوں کی بدولت جرمنی کی صنعتی عظمت از سرِ نو زندہ ہو گئی۔ امریکہ کی موٹریں، ریفریجریٹر، ٹائپ رائٹر، ٹیلیفون اور درجنوں دوسری ضروری چیزیں ہر جگہ فروخت ہو رہی تھیں۔ مشرقِ بعید میں جمہوریۂ امریکہ نے ۱۹۲۲ء میں نو طاقتوں کے ایک معاہدے کا انتظام کیا تھا جس میں وہ خود، جاپان اور دوسری بڑی طاقتیں شامل تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ چین کی برتری اور وحدت کا احترام کیا جائے۔ اگر ۱۹۴۱ء میں صدر روز ویلٹ نے یہ کوشش کی کہ جاپان کو چین اور مشرقِ بعید کے دوسرے علاقے ہڑپ کر جانے سے روکیں تو روز ویلٹ اسی پالیسی پر چل رہا تھا جو صدر ہارڈنگ کے ماتحت طے ہوئی تھی۔ سب سے آخر میں یہ کہ روز ویلٹ کے انقلاب سے پیشتر صدر ہوور کی وزارت نے وہ دستاویز شائع کی جو "یاداشت کلارک[۲]" کے نام سے مشہور ہوئی (۱۹۳۰ء)۔ اس میں بیان کیا گیا کہ منرو کے اصول کو امریکہ کی مختلف دولتوں کے باہمی تعلقات سے کوئی تعلق نہیں۔ جمہوریۂ امریکہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بحری فوج لاطینی امریکہ کے ساحل پر نہیں اتارے گی، بلکہ پورے امریکی براعظم کے اتحاد کو استوار کرے گی۔

غیر معمولی ترقی اور غیر معمولی تنزل

داخلی معاملات میں کولج کا عہد (۱۹۲۳ء ــ ۱۹۲۹ء) اب افسانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ غیر معمولی خوشحالی کا دور تھا۔ ہر شخص

---

[۱] Kellogg

[۲] Clark Memorandum

سٹاک ایکسچینج میں کاروبار کرتا تھا اور وہاں چیزوں کے بھاؤ بہت بڑھ گئے تھے۔ اس زمانے میں مسکرات کی ممانعت ہو چکی تھی۔ اور ناجائز شراب درآمد کرنے والوں کا زور تھا۔ عورتیں چھوٹے لہنگے پہنتی تھیں۔ مغرب کی تاریخ میں ایسے چھوٹے لہنگوں کی غالباً کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہی زمانہ ہے جس میں جنسی روابط اور گناہگاری کی دوسری شکلوں کا بازار گرم تھا۔ یہ زمانہ انیسویں صدی کے آخری عشرے جیسا تھا، جسے "شریر عشرہ" قرار دیا جاتا ہے، لیکن آج کل ہم اسے حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ بڑا رومانی اور رنگین زمانہ تھا۔ لیکن کولج کے دور کا پورا نقشہ "عہد جاز" کے ناولوں میں نہیں مل سکتا: مثلاً سکاٹ فٹز جیرلڈ[1] کا ناول "گیٹسبی اعظم"[2] یا سنکلیر لیوس[3] کے نیم مزاحی ناول "بیبیٹ"[4] اور "بڑا بازار"[5]۔ اس دور میں نمایاں صنعتی ترقی ہوئی۔ قومی کارخانوں اور ان کی صلاحیتِ کار میں بہت اضافہ ہو گیا۔ یہ حقیقت عموماً اس لیے نظر انداز کی جاتی ہے کہ صنعتی ترقی کی وجہ سے سٹے کا کاروبار بہت بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے میں جمہوریۂ امریکہ کا نظامِ معیشت مستقل طور پر پھیل رہا تھا۔ پہلے یہ معیار صرف چند افراد تک محدود تھا۔ اہلِ علم اسے پست اور ناکافی سمجھتے۔ بہ ایں ہمہ دنیا میں یہ چیز نئی تھی۔ اس زمانے میں اگر آپ کے پاس کوئی ملازمہ ہوتی تو اس کا برسرِ کار رہنا یقینی نہ تھا، بلکہ اسے مطمئن رکھنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی۔ یہ زمانہ تھا جس میں حقیقی نشان نہ ہالی وڈ کا کردار تھا، نہ علم، نہ صنعت کی کوئی بڑی ترقی، نہ کوئی بڑا غنڈا، بلکہ صدر کولج اس کا نشان تھا، جو بڑا سنجیدہ، محنتی اور حقیقت پسند آدمی تھا۔

۱۹۲۹ء کے موسمِ خزاں میں بڑا کساد شروع ہوا تو اس دور کی چمک دمک بھی ختم ہو گئی۔ ۱۹۲۸ء میں سٹا کمال پر پہنچا رہا۔ جنسوں کی قیمتیں دگنی ہو گئیں۔ سٹے باز اس امید پر سب کچھ کر رہے تھے کہ پوری جنسیں دگنے منافع پر جلد سے جلد بیچ لیں۔ وہ حصے اصل قیمت پر خریدتے تھے اور قیمت کا صرف ایک جزو نقد ادا کرتے تھے۔ وہ جزو بھی اکثر قرض لے لیتے۔ محض جنسیں ہی نہیں، بلکہ بعض دوسری خریداریاں بھی قرض پر لیے ہوئے روپے سے کی جاتی تھیں۔ قرض اتنا بڑھ گیا کہ بڑی بے قاعدہ اقتصادیات میں اس کی بنیاد محکم نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ آخر جو سرمایہ دار دور اندیش تھے، انھوں نے اپنی چیزیں اس خیال سے فروخت کر دیں کہ یہ بلبلا پھوٹنے کے قریب پہنچ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنسوں کی قیمتیں اکتوبر ۱۹۲۹ء کے آغاز میں تباہی خیز حد تک گر گئیں اور تنزل کا یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ اس طرح سٹے باز اور انھیں روپیہ قرض دینے والے لوگ دونوں تباہ ہوئے۔

کساد کا فوری سبب یہ ہوا کہ سٹاک ایکسچینج پر تباہی آئی۔ باقی سب سے زیادہ گہرے اسباب تو طلبائے اقتصادیات

---

[1] Scott Fitzgerald

[2] The Great Gatsby

[3] Sinclair Lewis

[4] Babbitt

[5] Main Street

ان پر آج بھی متفق الرائے نہیں۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ سرمایہ دار معاشرے میں کاروبار کے چکّر لازماً پیش آتے رہتے ہیں۔ کبھی انتہائی خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے، کبھی سخت بدحالی کا زمانہ آجاتا ہے۔ ساتھ ہی کہتے ہیں کہ یہ چکّر بہ اعتبارِ میعاد، مختلف ہوتے ہیں، بعض بہت مختصر، بعض متوسط اور بعض بے حد طویل۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے آخر میں مختلف چھوٹے چھوٹے چکّر غیر معمولی تعداد میں جمع ہو گئے تھے، اسی وجہ سے بہ طور خاص نازک کساد پیدا ہوا۔ دوسرے لوگ، جو مارکس کی آرا سے متاثر نہیں، کہتے ہیں کہ امریکی سرمایہ داری میں ہر مرتبہ شدید تر بدحالیوں کا آنا ناگزیر ہے۔ اگر اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تو صرف اسی وجہ سے ہی کہ امریکی اقتصادیات کا پیمانہ بہت وسیع ہے۔

یہ یقینی ہے کہ کولج کے عہد کی خوشحالی بہترین دور میں بھی امریکی اقتصادیات اور امریکی معاشرے کے مختلف حصّوں کے درمیان غیر مساوی طور پر منقسم ہوئی تھی۔ صدی کے تیسرے عشرے میں زراعت مستقل طور پر کساد کے باعث نقصان اٹھاتی رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر کسانوں کو جنسوں کی اعلیٰ قیمتیں مل رہی تھیں۔ ملکی اور بیرونی منڈیوں میں ان کے مال کے لیے مسلسل طلب جاری تھی۔ چنانچہ انھوں نے پیداوار بڑھالی اور اس سلسلے میں روپیہ قرض لیا۔ اکثر انھیں بہت زیادہ سود دینا پڑا۔ تیسرے عشرے کے آغاز میں حالات معمول پر آ گئے۔ باہر کی منڈیوں میں مانگ نہ رہی۔ ملکی منڈیوں میں بھی زرعی جنسوں کی ضرورت کم ہو گئی تو قیمتیں تیزی سے گر گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمینیں رہن ہونے لگیں۔ جو لوگ اُجرت پر کام کرتے تھے، انھیں کسانوں کے برابر تو ضرب برداشت نہ کرنی پڑی، مگر تیسرے عشرے کے دوران میں ان کی قوتِ خرید کچھ زیادہ نہ بڑھ سکی۔ وہ لوگ کبھی کوئی مکان یا موٹر خرید کر اپنا معیارِ معیشت بلند کرتے رہے، مگر یہ سب کچھ ادھار لیتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ روپیہ یا تو زمین رہن رکھ کر ادا کیا جائے گا یا لمبی قسطوں میں چکا دیا جائے گا۔ کولج کے عہد میں جن لوگوں نے زیادہ روپیہ پیدا کیا، وہ سارا کاروبار اور خصوصاً بڑے کاروبار میں لگا دیا گیا۔

بڑا کساد دنیا بھر کے اکثر ملکوں کے لیے بہت مصیبت خیز تھا، لیکن اس نے جو حالت جمہوریۂ امریکہ میں پیدا کی، وہ کہیں بھی پیش نہ آئی۔ اس کا سرسری اندازہ صرف اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ چوتھے عشرے کے اوائل میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ امریکی بے روزگار تھے۔ یہ قوم کی قوتِ کار کا کم از کم ایک تہائی حصّہ تھے۔ جس شے کو ماہرینِ اقتصادیات مجموعی قومی پیداوار کہتے ہیں، جمہوریۂ امریکہ کے محکمۂ تجارت نے اس کی مقدار ۱۹۲۹ء میں ایک کھرب تین ارب بیاسی کروڑ اسی لاکھ ڈالر رکھی تھی، اور ۱۹۳۳ء میں یہ عدد گھٹ کر پچپن ارب چھہتر کروڑ ڈالر پر آ گیا، یعنی ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں نصف سے کسی قدر زیادہ رہ گیا۔

امریکی اقتصادیات کے اس شدید بحران میں خاص طور پر مستحق توجہ یہ امر ہے کہ نہ اس سے بغاوت کے لیے کوئی منظم تحریک جاری ہوئی اور نہ انقلاب کا خطرہ پیدا ہوا۔ چوتھے عشرے کے اہلِ علم یقیناً عمرانی شعور کی طرف متوجہ ہوئے۔ مصنفوں اور فنکاروں میں سے بعض مارکسیت کے معتقد بھی بن گئے، لیکن باقی آبادی نے یہ بنیادی عقیدہ نہ چھوڑا کہ

راہِ نجات آئینی ذرائع ہی سے مل سکتی ہے اور امریکہ نے جو ادارے مہیا کر رکھے ہیں، انھیں سے کام لینا چاہیے۔ وہ اس عقیدے کو چھوڑ کر انقلابی عقیدے کی طرف نہ آئے۔ فرینکلن روزویلٹ کا انتخاب ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اس سے پیشتر اربابِ اختیار اور نجی اداروں نے ۱۹۳۲ء کے اوائل میں ایک فیڈرل ری کنسٹرکشن فائینینس کارپوریشن[1] قائم کر لی تھی، تاکہ جو اثاثے ضبط ہو چکے تھے، انھیں چھوڑ دیا جائے۔ اس سے بے روزگاروں کی بدترین تکالیف کم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

روشِ جدید

ریپبلکن پارٹی کا صدر ہوور (۱۹۲۹ء۔۱۹۳۳ء) آزاد تجارت کے فلسفے پر قائم رہا۔ مالیات کے لیے جس کارپوریشن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اس کے سوا ہوور نے کساد کے اثرات دور کرنے کے لیے کوئی زیادہ کام نہ کیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی ۱۹۳۲ء کے انتخابات میں کامیاب ہوئی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے قوم کی طرف سے کوئی بنیادی قدم اٹھانے کا اجازت نامہ مل چکا ہے۔ اس پارٹی کے صدر فرینکلن روزویلٹ (۱۹۳۳ء۔۱۹۴۵ء) نے ۴ مارچ ۱۹۳۳ء کو عہدۂ صدارت سنبھالا۔ اس زمانے میں مالی بحران کے باعث ملک بھر کے اندر بینک بند ہو چکے تھے۔ روزویلٹ نے کانگرس کا ایک غیر معمولی اجلاس طلب کیا اور بینکوں کی تعطیل کا اعلان کر دیا۔ ۹ مارچ کے اجلاس میں کانگرس نے صدر کے اس فعل کو آئینی قرار دے دیا۔ رفتہ رفتہ محکم مالی ساکھ والے بینک کھلے اور "روشِ جدید" جاری ہوئی۔ اس تدبیر پر عمل کے دوران میں امریکہ کے کاروباری لوگوں کی حالت بہتر ہو گئی۔ ساتھ ہی وہ روزویلٹ اور اس کے کاموں کے سخت مخالف ہو گئے، لیکن ۱۹۳۳ء کے اوائل میں محض اس حقیقت نے قومی ہمت و حوصلہ کی بحالی میں زبردست مدد دی کہ قومی نظام صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہا ہے۔ بینکوں کی تعطیل ختم ہوئی تو قوم میں نیا اعتماد پیدا ہو چکا تھا اور روزویلٹ کے افتتاحی خطبے کا یہ فقرہ دہرایا جا رہا تھا۔ "ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ خوف سے بچنا چاہیے۔"

"روشِ جدید"[2] جزواً مختلف وسائل کا ایک سلسلہ تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ فوری مشکلات ختم ہو جائیں۔ جزواً یہ ایسے وسائل کا سلسلہ تھی جس کے ذریعے سے امریکی معاشرے کے ڈھانچے میں مستقل تغیرات پیدا کرنے منظور تھے۔ فوری اور مستقل وسائل میں امتیاز ایک لحاظ سے ذاتی رائے پر مبنی ہو گا، کیونکہ جن لوگوں نے ان سلسلہ ہائے وسائل پر عمل کیا، وہ خود نہیں جانتے تھے کہ کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں ان وسائل سے زیادہ دلچسپی ہے جن کے اثرات مستقل تھے۔ مغربی تاریخ کے منظر میں نئی تدبیر کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ "بڑے کساد" کے خاص دباؤ کے تحت امریکہ میں ایسے وسائل اختیار کیے

---

[1] Federal Reconstruction Finance Corporation — R.F.C.

[2] New Deal

گئے۔ جنھیں مخالفین اشتراکی وسائل سمجھتے تھے۔ برطانیہ اور جرمنی جیسے یورپی ملکوں میں ایسے وسائل دیکھ چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک "فلاحی مملکت" پیدا کرنا مقصود تھا۔

نئی تدبیر کے فوری مسائل کا مقصد یہ تھا کہ امریکی چیزوں کی قیمتیں گھٹ جائیں، کیونکہ دنیا معیارِ زر ترک کر چکی تھی اور ڈالر سونے سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس ذریعے سے مالی کارپوریشن کی سرگرمیوں کو پھیلا کر قرض کا انتظام کر دینا مقصود تھا۔ پھر حکومت کی طرف سے قرض کی نئی انجمنیں بن گئیں، مثلاً مالکان مکان کے قرضے کی انجمن[1]۔ اس طرح بے روزگاری کے کم ہو جانے کی امید تھی۔ فیڈرل ڈیپازٹ انشورنش کارپوریشن[2] کے ذریعے سے بنکوں کی امانتیں محفوظ ہو گئیں۔ سکیوریٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن[3] کے ذریعے سے سٹے اور بازاروں کے نرخوں میں باقاعدگی پیدا کر لی گئی۔ ان وسائل کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ کوئی نجی کاروبار یا کسی ایک ریاست یا مقامی حکام کا کام نہ تھا، بلکہ یہ سب کچھ فیڈرل حکومت نے کیا۔

البتہ مستقل وسائل زیادہ اہم تھے۔ ۱۹۳۵ء میں سوشل سکیورٹی ایکٹ[4] بنا۔ اس کے ذریعے سے جمہوریۂ امریکہ میں بے روزگاری، بیماری اور مزدوری سے سبکدوشی کے لیے قومی پیمانے پر ویسے ہی الاؤنس منظور کر دیے گئے، جیسے بسمارک نے جرمنی میں اور لائڈ جارج نے برطانیہ میں جاری کیے تھے۔ فیڈرل محاصل، خصوصاً افراد اور کمپنیوں کی آمدنی پر انکم ٹیکس کو قومی پیداوار کی زیادہ مساوی تقسیم کے لیے استعمال کیا گیا۔ کانگرس نے مزدوروں کے متعلق متعدد قوانین منظور کیے، جن کے ذریعے سے امریکہ کی اقتصادی زندگی میں مزدوروں کے کردار کو تقویت پہنچی اور اس میں توسیع ہوئی۔ اسی طرح زراعت کے متعلق قوانین کا ایک سلسلہ منظور ہوا۔ ان کے مطابق کھیتی باڑی تو لاکھوں کاشتکاروں کے ہاتھوں میں رہی، جن کا کام یہ تھا کہ بازاروں میں جنسیں پہنچائیں اور نقد روپیہ لیں، تاہم فصلوں کی کاشت اور قیمتوں میں اس درجہ باقاعدگی پیدا کر دی گئی، جو انیسویں صدی کے کاشتکاروں کے نزدیک ناقابلِ تصور تھی۔ سب سے آخر میں "نئی تدبیر" کے مطابق ایک نمائشی مرقع بھی تیار ہوا۔ ایک بڑے خطے میں پلاننگ بورڈ یعنی وادی ٹنسی[5] کی ہیئت مقتدرہ نے حکومت کے اقتدار سے کام لے کر ایک نسبتاً پسماندہ خطے کو اعلیٰ درجے کی اقتصادی اور عمرانی زندگی کا نمونہ بنا دیا۔ طغیانیوں کو روک دیا گیا، زمینوں کے کٹنے پھٹنے کے تمام سلسلے ختم کر دیے۔ دور دور تک ارزاں نرخوں پر بجلی مہیا کر دی گئی۔ اس سلسلے میں جو بند تیار کرنے

---

۱ Home Owners' Loan Corporation

۲ Federal Deposit Insurance Corporation

۳ Securitres and . . . Exchange Commission یعنی ضمانتوں اور مبادلے کا کمیشن

۴ Social Security Act

۵ The Tennessee Valley Authority

پڑے، ان کا خرچ حکومت نے خود برداشت کیا۔

"روشِ جدید" پر نظرِ بازگشت

۱۹۳۳ء میں بینکوں کے لیے تعطیل کی منظوری ہوئی تھی۔ بیس سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی، مگر اہلِ امریکہ "روشِ جدید" پر بحثیں کر رہے تھے۔ یقیناً اس کی وجہ سے جمہوریۂ امریکہ کا معاشرہ بیسویں صدی کے وسط میں اس سے بہت مختلف تھا، جس کا تصور کلاسیکی ماہرینِ اقتصادیات نے قائم کر رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے نے آج تک آزادانہ کاروبار کی اس نظری انتہا سے مطابقت پیدا نہیں کی کہ ہر آدمی جو چاہے، بیچے اور جو چاہے، خریدے یا جو آدمی روزی پیدا نہ کر سکے، وہ بھوکوں مر جائے، مگر ایک لحاظ سے جمہوریۂ امریکہ سنہ ۱۸۷۰ء میں ایسا ہی معاشرہ پیش کر رہی تھی، لیکن جس جمہوریۂ امریکہ میں "نئی تدبیر" پر عمل ہوا، اس کا معاشرہ سابقہ معاشرے سے بہت مختلف ہے۔

آزاد مقابلے کے ہنگامے پر اجتماعی عمل اور حکومت کے قواعد و ضوابط سے مناسب پابندیاں لگ چکی ہیں، کیونکہ واضح ہو چکا ہے، ایسا مقابلہ بے روک ٹوک جاری رہنے سے وہ چیز باقی نہ رہے گی، جسے انسان بطورِ خاص قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ اگر آج ہر شخص کو اجازت دے دی جائے کہ جتنی ٹراؤٹ[1] مچھلیاں وہ پکڑنا چاہے یا پکڑ سکے، پکڑے تو ظاہر ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں یہ مچھلیاں ختم ہو جائیں گی، لیکن اکثر اہلِ امریکہ مچھلی اور شکار کے قوانین منظور کیے بیٹھے ہیں اور شکارگاہوں کے پاسبانوں کی مدد سے ان قواعد کی پابندی کر رہے ہیں۔ عمومی حیثیت میں انھیں معلوم ہو چکا ہے کہ طبعی وسائل کی حفاظت کے لیے حکومت کے قواعد و ضوابط کی ضرورت ہے۔ بہ ایں ہمہ جب چراگاہوں یا کھیتی باڑی کے ایسے طریقوں کا معاملہ سامنے آتا ہے، جن کی وجہ سے زمین کے کٹنے پھٹنے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو بہت سے امریکی حکومت کی مداخلت پسند نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کے "حقوق" پر زد پڑتی ہے۔

جب دولت و ثروت کے عملی تصرف، بلکہ اس کی تقسیم کا معاملہ سامنے آتا ہے تو اُس وقت بھی اہلِ امریکہ آزادیِ عمل کے لیے پابندیاں قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس مسئلے پر "نئی تدبیر" کے بعد بھی ضوابطِ حکومت اور نجی کاروبار کے حامیوں میں کشمکش جاری ہے۔ مارکس کے پیرووں کا یہ دعویٰ کاملاً درست نہیں کہ جس معاشرے میں مقابلہ ہو، اس کے اندر اہلِ ثروت زیادہ دولت حاصل کر لیتے ہیں اور غریب غریب تر ہوتے جاتے ہیں، لیکن گزشتہ دو سو سال کی تاریخِ مغرب سے واضح ہوتا ہے کہ اگر حکومت کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے تو دورِ حاضر میں دولت و ثروت کے لیے مقابلہ ایک ایسا معاشرہ پیدا کر دے گا، جو بہ لحاظِ وضع مخروطی ہو، یعنی ایسا معاشرہ، جس کی چوٹی پر بڑے بڑے دولتمند ہوں گے۔ پھر ایسے آدمی جن کا گزارہ بخوبی ہوتا ہو۔ سب سے نیچے انسانوں کی

---

[1] Trout میٹھے پانی کی ایک مچھلی جس کا گوشت بہت لذیذ مانا جاتا ہے۔

اکثریت، جو بمشکل زندگی کے دن گزار سکتے ہوں۔ تاہم ہمارے مغربی معاشرے میں جمہوریت نے بے شمار عوام کو جو سیاسی اختیارات دیئے ہیں، وہ سالہا سال سے اس مخروطی عمرانی شکل کو بدلنے کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ دولتمندوں پر زیادہ سے زیادہ محاصل عائد کیے گئے۔ غریبوں کے لیے حکومت کی امداد ضروری قرار دی گئی۔ اس طرح مخروطی شکل کو اس حالت پر لانے کی کوشش کی گئی کہ وہ نوکدار رہنے کے بجائے ہموار و مسطح ہو جائے، چوٹی کو کاٹ کر نیچے لا یا جائے۔ زیریں حصہ رفتہ رفتہ بلند کیا جائے۔ جو شکل پیدا ہو رہی ہے، وہ مخروطی تو نہ رہے گی، بلکہ الماس کی سی ہوگی، جو درمیان سے چوڑا ہوتا ہے۔ یقیناً یہ انسانی معاشرہ ایسا نہیں کہ اسے کامل عمرانی و اقتصادی مساوات کا نمائندہ قرار دیا جا سکے۔

بہر حال دورِ حاضر کے امریکہ میں اوپر اور نیچے سے معاشرے کو مسطح بنانے کی کوشش جاری ہے۔ وادی ہڈسن[1]، نیوپورٹ[2] اور کیلیفورنیا کے بڑے بڑے امرائی محل برقرار نہیں رکھے جا سکتے، کیونکہ ان پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ انھیں یا تو عجائب خانے بنایا جا رہا ہے یا مختلف اداروں کے کام میں لایا جا رہا ہے۔ شہروں میں غریبوں کے بدترین مکانوں کو آہستہ آہستہ صاف کر کے دورِ حاضر کے تعمیراتی منصوبے بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے دولتمند اب بھی موجود ہیں، کم از کم ٹیکساس[3] میں، لیکن زیادہ غریبوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ اس اثنا میں پوری قومی پیداوار بڑھ گئی۔ بہر حال مقررہ قومی آمدن زیادہ مناسب طریق پر تقسیم ہو رہی ہے۔ اگرچہ قدامت پسند شکائتیں کرتے رہے کہ عمل تسطیح کے باعث محنت و مشقت اور ایجادات کے لیے محرک باقی نہیں رہے، تاہم حقیقی قومی آمدنی میں ۱۹۳۲-۳۳ء سے — جو انتہائی کساد کا دور تھا — بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اب تقسیم کے لیے زیادہ چیزیں موجود ہیں۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ "روشِ جدید" سے جو امریکی معاشرہ بروئے کار آیا وہ "اشتمالی نہیں"، اسے اشتراکی قرار دینا بھی درست نہ ہوگا۔ بیسویں صدی کی جمہوریۂ امریکہ مخلوط اقتصادیات کی جمہوریت ہے، جس میں انفرادی اقتصادی سرگرمی — مزدور، مالک یا منیجر کی سرگرمی — کے لیے پابندیاں اور ضابطے بنا دیئے گئے ہیں، مگر حکومت کی طرف سے اسے کاملاً ضبط و نظم میں نہیں رکھا گیا۔ جمہوریۂ امریکہ میں اب بھی اقتصادی سرگرمی کا غیر معمولی دائرہ موجود ہے، جس میں "اشتراکی" ڈاک خانے سے بڑی بڑی صنعتیں — جو بجائے خود معاشرے بلکہ حکومتیں ہیں، ان کے اپنے انتظامی مسائل اور دفتری نظام ہیں — اور چھوٹے چھوٹے آزاد کاروبار تک شامل ہیں۔

مطمئن امریکہ

اگرچہ امریکی اب بھی "روشِ جدید" کے متعلق جھگڑتے رہتے ہیں، لیکن یہ حقیقت نمایاں ہے کہ روزویلٹ کے عہد میں جو تدبیریں اختیار کی گئیں، انھوں نے امریکی اداروں اور ثقافت کی طبعی قوت کے

---

[1] Hudson Valley

[2] New Port

[3] Texas

بل پر امریکہ کو کساد سے کم از کم جزوًا نجات دلادی اور اہلِ امریکہ کا اعتماد اعلیٰ پیمانے پر بحال ہو گیا۔ دورِ حاضر کے امریکہ میں اہلِ علم کا کردار کاروباری آدمیوں کے خلاف رہا ہے اور تیسرے عشرے میں وہ لوگ امریکہ کو ایک ایسا روبہ زوال اور مبتذل معاشرہ قرار دے رہے تھے جس کے بچاؤ کی کوئی امید نہ ہو، لیکن چوتھے عشرے میں اکثر اہلِ علم روشِ جدید کے نئے طریق کے حامی بن گئے، اگرچہ بعض نے مارکسیت سے نامہ و پیام جاری رکھا۔

جب یورپ میں جنگ شروع ہوئی تو اہلِ امریکہ — جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا — مضطرب تھے کہ اپنی اس خوشحالی کو معرضِ خطر میں نہ ڈالیں، جو اس وقت تک مذبذب حالت میں تھی۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ اگر یورپ کو جنگ پر اصرار ہے تو امریکہ غیر جانبدار رہے، مگر جمہوریۂ امریکہ سنہ ۱۹۴۰ء کے فرانس کی طرح ایک تکان زدہ اور منشکک سرزمین نہ تھی جس کے مختلف طبقے اصولی اعتبار سے منقسم اور باہم دشمن تھے۔ روزویلٹ اور اس کے ریپبلیکن حریف ایک دوسرے کی تذلیل کرتے رہے۔ اقتصادی شاہ لپند قصرِ ابیض[1] کے حکمران کے مخالف تھے، لیکن ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء کے بین الاقوامی بحران میں ظاہر ہو گیا کہ اگرچہ قوم کاملًا متحد نہ تھی، لیکن وہ مرضیاتی حد تک تفرقے کا شکار بھی نہ تھی۔ امریکہ کی تاریخ میں اکثر ایسا ہوا کہ سیاسیات کے اندر لسانی تشدد کی تہ میں بنیادی اتحاد موجود تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جمہوریۂ امریکہ کو جنگ سے سابقہ پڑا تو اہلِ امریکہ بہ لحاظ روحیت اس کے لیے بڑی حد تک تیار تھے اور — یہ چیز مغربی جمہوریت میں واقعی حیرت انگیز ہے — فوجی اعتبار سے بھی چنداں غیر مستعد نہ تھے۔

ا White House جہاں صدر امریکہ رہتا ہے۔

تہترواں باب

بین الاقوامی سیاسیات

۱۹۱۹ء - ۱۹۳۲ء

تمہید متارکے کے بیس سال میں جمہوری دنیا کی بین الاقوامی قیادت برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ انھیں اصولاً اور اکثر عملاً جمہوریہ امریکہ کی اعانت حاصل رہی، لیکن فرانس و برطانیہ آزاد خیال جمہوریہ کی دشمن طاقتوں ـــ اٹلی، جرمنی، ہسپانیہ، روس اور جاپان میں ـــ کو بروئے کار آنے سے روکنے میں زیادہ سے زیادہ ناکام ثابت ہوتے رہے۔ آخر ۱۹۱۸ء کا شکست خوردہ امن دشمن جرمنی اپنے دو سابق دشمنوں ـــ اٹلی اور جاپان کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دونوں ۱۹۱۸ء میں مالِ غنیمت کی حصہ داری سے غیر مطمئن تھے۔ اس وجہ سے دوسری عالمی جنگ کو پہلی عالمی جنگ سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں جنگوں میں جرمنی نے مشتبہ توازنِ قویٰ کی مخالفت کی اور شمالی او قیانوس کی جمہوریتیں اس توازنِ قویٰ کی سب سے بڑی محافظ تھیں۔

سوال یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء کے فیصلۂ صلح کے بعد کیوں بیس سال کے اندر اندر دوسری بڑی جنگ شروع ہوئی؟ کیا سبب ہوا کہ ۱۸۱۵ء میں محاربات نپولین کے بعد جو صلح ہوئی تھی، اس نے طویل مدت تک امنِ عامہ قائم رکھا۔ صرف متفرق مقامی جنگیں ہوتی رہیں۔ نازی جرمنی کا دعویٰ یہ تھا کہ دوسری عالمی جنگ اتحادیوں کے من مانے معاہدۂ ورسائی کا براہِ راست اور ناگزیر نتیجہ تھی۔ جس پر پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تھی۔ نازیوں کا دعوے تھا کہ جرمنی کو جنگ کا مجرم قرار دے کر ذلیل کیا گیا۔ اُس کے نو علاقے اور نو آبادیاں چھینی گئیں، جن کا وہ حقدار تھا۔ پھر اس پر ایک ایسا تاوان لگایا گیا، جس کے اعداد عام شمار سے باہر تھے۔ اسلحہ کے سلسلے میں اسے آزادی اور برتری کے حق سے محروم کیا گیا۔ غرض اس سے انتہائی بدسلوکی کی گئی، جس کے باعث معاہدے کے ذمہ داروں کے خلاف بغاوت ناگزیر تھی۔ اکثر جرمن اور ان کے ہمدرد اس دعوے کی حمایت کر رہے تھے، یقیناً معاہدہ ورسائی میں نئی جرمن جمہوریت پر حد درجہ بوجھ ڈالا گیا، جو سراسر انتقام اور پرانی جرمن سلطنت سے خوف کا نتیجہ تھا۔ اگر اتحادی دانشمندانہ پالیسی اختیار کرتے تو غالباً نئی جرمن حکومت کسی بڑے بوجھ کے بغیر کام شروع کرتی۔ اتحادیوں نے ۱۸۱۵ء میں لوئی ہشیر دہم کے فرانس سے نرمی ہی کا برتاؤ کیا تھا۔

دورِ ایفاء لیکن یہ نظریہ کہ جرمنی سے حکماً معاہدہ لکھوایا گیا، اصل حقیقت سے بہت دُور رہا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ تنہا

معاہدۂ ورسائی کی خرابیاں دوسری جنگ کا باعث ہوئیں۔ اس دلیل کو عہدِ انفاذ توڑ رہا ہے۔ جیساکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، تیسرے عشرے کے اواخر میں متعدد مظاہر سے واضح ہوتا تھا، کہ جمہوریۂ ویمر ۱۹۱۹ء کے صلحنامے کی شرطیں حرفاً حرفاً پوری کرے گی۔ بشرطیکہ ایک مرتبہ ان دفعات پر نظرِ ثانی کر لی جائے اور انھیں ذرا نرم کر دیا جائے۔ جرمنی اور اس کے سابقہ دشمنوں نے تدریجاً ایسی امن پسندانہ بات چیت شروع کی، جس کی وجہ سے معاہدۂ ورسائی کی بعض شدید دفعات نرم کر دی گئیں۔ مثلاً ۱۹۲۴ء میں ڈاز کا منصوبہ اور ۱۹۲۹ء میں ینگ کا منصوبہ تیار ہوا، جن کے مطابق تاوان کی رقم اتنی گھٹا دی گئی کہ اس کا انتظام ممکن تھا۔

دورِ انفاذ کا ایک بہت بڑا واقعہ معاہدۂ لوکارنو تھا، جو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ لوکارنو (سوئٹزرلینڈ) میں جرمنی نے مشترکہ سرحدوں کی باہمی حفاظت کے متعلق فرانس اور بلجیم سے اتفاق کر لیا۔ برطانیہ اور اٹلی اس اتفاق کے ضامن بن گئے۔ یعنی اگر کسی طرف سے حدود کو توڑنے کے لیے قدم اٹھایا جائے تو ضامن فوجی امداد کریں گے۔ ان عہد ناموں نے جرمنی اور اتحادیوں کی مصالحت کو خاصی تقویت پہنچائی۔ جرمنی نے مغربی جانب وہ سرحد قبول کر لی، جو ورسائی میں مقرر کی گئی تھی۔ فرانس نے اس معتدل پالیسی کی توثیق کر دی، جو روہر پر تصرف میں ناکامی کے بعد اس نے جرمنی کے متعلق اختیار کی تھی۔

مصالحت کے سلسلے میں روحِ لوکارنو آئندہ چند سال تک قائم رہی۔ جرمنی اور فرانس دونوں کی عام خوشحالی، نیز دونوں کے وزرائے خارجہ کی تعمیری پالیسی سے روحِ مصالحت کو تقویت پہنچی۔ ۱۹۲۶ء میں جرمنی کو جمعیتِ اقوام میں داخل کر لیا گیا۔ اس سے نہ صرف جرمنی کی بین الاقوامی عزت بحال ہوئی، بلکہ جرمنوں نے جمعیتِ اقوام کی رکنیت کے امن پرور مقاصد و فرائض بھی منظور کر لیے۔ ۱۹۲۸ء میں جرمنی نے کیلوگ اور بریاں پر دستخط کر دیئے تو مندرجہ بالا امید افزا تاثرات کو مزید پختگی حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں فرانس اس امر پر راضی ہو گیا کہ آئندہ سال رہائن لینڈ سے اپنی آخری قابض فوج ہٹائے گا۔ اس طرح جرمنی پر اتحادی تصرف معاہدۂ ورسائی کی شرطوں سے پہلے ہی ختم کر دیا گیا۔

جمعیتِ اقوام

اس اثناء میں بین الاقوامی حالات روحِ لوکارنو کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ ولسن نے جمعیتِ اقوام کے نام سے ایک بہت بڑی عالمی تنظیم کا اہتمام کیا تھا، جس کا کام ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا۔ ہمیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ جمعیت کے کام کا جو ریکارڈ رہا، اسے سراسر ناکام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ لیگ جلد ایک فعال ادارہ بن گئی۔ اس کی کونسل میں بڑی طاقتوں کو اقتدار حاصل تھا اور اس کی اسمبلی میں تمام رکن ملکوں کے نمائندے باقاعدہ شامل ہوتے اور اسمبلی کے اجلاس لیگ کے مرکز میں منعقد کیے جاتے، جو سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں تھا۔ پھر لیگ نے دو نازک موقعوں پر امن کا عزم دکھایا۔ اگر لیگ یہ کام انجام نہ دیتی تو یقیناً چھوٹی سی جنگیں ہو جاتیں۔ مثلاً ۱۹۲۰ء میں سویڈن اور فنلینڈ کے درمیان بحیرۂ بالٹک کے بعض جزیروں پر جھگڑا ہو گیا۔ ۱۹۲۵ء میں بلغاریا اور یونان کے درمیان سرحد کے متعلق اختلاف ہوا۔

بہت سی دوسری سرگرمیوں نے جمعیت کے بنیادی کام کو تقویت پہنچائی۔ عالمی عدالت (جس کا نام پیشتر بین الاقوامی معاملات کی مستقل عدالت تھا) کے اجلاس ہیگ (ہالینڈ) میں اس لیے منعقد ہوتے رہے کہ قوموں کے درمیان قانونی نزاعات کا فیصلہ ہو جائے۔ پھر جمعیت نے لیبر کا ایک بین الاقوامی دفتر قائم کیا۔ مزدوروں کے معاملات سے متعلق کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور کوشش کی گئی کہ اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ملکوں کے مزدوروں کی حالت سدھر جائے۔ جمعیت کی سرپرستی میں بین الاقوامی اقتصادی جلسوں کا انتظام کیا گیا۔ وباؤں اور خطراتِ صحت کے بارے میں اعداد فراہم کیے گئے۔ افیون اور فحش کاری کے انسداد کے لیے بین الاقوامی انتظامات کی ابتدا ہوئی۔ بہرحال جمعیت نے کوئی درجن بھر مختلف شعبوں میں اقتصادی اور عمرانی پروگراموں کی داغ بیل ڈالی، جس پر اس کی جانشین جماعت یعنی انجمن اقوام متحدہ نے عمل شروع کیا۔

تخفیفِ اسلحہ کے لیے کوششیں

جمہوریۂ امریکہ جمعیت اقوام میں شامل نہ ہوئی۔ اس وجہ سے جمعیت کے اثر و اقتدار پر سخت ضرب لگی۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ باپ نے بیٹے کی ابنیت سے انکار کر دیا۔ لیکن ایک حد تک ضرب کی تلافی یوں ہو گئی کہ جمہوریۂ امریکہ نے جمعیت کے ایک بڑے مقصد یعنی تخفیف اسلحہ کے لیے بہت کوششیں کیں۔ پہلی جنگ کے بعد جمہوریۂ امریکہ نے بڑی بڑی بحری طاقتوں کو دعوت دے کر اپنے پاس بلایا، تاکہ بحری قوت کی کمی پر غور کر لیں۔ یہ اجلاس ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۲۲ء کے موسم سرما میں بمقام واشنگٹن ہوا۔ اس بحری کانفرنس میں فیصلہ ہو گیا کہ آئندہ دس سال کے لیے کوئی بڑا جہاز (بڑا جنگی جہاز اور بڑا کروزر) نہ بنایا جائے۔ اس امر پر بھی اتفاق ہو گیا کہ مختلف ملکوں کے لیے بڑے جہازوں کی ظرفیت کا تناسب کیا ہو۔ چنانچہ یہ تناسب امریکہ کے لیے پانچ، برطانیہ کے لیے پانچ، جاپان کے لیے تین، فرانس کے لیے ۱٫۶۷ اور اتنا ہی اٹلی کے لیے مقرر ہوا۔

۱۹۳۰ء میں معاہدۂ واشنگٹن میں شریک ہونے والی پانچوں طاقتوں کا ایک اجلاس لندن میں ہوا تاکہ چھوٹے جہازوں کے متعلق بھی باہم سمجھوتا کر لیں۔ اس مرتبہ زیادہ کامیابی نہ ہو سکی۔ مختلف ممالک آبدوزوں کی جنگ کے سلسلے میں باہم متفق ہو گئے، مگر فرانس اور مسولینی کے اٹلی کے درمیان باہم بے اعتمادی کے باعث پانچوں طاقتیں چھوٹے جہازوں کے متعلق متفق نہ ہو سکیں۔ آخر میں امریکہ، برطانیہ اور جاپان نے باہم فیصلہ کر لیا کہ وہ چھوٹے جہازوں کی تعداد میں کمی کر دیں گے، لیکن ساتھ ہی یہ دفعہ لگا دی گئی کہ اگر فرانس یا اٹلی میں سے کوئی طاقت اپنے جہازوں کی تعداد بڑھائے گی تو دوسری طاقتیں بھی اضافے میں آزاد ہوں گی۔

لندن کی جزوی ناکامی فالِ بد تھی۔ دو سال بعد جمعیت نے بھی طویل تیاری کے بعد فوجی اسلحہ کی تخفیف کے مسئلے پر ایک اجلاس بلایا۔ محض جمعیت کے ارکان ہی نے نہیں، بلکہ جمہوریۂ امریکہ اور سوویٹ روس نے بھی اپنے نمائندے

جنیوا بھیجے۔ یہ کانفرنس، جو ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی، کسی نتیجے پر نہ پہنچی اور یہ فرانس و جرمنی کی مخالفت کے باعث تباہ ہوئی۔ جرمنی کا مطالبہ یہ تھا کہ اسے فرانس کے برابر سر و سامانِ جنگ کی تیاری کا موقع حاصل رہنا چاہیے۔ فرانس اس مطالبے کے قبول پر آمادہ نہ تھا۔

گویا ۱۹۳۲ء میں روحِ لوکارنو مر چکی تھی اور دورِ الیفا ختم ہو چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں سے جرمنی اس لیے گفت و شنید ترک کرنے والا تھا کہ اس کے نزدیک معاہدۂ ورسائی پر نظرِ ثانی اسی طرح ہو سکتی تھی۔ اٹلی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہی زمانہ ہے، جب جرمنی ہٹلر کے پیش کردہ طریق مذمت و مزاحمت اختیار کرنے پر آمادہ تھا۔ مشرقِ بعید میں جاپان نے چین سے منچوریا چھین کر ۱۹۳۱ء کا توازن درہم برہم کر ڈالا تھا۔ جنگ کے بعد کا دور خاتمے پر پہنچ رہا تھا اور نئی جنگ سے پیشتر کا دور شروع ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ معاہدۂ ورسائی کے علاوہ بھی دوسری عالمی جنگ کے اسباب میں بہت سے عوامل شامل تھے۔ ہم ان میں سے بعض کا جائزہ یوں لے سکتے ہیں کہ پوچھیں، الیفاء کی امید چوتھے عشرے کے اوائل میں کیوں تیزی سے ماند پڑ گئی؟

امیدِ الیفاء کی افسردگی

تیسرے عشرے میں جو امیدیں پیدا ہوئی تھیں، ان کی ناکامی کا ایک بدیہی سبب وہ عالمی کساد ہے، جو ۱۹۲۹ء میں شروع ہوا۔ یہ کساد جرمنی کے دوشِ تحمل پر آخری ناقابلِ برداشت بوجھ تھا۔ یہی فیصلہ کن عامل تھا، جو ہٹلر کو برسرِ اقتدار لایا۔ جمہوریتوں میں بھی اس نے امنِ عالم کے لیے ناخوشگوار نتائج پیدا کیے۔ مثلاً فرانس میں خصوصیت سے کساد کے باعث عمرانی اور سیاسی تفرقے خانہ جنگی کے قریب پہنچ گئے۔ اسی کساد نے اربابِ ثروت کی ہمدردیوں کا رخ فاشسٹ حکومتوں کی طرف پھیر دیا۔ یہی صورت جرمنی میں پیش آئی اور برطانیہ و امریکہ کے متعلق ان کی بے اعتمادی تیز تر ہو گئی۔ مزید براں ایک امر ایسا ہے، جو بظاہر مبہم معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی حقیقت میں کلام کی گنجائش نہیں، یعنی چوتھے عشرے کی اقتصادی مشکلات نے فرانس کی قومی حوصلہ مندی پر ضرب لگائی تھی اور اہلِ فرانس ہر قیمت پر امن کے لیے زیادہ مضطرب ہو گئے تھے۔ برطانیہ میں بست سالہ مناد کے کا دورِ طویل اقتصادی کساد کا دور بنا رہا۔ پھر چوتھے عشرے کی مشکلات نے اہلِ برطانیہ کو امن کا زیادہ خواہشمند بنا دیا۔ یہ حقیقت اس وقت دنیا کے سامنے پوری طرح نمایاں ہوئی، جب چیمبرلین نے چیکوسلواکیا کے متعلق ۱۹۳۸ء کے نازک حالات میں ہٹلر کے لیے المناک مراعات منظور کر لیں۔ غرض جمہوریتیں صلحنامۂ ورسائی سے فائدہ اٹھاتی رہی تھیں اور وہ دفاع کی طرف مائل ہو چکی تھیں۔ کساد نے انھیں اس جانب مزید دھکیل دیا۔

ایک اور عامل بھی بین الاقوامی سیاسیات میں خلل ڈال رہا تھا۔ یہ سوویٹ روس تھا۔ مغربی قوموں کی نگاہوں میں روس ایک انقلابی قوت تھا جس پر حقیقی بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ بین الاقوامی نظامِ مملکداری سے پوری طرح مربوط نہیں ہو سکتا تھا۔ جوازِ وراثت کے اصول اور بوربونوں کی بحالی نے انقلابِ فرانس کو ۱۸۱۵ء

کے بعد زیادہ باوقار بنا دیا تھا، لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد روس ایک لحاظ سے بدستور منکرِ جواز وراثت رہا اور اسے باقاعدہ سمجھنا مشکل تھا۔ سوویٹ روس ایک انقلابی عقیدے کا مرکز تھا، جسے مغربی سیاستدان نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ انھیں یہ خوف دامنگیر تھا کہ کمیونسٹ خود ان کے ہم قوموں میں مخالفانہ سرگرمیاں شروع کر دیں گے اور یہ خوف بالکل بے سبب نہ تھا۔ ایک مشرقی لوکارنو کے لیے مدّت سے بات چیت ہو رہی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ روس، جرمنی اور مشرقی یورپ کی چھوٹی چھوٹی مملکتیں پہلی عالمی جنگ کے بعد کی علاقائی حدیں تسلیم کر لیں۔ اس سلسلے میں کامیابی کی امید تھی، لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ روس کو ۱۹۳۴ء میں مجلسِ اقوام کا رکن بنا لیا گیا، تاہم سوویٹ روس توازنِ قوی میں ایک غیر یقینی عامل بنا رہا۔ اسے نازی جرمنی کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلے میں کوئی واضح اور تسلی بخش جوابی وزن نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے لیے ایک اور بنیادی عامل یہ تھا کہ مغرب کی تین بڑی جمہوریتیں — برطانیہ، فرانس اور امریکہ — کسی متحدہ محاذ کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔ جن امریکیوں کو بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی تھی، انھوں نے غالباً ۱۹۱۹ء میں امریکہ کی یکایک علیحدگی کے نتائج کے متعلق مبالغہ آمیزی سے کام لیا۔ فرانس اور برطانیہ نے جمعیتِ اقوام کے اندر جس رقابت اور تصادمِ مقاصد کا مظاہرہ کیا، اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ جمعیت میں رسماً شامل ہوتا تو حالات کی درستی میں مدد ملتی۔ بہ ایں ہمہ امریکہ کی علیحدگی نے فرانس کے خطرات اور احساسِ ضعف میں یقیناً اضافہ کیا اور وہ انتہا پسندی کی طرف زیادہ مائل ہو گیا۔ اس کی مثال روہر کے معاملے میں تباہی خیز مداخلت کی شکل میں نمایاں ہوئی، جو تیسرے عشرے کے وسط کا واقعہ ہے۔

فرانس و برطانیہ کی کمزور رفاقت

زیادہ خطرناک امر یہ تھا کہ فرانس اور برطانیہ مؤثر طریق پر مل جل کر کام نہ کر سکے۔ فرانس کے وسائل صرف ہو چکے تھے۔ اس کی آبادی کم تھی، لیکن وہ اوّل درجے کی طاقت بنا رہنا چاہتا تھا، حالانکہ اس کے وسائل کی حیثیت ثانوی تھی۔ پھر اسے ہر وقت یہ خطرہ لگا رہا کہ کہیں جرمنی دوبارہ زندہ نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس نے معاہدۂ ورسائی کی اقتصادی اور سیاسی دفعات پر پورا پورا عمل کرانے کی کوشش کی تاکہ جرمنی کمزور ہو جائے اور برابر کمزور رہے۔ فرانس نے یہ کوشش بھی کی کہ روس کو جرمنی کے خلاف اپنا مشرقی حلیف بنا لے۔ اس کی ابتدا ان معاہدوں سے ہوئی، جن کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ یہ معاہدے ان مملکتوں سے کیے گئے، جو جرمنی کے مشرق میں واقع تھیں، یعنی پولینڈ، چیکوسلواکیا، رومانیا اور یوگوسلافیا۔ یہ تمام مملکتیں ہیپسبرگ سلطنت کی بحالی کے ممکنات کے خلاف فرانس کی طرف سے حفاظت کی خواہاں تھیں۔ ہیپسبرگ سلطنت ہی سے انھیں زیادہ تر علاقے ملے تھے اور یہ تمام مملکتیں بہ استثناء فرانس ایک معاہدہ کر چکی تھیں، جسے "اتحادِ صغیرہ" کا نام دے دیا گیا تھا۔

برطانیہ کے مدبروں کو علم تھا کہ فرانس و انگلستان کے درمیان صد سالہ جنگ سے نپولین کے زمانے تک رزم و پیکار جاری رہی۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فرانس کا منصب تخیین یورپ کے اندر سب پر برتری حاصل کرنا ہے۔ وہ اس برتری کو اپنی روایتی پالیسی کے خلاف شدید خطرہ سمجھتے تھے اور اسے ہر حال میں روکنا چاہتے تھے۔ اب واضح ہو چکا ہے کہ اہل فرانس اس سلسلے میں طمع و حرص کی بنا پر نہیں، بلکہ خوف کی بنا پر سب کچھ کر رہے تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ فرانس جارحانہ اقدام کے قابل نہ تھا، تاہم یہ بھی درست ہے کہ فرانس کے اکثر مدبر پرانے طور طریقوں پر کاربند ہوتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ برطانیہ کو جو غلط فہمی ہوئی، وہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مزید براں خود نفس برطانیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا، لہٰذا اہل برطانیہ کو جرمنی کی بحالی کا اتنا خطرہ نہیں ہو سکتا تھا، جتنا فرانس کو تھا۔ اس کے برعکس مطمئن جرمنی کی بحالی برطانوی مدبروں کو خوشگوار نظر آتی تھی، کیونکہ اس سے اول برطانوی مال جرمنی میں بھیجا جا سکتا تھا، دوسرے بین الاقوامی تجارت کی عام بحالی کو فائدہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس کے خلاف برطانیہ نے جلد ہی جرمنی کے متعلق نرم روش اختیار کر لی اور ہر جگہ فرانس کی مخالفت کی کھلم کھلا مذمت کی۔

سب سے آخر میں یہ کہ جنگ کے بعد برطانیہ کی علیحدگی کی پالیسی سامنے آگئی، خصوصاً برطانیہ کی نو آبادیاں براعظم یورپ میں تحفظات کے متعلق کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر راضی نہ تھیں۔ برطانیہ نے لوکارنو کو قبول کر لیا تھا، مگر ایک سال پیشتر برطانیہ نے فرانس کے اصرار پر جو میثاق جنیوا منظور کر لیا تھا، اسے نو آبادیاں مسترد کر چکی تھیں۔ میثاق جنیوا کا مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی جھگڑے ثالثی کی بنا پر طے ہوں، اور اس پر دستخط کرنے والی تمام طاقتیں ہر اس مملکت کے خلاف جوابی کارروائیاں کریں، جو ثالثی پر راضی ہونے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسی طرح جمعیت کو تقویت پہنچائی جا سکتی تھی۔ اگر یہ میثاق عمل میں آجاتا تو امریکہ کی شرکت کے بغیر بھی جرمنی کے جارحانہ اقدام کے خلاف اتحاد کا وہ نظام بحال ہو جاتا، جو کلیمنشو نے ۱۹۱۹ء میں ولسن اور لائڈ جارج سے منوانے کی کوشش کی تھی، اگرچہ لوکارنو کے بعد برطانیہ اور فرانس کے تعلقات سدھر گئے۔ چوتھے عشرے کے اواخر میں نازیوں اور فاشسٹوں کے خطرے نے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا، لیکن جو نقصان پہنچ چکا تھا، اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ جرمنی نے جمہوریتوں کے اس تفرقے سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور یہ سب کچھ اس حکومت کے زمانے میں ہوا، جو قیصر ولیم دوم کی حکومت سے زیادہ جابر اور بے اصول تھی۔

جمعیت اقوام کی کمزوری کا بھی ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انگلستان اور فرانس کا اشتراک خرابیوں سے پاک نہ رہا۔ کسی مشینری میں ہر پرزے کی قوت مشین چلانے والوں کی ہنرمندی اور ربط ضبط پر موقوف ہوتی ہے۔ جمعیت اقوام کی مشینری میں بھی خرابیاں موجود تھیں۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دانت سرے سے موجود ہی نہ تھے، یعنی اگر کوئی مملکت جمعیت کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوتی تو اس فیصلے کو نافذ کرنے کے وسائل ناپید تھے۔ پھر اس حربے

کا بالائی حصہ زیادہ گرانبار تھا، کیونکہ پوری نمائندہ اسمبلی چھوٹی سی کونسل کے مقابلے میں کم حیثیت تھی اور کونسل میں برطانیہ اور فرانس کو اقتدار حاصل تھا۔ جب جمعیت کی مشینری کو چلانے والے یہ دو کاریگر باہم مختلف الرائے ہو گئے تو مشینری کام ہی کیونکر کر سکتی تھی؟ انگلستان اور فرانس کی کشمکش کے باعث جمعیت کے بڑے مقاصد کو جو نقصان پہنچا، اس کی ایک مثال میثاق جنیوا کا رد ہے، دوسری مثال ۱۹۲۳ء میں کارفو کا واقعہ تھا، جب مسولینی نے ایک خاص وقت کے لیے جمعیت کا مقابلہ کیا اور اس طرح ڈکٹیٹروں کے لیے ڈرا دھمکا کر کام نکالنے کا مذموم ترین نمونہ پیش کر دیا۔ کارفو کی بحرانی حالت کے دوران ہی میں جمعیت پر ایک اور ضرب اس وجہ سے لگی کہ روہر کے متعلق فرانسیسی پالیسی کے بارے میں انگلستان اور فرانس کے درمیان تفرقہ پیدا ہو گیا۔

جارحانہ اقدامات

کارفو کے واقعے نے ایک اور عنصر کی اہمیت واضح کر دی۔ یہ عنصر بیست سالہ متارکے کی تیز خرابی میں سب سے بڑھ کر اہم ہے۔ اس سے مراد اٹلی، جرمنی اور جاپان کے اقدامات ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ فاشیت اور نازیت کے حد درجہ حریصانہ پروگراموں نے ہٹلر اور مسولینی کی خارجہ پالیسی کو منچلے پن اور افراتفری کا مرکز بنا دیا۔ یہاں ہمیں ان کے حلیف جاپان کے جارحانہ اقدامات پیش کرنے چاہئیں، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران میں ہوئے۔

پہلی جنگ کے بعد جو فیصلے ہوئے، ان میں جاپان کو مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ بحرالکاہل میں چھوٹے چھوٹے جرمن جزیروں پر حکمداری اپنے لیے کافی سمجھے۔ جاپان چین میں وسیع علاقوں کا خواہاں تھا۔ اس کی مخالفت پہلے ۱۹۱۹ء میں کی گئی۔ پھر ۱۹۲۲ء میں نو طاقتوں کا معاہدہ ہوا جس میں جاپان کو مجبور کیا گیا کہ چین کی علاقائی وحدت بحال رکھے، لیکن جاپان کے مدبر برابر اپنے عزائم پر قائم رہے، زیادہ تر اس لیے کہ چین کمزور تھا اور ۱۹۱۲ء کے سیاسی انقلاب کے بعد وہاں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ مزید براں جاپان ایک بڑا صنعتی ملک بن رہا تھا، جس کی آبادی گھنی تھی اور اسے خام جنسوں کی بھی ضرورت تھی، تجارتی منڈیوں کی بھی۔ اس کے ایک، ماں۔ نر دہی روش اختیار کی، جس کا نمونہ مغرب پیش کر چکا تھا۔ یعنی وہ سامراجی توسیع کے لیے راستے پیدا کرنا چاہتا تھا۔ دنیا کے کساد عام نے جاپان پر بھی اثر ڈالا۔ ان تمام عوامل نے اہل جاپان کو ۱۹۳۱ء میں چین کے صوبے منچوریا پر قبضے کے لیے آمادہ کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے راستے میں یہ پہلا بڑا اقدام تھا۔

کشیدگی کا یہ پس منظر سامنے رکھ لیجئے، یعنی تصفیۂ ورسائی کے تعزیری پہلو، روہر اور کارفو پر کساد کے تباہی خیز اثرات، روس میں انقلابی مقاصد پر اصرار، مغربی جمہوریتوں کی دفاعی روش اور باہم بے اعتمادی، فاشیت اور نازیت کے نئے جارحانہ اعتقادات اور سامراجی جاپان کا ظہور۔ اب ہم ان اقدامات کو ایک ایک کر کے بیان کریں گے جو دوسری عالمی جنگ کے موجب ہے۔

چوہترواں باب

جنگ کی جانب پیشقدمی

سنہ ۱۹۳۱ء - سنہ ۱۹۳۹ء

(ا)

پہلا قدم :- منچوریا سنہ ۱۹۳۱ء

جاپانیوں کے جارحانہ اقدام کے لیے منچوریا بطورِ خاص جاذب تھا۔ وہاں کوئلے اور لوہے کے اچھے ذخیرے تھے اور وہ کوریا سے ملا ہوا تھا جس پر جاپان سنہ ۱۹۱۰ء میں قابض ہو چکا تھا۔ پھر یہ چین کا بیرونی شمالی صوبہ تھا، جو چینی نظام حکومت سے پوری طرح کبھی مرتبط نہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۰۴-۵ء کی جنگ میں جاپان نے روس کو منچوریا سے بھگا دیا تھا اور جاپان کے سامراجی سمجھ رہے تھے کہ وہی روس کے طبعی جانشین ہیں، لیکن مغربی حفاظت کے تحت منچوریا پر چینیوں کے حقوق کی توثیق ہو چکی تھی۔ چین کمزوری کے باعث مستقل قومی نظام قائم کرنے کا اہل نہ تھا، لہٰذا صدی کے تیسرے عشرے میں اس نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی، گویا منچوریا پہ اس کا قبضہ یوں ہی سا ہے۔ جاپانیوں کو یقین تھا کہ یہ مال آسانی سے ہڑپ کیا جا سکے گا، ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء میں جاپانیوں نے اسی عقیدے کے مطابق قدم اٹھایا۔ سب سے پہلے منچوریا کے شہر کرن[1] پر جاپانی فوجیں قابض ہوئیں پھر دوسرے حلقوں میں پہنچ گئیں۔

چینیوں نے جواب میں جاپانی مال کا نہایت مؤثر مقاطعہ کر دیا۔ جاپان نے انتقاماً چین کی بڑی بندرگاہ شنگھائی میں فوجیں اتار دیں۔ امریکہ کے صدر ہوور کے سیکرٹری سٹمسن[2] نے اعلان کر دیا کہ مسلح اقدام کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا جائے گا، وہ مسلّم نہیں مانا جائے گا۔ جمعیت اقوام نے ایک کمیشن مقرر کر دیا، جس کی قیادت برطانوی لارڈ لٹن[3] نے کی۔ پھر لٹن رپورٹ شائع ہوئی، جس میں جاپان کے جارحانہ اقدام کی سخت مذمت کی گئی، لیکن امریکہ یا جمعیت اقوام نے ان زبانی احتجاجوں کی پشتیبانی کسی مؤثر عمل سے نہ کی۔ قوت کا جواب قوت سے نہ دیا گیا۔ جاپانیوں نے منچوریا میں اپنے ایک پٹھو یعنی

---

[1] Kirin
[2] Stimson
[3] Lytton

چین کے آخری شہنشاہ پویی[1] کو بادشاہ بنا دیا اور ایک ایسی سلطنت قائم کر دی، جو ان کا آلہ کار تھی۔ مونچوکو[2] اس کا نام رکھا۔ اس حکومت کو بین الاقوامی قبول حاصل نہ ہوا۔ جاپانیوں اور چینیوں کے درمیان مسلسل کشیدگی قائم رہی۔ جاپان نے لٹن رپورٹ کو قبول نہ کیا اور مارچ ۱۹۳۳ء میں جمعیت اقوام چھوڑ دی۔ جمعیت کے نظام میں یہ پہلا رخنہ تھا۔

دوسرا اقدم :- جرمن پھر مسلح ہو گئے (۱۹۳۵ء - ۱۹۳۶ء)

جمعیت کے نظام میں دوسرا رخنہ جرمنی نے پیدا کیا۔ یہ جنگ کی طرف دوسرا قدم تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے جمعیت اقوام سے علیحدگی اختیار کی، گویا دنیا بھر کو اپنے جارحانہ عزائم کا نوٹس دے دیا۔ ۱۹۳۴ء میں مخالفوں کا صفایا کر دینے کی وجہ سے اس کی وضعیت مستحکم ہو گئی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۳۵ء کو اس نے معاہدۂ ورسائی کی اس دفعہ کی مذمت کی جس میں جرمنوں کی اسلحہ بندی محدود رکھی گئی تھی، ساتھ ہی جرمن فوجوں کی ترتیب کھلم کھلا شروع کر دی۔

ہٹلر کا یہ یکطرفہ اور ناجائز فعل آئندہ چند سال کے لیے ایک مثال بن گیا۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں جمعیت اقوام نے واجبات معاہدہ کی تنسیخ کی مذمت کی لیکن جرمنی اپنے کام میں مصروف رہا۔ ۱۹۳۵ء میں فرانس نے عجلت کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا جو جرمنی کے جارحانہ اقدام کے خلاف تھا۔ برطانیہ نے فوجی تربیت جاری رکھی۔ برطانیہ نے جون ۱۹۳۵ء میں حقیقت پسندی، مگر کوتاہ نظری کی بنا پر ـــ فرانسیسیوں کو ان کا یہ فعل بے وفائی معلوم ہوتا تھا۔ جرمنی سے ایک بحری معاہدہ کر لیا جس کا مفاد یہ تھا کہ جرمنی کی بحری قوت، جس میں آبدوزیں بھی شامل ہوں گی، برطانیہ کی بحری قوت پینتیس فی صد ہو گی۔

یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ اس کے بعد لوکارنو پر دستخط کرنے والوں کی طرف سے ہٹلر کے خلاف محض رسمی احتجاج ہوتے رہے۔ آخر مارچ ۱۹۳۶ء میں رہائن لینڈ پر پھر قبضہ ہو گیا، یعنی جرمن فوجیں اس مغربی جرمن حلقے میں پہنچ گئیں، جسے معاہدۂ ورسائی کے مطابق غیر مسلح قرار دیا گیا تھا۔ رہائن لینڈ پر دوبارہ قبضے سے نہایت عجیب سوالات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اگر برطانیہ اور فرانس کوئی قدم اٹھاتے اور اپنی فوجیں رہائن لینڈ میں بھیج دیتے تو کیا ہٹلر کے جارحانہ اقدامات ابتدا ہی میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے؟ فوجی ماہرین کا رجحان اس رائے کی طرف ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جرمنوں کی اسلحہ بندی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی۔ وہ فرانس اور برطانیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ ہٹلر کے اپنے فوجی مشیر قبضے کے خلاف تھے، لیکن ہٹلر ان سب سے بہتر ماہر نفسیات تھا۔ وہ اس قمار میں جیت گیا۔

تیسرا اقدم :- حبشہ ۱۹۳۵ء

اس اثنا میں اطالویوں نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ حبشہ قدیم افریقہ کے الگ تھلگ گوشے میں واقع تھا، جہاں پہاڑی علاقے اور سطح مرتفع میں ایک خود مختار سلطنت لشتم پشتم گزارہ کر رہی تھی۔ خود مختار رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے سامراجی ہمسایے ـــ برطانیہ، فرانس اور اٹلی ـــ نہ اسے تقسیم کرنے پر راضی ہوتے تھے اور نہ کسی کو پورا حبشہ ہضم کر لینے کی اجازت دیتے تھے۔

ا Pu-yi

۲ Manchukuo

اطالویوں کو حبشہ پر قبضہ کر لینے کی خواہش سب سے زیادہ تھی، مگر ۱۸۹۶ء میں اہلِ حبشہ نے انھیں بمقام عدوا تباہی خیز شکست دی۔ یہ ذلت خیز شکست فاشسٹوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے، دنیا کو دکھائیں کہ رومی سلطنت کو ازسرِنو زندہ کرنے کے دعوے زبانی جمع وخرچ تک محدود نہیں۔

۱۹۳۴ء میں اوال اوال[1] میں جو — اطالوی صومالی لینڈ کے صحرا میں واقع تھا یا حبشہ میں، کیونکہ دونوں اس کے مدعی تھے — ایک سرحدی سانحہ پیش آگیا، جس نے اس معاملے کو بین الاقوامی سیاستدانوں کے سامنے پہنچا دیا۔ فرانس اور برطانیہ بہر حال اٹلی کو مطمئن رکھنے پر آمادہ تھے، جس کی ایک وجہ یہ بھی کہ وہ مسولینی کو اپنے ساتھ ملانے اور ہٹلر کا مخالف بنا دینے کی امید رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ حبشہ میں اٹلی کو تمام ضروری حقوق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ان میں وہ مثبت اقتصادی مراعات بھی شامل تھیں جنھیں سامراج کا جوہر قرار دیا جاتا ہے، لیکن حبشہ جمعیتِ اقوام کا رکن تھا۔ فرانس اور برطانیہ دونوں کو اصرار تھا کہ اس کی رسمی خود مختاری ملحوظ رکھی جائے۔ مسولینی یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اس نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ ہوائی جہازوں، توپوں اور ٹینکوں نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی، جس کا تصور بھی ۱۸۹۶ء میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس مرتبہ اہلِ حبشہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں زہریلی گیس نے لڑائی ختم کر دی اور شاہ اٹلی نے شہنشاہ حبشہ کا لقب اختیار کر لیا، جس کا وہ مدت سے آرزومند تھا۔

جمعیتِ اقوام منچوریا میں جاپان کے جارحانہ اقدام کی مذمت کر چکی تھی۔ اسی طرح جرمنی نے معاہدۂ ورسائی کی شرطیں اسلحہ بندی کے متعلق توڑ ڈالیں تو اس کی بھی مذمت کی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں جمعیت نے اعلان کر دیا کہ اٹلی حبشہ پر حملہ آور ہوا ہے، جو جمعیت کا ایک رکن ہے۔ اس طرح اٹلی نے میثاقِ جمعیت کے واجبات کی خلاف ورزی کی ہے۔ اب جمعیت نے یہ اہم فیصلہ کیا کہ قول کے بجائے عمل کی آزمائش کرے۔ جمعیت کے بیشتر ارکان تہہ دل سے اس کے حامی تھے۔ برطانیہ اس پر اصرار کر رہا تھا۔ فرانس بھی ساتھ دے رہا تھا، اگرچہ زیادہ زور شور نہیں دکھا رہا تھا۔ حبشہ کا شہنشاہ ہیلا سلاسی[2] کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ جمعیت عملی اقدام کرے۔ اس نے جنیوا میں جمعیت سے پرجوش التجا کی۔ اطالوی مدبروں نے تقریر کے دوران میں اس کی ہنسی اڑائی اور انتہائی بے عزتی کے مرتکب ہوئے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو جمعیت کے اکاون ارکان نے فیصلہ کر لیا کہ میثاقِ جمعیت کی دفعہ ۱۶ اٹلی کے خلاف استعمال کی جائے۔ دفعہ یہ تھی :-

"۱۔ اگر جمعیت کا کوئی رکن میثاق کی دفعہ ۱۲، ۱۳ یا ۱۵ سے بے پروا ہو کر جنگ شروع کرے تو معاً سمجھا جائے گا کہ اس نے تمام ارکان کے خلاف جنگ کا ارتکاب کیا اور تمام ارکان فوراً اس سے تمام تجارتی یا مالی تعلقات منقطع کریں گے۔ اپنے ہم وطن

---

[1] Ualual

[2] Haile Selassie

اور میثاق شکن مملکت کے باشندوں میں ہر قسم کا ربط و ضبط ممنوع قرار دیں گے۔ تمام مالی، تجارتی یا شخصی ربط و ضبط، میثاق شکن مملکت یا کسی دوسری مملکت کے باشندوں سے توڑ لیں گے، خواہ وہ جمعیت کی رکن ہو یا نہ ہو۔

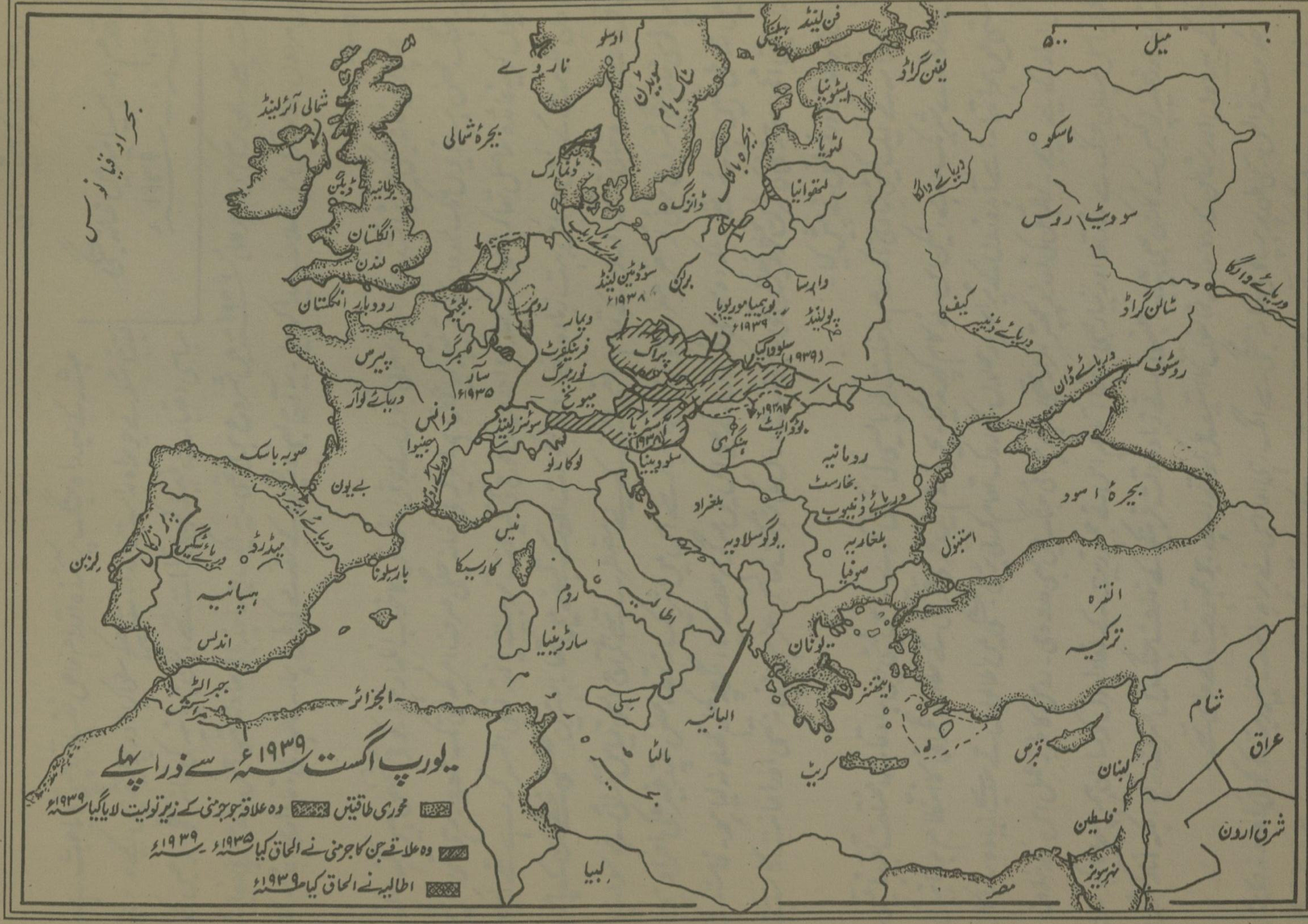
"۲۔ ایسے حالات میں کونسل کا فرض یہ ہوگا کہ مختلف متعلقہ حکومتوں سے سفارش کرے، وہ کیا مؤثر فوجی، بحری یا فضائی قوت ارکانِ جمعیت کے لیے بہم پہنچائیں گے۔ یہ قوت جمعیت کے میثاقوں کی حفاظت کے لیے استعمال کی جائے گی۔

"۳۔ جمعیت کے ارکان اتفاق کرتے ہیں کہ وہ ان مالی اور اقتصادی تدابیر میں ایک دوسرے کی امداد کریں گے، جو اس دفعہ کے تحت اختیار کی جائیں، تاکہ نقصان کم سے کم ہو۔ ان تدابیر کے باعث تکلیف کم پیش آئے۔ اگر میثاق شکن مملکت کسی ایک رکن کے خلاف خاص تدابیر اختیار کرے تو اس کی مزاحمت میں ایک دوسرے کی حمایت کریں گے اور وہ اپنے علاقے میں سے جمعیت کے ارکان کی فوجیں گزارنے کے لیے ضروری اقدامات عمل میں لائیں گے، جو جمعیت کے میثاقوں کی حفاظت کے لیے کارفرما ہوں گی۔

"۴۔ جمعیت کا جو رکن کسی میثاق کی مخالفت کرے گا، اس کے بارے میں کونسل تمام ارکانِ جمعیت کے اتفاق سے فیصلہ کر دے گی کہ میثاق شکن رکن جمعیت کا رکن نہیں رہا۔"

اقتصادی مجازات ـــــ یعنی مالی اور تجارتی روابط کا انقطاع ـــــ دفعہ ۱۶ کے پیراگراف اوّل کے تحت بروئے کار آئے، مگر ناکام رہے۔ ان میں بعض خامیاں تھیں۔ مثلاً تیل جنسوں کی اس فہرست میں شامل نہ تھا جن کی تجارت ممنوع قرار دی گئی تھی اور اٹلی کے پاس اس قیمتی جنگی شے کی مقدار بہت کم تھی۔ پھر جمعیت کے ارکان کے درمیان اس معاملے پر لے دے شروع ہوگئی کہ ممنوع اشیاء کی فہرست میں کون کون سی چیزیں شامل رکھی جائیں۔ ساتھ ہی یہ معاملہ طعن و تشنیع کا بھی موجب بن گیا کہ فرانس اور برطانیہ نے نہ تو اٹلی کی فوجی نقل و حرکت روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا اور نہ نہر سویز میں سے سامان جنگ لے جانے کی ممانعت کی۔ جرمنی جمعیت سے الگ ہو چکا تھا اور وہ کسی فیصلے کا پابند ہی نہ تھا، بلکہ بحران حبشہ کی افراتفری اور کشیدگی اس کے لیے مارچ ۱۹۳۶ء میں رھائن لینڈ پر قبضہ کر لینے کا موزوں موقع بن گئی۔

حبشہ کا افسوسناک واقعہ جمعیت کے لیے پیامِ مرگ بن گیا۔ چنانچہ جمعیت اس وقت سے عملاً بین الاقوامی سیاسیات میں بے دست و پا ہوگئی۔ بین الاقوامی ناظموں کے تربیت یافتہ گروہ کی خاص خدمات سے دوسری عالمی جنگ کے بعد مجلس اقوام متحدہ نے فائدہ اٹھایا، مگر چوتھے عشرے میں جمعیت بڑھتی ہوئی کشیدگی کے لیے ایک رسمی عامل بھی ثابت نہ ہو سکی۔ جب آگے چل کر جاپان اور جرمنی نے اٹلی کی پیروی کرتے ہوئے لیگ سے وابستگی اختیار کرلی (دسمبر ۱۹۳۷ء) تو نہ تو اس پر کسی کو حیرت ہوئی اور



یورپ اگست ۱۹۳۹ء سے ذرا پہلے
محوری طاقتیں
وہ علاقہ جو جرمنی کے زیر تولیت لایا گیا ۱۹۳۹ء
وہ علاقے جن کا جرمنی نے الحاق کیا ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۹ء
اطالیہ نے الحاق کیا ۱۹۳۹ء
بحر اوقیانوس
بحرۂ شمالی
شمالی آئرلینڈ
ڈبلن
انگلستان
لندن
رودبار انگلستان
ناروے
اوسلو
سویڈن
فن لینڈ
ہلسنکی
لینن گراڈ
ایسٹونیا
لٹویا
لتھوانیا
بحیرۂ بالٹک
ڈنمارک
ڈانزگ
ماسکو
سوویٹ روس
دریائے والگا
کیف
دریائے ڈنیپر
شالن گراڈ
روسٹوف
دریائے ڈان
برلن
سوڈیٹن لینڈ ۱۹۳۸ء
پولینڈ
وارسا
بوہیمیا موراویا ۱۹۳۹ء
سلوواکیہ ۱۹۳۹ء
پراگ
فرینکفرٹ
نورمبرگ
میونخ
سار ۱۹۳۵ء
پیرس
دریائے لوار
فرانس
جینیوا
سوئٹزرلینڈ
لوکارنو
بوڈاپسٹ
ہنگری
رومانیہ
بخارسٹ
دریائے ڈنیوب
بحیرۂ اسود
بلغراد
یوگوسلاویہ
بلغاریہ
صوفیا
استنبول
انقرہ
ترکیہ
صوبہ باسک
بے یون
ہسپانیہ
میڈرڈ
لزبن
بارسلونا
اندلس
نیس
کارسیکا
روم
سارڈینیا
اطالیہ
یونان
ایتھنز
البانیہ
کریٹ
مالٹا
الجزائر
جبرالٹر
مراکش
لیبیا
مصر
نہر سویز
فلسطین
لبنان
قبرص
شام
عراق
شرق اردن
میل
۵۰۰

نہ کسی نے اس واقعے کو اہمیت دی۔

چوتھا قدم :- ہسپانیہ میں خانہ جنگی ۱۹۳۶ء — ۱۹۳۹ء

حبشہ کے بعد راہِ جنگ پر آئندہ اقدام خاص نفسیاتی دلچسپی کا باعث ہے۔ یقیناً ہٹلر نے جو براہِ راست اقدامات چیکوسلواکیا اور پولینڈ میں کیے، وہ سیاسی اعتبار سے فیصلہ کن اقدامات تھے، لیکن ہسپانیہ کی خانہ جنگی، (جس کی تفصیلات پہلے بیان ہو چکی ہیں) جولائی ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا جذباتی حادثہ تھی جس نے مغربی دنیا کے لاکھوں مردوں اور عورتوں میں اختلاف پیدا کر دیا۔ یہ آج بھی دریفس کے مقدمے کی طرح ہمارے عہد کی وفاداری اور ضمیر کا امتحان ہے۔

ہسپانوی خانہ جنگی میں بڑا تشدد ہوا اور اصولی جنگوں کے جوش و خروش کا خوب اظہار ہوا۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اگر یہ جنگ محض ہسپانویوں تک محدود رہتی تو نتیجہ کیا نکلتا؟ امریکہ کی خانہ جنگی صرف امریکہ ہی تک محدود رہی تھی۔ فرینکو کے باغیوں کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ افضل نے حملہ کیا اور ان کی فوج کی قیادت تربیت یافتہ فوجی افسر کر رہے تھے، لیکن وفاداران حکومت کے پاس وسائل بہت زیادہ تھے۔ دارالحکومت ان کے قبضے میں تھا۔ بہترین صنعتی خطے ان کے پاس تھے۔ فوج سے بھی وہ خالی نہ تھے اور ان کے تمام ساتھی لڑنے کے لیے مضطرب تھے مگر آج ایسی قیاس آرائی بے سود ہے۔ جب ہسپانوی خانہ جنگی شروع ہوئی تو محض مغرب ہی جذباتی اعتبار سے اس میں شریک نہ تھا محض چند غیر ملکی افراد ہی اس میں شامل نہیں ہوئے تھے، بلکہ دوسری قوموں نے بھی اس میں سرگرم حصہ لیا، اگرچہ کھلم کھلا نہ لیا ہو۔ فاشسٹ طاقتوں یعنی اٹلی اور جرمنی کی شرکت غیر تر اور فیصلہ کن تھی۔ کمیونسٹ روس کی شرکت خاص عزم پر مبنی نہ تھی اور اعانت کا سب سے کمزور نمونہ برطانیہ اور فرانس نے پیش کیا۔

برطانیہ نے ایک کمیٹی بنا دی تاکہ عدم مداخلت کی پالیسی کی نگرانی کرے۔ اس کمیٹی میں بہ اوقات مختلف تقریباً تیس قوموں کے نمائندے شریک رہے، لیکن اس نے کام کچھ نہ کیا۔ بحیرۂ روم میں بحری قزاقی کے خلاف نگرانی کا انتظام برطانیہ کی سرپرستی میں ہوا تھا۔ اسے آبدوزوں کے پُراسرار حملوں کی روک تھام کرنی پڑی جنگ میں اطالویوں نے سب سے زیادہ رضاکار فرینکو کی امداد کے لیے بھیجے۔ غالباً ان کی تعداد پچھتر ہزار تھی۔ پھر ہوائی جنگ میں بھی مدد دی۔ روس کا طرزِ عمل اس کے خلاف رہا۔ اگرچہ وہ اصل میدان جنگ سے دور تھا اور زیادہ بھی نہ تھا، تاہم اس نے جمہوریت کے وفاداروں کو سامان بہم پہنچایا کمیونسٹ سیاستدان اور خفیہ پولیس کے کارکن بھی بھیجے، جنھوں نے زیادہ وقت فرینکو کے خلاف جنگ میں صرف نہ کیا، بلکہ انارکسٹوں، ٹروٹسکی کے پیروؤں اور سٹالن کے دوسرے مخالفوں کا استیصال کرتے رہے، جو جمہوریت کے حامی تھے۔

حکومت فرانس رسمی طور پر ہسپانوی خانہ جنگی سے الگ رہی اور اس نے براہِ راست جمہوریت کو کوئی امداد نہ دی۔ اس زمانے میں فرانس پر متحدہ محاذ کی حکومت تھی اور متحدہ محاذ جمہوریت کا حامی تھا۔ کوہستان پرینیز کا محاذ بہت طویل تھا۔ اس

کی نگرانی کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، لہٰذا بااصول آدمی، منچلے لوگ، طالع آزما سپاہی اور کمیونزم کے فریب خوردہ سب ہسپانیہ پہنچتے رہے۔ امریکیوں کا بھی ایک گروہ ـــ ابراہم لنکن کا بریگیڈ ـــ فرینکو کے خلاف لڑا، لیکن فرینکو کو جن لوگوں نے امداد دی، ان کے پاس ہتھیار تھے، رسد تھی، وہ لوگ خاص تربیت یافتہ تھے۔ ۱۹۳۹ء کے اوائل میں بارسیلونا (برشلونا) فتح ہو گیا۔ ساتھ ہی عملاً خانہ جنگی ختم ہو گئی۔ ایک اور فاشسٹ گروہ نے کامیابی حاصل کر لی۔

اس اثنا میں مسولینی کامرانی کی سیاہ مستی کے جوش میں دوسری ہنگامہ آرائیوں کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اس نے ہٹلر کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ اس وقت سے اٹلی اور جرمنی کا محور رسماً قائم ہوا اور فاشسٹ اٹلی نازی جرمنی کا حلیف بن گیا۔ مسولینی نے ہسپانیہ میں فرینکو کی امداد کے لیے زبردست کوشش کی۔ ۱۹۳۸ء کے اواخر میں اس نے اٹلی میں کھلم کھلا اعلان کیا کہ فرانس کو خاص علاقے ہمارے حوالے کر دینے چاہئیں۔ وہ نیس اور سوائے ہی نہیں چاہتا تھا، جو ایک صدی پیشتر اٹلی کے اتحاد کے وقت نپولین سوم کے حوالے کیے گئے تھے، بلکہ بحیرۂ روم کے جزیرے کارسیکا کا بھی خواہاں تھا، جو اٹھارھویں صدی میں لوئی پانزدہم کے زمانے سے فرانسیسی چلا آتا تھا۔ ساتھ ہی ٹیونس لینے کا خواہاں تھا، جہاں کبھی اٹلی کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور ۱۸۸۱ء سے ٹیونس فرانس کے قبضے میں چلا آتا تھا۔ یہ بے سر و پا مطالبات کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکے لیکن ان کی وجہ سے فرانس اور اٹلی کے تعلقات میں اصلاح نہ ہوئی۔ سب سے آخر میں ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو مسولینی نے البانیا پر حملہ کر دیا، جس پر مدت سے اطالویوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں اور اس چھوٹی سی پسماندہ بلقانی ریاست کو تیزی سے فتح کر لیا۔ چند سال تک وکٹر عمانوئیل شاہ البانیا اور شہنشاہِ حبشہ رہا۔

پچھترواں باب

جنگ کی جانب پیشقدمی

سنہ ۱۹۳۱ء - سنہ ۱۹۳۹ء

(۲)

پانچواں قدم: آسٹریا سے اتحاد سنہ ۱۹۳۸ء

اطالوی یا ہسپانوی فاشستوں کے جارحانہ اقدامات دوسری عالمی جنگ کے فوری اسباب نہیں مانے جا سکتے۔ یہ جنگ اس لیے ناگزیر ہوئی کہ ہٹلر نے پے در پے اور کھلم کھلا جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں اس نے جرمن فوجوں کی از سر نو ترتیب شروع کر دی تھی۔ تین سال بعد اس نے اپنے آپ کو اتنا قوی محسوس کیا کہ توسیع کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھائے۔ چنانچہ یہ قدم اٹھایا، مگر ساتھ ہی کہتا رہا کہ میں صرف جرمنی کی وہ حیثیت بحال کرنا چاہتا ہوں، جس سے اسے معاہدۂ ورسائی کے مطابق جبراً محروم کیا گیا تھا۔ آسٹریا زبان اور روایات کے اعتبار سے جرمن تھا۔ ہیپسبرگ سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تو آسٹریا محض ایک مختصر سا علاقہ رہ گیا۔ سنہ ۱۹۱۸ء سے آسٹریوں میں جرمنی کے ساتھ اتحاد کی پُرزور تحریک جاری تھی۔ پہلی جنگ کے فاتح اس تحریک کو سختی سے روکتے رہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آسٹریا اور جرمنی کے درمیان کسٹمز کے اتحاد سے اقتصادی اتحاد کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ فرانس و برطانیہ نے اس کی بھی مزاحمت کی۔ جب نازی جرمنی میں برسر اقتدار آ گئے تو انھوں نے آسٹریا اور جرمنی کے درمیان کامل اتحاد کا فیصلہ کر لیا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں نازیوں نے پہلی مرتبہ آسٹریا میں ہنگامہ بپا کیا۔ اس میں آسٹریا کا چانسلر ڈالفس مارا گیا، مگر نازی کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ اوّل تیاری ناکافی تھی، دوم مسولینی کی اٹلی کو اس سے سخت اختلاف تھا۔

ہٹلر نے نازیوں کی آئندہ کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی احتیاط سے زمین ہموار کی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء میں اٹلی سے معاہدہ کر لیا جس کے مطابق روما اور برلین کے محور کی بنیاد پڑی۔ اس معاہدے کے بعد مسولینی کے لیے اتحاد کی مخالفت کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ سنہ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں ہٹلر نے خاص سرگرمیاں شروع کیں۔ آگے چل کر واضح ہوا کہ اپنے شکار پر آخری ضرب لگانے سے پیشتر اسے رام کرنے کے لیے یہ اس کا معیاری طریقہ تھا۔ اس نے اخباروں، ریڈیو اور تقریروں

کے ذریعے سے شدید پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کردی، جس میں آسٹریا کی خود مختار حکومت کے خلاف نام نہاد بدعملیوں کے الزام عائد کیے جا رہے تھے۔ فروری ۱۹۳۸ء میں اس نے آسٹریا کے چانسلر شُشنگ کو اپنے خاص مکان برخس گاڈن[1] (واقع بویریا) پر بلایا اور اس کے خلاف شدید دھمکیوں کا ایک سیل بہا دیا۔ مارچ میں ہٹلر نے اپنی فوجیں آسٹریا بھیج دیں۔ یوں اتحاد ایک حقیقت ثابتہ بن گیا۔ آسٹریوں میں لوگ جو فاشزم کے مخالف تھے، اگرچہ ان کی تعداد خاصی تھی، مگر ان کی طرف سے موثر مفاہمت نہ ہو سکی۔ بین الاقوامی مزاحمت کا بھی کوئی خاص مظاہرہ نہ ہوا۔ جمعیت اقوام نے تنکا تک نہ توڑا۔

اب جرمن بولنے والے ساٹھ لاکھ مزید باشندے ہٹلر کے دائرہ خاص میں پہنچ گئے۔ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد سے اس نے وہ کام پورا کر دیا جس کے لیے عہد حاضر میں کسی ہیپسبرگ اور کسی ہوہنیزولوں کو جرأت نہ ہوئی۔ لیکن اس کے بعد بھی ہٹلر نے بسمارک کا اصول اختیار نہ کیا کہ جو کچھ حاصل ہو چکا ہے، فی الوقت اس پر قناعت کرے۔ اس کے برعکس وہ معاً چیکوسلواکیا کے سوڈیٹن جرمنوں کو ساتھ ملانے کے لیے مصروف کار ہو گیا۔

چھٹا قدم:- چیکوسلواکیا کا تجزیہ ۱۹۳۸ء — ۱۹۳۹ء

وسطی یا مشرقی یورپ میں جمہوریۂ چیکوسلواکیا تنہا ملک تھا، جہاں پہلی عالمی جنگ کے بعد پارلیمانی جمہوریت کی کامیابی نے ایک گونج پیدا کی، لیکن چیکوسلواکیا کے لیے قومی اقلیتوں کا مسئلہ بڑا مشکل تھا۔ وہاں سوڈیٹن جرمنوں کی ایک زبردست اقلیت تھی (تقریباً ساڑھے تینتیس لاکھ)۔ ان میں سے اکثریت جمہوریت کے حاشیے پر رہتی تھی۔ انھیں اس لیے چیکوسلواکیا میں شامل کر دیا گیا تھا کہ وہ جمہوریت کی طبعی سرحد یعنی کوہ سوڈیٹن[2] کے مشرقی جانب (چیکوسلواکیا کی جانب) رہتے تھے۔ یہی پہاڑ بوہیمیا کو جرمنی سے الگ کرتا تھا۔ جرمنوں کے علاوہ میگیاروں کی بھی ایک اقلیت وہاں موجود تھی (تقریباً سات لاکھ)۔ مزید براں جمہوریت کی سلافی اکثریت تین گروہوں میں بٹی ہوئی تھی —— چیک تقریباً ستر لاکھ۔ سلواک بیس لاکھ سے زائد، روتھینی تقریباً پانچ لاکھ —— ان تینوں کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی روایات میں وسیع اختلاف تھا۔

تاہم چیکوسلواکیا کو خوش نصیبی سے وہ علاقے ورثے میں ملے، جو صنعتی اعتبار سے بہترین اور اعلیٰ درجے کی ترقی پا چکے تھے۔ لہٰذا اس کے اقتصادیات میں صنعت و زراعت کے درمیان بہتر توازن تھا، جس کی مثال مشرقی یورپ کی کسی دوسری مملکت میں نہیں ملتی تھی۔ یہ صحت مند اقتصاد عمرانی نظام میں منعکس ہوا، کیونکہ کسانوں، صنعتی مزدوروں اور طبقۂ اوسط میں عملی توازن قائم رکھا جا سکا۔ جنگ کے بعد کساد اعظم کے دور میں جو مشکلات پیدا ہوئیں، ان کا اثر چیکوسلواکیا پر بہت گہرا پڑا، مگر یہ مشکلات جمہوریت کے قیام میں اس لیے حائل نہ ہو سکیں کہ ملک کے نجات دہندہ اور صدر ٹامس میساریک[3] کی پالیسی روشن خیالی پر مبنی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ تمام خدمات سے سبکدوش ہو گیا، کیونکہ عمر پچاسی سال کی ہو چکی تھی۔

---

[1] Berchtesgaden　[2] Sudeten Mountains　[3] Masaryk

چیکوسلواکیا کی روشن خیال حکومت بھی ملک کو تباہی سے نہ بچا سکی، کیونکہ ذکی الحس اقلیتوں پر باہر سے برابر دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس سلسلے میں سوڈیٹن جرمن سب سے بڑا مسئلہ بن گئے۔ وہ ہیپسبرگوں کے زمانے سے چیکوں کے مخالف تھے اور ہر قدم پر نئی جمہوریت کی مخالفت کرتے رہے، حتیٰ کہ حکومت نے ان کی جائز شکایات ختم کرنے کے لیے مراعات کا انتظام کر دیا تو جب بھی ان جرمنوں کی روش نہ بدلی۔ ان میں سے جو انتہا پسند تھے، وہ ہٹلر کی طرف متوجہ ہو گئے، مگر اعتدال پسند اور اشتراکی سوڈیٹن بھی بہ اعتبار افکار جرمنوں کا اتحاد چاہتے تھے۔ ۱۹۳۳ء سے نازیوں کی ہنگامہ آرائی چیکوسلواکیا کے لیے روز افزوں خطرناک بنتی گئی۔ ہٹلر آدمیوں اور روپے سے اس ہنگامہ آرائی کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا تو ساتھ ہی وہ چیکوسلواکیا کا معاملہ اٹھانے پر تل گیا۔ سوڈیٹن جرمنوں میں ہینلین[۱] اس کا خاص کارندہ تھا۔ اس نے حکومت چیکوسلواکیا سے ایسے مطالبے کیے، جن کا مفاد یہ تھا کہ سوڈیٹن جرمنوں کو کامل خود اختیاری مل جائے۔ ۱۹۳۸ء کے گرما میں گفت و شنید بھی جاری رہی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے میں بھی کمی نہ آئی۔ چیکوں کو اپنے حلیفوں یعنی برطانیہ اور فرانس پر پورا بھروسا تھا۔ برطانوی مدبروں نے بھی پہلی مرتبہ برسرعام یہ کہنا شروع کیا کہ جرمنی بہت آگے نکل گیا ہے۔ بہرحال برطانیہ نے لارڈ رنسیمین[۲] کو ثالث بنا کر بھیج دیا، جس کا رجحان یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہٹلر کے مطالبات کم از کم نصف ضرور منظور کر لیے جائیں گے۔

۱۹۳۸ء کے موسم خزاں میں ہٹلر اقدام کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ۱۲ ستمبر کو اس نے نورمبرگ میں ایک سخت تقریر کی جس میں سوڈیٹن جرمنوں کے لیے خود اختیاری پر اصرار کیا۔ یہ تقریر چیکوسلواکیا میں وسیع فسادات کا پیش خیمہ بن گئی اور حکومت کو مارشل لا کا اعلان کرنا پڑا۔ اب یورپ میں شدید بحرانی حالت پیدا ہو چکی تھی۔ لازم تھا کہ تمام مملکتوں کے برسراقتدار افراد اس میں شخصاً مداخلت کریں۔ برطانیہ کے وزیراعظم نیویل چیمبرلین[۳] نے دو مرتبہ جرمنی میں ہٹلر سے ابتدائی ملاقاتیں کیں۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ جرمنوں کے مطالبات میں اعتدال پیدا کیا جائے۔ آخر اس نے مسولینی کی امداد سے ہٹلر کو اس امر پر راضی کر لیا کہ چار بڑی مغربی طاقتوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے، جس میں ہٹلر اور مسولینی کے علاوہ فرانس کی طرف سے دلادیا اور انگلستان کی طرف سے چیمبرلین شامل ہوں۔ چنانچہ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کو یہ کانفرنس میونخ میں منعقد ہوئی۔ روس کو اس میں نہ بلایا گیا۔ اس بنا پر متحدہ محاذ کی پالیسی سے روس کی علیحدگی پر آخری مہر لگ گئی۔

میونخ کی کانفرنس ہٹلر کی بے پناہ کامیابی کی دستاویز تھی۔ چیکوسلواکیا کا ایک حصہ الگ کر لیا گیا۔ سوڈیٹن جرمنوں کا علاقہ، جو حاشیے پر واقع تھا، جرمنی کو لوٹا دیا گیا۔ چیکوسلواکیہ کے اقتصادیات اور نظام حمل و نقل اپاہج ہو گئے، اور اس کی سرحدوں کی حفاظت اس لیے غیر ممکن ہو گئی کہ پہلے پہاڑ حد تھے

---

[۱] Henlein

[۲] Runciman

[۳] Neville Chamberlain

اور وہاں چیکوں نے استحکامات کو رکھے تھے۔ وہ چھن گئے تو چیک بے دست و پا رہ گئے۔ چیک لیڈروں کو احساس تھا کہ اپنے حلیفوں، فرانس اور برطانیہ کی امداد کے بغیر وہ جرمنوں کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انھوں نے تصفیۂ میونخ کا تلخ گھونٹ صبر سے پی لیا۔ اس اثنا میں جرمنوں نے دستکار چیکوں اور بڑی حد تک زراعت پیشہ سلوواکیوں کے اختلافات پر بھی خاص زور دیا تھا۔ اگر ملکی باشندوں کے تمام طبقے متحد ہوتے تو اس صورت میں بھی میونخ کی شدید ضرب چیکوسلوواکیوں کے حوصلے پست کر دیتی۔ ہٹلر نے بڑی تیزی سے اگلا قدم اٹھایا۔ آئندہ موسم بہار میں جب میونخ کے تصفیے کے مطابق طے شدہ حدود پر قبضہ ہو گیا تو ہٹلر نے چیکوسلوواکیا کے صدر ہاہا[1] کو جرمنی بلایا اور دوسری دردناک ملاقاتوں کی طرح اس ملاقات میں بھی اعلان کر دیا کہ چیکوں کی تقدیر پورے اعتماد کے ساتھ فیوہرر کے حوالے کر دینی چاہیے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے اپنی فوجوں کو چیکوسلوواکیا کے بچے کھچے حصوں میں بھیج دیا۔ کہیں کوئی خاص مزاحمت نہ ہوئی۔

غرض جمہوریہ چیکوسلوواکیا کا تجزیہ مکمل ہو گیا۔ بوہیمیا اور موریویا چیک علاقے تھے۔ وہ جرمنی کی سرپرستی میں آ گئے۔ باقی اقلیتوں والے علاقے کی حیثیت بدل گئی۔ سلوواکیا میں قدامت پسند کیتھولک آبادی مدت سے چیکوں کے خلاف چلی آتی تھی اور ہیلنکا نے علیحدگی کی جو تحریک شروع کی تھی، وہ خوب جڑ پکڑ چکی تھی۔ نازیوں کے لیے یہ صوبہ خاصا سازگار ثابت ہوا۔ انھوں نے بزور سلوواکیا کو داخلی اعتبار سے خود مختار بنا دیا اور ہیلنکا کا جانشین پادری ٹسو[2] وزیر اعظم بن گیا۔ مارچ ۱۹۳۹ء کے بعد سلوواکیا کو برائے نام خود مختاری مل گئی۔ دراصل یہ جرمنی کی پہلی تابع ریاست تھی، جو توسیع یافتہ جرمنی کے بیرونی حواشی پر قائم کی گئی۔ میونخ کے بعد روتھینیا کو بھی تھوڑے عرصے کے لیے خود مختار بنا دیا گیا۔ اس کا نام بدل کر کارپیتھو یوکرین[3] رکھ دیا گیا۔ یہ صوبہ چیکوسلوواکیا کی انتہائی مشرقی سرحد پر واقع تھا۔ اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے پسماندہ مانا جاتا تھا۔ ہیپسبرگوں کے زمانے سے میگیار اس پر حکومت کرتے رہے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں ہنگری نے حملہ کر کے کارپیتھو یوکرین کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

تصفیۂ میونخ کا بہترین دفاع یہ ہو سکتا ہے کہ مغرب جنگ کی تیاری کے لیے تھوڑی سی مہلت کا طلبگار تھا۔ اسی لیے ہٹلر کو مطمئن کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جنگ ناگزیر ہے اور اس وقت تک مغرب اس کے لیے تیار نہ تھا، لیکن اغلب یہ ہے کہ چیمبرلین نے اور دلادیا نیز کروڑوں انسان سمجھے بیٹھے تھے یا انھیں امید تھی کہ سوڈیٹن جرمنوں کا علاقہ لے لینے کے بعد ہٹلر مطمئن ہو جائے گا اور وہ میونخ کے بعد اس اصول پر عمل پیرا ہو گا جس پر بسمارک جنگ سیڈان[4] میں کامیابی کے بعد عمل پیرا ہوا تھا، یعنی وہ مطمئن ہو کر توازنِ قوی محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا۔ بعض مغربیوں کو یہ امید بھی تھی کہ ممکن ہے، ہٹلر کمیونسٹ روس کے خلاف مغربیوں کا حلیف بن جائے یا وہ مشرقی یورپ کے معاملات میں اس طرح الجھ

---

۱ Hacha

۲ Tiso

۳ Carpatho- Ukraine

۴ Sedan. ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی، اس میں جنگِ سیڈان فیصلہ کن تھی۔ اس کی بنا پر فرانس صلح کے لیے مجبور ہو گیا۔

جائے کہ روس و جرمنی کی جنگ کے سوا چارہ نہ رہے، لیکن ہٹلر کے الفاظ یا اعمال نے اس عقیدے کے لیے کوئی حقیقی بنیاد مہیا نہیں کی تھی کہ وہ مغرب کا ساتھی بن جائے گا۔ دراصل یہ ایسا عقیدہ تھا جس کے لیے یورپی نظام ملک داری سے گزشتہ چار سو سال میں کوئی تائید نہیں ملتی تھی۔ ہٹلر بسمارک کی نسبت کہیں زیادہ نپولین سے مشابہ تھا۔ ایسا زبردست جابر جنگ عام کے بغیر ہرگز نہیں رک سکتا تھا۔ تاریخ، نفسیات، عمرانیات اور شاید عقل سلیم، سب یہی بتاتے رہے تھے کہ ہٹلر میونخ کے بعد مزید جارحانہ اقدامات کی جسارت کرے گا اور اس میں زیادہ عرصہ نہ لگے گا۔

جرمنی نے چیکوں کے مزید علاقے ہضم کر لیے۔ معلوم ہوتا ہے، اس پر کسی کو حیرت نہ ہوئی۔ غرض اس پر حواسگی، مذمت اور عزم کے جو مظاہرے ہوئے، وہ مغرب کی تاریخ کا انقلابی نقطہ ہیں۔ تملّق و خوشامد کا دور ختم ہو چکا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہٹلر کا کوئی آئندہ جارحانہ اقدام میونخ کے اعادے کا موجب نہ ہوگا۔ ہٹلر اور اس کے رفیقوں کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا انھیں یقین تھا، آئندہ کوئی جارحانہ قدم اٹھایا گیا تو جنگ عام شروع ہو جائے گی؟ عوامی اور نیم عوامی تقریروں سے، ہٹلر، گوئرنگ اور دوسرے لیڈر بے تکلف کہتے رہتے تھے کہ برطانیہ اور فرانس کے معاشرے زوال پذیر ہیں۔ ان میں کوئی عزم باقی نہیں رہا۔ وہ نااہل ہیں اور کبھی یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ پُرجوش اور جوان جرمنی کی مزاحمت کے لیے تیار ہوں، لیکن ایسی شہادت ملتی ہے کہ ہٹلر کو پولینڈ کے معاملے میں مقامی جنگ کی امید تھی اور وہ فرانس و برطانیہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

آخری قدم: پولینڈ (۱۹۳۹ء)

ہٹلر کا آئندہ ہدف پولینڈ تھا۔ پولینڈ کے لیے گزرگاہ پیدا کرنے کے لیے مشرقی پروشیا کو باقی جرمنی سے الگ کرنا ایک بڑی قوت کے جذبات کو مجروح کرنا تھا۔ یہی کیفیت ڈانزگ کے آزاد شہر کو جرمنی سے الگ کرنے کی تھی، جو پولستانی گزرگاہ کے کنارے پر واقع تھا۔ ڈانزگ زبان و روایت کے اعتبار سے خالص جرمن شہر تھا۔ پولستانی جمہوریت کے مغربی خطّے تقریباً سو سال سے پروشیا کا جزو لاینفک چلے آتے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد پولینڈ وجود میں آیا تو یہ خطّے اس کے حوالے کر دیے گئے۔ اب ہٹلر انھیں بھی واپس لینا چاہتا تھا۔ جرمن — بلکہ اعلیٰ درجے کے روشن خیال جرمن بھی — پولستانیوں کو ایک فروتر قوم سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قوم جرمنوں کی نگرانی سے مستفید ہوگی۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے بالٹک کی طرف اقدام شروع کیا اور پولینڈ کے شمالی ہمسایے لتھوانیا سے میمل[1] کی بندرگاہ لے لی۔

آخری چھ مہینے کی نازک مدت میں، جو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ پر منتج ہوئی، اصل نازک مسئلہ یہ نہ تھا کہ برطانیہ اور فرانس کی امداد کے بغیر پولینڈ کا حشر بھی وہی ہوگا، جو چیکوسلواکیا کا ہوا۔ حکومت برطانیہ نے اپریل میں پولینڈ سے

---

۱ Memil

باہم امداد کا معاہدہ کر کے کھلم کھلا واضح کر دیا تھا کہ وہ پولینڈ کی حمایت کرے گی۔ بحران کے آخری ہفتے میں چیمبرلین کے وزیر خارجہ لارڈ ہیلی فیکس[1] نے ہٹلر کو ایک تار بھیجا تھا، جس میں تاریخ کی عبرتوں پر توجہ کے لیے دردمندانہ اپیل کی تھی:۔

"کہا جاتا ہے کہ اگر ملک معظم کی حکومت ۱۹۱۴ء میں اپنا موقف واضح کر دیتی، تو جنگ کا خوفناک حادثہ رک سکتا تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قول میں حقیقت ہے یا نہیں۔ اب ملک معظم کی حکومت عزم کر چکی ہے کہ اس موقع پر کسی دردناک غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہنی چاہیے۔ اگر ضرورت پیش آئی تو حکومت پختہ ارادہ کیے بیٹھی ہے اور تیار ہے کہ بلا تاخیر اپنی تمام مہیا قوتیں کام میں لائے ..... میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان تمام مصالح پر پوری طرح غور و تدبر فرمائیں گے، جو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔"[2]

اصل تشویشناک امر یہ تھا کہ روس کی روش کیا ہوگی۔ ہٹلر کو دونوں محاذوں پر بیک وقت جنگ کا انتہائی خوف تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کی مثال جرمنی کے سامنے تھی، جس میں مشرق و مغرب دونوں میں بڑی طاقتوں سے سابقہ پڑا تھا، لیکن دو سال کے اندر اندر وہ دونوں محاذوں پر جنگ کے لیے مجبور ہو گیا۔ اگر ۱۹۳۹ء میں بھی برطانیہ، فرانس اور روس پولینڈ کی حمایت میں متحدہ محاذ پیش کر سکتے۔ تو بہت ممکن ہے، ہٹلر اس حالت میں بھی نہ خود باز رہ سکتا، نہ اپنے رفیقوں کو باز رکھ سکتا۔ بعض اوقات دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ کارفرما نازی لیڈر کسی غیر معمولی اور حد درجہ خطرناک تحریک کے مطابق ذاتی مفاد کی عام نگہداشت سے بالکل بے پروا ہو چکے تھے۔ ہٹلر پولینڈ سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا، جس طرح شرابی شراب سے دست بردار نہیں ہو سکتا، لیکن حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ہٹلر نے روسی مداخلت سے بالکل بے خوف ہو کر پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سٹالن سے پولینڈ کی تقسیم کے متعلق فیصلہ کیا، جو ویسی ہی تھی، جیسی اٹھارہویں صدی میں ہوئی تھی۔

ہم ان واقعات سے بہت قریب ہیں اور اس بے تعلقی سے ان کا جائزہ نہیں لے سکتے، جس طرح بعد کے آدمی لے سکیں گے۔ ہٹلر نے اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں اس قسم کے کام کے لیے خاصی نظری تیاری اور جواز کا انتظام کر لیا تھا۔ روس جمعیت اقوام میں شامل ہوئے۔ انھوں نے اجتماعی حفاظت اور بین الاقوامی تنظیم کے متعلق باتیں بہت کیں، مگر عمل کی

---

[1] Halifax برطانیہ کی خارجہ پالیسی کے متعلق دستاویزیں مرتبہ

[2] Documents on British Foreign.... Policy 1919-1939 Woodward and Butler سلسلہ سوم جلد دوم ص ۱۲۵

سطح پر ثابت کر دیا کہ مغربی طاقتوں کے بجائے انھیں ہٹلر سے زیادہ خوف تھا، لیکن ۱۹۳۹ء کے گرما میں انھوں نے یکایک رُخ پھیر کر اپنے جانی دشمن سے شرطیں طے کر لیں۔ جرمنوں نے روسیوں کے متعلق اور روسیوں نے جرمنوں کے متعلق جو کچھ برسرِ عام کہا تھا، وہ دشنام طرازی کے بجائے یکایک نہایت بے ڈھنگی مدح و ستائش میں تبدیل ہو گیا اور وفادار کمیونسٹوں نے دنیا بھر میں اس تبدیلی کی حمایت کے لیے غیر طبعی جست لگائی۔

سوال یہ ہے کہ روسیوں نے کیوں یکایک رخ پھیرا؟ چیکوسلواکیا کے بحران میں انھیں گفت و شنید سے باہر رکھا گیا تھا، اس لیے اُن کے دل مجروح تھے۔ باہر رکھنے کا پورا الزام وہ برطانیہ اور فرانس پر لگاتے تھے۔ جرمنی نے معاہدۂ ورسائی کی خلاف ورزی ۱۹۳۴ء سے شروع کی تھی، مگر مغربی طاقتیں اسے روکنے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ روسی اس نتیجے پر پہنچے کہ مغربی طاقتیں ہٹلر سے لڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہی نتیجہ ہٹلر نے اخذ کیا۔ روسیوں کو برطانیہ کے اُن قدامت پسندوں پر قطعاً اعتماد نہ تھا، جو نیویل چیمبرلین کی قیادت میں کام کر رہے تھے۔ روسیوں کو یقین تھا کہ برطانیہ کے قدامت پسند نازی جرمنی کے مقابلے میں کمیونسٹ روس کے زیادہ دشمن ہیں۔

فرانس اور برطانیہ نے تاخیر سے اور بادلِ ناخواستہ جو وفد ماسکو بھیجا (۱۹۳۹ء کے گرما میں)، اس سے مغربی جمہوریتوں کے متعلق روسیوں کی بے اعتمادی زائل نہ ہوئی۔ اس وفد نے باہم امداد کا معاہدہ تجویز کیا تھا، لیکن گفت و شنید کرنے والوں کی کوشش نیم دلانہ تھی اور اس سلسلے میں زیادہ دانشمندی سے بھی کام نہ لیا گیا۔ بطورِ خاص قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ چیمبرلین نے حکومت سے گفت و شنید کے لیے جو لوگ چنے، وہ اس کام کے لیے موزوں نہ تھے۔ ان میں سے ایک شخص آئرن سائڈ[ل] تھا، جو بالشویکوں کے ابتدائی دور میں اُس برطانوی فوج کے ساتھ تھا، جو آرک اینجل میں بالشویکوں سے لڑی تھی۔ ایک اور شخص وزارتِ خارجہ کا عام رکن تھا۔ روسیوں کو یہ پسند ہے کہ حد درجہ ذمہ دار اور سرکردہ لوگ ان سے گفتگو کریں، اس طرح اُن کی اہمیت بڑھتی ہے۔ اسی زمانے میں ہٹلر بھی روس سے گفت و شنید کر رہا تھا۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس نے اپنے وزیر خارجہ ربن ٹراپ کو اس کام پر مامور کیا۔ غرض انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ماسکو سے مفاہمت کی جو کوشش کی، وہ بے نتیجہ رہی۔ روسی لیڈر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مغربی جمہوریتیں شکستہ نَے کی حیثیت رکھتی ہیں اور اگر ہٹلر سے معاہدہ نہ کیا گیا تو وہ بہر حال روس پر حملہ کرے گا۔

سب سے آخر میں یہ کہ روسیوں کو پولینڈ کی حکومت پر بھی اتنی ہی بے اعتمادی تھی، جتنی کسی دوسری حکومت پر ہو سکتی تھی۔ مغربی جمہوریتوں، خصوصاً فرانس نے یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ مشرقی یورپ کی چھوٹی چھوٹی طاقتوں کو شہ دے کر جرمنی اور روس، دونوں کے خلاف استعمال کیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ نکل آیا۔ اہلِ پولینڈ روس کو اپنا محافظ نہ مان سکے۔ وہ

ل IRONSIDE

ہراس و بے اطمینانی کے اس دور میں، جب گفت و شنید جاری تھی، اس امر پر راضی نہ ہو سکے کہ جرمنی سے جنگ کی حالت میں روسی فوجیں پولینڈ کے اندر سے گزر سکیں۔ روسیوں کو اس اثنا میں یہ ترغیب مل گئی کہ پولینڈ کے مشرقی حصے کے جو علاقے ان سے پہلی عالمی جنگ میں چھنے تھے، ان پر دوبارہ قابض ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو جرمنی سے عدم تجاوز کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ مغرب میں اس پر سخت سراسیمگی پھیلی۔ ایک ہفتہ بعد جرمن فوجیں پولینڈ میں داخل ہوگئیں۔ ۳ ستمبر کو برطانیہ اور فرانس نے اپنے عہد کی پابندی میں جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ یوں متارکے کے بیس سال اختتام پر پہنچ گئے۔

جمہوریتوں کی پالیسی پر تبصرہ

مغربی دنیا کے اہلِ علم ۔۔۔ یعنی جو لوگ مقالے لکھتے ہیں یا تعلیم دیتے ہیں یا تقریریں کرتے ہیں ۔۔۔ جمہوریتوں کی خارجہ پالیسی کے جائزے میں سختی سے کام لیتے رہے۔ انھوں نے دونوں جنگوں کے درمیانی بست سالہ دور میں صرف برطانیہ اور فرانس ہی کی پالیسی کو نہیں، بلکہ یورپ کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور امریکہ کی پالیسی کو بھی مذموم قرار دیا۔ جمہوریتیں بیچارگی اور مایوسی کی حالت میں بیٹھی رہیں۔ اس اثنا میں اٹلی، جاپان، جرمنی اور ہسپانیہ کے معاشرے زیادہ سے زیادہ قوت پکڑ گئے اور ان کا ارادہ سب پر واضح تھا کہ روئے زمین پر جمہوریتوں کو تباہ کر دیا جائے۔ جمہوریتیں اپنے اس نہایت درجہ بنیادی اعتقاد پر قائم رہیں کہ خود مختار قوموں کو جارحانہ اقدام سے محفوظ رکھا جائے، لیکن ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر جاپان کے حملے سے ۱۹۳۹ء میں بچے کھچے چیکوسلواکیا پر جرمن حملے تک غیر مشتبہ جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رہا اور یہ سلسلہ بین الاقوامی قانون کے موجود نظام کے سراسر خلاف تھا، مگر کسی بھی جمہوریت نے احتجاج کے سوا کوئی قدم نہ اٹھایا۔ جمہوریۂ امریکہ بھی مستثنیٰ نہیں، جس نے سپین کی خود مختاری محفوظ رکھنے کے لیے مسلسل دلبستگی کا اظہار کیا تھا۔ جب تک جمہوریتیں پے درپے کچوکے لگنے سے آمادۂ کار ہوئیں، اُس وقت تک دشمن بہت قوی ہو چکے تھے اور اُن کے دل میں اپنی کامیابی کے متعلق اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔

تاہم یہ اندازہ کر لینا مشکل نہیں کہ اس مدت میں جمہوریتوں نے کیوں عملی اقدام میں تساہل سے کام لیا۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ ۱۹۱۸ء میں فتح حاصل کر چکے تھے۔ اسی لیے انہوں نے دفاع کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ دانشمندی سے کام لیا جاتا اور خوش نصیبی ساتھ دیتی تو یہ دفاعی روش بدرجہا زیادہ موثر ہو سکتی تھی، مگر اس سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی تھی کہ جمہوریتیں دفاع پر قائم تھیں۔ ہمارے نظام ملک داری کے طویل ماضی کی شہادت یہ ہے کہ دفاعی موقف ہمیشہ مشکلات کا باعث رہا اور اسے برابر جارحانہ اقدام میں زک اٹھانی پڑی۔ غالباً مغربی ثقافت کی فطرت ہی یہ ہے جو ہمیشہ تبدیلی پر متوجہ رہتی ہے۔ اس نقصان کو کسی بھی لحاظ سے جمہوریتوں کے لیے مخصوص نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مطلق العنان بادشاہیاں بھی دفاع میں اُسی طرح مبتلائے مشکلات ہوتی رہیں، جس طرح میٹرنخ کی ناکامی سے واضح ہے۔

دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی دور میں فاتحین کا طبعی رجحانِ استراحت جمہوری زندگی کے بعض حقائق کی بنا پر بڑھ گیا۔ مغربی

جمہوریتوں کا فیصلہ یہ تھا کہ ہر شہری کے لیے مادّی راحتیں بہم پہنچانے کی غرض سے جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، ضرور کیا جائے۔ ان کا طبعی رجحان یہ تھا کہ توپوں کے بجائے مکھن پیدا کیا جائے۔ ان کے جابر مخالف بھی ویسے ہی مادیت پرست تھے، جیسے جمہوریتیں تھیں، مگر وہ طے کر چکے تھے کہ مکھن مستقبل میں ہاتھ آئے گا اور توپوں ہی کی بدولت ہاتھ آئے گا۔ غرض جرمنی، جاپان اور اٹلی کی حکومتیں اپنے معاشروں کو کمر باندھ لینے پر آمادہ کر سکیں، تاکہ امکانی فوجی تیاریاں کر لی جائیں۔ جمہوری حکومتوں کے لیے ایسی قربانیاں اس وقت تک حد درجہ مشکل تھیں، جب تک جنگ شروع نہ ہو جاتی۔

مزید برآں انسانی فطرت اور انسانی معاشروں کے متعلق جمہوری معاشروں کے تصوّرات امیّد افزا تھے۔ جمہوری معاشرے مطلق العنان قوتوں کے جابرانہ اقدامات کی گہرائیوں کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ امریکیوں کے ہی نہیں بلکہ فرانس و برطانیہ کے عوام کے نزدیک بھی پہلی عالمی جنگ عقل و شرافت پر مبنی معاشرے کی مستقل ترقی میں ایک محیّر العقول افتاد تھی۔ اکثر لوگوں، خصوصاً اہلِ برطانیہ کے نزدیک معاہدۂ ورسائی کی انتقامی شرطیں بڑی حد تک جرمنوں کی پالیسی کے لیے وجہِ جواز تھیں۔ معاہدۂ ورسائی کے ذریعے سے جرمنی پر آغازِ جنگ کا جو جرم عائد کیا گیا تھا۔ اس کا احساس کتنا ہی اہم مان لیا جائے، مگر جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کے متعلق جمہوری اخلاقی اقدار اور جمہوری احساس نے مغرب کو اُن خطرات سے بالکل غافل کر دیا، جو گرد و پیش منڈلا رہے تھے۔ اکثر شریف جمہوریت پسندوں کو ہٹلر اتنا بُرا نظر نہیں آتا تھا، جتنا وہ اپنی تقریروں میں ظاہر ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی عجیب و غریب علّت کی بنا پر وہ ہنگامہ آرائی کی نمائش کر رہا ہے۔ حقیقت میں وہ معقول ہو گا اور مفاہمت کے لیے تیار ہو جائے گا۔ انھیں یہ خیال نہ تھا کہ ہٹلر واقعی نئی جنگ کا پیش خیمہ بنے گا اور جنگ بھی ایسی، جو غالباً مغرب کو تباہ کر دے گی، یہاں تک کہ فاتح بھی اس میں شکست خوردہ سمجھا جائے گا۔ ان جمہوریّت پسندوں کا استدلال یہ تھا کہ ہٹلر دیوانہ نہیں۔ اگر وہ دیوانہ بھی تھا تو جرمن اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنی قبر خود نہیں کھودیں گے۔

آخر انھوں نے دیکھ لیا کہ ہٹلر نے آخری دنوں میں برلن کے اندر دیگر سے بھی بدتر جنون کا مظاہرہ کیا۔ ہٹلر اور اس کے لاکھوں پیرووں نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا، جو مغربیوں کے نزدیک اٹھارھویں صدی کے عہدِ تنویر کی روشنی میں انسانوں کو لازماً اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اب غالباً مغرب کو ضروری سبق مل چکے ہیں۔ اب اہلِ مغرب — کم از کم بہت سے ذمہ دار لیڈر — یہ توقع نہیں رکھتے کہ مغربی جمہوریتوں کے دشمن عادات میں ویسے ہی ہیں، جیسے وہ خود ہیں اگر پسماندہ ممالک کے افراد نے یہ سبق نہ سیکھے تو ہمیں اُن پر زیادہ جرح نہ کرنی چاہیے۔

سامراجی بندھنوں کی کشود

چھہتّرواں باب

مشرق بعید

(۱)

تمہید

سنہ ۱۹۱۴ء سے پیشتر بھی ایسے آثار نمودار ہو چکے تھے کہ جو قومیں زیادہ ترقی کر چکی ہیں، وہ سامراج کی ماتحتی سے برگشتہ ہو رہی ہیں۔ یہ آثار خصوصیت سے مصر، فرانسیسی افریقہ، فلپینز، چین اور ہندوستان میں نمایاں تھے۔ پہلی عالمی جنگ نے ان قوموں میں قومی شعور زیادہ بیدار کر دیا اور جنگ ختم ہوئی تو اس میں کوئی شبہہ نہیں رہا تھا کہ مغرب کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ بلاشبہہ جرمنی سامراج کی کشمکش سے حذف ہو چکا تھا۔ اس کی نو آبادیاں برطانیہ، نیز اس کے بعض ڈومینینوں کو مل چکی تھیں۔ کچھ فرانس اور جاپان لے چکے تھے، مگر یہ انتظام جمعیت اقوام کے نظام حکمداری کے تحت کیا گیا تھا، مطلق الحاق نہ تھا۔ جو عرب مملکتیں سلطنت عثمانیہ سے پیدا ہوئیں، انھوں نے اپنی فوجیں مرتب کر لیں اور ترکی سے آزادی کے لیے اہل یورپ کے دوش بدوش لڑتی رہیں۔ اسی طرح فرانسیسی شمالی افریقہ کی فوجیں، حبشی فوجیں اور برطانیہ کی ہندستانی فوجیں عالمی جنگ میں شامل رہیں۔ بعض اوقات یورپ میں لڑیں۔ انگریزوں نے افریقہ میں جرمن نو آبادیوں کی تسخیر کے لیے دیسی فوجوں سے بہت کام لیا تھا۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ حقیقت واضح تھی کہ جنگ کے تجربے نے غیر مغربی اقوام کا درجہ بلند کیا۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ سفید فام آقاؤں کے نزدیک وہ کس درجہ اہم ہیں اور ان کے لیڈروں نے مغربی دنیا کے متعلق اپنی معلومات وسیع کر لی تھیں۔ آقاؤں کی باہم رزم آرائی کے منظر نے محکوم اقوام میں مغرب کا وقار کم دیا۔ مزید برآں اتحادیوں نے یہ جنگ تمام قوموں کی خود مختاری کے جمہوری اصول کی خاطر لڑی تھی اور وسطی یورپ کی طاقتوں کے پروپگنڈے میں سامراج کی مخالفت پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں ان سے کوئی علاقہ نہ چھینا، بلکہ نظام حکمداری کے تحت انھوں نے مزید علاقے حاصل کر لیے۔ بہت سی محکوم اقوام اور مغرب کے آزاد خیالوں کے نزدیک حکمداری بھی سامراج کا محض ایک پردہ تھی، مگر یہ یقینی ہے کہ سامراجی طاقتوں کے نزدیک یہ پردہ بڑا ضروری تھا۔ بہرحال مغربی جمہوریتیں اپنے مقبوضات کو کم از کم تدریجاً آزادی دینے پر آمادہ ہو چکی تھیں۔

مشرقِ بعید

۱۹۱۴ء سے پیشتر مغرب کے خلاف بغاوت کا بالاہتمام آغاز چین سے ہوا۔ اس زوال پذیر سلطنت پر مونچو خاندان حکمران تھا۔ یہ سلطنت برائے نام خود مختار تھی، مگر اس کی برتری مختلف طریقوں پر مجروح ہو چکی تھی۔ مثلاً مغربی سامراجی طاقتوں اور جاپان کو بحری مرکزوں میں وسیع مراعات، نیز سیاسی اقتصادی حقوق دیئے جا چکے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں جاپان نے چین کو شکست دی، پھر مغربی طاقتوں نے مزید مراعات کے لیے سرگرم کوششیں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چین میں بکسر[1] کے نام سے ایک خفیہ قومی انجمن بنی، جو غیر ملکیوں کی دشمن تھی۔ ۱۹۰۰ء میں اس انجمن نے بغاوت کا انتظام کیا، جس میں دو سو سے زیادہ غیر ملکی مارے گئے۔ یہ عموماً پادری تھے۔ غیر ملکی طاقتوں اور امریکہ نے اپنے اپنے ہم قوموں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ ۱۹۰۱ء میں مونچو حکومت کو مجبور کیا گیا کہ تاوان دے، نیز مزید مراعات حاصل کر لیں۔

۱۹۱۱ء کا چینی انقلاب

پھر ۱۹۱۱ء میں چین کے اندر زبردست انقلاب ہوا۔ یہ مونچو حکومت کے خلاف تھا، کیونکہ وہ حکومت سامراجی سلطنتوں کے تصرفات کو رد کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس انقلاب میں ایک عامل کارفرما رہا، جو مغربی اقتدار میں عمل و ضعیفیت کا باعث ہوا اور یہ عامل ایسی ہر تحریک میں کم یا زیادہ واضح طور پر کارفرما رہا۔ اسی سے ہمارے موجودہ باب کا تعلق ہے۔ یہ تحریک مغرب کے خلاف تھی، یعنی مغربی حاکموں یا اُن دیسی حاکموں کے خلاف، جو قوم سے بغاوت کر کے مغرب کے کارندے بنے یا دونوں کے خلاف، لیکن یہ تحریک مغربی افکار و امثلہ سے پیدا ہوئی اور مغربی اثر نہ ہوتا تو وہ شاید ہی نمودار ہوتی۔

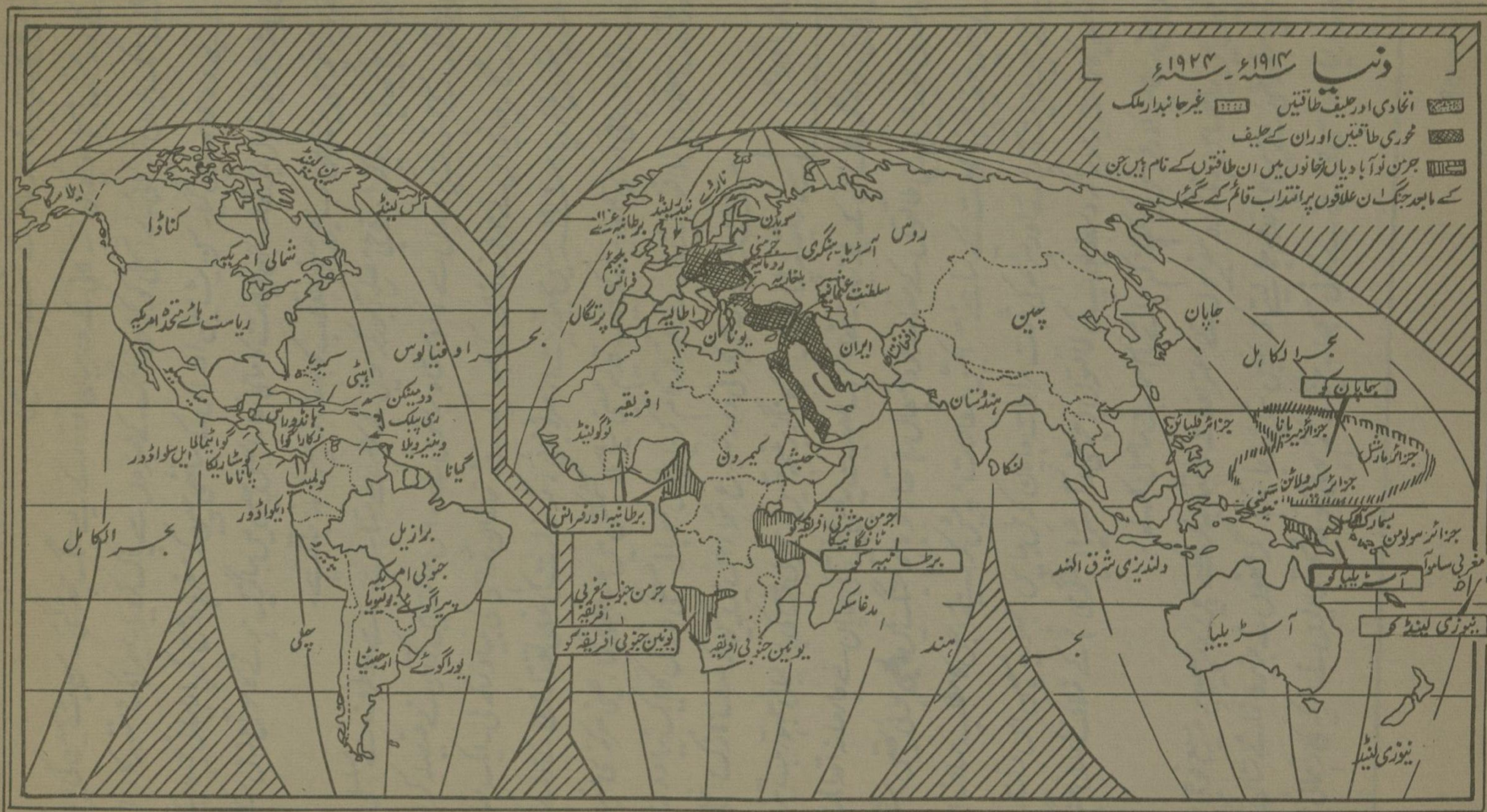
۱۹۱۱ء کا چینی انقلاب ابتدا میں متقابلۃً خونریزی سے پاک رہا۔ ۱۲- فروری ۱۹۱۲ء کو شش سالہ مونچو شہنشاہ پویی نے تخت سے دستبرداری اختیار کر لی۔ اس انقلاب میں دو گروہ کارفرما تھے اور اُن دونوں میں انقلاب کے نئے معاشرے کے متعلق اختلافِ رائے موجود تھا۔ ایک گروہ نے قوم پرور پارٹی یعنی کومن تانگ[2] کی شکل اختیار کر لی۔ سن یت سین[3] اس کا رئیس تھا اور بہت سے دوسرے اربابِ علم اس میں شامل تھے، جو مغرب میں تعلیم پا چکے تھے یا مغرب کی سیاحت کر چکے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ چین میں مغربی سیاسی نمونے کے مطابق پارلیمانی جمہوریت قائم کی جائے، البتہ جس حد تک ممکن ہو، چین کا بنیادی، خاندانی اور دیہاتی نظام قائم رکھا جائے۔ اسی پر مغربی صنعتی معاشرے کا پیوند لگا دیا جائے۔ دوسرے گروہ کا لیڈر یوآن شہ کائی[4] تھا۔ وہ ایک زبردست مرکزی حکومت کا داعی تھا، جو بنیادی طور پر تمام اختیارات کی حامل ہو اور جو اقتدار بادشاہ کو حاصل تھا وہ چین کے روایتی اور حد درجہ قدامت پسند دفتری نظام کو نہیں، بلکہ ان طاقتور لوگوں کے حوالے

ا۔ Boxer

۲۔ Kuomintang

۳۔ Sun Yat-sen

۴۔ Yuan Shih-kai


دنیا سنہ ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۲۴ء
اتحادی اور حلیف طاقتیں
غیر جانبدار ملک
محوری طاقتیں اور ان کے حلیف
جرمن نوآبادیاں خانوں میں ان طاقتوں کے نام ہیں جن کے مابعد جنگ ان علاقوں پر انتداب قائم کیے گئے
کناڈا
شمالی امریکہ
ریاستہائے متحدہ امریکہ
بحر اوقیانوس
ہیٹی
کیوبا
ڈومینکن ری پبلک
ہانڈوراس
نکاراگوا
وینیزویلا
گوئٹے مالا
ایل سلواڈور
کوسٹاریکا
پاناما
کولمبیا
گیانا
ایکواڈور
برازیل
جنوبی امریکہ
پیرو
بولیویا
پیراگوئے
چلی
ارجنٹینا
یوراگوئے
بحر الکاہل
روس
ناروے
سویڈن
برطانیہ عظمیٰ
جرمنی
آسٹریا ہنگری
بلجیم
فرانس
رومانیہ
بلغاریہ
سلطنت عثمانیہ
پرتگال
اطالیہ
یونان
ایران
افغانستان
افریقہ
ٹوگولینڈ
کیمرون
حبشہ
برطانیہ اور فرانس
جرمن مشرقی افریقہ کو
برطانیہ کو
مدغاسکر
جرمن جنوب مغربی افریقہ
یونین جنوبی افریقہ کو
یونین جنوبی افریقہ
ہندوستان
لنکا
چین
جاپان
جاپان کو
بحر الکاہل
جزائر فلپائن
جزائر ماریانا
جزائر مارشل
جزائر کیرولائن
جزائر سولومن
ولندیزی شرق الہند
آسٹریلیا کو
آسٹریلیا
نیوزی لینڈ کو
نیوزی لینڈ
بحر ہند

کیا جائے جو اپنے سے قوت استعمال کر کے چین کو دورِ حاضر کے نمونے پر لے آئیں

۱۹۱۱ء کے بعد منتخب اسمبلی اور یوآن شیہ کائی کے درمیان اقتدار کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ سن یٹ سین کی پارٹی نے شکست کھائی۔ ۱۹۱۴ء تک یوان شیہ کائی نے اسمبلی کو کومن تانگ کے ممبروں سے پاک کر دیا۔ پھر ایک دستور کا اعلان کر دیا، جس میں دس سال کے لیے وہ خود صدر بن گیا۔ سن یٹ سین اور اس کے ساتھی چین کو مغربی وضع کی پارلیمانی جمہوریت بنانے میں ناکام رہے۔ لیکن سن یٹ سین ایک قابل لیڈر تھا۔ وہ جن خیالات کا حامی تھا۔ انھیں چین میں جاگزیں ہونے کا موقع نہ مل سکا، مگر وہ بالکل ناپید نہ ہوئے، چنانچہ سن یٹ سین اب بھی چینی انقلاب کا بہت بڑا ہیرو مانا جاتا ہے۔

یوآن نے بعد میں جو کچھ کیا، وہ ایک ۱ ور فوجی مصلح آلیور کرامویل کے کام سے مشابہ ہے۔ اسے دو طرف سے مسلسل مزاحمت پیش آئی، اوّل کومن تانگ کے جمہوریت پروروں سے، دوم شاہ پرستوں سے۔ اس حالت میں یوآن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قدیم چینی نمونے کی پیروی کرے گا۔ چنانچہ اس نے ہونچو خاندان کے بعد ایک نئے خاندان شاہی کی بنیاد رکھ لی۔ ایک بغاوت ہوئی اور اس نے اپنا منصوبہ منسوخ کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں جمہوریت از سرِ نو بنائی، مگر وزارت کی عنانِ اقتدار فوج کے حوالے کی۔ ۶ جون ۱۹۱۶ء کو اس نے وفات پائی اور نئی جمہوریت کو ایک قدیم چینی سیاسی کشمکش میں مبتلا چھوڑ گیا، یعنی مرکزی ضبط و نظم محض برائے نام رہ گیا اور مختلف خطوں میں طاقتور لیڈروں نے اقتدار قائم کر لیا۔ یوں صوبائی جنگی لاٹوں کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

جاپان کا جارحانہ اقدام

۱۹۱۱ء کے بعد جو بحرانی دور شروع ہوا، اس میں چین کو صرف نازک داخلی مشکلات ہی سے سابقہ نہ پڑا، جو اس امر کا ناگزیر نتیجہ تھیں کہ مغربی وضع کی پارلیمانی جمہوریت تیزی سے جاری کرنے کی کوشش کی گئی، حالانکہ ملک اس کے لیے تیار نہ تھا، ایک مصیبت یہ بھی پیش آئی جاپان نے جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے تھے اور وہ مشرقِ بعید میں یورپی طاقتوں کے مقاصد خود سنبھال رہا تھا، جو باہم جنگ میں الجھی ہوئی تھیں۔ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں جاپان نے خفیہ خفیہ چینی حکومت کے سامنے "اکیس مطالبات" پیش کر دیئے، جس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ چین، جاپان کے زیرِ حمایت آ جائے اور ہر قسم کی ثبت مراعات جاپان کو مل جائیں۔ جمہوریہ چین اس وقت حد درجہ کمزور تھی۔ اس نے مخلصی کا راستہ یہ سوچا کہ وسطِ یورپ کی طاقتوں (جرمنی و آسٹریا، ہنگری) کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔ اس طرح دو اتحادیوں یعنی برطانیہ اور فرانس کی کم از کم برائے نام حمایت حاصل کر لے۔

اگر جاپانیوں میں یہ احساس ہوتا کہ وہ مغربیوں کے اعتراضات کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور چین پر وسیع فوجی یورش کی جا سکتی ہے تو وہ اتنی مضبوطی سے چین میں قدم جما لیتے کہ انھیں ہٹایا نہ جا سکتا، مگر انھوں نے جزیرہ نمائے شان تنگ[1] میں جرمنوں کی مراعات پر قبضہ کر لیا اور اسی کو اپنے لیے کافی سمجھا۔ جنگ ختم ہوئی تو فاتح اتحادیوں نے امریکہ کی رہنمائی میں اپنے حالیہ

Shantung ـ۱

فوجی رفیق جاپان کے عزائم روکنے کے لیے قدم اٹھایا۔ ۱۹۲۲ء میں ایک کانفرنس بمقام واشنگٹن ہوئی۔ اس میں جاپان کو مجبور کیا گیا کہ وہ نو طاقتوں کے معاہدے پر دستخط کرے جس میں چین کی آزادی کا عہد کیا گیا تھا۔ واقعات کے جس طویل سلسلے نے امریکہ کے خلاف جاپان کی عداوت کو تقویت پہنچائی، ان میں سے پہلا واقعہ یہی تھا اور انیس سال بعد یہ عداوت پرل ہاربر[1] پر حملے کی صورت میں بروئے کار آئی۔

قریبی چینی تاریخ کے نمایاں واقعات

پہلی عالمی جنگ کے اختتام اور چین میں کمیونسٹوں کے استحکام کی درمیانی مدت میں چین کے اندر جو واقعات پیش آئے، ان کی واضح کیفیت پیش کرنا سہل نہیں۔ تیس سال کی اس مدت میں ملک کے اندر بڑے عنصر تین تھے۔ اوّل کومن تانگ، دوم کمیونسٹ، سوم جاپانی حملہ آور۔ ان میں سے آخری دو عنصروں نے جو کردار ادا کیے، ان کا ذکر ہم ابھی کریں گے۔ کومن تانگ نے سن یٹ سین کی وفات (۱۹۲۵ء) کے بعد چین کائی شک کی قیادت قبول کر لی جس نے جاپان میں فوجی تربیت پائی تھی۔ کومن تانگ کے قوم پرستوں نے مسلسل صوبائی جنگی لاٹوں کے خلاف ناکام جدوجہد جاری رکھی، تاکہ ایک محکم مرکزی حکومت قائم ہو جائے۔ اکثر انھیں کمیونسٹوں اور جاپانیوں سے بھی لڑنا پڑا۔

یہ تینوں بڑی قوتیں قولاً اور عملاً تقریباً پچاس کروڑ چینیوں کی اطاعت یا کم از کم خاموش منظوری کے لیے برسرپیکار رہیں۔ ان پچاس کروڑ میں سے اکثر دہقان تھے اور ان میں سے زیادہ تر ان پڑھ تھے۔ چین کے عوام کی روش اکثر ایسی رہی کہ وہ ہم مغربیوں کی روش سے بالکل الگ تھی۔ حکومت کے بارے میں ان کے تصوّر کے متعلق یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ وہ اسے انسانی دسترس کے دائرے سے باہر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عام انسان اس میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ گویا یہ روش ایسی ہی تھی، جیسی ہم مغربیوں کی موسم کے متعلق ہوتی ہے۔ چین کو مغربی مفہوم کے مطابق ایک قوم بنا دینے کے لیے محض یہ کافی نہ تھا کہ ریل کی سڑکیں بنا دی جائیں، کارخانے قائم کر دیے جاتے یا چین کی کلاسیکی کتابوں کی جگہ علوم حاضر کے مطالعے کو فروغ دیا جاتا۔ اس کے لیے زیادہ اقدامات ناگزیر تھے۔ اصل کام یہ تھا کہ چینی کے دل میں ایک مستقل چینی شہری کا احساس پیدا کیا جاتا۔

دو جنگوں کے درمیان بست سالہ کی مدّتِ متارکہ میں یہ ناگزیر کام شروع ہو رہا تھا۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جاپانیوں نے ۱۹۳۱ء میں از سرِ نو جارحانہ اقدامات شروع کیے تھے تو وہ چین کے حقیقی مالک بن جانے میں کیوں ناکام رہے۔ اس سے پیشتر کے دور میں سمجھا جا سکتا تھا کہ جاپان چین کو فتح کر کے ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد رکھ لیتا، جو اگرچہ غیر ملکی ہوتا، مگر بہت جلد اہلِ چین اس سے گھل مل جاتے۔ اس دیرینہ رسم کی پیروی صدی کے چوتھے عشرے میں نہ کی گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ چین معرضِ تغیر میں تھا اور یہاں بھی مغرب کی توسیع زندگی کے روایتی طریقے میں بنیادی تبدیلی پیدا کر رہی تھی۔

---

[1] Pearl Harbor

جاپان کے جارحانہ اقدامات
(۱۹۳۱ء — ۱۹۴۵ء)

خالص فوجی نقطۂ نگاہ سے جاپانیوں کو خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کا ابتدائی اقدام یہ تھا کہ ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ چین کے شمالی حصے پر گرفت مضبوط کر کے انھوں نے اسے منچوکو کا نام دے دیا۔ پھر باقی چین پر قبضہ کرنے میں کوشاں ہو گئے۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں رسمی جنگ کا اعلان کیے بغیر انھوں نے ہلّہ بول دیا۔ اکتوبر تک جنوبی چین کا کلیدی شہر کنٹن ان کے قبضے میں آ چکا تھا۔ نیز وہ ساحلی علاقے کے اہم مقامات کے علاوہ زیریں دریائی وادیاں لے چکے تھے، جہاں آبادی بہت گھنی تھی۔ چیانگ کائی شک اپنی فوج اور کومن تانگ کے سیاستدانوں کے ساتھ اندرونی صوبے یشوان[1] میں پناہ گزیں ہوا۔ وہاں چونکنگ[2] کو مرکز بنا لیا۔ یہ صوبہ ساحل سے بہت دور تھا اور پہاڑوں کے ایک سلسلے کے باعث مدافعت کا انتظام بہت اچھا تھا۔ مغربیوں کی طرف سے اسے ہندوستان اور برما کی سڑک کے ذریعے سے امداد ملتی رہی۔ یہ سڑک بند ہوئی تو ہوائی جہازوں کے ذریعے سے امداد کا سلسلہ جاری رہا۔ یوں چیانگ کائی شک کی حکومت دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک جاپان کا مقابلہ کرتی رہی۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان نے اتحادیوں کے مقابلے میں ہار مان لی اور وہ براعظم ایشیا کے ہر حصے سے فوج ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔

تاہم جاپانی انتہائی کامیابی کی حالت میں بھی اس کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے کہ چین میں چھاؤنیوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ شنگھائی اور پیپنگ[3] جیسے بڑے بڑے شہر ان کے قبضے میں تھے۔ ریل کی سڑکوں پر انھیں تصرف حاصل تھا، لیکن چھاپا مار دستے سڑکیں توڑتے رہتے تھے۔ جاپانیوں نے بڑے بڑے مرکزوں میں اپنے پھٹو بٹھا دیئے تھے جو ملک کا انتظام چلا رہے تھے، لیکن دورِ حاضر کے وسائلِ حمل و نقل کے سوا وہ بالکل بے دست و پا تھے۔ جو علاقہ برائے نام جاپانیوں کے ماتحت تھا، اس کے اکثر چینی دیہات کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ غرض چینیوں نے جاپان کی حکومت کبھی قبول نہ کی۔ جاپان سے وفاداری کا تو سوال ہی خارج از بحث ہے۔

قوم پرست اور کمیونسٹ

قوم پرست چوتھے عشرے کے آغاز سے جاپان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس طویل جنگِ مزاحمت کے نازک سے نازک لمحات میں — دوسری عالمی جنگ سے پیشتر، جب جاپان کسی دوسری طرف جنگ میں نہیں الجھا تھا — چیانگ کائی شک کو حملہ آور کی مزاحمت میں کمیونسٹوں سے بھی مدد ملتی رہی۔ تاہم چیانگ کائی شک کی فوج جاپانی فوج کی برابری نہ کر سکی۔ قوم پرستوں کے پاس دورِ حاضر کے اہم صنعتی مرکز نہ تھے۔ جاپانیوں نے ابتدا ہی میں چین کے صنعتی شہروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہرحال چیانگ کی حالت سروسامانِ جنگ کے اعتبار سے اچھی نہ تھی۔

مدت تک یشوان میں رہنے کے باعث قوم پرستوں کی ہمت پر بھی اثر پڑ چکا تھا۔ اس نازک دور میں وہ خامیوں

---

[1] Syzechwan
[2] Chungaing
[3] Peiping یہ وہی نام ہے جو عوام میں پیکنگ مشہور ہے۔

سے پاک رہنے اور قوت حاصل کرنے کے بجائے چینی عوام سے الگ تھلگ ہو گئے۔ پھر ان میں رشوت خوری اور سازشوں کی گرم بازاری تھی۔ سن یٹ سین اور کومنتانگ نے ابتدا میں جو وعدے کیے تھے، انھیں وہ پورا نہ کر سکے۔ یہی موقعہ ہے جب قوم پرستوں کے بجائے کمیونسٹ انسانی جذبات و عزائم پر قبضہ کرنے اور کام میں لانے کے اہل بنے۔ یہی وہ قوت ہے، جو معاشرت میں انسانوں کو دورِ حاضر کی مادی ثقافتی ضرورتوں کی طرح متحد رکھتی ہے۔ اکثر چینیوں کے نزدیک قوم پرست نہیں، بلکہ کمیونسٹ ہی تھے، جنھوں نے انھیں چینی بنایا اور ان میں قوم پرستی پیدا کی۔

چینی کمیونسٹوں کی تحریک تیسرے عشرے کے اوائل میں شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا ماسکو میں کومنٹرن کے ساتھ براہِ راست ربط و ضبط کے ساتھ ہوئی۔ مشّاق سوویٹ کارندے اس کے رہنما تھے، جن میں سے میکائیل بورودن بہت مشہور رہے اور شروع میں کومنتانگ کے لیڈر بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ سن یٹ سین کو بھی امید تھی کہ کامیاب روسی کمیونسٹوں کے مشوروں اور مثال سے خود اس کی پارٹی کی ناقص تنظیم کو قوت حاصل ہوگی۔ گویا چینی کمیونسٹ کچھ مدت تک کومنتانگ کا بایاں بازو بنے رہے، لیکن بہت جلد دونوں میں ناگزیر تفرقہ پڑا اور قوم پرستوں میں جو عناصر قدامت پسند تھے، وہ چیانگ کائی شک کے ساتھ ہو گئے۔

اقتدار حاصل کرنے کے لیے اس ابتدائی جدوجہد میں کمیونسٹوں کو ناکامی ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں چیانگ کی فوجوں نے کمیونسٹوں کے خلاف قتل اور ظلم و جبر کی ایک مہم شروع کر دی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ کومنتانگ سے نکال دیے گئے اور انھیں اپنی جداگانہ تنظیم کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں چینی کمیونسٹوں کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ماسکو سے انھیں پوری امداد نہ مل سکی۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں روس کے اندر ٹراٹسکی اور سٹالن کے درمیان کشمکش جاری تھی اور کمیونسٹوں کے ان دو بڑے گروہوں میں کشمکش کے باعث چین کے متعلق سوویٹ روس کی صحیح پالیسی میں بھی اختلاف شدت اختیار کر گیا۔ سٹالن تیزی سے اقتدار حاصل کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چین کی فضا پرولتاری انقلاب کے لیے سازگار نہیں۔ لیکن اس نے اپنے چینی رفیقوں کو کوئی مدد نہ دی۔

ستتہرواں باب

مشرق بعید

(۲)

کمیونسٹوں کی کامیابی کا راستہ

آئندہ بیس سال میں یعنی دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کی قوت میں تدریجاً فیصلہ کن تغیر آگیا۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دونوں پارٹیاں ایک لحاظ سے مطلق العنان اقتدار کی حامی تھیں۔ دونوں میں سے کسی میں بھی مغربی سیاسی پارٹیوں کی طرح افہام و تفہیم کے لیے گنجائش نہ رہی تھی۔ چوتھے عشرے میں چین کے اندر جگہ جگہ کمیونسٹوں کا تعاقب کیا گیا اور انھوں نے شمال میں علاقۂ ینان[1] کو مرکز بنا لیا۔ اُس وقت ان کی حیثیت چیانگ سے ملتی جلتی تھی، جس نے جنوب میں شیوان کو مرکز بنا رکھا تھا، مگر دونوں میں ایک اہم فرق تھا۔ جب تک جاپان چین پر قابض رہا، چیانگ اپنی فوج اور دفتری نظام کے ساتھ چُنگنگ ہی میں مقیم رہا۔ اس کے برعکس کمیونسٹوں نے جاپانیوں کے متصرفہ علاقوں اور ان سے باہر شمالی جانب منظم فوجوں اور مقامی کونسلوں کا جال بچھا دیا۔ اُن کا حلقۂ اثر سمندر سے منچوریا تک پھیلا ہُوا تھا۔

یوں کمیونسٹوں نے جاپان کے خلاف طویل مدّت کی جدوجہد سے فائدہ اٹھایا یعنی اپنی عملی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کر لیا اور عوام میں براہ راست ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس کی ایک وجہ بالکل واضح ہے۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں کو کسانوں سے خوشگوار تعلقات پیدا کر لینے پر آمادہ کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ یہاں تک کہ کسانوں اور سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ باہم مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ چین میں سپاہی کو ہمیشہ سے انسانیت کی پست ترین سطح پر رکھا جاتا تھا۔ اسے ایک سیلاب یا طوفان کی طرح ایک تباہ کن قوّت مانا جاتا تھا۔ یہ طبعی امر تھا مگر ساتھ ہی حد درجہ ناخوشگوار بھی تھا۔ اس کے برعکس کمیونسٹوں کا نعرہ یہ تھا کہ "سپاہی مچھلیاں اور کسان پانی ہیں۔" یہ سراسر ایک انقلابی نعرہ تھا۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ فوج کا انحصار عوام کی حمایت و اعتماد پر ہے۔ پھر کمیونسٹوں نے وہ روایتی خلا باقی نہ رہنے دیا جو اہل علم اور عوام کے درمیان حائل تھا۔ اس سلسلے میں کمیونسٹوں

---

[1] Yenan

کے لیے کامیابی اس وجہ سے سہل ہوگئی کہ صدی کے پانچویں عشرے میں چینی اہلِ علم کے دلوں اور ذہنوں میں انقلابی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ پرانے عقیدے درہم برہم ہو چکے تھے۔ انھیں نئے عقیدوں اور تازہ امیدوں کی تلاش تھی۔ چنانچہ کمیونسٹوں کے پروگرام میں اہلِ علم کو وہ چیز مل گئی جس کے وہ آرزومند تھے۔ امریکی پروفیسر فیئر بینک[1] کو چین کے معاملات میں پوری مہارت حاصل ہے۔ اس نے دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر لکھا کہ جاپان کے خلاف جد و جہد نے چینی اہلِ علم کے نقطۂ نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا:۔

"عوام کے لیے ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی پروگراموں میں شرکت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس طرح اکثر عینی شاہدوں کے نزدیک ایک نئی نفسیاتی فضا پیدا ہو گئی یا کہنا چاہیے کہ جن جنگ زدہ علاقوں میں کمیونسٹوں کے پروگرام کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، وہاں عوام میں نئے دلولے رونما ہو گئے۔ نئے نظام کے شرکا نئے عقیدے — کسان عوام کے لیے سچی انسانی ہمدردی — کے بل پر حرکت میں آ گئے۔ عوام کے اس نئے مذہب میں انقلابی نظریہ شامل ہے، جس سے کام لے کر دورِ حاضر کی فنکاری اور نئی سیاسی تنظیم از سرِ نو استوار ہو سکتی ہے اور کسانوں کی زندگی مالا مال کی جا سکتی ہے۔ عوام کا یہی عقیدہ کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں اور فوجیوں کی روحِ رواں بنا ہوا ہے۔ پارٹی کے کارکنوں کے لیے لازم ہے کہ دیہات میں رہیں۔ کسانوں کے ساتھ کام کریں۔ ان کے ساتھ کھانا کھائیں۔ اُن جیسی زندگی گزاریں اور انھیں کی طرح سوچیں، تاکہ عوام سے انقلاب کے لیے دائمی غذا مہیا ہوتی رہے۔ اسی طرح پارٹی کے کارکن حیاتِ نو میں کسان عوام کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

"آزادی کا یہ تصور، جسے مذہبی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، دورِ حاضر کے چین میں سب سے بڑھ کر محرک روحانی عنصر ہے اور واقعات بہ ظاہر ناقابلِ تردید منطق کی بنا پر اسے نئی پارٹی کی ڈکٹیٹری کی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔"[2]

چین میں کمیونسٹوں کی کامیابی

دوسری عالمی جنگ کے دوران میں امریکہ کی پالیسی بنانے والوں کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ چین ان کا حلیف بنا رہے اور انجمن اقوامِ متحدہ کا ایک اہم رکن ثابت ہو۔ جمہوریۂ امریکہ کی طرف سے قوم پرستوں کو امداد ملتی رہی، جن کا مرکز چنگنگ تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو امید کی جاتی تھی کہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں

---

[1] Fairbank

[2] فیئر بینک کی کتاب جمہوریۂ امریکہ اور چین۔ (United States and China) صفحہ ۲۶۸-۲۶۹

میں سمجھوتا کرا دیا جائے گا، چین میں جمہوریت قائم کر دی جائے گی اور وہاں کی پارلیمانی حکومت امریکہ کی طرفدار ہو گی۔ اس حکومت میں کمیونسٹوں کو آئینی حیثیت حاصل ہوتی اور وہ بہت بڑی پارٹی بنے رہتے، جیسے کہ فرانس اور اٹلی میں کمیونسٹ ہیں، لیکن اکثریت حاصل نہ کر سکتے۔ ۱۹۴۶ء میں امریکہ نے جنرل مارشل کو گفت و شنید کے لیے بھیجا۔ وہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کو کسی عملی مفاہمت پر لانے میں ناکام رہا۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں مارشل امریکہ پہنچا تو چین میں ازسرِنو خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی، لیکن اس کے نتیجے کے متعلق کوئی خاص شبہہ نہ تھا۔ اس اثناء میں کمیونسٹوں کو روس کی طرف سے زبردست امداد مل گئی۔ اس میں وہ سامانِ جنگ بھی شامل تھا، جو جاپانیوں نے منچوریا میں روس کے حوالے کیا تھا۔ چیانگ کائی شک کی حکومت کمزور ہو چکی تھی۔ اس کا حوصلہ پست تھا۔ عوام کی تائید وہ کھو چکی تھی اور دورانِ جنگ میں افراطِ زر ترقی کر گئی تھی اور اقتصادیات پر مزید ضرب یوں لگی کہ مختلف علاقے مدّت تک جاپان کے قبضے میں رہے تھے۔ ۱۹۴۹ء کے آواخر میں قوم پرست چین سے نکالے گئے اور ان کی حکومت جزیرہ فارموسا میں منتقل ہو گئی، جسے جاپان نے ۱۹۴۵ء میں چھوڑا تھا۔ کمیونسٹوں کے پاس بحری قوّت نہیں تھی، لہٰذا وہ چیانگ کائی شک اور قوم پرستوں کا تعاقب نہ کر سکے۔

۱۹۵۰ء تک چین پر کمیونسٹ قابض ہو چکے تھے اور چین روسی بلاک کا حصہ بن گیا تھا۔ امریکیوں کو چین میں اپنی پالیسی کی کامل ناکامی سے سابقہ پڑا تو انھوں نے یہ بحث شروع کر دی کہ کمیونسٹ کن اسباب کی بنا پر چین کو اپنے ماتحت متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ متنازع فیہ مسئلہ ابھی تک مسئلۂ تاریخ قرار نہیں پا سکتا، کیونکہ تمام دستاویزیں سامنے نہیں آئیں اور حالات کے صحیح اندازے کے لیے جزواً غیر جانبداری اختیار کرنا لازم ہے، لیکن مؤرخ کی طرف سے یہ انتباہ ضروری ہے کہ کمیونسٹوں کی کامیابی کے متعلق عامیانہ نقطۂ نگاہ اختیار نہ کیا جائے، یعنی یہ کہ چند سازشیوں اور شریروں نے چند گم کردہ راہ لوگوں کی اعانت سے کمیونسٹوں کو کامیابی دلا دی۔ یقیناً شریر لوگ اور سازشی چین میں سرگرمی سے کارفرما تھے، لیکن وہ اتنا بڑا انقلاب پیدا نہیں کر سکتے تھے، جو ہمارے سامنے ہے۔ ضروری تھا کہ اس میں ان چیزوں کی امداد شامل ہوتی، جنھیں ہم عمرانی قوّتیں، اقتصادی ضرورتیں اور ہمّت و حوصلہ قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے انھیں مبہم اصطلاحیں قرار دیا جائے، لیکن یہ کروڑوں انسانوں کے اذہان و قلوب کی نمائندگی کر رہی ہیں اور ہم نے پیشتر کے پیراگرافوں میں چین کے اندر ان اصطلاحوں کا مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مؤرخ اعتماد کے ساتھ پیشگوئی نہیں کر سکتا کہ چین میں کمیونسٹ تجربے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ بالکل واضح ہے کہ چین نے مغرب سے کامل آزادی حاصل کر لی ہے۔ مغربی طاقتوں نے جو بہت سی استعماری مراعات حاصل کر رکھی تھیں، ان میں سے اکثر پہلی عالمی جنگ کے بعد ختم ہو گئیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ماتحتی کے تمام آئینی نشان مٹ گئے، خصوصاً مختلف یورپی سلطنتوں کا یہ حق کہ چین میں ان کے ہم قوموں کے مقدمات اُن کی عدالتوں میں پیش ہوں گے اور فیصلے اُن کے قانون کے مطابق کیے

جائیں گے۔ چین اور مغرب کے درمیان جو روابط پہلے موجود تھے، اُن کی جگہ روس سے نئے روابط پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ چینیوں کے عقیدے کے مطابق روس سامراجی حقوق حاصل کیے بغیر انھیں مغربی فنون اور مشینیں دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں چین کی خوش فہمی کے متعلق صرف قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے، جس طرح چین و روس کے دوستانہ روابط قائم رہنے کے باب میں قیاس آرائی ہی سے کام لیا جاسکتا ہے۔

چین میں کمیونسٹوں کی حکومت پر زیادہ مدت نہیں گزری۔ اس اثناء میں یہ حکومت بہ اعتبار نشوو ارتقاء صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے کے روس سے موافقت بھی کرتی رہی اور اس سے اختلاف بھی کیا۔ ۱۹۵۴ء تک موافقت کی تعداد اختلاف سے زیادہ تھی۔ سیاسی نظام میں یکسانیاں بالکل نمایاں ہیں۔ روس کی طرح چین میں جانفشانی سے مملکت کی خدمت پر زور دیا جارہا ہے۔ پارٹی کے نظام اور انتظامی ڈھانچے میں بھی یکسانی ہے اور دونوں جگہ حقیقی اختیار بھی چند بالائی آدمیوں کے ہاتھ میں ہے، جن کی حیثیت ڈکٹیٹروں کی ہے، مگر عمرانی اور اقتصادی پالیسی میں بڑا اختلاف رہا۔ کمیونسٹوں نے چین میں کسانوں پر خاص توجہ مبذول رکھی اور اُن کی آرزوئیں پوری کرنے کے سلسلے میں بڑی بڑی نجی ملکیتیں توڑ دیں اور بڑی بڑی زمینداریاں ختم کر دیں۔ یہ انتظام صنعتی پرولتاریا کے مارکسی نظریات سے بھی مختلف ہے، حالانکہ اصل بڑے انقلابی وہی ہیں۔ اُن اکثر طور طریقوں سے بھی مختلف ہے جن میں لینن اور سٹالن کاربند رہے۔

اس کے برعکس ایسے نشان موجود ہیں کہ چین کے کمیونسٹ لیڈروں نے اپنی عمرانی اور اقتصادی پالیسی مارکس، لینن اور سٹالن کے مطابق رکھی۔ یقیناً وہ صرف عام زرعی مصلحین نہیں، کیونکہ انھوں نے بھی ملک کو صنعتی بنانے کے لیے روس کی طرح پنجسالہ منصوبہ بنالیا ہے۔ کھیتی باڑی سے فالتو آدمی صنعتی کاموں میں لگانا، پھر بھی زرعی پیداوار کا معیار قائم رکھنا بہت بڑا کام ہے۔ یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سوویٹ یونین نے اس میں کامیابی حاصل کی تاہم انسانوں کو بڑی تکلیفیں پیش آئیں اور چین کے مقابلے میں روس کے حالات نسبتہً بہتر تھے۔ ۱۹۲۸ء میں روس کا پنجسالہ منصوبہ شروع ہوا۔ اس وقت روس کی اقتصادیات ۱۹۴۹ء کے چین سے زیادہ موجودہ دور کے مطابق تھیں۔ وہاں کی آبادی زیادہ تعلیم یافتہ اور دورِ حاضر کے اقتصادی انقلاب کے جزئیات سے زیادہ واقف تھی۔

جاپان کا سیاسی ارتقاء (۱۹۴۱ء)

غیر مغربی اقوام میں سے صرف جاپانیوں نے صنعتی انقلاب کا تجربہ کیا اور سامراج کے اس بڑے دور میں ۱۹۱۴ء تک اپنی آزاد سیاسی حیثیت کاملاً محفوظ رکھی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بیسویں صدی شروع ہوئی تو واضح ہو چکا تھا کہ جاپان ایک بہت بڑی طاقت بن گیا ہے اور ان طاقتوں میں شامل ہو گیا ہے، جو سامراج کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں، مگر اس کے شمول کو دوسروں نے خوشگوار نہ سمجھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جاپانیوں نے یہ تمام زبردست کارنامے اپنے مطلق العنان اور امرائی سیاسی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی کیے بغیر انجام دے دیئے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد دہ سالہ مدت میں نظر آرہا تھا کہ جاپان تدریجی سیاسی انقلاب کا مورد بن جائے گا۔ تیسرے عشرے کی وزارتوں میں کاروباری طبقے کے بہت سے ایسے آدمی شامل تھے، جو بیرونی ملکوں میں زبردست توسیع کے حامی تھے۔ ساتھ ہی وطن کے اندر محتاط لبرلزم کے خواہاں تھے۔ ابتدا میں ووٹوں کا سلسلہ محدود رکھا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں تمام مردوں کو ووٹ کا حق مل گیا۔ پہلی مرتبہ مغربی وضع کی سیاسی پارٹیاں منظم ہوئیں، خصوصاً شہروں میں اور معلوم ہو رہا تھا کہ ان سے پارلیمنٹ میں نئی سرگرمی پیدا ہو گی، جو جاپان کی زبردست مرکزی نمائندہ مجلس تھی۔ ٹریڈ یونینیں بن گئیں اور لوگ ان میں شامل ہونے لگے۔

تاہم جاپان بست سالہ متارکے کے دوران میں مغربی وضع کی پارلیمانی جمہوریت پیدا نہ کر سکا۔ سیاسی اختیارات زیادہ تر فوج اور بحریات کے افسروں کو ملتے رہے۔ جن سے اکثر جاگیردار سمورائے طبقے سے متعلق تھے۔ یہ فوجی گروہ آزاد وضع کی حکومت سے متنفر تھا اور کاروباری طبقے کو بے اعتمادی کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، نیز اس کا حاسد تھا۔ ان لوگوں کی نظروں میں شہنشاہ کا منصب ایک زبردست سیاسی حربہ تھا، کیونکہ سمجھا جاتا تھا، وہ دیوتا کی اولاد ہے اور اس سے کوئی سیاسی غلطی نہیں ہو سکتی۔ گویا اس کی حیثیت وہی تھی، جو مغربیوں کے نزدیک خدا کے مقرر کیے ہوئے حکمرانوں کی تھی۔ یہ امیر البحر اور سپہ سالار خود جو چاہتے، شہنشاہ سے کہلوا لیتے اور اس کے اعلانات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے۔ جاپان میں لبرلزم کے جو حامی پیدا ہو رہے تھے، ان کے بڑے بڑے ترجمانوں کو دہشت زدہ رکھتے یا قتل کرا دیتے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ صدی کے چوتھے عشرے میں جاپان کے اندر ایک فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی۔ پارلیمنٹ کو جو اختیارات حاصل تھے، وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ انتخابات ہوتے، مگر ان کے نتائج سے بے پروائی اختیار کی جاتی۔ کاروباری آدمی یا تو ڈر کے مارے اس نظام کی حمایت کرتے یا انھیں یہ توقع ہوتی کہ باہر فتوحات ہوں گی تو کاروباری لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ شہنشاہ کی پرستش کا طریقہ اختیار کر لیا گیا، جسے شنٹو کہتے تھے۔ یہ طریقہ قدیم جاپانی مذہب میں سے نکالا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ عوام کی توجہ شہنشاہ کے آسمانی مقاصد پر مرتکز ہو جائے اور جو لوگ شہنشاہ کے نام پر حکومت کر رہے تھے، ان کی مرضی کے رو برو سب سر تسلیم خم کیے رہیں۔ بیدرد کارندوں کا ایک جتھا تیار کیا گیا، جسے "خیالات کی پولیس" کہتے تھے۔ یہ ہر اس شخص کو ہدف بنا لیتے، جس کے بارے میں شبہہ ہوتا کہ اس کے خیالات خطرناک ہیں۔ غرض جاپان میں ایک ایسی حکومت قائم ہو گئی، جس کے لیے بہت سی جاپانی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا، مگر وہ وضع قطع میں یورپ کی مطلق العنان حکومتوں سے مشابہ تھی۔

جاپانی سامراج ۱۹۳۱ء — ۱۹۴۵ء

یورپی مطلق العنانی کی مشابہت سب سے بڑھ کر جاپان کی بیرونی اور سامراجی پالیسی میں صدی کے چوتھے عشرے، نیز پانچویں عشرے کے آغاز میں نمایاں ہوئی۔ ہٹلر کے نازیوں اور مسولینی کے فاشسٹوں کی طرح جاپانی بھی کہتے تھے کہ ہماری قوم کے پاس کچھ نہیں۔ وہ بھی اپنی روز افزوں آبادی کی طرف اشارے کرتے تھے اور اسے بڑھانے میں کوئی دقیقہ سعی

اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ وہ بھی یہی ترانے الاپتے تھے کہ وطن میں آبادی بہت زیادہ ہوگئی ہے، وسائل ناکافی ہیں اور منڈیاں محدود ہیں۔ اس کی تہہ میں حقیقی اقتصادی مسائل تھے، یعنی یہ کہ جاپانی اقتصادیات کو عالمگیر کساد سے بچا کر بین الاقوامی تجارت کو درہم برہم ہونے سے روکا جائے اور سنہ ۱۹۳۰ء کے چھ کروڑ جاپانیوں کے لیے کام اور خوراک مہیا کی جائے۔ ان مسائل کے حل کے لیے سامراجی توسیع کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ چوتھے عشرے کے فوجی گروہ نے وہ پالیسی اختیار کی جس کی بنا پر جاپانی افسروں اور سیاستدانوں نے سنہ ۱۸۹۵ء میں فارموسا لیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں کوریا پر قبضہ جمایا تھا۔ اب وہ چین کو فتح کر لینے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

ہم چین میں جاپان کی طالع آزمائی کا حال بیان کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر یورش جاپان کی طرف سے دوسری عالمی جنگ کے راستے میں پہلا قدم تھی۔ اگرچہ چین جاپان کے سامراجی مقاصد میں سب سے بڑھ کر اہم تھا، مگر اس کے مقاصد اس سے بدرجہا زیادہ وسیع تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں جاپان نے کلاں تر مشرقی ایشیا کی خوشحالی کا ایک مشترکہ حلقہ بنانے کی کوشش کی۔ ہم دوسری عالمی جنگ پر پہنچیں گے تو تفصیل سے بتائیں گے۔ مگر یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ جاپان کی توسیع کمال پر پہنچی تو اس میں مندرجہ ذیل علاقے شامل تھے — چین کا بڑا حصہ، فرانسیسی ہند چینی، ولندیزی جزائر شرق الہند، سیام، برما کا زیادہ تر حصہ، جزائر فلپائنز اور بحرالکاہل کے بہت سے دوسرے جزیرے، کوریا اور فارموسا پہلے سے جاپان کے قبضے میں تھے۔

مشترکہ خوشحالی کے اس علاقے اور نپولین کی دست نگر مملکتوں کے نظام میں مشابہت کے کئی نمایاں پہلو موجود تھے۔ ہٹلر کے قائم کردہ نظام سے بدرجہا زیادہ مشابہت تھی۔ کوریا اور فارموسا پہلے سے جاپان میں شامل چلے آتے تھے۔ باقی حصوں پر جاپان کا قبضہ اس تیزی سے ہوا کہ اسے کوئی انتظامی سلسلہ قائم کرنے کا موقع نہ مل سکا، لیکن جو فوری طریقے جاپانیوں نے اختیار کیے، وہ نئے نہ تھے، بلکہ براہ راست مغربی نمونوں سے اخذ کیے گئے تھے۔ ان کا انحصار زیادہ تر پرانے منصوبے پر رہا کہ ہر علاقے میں مقامی لوگوں کے ذریعے سے اپنے ڈھب کی حکومتیں قائم کر لی جائیں اور تمام علاقوں کے اقتصادی وسائل سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم پڑا تو جاپانی سلطنت ایک دم درہم برہم ہوگئی۔ یہ سلطنت اجزائے ترکیبی کی وفاداری سے یک قلم محروم تھی۔

جاپانیوں نے سامراج کا آغاز کیا تو انھیں ایک امتیازی خصوصیت حاصل تھی، یعنی وہ ایشیائی تھے اور ان کے رنگ سانولے تھے۔ ان کا تعلق مغربی یورپ سے نہ تھا، جہاں کے لوگ سفید فام قوموں کی برتری کا بوجھ اٹھائے پھرتے تھے۔ وہ ایشیائی ملکوں اور بحرالکاہل کے جزیروں میں پہنچے تو کہہ سکتے تھے کہ ہم تمھیں آزاد کرانے آئے ہیں اور اپنے پروپیگنڈے میں اس نکتے پر شدومد سے زور دیا، مگر وہ بہت کم لوگوں کو ہمنوا بنا سکے۔ ایشیائی ہونے کے باوجود وہ اپنے ایشیائی بھائیوں میں ہردلعزیزی نہ پیدا کر سکے۔ اُن کی فوجیں لوٹ مار کرتی رہیں اور مفتوحین پر اتنے ظلم کیے، جن کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ ظلم بالا وسطا اہل مغرب

کے ظلموں سے بدتر نہ ہوں گے، مگر بہتر یقیناً نہ تھے۔ مزید برآں جاپانی جہاں بھی گئے، وہاں حکمران قوم ہی کی حیثیت میں گئے اور حکمرانوں ہی کی روش اختیار کیے رکھی۔ وہ برابر اپنے آپ کو مقامی لوگوں سے برتر ظاہر کرتے رہے۔ چین میں بھی اسی روش پر کاربند رہے، اگرچہ چینی ثقافت سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ ممکن تھا کہ وقت گزرنے پر وہ عمرانی نفسیات سے آگاہ ہو جاتے اور اپنے مشترکہ خوشحالی کے وسیع حلقے کی بہتر تنظیم کر لیتے، مگر وقت نہ مل سکا۔

مقبوضہ جاپان ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۴ء

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر جاپان تمام ماورائے بحر مقبوضات سے محروم ہو گیا اور صرف جاپانی جزیروں تک اس کی سلطنت محدود رہ گئی۔ جاپان کی فوجی شکست میں امریکہ نے اتنی زیادہ کوششیں کی تھیں کہ یقین تھا، اس پر قبضہ بھی امریکیوں ہی کا ہوگا اور شرائط صلح بھی امریکی ہی طے کریں گے۔ اگرچہ امریکہ میں خاصے بڑے طبقے کی رائے تھی کہ شہنشاہ کو معزول کر دیا جائے اور جاپان میں جمہوری حکومت قائم ہو جائے، لیکن عمل زیادہ تر انتہا پسندانہ مشوروں پر نہ ہوا۔ شہنشاہ بدستور شہنشاہ رہا، البتہ اس کا آسمانی درجہ چھن گیا۔ جنرل میکارتھر[1] اور قابض فوج نے اس کی پوری نگرانی جاری رکھی۔ امریکیوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ جاپانیوں نے کم از کم بظاہر قبضے کی مخالفت نہ کی، بلکہ وہ قابض فوج کی قدر کرتے رہے، حالانکہ چینیوں نے ایسی روش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جاپانیوں کے بارے میں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جمہوریت کے معنی سمجھتے ہیں اور اسے سیکھنے کے لیے مضطرب ہیں۔ ان کی روش سے قوموں کی گروہی نفسیات کے متعلق قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ بعض کی رائے یہ تھی کہ جاپانی بچوں کو باقاعدہ تربیت دی جائے۔ وہ آقا کا حکم ماننے پر ہمیشہ تیار رہیں۔ اہل مغرب کو چالاک مشرقیوں پر پہلے سے جو بے اعتمادی چلی آتی تھی، اس کی بنا پر یہ نظریہ قائم کر لیا گیا کہ جاپان نے قومی اعتبار سے دوگونہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ وہ امریکہ کے خلاف اپنی نفرت کو مصلحتاً دبا رہے ہیں اور اطاعت گزار بن رہے ہیں تاکہ آگے چل کر موقع پائیں تو قابض کے پہلو میں چھرا گھونپ دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ معاصر چین کی طرح ہمارا معاملہ صرف تاریخ سے نہیں، بلکہ پُرپیچ اور غیر یقینی حال سے بھی ہے۔ جاپان میں یقیناً نہ کوئی جمہوری انجمن تھی اور نہ کوئی جمہوری سیاسی تنظیم تھی۔ ممکن نہ تھا کہ وہ تھوڑے سے وقت میں مغربی وضع کی جمہوریت قائم کر لیتے۔ اگر منظم صنعتی اقتصادیات نشو و نمائے جمہوریت کی ناگزیر بنیاد ہیں تو اہل جاپان تمام غیر مغربی اقوام سے پہلے یہ خصوصیت حاصل کر چکے تھے، لیکن ہمیں نتائج اخذ کرنے میں عجلت سے کام نہ لینا چاہیے یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جاپان نے مغرب سے صنعت لے لی تو ساتھ ہی وہ خود بخود کاملاً مغربی بن گیا۔ مغربی مبصروں میں سے سر جارج سینسم[2] ایک دانشمند مبصر ہے، جو جاپان کے حالات سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

---

[1] Mac Arthur

[2] Sansom

" اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ قوت سے چلنے والی مشینوں کے استعمال سے جاپانیوں کی زندگی پر مغرب کا گہرا اثر پڑا، مگر اسے صرف مشروط طریق ہی پر درست مانا جا سکتا ہے۔ اگر ہم متفرق مثالیں سامنے لائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ دورِ حاضر کی ایجادات دوسرے معاملات میں غیر ملکی اثرات کی روک تھام کے لیے استعمال کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً چھاپے اور جلد بندی کی مشینوں سے کتابوں اور اخباروں کی تعداد و اشاعت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ان میں ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے، جو غیر ممالک کے خلاف نکتہ چینی پر مبنی ہوں......

مشرقی اقوام پر مغربی اثرات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اثرات کے ساتھ ساتھ ان کی بربادی کے جراثیم بھی پھیلتے جاتے ہیں۔ اس کی نہایت نمایاں اور زبردست مثال غالباً دورِ حاضر کے ہند کی تاریخ پیش کرتی ہے، جہاں انگریزی سیاسی تعلیم نے انگریزی سیاسی اقتدار کے خلاف بغاوت کی روح پیدا کی اور انگریزوں کے دستوری نشوو ارتقا کی سرگزشت میں بغاوت کی مثالیں موجود ہیں.....

" یہ درست ہے کہ مغربی لباس، مغربی خوراک اور مغربی وسائل حمل و نقل، نیز مغربی افکار نے جاپانی زندگی کا دائرہ وسیع کر دیا اور اس میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ جس قوم کی مادی ثقافت سادہ ہو، اس پر صنعتکاری کا مجموعی اثر ملکی اثرات کو تباہ کر دے گا، مگر ترقی یافتہ مشرقی ثقافت پر ترقی یافتہ مغربی ثقافت کا اثر ایسی حالت پیدا کر سکتا ہے کہ بظاہر دُور رس تبدیلیوں کے باوجود زندگی پر معاشرے کے متعلق قوم کے مجموعی احساسات میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہیں یا اہم معاملات میں مخالفانہ ردِّ عمل کا موجب بن سکتا ہے[1]"

اگرچہ امریکی معیاروں کے مطابق جاپانی کسان اور مزدور غریب ہیں، مگر وہ دوسری غیر مغربی قوموں کے کسانوں اور مزدوروں سے بہت آگے ہیں۔ یقیناً آبادی کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ ایک لاکھ سینتالیس ہزار مربع میل میں ساڑھے آٹھ کروڑ باشندے رہتے ہیں، تاہم یہ اتنا خطرناک نہیں، جتنا ہندوستان یا جاوا کی بعض گھنی آبادی کے خطوں کا مسئلہ ہے۔ اگر جاپان اپنے قومی معیارِ معیشت کی بحالی اور اصلاح کا خواہاں ہے تو ضروری ہے کہ اس کی مصنوعات کے لیے منڈیوں کا انتظام کیا جائے۔ اس کی حیثیت ہر اعتبار سے برطانیہ کی سی ہے۔ یا تو اسے مال برآمد کرنا چاہیے یا وہ مر جائے گا۔

---

[1] سینسم کی کتاب The Western World and Japan (مغربی دنیا اور جاپان) ص ۴۹۷-۴۹۸

سب سے آخر میں روس اور امریکہ کے درمیان کشیدگی کے باعث جاپان امریکہ کا حلیف بن گیا ہے۔ جاپان ایک جزیرہ ہے، جو ایک وسیع کمیونسٹ سرزمین کے مشرقی کنارے پہ بیرونی چوکی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی یورپ کے کنارے پر برطانیہ بھی جاپان ہی کی طرح ایک جزائری چوکی ہے۔ اگر امریکہ جاپان کو قوی حلیف بنائے رکھنے کا خواہاں ہے تو ضروری ہے کہ اس کے لیے آزاد دنیا میں ضروری منڈیوں کا انتظام کرے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جاپان کی طاقت و قوت بحال ہو جائے گی تو وہ سامراجی عزائم پر آمادہ ہو سکتا ہے اور باہر کے علاقوں پر قبضہ کرے گا۔ ممکن ہے، فرانس اور برطانیہ جیسی پرانی سامراجی قوتیں سامراج کی بیماری سے شفا پالیں، اگرچہ اب تک یہی ظاہر ہوا ہے کہ وہ سمندر پار مقبوضات سے حد درجہ بادلِ ناخواستہ دست بردار ہوئی ہیں۔ لیکن یہ امر حد درجہ غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جاپان جیسا ملک جس نے حال ہی میں سامراجی سلسلہ شروع کیا تھا اور پہلے ہی مرحلے میں حد درجہ کامیاب ہوا ــــ طبعاً سامراج سے الگ رہے گا۔

جنوبی و مشرقی ایشیا

مشرقِ بعید کے دوسرے حصوں کی طرح دوسری عالمی جنگ کے بعد جنوبی و مشرقی ایشیا میں بھی نمایاں تغیرات ہوئے۔ اس حلقے میں، جو ہندوستان کی مشرقی سمت اور چین کی جنوبی سمت واقع ہے ــــ اور اسی میں جزائر شرق الہند ہیں ــــ پہلی جنگ نے نیز بست سالہ مناقشے نے صرف چند نمایاں تغیرات پیدا کیے۔ مگر بالغ نظر مبصروں کو صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہند چینی میں فرانسیسیوں کے خلاف اور جزائر شرق الہند میں ولندیزیوں کے خلاف رفتہ رفتہ قومی مخالفت بڑھ رہی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ جس جزیرہ نمائے ملایا پر برطانیہ قابض ہے، وہاں ربڑ اور ٹین پیدا ہوتے ہیں اور اس کی خوشحالی مغربی دنیا کی اقتصادی خوشحالی پر موقوف ہے۔

پھر دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ جاپان نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ایک زبردست سیاسی دھماکے کی نوبت آئی۔ سفید فام آقاؤں کو ایشیائیوں نے شکست دی۔ سمجھا جاتا تھا کہ انھیں کوئی آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ اگرچہ جاپانی خود آقاؤں کی حیثیت اختیار کیے بیٹھے تھے، مگر انھیں بھی سیاسی مقاصد کی خاطر مقامی آدمیوں کی حکومتیں قائم کرنی پڑیں۔ چنانچہ وہ حکمران بن گئے۔ جب جاپانیوں کو شکست ہوئی تو مغربی طاقتیں اپنے چھوڑے ہوئے سلسلوں کو دوبارہ سنبھال نہ سکیں، نیز امریکہ کی طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا کہ یورپی استعمار کا دور ختم کر دیا جائے۔ امریکیوں کے جذبات و مفاد بہت پہلے سے مشرقِ بعید کے ساتھ وابستہ تھے، اب امریکہ خود اپنے ماتحتوں، یعنی اہلِ فلپینز کو آزادی دے رہا تھا ــــ دوسری جنگ کے بعد جزائر شرق الہند کے باشندوں نے ہالینڈ کو آزادی دینے پر مجبور کر دیا۔ وہاں انڈونیشیا کی جمہوریت بن گئی۔ برطانیہ نے برما کو آزادی دے دی۔ ملایا کے لیے آگے چل کر خود مختارانہ حکومت کا انتظام ہو گیا۔ فرانسیسیوں نے ہند چینی میں قائم شدہ حکومتوں کو ویسی ہی مراعات دے دیں، لیکن یہ ایسی نہ تھیں کہ ہند چینی میں مدت سے جنگ کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ وہ رک جاتا۔ اس جنگ میں مقامی باغیوں کو چینی کمیونسٹوں کی امداد مل گئی۔

اس بڑے سیاسی انقلاب نے جنوبی و مشرقی ایشیا کے مسائل حل نہ کیے۔ وہاں کا ایک بڑا مسئلہ اقتصادی ہے۔ یہ علاقے

مدّت سے استعماریوں کے قبضے میں تھے اور وہاں خام جنسیں پیدا ہوتی تھیں۔ مغربی امداد کے بغیر ان کے لیے اقتصادی خودمختاری حاصل کرنا مشکل تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہ امر طبعی تھا کہ ان علاقوں کے اکثر باشندے سابق آقاؤں کی پیش کردہ امداد کو شبہے کی نظر سے دیکھتے۔ اگر وہ امداد قبول نہ کریں تو یقیناً اقتصادی افراتفری پیدا ہوگی، پھر کسی دوسری طاقت کے لیے قبضہ سہل ہو جائے گا، مثلاً کمیونسٹوں کے لیے۔

اس طرح ہم دوسرے بڑے مسئلے پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ سیاسی ہے۔ ۱۸۵۴ء تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ جنوبی و مشرقی ایشیا کی یہ نئی قومیں پائدار حکومتیں قائم کر سکیں گی اور کمیونسٹوں کی مداخلت روک سکیں گی۔ ۱۹۵۴ء کے موسم گرما میں فرانسیسیوں کے لیے ہند چینی میں حالات نازک ہو گئے، چنانچہ انھوں نے تقسیم قبول کر لی۔ ویٹ نام[۱] ہند چینی کی سب سے بڑی مملکت تھی۔ اس کا نصف شمالی حصّہ کمیونسٹوں کے حوالے کر دیا گیا، نصف جنوبی حصّہ ایک کمزور مقامی حکومت کے پاس رہا۔ اس طرح جنوبی و مشرقی ایشیا میں کمیونسٹوں کی توسیع ایک حقیقت بن گئی جو برما، ملایا اور فلپینز سب کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔

۱؎ Viet Nam

اٹھہتر واں باب

برِصغیر پاک و ہند

تمہید ہندوستان میں پہلی جنگ ایک نہایت اہم واقعہ تھی۔ اس ملک نے برطانوی فوجوں میں خاصی بھرتی دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی فوج کی امداد کے بغیر ترکوں پر فتح نہیں پائی جا سکتی تھی۔ یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے تعداد میں بڑھ رہے تھے اور ایک صدی پیشتر کے مقابلے میں اب ان خیالات سے زیادہ متاثر ہو رہے تھے جنھیں ہم لبرل، ترقی پذیر اور جمہوری کہتے ہیں۔ اتحادیوں نے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کیا تھا کہ یہ جنگ جمہوریت کے لئے دُنیا کو بچائے رکھنے کی غرض سے لڑی جا رہی ہے۔ پھر روپے کی افراط ہو گئی اور جنگ میں بعض چیزیں آگے پیچھے ہو گئیں۔ ان سے آزادی کے لیے شورش بڑھ گئی۔ دورانِ جنگ میں برطانوی وائسرائے "لارڈ چیمسفورڈ" نیز اس کے انگریز اور ہندوستانی ماہروں نے اصلاحات کی ایک سکیم تیار[1] کی تھی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں رائے عامہ ہندوستانیوں کے حق میں ہو رہی تھی پھر دفعتاً اپریل ۱۹۱۹ء میں امرت سر کے اندر ایک واقعہ پیش آیا جس سے ایسا معلوم ہُوا کہ سامراجی قوت اپنے پورے طور طریقوں پر چلی گئی ہے۔ انگریز جرنیل ڈائر[2] نے فوج کو غیر مسلح ہندوستانیوں کے ایک بہت بڑے مظاہرے پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ تقریباً چار سو آدمی مارے گئے۔[3]

اس وقت تک ہندوستان کے متعلق ایک بنیادی حقیقت واضح تھی، یعنی وہاں طویل مدّت کے لیے اطمینان کا سلسلہ جاری رہا اور ہندوستان میں رفتہ رفتہ مغرب کی مادّی چیزیں پہنچ گئیں، مثلاً ریلیں اور ہسپتال۔ ساتھ ہی ترقی اور مساوات کے مغربی افکار پھیل گئے۔ پھر برِصغیر ہند میں اور بھی حقائق تھے، مثلاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی اور بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا شدہ بے پناہ مسائل۔

---

[1] یہ سکیم وہی ہے، جسے مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کہا جاتا ہے، یہ ۱۹۲۱ء میں نافذ ہوئی۔

[2] Dyer

[3] مقتولین کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی۔

ہندو مسلم کشیدگی

ہندوستان پر اسلامی حملے کے وقت سے سات سو سال میں وہاں ایک بہت بڑی اقلیت پیدا ہوگئی تھی[1]۔ سندھ کے علاوہ پنجاب کے شمالی و مغربی حصے اور بنگال کے مشرقی حصے میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل تھی۔ باقی ملک میں وہ ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کے دوش بدوش بکھرے ہوئے رہتے تھے۔ اگرچہ بعض دیسی حکمران اور ان کے امراء مسلمان تھے، لیکن باقی مسلمان زیادہ تر کسان تھے۔ ہندو بہ لحاظ عمومی مالی اور صنعتی اعتبار سے مسلمانوں پر فوقیت لے گئے تھے۔ بعض مسلمان خصوصاً بالائی طبقے کے مسلمان اس پر فخر کرتے تھے کہ وہ فاتح گروہوں کی اولاد ہیں، لیکن زیادہ تر ہندو اور مسلمان ایک ہی ملی جلی نسل سے تھے اور دونوں ہندوستانی تھے۔ ان میں نسلی امتیاز کا کوئی واضح نشان موجود نہ تھا۔

لہٰذا اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں اکٹھا رکھنے کے لیے بیسویں صدی میں جداگانہ انجمنیں بروئے کار آئیں ـــــ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ۔ پہلی عالمی جنگ کے فوراً بعد یہ دونوں جماعتیں متفق ہوگئیں اور دستور ساز اسمبلی کے لیے دونوں نے اپنے اپنے تناسب مقرر کر لیے[2]۔ وہ اکثر برطانیہ کے خلاف مشترکہ محاذ بنا لیتیں، مگر آگے چل کر ان میں اختلاف بڑھتا گیا اور ان کے باہم رضامند ہونے میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا گیا[3]۔

آبادی کا مسئلہ

ہندوستان میں ایک اہم مسئلہ بطور خاص قابل ذکر ہے، جو نازک تر صورت اختیار کرتا گیا، یعنی آبادی کا دباؤ۔ آبادی میں افزائش انیسویں صدی کے اندر نمایاں ہوگئی تھی اور یہ افزائش ہمارے زمانے تک جاری رہی۔ گزشتہ ستر سال میں آبادی دگنی ہوگئی۔ اب ہندوستان میں بہ استثناء پاکستان پینتیس کروڑ افراد بستے ہیں۔ برطانوی حکومت نے امن و نظم کا اچھا انتظام کر دیا۔ زراعت میں اصلاح ہوگئی۔ صنعت و حرفت بڑھ گئی۔ یوں وسیع آبادی کے لیے گزارے کا انتظام ہوتا رہا، اگرچہ بعض اوقات قحط پڑتے رہے اور لوگ بھوکوں مرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندوستانی عوام انسانی فلاح کے وہ معیار حاصل کرنا چاہتے ہیں، جن کے لیے مغربیت کے زیر اثر لوگوں کے دلوں میں لگن پیدا ہوگئی ہے تو ہندوستان کو آبادی کا مسئلہ حل کرنا پڑے گا۔ یہ مسئلہ بھوک یا جنگ سے حل نہیں ہو سکتا۔

خود مختاری اور تقسیم

ان تمام مشکلات کے باوجود ہندوستان پہلی جنگ کے بعد سے خود مختاری کے لیے کوشاں رہا اور ۱۹۴۷ء میں کامیابی حاصل کر لی۔ ہندوؤں کی سیاسی تنظیم یعنی کانگریس نے بیسویں صدی

---

[1] مسلمان ایک مستقل قوم تھے انھیں اقلیت قرار دینا درست نہیں۔ [2] جن تناسبات کا یہاں ذکر ہے، ان کا تعلق میثاق لکھنؤ سے ہے، یہ میثاق دستور ساز اسمبلی کے لیے نہیں، بلکہ صوبائی اور مرکزی قانون ساز مجلسوں کے لیے طے ہوا تھا اور اس میں بھی بنگال اور پنجاب کے تناسب کو مسلمانوں کی اکثریت نے غلط قرار دیا، کیونکہ ان کی اکثریت ہی ختم کر دی گئی تھی۔

[3] ہندو اور مسلمان آزادی اور قومی حقوق میں برطانیہ کے خلاف ہمیشہ متحد رہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ مسلمان اپنے مستقل قومی حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔

کے ایک بہت بڑے لیڈر — مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ء — ۱۹۴۸ء) — کے ذریعے سے عوام میں بہت اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ گاندھی برہمن نہیں تھا، جو ہندوؤں میں سب سے اونچے درجے کی ذات ہے، بلکہ بنیا یعنی دکاندار طبقے سے تھا۔ آکسفورڈ میں قانون کی تعلیم پائی، لہٰذا مغرب کے طور طریقوں سے آگاہ تھا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی اقلیت کے درمیان رہ کر سیاسی تربیت حاصل کی۔ اس میں ہندوؤں اور انگریزوں، دونوں سے معاملہ طے کرنے کی خاص صلاحیت تھی۔ وہ اپنے ہم قوموں کو حد درجہ سادہ اور جفاکشی کی زندگی، نیز برتوں اور مختصر سے لباس کے ذریعے سے متاثر کرتا تھا۔ اس نے مخالفت کا ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا، جسے تشدد سے پاک لاتعاون[۱] کہتے تھے۔ ہندوؤں کو یہ طریقہ بہت پسند آیا، کیونکہ ان کے نزدیک قوت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اور اسے موثر نہیں سمجھا جا سکتا۔ جن طریقوں کی حمایت گاندھی نے کی، ان میں برطانوی مال کا مقاطعہ شامل تھا۔ خود مہاتما برتوں کے ذریعے سے مزاحمت کرتا تھا۔

دوسرے کانگرسی لیڈر خصوصاً مقامی سطح پر کام کرنے والے زیادہ واضح مغربی طریقوں سے کام لینے میں بھی متامل نہ تھے۔ مثلاً پروپیگنڈا کرتے اور اعتراف کرنا چاہیے کہ بعض اوقات متشددانہ عدم تشدد سے بھی کام لیتے۔ غرض انگریزوں سے مراعات پر مراعات لی گئیں اور ہندوستانیوں نے صوبائی خود اختیاری اور سول سروس میں سیاسی تجربہ حاصل کر لیا تو نوآبادیوں کا درجہ سامنے نظر آتا تھا۔ ۱۹۴۵ء کے برطانوی انتخابات میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آگئی۔ وہ ہندوستان کو خود مختاری حکومت دے دینے کا عہد کیے بیٹھی تھی۔ اب وہ عہد پورا کیا جا رہا تھا۔

رکاوٹ یہ پیش آئی کہ کانگرس پارٹی اور اس کی حریف مسلم لیگ پارٹی — محمد علی جناح کی قابل ستائش قیادت میں — کے درمیان خود مختار ہندوستان کے لیے ایک قابل عمل دستور پر اتفاق کی ضرورت تھی۔ یہ اتفاق ہو نہ سکا۔ مسلمان مدت سے ہندوستان کو اسلامی اور غیر اسلامی مملکتوں میں تقسیم کے لیے کوشاں تھے۔ آخر ہندوؤں کو بادلِ ناخواستہ ماننا پڑا۔ چنانچہ برطانوی دولت مشترکہ کے اندر ۱۹۴۷ء میں دو خود مختار ڈومینین — ہندو ہندوستان اور مسلم پاکستان — وجود میں آگئے۔

پاکستان دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور ان کے درمیان خاصا طویل ہندو علاقہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ مغربی پاکستان شمال مغرب میں ہے اور چھوٹا حصہ مشرقی پاکستان مشرقی بنگال میں۔ ہندوستان کا باقی حصہ ۱۹۵۰ء میں جمہوریۂ ہند بن گیا۔ پاکستان کی آبادی ساڑھے سات کروڑ[۲] ہے۔ اس مملکت میں صنعت نے چنداں ترقی نہ کی تھی[۳]۔ اس نے ابتدا ہی سے دولت مشترکہ

---

۱ on- Violent on- Coopneration

۲ ۱۹۴۷ء میں اندازہ یہی تھا، لیکن اب آبادی دس کروڑ ہے۔

۳ یہ انگریزوں کی بے انصافی تھی کہ اس نے اسلامی اکثریت کے علاقوں کو صنعتی ترقی سے محروم رکھا، خصوصاً مغربی پاکستان کو، کیونکہ اسے ادھر سے ہمیشہ بیرونی حملے کا خطرہ رہا۔

کے ساتھ روابط قائم رکھے۔ ہندوستان نے بھی آئرلینڈ کی طرح روابط منقطع کرنے پسند نہ کیے اور وہ اب تک دولت مشترکہ کا رکن ہے، البتہ دولت مشترکہ سے برطانیہ کا نام حذف ہو گیا۔ بہر حال آزادی کے بعد یہ حقیقت سامنے آگئی کہ روابط قائم رکھنا اچھا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تقسیم تشدد کے بغیر عمل میں نہ آسکی جغرافیائی اعتبار سے مختلف نسلی اور مذہبی گروہ برصغیر میں ملے جلے رہتے تھے۔ ایسی مملکتیں نہیں بن سکتی تھیں، جن میں صرف ہندو اور صرف مسلمان ہوتے۔ تقسیم کا جو خط پنجاب میں سے کھینچا گیا، اس سے قوموں میں سخت تلخی پیدا ہو گئی اور ہزاروں جانیں ضائع ہو گئیں۔ ہندو پاکستانی علاقے سے نکل کر ہندوستان میں چلے گئے، مسلمان ہندوستان سے نکل کر پاکستان میں آگئے۔ پناہ گیروں کا مسئلہ دونوں مملکتوں کے لیے بہت نازک صورت اختیار کر گیا تھا، مگر چند سال میں اسے دونوں نے معقول طریق پر حل کر لیا۔ اب پاکستان اور ہند کے درمیان صرف کشمیر کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے جس کا حکمران ہندو تھا۔ آبادی میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ہندوستانی فوج کشمیر پر قابض ہے۔ یہ امر اقتصادی اعتبار سے پاکستان کے لیے نقصان رساں ہے۔ ۱۹۵۴ء تک فیصلے کی کوشش کی گئی کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے عامہ سے لی جائے، لیکن یہ ناکام رہی۔

ہندوستان اور پاکستان دو آزاد ملکوں کی حیثیت میں قدم اٹھا چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے باعث خطرہ تھا کہ دونوں ملکوں میں جنگ شروع ہو جائے گی، مگر اب دونوں نے اسے قبول کر لیا، ہندوستان نے بادل ناخواستہ اور پاکستان نے رضامندی سے۔ دونوں کو مشکلات سے سابقہ پڑا، کیونکہ لیڈروں کو سیاسی تجربہ نہ تھا، لیکن برطانوی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اپنے اہم داخلی مسائل حل کرنے میں مصروف ہیں۔ دونوں نے بین الاقوامی دائروں میں بڑا عمدہ کام کیا ہے۔ جنوبی و مشرقی ایشیا کی قوموں میں یہ صورت نظر نہیں آتی۔

انا سیواں باب

مشرق قریب

تمہید

یورپی سلطنتیں مدت سے مشرق قریب یا مشرق وسطیٰ میں سامراجی مقاصد کے لیے جد و جہد کر رہی تھیں، خصوصاً زوال پذیر عثمانی سلطنت کے ایشیائی اور افریقی مقبوضات میں۔ انیسویں صدی میں یہ سرزمینیں زیادہ تر افلاس زدہ تھیں۔ بیسویں صدی میں وہاں بے اندازہ ثروت کا نیا ذریعہ مل گیا، یعنی پیٹرول۔ یہ ثروت عراق کے قدیم دوآبے اور اطراف کی سرزمینوں میں دریافت ہوئی۔ تیل کے ماہروں نے چھان بین جاری رکھی۔ ساتھ ساتھ اس ثروت کے ذخیرے بڑھتے گئے اور آج یہ علاقہ امیر ترین علاقہ ہونے کے اعتبار سے شمالی امریکہ اور کریبیا کے حلقے کا جانشین ہے۔ نئی ثروت نے اس علاقے میں یورپی طاقتوں کا مفاد کم نہ کیا۔ صدی کے چوتھے عشرے میں امریکہ کے ماہرین کو تشویش پیدا ہوئی کہ ان کے براعظم میں تیل کے ذخیرے ختم ہونے کو ہیں، لہٰذا امریکہ بھی مشرق قریب میں پہنچ گیا، پہلے اس نے ایک فیاض و مہربان حامیِ اشاعتِ علوم کی حیثیت میں بیروت (لبنان) اور قسطنطنیہ میں امریکی کالج قائم کیے تھے، اب مشرق قریب میں اس کے داخلے کی حیثیت اس سے زیادہ ہے۔

۱۹۱۸ء سے بعد کے سیاسی تغیرات

دوسری عالمی جنگ کے چھڑنے سے پیشتر ہی واضح ہو چکا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر ترک ایشیائے کوچک میں اپنے قومی حلقے کے اندر محدود ہو گئے تھے۔ مصطفیٰ کمال (۱۸۸۱ء ــ ۱۹۳۸ء) کی سرکردگی میں ترکوں کے اندر سرگرم قومی احیاء شروع ہوا۔ نوجوان ترکوں کے انقلاب نے جو ۱۹۰۸ء سے تھوڑی مدت پہلے رونما ہوا تھا، بڑی وسعت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۲ء میں پرانی عثمانی سلطنت ختم کر دی گئی۔ اس کی جگہ ترکی میں جمہوریت قائم ہو گئی لعد آگے چل کر وہاں حقیقی پالیمانی نظام وجود میں آ گیا۔ جمہوریت کو نمایاں کرنے کی غرض سے مصطفیٰ کمال نے استنبول کا مرکز چھوڑ دیا، جو ترکی علاقے کے حاشیے پر واقع تھا اور وہ ایشیائے کوچک کے قلب میں انقرہ منتقل ہو گیا۔ جمہوریت کی آبادی میں زیادہ یکسانی پیدا کرنے کی غرض سے اقلیت کے سب سے غیر مطمئن گروہ یعنی یونانیوں کو ایشیائے کوچک سے منتقل کرنے کے انتظامات ہو گئے اور ان کے بدلے میں وہ ترک لے لیے گئے، جو یونان میں مقیم تھے۔ پھر مصطفیٰ کمال نے وسیع پیمانے پر مغربیت پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کر لیں۔ بعض اوقات تشدد سے بھی کام لیا۔ عورتوں کو روایتی پابندیوں سے آزادی مل گئی اور عمرانی و سیاسی زندگی کا پورا ڈھانچہ بدل دیا گیا۔ ترکی زبان بھی روایتی عربی رسم الخط کے بجائے

لاطینی حروف میں لکھی جانے لگی۔ غرض مصطفیٰ کمال نے تھوڑی سی مدت میں ملک کی کایا پلٹ دی اور مغرب سے اس کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ یقینی بنا دیا۔ ترکوں نے جو مثال پیش کی تھی، اس کی پیروی مشرق اوسط کی دوسری بڑی آزاد سلطنت یعنی ایران نے بھی اختیار کر لی، اگرچہ اس کی رفتار ترکی کے برابر تیز اور مؤثر نہ تھی۔ ۱۹۰۶ء کے اوائل سے ایران میں ازمنۂ وسطیٰ کا سیاسی ڈھانچہ تدریجاً بدلتے بدلتے ایسے دستوری بادشاہی کی شکل دے دی گئی، یعنی شاہ بدستور حکمران رہا، مگر اس کے ساتھ ایک پارلیمنٹ بھی وجود میں آ گئی جس کے ارکان چنے جاتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ماضی سے رشتہ توڑنے کی خاطر سلطنت کا سرکاری نام ایران قرار پایا، مگر سیاسی تغیر سہل نہ تھا۔ ملک نے دورِ حاضر کے مغربی سیاسی ادارے بہ آسانی اختیار نہ کیے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں ایران کے اندر سیاسی نااستواری اور تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ برطانیہ اور روس کے درمیان بھی وہاں حلقہ ہائے اثر اور مراعات کے لیے مقابلہ ہوتا رہا، تاہم ایران یورپ کے سامراجی اقتدار کی زیادہ نمایاں مصیبتوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہو گیا۔

قدیم عثمانی سلطنت کے بعد عرب میں جو حکومتیں پیدا ہوئیں — شام، لبنان، عراق، عرب، فلسطین اور اس کا مشرقی ہمسایہ شرقِ اردن — وہ پہلی عالمی جنگ کے بعد ترکی کا نمونہ پیش نہ کر سکیں۔ فرانسیسیوں کو شام و لبنان کی حکمداری حاصل تھی۔ برطانیہ نے پہلے سے مصر پر اپنی سیادت قائم کر رکھی تھی، اب اس نے عراق فلسطین اور شرقِ اردن کی حکمداری بھی لے لی۔ صرف دولتِ سعودیہ عربیہ کو، جو ابن سعود نے تیسرے عشرے میں قائم کر دی تھی، ایسا درجہ حاصل تھا، جو حقیقی آزادی سے قریب تر تھا، لیکن یہ دولت اصلاً وضع و ہیئت میں ازمنۂ وسطیٰ سے ملتی جلتی اور جزیرہ نمائے عرب کے بڑے حصے پر مشتمل تھی۔ ابن سعود (۱۸۸۰ء — ۱۹۵۳ء) مسلمانوں کے اس گروہ کا لیڈر تھا، جسے وہابی کہا جاتا ہے۔

دونوں عالمی جنگوں کے درمیان بیست سالہ مدت کے دوران میں مغربی حکومتوں کو مشرق قریب کے بڑے حصے پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ وہ منظم طریق پر تیل سے بھی فائدہ اٹھا سکتی تھیں اور عرب حکومتوں کو شدید رزم و پیکار سے بھی باز رکھ سکتی تھیں، لیکن ان جانشین عرب حکومتوں کی اپنی سیاسی زندگیاں بھی تھیں۔ وہاں قومی تحریکات نشو و نما پا چکی تھیں اور ان میں قومیت کے عام اجزاء — اہلِ مغرب سے نفرت، ان کی ہمسری کا جذبہ، مغربی تعلیم کا شوق — شامل تھے۔ ساتھ ہی ان سب کو اسلام سے گہری وابستگی تھی۔ ایک کمزور، مگر حقیقی احساس یہ بھی تھا کہ ان سب کا تعلق مشترک عربی دنیا سے ہے، البتہ فلسطین کو یہودی آبادی کے ساتھ مستثنیٰ رکھنا چاہیے۔ وہاں گرد و پیش کی عرب حکومتوں سے کشمکش بڑھ رہی تھی[1]

---

[1] یہ بیان حد درجہ عجیب ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر فلسطین میں یہودیوں کی آبادی محض برائے نام تھی۔ برطانیہ کی حکمداری میں یہودیوں کی درآمد شروع ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ سے پیشتر یہودی ایک تہائی سے زیادہ نہ تھے، لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ فلسطین اسلام کے ساتھ وابستگی اور اسلام مشترکہ عربیت سے مستثنیٰ تھا۔ یہودیت کی ساری مصیبت برطانیہ نے پیدا کی اور آخری دور میں ایک عرب ملک کو یہودی بنانے کی پوری ذمہ داری جو ہے وہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس پر عائد ہوتی ہے۔ امریکہ کیوبا میں کمیونزم کو ایک لمحے کے لیے برداشت (باقی صفحہ ۸۶۱ پر)

دو مشارکہ عرب ریاستوں نے رفتہ رفتہ جزوی آزادی حاصل کرلی۔ بست سالہ دورِ مشارکہ میں فرانسیسی شام ولبنان کی حکمداری سے چمٹے رہے، اگرچہ مقامی آبادی کی طرف سے تلخ مخالفت بڑھ رہی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں فرانس دوسری عالمی جنگ کے باعث بُری طرح کمزور ہوچکا تھا، لہٰذا وہ حکمداری ختم کرنے پر راضی ہوگیا اور اس نے شام ولبنان دونوں کی خودمختاری تسلیم کرلی[1]۔ برطانیہ نے مختلف پالیسی اختیار کی۔ اس نے برائے نام آزادی دے دی۔ لیکن اکثر خاص فوجی اور اقتصادی حقوق کچھ مدّت بعد تک قائم رکھے۔ مثلاً مصر کو سرکاری طور پر ۱۹۲۲ء میں آزاد تسلیم کرلیا گیا تھا، مگر ۱۹۵۴ء تک بلکہ اس کے بعد بھی طویل اور ہنگامہ آرا گفت وشنید جاری رہی۔ پھر ایسے انتظامات پر اتفاق ہوا جن کی وجہ سے منطقۂ نہر سویز میں برطانوی افواج ٹھہرائے رکھنے کا سلسلہ ختم کیا گیا۔ عراق میں بھی ایسے واقعات پیش آئے۔ اسے سرکاری طور پر حکمداری کے نظام کی ماتحتی سے ۱۹۳۲ء میں آزاد کیا گیا۔ شرق اردن یا اردن کی ہاشمی بادشاہی کا اعتراف ۱۹۴۶ء میں کیا گیا۔

اس سرسری سیاسی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرق قریب کو مغربی طاقتوں نے جن سامراجی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، وہ قطعاً، مگر ایک حد تک غیر مساوی طور پر ڈھیلی ہوگئیں۔ گویا مشرق قریب کی دنیا میں بیسویں صدی کے اندر ایک نہایت اہم مسئلہ عربوں کے عزائمِ حریت کا تھا۔ اب ہمیں مشرق قریب کے دوسرے مسائل کا جائزہ لینا چاہیے۔ ان سب کا تعلق کسی نہ کسی حد تک مرکزی سیاسی مسئلے سے ہے۔ مسائل یہ ہیں، تیل، کمیونزم، عربوں کے اختلافات اور یہودیوں کے نئے قومی وطن یعنی اسرائیل سے ان کی دشمنی۔

تیل اور کمیونزم — مشرق اوسط میں گزشتہ تیس سال کے اندر تیل کے ذخائر سے فائدہ اٹھانے کا کام ان مشترکہ کمپنیوں کے ہاتھ میں رہا جو یورپ یا امریکہ یا دونوں کے سرمایے سے بنی تھیں۔ یہ کمپنیاں اپنے قومی سفارت خانوں کی نگرانی اور حفاظت میں عمل پیرا ہیں۔ اہلِ مغرب صرف تیل نہ لے جاتے رہے، جیسے اہلِ ہسپانیہ نئی دنیا (شمالی وجنوبی امریکہ) سے قیمتی دھاتیں لے جاتے رہے، بلکہ وہ تیل کی قیمت ادا کرتے رہے۔ وہ قیمت نہیں جو اپنے اپنے وطنوں میں ادا کرتے تھے، مگر بہرحال قیمت دیتے تھے اور اس کی شرح میں اضافہ ہوتا رہا۔ جو روپیہ تیل کی قیمت میں مشرق اوسط پہنچتا تھا وہ توقع کے مطابق زیادہ تر بالائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۶۰) نہ کرسکا، لیکن یہودیت کا خنجر عربوں کے پہلو میں گھونپتے وقت اسے ایک لمحے کے لیے بھی تامّل نہ ہوا۔

[1] دونوں کو الگ الگ کرکے خودمختاری تسلیم کرنا فرانس کا مجرمانہ فعل تھا اور یہ قدم صرف اس لیے اٹھایا گیا کہ لبنان کے مسیحی فرانس کی طرفداری کریں گے۔ برطانیہ کی بیسیوں سامراجی امیدوں کی طرح فرانس کی اس امید کا آبگینہ بھی ریزہ ریزہ ہوگیا۔

یا حکمران طبقوں کے حوالے ہوتا تھا۔ ان میں سے جو رقمیں مشرق قریب کی حکومتوں کو دی گئیں، ان کا بھی بہت تھوڑا حصہ عوام تک پہنچ سکا۔ بلاشبہہ مقامی مزدوروں کو مروجہ شرح کے مطابق اجرتیں ملتی تھیں اور مغربی کمپنیوں نے عمرانی بہبود کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ تاہم اس بنیادی حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ مشرق قریب کے تیل سے صرف چند افراد کے خزانے بھرے[1] اور اکثر جہاں تھے، وہیں رہے۔ ہاں نئی دولت کے نظارے سب کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔

اس صورت حال میں روسیوں نے زاروں کی طرح مشرق قریب پہنچ کر کمیونسٹوں کا پروپگنڈا شروع کر دیا۔ اگرچہ مذہب اسلام مارکسیوں کے افکار کا مخالف ہوتا ہے، تاہم کمیونزم کو بعض اوقات نشو و ارتقاء کے لیے زرخیز زمینیں مل جاتی ہیں۔ کمیونزم کو تقویت اس حقیقت سے پہنچتی ہے کہ مشرق قریب میں مغربی طاقتیں حکمران طبقے کی حمایت کر رہی ہیں، جسے عرفاً آفندی طبقہ کہا جاتا ہے۔ یہ آفندی طبقہ تدریجاً سیاسی اور اقتصادی مساوات قبول کرنے میں حد درجہ متأمل رہا ہے، جو فلاحی مملکت کے لیے ضروری ہے اور اسی کی وجہ سے اب تک مغرب کمیونزم کے پھیلاؤ اور عمرانی انقلاب سے محفوظ رہا ہے، لیکن روسیوں کی تحریک ہو یا نہ ہو، مشرق اوسط میں عمرانی انقلاب کا خطرہ زرا دور ہی معلوم ہوتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایرانیوں کے تعلق میں روسیوں کی روش بھی اسی طرح خامکار سامراجیوں کی سی رہی جیسی مغربیوں کی تھی۔

عربوں کے درمیان اختلافات

اس حلقے میں زیادہ فوری خطرہ یہ ہے کہ کہیں بعض یا تمام عرب قوموں اور نئی اسرائیلی ریاست کے درمیان از سرنو کشمکش نہ چھڑ جائے۔ اس معاملے میں عرب مملکتیں بدرجہا زیادہ آبادی کے باوجود باہم اختلافات کی شکار ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں لبنان، شام، دولت سعودیہ، مصر، عراق اور اردن نے جمعیت عربیہ بنائی تھی۔ اس جمعیت نے اپنے امکان میں ایک مشترکہ مقصد کا احساس پیدا کیا۔ بہت سے اہل علم اتحاد عرب کے منصوبے تیار کر رہے ہیں اور خواب دیکھ رہے ہیں کہ مراکش سے بحیرۂ اسود، بحیرہ قزوین اور خلیج فارس تک ایک بہت بڑی عرب قوم وجود میں آ جائے گی[2]۔

اتحاد عرب کے خواب کی تعبیر تو بہت دور نظر آتی ہے۔ لفظ "عربی" کے بہت سے معنی ہیں۔ اس کا صاف اور واضح اطلاق صرف زبان کے لیے ہوتا ہے۔ وہاں بھی یہ لفظ کلاسیکی تحریری زبان اور بہت سی مختلف مقامی بولیوں کے لیے مستعمل ہے۔ یہ لفظ "نسل" کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یا کم از کم اس گروہ کے لیے بالکل موزوں ہے، جو کسی زمانے میں جزیرہ نمائے عرب کے اندر رہتا تھا، لیکن جو عرب حکومتیں مشرق قریب میں سلطنت عثمانیہ کی جانشین بنیں، ان سب کے باشندے نسلاً عرب نہیں، بلکہ ہزار سال سے زیادہ مدت میں ان میں غیر معمولی اختلاط پیدا ہو گیا۔ نیز عربی کو مشرق قریب میں اسلام کا کامل

---

[1] برطانیہ اور امریکہ دونوں جمہوریت کے مدعی ہیں، مگر جہاں تیل کی غرض آ گئی، وہاں انھوں نے وہی کیا، جو ہر جمہوری مقصد کے خلاف تھا۔

[2] الحمد للہ اب یہ مملکتیں متحد ہو رہی ہیں اور یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے۔

مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا، مثلاً لبنان کی نصف آبادی مسیحی ہے، اگرچہ تمام لبنانیوں کی خاص زبان عربی ہے۔

ثقافتی و اقتصادی زندگی نیز سیاسی و مذہبی اطوار میں عربی دنیا کے اندر دولت سعودیہ سے — جہاں بیسویں صدی کا تیل نکلا اور جس سرزمین کی حیثیت ازمنہ وسطیٰ کی سی ہے — مصر تک — جو عرب مملکتوں میں سب سے زیادہ دولتمند اور ترقی یافتہ ہے — بڑا اختلاف ہے۔ مثلاً اگرچہ مسیحی لبنان سے فرانسیسی رخصت ہو چکے ہیں، مگر وہ خاصے ہر دلعزیز ہیں۔ شام کی ہمسایہ اسلامی مملکت میں فرانسیسیوں کو زیادہ سے زیادہ برا سمجھا جاتا ہے، اگرچہ یہ نفرت صرف لبنان کی مخالفت کے لیے[1] ہو۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو دولت سعودیہ کے پُرجوش وہابیوں اور شہری مصریوں کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ جدید نقطۂ نگاہ کے ترک مسلمانوں کا ذکر ہی غیر ضروری ہے۔

اسرائیل

عرب مملکتوں کے درمیان حقیقی اتحاد صرف یہودیوں کے خلاف نفرت میں ہے، جو اسرائیل میں مقیم ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے اعلان بالفور کے ذریعے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن کے قیام کو تقویت پہنچائی جائے گی۔ برطانوی حکمداری کے زمانے میں دنیا بھر سے یہودی فلسطین پہنچے۔ بہت سے غریب تھے، لیکن خاصی بڑی تعداد کے پاس سرمایہ تھا۔ انھوں نے تل ابیب میں ایک شہر تعمیر کر لیا۔ ان کا پس منظر مغربی تھا اور مغرب سے سرمایہ انھیں مل سکتا تھا۔ اس بنا پر نئے کارخانے پیدا کر لیے۔ ہٹلر کے ظلم و تشدد اور دوسری عالمی جنگ نے یہودیوں کے زیادہ تعداد میں فلسطین پہنچنے کا مسئلہ خاصا نازک بنا دیا۔ برطانیہ وہاں حکمدار تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مشرق قریب میں عرب مملکتوں کی دوستی کے ذریعے سے اپنے مفاد کی حفاظت کرے، لیکن خود فلسطین میں یہودیوں کا سیل عربوں پر غلبہ پا رہا تھا، جو بہت پہلے سے وہاں آباد تھے اور سمجھتے تھے کہ فلسطین ان کا وطن ہے۔ جنگ کے بعد برطانوی فوجوں نے یہودی تارکین وطن سے بھرے ہوئے جہازوں کو فلسطین میں داخلے سے روک دیا۔ اس وجہ سے حالات اور بھی نازک ہو گئے۔

برطانیہ نے مفاہمت کی بے نتیجہ کوششوں سے تنگ آ کر ۱۹۴۸ء میں فلسطین چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ساتھ ہی اسرائیلی جمعیت قائم ہو گئی اور انجمن اقوام متحدہ نے اسے منظور کر لیا۔ اب اسرائیلیوں کو نئی ریاست کے قیام کے لیے لڑنا پڑا۔ جو لڑائی شروع ہوئی، اس میں عرب ریاستوں کے مجموعی فوجی وسائل اسرائیلیوں سے بہت زیادہ تھے۔ مگر عرب

---

[1] یہ حالات کا صحیح تجزیہ نہیں۔ اسرائیل کو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی طرف سے برابر مال اور اسلحہ کی مدد ملتی رہی۔ عربوں میں مصر کا شاہ فاروق اور اردن کا شاہ عبداللہ برابر برطانیہ کے ایما پر کام کر رہے تھے۔ عربوں کی ناکامی کی اصل وجہ یہی تھی۔ آج بھی برطانیہ اور امریکہ عربوں میں تفرقہ ڈالنے کے ذمہ دار ہیں، تاکہ وہ اسرائیل کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ لیکن عربوں کو یقین ہے کہ اسرائیل کا نقش سرزمین عرب سے مٹا دیا جائے گا اور شام و فلسطین سرزمین عرب کے حصے ہیں۔ دو ہزار سال کے بعد فلسطین کے دعویدار یہودی اگر دس بیس سال فلسطین میں رہ گئے تو اس سے آخری صورت پر کوئی اثر نہ پڑے گا، وہ بہر حال مٹ جائیں گے اور ان کی قسمت میں ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں۔

متحدہ فوج میدانِ جنگ میں نہ لاسکے۔ ان کی فوجی صلاحیت بھی اچھی نہ تھی اور اسرائیلیوں کے پاس نئے زمانے کا سامان بہتر تھا۔ حوصلہ بھی بڑھا ہوا تھا، لہٰذا وہ کامیاب ہوئے۔ انجمن اقوام متحدہ کی سرپرستی میں مستقل صلح نہیں، بلکہ متارکے کا انتظام کیا گیا۔ اسرائیلی جمہوریت کے لیے غیر معقول سے حدود مقرر کیے گئے تھے، پورا فلسطین ان میں شامل نہ تھا، بلکہ بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ زمین کا ایک لمبا سا خطہ اسے دے دیا گیا تھا جس کا جنوبی گوشہ بحیرۂ قلزم کے قریب ایک مثلث کے بالائی کونے پر ختم ہوتا تھا۔ مشرقی جانب حد کو آگے بڑھا کر یروشلم کا ایک حصہ اس میں شامل کیا گیا تھا، جو یہودیت کا روحانی مرکز تھا، مگر قدیم شہر یروشلم اردن کے ہاتھ میں رہا اور اس پر عرب فوج ہی قابض رہی۔

عربوں کی یہودیوں سے کشمکش کے دوران میں تقریباً دس لاکھ عرب اسرائیل سے بھاگ کر اردگرد کی ریاستوں میں پہنچ گئے، جو ان پناہ گزینوں کو بسانے کے قابل نہ تھیں۔ فلسطین کے عرب پناہ گزینوں کے اس مسئلے نے عربوں اور یہودیوں کی پرانی مخالفت تیز تر کر دی۔ مزید براں خود اسرائیل میں عرب مسلمانوں کی خاصی بڑی اقلیت موجود ہے۔ ان کا وجود وہ تمام پریشانیاں پیدا کر رہا ہے، جو کسی مملکت کے اندر غیر مطمئن اقلیت کا طبعی نتیجہ ہیں۔ تقسیم شدہ یروشلم بھی استخوانِ نزاع بنا ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء سے ایک پریشان کن منارکہ چلا آتا ہے۔ سرحد پر واقعات وقتاً فوقتاً پیش آتے ہیں۔ کوئی واقعہ کسی بھی وقت خونریز جنگ کا موجب بن سکتا ہے۔

جمہوریۂ اسرائیل عرب اقلیت کے علاوہ بھی نازک خارجی مسائل کے ساتھ ساتھ نازک داخلی مسائل سے بھی دوچار ہے۔ آزاد اسرائیل نے زیادہ سے زیادہ یہودی تارکین وطن کو اپنے اندر آباد کر لیا۔ ان میں سے بعض ترقی یافتہ مغربی ثقافت کے حامل ہیں۔ باقی شمالی افریقہ اور عرب سے آئے ہیں اور بڑی حد تک ازمنۂ وسطیٰ کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان تمام اختلافی انسانی عناصر کو ایک قومیت کی شکل دینا بڑا کٹھن کام ہے۔ خارج شدہ عربوں کے علاوہ پناہ گزینوں کی آمد نے اسرائیل کی آبادی بہت بڑھا دی ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پیشتر کے مقابلے میں یہ آبادی تقریباً دس لاکھ بڑھ گئی ہوگی اور اسرائیل کا رقبہ کنکٹیکٹ کی امریکی ریاست سے زیادہ نہیں اور علاقہ پہاڑی ہے، سطح بھی چٹانی ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ کچھ علاقہ بالکل صحرائی ہے۔ اسرائیلیوں نے مغرب میں جو تربیت حاصل کی تھی اور جو تعلیم پائی تھی، اس سے کام لے کر اپنے محدود ذرائع کا استعمال بہت اچھا کیا ہے، مگر وہ ابھی تک اپنا بجٹ متوازن نہیں کر سکے اور نہ ان کی اقتصادیات میں توازن پیدا ہوا ہے، جو متوازن بجٹ کے لیے ناگزیر ہے۔ ابھی تک ان کا انحصار بیرونی امداد پر ہے، خصوصاً ان بے شمار ہمدردوں پر، جو جمہوریۂ امریکہ میں موجود ہیں۔[1]

---

[1] بس پیسے صرف امریکہ سے ملتے ہیں، سامان بھی امریکہ ہی دیتا ہے، کیونکہ اس کے ووٹوں پر یہودیوں کا روپیہ قابض ہے۔ یہ ایسا راز ہے، جسے سرِ علنی سمجھنا چاہیے۔

اسیواں باب

افریقہ اور دوسرے خطّے

باقی غیر مغربی اقوام

مشرقِ قریب، ہندوستان اور مشرقِ بعید کے علاوہ بھی دنیا میں بہت سے خطّے ہیں، جہاں غیر مغربی اقوام اُن مسائل کے حل میں مصروف ہیں، جن پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ خود برِّ اعظم امریکہ میں ریو گرینڈی کی جنوبی سمت بیں لاطینی امریکہ کی اکثر جمہوریتیں اپنے دیسی باشندوں اور مخلوط آبادی کی ثقافتوں کو موجودہ مغربی سطح پہ لانے کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ علاقہ کربیا بجائے خود ایک ایسا علاقہ ہے جو سراپا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہاں بہت سے جزیرے ہیں جن کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ مثلاً برطانیہ کا جمیکا[۱] اور جمہوریہ امریکہ کا پورٹو ریکو[۲]۔ امریکی، برطانوی، ولندیزی اور فرانسیسی اپنے کریبیائی مقبوضات کے مسائل تعاون اور جمہوریت کے انداز میں طے کر رہے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے برطانیہ نے اپنے جزائر غرب الہند کو ایسی سیاسی مراعات دے دی ہیں، جن کی بنا پر سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ آگے چل کر نوآبادیوں کا درجہ حاصل کر لیں گے۔ اگرچہ یہ علاقہ اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہے، لیکن وہ ایسا علاقہ نہیں جس کے داخلی اور خارجی مسائل امنِ عالم کے لیے خطرے کا باعث ہوں۔

بحرالکاہل کے جزیروں میں مقامی پولینیشیائی لوگوں کا انحطاط ابھی تک روکا نہیں جا سکا۔ صرف جزائر ہوائی ایک روشن نقطہ ہیں، جہاں امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ مخلوط نسل کو مشترکہ مغربی ثقافت میں جذب کرے۔ یہاں جو کام ہو رہا ہے، وہ یورپی اور حبشی نسلوں کے درمیان نہیں، جیسا کہ امریکہ کے برِّ اعظم میں ہے، بلکہ چین، جاپان، پولینیشیا اور "سفید فام" اقوام کی حد درجہ حیرت انگیز ملی جلی نسل جزائر ہوائی میں موجود ہے۔ مزید برآں دوسری عالمی جنگ میں امریکہ کی فتح کامل نے وسطی اور جنوبی بحرالکاہل میں حفاظت کی ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ اس حلقے کو کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں۔

غیر مغربی دنیا کے اس جائزے میں سوویٹ روس کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اپنی وسیع سلطنت کے ایشیائی حواشی پر روسیوں کو بھی غیر یورپی اقوام سے سابقہ پڑا ہے۔ سوویٹ روس میں تقریباً اڑھائی کروڑ مسلمان ہیں۔ چونکہ روس کے اردگرد آہنی پردہ تنا ہوا ہے اس لیے ہمیں پورا علم نہیں ہو سکتا کہ آیا روسیوں کو بھی نوآبادیوں کی وضع کے کسی مسئلے سے سابقہ پڑا ہے؟

---

۱ Jamaica

۲ Puerto Rico

مارکس کے نظریے کے مطابق وہاں کوئی ایسا مسئلہ ہونا نہ چاہیے، کیونکہ مارکس کا مجوزہ معاشرہ سامراجی معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ازبک، ترکمان اور روس کی دوسری ایشیائی قومیں سوویٹ یونین کے ارکان کی حیثیت میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے روسی ہموطنوں کے خلاف کوئی معاندانہ احساس نہ رکھتے ہوں۔ اس کے مقابلے میں روسی بھی اپنے آپ کو دوسرے سے برتر نہ سمجھتے ہوں لیکن مورخ کو اپنے شبہات واضح کر دینے چاہئیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء سے مشرقی یورپ میں روسیوں کی روش کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں، اس کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ مارکس کے اصول نے غالباً روسیوں کو ان اقوام کے اطمینان کے لیے کوئی ہر قفلی کنجی مہیا کر دی ہے، جنھیں پہلے محکوموں کی حیثیت حاصل تھی۔

"سیاہ فام" افریقہ

اب صرف افریقہ باقی رہ گیا۔ یہاں بھی سنہ ۱۹۱۸ء کے بعد سے قدیم وضع کا سامراج ایک فرسودہ و بوسیدہ چیز بن گیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ "سفید فام" قوموں کے لیے برتری لازم ہے۔ یورپی توسیع کے آغاز پر حبشی افریقہ ثقافت کی پست ترین سطح پر تھا۔ چین، جزائر شرق الہند اور مشرق قریب کے مقابلے میں بھی پست تر سطح پر تھا۔ ثقافت سے مراد یہاں رسمی ثقافت ہے۔ اقتصادی اور سیاسی تنظیمات کے اعتبار سے بھی اس کی حیثیت کچھ اچھی نہ تھی، لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد سے حبشی افریقہ میں حالات اس تیزی سے بدلے کہ خود مختاری اور جلد سے جلد آزادی حاصل کرنے کے لیے مطالبات تیز تر ہو گئے۔

بیسویں صدی کے وسط میں نائیجریا اس مرحلے پر پہنچ گیا کہ بالواسطہ حکمرانی یا مشترکہ ضبط و نظم کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہ رہی۔ انیسویں صدی میں بالواسطہ حکمرانی کا مطلب یہ تھا کہ دیسی باشندوں کو صرف روائتی قبائلی مراسم تک اختیار حاصل تھا اور "سفید فام" حکمران دورِ حاضر کے اصول کے مطابق سب کچھ کرتے تھے، مثلاً حفظانِ صحت، انجینیری، مغربی قانون اور دوسرے مغربی فنون۔ دو نسلوں سے بھی کم مدت میں ایسی صورت پیش آئی کہ مقامی باشندے — کم از کم مغربی درسگاہوں میں تعلیم یافتہ لوگ — چاہتے ہیں، خود مغربی اصول کے مطابق تمام کاروبار چلائیں۔ جس حد تک سول سروس کو افریقی بنانے کا تعلق ہے، برطانوی مغربی افریقہ میں یہ معاملہ خاصا آگے نکل چکا ہے اور حبشی اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ کمشنر کے اہم انتظامی عہدوں پر بھی مامور ہو چکے ہیں۔

یہ پالیسی سول سروس پر ختم نہیں ہو جاتی، ضروری ہے کہ مغربی پارلیمانی حکومت بھی اختیار کی جائے، جس کے منتخب ایوان ہوں۔ مطابع اور اجتماعات کی آزادی ہو، گویا مغربی جمہوریت کا پورا سلسلہ قائم ہو جائے۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد مغربی افریقہ میں ایک برطانوی علاقے یعنی گولڈ کوسٹ[1] نے ایسی خود مختاری حاصل کر لی کہ آگے چل کر برطانوی دولت مشترکہ میں ایک "سیاہ فام" ڈومینین کا اضافہ ہو سکتا ہے۔[2]

---

[1] Gold coast

[2] یہ اور اس کے علاوہ افریقہ سے اور بھی اضافے ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

لیکن افریقہ کے منطقۂ حارہ میں سیاسی آزادی کا مسئلہ اتنا سہل نہیں۔ دوسری سامراجی طاقتیں، جنھیں یہاں نو آبادیاں حاصل ہیں ــــ فرانس، بلجیم اور پرتگال ــــ سیاسی مراعات کے مسئلے میں برطانیہ سے بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ گولڈ کوسٹ میں بھی، جہاں ترقی بڑی تیز رہی، ایک دیسی مقالہ نگار نے سنہ ۱۹۵۰ء میں کہا تھا کہ مستعمرات کا درجہ بہت فرسودہ ہے اور "میری قوم ابھی ابھی" کامل آزادی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ مزید برآں "سیاہ فام" افریقہ میں قصبوں اور شہروں کے تعلیم یافتہ لوگوں اور قبائلی دیہات کے باشندوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ دیہاتیوں کے نزدیک سول سروس کے حبشی ملازم حد درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ وہ لوگ دیہاتیوں کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

سب سے آخر میں یہ کہ معاشرے کی وضع اقتصادی اعتبار سے نو آبادی کی سی ہے، یعنی جبری مزدوری کے ذریعے سے خام جنسیں پیدا کی جا رہی ہیں اور عام لوگ ابھی غلامی یا اس سے ملتی جلتی حیثیت سے آزاد نہیں ہوئے۔ وہ اب تک ان پڑھ ہیں اور ان کا درجۂ معیشت بہت پست ہے، لہٰذا خطرہ ہے کہ سیاسی اصلاح اقتصادی نشوو ارتقا سے آگے بڑھ جائے گی۔ جو لوگ ان حالات میں سیاسی آزادی حاصل کرتے ہیں، وہ ایسی شورش کا ہدف بن جاتے ہیں، جس کی وضع قطع کمیونزم کی سی ہو اور اکثر وہ کمیونسٹ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے برطانیہ کو صرف مغربی افریقہ ہی میں نہیں، بلکہ جنوبی افریقہ میں برطانوی گماشتا کے اندر بھی ایسے تجربات سے سابقہ پڑا ہے، لہٰذا حکومت برطانیہ نے سیاسی آزادی کی رفتار سست کر دی، بلکہ بعض اوقات دی ہوئی مراعات واپس لے لیں۔

یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جن یورپی طاقتوں کو افریقہ کے منطقۂ حارہ میں مقبوضات حاصل ہیں، وہاں اہلِ یورپ کی آبادی نہیں ہوئی، بلکہ وہاں "سفید فام" لوگوں کی چھوٹی سی اقلیت موجود ہے۔ وہ یا تو سرکاری افسر ہیں یا مشنری یا بڑی بڑی جاگیروں کے مالک یا درآمد و برآمد کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ہیں جنھوں نے کھیتی باڑی یا چھوٹا موٹا کاروبار یا کوئی اور پیشہ شروع کیا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہمارے عہد میں سفید فام لوگ بہ طیبِ خاطر امریکہ کے اس حصہ سے دستکش ہو جائیں گے، البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اور ان کی وطنی حکومتیں ایسی حبشی جمہوریتیں قائم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی، جنھیں جمعیتِ اقوام میں وہی حیثیت حاصل ہو، جو آج کل وسطی امریکہ کی جمہوریتوں کو حاصل ہے۔

"سفید فام" امریکہ

ایک صدی سے بھی زیادہ مدت میں "سفید فام" لوگ اس امید سے شمالی جانب بڑھتے بڑھتے کئی ہزار میل نکل گئے ہیں اور انھوں نے حقیقی آبادکاروں کی حیثیت اختیار کی۔ وہ جنوبی اور وسطی افریقہ کی سطوحِ مرتفع پر رہتے ہیں یا رہنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے زیادہ خوش نصیب ہموطنوں نے شمالی افریقہ یا آسٹریلیا کے نسبتہً خالی براعظموں میں رہنے کی کوشش کی۔ ان آبادکاروں نے کاشتکاروں، گلہ بانوں، کاروباری اور پیشہ ور آدمیوں کی حیثیت میں نئے گھر بنائے، مگر ایک بڑا فرق موجود رہا، یعنی جس طرح امریکیوں نے وہاں کے دیسی باشندوں اور آسٹریلیوں نے اپنے ہاں کے دیسی باشندوں کو نکال باہر کیا، جنوبی اور وسطی افریقہ کے آبادکار ایسا نہ کر سکے۔

ہر جگہ "سفید فام" اقلیت میں ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بعض خطوں میں انیسویں صدی کے اندر امریکیوں کے سے طریقے اختیار کرتے ہوئے دیسی باشندوں کے لیے جگہیں الگ کر دیں، لیکن وہ دیسی باشندوں سے کاشتکاری اور کان کنی کا کام لیتے رہے، کیونکہ وہ کم اُجرت پر کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان دیسی باشندوں کے درجاتِ معیشت حد درجہ خراب تھے اور خراب ہیں۔ ان کی مثال جنوبی افریقہ کے ایک بڑے مرکز جوہانسبرگ کے ارد گرد خوفناک حبشی جھونپڑیوں میں نظر آ سکتی ہے۔ مگر جو کچھ دنیا بھر میں پیش آیا، وہی جنوبی اور مشرقی افریقہ میں پیش آیا۔

کینیا

ہم ایک مثالی خطہ سامنے رکھ سکتے ہیں، جو بیسویں صدی کے وسط میں خوب منظرِ عام پر رہا یعنی کینیا، جو مشرقی وسطی افریقہ میں برطانیہ کی ایک نو آبادی ہے۔ کینیا خطِ استوا پر واقع ہے، لہٰذا اوّل نظر میں یہ بہت گرم علاقہ معلوم ہوتا ہے اور وہاں "سفید فام" لوگوں کو آباد نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگرچہ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور وہاں کے نشیبی حصے "سفید فام" لوگوں کی آبادکاری کے لیے موزوں نہیں، لیکن اندرونِ ملک میں ہزاروں مربع میل رقبے کے اندر لمبی لمبی گھاس اور جنگلات ہیں، جن کی آب و ہوا اہلِ یورپ کے لیے بہت اچھی ہے۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں یہاں مکتشفین چھان بین کر رہے تھے اور اسے خطرناک ملک سمجھا جاتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ انگریز وہاں گھستے گئے۔ پہلے فوج پہنچی، پھر انجنیئر ریلوے لائنیں بچھانے کے لیے پہنچ گئے۔ حکومتِ برطانیہ نے اندازہ کر لیا کہ یہ ملک "سفید فام" لوگوں کے لیے موزوں ہے، لہٰذا تقریباً پچاس لاکھ ایکڑ زمین یورپی آبادکاروں کے لیے محفوظ کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ یورپی وہاں پہنچے۔ ان کی تعداد چند لاکھ ہوگی اور وہی کارکنوں اور مزدوروں کے ذریعے سے انھوں نے بڑے بڑے رقبے آباد کر لیے۔

کینیا میں تقریباً پچاس لاکھ دیسی باشندے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے خطوں میں رہتے ہیں، جو گوروں کی آبادی کے لیے موزوں نہیں۔ وہاں وہی مسائل درپیش ہیں، جو افریقہ کے دوسرے منطقۂ حارہ میں موجود ہیں۔ لیکن جو دیسی باشندے بلند سطوح پر رہتے تھے، انھیں دھکیل دھکیل کر دیسی باشندوں کے مخصوص خطوں میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں ان کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ جو زمینیں انھوں نے انگریزوں کے ہاتھ فروخت کی تھیں، انھیں اندازہ نہ تھا کہ ہمیشہ کے لیے فروخت کر رہے ہیں اور ان کا نظامِ اراضی گوروں کے نظام سے بالکل مختلف تھا (امریکیوں کو بھی دیسی باشندوں کے ساتھ ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا)۔ گزشتہ پچاس سال میں دیسی باشندوں نے غیر معمولی ترقی کر لی۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بیعنامے واپس کیے جائیں اور زمینیں لوٹا دی جائیں۔

بلند سطوح پر جو بڑا قبیلہ رہتا ہے، اس کا نام گکیویو[۱] ہے۔ اس قبیلے نے بڑھتی ہوئی آبادی کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا، اس نے افریقہ کے ہر یورپی کے دل میں دہشت پیدا کر دی۔ گکیویو نے ایک خفیہ انجمن بنائی، جسے "ماؤماؤ"[۲] کہتے ہیں۔ یہ

---

۱ KIKUYZ

۲ Maumau

دہشت کا ایک حربہ بن گئی، جو صرف گوروں کے لیے نہیں، بلکہ زیادہ امن دوست اور قدامت پسند اہل قبیلہ کو بھی اس نے ہراساں کر دیا۔ یقیناً ماؤ ماؤ کو گکویو میں اقلیت حاصل ہے، مگر یہ بڑی جری اور متعصب اقلیت ہے اور زیادہ سے زیادہ ظلم و جبر کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ نو گردوں کا استیصال کر دیا جائے یا کم از کم انھیں نکال باہر کیا جائے۔ کوئی شبہہ نہیں کہ بعض گکویو "ماؤ ماؤ" کے اطوار و مقاصد سے دلی اختلاف رکھتے ہیں۔ اگرچہ صحیح اطلاعات میسر نہیں، تاہم اغلب ہے، "ماؤ ماؤ" ایسے قومی نصب العین کے لیے کوشاں ہو جن سے اس کے اکثر اہل وطن کو اتفاق ہو۔ یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ بعض "سفید فام" شاہد یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ گکویو کی اکثریت ماؤ ماؤ کے خلاف ہے، لیکن خوف کے مارے کچھ کر نہیں سکتی۔

"ماؤ ماؤ" ان پڑھ اہل قبائل میں براہ راست پروپیگنڈے کا وہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتی، جو مغربی لوگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ماؤ ماؤ کا طریقہ یہ ہے کہ اقدامات قتل کے ذریعے سے اکا دکا گورے زمینداروں، نیز ان قبائل میں دہشت پھیلائی جائے، جو ماؤ ماؤ کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ چند سال میں پرانے طور طریقوں کو حذف کرنا یقیناً مشکل ہے۔ ماؤ ماؤ متذبذب ہم قبیلہ لوگوں کو ایک ایسا حلف اٹھانے پر مجبور کرتی ہے، جس میں تمام قبائلی دیوتاؤں کو یاد کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ حلف توڑ دے تو گکویو کا عقیدہ ہے کہ دیوتا نہ صرف حلف شکن سے، بلکہ اس کے اقربا یعنی کنبے سے بھی انتقام لیں گے۔ بہت سے اعتدال پسند گکویو بظاہر قبائلی مذہب سے بے تعلق ہیں، لیکن دل میں اس قدر بے تعلق نہیں ہوئے کہ جبراً لیے ہوئے حلف کے بارے میں انگریزوں کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے پولیس کو اطلاع دے دیں۔ بعض مسیحی گکویو اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بھی ماؤ ماؤ کا مقابلہ کرتے رہے۔ جو لوگ قبائلی مذہب کے پابند تھے، ان میں سے بھی بعض نے ہمت سے کام لیا۔ "ماؤ ماؤ" کی مہم کی اخلاق سوزی نے ان کے دل پر چرکے لگائے۔ لیکن قبیلے کی بہت بڑی آبادی "ماؤ ماؤ" کے جال میں پھنس گئی۔ بہر حال گکویو پرانے اور نئے طریقوں کے درمیان پریشان حال ہیں۔ وہ قبیلے کے پرپیچ اداروں (قدیم وضع کے لوگوں کے ادارے سادہ نہیں، پرپیچ ہی ہوتے ہیں) میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے، لیکن مغربیوں کی مقابلہ افروز انفرادی زندگی بھی انھیں محفوظ ذریعہ معلوم نہیں ہوتی اور اس زندگی میں وہ اسباب سے دست بپا ہیں، کیونکہ ان کی اقتصادی حالت مغربیوں جیسی نہیں۔ عام گکویو بہر حال "ماؤ ماؤ" کے حامی ہیں۔ نوجوان گکویو کو موٹر سائیکل کی ضرورت ہے، جس کی پچھلی نشست پر اس کی محبوبہ بیٹھی ہو (زمانۂ گزشتہ میں وہ اس قسم کے اطوار محبت سے ناآشنا تھے) لیکن موٹر سائیکل خریدنے کی اس میں استطاعت نہیں۔ کاشتکار گکویو کے پاس زمین نہیں، جو بڑھاپے میں اس کا سہارا بن سکے۔ وہ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں، مگر سکولوں کی فیسیں ادا نہیں کر سکتے۔

ایک انگریز ماہر، جو گکویو کے حالات سے واقف ہے، ان کی مشکلات کا خلاصہ یوں پیش کرتا ہے:۔

"جن حالات میں آج گکویو زندگی بسر کر رہے ہیں، اُن میں انھیں کوئی خاص روش نہیں سکھائی جاتی۔ دیسی قانون اور مراسم کی تعلیم نہیں ملتی۔ ان کے کردار کو ایک خاص سانچے میں نہیں ڈھالا جاتا۔ پرانے قبائلی نظام میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی وسیع اکثریت مشن سکولوں، سرکاری سکولوں اور آزاد سکولوں میں جاتی ہے۔ ان تمام سکولوں میں جماعتیں بڑی بڑی ہوتی ہیں، کیونکہ تربیت یافتہ (ٹرینڈ) اساتذہ کی کمی ہے اور مختلف پیشوں کی تعلیم کے لیے استاد ملتے ہی نہیں۔ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ طالب علم امتحان پاس کرنے کے لیے کتابی علم حاصل کرے جو قبیلے کا بالغ رکن بننے کے لیے ضروری ہے۔"

"یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ گکویو کی تشنگی علم ناقابل تسکین ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کی بدولت اچھی تنخواہیں مل سکتی ہیں، آمدنی بڑھ سکتی ہے، اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے بہتر مواقع حاصل ہوتے ہیں۔"

"ہم لوگوں میں بچوں کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا بڑا حصہ والدین کے طبعی فرائض میں شمار ہوتا ہے اور مدت تک یہی صورت رہے گی۔ بہت سے گکویو والدین بھی ہیں، خصوصاً جو سچے مسیحی بن چکے ہیں، جو اپنے بچوں کو جماعت کے اچھے رکن بنانا چاہتے ہیں۔ قدیم عقائد کے لوگوں میں بھی ایسے ہوں گے، لیکن آج بے شمار گکویو بچوں کے لیے تعلیم محض کتابی علم تک محدود ہے۔ وہ اچھی شہریت کے لیے حقیقی تیاری کے بغیر بڑے ہو جاتے ہیں اور موجودہ زندگی کی ذمہ داریوں سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ہم نے جو نظام تعلیم پرانے قبائلی نظام کی جگہ جاری کیا، اس کی یہی ناکامی آج کے مصائب کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے[1]"

۱۹۵۲ء کے اواخر میں حکومت کینیا نے نازک حالت کا اعلان کر دیا۔ مقامی پولیس کے علاوہ فوج بھی بلائی گئی اور برطانیہ سے بھی ہوائی جہازوں میں کمک پہنچائی گئی، مگر دو سال بعد تک وہاں پورا امن قائم نہیں ہوا تھا، کیونکہ "ماؤ ماؤ" کی دہشت خفیہ طریقوں سے کام لیتی ہے، البتہ فوری خطرے پر قابو پا لیا گیا اور کینیا میں پھر سیاح جانے لگے، کیونکہ یہ خطِ استوا پر معتدل خطہ ہے اور وہاں اقتصادی مواقع بہت زیادہ ہیں۔

---

[1] Leakey کی کتاب Mauman and the Kikuyu (ماؤ ماؤ اور گکویو) ص ۷۶-۷۷

جنوبی افریقہ:۔ نسلی اور قومی کشیدگی

آئندہ چل کر کینیا، نیز اُن خطوں میں، جو کینیا کے جنوب اور مغرب میں واقع ہیں ––– ٹانگانیکا (جو پہلے جرمنوں کا مشرقی افریقہ تھا)، یوگنڈا اور روڈیشیا ––– میں جو صورت حال پیش آئے گی، اس پر جنوبی افریقہ کی یونین میں پیش آنے والے حالات کا گہرا اثر پڑے گا۔ جنوبی افریقہ کی یونین افریقہ میں گوروں کی آبادکاری کا پرانا مرکز ہے۔ یہ رسمی اعتبار سے خود مختار ہے، مگر برطانوی دولت مشترکۂ اقوام کا رکن ہے، لہٰذا اس پر بحث اس حصے میں ہونی چاہیے جس میں دولت مشترکہ کا ذکر آیا ہے، لیکن اصل میں جنوبی افریقہ ویسی نو آبادی نہیں، جیسے دوسرے ڈومینین جمہوریہ امریکہ یا لاطینی امریکہ کی جمہوریتیں ہیں۔ جنوبی افریقہ کی یونین آج نسلی کشمکش کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں محکوموں پر گوروں کی برتری کے قدیم اور خام احساسات واضح صورت میں سامنے آئے ہیں اور جہاں مغربی اداروں، مغربی مشینوں اور مغربی افکار و مقاصد سے نئے ولولے پیدا ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق جنوبی افریقہ کی یونین میں ایک کروڑ غیر یورپی اور پچیس لاکھ سے کسی قدر زیادہ یورپی آباد ہیں۔ گویا یورپیوں اور غیر یورپیوں کا تناسب ایک اور چار کا ہے۔ غیر یورپیوں میں پچاسی لاکھ بنتو حبشی ہیں، تقریباً پندرہ لاکھ نیم حبشی ––– یورپیوں اور غیر یورپیوں کی مخلوط نسل ––– اور تین لاکھ پینسٹھ ہزار ایشیائی ہیں، جن میں سے اکثریت ہندوستانیوں کی ہے۔ مردم شماری کے کاغذات میں یورپیوں کی تقسیم برطانویوں اور افریکانیوں (ولندیزیوں اور ہیوجی ناٹوں کے اخلاف کے لیے پرانا لفظ "بوئر" تھا) کو الگ الگ نہیں دکھایا گیا۔ یقیناً یہ سیاسی مصلحت کا نتیجہ ہے۔ جنوبی افریقہ میں سیاسی پارٹیاں قومیت کی بنا پر منظم ہیں اور پارٹیوں کے ووٹوں کا لحاظ رکھا جائے تو افریکانی نٹال کے سوا ہر مقام پر انگریزوں سے زیادہ ہیں۔

یہ پانچ عناصر ––– افریکانی، انگریز، بنتو، ایشیائی اور مخلوط نسل کے لوگ ––– خاصا سیاسی شعور رکھتے ہیں اور ان میں پروپیگنڈا کرنے والے گروہ بھی موجود ہیں۔ بعض اوقات ان کے مقاصد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے دعاوی جتنے انتہا پسندانہ ہیں، اُتنے وہ عملاً انتہا پسند نہیں۔ وہ ایک لحاظ سے ملے جُلے رہتے ہیں اور جنوبی افریقہ میں نہ خانہ جنگی ہوئی ہے، نہ انقلاب آیا ہے۔ افریکانی نسلی برتری کے جذبے میں سب سے بڑھ کر سرگرم ہیں، مگر وہ بنتو حبشیوں اور مخلوط نسل کا استیصال نہیں چاہتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر حبشی افریکانیوں سے الگ ہو جائیں تو وہ بشیتر ناخوشگوار کام خود انھیں انجام دینے پڑیں، جو آج کل ان کے لیے حبشی انجام دے رہے ہیں، مگر جنوبی افریقہ میں جو مشکلات درپیش ہیں، وہ انسانی قلوب میں اتنی گہری چلی گئی ہیں کہ اقتصادیات وہاں تک نہیں جا سکتیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جنوبی افریقہ میں واقعات تیزی سے پیش آئے۔ یونین کو جنوبی و مغربی افریقہ پر حکمداری مل چکی تھی، جو پہلے جرمنوں کے قبضے میں تھا۔ ۱۹۴۹ء میں یونین نے جمعیت اقوام کی طرف سے حاصل شدہ حکمداری اقوام متحدہ کے حوالے نہ کی، بلکہ جنوبی و مغربی افریقہ کا نیم صحرائی بنجر علاقہ یونین میں شامل کر لیا۔ سیاسی اعتبار سے جنوبی و مغربی افریقہ قومی افریکانی پارٹی کا حامی ہے۔ کیونکہ اس حصے میں انگریزوں سے زیادہ افریکانی آباد ہوئے تھے۔

صدی کے چوتھے عشرے میں ہٹلر نے یورپ کے اندر مختلف علاقے لے لیے تو افریکانیوں نے نازیت کو سہارا بنا لیا اور اسی سے انگریزوں کو دبانے کا کام لینے لگے۔ دوسری عالمی جنگ چھڑی تو جنوبی افریقہ کی یونین غیر جانبداری کا اعلان کرنے والی تھی، کیونکہ اکثر افریکانیوں کی خواہش یہی تھی۔ یونین کی شرکت جنگ بھی مقابلتاً محدود رہی۔ جنگ کے بعد انگریزوں اور افریکانیوں کے اختلافات بڑھ گئے۔ صرف صوبہ نٹال میں انگریزوں کو اکثریت حاصل ہے اور یہ صوبہ یونین سے علیحدگی کی دھمکیاں دیتا رہا۔

بوئروں کی جنگ نے انگریزوں اور افریکانیوں کے جذبات بہت بھڑکا دیئے تھے، پھر یونین بن گئی تو حالات امید افزا نظر آنے لگے، اس لیے افریکانیوں اور انگریزوں کی عداوت ایک معمہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر دو گروہوں کو مشترکہ حیثیت کے لیے خطرے کی بنا پر اکٹھا ہونا چاہیے، "اگر اتحاد میں قوت ہے" کے نعرے اثر انگیز ہو سکتے ہیں تو چاہیے کہ قلیل التعداد فرنگی افریقہ میں غیر فرنگیوں کی بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں مگر حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں افریکانی اور انگریز ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اگرچہ افریکانی اکثریت کے نزدیک انگریز "سیاہ فام" لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قائم واستوار نہیں، بلکہ نرم اور آزاد خیال ہیں، تاہم تمام انگریز بھی اس حس سے خالی نہیں، جسے نسلی امتیاز کہا جاتا ہے۔ وہ بھی یونین کو "سیاہ فام" لوگوں کی اکثریت کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں۔

حبشیوں کو کبھی ووٹ کا حق نہیں دیا گیا۔ کیپ کالونی کے صوبے میں مخلوط نسل کو ایک مرتبہ ووٹروں کی جداگانہ فہرست میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی اور انھیں یہ حق ملا تھا کہ صوبائی پارلیمنٹ میں تین نمائندے بھیج سکیں، مگر یہ لازم قرار دے دیا گیا تھا کہ تینوں نمائندے خالص گورے ہونے چاہییں یعنی یورپی۔ چونکہ یہ تین نمائندے انتہا پسند افریکانیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی حمایت کرتے تھے، اس لیے دوسری عالمی جنگ کے بعد فاتح افریکانیوں نے یہ محدود حق رائے بھی ختم کر دیا۔

جنوبی افریقہ، نسلی علیحدگی[1]

افریکانیوں نے دیسیوں کے متعلق جو پالیسی اختیار کی، اسے "نسلی علیحدگی" قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تہ میں وہ نسلی تعصب کارفرما ہے، جس سے ہر دیانت دار امریکی پوری طرح روشناس ہے، مگر بعض امریکیوں کی طرح افریکانیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ گورے اور حبشی الگ الگ گروہوں میں ترقی کر سکتے ہیں۔ بیشک وہ ایک دوسرے کے پاس پاس رہیں، مگر ان میں خلا ملا نہ ہونا چاہیے۔ افریکانیوں کا عقیدہ ہے کہ سیاسی زندگی پر اقتدار گوروں کو حاصل ہونا چاہیے۔ سیاہ فام لوگ دور حاضر کی اقتصادی اور فنی ترقی سے بعض فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے پیشہ ور طبقوں کو ترقی دیں، اپنے سکول اور ہسپتال قائم کریں۔ شہروں میں ان کے محلے الگ ہونے چاہییں، جہاں گوروں کے حبشی ملازم راتیں گزاریں۔

یہ سب کچھ ان لوگوں پر پوری طرح واضح ہے، جو جمہوریۂ افریقہ میں نسلی تعلقات کی تاریخ سے آگاہ ہیں۔ مگر جنوبی افریقہ

---

[1] Apartheid اس کے لغوی معنی علیحدگی اور یکسوئی ہیں، لیکن یہ نسلی علیحدگی کے لیے مستعمل ہے۔

میں نسلی علیٰحدگی کی پالیسی پر زیادہ شد و مد سے عمل کیا جا رہا ہے۔ جمہوریۂ امریکہ میں علیٰحدگی کی پالیسی اتنی شدید نہیں۔ فی الوقت افریقہ میں علیٰحدگی زیادہ نازک صورت اختیار کر رہی ہے۔ جمہوریۂ امریکہ میں اس کے متعلق خاصی نرمی پیدا ہو رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنوبی افریقہ میں نسلی علیٰحدگی کو ایک نصب العین بنا لیا گیا ہے، حالانکہ وہاں گوروں اور حبشیوں کا تناسب ایک اور چار کا ہے۔ امریکہ میں حالت یہ نہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ جنوبی افریقہ کے غیر یورپی، خصوصاً بنتو حبشیوں کی بہت بڑی اکثریت نسلی علیٰحدگی کو آئندہ کا مستقل اصول ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں سے انتہا پسند لیڈر کینیا کے "ماؤ ماؤ" کی طرح گوروں اور ایشیائیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جنوبی افریقہ سے ان سب کو نکال دیں۔ بہ ایں ہمہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ جنوبی افریقہ کے عام حبشی کیا چاہتے ہیں۔ وہ کوئی متحدہ گروہ نہیں۔ ان میں سے اب تک بعض اپنے قبائلی قانون و مراسم کے پابند ہیں، اگرچہ وہ مغربیوں کے اطوار اور ہتھکنڈوں کی قوتِ نفوذ سے زیادہ دور نہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ مشنریوں کے زیر اثر ہیں اور انھوں نے تعلیم پا کر طبقۂ اوسط کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ مگر بہت بڑی اکثریت کی حالت غلاموں سے بہتر نہیں۔ وہ کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں اور دیہاتی خطّوں میں نجی ملازم ہیں۔ وہ بڑے بڑے احاطوں میں جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں۔ وہیں سے نکل کر کاروبار اور صنعت و حرفت میں اُجرت پر کام کرتے ہیں۔

اکاسیواں باب

دولت مشترکۂ برطانیہ

تمہید جنوبی افریقہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے دولت مشترکۂ برطانیہ کی داخلی تاریخ میں پہلی عالمی جنگ کے بعد سے کوئی نمایاں نیا واقعہ پیش نہیں آیا۔ نیوزی لینڈ سب سے چھوٹا ڈومینین ہے۔ وہاں عمرانی قوانین کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۱ء میں اجتماعی طبی امداد کے لیے ایک قومی منصوبہ تیار ہو گیا تھا، گویا برطانیہ سے بھی کئی سال پیشتر نیوزی لینڈ قدم آگے بڑھا چکا تھا۔ وہاں کی اقتصادیات اب تک جزواً نوآبادیوں کی سی ہیں، یعنی وہاں سے اون، گوشت اور دوسری خام جنسیں برآمد کی جاتی ہیں اور مصنوعات کی درآمد ہوتی ہے۔ زیادہ تر مصنوعات برطانیہ سے آتی ہیں۔ داخلی صنعت و حرفت کی حالت ایسی ہے کہ نیوزی لینڈ خودداری قائم رکھ سکتا ہے۔ یہاں دیسی آبادی ماؤریوں[1] کی تھی۔ ان کی تعداد میں اب کوئی کمی نہیں ہو رہی، بلکہ وہ بڑھ رہے ہیں۔ اُنیسویں صدی کے آخری عشرے میں ان کی تعداد چالیس ہزار تھی، اب ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ نیوزی لینڈ کے تمام جزیروں کا رقبہ ایک لاکھ مربع میل ہے اور مجموعی آبادی بیس لاکھ سے زیادہ نہیں۔ گویا آبادی رقبے کے مقابلے میں زیادہ قرار نہیں دی جا سکتی اور ماؤری وہاں تنگ حال نہیں، جیسے کینیا میں گکویو اور امریکہ میں نواہو[2] ہیں۔ ماؤریوں میں سے فوجی اور سیاسی لیڈر بھی پیدا ہوئے اور کاروباری آدمی بھی اور وہ مغربیت کے پُرامن اور معززانہ عملیے میں اتنے کامیاب ہوئے ہیں کہ کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

کینیڈا کینیڈا بیسویں صدی کے وسط میں اقتصادی خوشحالی کے اس پیمانے پر پہنچ گیا ہے، جو امریکہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ امریکی سرمایہ بڑی حد تک اس کا معاون ہے۔ کینیڈا میں سیاسی حیثیت استوار رہی۔ لبرل پارٹی کو اقتدار حاصل رہا، مگر قدامت پسندوں کا حزب مخالف بھی خاصا پختہ ہے اور اس میں تلخی کوئی نہیں۔ سلطنت متحدہ کے وفادار "امریکیت" کے متعلق بڑے پریشان تھے، لیکن اس کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ امریکہ سے جو سیاح کینیڈا جاتے ہیں، وہ اپنے آپ کو کسی اجنبی

---

[1] Maoris — نیوزی لینڈ کے دیسی باشندے۔

[2] Navaho — ایری زونیا (جمہوریۂ امریکہ) کا ایک دیسی قبیلہ۔

سرزمین میں محسوس نہیں کرتے، البتہ فرانسیسی کینیڈا کے کسی دُور افتادہ گاؤں میں جاکر تھوڑی بہت اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔
بایں ہمہ جمہوریۂ امریکہ اور کینیڈا میں اہم اختلافات بھی ہیں۔ کینیڈا کے ایک باکمال ناول نگار نے اپنے ایک کردار لیسیٹر[1] کو، جو ایک امریکی کاروباری آدمی تھا، اہلِ کینیڈا کے ساتھ انٹیریو[2] کے چھوٹے سے قصبے میں ایک لنچ پر بٹھایا ہے۔

" جب وہ لنچ کے لیے ہوٹل میں پہنچا تو دیکھا کہ بڑا ایوان مقامی کاروباری آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج تو وہ روٹری کلب میں معزز مہمان ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کمرے میں گیا اور ہاتھ منہ دھوکر تیار ہوا۔ جب وہ نیچے آیا تو اس نے مختلف لوگوں کو بات چیت کرتے دیکھا۔ بات چیت پر کان دھرا تو اسے معلوم ہوا کہ آج صبح کے اخباروں کی خبریں خلافِ معمول پریشاں کُن تھیں۔ لوگ ہٹلر کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ وہ سب دیکھنے میں ویسے ہی تھے، جیسے نیو انگلینڈ کے کسی قدیم وضع کے قصبے میں روٹری کلب کے ممبر ہوتے ہیں۔ اس نے سنا کہ ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا: " امریکیوں کی حیثیت سیاسیات میں طفلکوں کی سی ہے اور وہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے اور یہ امید نہیں رکھی جاسکتی کہ روزویلٹ شب بھر میں انھیں بین الاقوامی اعتبار سے ذمّہ دار بنا دے گا۔"

" لیسیٹر کھسیانی ہنسی ہنسا اور اپنے ایک واقف کی طرف متوجہ ہوکر بولا: " کاش آپ جلد سے جلد جمہوریۂ امریکہ میں شامل ہوجائیں، پھر آپ جیسے فرد کو معلوم ہوگا کہ حقیقت حال کیا ہے۔ میرا احساس اس وقت یہ ہے کہ میں یونین کی کسی ایسی ریاست کو دیکھ رہا ہوں، جو نقطۂ ماسکہ سے ہٹی ہوئی ہے، اس لیے مجھے بھی بھینگے پن سے کام لینا پڑا۔[3]"

اقتصادی اعتبار سے کینیڈا امریکی نظام میں مرتبط ہوچکا ہے، یعنی وہ ڈالر کے حلقے میں شامل ہے، سٹرلنگ کے حلقے میں نہیں۔ اس پر ایک لحاظ سے برطانیہ کی حکمرانی نہیں، اگرچہ یہ رائے اس کے خلاف ہے، جو امریکیوں کے دل سے ابھی تک خارج نہیں ہوئی۔ غرض کینیڈا ایک خود مختار مملکت ہے، جو کسی قانونی رشتے کے ذریعے سے برطانیہ کے ساتھ وابستہ نہیں۔ اگرچہ برطانوی دولت مشترکۂ اقوام کا ایک سرگرم اور وفادار رکن ہے۔ جو لوگ اس کے قومی شعور کا جائزہ لے چکے ہیں، وہ اسے امریکہ سے وابستہ نہیں سمجھتے، بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے درمیان ایک مؤثر اور خود مختار ثالث قرار دیتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ کینیڈا متحد نہیں۔ کینیڈا کے فرانسیسی باشندوں کی تعداد قدرے بڑھ رہی ہے، لیکن رفتار اتنی تیز نہیں جتنی

---

[1] Lessiter   [2] Ontario

[3] ہیو میکلینن Hugh Maclennan. کی کتاب The Precipice ص ۸۸-۸۹

دوسرے اہلِ کینیڈا کی ہے ۔ فرانسیسی اب تک اپنی زبان بولتے ہیں اور انھیں صوبۂ کیوبک[۱] میں ایسے خاص حقوق حاصل ہیں ، جن کی نظیر جمہوریۂ امریکہ میں نہیں ملتی ۔ ایسے فرانسیسی باشندے بھی ہیں ، جو شدید قومی احساسات رکھتے ہیں اور جن کی وجہ سے دوسرے مقامات پر مشکلات پیدا ہوتی ہیں ۔ کینیڈا میں انتہا پسند فرانسیسی اخبارات اور فرانسیسیوں کی بعض تقریروں سے اندازہ کیا جائے تو دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ کینیڈا میں بھی قومیت کا مسئلہ اتنا ہی نازک ہے ، جتنا جنوبی افریقہ میں افریکانیوں اور انگریزوں کا مسئلہ یا آئرلینڈ میں آئرستانیوں اور باشندگانِ السٹر کا مسئلہ ہے ۔ کسی بھی عالمی جنگ میں کینیڈا کے فرانسیسی باشندے اتحادیوں کے مقصد میں زیادہ پُرجوش نہیں رہے اور دونوں جنگوں میں وفاقی مرکزی حکومت کو بڑی احتیاط سے ان کا خیال رکھنا پڑا ، لیکن فرانسیسیوں کی اکثریت موجودہ حکومت کی وفادار ہے اور وہ انگریزی بولنے والی اکثریت کے ساتھ کام کرنے کی خواہاں ہے ۔ وہ اتنے احمق نہیں کہ پورے کینیڈا کو فرانسیسی اور خوش عقیدہ کیتھولک بنانے کی امید رکھیں ۔ وہ فرانس سے اتحاد نہیں چاہتے ، جو ۱۷۸۹ء سے زبردست جمہوری چلا آتا ہے اور فرانسیسی بولنے والوں کے الگ الگ حلقے قائم کردینے سے وہ اس لیے گریزاں ہیں کہ جمہوریۂ امریکہ انھیں ہضم کرجائے گی اور وہاں ان کے خاص گروہی حقوق بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گے ۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا میں اقلیت کا کوئی مسئلہ موجود نہیں ، البتہ دولتِ مشترکہ کو صوبائی علیحدگی پر قابو پانا پڑا ، لیکن آسٹریلیا کی صوبائی ریاستیں اساساً امریکہ کی مغربی ریاستوں سے مختلف نہیں ۔ بیسویں صدی کا آسٹریلیا بھی بڑی حد تک فلاحی مملکت ہے ۔ منظم مزدور انگلستان کی طرح آسٹریلیا میں بھی ایک سیاسی لیبر پارٹی کے ذریعے سے کام کرتے رہے ، جسے مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں وقتاً فوقتاً اقتدار حاصل ہوتا رہا ۔ آسٹریلیا آج بھی کامل اشتراکیت سے دُور ہے اور ایک ایسے معاشرے سے یہی امید رکھی جاسکتی تھی ، جو ماضیِ قریب تک ایک سرحدی معاشرہ تھا اور سرحدی انفرادیت اس میں موجود تھی ۔

آسٹریلیا بھی امریکہ کی طرح ایک نیا معاشرہ ہے اور اب تک اس میں بھی سرحدی تندی و تیزی کا خاصا اثر موجود ہے ۔ اہلِ آسٹریلیا اپنے ابتدائی آبادکاروں کی یاد تازہ رکھنے کے خواہاں نہیں ، جو سزا یافتہ مجرم تھے اور انھیں آسٹریلیا جلاوطن کیا گیا تھا ، جو اصلاً مجرموں کی نوآبادی تھا ۔ آسٹریلیا میں سنجیدگی سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان مجرموں کی نسل باقی نہیں رہی ، وہ سب لاولد مرگئے ۔

موجودہ آسٹریلیا بھی نیوزی لینڈ کی طرح ایک نازک مسئلے سے دوچار ہے ۔ ان دونوں جزیروں میں مٹھی بھر گورے مشرقِ بعید کے کنارے پر موجود ہیں ۔ ان کی آبادی بڑھ رہی ہے ، مگر بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اچھی زمینیں موجود نہیں ۔ دونوں

---

[۱] Quebec

میں خاص اہتمام کیا گیا کہ گوروں کے سوا کسی کو آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ دونوں میں آبادی کم ہے اور مجموعی آبادی ایک
کروڑ سے کچھ ہی زائد ہوگی۔ دونوں کو خوف ہے کہ ایشیا میں کوئی ایسی قوت پیدا ہو جائے گی جو اُن تک پہنچ جائے، اور ان پر
غلبہ حاصل کرلے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی فیصلہ کن شکست نے بدترین خطرات ختم کر دیئے، لیکن اصل خطرہ اب
بھی موجود ہے اور وہ دلوں سے کبھی باہر نہیں نکلتا۔ بین الاقوامی تعلقات کے پیش نظر واضح ہے کہ دونوں کو محافظ کی حیثیت
میں امریکہ پر اعتماد رکھنا چاہیے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ برطانیہ سے ان کا تعلق کٹ جائے۔ اس کے لیے جذباتی یا
اقتصادی لحاظ سے وہ ہرگز تیار نہیں۔

دولتِ مشترکہ کی نوعیت

برطانوی دولتِ مشترکہ بہ حیثیت مجموعی سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد کی ایک اہم چیز ہے۔ اس کا دستوری
ڈھانچہ سنہ ۱۹۳۱ء میں ضابطۂ ویسٹ منسٹر کے ذریعے سے معین ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء اور
سنہ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان، پاکستان، سیلون اور دوسری غیر برطانوی یا غیر اینگلوسیکسن سرزمینوں کے شامل ہونے سے اس
کی رکنیت کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ ہندوستان سنہ ۱۹۵۰ء میں اس کا رکن بنا اور برطانیہ کا لفظ اس نظام سے خارج کر دیا گیا،
اور اس کا نام محض دولتِ مشترکۂ اقوام رہ گیا۔

ضابطۂ ویسٹ منسٹر نے برطانوی پارلیمنٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ برطانیہ اور ڈومینین:

"سلطنتِ برطانیہ کے اندر خود مختار مجموعے ہیں۔ ان سب کا درجہ برابر ہے۔ کوئی
داخلی یا خارجی معاملات میں قطعاً کسی کے تابع نہیں، اگرچہ سب تاجِ برطانیہ کی مشترکہ وفاداری
میں متحد ہیں اور برطانوی دولتِ مشترکۂ اقوام میں آزادانہ شامل ہوئے ہیں۔"

آزادانہ شمول کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہیں، الگ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں کسی سلطنت کا حق علیحدگی برطانوی
دولتِ مشترکۂ اقوام کا جزو ہے۔ امریکیوں نے اس کے لیے جنگ کی اور جمہوریۂ امریکہ کے دستور میں فیصلہ ہو گیا کہ حق علیحدگی کسی
کو حاصل نہ ہوگا۔ جنوبی آئرلینڈ کے چھبیس ضلعوں نے اسی حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آئرلینڈ کی جداگانہ جمہوریت بنالی اور
وہ دولتِ مشترکہ سے باہر ہے۔

دولتِ مشترکہ کا کوئی رکن چاہے تو دوسرے ارکان کے خلاف محاصل عائد کر سکتا ہے۔ اس کے شہریوں کی آمد
کے لیے قواعد بنا سکتا ہے۔ اپنی سفارتیں الگ بنا سکتا ہے۔ دولتِ مشترکہ کے اندر اور باہر دوسری سلطنتوں سے
معاہدے کر سکتا ہے۔ غرض ضابطۂ ویسٹ منسٹر کا یہ جملہ کہ "خود مختار مجموعے ہیں" محض سخن طرازی نہیں۔

مگر خود دولتِ مشترکہ بھی سخن طرازی نہیں اور اسے ایک قیاسی وجود نہ سمجھنا چاہیے۔ اصلاً تاج سب کے درمیان
ایک مشترکہ رشتہ ہے، لیکن یہ اصطلاح بھی غیر معمولی حد تک ایک مجرد تصور نہیں۔ اہلِ کینیڈا چاہیں تو فرمانبردارانہ ملکہ
کی تصویر اپنے ڈاک کے ٹکٹوں پر بنالیں۔ اگر شاہی خاندان کا کوئی فرد کینیڈا آئے تو وہ اس کا احترام کرتے ہیں اور امریکی

بھی احترام کرتے ہیں۔ اب اہل کینیڈا قانونی اعتبار سے کینیڈا کے شہری ہیں، برطانوی رعایا نہیں۔ ہندوستان میں تاج ملکہ کی طرح کوئی گوشت پوست کی چیز نہیں، بلکہ ایک مجرد تصوّر ہے۔

تاہم دولت مشترکہ دو جنگوں میں متحد رہی اور اب تک ماضی کی تلخ بغاوت کے باوجود ہندوستان بھی اس میں موجود ہے۔ غالباً سہولت اور عادت کے سوا دولت مشترکہ کو یکجا رکھنے والی کوئی چیز نہیں۔ یہ قوتیں بھی بڑی زبردست ہیں خصوصاً جب اقتصادی اور جنگی سہولتیں میسر اور جمہوری عادات موجود ہوں۔ یقیناً دولت مشترکہ کا انحصار مختلف اقوام کی رضامندی اور عملی مفاہمت کی محکم بنیاد پر ہے۔

دولت مشترکہ کے ادارے

دولت مشترکہ کی قومیں اپنی جمہوری روایات و عادات کا اظہار اداروں کی شکل میں کر چکی ہیں۔ قانون، پارلیمانی، اور پارٹی کی حکومتوں پر کاربندی، تعلیم، سیاسی افکار اور مختلف قوموں کے ناگفتہ مفروضات اور طور طریقے ان کے پشتیبان ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اطلاق پرانے ڈومینینوں پر ہوتا ہے جو "سفید فام" لوگوں پر مشتمل ہیں۔ بداہتہً طور طریقوں کی اصطلاح کا اطلاق ہندوستان جیسے ملک پر نہیں ہو سکتا، لیکن برطانوی طور طریقے ہندوستان میں بھی گھر کر چکے ہیں۔ خصوصاً وہاں کے نئے حکمران طبقات میں۔ اس گوناگوں سرزمین میں جہاں مختلف بولیوں کا ہنگامہ بپا ہے، اب تک انگریزی مشترکہ زبان ہے۔ دوسری تفصیلات میں بھی برطانوی طریقوں کا استحکام نمایاں ہے۔ قریبی تاریخ سے صرف ایک مثال لے لیجئے۔ ہندوستانی فوجوں کا کمانڈر کوریا میں ۱۹۵۳ء کے متارکے کے مطابق قیدیوں کی واپسی کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی جو تصویر شائع ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی انگریز جرنیل کی تصویر ہے اور اس کا نام کولمنڈلی[1] یا میسنگھم[2] ہونا چاہیے۔

برطانوی دولت مشترکہ میں حکومت کا کوئی مشترکہ وفاقی نظام موجود نہیں۔ "سامراجی وفاق" کے متعلق انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک واقعی وفاقی حکومت قائم کر دی جائے، جس کے ساتھ انتظام، قانون سازی اور عدالت کی شاخیں ہوں۔ آج کل سامراجی وفاق کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اصل تجویز تفصیلات میں اختلاف پر ختم ہو گئی، لیکن اصلاً جو مشکل پیش آئی وہ اٹھارہویں صدی ہی سے نمایاں تھی، جب اعتدال پسند مصلحین امریکی نوآبادیوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں نمائندگی دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وفاقی نظام میں تمام ڈومینینوں کو مساوی نمائندگی دے کر کام نہیں چلایا جا سکتا، کیونکہ چھوٹے ڈومینین بڑے ڈومینیوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جائیں گے۔ آبادی کی بنا پر نمائندگی ممکن نہیں، کیونکہ ۱۹۴۷ء تک برطانیہ کو زیادہ سے زیادہ قوت حاصل ہو جاتی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مقتدر بن جانے کا امکان ہے۔

---

[1] Chohnordely

[2] Messingham

برطانوی دولتِ مشترکہ کا کام رسمی مرکزی اداروں کے بغیر ہی چل رہا ہے۔ برطانیہ اور ڈومینینوں کے وزراء اعظم اور ان کا عملہ کانفرنسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ان میں انتظامی ماہرین بھی موجود ہوتے ہیں اور دوسرے ماہرین بھی۔ یہی عمل مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ کانفرنسیں محض سفیروں کی نہیں ہوتیں، بلکہ ان سیاسی شرکاء کی ہوتی ہیں، جو گرد و پیش کی ضرورتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ پُر امید لوگ خصوصاً دولتِ مشترکہ کے شرکاء ہیں سے یقین رکھتے ہیں کہ اس غیر رسمی اشتراک نے محض اپنی قوت ہی کا ثبوت نہیں دے دیا، بلکہ اسے پھیلا کر ملایا اور نائیجیریا جیسی نوآبادیاں خودمختاری حاصل کر لینے کے بعد اس میں شریک ہو سکتی ہیں۔ بعض اور لوگوں کی رائے ہے کہ برطانوی دولتِ مشترکہ امکانی عالمی وفاق کے لیے بہتر نمونہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے بہتر کوئی نیا نمونہ تجویز نہیں کیا جا سکتا۔

بیاسیواں باب

بندھنوں کی کشود کے نتائج

سلطنتوں کا سکڑنا

سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد نصف صدی کے اندر استعمار زدہ اقوام کا درجہ اس قدر تبدیل ہو چکا ہے کہ جب سے موجودہ یورپ نے پندرھویں صدی میں توسیع شروع کی اتنی مدت کے کسی دور میں ایسا تغیر کبھی نہیں ہوا، خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے بعد سے مغرب کی سامراجی سلطنتوں کی وسعت حد درجہ سکڑ گئی ہے۔ برطانیہ نے برما اور فلسطین کو چھوڑ دیا۔ ہندوستان، پاکستان اور سیلون کو آزاد کر دیا۔ دوسرے مقامات پر مراعات دی جا رہی ہیں۔ ولندیزوں نے انڈونیشیا سے بادلِ ناخواستہ دست برداری اختیار کر لی۔ امریکیوں نے فلپینز کو بہ طیبِ خاطر آزادی دے دی۔ اٹلی نے مسولینی کے ماتحت افریقہ میں جو سلطنت پیدا کی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔

برطانیہ کے بعد فرانس ہی نہایت اہم سامراجی طاقت تھی۔ اس سے شام، لبنان اور ہند چینی کا ایک حصہ الگ ہوئے، لیکن ابھی فرانس کے پاس پرانے سامراجی مقبوضات موجود ہیں، جو زیادہ تر افریقہ میں ہیں[1]۔ دو حقیقتیں بالکل نمایاں ہیں، اوّل مقامی قومی تحریکیں ترقی پر ہیں، خصوصاً شمالی امریکہ میں فرانسیسی مقبوضات —— مراکش، الجزائر اور ٹیونس —— کے اندر۔ یہ سب مصر کی مثال اور دنیائے عرب کے سیاسی ہنگامی حالات سے بے حد متاثر ہوئے۔ دوم دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر فرانس نے سامراجی پالیسی میں نمایاں تبدیلی پیدا کر لی اور فرانسیسی یونین کا اعلان کر دیا، جو فرانس اور اس کے سمندر پار مقبوضات کو ملا کر قائم کی جا رہی ہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء کے بعد تھوڑی مدت تک معلوم ہوتا رہا کہ فرانسیسی یونین زیادہ تر ایک نمائشی کھیل ہے اور پرانی فرانسیسی انجذابی سامراجی پالیسی کے لیے ایک نئی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ خیال یہ تھا کہ فرانس دیسی قوم پروروں کو صرف چند حقیقی مراعات دے گا، مگر سنہ ۱۹۵۴ء میں ہند چینی کے واقعات نے اسے متزلزل کر دیا۔ لہٰذا حکومتِ فرانس ٹیونس اور مراکش میں نیا درجہ قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی، جو ایک حد تک نوآبادیوں کے درجے سے ملتا جلتا تھا۔ پہلی مرتبہ نظر آنے لگا کہ

۱؎ فرانس تقریباً تمام افریقی علاقوں سے دست بردار ہو چکا ہے اور یونین کا ہتھکنڈا کارگر نہیں ہو سکا۔

فرانسیسی یونین فی الجملہ برطانوی دولت مشترکہ کی شکل اختیار کرے گی، اگرچہ اسے اغلب نہیں سمجھا جا سکتا۔

مشرق و مغرب کے درمیان تقریباً مساوات

سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد ایشیا میں جو واقعات پیش آئے، ان سے ہر جگہ کی استعمار زدہ قوموں پر ــــ اور پرانی سامراجی قوموں کے تشویش زدہ لیڈروں پر ــــ یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ چین اور جاپان کو مغربی طاقتوں کے خلاف جنگ میں کامیابی کے تقریباً مساوی مواقع حاصل ہیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں روس نے جاپان پر فتح حاصل کی۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جاپان نے پرل ہاربر کے جنگی جہازوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ کارٹیز[1] اور پیزارو[2] کے ماتحت یورپیوں کی جو توسیع شروع ہوئی تھی، اس کے ضمن میں صدیوں کے اندر واضح ہو گیا کہ دیسی باشندے چھاپوں اور کمین نشینوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور وقتاً فوقتاً یورپیوں کو شکستیں دے سکتے ہیں، جیسے "سیاہ فام" اہل حبش نے سنہ ۱۸۹۶ء میں اطالویوں کو بمقام عدوا شکست دی تھی۔ ساتھ ہی یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی مغربی طاقت سنجیدگی سے کارفرما ہوتی تو ہندیوں اور چینیوں کی بے پناہ آبادیوں کو بھی کچل سکتی تھی۔ اب بیسویں صدی کے اندر یہ ظاہر ہو گیا کہ "غیر سفید فام" اقوام جنگ میں "سفید فام" اقوام کے برابر رہ سکتی ہیں۔ اہل مغرب کو مزاحمت کے ایسے مؤثر طریقوں کا بھی تجربہ ہو گیا، جیسے گاندھی کی تشدد سے پاک تحریک یا ماؤ ماؤ کی وحشیانہ دہشت انگیزی یا ہند چینی اور ملایا کے ان باغیوں کے چھاپا مار دستے جن کی قیادت کمیونسٹ کر رہے تھے۔

مغربیوں اور غیر مغربیوں کے درمیان مادی قوت کے سلسلے میں مساوات یا تقریباً مساوات کے لیے مدت سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قوتیں تدریجاً بڑھتی رہیں اور ان کی ابتدا یورپ کی پنج صد سالہ توسیع میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی حیثیت دیسیوں کی رسمی اور غیر رسمی تعلیم کو حاصل ہے۔ انیسویں صدی میں اس تعلیم کی رفتار بھی بڑھتی رہی اور اس کے اثرات گہرے بھی ہوتے گئے۔ اس میں بڑا حصہ مسیحی مشنوں کی کوششوں کا ہے، اگرچہ صدی کے اختتام پر حکمران قوت نے بھی سیکولر تعلیم کے لیے منظم کوششیں شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ بڑی حد تک غیر ہموار تھا، یعنی مختلف ملکوں اور مختلف عمرانی طبقوں میں اس کی حیثیت مختلف رہی۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہر مقام پر رسمی تعلیم دیسی باشندوں کی مقابلتاً تھوڑی تعداد تک محدود رہی۔ کوئی ایسا فارمولا موجود نہ تھا جس کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکتا کہ کسے تعلیم دی جائے۔ ہندوستان میں راجاؤں کے بیٹے آکسفورڈ پہنچ گئے، لیکن جو طبقۂ اوسط رفتہ رفتہ ابھر رہا تھا، اس کے بھی ذہین بچے آکسفورڈ ہی پہنچے۔ بیسویں صدی تک ہندوستان میں مغربی تعلیم ایسی صورت اختیار کر رہی تھی۔ جسے مغرب میں قابلیت و صلاحیت کے لیے ہر قسم کے مواقع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چین میں بھی اسی قسم کا عمل جاری رہا۔ وہاں اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ سن یٹ سین فخریہ کہا کرتا تھا:

---

[1] Cortes — ہسپانیہ کا منچلا آدمی جس نے میکسیکو فتح کیا (۱۴۸۵ء ـــ ۱۵۴۷ء)

[2] Pizarro — (۱۴۷۸ء ـــ ۱۵۴۱ء)، یہ بھی ہسپانوی تھا جس نے پیرو فتح کیا۔

کہ میں مُغلی ہوں اور قُلی کا بیٹا ہوں۔ اس میں امریکی انداز نمایاں ہے۔

بعض غیر یورپیوں نے مغربی تعلیم کی مخالفت کی اور وہ اپنی ثقافتوں کے قدیم اقدار پر جم گئے لیکن زیادہ تر تعلیم یافتہ دیسی باشندوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ان کے وطن صرف مغرب کی پیروی کرتے ہوئے صنعت و حرفت، فنکاری اور فوجی ہنرمندی میں مغرب سے تعلیم حاصل کر کے حقیقی آزادی لے سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں جن ہنرمندیوں پر مغربی سامراجی قبضہ مسلط تھا، اُن کے نئے تعلیم یافتہ طبقے آزادی کے لیے تڑپ رہے تھے۔ بیسویں صدی تک وہ انقلابی بن گئے۔ مغربی انقلابی روایات سے وہ پوری طرح آگاہ تھے اور انقلاب کے طور طریقوں میں کامل مہارت رکھتے تھے۔

قوم پروری کی توسیع

"سفید فام" اقوام کی برتری کے داعیوں نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ فرض کر لیا، یہ انقلابی دیسی آبادی ایک کا لعدم غیر نمائندہ اقلیت ہیں اور آبادی کے بہت بڑے حصّے، جو ناخواندہ اور غریب ہیں، اپنے دیسی تعلیم یافتہ طبقوں کے پیرو نہیں، صرف یہ چاہتے ہیں کہ مہربان "سفید فام" لوگ ان پر حکومت کرتے رہیں یقیناً محکوموں میں سے ہمیشہ کچھ لوگ "چچا ٹام" ہے۔ یہ اصطلاح امریکی حبشیوں نے اُن لوگوں کے لیے وضع کی، جو "سفید فام" لوگوں کی فرمانبرداری پر زیادہ مائل تھے، لیکن غیر مغربی آبادیوں کا بڑا حصّہ "چچا ٹاموں" کی وضع کا نہ تھا۔ بیشک آبادی کے بیشتر حصے آقاؤں کی زبان نہیں بولتے تھے، مگر وہ اپنی زبان میں بالکل ناخواندہ نہ تھے۔ وہ غریب بھی ہوں گے لیکن شہری آبادی اور ان کے بعد کسانوں کی بہت بڑی آبادی رفتہ رفتہ قوم پروری کے احساسات سے بہرہ مند ہو گئی۔ ان پر واضح ہو گیا کہ غیر ملکی ان کے ہم وطن نہیں اور ملکی تعلیم یافتہ طبقے کتنی ہی مدد لیتے ہوں، مگر ہیں صحیح راستے پر یعنی غیر ملکیوں کو نکل جانا چاہیے۔ خود سامراجی طاقتوں نے قوم پروری کی پختگی میں بڑی مدد دی۔ جہاں جہاں وہ گئے، وہاں حفظانِ صحت، طبابت، قانون اور نظم کے لیے بہت کچھ کیا۔ شرح اموات کم ہو گئی اور دیسی آبادی اس رفتار سے بڑھی جس کی مثال پہلے موجود نہ تھی، لیکن آبادی کی زیادتی ہی نے زیادہ بڑی تعداد کے لیے غذا مہیا کرنے کی ضرورت پیدا کر دی۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب پر آبادی کا دباؤ واضح ہو گیا۔ اگرچہ مغربیوں کی تعداد اتنی نہ تھی کہ مجموعی غذائی پیداوار کا کوئی قابلِ ذکر حصّہ صرف کر لیتے، لیکن مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے وہ اعتراضات کا ہدف بن گئے۔ مثلاً کینیا میں بالکل ظاہر تھا کہ گوروں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ اگر وہ قبضہ نہ کرتے تو ان زمینوں کی پیداوار سے حبشیوں کی شکم پُری ہوتی۔

مزید برآں تعلیم نے دیسی باشندوں کو وہ خاص صلاحیتیں دے دیں، جو گوروں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی مادی اشیاء اور دورِ حاضر کی پُرپیچ مشینری پر نظم و ضبط۔ دیسیوں نے ریل کے انجنوں، موٹروں، ہوائی جہازوں اور مشینری سے کام لینا سیکھ لیا۔ انھوں نے سائنس کا علم حاصل کیا اور انجینئری میں مہارت پیدا کر لی۔ انھیں صلاحیتوں کی بدولت سب چیزیں بنی تھیں۔ اس وجہ سے ان میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ وہ گوروں کے برابر ہیں۔ نہ صرف ذہن و جسم کے معاملات میں وہ طبعی حیثیت قبول کرنے سے رفتہ رفتہ منحرف ہوتے گئے کیونکہ اُن کے برابر پہنچ جاتے تھے۔

مغرب کا کام

آخر میں ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ مغربی ثقافت کے بڑے سرچشموں ـــــ مسیحیت، نیز ترقی، جمہوریت اور قومیت پر پختہ اعتقاد ـــــ نے سامراجی طور طریقوں کے لیے بہت کم غذا بہم پہنچائی۔ مغرب اپنے ہاں کی بڑی بڑی اخلاقی اور سیاسی تصانیف کو تعلیم یافتہ طبقے سے چھپا نہ سکا، بلکہ ان کے سامنے مسیحی بائبل، امریکہ کے اعلانِ آزادی، فرانسیسیوں کے اعلانِ حقوقِ انسانی اور کمیونسٹوں کے منشور کو فخریہ پیش کرتا رہا۔ دیسی باشندوں کو مسلسل تعلیم دی جاتی رہی کہ تمام انسان پیدائش میں برابر ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ "سفید فام لوگ سانولے یا سیاہ فام" لوگوں پر برتری اور حکمرانی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ مغربی جمہوری افکار کے اس بڑے سلسلے کے لیے ڈاروِن کے عمرانی پیروؤں اور گوروں کی برتری کے دوسرے داعیوں نے جو کچھ پیش کیا، وہ ہرگز توڑ نہیں بن سکتا تھا۔ جس حد تک اغراض و مقاصد کا تعلق ہے، مغربی سامراج کی ناکامی کے اسباب خود اس میں مضمر تھے۔

اس نتیجے کو اب کسی حد تک اعتدال کی صورت میں لے آنا چاہیے۔ بیسویں صدی کے وسط میں مغربی سامراج یقیناً پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا، مگر نہ وہ ختم ہوا ہے اور نہ مرا ہے۔ سامراج کے بندھن ڈھیلے ضرور ہو گئے ہیں، لیکن وہ تباہ نہیں ہوئے۔ قدیم سامراج ـــــ ایسی نوآبادیاں، جن کے بارے میں فیصلے سامراجی حکومتیں کریں ـــــ کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو برطانیہ، فرانس، بلجیم اور پرتگال کے قبضے میں وسیع علاقے ہیں، خصوصاً افریقہ میں، جو تابعیت کے مختلف درجوں میں ہیں۔ جمہوریۂ امریکہ کے پاس بھی بحرالکاہل میں چند چوکیاں ہیں، مثلاً گوآم[1] اور وہ جزیرے، جو دوسری عالمی جنگ میں جاپان سے لیے گئے، ابھی تک پرانی وضع کے مقبوضات اور جمہوریۂ امریکہ نے پورٹو ریکو کے درجے کا مسئلہ حل نہیں کیا۔ ہسپانیہ اور ہالینڈ کی سلطنت کے بھی کچھ اجزا باقی ہیں۔

زیادہ تر نوآبادیوں اور بعض اندرونی اعتبار سے خودمختار علاقوں میں بھی اب تک اقتصادیات کا درجہ اصولاً نوآبادیوں کا سا ہے، یعنی وہ خام مال بہم پہنچاتی ہیں اور بنی بنائی چیزیں لے لیتی ہیں اور ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا کہ مغربی طاقتوں اور ان کے سابقہ مقبوضات کے درمیان نئی قسم کے بندھنوں کا بڑا تجربہ ضرور ناکام ہو گا، مثلاً برطانوی دولتِ مشترکہ اور فرانسیسی یونین کا تجربہ۔ جو ڈھیلا ڈھالا بندھن ان گروہوں کو باہم وابستہ کیے ہوئے ہے، اس کی حیثیت پرانے سامراجی بندھن کی نہیں، لیکن یہ بندھن انھیں اکٹھا رکھنے کے لیے کافی ثابت ہو سکتا ہے اور یہ کاروبار کامیابی سے جاری رہ سکتا ہے۔

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ مغربی سامراج نے غیر مغربی ملکوں میں گہرا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ جو علاقے پہلے سامراجیوں کے قبضے میں تھے، ان کی وضع و ہیئت بھی مغرب کی توسیع، مغربی افراد، اشیاء اور افکار کی وسیع نقل و حرکت سے بالکل نئی ہو گئی ہے۔ مغرب زمین کا وارث نہ بنے گا، مگر اس نے زمین کے مستقبل پر اپنی چھاپ ضرور لگا دی ہے[2]۔

---

[1] Guam

[2] یہ چھاپ مغرب کے لیے مخصوص نہیں، جن قوموں نے دنیا میں اقتدار حاصل کیا، ان کی چھاپیں جابجا موجود ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان چھاپوں سے کون سی چھاپ عالمِ انسانیت کے لیے مفید و نفع بخش ثابت ہوئی اور کس چھاپ نے امنِ عالم کی خدمت انجام دی۔ یورپ کی چھاپ سے اب تک تفرقے، بربادی اور خونریزی کے سوا بظاہر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

دوسری عالمی جنگ اور بعد کا دور

تراسیواں باب

محوریوں کی ابتدائی کامیابیاں

(۱)

جنگ کی نوعیت

ہماری صدی کی پہلی عالمی جنگ اپنے خاص دائرے یعنی مغربی محاذ پر ایک طویل محاصرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس وقت سے فوجی ماہر اس جنگ کے مختلف پہلوؤں پر بار بار غور کرتے رہے۔ فرانس اور جرمنی نے صدی کے چوتھے عشرے میں مشترک سرحد پر استحکامات کے دو متقابل سلسلے قائم کر لیے۔ فرانس کی جانب خطِ میجینو[1] اور جرمنی کی جانب خطِ سیگ فریڈ[2] ان عارضی خندقوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پختہ و استوار تھے، جو ۱۹۱۴ء ـ ۱۹۱۸ء کی جنگ میں کھودی گئی تھیں۔ لہٰذا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑی تو اکثر لوگوں کو امید تھی اس کا فیصلہ اصلاً اسی علاقے میں ہوگا، جو جرمنی اور فرانس کے درمیان ہے۔ نیز اس کی حیثیت مغرب میں محض ایک محدود محاصرے کی ہوگی اور دنیا کے دوسرے حصوں میں اس طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے مختلف قسم کی سرگرمیاں جاری رہیں گی۔

لیکن جنگ چھڑی تو پھر ایک مرتبہ ثابت ہو گیا کہ بڑے بڑے انسانی معاملات میں پیشگوئیاں حقیقۃً خطرناک ہوتی ہیں۔ چونکہ جرمنی اپنے محوری رفیقوں، اٹلی اور جاپان سے مل گیا تھا، اس لیے پہلی جنگ کے مقابلے میں دوسری جنگ واقعی عالمی جنگ بن گئی۔ اس کا فیصلہ جس طرح مغرب میں ہوا، اسی طرح روس، بحرالکاہل، بلکہ بحیرۂ روم میں بھی ہوا اور یہ تاریخ میں کھلی نقل و حرکت کی ایک حد درجہ غیر معمولی جنگ تھی۔

نیز یہ ایسی جنگ تھی، جس میں طیاروں نے سب سے پہلے وسیع پیمانے پر حصہ لیا۔ اس کا اندازہ صدی کے چوتھے عشرے میں حبش اور ہسپانیہ کی جنگوں سے ہو چکا تھا۔ سمندروں میں بھی طیاروں نے ـــ خواہ ان کے اڈے خشکی پر تھے یا طیارہ بردار جہازوں پر ـــ بہت جلد ثابت کر دیا کہ بحری رزم و پیکار میں انھیں مرکزی عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ اکثر ماہرین کی رائے میں طیاروں نے بڑے بڑے جنگی جہازوں کو بیکار ثابت کر دیا تھا۔ خشکی میں طیارے بہت جلد برّی فوجوں کی قوت آتشبازی کا

---

[2] Seigfried Line

[1] Maginot Line

ایک لا ینفک بازو بن گئے۔ بڑی فوجوں کو اس بازو کی ضرورت تھی اور آگے چل کر اسے فوجوں کے ساتھ بڑی احتیاط سے مرتبط کر دیا گیا، لیکن اس جنگ میں بھی طیارے اُس کردار پر نہ پہنچ سکے جس کے متعلق پہلے سے ان کے حامیوں نے قیاسات قائم کر رکھے تھے، یعنی یہ جنگ کا واحد ذریعہ نہ بن سکے اور تمام دوسرے ذرائع پر فوقیت نہ لے جا سکے۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے بڑے امتحان میں ـــــ جب جرمنوں نے صرف طیاروں کی قوت پر برطانیہ کو مسخر کرنا چاہا ـــــ تنہا طیارے ناکافی ثابت ہوئے۔

فضائی بمباری ـــــ خصوصاً جنگ کے اختتام پر جرمنی کے راکٹ میزائل اور طیارہ رانوں کے بغیر ہوائی جہازوں نے جس کا سلسلہ جاری رکھا ـــــ نے یقیناً شہروں کی غیر مصافی آبادی کو رزم آرائی کے خطرات سے بُری طرح دوچار کیا۔ فوجی ماہرین کا رجحان اس طرف ہو گیا تھا کہ شہروں کی غیر مصافی آبادیاں فضائی بمباری کا مقابلہ نہیں کر سکیں اور جس ملک کے شہر تھوڑی مدت کے لیے بھی ایسی بمباری کا ہدف بنیں گے، وہ امن کے لیے درخواست پر مجبور ہو جائیں گے، لیکن یورپ اور ایشیا کی غیر مصافی آبادیوں نے ثابت کر دیا کہ وہ مہینوں تک بمباری کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جرمنی کے جو لوگ فضائی بمباریوں میں مرے، ان کی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ کیا گیا۔ مختلف اسباب کی بنا پر برلین اور ٹوکیو جیسے بڑے بڑے شہروں نے ثابت کر دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بمباری برداشت کر سکتے ہیں، مثلاً منظم طریق پر پناہ گاہیں بنا دی گئیں۔ آبادیوں کو جزواً منتشر کر دیا گیا پھر ہر شہر میں بازار، باغ، کلیسا اور سرکاری عمارتیں ہوتی ہیں، جو خاصی جگہ گھیر لیتی ہیں اور رات کو اس میں کوئی نہیں ہوتا۔ بمباری عموماً رات ہی کو کی جاتی تھی۔ یہ ایسا معاملہ تھا جس کا اندازہ پہلے کسی کو نہ تھا۔

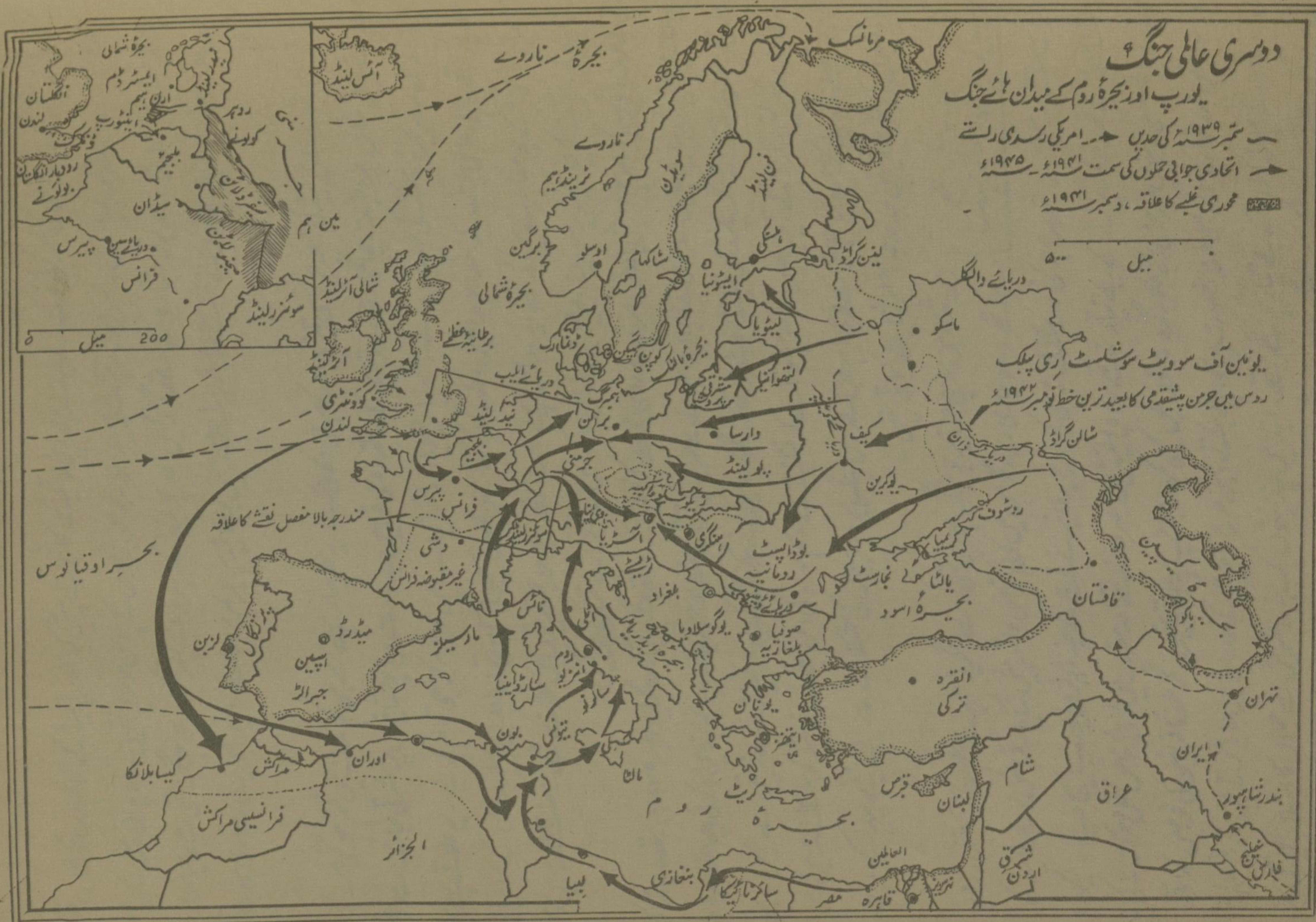
لیکن جنگ کے اختتام پر ایک فنی ایجاد بروئے کار آئی، جس سے جنگ کی عام حیثیت میں بہت بڑی تبدیلی ہو سکتی اور آگے چل کر اس ایجاد سے اتنی ناقابلِ برداشت تباہی پھیل سکتی ہے کہ جنگ بہت تھوڑی مدت میں ختم ہو جائے گی۔ یہ ایٹم یعنی جوہری بم تھا، جو امریکی اور برطانوی ماہروں نے خفیہ خفیہ تیار کیا۔ ۶؍ اگست سنہ ۱۹۴۵ء کو اسے جاپان کے شہر ہیروشیما[1] پر استعمال کیا گیا۔ صرف ایک بم نے نصف کے قریب شہر برباد کر دیا۔ تین روز بعد ناگاساکی[2] پر جو ایک پہاڑی شہر ہے دوسرا اور کسی قدر مختلف بم گرایا گیا، جس سے قدرے کم مادّی نقصان ہُوا، تاہم دونوں شہروں میں دونوں بموں سے ایک لاکھ سے زائد آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اس واقعے نے ہماری نظر میں ایٹم بم اور اس سے ہولناک تر ایجادات کے متعلق بالکل بجا خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔

پولینڈ اور فنلینڈ کی مہمیں عالمی جنگ کی پہلی مہم ایسے نتیجے پر پہنچی، جو غیر متوقع نہ تھا۔ کسی بھی سنجیدہ آدمی کی یہ رائے نہ تھی کہ تنہا پولینڈ زیادہ مدت تک جرمنی کی مسلّح قوت کا مقابلہ کر سکتا ہے یا برطانیہ و فرانس اپنے حلیف پولینڈ کی امداد کے لیے تیزی سے خاصی مدد بہم پہنچا سکتے ہیں، لیکن جرمن فتوحات کی تیزی نے تقریباً

---

[1] Heroshema

[2] (Nagasaki)


دوسری عالمی جنگ
یورپ اور بحیرۂ روم کے میدان ہائے جنگ
ستمبر ۱۹۳۹ء کی حدیں
امریکی رسدی راستے
اتحادی جوابی حملوں کی سمت ۱۹۴۱ء - ۱۹۴۵ء
محوری غلبے کا علاقہ، دسمبر ۱۹۴۱ء
میل
۵۰۰
یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک
روس میں جرمن پیشقدمی کا بعید ترین خط نومبر ۱۹۴۲ء
مندرجہ بالا مفصل نقشے کا علاقہ
میل
200
0
بحیرۂ ناروے
آئس لینڈ
مرمانسک
ناروے
سویڈن
فن لینڈ
ہلسنکی
لینن گراڈ
ماسکو
دریائے والگا
اوسلو
برگین
بحیرۂ شمالی
شمالی آئرلینڈ
آئرلینڈ
برطانیۂ عظمیٰ
کوونٹری
لندن
سٹاک ہوم
ایسٹونیا
لیتھوانیا
کوپن ہیگن
ڈنمارک
بحیرۂ بالٹک
ہمبرگ
برلن
دریائے ایلب
وارسا
پولینڈ
کیف
یوکرین
سٹالن گراڈ
روستوف
ہالینڈ
بلجیم
پیرس
فرانس
وشی
غیر مقبوضہ فرانس
جرمنی
آسٹریا
ہنگری
بوڈاپسٹ
رومانیہ
بخارسٹ
یالٹا
بحیرۂ اسود
قفقاز
بحیرۂ کیسپین
باکو
بحر اوقیانوس
میڈرڈ
اسپین
جبرالٹر
لزبن
مارسیلز
اٹلی
روم
سارڈینیا
بلغراد
یوگوسلاویا
صوفیا
بلغاریہ
یونان
ایتھنز
کریٹ
انقرہ
ترکی
تہران
ایران
شام
عراق
لبنان
قبرص
اردن شرقی
بندر شاہپور
خلیج فارس
کیسابلانکا
فرانسیسی مراکش
الجزائر
اوران
تیونس
مالٹا
بحیرۂ روم
بن غازی
لیبیا
مصر
قاہرہ
العلمین
انگلستان
لندن
ایمسٹرڈم
روڈیام
کولون
بلجیم
سیڈان
دریائے سین
پیرس
فرانس
سوئٹزرلینڈ

سب کو متحیر کر دیا۔ جرمنی کی فضائی قوت نے بہت جلد اپنی فائقیت کا ثبوت پیش کیا اور پولینڈ کے تمام وسائل حمل و نقل درہم برہم کر ڈالے۔ غوطہ خور بمباروں نے ہر طرف دہشت پھیلا دی۔ جرمن فوجوں کے پاس موٹریں تھیں۔ وہ پرانی وضع کے مسلح پولستانیوں کی صفوں میں سے برق رفتاری کے ساتھ گزر گئیں اور پولینڈ کے ہر طرف پھر نکلیں۔ یہی جنگ تھی، جسے جرمنوں نے برق رفتار جنگ قرار دیا۔ جرمنوں نے سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۱ء میں برطانیہ پر جو بم برسائے، انھیں بھی برق رفتاری ہی سے تعبیر کیا گیا۔

جرمنوں نے پولینڈ کی تسخیر میں اتنی تیزی اور کامیابی دکھائی — یہ مہم چار ہفتے سے بھی کم مدت میں ختم ہو گئی — کہ ہٹلر کے نئے رفیق سٹالن پر دہشت چھا گئی۔ اس نے تیزی کے ساتھ روسی فوجیں بے دست و پا پولستانیوں پر مشرقی جانب سے دھکیل دیں۔ روس نے بحیرۂ بالٹک کی جمہوریتوں — اسٹونیا، لیٹویا اور لتھوانیا — میں فوجی مرکز بھی قائم کر لیے۔ یہ علاقے پہلے روسی صوبے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر انھیں الگ کیا گیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں اور دیو پیکر روس کے درمیان "امدادِ باہمی" کے جو معاہدے ہوئے تھے، یہ دراصل پہلے فانے تھے، جو ان جمہوریتوں میں ٹھونکے گئے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں روس نے ان پر پورا قبضہ کر لیا۔ پھر یہ سوویٹ یونین میں شامل ہو کر اس کے اجزائے ترکیبی بن گئیں۔

جرمنی کے خوف یا توسیع کی سامراجی خواہش یا دونوں چیزوں نے روسی لیڈروں کو فنلینڈ کے ساتھ جنگ پر آمادہ کر لیا (نومبر ۱۹۳۹ء) مقصد یہ تھا کہ بحیرۂ بالٹک میں مزید مرکز بنا لیے جائیں۔ روسیوں نے غالباً اپنے چھوٹے سے حریف کی قوت کا غلط اندازہ کر لیا تھا، چنانچہ ابتدا میں وہ کوئی اچھا مظاہرہ نہ کر سکے، لیکن مارچ سنہ ۱۹۳۹ء تک باشندگانِ فنلینڈ مقابلے میں تھک گئے۔ روسیوں نے مرکز حاصل کر لیے اور فنلینڈ سے وہ زمینیں لے لیں، جو ان کے بڑے شہر لینن گراڈ کے قریب تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فنلینڈ سے موسم سرما کی اس جنگ نے ہٹلر کو سنہ ۱۹۴۱ء میں روس پر منحوس فیصلے کے لیے آمادہ کیا۔ جرمنی کے فوجی ماہروں نے اس جنگ میں روسیوں کی مشکلات سے ایسے نتیجے پیدا کیے، جن سے روسیوں کی جنگی صلاحیتیں حد درجہ ناقص ثابت ہوتی تھیں۔

مغرب میں برق رفتار جنگ

اس اثناء میں مغربی محاذ پر جو جنگ ہو رہی تھی، اسے انگریز "برائے نام جنگ" قرار دے رہے تھے۔ وہ جاری رہی، مگر اس میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ فرانس اور برطانیہ کی نقل و حرکت سنہ ۱۹۱۴ء کی طرح شروع ہو گئی اور سنہ ۱۹۱۴ء ہی کی طرح برطانیہ نے فوج کے چند ڈویژن یورپ بھیج دیئے، لیکن جرمن سنہ ۱۹۱۴ء کے نمونے کو دہرانے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ پولینڈ میں مصروف تھے اور مغرب میں کوئی خاص نقل و حرکت نہ کی۔ خطِ میجینو کے فرانسیسی دستوں اور جرمنی کے طلایہ گرد دستوں میں کبھی کبھار جھڑپ ہو جاتی تھیں۔ مگر عموماً فریقین کی فوجیں کھاتی پیتیں، سو رہتیں اور مختلف لوگ اسی طرح رخصت پر بھی چلے جاتے، جس طرح تربیت کے دوران میں جایا کرتے ہیں۔ فرانسیسی اور برطانوی شہر دشمن کے ہوائی حملوں کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ابتدا میں چند ہفتوں تک بڑی تشویش سے حملوں کا انتظار کیا گیا، پھر پابندیاں کم ہو گئیں، البتہ دونوں ملکوں میں جنگی سامان زور شور سے تیار ہوتا رہا۔ برطانیہ نے غالباً — ہوائی قوت سنہ ۱۹۴۰ء

کے موسم گرما میں جنگی جہازوں سے بہت محروم تھی ـــــ اس فرصت کے اندر ہوائی جہاز بنانے پر خاص توجہ مبذول رکھی ۔ کیونکہ فتح و شکست اسی پر موقوف تھی ۔

تاہم جرمن مغرب میں دفاعی جنگ پر اکتفا کے لیے تیار نہ تھے اور موجودہ دور کی جنگوں میں بھی موسم سے کامل بے پروائی اختیار نہیں کی جا سکتی ۔ موسم سرما شروع ہو گیا تھا اور جرمن اس موسم میں فیصلہ کن مہم شروع کرنے پر آمادہ نہ تھے ۔ وہ موسم بہار کے انتظار میں رہے ۔ اپریل میں انھوں نے ۱۹۱۴ء کے برعکس شمالی بازو کو مستحکم کرنے کے لیے ڈنمارک اور ناروے پر اچانک بحری اور ہوائی حملے کر دیے ۔ ڈنمارک بالکل تیار نہ تھا اور تقریباً کسی مزاحمت کے بغیر مسخر ہو گیا ۔ ناروے بھی تیار نہ تھا ، مگر اس نے جرأت و مردانگی دکھائی ۔ برطانیہ اور فرانس وہاں محض برائے نام کمک پہنچا سکے ۔ اواخر اپریل تک ناروے کی قابل ذکر مزاحمت ختم ہو گئی ۔ جرمنوں کو برطانیہ کے خلاف اقدام کے لیے طیاروں اور آبدوزوں کے نہایت عمدہ مرکز مل گئے ۔

۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو انتباہ کے بغیر زبردست ضرب لگائی گئی ۔ جرمن فوجوں نے بلجیم اور ہالینڈ پر حملہ کر دیا ۔ فضائی قوت نے فوج کی شاندار اعانت کی ۔ ہالینڈ ۱۹۱۴ء میں محفوظ رہا تھا ، مگر اس مرتبہ جرمنوں نے بھی اسے نہ چھوڑا تاکہ ان کے شمالی بازو کی دہری مدافعت کا انتظام ہو جائے ۔ بلجیم کا کلیدی قلعہ ایبن ایمائل[1] تھا ۔ اس پر بڑی احتیاط سے منصوبہ بنا کر حملہ کیا گیا ۔ جرمنی کے اندر ایک فرضی قلعہ بنا کر اس پر حملے کی مشق کر لی گئی تھی ۔ یہ حملہ فوراً کامیاب ہوا اور ہالینڈ اور بلجیم کے دروازے کھل گئے ۔ صدی کے چوتھے عشرے میں عام حالت کمزوری کی تھی ۔ بلجیم اور ہالینڈ چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو جرمنی کی دستبرد سے بچائے رکھیں ۔ چنانچہ وہ فرانس اور برطانیہ کے ساتھ مل کر امکانی جرمن حملے کے خلاف کوئی منصوبہ بنانے پر راضی نہ ہوئے ۔

برطانیہ اور فرانس اس شمالی بازو کی حفاظت مؤثر طریق پر نہ کر سکے ۔ یہی امر جرمنی کی کامیابی کا سب سے بڑا باعث بن گیا ۔ اگرچہ اس وقت سے اب تک خط میجینو کی ذہنیت کے خلاف بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جرمنوں نے خط میجینو پر براہ راست حملہ نہ کیا ، بلکہ وہ ایک اہم نقطے سے گزر کر خط میجینو کو بائیں طرف چھوڑتے ہوئے فرانس اور بلجیم کی سرحد میں داخل ہو گئے ۔ یہاں آردینس[2] کا پہاڑی علاقہ واقع تھا ۔ اسی علاقے سے جرمنی کے بہترین موٹر سوار دستے فرانس میں داخل ہو گئے ۔ پھر ایک برق رفتار جنگ شروع ہوئی ۔ جس کی تیاری ۱۹۱۴ء کے تجربات کی بنا پر کی گئی تھی ۔ جرمنوں نے پیرس پر بڑھنے کی خواہش قابو میں رکھی اور وہ شمالی فرانس سے ہوتے ہوئے رودبار کی طرف بڑھے ۔ وہاں بولون کی بندرگاہ ۲۶ مئی کو ان کے قبضے میں آ گئی ، حالانکہ اس وقت مہم کو شروع ہوئے دو ہفتے سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی ۔ جرمنوں کی اس

ل Eben Emael

ل۲ Ardennes

ضرب نے برطانیہ اور بلجیم کی فوجوں، نیز فرانسیسی فوجوں کے ایک حصے کو فرانسیسی فوجوں کے بڑے حصے سے الگ کر دیا، جو جنوبی جانب تھا۔ جرمنی کے اس حملے کا اثر برطانیہ پر یہ پڑا کہ نیویل چیمبرلین کی جگہ ونسٹن چرچل کو وزیراعظم بنا دیا گیا اور چند روز بعد فرانس نے جنرل گامیلن[1] کی جگہ جنرل ویگاں[2] کو سپہ سالار اعظم بنا دیا۔

نئے لیڈروں نے نہایت نازک وقت میں جرمنوں کے موٹر سوار دستوں کی پیشقدمی روکنے کی غرض سے شمال و جنوب میں متحدہ منصوبہ تیار کرنے کی کوشش کی، لیکن بلجیم کی فوجیں بری طرح منتشر ہو چکی تھیں، لہٰذا وہ حوالگی پر آمادہ ہو گیا۔ فرانس اور برطانیہ بھی متحدہ حرکت کا انتظام نہ کر سکے۔ مئی کے اواخر اور جون کے اوائل میں برطانیہ نے ایک اعجاز نما کارنامہ انجام دیا، یعنی دو لاکھ پندرہ ہزار برطانوی فوج اور ایک لاکھ بیس ہزار فرانسیسی فوج کو ڈنکرک[3] (جو فرانس کے شمالی گوشے میں واقع ہے) اور آس پاس کے علاقوں سے اٹھا کر سمندر کے راستے برطانیہ پہنچا دیا۔ ہر قسم کے جہازوں کا ایک غیر معمولی بیڑا تیار ہوا جس میں نجی کشتیاں اور موٹر سے چلنے والی کشتیاں بھی شامل تھیں، انھی میں فوجیوں کو سوار کرا کرا کے نکال لیا گیا۔ برطانوی فضائی قوت نے اس بیڑے کی حفاظت کا فرض انجام دیا، البتہ ہر قسم کا ساز و سامان چھوڑنا پڑا۔ ڈنکرک کا واقعہ ایک اولو العزمانہ کارنامہ تھا۔ اس سے برطانوی حوصلہ مندی کو بڑی تقویت پہنچی۔ جرمنی کی شکست کے بعد جو جرمن دستاویزیں اتحادیوں کے قبضے میں آئیں، ان سے بخوبی ثابت ہو گیا، یہ کارنامہ صرف اس وجہ سے انجام پا سکا۔ کہ ہٹلر نے فیصلہ کر لیا تھا، برطانیہ کی جو فوجیں ساحل پر گھر گئی ہیں، انھیں تباہ نہ کیا جائے، کیونکہ اس کے نزدیک برطانیہ سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔ آخری لمحے میں ہٹلر بھی پیرس کے جادو سے مسحور ہو گیا اور اس نے براہِ راست فرانس کے اندر پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ یہاں اسے تیزی سے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ فرانسیسی فوجیں ویگاں کی سرکردگی میں کچھ نہ کر سکیں اور جرمن فوجیں بلا مزاحمت جنوب کی طرف بڑھتی گئیں۔ ۱۲۔ جون کو دنیا پر آشکارا ہو گیا کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی طرح دریائے مارنے پر روک تھام کا واقعہ دہرایا نہ جائے گا۔ فرانس نے پیرس کو کھلا شہر قرار دے دیا اور اسے جنگ کے بغیر خالی کر دیا۔

---

[1] Gamelin — [2] Weygand — [3] Dunkirk

محوریوں کی ابتدائی کامیابیاں

(۲)

سقوطِ فرانس

یوں فرانس کی جنگ کا فیصلہ وسط جون میں ہوگیا، لیکن فرانسیسی جنوبی حصّے کے دفاع میں لڑ سکتے تھے۔ اس میں بھی ناکام رہتے تو اپنے جنگی اور تجارتی جہازوں کے ذریعے سے فوج نکال کر شمالی فرانسیسی افریقہ پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سمندر پار کی بڑی سلطنت میں بیٹھ کر انگریزوں کی امداد سے جرمنوں کے خلاف جنگ جاری رکھ سکتے تھے۔ بعض فرانسیسی لیڈروں کی خواہش یہی تھی اور بحرانی حالت میں چرچل نے حکومت فرانس کے سامنے یہ غیر معمولی پیشکش کی تھی کہ جنگ جاری رکھنے کے لیے دونوں ملکوں کی حکومتیں کاملاً متحد ہو جائیں، لیکن یہ پیشکش مانی نہ گئی۔

۱۶ جون کو ایک قسم کے فوجی اقدام کے ذریعے سے وزیر اعظم رینا[۱] کی جگہ مارشل پیتاں[۲] نے لے لی۔ پیتاں اور اس کے رفیق ہر قیمت پر صلح کا فیصلہ کر چکے تھے اور انھوں نے صلح کر لی۔ ۲۲ جون سنہ ۱۹۴۰ء کو بمقام کمپینی[۳] متارکے پر دستخط ہو گئے۔ یہ وہی مقام تھا، جہاں ۱۱ نومبر سنہ ۱۹۱۸ء کو متارکے پر دستخط ہوئے تھے۔ ساتھ ہی فرانس جنگ سے دستکش ہوگیا اور اس کا ۳/۵ حصہ، جس میں اطلانطک اور رودبار کے پورے ساحل شامل تھے، جرمنوں کے قبضے میں دے دیا گیا۔ وسطی فرانس اور اس کا جو حصہ بحیرۂ روم پر واقع تھا، اس پر جرمنوں کی کڑی نگرانی قائم ہو گئی۔ اس حصے پر، جو براہ راست جرمنوں کے قبضے میں نہ تھا، مارشل پیتاں نے ایک مطلق العنان اور غیر جمہوری حکومت قائم کر لی، جس کا رئیس وہ خود تھا۔ اس حکومت کا مرکز وشی[۴] تھا، جو ایک صحت افزا مقام سمجھا جاتا ہے اور تاریخ میں اس حکومت کو حکومتِ وشی قرار دیا گیا۔

۱۔ Reynaud

۲۔ Petain

۳۔ Compiegne

۴۔ Vichy فرانس کے اس شہر کی آب و ہوا بڑی صحت بخش مانی جاتی ہے، نیز یہاں قدرتی گرم چشمے ہیں اور یہاں کا پانی بہت مشہور رہے۔

مارشل پیتان کے بعض رفیق یقیناً جرمنوں کے حامی تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جرمنوں نے جو مطلق العنان نظام حکومت قائم کیا ہے، وہی آئندہ چل سکے گا، مگر اب دُنیا بھر پر ظاہر ہو چکا ہے کہ ان میں سے اکثر نے ـــــ جن میں لاوال[1] بھی شامل تھا، جسے حکومتِ وشی میں بلند حیثیت حاصل تھی، بلکہ پیتان بھی شامل تھا ـــــ جون کے اس حیران کن دور میں صرف اس لیے صلح کرلی کہ ان کے نزدیک یہ ناگزیر ہو گئی تھی۔ ان پر آشکارا ہو چکا تھا کہ ہٹلر نے جنگ میں فتح حاصل کرلی ہے۔ وہ جان چکے تھے کہ برطانیہ کے لیے جرمنی کی جنگی مشین کا کامیاب مقابلہ کرنے کی کوئی صورت نہیں، جس نے فرانس کو کچل کر رکھ دیا۔ اس عقیدے میں فرانسیسیوں کی بہت بڑی اکثریت ان کی ہمنوا بن گئی۔

ایک چھوٹی سی جماعت نے جس کا رئیس جنرل ڈیگال[2] تھا، سربہ خم ہونے سے انکار کر دیا۔ ڈیگال ہوائی جہاز میں سوار ہو کر لندن پہنچا۔ وہاں اس نے جلاوطن فرانسیسیوں کی ایک قومی مجلس بنالی اور حکومتِ وشی سے تعلقات منقطع کرلیے۔ فرانسیسیوں کی جس فوج کو ڈنکرک سے بچا کر انگلستان پہنچایا گیا تھا، اس سے آزاد فرانسیسی فوج مرتب ہوئی۔ اس فوج میں پناہ گزینوں کے وہ گروہ شامل ہوتے رہے جو رفتہ رفتہ انگلستان پہنچے۔ آئندہ چند ماہ میں اس آزاد فرانسیسی گروہ نے اپنی بعض نوآبادیاں سنبھال لیں، اگرچہ شمالی افریقہ کے زیادہ مستحکم حصے ان کے قبضے میں نہ آئے۔ بلاشبہہ یہ آزاد فرانسیسی گروہ ابتدا میں کمزور تھا، مگر ان کی وجہ سے ایک مرکزِ اجتماع قائم ہو گیا تھا اور انھوں نے انگلستان میں ریڈیو کا نہایت عمدہ انتظام کرلیا، جس سے جرمنوں اور حکومتِ وشی کے خلاف پُرزور پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ اس طرح فرانس کو دوبارہ شاملِ جنگ ہونے کیلئے تیار کیا گیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں سقوطِ فرانس کے وجوہ غالباً پوری طرح کبھی سمجھ میں نہ آئیں گے اور تاریخی علت و معلوم کے ایسے پُرپیچ مسائل میں عموماً یہی صورت پیش آتی ہے، مگر ہمارے سامنے ایسے حالات کا خاصا سلسلہ موجود ہے، جس کی بنا پر یہ اثر زائل کیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں فرانس بہت خستہ حال تھا، اس کی ذہنیت ابتدا ہی سے شکست خوردہ تھی اور وہ سنہ ۱۹۱۴ء کے طور طریقوں پر انحصار میں فرسودگی کی آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ یقیناً فرانس کو جس قسم کی جنگ سے سابقہ پڑا، اس کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ اس کے پاس فضائی قوت اور مشینی جنگ کی بڑی کمی تھی۔ ملک میں شدید اختلافِ رائے تھا۔ اونچے طبقے کو یہ یقین ہی نہ تھا کہ جنگ ضروری ہے اور سرگرم کمیونسٹ اقلیت نے سنہ ۱۹۴۰ء میں وہ طریقِ عمل اختیار کرلیا تھا، جو ہٹلر اور سٹالن کے میثاق کے بعد کمیونسٹ پارٹی نے طے کرلیا تھا۔ یہ لوگ غداری کرتے ہوئے جنگ کی مخالفت کر رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ فرانس کی مادی اور روحانی قوت کا بڑا حصہ کھا چکی تھی۔ بہ ایں ہمہ مئی اور جون سنہ ۱۹۴۰ء کی مہم یاس انگیز حد تک یک طرفہ نہ تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی فوجی شکست کے سلسلے میں متعدد واقعات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، مثلاً بلجیم کی یکایک علٰحدگی، خطِ میجینو کے شمالی حصے کی کمزوری۔ فرانس کی نویں فوج، جو آردونس سے آنے والی جرمن فوج کے مقابلے میں تھی،

---

[2] De Gaulle

[1] Laval

دفاع میں ناکامی اور ہزاروں دوسرے حوادث، جو تین ہفتے کی مہلک مدت میں پیش آئے۔

۱۰۔ جون کو ہٹلر کے حلیف مسولینی نے اطالویوں کو برطانیہ اور فرانس کے خلاف جنگ کا حکم دے دیا تھا، اگرچہ یہ حکم اتنا متاخر دیا گیا کہ اس سے جنگِ فرانس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ یہ پشت میں چھرا بھونکنے کا واقعہ اہلِ امریکہ کے لیے زیادہ جراحتِ قلب کا موجب بن گیا۔ وہ پہلے ہی نازیوں کی کامیابی پر چوکنے ہو گئے تھے۔ اب اٹلی بھی جنگ میں شامل تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسی کامیابی حاصل کرے، جو جرمن حلیف کی کامیابیوں میں مستحق توجہ بن سکے۔ اس وقت تک جنگ صرف شمالی و مغربی یورپ میں محدود تھی، اب بحیرۂ روم بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

جنگِ برطانیہ

جرمنوں نے منصوبہ بندی اور اس پر عمل کے محیّر العقول کارنامے دکھائے تھے، مگر برطانیہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی تجویز تیار نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے، ہٹلر کو یقین تھا کہ فرانس جنگ سے دستکش ہو جائے گا تو برطانیہ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ جداگانہ صلح کر لے گا، مگر ایسی صلح جس میں براعظم یورپ پر جرمنی کو اقتدار حاصل ہو گا اور برطانیہ اپنی سمندر پار سلطنت پر قانع رہے گا۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے اس منصوبے کا ذکر ہٹلر کھلم کھلا اور نجی طور پر بار بار کر چکا تھا اور وہ کہتا تھا کہ اسے حد درجہ اطمینان بخش سمجھنا چاہیے، لیکن چار صدیوں سے زیادہ مدت گزر چکی تھی کہ برطانیہ نے ہمیشہ مغربی اور مرکزی یورپ پر ایک طاقت کے اقتدار کی مخالفت میں جنگ کو ترجیح دی اور ہٹلر کو سقوطِ فرانس کے بعد ایسا ہی اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ لہٰذا برطانیہ نے اس کی ان مصالحانہ تجاویز پر کوئی توجہ نہ کی۔

ہٹلر کو یہ بھی یقین تھا کہ جرمن آبدوزیں آگے چل کر برطانیہ کی غذائی رسد اور خام مال کی درآمد روک دیں گی اور بھوک سے مجبور ہو کر برطانیہ صلح پر آمادہ ہو جائے گا، مگر اس میں بہرحال وقت لگتا اور ہٹلر بڑا بے تاب تھا۔ اس کے لیے بدیہی اقدام یہ تھا کہ انگلستان میں فوج اتارنے کی کوشش کرتا، مگر جرمنوں نے خشکی اور تری کی ملی جلی جنگ کے لیے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی۔ ان کے پاس فوجیں اتارنے والے خاص جہاز بھی نہ تھے۔ مزید برآں جرمنوں کی بحری قوت اور فضائی قوت کے درمیان شدید اختلافِ رائے تھا کہ رودبار پار حملے کے لیے مل جل کر کام کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ مختلف قسم کے جہاز عجلت سے اکٹھے کر کے فوج بھیجنے کا جو انتظام کیا گیا، اسے برطانیہ کی ہوائی قوت نے اگست سنہ ۱۹۴۰ء کے اوائل میں سخت نقصان پہنچایا۔ ہٹلر اور اس کے فضائی مارشل گوئرنگ نے آخر یہ خطرناک فیصلہ کیا کہ فضائی حملوں سے کام لیا جائے۔

اس کے بعد برطانیہ کے لیے جو جنگ شروع ہوئی، اس کے دو بڑے پہلو ہیں۔ پہلے اگست اور ستمبر میں جرمن فضائی قوت نے دن دہاڑے بمباری شروع کی۔ مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کے ہوائی اڈے اور جنگجو جہاز صفحۂ ہستی سے محو کر دیے جائیں۔ برطانیہ کی فضائی قوت کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا گیا تھا اور اس کی قیادت کا انتظام بہت اچھا تھا۔ پھر رڈار لہ کے ذریعے سے

لہ Radar

حملہ آوروں کا سراغ بہت پہلے لگایا جا سکتا تھا۔ اس دور میں برطانیہ کی فضائی قوت جرمنوں کی مزاحمت میں بڑی زبردست ثابت ہوئی، لیکن وہ بمشکل مزاحمت کر سکے۔ ۱۶ ستمبر کی بحرانی جنگ میں ایک سو پچاسی جرمن جہاز مار گرائے گئے۔ گوئرنگ کے نزدیک جرمن یہ نقصان برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چرچل نے اپنے ہمیشہ زندہ رہنے والے ایک فقرے میں برطانوی جنگی پائیلٹوں سے کہا: "کبھی ایسی صورت پیش نہیں آئی کہ خلق خدا کی بہت بڑی تعداد تھوڑے سے افراد کی اس قدر ممنون ہوئی ہو۔"

دوسرا دور سنہ ۱۹۴۰ء کے موسم خزاں میں شروع ہوا۔ اب جرمنوں کی کوشش یہ تھی کہ رات کو بڑے بڑے برطانوی صنعتی مرکزوں پر حملے کئے جائیں تاکہ برطانوی سامان کی تیاری ختم ہو جائے اور غیر مصافی آبادی دہشت زدہ ہو رہ جائے۔ اس طرح حکومت خود بخود صلح کی درخواست پر مجبور ہو جائے گی۔ ان میں سے کوئی بھی مقصد پورا نہ ہوا۔ کوونٹری[1] میں بھی، جو صنعتی کارخانوں کا بہت بڑا مرکز تھا، جرمنوں کو ناکامی ہوئی۔ بیشک کوونٹری کو بڑا نقصان پہنچا، مگر صنعتی کام بدستور جاری رہا۔ باقی رہی غیر مصافی آبادی کی ہمت اور اخلاقی بلندی تو حقیقت یہ ہے کہ اس بمباری نے انگریزوں کے عزم مزاحمت کو تقویت پہنچائی۔ غیر مصافی آبادی کی حفاظت کے لیے جو تدبیریں اختیار کی گئی تھیں، وہ افراد اور املاک کو انتہائی بربادی سے محفوظ رکھنے کے لیے مؤثر ثابت ہوئیں، ورنہ سب کچھ تباہ ہو جاتا اور مزاحمت کا عزم بھی باقی نہ رہتا۔ موسم سرما تک برطانیہ کے لیے جنگ میں انگریز کامیاب ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں انھیں سستانے کی فرصت ملی۔

بحیرۂ روم اور بلقان کی مہمیں

اب ہٹلر کو ایک طویل وقفے سے سابقہ پڑا۔ زمانۂ ماضی کے فاتحین میں سے نپولین جیسے لوگوں کو اس سے شاذ ہی سابقہ پڑا تھا۔ پہلے ہٹلر نے نپولین کی طرح یہ بدیہی منصوبہ تیار کیا کہ برطانیہ پر بحیرۂ روم میں ضرب لگائے، جو ہندوستان اور مشرق کی طرف برطانیہ کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہٹلر کا حلیف مسولینی بحیرۂ روم میں توسیع کے لیے مضطرب تھا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں اس نے البانیہ سے یونان پر حملہ کر دیا، مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ ہٹلر اس دائرے میں کس حد تک الجھنا چاہتا تھا۔ یقیناً اس نے ہسپانیہ کے ذریعے سے جبل طارق کے برطانوی حصار پر حملے کا خیال پیش نظر رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ مشرقی بحیرۂ روم پر محوریوں کے حملے ساتھ ادھر بھی لڑائی شروع کر دی جائے تاکہ برطانیہ اس سمندر سے بالکل خارج ہو جائے، لیکن ہسپانیہ کے ڈکٹیٹر فرنکو نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ ہسپانیہ میں سے جرمن فوجیں گزارنے کے لیے فرانس کا کچھ حصہ اسے دیا جائے۔ ہٹلر یہ بھاری قیمت ادا کرنے کو تیار نہ تھا اور اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس طرح وشی کی حکومت خلاف ہو جائے گی اور فرانسیسی شمالی افریقہ اس وقت اسی کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ جرمنوں کو یونان میں مسولینی کی حمایت اور لیبیا میں اطالوی نوآبادی سے مصر پہ حملے کے

---

[1] Coventry وارک شائر (انگلستان) کا ایک مشہور شہر، جو برمنگھم سے انیس میل جنوب مشرق میں ہے۔

لیے قناعت کرنی پڑی۔ برطانیہ اور فرانس کے خلاف مشرق قریب میں وہاں کے باشندوں کو اٹھانے کے لیے جو کوششیں کی گئیں، وہ کسی خاص مشکل کے بغیر دبا دی گئیں۔ ترکی سختی سے غیر جانبداری پر قائم رہا۔

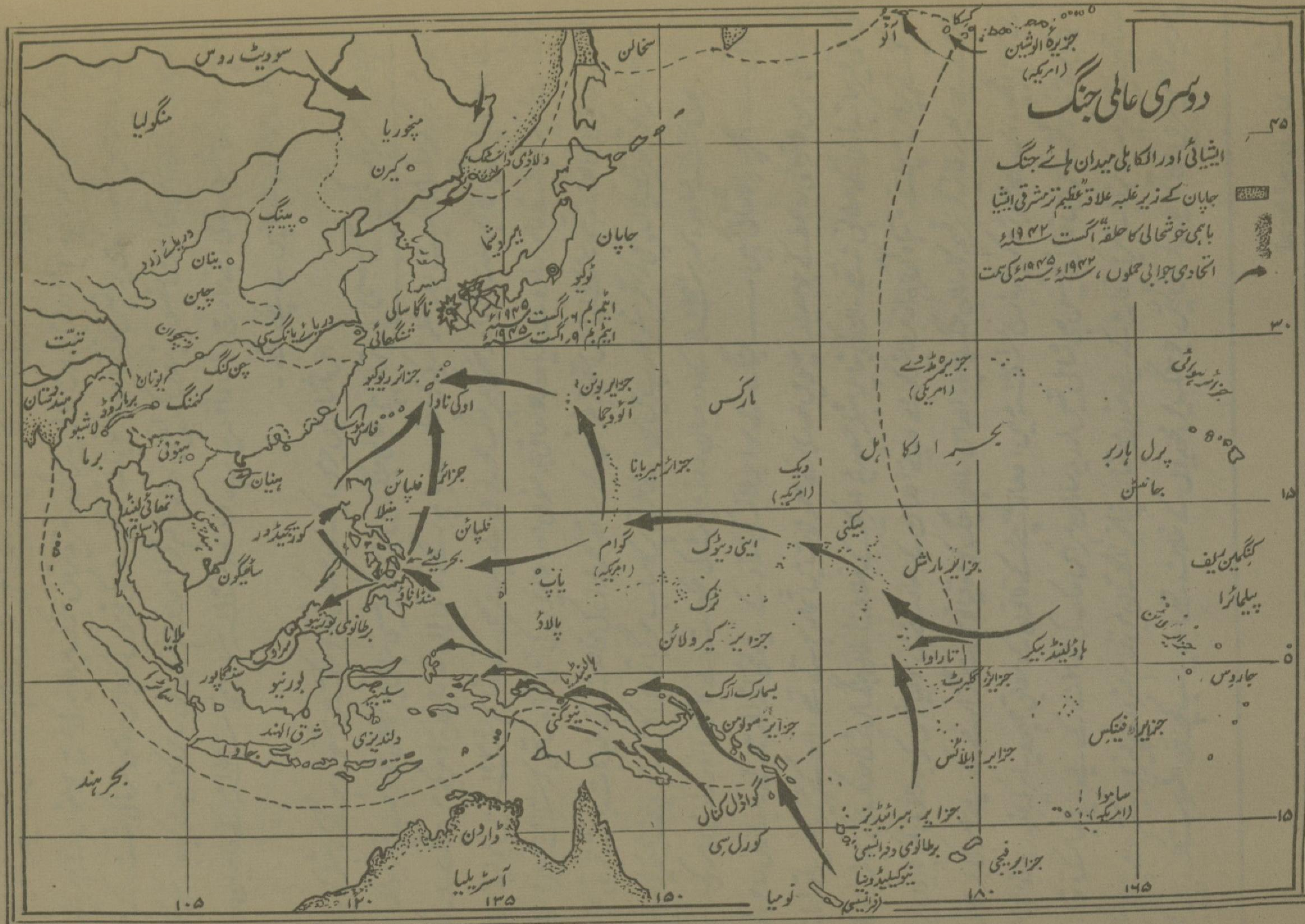
بہ ایں ہمہ جرمنوں نے یونان میں اطالویوں کی امداد کے لیے جو وعدے کیے تھے، انھیں پورا کرنے کے لیے خاصے جرمن ڈویژن ۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں بھیجنے پڑے۔ جرمنوں نے یوگوسلافیہ میں سے گزرنے کی کوشش کی۔ وہاں دیسی باشندوں نے چھاپا مار جنگ شروع کر دی۔ اس میں جرمنوں کا بھاری نقصان ہوا۔ برطانیہ نے اپنے یونانی حلیفوں کی امداد میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا، مگر پھر ایک مرتبہ ثابت ہوا کہ وہ جتنے قوی ہونے چاہییں تھے، نہیں ہوئے تھے۔ جزیرہ کریٹ کے اُس پاس کے سمندر میں برطانیہ کی جو بحری قوت تھی، اس پر جرمن ہوائی جہازوں نے خاصی ضرب لگائی۔ جون تک محوری یونان اور اس کے جزیروں میں پوری کامیابی حاصل کر چکے تھے۔

روس پر حملہ

۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں جرمن فوجوں کو ایک اور کام کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، یعنی روس کی تسخیر۔ ہٹلر پختہ ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ وہ خوفناک غلطی دہرائی نہ جائے گی، جو اس کے خیال کے مطابق ۱۹۱۴ء میں جرمنوں نے کی تھی، یعنی وہ دو محاذوں پر جنگ نہ ہونے دے گا۔ بہ ایں ہمہ اس نے جون ۱۹۴۱ء میں روس پر حملہ کر دیا اور دو محاذوں پر جنگ کی غلطی کا مرتکب ہوا۔ اس سلسلے میں دو مہینے کی تاخیر ہوئی، جس کا سبب یہ تھا کہ بلقان میں طالع آزمائی شروع ہو چکی تھی۔ یہی دو مہینے غالباً فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ بلاشبہہ روس ایک ایسا نصب العین تھا، جو بڑا دلآویز معلوم ہوتا تھا۔ نازیوں کے منصوبے میں پولینڈ اور جنوبی روس کے زرخیز خطوں کو خاص اہمیت حاصل تھی اور وہ سمجھے بیٹھے تھے کہ جرمنوں کی توسیع کے لیے یہی مناسب سرزمینیں ہیں، یہی ان کے لیے جائے بود و ماند ہے، یہی جرمنی کی تقدیر ہے۔ جمہوریۂ امریکہ برطانیہ کو ساز و سامانِ جنگ اور دوسری ضروری اشیاء بہم پہنچا رہی تھی۔ ایک فوج بھی بھرتی کی تھی۔ تجربات کو بھی تقویت پہنچائی تھی، مگر صاف ظاہر تھا کہ جمہوریۂ مذکورہ ۱۹۴۱ء میں یورپ کے اندر مؤثر جنگ کر سکتی تھی۔ اس وقت ہٹلر کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ روس پر حملہ دو محاذوں پر جنگ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر روس فتح ہو جاتا، جس کا ہٹلر کو یقین تھا تو برطانیہ کا فیصلہ بہ آسانی کیا جا سکتا تھا اور اگر جمہوریۂ امریکہ بھی جنگ میں شامل ہو جاتی تو اس سے کچھ فرق نہ پڑتا۔

روس ۱۹۴۱ء میں فتح نہ ہو سکا، مگر فتح قریب نظر آتی تھی۔ جنگِ برطانیہ کے مقابلے میں یہ زیادہ یقینی تھی۔ ہٹلر کے منصوبے پر خوب عمل ہوا۔ جرمنوں نے کامیاب برق رفتار جنگ کی اور وہ دو مہینے میں لینن گراڈ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جنوب میں انھوں نے اکتوبر کے اختتام پر یوکرین فتح کر لیا۔ لاکھوں روسی سپاہی مارے گئے یا قید کر لیے گئے۔ فاصلہ پیش نظر رکھا جائے تو جرمن فوجیں جتنی دور فرانس میں گئی تھیں، اس سے دگنی دور روس میں گھس گئیں۔

تاہم روسی سرما کے آغاز سے پہلے نہ لینن گراڈ لیا جا سکا، نہ ماسکو۔ روسیوں نے بھاری صنعتوں کے کارخانے جزواً علاقہ یورال میں منتقل کر لیے تھے، جو خاصا دور تھا۔ ان کارخانوں، نیز سائبیریا کے کارخانوں کو زیادہ تقویت پہنچا دی گئی


دوسری عالمی جنگ
ایشیائی اور الکاہلی میدان ہائے جنگ
جاپان کے زیر غلبہ علاقہ "عظیم تر مشرقی ایشیا باہمی خوشحالی کا حلقہ" اگست ۱۹۴۲ء
اتحادی جوابی حملوں، ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء کی سمت
سوویٹ روس
منگولیا
منچوریا
تبت
چین
جاپان
ٹوکیو
ہیروشیما
ناگاساکی
برما
ملایا
بورنیو
نیوگنی
آسٹریلیا
بحر ہند
مارکس
پرل ہاربر
جزائر فجی

جمہوریۂ امریکہ نے بھی سامان بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ روس کے پاس جتنے آدمی تھے، وہ تمام ضرورتوں کے لیے بالکل کافی تھے۔ حکومت کا سلسلہ درہم برہم نہ ہوا اور قومی روح کمال پر پہنچ گئی۔ مزید برآں جنگ برطانیہ کی طرح جرمنوں نے پھر ایک مرتبہ ثابت کر دیا کہ جس منصوبہ بندی پر انھیں فخر تھا، وہ مکمل قطعاً نہ تھی۔ ان کی فوجوں کے پاس روسی سرما کی شدت کے مقابلے کے لیے پورا سامان نہیں تھا۔ جرمن منصوبہ بندوں کو یقین تھا کہ موسم گرما اور موسم خزاں میں روس کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔ مگر موسم سرما ان کی منصوبہ بندی سے خارج رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۴۱ء اور مئی ۱۹۴۲ء کے درمیان روسی خاصے اچھے علاقے جرمنوں سے واپس لے چکے تھے۔

جمہوریۂ امریکہ کی پالیسی

اس اثنا میں جرمن ایک اور مہلک نقل و حرکت میں مشغول ہو گئے۔ ہٹلر کو یہ خیال رہا تھا کہ پہلی عالمی جنگ میں جرمنی کی پالیسی تباہی خیز ناکامی کا موجب بنی، کیونکہ اس نے جمہوریۂ امریکہ کو جنگ میں گھسیٹ لیا۔ ہٹلر امریکہ کو جنگ سے باہر رکھنے کا خواہاں تھا۔ جمہوریۂ امریکہ میں جنگ سے الگ تھلگ رہنے کی حامی پارٹی بڑی زبردست تھی اور مٹھی بھر لوگ محوریوں کے ہمدرد بھی تھے، تاہم ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملے کے وقت سے امریکہ کی رائے عامہ زیادہ سے زیادہ بالاتفاق جرمنوں اور اطالویوں کی اتنی مخالف تھی کہ ۱۹۱۴ء میں وسطی یورپی طاقتوں کی ویسی مخالف نہ تھی۔ ۱۹۴۰ء میں سقوطِ فرانس کے ساتھ محوریوں کی مخالفت کے جذبات بہت ترقی کر گئے۔ اس احساس کو تقویت یوں پہنچی کہ اگر ہٹلر یورپ میں من مانے طریق پر کامیاب ہو گیا تو اس کا آئندہ ہدف جمہوریۂ امریکہ ہوگا۔

جون ۱۹۴۰ء اور دسمبر ۱۹۴۱ء کے درمیان روزویلٹ کی حکومت نے کانگرس اور رائے عامہ کی مرضی کے مطابق ــــ اگرچہ بالاتفاق نہیں ــــ جنگ کے سوا برطانیہ کی امداد کے لیے کئی اقدامات کیے۔ بعدازاں روس کو بھی امداد دی۔ بین الاقوامی روابط کے جو معیار انیسویں صدی کے معمولات میں شمار ہوتے تھے، ان کے پیش نظر یہ اقدامات امریکہ کی رسمی غیر جانبداری کے مطابق نہ تھے۔ ان کی بنا پر ہٹلر جمہوریۂ امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ میں بڑی حد تک حق بجانب ہوتا۔ حکومت امریکہ نے پچاس "پرانے" تباہ کن جہاز برطانیہ کو دے دیئے اور ان کے معاوضے میں اوقیانوس کی برطانوی نو آبادیوں میں بحری مرکز لے لیے۔ پھر برطانیہ کو ہر قسم کا سامانِ جنگ پہنچایا اور اس سامانِ جنگ کو اوقیانوس سے گزارنے کے لیے امریکی بحری قوت سے کام لیا گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مارچ ۱۹۴۱ء میں ادھار پٹے[1] کے قانون کے مطابق جمہوریہ امریکہ ضروری دفاعی سامان دینے پر راضی ہو گئی۔ اس میں غذائی جنسیں بھی شامل تھیں اور یہ سامان ہر اس ملک کی حفاظت کے لیے دیا جا سکتا تھا، جو صدر جمہوریۂ امریکہ کے نزدیک امریکی دفاع کے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ انگلستان میں تمام ضروری چیزیں بکثرت پہنچنے لگیں۔ پھر یہ تمام چیزیں ان اتحادیوں کو دی گئیں، جو جنگ میں محوریوں کے خلاف تھے اور یہ سب کچھ اتنی افسوسناک پیچیدگیوں

---

[1] Land-Lease Act

سے بالکل الگ رہ کر گیا، جو پہلی عالمی جنگ کے بعد قرضہ ہائے جنگ کے سلسلے میں پیدا ہوئی تھیں۔

لیکن ہٹلر نے اس کے باوجود امریکہ کے خلاف جنگ نہ چھیڑی۔ البتہ وہ جاپان کی امداد کا پختہ وعدہ کر چکا تھا اور جاپان پر ایک فوجی گروہ مسلط تھا جس نے سقوطِ فرانس، سقوط ہالینڈ و بلجیم اور برطانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایشیا میں توسیع کی پالیسی پر تیزی سے عمل کا فیصلہ کر لیا، اس کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں منچوریا کے اندر ہوئی تھی۔ چنانچہ سقوطِ فرانس سے فائدہ اٹھا کر جاپان فرانسیسی ہند چینی میں گھس گیا، چین میں بھی اپنی مہم جاری رکھی۔ حکومتِ امریکہ صدی کے چوتھے عشرے میں جب رسمی اعتبار سے صلح قائم تھی، چین میں جاپانی فتوحات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئی اور اس نے مخالفت کی پالیسی ترک نہ کی، کیونکہ وہ جاپان کے عمل کو سراسر جارحانہ اقدام سمجھتی تھی۔ اگر حکومت امریکہ جاپان کو مشرقِ بعید میں من مانی کارروائیوں کی اجازت دے دیتی تو غالباً پرل ہاربر کا واقعہ پیش نہ آتا۔ لیکن مشرقِ بعید میں سابقہ امریکی پالیسی سے کامل دست برداری اختیار کیے بغیر بظاہر ممکن نہ تھا کہ جمہوریۂ امریکہ جاپان کے ساتھ جنگ سے الگ رہتی۔

پرل ہاربر اور بعد کے واقعات

۱۹۴۱ء کے موسم گرما اور موسم خزاں میں حکومت امریکہ نے اپنے حدود کے اندر جاپان کو ادھار سامان دینے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ نیز فیصلہ کر لیا کہ خام مال جاپان نہ لے سکے، جب تک چین اور ہند چینی سے دستکش نہ ہو۔ اس بارے میں جاپانیوں اور امریکیوں کے درمیان گفت و شنید جاری تھی کہ یکایک ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپانیوں نے بلا انتباہ طیارہ بردار جہازوں، ہوائی میں امریکہ کی بندرگاہ پرل ہاربر پہنچ لیے اور سخت ہوائی ضرب لگائی۔ بلاشبہ جہازوں اور دوسرے ضروری سامان کو سخت نقصان پہنچا، مگر بحرالکاہل میں امریکہ کی قوت تباہ نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریۂ امریکہ نے فوراً جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جرمنی اور اٹلی نے اپنے محوری حلیف کے ساتھ وعدوں کی پاسداری میں ۱۱ دسمبر کو جمہوریۂ امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ یوں جنگ نے حقیقی معنی میں عالمی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔

اگرچہ جمہوریۂ امریکہ ۱۹۱۷ء کے مقابلے میں بدرجہا بہتر طریق پر تیار تھی، مگر ابھی اس کی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ جرمنی کے خلاف فی الوقت وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ امریکہ اور روس کو ادھار پٹے کے قانون کے تحت زیادہ سے زیادہ امداد دیتی رہی اور جرمن آبدوزوں کے خلاف جنگ میں پورا حصہ لیا۔ جاپان کے خلاف جمہوریۂ امریکہ تقریباً بے بس تھی۔ بحرالکاہل میں اس کی بحری چوکیاں گوآم، ویک آئی لینڈ[لہ] اور فلپائنز میں تھیں۔ پے در پے جاپانیوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ برطانیہ، نیز ہالینڈ کی جلاوطن حکومت بھی جنوبی و مشرقی ایشیا میں اپنی نو آبادیاں محفوظ رکھنے کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ ۱۹۴۲ء کے موسم بہار تک جاپان برطانیہ سے ملایا اور ہالینڈ سے انڈونیشیا لے کر سیام و برما پر پورا اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا

لہ Wake Island

کہ اب آسٹریلیا پر حملے کا ارادہ ہے۔

آبادی، وسائل اور صنعتی قوت کے اعتبار سے برطانیہ، اس کی دولت مشترکہ، اس کی سلطنت، روس، چین، جمہوریہ امریکہ اور دوسری سرزمینیں، جو جلدی اقوام متحدہ بننے والی تھیں، جرمنی، اٹلی اور جاپان کی مجموعی قوتوں سے بے اندازہ برتر تھیں۔ اگرچہ محوری طاقتیں ان سرزمینوں کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتیں، جن پر ۱۹۴۲ء کے موسم گرما تک وہ قابض ہو چکی تھیں، تاہم اس وقت تک محوری ہر جگہ فتحمند تھے۔ دانشمند مبصر اس وقت بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ اگر محوریوں کے خلاف اتحاد بحال رہا تو اس اتحاد کے مجموعی وسائل محوریوں کو ختم کر دیں گے۔ اتحاد قائم رہا، اس سے بدرجہا بہتر طریق پر قائم رہا جس میں ہمارے مغربی نظام ملکداری کی گزشتہ چند صدیوں میں ایسے اتحاد قائم رکھے جا سکے۔ صرف تین سال میں ——— لوئی چہاردہم اور نپولین جیسے جابرانہ اقدامات کرنے والوں کے خلاف اتحادیوں کے مقابلے میں صرف تین سال کی مختصر مدت میں — محوری طاقتیں شکست کھا کر غیر مشروط حوالگی پر آمادہ ہو گئیں۔

پچاسیواں باب

اقوامِ متحدہ کی فتح

(۱)

انقلابی موڑ

جنگ میں کئی انقلابی نقطے پیش آئے۔ سب سے پہلا یہ کہ بحری اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا، جس سے جاپانیوں کی توسیع رک گئی۔ ان اقدامات میں اُن ہوائی جہازوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا، جن کے مرکز طیارہ بردار جہاز تھے۔ ۷ مئی ۱۹۴۲ء کو جنوبی بحر الکاہل میں بحیرۂ کورل[1] کی جنگ ہوئی۔ متحدہ بیڑے اور بحری قوت نے آسٹریلیا پر جاپان کا وہ حملہ روک دیا، جس کا امکان تھا اور جزیروں کو محفوظ کر لیا۔ جون میں جاپانی بیڑا جزیرہ مڈوے[2] کی تسخیر کا ارادہ کر رہا تھا، امریکہ کی بحری اور ہوائی قوت نے اسے منتشر کر دیا۔ الوشی جزائر میں، جو امریکی علاقہ تھا، جاپانی لنگر انداز ہوئے، مگر وہ ہوائی اور الاسکا کے لیے کوئی خطرہ نہ پیدا کر سکے۔

مغرب میں امریکہ اور برطانیہ، روس کا دباؤ قبول کر کے برّاعظم یورپ میں دوسرا محاذ پیدا کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں فرانسیسی شمالی افریقہ میں کئی مقامات پر ان کی فوجیں اتریں۔ شمالی افریقہ میں بعض فرانسیسیوں سے، جو محوریوں کے خلاف تھے، خفیہ گفت و شنید جاری رہی، لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ مراکش میں فوجیں اتار دی گئیں تو حکومت وشی نے تھوڑی دیر کے لیے سختی سے مزاحمت کی، مگر اتحادی فوجوں نے مراکش اور الجزائر میں جلد ہی قدم جما لیے۔

شمالی افریقہ کے طویل ساحلی علاقے کا ایک حصہ یعنی ساحل لیبیا بحیرۂ روم میں جنگ کے آغاز سے جرمنوں اور اطالویوں کے قبضے میں تھا۔ کچھ مدت تک صحرائی علاقے میں دھکا پیل کی جنگ جاری رہی۔ جب شمالی افریقہ میں فوجیں اتر گئیں تو برطانوی فوجیں جنرل منٹگمری کی سرکردگی میں مصری سرحد کے اندر دفاعی خط بنا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ۲۳ اکتوبر

۱؎ Coral Sea کورل مونگے کی چٹانوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ سمندر کے اس حصے میں ایسی چٹانیں زیادہ ہیں، اس لیے یہ نام پڑ گیا۔

۲؎ Midway Island

سنہ ۱۹۴۲ء کو برطانیہ نے منصوبے کے مطابق جارحانہ اقدام شروع کیا[1]۔ یہ منصوبہ جنرل آئزن ہاور[2] جو شمالی فرانسیسی افریقہ میں متحدہ افواج کا کمانڈر تھا ـــــ کے ساتھ مل کر بنایا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دشمن کو کلاسیکی نقل و حرکت کے مطابق دونوں طرف سے بند کر لیا جائے۔ جرمنوں نے تیزی سے خطرے کا مقابلہ شروع کیا۔ وہ اپنی افریقی فوجوں کے لیے ٹیونس کے راستے کمک لے آئے، جو حکومت وشی نے ان کے حوالے کر رکھا تھا۔ اس طرح شمالی افریقہ سے جرمنوں اور اطالویوں کے اخراج میں تاخیر ہو گئی، لیکن دونوں طرف کی فوجیں قریب تر پہنچتی رہیں۔ مئی ۱۹۴۳ء میں برطانوی، امریکی اور آزاد فرانسیسی فوجوں نے محوریوں کے آخری قلعے فتح کر لیے یعنی ٹیونس اور بزرتہ[3]۔ اس اثنا میں تقریباً تین لاکھ محوری فوج اسیر ہوئی۔

شمالی افریقہ کی مہم جنگ میں ایک انقلابی موڑ تھی۔ اتحادیوں نے کامیابی سے بہت بڑی فوج اتاری اور محوریوں کی بہت بڑی قوت تباہ کر ڈالی۔ اس کا کمانڈر جرمنی کے ان چند جرنیلوں میں سے ایک تھا، جس نے دنیا میں نام پیدا کیا، یعنی رومل[4]، جو صحرائی لومڑی مشہور ہوا۔ شمالی افریقہ کوئی بڑا اور مرکزی محاذ نہ تھا، تاہم مہم بہت بڑی تھی، جس میں اتحادیوں نے اعتماد و وقار حاصل کیا۔

خشکی میں ایک بڑا انقلابی موڑ سٹالن گراڈ کا کامیاب روسی دفاع تھا۔ اس دفاع نے اسی مہینے میں (نومبر سنہ ۱۹۴۲ء) حملے کی شکل اختیار کی، یعنی شمالی افریقہ میں اتحادی فوجیں اتاری گئیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء ـــ ۱۹۴۲ء کے موسم سرما میں رک جانے کے بعد جرمنوں نے سنہ ۱۹۴۲ء کے موسم گرما کا جارحانہ اقدام لینن گراڈ اور ماسکو دونوں سے بہت دور شروع کیا۔ وہ جنوبی و مشرقی یورپی روس کے اس خطے میں پہنچنا چاہتے تھے، جہاں تیل کے بڑے ذخیرے تھے۔ جرمنوں کو تیل کی کمی بہت تکلیف دہ معلوم ہونے لگی تھی، کیونکہ اول اتحادیوں نے بمباری شروع کر دی تھی، دوم اگرچہ جرمنوں نے رومانیا کے چشموں پر قبضہ کر لیا تھا، مگر میکانکی جنگ میں تیل کی جتنی ضرورت تھی، وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ روسی تیل کے چشموں کی طرف پیشقدمی جرمنوں کو روس کے اندر بہت دور لے گئی، یعنی وہ اپنے نقطۂ آغاز سے کم و بیش ایک ہزار میل پر پہنچ گئے تھے، مگر یہ پیشقدمی بھی رک گئی۔ گروزنی[5] اور باکو کے چشمے تھوڑی دور رہ گئے تھے۔ جرمنوں کے لیے اتنا لمبا فاصلہ،

---

[1] یہاں اتنا بتا دینا چاہیے کہ جنرل منٹگمری کو اگست سنہ ۱۹۴۳ء میں آٹھویں فوج کا کمانڈر بنایا گیا تھا۔ اس سے پیشتر آٹھویں فوج مصر کے اندر العلمین پہنچ گئی تھی۔ منٹگمری نے اکتوبر میں حملہ شروع کیا۔ اس وقت تک آئزن ہاور کی فوج مراکش میں نہیں اتری تھی۔ منٹگمری نے رومل کو شکست دی، پورا لیبیا لے لیا۔ اس اثنا میں آئزن ہاور بڑھتے بڑھتے ٹیونس کی طرف آیا۔ ٹیونس میں پھر فیصلہ کن جنگ منٹگمری ہی نے کی اور جرمنوں اور اطالویوں کو شمالی افریقہ سے نکال کر پہلے سسلی، پھر اٹلی پہنچا دیا۔

[2] Eisenhower

[3] Bizerte

[4] Rommel

[5] Grozney

روسیوں کی بے پناہ جنگی قوت اور مشکلات کا صابرانہ تحمل جرمنوں کو ناقابلِ شکست نظر آیا۔ ان کی فوجیں سٹالن گراڈ پر روک دی گئیں۔ ۱۹۴۳ء کے اوائل میں وہ طویل سفر شروع ہوا جو دو سال بعد روسیوں کو برلین پہنچانے والا تھا۔

جنگِ رسد

ایک بظاہر کم شاندار انقلابی موڑ جنگِ رسد کا تھا، جس میں اتحادیوں نے کامیابی حاصل کی۔ یہ جنگ شمالی افریقہ اور سٹالن گراڈ کی طرح ظاہری شان و شوکت سے خالی تھی، لیکن اس فتح کی اہمیت بہت بڑھی ہوئی تھی، کیونکہ بحری اور برّی کامیابیاں آخر رسد ہی پر موقوف تھیں۔ روس کے لیے بھی رسد کا بہت بڑا سرچشمہ جمہوریہ امریکہ تھی، لیکن یہ جمہوریہ اتحادیوں اور دشمنوں، دونوں سے دور تھی۔ بیچ میں پانی حائل تھا۔ صرف نہایت قیمتی اور کم وزن چیزیں ہوائی جہازوں سے بھیجی جاتی تھیں۔ باقی سب کچھ سمندروں کے راستے بھیجنا ناگزیر تھا۔ اگر جرمن رسد روک سکتے یا اس میں معتدبہ کمی کر سکتے تو وہ اتحادیوں کے بے پناہ وسائل کے باوجود کامیاب ہو سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی آبدوزوں میں اہم اصلاحات کر لیں اور ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا جس کی مدد سے آبدوزیں بہت دُور تک زیرِ آب جا سکتی تھیں۔ آبدوزوں کے افسر اور عملہ کو بھی بہت عمدہ تربیت دے دی گئی تھی، مگر آبدوزیں کافی نہ تھیں اور اتحادیوں نے جو جوابی تدبیریں اختیار کیں ــــ رڈار سے کام لینا شروع کیا، بحری اور ہوائی جہازوں نے مل کر سفر اختیار کیے، پھر تمام رسد رساں جہازوں کے ساتھ حفاظت کے لیے جنگی جہاز جاتے تھے اور رسد رساں جہاز قافلے کی صورت میں چلتے تھے، وغیرہ ــــ اُن کی بدولت رفتہ رفتہ جہازوں کی غرقابی کا تناسب گھٹتا گیا۔

واقعۂ پرل ہاربر کے بعد ۱۹۴۲ء کے اوائل میں جہازوں کی غرقابی کا تناسب واقعی خطرناک تھا اور جرمن آبدوزیں جمہوریہ امریکہ کے اوقیانوسی ساحل سے بہت قریب پہنچ کر حملے کرتی تھیں، مگر ۱۹۴۲ء کے آخر تک تعداد میں ایسی کمی ہوگئی، گویا لہروں کا رخ پلٹ گیا۔ ۱۹۴۳ء کے گرما میں اتحادیوں نے پورے اعتماد سے اعلان کر دیا کہ ۱۹۴۳ء کے نصف اوّل میں آبدوزوں کے ذریعے سے غرقابی کا تناسب ۱۹۴۱ء کے نصف اوّل سے صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔ یہاں ایک دلچسپ سوال ذہن میں آتا ہے، اگر ہٹلر جون ۱۹۴۰ء کے بعد حوصلے سے کام لے کر جو کچھ قبضے میں آچکا تھا، اسے سنبھالے رہتا اور جرمنی کی پوری صنعتی استعداد آبدوزیں تیار کرنے میں لگا دیتا تو کیا نتیجہ نکلتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۳ء کے موسم گرما تک رسد کی نہایت نازک جنگ میں کامیابی حاصل کر لی گئی تھی۔

محوری طاقتیں دفاع پر

جنگ کے آخری دو سال میں محوری طاقتیں دفاع پر رہیں۔ یورپ اور ایشیا، دونوں جگہ اتحادی فوجوں نے قطعی خطوط پیشقدمی کے ساتھ بڑے حملے شروع کر دیئے۔ ان مہموں کی حیثیت روائتی قسم کی تھی، لیکن جنگ میں دو نئے عامل پیدا ہو چکے تھے، یعنی فضائی قوت اور دورِ جدید کا پروپیگنڈا، جسے "نفسیاتی جنگ" کہا جاتا ہے۔ ان سے فوجوں کے کام میں بڑی سہولت ہوئی۔ تنہا ان نئے طریقوں سے جنگ فتح نہ ہوئی، لیکن یہ بڑے مفید معاون ثابت ہوئے اور ان سے فتح کی رفتار یقیناً تیز تر ہو گئی۔ فضا سے

بمباری کم از کم ہیروشیما پر ایٹمی بم پھینکنے تک کامل تباہی نہ لا سکی، حالانکہ مبصروں نے ایسی ہی تباہی کی پیشگوئی کر رکھی تھی۔ جرمنوں نے اپنی بعض کلیدی صنعتوں کے لیے زمین دوز کارخانے تیار کر لیے۔ جیسے جیسے اتحادیوں کی فضائی قوت اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتی گئی، محوریوں کے عزم و قوتِ مزاحمت پر کاری ضرب لگتی گئی۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے سے دشمن کی صلاحیتِ کار کو منظم طریق پر تباہ کیا گیا، مثلاً بال بیرنگ اور تیل کی صنعت۔ امریکی ہوائی جہازوں نے جاپانی شہروں پر آگ لگا دینے والے بم برسائے۔

جرمنی اور اٹلی پر بری حملے کا دباؤ تین طرف سے پڑا۔ روسیوں نے مشرقی جانب سے، برطانویوں، فرانسیسیوں، امریکیوں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے اتحادیوں نے جنوب اور مغرب کی طرف سے۔ جنوب میں اتحادی کامیاب بحری و بری کاروائی کے ذریعے سے سسلی پہنچ گئے (جولائی ۱۹۴۳ء)۔ یہ واقعہ شمالی افریقہ میں آخری فتح سے دو مہینے کے اندر اندر پیش آیا۔ پھر سسلی سے چھ ہفتوں میں آبنائے میسینا کو عبور کرتے ہوئے اٹلی میں داخل ہو گئے۔ اتحادیوں کو ابتدا میں امید تھی کہ اطالوی مہم بڑی کامیاب ثابت ہوگی، لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی، تاہم مہم جاری رہی اور تھوڑی ہی مدت میں امریکیوں اور برطانویوں کے درمیان پالیسی کے متعلق شدید جھگڑے شروع ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء کے گرما میں اتحادیوں کی کامیابیوں نے اٹلی کو بڑی حد تک جنگ سے خارج کر دیا۔ اطالوی فوج کے اعلیٰ افسروں اور بادشاہ کے دوسرے مصاحبوں نے جولائی میں ایک اقدام کا انتظام کیا جس میں مسولینی حکومت سے خارج کر دیا گیا اور اسے قید کر لیا گیا۔ مارشل بدولیو[1] نے نئی حکومت قائم کی۔ اس نے اتحادیوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔

لیکن جرمن اٹلی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس میں ایک بڑی وجہ وقار کی تھی، دوسرے فوجی نقطۂ نگاہ سے بھی اٹلی ان کے لیے مفید تھا۔ جرمن فوجوں کا ایک دستہ مسولینی کو قید خانے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا (ستمبر ۱۹۴۳ء) اور اسے ایک فاشسٹ جمہوریت کا رئیس بنا دیا گیا۔ وہ اس منصب پر فائز رہا، یہاں تک کہ اپریل ۱۹۴۵ء میں مخالفوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس اثنا میں اٹلی کو ایک طرف غیر ملکی جنگ درپیش تھی، دوسری طرف خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ اٹلی کے باشندے بہت تنگ آ چکے تھے اور وہ امن کے لیے مضطرب تھے، مگر دو اقلیتیں — فاشسٹ محوری گروہ اور فاشسٹوں کا مخالف اتحادیوں کا حامی گروہ — لڑتی رہیں۔ جون ۱۹۴۴ء میں کیسینو[2] کے آس پاس شدید جنگ کے بعد اتحادی روما پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور اگست میں انھوں نے فلارنس لے لیا، لیکن اس سے آگے وہ نہ جا سکے، یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء کے ابتدائی مہینوں میں جرمن بالکل شکست کھا گئے۔

---

1. Badoglio
2. Cassino

جرمنی کی شکست

تہران کی کانفرنس میں (دسمبر ۱۹۴۳ء) چرچل، روزویلٹ اور سٹالن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مغرب کی طرف سے اتحادی فرانس میں پیشقدمی کریں گے۔ وسیع تیاریوں کے بعد ۶ جون ۱۹۴۴ء کو اتحادی فوجیں فرانس میں اتریں۔ اس حملے کا مدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ اتحادیوں نے اس غرض سے نارمنڈی کے ساحل کا وہ حصہ چنا تھا جو جزیرہ نمائے کوٹینٹن[1] (شربورگ) کے موڑ کے مشرق اور مغرب میں ہے اور وہاں اچانک ابتدائی کامیابی حاصل کر لی۔ جرمنوں کے ہائی کمان کا یقین یہ تھا کہ فوجیں مزید شمال مشرق میں ساحل رود بار کے ساتھ ساتھ اتاری جائیں گی۔ جرمنی نے چار سال کے تصرف میں فرانسیسی ساحل کے ساتھ ساتھ پوری طرح استحکامات کر لیے تھے، مگر اتحادی بھی چار سال کی اس مدت میں حالات کے مطالعے، منصوبہ بندی اور ضرورت کے مطابق ہر چیز ایجاد کرنے میں مصروف رہے تھے۔ جب آزمائش کی ساعت آئی تو اتحادیوں کے جہازوں، خشکی اور تری میں چلنے والے ٹرکوں نے بحری اور ہوائی قوت کی امداد سے ——— اس وقت تک جرمن ہوائی فوج بالکل غائب ہو چکی تھی ——— اپنی فوجوں کے لیے خاصی جگہ حاصل کر لی۔ ان کے ساتھ مصنوعی بندرگاہیں بھی تھیں اور رسد کا نظام بہت عمدہ ثابت ہوا۔ ساحل پر اترنے سے ایک مہینے کے اندر اندر اتحادی فوجیں جرمنوں کے ایک بازو سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ یہ اقدام امریکہ کے جرنیل پیٹن[2] کی تیسری فوج نے کیا۔

ایک فوج بحیرۂ روم کے فرانسیسی ساحل پر اتارنے کا فیصلہ مدت سے ہو چکا تھا۔ یہ بھی ۱۵ اگست ۱۹۴۴ء کو اتار دی گئی اور دریائے رہون[3] اور دریائے سون کی وادیوں کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب بڑھی۔ اسے بہت کم مزاحمت سے سابقہ پڑا۔ ہر جگہ فرانسیسیوں نے آزادی دلانے والی فوجوں کا خیر مقدم کیا۔ فرانسیسی اس وقت تک مزاحمت کے لیے خوب منظم ہو چکے تھے۔ ان فوجوں میں کچھ فرانسیسی اور نو آبادیوں کے فرانسیسی بھی شامل تھے جو ۱۹۴۰ء کے آزاد فرانس کے جانشین تھے۔ پیرس آواخر اگست میں لے لیا گیا۔ یہ محض ایک مقام نہ تھا، بلکہ ایک خاص نشان تھا۔ اہل پیرس نے بغاوت کا انتظام کر دیا تھا اور جرمن فوج کے خلاف جگہ جگہ مورچے بنا لیے تھے۔

جرمن شکست کھا چکے تھے، مگر ان میں بدنظمی پیدا نہیں ہوئی۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں ہٹلر کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوششیں قدامت پسند عناصر نے کی تھی۔ فوجی اور سویلین دونوں اس میں شامل تھے۔ مقصد یہ تھا کہ گفت و شنید کے لیے راستہ نکل آئے، لیکن ہٹلر کے لیے جو بم رکھا گیا تھا، اس سے وہ بچ گیا اور نازیوں نے جرمنی پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ اتحادیوں کے حوصلے جولائی اور اگست کی فوری کامیابیوں کے باعث بہت بلند ہو گئے تھے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی

---

[1] Contentin

[2] Patton

[3] Rhone Soan valleyr

کہ یا تو سرما سے پہلے پہلے جرمن فوجوں کو تباہ کر دیں یا جرمنی سے ان کا رشتہ منقطع کر ڈالیں۔ مگر پیٹن کی میکانکی فوجوں کے پاس پٹرول ختم ہو گیا اور جرمنوں نے طیارہ رانفل کے بغیر طیاروں اور راکٹوں سے کام لیا۔ اس وجہ سے اینٹورپ[1] کی بندرگاہ رسد میں پورا سامان بروقت نہ پہنچایا جا سکا۔ موسمِ خزاں کے اختتام پر جرمن پورے نظم و جمعیت کے ساتھ خطِ سیگ فریڈ کے پیچھے جا بیٹھے۔

مشرقی جانب سے روسی فوجوں نے سٹالن گراڈ سے پانسا پلٹتے ہی پیشقدمی شروع کر دی تھی اور وہ برابر بے توقف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ جب مغربی اتحادی فوجیں اٹلی میں مصروف تھیں تو روسیوں نے ۱۹۴۳ء کی مہم میں وہ زیادہ تر علاقے واپس لے لیے، جو ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں ان سے چھینے تھے۔ ۶ نومبر ۱۹۴۳ء کو انھوں نے جنوب کے بڑے شہر کیف پر قبضے کا اعلان کر دیا۔ یہ روسی قوت کا ایک نشان تھا۔ سرما میں انھوں نے دباؤ جاری رکھا۔ آئندہ موسم بہار میں جنوبی جانب سے پھر اقدام شروع کر دیا۔ ۱۹۴۴ء کے موسمِ خزاں تک روسی فوجیں ہٹلر کے بلقانی پٹھوؤں کی نیم دلانہ مزاحمت کو توڑتی ہوئی یوگوسلافیہ کے کمیونسٹ چھاپا مار دستوں سے مل گئیں، جن کی قیادت مارشل ٹیٹو[2] کے ہاتھ میں تھی اور ہنگری پر حملے کے لیے وہ تیار تھیں۔ شمال اور وسط میں انھوں نے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے تھے اور مشرقی جانب سے جرمنی پر حملہ کرنے والی تھیں۔

۱۹۴۵ء میں جرمنی کی جنگ تیزی سے اختتام پر پہنچ گئی۔ مغرب میں جرمنوں نے پھر جارحانہ اقدام کی ایک آخری کوشش کی، (دسمبر ۱۹۴۴ء)۔ وہ آردنس سے اینٹورپ کی طرف بڑھے اور بسٹوگن[3] کی امریکی فوج کو دوسری فوجوں سے منقطع کر دیا۔ اگرچہ اتحادی عوام اور فوجیوں کو اس پیشقدمی سے تشویش ہوئی، کیونکہ وہ مسلسل فتوحات کے عادی ہو چکے تھے، لیکن جرمنوں کا یہ اقدام بے پناہ اتحادی فوجی قوت کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہ تھا۔ روسی فوجیں سرما میں بھی کہیں نہ ٹھہریں اور پولینڈ سے گزرتے ہوئے مارچ کے اوائل میں انھوں نے برلین کے لیے خطرہ پیدا کر دیا۔ مغربی اتحادیوں نے فروری میں خطِ سیگ فریڈ کو توڑا۔ دریائے رھائن کو عبور کیا اور وہ جرمنی کے قلب میں داخل ہو گئے۔

فروری ۱۹۴۵ء کے اوائل میں تین بڑی اتحادی طاقتوں کے لیڈر — سٹالن، چرچل اور روزویلٹ — یالٹا[4] (کریمیا) میں جمع ہوئے اور تسخیر جرمنی کے آخری منصوبے کی توثیق کر دی۔ اب واضح ہو چکا تھا کہ جرمن زیادہ عرصے تک مزاحمت جاری نہ رکھ سکیں گے۔ ان کی کلیدی صنعتیں فضائی حملوں کے باعث بری طرح مجروح ہو چکی تھیں اور فوجوں کے لیے ضروری سامان مہیا نہیں ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے آدمی نہ تھے، مگر اتحادیوں کی منصوبہ بندی کا کام جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا، وہ چاہتے تھے کہ جرمنی میں جلد سے جلد پہنچنے کی جو مسابقت جاری ہو

---

[1] Antwerp

[2] Tito

[3] Bastogne

[4] Yalta

گئی ہے، اسے روکا جائے اور پُرامن طریق پر جرمنی کے ان علاقوں کی حد بندی کر دی جائے، جن پر مختلف اتحادی قابض ہوں گے۔ یالٹا کی کانفرنس میں جو بہت سے فیصلے ہوئے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ برلن پر قبضے کا اعزاز روسیوں کو دے دیا جائے۔ مغرب میں اس فیصلے پر شروع ہی سے سخت نکتہ چینی ہوتی رہی۔ اس کانفرنس میں یہ اعتراف بھی کر لیا گیا کہ جرمنوں کے خلاف دو سال کے کامیاب اقدامات میں روسیوں نے جرمن فوج کے جتنے ڈویژنوں کو شکست دی، اتنے ڈویژنوں کو مغربی اتحادیوں نے شکست دی۔

روسی فوجیں لڑتی ہوئی برلن پہنچ گئیں۔ جب مغربی اتحادیوں کی فضائی قوت بری طرح پھیل چکی تھی، ہٹلر نے برلین کے اندر اپنے صدر مستقر میں خودکشی کر لی اور لاش جرمنوں کے قدیم طریقے کے مطابق جلا دیا گیا۔ وہ پہلے کہہ چکا تھا کہ میں جان دے دوں گا۔ اگرچہ اس کی لاش نہ مل سکی اور شناخت نہ کرائی جا سکی، لیکن اس کی موت کے بارے میں یقیناً کوئی شبہہ نہیں، لیکن ایسے حالات میں افسانے بن جایا کرتے ہیں اور ممکن ہے، آگے چل کر ہٹلر بھی گم شدہ ولیعہد فرانس (لوئی ہفدہم) کا ساتھی بن جائے یا ان انگریز شہزادوں کا ساتھی بن جائے، جو لندن کے قلعہ ٹاور[1] میں مارے گئے تھے یا ازمنۂ وسطیٰ کے شہنشاہ فریڈرک باربروسا کا رفیق بن جائے، جس کے متعلق گیتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ کسی زیر زمین قلعے میں زندہ ہے اور جرمنی کی شان و شوکت کے آخری ظہور کا انتظار کر رہا ہے۔

جرمنی میں اتحادیوں کی پیش قدمی کے بعد پہلی مرتبہ نازیوں کے ظلم و جبر کی پوری دردناکی واضح ہوئی، جو انھوں نے مفتوحہ سرزمینوں کے غلام مزدوروں، سیاسی مخالفوں، یہودیوں، پولستانیوں یا ان قوموں پر روا رکھے، جنھیں جرمن گھٹیا درجے کی قرار دیتے تھے۔ یکے بعد دیگرے وہ تمام مرکز آزاد ہوئے، جہاں یہ مساکین جمع تھے، مثلاً آشوٹز[2]، بلسن[3]، بوخن والڈ[4]، ڈخاؤ[5]، نارڈہاسن[6] وغیرہ۔ دنیا گیس کی ان بڑی بڑی بھٹیوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی، جہاں مظلوموں کی لاشوں کے انبار پڑے تھے اور انھیں ابھی جلایا نہیں گیا تھا۔ جو قیدی زندہ بچ گئے، ان کی حالت بھی بڑی دردناک تھی۔ یہ جنگ کے وہ ہولناک پہلو تھے، جن کی حقیقت اتحادیوں کی بُری سے بُری توقعات سے بھی بڑھ گئی تھی۔

۸ مئی ۱۹۴۵ء کو چرچل اور ٹرومین (جو امریکہ کا صدر بن گیا تھا، کیونکہ اپریل میں روزویلٹ نے وفات پائی تھی) نے اعلان کر دیا کہ جرمنوں کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ پورے یورپ میں فتح کا دن منایا گیا۔ سٹالن اس پر ناراض ہو گیا کہ مغربی

---

۱ Tower

۲ Auschuit

۳ Belsen

۴ Buchenwald

۵ Daehau

۶ No hausen

اتحادیوں نے جرمنی کے بعض فوجی لیڈروں سے ریمز (فرانس) میں رسمی جوانگی منظور کرلی۔ یہ آئندہ کی مشکلات کا پیش خیمہ تھی۔ چنانچہ سٹالن نے خود روس کی طرف سے جرمنی پر آخری فتح کا اعلان دوسرے دن کیا۔

چھیاسیواں باب

اقوامِ متحدہ کی فتح

(۲)

جاپان کی شکست

اب اتحادیوں کی کوششوں کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جاپان کو شکست دی جائے۔ روس نے بڑی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس وقت تک جاپان کو رسماً اپنا دشمن نہ بنایا جب تک جرمنی خطرے کا سامان بنا رہا۔ برطانیہ اور امریکہ چاہتے تھے کہ روس کو جاپان کے خلاف رسمی جنگ کے لیے آمادہ کر لیں۔ یہ طبعی خواہش ــــ طبعی اس لیے کہ تاریخی نمونہ یہی تھا یعنی زمانۂ ماضی کے تمام اتحادی زیادہ سے زیادہ رفیقوں کو ساتھ ملانے کے خواہاں رہے ــــ اس امر کا باعث بنی کہ جرمنی کے ساتھ جنگ کے آخری مہینوں میں روس کو بہت سی مراعات دے دی گئیں۔

جرمنی کے خلاف اتحادیوں کی دو سالہ فتوحات کے ساتھ ساتھ جاپان کے خلاف بھی برابر فتوحات جاری رہی تھیں۔ جاپان پر حملہ تین طرف سے کیا گیا۔ امریکی بحری قوت وسطی بحرالکاہل سے سیدھی جاپان کی طرف بڑھی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے جزیرے واقع تھے، جہاں دشمن نے مرکز بنا لیے تھے۔ امریکی بحری قوت نے ایک ایک جزیرے کو مسخر کیا۔ اس غرض سے بحری اور بری قوت بہ یک وقت استعمال کی گئی اور ہوائی جہازوں نے اوپر سے حفاظت کا انتظام کیا۔ پیشقدمی کے یہ منصوبے بیک وقت یورپ اور شمالی افریقہ میں تیار کیے گئے تھے۔ یہی پیشقدمی تھی، جسے امریکی اخبار نویسوں نے جزیرہ بہ جزیرہ جست لگاتے ہوئے آگے بڑھنا قرار دیا۔ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کے نام اب امریکی فوجوں کی دعاؤں کا حصہ ہیں۔ مثلاً تراوا[1]، کواجالن[2]، ایووجیما[3]، اوکیناوا[4]۔

۲۔ ہوائی بحری اور بری قوت کے گہرے تعاون سے امریکیوں اور آسٹریلیوں نے بعض دوسرے برطانوی عناصر

۱۔ Tarawa ۲۔ Kwagalein

۳۔ Iwojema ۴۔ Okinawa

کی امداد سے اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کیا اور وہ جنوبی و مغربی بحرالکاہل کے بڑے بڑے جزیروں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے، مثلاً جزائر سالومن[1]، نیوگنی اور فلپائنز۔ اس مہم کا سر عسکر امریکی جرنیل میک آرتھر تھا اور اس کا مرکز آسٹریلیا، نیو کیلیڈونیا[2] اور ہیبرائیڈیز[3] جیسے دور افتادہ جزیروں میں تھا۔ اس مہم کا آغاز مشرق بعید کے پہلے بڑے جارحانہ اقدام سے ہوا یعنی امریکہ کی بحری فوج نے ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو جزائر سالومن میں سے وادیٔ الکنال[4] پر قبضہ کر لیا۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ ان مہموں میں جنگلوں کے اندر بھی لڑائیاں کرنی پڑیں۔ بڑی مشکلات پیش آئیں۔ رفتار بڑی سست تھی اور بے حد تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء تک بحری قوت فلپائنز کے ارد گرد کے سمندر کی جنگ فتح کر چکی تھی اور میک آرتھر نے اپنی فوج کامیابی سے لیت[5] پر اتار دی۔ پھر جزائر فلپائنز جاپانیوں سے چھین لیے۔

۴۔ جاپان نے مشرقی ایشیائے کلاں میں برائے نام مشترکہ خوشحالی کا ایک حلقہ پیدا کیا تھا۔ اس پر تیسری طرف سے حملہ چین، برما اور ہندوستان کے مشترکہ محاذ سے ہوا۔ اس محاذ پر جو واقعات پے در پے پیش آئے، وہ اتنے پُر پیچ تھے کہ خلاصتہً بیان کرنے سے ان کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی۔ اتحادیوں کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ چیانگ کائی شک اور چینی قوم پرستوں کو، جن کا مرکز چنگنگ تھا، زیادہ سے زیادہ مادی امداد دی جائے اور جس حد تک ممکن ہو، برما، تھائی لینڈ (سیام) اور ہند چینی کی وضعیت پر ضرب لگائی جائے۔ پرل ہاربر پر حملے کے بعد جاپانیوں نے برما والی سڑک بند کر دی تو چیانگ کائی شک کے قوم پرستوں سے ربط ضبط کا صرف ایک ذریعہ رہ گیا اور وہ ہوائی جہاز تھے۔ یہ غالباً درست ہے کہ مغربی اتحادیوں نے اس محاذ پر بے پناہ طریق پر سامان جنگ نہ بھیجا، لیکن چیانگ کائی شک کو اتنی مدد ضرور دی کہ وہ جنگ جاری رکھ سکے اور ۱۹۴۵ء میں مہم اختتام پر پہنچ رہی تھی تو انگریز، چینیوں اور امریکیوں کی امداد سے اس محاذ پر تین جاپانی فوجوں کے ساتھ لڑ رہے تھے۔

جاپان میں جنگ کا اختتام اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ اتحادی قوموں، بلکہ اتحادی حکومتوں کو بھی ایسی امید نہ تھی۔ بحرالکاہل کے جزیری مرکزوں سے اڑ کر امریکی طیاروں نے ۱۹۴۵ء کے بہار اور گرما میں جاپانی صنعت پر کاری ضربیں لگائیں۔ ۶ اگست کو ہیروشیما پر پہلا ایٹمی بم گرایا گیا۔ روسیوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ جرمنی کو شکست دیتے ہی جاپان کے خلاف جنگ شروع کر دیں گے۔ چنانچہ ۸ اگست کو انھوں نے پوری قوت سے منچوریا پر حملہ کر دیا۔ اب جاپانیوں کو شکست یقینی نظر آتی تھی، مگر جاپانی حکومت نے جرمنوں کے برعکس فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے ملک میں آخری قطرۂ خون بہا

---

[1] Solomons
[2] New Caledonia
[3] New Habrides
[4] Guadal Canal
[5] Leyte

دینے تک جنگ جاری نہ رکھیں گے۔ ۲ ستمبر کو مختصر سی گفت و شنید کے بعد جاپان نے ٹوکیو میں رسماً ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ تمام فتوحات سے دست بردار ہوگیا اور اس نے امریکی فوج کا تصرف قبول کرلیا۔ اتحادیوں میں سے بعض کی رائے تھی کہ شہنشاہ جاپان کو تخت سے اتار دیا جائے، مگر اس رائے پر عمل نہ کیا گیا۔ نہایت نمایاں فوجی عناصر خارج کردیئے گئے اور حکومت جاپان نے اتحادیوں — حقیقۃً امریکیوں — کی نگرانی میں حکومت کا کاروبار جاری رکھا۔

اتحادیوں کے اشتراک کی نوعیت

بڑے اشتراک نے، جسے آخری دور میں اقوام متحدہ کہا گیا، جرمنی، جاپان، اٹلی، نیز بلقان، جنوبی و مشرقی ایشیا اور مغربی یورپ کے دوسرے محوری پٹھوؤں کے خلاف بے پناہ قوت جمع کرلی۔ برطانیہ، روس اور امریکہ کو اس اتحاد میں قلب کی حیثیت حاصل تھی، مگر قوم پرست چین نے بھی خامیوں کے باوجود لاکھوں جاپانی سپاہیوں کو الجھائے رکھا۔ سلطنت فرانس کے وسائل اور ملک کے اندر اور باہر مزاحمت کرنے والے فرانسیسی بھی بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔ اقوام متحدہ نے لاطینی امریکہ کے وسائل سے فائدہ اٹھایا اور برازیل اشتراک کا سرگرم رکن تھا۔ اس حقیقی عالمی جنگ میں برازیل کی فوجیں اٹلی کے اندر لڑتی رہیں، جو آخری دنوں میں صدر درجہ آفاقی محاذ جنگ بن گیا تھا۔ وہاں برازیل کے علاوہ امریکہ، فرانسیسی سامراج، برطانوی سامراج، پولینڈ اور دوسرے ملکوں کی فوجیں بھی لڑتی رہیں۔ اختتام جنگ کے قریب ارجنٹینا بھی اس اشتراک میں شامل ہوگیا، کیونکہ اس نے ۲۷ مارچ ۱۹۴۵ء کو جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا۔

جنگ کے دوران میں اقوام متحدہ نے جو اقدامات کیے تھے — خصوصاً روس کو پکا ساتھی بنانے کے لیے، ان میں سے بعض جاپان پر فتح حاصل کرنے کے بعد سخت نکتہ چینی کا ہدف بنے، لیکن خوب یاد رکھنا چاہیے کہ دور حاضر کی تاریخ مغرب میں ایسے اشتراک کی کمزوری اکثر ظاہر ہوتی رہی اور اقوام متحدہ کے جو لیڈر دوران جنگ میں برسر اقتدار تھے، وہ عزم کیے بیٹھے تھے کہ تاریخ کے سبق سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہٹلر نے آخری دم تک جنگ جاری رکھنے کی پالیسی کے حق میں جو دلیل اکثر پیش کی، وہ یہی تھی کہ ایسے اشتراک زمانۂ ماضی میں عموماً ٹوٹتے رہے ہیں، خصوصاً روس نے ہفت سالہ جنگ میں پروشیا کے خلاف اتحاد سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اسی وجہ سے ۱۷۶۲ء میں فریڈرک اعظم محفوظ رہا۔

اتحاد کو جاری رکھنے کا وسیلہ تین بڑوں — چرچل، روزویلٹ، سٹالن — کی کانفرنسیں تھیں، جن میں سیاسی فوجی مشیر اور ماہرین شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح برطانیہ اور امریکہ کی بھی کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ امریکہ کی شرکت جنگ سے پیشتر بھی روزویلٹ اور چرچل نیوفاؤنڈلینڈ کے قریب ملاقات کرچکے تھے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو انھوں نے منشور اوقیانوس[لہ] جاری کیا تھا، جس میں اعلان کردیا تھا کہ تمام سمندر آزاد ہوں گے، سب کو اقتصادی مواقع

میں آزادی حاصل ہوگی، جارحانہ اقدام ترک کر دیئے جائیں گے، مفتوحہ قوموں کے حقوق بحال ہو جائیں گے۔ منشورِ اوقیانوس کے خلاف کہا گیا کہ یہ غیر ممکن الحصول مقاصد کا ایک خالی اعادہ ہے، اس کے سوا کچھ نہیں لیکن ہر حقیقت پسند کو نظر آ سکتا ہے کہ یہ منشور دنیا کی رائے عامہ کو محور کے خلاف جمع کرنے کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ پھر روزویلٹ اور چرچل کے درمیان کیسابلانکا[1] (جنوری ۱۹۴۳ء)، کوبیک (اگست ۱۹۴۳ء) تین بڑوں کے درمیان تہران (دسمبر ۱۹۴۳ء) اور یالٹا (فروری ۱۹۴۵ء) میں کانفرنسیں ہوتی رہیں اور باہم مشورے سے ایسے فیصلے کیے گئے، جن کے مطابق نچلی سیاسی اور فوجی سطح پر مستعدی سے عمل ہوا۔

بلاشبہ بہت سے فوجی اور سیاسی مسائل پیش آئے، جن میں مشورے سے اتحاد پیدا کرنا ضروری تھا۔ انگریزوں اور امریکیوں کے درمیان بھی اتحاد قائم رکھنا آسان نہ تھا اور معلوم ہے کہ دو بڑی طاقتوں کے درمیان ایسا فوجی اتحاد غالباً کبھی نہ دیکھا گیا۔ میدانِ جنگ میں اقدامات کے فیصلے کے لیے برطانویوں اور امریکیوں نے ایسی کوئی کوشش نہ کی، جیسی پہلی عالمی جنگ میں اعلیٰ کمانڈر کے لیے اتحادیوں نے کی تھی اور مارشل فوش کو سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا تھا، بلکہ کارکنوں کے ملے جلے سٹاف قائم کر دیئے۔ ہر امریکی کمانڈر کے ساتھ ایک برطانوی اور ہر برطانوی کمانڈر کے ساتھ ایک امریکی معاون ہوتا تھا۔ طبعی قومی رقابتوں کے باوجود یہ انتظام کامیاب ثابت ہوا۔ شمالی افریقہ کی جنگ کے ابتدائی دور میں جنرل آئزن ہاور کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے ایک امریکی اعلیٰ افسر کو نہیں، بلکہ ایک انگریز اعلیٰ افسر کو برا بھلا کہا تھا۔ اعلیٰ ترین سطح پر امریکی اور برطانوی حکومتوں کے کارکن مشترکہ چیف آف سٹاف کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی کرتے تھے۔ روسیوں نے ایسا گہرا فوجی تعاون کبھی نہ کیا اور وہ میدانِ جنگ میں بطور خود سب منصوبے بناتے رہے۔

جنگی تدبیروں میں اختلافات

برطانیہ اور امریکہ کے درمیان جنگی تدبیروں میں اختلاف کا بڑا سرچشمہ وہ تھا جسے چرچل نے محوریوں کا "ملائم شکم" قرار دیا تھا۔ چرچل اور اس کے اکثر کمانڈروں کی رائے یہ تھی، جرمنوں کو زیر کرنے کے لیے بہترین طریقہ یہ نہیں کہ فرانس میں بڑی فوج اتارنے کی ضرورت ہے، بلکہ اس کے ملائم شکم پر ضربیں لگانا ضروری ہے، مثلاً جنوبی سمت سے بحیرۂ ایڈریاٹک کی طرف سے ڈینیوب کے میدان میں پہنچ کر، اسی طرح بحیرۂ ایجہ میں سے بھی ایک ضرب لگانے کا موقع ہے۔ برطانویوں نے یہ معاملہ غور کے لیے پیش کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر یہ اقدامات کامیاب ہو جائیں تو اتحادی جرمنی پر مؤثر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ بلقان بھی آزادی حاصل کرے گا۔ ڈینیوب کے وہ خطے بھی آزاد ہو جائیں گے، جو روسیوں کے سامنے ہیں اور ان علاقوں کو زیرِ اثر

---

[1] Casablanca

رکھنے کے لیے روسیوں کی وہ تدبیریں بھی ختم ہو سکتی ہیں، جو ان پر قبضے کے لیے انھوں نے اختیار کر رکھی ہیں۔

امریکیوں نے ان دلائل کے جواب میں کہا تھا کہ بحیرۂ روم میں سامانِ رسد پہنچانا مشکل ہے۔ جن علاقوں سے گزرنا پڑے گا، وہ پہاڑی ہیں اور وہاں سڑکیں اچھی نہیں۔ کم از کم ڈینیوب کے میدان میں پہنچنے تک یہ دعویٰ بالکل درست تھا۔ امریکیوں کو اصرار تھا کہ جرمنی پر وہاں ضرب لگانی چاہیے، جہاں وہ سب سے زیادہ قوی ہے، یعنی مغرب میں۔ مزید کہتے تھے کہ اس طرف سے حملے کے لیے ایک ایسا "طیارہ بردار جہاز" موجود ہے، جو ڈوب نہیں سکتا، یعنی برطانیہ۔ سمندر کا راستہ بہت مختصر ہے اور رودبار سے گزرتے ہوئے ہوائی جہاز بہ آسانی فرانس پہنچ سکتے ہیں۔ فرانسیسیوں سے بڑی اچھی امداد ملے گی۔ فرانسیسی ساحل پر فوجیں اتارنے میں کامیابی حاصل کر کے اعلیٰ پیمانے پر پروپیگنڈا کیا جا سکے گا، کیونکہ جرمن اعلان کر چکے ہیں، ہماری اوقیانوسی دیوار ناقابلِ تسخیر ہے۔ بہرحال امریکہ کی رائے مانی گئی اور اتحادیوں نے بڑا حملہ شمالی فرانس ہی پر کیا۔ جنوبی فرانس میں سے حملہ کر کے شمالی فرانس کے حملے کو تقویت پہنچائی گئی اور اطالوی محاذ سے فوجوں نے جنوبی فرانس میں اقدام کیا۔

مشترکہ فوجی پالیسی پر عمل کے سلسلے میں برطانیہ اور امریکہ کو اور بھی متعدد مشکلات سے سابقہ پڑا۔ جب اتحادی فوجیں نارمنڈی میں سے آگے بڑھیں تو انگریزوں کی رائے تھی کہ تمام فوجیں ایک خطِ مستقیم کی شکل میں رہیں۔ اسی طرح شمالی فرانس اور بلجیئم کی طرف بڑھیں۔ مقصد یہ تھا کہ رو ہر پر قبضہ ہو جائے۔ جنرل پیٹن کی تیسری فوج انتہائی تیزی سے جنوبی جرمنی کی طرف بڑھی تو امریکیوں کی رائے یہ ہو گئی کہ پیٹن کا اقدام جاری رہنا چاہیے۔ ساتھ ہی کینیڈا اور برطانیہ کی فوجیں شمال میں بڑھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی فوج سرما سے پیشتر جرمنی نہ پہنچ سکی، مگر رسد رسانی کا مسئلہ، خصوصاً میکانیکی فوجوں کے لیے تیل کا مسئلہ اتنا مشکل تھا کہ کوئی شخص یقین کی بنا پر نہیں کہہ سکتا، برطانیہ کی رائے درست تھی، یعنی اگر برطانوی رائے کے مطابق ایک متحدہ اقدام کیا جاتا تو مغربی محاذ پر جرمنوں کو ۱۹۴۴ء میں شکست دی جا سکتی تھی۔

سیاسی مسائل

جو سیاسی مسئلہ اب پس منظر میں بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے، اس نے دورانِ جنگ میں اتحادیوں کے درمیان کوئی خاص اختلاف پیدا نہیں کیا تھا۔ یہ غیر مشروط حوالگی کا مسئلہ تھا۔ یہاں ماضیِ قریب کی تاریخ نے اختیار کردہ پالیسی پر بہت زیادہ اثر ڈالا۔ ہٹلر نے عام جرمن پالیسی کی پیروی کرتے ہوئے کہا تھا کہ پہلی عالمی جنگ میں جرمنی کو میدانی شکست نہیں ہوئی تھی، بلکہ ولسن کے چودہ نکات میں جو جھوٹے وعدے کیے گئے تھے، ان کی وجہ سے جرمن دھوکا کھا گئے، حالانکہ اس وقت تک وہ غیر شکست خوردہ تھے۔ اس مرتبہ اتحادی لیڈر عزم کیے بیٹھے تھے کہ جرمنوں کو آئندہ کے لیے ایسے کسی عذر کا موقع نہ دیں گے، جس کی بنا پر وہ دوبارہ عوام کو آمادۂ جنگ کر سکیں، یعنی جرمنوں کو غیر مشتبہ طور پر شکست دینی چاہیے اور واضح رہے کہ اتحادی فوجیں فاتح کی حیثیت میں برلن پہنچیں۔ کوئی سیاسی گفت و شنید نہ ہونی چاہیے، بلکہ غیر مشروط طریق پر ہتھیار ڈالنا لازم ہے۔ دورانِ جنگ میں کسی قدر اس پالیسی کی مخالفت بھی ہوئی، کم از کم اُن سرزمینوں میں، جہاں سیاسی اظہارِ رائے کی آزادی تھی، مثلاً برطانیہ اور امریکہ۔ یہ مخالفت جزواً انسانی ہمدردی کی بنا پر تھی

اور جزوی اس بنا پر کہ غیر مشروط حوالگی کا مطالبہ جرمنوں کے عزم مزاحمت کو اور زیادہ قوی کر دے گا اور اتحادیوں نے نفسیاتی جنگ کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، نازیوں کے مخالف عناصر اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اور نازیوں کے نصب العین سے علیحدگی اختیار نہ کر سکیں گے، بلکہ پوری قوم ہٹلر کی حمایت کے لیے تیار ہو جائے گی۔

ایک اور سیاسی مسئلے نے برطانویوں اور امریکیوں میں واضح تفرقہ پیدا کر دیا، یعنی یہ مسئلہ کہ فرانس، اٹلی اور دوسرے مقبوضہ ممالک میں جو لوگ جرمنوں کے مخالف ہیں، انھیں یہ ثابت کر دینا چاہیے کہ وہ اچھے دیانت دار جمہوریت پسند ہیں تاکہ مغرب کے جمہوری ممالک ان کی مدد کر سکیں۔ یہاں امریکیوں اور برطانویوں کا بنیادی اختلاف چرچل اور روزویلٹ کے نظریات میں واضح تھا۔ روزویلٹ کو یقین تھا کہ اگر اتحادیوں نے مقبوضہ سرزمینوں میں دائیں بازو کے لوگوں کی حمایت نہ کی اور ہر ملک میں وہاں کے باشندوں کو خود حکومت انتخاب کر لینے کی اجازت دے دی، تو وہ جمہوریت کو چنیں گے۔ چرچل اس رائے کا حامی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو بھی عناصر جرمنوں کے مخالف ہوں، ان سے فائدہ اٹھایا جائے؛ اگرچہ انھوں نے مخالفت بہت قریبی زمانے میں اختیار کی ہو۔ اس کے نزدیک اطالوی یا ان جیسی دوسری قومیں اینگلو سیکسن جمہوریت کی نہ تو خواہاں تھیں اور نہ اس قسم کی جمہوریت کے لیے ان میں صلاحیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اٹلی میں مارشل بدولیو اور شاہ پسندوں کی حمایت کے لیے تیار تھا۔ روزویلٹ کو اصرار تھا کہ اٹلی میں جمہوریت کی ضرورت ہے اور اطالوی جمہوریت چاہتے ہیں۔

فرانسیسی سیاسیات میں ایک اور الجھن پیدا ہو گئی۔ روزویلٹ ڈیگال کو شک و شبہہ کی نظروں سے دیکھتا تھا، حالانکہ جون ۱۹۴۰ء میں ڈیگال کے عزم مزاحمت نے اسے فرانسیسی تحریک آزادی کا لیڈر بنا دیا تھا۔ روزویلٹ کے نزدیک ڈیگال بولانجر[1] یا نپولین ثالث سے بہتر نہ تھا۔ چرچل کے نزدیک یقیناً ڈیگال سے معاملہ مشکل معلوم ہوتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈیگال واقعی فرانس کی عظمت رفتہ بحال کرنے کی فکر میں ہے، لیکن وہ ایک ناگزیر حلیف تھا۔ آگے چل کر ثابت ہو گیا کہ ڈیگال کے پیرووں نے اندرون ملک کی منظم مزاحمت کے تعاون سے فرانسیسی علاقے کا انتظام آزادی کے ساتھ سنبھال لیا اور فرانس نے رائے عامہ کے اتفاق سے چوتھی جمہوریت بحال کر دی۔ یہ حکومت اساساً تیسری جمہوریت کے عین مطابق تھی۔ اٹلی میں بھی آزاد لوگوں نے جمہوریت کے لیے ووٹ دیے۔ جو معاملہ مثالیت پسند امریکیوں اور حقیقت پسند انگریزوں کے نزدیک سخت مشکل کا باعث تھا، آزاد شدہ لوگوں نے عمل سے اسے ختم کر دیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے جو سیاسی مسئلہ بہت نمایاں ہوا، وہ دوران جنگ میں بالکل واضح نہ تھا، یعنی مشرقی اور جنوبی و مشرقی یورپ پر روسیوں کا اقتدار۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ یالٹا میں مغربی طاقتوں نے روسیوں کے ساتھ نرم رویّہ اختیار کیا۔ ان کی فوجوں کو مغربی جانب بہت آگے بڑھنے دیا اور روسیوں نے پولینڈ، ہنگری، چیکوسلوواکیا اور بلقان

---

[1] Boulanger

میں آزاد انتخاب کے جو وعدے کیے تھے، حماقت سے انھیں صحیح سمجھ لیا گیا۔ اس نکتہ چینی کو تقویت برطانیہ کے ملائم شکم والے اصول سے پہنچتی ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ مغربی طاقتیں جلد سے جلد ۱۹۴۳ء میں بحیرۂ روم سے وادی ڈینیوب میں داخل ہو جاتیں اور روسیوں سے پیشتر وہاں پہنچ جاتیں۔ اس نکتہ چینی کے حامی یہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں آہنی پردہ "بہت پیچھے چلا جاتا۔ مشرقی اور جنوبی و مشرقی یورپ روسیوں کے بجائے مغربی جمہوریتوں کے ساتھ ہوتا۔

اس دلیل کے سلسلے میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دو بنیادی حقیقتیں نظرانداز کی جا رہی ہیں، اوّل مشرقی یورپ کے اکثر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں مغربی وضع کی جمہوریت کی کوئی روایت موجود نہ تھی۔ ان میں سے زیادہ تر دوسری عالمی جنگ سے پیشتر فاشزم اور مطلق العنانی کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ دوم دورانِ جنگ میں مغربی لیڈروں یا مغربیوں کی رائے عامہ پر واضح نہ تھا کہ جرمنی اور جاپان کو اس قدر جلد شکست دی جا سکے گی۔ چرچل جیسا لیڈر بھی ــــ جو روسیوں کو قطعاً قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا تھا اور جس نے جنگ کے بعد "آہنی پردے" کی ترکیب وضع کی ــــ روسی آبادی اور روسی مادی وسائل کے چھن جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں یالٹا کی کانفرنس ہوئی، اس وقت تک جاپان زور و شور سے جنگ کر رہا تھا اور روسیوں کو مطمئن کرنا حد درجہ ضروری تھا۔

مشرقِ بعید کے سیاسی مسائل کم از کم دورانِ جنگ میں زیادہ نازک نہ تھے۔ اس امر پر عام اتفاق تھا کہ جاپانیوں کے مقابلے میں چینی قوم پرستوں کی حمایت ضروری ہے، اگرچہ ان کی حکومت کتنی ہی رشوت خور اور نااہل تھی۔ جاپانی شہنشاہ کو تخت پر بحال رکھنے کے معاملے سے بھی مغرب میں کچھ زیادہ اختلاف نہ کیا گیا۔ مشرقِ بعید میں جو نازک فیصلے ہوئے، وہ یورپ اور جاپان میں فتح کے بعد ایک نازک دور میں ہوئے ــــ جب اکثر مغربی لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جس صلح کا انتظام کیا جا رہا ہے، وہ بھی اجرائے جنگ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے وہ سخت مایوس ہوئے۔ اب ہم اسی دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ستاسیواں باب

"سرد جنگ" اور بعد کے بین الاقوامی حالات

(۱)

تمہید اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ جنگ عموماً میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، انھیں دور کرنے میں بڑے سال لگتے ہیں اور کسی رسمی صلح سے ان کا پورا مداوا کبھی نہیں ہوا۔ سابقہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں کہ پہلی عالمی جنگ نے یورپی قوموں کو جو نقصان پہنچایا تھا، اس کی تلافی میں طویل وقت صرف ہو گیا۔ مثلاً فرانس میں جانی نقصانات اتنے زیادہ ہوئے کہ انھیں پورا کرنا غیر ممکن تھا۔ دوسری عالمی جنگ کا نقصان پہلی سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا، کیونکہ میدان ہائے جنگ بہت دُور افتادہ تھے۔ نازیوں نے اجتماعی مرکزوں میں لوگوں کو اندھا دھند قتل کر ڈالا۔ فضائی حملوں، بھوک اور بیماری سے بھی غیر مصافی آبادی کو شدید نقصان پہنچے۔ اس جنگ میں صرف اتلافِ نفوس کا جو اندازہ کیا گیا، وہ دو کروڑ بیس لاکھ سے کم نہیں۔ نصف سے زائد غیر مصافی تھے اور یہ اعداد پہلی عالمی جنگ سے کم از کم دگنے تھے۔ املاک کے نقصان کا اندازہ بتیس کھرب ڈالر کیا گیا ہے، جو پہلی عالمی جنگ سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ان دردناک اور بے اندازہ نقصانات کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی، مگر اکثر ملکوں میں ۱۹۴۵ء کے بعد دس سال کے اندر اندر ان نقصانات کی ایک حد تک تلافی ہو گئی۔ کیونکہ شرح پیدائش بڑھ گئی، نیز اقتصادی تعمیرِ نو اور عہدِ حاضر کی آسائشوں کے بڑے عمدہ منصوبوں پر کاربندی شروع ہو گئی۔

موجودہ جنگوں سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں سب سے بڑھ کر پیچیدہ مسئلہ بین الاقوامی سیاسیات کی تعمیرِ نو کا ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۴۵ء کے بعد یورپی مملکتوں کی نو آبادیوں اور مقبوضات میں وسیع انقلابات بپا ہوئے۔ سامراجی بندھن ڈھیلے ہو گئے۔ پاک و ہند اور انڈونیشیا جیسی نئی خود مختار مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ یہ ایک زمانے میں مغربی مقبوضات تھیں۔ محوری جابروں کی شکست کے بعد دنیا میں بین الاقوامی ربط و ضبط کے نئے سلسلے شروع ہوئے۔ جمہوریہ امریکہ اور روس کی حریف مملکتیں اس کشمکش میں ایک دوسری سے بالمقابل تھیں جسے "سرد جنگ" کہا جاتا ہے۔

یہ مشکلات ایسی نہیں، جن کی مثال پہلے موجود نہ ہو۔ پہلی عالمی جنگ اور ۱۹۱۹ء کے معاہدۂ ورسائی کے بعد بھی سیاسی ہنگامے پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۱۵ء میں وی آنا کے مقام پر جو فیصلے کیے گئے تھے، اگرچہ وہ اب خاصے تسلی بخش معلوم ہوتے تھے، اگر وہ بھی ۳۱-۱۸۳۰ء کے انقلابات سے محفوظ نہ رہے، جنھیں دبانے کے لیے میٹرنخ نے انتہائی کوشش کی تھی۔ ممکن ہے دوسری عالمی جنگ کے بعد کا دور آئندہ زمانے کے مؤرخین کو معمولی سے زیادہ سخت نظر آئے، جنھیں ہمارے مقابلے میں نظرِ بازگشت کا بہتر موقع حاصل ہوگا۔

بین الاقوامی دائرے میں نئے اور پرانے عناصر

جنگ سے بعد کے دور میں نئے عناصر یقیناً پیدا ہوئے۔ ایٹمی بم، دور دور پھینکے جانے والی میزائلوں، جراثیمی جنگ اور دوسرے خوفناک اسلحہ کے یقینی ممکنات نے پہلی مرتبہ یہ ثبت اور معقول خطرہ پیدا کیا کہ اب نئی عالمی جنگ شروع ہوئی تو اغلب ہے، وہ نسل انسانی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے یا کم از کم تہذیب کی مادی اور اخلاقی بنیادیں ڈھا دے اور عالم انسانیت کے لیے پھر ایک نئے حجری دور کا انتظام کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حملے اور دفاع یا انسانی تباہ کاری اور انسانی تعمیر و تلافی کی صلاحیتوں کے درمیان زمانۂ قدیم سے جو توازن چلا آتا ہے، وہ حقیقۃً تبدیل ہو گیا اور حملہ سراسر تباہی کا موجب ہوگا۔ تاہم اس بیان کی تصدیق تجربے کی بنا پر نہیں ہو سکی اور دونوں جنگوں کے نہایت دہشت انگیز واقعات کے باوجود آج سطح ارض پر اتنے انسان موجود ہیں اور اتنی دولت فراہم ہے کہ پہلے کوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مزید برآں بین الاقوامی سیاسیات میں مملکتوں کا صرف ایک نظام ——— صرف ایک دنیا کا وجود ——— ایک نئی چیز تھی۔ کولمبس کے زمانے سے تہذیب ایک دنیا تعمیر کر رہی تھی۔ پہلی عالمی جنگ میں اس کا تصور واضح طور پر سامنے آ گیا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد جو چیز اقوال تک محدود تھی، وہ حقیقت ثابتہ بن گئی۔ روئے زمین پر اب بھی ایسے دور افتادہ گوشے موجود ہیں، جہاں کے باشندوں کو بین الاقوامی سیاسیات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، لیکن زیادہ تر منظم سیاسی وحدتیں یا تو مغربی جتھے میں شامل ہیں یا روسی جتھے میں یا یہ کہیے کہ دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے کے لیے مذبذب ہیں۔

حریف جتھوں کے حقیقی لیڈروں کے لیے یہ منصب بالکل نیا تھا۔ نپولین اور قیصر کی عالمی جنگوں میں برطانیہ یا فرانس یا جرمنی مخالفانہ گروہوں کے مرکز تھے۔ اب جمہوریۂ امریکہ اور روس غیر مشتبہ طریق پر عالمی قوت کے نقطہ ہائے ماسکہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ روس پیٹر اعظم کے وقت سے بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم رکن تھا اور اگرچہ جمہوریۂ امریکہ نظریات کی علیحدگی کے باوجود وقت قیام سے بین الاقوامی سیاسیات میں سرگرم رہی، تاہم صدی کے پانچویں عشرے تک ان میں سے کسی مملکت نے لیڈر کی حیثیت اختیار نہ کی۔

لیکن حالات کو اتنی سادہ شکل میں پیش کر دینا سخت غلطی ہے ——— جیسا کہ بعض وقائع نگاروں کا شیوہ ہے۔

یقیناً صرف جمہوریۂ امریکہ اور روس ہی اعلیٰ درجے کی طاقتیں شمار نہیں ہوتیں اور باقی دنیا کو نظرانداز کر دینا ٹھیک نہیں۔ یقیناً یہ دونوں مملکتیں بہت بڑی ہیں۔ وہاں آبادی بھی بہت زیادہ ہے اور بالقوہ یا بالفعل پیداوار بھی یقیناً بہت بڑھی ہوئی ہے، تاہم دونوں کو اکٹھا بھی کر دیا جائے تو ان میں پورے کرۂ ارض کی صرف ۱/۵ آبادی موجود ہے۔ پھر جمہوریۂ امریکہ کی غیر معمولی صلاحیت پیداوار کی بنا پر دونوں مملکتوں میں پیداوار کا بہت بڑا حصہ آجاتا ہے۔ بایں ہمہ دونوں مل کر بھی باقی دنیا کی صلاحیت پیداوار کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ان میں سے کوئی بھی مملکت مادی اعتبار سے کفیل بالذات نہیں۔ دونوں کے لیڈروں نے عملاً واضح کر دیا کہ دونوں کی رقابت کفیل بالذات وحدتوں کی بنا پر نہیں، مقابلے کی بنا یہ ہے کہ کون باقی دنیا کی سرگرم وفاداری حاصل کر سکتی ہے۔

اگر ان کی رقابت نے جنگِ عام کی شکل اختیار کی تو اغلب یہ ہے کہ جنگ کا فیصلہ اس مملکت کے حق میں ہوگا، جو ممالک کے مستحکم ترین اجتماع کی وفاداری حاصل کر سکے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ جنگ مختلف ممالک کے اشتراک کی جنگ ہوگی۔ زمانۂ ماضی میں کامیاب اتحاد ان قوتوں کے خلاف ہوتے رہے، جو مقابلہ کرنے والوں کو جابر اور امن شکن معلوم ہوتی تھیں۔ گویا دنیا کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ جو لوگ نہ روسی ہیں اور نہ امریکی، وہ سوویٹ یونین اور جمہوریۂ امریکہ میں سے حقیقتہً کسے جابر سمجھتے ہیں۔ غرض روس اور امریکہ کی رقابت کا منتہٰی انسانیت کے قلب و روح ہیں۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ رقابت نئی نہیں۔ اب اس نے موجودہ شکل میں جو گہرائی اور شدت اختیار کی، وہ عناصر کے نئے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ مثلاً اٹھارھویں صدی کی جنگیں زیادہ تر صرف اقتدار، صرف علاقائی اور مادی فوائد کے لیے تھیں۔ غالباً انھیں جذباتی قوم پرستی کا رنگ ایک محرکِ اضافی کے لیے دیا گیا۔ انقلاب فرانس اور انیسویں صدی کی جنگوں میں قوم پرستی زیادہ زور شور سے شامل ہو گئی اور اقتدار کے لیے کشمکش کے ساتھ یہ اب بھی بہت بڑا عنصر ہے، جو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، مگر اب جمہوریۂ امریکہ اور روس کے درمیان اس کشمکش نے حقیقی مذہبی کشمکش کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس غرض سے ہمیں ایک متوازی کشمکش کی مثال دینی چاہیے۔ اس سلسلے میں عہد حاضر کے ابتدائی دور کی وہ غیر واضح کشمکشیں پیش نہیں کی جا سکتیں، جو کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے درمیان ہوئیں، بلکہ اس سے پیشتر کی وہ کشمکش سامنے لائی جا سکتی ہے، جو مسیحیت اور اسلام کے درمیان ہوئی تھی۔ کمیونزم اور مغربی جمہوریت کے درمیان کشمکش کا جو نمونہ روس اور جمہوریۂ امریکہ پیش کر رہے ہیں — اور روئے زمین پر انسانی تقدیر کی تعبیرات کے باب میں ایک دوسرے کے حریف ہیں اور ایک دوسرے کو ناقابل برداشت تصور کرتے ہیں — یہ مذاہب کی ایسی ہی کشمکش ہے، جو دنیا کی تقسیم گوارا نہیں کر سکتے تاہم مسیحیت اور اسلام صدیوں تک اس تقسیم کو قبول کیے بیٹھے رہے۔

یورپ میں کمیونسٹ بلاک

جرمنی اور جاپان میں ختم ہونے کے بعد دنیا کے اکثر حصے یا تو روس کے ساتھ ہو گئے یا جمہوریۂ امریکہ کے ساتھ۔ یالٹا کی کانفرنس کے بعد مغربی مدبروں کو امید تھی کہ مشرقی یورپ اور بلقان کے ملکوں کو آزادانہ حسبِ منشا حکومت قائم کر لینے کا پختہ وعدہ پورا کیا جائے گا — ان کا خیال تھا کہ اگر وہ ملک چاہیں گے

تو مغرب سے وابستہ ہو جائیں گے ـــــ مگر روسیوں نے اس وعدے کو پس پشت ڈال دیا۔ روسیوں نے ایک پارٹی کی سیاسیات کے معروف طریقوں سے کام لیا۔ اپنی نگرانی میں انتخاب کرائے، پابندیاں عائد کیں، ہر قسم کے دباؤ ڈالے، اس طرح اپنی مرضی پر چلنے والے ملکوں کا ایک مستحکم بلاک تیار کرلیا جنھیں آج کل آہنی پردے کے ملک کہا جاتا ہے۔ ان سے متصل مغرب میں جو ملک تھے ـــــ فن لینڈ کا ایک حصہ، ایسٹونیا، لیٹویا، لتھونیا، پولینڈ کا ایک حصہ اور رومانیا ـــــ انھیں دوسری عالمی جنگ کے آغاز ہی میں روسیوں نے اپنے اندر جذب کرلیا تھا اور سوویٹ روس کی یونین کے اجزا بنا لیا تھا۔ پھر انھوں نے مشرقی پروشیا کا الحاق کرلیا اور کونگس برگ[1] ـــــ جو مشہور فلسفی کانٹ کا وطن ہونے کے اعتبار سے جرمنوں کے نزدیک مقدس ہے ـــــ اب کلینن گراد[2] کہلاتا ہے۔ یہ نام روسی جمہوریت کے صدر کے نام پر رکھا گیا۔ مشرقی اور جنوبی و مشرقی یورپ میں انھوں نے "عوامی جمہوریتیں" بنائیں ـــــ پولینڈ، چیکوسلواکیا، رومانیا، ہنگری، بلغاریا اور البانیا میں ـــــ یہ ان کی پٹھو مملکتیں ہیں اور یہاں کی حکومتیں کمیونسٹ ہیں۔

روسی فوجوں نے ایک تہائی جرمنی پر قبضہ کرلیا۔ یہ علاقہ سرسری طور پر دریائے ایلب اور دریائے اوڈر کے درمیان ہے۔ یہاں انھوں نے مشرقی جرمنی کی جمہوریت بنادی۔ یہ بھی انھی کی پٹھو ہے۔ جرمنی کا جو حصہ دریائے اوڈر کے مشرق میں ہے وہ براہ راست روس میں شامل کرلیا گیا اور یہ پولستانی حکومت کے حوالے کردیا گیا جو ان کی پٹھو ہے۔ صرف مشرقی پروشیا کے بعض حصے چھوڑے گئے۔ پھر یہاں سے جرمنوں کی آبادی اٹھا کر یا تو مشرقی جرمنی میں پہنچا دی گئی یا جلاوطن کر دی گئی اور جرمنوں کی جگہ پولستانی آباد کیے۔ فن لینڈ روسی نظام کا ایک جزو بن گیا۔ مگر بعد میں اسے دوسری متعلقہ مملکتوں سے زیادہ اختیارات دے دیئے گئے۔ آسٹریا مشرق اور مغرب کی قابض فوجوں کے درمیان تقسیم کردیا گیا تھا۔ اسے جرمنی سے الگ کر دیا گیا اور ہٹلر نے جو اتحاد پیدا کیا تھا، وہ توڑ دیا گیا۔

جرمنی میں روس اور اتحادی حلقوں کے درمیان جو خط کھچا ہوا ہے، برلن اس کے مشرق میں ہے۔ اس کے مختلف حصے روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ یہاں یکم اپریل ۱۹۴۸ء سے روسیوں نے "سرد جنگ" کا نہایت تشویش افزا سلسلہ شروع کیا۔ مغربی جانب سے مشرقی جانب آنے والی سڑکیں بند کر دیں اور اتحادیوں کو مجبور کیا کہ برلن پورے کا پورا روسیوں کو دے دیا جائے۔ اتحادیوں نے سختی سے انکار کیا اور اپنے متصرفہ حصے کو صرف ہوائی جہازوں کے ذریعے سے ضروری سلسلہ پہنچانے کا یقیناً قابل فخر کارنامہ انجام دیا۔ ناکابندی کے چھ مہینوں میں اتحادی ہوائی جہازوں نے تیئس لاکھ ٹن جنسیں مغربی برلن پہنچائیں۔ ان میں کوئلہ، اشیاء خوردنی اور دوسری ضروری چیزیں شامل تھیں۔ روسیوں نے مشرقی برلن میں بھی ناکابندی کرلی۔ یکم ستمبر کو روسیوں نے ناکابندی ترک کردی اور برلن کے حالات معمول پر آگئے، لیکن مشترکہ تصرف کی غیر طبعی حیثیت بدستور قائم ہے۔

---

[1] Konigsberg

[2] Kaliningrad

یوگوسلافیا

مشرقی یورپ میں روسی پٹھوؤں کے بڑے بلاک میں صرف ایک خلل پیدا ہوا۔ یوگوسلافیا نے ۱۹۴۱ء میں جرمنوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہاں دوران جنگ میں چھاپا مار دستوں نے سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے دو بڑے گروہ تھے، ایک کو چیٹنک[1] کہتے تھے جس کا رئیس جرنیل مخائیلووچ[2] تھا۔ یہ قدامت پسند سربوں کا نمائندہ تھا جو جنوبی سلافی مملکت پر اقتدار کے طلبگار تھے۔ دوسرے گروہ کا رئیس جوزف بروز[3] تھا۔ یہ کمیونسٹ تھا اور اس نے خفیہ سرگرمیوں کے زمانے میں ٹیٹو نام اختیار کر لیا تھا اور اسی نام سے اس نے شہرت پائی۔ جنگ جاری ہی تھی کہ ٹیٹو کے کمیونسٹوں نے چیٹنکوں پر فوقیت حاصل کر لی اور چیٹنک کمیونسٹوں کے لیے جنگ جاری رکھنے کے بجائے جرمنوں اور اطالویوں سے سمجھوتا کر لینے کے حق میں تھے۔ ۱۹۴۳ء تک اتحادیوں کی نگاہیں صرف ایک مقصد پر جمی ہوئی تھیں اور وہ یہ کہ ہٹلر کو شکست دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے ٹیٹو کی امداد کے لیے سامان بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں روسی بلغراد پہنچے تو ان کا کمیونسٹ رفیق ٹیٹو تمام اختیارات پر قابض تھا۔

روسیوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ یوگوسلافیا طبعاً ان کا ساتھی ہے، لیکن جون ۱۹۴۸ء میں دنیا یہ معلوم کر کے حیرت زدہ رہ گئی کہ ٹیٹو کی حکومت کو کمیونسٹ مملکتوں کی یونین کے پروپیگنڈے سے خارج کر دیا گیا۔ اس یونین کو اصطلاح میں کومن فارم[4] کہتے ہیں۔ تھوڑی ہی مدت بعد یوگوسلافیا اور روسیوں کے درمیان تعلقات ختم ہو گئے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی شروع ہو گئی۔ یوگوسلافیا بدستور کمیونسٹ مملکت رہا، اگرچہ ۱۹۴۸ء کے بعد ٹیٹو نے زمینوں میں اجتماعی کاشت کی رفتار مدھم کر دی اور مغرب سے امداد طلب کی۔ ہمارے موجودہ انداز ے کے مطابق یوگوسلافیا کی قوم پرستی کمیونزم کے مقابلے میں زیادہ مستحکم ثابت ہوئی۔ ٹیٹو اور سٹالن کے درمیان تعلقات ٹوٹ گئے اور ٹیٹو جیسی زبردست شخصیت سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ ماسکو سے احکام حاصل کرتا رہے گا۔ یہ دراصل یوگوسلافیا کے قومی احساسات کی قوت کا مظاہرہ تھا۔

چین

مشرق میں روسیوں نے جنگ کے اختتام پر دنیا کا سب سے زیادہ کثیر النفار ملک اپنے بلاک میں شامل کر لیا۔ یعنی چین، جہاں پچاس کروڑ انسان بستے ہیں۔ اس سرزمین کے ساتھ زمانہ ماضی میں جمہوریۂ امریکہ کے تعلقات حد درجہ دوستانہ چلے آتے تھے اور یہ جمہوریت چین کو "کھلے دروازے کی پالیسی" کی بنا پر یورپی اور جاپانی اقدامات سے سالہا سال تک محفوظ کرتی رہی۔ اب یہ سرزمین رسمًا امریکہ کے دشمنوں میں شامل ہو گئی۔ واقعات کے اس رخ نے امریکہ میں بڑی تلخی پیدا کی۔ تلخی کا اظہار اس واقعے سے بھی کیا گیا کہ امریکہ نے کمیونسٹ چین کو رسمًا ماننے سے انکار کر دیا اور اس

۱؎ Chetniks

۲؎ Mikhelovich

۳؎ Broz

۴؎ Cominform

وجہ سے بھی کہ حکومت امریکہ، خصوصاً متعلقہ وزارت نے چین میں حالات اس درجہ بگاڑ دیے کہ کمیونسٹ وہاں قابض ہو سکے، بیشک امریکہ کی حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی نہ کی ہو۔

یہ واقعات اتنے تازہ ہیں کہ ان کے متعلق غیر جانبدارانہ اندازے کی امید رکھنا حماقت ہوگی، مگر کہا جا سکتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی جرنیل مارشل کی گفت و شنید ناکام ہو چکی تھی تو چین کی قوم پرست حکومت کو صرف پوری امریکی امداد کی بنا پر چین میں مسلط رکھا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں تقریباً یقین تھا کہ امریکی فوجیں بھی استعمال کرنی پڑیں گی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۴۹ء میں ناممکن تھا کہ کوئی امریکی حکومت رائے عامہ کی حمایت کے بھروسے پر چین میں جنگ شروع کر سکتی۔

کمیونسٹ بلاک میں کشمکش کمیونسٹ بلاک وسیع علاقے پر حاوی ہے، اس میں ایسی مملکتیں شامل ہیں جو باہم ملی ہوئی ہیں: لیپزگ[1] سے ولادی واسٹک اور پیکنگ تک جاتی ہیں۔ ان میں براعظم یوریشیا کا قلب شامل ہے۔ یہ بلاک کتنا مستحکم ثابت ہوگا؟ اسے ہمارے زمانے کا ایک لاینحل مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ بظاہر یہ محفوظ رہا اور بعض مبصر سمجھتے رہے کہ اندر اندر کوئی بڑی بحرانی حالت پیدا ہو رہی ہے۔ پھر سٹالن نے ۱۹۵۳ء کے اوائل میں وفات پائی۔ اس کے بعد کچھ نشان ایسے ظاہر ہوئے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ عوام اختیارات کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ تیس سال پیشتر لینن کی وفات پر بھی یہی حالت پیدا ہوئی تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد کمیونسٹ بلاک دو کشمکشوں کا ہدف بنا رہا ہے، جن کا باہم تعلق ہے۔ اوّل اس کی تمام ترکیبی مملکتیں، جن میں دو بڑے علاقے بھی شامل ہیں، یعنی روس اور چین، ان داخلی مسائل سے دوچار ہیں، جو کمیونسٹ انقلابات نے پیدا کیے۔ انھیں انقلابات کا یہ نتیجہ ہیں۔ جو انقلابات ہو چکے، ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ نیا معاشرہ قائم کرنے کے لیے بہت بڑی جدوجہد کے ابتدائی جوش کا دور گزر جاتا ہے تو تناؤ اور تطابق کا دور شروع ہوتا ہے۔ ممکن ہے، روس اس دور سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہو جو فرانسیسی انقلاب میں تھرمیڈور کہلایا، لیکن کمیونزم نے عوام سے بڑے بڑے وعدے کیے تھے، مثلاً یہ کہ امن قائم ہو جائے گا۔ مادی سر و سامان کی افراط ہوگی۔ سب کی زندگی بڑی اچھی گزرے گی اور اس سے حیات بعد الموت نہیں، بلکہ اسی دنیا کی زندگی مراد ہے اور یہ دور بہت جلد آ جائے گا۔ کمیونسٹ مملکتوں میں یہ وعدے اب تک پورے نہیں ہوئے۔ ممکن ہے، یہ جزواً اس حد تک پورے ہو جائیں کہ ان مملکتوں کی آبادیاں معقول حد تک مطمئن بیٹھی رہیں۔ ممکن ہے، انھیں کسی حد تک نرم کر لیا جائے اور سمجھوتے کی کوئی صورت نکلے۔ ممکن ہے وہ آبادیاں ان کی جگہ کوئی دوسری چیز قبول کر لیں، مثلاً مہمل قومی دعوے، جیسے روس نے کیے، یعنی یہ کہ ہر اچھی ایجاد حقیقۃً روسیوں نے کی۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ یہ امر قابل غور

---

[1] Leipzig

یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک

1. رشین سوویٹ فیڈریٹو سوشلسٹ ری پبلک
2. سفید روس
3. یوکرین
4. جارجیا
5. آرمینیا
6. آذربیجان
7. ترکمانستان
8. ازبکستان
9. تاجیکستان
10. کرغیزری پبلک
11. قازقستان
12. کریلیا
13. ایسٹونیا
14. لیٹویا
15. لتھوانیا
16. مولڈیویا



ہے کہ سوویٹ روس کی حکومت نے جنگ کے بعد بھی پنجسالہ منصوبہ قائم رکھا اور صارفین کے سامان پر خاص زور دیا، یعنی ایسا سامان، جو عام لوگ اپنے استعمال کے لیے خریدتے ہیں۔

ہم کمیونسٹ بلاک میں دوسری ممکن کمزوری کے متعلق ذرا زیادہ یقین سے کہہ سکتے ہیں۔ اس بلاک کی مملکتیں بہرحال قومی مملکتیں ہیں۔ ان میں سے بعض کی شعوری زندگی خاصی لمبی ہے۔ وہ خود مختار مملکتیں اور معاشرے رہے ہیں۔ جو مقالہ نگار لفظوں کو عمل سمجھ لیتے ہیں، وہ مارکس کے اس قول کو وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں کہ "کمیونزم" نے قوم پرستی کو حقیقتہً لفظاً اور معناً بالکل ختم کر دیا ہے، لیکن مورخین کو یہاں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ان کا رجحان یہ ہے کہ کمیونزم کے جادو نے ان قوم پرستانہ قوتوں پر قابو نہیں پایا، جو زمانۂ ماضی میں ایسی خود آگاہ مملکتوں اور معاشروں کے ایک کاملاً متحدہ بلاک میں انضمام کے خلاف کارفرما رہیں۔ یہ پیشگوئی سراسر مہمل ہو گی کہ پولینڈ، چیکوسلواکیا، چین ٹیٹو کا طریقہ اختیار کریں گے اور یوگوسلافیا کی پیروی کرتے ہوئے ماسکو سے رشتہ توڑ لیں گے، مگر یہ کہنا ایک عام تاریخی حقیقت ہے کہ موجودہ روسی کمیونسٹ اشتراک ان کشیدگیوں اور کشمکشوں سے ہرگز محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا، جو ایسے اشتراکوں کی باہم وابستگی کو حد درجہ مشکل بناتے رہے ہیں۔

روسی بلاک سے باہر کے کمیونسٹ

روس اور کمیونسٹ ملکوں کے بلاک سے باہر بھی کمیونزم روسی اثرات کے تحت قوت کے مختلف درجوں میں ساری دنیا کے اندر کارفرما ہی ہے۔ ۱۹۴۵ء سے ان درجوں کی ملک بہ ملک پیمائش مشکل ہے۔ دنیا کے بعض حصوں میں ـــــ ملایا اور ہند چینی ـــــ کمیونسٹوں نے بہت جلد جنگجو گروہ منظم کر لیے، جو ملکی گروہوں کے ساتھ ہو کر میدان میں لڑتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے شمالی ہند چینی میں اقتدار حاصل کر لیا۔ دوسرے حصوں میں کمیونسٹوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا، مثلاً برطانیہ میں۔ مگر وہ خفیہ خفیہ سرگرم عمل ہیں۔ بعض حصوں میں ان کی آئینی طور پر منظم پارٹیاں موجود ہیں۔ اور وہ قانون ساز مجلسوں کے انتخاب میں حصہ لیتے ہیں، مثلاً فرانس اور اٹلی میں۔ یہاں ان کی قوت کا پیمانہ یہ ہے کہ انھوں نے عام ووٹوں سے قومی مجلسوں میں کتنی نشستیں حاصل کیں، مگر یہ پیمانہ اکثر گمراہ کن ہو سکتا ہے، مثلاً فرانس میں کمیونسٹوں نے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۵۱ء کے عام انتخابات میں ایک چوتھائی سے کسی قدر زیادہ نشستیں حاصل کر لیں، لیکن فرانسیسی حالات کو جاننے اور سمجھنے والے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کمیونسٹ ووٹوں کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ پارٹی کے جنگجوؤں کا نمائندہ ہے۔ اکثر لوگوں نے صرف احتجاجاً ووٹ دیے۔ مزدوروں کا احتجاج یہ تھا کہ رہنے سہنے کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ اہل علم اور دوسرے اصحاب کا احتجاج یہ تھا کہ جنگ کے بعد فرانسیسی کابینوں نے کچھ بھی نہ کیا اور امریکہ کی طرف سے فرانسیسی ثقافت، نیز سیاسی آزادی کو خطرہ لاحق تھا۔

غیر کمیونسٹ دنیا میں کمیونزم کی داخلی تحریک کو بہ غرض سہولت سرسری طور پر دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کمیونسٹوں کی ایک قسم وہ ہے، جو "سیاہ فام" لوگوں کی سرزمینوں میں موجود ہے۔ یہ سرزمینیں ماضی قریب تک ـــــ یا اب

بھی مغرب کے ساتھ سامراجی رشتوں میں بندھی ہوئی ہیں۔ دوسرے کمیونسٹ وہ ہیں، جو مغربی مملکتوں میں کارفرما ہیں۔ پہلے گروہ۔ جنوبی ومشرقی ایشیا، ہندوستان، افریقہ اور مشرقِ قریب ۔۔۔ کی کمیونزم نے صرف طبقوں اور پسماندہ لوگوں کے اقتصادی جذبوں ہی کو نہیں ابھارا، ملکی قومی اور نسلی جذبوں پر بھی ضرب لگائی، جنھوں نے مغرب کے ساتھ دیرینہ سامراجی روابط میں نشوونما پائی۔ دوسرے گروہ میں وہ کمیونسٹ ہیں، جو پروپگنڈے کی غرض سے قوم پرستی کو بھی یوں اپیل کرتے ہیں، جو مارکس کو بھی ہراس زدہ کر دے۔ ان کا انحصار زیادہ تر غیر مطمئن پرولتاریا پر رہا ہے اور اہلِ علم ان کے ہمدرد ہیں۔

اٹھائیسواں باب

"سرد جنگ" اور بعد کے بین الاقوامی حالات

(۲)

آزاد دنیا دوسری عالمی جنگ کے بعد جمہوریۂ امریکہ آزاد دنیا کی لیڈر بن گئی۔ یہ اُن ملکوں کا اشتراک ہے، جو بڑے روسی اشتراک کے مخالف ہیں۔ اس مغربی جھتے میں دولت مشترکہ برطانیہ اور سلطنت، نیز فرانس، فرانسیسی یونین، مغربی یورپ عموماً، مغربی جرمنی، یونان، ترکی، مشرق قریب، لاطینی امریکہ اور جاپان، جو زمانۂ قریب تک دشمن تھا، شامل ہیں۔ منظم پیداواری سرگرمیاں، بالقوہ مادی وسائل اور موجودہ آبادی کے اعتبار سے یہ اشتراک روسی بلاک سے زیادہ مستحکم ہے۔ بساطِ ارضی کے اعتبار سے بھی اس اشتراک کی کیفیت یہی ہے، اگرچہ بظاہر کمیونسٹ بلاک کے ممالک یکجا نظر آتے ہیں اور "آزاد دنیا" کی سرزمینیں منتشر ہیں، مگر دورِ حاضر کی بحری اور فضائی قوت نے "آزاد دنیا" کے اشتراک کو فوجی اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔

۱۹۴۵ء کے تھوڑی مدت بعد جمہوریۂ امریکہ نے ایسی تدبیروں میں پیش دستی کی، جن سے غیر کمیونسٹ مملکتوں کو تقویت پہنچے، خصوصاً یورپ میں — تاکہ وہ باہر سے کمیونسٹوں کے امکانی بیرونی جارحانہ اقدامات، اور اندرونی تخریبی کارروائیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ۱۹۴۷ء میں امریکہ نے مارشل کے منصوبے کی سرپرستی کی۔ یہ منصوبہ جنرل مارشل کے نام سے موسوم ہوا، جو اس زمانے میں وزیرِ مملکت تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ دوسری عالمی جنگ میں جو نقصانات پہنچے اور کاروبار میں جو برہمی پیدا ہوئی، اس کی تلافی کے لیے اقتصادی بحالی کی تدبیریں تیز تر کر دی جائیں۔ یوں ان حالات کی اصلاح کر لی جائے، جن سے کمیونسٹ عموماً فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جمہوریۂ امریکہ نے شمالی اوقیانوس کے معاہدے کی سرپرستی کی، جو عموماً "نیٹو"[1] کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک دفاعی اتحاد تھا، جس میں یورپ اور امریکہ کی وہی مملکتیں شامل نہ تھیں، جو شمالی اوقیانوس کے کناروں پر واقع تھیں، بلکہ اٹلی، یونان اور ترکی بھی شامل ہو گئے۔

---

[1] North Atlantic Treaty Organization — Nato

۱۹۴۵ء سے "آزاد دنیا" کا اصل مسئلہ اتنا فوجی نہ تھا، جتنا سیاسی تھا، یعنی آیا "آزاد دنیا" کمیونسٹ بلاک کے خلاف واقعی متحد ہے؟ آیا اسے متحد رکھنے کے لیے سیاسی اور اخلاقی وسائل موجود ہیں؟ "آزاد دنیا" یکساں آزاد نہیں۔ مغرب میں جو آزاد خیال لوگ نظریاتی تکلفات میں مبتلا ہیں، انھیں شکایت ہے کہ اس بلاک کی بعض مملکتیں —— فرینکو کا ہسپانیہ، سالازار[1] کی نرم ڈکٹیٹری کے تحت پرتگال —— مطلق العنان اور غیر جمہوری مملکتیں ہیں اور پیرون[2] کے ماتحت ارجنٹینی جمہوریت صرف مطلق العنان ہی نہیں، بلکہ اس نے مغرب کی حمایت قبول بھی نہیں کی۔ اسی طرح لاطینی امریکہ کے بہت سے ملک ہیں، جو جمہوریتوں سے دور ہیں۔ پھر پورے مشرق قریب میں فلاکت زدہ عوام نہیں، بلکہ صرف خود غرض "افندی" یعنی بڑے لوگ ہیں، جو مغرب کی حمایت کر رہے ہیں اور افریقہ بھر میں امریکہ کے حلیف —— برطانیہ، فرانس، پرتگال اور بلجیم —— حبشیوں کو سامراج کے رشتوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور حبش جس کی حیثیت ازمنۂ وسطیٰ کی ایک مملکت کی ہے، آزاد حکومت کا محض ایک اضحوکہ ہے۔ اس الزام تراشی کا جواب کوئی مبصر یہ دے گا کہ یہ بڑی حد تک درست ہے۔ اگر مبصر سادہ حقیقت پسندی کے اظہار پر قناعت کرے گا تو کہہ سکے گا کہ "سرد جنگ" جیسے بین الاقوامی بحران میں دشمن کا دشمن تمہارا دوست ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ فرینکو، سالازار، پیرون اور دوسرے ڈکٹیٹر کم از کم کمیونسٹوں کے سخت دشمن ہیں۔

صرف مثالیت پسندوں کے سوا سب لوگ اس آخری دلیل کو قبول کرلیں گے۔ لیکن دنیا کے حالات کا زیادہ گہرا تجزیہ کرنے والا کہہ سکے گا کہ ممکن ہے آگے چل کر رفتہ رفتہ مغربی طاقتیں اپنا اثر براہ راست فرینکو کا تختہ الٹنے کے لیے استعمال نہ کریں، مگر ایسے حالات کو تقویت پہنچائیں، جن میں اہل ہسپانیہ خود بخود زیادہ جمہوری معاشرہ تعمیر کرسکیں۔ یا دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ پوری دنیا یکایک زندگی کے وہ طریقے اختیار کرے گی، جنھیں ہم جمہوری کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی اختیار نہ کرے

یوں ہم دوسری عالمی جنگ کے بعد بین الاقوامی روابط کے ایک مرکزی پہلو پر پہنچ جاتے ہیں۔ جنگ نے امریکہ پر قیادت ٹھونس دی۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ نے اس منصب کی صلاحیت کے لیے اب تک کیا ثبوت پیش کیا؟ ۱۹۴۵ء کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان سے ظاہر ہوگیا کہ امریکیوں کو اس قسم کا تجربہ حاصل نہیں، جو روسیوں اور برطانویوں نے قیادت کے طویل دور میں حاصل کرلیا۔ امریکی مثالیت پسند لوگ بے صبر ہیں۔ وہ جلد سے جلد نتائج کے لیے مضطرب رہتے ہیں۔ وہ اس پرانی فرانسیسی مثل سے سبق سیکھ سکتے ہیں: "بہترین شے وہ ہے جو اچھائی کی دشمن ہو۔" لیکن واقعات نے امریکیوں کی صلاحیتیں بھی ظاہر کردیں۔ اگرچہ جمہوریہ امریکہ میں امتیاز رنگ کی مشکلات موجود ہیں، تاہم دوسری عالمی جنگ کے بعد سے درسگاہوں، افواج اور دوسرے دائروں نے حبشیوں کی علیحدگی کو ختم کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ سمندر پار ملکوں میں سانولے اور سیاہ فام لوگوں کے ساتھ ربط و تعلق میں امریکی اتنے متکبر نہیں، جتنے

---

[1] Salazar

[2] Peron لیکن پیرون حکومت سے نکالا جا چکا ہے۔

ان کے پیشرو انگریز تھے وہ جرمنوں کی طرح بھی نہیں، جو ہر وقت خام نسلی نظریات کے اعتقادات میں بہے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ امریکی ہندوؤں جیسی قوم کے نازک نظریات کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن ان میں مذہبی رواداری موجود ہے۔

امریکہ کے دشمن بدیہی وجوہ سے امریکیوں کو ایک اور فاتح و جابر قوم قرار دے رہے ہیں جو اسی طرح اقتدار چاہتی ہے جس طرح دنیا کو رہنے کا بہتر مقام بنانے میں ان کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ عالم انسانیت کو یقین دلا دیں، وہ دوسرے فاتحوں جیسے نہیں۔

جس جمہوری اشتراک کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ اس میں بھی قوم پرستانہ تنازعات اور کشمکشیں پیش آتی رہیں۔ وہ فخر، وہ اقتصادی مفاد اور وہ طویل روایات، جن کی بنا پر انگریز یا فرانسیسی یا جرمن یا باشندگان لکسمبرگ ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں، جن کا مطالبہ اشتراک کے دوسرے رکن نہیں کرتے، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ روسی بلاک میں بھی ایسی کشمکشیں موجود ہیں، مگر کمیونسٹوں کی مشکلات منظر عام پر نہیں آسکتیں، البتہ بعض واقعات مستثنیٰ ہیں، مثلاً ٹیٹو اور سٹالن کے درمیان تفرقہ۔ مغربی جمہوریتوں کے بلاک کی مشکلات ہر وقت منظر عام پر آسکتی ہیں۔

ممکن ہے ”آزاد دنیا“ کے اکثر ملکوں میں عام غرض مند شہری پیش نظر مسائل پر برسر عام یا درسگاہوں میں یا اخباروں میں یا سیاسی جلسوں میں بحثیں کریں۔ وہ تمام کمزوریوں کا جائزہ خارجی طریق پر لے سکتے ہیں اور ان کا پختہ عقیدہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کمزوریاں ذہن نشین ہو سکیں گی اور ان پر قابو پایا جا سکے گا۔ اگرچہ ہمیں ”آہنی پردے“ کے اندر کے حالات کا علم نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ کمیونسٹ ایسا نہیں کر سکتے۔ ان پر اوپر سے ایسا سخت ضبط و نظم قائم ہے کہ وہ مغرب کے متعلق یا اپنے متعلق حقیقت نہیں جان سکتے۔ دو عالمی جنگوں کے تجربے سے واضح ہو چکا ہے کہ اگرچہ اس قسم کے اختلافات بروئے کار آنے میں خطرات اور مشکلات پیش آسکتی ہیں، لیکن پوری اور منصفانہ بحث و تمحیص کے بعد دباؤ کے مقابلے میں نتیجے بہتر نکلتے ہیں، گویا ”آزاد دنیا“ کی آزادی خوبی ہے، عیب نہیں۔

پرانی بین الاقوامی کشمکشیں اور جھگڑے جن میں آزاد قومیں الجھی ہوئی تھیں، طے ہو چکے ہیں یا ان کی شدت کم ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات بڑی مشکل اور تکلیف دہ گفت و شنید کرنی پڑی۔ اس کی ایک مثال ۱۹۵۴ء میں پیش آئی۔ اطالوی جمہوریت اور ٹیٹو کے یوگوسلافیا کے درمیان ٹریسٹ کے علاقے کی تقسیم پر اتفاق ہو گیا، حالانکہ اطالویوں اور یوگوسلافیوں میں مدت سے یہ جھگڑا چلا آتا تھا۔ اسی طرح جنگی اہمیت کے ایک اور علاقے میں مدت سے جھگڑا چلا آ رہا تھا اور سخت بحثا بحثی رہی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں اس کی حیثیت بھی واضح کر دی گئی۔ یہ سار کا علاقہ تھا۔ عارضی طور پر فیصلہ ہو گیا کہ سیاسی اعتبار سے یہ علاقہ فرانس کے ساتھ مرتبط رہے، لیکن اس کی بے پناہ جرمن آبادی کو سیاسی خود مختاری کا وسیع درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ ۱۹۵۴ء میں سار کا جو فیصلہ ہوا، اگرچہ وہ قطعی نہیں، لیکن فرانس اور جرمنی کی روایتی تلخیوں میں تخفیف کی طرف ایک قدم تھا۔ یہ تلخی ۱۹۴۰ء میں نازیوں کے ہاتھوں فرانس کی وحشیانہ تسخیر کے باعث بہت بڑھ گئی تھی۔

بعض اعتبارات سے مغرب کے لیے یہ مشکل ہے کہ روسیوں کے پاس ایک نیا جارحانہ اور انقلابی عقیدہ موجود ہے، جو ہر مقام کے غریبوں کے لیے بطورِ خاص جاذب ہے۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت نپولین بڑے فرانسیسی انقلاب کا جانشین بنا۔ وہ دنیا کے غریبوں کو نئی چیز کا وعدہ دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، مگر اس کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ اہلِ مغرب دفاع کا وہی قدامت پسندانہ طریقہ اختیار کر لیں، جو میٹرنخ نے ۱۸۱۵ء کے بعد یا مغربی جمہوریتوں نے ۱۹۱۸ء کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مغربی قومیں اس خطرے سے برابر آگاہ رہیں۔ انھیں ایسا موقع نہ دینا چاہیے کہ وہ ہر حال میں قائم شدہ نظام کی حامی بنی رہیں اور عمرانی و اقتصادی تغیرات کی مخالفت کریں۔ ایشیا اور یورپ کے کم ترقی یافتہ ملکوں میں خصوصیت سے یہ خیال رکھنا ضروری ہے، جو ملک پسماندہ تھے، انھوں نے صدر ٹرومین کی اس افتتاحی تقریر کا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا جو ۱۹۴۹ء میں کی گئی تھی اور اس میں وعدہ کیا تھا کہ پسماندہ قوموں کو معیارِ معیشت بلند کرنے کے کام میں مدد دی جائے گی۔ ۱۹۴۵ء سے مغربی مملکتیں سمجھنے لگی ہیں کہ انھیں جمہوری عقیدے کو محض ایک نصب العین نہیں، بلکہ ایک حقیقت بنانا چاہیے اور ہر جگہ ترقی کی طرف قدم بڑھانا چاہیے۔

جنگِ کوریا

بعد از جنگ بین الاقوامی سیاسیات کی اس بحث و تمحیص میں ہماری توجہ دنیا کے دو مخالف جتھوں پر جمی رہی، جن میں سے ایک کی قیادت جمہوریہ امریکہ اور دوسرے کی سوویٹ روس کر رہے ہیں۔ یہ مخالفت جرمنی اور جاپان کی شکست کے بعد ابتدائی چند سال میں خاصی نمایاں رہی۔ یہ پروپیگنڈے، فریب کاری اور برلین کے کمیونسٹ محاصرے کی "سرد جنگ" کے ایام تھے۔ جون ۱۹۵۰ء میں کشیدگی نے کوریا میں کھلم کھلا جنگ کی صورت اختیار کر لی، اگرچہ یہ جنگ کوریا ہی تک محدود رہی۔ کوریا ایک زمانے میں خود مختار تھا۔ ۱۹۱۰ء میں ایشیا کے اس ملک کا الحاق جاپان نے کر لیا۔ ۱۹۴۵ء میں روسی فوجیں شمالی کوریا کے اندر داخل ہو گئیں اور امریکیوں نے کوریا کا جنوبی حصہ سنبھال لیا۔ ملک کے اندر خطِ مستقیم عین وسط میں لگا دیا گیا، جو اڑتیس عرض البلد کے متوازی تھا۔ شمال میں پہلے کوریا کی ایک جمہوریت قائم کر دی گئی، جس کے بانی کمیونسٹ تھے۔ امریکہ نے جنوب میں کوریا کی ایک اور جمہوریت قائم کر دی۔ جب چند متخصّصین کے سوا امریکی فوجیں جنوبی کوریا سے ہٹا لی گئیں تو شمالی کوریا کی فوجیں کمیونسٹوں کے زیرِ قیادت جنوبی کوریا میں داخل ہو گئیں۔ تاکہ ملک کو متحد کر دیا جائے۔

جون ۱۹۵۰ء میں امریکہ نے اس نمونے کی پیروی گوارا نہ کی، جس پر انگلستان اور فرانس اس وقت کاربند ہوئے تھے، جب ہٹلر اور دوسرے مطلق العنان لیڈروں نے صدی کے چوتھے عشرے میں جارحانہ اقدامات شروع کیے تھے۔ امریکہ نے تسکین کی پالیسی کے بجائے جنوبی کوریا میں فوجیں بھیج دیں۔ وقت کم تھا، لیکن خاصی امریکی فوجیں جلد پہنچ گئیں اور شمالی کوریا کی پیشقدمی روک دی۔ پھر انھیں پیچھے دھکیلتے دھکیلتے خطِ مستقیم پر پہنچا دیا۔ اس وقت چینی کمیونسٹوں کی حکومت جنگ میں شامل ہو گئی اور دوبارہ جنوبی جانب پیشقدمی شروع کر دی گئی۔ ۱۹۵۱ء تک خطِ جنگ اس مقام پر قائم ہو گیا، جو شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان سرحد بنا ہوا تھا۔ معاملات کی اصلاح کے لیے گفت و شنید شروع کر دی گئی۔ جو دو

سال تک جاری رہی۔ آخر جولائی ۱۹۵۳ء میں متارکے کا فیصلہ ہوگیا۔

امریکہ کی حکومت نے جنوبی کوریا پر کمیونسٹوں کے جارحانہ اقدامات کو فوجی قوت سے کام لے کر روک دیا۔ جنوبی کوریا کا دفاع انجمن اقوام متحدہ کے نام پر کیا گیا۔ بعض اتحادیوں نے بہت کم، مگر نہایت قیمتی فوجی امداد دی۔ حکومت امریکہ کا یہ ارادہ بھی پختہ تھا کہ جارحانہ اقدام کے خلاف جنگ کو اسی مقام تک محدود رکھا جائے۔ کوریا میں انجمن اقوام متحدہ کی طرف سے امریکی جرنیل میک آرتھر سالار اعظم تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ جنگ کمیونسٹ چین کے اندر جاری رہنی چاہیے، مگر امریکی کارفرماؤں خصوصاً امریکہ کے حلیفوں کو اندیشہ تھا کہ ایسا قدم اٹھایا گیا تو روس سرگرمی سے چین کے ساتھ شامل ہو جائے گا اور نہایت خوفناک تیسری عالمی جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ صدر ٹرومین نے اپریل ۱۹۵۱ء میں میک آرتھر کو واپس بلا لیا۔

انجمن اقوام متحدہ

کمیونسٹوں اور "آزاد دنیا" کے درمیان کوریا میں کھلی جنگ کے باوجود، نیز مشرق کے دوسرے حصوں میں چھاپہ مار دستوں کی کشمکش کے باوصف دوسری عالمی جنگ کے بعد ایک ایسی بین الاقوامی انجمن موجود رہی جس میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ ممالک کم از کم پُرامن مباحث کے لیے جمع ہوتے رہے۔ یہ انجمن اقوام متحدہ تھی، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران میں محوریوں کے سرگرم مخالفوں نے قائم کی تھی۔ پھر اس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا اور ۱۹۴۵ء میں اس کا جو اجلاس بمقام سان فرانسسکو ہوا۔ وہاں اس کی طرف سے ایک منشور شائع کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء تک اس انجمن کے رکن اکسٹھ ہو چکے تھے۔ ان میں روس بھی شامل تھا۔ روس کی دو جمہوریتوں یوکرین اور سفید روس کو جداگانہ حق رائے مل گیا تھا۔ اسی طرح روس کے ہمنواؤں، پولینڈ اور چیکوسلواکیا کو بھی الگ حق رائے حاصل تھا۔ یوگوسلافیا کی کمیونسٹ مملکت بھی اس انجمن کی رکن تھی، اگرچہ اسے کسی خاص کمیونسٹ گروہ سے وابستگی نہ تھی۔ جو قومیں دوران جنگ میں اتحادیوں کی دشمن تھیں ——— رومانیا، بلغاریا، البانیا، ہسپانیہ اور آئرلینڈ ——— وہ شامل نہ کی گئیں، کیونکہ یا تو امریکیوں نے ان کے داخلے کی مخالفت کر دی یا روسیوں[1] نے۔

انجمن اقوام متحدہ جمعیت اقوام کی براہ راست جانشین ہے اور اس کا نظام تقریباً وہی ہے، جو جمعیت کا تھا۔ جمعیت کی طرح انجمن اقوام متحدہ بھی خود مختار مملکتوں کی نمائندہ ہے۔ سیاستدان اس میں بحثیں کرتے ہیں اور اس کی حیثیت عالمی حکومت کی نہیں۔ اس کی ایک مجلس عام ہے جو بین الاقوامی اہمیت کے بہت سے مسائل پر سفارشیں کر سکتی ہے۔ اس مجلس میں ہر رکن مملکت کو یکساں حق اظہار رائے حاصل ہے۔ ایک سلامتی کونسل ہے، جو مختلف مملکتوں کے تحفظ کے لیے خطرات کی روک تھام کا انتظام کرتی ہے۔ سلامتی کونسل میں کل گیارہ رکن ہیں۔ پانچ ——— قوم پرست چین، فرانس، برطانیہ،

---

[1] کسی ملک کو انجمن اقوام متحدہ میں شامل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ بنیادی ارکان میں سے کوئی مخالفت نہ کرے۔

روس اور امریکہ ــــ مستقل رکن ہیں۔ باقی چھ ارکان کا انتخاب دو دو سال کے لیے مجلس عام کرتی ہے۔

انجمن اقوام متحدہ کی تنظیم کا کلیدی نکتہ یہ ہے کہ سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔ اس وجہ سے یہ انجمن بڑی حد تک محض ایک بین الاقوامی دارالمباحثہ رہ گئی ہے۔ عام کاروباری معاملات کے سوا تمام مستقل ارکان متفق ہوئے ہوں تو سلامتی کونسل کوئی فیصلہ کر سکتی ہے۔ گویا ان پانچ بڑوں میں سے کسی کو بھی کونسل میں مطلق ویٹو کا حق حاصل ہے۔ ویٹو کا حق انجمن اقوام متحدہ کے منشور میں اصلاً امریکہ اور روس کے احترام کے لیے شامل کیا گیا تھا۔ اس پر عمل کے لیے انھیں مجبور نہ کیا جا سکے، لیکن ویٹو کا حق مستقل طور پر عموماً روس نے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلامتی کونسل کی مؤثریت مجروح ہوگئی۔ ساتھ ہی مجلس عام کی اہمیت بڑھ گئی، جو امریکی کانگرس کے سابق ممبر وینڈنبرگ[1] کے الفاظ میں دنیا بھر کی شہری مجلس تھی۔

جمعیت اقوام کی طرح انجمن اقوام متحدہ میں بھی مختلف وظائف کے لیے مجلسیں اور ادارے بنا دیے گئے ہیں۔ ان کی فہرست بڑی طویل ہے اور بہت سے دوسرے اداروں کے علاوہ مندرجہ ذیل بھی شامل ہیں:

۱۔ ٹرسٹی شپ کی کونسل، جو سابقہ محکوم اور سامراجی علاقوں کی نگرانی کے لیے بنائی گئی تھی۔

۲۔ اقتصادی اور عمرانی کونسل

۳۔ بین الاقوامی عدالت یا عالمی عدالت

۴۔ تعلیم، سائنس اور ثقافت کی تنظیم، جو یونیسکو[2] کے نام سے مشہور ہے۔

۵۔ عالمی صحت کی تنظیم

۶۔ غذائی اجناس اور زراعت کی تنظیم

۷۔ تعمیر نو اور نشو و ارتقا کے لیے بین الاقوامی بینک، جسے عالمی بینک کہتے ہیں۔

انجمن اقوام متحدہ کا اپنا مستقل عملہ ہے اور اس کا صدر مقام نیویارک شہر کی ایک نئی عمارت میں ہے، جو دریائے ایسٹ کے کنارے ہے۔ بہت سے نکتہ چینوں کی رائے ہے کہ اس عالمی مرکز کو غیر جانبدار سوئٹزرلینڈ سے ــــ جو جمعیت اقوام کا مرکز تھا ــــ منتقل کر کے انجمن کی نہایت طاقتور رکن مملکت کے سب سے بڑے شہر میں منتقل کرنا سخت غلطی تھی۔ وہ کہتے ہیں، اس الزام کا اثبات ہوتا ہے کہ انجمن اقوام متحدہ امریکی سامراج کی پیشرو کا محض ایک ہتھکنڈا ہے۔

؎۱ Vandenburg

؎۲ UNESCO یعنی The U.N. Educational Scientific and Cultural Organization

انجمن اقوام متحدہ کی روداد

انجمن اقوام متحدہ کی قدر و قیمت کا جائزہ لینا ابھی قبل از وقت ہے۔ جو لوگ عالمی مملکت کے بے صبر داعی ہیں، وہ برابر کہتے رہتے ہیں کہ انجمن اقوام متحدہ محض سیاستدانوں کا ایک مجمع ہے اور اس میں بطور خود نمائش قوت کا کوئی جوہر موجود نہیں۔ کوریا میں بحرانی حالت رونما ہوئی تو امریکی فوج سے کام لیا گیا۔ ضروری ہے کہ اسے ایک حقیقی حکومت کی شکل دی جائے اور اسے اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ افراد کے خلاف، نہ کہ مملکتوں کے خلاف براہ راست اقدامات کر سکے۔ عالمی حکومت کے یہ وکیل ریاستہائے متحدہ امریکہ کی دفعاتِ وفاق بار بار پیش کرتے ہیں، جو سنہ ۱۷۸۱ء سے سنہ ۱۷۸۹ء تک جاری رہیں۔ ان کے مطابق تیرہ ریاستیں ایک ایسی کانگرس کے ماتحت ڈھیلے ڈھالے طریق پر مربوط رہیں، جو محصول عائد نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس پولیس بھی نہ تھی اور رکن ریاستوں پر عدالتی اختیارات بھی حاصل نہ تھے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سنہ ۱۷۸۹ء کے امریکی دستور کا ایک بین الاقوامی مثنیٰ تیار کیا جائے اور وفاقی حکومت بنا دی جائے، جیسے ریاستہائے متحدہ کے شہریوں پر براہِ راست یہ اختیار حاصل ہوں۔ لیکن سنہ ۱۷۸۹ء میں تیرہ سابق نوآبادیوں کی زبان مشترک تھی، سیاسی ادارے اور روایات مشترک تھیں اور مختلف قسم کے مفاد بدیہی طور پر مشترک تھے۔ جو ساٹھ مملکتیں[1] انجمن اقوام متحدہ کی رکن ہیں۔ ان میں ایسا کوئی اشتراک موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالمی حکومت قائم کر لینا آج ممکن نہیں، اِلّا یہ کہ ایسی حکومت قوت کے بل پر عائد کر دی جائے۔

مگر انجمن اقوام متحدہ موجود ہے اور اس کا محض وجود انتہا پسندوں اور بیتاب مثالیت پسندوں کے سوا سب کے لیے کسی نہ کسی بہتری ہی کا پیغام ہے۔ یہ انجمن پہلے دس سال میں سرد جنگ یا ایٹمی اسلحہ پر بین الاقوامی ضبط و نظم کے بڑے مسائل حل نہ کر سکی، لیکن اس نے فلسطین کی تقسیم کا انتظام کر دیا[2]، ساتھ ہی اسرائیلیوں اور عربوں کی جنگ کو وسیع کشمکش نہ بننے دیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں شمالی کوریا کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوا تو انجمن نے امریکہ کی امداد سے پُر زور طریق پر اسے روکا۔ تنہا یہ کارنامہ جمعیّتِ اقوام کے پورے دورِ حیات کے کارناموں سے بڑھا ہوا ہے۔

سب سے آخر میں انجمن اقوام متحدہ کے جس بڑے کارنامے کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ اس کے بعض خاص اداروں نے ان پسماندہ ملکوں میں امداد کی نہایت امید افزا صورت پیدا کر دی ہے، جہاں بیماریاں پھیلی ہوئی تھیں اور ہر وقت قحط کا خطرہ رہتا تھا۔ عالمی بینک نے ان ملکوں کو بنیادی منصوبے مکمل کرنے کے لیے روپیہ قرض دیا، مثلاً یہ کہ بجلی پیدا کرنے والے مرکز بنائے جائیں۔ عالمی صحت کی تنظیم نے مصر میں ہیضہ کی روک تھام کے لیے دنیا بھر کے طبی وسائل کے اندر حرکت پیدا کر دی۔ نیز اس تنظیم نے وسیع مہمیں جاری کیں تاکہ یورپ اور ایشیا کے بچوں کو دق وسل سے محفوظ کر دیا جائے۔ اٹمی توانائی

---

[1] اب تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔

[2] یہ سب سے بڑی بے انصافی تھی جو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے زیرِ اثر اقوام متحدہ نے کی۔

اور بہت سے دوسرے ملکوں نے ملیریا (موسمی بخار) کی روک تھام کے لیے بھی بہت کچھ کیا۔ غذائی جنسوں اور زراعت کی تنظیم کے ماہرین اُن ملکوں میں پہنچ گئے، جہاں آبادی بہت زیادہ تھی، مثلاً اٹلی اور ہندوستان۔ انھوں نے کسانوں کو پیداوار بڑھانے اور زیادہ خوراک مہیا کرنے کے بارے میں مفید مشورے دیئے۔ ان منصوبوں، نیز درجنوں دوسرے ذریعوں سے انجمن اقوام متحدہ نے منشور کا یہ عہد پورا کرنے کی کوشش کی کہ انجمن عمرانی ترقی اور بہتر معیارِ معیشت کو تقویت پہنچائے گی۔

نواسیواں باب

جنگ کے بعد کے دوسرے مسائل

تمہید

۱۹۴۵ء کے بعد بین الاقوامی دائرے میں جو مسائل دنیا کی توجہ کا مرکز بنے، ان میں سے ایک تیسری عالمی جنگ کا خطرہ، ایٹمی اور جراثیمی بموں کے استعمال کا تھا، لیکن ہر ملک داخلی مسائل سے بھی دوچار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہر ملک اپنے اہم داخلی مسائل کے بہترین حل پر پہنچ جاتا تو دنیا بڑے بڑے بین الاقوامی مسائل کے بہتر حل کی راہ پہ لگ جاتی۔ زمانۂ ماضی میں غیر مطمئن اور ناستوار قومیں بین الاقوامی انتظام کے لیے خطرہ بنی رہیں۔ ان کے لیڈر داخلی جھگڑوں کی اصلاح کے لیے کوشش کے سلسلے میں عوام کو کسی خارجی دشمن کے خلاف جنگ کے لیے متحد کرتے رہے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ کریملن (روس) کے کارفرما سرمایہ دار جمہوریتوں کے خطرے سے متعلق اس لیے مبالغہ آرائی پر آمادہ رہے کہ روسیوں کی توجہ نسبتہً پست معیارِ معیشت سے ہٹا سکیں۔

جنگ کے بعد قوموں کے مختلف داخلی مسائل ملک بہ ملک مختلف رہے اور وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو اس سرسری خاکے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے پہلے ہمیں یہ حقیقت یاد دلانی چاہیے کہ جس قسم کے مسائل سے دنیا جنگ کے بعد دوچار ہوئی، یہ ہمیشہ لوگوں کے سامنے رہے۔ دنیا کی بربادی کے متعلق دورِ حاضر کے پیش گو کہتے رہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے وسط میں جو مشکلات پیش آئیں، ان کی کوئی نظیر پہلے نہیں ملتی۔ ضروری ہے کہ ہم ان کا مکمل حل دریافت کریں یا تباہ ہو جائیں، لیکن ماضی کا تھوڑا سا بھی علم رکھنے والے معقول لوگ جانتے ہیں کہ مشکلات ہمیشہ پیش آتی رہیں۔ انسانیت اور زندگی کا تقاضا ہی یہ ہے۔ بعض انسانی مسائل مثلاً بیماریوں کا کوئی مکمل حل اب تک ممکن نہیں ہوا اور ممکن نہیں کہ طبیب کسی بھی وقت بیماریوں کا قطعی ازالہ کرسکیں گے۔ ہمیں اپنے سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی طبیبوں سے جسمانی طبیبوں کے مقابلے میں زیادہ توقع نہ رکھنی چاہیے۔

اقتصادی مسائل

جنگ کے بعد کی دنیا میں اقتصادی اعتبار سے لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہے کہ کون سی صورت تنظیم ہے، جو انھیں مادی ضرورت کی چیزیں زیادہ مقدار میں دلاسکتی ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے جو ہمارے اجداد کو سرمایہ بہ مقابلہ محنت کی شکل میں درپیش تھا۔ اب اس مسئلے نے نمایاں عمرانی، سیاسی اور اخلاقی مفہوم پیدا کر لیے

ہیں۔ اب امریکہ میں بھی صرف چند ہی آدمی رہ گئے ہیں، جو انیسویں صدی کے آزاد کاروبار کی پوری نظریاتی مضمرات کو درست سمجھتے ہیں، یعنی ایک ایسے معاشرے کا وجود، جس میں ہر شخص جو چاہے، بنائے، جو چاہے، بیچے، جو چاہے خریدے۔ ممکن ہو تو لکھ پتی بن جائے یا اگر وہ کافی روپیہ حاصل نہیں کر سکتا تو بھوکا مرے۔ دورِ حاضر کے مغرب میں عملی مسئلہ انفرادیت بہ مقابلہ اشتراکیت، و اشتمالیت نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اقتصادی سرگرمی پر کس قسم کا ضبط و نظم کس حد تک قائم کیا جائے اور کون اس کے نفاذ کا ذمہ دار ہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی اقوام نے ماضی قریب میں ایک قسم کا مخلوط اقتصاد اختیار کر کے یہ مسئلہ حل کر لیا۔ اس اقتصاد کے مطابق حکومت صنعت و حرفت کو زیر ضبط رکھتی ہے۔ کم سے کم اجرتیں مقرر کر دیتی ہے۔ عمرانی تحفظ کی بہت سی دوسری تدبیروں سے کام لیتی ہے۔ محاصل اس طریق پر عائد کرتی ہے کہ ادا کرنے والے کی صلاحیت کے مطابق اس کا درجہ اونچا ہوتا جاتا ہے۔ اور بہت سے طریقے ہیں، جن کی بنا پر جزواً یہ طے کیا جاتا ہے کہ کیا کیا چیزیں پیدا کی جاتی ہیں اور انھیں کس کس طریق پر تقسیم کیا جاتا ہے، لیکن اس مخلوط اقتصاد میں بھی افراد کے لیے یہ ممکن ہے — اگرچہ محدود دائرے ہی میں سہی — کہ جو چاہیں بنائیں یا جو خدمت چاہیں، انجام دیں یا اپنے سامان اور خدمات کے لیے جو چاہیں، قیمتیں مقرر کریں۔

مغرب کے مخلوط اقتصاد کے اندر سرکاری یا عوامی دائرے اور نجی دائرے کی اضافی اہمیت میں خاصی تبدیلی ہوتی رہی۔ امریکہ نے نجی دائرہ نسبتہً وسیع رکھا، لیکن جنگ سے پیشتر "نئی تدبیر" کے مطابق عوامی دائرے کو جو وسعت دی گئی تھی، وہ جنگ کے بعد بھی قائم رکھی گئی۔ صدر ٹرومین (۱۹۴۵ء — ۱۹۵۳ء) کے نظم و نسق کی "منصفانہ تدبیر" سے وفاقی عمرانی تحفظ کے نظام کو فائدہ پہنچا۔ اس کے بعد صدر آئزن ہاور کے ریپبلکن نظم و نسق میں یہ فائدہ زیادہ وسیع اور گہرا ہو گیا۔ یہ دو امریکی پارٹیاں (ڈیموکریٹ اور ریپبلکن) بہت سے مسائل میں قومی اختلاف کی شدت کے باوجود فلاحی مملکت اور اس کے مؤید مخلوط اقتصاد کے مرکزی عنصر میں ہم رائے ہیں۔

بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال برطانیہ کی ہے، جہاں اقتصادی زندگی کا عوامی دائرہ دوسری عالمی جنگ کے بعد تیزی سے وسیع ہو گیا۔ لیبر پارٹی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء تک حکومت پر قابض تھی اور اس کا لیڈر اٹیلی وزیر اعظم تھا۔ اس حکومت نے ہمہ گیر طبی امداد کے لیے وسیع پیمانے پر ایک کامیاب پروگرام جاری کر دیا۔ اس نے بینک آف انگلینڈ، کوئلے کی کانوں، لوہے، فولاد، ریل کی سڑکوں، شہری ہوابازی اور چند دوسری کلیدی صنعتوں کو قومی بنا دیا۔ لیکن ہر معاملے میں سابق نجی مالکوں کو مناسب مالی معاوضہ دیا۔ یہ طرزِ عمل بالشویکوں کے سراسر خلاف تھا، جنھوں نے ۱۹۱۷ء میں مختلف چیزوں کو قومی بناتے وقت ضبطیوں کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ برطانیہ میں عموماً اس مسئلے پر اتفاق رائے تھا کہ کوئلے کی صنعت حد درجہ ناگفتہ بہ ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں، اسے اعلیٰ پیمانے پر بحال کرنا نجی مالکوں کے لیے ممکن نہیں، بلکہ قومی منصوبہ بندی اور قومی سرمایہ لگانا حد درجہ ضروری ہے۔ ۱۹۵۱ء میں قدامت پسند چرچل کے زیر سرکردگی برسراقتدار آئے تو انھوں

نے لیبر پارٹی کی جاری کی ہوئی اکثر چیزیں بحال رکھیں۔ امریکہ کی طرح برطانیہ میں بھی دو بڑی پارٹیوں کے درمیان بڑی حد تک اتفاق تھا کہ کس قسم کا مخلوط اقتصاد مطلوب ہے۔

مغرب کی تمام مخلوط اقتصادیات میں مقابلے کی آزادی باقی رہی۔ جو کامیاب ہوتے ہیں، انھیں مالی معاوضہ ملتا ہے اور جو ناکام رہتے ہیں، ان کا روپیہ ضائع جاتا ہے۔ روس اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں میں نصب العین ایسے معاشرے کی تعمیر ہے، جس میں چند اوپر کے منصوبہ بند فیصلہ کر دیتے ہیں کہ کون کون اشخاص کیا کیا بنائیں گے اور کیا کیا فروخت کریں گے۔ فرد کو اس سے زیادہ آزادی یا جدت طرازی کا حق حاصل نہیں، جتنا فوج میں سپاہی کو ہوتا ہے، لیکن ان کمیونسٹ ملکوں میں بھی اقتصادیات کی بنیاد زر ہے۔ کسان یا مزدور کو ایک حد تک صارف کا حقِ انتخاب حاصل ہے، یعنی وہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا وہ اپنے لیے جوتے کا جوڑا خریدے گا یا گھر کے سامان کی کوئی چیز لے گا؟

ہمیں "آہنی پردے" کے پیچھے سے جو خبریں ملتی ہیں، ان کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسان یا مزدور کوئی موٹر یا ٹیلی ویژن کا سٹ خریدنے کی امید نہیں رکھ سکتے۔ مغربیوں کو ایسا موقع حاصل ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مغربی قومیں صنعتی انقلاب میں پہلے شامل ہو گئیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بھی اہلِ مغرب بہت زیادہ چیزیں پیدا کرتے ہیں اور ان کا معیارِ معیشت ان قوموں سے بلند تر ہے، جو کمیونزم کے تابع ہیں۔ مغربیوں کو کمیونسٹوں سے ممتاز کرنے والا نشان یہ عقیدہ ہے کہ اقتصادی آزادی ایک حد تک محفوظ رکھنی چاہیے اور اقتصادی زندگی کا کامل اجتماع انسانوں میں سے وہ جوہر ختم کر دے گا جو انھیں زیادہ سے زیادہ کام پر آمادہ رکھتا ہے اور جس کی بنا پر وہ زیادہ سوچ سمجھ، قوتِ ایجاد اور صلاحیت سے سب کچھ کرتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اس جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں اس سے بہتر تدبیر نہیں مل سکتی، جو ہمارے آباؤ اجداد استعمال کرتے رہے ہیں، یعنی مقابلے کی آزادی۔

سیاسی مسائل

سیاسی اعتبار سے مغربی جمہوریتیں ہر سطح پر سینکڑوں مسائل سے دوچار رہیں۔ ان میں شہری انتظام کے بہترین طریقے ہیں ـــ یعنی اس غرض سے کوئی ناظم مقرر کیا جائے یا یہ معاملہ منتخب کارکنوں کے حوالے کیا جائے ـــ عدالتی جماعتوں کے کردار تک، مثلاً امریکی سپریم کورٹ، ہیئتِ انتظامیہ اور ہیئتِ قانون سازی کے درمیان تعلقات، خارجہ پالیسی کا انصرام وغیرہ سب کچھ شامل ہے جنگ کے فوراً بعد بعض مملکتوں کو حکومت کی بنیادی شکل کے متعلق فیصلہ کرنا پڑا۔ اٹلی کے اندر ۱۹۴۶ء میں قائم چلی آتی تھی ۱۹۴۸ء میں ایک دستور بنا جس میں پارلیمانی جمہوریت قائم کر دی گئی۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان رکھے گئے۔ فرانس کے اندر دورانِ جنگ میں ڈیگال اور آزاد فرانسیسی، جو ملک سے باہر تھے، نیز اندر مزاحمت کرنے والے فرانسیسی سب تیسری جمہوریت کی کمزوری پر بیزاری میں متفق تھے۔ انھوں نے چوتھی جمہوریت کی بنیاد رکھتے وقت اس امر کا خیال رکھا کہ انتظامیہ کو زیادہ اختیارات حاصل ہوں، حکومتیں استوار نظر آئیں اور پارلیمانی ہیر پھیر کے لیے کم گنجائش رہ جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسی طرح فرانس نئے سرے سے

عظمت و شان حاصل کر لے گا، مگر ۱۹۴۶ء کا دستور تیسری جمہوریت کے ۱۸۷۵ء کے دستور سے نمایاں بنیادی مطابقت رکھتا تھا۔ فرانس برابر پارلیمانی مملکت بنا رہا۔ اس کا صدر بڑی حد تک زیبائشی ہوتا تھا اور کابینہ قانون سازی کے ایوان زیریں رجسے اب ایوانِ مندوبین کے بجائے قومی مجلس کہتے ہیں) کے روبرو جوابدہ تھا۔ نئے ایوانِ بالا یعنی مجلسِ جمہوریت کو سابقہ ایوانِ بالا یعنی سینیٹ کے بہت کم اختیارات حاصل رہے، لیکن عمومی لحاظ سے چوتھی جمہوریت عملاً بڑی حد تک تیسری جیسی ہی رہی۔ متعدد سیاسی پارٹیوں نے اشتراک کر لیے اور تیزی سے یہ اشتراک ٹوٹتے رہے، خود پارٹیاں مختلف الخیال گروہوں میں بٹتی رہیں اور وزارتیں اسی تیزی سے بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ جو فرانس کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ ان سطحی ہنگاموں کی تہ میں مستقل فرانسیسی افسر مختلف وزارتوں کا کام بنیادی فرانسیسی پالیسی کے مطابق خاصی یکسانی سے چلاتے رہے۔

چوتھی فرانسیسی جمہوریت نے ایک ایسا پہلو آشکارا کیا، جسے تمام مغربی ملکوں کا مرکزی سیاسی مسئلہ سمجھنا چاہیے، یعنی یہ مسئلہ کہ سیاسی معاملات میں مستقل ملازمین —— دفتری نظام اور اس کے کارکنوں —— کو اختیارات کا کون سا درجہ دیا جائے۔ سیاسیین تو عارضی طور پر منتخب ہوتے تھے اور ختم ہو جاتے تھے۔ ان کی حیثیت غیر پیشہ ور منتظمین کی تھی۔ تمام مغربی قومیں جن میں امریکی بھی شامل ہیں، ۱۹۴۵ء سے اس رائے کی ہو رہی ہیں کہ ہر سطح پر ماہرین کو حکومت کا کاروبار جاری رکھنے کے لیے زیادہ اختیارات دیئے جائیں اور یہ سلسلہ مقامی شہر یا قصبے کے منتظمین سے قومی افسروں تک سب کے لیے ضروری ہے۔ دورِ حاضر کی تہذیب کی فنی پیچیدگیوں نے ان فنکاروں سے کام لینا ناگزیر بنا دیا مثلاً قومی بجٹ بنانے یا حفظانِ صحت کا کارکن بننے یا فرانسیسی سیاسی پارٹیوں کی پُرپیچ کارروائیوں کے متعلق حکومت کے لیے روداد تیار کرنے کی غرض سے خاص مہارت ضروری ہے۔ اگر جمہوریتوں کو یہ احساس بھی ہے کہ جو امانت ان ماہرین کے حوالے کی جائے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی پابندی ضرور ہونی چاہیے، ورنہ جمہوریت باقی نہ رہے گی۔ چنانچہ وہ اس عقیدے پر قائم چلے آتے ہیں کہ مقامی حکومت میں بھی پالیسی کے متعلق بڑے فیصلے ان مردوں اور عورتوں کو کرنے چاہئیں، جو عوام کی طرف سے اس لیے منتخب کیے جائیں کہ اکثریت کی خواہش کے مطابق کاروبار چلا سکیں۔ جمہوریت اصل میں جزواً غیر پیشہ ور افراد کی حکومت کا نام ہے۔

شہری حقوق

حقیقی جمہوریت میں ایک اور توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہ فرد کے شہری حقوق اور حکومت کے اختیارات کے درمیان توازن کا مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں کبھی مطلق غیر متبدل توازن نہیں رہا۔ مثلاً آزادیِ تقریر کو جمہوری روایات کا حد درجہ قیمتی جزو مانا جاتا ہے، لیکن یہ آزادی بھی کبھی اطلاق کی صورت اختیار نہ کر سکی۔ ازالہ حیثیت عرفی، دروغ حلفی اور غداری عام تقریروں کی ناجائز شکلیں ہیں۔ جب مشکلات کا دور آتا ہے تو یقیناً آزادیِ تقریر کو کسی حد تک محدود کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر یہ ہمیشہ محدود رہے یعنی اگر کسی ملک میں کسی شہری کو تقریراً یا تحریراً سرکاری افسروں کے کام پر نکتہ چینی کی ممانعت قائم رکھی جائے تو وہ ملک جمہوریت سے محروم ہو جائے گا۔

دورِ حاضر کی جمہوریتوں میں یہ شہری حقوق متفرق افراد کے لیے نہیں، بلکہ ان کے گروہوں کے لیے طلب کیے جاتے ہیں۔ ان گروہوں میں مذہبی گروہ، برادرانہ نظام، پیشہ ور انجمنیں، کالج، یونیورسٹیاں وغیرہ شامل ہیں۔ ایسے گروہ بھی بن سکتے ہیں، جو جمہوری مباحث اور انتخابات کے ذریعے سے خاص مقاصد کے لیے منظم ہوں۔ ایسے گروہوں میں بڑی اور چھوٹی سیاسی پارٹیوں سے خاص کاموں کے لیے انجمنوں تک سب شامل ہیں، مثلاً انجمن انسدادِ بے رحمی حیوانات یا لیبر یونین یا صنعتکاروں کی قومی انجمن۔ ان میں ایسے مرد و زن بھی ہو سکتے ہیں جنھیں نسل، قومیت یا مذہب کے اعتبار سے اقلیتیں کہا جاتا ہے، مثلاً امریکہ میں یہودی اور حبشی یا کینیڈا میں فرانسیسی۔

اس بارے میں حقیقی جمہوریتوں نے توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔ کوئی مملکت کسی ایک یا تمام اقلیتوں کو من مانی کارروائیوں کی اجازت نہیں دے سکتی۔ امریکہ کی تاریخ سے ایک مثال پیش کر دینا مناسب ہے۔ یہ ایک مذہبی گروہ کی مثال ہے، جو عموماً موَرمین[1] مشہور ہوا۔ ان لوگوں کے بنیادی اصول میں تعددِ ازدواج بھی شامل تھا، یعنی زیادہ بیویاں رکھنا۔ ہمارے قانون میں تعددِ ازدواج ممنوع ہے، موَرمین اسے اپنا مذہبی حق سمجھتے تھے۔ امریکہ کی رائے عامہ اس کے سخت خلاف تھی۔ آخر موَرمینوں کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کا جزو بننے اور اُوٹا[2] کی ریاست کو شامل کرنے (۱۸۹۶ء) کے سلسلے میں یہ اصول ترک کرنا پڑا۔

اس کے برعکس کوئی مملکت ایک ہمہ گیر اخلاقی زندگی اور ہر قسم کے گروہی اختلافات میں وسیع رواداری کے بغیر حقیقی جمہوریت نہیں بن سکتی۔ جمہوریت کے بہت سے نقادوں، مثلاً جان سٹوارٹ مل نے انیسویں صدی میں اس امر پر زور دیا کہ جمہوری معاشرے کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ اکثریت کا استبداد ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اکثریت ایسی سیاسی تدبیریں یا معاشرتی اور تعلیمی دباؤ اختیار کر سکتی ہے کہ اگر گروہی زندگی کی گوناگونی دب جائے اور ہر فرد عقیدے اور روش کے ایک مشترک نمونے سے مطابقت پیدا کرے، تاکہ سب لوگوں میں یکسانی آ جائے۔ امریکہ برطانیہ اور فرانس یا کسی مغربی معاشرے میں مل جیسے لوگوں کے بدترین خدشے گزشتہ ایک سو سال میں درست ثابت نہیں ہوئے۔ موجودہ زمانے کے فنکار، مثلاً پکاسو[3]، روایتی فنکار — خواہ وہ حیوانات کی چیر پھاڑ کے حامی تھے یا مخالف۔ ضبطِ تولید کو درست سمجھتے تھے یا نادرست، برہنگی کے قائل تھے یا پورا لباس پہننا ضروری سمجھتے تھے — اور سیکڑوں دوسرے گروہ آزاد دنیا میں فروغ پذیر رہے۔ ان میں باہم بحثیں بھی جاری رہیں، مگر مشترک زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

---

[1] Morman — یہ گروہ مذہباً تعددِ ازدواج کا قائل تھا۔

[2] Utah — امریکہ کی ایک ریاست

[3] Piccaso

——— لیکن یکسانی کے فنا کن اثرات کا خطرہ ہمیشہ موجودہ جمہوریتوں کے سامنے رہا۔ تنوّع اور یکسانی کے درمیان توازن قائم رکھنا سہل نہیں۔ بحرانی حالات میں ——— مثلاً سرد جنگ اور کوریا کی جنگ ——— توازن جلد سے جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اور صحت مند گروہی اختلافات حذف کر دیئے جاتے ہیں جمہوری حکومت میں جو گروہ سیاسی، اقتصادی اور عمرانی اداروں میں تبدیلی کے خواہاں ہیں، انھیں یہ حق حاصل ہے کہ ایسی تبدیلی کے لیے پُر امن ذرائع سے وکالت کرتے رہیں، لیکن فرض کیجئے وہ ایسی تبدیلی چاہتے ہیں، جو جمہوریت کو تباہ کر ڈالے، پھر کیا جمہوریت کو یہ اجازت دینی چاہیے کہ مختلف گروہ غیر جمہوری تدبیروں کو تقویت پہنچائیں، خصوصاً اس حالت میں کہ وہ پُر امن تغیرات کے وکیل نہیں بلکہ سازشی معلوم ہوں۔ امریکہ نے خصوصیت سے اور دوسری مغربی مملکتوں نے ایک حد تک دوسری عالمی جنگ کے بعد فیصلہ کر لیا کہ فاشسٹوں یا کمیونسٹوں جیسے گروہوں کے عام شہری حقوق میں تخفیف ضروری ہے۔ جمہوریتیں اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ ناروا داری سے پوری رواداری کا برتاؤ نہیں کر سکتیں اور ان گروہوں کو آزاد نہیں چھوڑ سکتیں، جو آزادی کے تمام اوضاع کو برباد کرنے کے درپے ہوں۔

نوے واں باب

موجودہ منظر

بربادی کی پیشگوئیاں

بیسویں صدی کی دنیا میں جو ٹھوس مشکلات کارفرما نظر آتی ہیں، ان کی وجہ سے ایک روحانی یاس اور ایک نوع کی ماندگی طاری ہوگئی ہے۔ اس روش کا واضح اظہار ان اہل علم کی تحریرات میں ملتا ہے، جنھیں بربادی کے پیشگو کہنا چاہیے۔ انھی میں فرانس کا فلسفی بقا سارتر[۱] شامل ہے اور اس باب میں خصوصیت فلسفۂ تاریخ کے ماہروں کو حاصل ہے، جن میں جرمن سپینگلر[۲] (وفات ۱۹۳۶ء) سے انگریز ٹائنبی اور امریکی سوروکن[۳] تک شامل ہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے ماہر ہماری تہذیب کا مقابلہ سابقہ تہذیبوں سے کرتے ہیں، خصوصاً یونانی و رومی دنیا سے۔ وہ ابھی تک اس امر پر متفق نہیں ہوئے کہ ہم آخری تباہی کے کس قدر قریب پہنچ چکے ہیں اور ہم جس رُخ پر جا رہے ہیں، آیا اس سے عود بھی کر سکتے یا نہیں۔ اکثر کا احساس یہ ہے کہ اگرچہ ہماری مغربی تہذیب کے ـــــ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، لیکن پوری نسل انسانی تباہ نہیں ہوگی۔ اغلب ہے، ہمارے اخلاف پھر ایک نئی تہذیب کا راستہ پالیں۔

چند ہزار سال کی جس مدت کے متعلق تاریخی تحریری دستاویزیں ملتی ہیں، ان سے بالکل واضح ہے کہ حیاتیاتی انسان نے اپنی نوع قائم رکھی اور گزشتہ چند صدیوں میں اس کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جو مختلف گروہ اس نے بنائے، یعنی سیاسی گروہ، وہ زندہ رہے اور مر گئے۔ اشوریوں کی مملکت، پندرھویں صدی کے شہری حکام، رومیوں کی سلطنت، انکا کی سلطنت، یہ سب چیزیں ختم ہوگئیں، اگرچہ ان کی ثقافت کے کچھ آثار باقی ہیں۔ فلسفۂ تاریخ کا جرمن ماہر سپینگلر کہتا ہے کہ اعلیٰ درجے کی ثقافتوں کا طبعی دورۂ حیات تقریباً ایک ہزار سال کا ہوتا ہے اور یہ ایک خارجی حقیقت ہے جس طرح انسانی زندگی کا اوسط ستر سال ہے۔ سپینگلر نے فیصلہ کیا کہ ہماری مغربی ثقافت سنہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس وجود میں آئی۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ بیسویں صدی کے اواخر میں ہم اپنے ناگزیر انجام کے قریب پہنچ جائیں گے لیکن اکثر مورخوں کے نزدیک مغربی تہذیب کا ظہور

---

۱ Sartre

۲ Spengler

۳ Sorokin

چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں اس وقت ہوا، جب مغرب میں مسیحیت نے غلبہ پایا۔ روما کی سلطنت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ جرمنوں کی مملکتوں نے لے لی۔ اگر یہ تاریخ پیدائش درست ہے تو ہماری ثقافت ایک ہزار سات سو سال زندہ رہ چکی ہے۔ گویا اس کے برابر انسانی زندگی کا مقابلہ کیا جائے تو ایک سو ساٹھ سال کی نکلتی ہے، جو بالکل غیر ممکن ہے۔

ہم سائنس کے رو سے یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ فلاں سیاسی یا ثقافتی گروہ مر رہا ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان گروہوں کا دورۂ حیات کیونکر متعین ہوتا ہے۔ ہمیں بحیرۂ روم کی ایک بڑی ثقافت ـــــ یونانی و رومی ثقافت خصوصاً رومی سلطنت کا دورِ عروج میں ـــــ کے عروج و زوال کے بارے میں واضح اور معقول تاریخی معلومات حاصل ہیں۔ اس کلاسیکی دور سے دورِ حاضر کے فلسفیوں نے ہمارے انجام کے متعلق نتائج اخذ کیے ہیں۔ ٹائنبی نے مرتی ہوئی کلاسیکی دنیا اور ہماری دنیا کے درمیان مقابلہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب فنون اور ادب میں بہت زیادہ تصنع پیدا ہو جاتا ہے، نقالی سے کام لیا جاتا ہے اور تازگی باقی نہیں رہتی، حکومت میں حد درجہ مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے، نیا پرولتاری مذہب قائم شدہ مذہب پر غلبہ پا لیتا ہے۔ پہلے زمانے میں مسیحیت اور کفر کا مقابلہ تھا، اب کمیونزم مسیحیت کے خلاف سرگرم عمل ہے، لیکن ہماری دنیا اور زوال پذیر رومی دنیا کے حالات میں بدیہی اختلافات ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اختلاف موجودہ سائنس اور فنکاری کا ہے۔ ہمیں مادی چیزوں پر بہت بڑا اقتدار حاصل ہو چکا ہے۔

محتاط مؤرخ آج کی دنیا پر نظر ڈالے گا تو وہ یہ کہنے پر قناعت کرے گا کہ بیسویں صدی کی مغربی دنیا کو ترقی پر جیسا یقین عہد وکٹوریہ میں تھا، اس میں کسی حد تک کمی آگئی ہے۔ اب تہذیب کے فوری مستقبل کے متعلق مایوسی کا رجحان نمایاں ہے اور بے حفاظتی کا احساس ظاہر ہو رہا ہے لیکن اس بیان میں بھی مؤرخ کئی شرطیں لگائے گا:

۱۔ بربادی کے متعلق پیشگوئیاں اہل مغرب کے لیے نئی نہیں۔ دنیا کے انجام اور یوم الحساب کے قریب مسیح کی دوبارہ آمد کا تصور مسیحیت کی ابتدا سے چلا آتا ہے اور یہ بار بار تازہ ہوتا ہے۔ قریبی صدیوں میں مایوسی کے نظریے نے عموماً ایسی صورت اختیار کی کہ زمانہ بڑا خراب آگیا ہے، تہذیب فرسودہ ہو چکی ہے، اس کا برباد ہونا اور از سر نو وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ آج سے دو سو سال پیشتر روسو بھی بربادی ہی کی پیشگوئیاں کر رہا تھا۔

۲۔ مؤرخ اپنے آپ سے سوال کرے گا کہ آیا بربادی کے یہ پیشگو عام مردوں اور عورتوں کی صحیح آئینہ داری کا حق رکھتے ہیں یا نہیں، مثلاً یہ واضح ہے کہ امریکہ میں دوسری جنگ کے بعد سے اہل علم کی قنوطیت اور عوام کی رجائیت میں بڑا فرق ہے۔ اکثر امریکیوں کو اب بھی ترقی کا یقین ہے اور مغربی یورپ کی اقوام میں ـــــ مثلاً فرانس، جہاں ایک قسم کی قومی ماندگی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے ـــــ بھی شاید ہی کوئی ایسا آدمی ملے، جسے بقا کے متعلق مایوسی ہو، مگر یہ کہنا بالکل مہمل ہوگا کہ امریکہ میں بھی دو عالمی جنگوں، بڑے کساد اور تیسری عالمی جنگ کے خطرے کے بعد عوام کی رجائیت کا وہی عالم ہے جو ان کے آباد اجداد کے عہد میں تھا۔

تنویر کی رجائیت

ہم بتا چکے ہیں کہ دورِ حاضر کی ابتدائی صدیوں میں روئے زمین پر انسانی تقدیر کے متعلق ایک نیا نظریہ پیدا ہوا تھا، جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں پھولا پھلا۔ نظریہ یہ تھا کہ انسان اسی دنیا میں راحت کی بجا توقع رکھ سکتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے دوران میں رابس پیئر کے نوجوان رفیق سان جسٹ[۱] نے کہا تھا۔ یورپ میں راحت کا خیال بالکل نیا ہے۔ جیفرسن نے بھی، جسے بیان میں کمال حاصل تھا، کہا تھا: انسانی حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ راحت کے لیے کوشش کرے۔ یقیناً انسانوں نے ہمیشہ اسی دنیا پر راحت ڈھونڈ لی ہے۔ البتہ مسیحیت میں یہاں راحت کی امید نہ رکھنی چاہیے، بلکہ موت کے بعد بہشت میں وہ راحت پا سکتے ہیں مسیحیت نے اس عقیدے پر زور دیا کہ بہشت میں جو راحت ملے گی، وہ جزواً زمین پر زحمتیں برداشت کرنے کا بدلا ہوگی۔

اٹھارھویں صدی کے مفکر فلسفیوں نے دورِ حاضر کا رجائی نظریہ پیش کیا۔ ان کے نزدیک راحت کا مطلب یہ تھا کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے، جس میں انسان ایک خاص موقع پر جو چاہے، حاصل کر سکے۔ ایسی حالت جس میں ہر مرد اور ہر عورت، بلکہ ہر بچہ بھی کسی رکاوٹ سے آگاہ نہ ہو۔ راحت کی اس اندرونی حالت کے ساتھ ساتھ بیرونی حالت میں مادی اشیا کی فراوانی ہوگی۔ ہر شخص جو چاہے گا کھائے گا کھا سکے گا۔ اس کے رہنے کے لیے اچھا مکان ہوگا۔ وہ اطمینان بخش جنسی زندگی بسر کرے گا۔ ذہنی اور جسمانی صحت سے مستفید ہوگا۔ اس معاملے کو ہم دورِ حاضر کی نفسیات کے لباس میں پیش کر سکتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں بجا طور پر کامل مطابقت کی زندگی کی امید رکھ سکتے ہیں، ایک ایسی زندگی جو کشمکش عدم حفاظت اور چیرہ دستی سے بالکل محفوظ ہو۔

سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فلسفیوں نے کامل راحت کا جو تصور پیش کیا تھا، وہ ابھی تک روئے زمین پر وجود میں نہیں آیا۔ یہ ایک بدیہی واقعہ ہے، کیونکہ مختلف قسم کے اداروں، عادتوں اور عقیدوں نے انسانی زندگی میں برائی بھی پیدا کی۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں انسان طبعی قوانین کے پابند نہ تھے۔ جو اُن کے لیے راحت کا موجب بنتے، بلکہ غیر طبعی قوانین کی پابندی کرتے تھے، جو ناخوشی کا باعث ہوتے۔ راحت کا نیا تصور پیدا کرنے والوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کی حالت بے اطمینانی ان حقوق کی وجہ سے پیدا ہوئی جو چند امیر اور طاقتور لوگوں نے صدیوں میں غیر طبعی طریق پر حاصل کر لیے اور غیر طبعی جہالت اور تعصبات کی بنا پر چند افراد اکثریت پر مسلط ہو گئے، لہٰذا نتیجہ یہ نکالا کہ اصل مسئلہ کا حل یہ ہے کہ:۔

۱۔ معدود افراد کو ان کے غیر طبعی حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

۲۔ اکثریت کو طبعی نظام تعلیم اور طبعی نظام حکومت کی بنا پر ان کی راحت کی کلید تھما دی جائے۔

غرض ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان فطرۃً نیک ہیں، بد نہیں۔ عقلمند ہیں، احمق نہیں۔ فہم و بصیرت رکھتے ہیں، بیوقوف اور

۱۔ St. Just

غبی نہیں۔

اٹھارھویں صدی کے فلسفیوں نے جمہوریت کا جو خواب دیکھا تھا، اس کا خلاصہ سادہ طریق پر یہی ہے۔ خواب یہ تھا کہ اس دنیا پر ایک آسمانی شہر آباد ہوگا، لیکن دو سو سال گزر گئے اور خواب کی کوئی تعبیر نہ نکلی۔ بعض لوگ اب تک اسی پر قائم ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ابھی تک ان طبقوں سے آزادی حاصل نہیں کر سکے، جو حقوق پر قابض چلے آتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں ابھی تک روشنی نہیں پہنچی۔ حقیقی جمہوریت کی نمائش ابھی تک نہیں ہوئی۔ لیکن خواب پورا نہ ہونے کے باعث بہت سے لوگ اس کی بنیاد —— یعنی یہ کہ انسان بالطبع نیک اور معقول ہیں اور ان کی معقولیت میں کلام کی گنجائش نہیں —— ہی کے متعلق شک و شبہہ میں پڑ گئے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انسانی اداروں یا ماحول ہی کا قصور نہیں، بلکہ انسانوں کی فطرت میں کوئی ایسی چیز جڑ پکڑ چکی ہے جو عدم راحت کو انسانیت کی تقدیر بنا رہی ہے۔ چنانچہ دورِ حاضر کی مغربی دنیا میں ردِ عمل پیدا ہوا۔ عہدِ تنویر کی اعلیٰ امیدوں کے خلاف جو حالات سامنے آئے، ان سے مطابقت اختیار کر لی گئی اور دنیا میں شر بدستور کارفرما رہا۔[1]

ہمیں اس ردِ عمل اور تطابق کی تین مختلف شکلیں ملتی ہیں:۔

تنویر میں رد و ترمیم

۱۔ ردِ عمل میں تنویر کی کامل تردید ہوئی۔ اس نے بہت سی شکلیں اختیار کیں۔ ایک شکل بعض جذباتی اہلِ علم تک محدود ہے، یعنی یہ کہ جس بربادی کا ہم ذکر کر چکے ہیں وہ واقعی موجود ہے اور یہ احساس قائم ہے کہ انسان نے دنیا کو بہشت بنانے کی کوشش میں سچ مچ اسے دوزخ بنا دیا۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اکثر انسان شریر یا بے عقل یا احمق ہیں۔ ضروری ہے کہ ان پر اچھے لوگ حکمران رہیں، جن کی تعداد ہمیشہ کم ہوگی اور ہمیں اس دور کی طرف عود کرنا چاہیے، جس میں بادشاہی کو خدا کا عطیہ سمجھا جاتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کا وہ دور جس میں جاگیرداروں، پادریوں اور امراء کو اقتدار حاصل تھا۔ یا نئی مطلق العنانی کی کوئی قسم وضع کر لینی چاہیے۔

۲۔ مسیحی نظریہ یہ ہے کہ انسانوں کو بنیادی مسیحی تصور کے مطابق مان لینا چاہیے کہ انسانوں میں نیک اور بد دونوں قسمیں موجود ہیں۔ اس کے مطابق روئے زمین پر زندگی قدوسی اور حیوان نما انسانوں کے درمیان کشمکش کا باعث بنی رہے گی۔ یہ کشمکش دردناک اور سخت ہوگی، مگر قنوطیوں کی رائے کے مطابق اس میں کمینگی اور دنائت کا کوئی پہلو نہ ہوگا۔ ان مسیحیوں میں بعض کے نزدیک مطلوب ارضی معاشرہ وہ ہے جس میں جمہور نہیں بلکہ امراء برسرِ اقتدار ہوں۔ لیکن ان میں سے اکثر —— مثلاً امریکی عالمِ دینیات و اخلاق رین ہولڈ نیبر[2] —— کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ معتدل جمہوریت پسند تھے۔

---

[1] اہلِ مغرب نے یہی کیا۔ دنیا کو محکوم بنایا اور سائنس میں جو ترقی کی، اس نے تعمیر سے بڑھ کر تخریب کے سامان پیدا کر دیئے۔

[2] Reinhold Niebuhr

اگرچہ ان کی رائے یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی میں انتہا پسند جمہوریت کا خواب دیکھا گیا تھا، وہ ایک مکروہ نغویت تھا، مگر ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ دنیا میں عدل پیدا کرنے کے لیے متوازن جمہوری معاشرہ بہترین طریقہ ہے۔ اسی طریقے میں انسان کی ثنوی فطرت (فطرت خیر و شر) بہترین طور پر منعکس ہوتی ہے

۳۔ ویسے لوگ بھی ہیں، جو فلسفیوں کے مقاصد، بلکہ انسانی فطرت کے متعلق اٹھارھویں صدی کے اندازے کو جزوًا قبول کیے بیٹھے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تنویر نے وقت کے باب میں غلطی کی۔ یہ امید صحیح نہ تھی کہ اس کے دعاوی ایک یا دو نسلوں میں پورے ہو جائیں گے۔ یہ ارباب فکر تنویر کی محتاط پیداوار ہیں۔ وہ اس نظریے کو مانتے ہیں کہ انسانوں کو راحت حاصل ہونی چاہیے، مگر گزشتہ دو نسلوں کے واقعات نے ان پر ثابت کر دیا کہ شر اور نامساوات نے چند برے اداروں میں سطحی طور پر جڑ نہیں پکڑ رکھی، جیسا کہ فلسفیوں کا عقیدہ ہے۔ اس کے برعکس شر اور تعصب نے پُرپیچ روایات اور غالبًا انسان کے حیاتیاتی وجود میں گہری جڑ پکڑ رکھی ہے۔

یہ مفکر نفسیات سے بہت متاثر ہوئے، جس نے انسان کی غیر معقول حیثیت نیز تحت الشعور اور لاشعور پر زیادہ زور دیا۔ اسی وجہ سے تنویر کے حقیقی کام میں مشکلات پیش آئیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ دنیا کو بہتر بنانے کا کام بہت طویل اور مشکل ہے، لیکن یہ کام ہر حال میں جاری رہ سکتا ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ ان میں اور مسیحیوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ موجودہ اور آئندہ دنیا کے درمیان تفاوت تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان فطرتی پیداوار ہے اور فوق الفطرت کا کوئی وجود نہیں۔

ہم دوسرے اور تیسرے گروہ یعنی مسیحیوں اور تنویر کے محتاط معتقدوں کے متعلق جو بحث کر چکے ہیں، اس کے انجام پر یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا ان میں عملی تطابق ممکن ہے۔ مغرب میں اس کے متعلق کام جاری ہے۔ اسی تطابق سے پہلے گروہ کو شکست دی جا سکتی ہے، جو جمہوریت کا دشمن ہے اور جمہوریت پر بادی کے پیشگوئیوں کا جھوٹ ثابت کرنے کے لیے باقی رہے گی۔ اسی تطابق کی بنا پر ہم پابندیوں، خامیوں اور تکلیفوں میں زندگی گزارنے پر آمادہ رہیں گے۔ امید کی روشنی کبھی ختم نہ ہوگی اور ہمارے لیے حریت، مساوات اور اخوت کا خواب زندہ رہے گا۔

مؤسسۂ فرینکلن کی چند مطبوعات

نفسیات، تعلیم و تعلّم، فلسفہ

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن غیر تجارتی ادارہ ہے۔ اس کا کام خود کتابیں چھاپنا اور فروخت کرنا نہیں، مگر یہ ادارہ اچھی انگریزی کتابوں کے اردو تراجم شائع کرنے میں پاکستانی ناشرین سے تعاون کرتا ہے۔ یہ اشتہار اور فروخت کا انتظام بھی صرف معاون ناشرین کی حوصلہ افزائی اور فائدے کے لیے ہے، کیونکہ اس طرح شائقین کتب کو بہ سہولت ایک ہی مرکز سے ہمارے سب معاون ناشروں کی کتابیں مل جاتی ہیں۔ اس فروخت کی پوری آمدنی آخر کار ناشروں ہی کو منتقل کر دی جاتی ہے۔

جامع نفسیاتِ تعلیمی

تصنیف : جارج جی۔ ٹامس
ترجمہ : امینہ قریشی

تعلیم و تعلم میں طلبہ کی نفسیات کے علم کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ طلبہ کی شخصیت کی نشو و نما پر استاد کا کیا اثر ہوتا ہے؟ متعدد خاکے، نقشے اور تصاویر شامل ہیں۔

صفحات ۳۹۰ قیمت : آٹھ روپے

تعلیم کے مقاصد (طبع دوم)

تصنیف : وائٹ ہیڈ
ترجمہ : ڈاکٹر سیّد عبداللہ

صفحات ۲۵۶ قیمت : چھ روپے پچاس پیسے

تعلیم کا عمل

تصنیف : جیروم ایس۔ برونز
ترجمہ : سیّد عابد علی عابد

ہمیں کیا پڑھانا چاہیے اور کس مقصد کے پیشِ نظر؟ ایک ماہر نفسیات اپنے تجربوں سے اساتذہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

صفحات ۱۵۲ قیمت : دو روپے پچاس پیسے

بچّے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون (طبع دوم)

تصنیف : لارنس کے۔ فرینک
ترجمہ : خان فضل محمد خان

اس ضخیم کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ بچے کی ذہنی نشو و نما اور تعلیم کے لیے والدین اور اساتذہ

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن، پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹، لاہور

کا تعاون کس قدر ضروری ہے۔

صفحات ۴۴۰ قیمت : نو روپے

آزاد تعلیم اور تہذیبِ نفس (طبع دوم)

تصنیف : اے۔ وِنٹے گرزوولڈ

ترجمہ : سیّد وقار عظیم

آزاد علوم اور آزاد فنون کے ساتھ ساتھ آزاد تعلیم کے حق میں چودہ پُر مغز مقالات کا مجموعہ جو پہلے "آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین" کے نام سے چھپ کر ختم ہو چکا ہے۔

صفحات ۲۳۱ قیمت : تین روپے پچاس پیسے

تعلیمی مقالات

تصنیف : ولیم جیمز

ترجمہ : پروفیسر عبدالغفور

مشہور امریکی ماہر نفسیات و تعلیمات، ولیم جیمز کے مضامین کا مجموعہ، جن میں بتایا گیا ہے کہ نفسیاتی تحقیقات کے استعمال و اطلاق سے عملِ تدریس کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

صفحات ۳۰۴ قیمت : سات روپے

اساتذہ کے لیے تحقیق کی روشنی

ہمارے مدارس اپنے نصابِ تعلیم سے طلبہ کو پورا فائدہ اسی صورت میں پہنچا سکتے ہیں کہ اساتذہ تدریسی فرائض انجام دینے کے پوری طرح اہل ہوں۔ یہ اہلیت اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ ہمارے تدریسی پروگرام جدید ترین تدریسی تحقیق کے مطابق ہوں۔ تحقیقی کتابوں کا یہ سلسلہ اسی مقصد سے مرتّب کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب میں ملک کے ماہرینِ تعلیم نے ہم سے تعاون کیا ہے۔

خداداد ذہانت رکھنے والے بچّے اور ان کی ابتدائی تعلیم
تصنیف : جیمز جے گیلاگر
ترجمہ : محمد ظہور الحق فاروقی

زیرِ نگرانی مطالعہ اور گھر کا کام
تصنیف : روتھ سٹرینگ
ترجمہ : سید سجّاد ناظم زیدی

معاشرتی علوم کی تدریس
تصنیف : جوناتھن سی۔ مکلینڈن
ترجمہ : انعام علی قریشی

خوش خطی کی تدریس	تصنیف : فرینک ای۔ فریمین	ترجمہ : محمد ظہور الحق فاروقی
سمعی بصری آموزش	تصنیف : پال آر۔ وینٹ	ترجمہ : ملکہ رضوی
کنڈر گارٹن کی تعلیم	تصنیف : الزبتھ ایم فُلر	ترجمہ : ملکہ رضوی
بچّے کی شخصیت اور اُس کی ماحول سے مطابقت	تصنیف : رالف ایچ۔ اوجیمان	ترجمہ : نذر محمد بخاری
نوعمروں کی جرم پسندی	تصنیف : ولیم سی۔ کوارے سیئس	ترجمہ : ملکہ رضوی
تعلیم حاصل کرنے کا عمل	تصنیف : ولیم کلارک ٹرو	ترجمہ : گل محمد جبکانی
ثانوی مدارس میں سائنس کی تدریس	تصنیف : جے۔ ڈاریل برنارڈ	ترجمہ : انعام علی قریشی
حساب کی تدریس	تصنیف : آر۔ ایل ۔مارٹن	ترجمہ : گل محمد جبکانی
ہائی سکول میں تدریسِ ریاضی	تصنیف : ہاورڈ ایف۔ فیئر	ترجمہ : ممتاز علی جعفری
ابتدائی اور ثانوی مدارس میں گروہی کارروائیاں	تصنیف : لوئی ایم۔ سمتھ	ترجمہ : محمد ظہور الحق فاروقی
تدریس کے لیے جماعتی تنظیم	تصنیف : جے۔ وین رائٹ سٹون	ترجمہ : سید نذر محمد بخاری
ہجوں کی تدریس	تصنیف : ارنسٹ ہارن	ترجمہ : سید سجاد ناظم زیدی

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن، پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹، لاہور

معاشرتی زندگی میں بچّوں کی رہنمائی

تصنیف : پال ایچ۔لینڈس
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

مدرسے کی زندگی میں بچّے کی رہنمائی

تصنیف : لیس گڈی کونٹز
ترجمہ : سیّد وقار عظیم

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

کامیاب باپ

تصنیف : او۔سپرجن انگلش
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

بچّے کی اخلاقی قدریں

تصنیف : ایشلے مونٹیگو
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

تمھارے مسئلے کیونکر حل ہوں؟

تصنیف : رابرٹ ایچ۔سی شور
ترجمہ : مولانا عبد المجید سالک

قیمت : دو روپے

آپ کے بچّے کی صحت

تصنیف : جے۔روزویل گیلاگر
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

شخصیّت کا مطالعہ

تصنیف : ولیم ای۔ہنری
ترجمہ : ڈاکٹر عبد الرؤف

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

بچّوں کے کھیل

تصنیف : جین شنک گروس مین
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

مؤسسہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹، لاہور

بچّوں کی ذہنی صلاحیّتیں
تصنیف : لورین بوتھلیٹ
ترجمہ : ابرار صدیقی
قیمت : ایک روپیہ

بچّوں کی دلچسپیاں
تصنیف : جی ۔ فرڈرک کیوڈر
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : دو روپے پچھتر پیسے

بچّوں کے خوف
تصنیف : ہیلن راس
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

بچّوں کی بدتمیزیاں
تصنیف : چارلز ڈبلیو ۔ لیونارڈ
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے

بچّوں کے جذباتی مسائل
تصنیف : او ۔ سپرجن انگلش
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : ایک روپیہ ستاسی پیسے

بچّوں میں جذبۂ عداوت
تصنیف : سیبل اسکلونا
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : ایک روپیہ ستاسی پیسے

انتخابِ معاش
تصنیف : جے ۔ انتھنی ہمفریز
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : ایک روپیہ پچھتّر پیسے

بچّوں کی سیکھنے کی قابلیّت
تصنیف : ہیری این ۔ رولن
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : ایک روپیہ پچھتّر پیسے

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن، پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹، لاہور

بچّوں کی نشوونما
تصنیف : ولارڈ سی۔ اولسن
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

ذہین بچّہ
تصنیف : پال وِٹی
ترجمہ : طاہر قریشی
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

مطالعے کے بہتر طریقے
تصنیف : پال وِٹی
ترجمہ : سید وقار عظیم
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

بچّوں کو ذمّہ دار کس طرح بنایا جائے؟
تصنیف : کانسٹنس جے۔ فاسٹر
ترجمہ : سید عابد علی عابدؔ
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

بچّوں کے ساتھ گذر بسر
تصنیف : ایڈتھ نائسر
ترجمہ : یوسف جمال انصاری
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

بھائی بہنوں کا مِل جُل کر رہنا
تصنیف : ہیلن ڈبلیو۔ پیوٹر
ترجمہ : محمد یوسف عباسی
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

بچّوں کو بہتر بولنا سکھائیے
تصنیف : سی۔ وین رائیپر
ترجمہ : سید وقار عظیم
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

بچّوں کو آداب سکھائیے
تصنیف : روڈا ڈبلیو۔ بیکمسٹر
ترجمہ : مولانا عبدالمجید سالک
قیمت : دو روپے پچاس پیسے

مؤسّسۂ مطبوعاتِ فرینکلن، پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹، لاہور

تاریخِ عالم اور شخصیّاتِ اسلام

تاریخِ فرشتہ

تصنیف : محمد قاسم فرشتہ

ترجمہ : عبدالحی خواجہ

ہندوستان میں مسلم عہد کی عظیم تاریخی داستان المعروف "تاریخ گلشنِ ابراہیمی" کا مکمل سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ، ایک معرکۃ الآرا تصنیف اہم دستاویز غیر معروف اور مشہور مقامات کی مکمّل تشریح جو مصنّف نے ۱۶۰۶ء میں لکھنا شروع کی اور ۱۶۱۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی -

دو جلدوں میں مکمل قیمت ۴۰ روپے

تاریخِ لبنان (باتصویر)

تصنیف : فلپ ، کے ، حتی

ترجمہ : غلام رسول مہر

عہدِ قدیم سے دورِ حاضر تک لبنان کے جغرافیائی تاریخی، تمدّنی، معاشیاتی اور سیاسی حالات کا مکمل جائزہ، نادر نقشہ جات اور متعدد تصاویر سے مزیّن

قیمت ۱۵ روپے

قسطنطنیہ (باتصویر)

تصنیف : ہیرلڈلیم

ترجمہ : غلام رسول مہر

پانچویں صدی قبل مسیح سے اب تک شہرۂ آفاق شہر کی مکمل داستان کا گراں بہا مرقع، جسے ہرلڈلیم کے سحر انگیز بیان نے اور غلام رسول مہر کے ترجمے اور حواشی نے ناول سے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔

قیمت ۸ روپے

تاریخِ اشاعتِ اسلام

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

زمانۂ نبوی، دورِ صحابہؓ اور عہدِ سلاطین سے تا عہدِ حاضر اشاعتِ اسلام کی مفصل اور مستند تاریخ۔

قیمت ۱۳/۵۰

تاریخِ شام (باتصویر)

تصنیف : فلپ ، کے ، حتی

ترجمہ : غلام رسول مہر

دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک اہلِ شام کے نشوو ارتقاء کی مکمل و جامع سرگذشت، نادر تصاویر اور نقشہ جات سے مزیّن - قیمت ۲۱ روپے۔

سیرت ائمہ اربعہ

سیّد رئیس احمد جعفری (ندوی)

حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی مکمّل و جامع احوال و سوانح، ان کی تعلیمات اور افکار و آراء کا بیش بہا مجموعہ - قیمت دس روپے۔

امام مالکؒ

مُصنّف : محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ و حواشی : عبیداللہ قدسی

امام دار الہجرت حضرت امام مالکؒ کے سوانح حیات پر جامع اور مفصل تصنیف، ان کی آراء و افکار اور قانونِ اسلامی میں مالکی فقہ کی امتیازی عظمت کی مستند تاریخ۔

قیمت دس روپے

امام ابوحنیفہؒ

تصنیف : محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ : سیّد رئیس احمد جعفری (ندوی)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے فقہی سرمایہ کا مکمل جائزہ، ان کے فقہی اصولوں پر تنقید و تبصرہ، ان کی حیاتِ گرامی اور ان کے عہد کے حالات کا جامع اور دل آویز مرقع -

قیمت پندرہ روپے

آثار امام شافعیؒ

تصنیف : محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ : سیّد رئیس احمد جعفری (ندوی)

فقہ اسلامی کے تدریجی ارتقا اور امام شافعیؒ کے فضائل و کمالات اور مجتہد اجتہاد پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظر، ان کی سوانح، افکار و آراء اور تعلیمات کا نادر مجموعہ قیمت ۱۲ روپے

آثار امام محمدؒ و امام ابویوسفؒ

تصنیف : محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ : سیّد رئیس احمد جعفری

فقہ حنفی کے امام کبیر اور مجتہدِ اعظم امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے آثار و اخبار، حالات و سوانح، مجتہدات و فتاویٰ کا ایک گراں بہا مجموعہ - قیمت ۱۲/۵۰ -

حیاتِ حافظ ابنِ قیم

تصنیف : علامہ عبدالعظیم عبدالسلام (مصر)

ترجمہ : پروفیسر غلام احمد حریری ایم - اے

حافظ ابنِ قیم کے مکمل حالاتِ زندگی، ان کے افکار اور تعلیمات کا گرانقدر مجموعہ جسے مصر کے جیّد عالم نے سالہا سال کی کاوش کے بعد ترتیب دیا ہے - سلیس اُردو میں ترجمہ - عمدہ طباعت - قیمت ۱۲ روپے

حضرت امام جعفر صادقؒ

تالیف : ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ : سیّد رئیس احمد جعفری

حضرت امام جعفر صادقؒ کے مکمل حالات و سوانح پر جامع اور مکمل تصنیف، آپ کے افکار و آراء آپ کی تعلیمات اور آپ کے عہد کی تاریخ کا گراں بہا مجموعہ -

قیمت ۱۵ روپے

حضرت علیؓ ابن ابی طالب

امان اللہ خاں ارمان سرحدی

حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کی عظیم المرتبت شخصیت کے جامع و مکمل حالات و سوانح کا بیش بہا مجموعہ، آپ کے علوم و معارف اور تعلیمات کا نادر ذخیرہ -

قیمت ۱۰ روپے

حکمائے عالم

تصنیف : القفطی

ترجمہ : ڈاکٹر غلام جیلانی برق

۴۱۱ - اسلامی و یونانی فلسفی حکمائے کے مفصل و جامع حالات و سوانح کا انسائیکلو پیڈیا - قیمت دس روپے -

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز - لاہور - پشاور - حیدر آباد - کراچی